مشتمل بر ۳ حصص

حصّہ دوم

مصنفہ

بشیر الدین احمد

اردو اکادمی، دہلی

ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ
سورۂ اعراف

ملک تو سب اللہ ہی کی ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اُس کا وارث بناتا ہے

کسے را زندگانی شاد باشد ✠ کہ در شاہ جہان آباد باشد

واقعاتِ دار الحکومتِ دہلی

۱۳۳۷ھ

مشتمل بر سہ حصص

حصۂ اوّل

شہر دہلی کی "بے عدیل تاریخ" قبل مسیح سے ۱۹۱۹ء تک

مصنفہٗ

بشیر الدین احمد (دہلوی) ایم - آر - اے - ایس (لندن)

اوّل تعلقدار (کلکٹر) پنشنر سرکار عالی نظام خلد اللہ ملکہ

مصنف اقبال دلہن حسن معاشرت - اصلاح معیشت - حرز طفلاں

نشاۂ عمر - عصائے پیری - تاریخ بیجانگر - واقعات مملکت بیجاپور وغیرہ وغیرہ

۱۳۳۷ھ
۱۹۱۹ء

شمسی مشین پریس آگرہ میں باہتمام محمد اسحاق و شمس الدین صاحبان کے چھپی

شہر دہلی کی نئی پرانی کل عمارتوں کا مفصل بیان مع نقشہ جات کے

واقعات دار الحکومت دہلی

۱۳۳۷ھ

مشتمل بر سہ حصص

(حصہ دوم)

۱۳۳۷ھ

مصنفہ بشیر الدین احمد دہلوی

۱۹۱۹ء

شمسی مشین پریس آگرہ میں محمد بشیر الدین خان و محمد شمس الدین خاں کے اہتمام سے چھپی

حرفِ آغاز

دہلی ہندوستان کا دِل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شہر اپنی تہذیبی روح، ثقافتی رنگارنگی اور تاریخی کردار کے اعتبار سے ایک چھوٹا سا ہندوستان ہے۔ دہلی کلچر کے فروغ میں اُردو نے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے، اور آج بھی یہ زبان اس کی ادبی و تہذیبی شناخت کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اُردو کی کلچرل اہمیت اور دہلی کی ثقافتی زندگی سے اس کے گہرے رشتے کے پیشِ نظر آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی سابق وزیرِ اعظم مرکزی حکومت ہند کے ایما پر ۱۹۸۱ء میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔

اکادمی کا اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ اور طے شدہ دستور العمل ہے۔ دہلی کے لفٹیننٹ گورنر اس کے صدر نشین (چیرمین) ہیں اور اکادمی کے اراکین کو دو سال کے لیے نامزد کرتے ہیں۔ ان اراکین میں ممتاز اہلِ قلم، ادیب، نقّاد، صحافی، معلّم اور محقّق شامل ہیں۔ اکادمی دہلی اور بیرونِ دہلی کے دوسرے علمی، ادبی، تہذیبی اور تعلیمی حلقوں سے بھی رابطہ قائم کیے ہوئے ہے اور اپنی سرگرمیوں میں اُن کے تعاون اور مشوروں کو خوش آمدید کہتی ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ کتاب انسان کی بہترین ساتھی ہے اور کتاب کا مطالعہ اس کا شریف ترین مشغلہ۔ کتاب ماضی کو حال اور حال کو مستقبل سے جوڑنے کا سب سے عمدہ وسیلہ ہے۔ اپنے اس بیش بہا ورثے کو محفوظ کرنا اُسے خوب تر اور مفید تر بنانا ہمارے

تہذیبی فرائض کا سب سے اہم حصّہ ہے۔ یہ گویا ادبی روشنیوں کو عام کرنا اور علمی خوشبوؤں کو پھیلانا ہے۔

اکادمی نے نہایت اہم موضوعات پر اچھی کتابوں کی اشاعت کا جو منصوبہ بنایا ہے "واقعات دارالحکومت دہلی" اِسی سلسلۂ پیش کش کا ایک حصّہ ہے۔ اس طرح کی کتابوں کی مدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی اور جو اب بالکل نایاب ہوچکی ہیں، یہ ۱۹۱۹ء میں شائع شدہ ایڈیشن کا عکسی ایڈیشن ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ اصل نسخے کے مطابق اسے جوں کا توں شائع کیا گیا ہے تاکہ محققین کے سامنے اصل نسخے کی شکل وصورت برقرار رہے۔ یہاں تک کہ اغلاط نامہ بھی برقرار رکھا ہے اور کتاب کی پشت پر پُرانا دیا ہوا پتہ بھی موجود رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کی تاریخ وادبیات سے متعلق کچھ ایسی اہم کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں جو کمیاب بلکہ نایاب ہوچکی تھیں۔ ایسی مزید کچھ کتابیں ترتیب واشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہیں۔ اس کے لیے ہم اشاعتی کمیٹی کے اراکین کے ممنون ہیں۔

ہم اپنے موجودہ سرپرست اور اکادمی کے صدرنشین جناب ارجن سنگھ صاحب لفٹیننٹ گورنر دہلی کی عنایات اور توجہات کے بے حد ممنون ہیں۔ ایگزیکیٹیو کونسلر (تعلیم) جناب کلانند بھارتیہ کی عنایات کا بھی اعتراف ہے اور اُن کی رہنمائی کے لیے بھی شکر گزار ہیں۔

سیّد شریف الحسن نقوی

سکریٹری

اردو اکادمی، دہلی

فہرست مضامین حصۂ دوم واقعات دارالحکومت دہلی

فہرست نقشہ جات و تصاویر.

قطعہ تاریخ نوشتۂ عالی جناب شہزادہ مرزا بلاقی صاحب امیر الملک تیموری گورگانی

مولوی صاحب بشیر احمد الٰہی شاد باد ۔ کرد تصنیف کتاب آں کہ سال آں این ہمیں
باہزاراں محنت و کوشش مدیں مدرسفتہ است ۔ "تذکرۂ دہلی بشنوی" تاریخ ہجری ہم دریں
تذکرہ شاہ جہان آباد باز آری بسال ۔ عیسوی تاریخ احقر ہم برآمد بالیقیں

قطعہ تاریخ "واقعات دار الحکومت دہلی" نوشتہ جناب مولوی محمد فضل ستار صاحب رئیس امروہہ

تاریخ مجلد دہلی

بشیر الدین احمد چوں نوشتہ ۔ یکے تاریخ جامع شہر دہلی
عیاں شد کنز مخفی حوادث ۔ بیاں گردیدہ سر وجہ دہلی
نمودہ گاہ رہش چوں گلستاں ۔ کشادہ گہ برخ پر قہر دہلی
چو دہلی نو بہار گلشن ہند ۔ حیات تازہ بخشد زہر دہلی
دُرر در دامن است ہر موج آبش ۔ محیط اعظم است بحر دہلی
زکلک لاابالی سال طبعش ۔ "صحیفۂ واقعات شہر دہلی"

غلط نامہ حصۂ دوم واقعات دارالحکومت دہلی

غلط نامے کی نسبت کچھ عذر معذرت کرنا عذر گناہ بدتر از گناہ۔ لیکن ایں آتنا بڑا غلط نامہ کہ کنکوے سے دم چھلا بھاری پیش کرتے ہوئے شرمندہ ضرور ہوں۔ یہ غلط نامہ بھی میرے خیال میں جیسا چاہیے ویسا مکمل نہیں اب بھی کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں گی تو عجب نہیں۔ بہرحال اتنی بڑی ضخیم کتب میں غلطیوں کا رہ جانا لازمۂ بشریت ہے۔ میں اپنی برأت کا خواہاں نہیں مگر اس الزام کا میں تن تنہا بھی ذمہ دار نہیں میرے شرکا سے غالب کاتب۔ قاری۔ سامع۔ مصحح۔ سنگ ساز سب ہی ہیں جس طرح میں نے صبر کر لیا ناظرین بھی براہ مہربانی کتاب شروع کرنے سے پہلے ان غلطیوں کو درست فرمالیں فقط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۷	۲	بارہ	گیارہ	۳۱	۱۵	درکاہ	درگاہ
۸	۲۲	غوری	غور	۳۹	۷	حوبلی	حویلی
۱۰	۳	خانہ ۸ و ۹ و ۱۰ کا	خانہ (۸) (۹) دہلی	۴۲	۱۰	حبیب اسد (اصل کتاب)	حبیب اسد
		اندراج غلط ہے	۱۸۰۳ء ۲۸ یوم ۱۰ ۱۸۲۳ء ۹۳۵ھ	۱	۴	غاوداں	جاوداں
۱۰	۱۰	کے	کی	۲	آخر	یاندیاں	باندیاں
۱۲	۹	کو	×	۳	۹	اس کہ	اس کے کہ
۱۶	۳	۱۶۷	×	؍	۲۳	تینا	تیمنا
۱۸	۳	خان خاناں	خان خاناں نے	۴	۲۳	ہتمم	مہتمم
۲۵	۱۸	کی	کے	۵	۱۶	[illegible]نے	زمانے سے
۲۶	خانہ (۱۱)	+	(۶۹) سال	؍	۱۹	کرزن کی	کرزن کو
۲۷	۲	صل	اصل	؍	؍	یادگاروں کو	یادگاروں کے
۲۹	۱۶	بدھ کی	بودھ کے	؍	۲۱	عمارتت	عمارات
؍	؍	احکام	احکام ہیں	۶	۹	موجودہ	موجود

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۶	۱۰	ترجمہ کا	ترجمہ	۱۶	۶	غرض	عرض
״	۱۵	آثار	آثار	۱۷	۴	حدیث	حدیث
״	۱۸	آپ	آپ	״	۵	ہو	را
۷	۲	ہریک زباں	ہر یک زبان	״	۶	بیان سے کر	بیان کے لیے
״	۹ و ۱۰	۵۷ ۳ ۵	+	״	۹	دیگر	دیگر سے
״	۱۲	چشم پر	چشم پر عالم	״	۱۵	وسیع ہیں	وسیع ہو
״	۱۴	بروے	بہ روے	۱۸	۸	اُس کا	اُس کی
״	۲۰	اسامی	اسماے	״	۹	سے	نے
״	۲۱	ہمارے	ہمارے دل	״	۱۰	ہیں	ہیں
۸	۳	شعاے	شفاے	״	۱۰	ہوا	ہو
״	۴	بحث	بحث	״	۱۸	کشن	کشن
״	۱۲	دارالسلطنوں	دارالسلطنتوں	۱۹	۴	اتنے	×
״	۱۳	یادگار	یادگار رہا	״	۵	ایک شہر	ایک
۹	۱۳	قلعے کے	قلعے کو	״	۶	یک	ایک
۱۱	۱۶	مصالح اور	مصالح	״	۱۰	م استناد	استناد
״	آخر	عادل آباد	عادل آباد ے	۱۹	۱۲	عوام کا	عوام کی
۱۰	۴	سادات نے	سادات	״	۱۳	گننگھم	کننگھم
״	۸	لودھی	لودھی نے	۲۰	۴	اس کے	اس کے بعد
״	۱۰	میدان	میدان میں	״	״	ہو	ہی
۱۱	۴	ضلغ	ضلع	״	۶	جن ہیر کا	جن میں کے
۱۴	۱۴	قلندر	قدر	״	۲۴	قطب	قطب
۱۵	۱۵	یار	یاران	״	۶	علاہات	علامات

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۴۲	۱	سودا	سواد	۳۱	۵	پھلو	پھلوں
؍	۹	بتانے	بنانے	۳۲	۳	طرح کی	طرح کے
؍	۱۲	کامیاب	کامیابی	؍	؍	طاقت اور	طاقت ور
؍	۱۵	قربانی	قربانی کی	؍	۶	اغاز	آغاز
۲۳	۱۳	گھاٹوں	گھاٹوں پر	؍	۲۴	جابجا اندر	اندر جابجا
؍	۱۵	بے ڈھنگی	بے ڈھنگے	۳۳	۵	انجاس	اجناس
؍	۱۹	جلاے تھے	جلاے جاتے	۳۴	۱۲	کر	کے
؍	آخر	۵۳۲ء	۱۵۳۲ء	؍	۱۵	مقتد	مقتدر
۲۴	۱	ہندیں	بند ہیں	؍	آخر	سلطب	سلطنت
؍	۷	بنایا ہے	بنایا ہو	۳۵	۲	یدھشٹر	یدھشٹر نے
۲۵	۱۷	سے	سر	۳۶	۱۰	جینی	چینی
۲۷	۱۲	اعزار	اعزاز	؍	۱۴	موزرخ	مورخ
؍	۱۵	تبدلیاں	تبدیلیاں	؍	۲۱	ستھے	سے تھے
؍	۲۱	مبسیط	مبسوط	۳۷	۲	ہم	ہم کو
۲۸	؍	شیوجن۔	نوٹ ہمارا سو میل کا ایک یوجن ہوتا ہے	۳۸	۱۶	نبائی نبائی	بنائی
۲۸	۱۳	سدرش	سدرشن	۳۹	۱۰	اہنی	آہنی
؍	۱۵	تحریض	تحریص	۴۰	۷	اپنا	اپنی
۲۹	۳	جیسے کہ	جیسے کا	؍	؍	کرلیا	کرلی
؍	۱۲	کر اپنے	کر انھوں نے اپنے	؍	۱۲	والوں نے	والوں کا
۳۰	۱۳	میں	×	۴۱	۱۳	شاہجہاں آباد	شاہجہان آباد
؍	۱۷	خیال	حال	۴۲	۷	ہجوم	ہجوم سے
۳۱	۲	جاے	جائیں	؍	۲۱	محت	محنت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۴۳	۱۲	کمخوالوں	کمخوابوں	۶۳	۴	پندرہ لاکھ سے تیس لاکھ	ڈیڑھ کروڑ سے دو کروڑ
"	۱۴	نگارخادہ	نگارخانہ	"	۱۰	پشب	یشب
۴۴	۶	سرخ کا	سرخ کی	۶۷	۲۴	عامہ	جامہ
"	۱۵	سوسکتا ہے	کرسکتا ہے	۶۷	آخر	ضرح	طرح
"	۲۳	مطب	مطلب	۶۸	"	خوض	حوض
"	۲۳	معالم	معاملہ	۶۹	۲ و ۱	"	"
۴۶	۹	گنگورسے	کنگورسے	"	۱۴	نہرے	نہر کے
۴۶	۱۲	احاے	احاطے	۷۰	۵	ہوے	ہونے
۴۹	۱۲	پڑے	پڑتے	۷۲	۸	صدر	صد
۵۰	۱۷	ٹکڑے	×	۷۳	۸	قدیم	قدم
۵۱	۴	ہستاد	اِستاد	"	۱۸	شمای رواں	شمالی دیوار
"	۱۱	"	"	"	آخر	×	۲۲ ۱۲ھ (۱۸۰۷ء)
"	۲۲	مغلہ	مغلیہ	۷۴	۲۰	عینمت	غنیمت
۵۳	۲۱	لاے	لاتے	۷۵	۲۳	بجیسے	بجسے
۵۴	۸	کھڑا	کٹہرا	۷۶	۱۱	نادار	نادر
۵۵	۱۹	سرے	سر	۷۸	۱۸	نہانب	نہایت
۵۷	۱۲	سے تھے	تھے	۷۹	۵	بہتی اور	نکل کر
"	۱۷	جب کہ	×	"	"	باغیچہ کے	باغیچہ کی
"	"	بعد	بعد سے	"	"	تھی	تھیں
"	۲۴	قاعدے	قاعدے سے ہے	۸۲	۴	ترمامہ	نسانہ
۵۹	۳	ھلی	کھلی	"	۱۴	مشرق	مشرق کے
"	۹	سکا	×	"	۲۰	ہی	ہی نے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۸۲	نقشہ	نقشہ شاہ برج	نقشہ شاہ برج دریا کی طرف سے	۹۷	۱۰	لز	گز
"	"	شاہ برج	شاہ برج مہتاب باغ کی طرف	"	۲۴	خسرشت	سرشت
۸۳	۶	مرامت	مرمت	۹۹	۲	لاتیغک	لائیغک
"	۱۴	س	جس	"	"	انہیں	انھیں
۸۴	۹	نشیین	نشیمن	"	۲۴	میں	ہیں
"	۱۶	پیولین	پیویلین	"	"	خراب	محراب
۸۵	۳	نہر	×	"	۲۶	گھڑی	کھڑی
"	۱۲	ژور	زور	۱۰۱	۶	کے	کی
۸۶	۲۲	اور	×	"	۱۰	نا	بنا
۸۷	۱	فصیل کو	فصیل سے	۱۰۲	۳	عمارات	عمارت
"	۱۶	ہیں	ہے	"	۵	بی	بنی
"	۱۸	پتلے	پلہ	"	۲۳	سے	×
"	۱۹	کرتے ہیں	کرتا ہے	۱۰۳	۲۰	نوّے گز	نوّے فیٹ
۸۸	۱۶	خبتر	مجز	"	"	تیس گز	تیس فیٹ
"	"	ولی	والی	۱۰۴	۴	سلطنت کے	سلطنت کی
۸۹	۱	لی گئیں	لیئے گئے	۱۰۶	۹	داحل	داخل
۸۹	۲۲	پتھر	پتھر جڑے ہوئے تھے	"	۲۰	کے	کی
"	"	کرکر	کر	۱۰۷	۱۲	تا	×
۹۰	۹	شاہ جہاں آباد	شاہ جہان آباد	"	۱۶	خوض	حوض
۹۱	۱۳	مچاہٹ	مچچاہٹ	"	۱۹	خواجہ سرا	خواجہ سرائے
۹۲	۲	تصیل	فصیل	۱۰۸	۵	رتبا تھا۔ بیاری	رہتا تھا۔ بہاری
۹۴	۱۹	بخوبی	بخومی	"	۱۲	گرائی	کرائی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۱۰۸	۱۴	نے	کے	۱۲۵	۲۰	یۃ	یہ
"	۱۶	پچپن	پچپن ہزار	"	۲۴	کا ٹھیکہ دار تھا	کی ٹھیکہ دار تھی
"	۱۸	سنہ ۱۹۰۶ء	سنہ ۱۹۰۱ء	۱۲۶	۳	یال	بال
"	"	حرف	صرف	"	۱۷	وہی	وہ
"	"	لو	گو	۱۲۷	۱۶	تہلائی	بتلاتی
۱۱۰	۱۷	کا پہلا جمعہ	کے پہلے جمعے	۱۲۸	۶	چودھا	چودہ
"	"	رجب میں	رجب کی	"	۲۲	چودہا	چودہ
"	"	تاریخ	تاریخ کو کرائی جاتی تھی	۱۲۹	۶	یرازہ	برازہ
"	۲۳	مبارک	مبارک	"	"	خلا	خلاے
۱۱۲	۱۳	بدرلشفا	بدارالشفا	"	۱۳	مجور	محور
۱۱۴	۱۷	عاسق	عاشق	"	"	بنا ہوا ہے	+
۱۱۸	۲	اوس	اس	۱۳۰	۸	معصود	مقصود
"	نقشہ	قلع	قلعہ	۱۳۲	۱۳	نتہا	تنہا
۱۱۹	۲۴	برڑ	بڑا	"	۱۷	محش	بخش
"	آخر	مسجد کی	مسجد کے	۱۳۳	۶	شیخ	تیغ
"	"	بنگری	بنگڑی	"	۲۴	الکفور	الغفور
۱۲۰	۸	میناریں	میناریں ہیں	۱۳۴	آخر	ہرس	برس پہلے
"	۲۲	کے	کی	۱۳۵	۳	ہوتے	ہوتے ہیں
۱۲۱	۱	خوض	حوض	۱۳۶	۱۴	ملازمت اختیار کی	×
"	۱۹	بیٹے محمد شاہ	اپنے بیٹے احمد شاہ	"	۲۳	چلد	چار
۱۲۳	۱۳	بچاس	پچاس	۱۳۷	۶	اوچکتے	اوچکے
"	۱۴	ہے	تھا	۱۳۸	۱	شہر	شہر کے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۱۳۸	۱۲	سے کے	کہ	۱۵۴	۱۹	بعد	بعد میں
"	۱۵	شہر	شہر کے	"	۲۱	سے نے	سے رام پور
"	۱۶	یہ شہر	شہر	۱۵۵	۱۱	بہاں	یہاں
"	آخر	پر	میں	"	۱۳	مرزار	مزار
۱۳۹	۲	خلیق	خلیق	"	۱۵	"	"
"	۱۳	کاہے	ہے	۱۶۰	۲۷	سکند	سکندر
"	۱۴	پھر	×	۱۶۱	۱۸	محمد کعلق	محمد تغلق
"	۲۱	انگریزی	انگریزی میں	۱۶۲	۷	کے	کی
۱۴۱	۸	ہرجی	برجی بجلی	"	۲۰	جہاں کے	جہاں
۱۴۲	۱۰	دور افاں	دوران خاں	۱۶۳	۴	بڑے	بڑا
۱۴۳	۱۲	اعظم عبدالرزاق	رئیس اعظم عبدالرزاق	۱۶۴	۸	قبریں	قبر
۱۴۴	۱۹	بیس	بیش	۱۶۵	۱۴	ملا	لا
۱۴۵	۱۳	اعزار	اعزاز	"	۲۰	کہ اور مہ	کہ و مہ
"	۱۴	بترجیح	ترجیح	۱۶۶	۱۱	سے ٹکرے	کی ٹکر
۱۴۷	۹	وعظ ہوتا ہے	×	۱۶۷	۲۰	رؤسا	رؤسا کے
۱۴۸	۲۰	معاملہ	معاملہ	۱۶۸	۹	کہ	کی
۱۵۱	۷	رفائی	رفاعی	۱۶۹	۶	کا	سے
"	۱۸	"	"	"	۱۲	کے	کی
۱۵۳	۱۹	طالباں	طالبان	"	۱۵	صاحب	صاحب کے
۱۵۴	۹	بعد	بعد میں	"	۱۷	اعزار	اعزاز
"	"	ریع	ربیع	"	۲۲	بنایا	بنا
"	۱۷	سنہ ۱۲۹۶ھ	سنہ ۱۲۹۶ھ میں	۱۷۰	۱۰	آتے نہ جاتے	آتے ہیں نہ جاتے ہیں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۱۷۱	۱۸	بعد	بعد میں	۱۹۶	۸	منضور علی	منصور علی
؍؍	آخر	خبش	حبش	۱۹۸	۱۴	آزاد	آزار
۱۷۱	۶	صوم صلوۃ	صوم وصلوۃ	۲۰۱	۲۱	ذہن	ذہین
؍؍	۱۹	یہ	یا	۲۰۴	۱۸	ہو	ہوا
۱۷۳	۲۳	محضوض اسد	مخصوص اسد	۲۰۵	۲۴	کے	کہ
۱۷۴	۱	لکھا تھا	لکھاتا	۲۰۷	۱۸	والاں	والا
؍؍	۵	صاحب	صاحب کے	۲۰۸	۱۵	عیوبی	عیوب
؍؍	۱۷	مسجدوں کو	مسجدوں کی	؍؍	۱۹	بینکنک	بینکنگ
۱۷۹	۲۲	اسسٹرا سسٹنٹ	اکسٹرا اسسٹنٹ	۲۱۰	۵	سرگردگی	سرکردگی
۱۸۰	۲۴	ابہ	ایر	؍؍	۲۰	کے طرف	کی طرف
۱۸۲	۵	خاں	خان بہادر	۲۱۱	۲۱	اس کی	اس کے
۱۸۳	۱۵	ہاتھی	ہاتھی والا	۲۱۲	۱	پیشانی	پیشانی پر
؍؍	۱۶	رود	روڈ	۲۱۶	۱	زمین	سطح زمین
۱۸۴	۱۹	وراسے	وترانہ	؍؍	۳	پوپنچتے	پہنچتے
؍؍	۲۳	زبے	ازبے	۲۱۷	۲۰	آخزار	آخزنادار
۱۸۵	۱۱	بھجور	کھجور	۲۱۸	۱۲	ہوئے	ہوتے
۱۸۶	۱۹	ثانی	ثانی نے	۲۱۹	۲۱	پرسے	پڑھے
؍؍	۲۰	سنہ ۱۳۲۲	سنہ ۱۲۲۲	۲۲۰	۲	وا	را
۱۸۸	۱۹	دونوں	دلوں	؍؍	۱۰	حاضر	خاطر
۱۸۹	۲۰	جگہ کے	جگہ	؍؍	۱۴	مخطوط	محفوظ
۱۹۳	۳	کے	کے صاحبزادے	؍؍	۱۹	بردیکت	نزدیکت
؍؍	۷	کریم احمد	محمد یعقوب	۲۲۱	۱۴	تماستوں	تماشوں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۲۲۲	۳	سائستہ خاں	شائستہ خاں	۲۴۵	۱۲	گاری	گاڑی
۲۲۳	۱	کے	کی	۲۴۵	۲۱	برٹھتے	پڑھتے
"	۱۱	سواے	ہندوستان میں سوائے	۲۴۶	۸	سے سلیں	کی سلیں
۲۲۶	۲	جو	کا جو	۲۴۷	۷	مقعول	معقول
"	۲۳	ہی	+	۲۴۸	۷	گیا	ہوگیا
۲۲۸	۱۴	نیبح	ننیج	"	۱۹	دروازےمیں	دروازے میں
"	۲۰	بزار	بزاز	۲۴۹	۱	مخاذ	محاذ
۲۲۹	۲	صدرجہاں	صدرجہاں	"	۲۲	اے	آئے
"	۹	یاغ	باغ	۲۵۱	۲	الفنسٹنز ا	الفنسٹنز
۲۳۰	"	سراہنے	سراپنے	"	۷	اس کے گھر	اب صرف
۲۳۱	۲۰	برقعہ	برقعہ	۲۵۵	۴	گودام میں	گودام میں
۲۳۲	۸	کوچادروں	جو چادروں	۲۵۵	۱۱۰	اولادمیں	اولاد میں تھا
"	۲۴	ہو	ہوا	"	۲۳	روئیوں	روپیوں
۲۳۳	۱۳	سررست	سررشت	۲۵۶	۳	بھاٹک	پھاٹک
۲۳۵	"	عبت	عبث	"	۶	پھاٹک سے	پھاٹک کے
۲۳۸	۹	سے محلے	محلہ	۲۵۷	۷	دروارے	دروازے
"	۱۹	امیرامیر	امیر	۲۵۸	۳	تحصل	تحصیل
۲۳۹	۱۸	انتقال	انتقال کیا	"	۱۳	شول	شوال
۲۴۱	۱	سمجھی جاتی	سمجھے جاتے	۲۵۹	۷	جادرا	جادوا
"	۲۰	کمانڈ	کمانڈر	۲۶۰	۱۷	الیسنی	ایسی
۲۴۳	۱۴	چھیٹ	چھت	۲۶۱	۴	کے	کی
۲۴۴	۱۱	مرتنت	مرمت	"	۱۲	ہو	ہوا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۲۶۲	۱۴	بسزم	ببزم	۲۸۰	۹	نبک کے	بنک کا
"	۲۳	محدت	محدث	۲۸۱	۲۴	صدی	صدی سے
۲۶۳	۹	پر	پہ	۲۸۵	۶	ریورند	ریورنڈ
"	۱۹	خلفت	خلقت	"	۱۱	ہے	ہیں
۲۶۵	۲۰	دیتا ہے	دیتی ہے	"	۱۳	ٹیم ٹامم	ٹیم ٹام
"	۲۱	کو صبح	کی صبح	"	۱۴	آرزؤ	آرزوو
"	آخر	تجفہ	تحفہ	۲۹۳	۲	اسلحو خانہ	اسلحہ خانہ
"	"	خلا اور ملا	خلا ملا	"	۱۱	سارے	سارے ریل میں
۲۶۸	۲	شاہجہان آبادی	شاہجہان آباد	۲۹۴	۱۴	نے	×
۲۶۸	آخر	معمول ہے	معمول بہ ہے	"	۱۸	کر	کے
۲۷۰	۵	کفر	کفر کفر	۲۹۵	۲۲	یا بشیر	یا بشیر
"	۱۳	یا	×	۲۹۶	۹	پچہا	چہار
"	۱۴	تھی	بھی	"	۱۴	مسجد میں	مسجد میں چوکوں
۲۷۱	۱۸	اس	اسی	"	۲۰	بست پہلو	ہشت پہلو
۲۷۲	۳	دبے	وہ سیے	۲۹۷	۱۵	بفصل	بفضل
۲۷۴	۲۱	پارٹی لڈو	پارٹی نے لڈو	"	۲۰	مخاذ	محاذ
"	۲۳	اس کا	اس	۳۰۱	۱۳	آگرہ	اگر
۲۷۵	۵	میسزز	ہیٹمرز	"	۲۲	برح	برج
"	۱۱	میسزرز	ہیٹرز	۳۰۲	۱۳	معمولی	×
"	۱۵	میں	×	۳۰۹	۲۰	بہت ی	بہت سی
"	۱۶	دروازسے	دروازے سے	۳۲۹	۱۵	صا	صاحب
۲۷۶	۲۶	سنہ ۱۲۱۶ھ	سنہ ۱۲۱۸ھ	۳۳۴	۱۵	خان دوراخاں	خان دوراں خاں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۳۶۰	۷	موتیں	مورتیں	۴۴۴	۶	لمونتہ	لمونتۂ
۳۶۸	۷	کوتیا	گوتیا	۴۴۱	۱۱	ہم بایہ	ہم پایہ
۳۷۲	۱۲	تھیں	تہیں	″	″	سے	کے
۳۷۹	۱۵	سپپ	چسپ	۴۴۲	۹	نغمہ سر	نغمہ سرا
۳۸۰	۱۴	وسیع	وسیع میدان	۴۴۴	۱۱	لی	کی
″	″	جگہ	جگہ تھیں	۴۵۹	۱۵	تخمیناً	تخمیناً
۳۸۱	۸	دوریاؤں	دو دریاؤں	۴۶۳	۴	ٹیکری	ٹیکڑی
″	۱۱	قطپ	قطب	۴۶۶	آخر	لوڈیاں	لونڈیاں
۳۸۹	۲	جھکے کے بارے	جھپکے کے بارے	۴۷۲	۱	لٹڑوکیسل	لڈلوکیسل
				۴۷۴	۹	اس کو	اس کی
۳۹۱	۲۲	اسی طرح	اسی سے	۴۷۶	۱۲	اک	ایک
۳۹۳	۴	نار	ناز	۴۷۸	آخر	سلول	سکول
″	۶	الاحتصار	الاختصار	۴۸۰	۱۶	عذر	غدر
″	۱۴	قراۃت	قرأت	″	۲۳	مل جانا	مل جانا تھا
″	۲۱	اعتبار	افتیاز	۴۸۱	۲۱	عظیم	عظیم
۴۱۵	۱۲	نظر اندار	نظر انداز	۴۹۷	۸	حوان نعمت	خوان نعمت
۴۱۷	۲۱	صاحب کے	صاحب	″	″	جوں	چوں
۴۲۴	۲۰	انگریزی	انگریزی	″	″	سوخ	شوخ
″	۲۱	اس شامل	اس میں شامل	″	۱۲	تشریفے	شریفے
۴۲۵	۱۸	مناسب	مناسبت	۴۹۹	۱۰	خاک	خار
″	۲۱	نہ کرتا	کرتا	۵۰۲	۹	جار	جا
۴۲۶	۱۵	کہ	جو کہ	۵۰۴	۱۲	بیلم	بیگم
۴۲۹	۱۲	صبح	صبح	۵۰۶	۱۶	ذکر	ذکر کر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۵۰۷	۲۲	انہ	×	۵۹۲	۱۹	جنزل	جنرل
۵۰۸	۲۳	کہاتا ہے	کہا جاتا ہے	۶۰۴	۱۶	جھکڑا	چھکڑا
۵۱۱	۹	حرید	خرید	″	۲۴	حکمت علی	حکمت عملی
۵۱۴	۶	باہرواز	باہروار	″	۲۵	انار	اُتار
۵۲۶	آخر	العف	الف	۶۰۵	۳	تعمر	تعمیر
۵۳۱	۲	حسرت	حسرت نصیب	۶۰۶	۱۴	سے دوسرے	کے دوسرے
″	۱۹	تیئسوں	تیئسویں	۶۱۲	۸	لی	کی
۵۴۴	۸	پماسے	پر آسے	″	۱۳	میں	ہیں
۵۴۵	۶	خاطر	کی خاطر	″	۱۹	لتبہ	کتبہ
۵۴۸	۱۷	لوازمے	لوازمے تھے	۶۱۷	۳	کفتند	گفتند
۵۵۰	۱۳	پڑا	پڑا ہا	۶۱۸	۱۶	سے	سے ہے
۵۵۱	۱۶	اول میں	دل میں	۶۲۰	۱۳	ہو	ہوے
۵۵۴	۱۵	دلی لوہارو	دلی عہد لوہارو	۶۲۶	۱۴	دین پناہ	دیں پناہ
۵۵۶	آخر	چامدی	چاندی	۶۲۸	۳	زیاتر	زیادہ تر
۵۶۳	۲۲	آپ نے	+	۶۳۲	۴	تصوبر	تصویر
۵۶۶	۱۴	رہنے	رہنے کے	۶۳۳	۱۳	کہنے	کہتے
″	۲۰	نیچ ہیں	نیچ میں	۶۳۴	۱۱	پیچکاری	پچپکاری
۵۶۹	۱۴	آکرہ	آگرہ	″	۲۰	فٹ	فٹ
۵۷۲	۳	رمنٹ	گورنمنٹ	″	۲۱	فسبت	نسبت
۵۸۲	۴	رہ خدا	راہ خدا	″	۲۲	بھی ہے	بھی ہیں
۵۹۵	آخر	شمس	ششش	۶۳۸	۷	لم	کم
″	۶	قاعدے	قاعدے کا ضلع	″	۱۳	ابک	ایک

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
۶۴۱	۲۰	برجی	برجی	۷۷۷	۱۸	نواسے	نواسے تھے
"	۲۳	ی	ہی	۷۸۵	۱۲	رہتے	رہتے تھے
۶۴۲	۱۵	ھا	تھا	"	۱۹	کواہ	گواہ
۶۴۵	۳	س	اُس	۷۹۰	۶	کنبد	گنبد
۶۴۸	۶	برڑ	بڑا	۷۹۷	۹	محمد شاد	محمد شاہ
۶۵۰	۲۴	اس	اس سے	"	۱۴	یادش	یاداشش
۶۵۳	۳	لکھ	لکھ	۷۹۹	۳	کسی	×
"	۱۹	یہ	یہ	۸۰۰	۱۶	سے	کے
۶۵۴	۱۳	دار و دار و	دار و	۸۰۷	۲۲	زننا	زمانا
۶۷۶	۷	یکر	ایکڑ	۸۱۳	آخر	کھبراے	گھبرائے
۶۸۰	۴	سے	سے	۸۵۰	۹	میرے اور	میں نے اور
۶۹۱	۲	گنگورا	کنگورا	۸۶۰	۲۱	میوا بخت	ہوائے بخت
۶۱۷	۱۸	رہ لئی نھی	رہ گئی تھی	۸۶۲	۱۳	خضرت	خاطر حضرت
۷۲۹	۲	کے	کا	۸۷۱	۶	دا سبنے	دبانے
۷۶۴	۱۹	سے	سبے				

تمت

قطعات تاریخ نوشتہ جناب مولوی حکیم لطیف احمد صاحب رئیس تتھلی ضلع سارن

(۱) دہلی کی سلطنت کی جناب بشیر نے
لاریب خوب لکھی ہو تاریخ سبے عدیل
تاریخ اس کے لکھنے کی تو نے بھی اے لطیف
کیانی البدیہہ لکھی ہو "تاریخ بے عدیل"

(۲) جو دہلی کی "تاریخ صحت کے ساتھ
بہت اچھی صاف اور ستھری چھپی"
تو یہ بول اُٹھی اُس کی خوبی لطیف
کہ "دیکھا خوب تاریخ دہلی چھپی"

۱۹۱۹ ع

قطعہ تاریخ نوشتۂ جناب مولوی سید علی احسن صاحب احسن مارہروی

بشیر احمد نامی و نامور — کہ ہیں وہ رئیسِ خوش اوقاتِ دہلی
بہت معتقد ہیں بہت مفتخر ہیں — نہ کیوں کر ہوں اُن پر مباہاتِ دہلی
کرے کیوں نہ کسبِ ضیا ذرہ ذرہ — وہ ہیں آفتابِ کمالاتِ دہلی
تصانیف و تالیف ہے شغل اُن کا — شب و روز کرتے ہیں خدماتِ دہلی
یہ تالیفِ تازہ جو اب چھپ رہی ہے — مفصل ہیں اس میں حکایاتِ دہلی
ہنوز اس میں آباد جب سے ہوئے ہیں — جبھی سے ہیں آثار و آیاتِ دہلی
اُسی عہدِ ماضی سے تا عصرِ حاضر — قلم بند کیں سب روایاتِ دہلی
کیے منسلک جا بجا اس میں نقشے — کھلا جن سے حالِ عماراتِ دہلی
جدا اہلِ محفل سے مجمل ہو کیوں کر — بہم ہیں مکین و مکاناتِ دہلی
نہ چھوڑی ضروری کوئی بات اس میں — یہاں تک کہ ذکرِ مضافاتِ دہلی
ہوئے اگلے پچھلے سب احوال روشن — حقیقت نما ہے یہ مرآتِ دہلی

کہی واقعی ہم نے تاریخ احسنؔ
صراحت سے لکھے یہ حالاتِ دہلی

۱۳ ھ ۳۸

ولہ

شہرت ہوئی اب و جد یعنی بشیر احمد — مشہور ہیں یہ بے حد مانندِ تیرو دہلی
دہلی کا حال لکھ کر اُن کے کھلے ہیں جوہر — منسوخ کی سراسر تاریخ تھی جو پہلی
تھا وہ محل جو پہلا گر کر بنا وہ محلا — دل سب کا جس سے بہلا خاطر ہوئی تسلی
اللہ رے لیاقت کیا طبع میں ہے جودت — ہر صفحے میں عبارت پھرتی ہے اپنی کھلی
ہر بات کے علاوہ لشکر کا سن کے دعاوا — کھایا فلک نے کاوا ساری زمیں بھی ہلی
مدت سے تھا تقاضا آیا ہے خط یہ تازہ — مجھ سے دل تو دو اتاریخ ہو جو کہہ لی

سن کر یہ حکم والا احسن بتاؤ سننے والا ہے
یہ مادہ نکالا۔ دلکش ہے ذکرِ دہلی

۱۳ ھ ۳۸

فہرست و غلط نامہ تمام شد

فہرست فرماں روایان دار الملک اندرپت و دہلی از ابتدائے راجہ جدھشٹر تا غایت سنہ ۱۳۲۷ھ

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	سنہ جلوس قبل مسیح	دارالسلطنت	مدت سلطنت	حالات
(۱)	راجہ جدھشٹر	راجہ پانڈو	۱۴۵۰	ہستناپور	۳۶ سال	بعد وفات کرشن اوتار کے راجہ
(۲)	راجہ پریچھت	ابھیمن بن ارجن بن راجہ پانڈو	۱۴۱۴	؍؍	۳۲	جدھشٹر نے ریاست چھوڑ کر کوہ ہمانچل پر اپنے آپ کو برف
(۳)	راجہ جنمیجہ	راجہ پریچھت	۱۳۸۲	؍؍	۳۴	میں ڈال کر گلا دیا۔ راجہ جدھشٹر
(۴)	راجہ شتانیک عرف راجہ اشمید	راجہ جنمیجہ	۱۳۴۸	؍؍	۳۳	کی اجازت سے مسند پر بیٹھا اور سانپ کے کاٹنے سے مر گیا
(۵)	راجہ سہسرانیک عرف راجہ ادھمن	راجہ اشمید	۱۳۱۵	؍؍	۳۲	
(۶)	اشومی دیج عرف راجہ مہاد جی	راجہ ادھمن	۱۲۸۳	؍؍	۳۶	
(۷)	اسین کرشن	راجہ مہاد جی	۱۲۴۷	؍؍	۳۵	
(۸)	نمی عرف راجہ دشٹ دان	اسین کرشن	۱۲۱۲	اول ہستناپور بعدہ کنار کوشکی ندی بعدہ اندرپت	۳۵	گنگا کے چڑھاؤ سے ہستناپور بہہ گیا اس سبب سے اس راجہ نے پہلے دکن میں کوشکی ندی کے کنارے شہر
(۹)	راجہ چکر عرف اوگرسین	دشٹ دان	۱۱۷۷	اندرپت	۳۶	بسانا چاہا اور پھر اندرپت میں چلا آیا۔
(۱۰)	راجہ چترتھ عرف سورسین	اوگرسین	۱۱۴۱	؍؍	۳۶	
(۱۱)	راجہ کیرتھ	راجہ سورسین	۱۱۰۵	؍؍	۳۲	
(۱۲)	بشنت مان عرف رسمی	راجہ کیرتھ	۱۰۷۳	؍؍	۳۱	
(۱۳)	سورسین عرف راجہ بیچل	راجہ رسمی	۱۰۴۲	؍؍	۲۷	

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	سنہ جلوس قبل مسیح	دارالسلطنت	تعداد سال حکومت	حالات
(۱۴)	راجہ سونتھ عرف سکھپال	راجہ برپھل	۱۰۱۵	اندرپت	۲۸	
(۱۵)	راجہ دیپک شو عرف نرہردیو	راجہ سکھپال	۹۸۷	"	۲۳	
(۱۶)	سکھی نل عرف سورج رتھ	راجہ نرہردیو	۹۶۴	"	۱۰	
(۱۷)	پرتیو عرف راجہ بھوپت	سورج رتھ	۹۲۶	"	۲۶	
(۱۸)	راجی سوتی	راجہ بھوپت	۹۲۰	"	۲۵	اس راجہ نے سونی پت شہر بسایا
(۱۹)	راجہ میدھاوی	راجہ سوتی	۸۹۵	"	۲۳	اسی راجہ کا نام دہاوا بھی ہم
(۲۰)	راجہ نرپانجی عرف شرون چتر	راجہ میدھاوی	۸۷۲	"	۲۵	جانتے ہیں جس کی بنائی ہوئی لوہے کی لاٹھ ہے۔
(۲۱)	راجہ ڈوربھ عرف بھیکم	راجہ شرون چتر	۸۴۷	"	۱۹	
(۲۲)	راجہ تتی عرف بدارتھ	راجہ بھیکم	۸۲۸	"	۲۱	
(۲۳)	برہدرتھ عرف راجہ وسوان	راجہ بدارتھ	۸۰۷	"	۲۰	
(۲۴)	راجہ سوداس عرف اودنے پال	راجہ وسوان	۷۸۷	"	۲۰	
(۲۵)	پشتانیک عرف ابھیدھر	راجہ اودنی پال	۷۶۷	"	۲۳	
(۲۶)	راجہ دردمن عرف ڈنڈپان	راجہ ابھیدھر	۷۴۴	"	۱۸	
(۲۷)	راجہ بہی ترعرف وربل رائے	راجہ ڈنڈپان	۷۲۶	"	۱۹	

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	تخمینہ سال عیسوی	دارالسلطنت	تخمینہ مدت سلطنت	حالات
(۲۸)	ڈونڈ پانی عرف دخت پال	راجہ دربل رائے	۷۰۷	اندرپت	۱۶	اسی راجہ نے پانی پت شہر بسایا ہے۔
(۲۹)	راجہ مٹی عرف راجہ کھیم پال	راجہ دشت پال	۶۹۱	〃	۲۶	
(۳۰)	راجہ کشی مک عرف کھمین	راجہ کھیم پال	۶۶۵	〃	۳۲	اوپر کے راجاؤں نے (۷۰۹) سال حکومت کی پھر بسراوا وزیر اس راجہ کو مار کر خود گدی پر بیٹھ گیا
(۳۱)	راجہ بسراوہ	+	۶۴۳	〃	۷	
(۳۲)	راجہ سورج سین	راجہ بسراوہ	۶۳۶	〃	۱۹	
(۳۳)	راجہ بیرساہ	راجہ سورج سین	۶۱۷	〃	۲۴	
(۳۴)	راجہ انیک ساہ عرف رب سین	راجہ بیرساہ	۵۹۳	〃	۲۲	
(۳۵)	راجہ ہرجیت عرف پتر سال	راجہ انیک ساہ	۵۷۱	〃	۱۶	
(۳۶)	راجہ دربھ	راجہ ہرجیت	۵۵۵	〃	۲۰	
(۳۷)	راجہ سدھی پال	راجہ دربھ	۵۳۵	〃	۱۳	
(۳۸)	راجہ برست	راجہ سدھی پال	۵۲۲	〃	۱۹	
(۳۹)	راجہ سنجی	راجہ برست	۵۰۳	〃	۱۶	
(۴۰)	راجہ امرچودھ	راجہ سنجی	۴۸۷	〃	۱۳	
(۴۱)	راجہ امین پال	راجہ امرچودھ	۴۷۴	〃	۱۲	
(۴۲)	راجہ سروہے	راجہ امین پال	۴۶۲	〃	۲۲	
(۴۳)	راجہ پدارتھ	راجہ سروہے	۴۴۰	〃	۱۲	
(۴۴)	راجہ بدھل	راجہ پدارتھ	۴۲۸	〃	۱۵	اس خاندان نے (۲۴۳) برس حکومت کی جب کہ
(۴۵)	راجہ بیرباہ	+	۴۱۳	〃	۱۷	بعد بیرباہ وزیر اس راجہ کو مار کر خود گدی پر بیٹھا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	سال تخت نشینی قبل مسیح	دار السلطنت	مدت حکومت	حالات
(۴۶)	راجہ مہراسنگھ	راجہ بیرباہ	۳۹۶	اندرپت	۱۴	
(۴۷)	راجہ ششترکن	مہراسنگھ	۳۸۲	〃	۱۱	
(۴۸)	راجہ جیپیت عرف دھنپت	راجہ ششترکن	۳۷۱	〃	۱۲	
(۴۹)	راجہ مہابل	راجہ جیپیت	۳۵۹	〃	۱۹	
(۵۰)	راجہ سروپ دت	راجہ مہابل	۳۴۰	〃	۱۴	شاید اس راجہ کے وقت میں راجہ دہلو والی قنوج کے نام سے اندرپت میں شہر بسا۔
(۵۱)	راجہ مترسین	راجہ سروپ دت	۳۲۶	دہلی	۱۲	
(۵۲)	راجہ سکھوان	راجہ مترسین	۳۱۴	〃	۸	
(۵۳)	راجہ جیت مل	راجہ سکھوان	۳۰۶	〃	۱۴	
(۵۴)	راجہ پال سنگھ	راجہ جیت مل	۲۹۲	〃	۱۹	
(۵۵)	راجہ کلمتی	راجہ پال سنگھ	۲۷۳	〃	۱۹	
(۵۶)	راجہ ششترمرون	راجہ کلمتی	۲۵۴	〃	۶	
(۵۷)	راجہ جیون جات	راجہ ششترمرون	۲۴۸	〃	۱۳	
(۵۸)	راجہ پرچھت	راجہ جیون جات	۲۳۵	〃	۸	
(۵۹)	راجہ بیرسین	راجہ پرچھت	۲۲۷	〃	۱۷	
(۶۰)	راجہ اودیت	راجہ بیرسین	۲۱۰	〃	۱۳	اس خاندان نے (۲۱۶) سال حکومت کی۔ جس کے بعد دھرنی دھر وزیر اس راجہ کو مار کر خود گدی پر بیٹھ گیا۔
(۶۱)	راجہ دھرنی دھر	✗	۱۹۷	〃	۱۹	
(۶۲)	راجہ سین دھج	راجہ دھرنی دھر	۱۷۸	〃	۲۵	
(۶۳)	راجہ مہی کنگ	راجہ سین دھج	۱۵۳	〃	۱۹	
(۶۴)	راجہ مہاجودھ	راجہ مہی کنگ	۱۳۴	〃	۲۲	
(۶۵)	راجہ بیرنابھ	راجہ مہاجودھ	۱۱۲	〃	۱۳	
(۶۶)	راجہ جیون راج	راجہ بیرنابھ	۹۹	〃	۲۱	
(۶۷)	راجہ اودی سین	راجہ جیون راج	۷۸	〃	۱۷	

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	[illegible]	دار السلطنت	مدت سلطنت	حالات
(۶۸)	راجہ انند جگ	راجہ اودے سین	۶۱	دہلی	۲۵	
(۶۹)	راجہ راج پال	راجہ انند جگ	۳۶	//	[illegible]	اس خاندان نے (۱۷۳) سال حکومت کی جس کے بعد راجہ بھگونت کماؤں کے راجہ نے دلی کو فتح کیا۔
(۷۰)	راجہ بھگونت گوہی	x	۲۴	//	۱۳	بکرماجیت کی لڑائی میں مارا گیا۔
(۷۱)	راجہ بکرماجیت والی اُجین	راجہ گندھرپ سین	۱۱ سمت (۴۴) بکرماجیت	اُجین	۹۳	جب کہ یہ راجہ سالباہن کی لڑائی میں مارا گیا دلی میں سمندرپال جوگی مسند پر بیٹھا۔
(۷۲)	راجہ سمندرپال جوگی	x	۱۳۵ سمت بکرماجیت ۷۸ء	دہلی	۲۴	
(۷۳)	راجہ چندرپال	راجہ سمندرپال	سمت ۱۵۹ ۱۰۲ء	//	[illegible]	
(۷۴)	راجہ نیپال	راجہ چندرپال	سمت ۱۸۶ ۱۲۹ء	//	۲۱	
(۷۵)	راجہ دیسپال	راجہ نیپال	سمت ۲۰۷ ۱۵۰ء	//	۱۴	
(۷۶)	راجہ سکھپال	راجہ دیسپال	سمت ۲۲۱ ۱۶۴ء	//	۱۹	
(۷۷)	راجہ گوبندپال	راجہ سکھپال	سمت ۲۴۰ ۱۸۳ء	//	۲۸	
(۷۸)	راجہ لکھپال	راجہ گوبندپال	سمت ۲۵۸ ۲۰۱ء	//	۲۲	
(۷۹)	راجہ ہرچندپال	راجہ لکھپال	سمت ۲۸۰ ۲۲۳	//	۱۳	
(۸۰)	راجہ مہیپال	راجہ ہرچندپال	سمت ۲۹۳ ۲۳۶ء	//	۱۵	
(۸۱)	راجہ ہرپال	راجہ مہیپال	سمت ۳۰۸ ۲۵۱ء	//	۱۴	
(۸۲)	راجہ مدن پال	راجہ ہرپال	سمت ۳۲۲ ۲۶۵ء	//	۱۸	
(۸۳)	راجہ کرم پال	راجہ مدن پال	سمت ۳۴۰ ۲۸۳ء	//	۱۵	
(۸۴)	راجہ بکرم پال یا کھیم پال	راجہ کرم پال	سمت ۳۵۵ ۲۹۸ء	//	۱۲	اس خاندان نے (۲۲۲) سال حکومت کی پھر راجہ تلوک چند بہیراچ کے راجہ نے دلی کو فتح پائی۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	تخت نشینی سمبت / عیسوی	دارالسلطنت	مدت سلطنت	حالات
(۸۵)	راجہ ملوک چند	×	سمبت ۳۶۷ / ۳۱۰ء	دہلی	۲	
(۸۶)	راجہ بکرم چند	راجہ ملوک چند	سمبت ۳۶۹ / ۳۱۲ء	"	۱۳	
(۸۷)	راجہ کان چند	راجہ بکرم چند	سمبت ۳۸۲ / ۳۲۵ء	"	۱	
(۸۸)	راجہ رام چندر	راجہ کان چند	سمبت ۳۹۳ / ۳۳۶ء	"	۱۱	
(۸۹)	راجہ دھیر چند	راجہ رام چند	سمبت ۳۹۴ / ۳۳۷ء	"	۱۵	
(۹۰)	راجہ کلیان چند	راجہ دھیر چند	سمبت ۴۰۹ / ۳۵۲ء	"	۱۶	
(۹۱)	راجہ بھیم چند	راجہ کلیان چند	سمبت ۴۲۵ / ۳۶۸ء	"	۱۲	
(۹۲)	راجہ ہر چند	راجہ بھیم چند	سمبت ۴۳۷ / ۳۸۰ء	"	۱	
(۹۳)	راجہ گوبند چند	راجہ ہر چند	سمبت ۴۳۸ / ۳۸۱ء	"	۱۳	
(۹۴)	رانی پیم دیوی	راجہ گوبند چند	سمبت [illegible]	"	۱	اس خاندان نے (۸۵) سال
(۹۵)	راجہ ہر پریم	×	سمبت ۴۵۲ / ۳۹۵ء	"	۸	حکومت کی۔ جب رانی مری
(۹۶)	راجہ گوبند پریم	راجہ ہر پریم	سمبت ۴۶[illegible] / ۴۰[illegible]ء	"	۳۰	تو لوگوں نے مل کر ہر پریم
(۹۷)	راجہ گوپال پریم	راجہ گوبند پریم	سمبت ۴۸۰ / ۴۲۳ء	"	۱۶	فقیر کو گدی پر بٹھا دیا۔
(۹۸)	راجہ مہا پاتر	راجہ گوپال پریم	سمبت ۴۹۶ / ۴۳۹ء	"	۷	اس خاندان نے (۵۱)
(۹۹)	راجہ دہی سین	×	سمبت ۵۰۳ / ۴۴۶ء	"	۱۸	سال حکومت کی آخر کار راجہ
(۱۰۰)	راجہ بلاول سین	راجہ دہی سین	سمبت ۵۲۱ / ۴۶۴ء	"	۱۲	ریاست چھوڑ کر فقیر ہو گیا
(۱۰۱)	راجہ کنور سین	راجہ بلاول سین	سمبت ۵۳۳ / ۴۷۶ء	"	۱۵	یہ خبر سن کر راجہ دہی سین
(۱۰۲)	راجہ مادھو سین	راجہ کنور سین	سمبت ۵۴۸ / ۴۹۱ء	"	۱۵	بنگالے کے راجہ نے دلی پر
(۱۰۳)	راجہ سور سین	راجہ مادھو سین	سمبت ۵۶۳ / ۵۰۶ء	"	۶	قبضہ کر لیا۔
(۱۰۴)	راجہ بھیم سین	راجہ سور سین	سمبت ۵۶۹ / ۵۱۲ء	"	۵	
(۱۰۵)	راجہ کان سین	راجہ بھیم سین	سمبت ۵۷۴ / ۵۱۷ء	"	۵	
(۱۰۶)	راجہ ہر سین	راجہ کان سین	سمبت ۵۷۹ / ۵۲۲ء	"	۹	
(۱۰۷)	راجہ لکھن سین	راجہ ہر سین	سمبت ۵۸۸ / ۵۳۱ء	"	۲	

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	تخمیناً سال جلوس	دارالسلطنت	تخمیناً مدت سلطنت	حالات
(۱۰	راجہ نراین سین	راجہ لکھن سین	سمت ۵۹۰ سنہ ۵۳۳ع	دہلی	۲۷	
(۱۰	راجہ دامودر سین	راجہ نراین سین	سمت ۶۱۷ سنہ ۵۶۰ع	؍؍	۱۱	بارہ آدمیوں نے ایک سو چھبیس برس
(۱	راجہ دیپ سنگھ کوہی	×	سمت ۶۲۱ سنہ ۵۷۱ع	؍؍	۱۷	حکومت کرکے اخیر کو ارکان
(۱	راجہ رن سنگھ	راجہ دیپ سنگھ	سمت ۶۴۵ سنہ ۵۸۱ع	؍؍	۱۴	ریاست نے راجہ دیپ سنگھ
(۱	راجہ راج سنگھ	راجہ رن سنگھ	سمت ۶۵۹ سنہ ۶۰۲ع	؍؍	۹	کو تربتاں ... جو سے
(۱۱	راجہ فقیر سنگھ	راجہ راج سنگھ	سمت ۶۶۸ سنہ ۶۱۱ع	؍؍	۴۵	سازش کرکے دلی میں بلالیا۔
(۱۱	راجہ ہر سنگھ	راجہ شیر سنگھ	سمت ۷۱۳ سنہ ۶۵۶ع ۳۷ھ	؍؍	۱۳	
(۱۱	راجہ جیون سنگھ	راجہ ہر سنگھ	سمت ۷۲۶ سنہ ۶۶۹ع ۵۰ھ	؍؍	۷	چھ آدمیوں نے ایک سو پانچ برس حکومت کرکے اخیر کو انیک پال
(۱۱	راجہ انیک پال تنور	راجہ اوگر سین	سمت ۷۳۳ سنہ ۶۷۶ع ۵۷ھ	؍؍	۱۸	تنور نے دلی پر فتح پائی۔
(۱۱	راجہ باسدیو	راجہ انیک پال	سمت ۷۵۱ سنہ ۶۹۴ع ۷۵ھ	؍؍	۱۹ سال ایک ماہ ۸ یوم	
(۱۱	راجہ کنک پال	راجہ باسدیو	سمت ۷۷۰ سنہ ۷۱۳ع ۹۵ھ	؍؍	۲۱ سال تین ماہ ۲۸ یوم	
(۱۱۹	راجہ پرتھی پال	راجہ کنک پال	سمت ۷۹۲ سنہ ۷۳۵ع ۱۱۷ھ	؍؍	۱۹ سال چھ ماہ ۹ یوم	
(۱۲	راجہ جی دیو	راجہ پرتھی پال	سمت ۸۱۱ سنہ ۷۵۴ع ۱۳۷ھ	؍؍	۲۱ سال۔ ۷ ماہ ۲۸ یوم	
(۱۲	راجہ ہر پال	جی دیو	سمت ۸۳۲ سنہ ۷۷۵ع ۱۵۹ھ	؍؍	۹-۴-۱۴	
(۱۲	راجہ اودی راج	راجہ ہر پال	سمت ۸۴۶ سنہ ۷۸۹ع ۱۷۴ھ	؍؍	۱۱-۷-۲۶	
(۱۲	راجہ بچھراج	راجہ اودی راج	سمت ۸۷۳ سنہ ۸۱۶ع ۲۰۱ھ	؍؍	۱۲-۲-۲۲	

نام فرماں روا	نام پدر	سنہ	دارالسلطنت	مدت حکومت	حالات
راجہ انگپال	راجہ بھراج	سمت ۸۹۲ / ۸۳۷ء / ۲۲۳ھ	دہلی	۱۶-۳-۲۲	
راجہ رکھپال	راجہ جانگپال	سمت ۹۱۰ / ۸۵۹ء / ۲۴۵ھ	//	۵-۶-۲۱	
راجہ نیک پال	راجہ رکھپال	سمت ۹۳۸ / ۸۸۱ء / ۲۶۸ھ	//	۲۴-۷-۲	
راجہ گوپال	راجہ نیک پال	سمت ۹۴۰ / ۹۰۶ء	//	۱۵-۳-۱۸	
راجہ سلکھن	راجہ گوپال	سمت ۹۵۸ / ۹۰۱ء / ۲۹۶ھ	//	۱۰-۲-۲۵	
راجہ جی پال	راجہ سلکھن	سمت ۹۸۳ / ۹۲۶ء / ۳۱۴ھ	//	۱۳-۴-۱۶	
راجہ کنور پال	راجہ جی پال	سمت ۱۰۰۰ / ۹۴۳ء / ۳۳۲ھ	//	۱۱-۹-۲۹	
راجہ انیک پال	راجہ کنورپال	سمت ۱۰۲۹ / ۹۷۲ء / ۳۶۲ھ	//	۱۸-۶-۲۹	
راجہ بجی پال	راجہ انیک پال	سمت ۱۰۵۹ / ۱۰۰۲ء / ۳۹۳ھ	//	۶-۱-۲۴	
راجہ مہیپال	راجہ بجی پال	سمت ۱۰۸۳ / ۱۰۲۶ء / ۴۱۷ھ	//	۱۳-۲-۲۵	
راجہ اگرپال	راجہ مہیپال	سمت ۱۱۰۸ / ۱۰۵۱ء / ۴۴۳ھ	//	۱۵-۲-۲۱	
راجہ پرتھی راج	راجہ اگرپال	سمت ۱۱۲۹ / ۱۰۷۲ء / ۴۶۵ھ	//	۱۶-۳-۲۲	اس خاندان کے بیس راجاؤں نے
راجہ بیلدیو چوہان	راجہ انیلدیو	سمت ۱۱۵۲ / ۱۰۹۵ء / ۴۸۹ھ	//	۴-۱-۶	۴۱۹ سال ۷ ماہ ۲۸ یوم سلطنت
راجہ امرکنگو	راجہ بیلدیو چوہان	سمت ۱۱۵۸ / ۱۱۰۱ء / ۴۹۹ھ	//	۵-۲-۵	کی۔ آخر کو بیلدیو چوہان نے
راجہ کھرپال	راجہ امرکنگو	سمت ۱۱۶۳ / ۱۱۰۶ء / ۵۰۰ھ	//	۵-۱-۳۰	فتح پائی۔
راجہ سمیر	راجہ کھرپال	سمت ۱۱۸۳ / ۱۱۲۶ء / ۵۲۰ھ	//	۳-۴-۷	
راجہ جاہرا	راجہ سمیر	سمت ۱۱۹۰ / ۱۱۳۳ء / ۵۲۸ھ	//	۸-۴-۴	
راجہ ناگ دیو	راجہ جاہرا	سمت ۱۱۹۵ / ۱۱۳۸ء / ۵۳۳ھ	//	۵-۰-۳	
راجہ پرتھی راج عرف رای پتھورا	راجہ ناگ دیو	سمت ۱۱۹۸ / ۱۱۴۱ء / ۵۳۶ھ	دہلی و اجمیر	۹-۵-۲۹	اس خاندان کے سات راجاؤں

نے (۹۵) برس (۷) ماہ حکومت کی آخر کو رای پتھورا معزالدین محمد سام عرف سلطان شہاب الدین غوری کی لڑائی میں مارا گیا۔ سلطنت مسلمانوں کے گھرانے میں چلی گئی۔ اگرچہ غوری کا بادشاہ غیاث الدین محمد بن سام سلطان شہاب الدین کا بھائی تھا لیکن سلطان شہاب الدین نے ہندوستان کی فتح خود آپ کی تھی اور اس کو بنا تسلط عظیم تھا اس واسطے سلطان شہاب الدین ہی کی فتح کی تاریخ سے دلی کے بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

نمبر	نام فرمان روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دار السلطنت	قمری مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
				خاندان غلامان ترک								
(۱۳۴۳) ۱	شہاب الدین الملقب بہ ابو المظفر سلطان معز الدین	بہاؤ الدین سام	غوری	×	سنہ ۵۸۷ھ ۱۱۹۱ء سمت ۱۲۴۸ بکرماجیت	محل فتح موضع نراین عرف کنار تلاوری آب سرستی	غزنین	۱۵ سال	۳ شعبان سنہ ۶۰۲ھ ۱۲۰۵ء	+	غزنین اپنی مدرسے کے مقبرے میں	لاہور سے غزنین جاتے ہوئے دہمیک مقام میں گکھڑوں نے مار ڈالا اور غور کی سلطنت پر اس کا بھتیجا سلطان محمود بیٹھا جو کہ قطب الدین ایبک سلطان شہاب الدین کی طرف سے ہندوستان کا سپہ سالار تھا اور اسنے بہت قوت بہم پہنچائی تھی اس واسطے سلطان محمود نے ہندوستان کی بادشاہی قطب الدین ایبک کو بخش دی اور خطاب آزادی اور چتر شاہی بھیج دیا اور قطب الدین لاہور تک اسکے استقبال کو گیا
(۱۳۴۴)	سلطان قطب الدین ایبک	غلام سلطان شہاب الدین غوری	ترک	×	روز شنبہ ۱۰ ذی قعدہ سنہ ۶۰۲ھ ۱۲۰۵ء	لاہور	دہلی قلعۂ رائے پتھورا	۴ سال چند ماہ	سنہ ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء	×	لاہور	لاہور میں چوگان بازی میں گھوڑے سے گر کر مر گیا امرا نے اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دار السلطنت	مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۴۵)	آرام شاہ	قطب الدین ایبک	ترک	×	سنہ ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء	لاہور	دہلی	چند ماہ	×	×	×	امیر علی اسمٰعیل سپہ سالار اور امیر داؤد دیلمی نے اس بادشاہ کی حرکتوں سے ناراض ہوکر سلطان شمس الدین التمش کو جو بدایوں کا حاکم تھا دلی میں بلا لیا۔ آرام شاہ سے لڑائی ہوئی جس میں آرام شاہ نے شکست پائی اور سلطان شمس الدین التمش تخت پر بیٹھا۔
(۱۴۶)	سلطان شمس الدین التمش غلام و داماد قطب الدین ایبک	ایلم خاں	ترک	×	سنہ ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء	قصر سفید واقعہ قلعۂ رائے پتھورا	دہلی	۲۶ سال	۲۰ شعبان سنہ ۶۳۵ھ ۱۲۳۵ء		قلعۂ رائے پتھورا عقب مسجد قوت الاسلام	بیمار ہوکر مرگیا۔
(۱۴۷)	رکن الدین فیروز شاہ	شمس الدین التمش	ترک	×	شعبان سنہ ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء	قلعۂ رائے پتھورا	۶ ماہ ۲۸ یوم	سنہ ۶۳۵ھ ۱۲۳۷ء	×		ملک پور	ملک عز الدین حاکم ملتان کے تنبیہ کو پنجاب کی طرف روانہ ہوا اس کے پیچھے امرا نے سلطانہ رضیہ کو تخت پر بٹھایا۔ بادشاہ یہ خبر سن کر دلی پھر آیا اور کیلوکھڑی کے میدان میں لڑائی ہوئی اسی لڑائی میں پکڑا گیا اور قید میں مرگیا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دار السلطنت	قمری مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۴۸)	رضیہ سلطانہ بیگم	شمس الدین التمش	ترک	×	۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء	قلعہ رائے پتھورا	دہلی	۳ سال ۶ ماہ ۶ یوم	۲۵ ربیع الاول ۶۳۸ھ ۱۲۴۰ء	×	شاہ جہان آباد محلہ بلبلی خانہ گرد ترکمان دروازہ	جبکہ ملک التونیہ بھٹنڈے کے حاکم سے لڑائی ہو رہی تھی اُس وقت امرا نے مخالفت کرکے سلطانہ رضیہ کو قلعہ بھٹنڈے میں قید کیا اور معز الدین بہرام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ بعد اُس کے سلطانہ رضیہ نے ملک التونیہ سے نکاح کر لیا اور بہرام شاہ سے دو دفعہ لڑی آخر کو ماری گئی۔
(۱۴۹)	معز الدین بہرام شاہ	"	"	×	شنبہ ۲۸ رمضان ۶۳۷ھ ۱۲۳۹ء	"	"	۱۰-۱-۲	۸ ذی قعد شنبہ ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء	×	ملک پور	نظام الملک مہذب الدین اور امرا نے مخالفت کرکے بادشاہ کو دلی میں محصور کیا اور تین مہینے تک برابر لڑائی رہی آخر کار بادشاہ کو پکڑ کر مار ڈالا اور ملک معز الدین بلبن امیر الامرا تخت پر بیٹھ گیا مگر اور امرا اُس کی بادشاہت پر راضی نہ ہوئے اور علاء الدین کو جو قصر سفید میں قید تھا بادشاہ کیا۔
(۱۵۰)	سلطان علاء الدین مسعود شاہ	رکن الدین فیروز شاہ	"	×	ذی قعد ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء	"	"	۱-۱-۴	۶۴۴ھ ۱۲۴۶ء	×	×	اس بادشاہ کے ظلم سے امرا ناراض ہوئے اور سلطان ناصر الدین کو بھرڑ دیجے سے بلا کر بادشاہ کیا اور ۲۳ محرم ۶۴۴ھ ۱۲۴۶ء کو علاء الدین کو قید کر لیا جو اُسی زمانے میں قید میں مر گیا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دارالسلطنت	مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۵۱)	سلطان ناصرالدین محمود شاہ	شمس الدین التمش	ترک	×	۲۳ ذی الحجہ سنہ ۶۴۳ھ ۱۲۴۵ء	قصر سفید رائے پتھورا	دہلی	۲۰ سال چند ماہ	۱۱ جمادی الاولیٰ سنہ ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء	×	دہلی	بیمار ہو کر مرگیا اور چونکہ کوئی وارث نہ تھا امرا نے الغ خاں کو بادشاہ کر لیا۔
(۱۵۲)	الغ خاں الملقب سلطان غیاث الدین بلبن	غلام شمس الدین التمش	"	سنہ ۶۰۵ھ ۱۲۰۸ء	جمادی الاولیٰ سنہ ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء	"	"	۲۱ سال چند ماہ	سنہ ۶۸۶ھ ۱۲۸۷ء	۸۰ سال	"	بیمار ہو کر مرگیا اور ملک فخرالدین کوتوال اور دارامرا نے آپس میں صلاح کرکے معزالدین کیقباد کو بادشاہ کیا۔
(۱۵۳)	(۱) معزالدین کیقباد (۲) کیومرث الملقب سلطان شمس الدین	ناصرالدین بغراخاں بن غیاث الدین بلبن	"	سنہ ۶۶۷ھ ۱۲۶۸ء	سنہ ۶۸۶ھ ۱۲۸۷ء / محرم سنہ ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء	"	قصر کیلوکھری دہلی	۳ سال چند ماہ	جمادی الثانیہ سنہ ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء	۲۰ سال	×	بادشاہ کو فالج ہو گیا اس سبب سے امرا نے کیومرث اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھایا مگر امرائے خلجی نے مخالفت کی اور کیومرث کو بہادرپور میں پکڑ لے گئے اور بادشاہ کو لاتوں سے مار ڈالا اور ملک جلال الدین خلجی کو تخت پر بٹھایا بارہ آدمیوں نے ترکوں میں سے جو سلاطین غوریہ کے غلاموں میں سے تھے ستّو برس تک بادشاہت کی بعد اس کے سلطنت خاندان خلجیہ میں چلی گئی۔

خاندان خلجیہ

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دار السلطنت	قمری مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۵۴)	جلال الدین فیروز شاہ خلجی	یغرش	خلجی ترک	سنہ ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء	جمادی الثانیہ سنہ ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء	کیلوکھری	دہلی	۶ سال چند ماہ	سنہ ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء	۷۷	×	ملک علاء الدین نے دغا سے بادشاہ کو کڑہ مانک پور میں بلایا اور جب بادشاہ کشتی میں سے اتر رہا تھا اس وقت اس کو تلوار سے مار ڈالا جب یہ خبر دلی میں پہنچی تو ملکہ جہاں بادشاہ کی بی بی نے رکن الدین اپنے چھوٹے بیٹے کو تخت پر بٹھایا۔
(۱۵۵)	رکن الدین ابراہیم شاہ	جلال الدین فیروز شاہ	خلجی	×	رمضان سنہ ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء	کوشک سبز	"	۴ ماہ	×	×	×	سلطان علاء الدین سے لڑکر بھاگ گیا اور سلطان علاء الدین دلی کے تخت پر بیٹھ گیا۔
(۱۵۶)	سلطان علاء الدین	شہاب الدین مسعود	"	×	۲۲ ذی الحجہ سنہ ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء	قلعۂ رائے پتھورا	دہلی قلعۂ سیری	۱۹ سال چند ماہ	شب ششم ماہ شوال سنہ ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ء	×	قلعۂ رائے پتھورا عقب مسجد قوت الاسلام	بیماری سے مرا۔ امرا نے مشورت کرکے شہاب الدین کو تخت پر بٹھایا۔
(۱۵۷)	شہاب الدین عمر	سلطان علاء الدین	"	سنہ ۷۰۹ھ ۱۳۰۹ء	۷ شوال سنہ ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ء	قلعۂ علائی	دہلی	۳ ماہ چند یوم	×	×	×	مبارک خاں نے ایک تدبیر سے ملک نائب مدار المہام سلطنت کو مروا کر آپ نائب سلطنت ہوا اور چند روز بعد بادشاہ کو پکڑ کر اندھا کر دیا اور گوالیار کے قلعے میں قید کیا اور آپ بادشاہ ہوا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دارالسلطنت	مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۵۸)	قطب الدین مبارک شاہ	سلطان علاء الدین	خلجی	×	۱۶ محرم ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء	قلعۂ علائی	دہلی	۵-۱-۲۷	غضب ۵ ربیع الاول ۷۲۱ھ ۱۳۲۱ء	×	×	جاہر بیگ نے بسازش خسرو خاں کے بادشاہ کو قصر ہزار ستون میں مار ڈالا اور خسرو خاں تخت پر بیٹھا۔
(۱۵۹)	حسن خاں الملقب بہ ناصر الدین خسرو خاں	×	بروار	×	ربیع الاول ۷۲۱ھ ۱۳۲۱ء	قلعہ علائی قصر ہزار ستون	″	۴ ماہ چند یوم	آخر ماہ رجب ۷۲۱ھ ۱۳۲۱ء	×	×	غازی الملک تغلق شاہ دیپال پور کے حاکم نے خسرو خاں پر فوج کشی کی اور خسرو خاں حوض علائی کے کنارے سے نکلا اور اندرپت کے میدان میں لڑائی ہوئی جس میں خسرو خاں بھاگ کر تلپت میں چھپا آخر کار پکڑا جا کر مارا گیا اور تغلق شاہ بادشاہ ہوا۔
							خاندان تغلق					
(۱۶۰)	سلطان غیاث الدین تغلق شاہ	ملک تغلق	ترک	×	غرہ شعبان ۷۲۱ھ ۱۳۲۱ء	قلعۂ علائی	دہلی قلعۂ تغلق آباد	۴ سال چند ماہ	ربیع الاول ۷۲۴ھ ۱۳۲۴ء	×	تغلق آباد	الغ خاں اس کے بیٹے نے افغان پور کے قریب ایک محل بنایا تھا اس میں بادشاہ خاصہ تناول کر رہا تھا کہ مکان گر پڑا اور بادشاہ دب کر مر گیا اور اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا۔
(۱۶۱)	سلطان محمد عادل تغلق شاہ	غیاث الدین تغلق شاہ	″	×	ربیع الاول ۷۲۵ھ ۱۳۲۴	تغلق آباد	دہلی پھر دولت آباد پھر دہلی	۲۷	۲۱ محرم ۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء		″	سفر ٹھٹھے میں بیمار ہو کر چودہ کوس دریائے سندھ کے کنارے پر انتقال کیا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دار السلطنت	قمری مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۶۲)	فیروز شاہ غیاث محمد شاہزادہ فتح خاں ناصر الدین محمد شاہ	سالار رجب برادر خورد تغلق شاہ تغلق شاہ فیروز شاہ 〃	ترک	۷۰۹ھ / ۱۳۹۸ء ۷۵۳ھ / ۱۳۵۲ء	۲۳ محرم ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء ۷۶۰ھ / ۱۳۵۹ء ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء	سبھوال	دہلی فیروز آباد	۳۸-۷-۲	۱۳ رمضان ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء	۹۱	حوض خاص	احمد ایاز الملقب بہ خواجہ جہاں نے دہلی میں غیاث الدین محمد کو تخت پر بٹھایا تھا کہ فیروز شاہ نے اُسے مار دیا بعد چند مدت کے فیروز شاہ نے جیتے جی شاہزادہ فتح خاں کو تخت پر بٹھایا اور سکہ و خطبہ اس کے نام پر کر دیا اور اس کے مرنے کے بعد محمد خاں کو ناصر الدین محمد شاہ کا خطاب دیکر تخت نشین کیا مگر امرا نے مخالفت کی اور لڑا کر کوہ سرمور کی طرف بھگا دیا اور تغلق شاہ کو تخت پر بٹھایا اور اسی عرصے میں فیروز شاہ مر گیا اور تغلق شاہ مستقل بادشاہ رہا۔
(۱۶۳)	سلطان غیاث الدین تغلق شاہ ثانی	شاہزادہ فتح خاں	،	×	۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء	فیروز آباد	دہلی	۵ ماہ ۸ یوم	۲۱ صفر ۷۹۱ھ / ۱۳۸۸ء	×	×	ملک رکن الدین وزیر نے اس بادشاہ کو مار ڈالا اور ابوبکر شاہ کو تخت پر بٹھایا۔
(۱۶۴)	ابوبکر شاہ	ظفر خاں بن فیروز شاہ	〃	×	صفر ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء	〃	〃	ایک سال چھ ماہ چند یوم	۲۰ ذی الحجہ ۷۹۲ھ / ۱۳۸۹ء	×	×	امرا کی مخالفت اور ناصر الدین محمد شاہ کے آنے کی خبر سنکر یہ بادشاہ میوات میں چلا گیا اور ناصر الدین محمد شاہ دلی میں آکر تخت پر بیٹھ گیا اور بعد لڑائیوں کے ابوبکر شاہ کو پکڑ کر قلعۂ میرٹھ میں قید کیا جو وہیں مر گیا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	مقام جلوس	دار السلطنت	مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۶۵)	ناصر الدین محمد شاہ	فیروز شاہ	ترک	دوشنبہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۷۵۳ھ ۱۳۵۲ء	۱۹ رمضان ۷۹۲ھ ۱۳۸۹ء	فیروز آباد	دہلی	۳ سال ۶ ماہ چند یوم	۱۷ ربیع الاول ۷۹۶ھ ۱۳۹۳ء	×	حوض خاص	بیمار ہو چالیسر میں مرا ہمایوں خاں سکندر اس کا بیٹا بادشاہ ہوا
(۱۶۶)	علاء الدین سکندر شاہ	ناصر الدین محمد شاہ	″	×	۱۹ ربیع الاول ۷۹۶ھ ۱۳۹۳ء	فیروز آباد	دہلی	یک ماہ چند یوم	ربیع الثانی ۷۹۶ھ ۱۳۹۴ء	×	حوض خاص	بیمار ہو کر مر گیا اس کے بعد پندرہ روز تک امراء میں مشورہ رہا آخر کار محمود شاہ کو تخت پر بٹھایا
(۱۶۷)	ناصر الدین محمود شاہ	ناصر الدین محمد شاہ	″	×	جمادی الاولیٰ ۷۹۶ھ ۱۳۹۳ء	″	″	۱۹ سال ۱ ماہ چند یوم	ذی قعدہ ۸۱۵ھ ۱۴۱۲ء	×	×	
(۱۶۸)	ناصر الدین نصرت شاہ	شاہزادہ فتح خاں بن فیروز شاہ		×	۷۹۷ھ ۱۳۹۴ء / ۸۰۱ھ ۱۳۹۸ء	″	″	×	×	×	×	اس بادشاہ کے زمانہ سلطنت میں نہایت تنزل آ گیا، سعادت خاں نے نصرت شاہ کو فیروز آباد میں تخت پر بٹھا دیا اور پھر اقبال خاں فیروز آباد پر قابض ہو گیا اور کبھی یہ بادشاہ بھاگ گیا اور کبھی پھر آ گیا اور اسی درمیان میں امیر تیمور بھی دہلی میں آیا آخر کو یہ بادشاہ بیمار ہو کر کیتھل سے مراجعت کرتے وقت مر گیا۔ امرا دولت نے دولت خاں کو بادشاہ بنا لیا۔
	اقبال خاں عرف ملو	×	پٹھان	×	۸۰۰ھ ۱۳۹۷ء / ۸۰۲ھ ۱۳۹۹ء	کوشک سیری	″	×	×	×	×	
	امیر تیمور	امیر طراغای	چغتائی	شب شنبہ ۲۵ شعبان ۷۳۶ھ ۱۳۳۵ء	جمادی الاولیٰ ۸۰۱ھ ۱۳۹۸ء	فیروز آباد	سمرقند	۱۵ یوم	شب چہار شنبہ ۱۷ شعبان ۸۰۷ھ ۱۴۰۵ء	(۷۱) سال ۱۱ ماہ ۲۰ یوم	سمرقند	

نمبر	نام فرمانروا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دارالسلطنت	مدت سلطنت قمری	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۶۸)	دولت خاں	×	لودھی	×	محرم ۸۱۶ھ ۱۴۱۳ء	کوشک سیری	دہلی	ایک سال دو ماہ چند یوم	۸۱۷ھ ۱۴۱۴ء	×	×	خضر خاں نے دلی پر فوج کشی کی اور دولت خاں کوشک سیری میں محصور ہوا آخر کار خضر خاں کے پاس چلا آیا اور اس نے فیروزآباد میں قید کیا اور وہیں مر گیا۔
					خاندان سادات							
(۱۶۹)	خضر خاں	ملک سلیمان	سید	×	۱۵ ربیع الاول ۸۱۷ھ ۱۴۱۴ء	کوشک سیری	دہلی	۷-۲-۲	۱۷ جمادی الاولیٰ ۸۲۴ھ ۱۴۲۱ء	×	دہلی	۸۲۴ھ میں بیمار ہو کر دلی میں آیا اور یہیں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔
(۱۷۰)	معزالدین ابوالفتح مبارک شاہ	خضر خاں	سید	×	۱۷ جمادی الاولیٰ ۸۲۴ھ ۱۴۲۱ء	″	دہلی	۱۳ سال ایک ماہ چند یوم	۹ رجب ۸۳۷ھ ۱۴۳۳ء	×	دہلی مبارک پور کوٹلہ	قلعۂ مبارک آباد میں جو اس بادشاہ نے دریائے جمنا کے کنارے بنایا تھا میراں صدر اور قاضی عبدالصمد نے اس بادشاہ کو مار ڈالا اور سرور الملک وزیر کو خبر کی اس نے صلاح کر کے محمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔
(۱۷۱)	سلطان محمد شاہ	فرید خاں بن خضر خاں	سید	×	۹ رجب ۸۳۷ھ ۱۴۳۳ء	″	دہلی	۱۲ سال چند ماہ	۸۴۹ھ ۱۴۴۵ء	×	متصل مقبرہ صفدر جنگ مسمّٰی موضع خیر پور	بیماری سے مرا اور باپ کی جگہ بیٹا جانشین ہوا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	مقام جلوس	دارالسلطنت	مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۷۲)	سلطان علاء الدین عالم شاہ	محمد شاہ	سید	×	سنہ ۸۴۹ھ ۱۴۴۵ء	کوشک سیری	دہلی	چھ سال چند ماہ	سنہ ۸۸۳ھ ۱۴۷۸ء	×	×	بادشاہ بدایوں میں جا پڑا اور ملک بہلول لودی دلی پر قابض ہو کر تخت نشین ہوا۔
						خاندان لودی						
(۱۷۳)	سلطان بہلول لودی	ملک کالا	لودی	×	۱۷ ربیع الاول سنہ ۸۵۵ھ ۱۴۵۱ء	"	دہلی	۳۸-۸-۷	سنہ ۸۹۴ھ ۱۴۸۸ء	×	دہلی متصل درگاہ چراغ دہلی	بیماری سے مرا اور خان خاناں اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھایا۔
(۱۷۴)	سلطان سکندر	سلطان بہلول	لودی	×	سنہ ۸۹۴ھ ۱۴۸۸ء	قصبہ جلالی	دہلی بعدہ آگرہ	۲۸ سال ۵ ماہ	یکشنبہ ذی قعدہ سنہ ۹۲۳ھ ۱۵۱۷ء	×	دہلی	اس بادشاہ کے عہد میں ہندوؤں نے فارسی لکھنا اور پڑھنا شروع کیا اس سے پہلے کوئی نہ پڑھتا تھا یہ بادشاہ بیماری سے مرا۔
(۱۷۵)	سلطان ابراہیم	سلطان سکندر	لودی	×	ذی قعدہ سنہ ۹۲۳ھ ۱۵۱۷ء	آگرہ	آگرہ	۸ سال چند ماہ	۸ رجب سنہ ۹۳۲ھ ۱۵۲۵ء	×	پانی پت	پانی پت کے میدان میں بادشاہ کی لڑائی میں مارا گیا اور مغلوں کے خاندان میں بادشاہت چلی گئی۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دارالسلطنت	قمری مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
					خاندان مغلیہ							
(۱۷۶)	ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ	عمر شیخ میرزا	چغتائی	سنہ ۸۸۸ھ ۱۴۸۳ء	رجب سنہ ۹۳۲ھ ۱۵۲۵ء	دہلی	آگرہ	۴ سال دس ماہ چند یوم	دوشنبہ ۶ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء	۴۹ سال چند ماہ	کابل	بیمار ہو کر مرا۔
(۱۷۷)	نصیر الدین ہمایوں بادشاہ (مرتبہ اول)	بابر بادشاہ	"	شب شنبہ ذی قعدہ سنہ ۹۱۳ھ ۱۵۰۷ء	جمادی الاولیٰ سنہ ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء	آگرہ	آگرہ بعد دہلی	۱۱ سال	سال معزولی سنہ ۹۴۷ھ ۱۵۴۰ء	×	×	شیر شاہ کی لڑائی میں سنہ ۹۴۷ھ ۱۵۴۰ء میں شکست کھا کر بادشاہ ایران چلا گیا۔
					خاندان سور							
(۱۷۸)	فرید خاں الملقب بہ شیر شاہ	حسن	سور پٹھان	رجب سنہ [illegible]ھ ۱۴۷۲ء	سنہ ۹۴۷ھ ۱۵۴۰ء	آگرہ	دہلی	۱۵-۴-۴	۱۲ ربیع الاول سنہ ۹۵۲ھ ۱۵۴۵ء	۷۳ سال ۸ ماہ چند یوم		سہسرام کالنجر کے قلعے کی لڑائی میں بارود سے جل کر مرا۔
(۱۷۹)	جلال شاہ الملقب بہ اسلام شاہ	شیر شاہ	"	صفر سنہ ۹۰۲ھ ۱۴۹۶ء	۱۵ ربیع الاول سنہ ۹۵۲ھ ۱۵۴۵ء	قلعہ کالنجر	"	۸-۲-۱۰	۲۵ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۶۰ھ ۱۵۵۲ء	۵۸ سال ۳ ماہ چند یوم	×	بیماری سے مرا اور فیروز خاں تخت پر بیٹھا۔

نمبر	نام فرمانروا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دار السلطنت	مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	
(۱۸۰)	فیروز شاہ	اسلام شاہ	سور پٹھان	ربیع الثانی سنہ ۹۴۸ھ ۱۵۴۰ء	۲۶ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۶۰ھ ۱۵۵۲ء	دہلی	دہلی	۳ یوم	۲۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۶۰ھ ۱۵۵۲ء	۱۲ سال چند یوم		مبارز خاں اس کے ماموں نے مار ڈالا اور آپ تخت پر بیٹھا۔
(۱۸۱)	مبارز خاں الملقب بہ محمد عادل شاہ	نظام خاں	؍؍	شعبان سنہ ۹۱۱ھ ۱۵۰۵ء	۲۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۶۰ھ ۱۵۵۲ء	؍؍	؍؍	۱-۱۱-۷	×	×	×	ابراہیم خاں بنی عم شیر شاہ سے شکست پائی۔
(۱۸۲)	سلطان ابراہیم	×	؍؍	سنہ ۹۰۳ھ ۱۴۹۷ء	۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۹۶۲ھ ۱۵۵۴ء	؍؍	؍؍	دو ماہ ۳ یوم	×	ـ	×	احمد خاں بنی عم شیر شاہ سے لڑکر شکست پائی۔
(۱۸۳)	احمد خاں الملقب بہ سکندر شاہ	حسین خان	؍؍	ربیع الاول سنہ ۹۱۱ھ ۱۵۰۵ء	۹ رجب سنہ ۹۶۲ھ ۱۵۵۴ء	فرح	دہلی	دو ماہ	×	×	×	ہمایوں بادشاہ سے شکست کھاکر ٹھٹھے کی طرف بھاگ گیا۔
							خاندان مغلیہ					
(۱۸۴)	نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ دوبارہ دوم	بابر بادشاہ	چغتائی	شب شنبہ ۴ ذی قعدہ سنہ ۹۱۳ھ ۱۵۰۷ء	رمضان سنہ ۹۶۲ھ ۱۵۵۵ء	دہلی	؍؍	۶ ماہ چند یوم	۱۱ ربیع الاول سنہ ۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء	۴۹-۳-۲۶	دہلی مقبرہ ہمایوں	شیر منڈل از قوفعلہ کنہ سے اترتے وقت گر پڑا اور کئی دن بعد انتقال کیا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دار السلطنت	مدت سلطنت قمری	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۸۵)	ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ	ہمایوں بادشاہ	چغتائی	شب یکشنبہ ۵ رجب ۹۴۹ھ ۱۵۴۲ء	ربیع الثانی ۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء	کلانور	آگرہ	۵۱-۲-۱۱	چہار شنبہ ۱۳ ربیع الثانی ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء	۹-۱۱-۶۲	اکبر آباد یعنی آگرہ بہشت آباد معروف بہ سکندرہ	بیماری سے وفات پائی۔
(۱۸۶)	ابو المظفر نور الدین جہانگیر بادشاہ	اکبر بادشاہ	″	روز چہار شنبہ ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ ۱۵۶۹ء	روز پنجشنبہ ۱۰ ربیع الاول ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء	آگرہ	آگرہ	۲۱-۸-۳۰	۲۷ صفر ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء	۱۰-۱۱-۵۸	لاہور	بیماری سے وفات پائی۔ امرا نے بہ مصلحت داور بخش کو بادشاہ کر دیا اور خفیہ شاہ جہاں کو بلایا
(۱۸۷)	مرزا بلاقی الملقب بہ سلطان داور بخش	شاہزادہ سلطان خسرو بن جہانگیر	″	ذی قعد ۱۰۱۰ھ ۱۶۰۱ء	ربیع الاول ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء	راج پوری	آگرہ	دو ماہ چند یوم	۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء	۲۶	×	جب کہ شاہ جہاں لاہور میں پہنچا آصف خان نے اس بیچارے کو مار ڈالا اور شاہ جہاں کو تخت پر بٹھایا
(۱۸۸)	شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ	جہانگیر بادشاہ	″	شب پنجشنبہ یکم ربیع الاول ۱۰۰۰ھ ۱۵۹۱ء	روز یکشنبہ ۲۳ جمادی الثانی ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء	لاہور	آگرہ بعدہ شاہ جہاں آباد	۳۲ سال چند ماہ	شب دوشنبہ ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۶ء	۷۶-۴-۲۶	تاج گنج آگرہ	عالم گیر نے ۱۰۶۸ھ میں قید کر کے خود تخت پر بیٹھا اور شاہ جہاں نے نویں سال جلوس عالم گیری میں انتقال کیا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دارالسلطنت	عمری مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۸۹)	ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ	شاہ جہاں	چغتائی	شب یک شنبہ ۱۱ ذی قعدہ سنہ ۱۰۲۸ھ ۱۶۱۸ء	جمعہ یکم ذی قعدہ سنہ ۱۰۶۸ھ ۱۶۵۹ء	اعزآباد متصل سرہند	دہلی	(۵۰) سال ۲۷ یوم	جمعہ ۲۸ ذی قعدہ سنہ ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۷ء	۹۰ سال ۱۷ یوم	اورنگ آباد دکن	بیمار ہو کر انتقال کیا۔ محمد معظم منعم خاں کی سعی سے دکن میں آپ کے تخت پر بیٹھا اور اپنے بھائیوں سے لڑ کر فتح یاب ہوا۔
(۱۹۰)	محمد معظم الملقب بہ شاہ عالم بہادر شاہ محمد اعظم شاہ	اورنگ زیب عالم گیر ″	″ ×	سلخ رجب سنہ ۱۰۵۳ھ ۱۶۴۳ء +	غرہ ذی حجہ سنہ ۱۱۱۸ھ ۱۷۰۷ء سنہ ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۸ء	لاہور احمد نگر	دہلی ×	۵-۱-۲۱ ×	۲۱ محرم سنہ ۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء سنہ ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۸ء	(۷۰) سال چھ ماہ ×	قطب صاحب دہلی مقبرہ ہمایوں دہلی	بہ مقام موضع جاجو صوبہ اکبرآباد اپنے بھائی سے لڑ کر فتح پائی۔ آخر کو آپ بھی بیمار ہو کر مر گیا اور اس کے بیٹوں میں بادشاہت پر لڑائی ہوئی اور معزالدین جہاں دار شاہ سب پر غالب آیا۔
(۱۹۱)	معزالدین جہاں دار شاہ عظیم الشان رفیع الشان خجستہ اختر جہاں شاہ	شاہ عالم بہادر شاہ	″	۱۰ رمضان سنہ ۱۰۷۲ھ ۱۶۶۱ء	سنہ ۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء	شاہجہاں آباد و بعد فتح لاہور و بنگالہ شاہجہاں آباد ″	دہلی	۱۱ ماہ ۵ یوم	جمعہ ۸ محرم سنہ ۱۱۲۵ھ ۱۷۱۳ء	۲۶-۳-۵۱	دہلی فرش چبوترہ مقبرہ ہمایوں	فرخ سیر سے لڑ کر پکڑا گیا اور قلعہ دہلی میں مارا گیا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دار السلطنت	قمری مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۹۲)	جلال الدین فرخ سیر	عظیم الشان بن بہادر شاہ	چغتائی	پنجشنبہ ۸ رجب ۱۰۹۵ھ ۱۶۸۳ء	۲۴ ۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء وجلوس ثانی ۱۱۲۵ھ ۱۷۱۳ء	آگرہ بعدہ شاہجہان آباد	دہلی	۶-۳-۱۵	۸ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء	۳۵-۰-۲۰	دہلی صحن مقبرہ ہمایوں	عبد اللہ خاں اور حسین علی خاں نے زہر دے کر مار ڈالا۔
(۱۹۳)	محمد ابو البرکات سلطان رفیع الدرجات	رفیع الشان بن بہادر شاہ	"	۷ جمادی الثانیہ ۱۱۱۱ھ ۱۶۹۹ء	۹ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء	شاہجہان آباد	"	۳ ماہ ۱۱ یوم	شنبہ ۸ رجب ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء	۱۸-۹-۱۲	"	بیماری سے مرا۔ عبد اللہ خاں اور حسین علی خاں نے رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھایا اور اکبر آباد میں ہزاری متر سین نے نیکو سیر کو تخت پر بٹھا دیا مگر نیکو سیر پکڑا گیا۔
(۱۹۴)	شمس الدین رفیع الدولہ شاہ جہاں بادشاہ ثانی سلطان نیکو سیر	رفیع الشان بن بہادر شاہ ×	" +	۵ صفر ۱۱۱۳ھ ۱۷۰۱ء ×	۲۰ رجب ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء +	شاہجہان آباد آگرہ	" ×	۳ ماہ ۲۸ یوم ×	۱۷ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء +	۱۸-۹-۱۲	دہلی مقبرہ ہمایوں	بیماری سے مرا۔ عبد اللہ خاں اور حسین علی خاں نے محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا لیکن جب حسین علی خاں کو بادشاہ نے مروا ڈالا تو عبد اللہ خاں نے سلطان ابراہیم کو بٹھایا مگر وہ مغلوب ہوا۔
(۱۹۵)	روشن اختر ابو الفتح محمد شاہ بادشاہ سلطان ابراہیم نادر شاہ	خجستہ اختر جہاں شاہ بن بہادر شاہ رفیع الشان بن بہادر شاہ ×	چغتائی ×	۲۴ ربیع الاول ۱۱۱۴ھ ۱۷۰۲ء +	۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء ۱۱۳۲ھ ۱۷۲۰ء ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ ۲۲ مارچ ۱۷۳۹ء	شاہجہان آباد	دہلی ×	۲۹ سال ۸ ماہ +	۲۷ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء ×	۴۷-۱-۱ +	دہلی درگاہ حضرت نظام الدین اولیا +	بیمار ہو کر مرا۔ اس کا بیٹا جانشین ہوا۔

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دار السلطنت	مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۹۶)	مجاہد الدین ابو النصر احمد شاہ بہادر بادشاہ	محمد شاہ	چغتائی	شنبہ ۲۷ر ربیع الثانی سنہ ۱۱۴۰ھ ۱۷۲۷ء	۲ر جمادی الاولیٰ سنہ ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء	پانی پت	دہلی	۸-۳-۶	۲۷ر شوال سنہ ۱۱۸۸ھ ۱۷۷۴ء	۴۸ سال ۲ ماہ	دہلی مقبرۂ ہمایوں	عماد الملک نے پکڑا اور اندھا کر کے قید کر دیا اور اسی حالت میں چند مدت کے بعد بیماری سے مرگیا۔
(۱۹۷)	عزیز الدین عالمگیر ثانی	معز الدین جہاں دار شاہ	〃	سنہ ۱۰۹۹ھ ۱۶۸۷ء	شنبہ ۱۰ر شعبان سنہ ۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء	شاہ جہاں آباد	〃	۲۸-۷-۵	پنجشنبہ ۸ر ربیع الثانی سنہ ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء	۷۴ سال چند ماہ	دہلی مقبرۂ ہمایوں	عماد الملک کے کہنے سے تاج باش خاں اور مہدی قلی خاں نے مار ڈالا اور محی الملۃ کو تخت پر بٹھایا اور شاہ عالم نے بنگالے میں جلوس کیا سلطنت شاہ عالم کی قایم رہی۔
	احمد شاہ درانی	×	×	×	سنہ ۱۱۷۰ھ ۱۷۵۶ء	×	×	×	×	×	×	

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	محل جلوس	دارالسلطنت	قمری مدت سلطنت	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
۱۹۷	ابوالمظفر جلال الدین سلطان عالی گوہر	عالمگیر ثانی	چغتائی	۱۷ ذی قعد سنہ ۱۱۴۰ھ ۱۷۲۷ء	۴ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء دسمبر	پٹنہ عظیم آباد	دہلی	۴۵ سال	۱۷ رمضان سنہ ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء نومبر	۸۰-۹-۲۰	دہلی قطب صاحب	بیدار بخت کو غلام قادر نے تخت پر بٹھایا لیکن بعد مارے جانے غلام قادر خاں کے وہ سلسلہ برہم ہوگیا آخر کار جنرل لیک سپہ سالار انگلشیہ نے دلی فتح کی اور سرکار انگریزی کی عملداری ہونے سے تین برس کے بعد بادشاہ نے انتقال کیا۔ مورخین نے سنہ ۱۷۶۱ء کو سلطنت مغلیہ اور سلطنت برطانیہ کا حد فاصل قرار دیا ہے اور یوں تو سنہ ۱۸۵۷ء تک سلطنت مغلیہ برائے نام رہی لیکن سنہ ۱۷۵۷ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک جو ایک صدی کا زمانہ ہوتا ہے کہنے کو یکے بعد دیگرے برائے نام بادشاہ ہوتے رہے۔ شاہ عالم اکبر ثانی۔ بہادر شاہ ثانی۔ شاہ جہاں ثانی۔ بیدار بخت۔ یہ سب نام کے بادشاہ تھے شاہ عالم سنہ ۱۷۶۵ء سے الٰہ آباد میں برٹش کی طرف سے پنشن پاتے رہے سنہ ۱۸۰۳ء تک ہو کے [illegible] لیکن سنہ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر خاں افغان نے اسے نہایت بے دردی سے اندھا کر ڈالا ستمبر سنہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دلی پر تسلط کیا تب سے پھر انگریزوں کی طرف سے پنشن ملنے لگی اور اس کے بعد اور جو بادشاہ ہوئے وہ بھی برٹش گورنمنٹ کی پنشن خوار رہے۔
	محی الملۃ الملقب بہ شاہ جہاں ثانی	محی السنۃ بن کام بخش بن عالم گیر ثانی	×	×	×	×	×	×	×	×	×	
	احمد شاہ درانی	×	×	×	سنہ ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء	×	×	×	×	×	×	
	بیدار بخت	احمد شاہ	×	×	سنہ ۱۲۰۲ھ ۱۷۸۷ء	×	×	×	×	×	×	

نمبر	نام فرماں روا	نام پدر	قوم	سال ولادت	سال جلوس	مقام جلوس	دار السلطنت	مدت سلطنت قمری	سال وفات	مدت عمر	مدفن	حالات
(۱۹۹)	ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی	شاہ عالم	چغتائی	چہارشنبہ ۷ رمضان سنہ ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء	چہارشنبہ ۲ رمضان سنہ ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء	شاہ جہاں آباد	قلعہ شاہ جہاں آباد	۳۱-۹-۲۱	جمعہ ۲۸ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء	۷۹-۱۰-۱۱	دہلی قطب صاحب	اگرچہ جارج سوم بادشاہ انگلستان کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہو گئی مگر خاندان تیموریہ پر لقب بادشاہی تخت اور چتر اور قلعہ شاہ جہاں آباد کی حکومت قائم رہی۔
(۲۰۰)	ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ	اکبر شاہ	″	سنہ ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء	سنہ ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء	قلعہ شاہ جہاں آباد	قلعہ شاہ جہاں آباد	تخمیناً ۲۰ سال شمسی	سنہ ۱۸۶۲ء	۸۷	رنگون	سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں رنگون میں جلاوطن کیے گئے۔
(۲۰۱)	ملکہ وکٹوریا قیصرہ ہند	دختر ڈیوک آف کنٹ	انگریز	سنہ ۱۲۳۵ھ ۱۸۱۹ء	سنہ ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۶ء	قصر بکنگھم	لندن	۶۴ سال شمسی	۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء	۸۲ سال	لندن	
(۲۰۲)	ایڈورڈ ہفتم بادشاہ انگلینڈ و قیصر ہند	پسر کوئین وکٹوریا	انگریز	۹ نومبر سنہ ۱۸۴۱ء	۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء	″	″	۹ سال شمسی	۶ مئی سنہ ۱۹۱۰ء		لندن	
(۲۰۳)	جارج پنجم بادشاہ انگلینڈ و قیصر ہند	ایڈورڈ ہفتم	″	۳ جون سنہ ۱۸۶۵ء	۶ مئی سنہ ۱۹۱۰ء	″	″	×	×	×	×	تم سلامت رہو ہزار برس + ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

دلی کے قلعہ جات اور شہر کی بنا کی فہرست

نمبر	نام قلعہ یا شہر کا	نام حن بانی کا	سال بنا	کیفیت
(۱)	اندرپت	راجہ جدھشٹر	تخمیناً ۱۴۵۰ سال قبل مسیح	
(۲)	دہلی	راجہ دہلو	تخمیناً ۴۳۸ سال ق م	
(۳)	پرانہ قلعہ یا دین پناہ یا شیر گڈھ	انکپال تنور	۵۷ سنہ ۶۷۶ء	۹۴۰ھ ۱۵۳۳ء کو ہمایوں بادشاہ نے اس قلعے کی از سر نو مرمت کرا کے دین پناہ نام رکھا اور شیر شاہ نے بھی اس کی مرمت کی اور شیر گڈھ نام رکھا۔
(۴)	قلعہ رای پتھورا	رای پتھورا	۵۳۸ سنہ ۱۱۴۳ء	اس قلعے کے غربی دروازے کا نام "غزنین دروازہ" تھا۔
	قصر سفید	قطب الدین ایبک	۶۰۲ سنہ ۱۲۰۵ء	رای پتھورا کے قلعے میں یہ محل بنا تھا۔
(۵)	کوشک لعل	غیاث الدین بلبن	۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء	ان سنوں سے چند سال پہلے یہ قلعہ بنا کیوں کہ یہ سن تو بادشاہ ہونے کے ہیں اور یہ کوشک بادشاہ ہونے کے کچھ برس پہلے بنایا تھا۔
(۶)	قلعہ مرزغن یا غیاث پور	ر	۶۶۶ھ ۱۲۶۷ء	اس قلعے کی زمین میں حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ ہے۔
(۷)	کیلوکھڑی یا قصر معزی	معز الدین کیقباد	۶۸۵ھ ۱۲۸۶ء	ہمایوں کا مقبرہ اسی قلعے کی زمین میں ہے۔
(۸)	کوشک لعل یا نیا شہر	جلال الدین فیروز خلجی	۶۸۸ھ ۶۸۹ء	
	کوشک سبز	ر	ر	کوشک لعل میں کا یہ بھی ایک محل ہے۔

نمبر	نام قلعہ یا شہر کا	نام اصل بانی کا	سال بنا	کیفیت
(۹)	دہلی علائی یا قلعۂ علائی یا کوشک سیری	علاء الدین خلجی	سنہ ۷۰۳ھ / ۱۳۰۳ء	
	قصر ہزار ستون		سنہ ۷۰۳ھ / ۱۳۰۳ء	کوشک سیری میں کا یہ بھی ایک محل تھا۔
(۱۰)	تغلق آباد	تغلق شاہ	سنہ ۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ء	
(۱۱)	عادل آباد یا محل آباد	محمد عادل تغلق شاہ	سنہ ۷۲۸ھ / ۱۳۲۷ء	
(۱۲)	جہاں پناہ	〃	〃	دہلی علائی اور دہلی کہنہ یعنی قلعہ رای پتھورا کو ملا دیا
	کوشک بجی منڈل یا بیع منزل	〃	〃	جہاں پناہ کی فصیل کا ایک برج ہے۔
(۱۳)	کوشک فیروز شاہ یا فیروز شاہ کا کوٹلہ	فیروز شاہ	سنہ ۷۵۵ھ / ۱۳۵۴ء	
	شہر فیروز آباد	〃	〃	کوٹلے کے ساتھ کا یہ شہر بھی ہے۔
(۱۴)	کوشک جہاں نما یا کوشک شکار	〃	〃	
(۱۵)	خضر آباد	خضر خاں	سنہ ۸۲۱ھ / ۱۴۱۸ء	
(۱۶)	مبارک آباد	قطب الدین مبارک شاہ	سنہ ۸۳۷ھ / ۱۴۳۳ء	قلعۂ قطب آباد بھی غالباً اس قلعے کا نام تھا۔
(۱۷)	دہلی شیر شاہ	شیر شاہ	سنہ ۹۴۸ھ / ۱۵۴۱ء	اس شہر کا "کابلی دروازہ" اب تک جیل خانے کے پاس موجود ہے۔
(۱۸)	سلیم گڑھ یا نور گڈھ	اسلام شاہ جس کو سلیم شاہ بھی کہتے ہیں	سنہ ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء	نور الدین جہانگیر کے وقت میں پل اس کے سامنے بنا اور اسی وقت سے "نور گڈھ" نام پڑا

نمبر	نام قلعہ یا شہر کا	نام اصل بانی کا	سال بنا	کیفیت
(۱۹)	لال قلعہ	شاہ جہاں بادشاہ	سنہ ۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸ء	اس قلعے کی تعمیر میں اٹیلین بھی شریک تھے۔ شاہ جہاں کی بنائی ہوئی یہ عمارتیں موجود تھیں۔ دلی دروازہ۔ لاہوری دروازہ مع چھتہ۔ نقار خانہ یا ہتیا پول۔ دیوان عام مع تخت سنگین خاص محل۔ امتیاز محل یا رنگ محل۔ بیٹھک مع مثمن برج۔ اسد برج شاہ محل یا دیوان خاص۔ حمام۔ موتی محل۔ باغ حیات بخش مع ساون بھادوں۔ شاہ برج۔ مہتاب باغ اب ان میں سے عمارات نمبر ۵-۱۲-۱۳ باقی نہیں ہیں

عمارات قدیمہ شہر و مضافات دہلی

نمبر	نام مکان	نام اصل بانی کا	نام بادشاہ کے عہد میں بنا	سال	کیفیت
(۱)	لوہے کی لاٹھ	راجہ میدہاوے عرف دہاوا	راجہ دہاوا	تخمیناً ۹۵ سال قبل مسیح	اس لاٹھ پر سنسکرت حرفوں پر فتح یابی کا فتح نامہ کندہ ہے مگر روش خط سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حرف پانچویں صدی بعد حضرت عیسیٰ کے کندہ ہوئے ہیں۔
(۲)	لاٹھ اسوکا یا منارۂ زریں یا فیروز شاہ کی لاٹھ	راجہ اسوکا	راجہ اسوکا	سنہ ۲۹۰ ق م	پرانے خط میں بودھ کی مذہب کے احکام
(۳)	لاٹھ اسوکا یا متائے کوشک شکار	″	″	″	بیل دیو چوہان کا فتح نامہ کندہ ہے مگر رائے پتھورہ کے عہد میں کندہ ہوا ہے۔
(۴)	انیک پور	انیک پال تنور	انیک پال تنور	سنہ ۵۷ ۶۷۶ء	
(۵)	انیک پال	″	″		

نمبر	نام مکان	نام اصل بانی کا	نام بادشاہ جسکے عہد میں بنا	سال بنا	کیفیت
(۶)	سورج کنڈ	سورج پال	انیک پال تورر	۵۷۲ھ / ۶۶۷ع	
(۷)	بت خانہ واقع قطب صاحب مسجد قوت الاسلام	پرتھی راج عرف رائے پتھورا	رای پتھورا	۵۲۹ھ / ۱۱۴۳ع	۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ع میں قطب الدین ایبک نے بت خانہ توڑ کر مسجد بنائی اور بت خانہ پر اور سلاٹھ کے پہلے درجے پر فتح نامہ لگایا اور ۵۹۲ھ / ۱۱۹۵ع میں سلطان معز الدین نے پانچ محرابیں بنوائیں ۶۲۷ھ / ۱۲۲۹ع میں سلطان شمس الدین نے تین تین محرابیں اور بنوائیں اور لاٹھ پر پانچ درجے اور بڑہائے ۷۱۰ھ / ۱۳۱۰ع میں سلطان علاء الدین نے اس مسجد کو بڑہانا چاہا اور دوسری لاٹھ پہلی لاٹھ سے دگنی بنانی چاہی جو ناتمام رہ گئی۔
	〃	قطب الدین ایبک	معز الدین سلطان		
	〃	سپہ سالار			
	〃	تعمیر معز الدین سلطان	〃		
	〃	تعمیر سلطان شمس الدین			
	〃	تعمیر سلطان علاء الدین	سلطان علاء الدین		
(۸)	قطب صاحب کی لاٹھ	پرتھی راج			
	〃	عرف رائے پتھورا	رای پتھورا		
	〃				
(۹)	متصل دروازہ لاٹھ کلاں	تعمیر سلطان علاء الدین			
(۱۰)	اودھ بنی یعنی ناتمام لاٹھ	سلطان علاء الدین	〃		
(۱۱)	حوض شمسی	سلطان شمس الدین	سلطان شمس الدین التمش	۶۲۷ھ / ۱۲۲۹ع	۶۲۷ھ / ۱۳۰۱ع میں سلطان علاء الدین نے اس حوض کے بیچ میں ایک برجی بنائی۔
(۱۲)	مقبرۂ سلطان غاری	〃	〃	۶۲۹ھ / ۱۲۳۱ع	ناصر الدین محمود سلطان شمس الدین کے بیٹے کا مقبرہ ہے۔
(۱۳)	مقبرۂ سلطان شمس الدین	سلطانہ رضیہ بیگم	سلطانہ رضیہ بیگم	۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ع	
(۱۴)	درگاہ ترکمان شاہ	×	معز الدین بہرام شاہ	۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ع	
(۱۵)	مقبرۂ رکن الدین فیروز شاہ	معز الدین بہرام شاہ	معز الدین بہرام شاہ	〃	

نمبر	نام مکان	نام اصل بانی کا	نام بادشاہ جسکے عہد میں بنا	سال بنا	کیفیت
(۱۶)	مقبرہ سلطانہ رضیہ بیگم	معزالدین بہرام شاہ	معزالدین بہرام شاہ	۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء	
(۱۷)	مقبرہ معزالدین بہرام شاہ	شاہ علاؤالدین مسعود	۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء		
(۱۸)	مقبرہ غیاث الدین سلطان بلبن	غیاث الدین بلبن	۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء		خان سعید کے مرنے کے وقت اس کی قبر اور یہ مقبرہ خود بادشاہ نے بنوایا
(۱۹)	حوض علائی یا حوض خاص	سلطان علاءالدین	سلطان علاءالدین	۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء	فیروز شاہ کے وقت میں حوض خاص اس کا نام ہوا۔
(۲۰)	مقبرہ سلطان علاءالدین	قطب الدین مبارک شاہ	قطب الدین مبارک شاہ	۷۱۷ھ / ۱۳۱۷ء	
(۲۱)	باؤلی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء	حضرت نظام الدین اولیاء	غیاث الدین تغلق شاہ	۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ء	۷۸۱ھ / ۱۳۷۹ء میں محمد معروف نے اس باؤلی پر مکانات بنائے۔
(۲۲)	مقبرہ غیاث الدین تغلق شاہ	محمد عادل تغلق شاہ	محمد عادل تغلق شاہ	۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء	محمد عادل تغلق شاہ کی قبر بھی یہیں ہے
(۲۳)	درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء	عماد الملک ضیاءالدین وکیل سلطان محمد بن تغلق شاہ	محمد عادل تغلق شاہ	؍؍	خلیل اللہ خاں نے ۱۰۶۳ھ / ۱۶۵۲ء میں مزار پر غلام گردش بنوائی۔
(۲۴)	ست پلہ	محمد عادل تغلق شاہ	؍؍	۷۲۷ھ / ۱۳۲۶ء	
(۲۵)	درگاہ شیخ صلاح الدین	×	فیروز شاہ	۷۵۴ھ / ۱۳۵۳ء	
(۲۶)	مسجد درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء	فیروز شاہ	؍؍	؍؍	

نمبر	نام مکان	نام اصل بانی کا	نام بادشاہ جسکے عہد میں بنا	سال بنا	کیفیت
(۲۷)	مسجد جامع فیروزی	فیروزشاہ	؍؍	سنہ ۷۵۵ھ / ۱۳۵۴ء	تیمور کا خطبہ اسی مسجد میں پڑھا گیا۔
(۲۸)	کوشک انوار یا مہندیاں	فیروزشاہ	فیروزشاہ	سنہ ۷۵۵ھ / ۱۳۵۴ء	
(۲۹)	بولی بھٹیاری کا محل	؍؍	؍؍	؍؍	
(۳۰)	کالی مسجد کوٹلہ نظام الدین	خانجہاں	؍؍	سنہ ۷۷۲ھ / ۱۳۷۰ء	
(۳۱)	درگاہ روشن چراغ دہلی	فیروزشاہ	؍؍	سنہ ۷۷۵ھ / ۱۳۷۳ء	
(۳۲)	قدم شریف یا مقبرہ فتح خاں	؍؍	؍؍	سنہ ۷۷۶ھ / ۱۳۷۴ء	
(۳۳)	مسجد چوراہا قدم شریف	؍؍	؍؍	؍؍	
(۳۴)	درگاہ حضرت سید محمود بحار	×	؍؍	سنہ ۷۷۸ھ / ۱۳۷۶ء	
(۳۵)	کلاں مسجد عرف کالی مسجد	خانجہاں	؍؍	سنہ ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء	
(۳۶)	مسجد بیگم پور	؍؍	؍؍	؍؍	
(۳۷)	مسجد کالو سرائے	؍؍	؍؍	؍؍	
(۳۸)	مسجد کھڑکی	؍؍	؍؍	؍؍	
(۳۹)	مقبرۂ فیروزشاہ	ناصرالدین محمد شاہ	ناصرالدین محمد شاہ	سنہ ۷۹۳ھ / ۱۳۸۹ء	

نمبر	نام مکان	نام اصل بانی کا	نام بادشاہ جس کے عہد میں بنا	سال بنا	کیفیت
(۴۰)	خضر کی گمٹی	ابو الفتح مبارک شاہ	ابو الفتح مبارک شاہ	۸۲۴ھ ۱۴۲۱ء	خضر خان کا یہ مقبرہ ہے
(۴۱)	مبارک پور کوٹلہ	محمد شاہ	محمد شاہ	۸۳۶ھ ۱۴۳۲ء	
(۴۲)	مقبرہ محمد شاہ	علاءالدین عالم شاہ	علاءالدین عالم شاہ	۸۴۹ھ ۱۴۴۵ء	
(۴۳)	مقبرہ سلطان بہلول	سلطان سکندر	سلطان سکندر	۸۹۴ھ ۱۴۸۸ء	
(۴۴)	پنج برجہ زمرد پور	زمرد خان	"	"	
(۴۵)	بستی باؤلی	بستی خواجہ سرا	"	"	
(۴۶)	موٹھ کی مسجد	شہاب الدین	"	"	
(۴۷)	مقبرہ لنگر خان	×	"	۹۰۰ھ ۱۴۹۴ء	
(۴۸)	تبرجہ	×	"		
(۴۹)	راجون کی بائین	دولت خاں	"	۹۱۲ھ ۱۵۰۶ء	
(۵۰)	مقبرہ سلطان سکندر	سلطان ابراہیم	سلطان ابراہیم	۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء	
(۵۱)	درگاہ یوسف قتال	شیخ علاءالدین	بابر بادشاہ	۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء	
(۵۲)	درگاہ مولنا جمالی	مولنا جمالی	"	۹۳۶ھ ۱۵۳۰ء	
(۵۳)	مسجد درگاہ جمالی	"	"	"	
(۵۴)	نیلی چھتری	ہمایوں بادشاہ	ہمایون بادشاہ	۹۲۹ھ ۱۵۳۲ء	
(۵۵)	درگاہ امام ضامن	حضرت امام ضامن	"	۹۴۴ھ ۱۵۳۷ء	
(۵۶)	درگاہ حضرت قطب صاحب	خلیل اللہ خاں	شیر شاہ	۹۴۸ھ ۱۵۴۱ء	
(۵۷)	مسجد قلعہ کہنہ	شیر شاہ	"	"	
(۵۸)	شیر منڈل	"	"	"	
(۵۹)	مسجد مقبرہ خیر پور	خیر پور	"	۹۵۰ھ ۱۵۴۳ء	
(۶۰)	گندی باؤلی	خواجہ عبداللہ عمادالملک	اسلام شاہ	۹۵۲ھ ۱۵۴۵ء	
(۶۱)	مقبرہ عیسیٰ خان	عیسےٰ خاں	"	۹۵۴ھ ۱۵۴۷ء	
۶۲	مسجد عیسیٰ خان	"	"		
(۶۳)	مسجد درگاہ قطب صاحب	اسلام شاہ	اسلام شاہ	[illegible] ۱۵۵۰ء	[illegible]

کیفیت	سال بنا	نام بادشاہ جس کے عہد میں بنا	نام اصل بانی کا	نام مکان	نمبر
	سنہ ۹۶۸ھ ۱۵۶۰ء	اسلام شاہ	حاجی بیگم صاحبہ	عرب سرائے	(۶۴)
	سنہ ۹۶۹ھ ۱۵۶۱ء	"	ماہم بیگم صاحبہ	محیر المنازل	(۶۵)
	"	اکبر بادشاہ	اکبر بادشاہ	بھول بھلیاں یا مقبرہ ادہم خاں	(۶۶)
	سنہ ۹۷۳ھ ۱۵۶۵ء	"	حاجی بیگم صاحبہ	مقبرہ ہمایوں	(۶۷)
	"	"	نواب نوبت خاں	نیلی چھتری مقبرہ نوبت خاں	(۶۸)
	سنہ ۹۷۴ھ ۱۵۶۶ء	"	کوکلتاش خاں	مقبرہ اتگہ خان	(۶۹)
	سنہ ۱۰۱۲ھ ۱۶۰۳ء		"	درگاہ حضرت خواجہ باقی اللہ	(۷۰)
	سنہ ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء	نورالدین جہانگیر بادشاہ	عمادالدین حسن	درگاہ حضرت امیر خسرو رح	(۷۱)
	سنہ ۱۰۱۷ھ ۱۶۰۸ء	"	فرید خاں	جیلی نہ سرائے فرید خاں	(۷۲)
	سنہ ۱۰۲۱ھ ۱۶۱۲ء	جہانگیر بادشاہ	آغا مان	بارہ پلہ	(۷۳)
	"	"	"	منڈی	(۷۴)
	سنہ ۱۰۲۹ھ ۱۶۱۸ء	"	جہانگیر بادشاہ	کوس منارہ	(۷۵)
	سنہ ۱۰۳۱ھ ۱۶۲۱ء	"	"	پل سلیم گڑھ	(۷۶)
	سنہ ۱۰۳۳ھ ۱۶۲۳ء	"	شیخ فرید	مقبرہ شیخ فرید	(۷۷)
	سنہ ۱۰۳۴ھ ۱۶۲۴ء	"	عبدالرحیم خان خاناں	نیلا برج یا مقبرہ فہیم	(۷۸)
	"	"	مرزا عزیز کوکلتاش خاں	چونسٹھ کھمبا یا مقبرہ کوکلتاش	(۷۹)
	سنہ ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۶ء	"	عبدالرحیم خان خاناں	مقبرہ خان خاناں	(۸۰)
	"	شاہجہاں بادشاہ	خان دوران خاں	مقبرہ سید عابد	(۸۱)
	سنہ ۱۰۴۲ھ ۱۶۳۲ء	"	خاص محل دختر زین خاں	خاص محل	(۸۲)
	سنہ ۱۰۵۲ھ ۱۶۴۲ء	"	شیخ الاسلام	مقبرہ شیخ عبدالحق محدث	(۸۳)
	سنہ ۱۰۶۰ھ ۱۶۵۰ء	شاہ جہاں بادشاہ	شاہجہاں بادشاہ	جامع مسجد	(۸۴)
	"	"	"	دارالشفا و دار البقار	(۸۵)
	"	"	جہاں آرا بیگم صاحبہ	بیگم کا باغ	(۸۶)
	"	"	فتحپوری بیگم صاحبہ	مسجد فتحپوری	(۸۷)

نمبر	نام مکان	نام اصل بانی کا	نام بادشاہ جس کے عہد میں بنا	سال بنا	کیفیت
(۸۸)	مسجد اکبر آبادی	اکبر آبادی بیگم صاحبہ	شاہ جہاں بادشاہ	۱۰۶۰ھ / ۱۶۵۰ء	
(۸۹)	مسجد سرہندی	سرہندی بیگم صاحبہ	"	"	
(۹۰)	باغ شالامار	شاہ جہاں بادشاہ	"	۱۰۶۴ھ / ۱۶۵۳ء	
(۹۱)	باغ روشن آرا	روشن آرا بیگم	"	"	
(۹۲)	باغ سرہندی	سرہندی بیگم صاحبہ	"	"	
(۹۳)	موتی مسجد اندرون قلعہ	عالمگیر بادشاہ	عالمگیر بادشاہ	۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹ء	
(۹۴)	مجر جہاں آرا بیگم	جہاں آرا بیگم صاحبہ	"	۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء	
(۹۵)	مقبرہ سرنالہ	×	عالمگیر بادشاہ	۱۱۰۰ھ / ۱۶۸۸ء	
(۹۶)	درگاہ حضرت سید حسن رسول نما	×	"	۱۱۰۳ھ / ۱۶۹۱ء	
(۹۷)	جھرنا	غازی الدین خاں	"	۱۱۱۲ھ / ۱۷۰۰ء	
(۹۸)	مسجد اورنگ آبادی	اورنگ آبادی بیگم صاحبہ	"	۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۲ء	
(۹۹)	مقبرہ زیب النساء بیگم	عالمگیر بادشاہ	"	"	
(۱۰۰)	موتی مسجد قطب صاحب	بہادر شاہ	بہادر شاہ بادشاہ	۱۱۲۱ھ / ۱۷۰۹ء	
(۱۰۱)	زینت المساجد	زینت النساء بیگم صاحبہ	"	۱۱۲۲ھ / ۱۷۱۰ء	
(۱۰۲)	مقبرہ غازی الدین خاں	غازی الدین خاں	شاہ عالم بہادر شاہ	"	
(۱۰۳)	مجر شاہ عالم بہادر شاہ	جہاں دار شاہ	جہاں دار شاہ	۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء	شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی کی بھی یہیں قبریں ہیں
(۱۰۴)	برج مقبرہ ہمایوں	×	رفیع الدرجات	۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء	
(۱۰۵)	کوتوالی متصل مسجد سنہری	روشن الدولہ	محمد شاہ	۱۱۳۴ھ / ۱۷۲۱ء	
(۱۰۶)	مسجد واقع دریبہ	شرف الدولہ	"	۱۱۳۵ھ / ۱۷۲۲ء	
(۱۰۷)	جنتر منتر	راجہ سوائی سنگھ	محمد شاہ بادشاہ	۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء	اس رصد خانے میں انگریز بھی [illegible]
(۱۰۸)	شاہ مرداں	نواب قدسیہ بیگم	"	"	
(۱۰۹)	فخر المساجد	فخر النساء خانم	"	۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء	
(۱۱۰)	باغ محل دار خان	ناظر محل دار خان	"	"	
(۱۱۱)	گھاٹ نگمبودھ	×	"	۱۱۵۰ھ / [illegible]	

نمبر	نام مکان	نام اصل بانی کا	نام بادشاہ جس کے عہد میں بنا	سال بنا	کیفیت
(١١٢)	مسجد روشن الدولہ واقع قاضی واڑہ	روشن الدولہ	محمد شاہ بادشاہ	١١٥٨ھ ١٧٤٥ء	
(١١٣)	باغ ناظر	ناظر روز افزوں	″	١١٦٠ھ ١٧٤٧ء	
(١١٤)	مقبرہ محمد شاہ بادشاہ	محمد شاہ	″	″	
(١١٥)	قدسیہ باغ	نواب قدسیہ بیگم	احمد شاہ بادشاہ	١١٦٢ھ ١٧٤٨ء	
(١١٦)	چوبی مسجد	احمد شاہ بادشاہ	″	١١٦٤ھ ١٧٥٠ء	
(١١٧)	سنہری مسجد نزد قلعہ	جاوید خواجہ سرا	″	١١٦٥ھ ١٧٥١ء	
(١١٨)	مقبرہ منصور	شجاع الدولہ	عالمگیر ثانی بادشاہ	١١٦٧ھ ١٧٥٣ء	
(١١٩)	کالکا	×	شاہ عالم	١١٧٨ھ ١٧٦٤ء	
(١٢٠)	لال بنگلہ	شاہ عالم بادشاہ	شاہ عالم بادشاہ	١١٩٣ھ ١٧٧٩ء	
(١٢١)	مقبرہ نجف خان	×	″	١١٩٥ھ ١٧٨٠ء	
(١٢٢)	جینیوں کا شوالہ واقع محلہ دھرم پورہ	موہن لال ہر سکھ رائے	″	١٢١٥ھ ١٨٠٠ء	
(١٢٣)	گرجا واقع کشمیری دروازہ	کرنل اسکنر	جارج چہارم و اکبر شاہ ثانی	١٢٤٢ھ ١٨٢٦ء	
(١٢٤)	جوگ مایا	راجہ سیڈمل	″	١٢٤٣ھ ١٨٢٧ء	
(١٢٥)	جینیوں کا چھوٹا شوالہ واقع ستھ کی گلی	پنچایتی	″	١٢٤٤ھ ١٨٢٨ء	
(١٢٦)	کوٹھی مہمان نما	مٹکاف صاحب	″	″	
(١٢٧)	مسجد [illegible]	نواب ممتاز محل زوجہ محمد اکبر شاہ ثانی	ولیم چہارم و اکبر شاہ ثانی	١٢٤٨ھ ١٨٣٢ء	
(١٢٨)	ظفر محل	بہادر شاہ ثانی	ملکہ وکٹوریا و ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ	١٢٥٨ھ ١٨٤٢ء	
(١٢٩)	ہیرا محل	″	″	″	
(١٣٠)	کوٹھی دلکشا	مٹکاف صاحب	″	١٢٦٠ھ ١٨٤٤ء	
(١٣١)	باؤلی قطب صاحب	حافظ محمد داؤد خان	″	″	
(١٣٢)	آہنی پل ہنڈن	[illegible] گورنمنٹ انگریزی	ملکہ وکٹوریہ و ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ	١٢٦٣ھ ١٨٤٦ء	
(١٣٣)	لال ڈگی	″		″	
(١٣٤)	پل جدید [illegible]	″		١٢٦٩ھ ١٨٥٣ء	

تمت

کلید نقشہ شاہجہان آباد (دہلی)

نقشہ شہر دہلی کے اندر اندر کی عمارتوں کا ہے۔ عمارات قدیمہ کی تقسیم محلہ وار کی گئی ہے قلعہ کی عمارات کا گروپ جداگانہ قایم کیا گیا ہے جس کا نمبر سلسلہ وار قلعہ سے شروع ہوا ہے۔ دوسرا گروپ چاندنی چوک کے جنوب سے شروع ہوا ہے اور آخری گروپ اُن عمارتوں کا ہے جو بازار مذکور کے شمال میں واقع ہیں۔ نقشے میں بڑی بڑی عمارتوں کے نمبروار علامات کے علاوہ نام بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اُس سے کم تر درجے کی عمارتوں میں علامات کے ساتھ نمبر ڈال دیئے ہیں اور جو معمولی ہیں اُن پر صرف نمبر ہی ڈالنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ نقشے کے دیکھنے کے بعد جو نمبر اُس میں ہو اُس کو فہرست میں تلاش کرنے سے اصل عمارت کا پتہ بہ آسانی چل جائے گا۔

نشان سلسلہ	نام عمارت	نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲	۱	۲
۱	قلعۂ معلی۔ یا لال قلعہ	۹	پل لاہوری اور دلی دروازوں کے گھوگس کے سامنے۔
۲	لاہوری دروازہ یا وکٹوریا گیٹ	۱۰	چھتہ چوک۔ لاہوری دروازے کے مشرق میں۔
۳	دلّی دروازہ یا الگزینڈرا گیٹ	۱۱	نوبت خانہ یا نقار خانہ۔ لاہوری دروازے اور چھتہ چوک کے آگے۔
۴	دروازہ۔ کوئی خاص نام نہیں قلعہ کی شمالی فصیل میں سلیم گڑھ کے محاذی۔	۱۲	دیوان عام۔ نوبت خانے کے مشرق میں۔
۵	کھڑکی فصیل کے شمال مشرق میں سلیم گڑھ دروازے کے پاس۔	۱۳	اسد برج۔ قلعے کے جنوب مشرق کے کونے میں۔
۶	خضری دروازہ یا پانی دروازہ تحت مثمن برج۔	۱۴	ممتاز محل جس میں اب دہلی میوزیم ہے۔ رنگ محل کے جنوب میں۔
۷	پانی دروازہ متصل اسد برج قلعہ کے جنوب مشرقی کونے میں۔	۱۵،	رنگ محل خوابگاہ اور بیٹھک کے جنوب میں
۸	گھوگھس۔ گھونگٹ کی دیوار لاہوری اور دلّی دروازوں کے سامنے۔	۱۶	حوض سنگ مرمر رنگ محل کے سامنے والے بلند تالاب کے بیچ میں۔
		۱۷	تسبیح خانہ۔ خوابگاہ اور بیٹھک۔ دیوان خاص کے جنوب میں

نشان سلسلہ	نام عمارات
۱	۲
۱۸	مثمن برج یا برج طلا - خوابگاہ کی مشرقی دیوار سے ملا ہوا -
۱۹	جھروکہ - مثمن برج کے سامنے لب دریا -
۲۰	دیوان خاص - حمام اور مثمن برج کے درمیان قلعے کی مشرقی فصیل کی طرف -
۲۱	نہر بہشت - شاہ برج سے حمام - دیوان خاص خوابگاہ اور رنگ محل میں گزرتی ہوئی -
۲۲	حمام - دیوان خاص کے شمال میں -
۲۳	موتی مسجد - حمام کے پاس ہی بجانب مغرب -
۲۴	باغ حیات بخش - موتی مسجد کے شمال میں -
۲۵	ہیرا محل - حمام کے شمال میں -
۲۶	شاہ برج - ہیرا محل کے شمال [illegible] قلعے کے شمال مشرقی
۲۷	پیولین - شاہ برج کے عین شمال مغرب (کونہ میں) اور قلعہ کی شمالی فصیل کے پاس -
۲۸	ساون بھادوں - تالاب واقع باغ حیات بخش کے شمال اور جنوب میں
۲۹	ظفر محل - تالاب - حیات بخش باغ کے وسط میں -
۳۰	ظفر محل - تالاب نمبر ۲۹ کے بیچ میں -
۳۱	باؤلی - حیات بخش باغ کے مغرب میں پریڈ گراؤنڈ پر
۳۲	مسجد (بے نام) چھتہ چوک کے جنوب میں سپلائی اور ٹرانسپورٹ کے احاطے کے اندر -
۳۳	سنہری مسجد قلعے کے دلّی دروازے کے باہر کوئی سو گز کے فاصلے سے
۳۴	قیرناسلوم - جاوید خاں کی سنہری مسجد کے پیچھے -
۳۵	قیرنامعلوم سنہری مسجد کے مشرق میں -
۳۶	زینت المساجد - فصیل کے پاس خیراتی دروازہ یا مسجد گھاٹ دروازے کے پاس -
۳۷	مسجد بے نام فیض بازار - فیض بازار اور دریا گنج کی سڑکیں جہاں ملتی ہیں -
۳۸	درگاہ شاہ صابر بخش صاحب مسجد اور مسافر خانہ فیض بازار
۳۹	سنہری یا قاضی زادوں کی مسجد - فیض بازار -
	دلّی دروازہ
۴۰	نبی بخش کی مسجد متصل دلّی دروازہ -
۴۱	دلّی دروازہ - شاہجہان آباد کا جنوبی دروازہ -
۴۲	جینیوں کا مندر دہلی دروازہ -
	چٹواڑہ متصل دہلی دروازہ
۴۳	گڈریوں کی مسجد - کٹڑہ حکیم محسن خاں
	چھتہ لال میاں
۴۴	مسجد قصابان فصیل کے پاس -
۴۵	جھوٹی مسجد -
۴۶	بھٹیاری والی مسجد -
	محلہ دھوبیاں
۴۷	مسجد دھوبیاں -
	کوچہ سعد اللہ خاں
۴۸	اونچی مسجد -
	تراہا بیرم خاں
۴۹	دائی والی مسجد -

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۵۰	مکان سر سید احمد خاں مرحوم۔
۵۱	مکان خواجہ فرید الدین خاں
۵۲	کھجور والی مسجد۔ قریب کمرۂ بنگش۔
۵۳	رنگ محل۔
	محلۂ رکاب
۵۴	مسجد (بے نام)
	حویلی میر خاں
۵۵	شیش محل کی مسجد۔ محلۂ تیلیاں
۵۶	مرزا الٰہی بخش کا رنگ محل۔
۵۷	چاندنی محل۔
۵۸	شیش محل۔
۵۹	مکان مرزا خجستہ بخت پسر شاہ عالم ثانی۔
	کوچۂ چیلاں
۶۰	مسجد۔ محلۂ رنگ محل۔
۶۱	کہار والی مسجد متصل گلی اولیاء
۶۲	آقا سیتا کی مسجد۔ شاخ منبع عربک سکول کے پاس
۶۳	مسجد کالے خاں۔
	پھول کی منڈی
۶۴	اولیاء مسجد۔
	کوچۂ فولاد خاں
۶۵	خواجہ میر درد کی مسجد۔ بارہ دری۔
۶۶	حکیم آغا جان کی مسجد چھتہ آغا جان۔
	کوچۂ ناہر خاں

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۶۷	مسجد بے نام۔
	کوچۂ مہر پرور
۶۸	مسجد بے نام
	کوچۂ دکھنی راؤ
۶۹	مسجد بے نام
	سڑک نقار خانہ
۷۰	مسجد بے نام۔
	کھڑکی حویلی خان دوران خاں
۷۱	مسجد بے نام۔
	گلی گوندنی والی قریب کلاں مسجد
۷۲	مسجد گوندنی والی۔
	محلۂ گڑھیا یا حویلی نواب احمد علی خاں
۷۳	مسجد بے نام۔
	کٹڑۂ گوگل شاہ
۷۴	مسجد بے نام۔
	مٹیا محل
۷۵	مٹیا محل کی مسجد
۷۶	مسجد بے نام
	محلہ اعظم خاں کی حویلی
۷۷	مسجد کنوئیں والی۔
۷۸	مسجد بے نام
	کلاں محل
۷۹	جامن والی مسجد۔

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
	موچیوں کی گلی
۸۰	مسجد بے نام
	سڑک جامع مسجد سے دلی دروازے تک
۸۱	مسجد بے نام بنگش کے کمرے اور چتلی قبر کے بیچ میں
۸۲	مسجد بے نام بنگش کے کمرے اور چتلی قبر کے بیچ میں
۸۳	کمرۂ بنگش۔
	محلہ چتلی قبر
۸۴	میر محمدی صاحب کی قبر اندرون خانقاہ میر محمدی
۸۵	سید جلال الدین کی قبر چتلی قبر کے پاس ایک دکان کے اندر۔
۸۶	چتلی قبر۔
	حویلی میر ہاشم
۸۷	شاہ آفاق صاحب کی مسجد
	شاہ کلن کی ڈگڈگی
۸۸	خانقاہ شاہ غلام علی صاحب۔
	محلہ سوئی والاں
۸۹	مسجد بے نام۔
۹۰	پتلی گلی کی مسجد۔
	محلہ سوئی والوں کا حوض
۹۱	سید داؤد صاحب کی قبر۔
۹۲	حوض والی مسجد۔
۹۳	بارہ دری اور نواب اعظم خاں کا حوض۔
	گنج میر خاں
۹۴	پیپل والی مسجد۔
	ترکمان دروازہ
۹۵	قبور بزرگان نامعلوم متصل پولیس سٹیشن۔
۹۶	ترکمان دروازہ شہر شاہجہان آباد کا جنوب مغربی دروازہ
۹۷	مسجد بے نام
	محلہ گڈریاں ترکمان دروازے کے پاس
۹۸	مسجد۔ گڈریاں
	محلہ قبرستان
۹۹	قلندر بیگ کی مسجد۔
۱۰۰	حافظ داؤد کی مسجد۔
۱۰۱	پلاؤ والی مسجد۔
۱۰۲	درگاہ حضرت شاہ ترکمانؒ
۱۰۳	قبر حیدر رضا۔ درگاہ شاہ ترکمان میں۔
۱۰۴	بی مولا کی قبر۔
۱۰۵	تحقیق خاں کی قبر۔
	سڑک ترکمان دروازے سے چتلی قبر
۱۰۶	حاجی امان اللہ کی مسجد۔
۱۰۷	حافظ نظام علی عطار کی مسجد۔
	بازار چتلی قبر
۱۰۸	سید رفائی صاحب کی مسجد چتلی قبر کے پاس۔
	بھوجلا پہاڑی
۱۰۹	مسجد بے نام۔ گلی رام جی داس۔

نشان سلسلہ	نام عمارات
۱	۲
۱۱۰	مسجد بے نام - گلی رام جی داس -
۱۱۱	مسجد بے نام - اندھیری گلی -
۱۱۲	استاد کریم بخش کی مسجد
۱۱۳	گرد ہر کپتان کی مسجد -
	گلی شعلیاں
۱۱۴	مسجد بے نام -
	املی کی پہاڑی
۱۱۵	املی کی پہاڑی کی مسجد -
۱۱۶	یک برجی مسجد -
۱۱۷	شاہ محمد علی واعظ کا مقبرہ -
	گلی سرخ پوشاں
۱۱۸	اونچی مسجد -
	حویلی بختاور خاں
۱۱۹	مسجد اور مدرسہ حسین بخش
	چھتہ شیخ منگلو
۱۲۰	مولوی محبوب علی کی مسجد -
	چتلا دروازہ
۱۲۱	بڑھ معیا کی مسجد -
۱۲۲	مسجد بے نام -
	کوچۂ میر عاشق
۱۲۳	چھوٹی مسجد -
۱۲۴	بڑی مسجد -
	گلی کدار ناتھ

نشان سلسلہ	نام عمارات
۱	۲
۱۲۵	مندر بابو گلاب داس
	گلی مرغاں
۱۲۶	مسجد بے نام -
۱۲۷	مندر بے نام -
۱۲۸	شوالا بے نام -
	محلہ چوڑی والاں
۱۲۹	حمام والی مسجد -
۱۳۰	مسجد جوتے والاں -
۱۳۱	شوالا بے نام - گلی کشمیریاں -
	محلہ بدلیاں
۱۳۲	چودھری کا مندر -
	کوچۂ سربلند خاں
۱۳۳	شوالا بے نام
	میلکی خانہ
۱۳۴	منشی شیر علی کی مسجد -
۱۳۵	رضیہ سلطان کی قبر -
۱۳۶	مسجد بے نام -
۱۳۷	نواب مولوی قطب الدین خاں کی مسجد -
	کلاں مسجد یا کالی مسجد
۱۳۸	کلاں مسجد -
	محلہ عقب کلاں مسجد
۱۳۹	مسجد نقیب الاولیاء
۱۴۰	بیری والی مسجد -

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۱۴۱	حویلی نواب مظفر خاں قریب کمان دروازہ پھاٹک بے نام
	گلی سنگھی والی (عقب کلاں مسجد)
۱۴۲	غلام چشتی کی مسجد۔
	محلہ گھوسیاں (عقب کلاں مسجد)
۱۴۳	چند الگوسی کی مسجد۔
	گلی ڈکوتاں (عقب کلاں مسجد)
۱۴۴	مسجد موماں۔
	کوچۂ گوکل شاہ
۱۴۵	حافظ حبیب اللہ کی مسجد
	بازار سیتارام
۱۴۶	کالیسور ناتھ کا مندر۔
۱۴۷	خواجہ تراب کی مسجد۔
۱۴۸	پیپل والی مسجد۔
۱۴۹	شوالا بے نام۔
۱۵۰	کشمیریوں کا مندر۔
	املی کا محلہ
۱۵۱	مندر بے نام۔
۱۵۲	اوما مہیشور کا مندر
۱۵۳	کیسرن کا مندر۔
۱۵۴	شوالا بے نام۔ گلی کشمیریاں
۱۵۵	قنوجی رائی کا مندر۔
۱۵۶	شوالہ بے نام۔ کوچۂ باقی رام۔

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۱۵۷	شوالا بے نام۔ محلۂ جاٹ واڑا یا کونڈے والاں سڑک پر کنوئیں کے پاس۔
	محلۂ نمدے والاں
۱۵۸	مسجد بے نام۔
	اجمیری دروازہ
۱۵۹	موچیوں کی مسجد جسے دوگل صاحب نے فیل کی مسجد لکھا ہے۔ اجمیری دروازے کے قریب
۱۶۰	اجمیری دروازہ۔ شہر کا جنوب مغربی دروازہ۔
۱۶۱	اونچی مسجد۔ کوچۂ شاہ تارا۔
۱۶۲	قبروں والی مسجد شاہ تارا۔
۱۶۳	پائندہ خاں کی مسجد۔ ایضاً
	سڑک۔ اجمیری دروازے سے قاضی کا حوض
۱۶۴	کوٹلے والوں کی مسجد۔ کوچۂ شاہ تارا۔
۱۶۵	دروازہ بے نام۔ کروڑی محلے کا داخلی دروازہ
۱۶۶	دروازہ بے نام۔ کوچۂ رحنا بیگم کا دروازہ
۱۶۷	” ۔ کوچۂ فتح النسا بیگم کا دروازہ۔
	محلہ قاضی کا حوض
۱۶۸	قاضی کے حوض کی مسجد۔
۱۶۹	مسجد بے نام۔ کوچۂ فتح النسا بیگم
۱۷۰	لال مسجد قریب حوض قاضی جسے ڈاکٹر دوگل نے مبارک بیگم کی مسجد لکھا ہے۔
۱۷۱	دروازہ بے نام حویلی نواب بدل بیگ خاں کا۔ دروازہ جسٹس محمد رفیق کی بارہ دری کا ہے۔

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۱۷۲	سرکی والوں کی مسجد۔ نواب بدل بیگ خاں کے پھاٹک کے پاس۔
۱۷۳	دروازہ بے نام۔ حویلی نواب بدل بیگ خاں کا دوسرا دروازہ جو محمد اسلام اللہ خاں صاحب کے مکان کا ہے۔
۱۷۴	مکان حکیم احسن اللہ خاں۔ حویلی نواب بدل بیگ خاں
۱۷۵	حمام۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب کے مکان کے احاطے کے اندر۔
۱۷۶	دروازہ بے نام۔ حویلی عبدالرحمن خاں کا پھاٹک۔
۱۷۷	لال دروازہ۔ مرزا مغل بیگ خاں کی حویلی کا پھاٹک
۱۷۸	مرزا مغل بیگ خاں کی مسجد۔ اندرون لال دروازہ
	کوچۂ پنڈت
۱۷۹	خوجن صاحب کی مسجد۔ گلی عزیز الدین وکیل
۱۸۰	میاں جی صاحب کی مسجد۔
۱۸۱	سوار خاں کی مسجد۔ گلی سوار خاں
	محلۂ نیاریان
۱۸۲	مسجد بے نام۔
	فصیلیں فراش خانہ
۱۸۳	مسجد بے نام۔ رجی کا کٹڑہ
	محلۂ فراش خانہ
۱۸۴	کھڑکی فراش خانہ شاہ جہاں آباد جنوب مغربی کھڑکی جو اب توڑ دی گئی۔
۱۸۵	انار والی مسجد۔ گھنٹہ کا کوان۔
۱۸۶	میر مدری کی مسجد۔ گلی میر مداری
۱۸۷	مسجد بے نام۔ احاطۂ مجن صاحب۔
۱۸۸	دروازہ بے نام۔ مجن صاحب کے احاطے کا۔
۱۸۹	اخوند جی کی مسجد۔ گلی اخوند جی۔
۱۹۰	مسجد بے نام۔ کٹڑۂ دھوبیان
۱۹۱	مرزا فخر اللہ بیگ کی مسجد۔ پل کے پاس۔
۱۹۲	مسجد بے نام۔ کٹڑۂ ہڈو۔
۱۹۳	حکیم جی کی مسجد۔ گلی چاہ شیریں۔
۱۹۴	مسجد بے نام۔ گلی راجاں۔
۱۹۵	گولر والی مسجد۔ دو منزلہ سڑک کے کنارے۔
۱۹۶	گوندنی والی مسجد۔ نگینہ محل کے پاس۔
۱۹۷	مسجد بے نام۔ چھتہ راجاں۔
۱۹۸	مسجد بے نام۔ چھپیا کا چھتہ۔
	محلہ رودگراں
۱۹۹	دروازہ بے نام۔ مدرسۂ ارادت اللہ خاں کا پھاٹک
۲۰۰	نواب ارادت اللہ خاں المخاطب ارادت مند خاں مشرف الدولہ کی قبر۔ اندرون احاطۂ مدرسہ۔
۲۰۱	نواب موسی یار خاں کی قبر۔ ارادت مند خاں کی قبر کے مغرب جانب۔ نیچے کے چبوترے پر
۲۰۲	مسجد بے نام۔ مدرسۂ ارادت مند خاں میں۔
۲۰۳	سید منصور علی کی قبر۔ محاذی مسجد نمبر ۲۰۴۔
۲۰۴	سیدان والی مسجد۔
۲۰۵	املی والی مسجد۔

نشان سلسلہ	نام عمارات
۱	۲
	کٹڑہ شیخ چاند
۲۰۶	مسجد بے نام۔
	بازار لال کنواں
۲۰۷	میر افضل کی مسجد۔ حویلی میر افضل۔
۲۰۸	سبز مسجد۔ قریب کٹڑۂ آدینہ بیگ
۲۰۹	دروازہ بے نام۔ کٹڑۂ آدینہ بیگ کا داخلی دروازہ
۲۱۰	سنّوجی کی مسجد۔ بازار میں
۲۱۱	لال کنواں۔ سڑک پر۔
۲۱۲	لال مسجد۔ بازار میں۔
۲۱۳	دروازہ بے نام۔ کٹڑہ سپہدار خاں کا
۲۱۴	زینت محل پیر سڑک پر۔
۲۱۵	مسجد بے نام۔ گلی چابک سواراں۔
	مسجد تہور خاں
۲۱۶	تہور خاں کی مسجد۔
۲۱۷	املی والی مسجد۔
	بازار نیا بانس
۲۱۸	شوالا بے نام۔ کوچۂ سنجوگی رام
	محلۂ نیا بانس
۲۱۹	گینڈ وکا مندر۔ کوچۂ سنجوگی رام
۲۲۰	شوالا بے نام۔
۲۲۱	بھیرو کا مندر قریب نمبر ۲۲۰
	کھاری باؤلی
۲۲۲	شوالہ بے نام۔ گلی بتاشاں خورد۔
۲۲۳	مسجد بے نام۔ کوچۂ نواب مرزا جس کو ڈاکٹر فوگل نے کھاری باؤلی کی مسجد لکھا ہے۔
۲۲۴	سرائے بنگش۔ قریب مسجد فتح پوری۔
	مسجد فتح پوری
۲۲۵	مسجد فتح پوری۔ چاندنی چوک کے غربی سرے پر
	بازار فتح پوری
۲۲۶	مسجد بے نام گوندنی کا کٹڑہ بید کے حمام کے پاس
۲۲۷	" ۔ بڑیوں کا کٹڑہ۔
	محلۂ بلّی ماراں
۲۲۸	پنجابیوں کی مسجد۔ حویلی حسام الدین حیدر
۲۲۹	املی والی مسجد۔
۲۳۰	کُپّے والوں کی مسجد۔ گلی کُپّے والاں
۲۳۱	دروازہ بے نام حسام الدین حیدر کی حویلی کا داخلی دروازہ۔
۲۳۲	حکیم شریف خاں کی مسجد۔ قریب مکان حاذق الملک حکیم حافظ اجمل خاں صاحب
۲۳۳	بے نام دروازہ۔ کوچۂ رایان کا داخلی دروازہ
۲۳۴	ایک برجی مسجد۔ کوچۂ رایان۔
۲۳۵	اونچی مسجد۔ نواب صاحب دہارو کی کوٹھی کے پاس
۲۳۶	پیرجی والی مسجد۔ بارہ دری شیر افگن خاں۔
۲۳۷	شوالا ہرد یو داس۔ گلی پاسباں۔
۲۳۸	لالہ فتح سنگھ کا شوالا۔ کوچۂ بی بی گوہر
۲۳۹	لکشمی نراین کا شوالہ۔ "

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۲۴۰	شوالا بے نام - کوچہ بی بی گوہر -
۲۴۱	مسجد بے نام - کوچہ قطبی بیگم
۲۴۲	پیپل مہادیو کا شوالا -
۲۴۳	چرنداسیوں کا مندر -
۲۴۴	شوالا بے نام گلی دل سکھ رائے -
۲۴۵	شوالا بے نام - گلی دستاں -
۲۴۶	ہنومان جی کا مندر - پیپل مہادیو -
۲۴۷	راجہ جی کا مندر - ″
۲۴۸	رگھو مصر کا شوالا - ″
۲۴۹	مسجد بے نام - چھتہ صوفی - پیپل مہادیو -
۲۵۰	کپتان والی مسجد - بارہ دری شیر افگن خاں
	گلی قاسم جان
۲۵۱	مسجد بے نام - مدرسہ عنایت اللہ -
۲۵۲	نواب احمد سعید خاں کی مسجد -
۲۵۳	دروازہ بے نام داخلی حویلی کالے صاحب
۲۵۴	کروڑیے کی مسجد -
	گلی حکیم بقا
۲۵۵	شوالا بے نام - قریب حوض قاضی
۲۵۶	مسجد بے نام - ایضاً
	چاوڑی بازار
۲۵۷	شادی رام کا مندر کوچہ دیارام -
۲۵۸	سدھو گھوسن کی مسجد - محلہ چرخے والاں -
	اجرٹن روڈ یا نئی سڑک
۲۵۹	سڑک والی مسجد - روشن پورہ -
۲۶۰	رحیم علی وکیل کی مسجد - دائی واڑہ -
۲۶۱	درگاہ والی مسجد - چیرہ خانہ - قریب چھتہ تن سکھ رائے
۲۶۲	صدر جہاں کی قبر - ایضاً
۲۶۳	سدانند دیو کا شوالا - محلہ مالی واڑہ - پتلی گلی -
۲۶۴	دیوان سنگھ کا مندر - چھتہ مکھن لال گوسائیں
۲۶۵	گوما کا شوالا - گلی بھیروں محلہ مالی واڑہ -
۲۶۶	حوض والی مسجد - سڑک پر -
	کوچہ رائمان
۲۶۷	چیل والی مسجد -
۲۶۸	بانچھی والی مسجد -
۲۶۹	اونچی مسجد -
۲۷۰	اناروالی مسجد
	چاندنی چوک[له]
۲۷۱	بے نام دروازہ - حویلی حیدر قلی خاں کا
۲۷۲	مسجد بے نام - کوچہ نیچہ بنداں -
۲۷۳	خلیفہ جی کی مسجد - کوچہ خان چند -
۲۷۴	سنہری مسجد متصل کوتوالی -

له بعض انگریز مصنفوں نے چاندنی چوک سمجھ کر اس کا ترجمہ سلور سٹریٹ کیا ہے جو صحیح نہیں بلکہ اس کا ترجمہ مون لائیٹ سٹریٹ ہونا چاہیئے ۱۲

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۲۷۵	کوتوالی۔
۲۷۶	گرودوارہ سیس گنج سری گرو تیغ بہادر صاحب جی متصل کوتوالی
۲۷۷	خونی دروازہ۔ دریبہ کلاں کا دروازہ بازار چاندنی چوک کی طرف۔
۲۷۸	مندر بے نام۔ کوچہ سکھانند۔
۲۷۹	موہن لال گوسائیں کا مندر۔ ایضاً
۲۸۰	گلاب رائے مہر چند کا مندر۔ ایضاً
	مالی واڑہ
۲۸۱	ساول جی کا شوالہ۔ بھوج پورہ۔
۲۸۲	مندر بے نام۔ بید واڑہ۔
۲۸۳	غس بہائی مسجد۔
۲۸۴	حکیم اجیت سنگھ اور جیون سنگھ کا مندر
۲۸۵	جوہریوں کا مندر۔ ٹوٹ گھرا محلہ۔
	چیرہ خانہ
۲۸۶	مسجد بے نام۔ چھتہ من گوپال کے قریب
۲۸۷	جوہریوں کا مندر۔
۲۸۸	مسجد بے نام۔
۲۸۹	ایضاً۔
۲۹۰	شہتوت والی مسجد۔ گلی متوالی۔
۲۹۱	شوالا بے نام۔ چیل پوری۔
۲۹۲	مسجد بے نام۔
۲۹۳	لالہ نبی مصر لال کا شوالا۔
۲۹۴	چودھری بہت سنگھ کا شوالا۔
۲۹۵	کھجور والی مسجد۔
۲۹۶	جینیوں کا مندر۔
	دھرم پورہ
۲۹۷	توپ خانے والا شوالا۔
۲۹۸	چندی مصر کا شوالا۔
۲۹۹	توپ خانے والا مندر دوسری لالہ گوسائیں کا مندر پہاڑ والی گلی کے نکڑ پر
۳۰۰	شوالا بے نام۔ گلی پہاڑ والی خورد۔
۳۰۱	جینیوں کا مندر المعروف بہ نوا مندر چیل پوری
	چھتہ شاہجی
۳۰۲	مسجد بے نام۔ شاہ بولا کے بڑ کے قریب
۳۰۳	شاہ جی کا مکان۔
	نائی واڑہ
۳۰۴	گھانسی کا شوالا۔
	چھیپی واڑہ کلاں
۳۰۵	باباجی کا شوالا۔
۳۰۶	بالا والا شوالا۔
۳۰۷	جھجھر والے کا مندر
۳۰۸	صاحب سنگھ کا مندر
	رہٹ کا کنواں
۳۰۹	چاندی والوں کی مسجد۔
	چھتہ پرتاب سنگھ یا گلی پیپل والی

نشان سلسلہ	نام عمارات
۱	۲
۳۱۰	نائی کا شوالا - گلی پیپل والی -
۳۱۱	باباجی رام کا مندر نمبر ۳۱۲ کے پاس -
۳۱۲	مندر سیتل پوری -
۳۱۳	بڑ والی مسجد -
۳۱۴	راجوں کی مسجد -
	کناری بازار
۳۱۵	لالہ شام لال کا شوالا - چیل پوری
۳۱۶	جوہریوں کا مندر - ایضاً
	دریبہ کلاں
۳۱۷	نواب صاحب کی مسجد
۳۱۸	مندر ٹھاکر کیسو رادھو المعروف بہ گجراتی مندر
	لٹو شاہ کا تکیہ
۳۱۹	مسجد بے نام - شروع کا کٹرہ
۳۲۰	" - گلی گنجس
۳۲۱	بدرالدین مہرکن کی مسجد -
۳۲۲	جینیوں کا مندر - کوچہ سیٹھ -
۳۲۳	ایضاً - ایضاً
۳۲۴	چوڑی والوں کی مسجد -
۳۲۵	دروازہ بے نام - کوچہ استاد حامد کا داخلی دروازہ
۳۲۶	مسجد بے نام کوچہ استاد حامد
	جامع مسجد
۳۲۷	جامع مسجد -

نشان سلسلہ	نام عمارات
۱	۲
	پریڈ گراؤنڈ
۳۲۸	ہرے بھرے صاحب کا مزار - جامع مسجد کے شرقی دروازے کے سامنے -
۳۲۹	صوفی سرمد کا مزار - ایضاً
۳۳۰	سید شاہ محمد عرف ہنگا .نی کی قبر - نمبر ۳۲۸ و ۳۲۹ کے پاس -
۳۳۱	شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کا مزار جامع مسجد اور قلعے کے بیچ میں -
۳۳۲	سید بھورے شاہ کی قبر قلعے کی فصیل کے پیچھے خندق کی دوسری طرف - قلعے کے لاہوری اور دلی دروازے کے درمیان -
۳۳۳	اردو کا مندر قلعے کے لاہوری دروازے کے پاس
۳۳۴	آپا گنگا دھر کا مندر - ایضاً
	شہر دہلی - چاندنی چوک کے شمال میں
۳۳۵	رام رام کا مندر - مادھو داس کے باغیچے کے سامنے
۳۳۶	مادھو داس کا مندر -
	کوڑیا پُل
۳۳۷	بے نام شوالا - چاہ اندارا -
۳۳۸	مسجد بے نام - سرائے توپ خانہ -
	چاندنی چوک
۳۳۹	جھجھر والے کا مندر - چوک میں -
۳۴۰	ملکہ یا بیگم کا باغ -
۳۴۱	فریجاس کی مسجد - کوچہ قابل عطار ملکہ کے باغ کے پاس -

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۳۴۲	مسجد بے نام - گلی سیدانی
۳۴۳	دروازہ بے نام - کوچۂ گھانسی رام کا داخلی دروازہ
	محلۂ کچا باغ
۳۴۴	حکیم مہر علی شاہ کی مسجد -
۳۴۵	شاہ عبد اللطیف کا مقبرہ - مہر علی کی مسجد کے احاطے میں -
۳۴۶	امر سنگھ کا شوالا - کوچۂ مہاجنی -
	نٹووں کا کوچہ
۳۴۷	بے نام شوالا -
۳۴۸	امام باڑہ -
۳۴۹	بے نام مسجد - امام باڑے کے قریب -
	کٹڑۂ نیل
۳۵۰	بے نام مسجد -
۳۵۱	گورکھنا تھ مصر کا شوالا - گلی دھوبیان
۳۵۲	بے نام شوالا - ایضاً
۳۵۳	جھبّا مصر کا مندر - بیجو بھائی کی گلی -
۳۵۴	بڑا شوالا -
۳۵۵	مسجد بے نام - گلی تعلیان کے سامنے -
۳۵۶	چھوٹا مندر جو بھانو کما جی کا مندر بھی کہلاتا ہے - گلی گنیشور مہادیو -
۳۵۷	بڑا مندر ریالا ڈلی جی کا مندر - گلی مذکور -
۳۵۸	شوالا گنیشور مہادیو - ایضاً -
۳۵۹	دھومی مل کھتا کا شوالا -

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۳۶۰	مانک چند اور دسویسر ناتھ کا شوالا -
۳۶۱	رنگی مصر کا شوالا - نئی بستی -
	محلۂ کوچۂ گھانسی رام
۳۶۲	بھیروجی کا مندر -
۳۶۳	سراون کا شوالا -
۳۶۴	منشی بھوانی شنکر کا مکان المعروف بہ نمک حرام کی حویلی -
۳۶۵	مانک چند کھتری کا مندر -
	بازار فتح پوری
۳۶۶	بھوانی شنکر کی کچہری -
۳۶۷	جوتی پرشاد کا مندر -
	گندی گلی
۳۶۸	وشیشور ناتھ کا شوالا - نیبے کی گلی -
۳۶۹	کالی پرشاد کا شوالا -
	بازار کھاری باؤلی
۳۷۰	گوری شنکر کا شوالا - کٹڑۂ میدہ گراں -
	پھاٹک حبش خاں
۳۷۱	حبش خاں کا پھاٹک -
۳۷۲	ایک برج کی مسجد -
۳۷۳	میاں صاحب کی مسجد - دھوبی کا کٹڑہ - میاں صاحب سے مراد مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی ہیں -
۳۷۴	پھاٹک بے نام - گلی تیلیوں کا داخلی دروازہ -

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۳۷۵	رمضان شاہ کی مسجد۔ کوچۂ مولوی قاسم
۳۷۶	محتسب کی مسجد۔ ایضاً
	محلۂ پیٹے والاں
۳۷۷	ایک برجی مسجد۔ فصیلوں کے پاس
	نہر سعادت خاں
۳۷۸	مسجد بے نام۔ کابلی دروازے اور پولیس کے تھانے کے پاس۔
۳۷۹	ساربان کی مسجد۔ لالہ نارائن داس کے کٹڑے کے سامنے۔
۳۸۰	نارائن داس کا مندر۔ ڈفرن برج کے پاس۔
۳۸۱	پھاٹک نہر سعادت خاں۔ حویلی نواب وزیر کا داخلی دروازہ۔
۳۸۲	بارہ دری نواب وزیر۔ نمبر ۳۸۱ کے پاس۔
۳۸۳	پھاٹک بے نام۔ رنگ محل کا شمالی داخلی دروازہ نمبر ۳۸۱ کے پاس۔
۳۸۴	ایضاً۔ رنگ محل کا مغربی دروازہ۔ نمبر ۳۸۱ کے پاس۔
۳۸۵	ایضاً۔ گلی تیلیان اور گمی کے کٹڑے کا داخلی دروازہ۔
۳۸۶	ایضاً۔ گمی کے کٹڑے کا داخلی دروازہ

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۳۸۷	غازی الدین خاں کی مسجد جو اب مولوی حفیظ اللہ خاں کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ نہر پر محاذی نمبر ۳۸۱۔
	سڑک موری گیٹ
۳۸۸	مسجد رائے بیل۔ کوچۂ معظم خاں۔
۳۸۹	شیعوں کی مسجد۔
	موری دروازہ
۳۹۰	امام باڑہ نواب سید احمد مرزا۔ دھوبی واڑہ
۳۹۱	غلام نبی کی مسجد۔ محلۂ ڈوروالاں۔
۳۹۲	بڑھیا کی مسجد۔ ایضاً
	گندا نالہ
۳۹۳	بڑ والی مسجد۔
۳۹۴	تکیئے والی مسجد۔
	کشمیری دروازہ
۳۹۵	مولوی محمد باقر کی مسجد۔ گلی پنجہ۔
۳۹۶	درگاہ پنجہ شریف۔ ایضاً
۳۹۷	مرزا محمد کی قبر۔ گلی پنجہ۔
۳۹۸	ابوالقاسم کی قبر۔
۳۹۹	مولوی عطاء اللہ کی مسجد۔
۴۰۰	مقبرۂ نامعلوم۔ کھڑکی ابراہیم علی خاں چاپی گنج۔
۴۰۱	مسجد نامعلوم۔
۴۰۲	صوفی جی کی مسجد۔ کنجنیوں کی گلی۔

نشان سلسلہ	نام عمارت
۱	۲
۴۰۳	شوالا بے نام - کنجنیوں کی گلی
۴۰۴	مسجد بے نام - ایضاً
۴۰۵	مسجد پانی پتیاں - کشمیری دروازہ
۴۰۶	فخر المساجد - ایضاً
۴۰۷	کشمیری دروازہ - شہر کا شمالی داخلی دروازہ -
	ہیملٹن روڈ
۴۰۸	حامد علی خاں کی مسجد - سڑک پر -
	لوتھین روڈ
۴۰۹	دارا شکوہ کا کتب خانہ - ایضاً
۴۱۰	**فصیل گرد شہر** عہد شاہجہاں - یہ فصیل پہلے پتھر اور گارے سے سنہ ۱۰۶۰ھ / ۱۶۵۰ء میں ڈیڑھ لاکھ کے صرف سے چار سال میں بنی تھی - جو کثرت بارش سے جلد گر گئی اور پھر سات برس کے عرصے میں چار لاکھ کی لاگت سے از سر نو پختہ بنی - یہ فصیل ۶۶۶۴ گز لمبی - چار گز چوڑی اور نو گز اونچی ہے جس میں (۲۷) برج تقریباً تیس فیٹ اونچے ہیں - شہر کے چودہ دروازے اور چودہ ہی کھڑکیاں تھیں - مارٹلو قسم کے برج اور بڑے بڑے برج انگریزوں نے جب دہلی پر مرتبۂ اول قبضہ کیا تب بنے تھے -

قطعۂ تاریخ از جناب حافظ محمد یعقوب صاحب اوج گیاوی

مکرم بشیر احمد ذی حشم — سپہر کرم - مہر مجد و علا

تصانیف ان کی ہیں سب لاجواب — گراں قدر مثلِ دُرِ بے بہا

مورخ سخن سنج ناظم ادیب — ہر اک فن میں خالق نے یکتا کیا

وہ تاریخ میں لکھی نادر کتاب — کہ دہلی کا نقشا ہے گویا کھچا

لکھا اوج نے مصرعِ سالِ طبع

یہ تاج التواریخ سے دل ربا

۱۹ ۱۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا[۱]

دیباچہ

بنام آں کہ دل را نقد جاں داد　　　سخن را زندگی جاوداں داد

یَا مَنْ تَقَدَّسَ عَنِ الْاَشْبَاہِ ذَاتُہٗ وَتَنَزَّہَ عَنْ مُشَابَہَۃِ الْاَمْثَالِ صِفَاتُہٗ[۲] یَا مَنْ دَلَّتْ عَلٰی وَحْدَانِیَّتِہٖ اٰیَاتُہٗ وَشَہِدَتْ بِرُبُوْبِیَّتِہٖ مَصْنُوْعَاتُہٗ وَاحِدٌ لَا مِنْ قِلَّۃٍ وَمَوْجُوْدٌ لَا مِنْ عِلَّۃٍ یَا مَنْ ھُوَ بِالْبِرِّ مَعْرُوْفٌ وَبِالْاِحْسَانِ مَوْصُوْفٌ مَعْرُوْفٌ بِلَا غَایَۃٍ وَمَوْصُوْفٌ بِلَا نِہَایَۃٍ اَوَّلٌ قَدِیْمٌ بِلَا ابْتِدَاءٍ وَاٰخِرٌ کَرِیْمٌ بِلَا انْتِہَاءٍ وَغَفَرَ ذُنُوْبَ الْمُذْنِبِیْنَ کَرَمًا وَحِلْمًا یَا مَنْ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ یَا دَائِمًا بِلَا فَنَاءٍ وَیَا قَائِمًا بِلَا زَوَالٍ وَیَا مُدَبِّرًا بِلَا وَزِیْرٍ لَا اُحْصِیْ عَلَیْکَ ثَنَاءً اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ عَزَّ جَارُکَ وَجَلَّ ثَنَاؤُکَ وَتَقَدَّسَتْ اَسْمَاؤُکَ۔

---

[۱] اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ) سے نہ ہٹواتا رہتا تو (نصاری کے) صومعے اور گرجے اور (یہودیوں کی) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ ۱۲

[۲] اے وہ کہ پاک ہے مثلوں سے ذات جسکی اور پاک ہیں مشابہت مثالوں سے تعریفیں اسکی اے وہ کہ دلالت کرتی ہیں اسکی وحدانیت پر اس کی نشانیاں اور گواہی دیتی ہیں اس کے پروردگار ہونے پر اسکی کاریگریاں اکیلا ہے نہ بوجہ قلت کے اور موجود ہے نہ بوجہ کسی علت کے اے وہ کہ ساتھ نیکی کے مشہور ہے اور ساتھ احسان کے تعریف کیا گیا ہے۔ پہچانا گیا ہے بے حد اور تعریف کیا گیا ہے بے انتہا۔ پہلا ہے قدیم بے ابتدا کے اور پچھلا ہے بزرگ بے انتہا کے اور بخشے اس نے گناہ گناہگاروں کے کرم اور بردباری سے اے وہ جس کے مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اے ہمیشہ رہنے والے بغیر فنا کے اور اے قائم رہنے والے بغیر زوال کے اور اے تدبیر کرنے والے بغیر وزیر کے۔ نہیں گھیر سکتا کوئی تیری تعریف جیسے کہ خود تعریف کی تو نے اپنی غالب ہے پناہ تیری اور بڑی ہے تعریف تیری اور پاک ہیں نام تیرے

وَعَظُمَ شَانُکَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُکَ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَاءُ بِقُدْرَتِهٖ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ بِعِزَّتِهٖ اَلَا اِلَی اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُکْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ

حمد

لوامعِ صفتش بست چشم پوشِ عقول
حکیم گفت شناسم بعقل یزداں را
بکنہِ حق نرسد عارف ارچہ داند ہست
بہر صحیفۂ برگ ست نورِ حکمت او

چو آفتاب کہ نورش حجابِ ابصارست
زہے کمالِ حماقت وہ ایں چہ گفتارست
بر آسماں نپرد جعفر ارچہ طیارست
نوشتہ چوں لقبِ شہ بروے دینارست

نعت

وصفِ شرفِ تو بیش از ادراک آمد
توقیعِ تو کز صحیفۂ پاک آمد

سبقِ ادبت نعبد ایاک آمد
لولاک لما خلقت الافلاک آمد

از عزّ محمد ار نداری خبرے
اللہ و محمد ست پیوستہ بہم

کن از رہِ عقل در شہادت نظرے
یعنی کہ میانِ شاں نہ گنجد دگرے

دل و دلی گرچہ ہیں دونوں خراب
پہ کچھ لطف اس اجڑے گھر میں بھی ہے

یَا مَنْ یُّسَائِلُ عَنْ دِهْلِیْ وَرِفْعَتِهَا
عَلَی الْبِلَادِ وَمَا حَازَتْهُ مِنْ شَرَفٍ
اِنَّ الْبِلَادَ اِمَاءٌ وَهِیَ سَیِّدَةٌ
فَاِنَّهَا دُرَّةٌ وَالْکُلُّ کَالصَّدَفِ

ؔ؎ اور بڑی ہے شان تیری اور نہیں کوئی معبود سوائے تیرے کرتا ہے جو چاہتا ہے اپنی قدرت سے اور حکم کرتا ہے جو چاہتا ہے اپنی قوت سے آگاہ رہو کہ اللہ ہی کی طرف پھرتے ہیں سب کام۔ ہر شے فنا ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے اسی کے لیے ہے حکم اور اسی کی طرف تم سب پھروگے۔

ؔ؎ اے وہ شخص جو دہلی کے حالات اور دوسرے شہروں پر اسکی رفعت اور شرف کے متعلق استفسار کرتا ہے۔

ؔ؎ بیشک تمام شہر باندیاں ہیں اور دہلی ان کی ملکہ ہے اور بے شک دہلی کی مثال ایک موتی کی سی ہے باقی شہر وہ رنمہ سیپ ہیں۔

فَاقَتْ بِلَادَ الْوَرٰی حُسْنًا وَّمَنْقَبَةً
سُکَّانُهٗ جَمَالُ الْاَرْضِ قَاطِبَةً
بِهَا مَدَارِسُ لَوْ طَافَ الْبَصِیْرُ بِهَا
کَمْ مَسْجِدٍ زُخْرِفَتْ فِیْهَا مَنَارَتُهٗ
لَاغَرْوَ اِنْ زُیِّنَتِ الدُّنْیَا بِزِیْنَتِهَا
وَمَاءُ جَوْنٍ جَرٰی مِنْ تَحْتِهَا لَحِکٰی

غَیْرَ الْحِجَازِ وَغَیْرَ الْقُدْسِ وَالنَّجَفِ
خَلْقًا وَّخُلْقًا بِلَا عُجْبٍ وَّلَا صَلَفٍ
لَمْ تَنْفَتِحْ عَیْنُهٗ اِلَّا عَلَی الصُّحُفِ
لَوْ قَابَلَتْهُ شُمُوْسُ الضُّحٰی تَنْکَسِفُ
کَمْ مِنْ اَبٍ قَدْ عَلَا بِابْنٍ ذَوِیْ شَرَفٍ
اَنْهَارَ خُلْدٍ جَرَتْ فِیْ اَسْفَلِ الْغُرَفِ

جس طرح کسی نئے شخص کا تعارف کرایا جاتا ہے اسی طرح کسی کتاب کی تقریب دیباچے کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصہ ایک اجمالی تاریخ ہندوستان کے بادشاہوں کی ہے اور دوسرے میں آثار قدیمہ شہر دہلی کا مفصل بیان ہے۔ قبل اس کہ میں نفس کتاب کی نسبت کوئی تمہید لکھوں ضرور ہے کہ میں اس کتاب کی تدوین کی غرض وغایت کا اظہار کروں۔ بادی النظر میں اس کتاب کی نسبت ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب سرسید احمد خاں علیہ الرحمۃ جیسا نامور شخص اس مضمون پر آثار الصنادید جیسی مستند اور مکمل کتاب لکھ چکا ہے تو کسی اور کا اس میدان میں قدم فرسائی کرنا تحصیل حاصل ہے۔ میں کیا سب مانتے ہیں کہ اس موضوع پر آثار الصنادید سے بہتر تو کیا برابر کی کتاب بھی لکھنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لیکن یہاں نہ برابری کا خیال ہے نہ برتری کا خبط وہ تو سرسید ہی کا حصہ تھا دوسرا کوئی کیا لکھ سکتا ہے ؎ وہ بات کوہ کن کی گئی کوہ کن کے ساتھ۔

لے یہ تمام شہروں سے عزت اور منقبت میں فوق لے گئی ہے سوائے مکہ مدینہ۔ بیت المقدس اور نجف کے
لے اس کے رہنے والے یقیناً زمین کی خوب صورتی اور رونق ہیں خلقۃً اور اخلاقاً ان میں تکبر اور شیخی نہیں ہے۔
لے اس میں اتنے مدرسے ہیں کہ اگر دیکھنے والا اس میں گشت لگائے تو جدھر دیکھے گا قرآن ہی قرآن نظر پڑیں گے۔
لے بہت سی مسجدیں ایسی ہیں کہ جن کے مینار اپنے بڑی رونق ہیں کہ اگر ان کے مقابل میں آفتاب بھی آجاتا تو اسکو گہن لگ جاتا
لے دنیا کا اس (شہر) کی زینت سے مزین ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں کیونکہ بہت سے باپ ایسے نکلیں گے جو شریف بیٹے کی وجہ سے ممتاز ہو گئے۔
لے دریائے جمن کا پانی اس کے نیچے بہتا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ جنت کی کھڑکیوں کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔

یہ عربی اشعار جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز محدث دہلوی کے ہیں جنکو ہم نے تیمناً و تبرکاً درج کر دیا کہ ان کے کلام کی برکت سے خدا کرے کہ یہ کتاب بھی مقبول عام ہو جائے۔

فَلَوْ قَبْلَ مَبْکَاھَا بَکَیْتُ صَبَابَةً	شَفَیْتُ النَّفْسَ قَبْلَ اَلتَّنَدُّمِ
وَلٰکِنْ بَکَتْ قَبْلِیْ فَھَیَّجَ لِیَ الْبُکَاءُ	بُکَاھَا فَقُلْتُ اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّمِ

لیکن باوجود اِس کے میں نے اسقدر مبسوط کتاب رکھی ہے لکھی یہ آخر کیوں ؟
میری کتاب واقعات مملکت بیجاپور جو ملک دکن کی بہت بڑی تاریخ تین جلدوں میں ہے میری توقع سے بہت زیادہ مقبول ہوئی چنانچہ اعلیٰحضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی حضور نظام دام اقبالہم سے ہزار روپیہ انعام ملا اور کتاب کے نصیب جاگے کہ ذرۂ بے مقدار خورشید بنا یعنی اپنے مبارک نام سے منسوب کرنے کی اجازت بھی سرفراز ہوئی۔ سر جان مارشل صاحب بہادر ڈایرکٹر جنرل آثار قدیمہ نے کتاب ملاحظہ فرما کر بہت کچھ اظہار پسندیدگی فرمایا اور لکھا کہ ایسی کتاب جس میں بہت سی نئی باتیں ہیں اس سے پہلے کسی نے نہیں رکھی۔ ہز اکسلینسی لارڈ ہارڈنگ نواب گورنر جنرل بہادر بندے ایک نسخے کی نذر قبول فرمائی۔ رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے اپنے قابل قدر و فخر زمرے میں اس ناچیز کو شامل کر کے ہم چشموں میں عزت بڑھائی۔ غرض یہ کہ حوصلے سے زیادہ داد پائی۔ شدہ شدہ یہ کتاب صوبۂ دہلی کے حاکم اعلیٰ دی آنریبل ڈبلیو ایم ہیلی صاحب بہادر۔ سی اس آئی۔ سی آئی ای چیف کمشنر کی نظر انور سے گزری پسندیدگی کے ہاتھوں لیا اور قدر دانی کی نگاہ سے ملاحظہ فرمایا خاکسار خانہ نشین کو شرف باریابی بخشا اور زبان گوہر فشاں سے ارشاد ہوا کہ تو ایک بڑے لایق و فایق اور نامور مصنف باپ کا بیٹا ہے اور تو بھی صاحب تصنیف و تالیف ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جس نہج پر تو نے تاریخ بیجاپور لکھی ہے اُسی اہتمام سے دلی کی بھی ایک تاریخ لکھ کیوں کہ بہ حیثیت تیرا وطن ہونے کے دلی کا تجھ پر حق ہے اور تیرا فرض اولین ہے کہ اس کام کو پورا کرے اور چونکہ ما بدولت کو شہر دہلی سے ایک خاص اُنس اور اسکی بہبودی و فلاح کی طرف میلان خاطر ہے یہ کام تیرے ہاتھ سے جلد پورا ہو اور ساتھ ہی اس کے فرط نوازش سے محکمۂ آثار قدیمہ کے نام ایک چٹھی لکھ دی کہ مجھے جس قسم کا مواد درکار ہو یا مدد مطلوب ہو دیجائے۔ یہ کام جیسا مہتمم بالشان ہے ظاہر ہے میں اپنی کم مایگی سے خوب واقف تھا:۔

سلہ پس اگر پیش از گریۂ آں حامہ گریہ می کردم از سوز عشق بہ محبوبہ کہ نامش سعدی است شفا می دادم نفس خود را لیکن گریست حامہ پیش از من پس برانگیخت مرا بگریہ گریۂ آں پس گفتم بزرگی برائے متقدم است۔ ۱۲

آئینۂ خویش را بصیقل دادم	روشن کردم بہ پیش خود بنہادم
در آئینہ عیب خویش چنداں دیدم	کز عیب کسے دگر نیامد یادم

لیکن بمصداق اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَب لب کشائی کا کیا موقع تھا عذر و معذرت داخل گستاخی تھا سر تسلیم خم کیا اور زبانِ حال سے عرض کیا:۔

انسان کو کہتے ہیں کہ ہے بندۂ احساں	یعنی کہ ہم آوازۂ گنبد کی صدا ہیں
گر شاہ کرے لطف و عنایت تو رعایا	تسلیم و اطاعت میں غلاموں سے سوا ہیں
خود تم کو نہیں مال و زر و سیم کی پروا	اور ہم بھی ادھر مفلس و بے برگ و نوا ہیں
لیکن دل و جان کہتے ہیں اور دونوں کے دو ہیں	سچ مانا قربان ہیں تم تجھ سے فدا ہیں
کیا ہو سکے احسانِ گورمنٹ کا بدلہ	بس جہدِ مقل یہ ہی کہ مصروف دعا ہیں
جس عہد میں ہم امن سے بیٹھے ہیں الٰہی	قایم رہے جبتک فلک ارض و سما ہیں
ہیلی کو خدا لاٹ کرے سب کہو آمیں	اس کشتیِ طوفاں زدہ کے ناخدا ہیں

مختصر یہ کہ کتاب لکھنی شروع ہوئی اور بایں ہمہ ایقان کہ سرسید کی کتاب لاجواب ہے اس قدر بسوط لکھی پر لکھی۔ مخفی نہ رہے کہ سرسید کا پہلا ایڈیشن آثار الصنادید کا ۱۲۶۳ھ میں شائع ہوا یعنے غدر سے پہلے جسے آج پورے بہتر برس ہوئے۔ اس پون صدی میں دنیا میں جو جو انقلاب ہوئے اور زمانے نے جو کچھ ترقی کی وہ قدرتِ الٰہی کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے سب سے بڑی کروٹ یا لوٹ تو زمانے یہ لی کہ مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ کر وہ سلطنت قایم ہوئی کہ جس پر دن رات میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا پھر جہاں بین کاوش و تلاش تفحص و تفتیش اس درجے پر پہونچی کہ ایک محکمہ آثار قدیمہ کا اسی غرض سے قایم ہوا جنھوں نے چپہ چپہ اور کونا کونا زمین کا کھوند مارا۔ لارڈ کرزن کی پچھلی یادگاروں کو تازہ کرنے اُن کے آثار کو قایم رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ آج جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ گری پڑی عمارتیں درست ہو رہی ہیں اُن کی نگہداشت کا انتظام بلیغ ہے۔ لاکھوں روپیہ زمانۂ سلف کی عمارت کو قایم و برقرار رکھنے میں بے دریغ صرف ہو رہا ہے یہ سب حسنات **لارڈ کرزن** کے نامۂ اعمال میں مستزاد ہو رہی ہیں۔ قدیم زمانے کے راجہ۔ بادشاہ۔ شہنشاہ سب کی ارواح مقدسہ خوش ہو رہی ہیں کہ ہمارے نام کی بقا اور دوام کے لیئے برٹش گورمنٹ کا یہ کچھ احسان ہے سبحان اللہ کیا تیری شان ہے۔ اس محکمے کے حکام نے دبی ہوئی

عمارتوں کو کُھد والکُھدوا کر نکلوایا۔ نئے نئے کتبے نکلے پُرانے پُرانے سکّے ملے فرامین دستیاب ہوئے جس سے امتدادِ زمانے کی گہری گھٹا چھٹ گئی مطلع صاف ہو گیا دُھندلاہٹ جاتی رہی اور آفتاب کے نورانی چہرے سے ظلمات کا نقاب اُٹھ گیا اور جو باتیں اس زمانے میں خواب وخیال میں بھی نہ تھیں مثل روزِ روشن کے آشکارا ہو گئیں۔ دُنیا کی کایا پلٹ ہو گئی۔ معلومات کے خزائن پُر ہو گئے۔ سرسید نے جو لکھا اس زمانے میں انھیں کی جستجو اور طول تھی جو اب بھی سینوں کے بند گنجینوں اور زبانوں سے زبانِ قلم پر آگیا لیکن روز بروز جو دریافت اور ایجاد میں ترقی ہوتی چلی جارہی ہے تو لامحالہ آثار الصنادید کے نقشِ اولین میں نمایاں کمی دکھلائی دے رہی ہے میں مثالاً عرض کرتا ہوں کہ کلام مجید کے دو بہترین اُردو کے ترجمے جناب شاہ عبدالقادر صاحب وشاہ رفیع الدین صاحبان رحمہا اللہ تعالیٰ کے موجود تھے لیکن پھر بھی میرے والد ماجد (مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم مغفور) نے ایک اور ترجمہ کا کلام مجید کا کیا۔ جو ضرورت ایک جدید ترجمے کی تھی وہ یہی تھی کہ زبانِ اردو نے جب سے اب تک بہت کچھ ترقی کی ہے اور پہلے سے بہت نیا دہ آراستہ وپیراستہ ہو گئی ہے۔ ہر دو حضرات موصوفین کے ترجمے پُرانے ہو جانے کی وجہ سے اُکھڑے اُکھڑے معلوم دیتے تھے اور زمانے کی مانگ ایک ایسے ترجمے کی تھی جو اس زمانے کی بول چال کی پوری مثال ہو۔ بجنسہٖ یہی ضرورت مجھے اس کتاب کے لکھنے کی محسوس ہوئی۔ ناظرین خود دیکھ لیں گے کہ آثار الصنادید سے اس میں کس قدر زیادہ اور نیا مواد ہے اور اس پچہتر برس میں کیسی کیسی نئی باتین پردۂ خفا سے معرضِ ظہور میں آئی ہیں۔ بہر حال یہ کتاب آپ ٹو ڈیٹ (الی یومنا ہذا) ہے۔ سو پچاس برس بعد یہ بھی تقویم پارینہ ہو جائے گی اور یہی سلسلہ الیٰ غیر النہایۃ جاری رہے گا۔ یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ سلاطین خاندان مغلیہ سے بڑھ کر ہندوستان یا ہندوستان کی جگہ دُنیا بھی کہوں تو کچھ بے جا نہیں کسی بادشاہ نے ایسی خوش وضع۔ عالی شان۔ سربفلک عمارتیں کہ جن کے شوقِ دید میں لوگ آئے دن جوق جوق کھنچے چلے آتے ہیں اور جن سے تاج گنج آج بھی سب عمارتوں کا تاج اور دُنیا کی سات عجائبات میں کا ایک عجوبہ مانا گیا ہے۔ نہیں بنائیں۔ اور نہ اس کثرت سے اپنی دوامی یادگاریں صفحۂ دُنیا پر چھوڑیں۔ خدا جانے کس بلا کی دولت ان کے ہاں اُمنڈ آئی تھی کہ جس کا حد وحساب نہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیسے کیسے نادر کاریگران کو میسر آئے کہ جن کے ہاتھ چومنے کے قابل ہیں۔ اور ان کا مذاقِ فن تعمیر کیسا عمدہ نفیس اور اچھوتا تھا کہ آج بھی باوجودیکہ

فن انجینیری نے بالشوں ترقی کی ہو لیکن ان کا ڈِزائین - استحکام - بناوٹ - سجاوٹ
دیکھ کر سب انگشت بدہاں ہیں اور سب ان کی عمدگی ہر یک زباں ہیں - رطب اللسان
ہیں اور دُنیا کا متفقہ فیصلہ اگر ہی تو یہی کہ یہ لوگ
The greatest architects of the world تھے اور جن لوگوں نے ان
عمارتوں کو دیکھا ہو بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں کہ ”سلاطین ہند بادشاہی نمی کنند
بلکہ خدائی می کنند“
دُنیا کا کارخانہ ایک عجیب وغریب طلسم حیرت ہی - یہاں کسی کو قرار نہیں ایک آتا ہی ایک جاتا ہی
یہی تانتا لگا ہوا ہی - ایک قوم گرتی ہی اور ایک اُبھرتی ہی -

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

بِذَا قَضَتِ الْاَيَّامُ مَا بَيْنَ اَهْلِهَا — مَصَائِبُ قَوْمٍ عِنْدَ قَوْمٍ فَوَائِدُ

بڑے بڑے بادشاہ جن کی سطوت اور جبروت کا ڈنکا بجتا تھا اور جن کی ہیبت سے
دل دہل جاتا تھا اور جن کے اشارۂ چشم پر تہ وبالا ہو جاتا تھا آج وہ بھی ایک معمولی سے
معمولی شخص کے برابر منوں مٹی کے تلے دبے پڑے ہیں :-

چو آہنگِ رفتن کند جانِ پاک — چہ بر تخت مردن چہ بر روے خاک

اُن کی بادشاہت - اُن کے خزائن عامرہ - اُن کے لاؤ لشکر - اُن کے حشم خدم حوالی
موالی - اُن کو رتی برابر بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتے :-

گرفتند عالم بہ مردی و زور — ولیکن نبردند با خود بگور

پس اس عالم فانی میں اگر کسی کی یادگار کو کچھ قیام ہو تو اُس کی شکل یہی خیر جاریہ تعمیر
عمارات مساجد و معابد وغیرہ کی ہو جن کا ذکر اس کتاب میں ہو اور جن کی بدولت آج تک
اُن لوگوں کے اسامی گرامی دل وزبان پر کالنقش فے الحجر ہیں اور جن کو دیکھ دیکھ کر
ہمارے سبق حاصل کرتے ہیں اور اُن کا دلفریب منظر ہماری غفلت کا تازیانہ ہوتا
ہی اور ہمارے منہ سے صدائے احسنت کی بلند ہو جاتی ہی :-

دوشس بعقل درسخن بودم	کشف شد بر دلم مثالے چند
گفتم اے مایۂ ہمہ دانش	دارم الحق بتو سوالے چند
چیست ایں زندگانیِ دنیا	گفت خوابیست یا خیالے چند

گفتم از وے چہ حاصل ست بگو	گفت دردِ سر و بلائے چند
گفتم این نفس کے شود رامم	گفت چوں یافت گوشمالے چند
گفتم اہل ستم چہ طائف اند	گفت گرگ و سگ و شغالے چند
گفتم این بحثِ اہلِ دنیا چیست	گفت بیہودہ قیل و قالے چند
گفتم اہلِ زمانہ در چہ فن اند	گفت در بندِ جمعِ مالے چند
گفتم اورا مثالِ دنیا چیست	گفت زالے کشیدہ خالے چند
گفتمش چیست گفتۂ خیام	گفت پنداست حسبِ حالے چند

دلی کا ویرانہ پینتالیس مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ جسکے حدود مواضع تغلق آباد مہرولی چندراؤں اور جمنا کا مغربی کنارہ ہوتے ہیں۔ اس عجیب و غریب خطے پر تیرہ دار السلطنتیں عالمِ وجود میں آئیں اور مٹ گئیں:-

ہے جہاں مانندِ مجمر اور ہم مثلِ سپند	اب بھلے جائیں گے آئے اک صدا کہنے کو ہیں

ان تیرہ دار السلطنتوں میں سے ایک تو بفضل خدا اب بھی موجود ہے القبا ہا اللہ تعالیٰ الی آخر الزمان اب رہیں بارہ اُن کی یادگار تو کھنڈر ہیں یا لوگوں کی روایات سے کچھ پتہ چلتا ہے۔

سنہ عیسوی سے پندرہ سو برس پہلے راجہ جدھشٹر نے پانڈوؤں کی ایک بڑی سلطنت قایم کرکے اپنی راج دھانی جمنا کے مغربی کنارے پر بنائی اور اس کا نام **اندرپرست** رکھا۔ جدھشٹر کا خاندان تیس پشت تک حکم راں رہا اس کے بعد تک حرام **وسروا** کے خاندان کا دور دورہ پانڈوؤں کی دار السلطنت میں پانسو برس تک رہا ان کے بعد **گوتم بنسیوں** کا نمبر آیا۔ گوتم خاندان کے ایک شخص سروپ دت نامی نے جو حاکمِ قنوج کی فوج کا لفٹننٹ تھا اپنے راجہ **دیلو** کے نام پر **دلی** شہر بسایا۔ گوتموں کے بعد **دھرم داج یادھر** **لی** دھر نامی شخص کے بناکردہ خاندان کا راج پاٹ ہوا اس خاندان کے آخری راجہ نے اجین کے راجہ سے شکست پائی جن کی حکومت آگے چل کر جوگیوں کے خاندان میں **سمندر پال** پر منتقل ہوئی جوگیوں کے بعد **ملک اودھ** کے **بہرائچ** کے راجاؤں کا دورہ ہوا ان کے بعد **فقیروں** کا خاندان برسرِ حکومت رہا۔ خاندان فقرا کے بعد **بلاول سین** حکم راں رہا سینوں کے خاندان کا قلع قمع **دیپ سنگھ** کوہی سوالک والے نے کیا اُسے **اننگ پال** یا **انیک پال** اول بانی خاندانِ **تنوار** نے دلی سے نکال باہر کیا۔ اننگ پال اول نے

سنہ ۷۳۶ء میں دلی کو از سر نو بسایا۔ اس کے بعد اسی خاندان کے ایک ممبر **اننگ پال دوم** نے سنہ ۱۰۵۲ء میں پھر دلی کو آباد کیا۔ پھر ۹۲ برس تک دلی شمالی ہند کے دارالسلطنت کے مرتبے سے گری اور کس مپرسی کی حالت میں رہی یہ زمانہ وہ ہے جس کی ابتدا راجۂ اجمین کی فتح ہے اور اننگ پال ثانی کا دلی کو دوبارہ آباد کرنا۔ سنہ ۱۱۵۵ء میں تنوار کے خاندان کے آخری راجہ کو **چوہانوں** نے شکست دی۔ خاندان چوہان کے آخری راجہ **پرتھی راج** المعروف **رائے پتھورا** کا نیر اقبال شمالی ہند میں چمکنے لگا۔ اس نے اپنے نام کا ایک قلعہ قلعہ رائے پتھورا نام کا بنایا۔ سنہ ۱۱۹۱ء میں **مسلمانوں** کے بادشاہ **قطب الدین ایبک** نے قطعی طور پر دلی کو فتح کرلیا اور اسی زمانے سے شمالی ہند میں ہندوؤں کے راج کا خاتمہ ہوا۔

قطب الدین ایبک کے بعد پہلے آٹھ بادشاہوں نے قلعۂ رائے پتھورا ہی میں رہ کر حکمرانی کی اور انہوں نے اس قلعے کو اپنی مرضی اور ضروریات کے لحاظ سے درست کرلیا۔ اس میں کئی محل اور ایک مسجد بھی بنائی۔ اب وہ محل تو باقی نہیں البتہ ایک **مسجد** اور **شیر مندل** کا برج رہ گیا ہے اور یہ دونوں عمارتیں غنیمت ہیں کہ اب تک بہت اچھی حالت میں **پرانے قلعے** میں موجود ہیں جو سلاطین اسلام کی عمدہ یادگار اور بہترین نشانیاں ہیں۔ لیکن پرانے قلعے کے چھوڑ کر مسلمانوں کے دسویں بادشاہ بلبن کے پوتے **کیقباد** نے ایک نیا محل **کلوکھری** میں بنایا جو **نئے شہر** کے نام سے مشہور رہا۔ اسی بادشاہ نے رائے پتھورا کے قلعہ کو چھوڑ کر دارالحکومت منتقل کیا۔ اس کے جانشین **جلال الدین خلجی** نے مصالح اور ملکی سے کلوکھری کو محصور کیا اور ترقی دی۔ جلال الدین کے بعد اس کا بھتیجا **علاؤ الدین خلجی** اپنے چچا کی جگہ تخت سلطنت پر بیٹھا اور بہت تھوڑے دنوں قلعہ رائے پتھورا میں رہا۔ اس نے ایک اور ہی قلعہ **سیری** میں بنا کر اپنا دارالسلطنت ٹھیرایا۔ سنہ ۱۳۲۱ء میں علاؤ الدین خلجی کے چھوٹے بیٹے **قطب الدین مبارک شاہ** کو نمک حرام **نصیر الدین خسرو خاں** نے قتل کیا اور سیری میں **قصر ہزار ستون** بنا وہیں تخت پر بیٹھا لیکن خسرو خاں زیادہ سلطنت کی بہار نہ لوٹ سکا اور اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا معاملہ پیش آیا یعنے خسرو خان کو **غیاث الدین تغلق شاہ** نے شکست دے کر تلوار کے گھاٹ اتار دیا اور اپنی دارالسلطنت سیری سے اٹھا **تغلق آباد** کو منتقل کی۔ غیاث الدین تغلق کے بیٹے اور جانشین **سلطان محمد ثالث** نے اپنے باپ کی دارالسلطنت سے تھوڑی ہی دور **عادل آباد** آباد کیا۔ اس کے چند سال بعد اسی بادشاہ نے رائے پتھورا کے قلعے اور

سیری دونوں کو ملا کر ایک اور ایک شہر آباد کیا جس کا نام **جہاں پناہ** رکھا۔ اس کے بھانجے اور جانشین **فیروز شاہ تغلق** نے آبائی دارالسلطنت چھوڑ کر اور ایک بالکل نیا شہر **فیروز آباد** بسایا۔ ۱۳۹۸ء میں **امیر تیمور** نے ہندوستان پر ایک بڑا بھاری حملہ کر کے فیروز آباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی کمزور **سادات** نے جو جنگجو پٹھانوں کے بعد حکمراں ہوئے تو ان کو بھی اپنے نام سے ایک اور شہر بسانے کا شوق ہوا اور خضر خاں نے **خضر آباد** آباد کیا۔ خضر خاں کے بیٹے **مبارک شاہ** نے بس اتنا ہی کیا کہ اس کا نام **مبارک آباد** بدل کر رکھدیا۔ سیدوں کے بعد **لودھی** آئے انہوں نے اپنی کوئی نشانی شہر کی صورت میں نہیں چھوڑی۔ **بہلول شاہ** بانیِ خاندانِ لودھی سیری میں رہتا تھا۔ اس کے بیٹے **نظام خاں سکندر شاہ لودھی** کچھ دنوں تو پرانی دلی ہی میں سلطنت کی پھر آگرے کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا جب **بابر** نے ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان ابراہیم لودھی کو شکست دی تو دہلی میں اپنا ایک نائب چھوڑ کر آگرے ہی کو دارالسلطنت ٹھیرا خود کابل چلا گیا۔ بابر کے بیٹے **ہمایوں** کو افغانوں سے بسر کردگی **شیر شاہ سور** ۱۵۴۰ء میں ہندوستان سے بدر کر دیا چنانچہ ہمایوں پورے چودہ برس جلا وطنی کی حالت میں رہا ہندوستان سے اخراج کے اول ہمایوں نے شہر **دین پناہ** کی تعمیر شروع کردی تھی جب شیر شاہ سور دہلی پر قابض ہو گیا تو اس نے بھی اگلے بادشاہوں کے قدم بقدم ایک نیا شہر **شیر گڑھ یا دہلی شیر شاہی** بنایا ۱۵۴۲ء میں اس کے بیٹے **سلیم شاہ سور** نے دریائے جمنا کے جزیرے پر قلعۂ سلیم گڑھ بنایا۔ ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے پٹھانوں کو شکست دے کر پھر دلی کی سلطنت پر قبضہ پایا۔ پٹھانوں پر فتح یابی کے چھ مہینے بعد ہمایوں بادشاہ نے دین پناہ میں انتقال کیا۔ اب **اکبر اول** جانشین ہوا جو آگرے میں رہا اور وہیں انتقال کیا اور وہیں دفن ہے۔ اکبر کا بیٹا **جہانگیر** بھی آگرے ہی میں رہا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد دلی کے بخت خفتہ پھر بیدار ہوئے اور **شاہ جہاں** نے آگرے سے دارالسلطنت دلی میں منتقل کی اور اس کا نام **شاہ جہان آباد** رکھا اور یہی نام انگریزوں کی شروع عملداری یعنی ۱۸۰۳ء تک برقرار رہا۔ اب شاہجہاں آباد جا کر بالعموم دہلی یا دلی کہلاتا ہے اور انگریزوں کی زبان پر ڈیلہی چڑھا ہوا ہے اور گورنمنٹ کا منظور شدہ بھی یہی نام ہے۔ تیرہ دلیوں کا حال آپ سن چکے **چودھویں دلی** جسکو شاہجہاں آباد کے جوڑ پر **جارج آباد** کہنا زیادہ موزوں ہوگا ۱۲ دسمبر ۱۹۱۲ء سے معرض ظہور میں آئی یعنی پھر دلی کی دولت جو نہ صوبہ کا مستقر نہ کمشنری کا بلکہ گھٹتے گھٹتے ذرا ایک ضلع رہ گیا تھا عزت سے بدل گئی اور کھینچ لی

کہ جب سے سلطنت انگلشیہ قایم ہوئی کسی یورپین بادشاہ نے سرزمین ہند پر بحیثیت شاہی قدم نہ رکھا تھا یا یوں تقدیر چمکی کہ ملک معظم جارج پنجم قیصر ہند نے مع ملکہ معظمہ کوئین میری قیصرۂ ہند کے سرزمین دہلی کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے عزت تازہ بخشی۔ شان نہ گمان قدرت خدا دیکھیے کہ دلی کے بھاگ جاگے ضلع سے اچک کلکتے کو دھکیل ہندوستان کا دارالسلطنت بنی ہے

	دینے پہ تو جو آئے بنا دے بگاڑ کے	
	دے جس پہ تیرا فضل ہو چھپر کو پھاڑ کے	

چنانچہ اب دہی چہل پہل ہی۔ سڑکیں بن رہی ہیں مکانات طیار ہو رہے ہیں۔ خدا کا لا منہ کرے اس جنگ یورپ کا اس نے چار برس میں سب کو ادھمو اکر دیا یہ نہ ہوتی تو نئی نویلی دلی جو رائے سینا میں موجودہ دلی سے چار میل کے فاصلے پر بڑے بھاری سکیل پہ بن رہی ہی کبھی کی بن چکتی۔ خیر دیر آید درست آید خدا نے چاہا تو یہ چودھویں دلی بلاد و امصار موجودہ میں سب سے بہتر اپنے انداز میں سب سے نرالی اپنی وضع میں انوکھی پر تو ظہور میں آجائے گی یا یہ سمجھو کہ اب آئی کہ آئی:-

دعائے دولت

یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا

یارب رہے سلامت شاہنشۂ معظم ۔۔۔ زندہ رہے ابد تک شاہنشۂ معظم

یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا

یارب ہو وہ مظفر باعزّ و شانِ شاہی ۔۔۔ ہو شادکام و خرّم وہ نازِ کجکلاہی

یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا

قدرت کے جو عطیے مخفی ہیں آسماں پر ۔۔۔ برسیں وہ بن کے نیساں شاہنشۂ زماں پر

یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا

یارب کرم کو اپنے اب آشکار کر دے ۔۔۔ اور دشمنانِ دولت کو خوار و زار کر دے

یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا

دشمن کو پست کر دے ناکامیاب کر دے ۔۔۔ اُسکی سیاستوں کو یارب خراب کر دے

یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا

نغات

سلطنت کا حامی ہو نگہباں ہو — تا یہ دعائے دولت دل میں ہو بزباں ہو

یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا

شائقین فنِ تاریخ کے لیے تمام روئے زمین پر کوئی خطہ پینتالیس میل مربع کا ایسا نہیں ہے جس میں اسقدر انقلابات عظیم ہوئے ہوں جن سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سلطنت کا عروج اور زوال سب کچھ تاریخ کے باقاعدہ مدون ہونے سے پہلے ہو ہوا یا اور یہیں راجہ اشوک کے زمانے کے وہ ستون ہیں جنپر دو ہزار سال پہلے کے پرانے کتبے موجود ہیں۔ یہاں وہ آہنی ستون بھی ہے کہ جس کی قدامت کا کچھ صحیح حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بہت پرانا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کرکے اسلامی حکومت کا جھنڈا گاڑ دیا اور دلی ہو قلعہ رائے پتھورا ہو یا نیا شہر۔ یا سیری۔ یا تغلق آباد۔ یا فیروزآباد یا شیرگڑھ یا شاہجہان آباد۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہ ان مختلف الاسم مقامات پر حکمراں رہے اور یہیں سے احکام و فرامین شاہی نفاذ پذیر ہوتے تھے اور اسی شہر کے نام کے ساتھ سلطنت وابستہ تھی۔ اس کتاب میں دہلی کے آثار قدیمہ کی تاریخ جدھشٹر کی دارالسلطنت اندرپت سے لے کر ۱۴۰۰ قبل مسیح میں تھی تا زمانۂ حال ہے۔ دہلی کی اسلامی عمارات قدیمہ کو بلحاظ طرز تعمیر کے آٹھ عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہر طرز اس کے بانی کے نام سے منسوب ہے جو اپنی اپنی وضع قطع میں دوسرے سے ممیز ہے اور جوں جوں زمانہ بڑھتا گیا ہے ان کی خوبیاں بھی رفتار زمانے کے ساتھ ترقی کرتی چلی گئی ہیں۔ دہلی کی عمارات قدیمہ درحقیقت اصلی نمونہ ہیں جن کا تتبع جونپور۔ بیجاپور۔ مانڈو اور مالوہ وغیرہ مقامات پر کیا گیا ہے۔ اور بحالت موجودہ ستر میل کے خطہ میں دہلی کی بکھری ہوئی عمارات کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اہلِ ہنود کی عمارات میں ہم اسی قسم کی تفریق و تقسیم کرنے سے اس وجہ سے قاصر ہیں کہ اُن کے زمانے کی کوئی مکمل عمارت بہ حیثیت اصلی یا اس کے قرب و جوار میں اب باقی نہیں رہی:-

مسلمانوں کی عمارات قدیمہ کی تقسیم بلحاظ نوعیت

(۱) غزنی	سنہ ۱۰۰۱ء تا ۱۱۹۱ء	(۲) ترکی	۱۱۹۱ء تا ۱۲۹۰ء
(۳) خلجی	سنہ ۱۲۹۰ء تا سنہ ۱۳۲۰ء	(۴) تغلق	سنہ ۱۳۲۰ء تا سنہ ۱۳۵۱ء

(۵) افغان ۱۴۵۱ء تا ۱۵۵۵ء (۶) دورِ اولی مغلیہ ۱۵۵۵ء تا ۱۶۲۸ء

(۷) دورِ اوسط مغلیہ ۱۶۲۸ء تا ۱۷۰۷ء (۸) دورِ آخر مغلیہ ۱۷۰۷ء تا ۱۷۵۰ء

(۱) غزنوی دور کی کوئی عمارت ہندوستان میں اب موجود نہیں ہے۔ شہاب الدین غوری نے حملوں کے بعد اپنی کوئی یادگار عمارات کی شکل میں ہندوستان میں نہیں چھوڑی۔ رہے وہ مینار جو اس عہد کے غزنی میں ہیں اُن کی نسبت اکثر ماہرین کی رائے ہے کہ قطب مینار جو دلی کے جنوب میں تقریباً گیارہ میل پر واقع ہے وہ اُنھیں کے نمونے اور طرز پر بنی ہے اور اس لحاظ سے غزنی کے مینار آثارِ قدیمہ کے نقطۂ خیال سے ایک بہت قابلِ قدر یادگار ہے۔

(۲) ترکی پٹھانوں کے عہد کی عمارتوں کا طرز نوکدار محرابیں۔ مسجدوں کے سامنے کی اونچی اونچی دیواریں تھیں جس کا نمونہ مسجد قوت الاسلام۔ قطب مینار۔ سلطان التمش (قطب) اور سلطان غاری (مہپال پور) کے مقبرے ہیں:۔

(۳) مذکورۂ بالا طرز سے زیادہ نازک اور نفیس کام خاندان خلجیہ کا ہے جس کا طرز گھوڑے کے نعل کی شکل کی محرابیں۔ مکلف نقش و نگار اور آرایش جس کا سب سے بہتر نمونہ علائی دروازہ قطب میں موجود ہے جو خاندانِ خلجیہ کے بہت بڑے بادشاہ علاء الدین محمد ثانی کا بنوایا ہوا ہے۔ مزید برآں مسجد قوت الاسلام کی اُن توسیعات سے جو اس بادشاہ کے عہد میں ہوئی ہیں کچھ اندازہ اس بادشاہ کی بلند نظری اور ہمت اور عمارات کی ساخت کا کیا جا سکتا ہے:۔

(۴) خاندان تغلق۔ سٹکو (رنگین پچیکاری) کے استرکاری کئے ہوے گنبد۔ نمونہ اس کا خود تغلق آباد کا شہر ہے جس کو اس خاندان کے پہلے بادشاہ غیاث الدین نے چار برس میں بنا کھڑا کیا۔ اس کے علاوہ خود اس بادشاہ کا مقبرہ اس طرزِ خاص کا عمدہ نمونہ موجود ہے۔ یہ تو اوائل زمانے کی عمارتیں ہیں بعد کا طرز دیکھنا ہو تو فیروز آباد۔ کلاں مسجد خاں جہاں۔ کھڑکی اور بیگم پوری کی مساجد دیکھیئے۔

(۵) افغانوں کے عہد کا طرز یہ تھا کہ پتلی اور سیدھی دیواریں۔ لمبے اور ہشت پہلو گردنوں کے گنبد۔ پھر آگے چل کر سور خاندان نے رنگ آمیزی کے کام چینی کی رنگین اینٹوں اور کھپروں کا رواج دیا۔ سٹکو کے طرز کی استرکاری چھوڑ کر رنگ برنگ کے پتھر جڑے جانے لگے جیسے خیرپور کے لودھیوں کے مقبرے موٹھ کی مسجد۔ پرانا قلعہ (اندرپت) جسمیں مسجد قلعۂ کہنہ بھی شامل ہے۔

(۶) مغلوں کا ابتدائی زمانہ جس سے مراد دورِ اکبری و جہانگیری ہے۔ اس کا طرز لمبی مدور گردنوں کے ایرانی طرز کے گنبد ہیں۔ اس عہد میں کثرت سے چینی کی رنگ برنگ کی اینٹوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ دورِ اکبری

دورِ جہانگیری کی عمارات کے بہترین نمونے تو آگرے اور فتح پور سیکری میں ہیں رہی دلی یہاں ہمایوں کا مقبرہ اور نیلا برج اس طرز کا نمونہ ہیں۔ مغلیہ دور درمیانی شاہجہاں جیسے گرامی قدر بلند مرتبہ شایق عمارات بادشاہ کا دور ہے۔ لال قلعہ مع محلات متعلقہ۔ جامع مسجد۔ فتح پوری مسجد اس کے عہد کی بڑی بڑی عمارات ہیں اورنگ زیب کے زمانے کی عمارات بھی اسی عنوان کے تحت میں آئی ہیں جس کا نمونہ قلعے کی موتی مسجد اور زینت المساجد ہیں۔

مغلوں کا دور آخری۔ رنگین پتھروں کی پچیکاری اور منبت کاری اور چینی کی رنگین اینٹیں جس کا نمونہ صفدر جنگ کا مقبرہ ہے جو عمارات دہلی کے لیمپ کی آخری بھڑک" کہلاتا ہے اس کے علاوہ تینوں سنہری مسجدیں اور مہرولی کی موتی مسجد یہ بھی اسی دور آخری کی باقیات الصالحات ہیں۔

جن جن عمارتوں پر کتبے نہیں یا اُن کی تاریخ بنا ٹھیک نہیں ملتی وہاں اس عمارت کو اس بادشاہ کے زمان سلطنت سے متعلق کیا گیا ہے جس کے عہد میں کہ وہ بنی تھی ایسی صورت میں تعین سال بنا البتہ ایک قیاسی امر ہے۔ اور جہاں اس کا بھی پتہ نہ چل سکا کہ فلاں عمارت کس بادشاہ کے عہد میں بنی تھی تو وہاں طرز وساخت عمارت پر سے قیاس دوڑایا گیا ہے یا یہ کہ مقامی روایات پر بھروسہ کرنا پڑا ہے۔ بعض عمارات کو ہم نے دور آخری مغلیہ کا تبلایا ہے اُس سے اورنگ زیب کی سلطنت کا زمانہ آخر ۱۷۰۷ء اور غدر ۱۸۵۷ء کا درمیانی زمانہ سمجھنا چاہیئے۔

اس کتاب میں بعض مساجد اور مندر بالکل معمولی حیثیت کے بھی درج ہوئے ہیں جن میں کوئی خاص تاریخی دلچسپی کی بات نہیں ہے لیکن ممکن ہے کہ آگے چل کر اُن کے متعلق کوئی مزید حالات معلوم ہو کر بکار آمد ہو جائیں اس لیئے اُن کا قلم بند کر لینا بھی خالی از مفاد نہیں۔

جن جن لوگوں کا ذکر جا بجا آگیا ہے اُن کی مختصر سوانح عمری بھی ساتھوں ساتھ لکھدی گئی ہے۔ بڑی غرض اس سے یہ ہے کہ جس کی جو عمارت ہے اُس کا کچھ حال تو معلوم رہے تاکہ عمارت کی بنا کی غرض اور دیگر حالات متعلقہ پر کچھ روشنی پڑے۔ مگر بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ ان بزرگواروں اور ناموروں کے حالات ایسے دلچسپ ہیں کہ ضروری باتوں کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا اور سب لکھو تو طول عمل کا اندیشہ ہے بہرحال بادلِ ناخواستہ جہاں تک ممکن ہوا اختصار کو مدنظر رکھا ہے

چہ برخیزد از دستِ کردارِ من	مگر دست لطفت شود یارِ من

شکریہ قبل اس کے کہ دیباچہ ختم کیا جائے۔ مجھپر فرض ہی کہ عالی جناب معلی القاب ڈی اٹر سر بل ہیلی صاحب بہادر بالقابہ چیف کمشنر صوبۂ دہلی کا دلی شکریہ نہایت ادب سے ادا کروں کہ جن کے ارشاد کے موافق یہ ناچیز کتاب لکھی گئی ہی اور جنہوں نے شروع سے آخر تک اسکی تدوین وترتیب میں پوری دلچسپی لی اور جس طرح کی مدد مجھے درکار ہوئی بکشادہ پیشانی دی۔ جناب کرنل بیڈن صاحب بہادر ہمارے شہر کے ڈپٹی کمشنر کو شہر دہلی سے خاص شغف ہی ان کی اوقات گرانمایہ کا بہت بڑا حصہ رفاہ عالم اور بہبودیِ خلایق میں صرف ہوتا ہی۔ جناب معفر چونکہ ہمارے حاکم ہیں اُن کا شکریہ بھی کسی طرح مجھپر کم واجب نہیں ہی کہ دلی کی موجودہ رونق کا سہرا انہیں کے سر پر ہی۔ اس کے بعد جناب مولوی ظفر حسن صاحب بی۔ اے۔ اسسٹنٹ سپرنڈنٹ آثار قدیمہ دہلی کا میں از بس ممنون ہوں کہ اُن کو میں نے بہت زیادہ گھیرا اور بار بار تکلیف دی کیونکہ وہی ایک صاحب ہیں جن سے میں اپنی معلومات میں عمدہ اضافہ کرسکا ہوں اور ایمان کی بات یہ ہی کہ اُنھوں نے کبھی مجھے مدد دینے سے دریغ نہیں کیا۔ باقی اور کسی صاحب کا میں رتی برابر شرمندۂ احسان نہیں۔

شکایت

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارِ وطن یاد نہیں

گو کہ دلی میں ایسے کئی صاحب موجود ہیں جن سے ہر طرح کی مدد کی توقع تھی میں کسی سے روپئے پیسے کا طالب نہ تھا میں تو صرف اُن سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا جس کو وہ بہت آسانی سے دے سکتے تھے مگر ان کی طبیعت کے بخل نے اس پر بھی آمادہ نہ کیا۔ یہ اُن لوگوں میں ہیں جو نہ خود کچھ کریں نہ دوسرے کو کرتے دیکھ سکیں۔ ایسوں کا نام بھی لینا بیکار ہی ؎

نہ خود خورد نہ کس دہد	گندہ کند بسگ دہد

معذرت کتاب جس محنت اور کاوش سے لکھی گئی اُسکی شاہد خود کتاب ہی جس کے لیے اردو فارسی۔ انگریزی کی بیسوں کتابیں الٹنی پڑیں جنکی فہرست علحدہ پیش کی جاتی ہی۔ اس سے میری محنت اور تفتیش کا اندازہ کیا جاسکتا ہی۔ اس کے علاوہ اکثر

مقامات کو خود بھی جا کر دیکھنا پڑا کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ ۔ خدا کرے کہ پبلک کی پسند آئے تو بس ساری محنت راحت ہی ورنہ کیا دھرا سب اکارت ۔ ہم نہایت افسوس سے دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی نگاہ زیادہ ترعیب بینی کی طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے ۔ بے عیب ذات خدا کی ۔ اتنی بڑی کتاب کی نسبت اغلاط سے پاک ہونے کا دعویٰ کرنا مستحیلات کو ممکنات کا لباس پہنانا ہے مگر اپنی طرف سے تو کوئی دقیقہ کتاب کے دلچسپ بنانے کا اُٹھا نہیں رکھا گیا اب میری شرم خدا کے ہاتھ ہے ۔ جن لوگوں کی نظر محاسن سے چشم پوشی کر کے اسقام کو چمکاتی ہے اُن سے تو یہ عرض ہے کہ :-

گل ست سعدی و در چشم دشمناں خارست	ہنر بچشم عداوت بزرگ ترعیب ست

لیکن جو لوگ تصنیف و تالیف کی مشکلات سے واقف ہیں اُن سے توقع ہے کہ وہ چھوٹی موٹی فروگزاشتوں سے لازمۂ بشریت خیال فرما کر چشم پوشی فرمائیں گے اور اصل غرض و غایت جو کتاب لکھنے کی ہے اُس سے اپنی معلومات کو بڑھائیں گے :-

بپوش چشمِ خود از عیب تا شوی بے عیب
کہ عیب پوشِ کساں عیب پوشِ خود باشد

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى نَبِيِّهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۔

دہلی ۔ مارچ ۱۹۱۹ء ۱۳۳۱ھ حررہٗ

بشیر الدین احمد عفی عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

دہلی اور اندرونِ شہر کی عمارات کا بیان

حدیثِ از مطرب و مے گو و راز از دہر کم تر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارہ

اندر پرستھ یا اندرپت تخمیناً (۱۴۵۰) برس قبل مسیح

دہلی کے آثار قدیمہ کے حالات لکھنے کے بیان کے ہم کو راجہ جدھشٹر کے بہت قدیم زمانے کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو حضرت مسیح کے پندرہ سو برس قبل جا پڑتا ہے۔ دلّی کی کوئی سی یادگار یا اسی نام کے جو شہر یکے بعد دیگر آباد ہوتے اور اُجڑتے گئے اُنکی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اُس پُرانے اور سب سے قدیم شہر کا ذکر نہ کریں جس میں دلّی کی نال گڑی ہے یعنی راجہ یُدھشٹر کا بنایا ہوا شہر اندرپرستھ جو کچھ عرصے تک اسی راجہ کا دارالسلطنت تھا اور پھر پانڈو خاندان کے پہلے راجاؤں کے زمانے میں دوسرے درجے کا شہر رہا اور اس کے بعد شمالی ہند کا دارالسلطنت بنا۔

اندرپرستھ کی تاریخ یا وہ واقعات جو اس شہر کے متعلق قابل اعتبار رہیں اُن کا ذکر "اندرپت" علیم اور ہندوؤں کی مشہور کتاب "مہابھارت" میں درج ہیں جس نے پانڈو اور کورو کی لڑائی کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ پانڈو اور کورو دونوں قرابت قریبہ رکھتے تھے جو اس زمانے میں سارے ہندوستان پر حکمراں تھے لیکن آگے چل کر ان میں جھگڑے و فساد پڑ جانے سے ان دونوں نے اپنی ساری

طاقت اور شجاعت اور دلاوری کو "بھارت ورش" یعنی ہندوستان پر تفوق حاصل کرنے کے لئے آپس میں تقسیم کر لیا۔ ایک زمانے ایک راجہ **دشینت** نام کا تھا۔ جس نے ایک رشی کی لڑکی **شکنتلا** سے شادی کر لی تھی جس سے ایک لڑکا **بھارت** نام پیدا ہوا جس نے اس ملک کو جو اب ہندوستان کہلاتا ہے فتح کیا جسکا نام "بھارت ورش" یعنی بھارت کا ملک پڑا۔ **ہستن** بانی **ہستناپور** اسی بھارت کا بیٹا تھا اور ہستن کا بیٹا **کورو** تھا اور کورو کا بیٹا **شانتنو** تھا یہی کورو بھارت کی لڑائی لڑنے والوں کا دادا تھا۔ شانتنو کے ایک بیٹا دیوی **گنگا** سے پیدا ہوا جسکا نام **ستیہ ورت** تھا۔ اس کے علاوہ دو بیٹے **ستیاوتی** سے بھی تھے شانتنو کی وفات کے بعد اسکا جانشین اس کی دوسری بیوی کی اولاد ہوئی کیونکہ پہلی بیوی کے لڑکے شانتنو والے ایک بڑا بھاری عہد کر لیا تھا جسکی وجہ سے اس نے "بھیشم" کے نام سے شہرت پائی جس کے لغوی معنے "ڈراؤنے" کے ہیں اور وہ عہد یہ تھا کہ وہ راج سے خود کنارہ کش ہوا اور اپنے سوتیلے بھائیوں کے لیئے جگہ خالی کردے چنانچہ بھیشم کا بڑا سوتیلا بھائی ہی باپ کا جانشین ہوا۔ اور جب کوہ ہمالیہ کی ایک پہاڑی قوم سے لڑنے میں وہ مارا گیا تو اس کا چھوٹا بھائی **وچتر ویریا** جانشین ہوا۔ وچتر ویریا نے **کاسی** کے راجہ کی لڑکی سے شادی کی تھی لیکن لاولد فوت ہوا جس کے بعد رانی کے کسی قرابت دار قریبہ **ویاس** نامی نے ہستناپور کی تخت نشینی کے واسطے اپنے بیٹوں کو پیش کیا۔ اس کے تین لڑکے تھے ایک کا نام **دھرت راشٹر** تھا مگر وہ اندھا تھا اور دوسرے کا نام **پانڈو** تھا مگر وہ نحیف الجثہ تھا اور تیسرا لڑکا ایک باندی کے پیٹ سے تھا جس کا نام **ودُر** تھا ان تینوں لڑکوں میں سے ایک اندھا ہونے سے اور دوسرا باندی زادہ ہونے سے محروم رہے اور پانڈو تخت نشین ہوا۔ پانڈو کے دو بیویاں تھیں۔ ایک **کُنتی** (سورا کی بیٹی جو کرشن کا دادا تھا) دوسری **مادری**۔ کُنتی کے تین بیٹے تھے **یدھشٹر**۔ **بھیم**۔ **ارجن** اور مدری کے دو لڑکے **نکُل** اور **سہدیو** تھے پانڈو کے مرنے کے بعد دھرت راشٹر۔ بھارت ورش کا راجہ ہوا جس نے رانی **گاندھاری** سے شادی کی جس سے بہت سی اولاد ہوئی اور یہ سارے کا سارا خاندان اپنے مورث کے نام پر کورو اور پانڈو کی اولاد پانڈو کہلانے لگی۔ دھرت راشٹر کا بڑا لڑکا **دریودھن** تھا۔ اس کے بھائیوں میں سب سے سربرآوردہ **دشاسن** ایک بھائی تھا اور اس طرح کورو اور پانڈو ہستناپور میں رہتے تھے۔ ان دونوں خاندانوں میں کچھ کھٹ پٹ ہوگئی۔ دھرت راشٹر نے پانڈوؤں کو چند روز کے لیئے **وارنا وت** چلے

[1] اصل نام کرشن ہے مگر لوگوں کی زبان پر کشن چڑھا ہوا ہے اور غلط العام فصیح ۱۲۰

جانے کی صلاح دی اور کہا پھر چند روز میں میں تم کو بلاؤں گا چنانچہ حسب وعدہ چند روز کے بعد ان کو ہستناپور بلا بھی لیا۔ لیکن پھر کچھ عرصے بعد دھرت راشٹر نے پانڈوؤں سے کہا کہ تم کھانڈو پرستھ کو جاکر راج کے اس حصے پر جو تمہارا ہی قبضہ کرلو۔ چنانچہ یدھشٹر اس خطۂ ملک پر چلا گیا جو جمنا کے دریا کے کنارے ہی اور اتنے بہت سے لوگ جمع کرکے یہاں ایک شہر ایسا بڑا شہر بسایا کہ گویا وہ اندر کا شہر تھا اور اسی سبب سے وہ اندر پرستھ کہلانے لگا۔ اب اس جگہ سے جہاں کسی زمانے میں اندرپرستھ شہر تھا جمنا ایک میل ہٹ گئی ہی۔ لیکن وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف روایات ہیں کوئی تو کہتا ہی کہ یہ شہر راجہ اندر ہی کے نام پر بسایا گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ نہیں راجہ اندر نے اس مقام پر پراستھ دیا تھا۔ پراستھ دونوں لب بھر کے اڑتالیس لب خیرات کرنے کو کہتے ہیں۔ ماہرین علم الالسنہ پروفیسر ولسن کے قول سے استناد پکڑتے ہیں کہ اندرپرستھ کے معنے اندر کا میدان ہی۔ پرستھ کے لغوی معنے ہیں شے گستردہ یا جو چیز وسیع کردیجائے اور اسی وجہ سے کھلے میدان پر اس کا اطلاق ہوتا ہی۔ جیسا کہ اب تک عوام کا زبان پر اندرپت "اندر کا کھیڑا" چڑھا ہوا ہی۔ جنرل کننگھم صاحب نے بڑی چھان بین کے بعد یہ رائے قایم کی ہی کہ اندرپرستھ کی بنا ۱۴۵۰ قبل مسیح یا اسی کے لگ بھگ پڑی اور ہندوؤں نے جو دلی کو اس سے زیادہ قدامت و سے پانچ ہزار برس سے بھی زیادہ کا کھوج لگایا ہی وہ بمقابلہ جنرل صاحب کی باقاعدہ تحقیقات کے زیادہ وثوق کے قابل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اب اس بات میں بھی اختلاف ہی کہ ہستناپور کی جگہ اندرپرستھ کب قایم ہوا۔ ہستناپور (بقول ولفور صاحب مہابھارت کی لڑائی سے چھٹی یا آٹھویں پشت میں) راجہ دستوان (یدھشٹر کے بعد ساتویں راجہ) کے زمانے میں گنگا کی طغیانی سے غرق آب ہو گیا تھا۔ اس لیئے راجہ دستوان کو ملک دکن میں راج دھانی کے لیے کسی اچھے اور موزوں مقام کی تلاش تھی اور وہ اسی اُدھیڑبن میں کچھ دنوں دکن میں رہا بھی مگر آخر کار اندرپرستھ کو آکر اسی مقام کو پانڈوؤں کی دارالسلطنت بنایا۔ وشنو پران کے موافق رنچاکرا (یدھشٹر کے بعد چھٹے راجہ) نے ہستناپور گنگا کی طغیانی سے تباہ ہوجانے سے اپنی دارالسلطنت کنوسمبی کو تبدیل کردی۔ ان روایات کا ماحصل یہ ہی کہ پانڈوؤں کی دارالسلطنت ہستناپور سے اندرپرستھ کو تیرھویں صدی قبل مسیح کے کسی حصے میں (جو راجہ دستوان کا زمانہ ٹھیرتا ہی) منتقل ہوئی۔ یدھشٹر سے لیکر کشیمکا تک جس کو قبل مسیح برابر تیس پشتیں گزریں

(یعنی پندرھویں سے ساتویں صدی قبل مسیح تک) اندرپرستھ مسلسل پانڈوؤں کی راج دھانی
رہا اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ جب وِسروا (آخری پانڈو راجگان کا وزیر افواج
جو اُن کا قرابت دار بھی تھا) نے سلطنت چھین لی تو اندرپرستھ (جو شمالی ہندوستان میں علم
کا عروج کم ہوگیا لیکن پھر اس کے بھی تین خاندانوں تک اندرپرستھ ہی مسلسل دارالسلطنت
رہا یعنی وِسَروا خاندان کے چودہ نفر اور گوتم کے پندرہ اور موریا کے نو حکمراں رہے
جن میں کا آخری راجہ راج پال یا رنگ پال نے کماؤں پر چڑھائی کی اور شکست پائی اور کماؤں
کے راجہ سُکونتا[1] کے ہاتھ سے مارا گیا اور اس طرح اندرپرست اس راج میں شریک کرلیا گیا۔
بارہ برس کے بعد سکونتا کی باری آئی اور اُجین کے راجہ بکرماجیت نے اسے مار کر نہ صرف
پانڈوؤں کے خاندان کا خاتمہ کردیا بلکہ یُدھشٹر کا سمت بھی موقوف کردیا۔ راجہ کماؤں کی فتح
کے پہلے سے ہی اندرپرستھ کی پہلی سی عظمت اور شان وشوکت باقی نہ رہی تھی۔ طاقت ور
گُپتا خاندان کے عہد میں شمالی ہند کا سربرآوردہ شہر پالی بوتھرا تھا۔ یونانی مورخین اگرچہ
کم وبیش شمالی ہند سے واقف تھے لیکن پھر بھی ان کو اندرپرستھ کے وجود کا حال معلوم نہ تھا۔
آرین (Arrian) مورخ متھرا کا تو تذکرہ کرتا ہے جس کے نام میں آج تک کوئی تغیر
نہیں ہوا لیکن اس نے بھی اندرپرستھ کا ذکر نہیں کیا اور نہ فیبین (Fabian)
نے اس کا کچھ ذکر کیا حالانکہ وہ ۴۰۰ ق۔م۔ میں کابل سے متھرا تک آیا تھا۔ کرنل ٹاڈ نے
پانڈوؤں کے خاندان کے تذکرے میں اندرپرستھ اور دہلی کا تذکرہ کیا ہے گویا کہ یہ دونوں
ایک ہی شہر تھے اور یہاں کے حکمراں کا نام بھی سنتنو بتلایا ہے حالانکہ دلّی کے نام کا وجود
بھی اس وقت تک نہ تہا۔ بلکہ سنتنو کی۔ مان سلطنت کے کئی صدیوں کے بعد دلّی کا نام
زبان پر آیا ہے۔ اندرپرستھ کی بنا کی نسبت تعین زمان میں جو کچھ شک وشبہ ہو سو ہو
لیکن اس کے موقع کے تعین میں تو کوئی ایسا ابہام نہیں ہے ہم نے جو مقام اندرپرستھ کا
ٹھہرایا ہے اس کا تعین عمارت ہائے منہدمہ یا کسی اور موجودہ نشان کی بنا پر تو ہے نہیں بلکہ محض روایات پر
اس کا دارومدار ہے۔ چنانچہ پنڈت بشمبر ناتھ صاحب نے دہلی لٹریری سوسائٹی میں ایک لکچر دیا تھا
جس میں انھوں نے اس امر کی وضاحت کی تھی کہ اندرپرستھ کی حدود موضع اوکھلے سے لے کر
موضع براری تک تھیں۔ مسٹر وھیلر کہتے ہیں کہ قطب روڈ کی جانب علامات حدود زیادہ نمایاں

[1] سرسید نے کماؤں کے راجہ کا نام راجہ سکونت (کوپی) لکھا ہے جو بکرماجیت کی لڑائی میں مارا گیا۔ ۱۲

ہیں کیونکہ بیشمار ویران ٹیلوں۔ ہزارہا برس کے ڈھیروں کا سلسلہ برابر چلا جاتا ہی۔ یہ سب ڈھیر انہیں دارالسلطنتوں کی منہدمہ عمارات کے ہیں اور قدیم زمانہ تاریخ کی یہ مت کے ہیں۔ اور روایات علی التواتر بتلا رہی ہیں کہ سارے کے سارے ملبوں کے انبار ان پانڈو خاندان کے راجاؤں کے اجڑے ہوئے شہر اندر پرستھ کے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس سوائے زبانی روایتوں کے اس امر کا اور کوئی وثیقہ نہیں ہی۔" اسی طرح کرنل ٹاڈ نے بھی بلا کسی قسم کی تائید مزید کے جب کہ وہ صفدر جنگ کے مقبرے میں ٹھیرے ہوئے تھے لکھا ہی کہ "یہ مقبرہ جو دہلی کی آبادی سے کئی میل کے فاصلہ پر ہی خود اندر پرستھ کے ویرانے کے اندر واقع ہی۔" پرانے پالی بوتھرا کا تو کہیں پتہ ہی نہیں ملتا کہ کس سرزمین پر تھا لیکن ہاں بمقابلے اُس کے اندر پرستھ کے شہر کا پتہ چلتا ہی جس کی نسبت کہا جاتا ہی کہ طول میں اسّی فرلانگ اور عرض میں پندرہ فرلانگ تھا جس کی اطراف اتنی بڑی خندق تھی جس کا پھیلاؤ چھ ایکر اراضی میں تھا اور گہرائی اس خندق کی ۴۲ کیوبٹ[۱] تھی۔ فصیل کے (۵۷۰) برج اور (۶۴) دروازے تھے۔ خندق شہر کی محافظت بدررو کے پانی اور کوڑے کرکٹ کے لیے بنائی گئی تھی۔ جس مقام پر اندرپرستھ کی آبادی کہی جاتی ہی وہاں کے انبار اور ملبہ اتنا پرانا کہ ہزارہا سال کا کہا جا سکے نظر نہیں آتا بلکہ بات یہ ہی کہ اس جگہ کئی ایک شہر یکے بعد دیگرے بنے اور اجڑے اجڑا بھی گئے تو اب کیونکر اس مقام کی تخصیص کی جا سکتی ہی جہاں کہ اندر پرستھ کی آبادی تھی۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اندرپت نام گاؤں جو اب تک موجود ہی اور جس کے اطراف فصیل ہی یہ مقام شہر اندر پرستھ کے اندرونی حصے کا ایک باقی ماندہ ٹکڑا ہی۔ لیکن اس سے بھی ہماری تشفی نہیں ہوتی اور اندر پرستھ جیسے قدیم شہر کے صحیح حدود کا اس زمانے میں اندازہ کرنا بالکل قیاس کے تکّے چلانے ہیں۔ عام خیال ہی کہ اندر پرستھ کا شہر موضع اندرپت کے وسیع میدان میں تھا جو شمالاً دلی دروازے تک پھیلا ہوا تھا جنرل کننگھم نے ہمایوں کے مقبرے کو اندر پرستھ کی جنوبی حد قرار دیا ہی اور شمالی حد فیروز شاہ کا کوٹلہ لیکن اس میں یہ خرابی آن پڑی ہی کہ نگمبود کا متبرک گھاٹ جو مید ھشٹر کے بسائے ہوئے شہر کا جزو اعظم تھا اندر نہیں آتا۔ کار سٹیون صاحب اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ "اندر پرستھ کی شمالی حد موجودہ دلی کے شمالی اور جنوبی حدود کے درمیان تھی اور روایت کے لحاظ سے اُس کا موقع دریبے کا بازار شمالی مشرقی سرا قرار پاتا ہی جو وسط شہر میں ہی۔" بہرحال کوئی بات ٹھکانے کی دل کو لگتی سمجھ میں نہیں آتی۔ جتنے منہ اُتنی ہی باتیں وثوق کے ساتھ دو ٹوک رائے قایم

---

[۱] اٹھارہ انچ کا ایک کیوبٹ ہوتا ہی۔ ۱۲

کرنے کے لیئے ہمارے پاس کوئی سودا ہی نہیں غیب کی باتیں خدا ہی جانے۔ اور جب یہ حالت ہے
تو اس سوال کا جواب کیا دیا جاسکتا ہے کہ اندرپرستھ لال کوٹ کے برابر تھا یا پرتھی راج کے
قلعے سے چھوٹا۔ مسٹر وھیلیر نے جو کیفیت ہستناپور کی لکھی ہے وہ من وعن اندرپرستھ پر بھی
صادق آتی ہے۔ ہستناپور چند جھونپڑوں کا ایک شہر تھا جس میں کچھ اینٹ کے مکان بھی تھے
اور ایک محل بھی اینٹوں ہی کا بنا ہوا تھا وہ بظاہر مستحکم و مضبوط تھا۔ اس میں زیادہ تر آبادی کاشتکاروں
مزدوروں۔ پیشہ وروں۔ چرواہوں اور چھوٹے چھوٹے دکان داروں اور امرا کے ہمراہیوں کی
تھی۔" اندرپرستھ میں جو کچھ تیر تھوار ہوتے تھے اُن کی تفصیل تو مہابھارت میں ہے مگر اصل شہر کا
بیان کچھ بھی نہیں۔ سلح سُویا (خودمختار سلطنت کا اعلان) میں جب کہ بڑے بڑے مہان بلائے گئے
تھے اُس میں بڑے بڑے دو منزلہ عالی شان مکانوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے بنانے سنوارنے
اور آراستگی کے بیان میں بہت مبالغے سے کام لیا گیا ہے کہ اندرپرستھ کا سارا شہر وید مقدس کے
گیتوں کے گانے سے گونج اُٹھا تھا اور جو عجائبات اور غرائبات اس موقعے پر دکھلائے گئے اُن
سب کا ذکر ہے لیکن تعجب ہے کہ نفس شہر کی نوعیت کا کچھ بھی ذکر نہیں۔ یدھشٹر کی مختصر کامیاب کے
زمانے میں اندرپرستھ کی چہل پہل اور رونق نے ہستناپور کو جو ممالک محروسہ میں دوم درجے کا
شہر تھا بالکل بٹھا دیا ہوگا۔ مہابھارت کی لڑائی کے بعد یدھشٹر مظفر و منصور بھارت ورش کی
دارالسلطنت ہستناپور میں داخل ہوا اور یہیں اُس نے گھوڑے کی قربانی جو اَشومیدھ کہلاتی
ہے اور اسی جگہ راجہ یدھشٹر نے اپنی سلطنت کی اس طرح تقسیم کی کہ ہستناپور تو اُس نے ارجن
کے بیٹے پرکشت کو دیا اور اندرپرستھ دھرت راشٹر کے بیٹے جٹو سو کو دیا

نگمبودھ گھاٹ اور دروازہ

بربنائے روایت جمنا کے کنارے دو مقام ایسے بتلائے جاتے ہیں جو قدیم اندرپرستھ کی باقی ماندہ یادگار ہیں۔ ایک تو نگمبودھ گھاٹ اور دوسرے نیلی چھتری کا مندر۔ یدھشٹر کے زمانے میں اِس گھاٹ کی کیا حالت تھی خدا ہی بہتر جانتا ہے
جس کے دستِ قدرت میں سلطنتوں کا قلع قمع ہے۔ لیکن یہ جو کہا جاتا ہے کہ گھاٹ سلیم گڈھ
سے ملا ہوا تھا اور اس زمانے کے دلّی شہر کے نگمبود دروازے کے پاس تھا صحیح معلوم ہوتا ہے۔
گھوڑے کی قربانی کے بعد اسی جگہ راجہ یدھشٹر نے "ہوم" کی رسم ادا کی تھی۔ ہوم اہل ہنود
کی ایک بڑی بھاری اور متبرک مذہبی تقریب ہے جس میں دیوتاؤں کو گھی ترکاری اور جڑی بوٹی

نقشہ گھاٹ بگنود
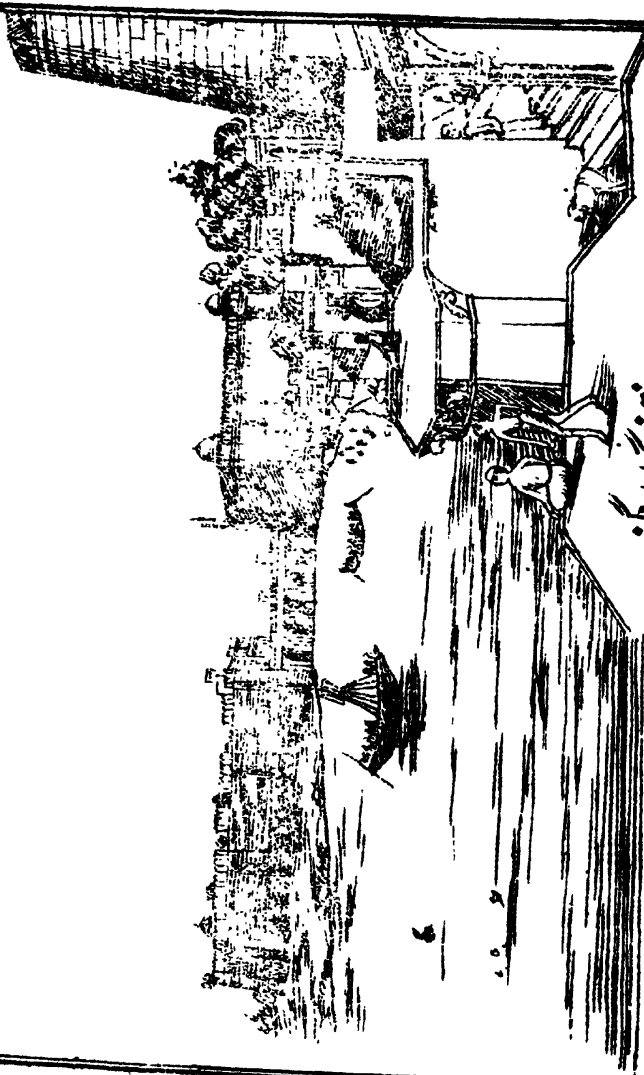
چڑھائی جاتی ہے۔ اہل ہنود کے معتقدات کے موافق پانچ ہزار برس گزرے کہ ہرمہا یکایک تمام مقدس کتابوں کے مضامین بھول گیا مگر جوں ہی اُس نے جمنا جی میں غوطہ لگایا سب باتیں جوں کی توں اُسے از بر اور تازہ ہوگئیں اور یہی نگمبودھ کی وجہ تسمیہ ہے۔ نگم سے مراد ہے وید اور بودک بہ معنی علم۔

اب اس گھاٹ پر قدیم زمانے کی کوئی عمارت بھی باقی نہیں ہے اور جو ہیں وہ زمانۂ حال یعنے ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر ہی کی ہیں۔ سنہ ۱۷۶۰ء میں ہندوؤں کو یہاں عمارتیں بنانے کی اجازت دی گئی تھی اور نگمبودھ دروازے سے شمال رخ پر گیلا گھاٹ کی وہی عمارتیں ہیں جو کوئی تیس گز تک اور جنوب کی طرف دریا کے موڑ تک موجود ہیں جہاں پہلے کلکتہ دروازہ تھا۔ کلکتہ دروازہ بھی اب نہیں رہا بلکہ اس کو توڑ کے ریل کی سڑک کے دو کلورٹ بنا دیئے ہیں اور ایک تختی لگا دی ہے جس پر انگریزی میں:-

Former site of Calcutta gate 1852

یعنے کلکتہ دروازے کی جائے سابقہ سنہ ۱۸۵۲ء لکھا ہے۔ نگمبودھ دروازہ شہر کی فصیل میں اپنی اصلی حالت پر موجود ہے اور اس پر اُس کا نام کندہ کر دیا گیا ہے۔ نئے گھاٹوں چھوٹے چھوٹے پختہ سنگین منڈپ بنے ہوئے تھے جن کی دو جانب دیواریں تھیں اور دریا کی طرف سیڑھیاں یہ منڈپ کچھ مسلسل یا باقرینہ نہ تھے۔ کوئی چھوٹا کوئی بڑا۔ بے ڈھنگی طور پر کہیں پاس پاس کہیں دُور دُور۔ اب گھاٹ اور منڈپ سب توڑ تاڑ کے برابر کر دیئے گئے۔ نہ ڈھنگ والے رہے نہ بے ڈھنگے۔ نگمبودھ دروازے کے جنوب میں مرگھٹ ہے جہاں اب تک مُردے جلائے جاتے ہیں اور مردے کو اس دروازے کا جو بہت مقدس ہے درشن دکھلایا جاتا ہے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے جہاں مُردے جلائے تھے اس مقام کی دیوار کا نشان اب تک موجود ہے اب اس جگہ ایک احاطہ کھینچ کر محصور کر دیا گیا ہے۔ نگمبودھ گھاٹ پر روزانہ صبح کو ہندوؤں کا بڑا مجمع رہتا ہے ہر اتوار کو اور ہندی مہینوں کی چودھویں پندھرویں تاریخ اور جب تک سورج "درگو" میں رہتا ہے اور کارتک کے پورے مہینے میں اور گرہن کے زمانے میں۔ دیوالی۔ دسہرے پر۔ رتھ جاترا جنم اشٹمی اور نرسنگ چودس پر یہاں بڑا میلا لگا رہتا ہے۔

نیلی چھتری سنہ ۹۴۹ھ

نگمبودھ دروازے سے کوئی پانچ منٹ کے رستے پر بجانب جنوب لب دریا سلیم گڑھ کے شمالی دروازے اور بہادر شاہی دروازے

(جو دونوں اب ہند میں) سے کوئی تیس قدم کے فصل سے نیلی چھتری ہے۔ اس کے قریب دھار میں ہوم یاگیہ کرنے کے بعد راجہ یدھشٹر نے ایک مندر بنایا تھا جس کا اب صرف نام ہی نام رہ گیا ہے۔ اب جو عمارت کھڑی ہے وہ تو یقیناً اُس زمانے کی نہیں ہے لیکن ہندو کہتے ہیں کہ اصل مندر پانڈوؤں کے وقت بنا تھا اور ہمارا خیال بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ ہے مندر ہندوؤں ہی کا کیوں کہ لبِ دریا اکثر اہلِ ہنود ہی کے معابد ہوا کرتے ہیں ہاں یہ بات دوسری ہے کہ وہ اتنا قدیم نہ ہو کہ پانڈوؤں کے زمانے سے منسوب کیا جا سکے اور کسی زمانۂ مابعد میں ہندوؤں نے بنایا ہے۔ اگر ہمارا یہ خیال صحیح نہیں ہے اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ہمایوں بادشاہ نے یہ چھتری دریا کی سیر دیکھنے کے لیئے بنتا ما بنائی تھی تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس چھتری پر جو چینی کی اینٹیں لگی ہوئی ہیں ہو نہ ہو وہ ہندوؤں کے کسی اور مندر یا عمارت سے اکھاڑ کر لگائی گئی ہیں اور اسی سبب سے الٹ پلٹ جمائی گئی ہیں اور ان میں جو جانوروں وغیرہ کی مورتیں اب تک بنی ہوئی موجود ہیں وہ بھی الٹ پلٹ ہیں کسی کا دھڑ کسی اور کے سر سے جوڑ دیا گیا ہے اور بیل بوٹوں کی موزونیت میں بھی نقص آگیا ہے۔ زیادہ تر قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ ایک قدیم مندر ہنود کا تھا جیسا فی زمانا بھی ہے اور ہمایوں بادشاہ نے اپنے عہد ۹۳۹ھ ۱۵۳۲ء میں اسے توڑ پھوڑ کر لبِ دریا ایک تفریح گاہ بنالی ہو جس کی چھت کے گنبد پر کسی اور پرانی عمارت کی چینی کی اینٹیں لاکر جمادیں۔

پنڈت بشمبر ناتھ صاحب اور اُن کے ساتھ جنرل کننگھم کی رائے ہے کہ مندر کی موجودہ عمارت مرہٹوں کی بنائی ہوئی ہے جو اُنھوں نے اپنے دلی کے چند روزہ قبضے کے زمانے میں بنوائی تھی۔ سنہ ۱۰۲۸ھ ۱۶۱۹ء میں جہانگیر بادشاہ دارالخلافہ آگرے سے کشمیر جاتے جاتے دلی تشریف لائے تو اُنھوں نے اس مندر پر ایک کتبہ نصب کیا اور کشمیر سے دو برس بعد جب شہنشاہ حامی ملۃ والدین نے مراجعت فرمائی تو یہ اظہارِ امتنانِ قدوم میمنت لزوم سے اس مقام کو عزت بخشی اور حکم صادر فرمایا کہ یہ اشعار کندہ کیے جائیں اب یہ دونوں کتبے موقعہ پر نہیں ہیں خدا جانے کیا ہودے۔ لیکن آثار الصنادید میں موجود ہیں جن پر سے ہم نقل کرتے ہیں:—

کتبۂ اوّل

یا فتاح

وقتیکہ بادشاہ ہفت کشور نورالدین
جہانگیر بادشاہ غازی از دارالخلافہ
آگرہ متوجہ سیر کشمیر جنت نظیر بودند
ایں مصرع را بر زبان الہام بیان گویانیدند

اللہ اکبر

بر بیہہ حضرت جہانگیر شاہ اکبر
عجب پرفیض جائے کامرانیست
نشیمن گاہ جنت آشیانیست
سنہ ۱۴ جلوس جہانگیری ساقی ۱۰۲۸

کتبۂ دوم

یا ناصر
چوں آں شہنشاہ گیتی پناہ کشور دلپذیر
مراجعت نمودند باین مکان فیض رساں
نزول اجلال فرمودند حکم کردند کہ
ایں مطلع را نیز نقش نمایند

اللہ اکبر
ہمایوں شاہ ابن شاہ بابر
کہ اصل پاکش از صاحب قرانیست
سنہ ۱۶ جلوس مبارک
جہانگیری موافق سنہ ۱۰۳۰

خلاصۂ کلام یہ کہ موجودہ مندر کسی قدیم عمارت کی جگہ بنا ہوا ہے۔ یہ مقام کسی وقت میں ہمایوں کا شاہی تفرج گاہ بھی رہا ہے۔ پھر یہ نہیں معلوم تھا کہ دوبارہ ہنود کے قبضے میں کس طرح اور کس وقت آیا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مرہٹوں نے اپنے چند روزہ دور دورے میں اہل ہنود کے تفویض کر دیا ہو اور یہی عام خیال بھی ہے۔ اُس سڑک پر سے جو سلیم گڑھ سے نیلی چھتری کو جاتی ہے صرف مندر کی راؤٹی نما چھت نظر آتی ہے۔ مندر کا پچھواڑہ سارے کا سارا سڑک کے پشتے میں دب گیا ہے اور چھت کی نری چوٹی ہی چوٹی دور سے جھل جھل کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مندر چودہ فٹ مربع ہے جو ایک خوشنما اور چوڑے دو فٹ اونچے چبوترے پر واقع ہے۔ چھت کے اوپر نیلی زرد۔ سبز رنگ کی چینی کی اینٹیں لگی ہوئی ہیں جن میں بعض پر پھول بنے ہوئے ہیں بعض پر چرند پرند مثل گائے اور مور وغیرہ کی شکلیں اور انسانی تصویریں ہیں لیکن ایسے بے ڈھنگے پن اور لاپروائی سے کسی نے ان اینٹوں کو جمایا ہے کہ آدمی کا دھڑ مور کی دُم سے جوڑ دیا ہے اور مور کی گردن کسی اور جانور سے ملا دی ہے کسی چڑیا کی دم کو لے جا کر پھول میں ٹھونس دیا ہے جس سے عجب دل لگی معلوم دیتی ہے۔ غرض کوئی اینٹ جگہ پہ نہیں ہے۔ میرے دیکھنے میں تو یہ بے تمیزی بھی اس عمارت کی کس مپرسی کی حالت میں ہوئی ہے ورنہ کیا ممکن تھا کہ ہمایوں جیسے جلیل القدر بادشاہ کی تو ہو تفرج گاہ اور جہانگیر جیسا نزاکت پسند وہاں خود گیا ہو اور اس بے ڈھنگے پن کو روا رکھا ہو۔ غالباً ہوا یہ ہے کہ چھت گر گئی ہوگی یا مرمت طلب ہو گئی ہوگی۔ اناڑیوں کے پلّے پڑا یہ کام۔ اُنھیں اتنی تمیز بھی نہ تھی۔ اُنھوں نے اپنا سلیقہ دکھایا۔ جیسے کسی شیخ نے کہا تھا "جاٹ رے جاٹ تیرے سر پہ کھاٹ" جاٹ نے کہا شیخ رے شیخ تیرے سر پر کولھو شیخ نے کہا واہ تُک سے تُک تو ملا ہی نہیں۔ جاٹ نے گالی دے کر کہا پڑا نہ ملو بوجھوں تو مرے ہی گا۔ چبوترا جس پر ستون کھڑا ہے چاروں طرف نہیں ہے بلکہ اُس کا پچھلا چوتھائی حصہ

سڑک میں آگیا۔ ستون کے اُس رُخ پر جو سڑک کی طرف ہو اُس پر بھی چینی کی رنگین اینٹیں لگی ہوئی ہیں اور دوسری طرف دریا کے رُخ پر بھی چمکدار رنگین پتھر لگے ہوئے ہیں جن پر پھول پتے اور نقش و نگار ہیں۔ ستون کے مشرقی طرف زیادہ حصے پر چینی کی اینٹیں منبت کام کی جڑی ہوئی ہیں اور جا بجا صاف اور مجلّٰی پتھر بھی لگے ہوئے ہیں اور مغربی رُخ پھولوں اور نقش و نگار کے پتھروں سے آراستہ ہو۔ اب مجھے تو یہ خواب کی باتیں معلوم دیتی ہیں وہ ستون تو ضرور ہی مگر بالکل سپاٹ نقش و نگار اور رنگ و ڈھنگ سب فق ہی۔ مندر سڑک سے اتنا نیچا ہوگیا ہو کہ بالکل حوض معلوم دیتا ہی پندرہ سیڑھیاں اُتر و جب اُس کے صحن میں پونچو۔ مندر کا ایک کمرہ ۱۸ اِنچ مربع اور ۵۰ فٹ اونچا ہی۔ اب یہ حالت بھی قایم نہیں صرف دو در کا ایک بالکل معمولی مندر ہی۔ یہ عمارت ایک بالکل معمولی پتھر کی بنی ہوئی ہی جسکے دروازے ۵ فٹ ۷ اِنچ بلند اور ۲ فٹ ۹ اِنچ عریض ہیں۔ مندر کی داہنی طرف ایک کوٹھری پوجاری کے رہنے کی ہی مسجد کے وسط میں ایک لنگ[۱] ہی جس پر غلاف پڑا رہتا ہی اس کے علاوہ اور بہت سی مورتیں سنگ مرمر کی ہیں۔ اب نہ لنگ رہا نہ سنگ مرمر کی مورتیں۔ مسجد کی پچھیت کی دیوار میں ایک طاق ہی جس میں شام سے چراغ جلا دیا جاتا ہی۔ مندر کی جو حالت کار سٹیون صاحب نے اپنی کتاب مطبوعہ ۱۸۷۶ء میں لکھی ہو اُس میں اور اب میں آسمان زمین کا فرق ہی۔ اب ایک فوارہ مندر کے داہنی طرف کی کوٹھڑی میں ہو جو پوجاری کی کوٹھڑی کے جواب میں ہو اور صحن میں کنواں ہو جس کا ذکر اوپر نہیں آیا۔ دیکھنے سے یہ بعد کے بنے ہوئے معلوم دیتے ہیں۔

اندرپرستھ اہل ہنود کے نقطۂ خیال سے۔

> کوئی عالم میں نہیں شہرِ بسانِ دہلی
> ہو مٹے پر بھی سوا عرش سے شانِ دہلی

یہ امر مخفی نہیں ہو کہ شہر دہلی تاریخ ہند میں ہر زمانے میں مشہور رہا ہی اور یہ کہ وہ روئے زمین کے تمام شہروں سے[۲] اپنی قدامت کے اعتبار سے سبقت لے گیا ہی۔ یہ وہی سرزمین ہی جہاں یدھشٹر

---

[۱] لنگ کے لغوی معنی علامات یا نشان کے ہیں۔ دکن میں ایک قوم لنگایت اسی سے موسوم ہی کہ وہ ایک گول پتھر ایک کپڑے میں باندھ کر چاندی میں منڈھ کر گلے میں ڈال لیتے ہیں جو دیوتا کے قایم مقام ہوتا ہی۔ ۱۲

[۲] یہ ترجمہ اُس مختصر انگریزی رسالے کا ہو جو ۱۹۱۱ء کے کارونیشن دربار پر بطور اندرپرستھ کی قدیم تاریخ کے جابجا او دھیا پنڈت بانکے رائے ترن گوسامی دہلوی نے لکھا تھا۔ مضامین مندرجۂ رسالہ کا ماخذ اُن کے والد پنڈت تولیشونا تھ جی گوسامی کے نوٹ اور بمبئی کے ڈاکٹر بھگوان لال اندرجی کی آثار قدیمہ کے مشہور ماہر کی کتاب ہو۔ اس رسالے کو ڈاکٹر جے۔ بی ایچ۔ وڈمل۔ قایم مقام ڈائرکٹر جنرل آثار قدیمہ نے بھی ملاحظہ فرمایا اور چونکہ از منۂ سابقہ کی اس میں تفصیل ہو پسند فرمایا۔ ۱۲

مہاراج نے مہابھارت کی بڑی بھاری لڑائی سے پانچ ہزار برس پیشتر "راج سوئے یگن"[1] کی تقریب کی تھی۔ پھر تو یکے بعد دیگرے ہندو راجہ ہوں یا مسلمان بادشاہ سب ہی نے تو اس مقام کو مختلف ناموں سے اپنا دار السلطنت بنایا۔ کھنڈوی پوری۔ اندرپرستھ۔ یوگنی پوری۔ کلیان پوری۔ بگلی پوری۔ ڈلی پوری۔ دلی۔ شاہ جہان آباد۔ دہلی۔ یہ سب نام اسی مقدس خطے کے تو ہیں۔ منہدمہ عمارات کے بے شمار کھنڈر۔ گنبد۔ مقبرے اور دیگر عمارات سے ان فرماں رواؤں کی شان وشوکت عظمت وجبروت کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں دیدۂ عبرت کو ہندوؤں۔ بدھ مت والوں اور مسلمانوں کی باقتدار سلطنت دولت اور ثروت کا چپے چپے پر پتہ لگتا ہے علاوہ اس کے یہ مقام ابدالآباد سے اہل ہنود کا ایک بڑا محترم ومقدس تیرتھ گاہ رہا ہے بدیں وجوہ ہندوستان بھر میں اس سے بہتر۔ اس سے زیادہ مناسب اور موزوں تر مقام ہمارے شہنشاہ ذی جاہ جارج پنجم خلداللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کی تاج پوشی کی مبارک تقریب کے لیئے ہو نہیں سکتا تھا کیوں کہ شہر دلی کے واسطے یہ کچھ پہلا ہی اعزاز نہ تھا بلکہ وہ تو ایسے ایسے جشن کا مرکز بار بار رہ چکا ہے۔

اب میں اس شہر کی ایک مختصر تاریخ اہل ہنود کے نقطۂ خیال اور اُن کی مذہبی اور سنسکرت کی کتابوں سے لکھنی چاہتا ہوں جس سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ زمین کا وہ ٹکڑا جس پر یہ شہر بسایا گیا ہے کیسا مقدس اور متبرک ہے اور خدا نے چاہا تو ایسا ہی تاقیام روزگار رہے گا۔ اندرپرستھ کی قدیم تاریخ بے حد دلچسپ ہے مسلسل ومتواتر تبدیلیاں جو اس کی حالت میں ہوئی ہیں ایک گھنا وسیع جنگل جو دین دار متقی۔ زاہد وپرہیزگار رشیوں کی ریاضت کے لیئے مخصوص تھا جس کو مہاراجہ سدرشن نے ایک شان دار شہر کی شکل میں بدل دیا تھا لیکن پھر وہ انقلاب روزگار سے ویسا ہی گنجان جنگل ہوگیا اور وہی رشی لوگ پہلے کی طرح سے اس سرزمین پر رہنے سہنے لگے۔ دوسری مرتبہ پھر اُس کا نصیب جاگا اور ایک شان دار تبدیلی عمل میں آئی جس کا دلچسپ تذکرہ کلکا پُران میں موجود ہے اور اس سے زیادہ مبسوط ومفصل بیان اندرپرستھ مہاتمیا میں ہے جو تاریخ کو حال کے زمانے کے کل جگ تک پہنچا دیتا ہے اس خطے کی قدرتی مناسبت ہے کہ یہاں کی خاک سے بڑے بڑے نامور۔ بڑے بڑے

[1] ایک بہت بڑی قربانی ہے جو کوئی بڑا راجہ اپنی تاجپوشی کے وقت کرتا ہے اور جس میں دوسرے باج گزار بھی شریک ہوتے ہیں۔ ۱۲

مشاہیر پیدا ہوئے اور اسی اندر پرستھ کو اس بات کا بھی فخر حاصل ہو کہ باوجود زمانے کی بڑی بڑی گردشوں اور انقلابات کے اس سرزمین نے متعدد نامآور فرماں روا۔ مقدس بزرگ۔ دین وار مہاتما۔ مشہور صناع۔ ایسے ایسے پیدا کیئے کہ جن سے یہ خطہ اگلے زمانے میں ہمیشہ ممیز و ممتاز رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ شاید اس زمین میں کوئی فوق العادت غیر معمولی تاثیر مضمر کہ جسکی وجہ سے سلاطین ماضیہ کا دل اس کی طرف بلا قصد کھنچا چلا جاتا تھا کہ اُنہوں نے اس شہر کو اپنے قبض و تصرف میں لینے کو ایک بہت بڑا اور بھاری فرض خیال کیا۔ ایسے شہر کے عجیب و غریب انقلابات کا مختصر بیان بے موقع نہ ہوگا اور ذیل میں ہم کلیکا پُران کے باب ششم اور اندر پرستھ مہاتمیا کا لُبِ لباب دیتے ہیں:۔

پہلے وقتوں میں اندر پرستھ کھنڈؔ وَن یا اِندر اوَن کے نام سے مشہور تھا۔ اس بستی کو چندربنسی خاندان کے راجہ سدرشن نے ایک خوب صورت شہر بنا کے کھنڈوی پوری نام رکھا۔ شہر بنانے کے لیئے راجہ نے جنگل کو کٹوایا درندے جانور نکلوائے اور ایسا صاف کردیا کہ عابدوں اور زاہدوں کے لیئے کوئی کونا نہ رہا۔ یہ پوری (بستی) قریب سو یوجن تو لمبی تھی اور (۳۲) یوجن چوڑی تھی۔ سدرشن نے اپنے سارے ہمعصر راجاؤں کو مغلوب کیا اور لاتعداد دولت زر و جواہر جمع کیا۔ راجہ نے لوگوں کو کھنڈوی جاکر بسنے کی ترغیب و تحریص کی۔ اُس نے وہاں بہت سے درخت اور جڑی بوٹیاں گندھرو لوگ اور سورگ (بہشت) سے لاکر لگائیں۔ اندر کو سدرشن کی شان و شوکت پر حسد ہوا اور کاشی (بنارس) کے راجہ دِیجایا کو اُس سے لڑائی کرنے کو اُبھارا۔ راجہ ویجایا بڑا بھاری لشکر لے کر راجہ سدرشن پر آن چڑھا اور بڑی گھمسان لڑائی کے بعد راجہ سدرشن کو اپنے گُرز سے ہلاک کیا۔ راجہ کے مارے جانے سے اُس کی فوج تتر بتر ہوگئی اور کھنڈوی پر راجہ ویجایا قابض ہوگیا۔ سدرشن کا خزانہ زر و جواہرات کے ڈھیروں سے معمور تھا اور سر بفلک محلات کھڑے تھے سو اُلک یہ دولت و حشمت دیکھ کر ویجایا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ تو امراپور (جنت کا ٹکڑا) زمین پر اُتر آیا ہے۔ اندر نے (جو سارے دیوتاؤں کا سردار تھا) راجہ سے کہا کہ تمہیں کچھ خبر بھی ہو کہ یہ جگہ دیوتاؤں اور گندھروں کی تفریح گاہ کے لیئے مخصوص تھی اور اس میں مُنی لوگ تپشا کرتے تھے۔ تمہارے شایان حال یہ ہو کہ کھنڈوی کو اس کی حالت صحرائی پر چھوڑ دو۔ راجہ نے جب اندر کی یہ بات سُنی تو اس کے دل کو بھی لگ گئی۔ راجہ نے تمام باشندوں کو حکم دیا کہ

جہاں تمہارا دل چاہے اور جدھر تمہارے سینگ سمائیں چلے جاؤ یا میرے ساتھ میری راج دہانی کو چلو اور جن جن راجاؤں سے سدرشن نے روپیہ پیسہ لیا تھا سب واپس کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ کھنڈو ی اجڑ کر پھر جیسے کہ ویسا بڑا بھاری جنگل ہو گیا۔ دیوتا اور گندھرو پھر وہاں خوش فعلیاں کرنے لگے اور سالہا سال اس کا یہی حال رہا۔ ستو دھری سن ہیتا اور پدما پران جس کا ایک جزو اندر پرستھ مہاتیا ہی اُس میں یوں لکھا ہے۔

اندر نے ایک مرتبہ یگن کرنے کا ارادہ کیا اور وہ اپنے گرو برہسپتی سے ایسی ایک جگہ کے متعلق جو اس رسم کے لیے متبرک اور مناسب ہو استمزاج کیا۔ برہسپتی نے یگن کے واسطے جمنا کے کنارے ایک خوشنما اور مقدس مقام کھنڈو بن کا پتہ دیا۔ اندر اپنے گرو کے ارشاد کے موافق جمنا کے کنارے پہنچا اور یگن کی طیاری شروع کی۔ تمام دیوتاؤں اور رشیوں کو دعوت دی گئی اور سب بطیب خاطر اِس مذہبی رسم میں شریک بھی ہوئے۔ مہمان داری کا انتظام اندر نے ایسے اعلیٰ پیمانے پر کیا کہ یہ سب لوگ اس قدر مسرور ہوئے کہ اپنے زہد و تقوے اور تقرب الی اللہ کی برکت سے اس مقام پر یہ مختلف مقدس خطے منتخب کر دیئے۔ نگمبودھ (نگم = وید۔ بودھ = علم دیا) میرو تحتی ترا کتا ہی کہ برہما نے ویدوں کی تقدیس یہیں کی۔ راج گھاٹ۔ سب تیرتھوں سے برتر پریاگ (الہ آباد) کی طرح کا جمنا کے کنارے اشنان کے لیئے ایک گھاٹ جو لال قلعے کے جنوبی رُخ پر ہی۔ و ڈیا پورا۔ جو اب چاندنی چوک بازار میں نیل کا کٹرہ کہلاتا ہی۔ چنانچہ شاہ جہاں بادشاہ کے فرمان میں جو پنڈت بلنکے رائے صاحب کے ہاں موجود ہی اس امر کا تذکرہ ہی کہ یہ مقام کاشی (بنارس) کی طرح مقدس اور دار العلم تھا۔ یہاں ایک قدیم مندر مہادیو کا ہی جو پرانے زمانے میں وشو یشور کا مندر کہلاتا تھا۔ برہاری جس کا صحیح نام برہ مُراری ہی ایک موضع ہو دلی کے شمال میں جمنا کے کنارے جس کے متعلق مہابھارت میں لکھا ہی کہ یہ وہی جگہ ہی جہاں بھگوان کرشن اور کالندی کی شادی کی مبارک رسم ادا ہوئی تھی۔ یہاں بھی مہادیو کا ایک پرانا مندر ہی جو کھنڈیشور کے نام سے مشہور ہی۔ اس مندر کے اطراف اب تک بھی پرانی عمارت کے کچھ حصے زمین میں دبے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد سے اندر پرستھ نے کیسے کیسے قالب بدلے اُن کا ذکر مہابھارت میں

یوں آیا ہے:- اس بات کو اب کوئی پانچ ہزار برس ہونے آئے کہ کھنڈ دلوا تار جس کا نام اندربے کے یجن سے بعد اندر پرستھ پڑ گیا تھا) کو یدھشٹر کے بہادر بھائی ارجن نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا۔ عین اُسی مقام پر یدھشٹر نے خود ایک نہایت خوب صورت شہر بسایا اور اُس کا نام بھی اندر پرستھ ہی رکھا۔ اسی شہر میں یدھشٹر کے لیئے مایا دیو نے ایک بہت خوب صورت نادر اور عالیشان محل بنایا جس کا پھیلاؤ پانچ ہزار مربع ہاتھ تھا اور جو آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ اس محل کے بے شمار ستون سونے کے تھے۔ وہ وسیع۔ خوشنما اور فرحت بخش تھا۔ اُس کے در و دیوار سونے کے تھے جس میں انواع و اقسام کی تصاویر تھیں اور اس قدر صرف کثیر اور اس خوبی سے بنایا گیا کہ خود برھما کے محل پر بھی وہ سبقت لے گیا تھا۔ اِس کے محافظ کے لیئے آٹھ ہزار جری اور قد آور سپاہی مقرر تھے۔ اس محل کے اندر ایک عجیب و غریب تالاب بنایا تھا جس میں کنول کے پھول ایسے تھے کہ جن کی پتیاں اور ڈنٹھل جواہرات کے تھے اور دوسرے آبی پھولوں کے پتے بھی سونے کے تھے۔ جس کی صاف و شفاف سطح آب پر انواع و اقسام کے پرند خوش فعلیاں کرتے نظر آتے تھے۔ تالاب میں خود بھی بالیدہ کنول کے پھولوں۔ مچھلیوں۔ سنہری کچھووں سے جگمگا رہا تھا۔ پانی اس کا نہایت شفاف تھا یہاں تک کہ تہ میں کیچڑ کا نام تک نہ تھا تالاب کے چاروں طرف سنگ مرمر کی جڑاؤ سِلیں جن میں بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے لگی ہوئی تھیں۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس تالاب کو اِس طرح آراستہ پیراستہ اور جواہرات سے جگمگاتا ہوا دیکھ کر ایسے محو حیرت ہو جاتے تھے اور باوجودیکہ اُن کی آنکھیں کُھلی ہوتی تھیں پھر بھی اُسے محل سمجھ کر گر گر پڑتے تھے۔

اسی محل میں ایک اور طلسماتی تالاب تھا جس کی تہ بلوری تھی اور جس کے کناروں پر پچیکاری کا نہایت نفیس کام تھا۔ یہ تالاب مذکورۂ بالا محل کے گرد ایک پرستان کے طور پر تھا۔ اس میں مصنوعی جنگل لگایا گیا تھا جس میں سے نہایت عمدہ خوشبو آتی تھی اور انھیں درختوں کے جھنڈوں میں بڑے بڑے اونچے ہرے ہرے سایہ دار سدا بہار درخت تھے۔ یہ سارا کارخانہ شفاف پتھروں کے فرش اور مصنوعی کنول کے مختلف اقسام کے تراشے ہوئے پھولوں کا ایسا مکمل اور مغالطہ دہ تھا کہ ساجد میدوھن

جیسا واقف کار شخص بھی دھوکا کھا گیا اور جب آیا تو پانی سمجھ کر جھٹ پائنچے چڑھا لیئے کہ بھیگ نہ جائے جس پر ایک خوب قہقہہ[1] لگا۔ اس میں شیشے ہی کے دو قسم کے دروازے تھے کوئی کھلے کوئی بند۔ جو کھلے تھے وہ ایسے دکھلائی دیتے تھے گویا کہ بند ہیں اور جو بند تھے وہ کھلے معلوم دیتے تھے۔ محل کے گرد سرسبز اور ہرے بھرے شاداب درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ پھلوں سے لدے ہوئے جن کی ڈالیاں بوجھ سے زمین پر لوٹ رہی تھیں اور جن کی خوشبو سے سارا محل مہک اُٹھا تھا۔ اس تمام عمارت کے اطراف ایک نہایت چمک دار سفید شفاف املسلے کی دیوار تھی جس میں تمام جواہرات جڑے ہوئے تھے اور جا بجا چمک دار رنگ تھا کہ جس کے سامنے آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں۔ یہ بڑا بھاری عجیب و غریب فلک نما محل ساری آرایش و ساز و سامان سمیت چودہ مہینے کے اندر ہی اندر بن کر طیار ہو گیا۔ محل طیار ہو جانے پر راجہ یدھشٹر نے دس ہزار برہمنوں کو انواع و اقسام کی اغذیۂ لذیذ اور اشربۂ لطیف ایسی ایسی کھلائیں کہ اُن کا دل بھر گیا اور سب کو غیر معمولی نئی نئی پوشاکیں نفیس پھولوں کے ہار اور ایک ہزار گائیں دیں۔ تب کہیں راجہ نے اپنے چاروں بھائیوں بھیمسین۔ ارجن۔ نکولا اور سداشیو کے ساتھ محل میں قدم دھرا۔ پہلوانوں۔ کرتبی لوگوں نقالوں۔ رقص کرنے والوں۔ بھاٹوں۔ مداحوں نے اپنے اپنے ہنر اپنے اپنے کرتب اور جوہر دکھلا کر مہاراج کا دل خوش کیا۔ راجہ یدھشٹر نے بھی مختلف قسم کے مزامیر اور نہایت عمدہ خوشبو و عطریات و بخورات کے ساتھ دیوتاؤں کی پوجا کی۔ ملک کے مختلف حصوں کے بہت سے طاقتور اور دولت مند راجہ بھی یدھشٹر کے

---

[1] ایسا ہی واقعہ ملکہ بلقیس قرآن شریف کی سورۂ نمل میں ہے۔ قِیْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا۔ قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيرَ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

ترجمہ۔ کہا گیا کہ آپ محل میں تشریف لے چلیئے۔ تو جب اُس نے محل (میں شیشے کے فرش) کو دیکھا تو اُس کو پانی سمجھی اور وہاں سے گذرنے کے لیئے اس طرح پائنچے اُٹھائے کہ اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں (سلیمان نے) کہا۔ یہ (بھی) شیشے (ہی) جڑے ہوئے ہیں۔ تب اُس کو اپنی غلطی اور بے سمائی پر تنبیہ ہوا (اور) لگی (خدا کی بارگاہ میں) عرض کرنے کہ اے میرے پروردگار (میں جو اتنے دنوں آفتاب پرستی کرتی رہی اس سے) میں نے اپنا ہی نقصان کیا اور اب میں سلیمان کے ساتھ ہو کر اللہ رب العالمین پر ایمان لائی

ساتھ شریک تھے جیسے کہ فرشتے برمہا کے ساتھ رہتے ہیں۔ جب پانڈویوں جم گئے تو آسمانی رشی نردوان کی مجلس میں آیا اور مذہبی اور ملکی معاملات پر ایک طول طویل گفتگو ہونے کے بعد اُس نے صلاح دی کہ تمہاری طرح کی ہر طاقت اور فرماں روا کا یہی فرض عین ہے کہ وہ راج سویا کی قربانی کرے۔ مقدس نرد کا یہ مشورہ سننے کے بعد بڑے بڑے رشی دَھومیا اور سری دیاس وغیرہ ہم نے بھی یہی صلاح دی تب سری کرشن چندر مہاراج نے یدھشٹر کا ایما لیا کہ کس طرح اُس بڑی قربانی کی تقریب کا آغاز اور سرانجام کرنا چاہیئے اور یہ تقریب صرف وہی ایک شخص کر سکتا ہے جس کی حکومت چار دانگ عالم میں ہو اور تمام روئے زمین کے بادشاہ اُس کا سکہ مانتے ہوں۔ اس دیرینہ آرزو کو حاصل کرنے کے لیئے یدھشٹر نے اپنے چاروں بھائیوں کو لشکر جرار دے کر چاروں طرف دوڑایا۔ بھیمسین نے مگدھ دیس کی طاقتور رجہ جرسِندھ کو مغلوب کر لیا جو ستر راجاؤں کو نیچا دکھا کر قید کرنے کے بعد خود مہاراج بنا تھا بھیما نے بڑی بھاری اور سخت لڑائی کے بعد جرسِندھا کو قتل کر کے اُن ستر راجاؤں کو جو اُس کے پاس قید تھے چھڑوایا اور اپنے بھائی کی راج سویا یجن کی تقریب میں شرکت کی دعوت دی اور واپسی کے وقت اپنے ساتھ بے شمار دولت زر و جواہر لاکر سارے کے سارے یدھشٹر کے سامنے رکھ دیئے۔ علی ہذا دوسرے تین بھائی بھی بڑے بڑے راجاؤں سے لڑے اور اُن کو مطیع و منقاد کیا یا یہ کہ اُن سے حکمت عملی سے مصالحت کر لی اور اُن کی طرف تحفے تحائف اور خراج بشکل سونا چاندی۔ جواہرات۔ زیورات۔ موتی۔ گھوڑے۔ ہاتھی۔ خچر۔ بیل۔ طرح بطرح کی چڑیاں اور انواع و اقسام کی دوسری اشیا لائے اور ان سب کو جشن راج سویا یجن میں مدعو کیا۔ جب چاروں بھائی چاروں طرف مظفر و منصور فائزالمرام ہو کر آئے تو اُنھوں نے تمام مال خزانہ یدھشٹر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ تب کہیں جاکر سری کرشن چندر مہاراج کی زیرنگرانی جشن کی طیاری شروع ہوئی۔ محلاتِ شاہی کے احاطے کے باہر اُن کثیر التعداد مہمانوں کے آرام و آسایش کے لیئے جن کو دعوت دی گئی تھی مکانات بنائے گئے جن کے دروازے اور کھڑکیاں تک سونے کی تھیں جن پر سونے کے تاروں کا جال تنا ہوا تھا اور ان مکانوں کے جابجا اندر موتیوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ یہاں سیڑھیاں پتلی پتلی اور اس انداز سے بنائی گئیں تھیں کہ چڑھنے اُترنے میں بار نہ ہو۔ زمین پر

نہایت قیمتی (قالین) اور دریوں کا فرش تھا۔ ان رکانوں کا ہر ہر کمرہ عمدہ اور قیمتی ساز و سامان سے سجایا گیا تھا۔ لونڈیاں۔ باندیاں۔ غلام۔ کھانے پینے کی انواع و اقسام کی اشیاء۔ عمدہ عطریات اور خوشبوئیں۔ تصاویر۔ ہار۔ پھول (گلدستے) سب ہی کچھ تھا۔ طباخی کا صیغہ راجہ کے سب سے چھوٹے بھائی سدا شیو کے تفویض تھا۔ ایک جگہ خام اجناس کی ناپ تول ہوتی تھی اور ایک دوسری جگہ پخت و پز ہوتی تھی اور ایک تیسرے مقام پر سینکڑوں باورچی اور خدمت گاران کھانوں کی تقسیم میں مصروف تھے جو بلحاظ اپنی نفاست کے دیوتاؤں کے قابل تھے کھانا ہر درجے کے آدمیوں کو لذیذ اور سونے کی ہی رکابیوں میں دیا جاتا تھا۔ آبنوشی کے لیئے مختلف مقامات پر کنوئیں اور تالاب کھُدوا دیئے گئے تھے بہت سے راجہ۔ روسا۔ امراء اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے مختلف کاموں پر تعینات کیئے گئے تھے۔ سری کرشن چندر نے اپنے لیئے یہ خدمت پسند کی کہ وہ رشیوں اور برہمنوں کے چرن دھلانے کی سعادت حاصل کرتے رہتے۔ جو دن جشن کے لیئے مقرر تھا اُس روز یدھشٹر مہاراج ایک بے نظیر شامیانے میں سونے کے تخت پر براج رہے تھے ستیکی چھتر تھامے ہوئے تھا اور مورچھل راجہ کے بھائی جھل رہے تھے۔ ذی تربیت گرو ویاس نے مذہبی رسوم ادا کیں اور اُس پانی سے جو تمام روئے زمین کے مقدس دریاؤں اور سمندروں سے جمع کیا تھا اصطباغ دیا۔ سینکڑوں بڑے بڑے رشی وید کے ترانے گا رہے تھے۔ دھومیا یجن ذکلیا اور دوسروں نے مل کر وہ چاول پکائے تھے جو اس تقریب سے مخصوص تھے اور جو دیوتاؤں پر چڑہائے گئے۔ مختلف بلاد و امصار کے بڑے بڑے راجہ مہاراجہ جیسے کرش (جس سے غالباً روس مراد ہی) چین۔ لنکا۔ برہما۔ ترکستان۔ افغانستان وامثالہم مختلف دور دراز اقطاع سے آئے تھے جن کا شمار اور انحصار باعث تطویل ہی۔ ان سبھوں نے مہاراج یدھشٹر کے حضور میں۔ زر و نقرہ جواہرات۔ زیورات مروارید۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ خچر۔ بیل۔ اونٹ۔ اقمشۂ قیمتی اپنے اپنے ملک کے نوادرات بے شمار ہر قسم کے ہتھیار حسین وخوب صورت باندیاں۔ وقس علی ہذا اپنے اپنے مراتب اور شان کے موافق مقسم قسم کی چیزیں پیش کیں جو تحائف قبول ہوئے وہ ہر قسم کے تعداد یا وزن یا کیل میں ہزار سے کم نہ تھے۔ شاہزادہ دریودھن اپنے والد (بزرگوار) مہاراجہ دھرت راشٹر راجہ درموپت کے ساتھ آیا تھا۔ جو مہارانی دروپدی کا باپ تھا

ششوپال چیدیری کا راجہ اور دوسرے عزیز قریب سب جمع تھے۔ بالجملہ بے شمار بادشاہ راجہ سردار جمع ہوئے تھے
پھر اس کے بعد رتبہ برہمنوں۔ چھتریوں اور ویشوں کا تھا اور نیز معزز و ذی علم شودر لوگ
خاص طور پر مدعو کیے گئے تھے۔ لیکن شودروں کو صرف اس جگہ جہاں کہ متبرک مذہبی رسم
ادا کی گئی تھی باریابی کا موقع نہیں ملا۔ اٹھاسی ہزار برہمنوں کو روزانہ کھانا کھلایا جاتا تھا۔ نیز
دس ہزار سنیاسیوں کو روزانہ محل میں بلا کر طبق ہائے طلائی میں پروسا جاتا تھا۔ مطلع خانہ
براہ راست خاص مہارانی صاحبہ کی زیر نگرانی تھا۔ مہارانی صاحبہ کا یہ دستور تھا کہ جب تک وہ
لنگڑوں۔ لولوں۔ اندھوں۔ مفلوجوں گیبرڑوں اور اسی قسم کے معذورین اور اپاہجوں کو
کھانا نہ کھلوا لیتی تھیں آپ لقمہ نہ توڑتی تھیں۔ بڑے بزرگ نرد کی مذہبی منڈلی (پارٹی) الگ ہی
تھی جس کے صدر وہ تھے اور جس کا منڈپ جداگانہ تھا جس میں بڑے بڑے مقدس
بزرگ۔ بڈھے اور جوان حیات و ممات اور اسی قسم کے دوسرے علمی مسائل پر مباحثہ اور
طبع آزمائی کرتے کہ جس سے حضار کو علاوہ دلچسپی اور سرور کے اُن کے علم و تجربے کو
بھی معتد بہ فائدہ پہنچتا تھا۔ سینکڑوں راجاؤں۔ امرار و رؤسا کے ایسے بڑے شان دار
مجمع میں ایک افسوس ناک واقعہ بھی ہوا کہ من جملہ مدعو فرماں رواؤں کے ایک شخص اسی
موقع و محل پر جان سے مار ڈالا گیا۔ اس سانحے سے سارے کے سارے لوگ انگشت
بدہاں اور متحیر ہو گئے لیکن کسی ایک نے بھی چوں نہ کی ششوپال چیدیری کے مقتدر راجہ کو
اس بات پر کچھ حسد معلوم ہوا کہ رخصت کے وقت سب سے اول سری کرشن کی پوجا کی گئی ایسے
ششوپال کو غصہ آ گیا اور اُس نے کچھ نامناسب الفاظ سری کرشن چندر اور دوسرے
راجاؤں کو بھی کہہ ڈالے جس پر سری کرشن نے جو باقی مہاتی اس راج سویا یگن کا تھا
ششوپال کا سر قلم کر دیا۔ جس سے یہ بھی جتلانا مقصود تھا کہ یدھشٹر صرف ایک بڑا راجہ ہی
نہ تھا بلکہ وہ ایک خود مختار اور مطلق العنان فرماں روا بھی تھا۔ اس تقریب میں رانیاں بھی رونق
بخش تھیں۔ مہارانی دروپدی ملکہ کے قایم مقام تھی۔ اور دوسری رانیوں نے بھی تمام مراسم
میں شرکت کی۔ اس تقریب کے اختتام پر یدھشٹر نے زنجیر ہائے فیل جمعیت سواران
و پیدل کا ملاحظہ بھی فرمایا۔ یہ ایک بڑا بھاری اور عظیم الشان جلسہ تھا جس میں فیل نشین
اور اسپ سواروں کی کروڑوں کی تعداد تھی لاکھوں رتھیں اور گاڑیاں اور بے شمار
پیدل جمع تھے جن کو سارے باج گزار راجہ کے قرابت داری والے اور سلطنت کے

دوست احباب اپنے ساتھ لائے تھے۔ دنگل اور تماشہ گاہیں بھی بنائی گئی تھیں۔ مختلف اقطاع ملک سے پہلوان اپنی کشتیوں کے کرتب دکھانے آئے تھے۔ نامی گرامی طوائفوں میں اُروسی اور رنبھا کے سوا اور بھی بہت سی تھیں جن کے گانے بجانے کا بڑا لطف رہا اور مجلس کو بڑا حظ ملا۔ چترسین اور دوسرے گویئے اور کلاونتوں نے بھی اپنے عمدہ عمدہ راگوں سے بہت ہی محظوظ کیا۔ یہ تقریب اور جلسے برابر ایک سال تک رہے۔ کرشن کے مشورے سے مہاراج یدھشٹر رعایا برایا پر حسب ذیل مراحم و عواطف خسروانہ مبذول کیں:۔ نہریں اور تالاب کھدوائے گئے تاکہ رعایا بارش سماوی کی محتاج نہ رہے۔ غلے کے انبار خانے بنائے گئے۔ تجار کا اعزاز و احترام کرکے مال تجارت کا محصول گھٹا دیا گیا۔ اس طرح راج سویا یگن کی تقریب مسعود بخیر و خوبی ختم ہوئی جس جگہ یگن کی تقریب ہوئی وہ وہی مقام بتلایا جاتا ہے جہاں کہ اب لال قلعے کے شمال میں نیلی چھتری ہے لیکن صرف لوگوں کی کہن ہے۔ جس کا ہمارے پاس کوئی وثیقہ نہیں۔

ہندوؤں کی دلی مسلمانوں کی دہلی انگریزوں کی ڈلہی

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

دہلی کی قدیم تاریخ بوجہ اُس کی قدامت کے ایسی کچھ پردۂ خفا میں ہے کہ اس گتھی کا سلجھانا بالکل ناممکنات سے ہے۔ اس وجہ سے ابھی تک ہم دہلی کی قدیم تاریخ کے متعلق بالکل خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں اور محض تخیلات اور فرضیات سے کام لینے پر مجبور ہیں سر ہنری الیٹ نے جو محکمۂ آثار قدیمہ کی رہنمائی کی ہے کہ اندرپرستھ کی جگہ دلی نے کب لی یہ ایک سربستہ راز ہے جو باوجود عالمانہ تفحص اور تحقیقات کے بھی اب تک قابل اطمینان طور پر تحقق نہیں ہو سکا۔ اندرپرستھ کی جگہ دہلی نے کب لی کوئی اُس زمانے کی تحریر تو دستیاب نہیں ہوئی لیکن تاریخی لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ عیسوی کی پہلی صدی میں اُجین کے راجہ بکرماجیت نے اندرپرست پر اُس وقت حملہ کیا تھا جب کہ وہ کماؤں کے راجہ سکونتا کے قبضے میں تھا اور اُس کو مار کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مسٹر ٹیلبائز و ہیلز لکھتے ہیں کہ جب اندرپرستھ کو بکرماجیت نے راجۂ کماؤں سے فتح کیا تو اس کے بعد سے آٹھ صدیوں تک یہ مقام دارالسلطنت نہیں رہا۔ پھر اس کو راجہ اننگ پال نے از سر نو بسایا تب بجائے اندرپرستھ

کے اِس کا نام دلی پڑا۔ بہر حال اس امر کا یقینی طور پر فیصلہ کرنا ناممکن ہی کہ راجہ کاؤں سے
شروع کرنے کے بعد اس خطے کا نام دلی پڑا یا کسی ایسے واقعات کی بنا پر جن سے تاریخ
ساکت ہی تداولِ ایام اور امتداد زمانے سے راجہ یدھشٹر کی دارالسلطنت کا اصلی نام
مٹ کر دلی ٹھیر گیا۔ یہ ہم نے مانا کہ بکراجیت کے قبض و تصرف سے پیشتر دلی کا نام کہیں
سنائی نہیں دیا۔ یہ زمانہ ۵۶ء کے قریب کا قرار پاتا ہی اور اسی زمانے کے ہندوستان کے
تاریخی حالات یونانی مورخوں نے لکھے ہیں مگر اُن کے کان دلی کے نام سے آشنا
ہونے کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی۔ اِس کے بعد بھی زمانۂ مابعد کے مسلمانوں کے
حملوں میں جو عیسوی گیارہویں صدی میں ہوے اُن میں نہ کہیں دلی کا ذکر ہی نہ اُجین کے
راجہ بکراجیت کے دارالخلافہ رہنے کا اسی طرح نہ دلی طاقت ور گپتا خاندان (۳۰۰ تا ۶۱۹ء)
کی راج دھانی رہی نہ قنوج کے بڑے سلاطین (۵۵۰ تا ۶۰۶ء) کا دارالخلافہ رہی۔ چینی سیاح
فاہی آن (Fa Hian) اور ہیون تھسینگ Hewen Thsang کو
جو اس ملک اور اس نواح میں ۴۰۰ تا ۶۴۵ء میں آے تھے اِن کو دلی کی خبر تک نہیں۔
نہ دلی کوئی اس قدر مشہور مقام تھا کہ محمود غزنوی کو ہندوستان کے حملوں کی رغبت
دلاتا۔ مشہور مورخ البیرونی نے دسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کی حالت کا
بہترین خاکہ کھینچا ہی اور وہ کئی برس ہندوستان میں رہا بھی ہی چنانچہ سلطان محمود غزنوی
کے حملے کے زمانے میں وہ سنسکرت پڑھ رہا تھا اُسکی قلم سے بھی کہیں دلی کا نام نہیں
نکلا (از تاریخ مسٹر الیٹ جلد اول ص۲۳)۔ اُس نے قنوج۔ ماہورہ (متھرا) تھانیسر کا ذکر
البتہ کیا ہی اور قنوج سے مختلف مقامات کا فاصلہ بیان کرتے وقت میرٹھ۔ پانی پت۔
کیتھل تک کے نام گنواے ہیں مگر دلی کا اُس نے بھی نام نہیں لیا۔ سلطان محمود غزنوی
کے زمانے کے مورخ عُتبی مصنفِ "تاریخ یمینی" نے بھی خاص دلی کا کوئی ذکر نہیں کیا
حالاں کہ دلی کے پاس پاس کے چار مقامات غزنویوں نے لوٹے تھے۔ عُتبی نے جمنا پار
ہونے کا ذکر کیا ہی۔ متھرا کے محاصرے اور قنوج کی فتح کا بھی ذکر ہی مگر دہلی کا ذرا سا بھی
حوالہ نہیں۔ مورخین اور سیاحوں کے طرزِ عمل سے ہم کو اس نتیجے پر پہنچے بغیر گزر
نہیں ہی کہ محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے کرنے تک دلی کسی شمار قطار میں
نہ تھی جو قابل تذکرہ سمجھی جاتی۔ اگر اس کا وجود اس زمانے میں بالفرض رہا بھی ہوگا

تو ایک گم نامی کی حالت میں کوئی چھوٹی موٹی بستی رہی ہوگی تو رہی ہوگی۔ قبل ازیں کہ ہم دلی کی آبادی کی جگہ کا تعین کریں جو ایک نہایت مختلف فیہ امر ہو پہلے تو ہم اس کی وجہ تسمیہ کی مختلف روایات اور اس کے بانیوں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنی چاہیئے۔ یہ خیال کہ دلی راجہ دیپ کی بسائی ہوئی ہو اب بالکل متروک ہو۔ یہ مسلم ہو کہ اندرپرست دلی سے کہیں پہلے کا آباد شدہ تھا۔ بریں ہم یہ خیال بھی کہ دلی کو راجہ یدھشٹر کے آباواجداد نے آباد کیا تھا نا قابل قبول ہو اور مسٹر بگلر (Beglar) کا یہ خیال کہ دلی اور اندرپرستھ دونوں شہر زمان واحد میں آباد تھے تاریخی نقطۂ نظر سے نظر انداز کرنے کے قابل ہو۔ یہ بھی غیر معتبر روایت ہو کہ دلی کو تنوار خاندان کے راجپوت راجاؤں نے ۹۱۹ ق م میں آباد کیا تھا۔ اور دہلی کا ماخذ ہندی کا لفظ "ڈھیلی" یعنی وہ مقام جس کی سرزمین ایسی پلپلی اور نرم تھی کہ میخ نہ ٹھیر سکتی تھی بھی کچھ یوں ہی چلتی سی بات ہو۔ تیسری روایت یہ ہو کہ قنوج کے ایک راجہ کا نام دیلو تھا جس کے مقبوضات میں ایک مقام دلی بھی تھا جہاں کا گورنر سروپ دت نام تھا اور جس نے اندرپرستھ کے ویران شدہ مقام پر ایک شہر آباد کیا جس کا نام اپنے راجہ کے نام پر "دیلو" رکھا۔ اس روایت کی تائید میں مشہور شاعر امیر خسرو کا یہ شعر نقل کیا جاتا ہو ؎

یا نمک اسم بخش یا از خور بفرما بار گیر
یا بفرماں دہ کہ گردوں نشینم در دہلو روم

لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہو کہ راجہ دیلو ۳۲۸ ق م میں تھا جس کا ہم عصر کماؤں کا راجہ پورس تھا جس نے اُسے مغلوب کر کے دلی فتح کی۔ ان وجوہ سے یہ امر بہت قرین قیاس ہو کہ دلی کسی راجہ کی بسائی ہوئی ہو لیکن اس کے آباد کرنے کے حالات کا راسے قایم کرنا تب بھی مشکل ہو۔ جنرل کننگھم کہتے ہیں کہ دلی کا نام پہلے پہل کماؤں کے راجہ کے زمانے میں زبان پر آیا جو دہلی کا فاتح تھا اور آگے چل کر اُسی سے اجین کے راجہ نے فتح کی۔ اس واقعے کے متعلق چار مختلف روایتیں ہیں۔
(۱) کماؤں کے راجہ پورس کا دیلو کو فتح کرنا (۲) کماؤں کے راجہ سکونتا کا راجہ راجپال سے دلی کو فتح کرنا۔ پھر ان دونوں کو راجہ بکرماجیت کا مغلوب کرنا جنرل صاحب کی رائے میں یہ دونوں شکلیں ایک ہی واقعے کو ظاہر کرتی ہیں۔ (۳) دلی کے راجہ

بنگمائتی کو ایک راگھوبنسی راجہ نے جس کا نام سکندراج تھا مغلوب کرنا جس کو آگے چل کر اجین کے راجہ بکرماجیت نے مغلوب کیا۔ (۴) ہند کے راجہ رسل کو ایک ہاتھی نے معزول کیا اور ہاتھی کو برہ کنی آرین (Barkniang) نے راجہ پورس اور سیلوکس کے واقعے کو نزہتہ القلوب سے نقل کیا ہی۔ غرض یہ کہ شہر دہلی کی بنا کی مختلف تاریخیں مختلف ذرائع سے معلوم ہوتی ہیں لیکن اس مقام پر جنرل صاحب کی راے کی تنقید کی جاتی ہی جو بادی النظر میں قابل وثوق نہیں چنانچہ خود جنرل صاحب کو بھی اپنی راے پر پورا بھروسہ نہیں ہی۔ صاحب موصوف ابوریحان کی راے بیان کرتے ہیں کہ بکرماجیت جس نے کوہی راجہ پر فتح پائی اس بکرماجیت سے جس کا سمت مشہور ہی جو سنہ ۵۷ء کے مطابق آن کے پڑتا ہی (۱۳۵) برس کے بعد راجہ ہوا۔ پہلا بکرماجیت اور سالیواہن جس نے سکے کا رواج دیا ایک ہی شخص ہی۔ راجہ بکرماجیت فاتح کی طرح سالیواہن نے بھی نوّے برس سلطنت کی اور سنہ ۷۸ء میں جو اس کے سکے سمت کا شروع سال تھا شکست پائی۔ جنرل صاحب اس زمانے سے کچھ پہلے دہلی کی بنا کا زمانہ قرار دینا زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں سنہ ۵۷ ق م جو بکرماجیت کا زمانہ ہوتا ہی اور جسے مورخ فرشتہ نے بھی لکھا ہی ہمارے خیال میں بنائے دہلی کے لیئے واقعیت سے زیادہ بعید نہ ہوگا۔ دہلی کس مقام پر بسائی گئی اس امر میں بھی ہندوستانیوں اور جنرل صاحب کی راے میں بیّن اختلاف ہی۔ ہندوستانی یقین کرتے ہیں اور روایات بھی یقیناً انھیں کی موئید ہیں کہ قدیم دلّی اُسی جگہ بنائی گئی تھی جہاں کا اُجڑا ہوا شہر اندرپرستھ کا پہلے سے موجود تھا اور جب دلّی کو دوبارہ راجہ اننگ پال نے جو راجپوتوں کے تنوار خاندان کا مورث تھا آباد کیا۔ تو وہ مقام وہ تھا جہاں کہ اب پرانا قلعہ ہی۔ لیکن جنرل صاحب کی راے یہ ہی کہ پرانی دلّی اور اندرپرستھ دونوں بالکل جداگانہ شہر تھے جن کے مابین پانچ میل کا فصل تھا۔ پرانی دلّی کو وہ اس پہاڑی پر بتلاتے ہیں جہاں مشہور لوہے کی لاٹ ہی جو غالباً قدیم دلّی کی یادگار ہی۔ اب اس امر کا تصفیہ ایک مشکل کام ہی کہ کون سی راے زیادہ وقیع ہی۔ جو لوگ روایات متواترہ پر بھروسہ کرتے ہیں اور گورنمنٹ کے کسی عہدہ دار کی راے پر خواہ مخواہ ٹیکہ نہیں لگاتے اُن کے نزدیک یہ بات کچھ بھی خلاف نہیں ہی کہ پرانی دلّی اندرپرستھ کی جگہ ہی بنائی گئی جو پہلے سے ایک بڑی بھاری سلطنت کا دارالخلافہ تھا اور راجہ اننگ پال اوّل نے کچھ عجب نہیں کہ نئے شہر کو از سر نو بسانے کے

مقابلے میں پرانے شہر ہی کے پھر آباد کرنے کو ترجیح دی ہو اور یہی ابوالفضل کی بھی رائے ہی اور اسی پر آگے چل کر تمام مورخین نے بھی اتفاق کیا ہی۔ سلاطینِ اسلام کی پرانی تاریخوں میں پرانے قلعے کو اندر پرپت بھی لکھا ہی۔ اس سے تو ہندوستانیوں ہی کی رائے مرجع قرار پاتی ہی۔ یہ ضرور نہیں ہی کہ لوہے کی لاٹ پرانی دلی کے بیچوں بیچ یا اُس کے آس پاس ہی نصب کی گئی ہو۔ غالبًا جنرل صاحب کا مقصود اس سے عارضی دلی ہوگا جس پر راجہ سکوتنا تیرہ سال قابض رہا اور بعد کو راجہ بکرماجیت نے فتح کرلی۔

اب رہی لوہے کی لاٹ۔ کون کہہ سکتا ہی کہ وہ اپنی اصلی جگہ پر اب تک قایم بھی ہی یا نہیں ہمارے علم کا یہ حال ہی کہ ہم آج تک اُس کے بنانے والے کو بھی نہیں جانتے۔ اب جنرل صاحب کے استدلال سے بحث کی جاتی ہی۔ اِس میں شک نہیں کہ راجہ اننگ پال ثانی نے سمت ۱۱۰۹ء میں دلی کو دوبارہ آباد کیا کیونکہ یہ بات خود آہنی ستون پر کندہ ہی اس سے ہم صحیح طور پر نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ دوبارہ آباد کی ہوئی دلی راجہ اننگ پال اول والی دلی تھی۔ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جو آہنی ستون شہر کی آبادی کی یادگار میں بنایا گیا تھا وہ اغلبًا اُس مقام سے جسکی وہ یادگار ہی دور نہیں رکھا جاسکتا۔ پھر اگر اننگ پال اول کے ہی سر دلی کے آباد کرنے کا سہرا رہتا ہو تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہی کہ اُس نے پانچ میل کے فاصلے سے اسی نام کی ایک اور دلی بسائی ہو۔ اگر ہم جنرل صاحب کی رائے سے اتفاق کریں تو مورخین کی تمام روایات کو پس پشت ڈال دینا پڑے گا اور اگر ہم جنرل صاحب کی رائے کی تصویب نہ کریں تو ہم کو لازمی طور پر اِس بات سے انحراف کرنا ہوگا کہ اننگ پال اول نے دوبارہ دلی بسائی اور نیز اُس سے بھی اعراض کرنا ہوگا کہ اننگ پال ثانی نے اُسی جگہ از سرِ نو دلی آباد کی اور اس سے بھی کہ لوہے کی لاٹ اُسی مقام پر کھڑی ہی جہاں کہ دلی آباد کی گئی تھی۔ ماحصل اس تمام تقریر کا یہ ہی کہ رائے پتھورا کا تعلق دلی کی تاریخ سے بالکل غیر متعلق قرار پاتا ہی۔ یہ جو روایت مشہور ہی کہ بکرماجیت نے راجہ ساکا کو شکست دی تو اس کے بعد سے (۷۹۲) برس تک دلی بالکل چھوڑ دی گئی تھی اس بات کو اکثر مورخین نے بالاتفاق بیان کیا ہی اور اس سے یہ سمجھا جاتا ہی کہ اس عرصہ مدت میں دلی پانڈو راجاؤں کی دار السلطنت نہیں رہی۔ بقول کرنل ٹاڈ آٹھویں صدی تک دلی پر کوئی حکمراں نہ تھا اور گورنمنٹ شمالی ہند سے جنوبی ہند میں منتقل ہوگئی تھی۔ اور یہی

حالت چوتھی صدی اور بقول بعض مورخین کے بکرماجیت کے بعد تک رہی۔ اس کے بعد یدھشٹر کے شہر اندرپرست پر تنوار خاندان کے راجپوتوں نے قبضہ کیا جو اپنے کو پانڈوؤں کی نسل کا کہتے تھے۔ اس وقت اِس قدیم دارالسلطنت کو جو پھر آباد کیا گیا تو ایک نیا نام دلی کا دیا گیا اور اس کے بانی انگ پال اول کا خاندان بارھویں صدی تک حکمراں رہا تا آں کہ انگ پال سوم نے اپنے پوتے پرتھی راج کے لیے جو زیادہ تر راے پتھورا کے نام سے مشہور ہی خود تخت خالی کر دیا۔ ہندوستانی مورخین کا یہ بیان ہی کہ انگ پال نے قنوج سے اپنا راج دھانی ۲۶ء کے قریب اندرپرستھ پر منتقل کرلیا پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس جدید دارالسلطنت کا نام دلی مشہور ہوگیا کننگھم صاحب کی تحقیقات کی بنا پر انگ پال نے دلی شہر کو قریب ۱۳۱ء یا ۷۳۶ء از سر نو بسایا۔ صاحب موصوف کی راے ہی کہ لوہے کی لاٹ کے راجہ دہاوا کے کتبے کی بنا پر (۷۹۲) برس تک جو دلی کا دارالسلطنت سے خالی رہنا کہا جاتا ہی اس اثنا میں بھی راجہ دہاوا کے زمانے میں دلی ایک دفعہ مستقر سلطنت رہ چکا ہی یا کم سے کم یہ ہوا کہ اس غاصب کے عہد میں براے چندے دلی کچھ پنپ گئی ہو۔ لیکن ڈاکٹر بھاؤ داجی نے جو اس کتبے کا ترجمہ کیا ہی اس کی روسے راجہ دہاوا کا پتہ نہیں چلتا اور نہ کسی تاریخ میں اس نام کے کسی راجہ کا ذکر دیکھا گیا اور یہی مسٹر ایڈورڈ طامس کی بھی راے ہی کہ اس نام کا کوئی راجہ اس زمانے میں نہیں گزرا۔ ابوالفضل نے جو چوتھی عیسوی صدی میں تنوار خاندان والوں نے دلی کا از سر نو بنانا لکھا ہی اس کو کننگھم صاحب اور سرسید احمد خاں صاحب دونوں نے غلط ظاہر کیا ہی جنرل صاحب نے اس غلطی کی تشریح یوں کی ہی کہ مصنف آئینِ اکبری نے بلبھی سمت (۴۲۹) کو بکرماجیتی سمت سمجھ لیا ہی۔ حالانکہ بلبھی سمت کا آغاز ۳۱۹ء سے ہوا ہی۔ لوہے کی لاٹ پر دلی کے از سر نو بنانے کا سمت ۴۱۹ منقوش ہی اس میں اگر (۳۱۸) جوڑ دیئے جائیں تو ۷۳۷ سنہ عیسوی ہوتا ہی۔ امیر خسرو کی مثنوی "نہ سپہر" کا حوالہ بھی دیا جاتا ہی جس میں راجہ انگ پال اول کا ذکر ہی کہ وہ ایک بڑا "راے" تھا جو پان چھ سو برس اول زندہ تھا۔ اس مثنوی کے سال تصنیف سے حساب لگایا جائے تو انگ پال کا زمانہ ۷۱۸ء یا ۷۱۸ء قرار پاتا ہی سرسید اور جنرل صاحب دونوں ذیل کی روایت اسی مثنوی سے نقل کرتے ہیں لیکن جنرل صاحب ان شعروں کا وجود آہنی ستون کے

پاس تبلاتے ہیں اور سرسید پر انے قلعے میں۔ (راجہ اننگ پال) نے اپنے محل کے دروازے پر پتھر کے بنے ہوئے دو شیر بٹھلائے تھے اور اُنھیں کے پاس ایک گھنٹا بھی اس غرض سے لٹکایا گیا تھا کہ دادخواہ اُسے ہلا دیں جس کی آواز سن کر راجہ لوگوں کی داد کو پہونچتا تھا۔" سرسید یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ شیر ۱۳۱۵ء تک موجود تھے لیکن آگے چل کر ان کا کیا حشر ہوا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ بات بہت ممکن ہو کہ صحیح ہو کہ دلی راجہ اننگ پال دوم کی دارالسلطنت تھی جس نے ایک ایسے پُرانے شہر کو جو اسی مقام پر پہلے بسا ہوا تھا ازسرِنو آباد کیا لیکن ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ جب گیارہویں صدی عیسوی میں سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو دلی ایک ایسی معمولی بستی اور قصبہ گمنامی میں تھی کہ یا تو مسلمانوں کے کان اُس کے نام سے آشنا نہ تھے یا یہ کہ اُنھوں نے دلی کا نام سنا ہو لیکن چونکہ وہ ایک معمولی حیثیت کی بستی تھی خاص طور پر تذکرے کے قابل نہیں سمجھی گئی۔

لال قلعہ یا قلعۂ مبارک یا قلعۂ شاہجہاں آباد

۱۰۴۸ھ

زہے قلعہ کاندر بساتین وی
نداردی بہشت ست بے گل نذی

نموذش گلِ کوہساری دہد
زمستاں نسیمِ بہاری دہد

بہشتی شدہ بیشہ پیرامنش
دگر گونہ رُتے بستہ بر دامنش

سوادش ز بس سبزۂ اشک بید
چو باغ ارم مایۂ صد امید

گرایندہ گردش با سودگی
فروشستہ خاکش ز آلودگی

ہمہ سال ریحان او سبز شاخ
ہمیشہ درو ناز و نعمت فراخ

زمینش باب زر آغشتہ اند
تو گوئی دراں زعفراں کشتہ اند

خمانندہ بر سبزۂ آں زمیں
خیالے نہ بیند بجز خرّمی

لب خندقش بستہ از سحر دم
طلسمے میانِ وجود و عدم

جہاں را ضرورست خمیازۂ
کہ از سایہ اش گیرد اندازۂ

۱۵۲۶ء کی پانی پت کی لڑائی اور لودھی خاندان کی تباہی کے بعد ہندوستان کا مغل بادشاہ بابر آگرے میں جو اُس زمانے میں دارالسلطنت تھا تخت نشین ہوا۔

بابر کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا ہمایوں بھی آگرے ہی میں اُس وقت تک رہا جب کہ
۱۵۴۰ء میں اُسے شیر شاہ نے ہندوستان سے بدر کر دیا اور جب ۱۵۵۵ء میں
ہمایوں پھر ہندوستان میں آیا تو اُس نے دہلی میں قیام کیا اور صرف چھ مہینے سلطنت
کر کے یہیں انتقال کیا۔ ہمایوں کے بعد اکبر نے پھر آگرے کو دارالسلطنت قرار دیا
اور دہلی میں ایک نایب السلطنت رہنے لگا۔ اکبر کے بعد جہانگیر بھی آگرے ہی میں رہا۔
جہانگیر کے بعد شاہ جہاں کی تخت نشینی کا جلوس بھی بڑی دھوم دھام سے اُس کے
جد امجد کے محل میں آگرے ہی میں ہوا۔ گیارہ برس کے بعد جب جاہ و حشم کے ہجوم سے آگرے
اور لاہور کے قلعوں میں گنجایش نہ رہی تو شاہ جہاں نے دلی کو دارالسلطنت مقرر کرنے کا
قصد کیا اور کئی دفعہ شہر دین پناہ کو دیکھنے گیا۔ نجومیوں اور علما و مشایخین کے مشورے
سے یہ جگہ جہاں کہ اب لال قلعہ ہے قلعے کی تعمیر کے لیے منتخب کی اور پھر قلعے کے اطراف
شہر شاہ جہاں آباد کی بنا ڈالی۔ جس کو بالعموم دہلی کہا جاتا ہے۔ اور شاہ جہاں آباد میں ایسا قلعہ
بنوانا شروع کیا جو آگرے کے قلعے سے دوچند اور لاہور کے قلعے سے چند در چند
زیادہ ہو۔ بعد از دو ر پنج ساعت دوازدہ دقیقہ از شب جمعہ ۹ محرم ۱۰۴۹ھ / ۱۶۳۹ء مطابق ۱۲ ہر اردی
بہشت ۱۲ شمسی ملک شاہی۔ ساعت مسعود آوان محمود میں عزت خاں (جو بعد ۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء
میں سندھ کا صوبہ دار رہا) کے زیر اہتمام سنگ بنیاد رکھا گیا۔ کاریگروں میں سب سے
بڑے اُستاد احمد و حامد نامی تھے عزت خاں کے سپرد یہ کام پانچ مہینے دو دن رہا
جس میں اُس نے بنیادیں بھروا دیں اور مال مسالا جمع کیا تھا کہ سندھ جانے کا حکم ملا
جب عزت خاں سندھ بھیجا گیا تو قلعہ کا کام اللہ وردی خاں کے سپرد ہوا جس نے
دو برس ایک مہینے چودہ دن میں قلعے کے گرد فصیل بارہ بارہ گز اونچی اُٹھوائی۔
اِس کے بعد اللہ وردی خاں بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا گیا اور یہ کام مکرمت خاں کے
تفویض ہوا جس نے نو سال کی لگاتار محنت سے سنہ (۲۰) جلوس شاہجہانی میں تعمیر کا
کام حسن اختتام کو پہنچایا۔ اُس وقت بادشاہ کابل میں تھا مکرمت خاں میر عمارت نے
پیشگاہ خداوندی میں عرضی گزرانی۔ بتاریخ ۲۴ ربیع الاول ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء بادشاہ سلامت

---

[1] آثار الصنادید میں ایک قدیم دیباچے پر سے یہ تاریخ درج کی گئی ہے ورنہ کتبے کی رو سے دسویں ذی حجہ
۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸ء قلعے کی بنیاد رکھنے کی تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے۔۱۲

ہلواسا آبی پر سوار ہوکر جلوسِ شاہانہ سے قلعۂ معلی میں دریا کے دروازے سے جو غالباً خضری دروازہ تھا تشریف فرما ہوئے اور قلعے کو ملاحظہ فرمایا سر سے پاؤں تک سنگ سرخ سے گُل رنگ۔ اس پر سنگ مرمر کے حاشیے کا نرالا ڈھنگ۔ برجیاں فصیلیں اور مرغولیں خوشنما۔ عمارتیں اور باغ اور باغوں کی نہریں ایسی دل کشا کہ اگر بے مبالغہ بھی ایک ایک کی مفصل تفصیل کی جائے تو ایک دفتر آراستہ ہوجائے۔ کل قلعے کا نقشہ دیکھو تو کاغذ پر ایک ہشت پہلو پھول نظر آتا ہے دیوانِ عام میں دربار کا انعقاد مرکوزِ خاطرِ اقدس ہوا۔ غرض جشن کا سامان شروع ہوا۔ دیوانِ عام کے سامنے وہ شامیانہ کہ جس کا نام "دل بادل" تھا اور دیوانِ خاص کے میدان میں "شہامنڈل" خیمہ ایستادہ ہوا جس کا کلس خیمۂ فلک کے پار نکلا جاتا تھا۔ یہ بھی سات برس کے عرصے میں تیار ہوئے تھے اور ہزاروں گز پشمینے کشمیر کے اور مخمل زرباف گجرات کے ان پر خرچ ہوئے تھے۔ دونوں سونے کے ستونوں اور چاندی کے استادوں پر کھڑے تھے۔ ان کے آگے خوشنما شامیانے اطلسی اور زربافی۔ سنہری روپہلی چوبوں پر تانے گئے۔ دیوان عالی جس طرح طلائی چھت کی میناکاری سے گوناگوں تھا اسی طرح ایرانی قالین اور بناسی بکھواؤں سے بوقلمون تھا۔ صدر سے لے کر پائنداز کے ایک ایک مکان تک در و دیوار کو مخمل۔ زربافت۔ بادلہ و کمخواب۔ پردہ ہائے فرنگی۔ دیباے رومی۔ اطلسِ چینی سے نگارخانۂ چین کردیا۔ صدر میں تختِ طاؤس بچھایا گیا۔ اور دربار بڑی شان و شوکت سے ہوا۔ برنیر سیاح نے اس قلعہ کے متعلق ۱۶۶۳ء میں لکھا ہے کہ "قلعہ کی عمارت مدور بلکہ نصف دائرے کی شکل کی ہے۔ قلعہ پر سے دریا کا منظر (خوب) ہے۔ قلعہ اور دریا کے بیچ میں ایک بڑا ریتیلا میدان حائل ہے۔ اسی میدان میں ہاتھیوں کی لڑائی (کا تماشہ) ہوتا ہے۔ امراء جاگیرداروں۔ راجاؤں اور رؤسائے ساکی افواج بغرض ملاحظہ خداوندی یہیں صف آرا ہوتی ہیں اور بادشاہ سلامت نشیمن میں برآمد ہوکر ملاحظہ کا شرف بخشتے ہیں۔ قلعہ کی فصیل کے قدیم اور گول برج اسی وضع کے ہیں جیسے کہ شہر پناہ کے ہیں لیکن قلعے کے برج کچھ تو اینٹ کے ہیں اور کچھ سنگ سرخ کے جو سنگ مرمر سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر ان کی ساخت زیادہ بہتر ہے۔" قلعہ بے قاعدہ ہشت پہل شکل کا ہے۔ جس کے دو بڑے بڑے ضلعوں میں سے ایک مشرقی دریا کی جانب ہے اور دوسرا مغربی شہر کی طرف اور چھ چھوٹے چھوٹے ضلعے شمال اور جنوب کی سمت میں ہیں۔ قلعے کا دَور قریب قریب ڈیڑھ میل کے ہے۔

طول تقریباً تین ہزار فیٹ اور عرض بجانب دریا اٹھارہ سو فیٹ ہو۔ دریا کے طرف کی فصیل اگرچہ ساٹھ فیٹ اونچی ہو مگر قلعے کی زمین میں اس قدر بھرتی کی گئی ہو کہ اس فصیل کے ہم سطح ہو اور اسی سبب سے دریا کی طرف سے قلعہ اور شہر شاہجہاں آباد کا منظر عجیب خوش نما نظر آتا ہو فصیل اور دریا کے بیچ میں ایک بڑا بھاری کوٹاریت کا ہو جس پر کبھی پانی نہیں چڑھتا۔ دوسری طرف سے قلعے کو دیکھیے تو اِس کی وسیع اور عظیم الشان سنگ سُرخ کا فصیل۔ برج۔ دروازے۔ بھاری بھاری پشتے اور گہری خندق دیکھ کر دل کو ایک گہرا اثر عظمت اور جبروت کا آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہو۔ فصیل کو دیکھیے آسمان سے باتیں کرتی ہو یعنی ۱۱۰ بلند جس میں سے ۷۵ سطح زمین کے اوپر ہو اور پائے میں ۴۵ عریض ہو اور ۳۰ وہاں جہاں کہ مورچہ بندی کا کنگورا ہو۔ خندق کو دیکھ کر ہیبت معلوم دیتی ہو جو ۷۵ عریض اور ۳۰ عمیق ہو۔ برنیر سیاح جو اورنگ زیب کے عہد میں اس ملک میں آیا تھا لکھتا ہو کہ "قلعے کی فصیل بلندی اور استحکام میں شہر کی فصیل سے کہیں زیادہ ہو قلعے کی طرف چھوڑ کر سب طرف پختہ سنگ بست خندق ہو جس میں ہر وقت پانی بھرا رہتا ہو اور مچھلیاں خوش فعلیاں کرتی رہتی ہیں"۔ لیکن جیسا کہ برنیر کی عادت ہو کہ ہمیشہ اُس کی نگاہ عیب جو رہتی ہو ایک چلتا سا فقرہ یہ بھی لکھ مارا ہو کہ "ایک معمولی سا توپ خانہ بھی ذرا سی دیر میں اُس کو مسمار کرکے زمین کے برابر ہو سکتا ہو"۔ میں کہتا ہوں کہ منہ سے کہہ دینا تو بہت آسان ہو لیکن کرکے دکھانا کاسے وارد"۔ خندق سے ملے ہوے بڑے بڑے باغات ہیں جن میں انواع واقسام کے ہرے بھرے درخت ہیں اور طرح بطرح رنگ برنگ کے پھول ہمیشہ کھلے رہتے ہیں جن کی سبزہ زاری اور بہار سے دماغ کو تازگی اور دل کو سرور کے علاوہ ایک ایسا خوش نما اور دل چسپ نظارہ ہو کہ جس نے یہ سماں دیکھا ہو وہی اس کا کچھ اندازہ کرسکتا ہو"۔ اب تو باغ کٹ کٹا کر ایک چٹیل میدان رہ گیا ہو ؎

بباغ رفتم و گل چیدم و فغاں کردم	زیارتِ دلِ مجروح بلبلاں کردم
بمن بگفت یکے بلبلے کہن سالے	ہزار سال دریں باغ آشیاں کردم
وفا و عہدِ مودت زگل رخاں مطلب	من ایں معاملہ را کردم و زیاں کردم

اب سال گزشتہ رہے سہے درخت کٹوا کر قلعے سے لے کر مسجد فتح پوری تک یعنی سارے چاندنی چوک کو سپاٹ کر دیا ہو کہ سایہ کا نام نہیں رہا۔ دلی کی سخت گرمی اور لوچس میں

چیل انڈا چھوڑ دیتی ہے اور ہرن کا لے پڑ جاتے ہیں۔ سڑک کے دو طرفہ سایہ دار درخت ایک نعمت غیر مترقبہ تھے۔ خدا جانے حکام وقت کی کیا مصلحت تھی کہ چاندنی چوک کا بازار جو عروس البلاد تھا یوں نوچ کھسوٹ ڈالا گیا۔ اب سڑک چوڑی کر کے کنارے کنارے پھر درخت لگائے گئے ہیں مگر ہو تا سال و گرہو کہ خورد رندہ کہ ماند۔ ایک زمانہ چاہیے کہ اتنے بڑھیں کہ لوگ ان کے سائے سے مستفید ہو سکیں۔ ؎

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش رموز مملکت خویش خسرواں دانند

کہا جاتا ہے کہ غدر کے پہلے تک ان باغوں کا کچھ کچھ حصہ باقی تھا مگر اب جو حالت ہے وہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ قلعے کے دو عالی شان سر بفلک دروازے مع پیش برجوں کے ہیں جن میں ایک دروازہ مغربی دیوار کے وسط میں ہے اور دوسرا فصیل کے جنوب و مغربی کونے میں قلعے کی جنوبی دیوار میں ہے ان دروازوں میں سے شہر کے لوگ آمد و رفت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں دروازے (۴۱ فٹ) بلند ہیں۔ یہ تو شہر کی طرف کے دروازے ہوئے ان کے علاوہ اور دو چھوٹے دروازے بھی ہیں۔ ایک مثمن برج کے پاس خضری دروازہ جو دریا کی طرف ہے اور دوسرا شمال رخ سلیم گڑھ کے پاس۔ ان کے سوا دو کھڑکیاں بھی اور ہیں ایک جنوب مشرق کے کونے میں اسد برج کے پاس دوسری شمال مشرق کے کونے میں شمالی دروازے اور شاہ برج کے بیچوں بیچ فصیلوں پر مورچے بندی کا کنگورا ہے جس میں اکیس چھوٹی چھوٹی برجیاں ہیں جن میں سے سات گول اور باقی ہشت پہلو ہیں۔ قلعے کے مصارف کا تخمینہ ایک کروڑ روپیہ کیا گیا ہے جس میں سے نصف رقم فصیلوں میں لگی اور بقیہ نصف اندرونی عمارات میں۔ بعض لوگوں نے صرف پچاس ہی لاکھ کا تخمینہ لگایا ہے جو بلحاظ وسعت و استحکام عمارات کم معلوم دیتا ہے لیکن کتبے میں بھی یہی رقم درج ہے جو غالباً صرف عمارات کی معلوم ہوتی ہے باقی خرچ تعمیر فصیل وغیرہ کا غالباً اس میں شامل نہ ہوگا۔ برنیر صاحب لکھتے ہیں کہ "قلعہ جس میں محلات اور دوسری شاہی عمارات ہیں لب دریا ہے۔ حد فاصل مابین قلعے اور دریا کے ایک ریتیلا میدان ہے" اسی میدان میں ایک دفعہ برنیر ہاتھیوں کی لڑائی میں ایک مست ہاتھی کی زد سے بال بال بچ گیا۔

لاہوری دروازہ
وکٹوریا گیٹ ۱۸۵۷ء۔ ۹۔۶۳۹ء
قلعے کے سب دروازوں میں سے اسی دروازے سے سب سے

زیادہ آمد و رفت ہے کیونکہ دہلی کے مشہور بازار چاندنی چوک کی طرف ہے۔ اورنگ زیب بادشاہ نے دروازے کے سامنے گھوگس یعنی پیش برج یا گھونگٹ کی دیوار بنوا کر دروازے کی پوری حفاظت کر دی۔ اگرچہ دروازے کا رخ بجانب مغرب ہے مگر پیش برج میں جانے کا رستہ جس کے نیچے گہری خندق ہے شمال کی طرف ہے۔ اس دروازے کے پیش برج کے سامنے ایک تغلی دار پل تھا اور ایسا ہی دلی دروازے کے سامنے بھی تھا جسکو اکبر ثانی نے توڑ وا کر ۲۵ چوڑا پختہ اور سنگ بست پل بنوا دیا جس کی محراب پر یہ کتبہ ہے

هو المغنی

سنہ جلوس والا ۱۱ ۱۸۱۱ء ۱۲۲۶ھ در عہد شاہ جم جاہ محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی صاحب قران ثانی باہتمام ولاور الدولہ رابرٹ ماقفرسن بہادر دلیر جنگ پل فیض منزل تعمیر یافت

گھونگٹ کی دیوار ایک مربع قطعۂ زمین کو محاط کیے ہوے ہے جس کی دیوار کنگورے سمیت چالیس فیٹ بلند ہے۔ مغربی دیوار کے کونوں پر برجیاں ہیں جن پر سنگ مرمر کے کلس ہیں۔ گھونگٹ کے اندر جانے کا ایک محراب دار دروازہ چالیس فیٹ اونچا اور چوبیس فیٹ چوڑا ہے جس کی بلندی احاطے کی دیوار سے آٹھ فیٹ زیادہ ہے جس پر مورچہ بندی کنگورا ہے جس کے دونوں طرف سنگ سرخ کی دو پتلی پتلی مناریں دس فیٹ اونچی ہیں۔

لاہوری دروازہ نہایت بلند اور محراب دار ہے۔ اس کی بلندی اکتالیس فیٹ اور چوڑائی چوبیس فیٹ ہے۔ یہ دروازہ سہ منزلہ ہے جس پر مثمن شکل کے کمرے بنے ہوے ہیں ان میں قلعے کے یوربین عہدہ دار رہتے ہیں اور نیچے گارڈ کے لوگ غدر سے پہلے قلعے کی فوج کا کمانیر انھیں میں رہتا تھا۔ ۱۸۱۱ء میں جب کہ اکبر شاہ ثانی کے لاڈلے فرزند نے مسٹر سیٹن (Seton) رزیڈنٹ دہلی کی جان لینے کا قصد کیا تب ہی سے گارڈ مقرر کیا گیا۔ برجوں پر ہشت پہلو چھتریاں بنی ہوئی ہیں۔ برجوں کے کنگوروں کے بیچوں بیچ دروازے کا درمیانی کنگورا ہے۔ دروازے کے بالائی کنگورے کی منڈیر پر ایک قطار سنگ سرخ کی تین تین فیٹ اونچی کھلی ہوئی محرابوں کی ہے جن پر سات چھوٹی چھوٹی سنگ مرمر کی برجیاں محرابوں کے برابر برابر ہیں۔ اس تمام خوب صورت اور خوشنما جنگلے کی دونوں جانب پتلی پتلی گاؤ دم سنگ مرمر کی مناریں ہیں جن پر لالٹین کی وضع کے سنگ مرمر کے سفید براق گنبد چڑھے ہوے ہیں ۱۸۵۷ء کے غدر میں اسی دروازے کے سامنے مسٹر فریزر۔ کپتان ڈگلس۔

نقشۂ دہلی دروازہ قلعۂ معلیٰ

پادری جننگ۔ اُن کی لڑکی اور مسز کلیفرڈ جو ایک نوجوان لیڈی اُن کی مہمان تھیں اور مسٹر ہچنسن سب کے سب باغیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

دلی دروازہ
الگزینڈرا گیٹ
سنہ ۱۰۴۸-۱۰۵۸ھ
۱۶۳۹-۴۸ء

بالکل اسی طرز کا جنوبی طرف کا دروازہ بھی ہے جو دلی دروازے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نام شہر کے دہلی دروازے کی مناسبت سے رکھا گیا ہے جو شیر شاہ کی دلی کے کھنڈروں کے محاذ میں ہے۔ اسی دروازے کے سامنے محراب کے ادھر اُدھر پتھر کے وہ دو ہاتھی ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے جن کو لارڈ کرزن نے سنہ ۱۹۰۳ء میں استادہ کر دیا ہے جس سے اس دروازے کی رونق اور بڑھ گئی ہے۔

چھتہ لاہوری دروازہ
سنہ ۱۰۴۸-۱۰۵۸ھ
۱۶۳۹-۴۸ء

لاہوری دروازے میں داخل ہونے کے بعد ہم کو ایک چھتہ ۲۳۰ فٹ لمبا اور ۱۳ فٹ چوڑا ملتا ہے۔ جس کی بیچوں بیچ مثمن شکل کا ایک چوک ہے جس کا قطر ۳۰ فٹ ہے اور جس کی چھت روشنی کے لیے نہیں پاٹی گئی۔ اس چوک کے داہنے بائیں چھوٹے چھوٹے دروازے ہیں جو کسی زمانے میں قلعے کے بہت آباد مقامات پر نکلتے تھے۔ اس چھتے کی نسبت بشپ ہیبر نے لکھا ہے کہ "ایسا شان دار دروازہ اور چھتہ میرے دیکھنے میں کبھی نہیں آیا۔ یہ چھتہ مثل ایک گاتھک[1] قطعہ کے گرجا کی ڈیوڑھی اور دروازے کے ہے جو تین سو فٹ لمبا ایک نفیس لداؤ کا ہے۔" اس چھتے کے دونوں طرف چار فیٹ اونچے چبوترے پر بتیس دکانیں ہیں جو کسی زمانے میں "چھتہ بازار" کے نام سے مشہور تھا جو اب بھی اسی حالت میں ہے جیسا کہ تین سو برس پہلے برنیر نے دیکھا تھا۔ چھتے کی چھت لداؤ کی بہت اونچی ہے اور اس لداؤ میں عجب عجب طرح سے لہریں اور موڑ توڑ بنائے ہیں کہ دیکھنے سے علاقہ رکھتے ہیں اس بلندی اور ارتفاع پر طولانی بھی بہت ہے چھتے کے دونوں طرف مکانات دل کشا و ایوانات فرحت افزا سراسر دو منزلے مکان ہیں اور بیچ میں ایک چوک ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ بجنسہ اسی قسم کا چھتہ دلی دروازے کے سامنے بھی ہے۔

نقار خانہ
سنہ ۱۰۴۸-۱۰۵۸ھ
۱۶۳۹-۴۸ء

لاہوری دروازے کے چھتے میں گزرنے کے بعد ہم کو ایک نہایت آراستہ اور پیراستہ چوک ۲۰۰ × ۱۴۰ فٹ کا ملتا ہے جس کے گرد مکانات بنے ہوئے تھے۔ جن میں زمانۂ قدیم میں نکاب کے

[1] ایک قدیم طرز عمارت کا ہے جس میں نوک دار محرابیں ہوتی ہیں۔ ۱۲

امرا اور منصب داروں کی نشست ہوتی تھی اور حاضر باش رہتے تھے۔ اس چوک کے جنوب و مغرب کے گوشہ میں اور کچھ عمارات تھیں جن میں ارکانِ دولت امورِ سلطنت انجام دیا کرتے تھے۔ چوک کے وسط میں ایک حوض تھا جس میں نہر گرتی تھی اور ہر وقت لبریز رہتا تھا۔ یہ نہر چوک کے بیچوں بیچ میں سے گزرتی تھی جس سے اس مربع قطعہ کے بالمناصفہ دو ٹکڑے ہوگئے تھے۔ نہر کے برابر برابر ہر دو طرفہ ایک چوڑی سڑک شمال سے جنوب کو تھی۔ جو ایک طرف شاہی باغات کو چلی گئی تھی جن کو یہی نہر سیراب کرتی تھی اور جنوب کی طرف دلی دروازے سے جا ملی تھی۔ برنیر نے اس مقام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس قطعے کے عمارات کی کرسی ہاتھ بلند تھی اور محراب دار مکانات کے سامنے کی گلیاں کوئی چار فیٹ چوڑی تھیں۔ اس جگہ اوسط درجے کے امرا رہا کرتے تھے اور نشست کے امرا بھی یہیں رہتے تھے۔" حوض کے سامنے اور لاہوری دروازے کے بازار کے اندرونی دروازے کے بالمقابل ایک پختہ جنگلے کے اندر نقار خانے کی سنگ سرخ کی پختہ عمارت تھی جس میں انگریزی عہد میں بہ اغراضِ ضروریات فوجی بہت کچھ توڑ پھوڑ کی گئی ہے۔ اب نہ اس چوک کی دیواریں رہیں نہ حوض نہ کوئی عمارت باقی ہے نہ وہ سنگین جنگلا رہا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نقار خانے کی عمارت جوں کی توں اپنی حالتِ اصلی پہ قایم و برقرار رہی۔ پہلے نقار خانے کے حجرے اور در کھلے ہوئے تھے لیکن چوں کہ اب اس میں فوجی عہدہ دار رہتے ہیں بعض بعض در چن دیئے گئے ہیں۔ بازار کے دروازے اور نقار خانے کے درمیان ساری عمارت کو ڈھا کر اب میدان صاف کر دیا گیا ہے اس وجہ سے اب کچھ پتہ نہیں چل سکتا کہ نقار خانۂ شاہجہانی کے ہر دو جانب کیا کیا عمارتیں اس زمانے میں تھیں۔ اس سر بفلک نقار خانے پر روزانہ پانچ وقت نوبت جھڑا کرتی تھی۔ اتوار کو سارے دن نوبت بجتی رہتی تھی کیوں کہ بحساب شمسی اتوار کا دن زیادہ مبارک خیال کیا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا جو دن بادشاہ سلامت کی ولادت کا تھا اس دن بھی تمام دن نوبت بجا کرتی تھی۔ برنیر صاحب پہلے پہل نوبت نقاروں کی آواز سے بہت بھنّائے کیوں کہ اُن کے کان کب اس سے آشنا تھے مگر پھر تو وہ ایسے رسجھے کہ نوبت کی عظمت و شان دبدبہ اور وقار اور سُریلی آواز کے گرویدہ ہو کر تعریف کرنے لگے۔ نقار خانہ تین فیٹ اونچے

چبوترے پر بنا ہوا ہی جو اب چبوترے کے اس سرے سے اُس سرے تک بڑھا دیا گیا
نقار خانے کا اصلی دروازہ اب بے کار پڑا ہی۔ نقار خانے کا ہال ستر فیٹ چوڑا اور
چھیالیس فیٹ اونچا ہی جس کے چاروں کونوں پر دس دس فیٹ اونچی برجیاں ہیں
نقار خانے کا دروازہ اٹھتیس فیٹ اونچا اور سو فیٹ چوڑا اینچ میں ہی جس کے دونوں
جانب دو منزلہ حجرے ہیں کہ اُن کے آگے بھی محرابیں بنا دی ہیں اور اُن کے ادھر اُدھر
سیڑھیاں اوپر جانے کی بنی ہوئی ہیں اُس کے اوپر بیچ ورہ دالان ہی کہ ادھر اُدھر دونوں
طرف اُس کے در نمودار ہیں۔ اسی دالان میں شاہی نوبت بجا کرتی تھی۔ چھت کے شمال
مغربی اور جنوب مغربی کونوں پر چار چار ستونوں کی مربع برجیاں ہیں
جن کے گنبدوں کے تلے ایک چھجا ہی۔ یہ دروازہ جو بطور نقار خانے کے استعمال
کیا جاتا تھا در اصل دیوان عام کے صحن کا دروازہ تھا۔

ہتیا پول دروازہ یعنے ہاتھی دروازہ

نقار خانے کے دروازے کو ہتیا پول دروازہ بھی کہتے تھے
بعض کہتے ہیں کہ ہتیا پول اس سبب سے کہلاتا تھا کہ دونوں طرف
دو پتھر کے ہاتھی کھڑے تھے۔ اور بعض کا یہ کہنا ہی کہ یہاں
ہاتھی کبھی بھی نہ تھے چوں کہ بجز خاندانِ شاہی کے ممبروں
کے اور سارے امرائے فیل نشین دیوان عام کے صحن میں داخل ہونے کے پہلے
یہیں بپاس ادب ہاتھیوں پر سے اُتر پڑتے تھے اس واسطے یہ نام مشہور ہوگیا اور
یہی بات زیادہ تر قرینِ قیاس ہی۔ برنیر صاحب نے بھی محل کے دروازے پر دو ہاتھیوں
کے ہونے کا ذکر کیا ہی لیکن کننگھم صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ہاتھی دہلی دروازے کے
باہر تھے (جہاں کہ اب ہیں) اور برنیر کے قول کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ مسٹر کین اس
معاملے پر نظر غائر ڈالنے کے بعد لکھتے ہیں کہ جس دروازے پر زمان شاہی میں ہاتھی
کھڑے تھے وہ دروازہ بلحاظ صراحت مینہ کے لاہوری دروازہ قرار پاتا ہی نہ کہ دہلی دروازہ
جس کے سامنے گھوگس بنا ہوا ہی۔ جنرل کننگھم اور مسٹر کین دونوں کی رائے سے مسٹر
کار سٹیون نے اس وجہ سے اختلاف کیا ہی کہ مسٹر کین کا بیان تو مجرد ہی البتہ جنرل صاحب
برنیر کے بیان کو اپنی رائے کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ برنیر کا اصل قول یہ ہی: "محل کے
دروازے میں داخل ہوتے وقت کوئی عجیب چیز سوائے پتھر کے دو ہاتھیوں کے

نہیں دکھلائی دیتی جو دروازے کے دونوں طرف ہیں۔ جن میں سے ایک پر جائل چتوڑ کے مشہور راجہ کا مجسمہ ہے اور دوسرے پر اُس کے بھائی پتا نامی کا۔۔ قلعے میں داخل ہوتے ہی دو بڑے بڑے گراں ڈیل ہاتھی جن پر دو جری آدمی بیٹھے ہوئے ہیں دیکھ کر عظمت و جبروت کا سماں بندھ جاتا ہے اور آدمی ہکا بکا رہ جاتا ہے" برنیر نے کہیں کسی دروازے کا نام نہیں لیا ہے بلکہ یہاں تک کہ اُس نے یہ بھی نہیں لکھا کہ وہ قلعہ کا دروازہ تھا بلکہ وہ صاف محل کا دروازہ بتلاتا ہے جس سے زیادہ تر مناسبت اُس دروازے کو ہے جو نقارخانے یا ہتیا پول دروازے کے نام سے مشہور ہے نہ کہ قلعے کے دلی یا لاہوری دروازے سے۔ پھر برنیر نے قلعے کے بڑے دروازوں کے بیان میں کچھ ایسی گڈمڈ کی ہے کہ دونوں دروازوں میں سے ایک سے بھی میل نہیں کھاتا۔ عام روایت اور خود اس دروازے کا نام صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ دراصل جس دروازے کے طرف ہاتھی کھڑے تھے وہ یہی نقار خانے کا دروازہ تھا نہ کہ کوئی اور۔ فرینکلن صاحب جو ۱۷۹۳ء میں دلی گئے تھے تو صاحب موصوف نے دریافت کیا کہ وہ مجسمے جو ان ہاتھیوں پر تھے کیا ہوئے تو معلوم ہوا کہ اورنگ زیب نے چونکہ وہ بت پرستی کا سخت دشمن تھا ہاتھیوں کو مجسموں سمیت نکلوا کر اس جگہ سنگ سرخ کی جالیاں لگوا دیں جس سے ایک گونہ دروازے کی رونق میں فرق آ گیا۔ برسوں بعد ۱۸۶۳ء میں ایک ہاتھی تو قلعہ ہی میں گڑا ہوا اس ہیئت کذائی سے ملا کہ اُس کے ۱۲۵ ٹکڑے ٹکڑے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ اس سے یہ امر کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا کہ اورنگ زیب ہی نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیئے ہوں۔ برنیر لکھتا ہے اور کیا عجب ہے کہ یہ بات صحیح بھی ہو کہ "یہ ہاتھی اور مجسمے اکبر نے آگرے میں طیار کرائے تھے جو آگرے کے قلعے میں اُس دروازے کے سامنے کھڑے تھے جو دریا کے سامنے ہے۔ وہاں سے اُکھڑوا کر شاہجہاں دلی لوا لایا" ان پر مجسمے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں والی چتوڑ جائل اور اُس کے بھائی پتا کے تھے جنھوں نے اکبر سے مقابلہ کیا تھا۔ یہ ہاتھی اور مجسمے بڑے بھاری تھے۔ ایک ایک ہاتھی پر دو دو شخص سوار تھے اگلا مہاوت اور پچھلا سردار۔ ان میں سے ایک ہاتھی کے ٹکڑے ٹکڑے قلعے میں ملے تھے جن کو تین برس بعد مسٹر کیمبل نے جوڑ جاڑ کر ملکہ کے

باغ میں کھڑا کر دیا تھا پھر ۱۸۹۲ء میں میونسپل ہال کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا جس کے
چبوترے پر انگریزی میں یہ کتبہ تھا جس کا ترجمہ ہم لکھتے ہیں۔ "یہ ہاتھی جو بے نہایت
اور نامعلوم قدامت کا ہے۔ اس کو شاہنشاہ شاہ جہاں نے ۱۶۴۵ء میں لاکر اپنے
نئے محل کے جنوبی دروازے کے سامنے استادہ کیا تھا۔ اس مقام سے شاہنشاہ
اورنگ زیب نے اکھڑوا کر ہزار ہا ٹکڑے کروا ڈالے (یہ ہاتھی پھر کسی کو یاد نہ رہا)
سب بھول (بسر) گئے اور (اس کس مپرسی کی حالت میں، ڈیڑھ صدی سے
بھی زیادہ زمین کے اندر دفن رہ کر ۱۸۶۶ء میں نکالا گیا اور اس مقام پر استادہ کیا گیا"
اب چوں کہ میونسپل ہال اور گھنٹہ گھر کے بیچ میں چاندنی چوک کے رخ پر ملکہ معظمہ
آں جہانی کا بت نصب کیا گیا ہے لہذا یہ ہاتھی اور اس کے بالمقابل ایک دوسرا
ہاتھی دونوں آمنے سامنے قلعے کے دلی دروازے کے گھونگٹ میں کھڑے
کیے گئے ہیں جن کو لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں یہاں استادہ کرا کے گویا
اپنے مرکز اصلی پر پونہچا دیا ہے کیوں کہ ان ہاتھیوں کے استادہ کرنے کے وقت
جو کھدائی کی گئی تو کچھ نشانات ایسے ملے کہ جن سے اور زیادہ ثبوت اس
امر کا مل گیا کہ دراصل یہ ہاتھی پہلے یہیں تھے۔ جامل اور پتا کے مجسمے اب
بھی میونسپل ہال کے عجائب خانے کے برآمدے میں موجود ہیں جن کے پاس
اور دو مجسمے بھی دست و پا شکستہ دھرے ہیں جو عجب نہیں کہ انھیں ہاتھیوں کے
مہاوتوں کے ہوں۔ نقار خانے کے دروازے سے نکل کر دیوان عام کے صحن میں
داخل ہوتے ہیں اور یہیں سے وہ باوقار ادب کے مراسم شاہی شروع ہوجاتے
تھے جو سلاطین مغلیہ کے درباروں میں ملحوظ رہتے تھے۔ نقار خانے کے دروازے
میں سے سوائے مرشد زادوں یعنی ممبرانِ خاندان شاہی کے سواری پر اور
اور کوئی جانے کا مجاز نہ تھا۔ سفرا۔ ایلچی ۔ وزرا۔ امرائے عظام سب کے سب یہیں سے
پاپیادہ ہوجاتے تھے۔ ان رسوم کی پابندی آخری دم یعنی سلاطین مغلیہ کے آخری
بادشاہ بہادر شاہ کے زمانے تک بھی بلاکم و کاست کی جاتی تھی چنانچہ دہلی کے
رزیڈنٹ مسٹر فرینسس ہاکنز (جن کی مستعدی قوتِ تیزی سے بڑھی ہوئی تھی)
وہ آداب و مراتب شاہی کے ملحوظ نہ رکھنے ہی کی وجہ سے معتوب اور خدمت سے

موقوف ہوئے۔ اُن پر سب سے سنگین الزام یہی تھا کہ وہ نقار خانے کے دروازے میں سے سوار نکل گئے جو آدابِ شاہی کے سراسر خلاف تھا۔ جہاں دار شاہ (سنہ ۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء) اور فرخ سیر (سنہ ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء) دونوں اسی نوبت خانے میں قتل کیے گئے۔ فرخ سیر بے چارے کو تو پہلے مکحول کیا بعد قتل کیا۔ اب اس نقار خانے کے نیچے کے دو کمروں میں محافظ قلعہ رہتا ہے۔

دیوانِ عام

سنہ ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸-۴۹ء

جس زمانے میں یہ شان دار عمارت اپنی اصلی حالت پر تھی تو اس کا طول ۵۵۰ فٹ اور عرض تین سو فیٹ تھا۔ اس کی چار دیواری کے اندر ایک سلسلہ مکانات اور دالانوں کا تھا جن کی نسبت برنیر لکھتا ہے کہ "یہ محل انگلستان کے پیلس رایل سے ملتا جلتا ہوا تھا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ یہ دو منزلہ نہیں ہے اور دالان جدا جدا ہیں مگر اس ترکیب سے کہ ایک سے دوسرے قطعے میں جانے کے لیے چھوٹا سا دروازہ رکھا گیا ہے" اس محل کے کمرے بہت کشادہ اور وسیع تھے جن کی کرسی ۳½ فٹ کی تھی۔ ان مقامات میں وہ درباری اور امراء رہتے تھے جن کی نشست ہوتی تھی۔ عیدین وغیرہ بڑے بڑے مواقع پر یہ مقامات بڑے تکلف سے سر سے پاؤں تک سجائے اور آراستہ کیے جاتے تھے۔ ستونوں پر مغرق کمخواب لپیٹی جاتی تھی۔ دروں میں ریشمین اور مخملی پردے آویزاں کیے جاتے تھے۔ فرش بہترین قالینوں کا ہوتا تھا۔ غرض ہر طرح سے مکان کو بنا سنوار کر دلہن بنا دیتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اس محل کے احاطے کے تمام مکانات اور دیواریں گرا کر زمین کے برابر کر دیئے گئے اس طرح کہ اب اُن کا نام و نشان تک بھی باقی نہ رہا اور نہ اب کوئی اُس تجمل و احتشام اور اُن تکلفات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اب جہاں دیوان عام کا بڑا بھاری ہال اکیلا کھڑا ہے یہ درحقیقت مشرقی دیوار سے ملے ہوئے صحن کا وسط تھا۔ اس ہال کے سیدھی طرف ایک پھاٹک تھا جس میں سے ایک دوسرے صحن میں جا نکلتے تھے۔ اس کے بائیں جانب ولی عہد بہادر کے محلات تھے جو سب گرا گرا کر سپاٹ میدان کر دیا گیا ہے۔ اب رہا دیوان عام کا حال وہ بھی بے حال ہے۔ اس کا طلائی کام بھی جا بجا سے کھرچ ڈالا اور پچیکاری کے کام میں جو قیمتی پتھر اور نگینے جڑے ہوئے تھے وہ بھی نکال کر خراب کر دیا مگر پھر جو کچھ ان بے دردوں کے ہاتھ سے بچ رہا ہے وہ بھی لاجواب اور قابلِ دید ہے۔ باوجود اس قدر تباہی اور بربادی اور

نشستگاہ آگرہ، تخت نشینی ۱۰۱۴ھ و ۱۶۰۵ء
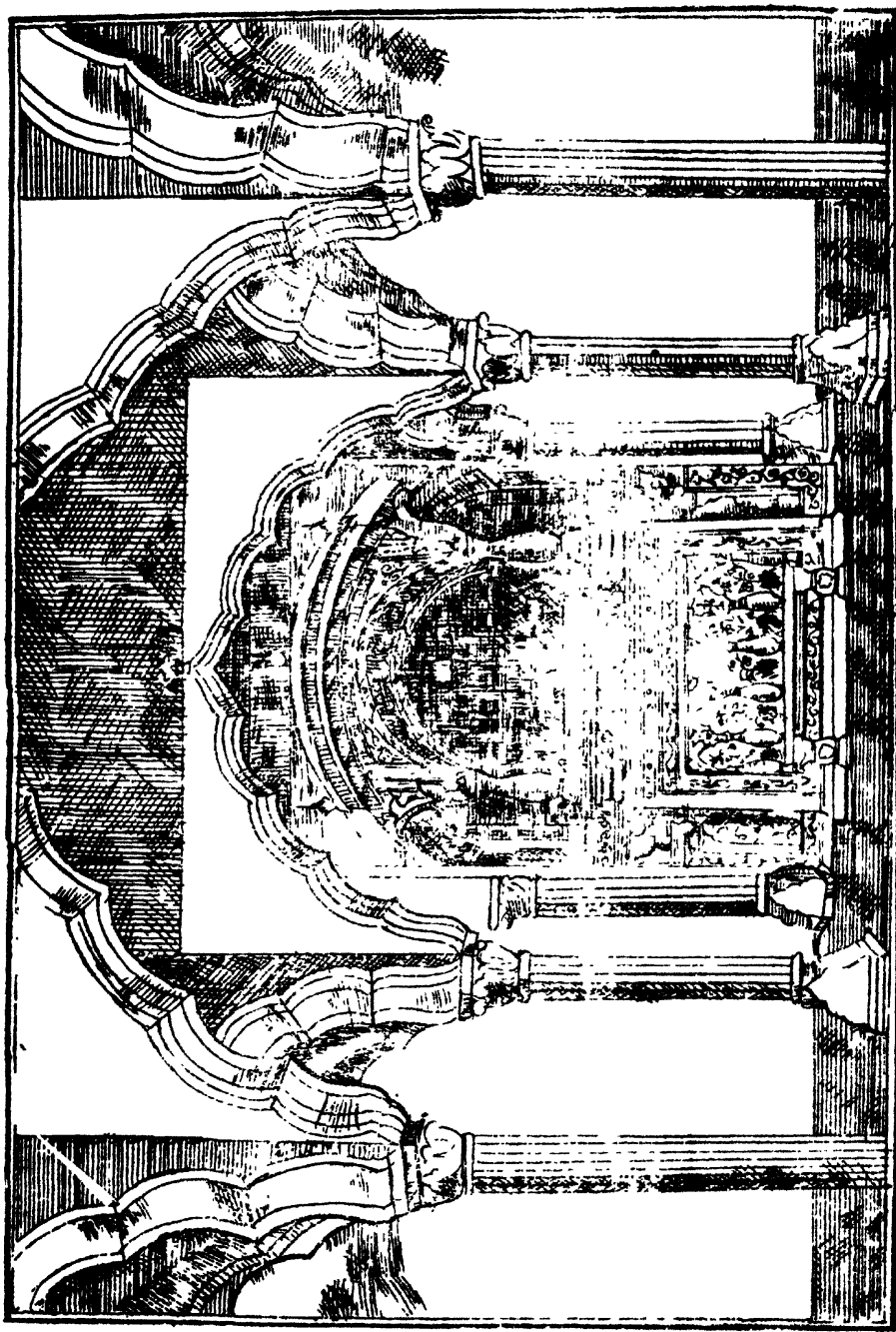
نوع کمسوٹ سے اب بھی اس عالی شان ہال کا جواب نہیں ہے۔ یہ عمارت تمام تر سنگ سرخ کی ہے۔ چبوترہ چار فیٹ بلند اور ہال اسی فیٹ لمبا اور چالیس فیٹ چوڑا ہے۔ برجیوں کی بلندی چھوڑ کر چھت کی اونچائی تیس فیٹ ہے۔ یہ ہال تین جانب سے کھلا ہوا ہے صرف ایک طرف دیوار ہے۔ ہال کے سامنے وار کے رخ پر چھت پر دو برجیاں اُسی وضع کی ہیں جیسی کہ نقارخانے کے دروازے پر ہیں۔ چھت سپاٹ ہے جس کے تین طرف چوڑا چھجہ ہے۔ ہال کے اندر تین قطاریں سات سات دروں کی ہیں۔ ہر در میں چار چار ستون چھ چھ فیٹ کے فصل سے ہیں جن پر بنگڑی دار محرابیں پچھیت کی دیوار سے شروع ہو کر عمارت محاذ تک ہیں۔ ہال کے پیش میں دس بڑے بڑے ستون ہیں جن کی محرابیں اسی وضع کی ہیں۔ ہال کے ہر سہ جانب سیڑھیاں ہیں۔ پانچ سامنے وار کو اور سات سات اِدھر اُدھر

نشیمن ظلِ الٰہی یا اورنگ ظلِ الٰہی

پچھیت کی دیوار کے وسط میں قریب اکیس فیٹ کے سنگ مرمر لگا کر پچیکاری کا کام کیا گیا ہے جس میں مختلف اقسام اور رنگ برنگ کے پتھر جڑے ہوئے ہیں جس میں طرح بطرح کے پھول پتیوں بیل بوٹوں گلدستوں اور چڑیوں کی بے نظیر صنعت کاری کے جوہر دکھلائے ہیں۔ اس کے محاذ میں ایک سنگ مرمر کا چبوترا آٹھ فیٹ بلند اور سات فیٹ مربع ہے جس پر ایک نرا سنگ مرمر کا کرسی دار بنگلہ چار گز مربع بنا ہوا ہے جس کے چار ستون ہیں جن پر وہ بنگلہ کھڑا ہے یہ ستون سنگِ مرمر کے منبت کاری کے ہیں جن پر سنہری کلس جڑے ہوئے ہیں اس کے پیچھے ایک پیش طاق ہے سات گز لمبا اور ڈھائی گز چوڑا نرا سنگ مرمر کا اور اس نشیمن اور پیش طاق میں طرح طرح کے رنگین اور بیش قیمت پتھر لگائے ہیں اور منبت کاری اور پرچین سازی سے طرح طرح کے بیل بوٹے تراشے ہیں۔ اس پیش طاق کے پیچھے محل شاہی تھا اُس میں دروازے لگے ہوئے تھے جب کبھی دربار عام ہوتا تھا بادشاہ اُس طرف سے تشریف لاتے تھے اور اس تخت سنگین دل نشین پر رونق افروز ہوتے تھے اور تمام امرا و وکلائے بادشاہاں ہاتھ باندھ کر تخت کے آگے حاضر رہتے تھے۔ اس تخت کی کرسی قدِ آدم سے بہت اونچی ہے اس واسطے اس تخت کے آگے سنگ مرمر کا بہت خوب صورت ایک تخت رکھا ہے اور اُس میں بھی طرح طرح کی پرچین سازی کی ہے جب کبھی کسی مقرب خاص کو کچھ عرض کرنا ہوتا تھا تو

اجازت حاصل کرکے اس پر قدم رکھتا تھا اور پایۂ تخت کو بوسہ دے کر آداب بجالا کر عرض معروض کرتا تھا۔ یہ تخت بھی سارا سنگ مرمر کا ہے جو ۴ × ۳ اور ۳ اونچا ہے اس کا سارا کام لوگ کھاڑ کر لے گئے اب بے غوری کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ چبوترے کے گرد بھی اسی قسم کی نقاشی کا کام ہے۔ یہ سنگ مرمر کا بنگلہ اور چبوترا ہال کی پوری چوڑان میں نہیں ہے بلکہ چبوترے کی دونوں جانب ہے اس بنگلے کی سطح کے برابر دو سنگ مرمر کے نشیمن تھے جو اُن اُمرا کی نشست کے واسطے مخصوص تھے جو بادشاہ کی خواصی میں باریاب ہوتے تھے۔ اسی مقام سے وزیر معروضات وگزارشات وعرائض حضور والا کے ملاحظے میں گزرانتا تھا۔ اس تخت کے ہر سہ جانب ایک قطع کیا ہوا آہنی کٹہرا تھا۔ ۴ × ۳ کا تھا۔ یہ جگہ درباری امرا کے واسطے مخصوص تھی۔ برنیر صاحب نے اس دیوان کی اُس زمانے کی کیفیت جب کہ یہاں پوری چہل پہل اور رونق تھی یوں لکھی ہے کہ:- یہ ہال بہت نشیں اور وسیع ہے جس میں اونچے اونچے ستون لگے ہوئے ہیں یہ مکان تین طرف سے کھلا ہوا اور ہوادار ہے۔ ستونوں اور سارے فرش پر سنہری ملمعے کی تہ چڑھی ہوئی ہے۔ اُس دیوار کے بیچ میں جو محل شاہی اور دیوان عام میں حدفاصل ہے ایک برآمدہ بنا ہوا ہے جو ایک قسم کی بڑی اور اونچی کھڑکی ہے جو اس قدر بلند ہے کہ نیچے سے آدمی کا ہاتھ وہاں تک نہیں پونہچتا۔ اسی مقام پر بادشاہ سلامت برآمد ہوتے ہیں اور تخت پر مع شاہزادگان والاتبار کے جلوس فرماتے ہیں۔ کچھ خواجہ سرا خواصی میں حاضر باش رہ کر مورچھل اور بڑے بڑے پنکھے جھلا کرتے ہیں اور کچھ لوگ دست بستہ مؤدب منتظر حکم کھڑے رہتے ہیں۔ نیچے سارے امرا، راجگان، سفرا ایک چاندی کے کٹہرے کے اندر دست بستہ نیچی نگاہ کیئے سرو قد کھڑے رہتے ہیں جن کے پیچھے منصب دار اور دیگر امرا درجۂ دوم اُسی طرح مؤدب کھڑے رہتے ہیں اور پھر ان کے پیچھے ہال کے باقی حصے میں درجہ بدرجہ حسب تفریقِ مراتب اور لوگ کھڑے رہتے ہیں اسی طرح صحن میں ایک جم غفیر ہر قسم کے لوگوں کا لگا رہتا تھا۔ اسی نشیمن میں روزانہ دوپہر کے قریب بادشاہ سلامت برآمد ہو کر اپنے درشن سے ہوا خواہانِ سلطنت کو مشرف و بہرہ ور فرماتے تھے اور اسی واسطے اس دیوان کو "عام خاص" کہتے تھے یعنی دربار کا وہ مقام جس میں عام خاص چھوٹے بڑے سب باریاب ہو سکتے ہیں"۔ برسفورڈ صاحب کی دہلی گینڈبک میں غدر سے پہلے یہاں کی جو حالت تھی یوں لکھی ہے:- یہ ایک وسیع ہال ہے جو تین طرف سے کھلا ہوا ہے

حمہ میں سنگ سرخ کے ستون لگے ہوے ہیں ان پر پہلے پچیکاری کا کام اور سنہری لتع تھا۔ پچھیت کی دیوار میں تخت پر جانے کا زینہ ہی جو زمین سے کوئی دس فیٹ اونچا ہی۔ تخت کے اوپر ایک سائبان ہی جو چار سنگ مرمر کے ستونوں پر ایستادہ ہی اس سارے سائبان میں عجیب و غریب پچیکاری کا کام ہی۔ تخت کے پیچھے محل شاہی میں سے آنے کا وہ دروازہ ہی جس میں سے بادشاہ سلامت برآمد ہوتے ہیں تخت کے پیچھے کی دیوار پچیکاری اور منبت کاری کے کام سے پٹی پڑی ہی جس میں جواہرات جڑے ہوے ہیں اور نہایت خوب صورت اور نادر پھول پھل اور ہندوستان کے پرند اور چرند کی تصویریں ہیں جن میں بیشتر بالکل اصلی معلوم دیتی ہیں یہ ساری صناعی آسٹن ڈی بورڈو (Austin de Bordeaux) کی ہی جس نے بڑے شہزادگان یورپ کو اس صفائی سے ٹھگا کہ اصلی جواہرات تو ہضم کیے اور ان کی جگہ نقلی بے معلوم طور پر جڑ دیئے۔ (یہ شخص) وہاں سے (دُک دُم) بھاگا اور شاہجہاں کے دربار میں آکر پناہ لی۔ یہاں آن کر اُس کی تقدیر جاگی اور خوب ہاتھ رنگے) بے انتہا دولت کمائی۔ یہ شخص بادشاہ کا بہت منہ چڑھا تھا۔ نشیمن کے سامنے ہال کی زمین سے کچھ اونچا سنگ مرمر کا تخت تھا جس پر بہت کچھ پچیکاری کا کام کیا ہوا تھا اب جس کا صرف نشان باقی رہ گیا ہی دیوار کے نقش و نگار کے درمیان تخت کے پیچھے اُس فرانسیسی نے اپنی بھی ایک تصویر پچیکاری کی بنائی تھی جس میں اُس نے اپنے آپ کو ایک لمبے لمبے سنہری بالوں والا نوجوان بنایا ہی گویا کہ آرفینیس[1] ایک چٹان پر درخت کے نیچے بیٹھا ہوا طاؤس بجا رہا ہی اور شیر پاس بیٹھا ہوا ہی۔ ایک خرگوش اور چیتا بھی اس ساز پر مفتون ہو کر قدموں میں لوٹ رہا ہی۔ یہ تصویر آٹھ فیٹ اونچی تھی اور سرے سے پاتک اس میں مختلف رنگوں کی جگہ جواہرات جڑے ہوے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں قلعۂ دہلی کا ایک فوجی افسر اسے اُکھاڑ کر ولایت لے گیا اور اب یہ تصویر سوتھ کنسنگٹن کے عجائب خانے میں نوادر ہند کے زمرے میں رکھی ہوئی تھی۔ لارڈ کرزن کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو تڑپ گئے

---

[1] تھریس میں اس نام کا ایک شاعر ایسا فرض کیا گیا ہی کہ جو اس غضب کا طاؤس بجاتا تھا کہ طیور و وحوش بھی وجد میں آکر ناچنے لگتے تھے۔ تھریس وہ قدیم حصۂ ملک ہی جو مابین دریاے ڈینیوب اور ایجین کے ہی۔ ایجین، بحر میڈیٹیرینین کا وہ حصہ ہی جو بجانب شمال یونان اور ایشیاے کوچک کے پھیلا ہوا ہی۔ ۱۲

اور فوراً اس مرقعے کو سنہ ۱۹۱۱ء میں واپس منگوایا۔ اول ہی اس مرقعے کی بہت کچھ خرابی ہو چکی تھی پھر غدر کے بعد ولایت کو جانا اور وہاں سے آنا غرض بڑی گت بنی۔ لارڈ صاحب نے ایک اٹیلین کاری گر سے پھر اسے درست کرا کے اپنی اصلی جگہ پر جڑوا دیا جو پتھر گم ہو گئے تھے اُن کی جگہ نئے پتھر لگائے گئے اور بفضلِ خدا اب یہ نادر و نایاب مرقعہ اپنے اصلی مقام پر لارڈ کرزن کی بدولت موجود ہے۔ جس وقت بادشاہ سلامت تخت پر جلوہ افروز ہوتے تھے تو اس ہال کے سامنے کے عجیب و غریب نظارے کی کیفیت ہم آپ کو برنیر کی زبانی سناتے ہیں کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ:۔ دربار کے وقت پہلے خاصے کے چند گھوڑے ملاحظے سے گزرتے تھے تاکہ بادشاہ سلامت خود ملاحظہ فرمالیں کہ ان کی نگہداشت خاطرخواہ ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر ہاتھیوں کی باری آتی تھی جن کو خوب نہلا دھلا کر کچھ مسالا مل دیا جاتا تھا جس سے کالے بھنور ہو کر (ان کی جلد چمکنے لگتی تھی) ان کے مستک سے لے کر سونڈ کے سرے تک دو سرخ لکیریں (سیندور سے) کھینچی جاتی تھیں۔ ہاتھیوں پر مغرق جھولیں پڑی رہتی تھیں جس کی پیٹھ پر سے دونوں طرف چاندی کی ایک زنجیر سے دو نقرئی گھنٹے آویزاں رہتے تھے۔ تبت کی گائے کی سفید براق دُمیں ہاتھی کے کانوں سے ایسی لٹکتی رہتی تھیں جیسے کہ بڑے بڑے گل مچھے۔ ایک بڑے گراں ڈیل ہاتھی کے دائیں بائیں دو چھوٹے چھوٹے ہاتھی اسی طرح بنے سنور اُس کی بغل میں بطور خواصی کے چلتے تھے۔ ایسا معلوم دیتا تھا کہ جیسے دو نوکر حاضر خدمت ہیں۔ ہاتھی قدم تولتے خلاں خراماں بڑے ٹھسے سے قدم دھرتے تھے جس سے ایسا معلوم دیتا تھا کہ گویا یہ جانور بھی اپنے بناؤ سنگھار اور شان و شوکت سے باخبر ہیں اور جب تخت کے سامنے سے گزرتے تھے تو مہاوت آنکس سے اشارہ کرتا تھا اور کچھ بول اُس کے جذبات اُبھارنے کو ایسے کہتا تھا کہ فوراً ہاتھی ایک پاؤں ٹیک کر سونڈ اوپر کر کے ایک چنگھاڑ مارتا تھا اور یہی ہاتھیوں کا مجری اور آداب بجالانا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے جانور باری باری سے نظر انور سے گزرتے تھے۔ پلے اور سدھائے ہوئے کار چوبی جھولیں پڑی ہوئی ہرن لڑانے کے لیے نیل گائیں۔ گینڈے۔ بنگال کے بڑے بڑے سینگوں والے ارنے بھینسے جو شیر سے مقابلہ کرتے ہیں۔ سدھائے ہوئے شکاری چیتے جھولیں پڑی ہوئی سروں پر ٹوپیاں چڑھی ہوئی گلے میں زریں پٹے

چاندی کی زنجیریں پڑی ہوئی ہرن کے شکار کے لیئے۔ اُزبک کے شکاری کتے قسم قسم کی سُرخ اور زرق برق جھولیں پڑی ہوئیں۔ سب سے آخر ہر قسم کے شکاری پرند باز۔ شاہین جُرّے۔ بہری جو ہرن تک کا شکار کر لیتے تھے۔ تیتر۔ بٹیر۔ سارس۔ خرگوش وغیرہ وغیرہ سب باری باری سے گذرتے تھے۔ ہرن کا شکار اس طرح ہوتا تھا کہ ہرنوں کی ڈار دیکھ کر باز کی ٹوپی اُٹھائی اور اُسے باؤلی دی۔ باز شکار پر تیر کی طرح سیدھا ٹوٹتا ہے اور اس زور سے پر اور پنجہ مارتا ہے کہ سرپٹ جاتا ہے اور پنجے سے اس کی آنکھیں نکال کر آناً فاناً میں اندھا کر دیتا ہے۔ جانوروں کے سلسلے کے علاوہ ایک دو امرا کی جمعیت بھی اپنی اپنی شان سے بطور مارچ پاسٹ گذر جاتی تھی۔ سواروں کی مکمل وردیاں دہر قسم کے ہتیار لگے ہوئے اوپچی بنے زرہ بکتر لگائے گھوڑوں کے مغرق زین اور بے شمار ساز و زیورات سے لدے ہوئے بادشاہ سلامت کے حضور سے پھینک۔ نیزہ بازی۔ تلوار کی ایک ضرب سے بھیڑ کے دو ٹکڑے کرتے ہوئے غرض ہر قسم کی کسرتیں کرتے اور کرتب دکھاتے گھوڑوں کو اُچھالتے کداتے جوان جوان کسرتی بدن والے خوش رو و خوش لباس امرا۔ منصبدار۔ گرز بردار اپنی پھرتی اور کسرت کے جوہر دکھاتے سامنے سے نکل جاتے تھے۔ بھیڑ کے کاٹنے کا یہ طریقہ تھا کہ اُس کو حلال کر کے آلائش سے پاک و صاف کر کے چوبیخہ کر کے لٹکا دیتے تھے جس کے تلوار سے ایک ہی وار میں بیچ میں سے دو ٹکڑے کر دیتے تھے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ بادشاہ فوج کو سرسری طور پر ملاحظہ فرماتے تھے نہیں بلکہ سواروں پر خاص نظر ڈالتے تھے خصوصاً جب سے کہ لڑائی کے ختم ہونے کے بعد تو ایک ایک سوار کو بنفس نفیس ملاحظہ فرماتے تھے۔ کسی کو ترقی ملتی تھی تو کسی کا تنزل کیا جاتا تھا اور بعض برطرف بھی کیئے جاتے تھے۔ دیوان عام میں جو لوگ جمع ہوتے تھے وہ اپنے ہاتھ میں عرضی لے کر اونچا کر لیتے تھے۔ وہ سب عرائض ایک ایک کر کے پیشگاہ خداوندی میں گذرانی جاتی تھیں جس پر عرائض گذار بالمشافہ طلب کیئے جاتے تھے اور خود بادشاہ سلامت اُن سے دریافت فرماتے حتی المقدور اُسی وقت مظلومین کی داد رسی فرماتے۔ ہفتے میں ایک دن ایسا مقرر تھا کہ خلوت میں دو گھنٹے تک دس منتخب اشخاص کی عرائض سنی جاتی تھیں جن کو کوئی دیرینہ تجربہ کار معتمد امیر پیش کرتا تھا۔ سب سے اخیر جب بادشاہ کے وقت تک یہ ادب قاعدے اور ان آداب شاہی کی پابندی کی گئی وہ فرخ سیر تھا۔ دیوان عام کی داہنی طرف

کے احاطے کے بیچ میں ایک محراب دار دروازہ تھا جس میں سے لوگ ایک اور چھوٹے سے صحن میں داخل ہوتے تھے جواب باقی نہیں رہا اور اسی وجہ سے اُس کا عرض و طول کہا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح مشرقی دیوار سے لگا ہوا ایک دروازہ اور صحن تھا جو مغربی طرف کے احاطے سے ذرا چھوٹا تھا اسی میں سے دیوان خاص میں جانے کا رستہ تھا۔ اس دروازے کے سامنے ایک سُرخ شامیانہ تنا رہتا تھا اور اسی وجہ سے اس دروازے کا نام "لال پردہ" تھا۔ اب جو دیوانِ عام کے سامنے مرغزار نظر آتے ہیں اُن سے دیوانِ عام کے صحن کی حدود کا پتہ چلتا ہے اور جو مہندی کی باڑھ دونوں طرف اور سروں پر لگا دی گئی ہے وہ نشان ہے قدیم دالانوں کا۔ جنوب رخ کی باڑھ کو مجبوراً اپنے اصلی مقام سے ذرا شمال کی طرف اور ہٹانا پڑا ہے کیوں کہ جہاں اصلی دالان تھا وہ مقام اب فوجی سڑک سے گھر گیا ہے۔

شاہ محل معروف بہ دیوانِ خاص

سنہ ۱۰۴۸ تا ۱۰۵۸ھ
۱۶۳۹ تا ۱۶۴۸ء

جس صحن میں ہم لال پردے میں سے ہو کر جاتے تھے وہ دیوان عام کے صحن کا چوتھائی تھا۔ دوسرا صحن طول و عرض میں ۲۱۰ x ۱۸۰ فٹ تھا جس کی نسبت بشپ ہیبر نے لکھا ہے کہ :-

"یہ ایک نہایت خوب صورت اور شاندار صحن تھا جس کے گرد پست مگر نہایت عمدہ اور آراستہ عمارات ایک خوب صورت سنگ مرمر کے ہال سامنے تھیں"۔ اس احاطے کی مشرقی دیوار سے ملا ہوا دیوان خاص ہے جس کی مشرقی دیوار سے ملا ہوا شاہجہاں کا حمام اور اورنگ زیب کی موتی مسجد ہے۔ اس احاطے کی غربی دیوار خود وہ صحن تھا جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اور جنوبی جانب محلات کا سلسلہ اور رنگ محل تھا۔ دیوانِ خاص کی بے نظیر عمارت ساڑھے چار فیٹ اونچے ۱۱۲ x ۸۰ فٹ کے طول و عرض کے چبوترے پر واقع ہے۔ دیوانِ خاص کی عمارت ہندوستان بھر کی ساری عمارتوں میں سب سے بہتر ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یہ عمارت بالکل سیدھی سادی اور ایک عظیم الشان سنگ مرمر کے پویلین کی شکل کی ہے۔ مسٹر فرگسن نے لکھا ہے کہ "دیوان خاص اگر سب عمارتوں سے خوب صورت نہ بھی ہو تاہم اس میں تو شک نہیں کہ شاہ جہاں کی بنائی ہوئی ساری عمارتوں میں بلحاظ نفاست، کاریگری صناعی اور آراستگی کے یقیناً سب سے بڑھی چڑھی ہوئی ہے"۔ اس ہال کا طول و عرض ۹۰ x ۶۷ فٹ ہے جس کی چھت مسطح اور محرابیں بنگڑی دار ہیں۔ اس میں بتیس ستونوں کی دُہری قطار ہے۔

دیوان خاص
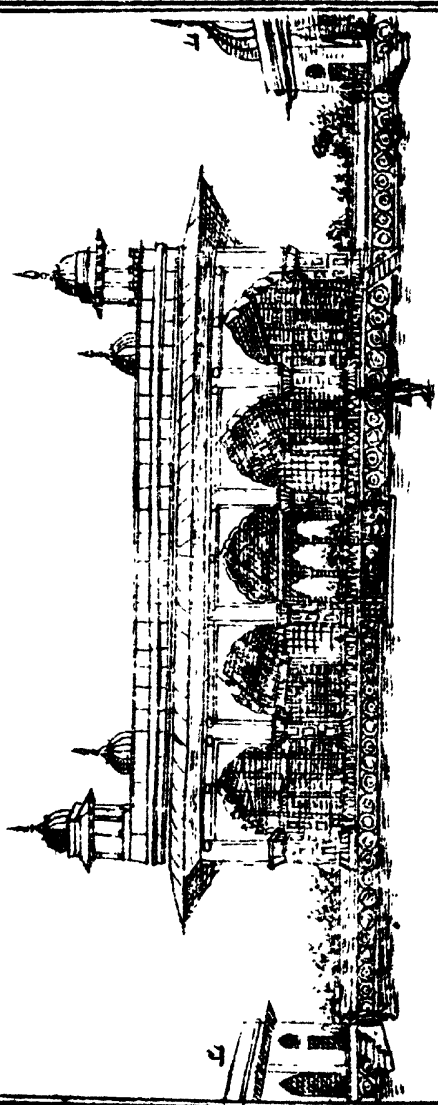
ان ستونوں میں سے چوبیس تو چار چار فیٹ مربع ہیں اور باقی آٹھ ۳ فٹ × ۳ فٹ کے ہیں۔ ہال کی شرقی دیوار کے دو دروں میں سنگ مرمر کی نفیس جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ سارا ہال مع چبوترے کے از سرتاپا سنگ مرمر کا ہی۔ ہال کی چھت کے چاروں کونوں پر کھلی ہوئی چوکون برجیاں ہیں جن پر چھتریاں اور چار چار ستون ہیں اور اوپر سنہری کلس ہیں۔ ہال مستطیل ہی۔ عمارت کے عرض میں جو ستون ہیں بہ نسبت لمبان کے ستونوں کے پتلے ہیں۔ لیکن نقش ونگار اور کاریگری میں سب برابر ہیں۔ باہر دار کے ستونوں پر صرف اندر وار کے تین رخوں پر کام کیا ہوا ہی رہے اندر وار کے ستون وہ از سرتاپا چاروں طرف سے منقش ہیں۔ ہر ستون کے سطحی تین حصّے ہیں۔ نیچے کے دونوں حصّے برابر کے ہیں لیکن بالائی حصّہ ان سے ایک تہائی کا ہی۔ نیچے کے حصّوں میں پھول درختوں کے لمبے لمبے پتّے اور اوپر کے حصّے میں مختلف اقسام کے بیل بوٹے ہیں۔ محرابوں کے اندرونی رُخ۔ روکار اور درب پر پھول پتوں اور بیلوں کے نقش ونگار پچیکاری کے کام کے ہیں جن میں انواع واقسام کے رنگ برنگ کے پتھر سبز۔ زرد۔ نیلے۔ سُرخ۔ گلابی۔ کشمشی۔ زعفرانی وغیرہ بہت ہی نفاست اور عمدگی سے پچی کرکے بٹھائے گئے ہیں۔ دیوان خاص میں سے ایک نہر سنگ مرمر کی کوئی بارہ فیٹ چوڑی جس پر سنگ مرمر کی سلیں ڈھکی ہوئی ہیں رواں تھی۔ ہال کا اندرونی کمرہ ۴۸ فٹ × ۲۷ فٹ ہی جس کے بارہ ستون ہیں۔ اب بھی سنگ مرمر کا وہ مرصّع چبوترا موجود ہی جس پر شاہجہاں بادشاہ کا وہ مشہور تخت طاؤسی تھا جس کا شہرہ چاردانگ عالم میں ہی۔ اس ہال کی کارنس کے نیچے۔ کمرے کی چوڑان میں کونے کی محرابوں پر چھوٹی سی مستطیل سنگ مرمر کی تختیوں پر سعداللہ خاں کا مشہور کتبہ مشہور زمانہ خوش نویس رشید کا لکھا ہوا یہ ہی:۔

اگر فردوس بروئے زمین است / ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

برنیر نے دیوان خاص کے متعلق جو لکھا ہی وہ بالکل مذبذب ہی "خیر ہال تو بہت خوبصورت وسیع۔ سنہری۔ رنگین فرش زمین سے چار یا پنج فرنچ فیٹ اونچا ایک بڑے تخت کی طرح کا ہی۔ اسی محل میں بادشاہ کرسی پہ جلوس فرماتے ہیں اور امرا اُس کے گرد کھڑے رہتے ہیں۔ اسی جگہ اکثر عہدہ دار تخلیہ میں باریاب ہوتے ہیں اور اُن کی گزارشات اور معروضات سنے جاتے اور یہیں سلطنت کے اہم امور اکثر طے پاتے ہیں"

مسٹر فرینکلن نے بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں دیوان خاص کی نسبت حسب ذیل لکھا ہے۔ "تیسرے صحن میں جو سب سے اخیر ہی پونہچنے کے بعد دیوان خاص اپنی شان و شوکت سے نمودار ہو جاتا ہے جس کا ایک رخ دریا کی جانب ہے۔ اِس محل کا چبوترہ چار فٹ بلند ہے۔ یہ ساری عمارت اندر باہر سے چبوترے اور برجیوں سمیت سنگ مرمر کی ہے۔ اس کی چھت بتیس مربع نیل پایوں پر استادہ ہے جو چھ فیٹ تک نقش و نگار سے آراستہ ہیں اور جن پر پھول پتیوں کا پچیکاری کا کام عقیق یمنی اور دیگر اقسام کے سنگ ہاے بیش قیمت کا ہے۔ باقی حصے میں کارنس تک تمام طلائی کام کے نقش و نگار کثرت سے ہیں۔ اس ہال کا طول ۷۵ فٹ اور عرض ۴۲ فٹ ہے جس کے گرد ایک کشادہ برآمدہ دس فیٹ چوڑا ہے جس میں ایک خوب صورت بلوری فوارہ اٹھارہ انچ اونچا اور چار فیٹ قطر کا ہے۔ بادشاہ جس تخت پر عموماً جلوس فرماتے ہیں اُس کی چھت چوبی ہے اور رنگ سُرخ۔ اس تخت پر پہلے سونا چاندی بہت کچھ جڑا ہوا تھا جسکی قیمت (۳۹) لاکھ روپئے تھی۔ مرہٹوں نے سارا سونا چاندی اُکھاڑ کر ٹکسال میں مسکوک کرنے کے واسطے بھیجا تو (۲۸) لاکھ کا نکلا۔ ایک حجرے کی کارنس پر باہر وار سنہری حرفوں میں یہ شعر لکھا ہوا ہے۔ ؎

اگر فردوس الخ۔ چھت کے چاروں کونوں پر چار برجیاں ہیں جن کے کلسا سے برنجی گہرا سنہری ملمع ہے جشن کے مواقع پر ہال کے سامنے ایک سُرخ رنگ کا مغرق شامیانہ رنگ برنگ کی سوت کی رسیوں سے تانا جاتا ہے جو ۹۰ × ۵۰ فٹ ہے۔ چبوترے کے چاروں طرف اسی قسم کی قناتیں لگائی جاتی ہیں۔ چبوترے کے ایک کونے میں ایک تنگ حجرے میں سے ہو کر محل سرا میں جانے کا رستہ ہے اور دوسرا رستہ موتی مسجد کو جاتا ہے جس کے گنبد برنجی ہیں مگر اُن پر ایسا گہرا ملمع ہے کہ بالکل سنہری معلوم دیتے ہیں"

دیوان خاص کا بیان جو انگریزوں نے لکھا ہے وہ اوپر آچکا مگر ہمیں تو اس سے کچھ لطف نہیں آیا نہ وہ ایسا ہے کہ جس سے اعجوبۂ روزگار مکان کا نقشہ نظروں میں پھر جائے لہذا آثار الصنادید سے ہم ذیل کی عبارت نقل کرتے ہیں کہ اس سے بہتر چربہ اُتار نا قلم کی طاقت سے باہر ہے۔ یہ ایک عمارت ہے نامی اور مشہور بے شل و بے عدیل کہ روے زمین پر اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ خواب گاہ کے جانب شمال کو ایک بہت بڑا چوک ہے اس چوک کے ضلع شرقی میں ڈیڑھ گز کا اونچا چبوترہ بنایا ہے ۸۰ گز لمبا ۲۶ گز چوڑا اُس کے بیچوں بیچ میں دیوان خاص کی عمارت ہے

۴۸ گز ۷۶ گز۔ سر سے پاؤں تک سنگِ مرمر کی۔ اور سر تا سر اس کے بیچ میں چار گز عریض نہر بہشت بہتی ہے۔ اس عمارت کے بیچوں بیچ میں پایہ نا ستون بنا کر ۱۸ گز × ۱۰ گز کا مکان بنایا ہے جس کے بیچ میں ایک چبوترا ہے اس چبوترے پر تخت طاؤس رکھا جاتا تھا اور اس پر بادشاہ اجلاس فرماتے تھے۔ اس مکان کے گرد پایہ نا ستون لگا کر مکان بنایا ہے۔ در و دیوار و ستون و مرغول و محراب و فرش سب سنگ مرمر کا ہے اور اس میں اجارے تک عقیق و مرجان بیش قیمت پتھروں کی پچیکاری کی ہے۔ اور بیل بوٹے پھول پتے بنائے ہیں اور اجارے سے اوپر چھت تک سونے کا کام کیا ہوا ہے گویا سونے کے پانی سے لیپ دیا ہے۔ اندر کے رخ محرابوں پر سونے کے پانی سے یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎ اگر فردوس الخ۔ جانب شرق سے مشرف بدریا ہے اور اس طرف کے دروں میں جالیاں لگا کر آئینہ بندی کی ہے اور جانب غرب اس کا صحن ۷۰ گز + ۴۰ گز ہے اور اس صحن کے گرد مکانات اور ایوان ہائے سنگ سرخ بنے ہوئے ہیں۔ جانب غرب اس صحن کے دروازہ ہے کہ دیوانِ عام سے اس میں رستہ آتا ہے اور اس دروازے کے آگے لال پردہ تنا رہتا ہے اور سب امرا ربوقتِ دربار اس لال پردے کے پاس سے آداب و تسلیمات بجا لاتے ہیں اور جانبِ شمال رستہ ہے حیات بخش باغ کا اور جانبِ جنوب ڈیوڑھی محلاتِ شاہی کی اور اس کے بیچ کے در کے سامنے صحن کی طرف ایک کٹہرہ ہے سنگِ مرمر کا جس کو دیوان خاص کی چوکھنڈی کہتے ہیں۔ اس محل کی چھت نری چاندی کی تھی مگر مرہٹے اور جاٹ گردی میں اکھڑ گئی۔

تخت طاؤسی
سنہ ۱۰۴۴ھ

چو تاریخش زباں پرسید از دل
بگفت "اورنگ شاہنشاہ عادل"

نادر شاہ نے جب ۱۰۴۴ھ سنہ ۱۷۳۹ء میں دہلی پر قبضہ کیا تو تخت طاؤسی کو توڑ تاڑ سونا چاندی اور جواہرات کل کے کل وہ لے کر چلتا ہوا۔ برنیر نے اس تخت کو زمانِ سلطنت اورنگ زیب میں دیکھا ہے جو جشن کے مواقع پر لوگوں کو دکھلایا جاتا تھا اس نے حسب ذیل کیفیت لکھی ہے:- "اس تخت کے ٹھوس سونے کے چھ بڑے بڑے زبردست بھاری بھاری پائے تھے جن پر لعل، زمرد اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس تخت میں جو بے شمار جواہرات جڑے ہوئے تھے ان کی لاتناہی قیمت یا تعداد بیان کرنے سے میں اس وجہ سے قاصر ہوں کہ کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ تخت کے اس قدر قریب

پہنچ سکے کہ ان کو شمار کر سکے یا ان کی آب و تاب کو دیکھ کر قیمت کا اندازہ لگا سکے لیکن اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تخت جواہرات سے لدا ہوا ہی اور جہاں تک میرا قیاس کام کر سکتا ہو اس کی قیمت کا سرسری طور پر تخمینہ چار کروڑ روپئے کا کیا جاتا ہی۔ یہ تخت شاہ جہاں بادشاہ کا بنایا ہوا ہی جس میں کثرت سے بیش قیمت جواہرات اس غرض سے لگائے گئے ہیں کہ دولت سلاطین کا اندازہ ہوسکے کہ جب اس قدر جواہرات صرف ایک تخت میں لگے ہوے ہیں تو خزانہ کیسا کچھ مالا مال ہوگا۔ یہ جواہرات وہ ہیں جو فتوحات ملک، نذر و نذرانہ پیش کش وغیرہ مواقع جشن امرا پر گزرانتے ہیں اور جو توشہ خانے میں جمع ہوتے رہتے ہیں تخت کی ساخت سونے چاندی اور جواہرات کے لحاظ سے جیسی ہونی چاہیئے ویسی نہیں ہی بجز دو موروں کے جو تمام جواہرات اور موتیوں سے لپے ہوے ہیں یہ البتہ بڑی نفاست اور عمدگی سے بنائے گئے ہیں۔ یہ ایک فرانسیس کے بنائے ہوے ہیں جس کی بے مثال دست کاری انسان کو محو حیرت کر دیتی ہی۔ جس نے اوّل اوّل بہت سے یورپین امرا کو جھوٹے جواہرات لگا کر خوب ٹھگا کیوں کہ اس کو نقلی جواہرات بنانے میں بڑی دستگاہ تھی۔ وہاں سے سب سمیٹ ساٹ یہ شخص جو سر پہ پیر رکھ کر بھاگا تو سلاطین مغلیہ کے ہاں پناہ لی اور یہاں کس بات کی کمی تھی آتے ہی مالا مال ہوگیا۔ تخت کے نیچے امیر امرا اپنے زرق برق لباسوں میں ایک پست تخت پر جمع ہوتے تھے جس کے اطراف نقرئی کٹہرا تھا جس پر کمخواب کا شامیانہ چوڑے چوڑے زرین جھالروں کا تنا رہتا تھا۔ ہال کے ستوں پر کمخواب اور زری بوٹی کی ساٹن لپیٹی جاتی تھی۔ تمام بڑے بڑے کمروں کے سامنے شامیانے تانے جاتے تھے جو ریشمین ڈوریوں سے تنے ہوے ہوتے تھے اور ان شامیانوں میں ریشم اور کلابتون کے پھندنے لٹکتے رہتے تھے فرش تمام تر نہایت بیش قیمت قالینوں کا ہوتا تھا یا لمبی لمبی اور چوڑی چوڑی دریوں کا۔ ہال سے ملا ہوا باہر دار کو ایک ڈیرہ جو "اسپک" کہلاتا تھا نصب کیا جاتا تھا جو ہال سے بھی بڑا تھا۔ یہ ڈیرہ آدھے صحن کو گھیر لیتا تھا جس کے گرد قناتیں لگی رہتی تھیں جن پر چاندی کے پتروں کے خول چڑھے رہتے تھے۔ تین چوبیں اس ڈیرے کی ایسی بڑی اور موٹی تھیں کہ جیسے جہاز کا مستول اور ان پر بھی چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا باقی اس سے چھوٹے تھم تھے اس شان دار خیمے کا ابرا بالکل سرخ اور اندروار مچھلی بندر کا نہایت عمدہ چھینٹ کا استر تھا جو خاص فرمائش سے

بنوائی گئی تھی جس کے بیل بوٹے ایسے نفیس رنگ ایسے شوخ تھے کہ نظر میں کھبے جاتے تھے اور بیچ بیچ کا باغ کھلا ہوا معلوم دیتا تھا جس میں روشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ کمروں کے سامنے کے شامیانے جو صحن کے چاروں طرف تنے ہوئے تھے اُن کی آرایش ہر ہر امیر نے اپنی اپنی حیثیت اور مقدرت کے موافق کی تھی اور ہر امیر یہی چاہتا تھا کہ اُس کی سجاوٹ اور آرایش دوسرے سے بڑھ جاے اور بادشاہ کی نظر میں شرف قبولیت حاصل کرے۔ اسی وجہ سے تمام دالان اور شامیانے سرے پاتک کمخواب اور زربفت سے منڈھے ہانڈی لنتر جھاڑ فانوس سے سجے سجائے اعلیٰ درجے کے بیش قیمت فرش فروش سے مزین رہتے تھے۔" ٹیوِرنیر Tavernier سیاح اور جوہری نے تخت طاؤس کی قیمت دوسو ملین لیور ۵۱ آنکی ہے۔ اگرچہ تخت طاؤسی کی بہت کچھ تعریف و توصیف کی جاتی ہے لیکن کارسٹیون صاحب کی رائے میں اس تخت کی شہرت کا بڑا اور اصلی سبب اس کا بیش قیمت ہونا تھا نہ کہ اس کی خوب صورتی یا بہتر ساخت۔ مسٹر برسفورڈ نے غالباً ہندوستانی روایات کی بنا پر تخت طاؤسی کی نسبت یہ لکھا ہے:۔"دیوان خاص میں مشہور تخت طاؤسی تھا۔ وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اُس کے پیچھے دو مور دُم کو چنور کیئے ہوئے تھے۔ ان میں نیلم۔ یاقوت۔ ہیرے۔ لعل۔ زمرد۔ پکھراج اور دوسرے رنگ برنگ کے جواہرات موروں کی دموں کو اصلیت کا رنگ دینے کے لیئے جڑے ہوئے تھے۔ تخت چھ فیٹ لمبا اور چار فیٹ چوڑا تھا جس کے چھ بھاری بھاری پاے تھے۔ یہ پاے اور تخت سارے کا سارا طلاے خالص کا تھا جس میں انواع و اقسام کے جواہرات جڑے ہوے تھے۔ تخت کے اوپر ایک زری کا شامیانہ تھا جس کے بارہ ستون تھے جو بیش قیمت جواہرات سے جگمگا رہے تھے۔ شامیانے کی جھالر موتیوں کی تھی۔ دونوں موروں کے بیچ میں ایک طوطا بھی اصلی قد و قامت کا ایک ہی زمرد میں تراشا ہوا تھا۔ تخت کی دونوں جانب دو شاہی چتر تھے جو لوازمۂ شاہی مراتب میں داخل ہیں یہ چتر قرمزی

۵۱ فرانس کا پُرانا سکہ ہے جو ایک فرینک کے برابر ہوتا تھا۔ یہ سکہ ۱۷۹۵ء سے موقوف ہو کر فرینک کا رواج ہوا۔ فرینک ساڑھے نو شلنگ کا ہوتا ہے۔ شلنگ فی زمانا بارہ آنے اور پونڈ پندرہ روپئے کا ہوتا ہے اور دس لاکھ کا ایک ملین۔ اس حساب سے ساڑھے نو کروڑ پونڈ ہوے جس کے ۱۴۲۵۰۰۰۰۰۰ روپئے ہوے۔ ۱۲۰

مخمل کے نہایت عمدہ کارچوبی کام کے موتیوں کے جھالر کے تھے جن کی ڈنڈیاں آٹھ آٹھ
لبی ٹھوس سونے کی تھیں ان پر بھی جواہرات جڑے ہوے تھے۔ اس عالی شان اور بیش بہا
تخت کی قیمت کا اندازہ مختلف طور پر ایک ملین پونڈ سے لے کر چھ ملین پونڈ تک کیا گیا ہے
یعنی پندرہ لاکھ سے نوّے لاکھ روپیئے تک۔ یہ تخت آسٹن ڈی بورڈو کی اختراع ہے اور
اسی کی زیر نگرانی تیار بھی ہوا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے عام خاص (دیوانِ عام) کی پچیکاری کا
کام بنایا تھا۔"

تختِ طاؤسی کا اور کچھ حال

یہ تخت کیا تھا عجائبات دُنیا کا ایک نمونہ تھا۔ کروڑ روپیہ کہنے کو
تو لفظ اور ایک بات ہے مگر خیال کرنا چاہیئے کہ آج اس قدر سونے
اور جواہرات کے لیئے کس قدر دریا اور پہاڑ چھاننے پڑے ہوں گے
یشب کا تختہ جو بجاے تکیئے کے تھا دس لاکھ روپیئے کا تھا۔ بارہ مرصع ستونوں پر
مغرق محرابیں اور جڑاؤ میناکاری کی چھت دھری تھی۔ چھت سے پاے تک خالص کندن اور
آب دار جواہر سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ گویا ایک ستارے کا نگینہ ہے کہ انگوٹھی پر دھرا ہے
اس کی روکار کی محراب پر ایک بھاری درخت طلائی دھرا تھا جسے سبزہ و الماس سے
سرسبز اور لعل و یاقوت سے گل رنگ کیا تھا۔ اس کے ادھر اُدھر دو مور زنگارنگ کے
جواہرات سے مرصع چونچ میں موتیوں کی تسبیحیں لیئے اس طرح کھڑے تھے گویا اب ناچنے
لگتے ہیں۔ چاروں طرف چاروں چتر زرنگار جن میں موتیوں کی جھالر جھلملاتی تھی آگے ایک
شامیانہ کہ جواہرات اور موتیوں کی آبداری سے دریاے نور کی طرح لہراتا تھا اور ایک لاکھ
روپیئے کی لاگت سے طیار ہوا تھا۔ اس کے گرد کرسیاں اور چوکیاں اپنے اپنے مرتبے
سے بچی ہوئی تھیں۔ تخت کے گرد پاس ادب کے لیئے کئی کئی گز تک حاشیہ چھوڑ کر چاندی
کٹہرا ایسا خوشنما لگا تھا کہ جسکی میناکاریاں مرغ نظر کو شکار کرتی تھیں۔ غرض دربار آراستہ
ہوا۔ مگر اقبال کا رعب داب دیکھ کر قدرتِ خدا یاد آتی تھی چنانچہ کٹہرے کے باہر اول پہلو
ولیعہد شہزادگانِ والاتبار۔ ان کے بعد راجہ مہاراجہ۔ ملک ملک کے حاکم۔ امیر وزیر اپنے
اپنے مراتب سے کھڑے مگر تمام فرماں برداروں کی آنکھیں زمین پر اور گوشِ دل اپنے
فرماں روا کے حکم پر لگے تھے۔ ہر ایک در میں دو دو خاص بردار مخمل کی غلاف دار بندوقیں
کندھوں پر بادلے کی جھنڈیاں ہاتھوں میں لیئے بُت بنے ہوے قایم تھے۔ باہر

دالان میں اور عہدہ دار جاگیردار منصب دار حکم کے منتظر حاضر تھے۔ اس سے آگے کے درجوں میں تین تین حبشی جیسے کالے دیو۔ آنکھیں لال لال۔ زربفت کی وردیاں پہنے ہتیاروں میں ادبھی بنے۔ گرزہائے فولادی کندھوں پر۔ بادلے کی بیرقیں ہاتھوں میں۔ تیسرے درجے میں اہلکار۔ اور ہر کارخانے کے کار دار۔ منشی۔ متصدی قلمدان کمریں۔ بستے آگے رکھے موجود تھے اور درجوں میں سپاہی ننگی تلواریں علم کیے۔ قدآدم چاندی کے کٹہرے سے لگے خاموش کھڑے تھے۔ باہر تیس تیس گز کا فاصلہ دے کر پھر چاندی کا کٹہرا تھا اور اُس کے برابر بہادر سپاہی خاص بادشاہی جن میں دائیں پر ترک۔ بائیں پر افغان سامنے راجپوت اپنی زرق برق وردیاں پہنے۔ سنہری روپہلی بیرقیں ہاتھوں میں لیے جمے تھے۔ یہاں سے دروازے تک سواروں کے پرے دورستہ پابستہ آراستہ تھے۔ جو درباری لوگ آتے۔ پہرے پہرے پر اپنے نام ونشان بتاتے اور آگے چلے جاتے۔ مگر دبدبہ و دہشت کا یہ عالم تھا کہ ہوش وحواس کے قدم تھرّاتے تھے دربار میں پونچ کر تین سلام گاہوں پر تسلیم بجالاتے تھے۔ جب نقیب آواز دیتا تھا کہ آداب بجالاؤ۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت! عالم پناہ بادشاہ سلامت۔ ادب سے تفاوت سے! تو دل سینوں میں دہل جاتے تھے۔ کٹہرے کے پاس کورنش کا آداب ادا کرتے تھے۔ غرض اول شاہزادوں کی نذریں گزرنی شروع ہوئیں۔ ہر ایک کو خلعت اور ترقیِ منصب اور سرفرازیوں کے احکام سنائے گئے۔ سعد اللہ خاں وزیر اعظم کو ہفت ہزاری کا منصب عطا ہوا۔

جشن ماہتابی

رات کو جشن ماہتابی ہوا کہ تمام دیوانِ عام ایک بقعۂ نور نظر آنے لگا فرش میں سفید مخملیں۔ سفید ہی قالین۔ دیواروں پر براق اطلسیں۔ زربفت وکمخاب کے پردے مگر وہ بھی روپہلی۔ آرائش کے سامان اور روشنی کے سب لوازمات موجود مگر تمام بلور اور شیشہ ہائے سفید۔ سامنے چمن اور درختوں کے پھول پتے تمام سفید۔ روشوں پر گھاس سفید۔ دربار کا لباس سفید۔ یہاں تک کہ انگوٹھی بھی چاندی کی۔ اُس پر بھی الماس سفید۔ غرض کہ زمین سے آسمان تک نور کا عالم تھا۔ اور دریائے مہتاب لہراتا نظر آتا تھا۔ چندرما کی تُلا[1] کے جشن میں نودن باقی تھے۔

[1] نجومی اپنے علم کے موافق امیروں اور بادشاہوں کو ستاروں کی نحوست دور کرنے کے لیے نقد اور جنس کے ساتھ ترازو میں تولا کرتے ہیں اور وہ نقد وجنس مساکین کو خیرات میں دے دیا کرتے ہیں اس عمل کو تُلا کرنا کہتے ہیں۔ ۱۲

اس لیئے نوروز تک برابر جشن کے انعام واکرام جاری رہے۔
اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں جو شاہ عالم کے صاحب زادے اور جانشین تھے دیوان عام کی حالت ایسی ابتر ہو گئی تھی کہ آنے جانے والے اُسے دیکھ کر کفِ حسرت وافسوس ملتے تھے۔ دہلی کے رزیڈنٹ سٹر ایلیٹ نے بشپ ہیبر سے کہا تھا کہ ''محلات شاہی کی ردی حالت کا سبب کچھ تمول کی کمی نہ تھا بلکہ ان لوگوں نے محض اپنی بے پروائی سے ایک ایسی عمارت کی جو خود ان کی گزشتہ عظمت کی یادگار تھی اس کی نگرانی۔ مرمت حتی کہ معمولی صفائی تک بھی چھوڑ دی۔ دیوان خاص ایک بے ترتیب اور ناکارہ سامان کا انبار خانہ بن گیا۔ ٹوٹی ہوئی پالکیاں۔ خالی صندوق بھرے پڑے تھے۔ تخت کی یہ حالت تھی کہ کبوتروں کی بیٹ سے ایسا اٹ گیا ہے کہ جواہرات بھی مشکل سے نظر آتے ہیں'' غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے پھر اس کی نگہداشت ہونے لگی۔ ملمع کاری کو از سر نو جالا گیا۔ چوبی چھت بدلی گئی اور لال رنگ کرا کے نہایت عمدگی سے ملمع کرا دیا گیا۔ یہ مقام بھی زمانے کی نیرنگیوں اور انقلابات عجیبہ کا اکھاڑا رہا ہے۔ یہ مکان شاہجہاں کا بنایا ہوا ہے اور اسی کے عہد میں یہ سب سے زیادہ پسندیدہ اور آراستہ بھی سجائی جگہ تھی جہاں بادشاہ اکثر دربار کیا کرتے تھے۔ اور یہیں سے وہ احکام وفرامین اپنے صوبہ داروں۔ طرف داروں اور مقامی حکام کے نام نافذ فرماتے تھے۔ جن کے سامنے ساری دسعت سلطنت احکام قضا شیم سلاطین مغلیہ کے لیئے سر تسلیم خم کرتی تھی۔ نادر شاہ نے جب پانی پت کے میدان جنگ سے سلطنت دہلی کو تباہ و برباد کر دیا تو یہی مکان تھا جہاں اُس نے اپنے شکست یافتہ میزبان محمد شاہ سے پگڑی بدل کر تاج شاہی زیب سر کیا۔ ۱۷۶۰ء میں ستارے کے گیئر سے گروہ یعنی مرہٹوں نے اس ہال کو نوچ کھسوٹ کر برباد کر دیا۔ اس واقعے کے کوئی پچیس برس کے بعد ایک سفاک سپاہی نے خود مختار شاہنشاہ دہلی شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں۔ اس نسبے باکانہ حملے کے کوئی بیس برس بعد شاہ عالم کے دربار میں انگریزوں کا جنرل لارڈ لیک باریاب ہوا اور بادشاہ نے اُس گلوخلاصی کے لیئے جو اُسے سیندھیا کی ملازم فرنچ افواج سے نجات پانے میں حاصل ہوئی تھی برٹش گورنمنٹ کا شکریہ ادا فرمایا۔ اس واقعے کے نصف صدی سے کچھ زیادہ بعد ۱۸۵۷ء میں شاہ عالم کے پوتے نے جو برائے نام دہلی کا بادشاہ تھا غدر دہلی کے ہندوستانی باغی افواج کے عہدہ داروں کو

جو برٹش گورنمنٹ کے ملازم تھے اسی ہال کے دربار میں بڑے تپاک سے لیا اور اُن باغیوں نے ایک بار پھر اسی بادشاہ کو سلطنت ہند کا فرماں روا بنا دیا۔ غرض دیوان خاص ان تاریخی واقعات اور نیز اُس کی بے نظیر عمارت کے لحاظ سے ضرور صفحۂ زمین پر فردوس بریں کہلانے کا مستحق ہی۔

حمام
شہ ۱۰۴۸-۵۰ھ
۴۰-۱۶۳۹ع

زہے صفاے عمارت کہ در تماشایش
بدیدہ باز نگردد نگاہ از دیوار

دیوان خاص کے شمال میں شاہی حمام ہیں ان دونوں عمارتوں کے بیچ میں ۲۹ہم چوڑا سنگ مرمر کا فرش ہی۔ حمام کی عمارت کی جنوبی دیوار کے وسط میں دیوان خاص کے مقابل ایک تین در کا ہال ہی جو حمام کی ڈیوڑھی ہی۔ اس ڈیوڑھی کے ہر دو جانب دو کمرے ہیں جن کے بیچ میں سے آدمی حمام میں داخل ہوتا ہی۔ حمام میں سنگ مرمر کے فرش کے تین وسیع کمرے ہیں۔ ان کمروں کا فرش نصف نصف دیواریں۔ حوض۔ گرم آبے ان سب پر پہلے رنگ برنگ کے قیمتی پتھر جڑے ہوے تھے اور نہایت خوش نما پھول پتیاں گلدستے بنے ہوے تھے۔ دریا کی طرف کے کمرے میں پانی کے لیئے تین حوض بنے ہوے ہیں۔ مشرقی دیوار میں ایک چھوٹا سا سنگ مرمر کا نشیمن ہی جس کے ہر طرف ایک ایک کھڑکی ہی جس میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ دوسرے کمرے میں صرف ایک ہی حوض ہی اور تیسرے کمرے میں ایک گرم آبہ نہایت خوب صورت بنا ہوا ہی جس کے پیچھے ایک تو لگا ہوا ہی جہاں سے پانی گرم ہو کر آتا تھا۔ حمام میں جا بجا نہریں دوڑتی تھیں فوارے لگے ہوے تھے جس سے ہر کمرے میں پانی پونچتا رہتا تھا۔ حمام میں روشنی آنے کے لیئے دھندے آئینے لگے ہوے ہیں۔ تسبیح خانے کے جنوب میں حمام ہی۔ جس میں جانے کا دروازہ دیوانِ خاص کی مشرقی دیوار کے سامنے ہی۔ حمام کی عمارت کے ادھر اُدھر جو کمرے ہیں کہتے ہیں کہ وہ صاحبزادوں کا حمام تھا۔ حمام کی عمارت کے تین بڑے حصے ہیں۔

عقبِ حمام یا جامہ کُن

یہ پہلا درجہ حمام کا لب دریا عقب حمام یا جامہ کُن کہلاتا ہی جہاں جاکر کپڑے اُتارے جاتے تھے یا غسل کے بعد آکر بیٹھتے کپڑے پہنتے اور کچھ ناشتہ کرتے۔ یہ عمارت بہت نفیس ہی اور کمرے کی طرح اس کے درجے ہیں اور بیچ میں چلنے پھرنے کے لیئے رستے چھٹے ہوے ہیں

اور اجارے تک سنگ مرمر لگا ہوا ہی جس میں رنگ برنگ کے پتھر بٹھا کر پچیکاری کا بہت
اعلیٰ درجے کا نفیس کام کیا ہی۔ اس میں چھوٹے چھوٹے حوضوں میں تین فوارے لگے ہیں جن
میں سے ایک فوارہ جس سے گلاب کی پھوار نکلتی تھی دیکھنے کے قابل ہی۔ اس کی ایک کھڑکی
میں سنگ مرمر کی بہت نازک اور نادر جالی لگی ہوئی ہی اور کچھ رنگین آئینے بھی اُسی زمانے کے
ہیں یعنی آئینہ بندی کی تھی جس میں سے دریا اور سبزہ اور جنگل کی کیفیت دیکھ کر نظر اُٹھانے کو
دل نہیں چاہتا تھا۔

درجۂ دوم سرد خانہ

اس درجے میں جانب شمال ایک شہ نشین ہی تمام تر سنگ مرمر کی
نہایت منبت کار اور پر چین ساز اور پچی کار اور اس کے آگے ایک
درجہ ہی مربع سنگ مرمر کا جس میں فرش سے لے کر چھت تک عجیب
عجیب رنگ کے پتھر سے پچی کاری کی ہوئی ہی اور طرح طرح کے بیل بوٹے بنائے ہیں اس
حد تک کہ فرش دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ گویا قالین ایرانی بچھے ہوئے ہیں۔ اس کے
بیچوں بیچ میں ایک حوض ہی مربع اسی طرح کا پرچین کار جس کے چاروں کونوں پر چار فوارے
ہیں سنہری کہ وہ جب چھوٹا کرتے تھے تو اس میں بھی ایک ندرت رکھی تھی اور اس طرح منحرف
لگائے تھے کہ چاروں فواروں کی دھاریں مل کر حوض میں گرتی تھیں اور گرد اس کے دیوار سے
ملی ہوئی ایک نہر جدول کے طور پر ایک گز عریض بنی ہوئی ہی۔ اور اس مکان میں ایک خوبی
رکھی ہی کہ چاہے تو یہ درجہ سرد رہے اور نہر اور حوض میں بھی ٹھنڈا پانی جاری رہے
اور چاہیں اسے گرم کر دیں کہ فرش سے لے کر چھت تک گرم ہو جائے۔ فوارے بھی گرم ہی
چھوٹیں اور نہر بھی گرم ہی بہے۔ اس درجے میں سنگ مرمر کی ایک قابلِ دید کوچ
بھی رکھی ہوئی ہی۔ خدا جانے کس طرح بچ گئی۔ جس کے دیکھنے سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا
ہی کہ اُس حمام میں کس قسم کا سامان و اسباب مہیا تھا۔

گرم خانہ

حمام کا یہ تیسرا درجہ ہی جس کے غرب میں حوض آب گرم کے بنے ہوئے
ہوئے ہیں جو خرے سنگ مرمر کے ہیں جن کو سوا سو من لکڑیوں کا
لقمہ دیا جاتا تھا اور اس کے آگے ایک مربع درجہ ہی جس کے بیچ میں
سنگ مرمر کا چبوترا ہی جس پر بیٹھ کر غسل کرتے تھے اور جانب شمال دوسرے درجے کی
طرح شہ نشین بنی ہوئی ہی اور اس شہ نشین پر ایک بڑا مستطیل حوض ہی اور اس میں بھی خوبی یہ

نقشہ گرم خانہ حمام

نقشہ ہیرا محل
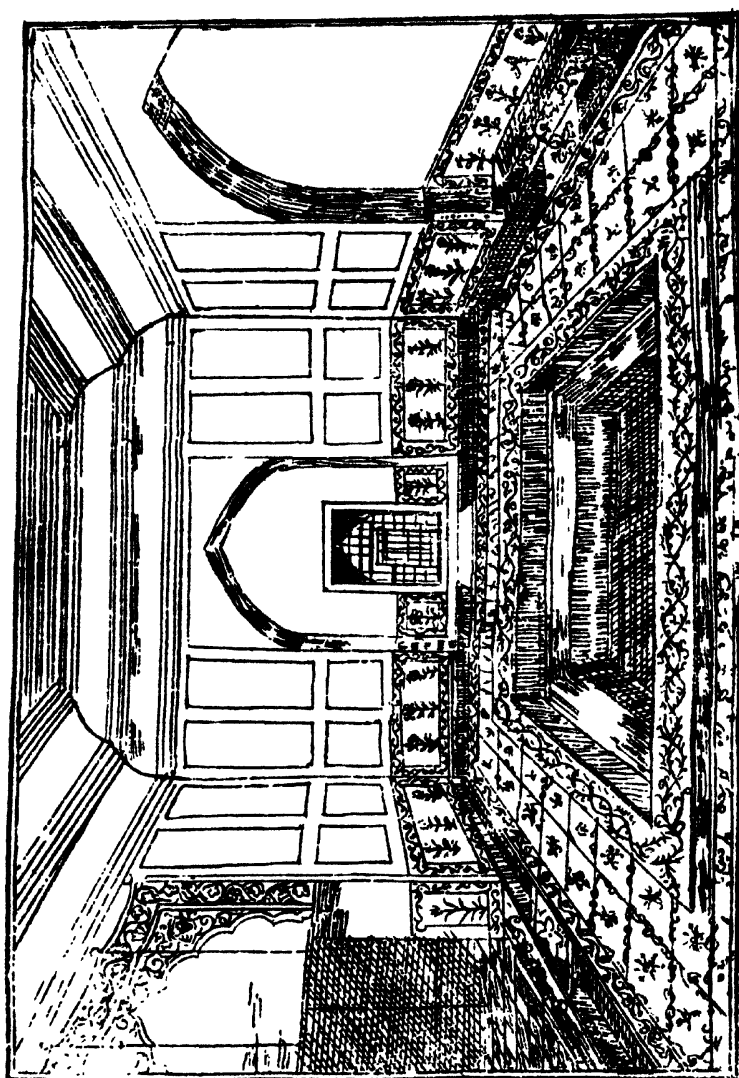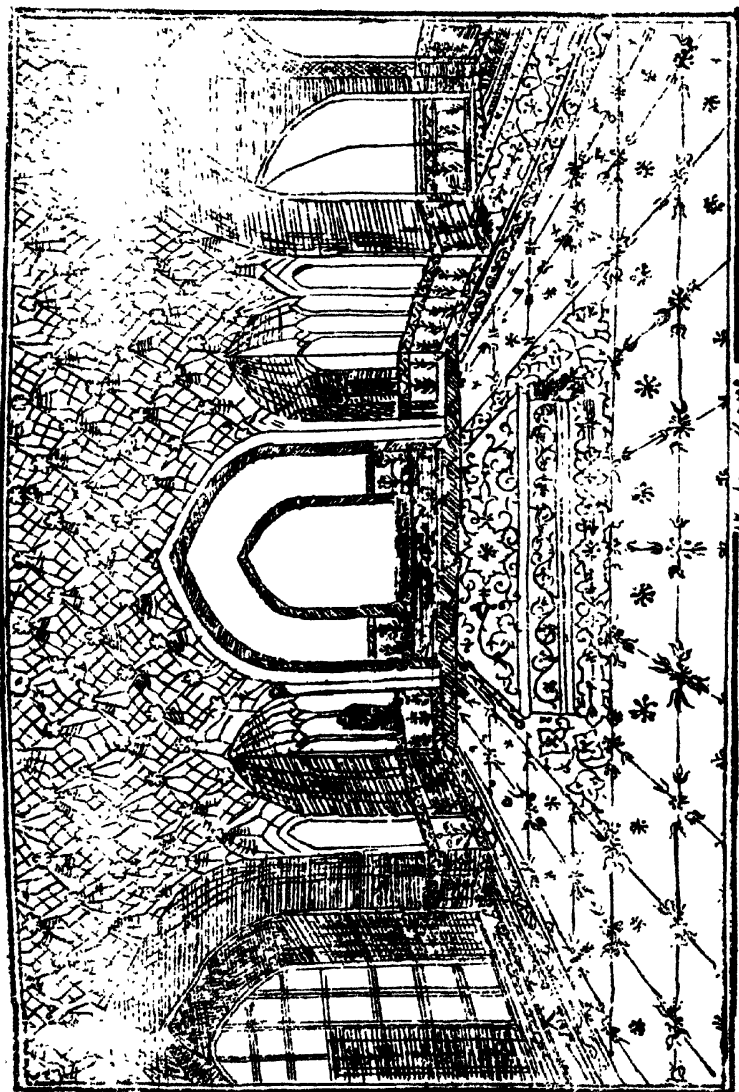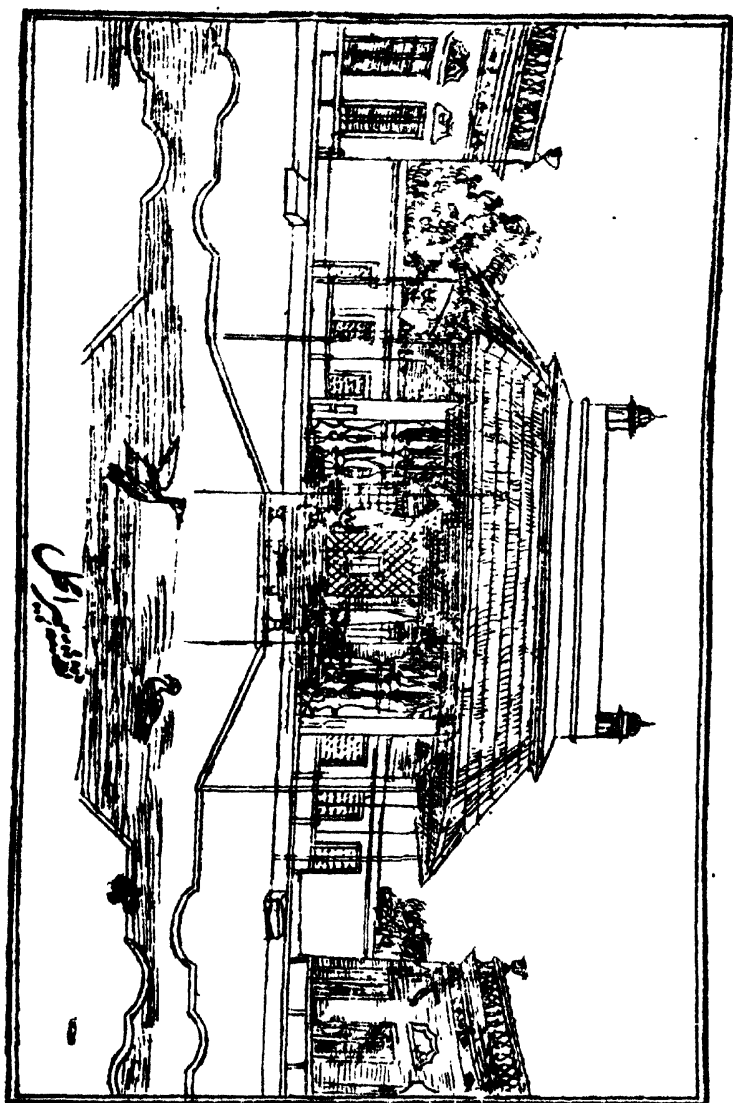
کہ چاہے اس حوض کو گرم پانی سے بھریں چاہے سرد سے۔ اس درجے کا بھی فرش چبوترہ حوض اور دیواریں ازارے تک بالکل منبت کار ہیں اور طرح بطرح رنگین اور بیش قیمت پتھر اس میں جڑے ہیں اور انواع و اقسام کے پھول اور بیلیں بنائی ہیں۔ اسی میں ایک جالی گرم آبہ کی بہت نفیس ہے۔ پانی کے گرم کرنے کا سب سامان مغربی دیوار میں بنا ہوا ہے۔ حمام کے ہر درجے میں روشنی رنگین شیشوں کے ذریعے سے آتی تھی جس کا نمونہ اب بھی حمام کے مشرقی حصّے میں موجود ہے۔ شاہان مغلیہ کو حماموں کا بڑا شوق تھا اور سلطنت کے امور عظام صیغۂ راز کے یہیں طے پاتے تھے۔ چنانچہ سر طامس رو شاہ جہاں کے حضور میں آگرے کے قلعے میں حمام ہی میں باریاب ہوا تھا۔ موسم سرما میں ان حماموں میں زیادہ تر بادشاہ جایا کرتے تھے کیوں کہ وہ خوب گرم رہتے تھے! لیکن بقول سرسید یہ حمام شاہجہاں اور اورنگ زیب کے وقت میں گرم ہی نہیں ہوئے۔

ہیرا محل
تقریباً ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء

حمام کے شمال میں یہ محل ہے۔ اس میں اور حمام میں صحن چھوٹا ہوا ہے اور اس صحن میں چار گز کے عرض کی ایک نہر بطور مارپیچ کے سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے یہ وہی نہر ہے جس کا نام نہر بہشت ہے اور دیوانِ خاص اور رنگ محل میں جاری ہے۔ اس صحن کے بیچ میں نہر کے کنارے پر ایک بڑی بارہ دری سنگِ مرمر کی ۲۲ فٹ طول شمالاً جنوباً اور ۱۹ فٹ عرض شرقاً غرباً بہادر شاہ ثانی خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار کی بنوائی ہوئی ہے۔ جو مرزا فخرو ولی عہد کی بارہ دری مشہور رہی۔ اس بارہ دری سے قریب ایک کوٹھری ہے جس میں پرانے ہتیار رکھتے ہیں۔ حمام کے پیچھے ایک کنواں بہادر شاہ کا بنوایا ہوا ہے اس پر یہ تاریخ کندہ ہے

ظفر تعمیر شد این چاہِ شیریں	کہ آبش شربت قند و نبات است
ازیں خوش تر نباشد سال تاریخ	بود پیدا چشمۂ آب حیات است

اس کے دیکھنے سے شاہ جہاں کے زمانے میں اور آخری دورِ مغلیہ میں جو فرق فنِ طرزِ عمارت میں ہو گیا ہے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی چھت کے چاروں کونوں پر چار چھوٹی چھوٹی گمٹیاں بنائی ہیں جن کی برجیاں سنہری ہیں۔ یہ محل بھی سارا سنگِ مرمر کا بہت نازک اور خوب صورت بنا ہے۔ اس صحن میں جو نہر ہے وہ اس طرح سے مارپیچ سے بنائی ہے کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اس زمانے میں اس نہر کے بیچ میں سنہری روپہلی چوبیں فوارے تھے جو بیٹھے چھوٹا کرتے تھے

موتی محل

ہیرا محل کے شمال میں اور حیات بخش باغ کی مشرقی آبشار کے
سامنے موتی محل تھا جو غدر کے بعد توڑ ڈالا گیا اور وہاں توپ خانے
کی بارک بنادی گئی جس عمارت کا وجود ہی نہ رہا تو اب کیا ہوسکتا تھا لیکن
سنہ ۱۹۱۳ء میں وہ بیرک نکلوادی اور جتنا ہوسکتا تھا وہ کیا گیا خیر اس محل کے
حدود تو معلوم ہونے لگے کہ یہاں یہاں تک تھا۔ محل کی تصویر دیکھنا چاہتے ہو تو آثار الصنادید
میں یوں لکھا ہے کہ یہ محل سنگِ سرخ کا تھا جسے سنگِ بٹھانی سے سفید کرکے رنگامیزی
اور طلاکاری کے گل بوٹے بنائے تھے۔ اس میں ایک درجہ تھا ۱۵ گز × ۷ گز مشتمل دو شہ نشینوں
اور اس کے بیچ میں ایک حوض تھا ۸ گز × ۳ گز۔ اور ہر ایک شہ نشین کے پیچھے ایک ایک
درجہ تھا ۸ گز × ۵۔ اور دیوان تھے۔ فیع بیچ درے کہ جانب شرق سے مشرف بدریائے
اور جانب غرب سے مشرف بہ باغ حیات بخش۔ ہر ایک ایوان کا طول ساٹھ گز اور عرض تیس
گز تھا۔ اندر کی عمارت میں اجارے تک سنگ مرمر لگا ہوا تھا اور باقی سنگِ سرخ کا تھا
جسے سنگِ بٹھانی سے سفید کیا تھا اور اس میں ایک حوض اور نہر تھی جس میں سے ایک چادر دو گز کے
عرض کی باغ حیات بخش کے ایک حوض میں پڑتی تھی اور یہ حوض وہی تھا جو اب رنگ محل کے
سامنے رکھا ہوا ہے جس کا ذکر ہم نے صفحہ کیا ہے۔

موتی مسجد

سنہ ۱۰۷۰ھ
۶۰-۱۶۵۹ء

یہ مسجد لال قلعے میں شاہنشاہ اورنگ زیب نے سنہ جلوس (۲) مطابق
سنہ ۱۰۷۰ھ و ۶۰-۱۶۵۹ء میں بصرف ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت بنوائی تھی۔
اس کی عمارت غایت درجہ خوب صورت اور از سر تا پا سنگِ مرمر کی ہے۔
یہ مسجد بادشاہ اور بیگمات کی پرائیوٹ عبادت گاہ تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء میں اس پر ایک توپ کا گولہ
گر کر گنبدوں کو سخت نقصان پہنچا تھا جس کی مرمت نہایت خوبی سے بعد میں کردی گئی۔
لیکن گنبد جو پہلے بالکل سنہری تھے ویسے نہیں بن سکے اب سادے ہیں۔ اگرچہ مسجد بہت چھوٹی
ہے بمصداق ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر سارے ہندوستان کی مسجدوں پر اپنے حسن و خوبی
کے لحاظ سے تفوق رکھتی ہے۔ مسجد کا داخلی چھوٹا سا دروازہ سنگِ مرمر کا ہے جس میں برنجی
چادر کے جڑے ہوئے پٹ ہیں۔ صحن مسجد ۴۰ × ۳۰ سارے کا سارا سنگِ مرمر کی سلوں کے
فرش کا ہے۔ چار دیواری بیس فیٹ بلند ہے۔ دیواروں کے بیرونی رخ پر سنگِ سرخ اور
اندر وار سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ دیواروں میں چوڑی چوڑی سلیں لگی ہوئی ہیں جن میں دیوار وغیرہ

نقشہ موتی محل

نقشہ موتی مسجد
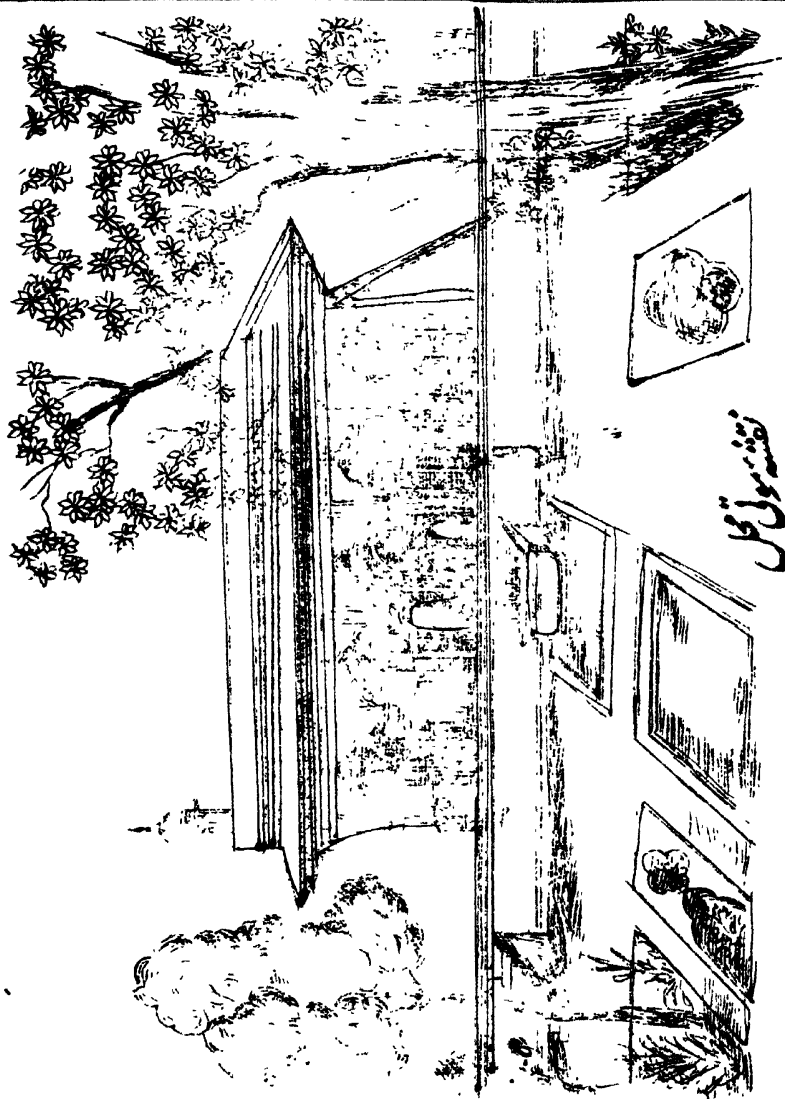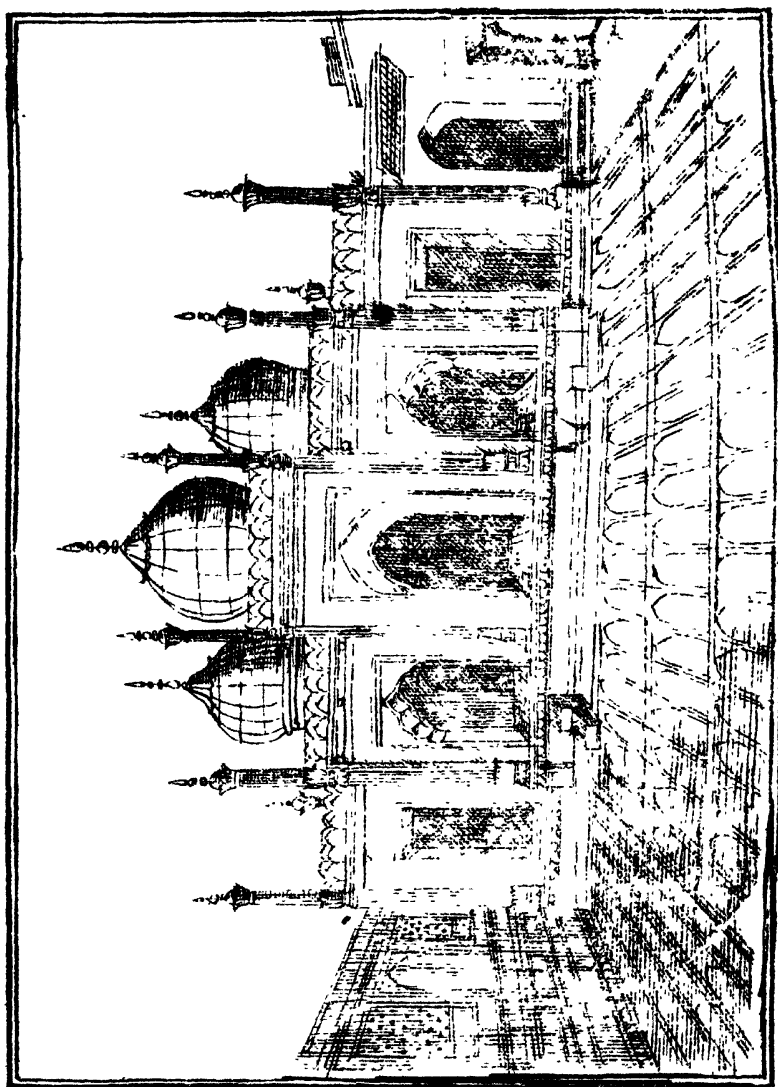
ہیں اور اُن پر سنگ مرمر کی بُرجیاں ہیں۔ احاطے کی شمالی دیوار میں زنانے محل میں سے آنے کا رستہ ہے۔ اِس رستے سے بیگمات آکر شریک نماز ہوتی تھیں صحن کے وسط میں ایک سنگ مرمر کا حوض ۱۰ × ۸ ہے جو باغ حیات بخش کی نہر سے بھرا جاتا تھا چوں کہ یہ حوض دہ در دہ سے چھوٹا تھا اور اُس کا پاک رہنا مشکل تھا لہٰذا اس میں ایسی ترکیب رکھی ہے کہ بھادوں میں سے اس حوض میں پانی آتا ہے اور اُبل کر ہر وقت بہتا رہتا ہے گویا یہ حوض بھی چشمۂ جاریہ ہے۔ مسجد کا طول و عرض ۰ × ۳۰ ہے۔ بلندی ۲۵ - اور چھت سے درمیانی گنبد کے کلس تک ۱۲ اور ہے۔ اس مسجد کے تین در نہایت خوب صورت بنگڑی دار محرابوں کے ہیں جو زیادہ اونچے نہیں۔ چبوترے کی چار سیڑھیاں ہیں جو ۳ اونچا ہے۔ جس میں سنگ موسیٰ کی تحریر کے مصلے ہیں۔ ان محرابوں کے چار ستون ہیں جن کے سرے اور بیٹھک پر تو نقش و نگار ہیں باقی بیچ کا حصّہ بالکل صاف و شفاف سنگ مرمر کا ہے۔ ادھر اُدھر کی محرابیں آٹھ فیٹ چوڑی ہیں اور بیچ کی اُس سے دگنی۔ پیش دالان کے پیچھے اور ایک دالان ہے اُس کے بھی تین ہی در ہیں۔ اس طرح اس مسجد میں ستونوں کی دو قطاروں سے چھ حصّے ہو گئے ہیں۔ مسجد کی پچھیت کی دیوار میں حسب معمول دیوار دو محراب ہے۔ درمیانی محراب زیادہ چوڑی اور گہری ہے سامنے کی محرابوں کے دونوں طرف مینارے ہیں اور ادھر اُدھر کی محرابوں کے سامنے ہر ہر قطع میں ایک سنگ مرمر کا چوڑا چھجہ ہے چھت کی منڈیر گو چھوٹی ہے مگر اُس پر بہت کچھ نقش و نگار کیے ہوئے ہیں۔ یہ منڈیر بیچ کے در پر محراب دار ہے اور باقی دو دروں پر ہموار تینوں گنبد سنگ مرمر کے کمر کی وضع کے ہیں جو سنہری تھے اسی وجہ سے بعض لوگ اسے سنہری مسجد بھی کہتے ہیں۔ بہ مقابلے مغلوں کے بنائے ہوئے گنبدوں کے یہ زیادہ کوٹھی دار ہیں ان پر ملمع کے کلس چڑھے ہوئے ہیں۔ اس مسجد کی جانب شمال ایک حجرہ بنا ہوا ہے عبادت اور وظیفہ وظائف کے لیے اُس میں بھی ایک مختصر کم عمق بہت نفیس حوض ہے اور اُس کے گرد آئینہ بندی کی ہوئی ہے۔ عاقل خاں نے اس کی تاریخ کیسی نفیس نکالی ہے۔ جیسی مسجد ویسی تاریخ اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا

باغ حیات بخش

سنہ ۱۰۴۸ھ - ۱۶۳۹ء

دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

یہ باغ جس کا اب وجود نہ رہا موتی مسجد کے شمال میں تھا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں یہ باغ بالکل ملبے کے انباروں میں دبا ہوا تھا اور باقی حصہ سڑکوں میں آگیا تھا۔ غرض یہ کہ اس کی نہریں روشیں آبشار نالیاں سب ٹوٹ پھوٹ کر تباہ ہو گئی تھیں۔ حیات باغ ممات باغ ہو گیا تھا۔ لارڈ کرزن کو اس کی دُھن تھی اور کیا ہی نیک دُھن تھی سنہ ۱۹۰۳ء میں اس کی داد فریاد سنی گئی اور پھر باغ خزاں رسیدہ میں بہار آئی اور فوری درستی شروع ہو گئی سنہ ۱۹۱۱ء تک برابر مرمت جاری رہی اور جہاں تک امکان بشری میں تھا تلافی مافات کی گئی۔ جو حصہ خالی تھا ٹھیک ٹھاک ہو گیا باقی حصہ جو سڑکوں سے گھر گیا تھا وہ امر لاعلاج تھا۔ اب اس باغ کی اُس حالت کا نقشہ بھی ملاحظہ ہو جیسا کہ یہ کبھی تھا۔

صد ہزاراں گلِ شگفتہ درو
سبزہ بیدار و آب خفتہ درو

یہ باغ خدا کی قدرت کا نمونہ ہے کہ اس کے دیکھنے سے دل کو فرحتِ تازہ اور جان کو نشاطِ بے اندازہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کے دیکھنے سے نقشہ بہشتِ بریں کا آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ہر دلعت اس کا رشک قامت یار اور ہر گل رخسار اس کی سمن کے آگے بناگوش یار خجل اور اس کی بنفشہ کے سامنے زلفِ خوباں منفعل اس باغ کے بیچوں بیچ میں ایک حوض کلاں ہے اور حوض کے چاروں طرف سنگ سُرخ کی نہریں چھ گز عریض بہتی ہیں اور ہر ہر نہر میں تیس تیس فوارے چاندی کے چھوٹتے تھے اور روش میں نہر کا پانی آتا ہے اور گل ہائے معطر اور درختان دل کش کی تازگی کا باعث ہوتا ہے اور حوض کی دو جانب میں دو مکان واقع ہیں کہ ان کو ساون بھادوں کہتے ہیں۔ طول اس باغ کا دو سو پچاس گز اور عرض ایک سو پچیس گز ہے۔ الغرض کیفیت سبزہ و گل اور آب جاری اور ہوائے ملایم اور صحن دل کشا ایسی نہیں کہ زبانِ قلم سے ادا ہو سکے۔

حوض باغِ حیات بخش

منڈیر کا بالائی حصہ

سنہ ۱۸۰۵-۱۸۰۴ء
سنہ ۱۸۰۵-۱۸۳۶ء
سنہ ۱۸۴۷-۱۸۵۷ء

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

اس باغ کے بیچوں بیچ میں ایک بہت بڑا حوض ۱۵۰ فٹ × ۱۵۳ فٹ ہے حوض جس کے بیچ میں انچاس فوارے چاندی کے لگے ہوئے تھے اور ہر دم چھوٹا کرتے تھے اور علاوہ ان فواروں کے گرداگرد اس حوض کے ایک سو بارہ فوارے چاندی کے حوض کی جانب جھکے ہوئے تھے۔ ان فواروں کا نام بھی نہیں رہا۔ جابجا سوراخ البتہ نظر آتے ہیں۔ اس حوض کے گرد جنگلا لگا ہوا ہے جس کا

نقشہ ظفر محل مع حوضِ مہتاب باغ
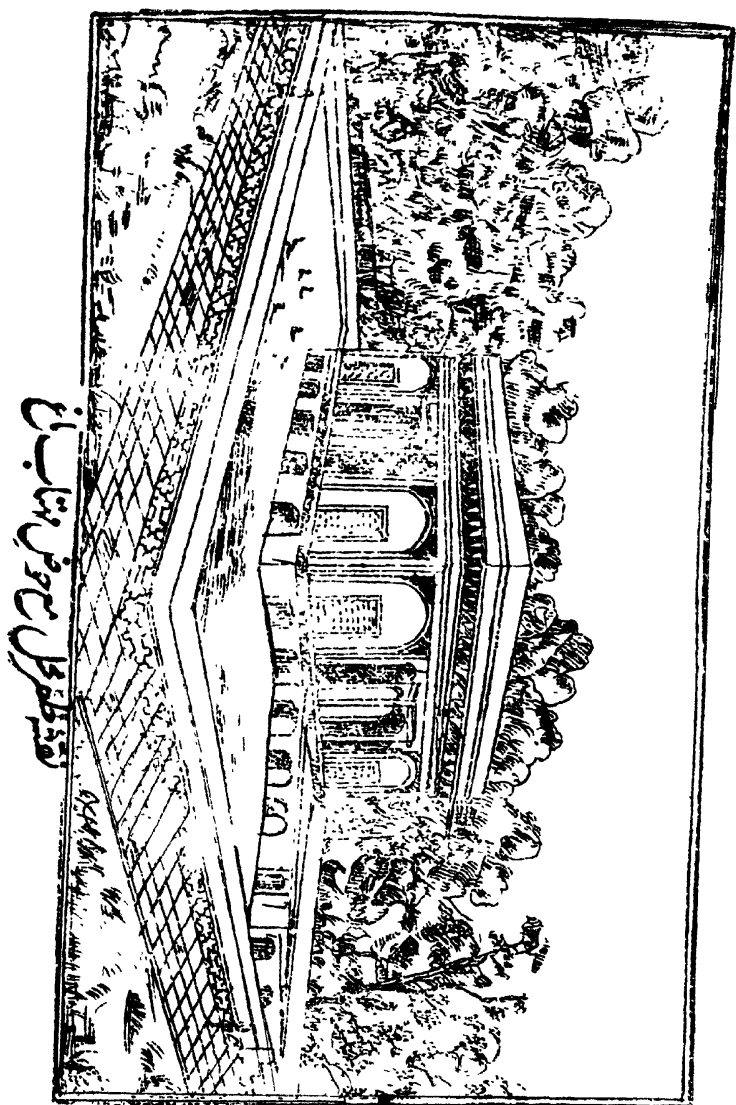
بالائی حصہ شاہجہانی دور کا نہیں ہے بلکہ اغلباً بہادر شاہ ثانی کے زمانے میں بنا ہوا معلوم دیتا ہے اس حوض کی بھی زمانہ حال میں بہت کچھ درستی ہوئی ہے۔

مہتاب باغ

بعد میرے جو نوید وصلِ یار آنے کو تھی
وہ چمن ہی لٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی

حیات بخش باغ کے مغرب میں یہ باغ کسی زمانے میں دیکھنے کے قابل تھا مگر مدتیں ہوئیں کہ اُجڑ گیا چپے چپے پر نہر اور حوض تھے یا اب سارے شہر میں ڈھونڈنے سے بھی نہر کا کھیت نہیں ملتا۔ بہادر شاہ نے اس نہر کے جانب غرب قطب صاحب کے جھرنے کے طور پر نراسنگ سُرخ کا بنایا تھا اور اسی باغ میں ایک درگاہ قدیم شریف کی بھی تھی۔ مگر اب نظریں چو طرف ان مقامات کو ڈھونڈتی ہیں اور کہیں نہیں پاتیں۔ اس درگاہ کا حوض سنگ مرمر کا اب قلعہ کے عجائب خانے میں ہے[1]

ظفر محل یا جل محل سنہ ۱۸۴۲ء

اس حوض کے بیچوں بیچ میں ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ نے یہ محل سر سے پا تک سنگ سرخ کا بنایا۔ جس کا ایک درجہ ہے اور چاروں طرف غلام گردش کے طور پر مکان اور کونوں پر حجرے اور چاروں ضلعوں میں نشیمن ہیں اور ایک طرف اس مکان میں آنے جانے کا پُل بنایا تھا۔ اس پُل کا تو اب نشان بھی نہ رہا اور دالان کی چھت بھی گر گئی ہے۔ یہ مقام عرصہ دراز تک فوج کا "سوئمنگ باتھ" یعنی تیرنے کا حوض رہا۔

باؤلی

یہ باؤلی حیات باغ کے مغرب میں پریڈ گرونڈ پر بنی ہوئی ہے۔ ہشت پہلو ہے جس کا قطر ۲۱ فٹ ۔ ۶ انچ ہے اور عمق ۴۳ فٹ ۔ ۰ انچ ہے۔ اور اسی کے پاس ایک تالاب بیس فیٹ مربع ہے۔ ۲۷ فٹ × ۶ انچ کی گہرائی پر شمالی دیوار میں ایک محراب ہے جس میں سے باؤلی میں پانی آتا ہے۔ اور کچھ ایسا حساب رکھا ہے کہ تالاب میں ایک ہی لیول پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ یہ حوض تیرنے کے واسطے بنایا ہے۔ تالاب کے شمال اور مغرب میں سیڑھیاں ہیں اور دونوں طرف کمرے بھی بنے ہوئے ہیں۔ اب باؤلی اور تالاب دونوں پر جست کی چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ اب اسی باؤلی اور تالاب سے قلعہ کے موجودہ باغوں کو پانی پہنچتا ہے۔ باؤلی اور تالاب دونوں کے گرد آہنی کٹہرا لگا دیا ہے۔

مسجد ۵۷-۱۸۳۷ء

اس مسجد کا کوئی خاص نام نہیں ہے۔ چھتہ چوک کے شمال میں ہے اور اب سپلائی اور ٹرانسپورٹ کے احاطے میں آ گئی ہے۔ مسجد ۲۴ فٹ ۔ ۴ انچ × ۱۱ فٹ ہے

[1] یہ حوض عرض و طول میں ۴ فٹ ۲ انچ اور ۲ فٹ گہرا ہے اس پر یہ کتبہ ہے "آب قدم شریف محمد رسول اللہ" جو زمانہ اکبر شاہ ثانی کا بنا ہوا ہے

اور بہادر شاہ ثانی کی بنائی ہوئی ہی۔ اس مسجد کا صحن نہیں۔ مسجد کی چھت مسطح اور دالان میں اور پانچ در ہیں۔ اب اس مسجد میں سپلائی اور ٹرینسپورٹ کا گودام ہی۔

تسبیح خانہ خواب گاہ بڑی بیٹھک

حمام خانہ شاہی کے برابر اور دیوان خاص کے جنوب میں از سرتا پا سنگ مرمر کے بنے ہوئے چند کمرے ہیں جن کے بیچ میں سے نہر دواں ہی۔ ان کمروں اور دیوان خاص کے درمیان سنگ مرمر کا ایک چبوترا ۶ ہاتھ چوڑا ہی۔ تسبیح خانہ۔ خواب گاہ بڑی بیٹھک سب ایک ہی عمارت میں ہیں۔ تسبیح خانے کے تین کمرے دیوان خاص کے سامنے ہی ہیں جن کے پیچھے اور تین کمرے خواب گاہ کے نام سے موسوم ہیں اور خواب گاہ سے ملا ہوا ہال جو خواب گاہ کی چکلان سے آدھا ہی بڑی بیٹھک یا توشک خانہ کہلاتا ہی۔ یہ تینوں عمارتیں ملاکر دیوانِ خاص کے برابر ہیں۔ اس چبوترے پر کہ عقب ہی خواب گاہِ معلی کا ایک دالان بنا ہوا ہی جو تسبیح خانہ کہلاتا ہی۔ کبھی کبھی جب خلوت کرنی منظور ہوتی ہی یا دربار امراے مخصوص کا ہوتا ہی تو حضور والا یہاں بھی برآمد ہوتے ہیں۔ اس دیوار کے بیچ میں سنگ مرمر کی میزان بنی ہوئی ہی اور وہاں **میزانِ عدل** لکھا ہوا ہی اور تاروں کے جھرمٹ میں سے چاند نکلتا ہوا دکھلائی دیتا ہی اور بہت سا سنہری کام کیا ہوا ہی۔ یہ میزان کیسے عمدہ موقع سے بنائی گئی ہی جا جو شخص میزانِ عدل الٰہی کی یاد دلاتی ہی کہ بروز قیامت بادشاہ و غریب سب برابر ہوں گے اور سب کے اعمال تولے جائیں گے۔ اسی طرح بادشاہ کو جو ظلِ اللہ فی الارض ہی لازم ہی کہ انصاف کو کبھی ہاتھ سے نہ دے اور جو کام کرے میزانِ عدالت میں جانچ تول کر کرے۔ اسی تسبیح خانے میں سے خواب گاہ کا رستہ ہی جو **خاصی ڈیوڑھی** کہلاتی ہی۔ اُن سب کمروں میں بیش قیمت رنگ برنگ کے پتھروں کی پچیکاری کا کام تھا۔ اصلی پتھر تو لوگوں نے سب نکال لیئے اب اُن گڑھوں میں جو رنگ بھر دیا گیا ہی وہ بھی صیمت ہی۔ بیچ کے کمرے کی شمالی اور جنوبی دیوار کے دروازوں میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں اور گرداگرد جارے کے سعد اللہ خاں وزیر شاہ جہاں کے شہرۂ آفاق تاریخی کتبے سونے کے پانی سے حسب ذیل لکھے ہوئے ہیں۔

کتبۂ محراب جنوبی

سبحان اللہ ایں چہ منزلہاست رنگین۔ و نشیمن ہاست دلنشیں۔ قطعۂ بہشت بریں۔ چوں گویم کہ قدسیان ہمت بلند تماشایش آرزو مندند۔ اگر ساکنان اطراف و اکناف بسان بیت العتیق بطوافش آیند رواست۔ و دیگر نظارگیان نقش

و آفاق شمل حجر اسود بہ تقبیل آستان رفیع الشانش شتابند سنرا - آغاز قلعۂ والاکہ از کاخ گردون برتر است در شکست سدِ اسکندر - و ایں عمارت دل کشا و باغ حیات بخش کہ در منازل چوں روح در بدن است و شمع در انجمن - و نہر اطہر کہ آب صافیش بینا را آئینہ جہاں نما ست نمو داری از عالم غیب دہ کشا - و آبشار بالا ہر یک گوئی کہ سفیدۂ صبحدم است یا لوحۂ اسرار ز لوح قلم - و فوارہ کہ ہر کدامش نیجۂ نور ست -

کتبۂ محراب شمالی

بمصافحۂ آسمانیاں مائل بالا لی متلالی ست بانعام زمینیاں نازل و حوض کہ - ہمہ از آب زندگانی پر بصفا رشک نور چشمۂ خور - واز دہم ذوالحجہ سال جلوس دوازدہم اقدس مطابق ہزار و چہل و ہشت ہجری بعالمیاں نوید کامرانی داد و انجامش کہ بصرف پنجاہ لک روپیہ صورت پذیرفت بست و چہارم ربیع الاول سال بست و یکم جلوس ہمایوں موافق سنہ ہزار و پنجاہ و ہشت بفرقدوم میمنت لزوم گیتی خدیو گیہان خداوند بانی ایں مبانی آسمانی شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی در فیض بر روے جہانیاں بکشاد - ذیل کے اشعار سنہری تحریر کے ہیں :-

شہنشاہ آفاق شاہ جہاں - باقبال ثانی صاحبقراں - درایوانِ شاہی بعد احتشام چو خورشید بر چرخ باد امدام اساس ست تا ناگزیر ایں بنا - بود قصر اقبال او عرش سا - نو ہے دلنشیں قصر پیراستہ - بہشتے بصد خوبی آراستہ شرافت یکے آیہ در شان او - سعادت در آغوشِ ایوانِ او - چو × × × دریں سراے در کند × × × × از جبہ دور - بپایش سرِ صدق ہر کس کہ سود - چو دریاے چوں آبروئش فزود - زمانہ چو دیوار او برفراشت - بہ پیش رخ مہر آئینہ داشت مذہب روے دیوارش آراستست - ز نقاشِ چیں رونما خواست چناں بر سرش دستِ ایام کرد - کہ گردوں بلندی ازو وام کرد ز فوارہ و حوض و بالنشاں - بآب زمیں شستہ روے آسماں - چو جاے شہنشاہِ عادل بود - ازاں بادشاہِ منازل بود - اس شہ نشین کے آگے ایک بیچ در والان ہے نرا سنگِ مرمر کا پرچین کا نہایت نفیس گچ × ہے اور ادھر ادھر اس دالان کے بھی محرابیں ہیں - غربی حجرے میں سے دیوان خاص کو رستہ جاتا ہے جسے ڈیوڑھی خاصی کہتے ہیں - اس دالان کے بیچ میں ایک حوض ہے سنگِ مرمر کا کہ ایسا حوض نہ دیکھنے میں آیا نہ سننے میں - یہ حوض نہایت نفیس سنگِ مرمر کا بلا فوارے کے ہے جس کی تہ میں طرح طرح کے رنگین اور بیش قیمت پتھروں سے ہزار سعل گل بوٹے پتیاں بنائی ہیں اسی ہر پھول کی پنکھڑی میں ایک سوراخ رکھا ہے کہ جب

پانی چھوڑا جاتا تھا تو اُن سوراخوں میں سے فوارے چھوٹتے تھے۔ اِس حوض کی پچکاری میں ہزاروں
پنکھڑیاں ہیں اس واسطے اس کا خزانہ بہت اونچا رکھا گیا ہی۔ اب آپ اپنے تصور میں
اس لطف اور بہار کا اندازہ کریں جو ان فواروں کے چھوٹنے سے ہوتا ہی۔ کاریگر نے کیا
نادر صنعت رکھی ہی کہ سبحان اللہ۔ ع۔ جو بات کی قسم بخدا لاجواب کی۔ اس دالان کے
آگے صحن سنگ مرمر کا ہی اور نہر بہشت بہتی اور لہراتی رنگ محل میں چلی جاتی ہی۔ یہاں کے
مغربی رخ کے دو کمرے حال میں مغلیہ طرز قدیم پر اس غرض سے سجائے گئے ہیں کہ لوگ اُن کو
دیکھ کر اس زمانے کی طرز ماند و بود کا اندازہ کر سکیں۔ ان میں کچھ پرانی زرنگار مخملی مسندیں اور
تکیئے گھٹیا اوتی درجے کا فرش تلوار خنجر وغیرہ متفرق چیزیں ایک قرینے سے جا دی گئی ہیں جو بادشاہ
تو بادشاہ ایک معمولی درجے کے امیر کے لائق بھی نہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ قلعے کا چپہ چپہ دلہن
بنا ہوا تھا یا آج دو چھوٹے چھوٹے حجروں کے سجانے میں اس وقت کا سامان ہی۔ بات یہ ہی کہ
وہ سامانِ آرایش آج میسر نہیں آسکتا۔ ان کمروں میں صرف ایک چیز البتہ نادار اور قابل قدر ہی
جو شاہجہاں کی خاص تلوار آبدار ہی جس کے قبضے پر طلائی خط میں کندہ نام باری تعالیٰ کے تلوار
کی پشت پر شاہجہاں کا نام مع القاب شاہی کے ہی باقی ایک چیز بھی ایسی نہیں۔ جسے شاہان
اولوالعزم سے منسوب کیا جا سکے۔

برج طلا یا مثمن برج یا خاص محل

سنہ ۱۰۴۸-۱۰۵۸ھ
۱۶۳۹-۱۶۴۸ء

خواب گاہ کی مشرقی دیوار سے ملا ہوا دریا کی جانب ایک
گنبد دار برآمدہ ہی جس کی تعریف میں برنیر نے باوجودیکہ خود
کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا بہت کچھ لکھا ہی۔ "خواجہ سرا مثمن برج
کی تعریف میں بہت کچھ مبالغہ کرتے ہیں جو لب دریا ایک
چھوٹا سا برج ہی جس پر طلائی پتروں کا خول اُسی طرح کا چڑھا ہوا ہی
جیسے کہ آگرے کا گنبد ہی۔ اس کے لاجوردی رنگ کے کمرے۔ لاجوردی اور سنہری کام کی عمدہ
نقاشی سے آراستہ ہیں جن میں بڑے بڑے شان دار آئینے لگے ہوئے ہیں۔" یہ ایک
ہشت پہلو کمرہ ہی جس پر گنبد ہی۔ کسی زمانے میں سارے گنبد پر تانبے کا خول چڑھا ہوا تھا
جس پر سونے کا ملمع تھا اب تو اس پر سفید استرکاری ہوئی دی ہی۔ اس کمرے کے تین
کونے تو خواب گاہ میں آ گئے ہیں اور پانچ کونے لب دریا ہیں۔ جن میں سے چار میں
سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں اسی قسم کے مثمن برج آگرے اور لاہور کے قلعوں

میں بھی بنے ہوئے موجود ہیں۔ یہ بطور جھروکے کے استعمال ہوتے تھے جہاں بادشاہ روزانہ برآمد ہو کر اپنی رعایا برایا کو جو نیچے میدان میں منتظر جمالِ مبارک رہتی تھی اپنا درشن دکھلاتے تھے۔ مثمن برج کا اصلی گنبد تو اب رہا نہیں۔ یہ جو گنبد اب ہے غدر کے بعد کا بنا ہوا ہے۔ اصلی گنبد اور طرح کا تھا اور اس پر طلائی پتروں کا خول چڑھا ہوا تھا۔ مثمن برج کی غرب رویہ دیوار پر یہ کتبہ ہے

اے بند پا و قفل بر دل ہشدار	وی دوختہ چشم و پاے در گل ہشدار
عزم سفر مغرب در مشرق رو	ای راہ روِ پشت بمنزل ہشدار

جھروکہ
۱۲۲۳ھ
۱۸۰۸-۹ء

جھروکہ عمارت ہے اس برآمدہ نما مکان سے جس میں دریا کی ریتی کی جانب کھڑکیاں ہیں اور کچھ تماشہ وغیرہ بادشاہ کو ملاحظہ فرمانا ہوتا ہے یہیں برآمد ہو کے ملاحظہ فرماتے ہیں۔ یہ ایجاد اکبر بادشاہ کی ہے اور درشنی کہلاتے تھے۔ چوں کہ اکبر کے زمانے میں ہندوؤں کا غلو تھا اور جو مقربانِ شاہی تھے وہ بندگانِ خاص اکبری کہلاتے تھے اُن کا یہ قاعدہ تھا کہ جب تک بادشاہ کی صورت نہ دیکھ لیتے تھے اور بادشاہ کی ڈنڈوت نہ کر لیتے تھے بات نہ کرتے تھے اس واسطے بادشاہ ہر روز صبح کے وقت درشنی میں جا کر جلوہ افروز ہوتے تھے اور اُن بندگانِ خاص کو اپنا درشن دکھلاتے تھے۔ اکبری دور کے بعد یہ طریقہ موقوف ہوا اس وقت اس کا نام جھروکہ رکھا گیا اور سیر و تماشا گاہ موقوف ہوئی۔ کہتے ہیں کہ شاہ جہاں کے زمانے تک یہ طریقہ جاری تھا اورنگ زیب نے موقوف کر دیا۔ مثمن برج سے ملا ہوا بلکہ اس کے پانچویں ضلع کے سامنے یہ مسقف برآمدہ اکبر ثانی نے بنوایا تھا جس کی چھوٹی سی برجی بنگالی طرز کی خمیدہ وضع کی ہے۔ اس جھروکے کی محرابوں پر یہ کتبہ ہے:۔

ثنا و حمد سزاوار مالک الملکے	کہ کرد بادشہ دہر اکبر شاہنشہ
کز آب و جد شہ ابن شہ ست تا تیمور	جہاں پناہ ملک بارگہ ستارہ سپاہ
معین دین و ابو النصر اکبر غازی	شہ جہاں و جہانگیر عہد ظل اللہ
بسوے برج مثمن ز نو مرتب ساخت	نشیمنے کہ برو چشم دوخت مہر و مہ
بسید الشعرا کرد حکم تاریخش	کہ بر سفید بماند نوشتہ حرف سیہ
نوشت مصرعۂ تاریخ ایں بنا سید	بروے نشیمنے عالی اساس اکبر شہ
	۱۲۲۳ھ

یہ بات بڑی فخر و مباہات کی ہے کہ مدتوں سے یہ جھروکہ بے مکین کے تھا۔ دربار تاجپوشی ملکِ معظم جارج پنجم ادام اللہ اقبالہم کے جشن کے زمانے میں ملک معظم و ملکہ معظمہ اسی جھروکے میں برآمد ہوئے اور ایک کثیر اژدحامِ خلائق کو جو بادشاہ کے دیدار کو ترستے ہوئے تھے اپنے دیدار پر انوار سے مشرف فرماکر صدہا سال کی مسدود شدہ درشن کی رسم کو تازہ کیا۔

خضری دروازہ

سنہ ۵۸-۸-۱۰۴۸ھ
۴۸-۹-۱۶۳۹ء

مثمن برج کے نیچے۔ چند سیڑھیاں اتر کر دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ مثمن برج کی تحتانی منزل درحقیقت اس دروازے کی ڈیوڑھی ہے جس میں کھڑکیاں بھی رکھی گئی ہیں یہ وہی دروازہ ہے جس کو کپتان ڈگلس صاحب نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو اس غرض سے کھلوانا چاہا تھا کہ وہ نکل کر دوبدو بلوائیوں سے دو دو باتیں کرکے اتمام حجت کرنی چاہتے تھے۔

سلیم گڈھ دروازہ

سنہ ۵۸-۸-۱۰۴۸ھ
۴۸-۹-۱۶۳۹ء

سلیم گڈھ کے محاذی قلعہ کی شمالی فصیل کے بیچ میں ایک دروازہ ہے جس کا کوئی خاص نام نہیں ہے اس دروازے سے شمال کی طرف تھوڑے فاصلے سے جہانگیر کا بنوایا ہوا وہ پل تھا جو ۱۰۳۱ھ ۱۶۲۲ء میں سلیم گڈھ میں جانے کے لیے بنوایا تھا اور جس کے کتبے کو ہم نے سلیم گڈھ کے بیان میں نقل کیا ہے سلیم گڈھ دروازے کے پاس قلعہ کی شمال شرقی فصیل میں ایک کھڑکی ہے اس کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ اس کھڑکی کا روکار سنگِ سرخ کا ہے جس کے اوپر کنگورا بنا ہوا ہے۔

رنگ محل یا امتیاز محل

سنہ ۵۸-۸-۱۰۴۸ھ
۴۸-۹-۱۶۳۹ء

دیوانِ عام کی پشت پر شاہجہاں کے عہد کا یہ سب سے بڑا اور عالی شان محل ہے جو شمال سے جنوب کی طرف ۱۵۳ گز ہے اور مشرق سے مغرب کی جانب ۶۹ گز۔ صحن اس کا نہایت وسیع تھا کہ اس میں نہریں جاری تھیں اور فوارے چھوٹتے تھے باغ لگا ہوا تھا۔ اب سب برباد ہو گیا اور اس صحن دلکشا میں سڈول سڈول مکان بن گئے۔ اگلے زمانے میں اس محل کے صحن میں ایک حوض تھا ۵۰ گز × ۸ گز اور پانچ فوارے اس میں چھوٹتے تھے اور ایک نہر تھی کہ اس میں (۲۵) فوارے تھے اور ایک باغیچہ تھا گز ۱۱۵ × ۱۰۰ اور اس کے گرد سنگ سرخ کا مجر تھا جس پر دو ہزار سنہری کلسیاں چڑھی ہوئی تھیں اور تین طرف اس صحن کے ستر گز کے عرض کا مکان دل کشا اور ایوان ہائے دلربا بنے ہوئے تھے اور دریا کی طرف پائیں باغ اور امتیاز محل کی عمارت ہے جس کی تعریف لکھنا قوت بشری سے خارج ہے۔ شکل و صورت اس کی باہر سے اس طرح ہے
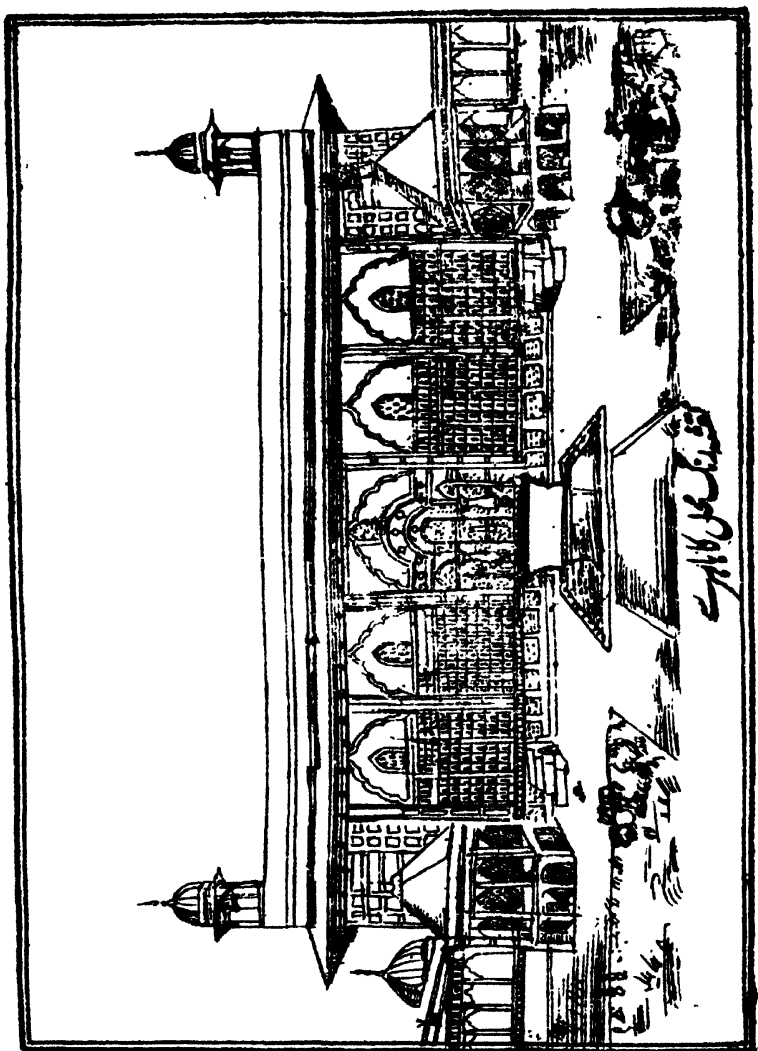
کر کرسی دے کر ایک چبوترہ بنایا ہے جس کے نیچے دو وسیع تہ خانے ہیں نہایت نفیس۔ اس چبوترے پر پنج درہ تہرا دالان بنایا ہے گنبد ہشت پہلو۔ بیچ کے در کے سامنے صحن کی طرف ایک حوض ہے سنگ مرمر کا بہت بڑا ایک پتھر کا نہایت مضبوط جس میں ڈیڑھ گز کی اونچائی سے تین گز کی چوڑی چادر پڑتی ہے اور اس میں سے اُبل کر نیچے کے حوض میں آتی ہے اور وہاں سے نہریں بہتی اور صحن کے حوض میں جا کر باغیچہ کے ہر ہر روش اور پٹری میں بہتی تھی۔ روکار اس محل کا تمام سنگ مرمر کا تھا اور وہ عمدہ محرابیں اور مرغولیں بنائی ہیں اور وہ منبت کاری کی ہے کہ آدمی کی عقل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ محل کی چھت کے چاروں کونوں پر چار چوکھنڈیاں بنائی ہیں کہ اُس سے رفعت اور شان اس مکان کی دوبالا ہو گئی ہے۔ اس محل کے کونوں پر چار بنگلے سنگین بنے ہوئے تھے تاکہ گرمیوں میں خس کی ٹٹیاں لگا کر خس خانہ بنا لیے۔ غور کیجیے کہ جب یہ سب نہریں جاری ہوں گی اور حوض چھلکتے ہوں گے اور فوارے چھوٹتے ہوں گے اور خس خانہ طیار ہوگا اور ٹٹیوں پر پانی چھڑکا جاتا ہوگا اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہوگی تو کیا عالم ہوگا اور اس کو بہشت بریں کا ایک ٹکڑا کہنا کیا بے جا ہوگا غرض اس کی خوبیوں کا بیان کیا ہو سکتا ہے۔ یہ حال تو اس محل کے صحن اور بیرونی شکل کا تھا لیکن اندر اس محل کے اس سے بھی زیادہ عجائبات اور نوادرات تھے۔ اس محل کے اندر بنانے والے نے عجیب عجیب طرح کی کارسازیاں اور نیرنگیاں کی ہیں۔ ایک طلسمات کا عالم ہے جو دیکھنے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح کہ اس کے روکار میں پانچ در بنائے ہیں اُسی طرح اس کے اندر بھی محراب دار در ہیں۔ محرابیں اس ترکیب سے بنائی ہیں کہ بیچ میں ایک چوکھنڈی سی بن گئی ہے۔ اُس میں ایک حوض ہے جو اس خوب صورتی سے بنایا ہے کہ ایک کھلا ہوا پھول معلوم دیتا ہے۔ اس کی پنکھڑیاں ایسی خوب صورت ہیں کہ حیطۂ بیان سے خارج۔ رنگ برنگ کے پتھروں سے وہ منبت کاری اور پچیکاری کی ہے اور وہ گل بوٹے پھول پتے بنائے ہیں کہ نگار خانۂ چین کو مات کیا ہے۔ یہ حوض ساڑھے سات گز مربع لیکن عمق بالکل کم رکھا ہے بعینہ مثل کفِ دست دلبراں معلوم دیتا ہے اس میں خوبی یہ ہے کہ جس وقت پانی بھرتا اور لہراتا ہے تو تمام بیل بوٹے اس حوض کے ہلتے دکھائی دیتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک باغ ہے جس میں ہزاروں طرح کے گلہائے رنگا رنگ کھلے ہوئے ہیں۔ حوض کے اندر ایک کاسۂ سنگ مرمر کا کمر کی ایسا نادر بنایا ہے اور اس میں منبت کاری اور پرچین سازی کا وہ کمال دکھایا ہے کہ دیدہ شنیدہ بالکل پھول کی شکل ہے اُس کے ہر ایک مرغولہ اور مرغول پر رنگین پتھروں سے گل بوٹے اور بیل پتے بنائے ہیں کہ پھول میں بیل اور بیل میں سے

پھول نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُس پیالے میں ایک سوراخ ہی اور ایک نہر پوشیدہ
ملے تلے آئی ہی اور اُس پیالے میں سے اُبلی ہی۔ پیالے کے لبوں پر سے پانی کا گرنا اور
اُس حجابِ آب میں سے گل بوٹوں کا لہراتا ہوا دکھائی دینا کیا طلسمات سے کچھ کم ہی۔ نہرِ بہشت
جو موتی محل اور دیوان خاص میں سے ہوتی ہوئی آئی اس محل کے نہ بیچوں بیچ سے گزری
ہی اور جنوب کی طرف بہتی ہوئی چلی گئی ہی اور جانب شرق اُس حوض میں جو صحن کی طرف مکان
کے سامنے رکھا ہی چادر ہو کر گرتی ہی۔ ہر ایک نہر میں منبت کاری اور پرچین کاری کا وہی
حال ہی جو جا بجا اوپر لکھا جا چکا ہی۔ یہ محل اجارے تک اور اُس کے پایہ نا ستون اور محرابیں سب
سنگِ مرمر کی ہیں اس میں پچیکاری کی ہوئی ہی۔ علاوہ اس کے ہر در و دیوار پر سونا لپا ہوا ہی اور
اور سونے کے کام کے گل بوٹے بنے ہوئے ہیں کہتے ہیں کہ اس محل کی چھت نقری
چاندی کی تھی۔ فرخ سیر کے وقت میں کسی ضرورت کے سبب وہ چھت اُکھاڑی گئی اور اُس
کے بدلے تانبے کی چھت چڑھا دی اور پھر محمد اکبر شاہ ثانی کے وقت اُس تانبے کی چھت کو
بھی اُکھاڑا اور کاٹ کی چھت لگائی گر وہ بھی اب بوسیدہ ہو گئی ہی۔ اس محل کے پہلو میں حجرے
بنے ہوئے ہیں جن کے بعد جانب جنوب چھوٹی بیٹھک نام کا ایک مکان ہی۔ پچھلے سو سال
کے اندر اندر خاص کر اس محل کو بے غوری اور کس مپرسی کی وجہ سے بہت نقصان پہنچا ہی۔
بہت دنوں تک اس میں میس روم رہا ہی۔

سنگِ مرمر کا حوض

جس کا ذکر اوپر آیا ہی سنگ مرمر کے بالکل بے جوڑ پتھر میں مع
پایوں کے تراشا ہوا ہی جو شاہجہاں کے وقت میں مکرانے کی
کان سے لایا گیا تھا۔ یہ حوض ۷ فٹ ۔ ۲ انچ لمبا ۔ ۹ ۲/۱ فٹ چوڑا ۔ ۲ فٹ ۔ ۱۰ انچ عمیق ہی۔ یہ حوض چار مربع
سنگ مرمر کے پایوں پر کھڑا ہی۔ اتنا بڑا پتھر اور ایسا بے جوڑ حوض شاید ہی کہیں اور ہو تو ہو۔
اس کی حقیقت یہ ہی کہ مکرانے کی کان سے نکالا گیا صفائی اور شفافی میں یہ بڑا بھاری ڈھیم
بے نظیر تھا۔ شاہی حکم کی بنا پر حوض تراشا گیا اور بن کر طیار ہوا تو مکرانے سے جو دلی سے دو سو
کوس ہی نہایت حفاظت اور احتیاط سے لایا گیا اور قلعے کے موتی محل میں رکھا گیا غدر
کے بعد سے یہ گوہر بے بہا بھی گردش میں آیا اور ناقدری کے ہاتھوں ملکہ کے باغ
میں لاکر رکھ دیا گیا۔ غنیمت ہی کہ گھن اور ہتوڑے کی ضرب سے پاش پاش نہیں
کیا گیا ۱۹۱۱ء میں خدا خدا کر کے رنگ محل کے سامنے رکھوا دیا گیا بعض روایات

نقشہ رنگ محل کا اندر سے

نقشۂ شاہ برج
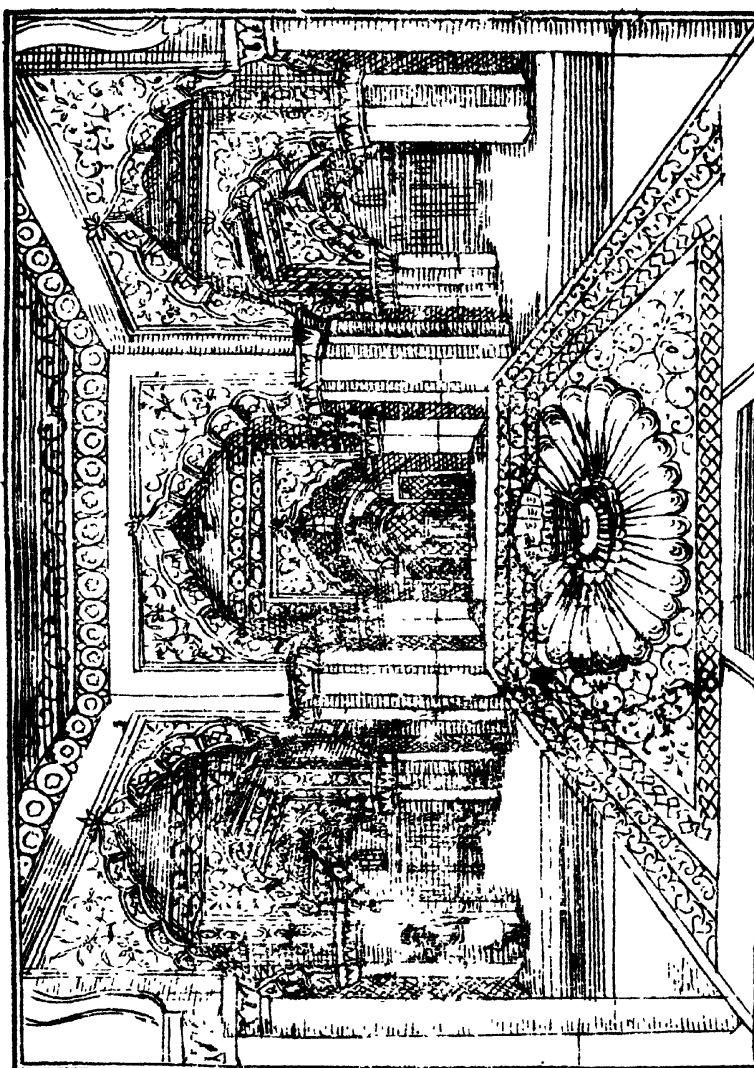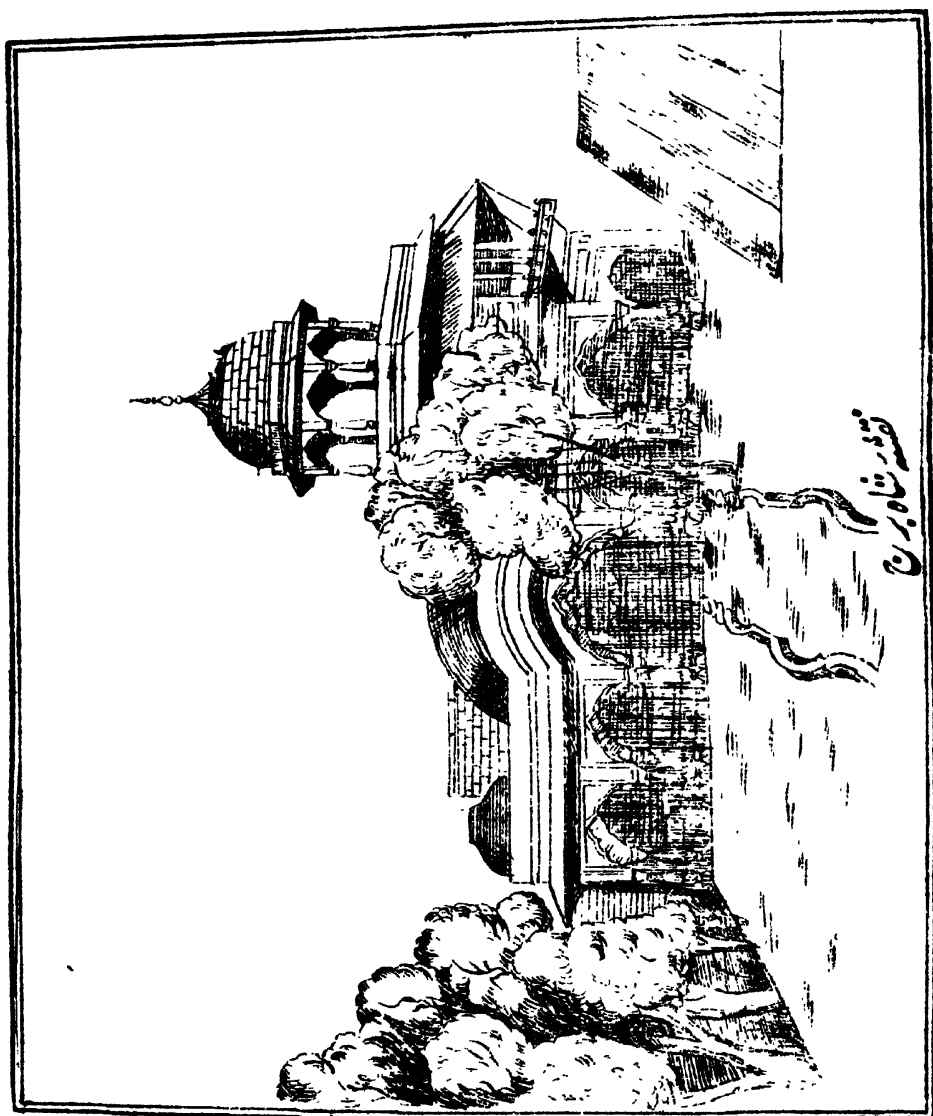
میں یہ بھی ہو کہ یہ حوض موتی محل کے سامنے حیات بخش باغ کے مشرقی دالان کے بیچ میں رکھا ہوا تھا۔ خدا معلوم صحیح بات کون سی ہو۔

دریا محل

رنگ محل اور امتیاز محل کے پاس اس نام کا ایک محل مشرف بدریا تھا۔ یہ محل بدرجۂ غایت آراستہ و پیراستہ تھا جس کے سامنے دریا کی طرف ایک سائبان نکلا ہوا جس میں ایک پرندگی نہایت خوب صورت شکل بنی ہوئی تھی۔ نہیں معلوم ہوسکتا کہ یہ عمارت کس نوعیت کی تھی مگر غالباً اسی وضع قطع اور اسی مال مسالے کی ہوگی جیسے کہ دوسری عمارتیں ہیں۔ اب اس محل کا نام و نشان تک نہیں رہا۔ میں نے غلط کہا نام تو اب بھی باقی ہو مگر نشان البتہ نہیں رہا۔

چھوٹی بیٹھک یا خورد جہاں (یا چھوٹی دُنیا)

امتیاز محل کے جنوب میں یہ بھی ایک عمارت تھی جو قرینہ بڑی بیٹھک کر کے مشہور تھی۔ یہ عمارت بھی قلعے کی دوسری عمارات کی طرح نہایت خوشنما تھی لیکن مرزا جہاں گیر بہادر نے اس میں تصرفات جدید کیے تھے جس سے شاہجہانی طرز باقی نہ رہا تھا۔ اب یہ عمارت موجود نہیں ہو۔ دریا کی طرف محلات میں سب سے اخیر یہی تھا۔ وجہ تسمیہ اس کی معلوم نہیں ہوتی۔ چوں کہ اس میں پھول باغ اور انواع و اقسام کے نوادر درخت تھے ممکن ہو کہ دنیا میں چھوٹا سا نمونہ باغ جنت کا دکھلایا ہو۔ نہایت افسوس ہو کہ اب اس کا پتہ و نشان تک نہیں رہا۔ خوش نما روشیں گھنے سایہ دار درخت اور منڈوے۔ فوارے۔ آبشار۔ سرد خانے بارہ دریاں۔ مصفا چبوترے۔ جا بجا چھڑکاؤ۔ سبزہ زار۔ فرش زمردیں کے تختے بچھے ہوئے۔ جدھر نگاہ اٹھاؤ سرسبزی اور بہار۔ خوشبو سے معطر۔ دلّی کی گرمی اور لو جس میں آفتاب کی تمازت سے آدمی سر سے پا تک پسینے میں شرابور ہو جاتا ہی۔ یہاں آکر دم میں دم آجاتا تھا۔ تاہم کچھ لوگ اس خیال کے بھی ہیں کہ یہ دولت لٹانے کے سارے فضول ڈھکوسلے اور امیری چوچلے تھے جن سے سوائے اسراف کے کچھ فائدہ نہ تھا اچھا ہوا کہ یہ سب سامان عیش و عشرت مٹا دیا گیا۔ لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ آخر یہ دولت اور زر ادھر ہی پھر کر جاتا کہاں تھا۔ اس سے ہزاروں آدمیوں کی روزی چلتی تھی اور اُن کے پیٹ پلتے تھے۔ صدہا کارخانے زردوزی۔ شال بافی۔ پارچہ بافی۔ تصویر و مرقعہ سازی اور اسی قسم کی ہزارہا دست کاریوں کے تھے جن کے بند ہونے کے معنی

یہ ہیں کہ لوگوں کا رزق بند ہوگیا۔ پیشہ ور لوگ۔ دستکار اور صناعوں کی موت آگئی۔ کیوں کہ ان چیزوں کے خریدار اور قدرداں اُٹھ گئے نتیجہ یہ کہ ؏ آں قدح بشکست داں ساقی نماند۔ مسٹر گارڈن رشلی ہرن اپنی کتاب دلی کے سات شہر کے صفحہ ۱۶۱ پر کہتے ہیں کہ "اگر وہ پرانا زمانہ (یادش بخیر) پھر کسی طرح آجائے تو دلی والوں کے نصیب جاگ جائیں اور روپیہ پانی کی طرح بہنے لگے"۔

ممتاز محل
۱۰۴۸-۵۸ھ
۱۶۳۹-۴۸ء

اب جس میں آثار قدیمہ کا عجائب خانہ ہے۔ شمال سے جنوب ۳۸ء مشرق سے مغرب ۱۰۰ء اس کا شمار پہلے بڑے محلات میں تھا۔ غدر کے بعد اسے قیدخانے کا کام لیا اور ابھی چند سال پیشتر تک سارجنٹوں کا میس ہاؤس تھا۔ اس کی چھت کے چاروں کونوں پر سنہری چھتریاں تھیں وہ اب نہیں رہیں لیکن اُس تصویر سے جو عجائب خانے میں قلعہ کی مشرقی دیوار کی محفوظ ہے اس محل کی اصلی ہیئت معلوم ہوتی ہے۔ ۱۹۱۱ء میں اس عمارت کی اس حد تک مرمت ہوئی کہ اب اصلی حالت باقی نہیں رہی۔ اس کا چھجا بھی از سر نو بنا ہے۔ دیواریں اجارے تک اور فیل پایوں کا حصہ زیرین سنگ مرمر کا ہے۔ دیواروں پر پچیکاری اور آئینہ بندی تھی جس کی علامات اب تک موجود ہیں۔

اسد برج
۱۰۴۸-۵۸ھ
۱۶۳۹-۴۸ء

قلعے کے جنوب و مشرق کونے میں ایک بہت بڑا برج ہے اس میں اب فوجی عہدہ دار رہتے ہیں۔ جب ہرناتھ چیلے نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر تاخت کی تھی تو اختر لونی (Ochterlony) نے بڑی دلیری سے اس کو پسپا کیا تھا۔ اس برج کو اس معرکے میں بہت نقصان پہنچا تھا لیکن اکبر شاہ ثانی نے اس کو دوبارہ بنوایا اور جیسا تھا ویسا ہی ہوگیا۔

بدر رو دروازہ
۱۰۴۸-۵۸ھ
۱۶۳۹-۴۸ء

قلعے کے جنوب و مشرق کے کونے میں اسد برج کے پاس ہے اس دروازے کے سامنے بھی گھوگس بنا ہوا ہے جو غالباً اورنگ زیب ہی نے بنوایا ہوگا۔

شاہ برج
۱۰۴۸-۵۸ھ
۱۶۳۹-۴۸ء

قلعے کے تین مشہور برجوں میں سے آخری برج یہی ہے۔ یہ برج دریا کی طرف حمام سے تھوڑی دور قلعہ سلیم گڑھ سے ملا ہوا امیر محل کے شمال مشرق کے کونے میں ہے۔ یہ برج سہ منزلہ تھا اور دریا پار سے اس کا نظارہ بہت خوشنما معلوم دیتا ہے۔ ۱۷۸۴ء میں شاہ عالم ولی عہد جواں بخت اپنے باپ کے وزراء کی سختی سے تنگ ہوکر اسی برج پر سے پگڑیاں لٹکا کر بھاگا اور انگریزوں کے پاس لکھنؤ چلا گیا۔ یہ برج

شمالی بھی کہلاتا ہے۔ اب اس برج کی دو ہی منزلیں باقی رہ گئی ہیں۔ غدر میں گنبد اُڑ گیا۔
جنوب کی طرف کا سنگ مرمر کا برآمدہ خوب صورتی اور نفاست میں بے نظیر ہے مگر روز بروز
خستہ اور مرمت طلب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اورنگزیب کے زمانے ہی سے اس کی حالت خراب
ہو چلی تھی پھر اب کا کیا پوچھنا۔ یہ برج مشرق سے مغرب ۶۹ فٹ - ۲ انچ اور شمال سے
جنوب ۳۲ فٹ ہے۔ غدر کے بعد برسوں تک اس میں فوجی عہدہ دار رہا کرتے تھے سنہ ۹۱
میں اُن سے خالی کرا لیا گیا اور کچھ مرامت کرا کے اس کے گرد جو مکانات وغیرہ بنوائے
تھے، سب تڑوا دیئے گئے۔ اسی سال میں ایک زلزلہ آیا جس سے اس برج کی بنیاد تک
ہل گئی اور ساری عمارت کو اُتار کر از سر نو بنانا پڑا اس لیے اصلی حیثیت اور نفاست
کیوں کر باقی رہ سکتی ہے۔ اس برج اور حمام کے بیچ میں ۱۹۱۱ء میں ایک چبوترا بنا کر تختہ گھانس کا
لگا دیا گیا ہے۔ سنگ مرمر کے برآمدے کے پیچھے گنبد کے نیچے کے کمرے کی چھت پر
آئینہ بندی کا کام تھا۔ اس برج کے زمانۂ قدیم کے نقشے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے
کہ اس پر کی چھتری اب نہیں رہی یہ چھتری اُسی طرح کی تھی جیسی کہ اسد برج پر ہے کہتے
ہیں کہ یہ چھتری اُتار کر میرٹھ کو لے گئے پہلے اس برج کی یہ حالت تھی یہ برج بھی ایک
عجائب روزگار ہے قطر اس برج کا سو گز کا ہے اور تین طبقے ہیں۔ پہلے حصے کو زمین سے
بارہ گز کی کرسی دے کر بنایا ہے اور اس کی چھت اندر سے گول اور اوپر سے سطح ہے۔ یہ عمارت
تمام سنگین ہے اجارے تک تو سنگ مرمر ہے جس میں رنگ برنگ کے پتھروں کی
پچیکاری کی ہوئی ہے اور اجارے سے چھت تک سنگ پٹھانی ہے جس کو پالش کر کے
سفید کر دیا ہے اور سنہری گل بوٹے بیل پتے بنائے ہیں اور یہ درہ ہشت پہلو ہے اور
اس کا قطر آٹھ گز کا ہے اور اس میں چار طاق اور دو نشیمن نیم مثمن مشرف بدریا بنائے گئے
ہیں جن کا ردکار سنگ مرمر کا ہے۔ طول و عرض طاقِ شمالی اور مشرق کا چار۔ چار گز ہے اور
غربی اور جنوبی طاقوں کا طول چار گز عرض تین گز ہے اور مثمن درجے کے بیچ میں ایک حوض
ہے تین گز قطر کا نہایت خوش نما جس کی منبت کاری کی نفاست سے عقل حیران ہے۔ غربی
طاق میں ایک آبشار ہے اور چھوٹے چھوٹے محراب دار طاق بنائے ہیں کہ اُن میں دن کو
پھول اور رات کو چراغ رکھا کرتے تھے۔ اس آبشار کے آگے ایک حوض ہے سنگ مرمر کا
۴ ۳/۴ گز × ۲ ۱/۲ گز۔ اس حوض سے شرقی طاق کے کنارے تک ایک نہر ہے ڈیڑھ گز

عریض خالی سنگ مرمر کی بہت نفیس کہ جس پر نگاہ پھسلتی ہی۔ پرچین ساز اور منبت کار۔ یہ دونوں حوض بھی پرچین کار اور منبت کار ہیں جن میں عقیق و مرجان اور بیش قیمت پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس نہر میں سے ایک نہر نکل کر غربی حوض کے طاق میں پڑتی ہی اُس سے برج کی نہر میں آن کر مثمن حوض میں سے ہو کر شرقی طاق کی طرف بہتی ہی۔ اُس کے نیچے دریا کی طرف ایک آبشار بنی ہوئی ہی۔ سارے قلعے میں اسی مقام سے نہر گئی ہی اور ہر جگہ پانی جانے کے قلبے اسی برج میں بنے ہوئے ہیں اور ہر ہر قلبے پر نام لکھا ہوا ہی کہ یہ فلاں حوض یا فلاں نہر کا قلبہ ہی۔ دوسرے درجے کی عمارت بھی مثمن ہی نہایت مصفا آٹھ گز قطر کی جس کے آٹھوں ضلعوں پر چوبیس ستونوں کا سراسر ایوان ہی اور تیسرے درجے کی عمارت ایک نشیمن ہی گنبد نما جو آٹھ ستونوں پر استادہ ہی۔ اِس کا گنبد سنگ مرمر کا اور کلس سنہری ہی۔

نہر بہشت

شروع ۸-۵-۱۰۴۸ھ

۸-۴-۱۶۳۹ء

شاہ برج کے پاس سے یہ نہر نکالی گئی ہی جو تمام۔ دیوان خاص۔ خواب گاہ میں ہوتی ہوئی رنگ محل کو چلی گئی ہی۔ اس نہر کا ذکر خوابگاہ کے محراب والے کتبے میں ہی۔ نہر بہشت اسی کا نام تھا۔ نہر اطہر نام نہ تھا بلکہ نہر کا تعریفی لفظ ہی۔

پیویلین یا ایوان

شاہ برج کے شمال مغرب میں قلعہ کی شمالی فصیل کے پاس یہ ایک پیویلین ہی جو آخری دور مغلیہ کا بنا ہوا ہی۔ اس میں بہت کچھ رد و بدل ہوا ہی اور کچھ مکانات بھی بن گئے ہیں اب یہ فوج کی چارزوشی کا کمرہ ہی یہ پیویلین کس غرض سے بنایا گیا تھا کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہی کہ قلعے کے اس حصے میں شاہزادوں کی حویلیاں تھیں۔

ساون بھادوں

شروع ۸-۵-۱۰۴۸ھ

۸-۴-۱۶۳۹ء

یہ دونوں مکان بجنسہ ایک ہی طرح کے ہیں۔ ۸ فٹ ۔ ۸ انچ × ۴ فٹ - ۴ انچ ہی جو سرتاپا سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں اور باغ حیات بخش کے شمال میں جو مکان ہی وہ ساون کہلاتا ہی اور جنوبی بھادوں۔ وضع قطع یہ ہی کہ ایک چبوترہ کرسی دے کر بنایا ہی اور اس پر سولہ ستون لگا کر ایک ایوان دل کشا بنایا ہی جس میں دو ایوان شرقاً اور غرباً ہیں اور دو جنگلے ہیں ان کے آگے اور پیچھے کہ ان ستونوں کے سبب

شاہ برج

نقشۂ ساون

بیچوں بیچ ایک چوکھنڈی سی بن گئی ہے اور اس میں ایک حوض سنگِ مرمر کا چار گز پندرہ تسو
مربع اور ڈیڑھ گز گہرا ہے۔ اس مکان میں نہر بہشت آتی ہے۔ اور حوض میں چادر ہو کر پڑتی ہے اور
نہر اس میں سے نکل کر آگے ایک اور چادر چھوٹتی ہے اور نہر میں پڑتی ہے۔ یہ عمارت بھی بہت
نادر ہے اور اس میں پانی کا پڑنا اور چادر کا چھوٹنا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا بھادوں کا مینہ
برستا ہے اور اسی سبب سے اس کا نام بھادوں رکھا ہے۔ اب اس مکان میں پانی آنے کا اور چادریں چھوٹنے کا رستہ
بالکل بند ہو گیا ہے۔ اس مکان کے حوض اور چادروں میں محرابی چھوٹے چھوٹے طاق بنا دیئے ہیں کہ دن کو ان میں
گلدان ہائے رنگین رکھے جاتے تھے اور رات کو شمع کافوری روشن ہوا کرتی تھیں کہ اس کے اوپر سے پانی کی
چادر پڑتی تھی اور اندر سے ان پھولوں کی خوش نمائی اور چراغوں کی روشنی عجیب عالم دکھاتی
تھی۔ اس کی چھت کے چاروں کونوں پر بھی چار برجیاں چوکھنڈی کی سنہری بنی ہوئی
ہیں۔ ساون کا مکان بھی بھادوں ہی کی طرح کا ہے اسی طرح اس میں بھی چادر بنی ہوئی ہے اور حوض
بھی ہے اور اسی طرح گل دان اور چراغاں رکھنے کو محرابی طاق بنائے ہیں۔ اس مکان میں
پانی کی آمد اور چادر کا پڑنا اور زور شور سے پانی کا بہنا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ساون کا
مینہ برس رہا ہے۔ چوں کہ ساون اور بھادوں دونوں مہینے موسمِ برسات کے ہیں
یہ دونوں مکان موسمِ برشگال کی پوری نقل ہیں۔ دس سال کے عرصے میں ان دونوں
مکانوں کی بہت کچھ مرمت کی گئی ہے اور حوض بھی از سرِ نو درست کیئے گئے ہیں۔

لال قلعہ اورنگ زیب کے عہد میں

شاہ جہاں کے بنائے ہوئے لال قلعے کا کمال عروج
اورنگ زیب کے زمانے میں تھا۔ قلعے کی مزید حفاظت
و استحکام کے لیئے اورنگ زیب نے لاہوری اور دلی دروازوں
سے آگے دمدمہ کا گھونگٹ بنوا دیا تھا علاوہ بریں قلعے کی متعدد سنگِ مرمر کی نفیس عمارتوں
اور ایک بے نظیر موتی مسجد کا اضافہ کیا۔ چوں کہ عالم گیر نے بعض مصالح ملکی کے لحاظ سے اپنے
والد ماجد شہاب الدین محمد شاہ جہاں کو کنج عبادت میں بٹھایا اور کار و بار سلطنت اپنے قبضے میں
لیا مشہور ہے کہ جب شاہ جہاں نے یہ بات سنی تو عالم گیر کو لکھا کہ "اے فرزند ارجمند تم نے قلعے کو
دلہن بنایا اور اس کا گھونگٹ نکالا" اورنگ زیب کے بعد سے گو پھر کسی بادشاہ نے کچھ بنایا ہو
نہیں تاہم اس کی عظمت و شان و شکوہ میں بھی کسی قسم کا انحطاط ہونے نہ پایا۔ ہم اس
مضمون میں قلعے کی وہ حالت ناظرین کو دکھلانا چاہتے ہیں جو اس کی تباہی اور بربادی سے

پہلے تھی۔ لاہوری دروازے سے ہم ایک لمبے وسیع چھتے میں داخل ہوتے ہیں جس کے
بیچ میں ایک بڑا بھاری روشن دان ہوا اور جس کی دونوں جانب ایک ایک پتلی سی گلی نکل
گئی ہے۔ سیدھی طرف کی گلی ایک باغ میں جا نکلتی تھی جس کے آگے عمارتوں کے دو بلاک
تھے۔ جن میں سے ایک سلسلہ عمارات کا جو جنوب کی طرف تھا دلی دروازے تک کچھ اوپر
تین سو گز تک چلا گیا تھا اور دوسرا قلعے کی مغرب رویہ فصیل سے مشرق کی طرف ۲۰۰
گز کا لمبا تھا۔ ان دونوں بلاکوں کی عمارتوں میں معمولی درجے کے عہدہ دار یا تو بود و باش رکھتے
تھے یا اپنی ڈیوڑھی پر رہا کرتے تھے۔ بائیں طرف کی گلی آگے بڑھ کر ایک وسیع شارع عام
میں جا نکلتی تھی جس میں سے اور گلیاں اور چوراہے پھوٹتے تھے۔ قلعے کی شمال رخ کی فصیل کے
جانب کا سارا میدان عمارتوں سے پٹا پڑا تھا جن میں کارخانجات (ورک شاپ) تھے جن کی
نسبت برنیر نے اپنے ایک دوست مانسر ڈی لاموہٹی لی ویر (Monsieur
de la Mohti le Vayer) کو یہ لکھا تھا۔ "قلعے میں اکثر جگہ
جو بڑی بڑی عمارتیں دکھلائی دیتی ہیں وہ سب کارخانہ جات ہیں جو کاریگروں اور اہل حرفہ
کی ورک شاپیں ہیں۔ ایک ہال میں زردوز اور کارچوب ساز ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے
ہیں ان پر ایک داروغہ مسلط ہے۔ ایک دوسری جگہ سنار ہیں جو زیور گھڑا کرتے ہیں تیسرے
قطعے میں نقاش چوتھے میں رنگ ساز۔ پانچویں میں لوہار۔ بڑھئی۔ خرادی۔ درزی۔
موچی وغیرہ وغیرہ۔ چھٹے میں زربفت۔ کمخواب۔ ریشمین پارچہ جات اور باریک ململ بننے
والے۔ ہمہ اقسام کے پارچہ باف جو پگڑیاں۔ سیلے۔ پٹکے۔ دوپٹے اور ہر طرح کے
پھول دار زنانے لباس کے لائق کپڑے بناتے ہیں جن میں سے بعض بعض ایسے باریک
نفیس اور نازک ہوتے ہیں کہ ایک دفعہ کے پہننے ہی میں مسک جاتے ہیں × × × × × ×
کام والے لوگ اپنے اپنے کارخانوں میں صبح گجر دم ہی اپنے کام سرآن لگتے ہیں اور
سارے دن کام پر لگے رہتے ہیں اور شام کے قریب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔"
چھتے سے ٹھیک پورب رخ پر نقار خانے کا صحن تھا اور جس کے احاطے کی مشرقی دیوار
سے ملا ہوا نقار خانہ تھا۔ ایک سڑک جو شمال سے جنوب کو جاتی تھی اُس کے بیچ میں
آجانے سے اِس وسیع صحن کے دو قطعے چھوٹے چھوٹے ہو گئے تھے۔ یہ سڑک جنوب
کی طرف ناک کی سیدھ قلعے کے دلی دروازے کو چلی گئی تھی اور شمال کی طرف اُس مشہور

باغ کو جاتی تھی جس کا نام مہتاب باغ تھا اور پھر وہاں سے قلعے کی شمالی فصیل کو جاتی تھی
یہ سڑک سات سو گز لمبی تھی جس کے متعلق برنیر نے حسب ذیل لکھا ہے۔ ناظرین کو یاد رکھنا
چاہیئے کہ برنیر اُس سڑک کا ذکر کرتا ہے جو نقار خانے کے صحن سے دلی دروازے کو گئی تھی۔
"قلعے کے دوسرے صدر دروازے سے ایک لمبی اور چوڑی سڑک نکلی ہے جس کے دو طرفہ
مکانات اور سامنے دکانیں ہیں۔ درحقیقت یہ ایک بازار ہے جس سے گرمیوں اور برسات
میں بڑا آرام ملتا ہے کیوں کہ سارے کا سارا بازار مسقف ہے یعنی لداوی چھتے سے پٹا ہوا ہے
جس میں ہوا اور روشنی کے لیئے جابجا بڑے بڑے روشن دان کھول دیئے گئے ہیں"
نقار خانے سے دیوان عام میں جانے کا رستہ تھا۔
دیوان عام کے شمال میں شاہی مطبخ تھا اور اسی طرف اُس سے اور آگے بڑھ کے
دو باغ مہتاب باغ اور حیات بخش نامی تھے۔ ان کے سامنے نہر دوڑتی تھی
جو سیدھی مشرق کی طرف شاہ برج کو جاتی تھی اور پھر آگے بڑھ کر قلعے کی شمالی
فصیل سے جا ملتی تھی۔ اس ٹکڑے میں شاہی اصطبل تھے۔ دیوان عام کے جنوب میں
محلات شاہی اور امراے عظام کے محلات کا سلسلہ تھا جو قلعے کی جنوبی فصیل پر
جاکر منتہی ہوتا تھا۔ برنیر لکھتا ہے کہ "ان دو شوارع کے سوا قلعے میں دائیں بائیں اور
بہت سے چھوٹے بڑے رستے ہیں جو امراے رکاب کے مکانوں کو جاتے ہیں۔
ان امرا کی باری ہفتے وار آتی ہے اور چوبیس گھنٹے برابر نشست رہتی ہے۔ ان امرا کے
مکانات بجاے خود شان دار محلات ہیں اور ہر امیر اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے کہ اس کے
مکان کی شان و شوکت اور آراستگی اپنے ہم پلے امراسے کسی طرح گری ہوئی نہ رہے اور
اُس کے تمامی مصارف خود برداشت کرتے ہیں۔ یہ مکانات عموماً وسیع اور مرتفع ہیں جن
میں کشادہ اور بڑے بڑے کمرے دالان اور خانہ باغ ہیں۔ باغوں میں حوض ہیں اور
چو طرف پانی کی نالیاں دوڑ رہی ہیں۔ حوض میں فوارے چھوٹ رہے ہیں" اگرچہ برنیر کو
محلات شاہی کے اندر باریابی کا کبھی موقع نہیں ملا تاہم اُس نے محلات کے لوگوں خواجہ سراؤں
وغیرہ سے سن سنا کر ان کے متعلق حسب ذیل لکھا ہے: "ان لوگوں کے بیانات سے
مجھے معلوم ہوا کہ شاہی محلات میں علحدہ علحدہ نہایت خوب صورت سجے سجاے کمرے
ہیں جو بہت وسیع اور شان دار ہر ایک بیگم کے مرتبہ و اعزاز اور تمول کے شایاں ہیں۔

ہر کمرے کے سامنے حوض اور آب رواں ہے اور ہر طرف خانہ باغ۔ دلکش چمن اور روشیں۔ سایہ دار درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔ پانی کی نالیاں۔ فوارے۔ جھرے۔ تہ خانے جن میں تمازت آفتاب سے پناہ ملتی ہے۔ اونچے اونچے کمرے اور برآمدے جن میں رات کو ٹھنڈک اور آرام ملتا ہے۔ ہیں۔ ان دل کش محلات کی چار دیواری کے اندر گرمی کی تکلیف بالکل محسوس نہیں ہوتی "۔ دیوانِ عام کے صحن کے شمال و مشرق کے کونے میں ایک محرابدار پھاٹک تھا جس میں سے ایک اور چھوٹے صحن میں رستہ نکلتا تھا۔ اس صحن کے احاطے کی مشرقی دیوار میں ایک اور دروازہ دیوانِ خاص میں جانے کا تھا۔ اسی صحن کے شمال میں موتی مسجد۔ شاہی حمام اور اسی سمت میں کچھ آگے بڑھ کر حیات بخش کا باغ اور شاہ برج اور نہر تھی۔ اس کے آگے پھر شاہی عمارات کا تانتا بندھا تھا برابر قلعے کی شمال رخ کی فصیل تک چلا گیا تھا۔ دیوانِ خاص کے عین جنوب و مغرب میں اور دیوانِ عام کے بالکل عقب میں امتیاز محل اور رنگ محل تھے قلعے کی جنوبی فصیل اور ان دونوں محلوں کے احاطوں کے بیچ میں جو جگہ ہے وہ ساری کی ساری شاہی محلوں سے بھری پڑی تھی اور انھیں عمارتوں کے ایک کونے میں اسد برج تھا ان ساری عمارتوں کا پیش جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں دریا کی طرف تھا۔

قلعہ کیا تھا اور کیا ہو گیا

ہر کو شک دیوان ہر ایک منزل عالی + عبرت سے بھرے اور مکینوں سے ہیں خالی
آقا نہ خداوند اہالی نہ موالی + خبر ذات خدا کوئی بھی وارث ہے نہ والی
یہ جملہ مکانات جو سنسان کھڑے ہیں + پتھر کا کلیجہ کیے حیران کھڑے ہیں

محمد شاہ کے عہد میں قلعے کی اندرونی عمارات میں بہت کچھ ردوبدل ہوا۔ دلی کے قتل عام کے بعد جو نادر شاہ نے کیا قلعے کی بے نظیر عظیم الشان عمارت جو اسلامی سلطنتوں کے معراج الکمال پر پہنچنے کی ایک قابل فخر یادگار تھی جو شایستہ مذاق۔ وسیع سلطنت اور بے انتہا تمول کی بدولت معرض ظہور میں آئی تھی کس مپرسی کی حالت میں پڑ کر تنزل پذیر ہونے لگی میلی کچیلی سڑی بسی چھونپڑیاں اور شاہی محل گڈ مڈ ہو گئے اور سب سے بڑھ کر طوفان بے تمیزی برپا ہوا کہ شاہجہاں نے جو بڑی عالی شان سر بفلک نادر روزگار عمارتیں بنا کر دارالسلطنت کو چمکا دیا تھا اور ان عمارتوں کے آس پاس کھلی جگہیں اس خیال سے چھوڑ دی تھیں کہ منظر پر نما ہو اور عمارتیں گھٹ نہ جائیں وہ سب مقامات بے موقع اور بے ہنگم مکانوں سے

گھیر لی گئیں گویا چاند کو گہن لگ گیا۔ عمارتوں کو نوچ کھسوٹ کر اُن دیواروں کو جن میں منہ دکھائی دیتا تھا میلا کچیلا بدروپ اور بے رونق کر دیا۔ جس کا کوئی محافظ و خبر گیر نہ ہو اُس کا یہ حال ہوا ہی چاہیے۔ تباہی اور بربادی کی نوبت اس حد تک پونچی کہ دیواروں اور ستونوں کی مٹی یوں پلید کی کہ سارا کام سونے کا کھرچ ڈالا۔ سارے قیمتی پتھر چُن چُن کر اکھاڑے گئے۔ شاہی عمارات اور نشست گاہیں جن پر آنکھ نہیں ٹھیرتی تھی اور جن کی صفائی پر نظر پھسلتی تھی اُن پر سالہا سال کی گرد کی تہیں پر تہیں جم گئیں۔ برآمدے سائبان کچھ گر گئے کچھ کھنڈر ہو گئے۔ جن لوگوں نے ان عمارتوں کی تعریفیں معتبر کتب تواریخ اور سیاحوں کے بیانات میں پڑھی تھیں اور جن کو شوقِ دید کشاں کشاں دور دراز مقامات سے یہاں لایا تھا وہ اس کس مپرسی اور بے دردی کے سین کو دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے اُلٹے منغص اور ملول ہو کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ ع۔ بہ شوق آمدہ بودم بہ حرماں رفتم۔

چنانچہ ایک سیاح فرینکلن نامی قلعۂ معلی کی تباہی اور بربادی کا چشم دید حال یوں لکھتا ہے۔

"اب جو عمارتیں بچ کھچ رہی ہیں اُن کی حالت نہایت تباہ اور ویران ہے۔ آداب و مراسم دربار شاہی جہاں تک ممکن ہے اور جیسے شاہجہاں کے عہد میں تھے اب بھی ملحوظ رکھے جاتے ہیں لیکن افسوس صد افسوس وہ شان و شوکت اور تموّل جو شاہانِ مغلیہ کا مابہ الامتیاز تھا اب کہاں باقی ہے۔ اُس زمانے میں حجروں اور برآمدوں میں مخملی اور کارچوبی فرش ہر طرف نظر آتا تھا۔ ستون سنہری اور رُپہلی کپڑوں میں لپٹے ہوئے جگمگاتے تھے اب اُن کی جگہ لکڑی کے کھمے اور (بہت ہوا تو) اُن پر سادہ کپڑا لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ چھتیں جن میں چاندی کے پتر جڑے ہوئے تھے اب وہاں چوبی تختے لگا کر (معمولی) رنگ پھیر دیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر ہر قدم پر یہ عیاں ہے کہ پہلے کیا کچھ تھا اور اب کیسی بدتر حالت ہے۔ نوبت باینجا رسید کہ اشرا کے (بے درد) ہاتھوں سے دیواریں تک بھی نہ بچ سکیں۔ اکثر دیواریں خصوصًا باغوں میں سنگِ مرمر کی مورتیں اور بڑے بڑے مقامات میں جو پچیکاری کا کام تھا جس میں سنگ سلیمانی۔ یشب۔ عقیق یاقوت اور ہمہ اقسام کے بیش قیمت پتھر تمام اکھاڑ کر لے گئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انگریزوں نے قلعے کی عمارتوں کو توڑ پھوڑ کر اپنی ضروریات کے مناسبِ حال بنا لیا۔ قلعے کی چار دیواری کے اندر اب (جا بجا) دو منزلہ بارگیں بن گئی ہیں۔ لاہوری اور دلّی دروازے۔ نقار خانہ۔ اسد برج اور شاہ برج کی عمارتوں میں

اب گورے رہتے ہیں۔

مسٹر فرگسن نے اپنی بیش بہا تصنیف "ہسٹری آف انڈین اینڈ ایسٹرن آرکیٹکچر" میں قلعے کو فوجی دارالاقامہ بنانے پر بہت کچھ برآشفتگی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے عہدہ داران فوجی عمارات کو عمداً منہدم کرانے کے عذر کو بالکل تسلیم نہیں کیا اور انھوں نے اس خیال کی بھی تضحیک کی ہے کہ دلی کی گھٹی ہوئی اور نہتی آبادی کی نسبت یہ واہمہ کہ وہ (کہیں ایسا نہ ہو کہ کبھی سر نہ اٹھا بیٹھے ایسی (فضول) بات ہے جو کبھی (کسی کے) خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی

موجودہ دلی یعنی شاہجہاں آباد

سنہ ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء

عراقی و خراسانی ز حد بیش + نہادہ پیش خود سرمایۂ خویش
فرنگی از فرنگستاں رسیدہ + نوادر از نبادر پیش چیدہ
نشستہ ہر طرف گوہر فروشے + برآوردہ ز دریا ہا خروشے
فتادہ ہر طرف صد لعلِ رخشاں + بود در ہر دکاں کانِ بدخشاں
برآید از برائے امتحانے + متاعِ ہفت کشور از دکانے

لال قلعے کی تعمیر کے دس برس بعد سنہ ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء میں شاہجہاں آباد کے شہر کی بنا پڑی جو عموماً اپنے قدیم نام دلی ہی سے زیادہ تر مشہور ہے۔ شہر بسانے کی تاریخ بیچی کاشی سے نکلی ہے۔ ع۔ شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد۔ آبادی کی شکل نصف دائرے کی ہے اور بعضوں کے نزدیک ایک بے قاعدہ ربع دائرے کی جس کے خطوط براست مشرق اور شمال کی طرف ہیں اور پولیر (Polier) نے لکھا ہے کہ آبادی کی شکل کمان کی سی ہے جس کی تانت کا سرا جمنا ہے اور شرقی رخ قلعے کو سمجھنا چاہیے شہر کی فصیل کا دور تقریباً ۵½ میل ہے۔ کرنل پولیر شہر کا دور دس میل بتلاتے ہیں فرینکلن نے سات اور کپتان آرچر نے پانچ میل لکھا ہے۔ وان آرلک (Von Orlich) شاہجہاں آباد کو ہندستان کا روم کہتا ہے اور اس شہر کی مسجدوں۔ محلوں۔ منڈووں۔ ہالوں۔ باغات۔ بادشاہوں اور اُن کی بیگمات اور بڑے بڑے امرا کے مقبروں کی بہت تعریف کی ہے اس شہر اور اس کے مضافات کے متعلق فرینکلن لکھتا ہے کہ شہر اور اس کی ملحقہ عمارات اور کھنڈروں کا بہترین نظارہ دریائے جمنا پر سے ہوتا ہے جو عین قلعے کے سامنے اور شہر سے تین میل ہے۔ اس جگہ سے چاروں طرف کا نظارہ ہوتا ہے۔ شیر شاہ اور فیروز شاہ کے قلعوں کے شاندار کھنڈر

ہمایوں کا عالی شان مقبرہ جو اُس کے بلند چبوترے پر کھڑا ہی۔ اُس کے اور (چھوٹے موٹے) مسجدوں کے بے شمار گنبدوں (کا جمگھٹا) جن میں سے کوئی سنگِ مرمر کا ہی اور کوئی طرح بطرح کے رنگوں میں جگمگا رہا ہی۔ پہاڑوں کے حلقے میں گھری ہوئی سر بفلک قطب مینار۔ شہر کا نشیب و فراز۔ سنگ مرمر کی جا بجا چمکتی ہوئی عمارتیں۔ سنہری گنبد۔ شان دار فصیل اور سنگ سُرخ کے اونچے اونچے دروازے جن کے بیچ میں سے جامع مسجد اور زینت المساجد کی اونچی اونچی مینار یں سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ یہ سارے کا سارا سین ایک نہایت دل چسپ اور پر عظمت و شان نظارہ ہی۔"

عام روایت یہ ہی کہ شہر سات برس میں بنا۔ شہر کی وسعت۔ عمارتوں کی نوعیت کے لحاظ سے یہ مدت کچھ خلافِ قیاس نہیں معلوم دیتی۔ برنیر نے اس شہر کو سنہ ۱۶۶۶ء میں دیکھا تھا اور یوں لکھتا ہی "کوئی چالیس برس ہوئے آے کہ بادشاہ وقت اورنگ زیب کے والد شاہ جہاں نے اپنی دوامی یادگار قایم کرنے کی غرض سے پرانی دلی کے پاس ایک نئے شہر بنانے کا قصد کیا چنانچہ نئی دلی اُس کے بانی کے نام پر شاہ جہاں آباد اور بلحاظ اختصار جہان آباد کہلانے لگی۔ شاہ جہاں نے آگرے کی چمچاہٹ کی گرمی سے بیزار ہو کر اُس شہر کو شاہی قیام کے مناسب حال خیال نہ کیا اور بجاے آگرے کے دلی کو دار السلطنت قرار دیا۔ نئے شہر کی تعمیر کے لیئے بہت سا مال مسالا تو اُدھر اُدھر کی گری پڑی عمارتوں سے مل گیا اور اسی وجہ سے دوسرے ملک کے لوگوں نے پرانی اور نئی دلی کو خلط ملط کر دیا ہی لیکن پھر بھی اہل ہند اس نئی دلی کو شاہ جہاں آباد ہی پکارتے ہیں مگر یورپ میں چوں کہ دلی کا نام ہی زیادہ مشہور ہی اس لیئے میں بھی (اپنے سفرنامے میں) جا بجا دلی ہی لکھتا ہوں۔ اس اعتبار سے دلی بالکل ایک نیا شہر ہی جو جمنا کے کنارے ایک وسیع قطعے پر آباد ہی جو ہمارے (ملک کے) شہر لایر ([illegible]) کے جوڑ کا ہی۔ یہ شہر دریا کے ایک ہی کنارے پر آباد ہی۔ آبادی کی شکل اس طرز کی واقع ہوئی ہی کہ ایک ہلال سا بن گیا ہی۔ دریا سے عبور و مرور کے لیئے صرف کشتیوں کا ایک پل ہی۔ شہر کی ایک جانب تو دریا (کی قدرتی حد) محافظ ہی۔ باقی تین طرف اینٹوں (پتھروں) کی فصیل سے محصور ہی۔ لیکن شہر کا حصار مکمل نہیں ہی کیوں کہ نہ تو خندق ہی نہ شہر کی حفاظت کے لیئے اور کوئی

مزید بندوبست کیا گیا ہی البتہ سو سو قدم کے فاصلے سے پرانی وضع کا ایک ایک برج اور ایک
ایک مٹی کا دمدمہ فصیل کے پیچھے ایک چبوترے کی شکل کا بنا ہوا ہی۔ فصیل کا آثار چار
یا پانچ فرانسیسی فیٹ کا ہی۔ یہ فصیل نہ صرف شہر کے گرد ہی بلکہ قلعے کے اطراف بھی ہی
تاہم فصیل کا دَور اتنا بڑا نہیں جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں میں نے تو گھوڑے پر سوار
ہو کر تین گھنٹے میں بہت آسانی سے سارے شہر کا چکر مار دیا اور میرے خیال میں
میری رفتار فی گھنٹے ایک فرانسیسی لیگ سے زیادہ نہ تھی۔ میرے اس چکر میں البتہ
شہر کے مضافات شامل نہ تھے جو بکثرت ہیں اور جن کا ایک لمبا سلسلہ لاہور کی طرف
چلا گیا ہی اور پرانے شہر کی عمارتیں بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور اس شہر کے
آس پاس تین چار چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی ہیں اگر ان سب کو ملا لیا جائے تو البتہ شہر کی
وسعت بہت بڑھ جائے گی اور اگر شہر کے بیچوں بیچ میں سے ایک خط مستقیم ڈالا جائے
تو ایک فرانسیسی لیگ سے کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ اگرچہ میں اس شہر کا صحیح محیط نہیں بتلا سکتا
کیوں کہ اس کے مضافات میں جا بجا بڑے بڑے باغ اور کھلے ہوئے قطعات
بھی آگئے ہیں تاہم ہم کو سمجھ لینا چاہیے کہ شہر کا دَور بہت بڑا ہی۔" افواج انگریزی نے
بزیر کمان جنرل لیک جب سنہ ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا اور نیز جب کہ جنرل اختر لونی نے
بمقابلہ مرہٹوں کے اس شہر کی حفاظت کی تو ساری فصیل کی داغ دوزی اور جا بجا سے
فصیل کی مرمت اور مضبوطی کی گئی اور پرانے اور بوسیدہ مرمت طلب مورچوں کو بڑھا کر
ایسا درست کر دیا کہ اُن پر نو نو توپیں چڑھ سکتی تھیں۔ پھر سنہ ۱۸۱۱ء میں بھی فصیل کی مرمت اور
برجوں کی درستی کی گئی اور بڑی بڑی گھونگٹ کی دیواریں توڑ کر چھوٹے چھوٹے مارٹیلو
(Martello) قسم کے مورچے بنا دیئے گئے اور اطراف خندق بھی کھدوا دی
گئی۔ غازی الدین خاں کا مقبرہ اور مدرسہ جو بیرون فصیل اجمیری دروازے کے باہر تھا مگر
بھی اندر لے کر حصار کی تکمیل کر دی گئی اور تمام حصہ عمارات کا شہر کے اندر شامل کر لیا گیا تھا۔
کہا جاتا ہی کہ پرانی فصیل سنہ ۱۰۶۰ھ میں ڈیڑھ لاکھ روپئے کے صرف سے بنی جس میں بندوقیں
چھوڑنے کی جھانکیاں بنائی گئی تھیں۔ یہ فصیل چار سال میں طیار ہو گئی تھی لیکن برسات میں
گر پڑی اور پھر پختہ فصیل چار لاکھ کے صرفے سے سات سال میں تعمیر ہوئی۔ یہ فصیل
۴۴۶۶ گز لمبی۔ نو گز اونچی اور چار گز چوڑی تھی جس میں تیس تیس فیٹ قطر کے ستائیس

مع چودہ دروازے اور چودہ کھڑکیاں تھیں۔ فرینکلن لکھتا ہے کہ شمال ومغرب کی طرف شالامار باغ سے جنوب ومشرق میں قطب مینار سے اور اجمیری دروازے سے لے کر قطب مینار تک بیس میل کا دور تھا" اس معرکۃ الآرا خطے کی نسبت بشپ ہیبر نے لکھا ہے کہ "یہ مقام تباہی اور بربادی کا بھیانک اور ہیبت ناک منظر ہے جہاں تک نظر دوڑتی ہے کھنڈر ہی کھنڈر۔ مقبرے ہی مقبرے (ڈھیروں) ٹوٹی پھوٹی عمارتیں پتھروں اور سنگ خارا کے انبار۔ سنگ مرمر کے (شکستہ) ٹکڑے اس قطعۂ زمین پر جو پتھریلا اور چٹیل میدان ہے اور جہاں بجز ایک دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے زراعت کا بھی کہیں پتہ نہیں نہ کوئی درخت ہے۔ بکھرے پڑے ہیں" اگر ہم کشمیری دروازے سے چلیں جو شہر کے شمال میں ہے اور جو ۱۸۵۷ء کے واقعۂ غدر۔ انگریزوں کی گولہ باری اور فتح دہلی کی وجہ سے مشہور ہو گیا ہے تو حسب ذیل رستے سے شہر کا چکر لگا سکتے ہیں:۔ (۲) موری دروازہ۔ بجانب شمال جو ۱۸۶۷ء میں ڈھا کر اس کے اطراف کا میدان صاف کر دیا گیا۔ (۳) کابلی دروازہ مغرب میں۔ یہ بھی توڑ دیا گیا۔ (۴) لاہوری دروازہ۔ جو حال میں فصیل کے ساتھ توڑ ڈالا گیا۔ (۵) اجمیری دروازہ۔ جنوب ومغرب میں۔ (۶) ترکمان دروازہ۔ جنوب میں (۷) دلی دروازہ جنوب میں۔ (۸) خیراتی دروازہ۔ مشرق میں۔ (۹) راج گھاٹ دروازہ۔ مشرق میں بجانب دریا۔ (۱۰) کلکتہ دروازہ۔ شمال ومشرق میں تھا جس کے مقام سابقہ کی نشانی کے طور پر ایک رستہ ۱۸۵۲ء میں بنا کر اس پر انگریزی میں ایک کتبہ بھی لگا دیا ہے اب تو اس جگہ ریل کے دو کلورٹ بنے ہوئے ہیں اور ان پر وہی پتھر نصب کر دیا ہے جو بتلاتا ہے کہ کلکتہ دروازہ پہلے یہاں تھا۔ (۱۱) کیلا گھاٹ دروازہ۔ شمال ومغرب میں دریا کی طرف (۱۲) نگم بود دروازہ شمال ومشرق میں دریا کی طرف۔ (۱۳) پتھر گھاٹی دروازہ۔ توڑ دیا گیا۔ (۱۴) بدرو دروازہ شمال ومشرق میں۔ علاوہ چودہ دروازوں کے خلق اللہ کے آرام و آسائش کے لیے چودہ کھڑکیاں بھی اس نام کی تھیں:۔

(۱) کھڑکی زینت المساجد تحت مسجد مذکور۔ (۲) کھڑکی نواب احمد بخش خاں۔ (۳) کھڑکی نواب غازی الدین خاں۔ (۴) کھڑکی نصیر گنج۔ (۵) نئی کھڑکی۔ (۶) کھڑکی شاہ گنج۔ (۷) کھڑکی اجمیری دروازہ۔ (۸) کھڑکی سید بھولا۔ (۹) کھڑکی بلند باغ۔ (۱۰) کھڑکی فراشخانہ۔ جو حال میں توڑ دی گئی۔ (۱۱) کھڑکی امیر خاں۔ (۱۲) کھڑکی خلیل خاں۔ (۱۳) کھڑکی بہادر علی خاں۔

(۳۴) کھڑکی کم برو۔ شہر دہلی بھوجلا اور جھوجلا نام کی دو پہاڑیوں پر بسایا گیا ہے۔ بھوجلا پہاڑی تو وسط شہر میں ہے رہی جھوجلا پہاڑی وہ شمال و مغربی فصیل سے ملی ہوئی ہے۔ شہر جس قطعۂ زمین پر آباد ہے اس کا ہلکا سا ڈھلاؤ مشرق سے مغرب کی طرف ہے یا توں یوں کہو کہ پہاڑی سے دریائے جمنا کی طرف نشیب ہے۔ علی مردان کی نہر کابلی دروازے سے شہر میں داخل ہو کر شہر اور قلعے دونوں میں دوڑتی ہے اور پھر دریا میں جا ملتی ہے قلعے کی فصیل سے ملے ہوئے بہت سے باغات تھے مگر برنیر جب آیا ہے تو ان میں سے صرف ایک ہی بڑا باغ رہ گیا تھا جس کی نسبت اس نے لکھا ہے "بارہ مہینے ہرے بھرے پودوں اور پھلوں سے سرسبز و شاداب رہتا تھا۔ یہ سبزہ زار قلعے کی شاندار لال فصیلوں کے پہلو بہ پہلو عجیب لطف دکھاتا تھا" یہ باغ جس کا ذکر برنیر نے کیا ہے قلعے کے لاہوری دروازے سے لگا ہوا تھا اور یہیں باغ کے متصل سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہ جہاں کا بنایا ہوا "چوک شاہی" بھی تھا جس کا ذکر برنیر نے اپنے ایک خط میں جو دلی سے لکھا تھا یوں کیا ہے۔ "باغ سے لگا ہوا چوک شاہی ہے جس کا ایک رخ تو قلعے کے دروازے کی طرف ہے اور دوسرا سرا دو بڑے بازاروں کی طرف ختم ہوتا ہے × × × اسی چوک کے احاطے میں اُن امرار کے خیمے لگے رہتے ہیں جن کی نشست کی باری ہر ہفتے آتی ہے × × × × × ۔ اسی میدان میں خاصے کے گھوڑے صبح سویرے ہواخوری کے لیئے ٹہلائے جاتے ہیں اور یہیں سواروں کا بڑا افسر اُن گھوڑوں کا معاینہ کرتا ہے جو فوج میں بھرتی کیئے جاتے ہیں۔ یہیں ایک بہت بڑا بازار ہے جس میں ہمہ قسم کی اشیا ملتی ہیں جیسے پیرس میں پانٹ نوف (Pont-Neuf)۔ یہ جگہ تماشائیوں اور سیلانیوں کی سیرگاہ ہے یہیں ہندو اور مسلمان رمال اور نجومی جمع رہتے ہیں" اب اس چوک اور بازار کا کہیں پتہ بھی نہیں ملتا قلعے کے اطراف دور دور سارے کا سارا میدان صاف کر دیا گیا اسی میں یہ مقامات بھی آ گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قلعے کے لاہوری دروازے کے دونوں طرف یعنی شمال اور جنوب میں یہ بازار تھا۔ شہر کے دو بڑے بازار جو شاہی چوک پر آ کر ختم ہوتے تھے ان کی نسبت برنیر لکھتا ہے کہ "جہاں تک بخط مستقیم نظر دوڑتی تھی بازار ہی بازار نظر آتا ہے لیکن وہ بازار جو لاہوری دروازے کی طرف ہے (یعنی چاندنی چوک) وہ اس سے بھی بہت بڑا ہے۔ دوسرا بازار شہر کے دہلی دروازے سے لے کر شاہی چوک تک ہے (یعنی فیض بازار) عمارت کے

اعتبار سے دونوں بازار ایک ہی طرح کے ہیں۔ سڑک کے دو طرفہ اینٹ اور چونے کی پختہ دکانیں بنی ہوئی ہیں جن کے بالاخانے نشست کا کام دیتے ہیں۔ ان بازاروں میں بجز دکانوں کے اور کوئی عمارت نہیں ہے۔ یہ دکانیں سب علیحدہ علیحدہ ہیں ان میں بیچ میں رستہ نہیں ہے۔ دکانوں میں دن کے وقت کاریگر لوگ اپنا اپنا کام کرتے ہیں ساہوکار لین دین کا بنج بیوپار کرتے ہیں۔ تاجر اپنا اپنا مال و اسباب برتن وغیرہ دکھلاتے ہیں × × × ×
ان دکانوں اور کارخانوں کے پچھواڑے سوداگروں کے رہنے سہنے کے گھر ہیں جن سے خوشنما گلیاں بن گئی ہیں۔ یہ مکان ضرورت کے موافق اچھے خاصے وسیع ہوادار اور آرام دِہ معلوم دیتے ہیں جو سڑکوں کے گرد و غبار سے الگ ہیں۔ ان مکانوں میں سے دکانوں کی چھتوں پر جانے کا رستہ ہے جہاں لوگ رات کو سوتے ہیں۔ لیکن سارے بازار میں اس طرح کے مکانات کا سلسلہ نہیں ہے۔ بازاروں کے علاوہ شہر کے دوسرے حصوں میں دو منزلہ مکانات بہت کم ہیں۔ سیگز ینوں کے مکانات اکثر نیت اس غرض سے بنائے گئے ہیں تاکہ سڑک پر سے مد نظر نہ ہو۔ سعد اللہ خاں کے نام کا بھی ایک چوک تھا وہ بھی اب نہ دار دہے لیکن یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود ایک طرف تو قلعے کا دہلی دروازہ اور فوجی باغ تھا اور دوسری طرف سنہری مسجد۔ پرانا قبرستان جہاں اب موریل کراس ہے۔ تھا۔ اس چوک کے جنوبی رخ پر دو بازار اور آکر ملتے تھے فیض بازار شمال کی جانب شہر کے دہلی دروازے سے قلعے کے دہلی دروازے تک تھا اور خاص بازار جامع مسجد اور قلعے کے دروازے کے بیچ میں تھا البتہ درمیان میں کچھ ذرا سا حصہ چھوٹا ہوا تھا۔ برنیر نے جو دو بازاروں کا بیان کیا ہے اُن میں سے ایک بڑا بازار یعنی چاندنی چوک تو شہر کے لاہوری دروازے سے (جو اب باقی نہیں ہے) قلعے کے لاہوری دروازے تک تھا اور دوسرا شہر کے دہلی دروازے سے قلعے کے لاہوری دروازے تک تھا ان دونوں بازاروں کے مختلف حصے مختلف ناموں سے موسوم تھے وہ حصہ جو قلعے کے لاہوری دروازے اور دریبے کے خونی دروازے کے مابین ہے اردو بازار کہلاتا تھا جس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی زمانے میں اس حصۂ شہر میں لشکری لوگ رہتے تھے۔ خونی دروازے اور کوتوالی کے درمیان کا حصہ پھول کی منڈی کہلاتا تھا۔ اس مقام پر اس زمانے میں ایک چوک بنا ہوا تھا۔ کوتوالی اور ترا ہے کے

بیچ میں چوپڑ کا بازار تھا۔ ترا ہے اور اس کے متصل اخری کا کٹرہ درحقیقت چاندنی چوک کا سب پر رونق حصہ تھا۔ چاندنی چوک کے اس مقام پر جہاں کہ اب گھنٹہ گھر ہے بیچوں بیچ میں ایک حوض تھا اس سے آگے بڑھ کر فتح پوری کی مسجد تک فتح پوری بازار کہلاتا تھا۔ چاندنی چوک کے بازار کے مکانات سب بلندی میں یکساں تھے اور دکانوں میں محرابی دروازے اور رنگین سائبان تھے۔ چاندنی چوک کے شمال اور جنوب میں دو دروازے تھے۔ شمالی دروازے سے رستہ جہاں آرا بیگم کی سرا کو جاتا تھا اور جنوبی دروازے سے ایک رستہ شہر کے ایک نہایت آباد اور گنجان حصے کو جاتا تھا۔ حوض کے اطراف کثرت سے پھل پھلاری۔ ترکاریوں اور مٹھائی کی دکانیں تھیں۔ رفتہ رفتہ اس بازار کے ٹکڑوں کے متفرق نام جاجو کر سارا بازار چاندنی چوک کہلانے لگا۔ چاندنی چوک عظیم الشان بازار شاہ جہاں کی صاحب زادی جہاں آرا بیگم نے سنہ ۱۰۶۰ھ میں بنوایا تھا اور اس کے کئی برس بعد بیگم صاحب موصوفہ نے ایک باغ اور سرائے بھی بنوائی تھی قلعے کے لاہوری دروازے سے لے کر چاندنی چوک کے آخر تک یہ بازار ۱۵۲۰ گز لمبا اور چالیس گز چوڑا ہے جس کے بیچوں بیچ میں علی مرداں کی نہر رواں تھی جس کے دونوں جانب سرسبز و شاداب سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے (اب نہر پاٹ دی گئی اور سب درخت بھی کاٹ دیے گئے)۔ چاندنی چوک کے شرقی سرے پر قلعے کا لاہوری دروازہ ہے اور دوسرے سرے پر فتح پوری کی خوشنما مسجد ہے۔ برنیر نے جو دوسرے بازار کا ذکر کیا ہے وہ قلعے کے لاہوری دروازے سے لے کر شہر کے دہلی دروازے تک تھا۔ لاہوری دروازے سے چوک سعد اللہ خاں تک اس بازار کا حصہ بالکل معمولی تھا باقی حصہ جو انتہائی شمالی حد پر تھا اس کا بیان چوک کے ساتھ آئے گا۔ ایک دوسرا بڑا بازار وہ تھا جو قلعے کے لاہوری دروازے سے ان عمارات تک چلا گیا تھا جن میں سے ایک عمارت کو جنرل لیک نے دہلی فتح کرنے کے بعد رزیڈنسی بنا لیا تھا۔ یہ بازار آدھ میل لمبا اور تیس فیٹ چوڑا تھا اور اس سرے سے اس سرے تک اس کی دونوں جانب گھنے سایہ دار درخت ایسے لگے ہوئے تھے کہ ایک خوب صورت ایونیو (AVENUE) بن گیا تھا۔ خاص بازار کا اب کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب قلعے کے اطراف زمین کو عمارات سے صاف کیا گیا تو چاندنی چوک اور خاص بازار بھی اس کی

زد میں آ گئے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ان دونوں بازاروں میں صبح سے رات گئے تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور دکانیں مال و اسباب سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں جن میں ہر قسم کا بیش قیمت سامان موجود تھا۔ جب کبھی بادشاہ کی سواری جامع مسجد کو یا اعیاد میں برآمد ہوتی تھی تو اسی بازار سے جلوس گزرتا تھا۔ اب بھی فیض بازار کا دو تہائی حصہ باقی ہے۔ بازار کی دونوں جانب دکانیں ہیں اور بیچ میں سے نہر بہتی ہے (اب نہر بند کر دی گئی) اور جابجا بڑی بڑی عمارتوں محلوں اور مسجدوں کے کھنڈر نظر آتے ہیں جن سے اب بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ بادشاہ پسند بازار کیسا کچھ آباد اور پر رونق رہا ہوگا۔ لیکن افسوس کہ اب ایسا اجڑا ہے کہ دہلی میں اس سے زیادہ غیر آباد حصہ اور کوئی نہیں ہے۔ یہ بازار شاہجہاں بادشاہ کی حرم محترم اکبر آبادی بیگم کا بسایا ہوا تھا جن کے نام کی ایک مسجد بھی یہاں موجود ہے۔ یہ بازار گیارہ سو گز لمبا اور تیس گز چوڑا تھا۔ اس کی اور اردو بازار کی بنا ساتھ ہی ساتھ پڑی تھی اور یہ دونوں بازار بھی شہر کے ساتھ ہی ساتھ چاندنی چوک کے بازار سے پہلے بنے تھے۔ نہر جو اس بازار میں رواں تھی وہ چار فیٹ چوڑی اور پانچ فیٹ گہری شاہجہاں کی بنائی ہوئی تھی۔ دلی کے بازاروں میں فیض بازار ہی کو یہ فخر حاصل تھا کہ اس کی دکانوں میں ہر ہر ملک عراق و خراسان اور دوسرے بندرگاہوں کے بے شمار سامان کے علاوہ یورپ کی اشیاء بھی کثرت سے رہتی تھیں۔ برنیر لکھتا ہے کہ "اس شہر میں بے شمار بازار اور پیچ در پیچ گلیاں ہیں جو آپس میں قطع کرتی ہیں۔ بازاروں کی دکانیں مختلف اوقات میں مختلف اشخاص کی بنائی ہوئی ہیں اس وجہ سے یکسانیت کا خیال نہیں رکھا گیا پھر بھی بعض بعض دکانیں بڑی بڑی بھاری ہیں جن کی سیدھی قطار دور تک چلی گئی ہے۔" شہر کے چھتیس محلے ہیں جن میں سے اکثروں کے نام سربرآوردہ اشخاص و امرائے شہر کے ناموں سے منسوب ہیں۔ برنیر لکھتا ہے کہ "ان محلوں میں جابجا منصب دار۔ نظمائے عدالت۔ مال دار تجار اور دوسرے لوگوں کے مکانات پھیلے پڑے ہیں۔" برنیر نے شہر کے ایک عمدہ مکان کا خاکہ حسب ذیل کھینچا ہے:۔

چو جنت بر زمینش ہر مکانے + بود در ہر مکانے بوستانے + خیابانے چناں عشرت فزا ست
تکلّفہا کو چہ ہا سایہ بہشت است + ہوایش دل کشا و دل نشین ست + طراوت خانہ زاد این زمین است

یہاں کے ایک اچھے مکان کا طرز یہ ہوتا ہے کہ اُس کے صحن میں ہمیشہ خانہ باغ، نہر، حوض، فوارے۔ ایک بڑا صدر دروازہ۔ خوب صورت تہ خانے ہوتے ہیں جن میں بڑے بڑے فراشی پنکھے لگے رہتے ہیں۔ سب سے بہتر مکان وہ سمجھا جاتا ہے جو وسط شہر میں ہو اور جس میں ایک بڑا پھول باغ اور چار بڑے بڑے قد آدم اونچے چبوترے بھی ہوں اور چاروں طرف سے ایسی ہوا آتی ہو کہ ٹھنڈک رہے۔ ہر عمدہ مکان میں رات کو سونے کے لیے چھتیں بنی ہوتی ہیں اور کوٹھوں پر بھی دالان ہوتے ہیں کہ اگر بارش آجائے تو اُس میں چلے جائیں۔ عمدہ مکانات میں عموماً دریوں کا فرش ہوتا ہے۔ دیواروں میں پانچ پانچ چھ چھ فیٹ تک مختلف شکلوں کے خوشنما طاق بنے رہتے ہیں جن میں چینی کے عمدہ عمدہ پھولوں کے گلے چُنے رہتے ہیں۔ چھتوں میں یا ملمع کیا جاتا ہے یا رنگین ہوتی ہیں لیکن مکانوں میں کہیں انسان یا حیوان کی تصویر نظر نہیں آتی کیونکہ تصویر کا رکھنا مذہباً ممنوع ہے۔

یوں تو شہر میں بڑے بڑے رئیسوں اور امراء کے بے شمار محل تھے مگر سب سے زیادہ مشہور قمر الدین خاں۔ علی مرداں۔ اور زمانِ مابعد کے غازی الدین خاں۔ سعادت خاں اور صفدر جنگ کے محل تھے۔ کرنل پالیر سنہ ۱۸۱۰ء میں کچھ عرصے تک شاہی ملازم تھا وہ بھی کسی ایک محل میں رہتا تھا ہم بطور نمونہ اُس کے مکان کا رنگ ڈھنگ بتلاتے ہیں جس کا تذکرہ ناظرین کے لیے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ”اگرچہ یہ محل اب خستہ اور تباہ حالت میں ہے لیکن اب بھی اُس کی گری پڑی حالت سے اُس کے بانی کا تموّل۔ بلند حوصلگی اور خوش سلیقگی اور حسن مذاق ظاہر ہے۔ اس کی بلند چار دیواری کے اندر بہت ساری زمین گھری ہوئی تھی اور صحنِ مکان میں کئی بڑے بڑے اونچے اور شاندار دروازے تھے۔ اس محل میں ملازمین۔ شاگرد پیشہ۔ آئے گئے مہمان اور ملاقاتیوں کے رہنے سہنے کے لیے متعدد وسیع قطعات تھے۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے اصطبل جدا جدا۔ دیوان خانہ اور زنانہ محل سرا مکان کے یہ دو بڑے حصے تھے جن کے بیچ میں آمد و رفت کا رستہ تھا۔ ہر ہر مکان میں حمام اور تہ خانے کا ہونا ضرور تھا۔ جن میں ہمہ قسم کا سامان آسائش مہیا رہتا تھا“ بایں ہمہ تموّل و احتشام فلاکت اور افلاس کے نمونے بھی مفقود نہ تھے۔ برنیر لکھتا ہے کہ ”ان محلات کے پہلو بہ پہلو بے شمار چھوٹے چھوٹے مکانات بھی کچے اور چھپر کے ہوتے تھے جن میں غریب غربا اور ادنیٰ درجے کے ملازموں کا جم غفیر سپاہی

سلیم گڈھ یا نور گڈھ

س وغیرہ جن کی تعداد کا کچھ ٹھکانا نہ تھا اور جوہر صاحب ثروت و صاحب سیر کا ایک جزو
لک سے رہا کرتے تھے۔ انہیں چھپروں کی وجہ سے شہر میں اکثر آگ لگ جایا
تھی...... انہیں کچے اور پھوس کے گھروں سے دلی کی بستی چند گاؤں کا مجموعہ
چھاؤنی معلوم دیتی تھی جس میں خال خال بڑی بڑی عمارتیں بھی کھڑی تھیں۔"

سلیم گڈھ یا نور گڈھ

سنہ ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء

سنہ ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء میں شیر شاہ سور کے بیٹے سلیم شاہ نے جب ہمایوں بادشاہ کے آنے کی خبر سنی تو اُس کے متعلق تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ "بادشاہ لاہور سے کوچ کر کے دلی آیا اور دین پناہ کے محاذی جمنا کے بیچ میں
م گڈھ بنوایا۔ اُس کا منشا یہ تھا کہ ایسا مضبوط قلعہ بنوایا جائے کہ جس کا جواب تمام ہندوستان
ہو اور فی الواقع وہ بنایا بھی ایسا ہی گیا ہے کہ ایک ہی پتھر میں ترشا ہوا معلوم ہوتا ہے"
نصف دائرے کی شکل کا بنا ہوا ہے اور ایک زمانے میں اس میں مختلف جسامت کے
برج تھے اور اس کی تعمیر میں چار لاکھ روپیہ صرف ہوئے اور پانچ سال کے
ے میں صرف اس کی فصیل طیار ہونے پائی تھی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی
کا منصوبہ دل کے دل ہی میں رہا اور یہ قلعہ کس مپرسی کی حالت میں پڑ گیا۔ اسی برس
فرید خاں المعروف بہ مرتضیٰ خاں جو اکبر اور جہانگیر بادشاہوں کے عہد کا ایک سر برآوردہ
تھا اُس کو سلیم گڈھ بطور جاگیر کے سرفراز ہوا۔ اُس نے اس قلعے میں بہت سے
ات تعمیر کرائے۔ سنہ ۱۸۲۹ء تک یہ تمام عمارات گر پڑ کر کھنڈر ہو گئی تھیں صرف ایک
زلہ دالان اور ایک باغ ہوا خوری کے لیے اکبر شاہ ثانی کے عہد تک (سنہ ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء)
حالت میں باقی تھا۔ سنہ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر مع اپنے ہمراہیوں کے اسی قلعے سے بھاگا
قلعے سے ملا ہوا ہے یعنی قلعہ شاہجہاں آباد کے پاس والے پل کو عبور کر کے
گیا۔ یہ پل جہانگیر بادشاہ نے سنہ ۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۲ء میں بنوایا تھا۔ اب اس قلعے میں سے ایسٹ انڈین
ے گزرتی ہے اور ریل کے پل کے واسطے جگہ نکالنے کو اس پل کو توڑنا پڑا جس کے

ل سنہ ۱۸۶۳ء میں بننا شروع ہوا اور یکم جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو ٹریفک کے لیے کھول دیا گیا۔ ریل کا پل کلکتہ کی طرف سے ۹۵۴ میل پر شروع ہوتا ہے اور
لمبا ہے۔ اس کے بارہ در ہیں اور ہر در کی محراب ۱۱ فٹ چوڑی ہے۔ یہ پل دہرا ہے اوپر ریل جاتی ہے نیچے بیل آدمی گاڑی پیدل وغیرہ
میں دس کنویں چلائے گئے ہیں جن کا قطر اوپر سے دس فیٹ کا ہے اور ۳۴ فٹ زمین کے اندر اتارے گئے ہیں اور ان کو
ا بھی دیوار ہیں پانی کے ریلے کو روکنے کے لیے کھڑی کی گئی ہیں۔ سطح آب سے گرڈروں کی اونچائی ۲۳½ ہے اکہرے پل کا صرفہ
ہ ساٹھ ہزار تین سو پچیس روپیہ یعنی ۔۔۔ فی سطحی فٹ خرچ پڑا ہے۔ یہ پل پہلے ہی سے ڈبل لین کے لیے بنا ہوا تھا
ور اب چند سال ہوئے کہ انھیں پایوں پر نیا آہنی پل رکھ دیا گیا ہے اور یہ بھی پہلے پل کی طرح دہرا ہے۔

دو کتبے پل ٹوٹ جانے سے اب قلعے کے عجائب خانے میں رکھے ہوے ہیں اور ہم نے اُن کی نقل اس مضمون کے خاتمے پر کر دی ہی۔ اب جو پل پھاٹک کے سامنے بنا ہوا ہی وہ جدید ہی اور اس پل کو یہ فخر حاصل ہی کہ دربار ۱۹۱۱ء میں شاہ معظم جارج پنجم جلوس شاہی کے ساتھ اسی پر سے گزرے تھے سلیم گڈھ کا قلعہ شاہجہاں کے محل کے شمال میں ہی مگر اس محل کے بننے کے بعد یہ قلعہ بطور شاہی محبس کے استعمال کیا جاتا تھا اس قلعے کی لمبائی قریب قریب پاؤ میل کے ہی اور فصیل کا دور تقریباً پاؤ میل کا ہی۔ یہ قلعہ دریاے جمنا کے مغربی ساحل کے قریب ایک جزیرے میں بنا ہوا ہی۔ اس کی بڑی بھاری فصیل اور شاندار سر بفلک برجوں کا ایک عجیب و غریب نظارہ دریا کے اُس پار سے ہوتا ہی۔ اس قلعے کے جنوبی دروازے کے سامنے جب ایک پل شہنشاہ نورالدین نے بنوایا تب سے اس کا نام نور گڈھ رکھا گیا لیکن عام طور پر اب بھی سلیم گڈھ ہی مشہور ہی (کننگھم کی آرکیالوجیکل رپورٹ جلد دوم صفحہ ۲۲۳) اس پل کی نسبت جنرل کننگھم کے اسسٹنٹ مسٹر بگلر نے لکھا ہی کہ "سلیم گڈھ اور قلعۂ دہلی کے درمیان جو پل ہی (اب نہیں رہا) اس کی خصوصیاتِ تعمیر خاص توجہ کے قابل ہیں۔ پل کے دروں کا روکار بن گھڑے پتھروں اور چونے کا ہی۔ ان دروں میں خاص طور پر کھمب ڈال کر مضبوط کیا گیا ہی جن سے ظاہری حالت میں مضبوطی اور نزاکت دونوں باتیں پیدا ہو گئی ہیں" اس پل پر حسب ذیل دو کتبے تھے :-

کتبۂ اول جانب مشرق
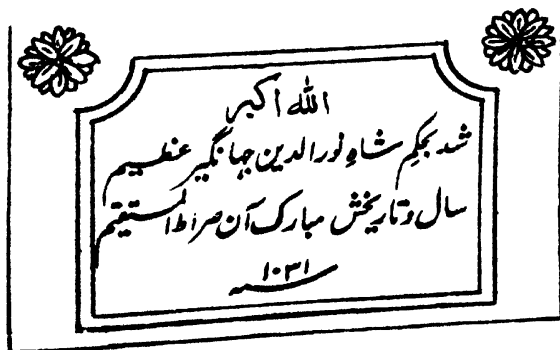
اللہ اکبر

شد بحکم شاہ نورالدین جہانگیر عظیم

سال و تاریخش مبارک آن صراط المستقیم

سنہ ۱۰۳۱

کتبہ دوم جانبِ غرب

اللہ اکبر	بحکمِ بادشاہِ ہفت کشور	جل جلالہ	شہنشاہِ بعدل و داد و تدبیر	یا فتاح
یا ناصر	جہانگیر ابن شاہنشاہ اکبر	یا ولی	کہ شمشیرش جہاں را کرد تسخیر	یا حی
سنہ ۱۷	چو ایں پل گشت در دہلی مرتب	جلوس	کہ وصفش را نشاید کرد تحریر	جہانگیری
با اہتمام	پی تاریخ اتمامش خرد گفت	حسین بیگ	پلِ شاہنشہِ دہلی جہانگیر ۱۰۳۱	حسن فریف

سڑک کے اس طرف قلعے کے اس رُخ پہ جو دریا کے جانب ہے دو دروازے ہیں ان میں سے ایک پر یہ کتبہ سنگِ مرمر کی تختی پر کھدا ہوا ہے۔ مگر اب یہ دروازہ بند کر دیا گیا ہے:۔

گشت چو تعمیر بفضلِ الٰہ ایں درِ خوش منظر و فرحت فزا
گفت خرد سالِ بنایش ظفر بابِ فلک جاہ و خجستہ بنا (۱۰۰۱ھ)

جامع مسجد (جامع مسجد سے دہلی دروازہ تک)

بیت ۱۱۱ ابجد

من نگویم کعبہ لیکن ایں قدر گویم کہ ہست ✦ جبہ او تا دِ عاشق سجدۂ ایں آستاں
پرتوِ انوار او چوں عالم افروزی چند ✦ صبح را گرد و نفس انگشتِ حیرت در دہاں

مسجدا را ایں ست می زیبد اماش جبرئیل خلوتِ روحانیاں را شمع باید بے دخاں
دستِ استادِ قضا تا از رخامش ساختہ روسفیدی ابد آباد گشت از بہرِ کاں
نیست در دِ حاصلِ اوقاتِ اہلِ طاعتش جز دعائے ثانیِ صاحبقراں شاہِ جہاں
در بنائے خیر ایں سعی کہ وارد ہمتش حاصلِ کاں جملہ خواہد گشت آخر صرفِ کاں
تا ہمیشہ قبلۂ اسلام سمتِ کعبہ است قبلہ گاہِ آرزو با د اجنابش جاودان
مسجدِ کاں کعبۂ ثانی است تاریخش بود قبلۂ حاجات آمد مسجدِ شاہجہاں

لہ اس تاریخ میں ایک عدد کی زیادتی ہوتی ہے لیکن ایک کی زیادتی شمار میں نہیں آتی اور کالعدم سمجھی جاتی ہے مصنف نے اسے جائز رکھا ہے۔ ۱۲

بقول جنرل کننگھم دلی شہر کی عمارتوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر جامع مسجد اور زینت المساجد یہی دو عمارتیں ہیں۔ جامع مسجد کو شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۶۰ھ میں بنایا تھا جو سارے ہندوستان کی مسجدوں سے بڑی اور سب سے عمدہ ہے۔" ہندوستانی روایت کی رو سے اس عجیب غریب عمارات کی بنا ۱۰ شوال المکرم ۱۰۶۰ھ میں ہوئی ہے۔ جامع مسجد لال قلعے سے کوئی ہزار گز کے فصل سے بھو جلا پہاڑی پر خاص بازار کے مغربی سرے پر بنی ہوئی ہے۔ اس کی کرسی کا کیا کہنا جو سنگ سرخ کا ایک بڑا بھاری چبوترا سطح زمین سے تیس فیٹ بلند اور چودہ سو مربع گز ہے۔ اس کی تعمیر زیر نگرانی سعد اللہ خاں وزیر شاہ جہاں اور فضل خاں خانساماں کے ہوئی۔ مشہور ہے کہ جب مسجد کی بنیاد رکھنے وقت آیا تو بادشاہ ظل اللہ نے فرمایا کہ اس کی بنیاد وہ شخص رکھے جس کی نماز تہجد اور تکبیر اولی کبھی قضا نہ ہوئی ہو۔ یہ سن کر سبھوں نے گردنیں جھکالیں اور کچھ جواب نہ دیا۔ جب بہت دیر ہو گئی تو بادشاہ نے فرمایا "الحمد للہ مجھ میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ مگر افسوس کہ آج راز فاش ہوتا ہے"۔ اور پھر دست مبارک سے سنگ بنیاد رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ چھ ہزار راج۔ بیلدار۔ مزدور اور سنگ تراش چھ برس تک روزانہ اس کی تعمیر میں گھسے رہے اور تعمیر میں دس لاکھ روپیہ صرف ہوا جس میں پتھر کی قیمت شامل نہیں ہے۔ سنا ہے کہ پتھر ہر قسم کا راجاؤں اور نوابوں نے بادشاہ کی نذر کیا تھا مسجد جب بن بنا کر تیار ہو گئی عید الفطر قریب تھی۔ میر عمارت کو شاہی حکم پہنچا کہ ما بدولت عید کی نماز جامع مسجد میں پڑھیں گے۔ ہزاروں من ملبہ پڑا ہوا۔ جگہ جگہ پاڑیں بندھی ہوئیں اتنی جلدی مسجد کا صاف ہو کر آراستہ ہو جانا بالکل ناممکن تھا۔ فوراً حکم سلطانی پہنچا کہ جو چیز جس کو ملے اٹھا لے جائے۔ پھر کیا تھا ذرا سی دیر میں مسجد صاف ہو گئی تنکا تک باقی نہ رہا۔ اسی وقت جھاڑ پونچھ کر فرش کر دیا گیا۔ دیکھتے دیکھتے شیشہ و آلات سے آراستہ ہو کر اچھی خاصی دلہن بن گئی۔ حضور میں عرضی گزری کہ مسجد آراستہ ہے۔ صبح عید تھی نماز کا وقت ہوا قلعے میں شادیانے بجنے لگے۔ حضور کی سواری نکلی۔ قلعے کے دروازے سے مسجد کے شرقی دروازے تک سواروں کی قطار آگے آگے نقیب و چوبدار پیچھے پیچھے شہزادگان والا تبار نے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ مسجد میں داخل ہوئے۔ چاروں طرف سے لوگوں کا ہجوم ہوا۔ مسجد بھر گئی۔ دوگانہ ادا کیا گیا شہر میں عید منائی گئی۔ اس مسجد میں پنج وقتہ جماعت ہونے لگی۔ امام مؤذن فراش وغیرہ سب بادشاہ کی طرف سے مقرر

نقشہ دروازہ جنوبی مسجد جامع

نقشہ دروازہ شمالی مسجد جامع

نقشہ دروازہ شرقی مسجد جامع
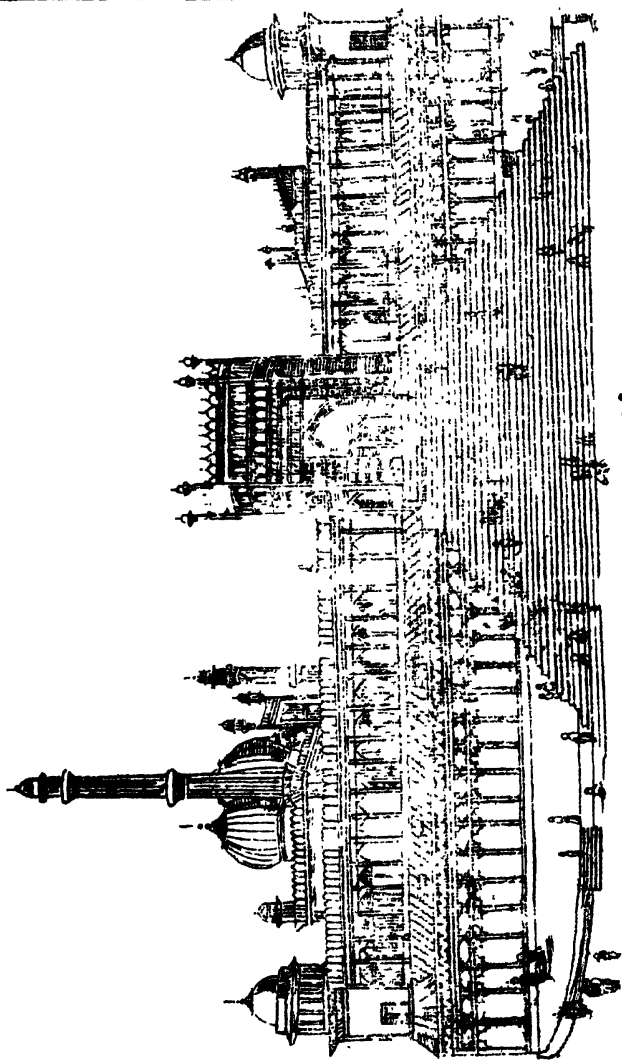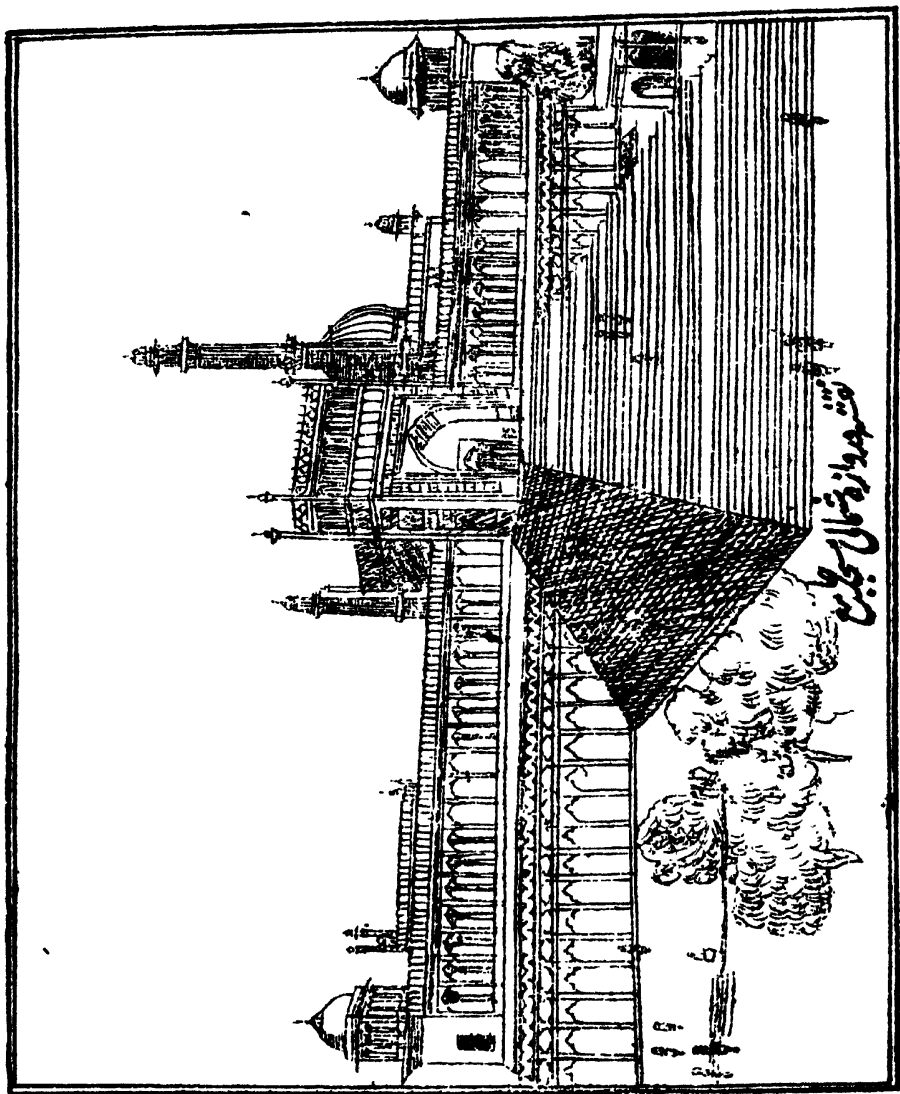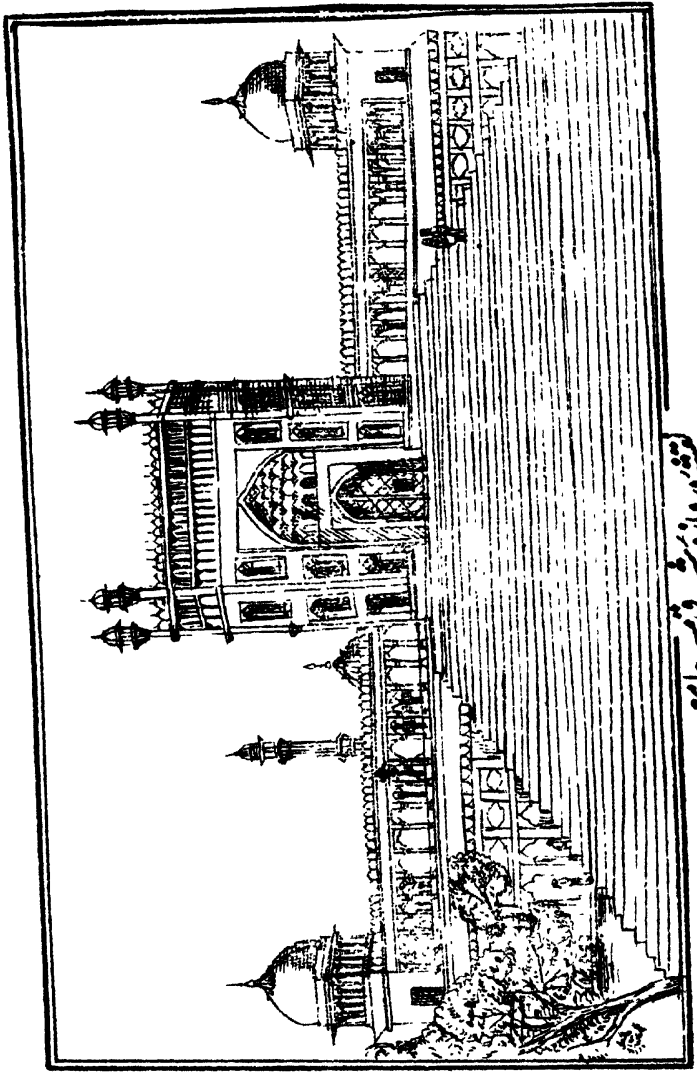
ہو گئے مسجد جنت کا ٹکڑا بن گئی ۔ مسجد کے تین عالی شان دروازے مشرق۔
شمال اور جنوب میں ہیں اور تینوں طرف سنگ سرخ کی لمبی لمبی اور بڑی چوڑی چوڑی
سیڑھیاں ہیں۔ شمالی دروازے کے محاذ میں (۳۹) سیڑھیاں ہیں۔ قدیم زمانے
میں ان سیڑھیوں پر نان بائی اور کبابی بیٹھا کرتے تھے ۔ تماشے والوں اور داستان گویوں
کا جمگھٹا بھی یہیں رہا کرتا تھا جن کی کہانیاں سننے کو لوگوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں جمع رہتی تھیں
جنوبی دروازے کی (۳۳) سیڑھیاں ہیں۔ جہاں پارچہ فروش اپنا اپنا فرش بچھا کر بیٹھا
کرتے تھے ۔اس طرف ایک مدرسہ اور ایک بڑا بازار تھا جو غدر کے بعد منہدم کرا دیا گیا۔
مسجد کا شرقی دروازہ جو بادشاہ کی آمد و رفت کے واسطے مخصوص تھا اُس کی (۳۵)
سیڑھیاں ہیں اور یہیں شام کو کبوتر۔ مرغیاں اور دوسرے جانور بکتے ہیں۔ جو گزری کا
بازار کہلاتا ہے۔ اب بھی شام کے وقت یہاں بڑا گلزار رہتا ہے اور آدمیوں کی خوب ریل پیل
رہتی ہے کبوتر وغیرہ سب قسم کے جانور ملتے ہیں اور ٹکڑے فروش کپڑوں کے ٹکڑے
کثرت سے بیچتے ہیں ۔ کبابیوں اور نان بائیوں کی دکانیں اب بھی بڑی رات تک کھلی
رہتی ہیں یہ سب لوگ جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ بیٹھتے ہیں چبوترے کے مغربی جانب
مسجد کی اصل عمارت ہے جس کے بقیہ ہر سہ اطراف میں کشادہ دالان بنے ہوئے ہیں اور
انھیں میں ہر طرف ایک ایک دروازہ ہے جن میں سے قلعے کی طرف کا دروازہ تو بند رہتا ہے
باقی دونوں کھلے رہتے ہیں اور انھیں دروازوں سے خلقت کی آمد و رفت رہتی ہے نقشہ
اس مسجد کا جو "جہاں نما" بھی کہلاتی ہے عرب اور قسطنطنیہ کی مساجد کا سا ہے۔ اس کی لمبائی ۲۶۱ فٹ
اور چوڑائی نوّے فیٹ ہے۔ مسجد کے تین کمرک تا گنبد ہیں جن پر ایک ایک پٹی
سنگ موسیٰ کی اور ایک ایک سنگ سرخ کی پڑی ہوئی ہے اور اوپر سنہری کلس ہیں
یہ گنبد طول میں نوّے گز اور عرض میں تیس گز ہیں۔ مسجد کے دو نہایت بلند اور خوب صورت
مینار سنگ سرخ کے ہیں جن پر کھڑی پٹیاں سنگِ مرمر کی ہیں۔ ان کی بلندی ۱۳۰ فٹ اور
اندر چکر دار زینہ ہے جس میں (۱۳۰) سیڑھیاں ہیں۔ مینار کے تین کھنڈ ہیں۔ ہر کھنڈ کے
گرد کھلا ہوا برآمدہ ہے۔ چوٹی پر کی برجی بارہ دری کی ہے۔ مسجد کے عقب میں اور چار چھوٹی چھوٹی
برجی دار مناریں ہیں۔ مسجد کے بڑی بڑی محرابوں کے سات در ہیں۔ مسجد کے اجارے
میں تمام تر سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ پیش دالان میں گیارہ در ہیں۔ دالان ۲۴ فٹ چوڑا ہے۔ ان میں کی

سینچ کی محراب ایک دروازے کی طرح چوڑی اور بلند ہے اور اُس کے دونوں جانب پتلی پتلی ہشت پہلو برجیاں ہیں۔ ان دروں کی پیشانی پر سنگ مرمر کی تختیاں چار فیٹ لمبی اور ڈہائی فیٹ چوڑی ہیں جن پر سنگ موسی کی پچیکاری سے کتبے ہیں۔ ان کتبوں میں تعمیر مسجد کے حالات اور شاہجہاں کے زمان سلطنت کے برکات کندہ ہیں۔ وہ کتبات یہ ہیں:-

پہلا کتبہ انتہائی شمالی محراب پر بہ فرمان شہنشاہ جہاں بادشاہ زمین وزماں گیہان خدیو کشورستان گیتی خداوند گردوں تواں مؤسس قوانین عدل وسیاست مشید ارکان ملک و دولت بسیار روان عالی فطرت قضا فرمان قدر قدرت فرخندہ رائے خجستہ منظر فرخ طالع بلند اختر آسمان حشمت انجم سپاہ خورشید بارگاہ۔

کتبہ در دوم مظہر قدرت الٰہی مورد کرامت نامتناہی مظہر کلمۃ اللہ العلیا مروج الملۃ الحنفیۃ البیضا ملجاء الملوک والسلاطین خلیفۃ اللہ فی الارضین الخاقان الاعدل الاعظم والقاآن الاجل الاکرم ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی لازالت رایات دولتہ منصورۃ و اعداء حضرتہ مقہورۃ کہ دیدۂ بصیرت حق بینش از شعشہ انوار ہدایت انما یعمر مساجد اللہ۔

کتبہ در سوم من آمن باللہ والیوم الآخر مستنیر است وآئینہ ضمیر صدق گزینش از اشعۂ مشکات روایت احب البلاد الی اللہ مساجدہا فروغ پذیر ایں مسجد کوہ اساس گردوں مماس کہ کریمۂ لمسجد اسس علی التقوی بیان بنیان پائدار اوست وہینہ والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم کنایۂ ایوان استوار او قمۂ وقبۂ فلک شانش از طبقات آسمان گزشتہ وشرفہ طاق سپہر نشانش با وج کیواں پیوستہ۔

کتبہ در چہارم گر ز طاق وقبۂ مقصورہ اش جوئی نشاں ہیچ نتواں گفت غیر از کہکشاں تک سماں فرو بودے قبۂ گردوں نبودے نائیش + طاق بودے طاق گر جفتش سے گہکشاں فروغ شمسیش طاق جہاں نمائش روشنی بخش مصابیح سموات پر تو کلس گنبد عالم آرائش نور افزائے قنادیل جنات منبر سنگ مرمرش چوں صخرۂ مسجد اقصیٰ مرقات۔

کتبہ در پنجم مقام قاب قوسین او ادنی محراب فیض گسترش مانند صبح صادق کشادہ پیشانی

بشارت رسان تو لقد جاءہم من ربہم الہدیٰ ابواب رحمت آمایش صلائے والعہد عوا الیٰ دارالسلام بسامع خاص و عام رسانیدہ منار سپہر مدارش ندائے ویجزی الذین احسنوا بالحسنیٰ از نہ رواق گنبد فیروزہ فام گزرانیدہ سقف رفیع باصفایش تماشاگاہ روحانیانِ کرۂ افلاک

کتبۂ درِ ششم پیش طاق

یا ھادی (بخط طغریٰ)

کتبۂ درِ ہفتم

صحن وسیع دلکشایش سجدہ گاہ پاک نزاد ان معمورۂ خاک روح فضائے فیض انتما و طیب ہوائے روح افزایش از روضۂ رضوان حکایت کردہ و عذوبت مار معین حوض دلنشین لطافت آمایش از چشمۂ سلسبیل خبر دادہ در روز جمعہ دہم شہر شوال سال ہزار و شصت ۱۰۶۰ ہجری موافق سال چہارم از دور سیوم جلوس میمنت مانوس بساعت خجستہ۔

کتبۂ درِ ہشتم

و طالع شائستہ ابتنا و پیرایۂ تاسیس یافت و در عرض مدت شش سال بحسن سعیِ کارپردازانِ کاروان کارگزار و فرط اعتنا و اہتمام کارفرمایان صاحبِ اقتدار و بذلِ جد و جہد استادان ماہر دانشور و وفورِ کوشش پیشہ کاران چابک دست صاحب ہنر و انفاق مبلغ دہ لک روپیہ صورت انجام و طراز اختتام پذیرفت و مقارنِ اتمام در روز عید الفطر۔

کتبۂ درِ نہم

بفرِ قدوم اقدس بادشاہ ظل الٰہی صافی نیت خدا آگاہ زیب و زینت گرفت و باقامت نماز عید و اداے وظایف اسلام چون مسجد الحرام در روز عید اضحیٰ مرجع طوایف انام گردید و مبانی اسلام و ایمان را متانت و رصانت کرامت فرمود سیاحانِ ربع مسکون و مسالک نوردانِ کوہ و ہامون را آراستہ عمارتے باین رفعت و حصانت در آئینۂ بصر۔

کتبۂ درِ دہم

و مرات خیال مرتسم نگشتہ و حقایق گزران وقایع دہر و فکرت پردازان نظم و نثر را کہ سوانح نگارانِ بدایع ارباب ملک و دولت و صنایع غفران صحاب مکنت و قدرت اند فراختہ بناے باین شکوہ و عظمت بر زبان قلم و قلم زبان نگذشتہ فرازندۂ کاخ ہستی و طرازندۂ بلندی و پستی این بنیانِ رفیع را کہ قرۃ العین بینش و زینت بخش

نمازخانہ آفرینش است۔

کتبۂ دریازدہم | پائدار داشتہ صدائے تسبیح سبحانش راہنگامہ آرائے ذاکرانِ مجامع ملکوت و زمزمۂ تہلیل جلالش رانشاط افزائے معتکفان

مجامع جبروت داراد و رؤس منابر معمورۂ جہاں را بخطبۂ دولت جاوید طراز ایں پادشاہ داد گرزیب دہد کہ بیامن ذاتِ مقدسِ مبارکش ابواب امن و امان بر روئے روزگار کشادہ و آراستہ داراد بحق الحق و اہلہ۔ کتبہ نوراللہ احمد۔

صحن مسجد کے فرش سے اصل مسجد کے دالان پانچ فیٹ اونچے چبوترے پر واقع ہیں جن میں شرق شمال اور جنوب ہر سہ اطراف سے تین تین سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ مسجد کے تمام اندرونی مسقف حصے میں سنگ مرمر کا فرش ہے جس میں سنگ مرمر کے مصلے سنگِ موسیٰ کا حاشیہ دے کر نہایت خوب صورت بنائے گئے ہیں۔ ہر مصلیٰ تین فیٹ لمبا اور ڈیڑھ فیٹ چوڑا ہے اور کل مصلے ۸۹۹ ہیں۔ مسجد کے پچھواڑے جو بڑے بڑے گنڈ تھے اُن کو چھپانے کے لیے صحن مسجد میں بھراؤ کر کے عمارت کو بہت اونچی کرسی دی گئی ہے جس سے مسجد کی شان و شکوہ اور بھی نکل آئی ہے۔ یہ مسجد از سرتاپا سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے البتہ فرش۔ محرابیں اور گنبد سنگ مرمر کے ہیں۔ منبر کے پاس ایک بڑی گہری محراب ہے۔ منبر چار سیڑھیوں کا سنگ مرمر کے ایک ہی پتھر میں تراشا ہوا ہے اس میں کہیں جوڑ نہیں ہے۔ صحن مسجد محاط ہے۔ جس کے ہر طرف محراب دار بیس بیس فیٹ چوڑے اور اتنے ہی اونچے دالان ہیں۔ ان دالانوں کے کونوں پر بارہ اضلاع کے برج ہیں جن پر سنگ مرمر کے قبّے سنہری کلس لگے ہوئے ہیں۔ شمالی اور جنوبی دونوں دروازے ایک ہی وضع طرح کے نصف مثمن قبّے نما ہیں جن کا خطِ قاعدہ مسجد کے صحن کے جانب ہے اور پانچ ضلعے شہر کی طرف ہیں۔ دروازے پچاس فیٹ اونچے اور اسی قدر چوڑے ہیں اور ان کی گہرائی ۳۳ ہے۔ ان دروازوں کے اندر ایک ایک اور چھوٹا دروازہ دونوں طرف دونوں منزلوں میں ہے۔ دروازوں کے اوپر کنگورے اور اُن پر ایک قطار چھوٹی سنگ مرمر کی برجیوں کی ہے جس کے دونوں سروں پر نہایت خوب صورت اور نازک مینار ہیں۔ مسجد کا صدر دروازہ صحن کے مشرق میں ہے یہ دروازہ بڑا بھاری مثمن شکل کا گنبددار

پچاس فیٹ بلند۔ ساٹھ فیٹ چوڑا اور گہرا ان میں ۵ ہی۔ اس کی چوکون شکل سے اضلاع کو کاٹ کر ہشت پہلو بنادیا گیا ہی باقی شکل وصورت اس دروازے کی ویسی ہی ہی جیسی کہ دوسرے دروازوں کی ہی۔ مسجد کے تینوں دروازوں کے پٹوں پہ پیتل کی موٹی موٹی چادریں چڑھی ہوئی ہیں جن پر منبت کاری کا کام ہی۔ بادشاہ کی سواری بار بہاری قلعۂ معلی کے مشرقی دروازے سے رونق افروز ہوتی تھی۔ جب سے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا یہ دروازہ بھی بند ہی۔ مسجد کے صحن میں سنگِ سرخ کے بڑے بڑے چوکے بچھے ہوئے ہیں جو ۱۳۶ گز مربع ہی۔ باوجود اس وسعت کے اس کا ڈھلاؤ اس خوبی کا رکھا گیا ہی کہ ادھر مینہ برسا ادھر صاف۔ کیا مجال کہ کہیں ایک قطرہ باقی کا کھڑا تو رہ جائے دوسری ندرت اس مسجد میں یہ ہی کہ ساری مسجد میں کبوتر یا ابابیل کا نام نہیں ورنہ ہمیں فتحپوری کی مسجد میں کبوتروں سے ناک میں دم ہی اور حیدرآباد دکن کی مکہ مسجد کو دیکھیے کہ کبوتروں کے مارے دروں میں جال لگا دیے جب کہیں جاکر امن ملا ہی۔

حوض

زصحنش فیض دیگر می تا تواں یافت + زحوضش آب کوثر می تواں یافت
زرفعت آسماں یک پایۂ او + سر خورشید زیرِ سایۂ او
رواقش قبلۂ اہلِ یقیں ست + نظیرِ مسجدِ اقصیٰ ہمیں ست

صحن کے بیچوں بیچ فرش سے ایک ہاتھ اونچا پندرہ گز سے بارہ گز خالص سنگِ مرمر کا حوض ہی جس میں سنگ موسی کی سیاہ سیاہ تحریریں اور بھی سنگِ مرمر کی سفیدی کو رونق دیتی ہیں۔ سہ دُرِ ابلق کے کم دیدہ موجود۔ گر اشکِ بتانِ سرمہ آلود چاروں کونوں پر چار لالٹینیں اور بیچ میں فوارہ جو جمعہ۔ عیدین اور الوداع کو چھوٹا کرتا تھا حوض کے غربی گوشے پر ایک چھوٹا سا کٹہرا سنگ مرمر کا محمد حسین خاں محلی خواجہ سرا بنوادیا ہی اس واسطے کہ اس مقام پر علی روایت العوام جناب رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بیٹھے ہوئے خواب میں دیکھا تھا اور اُس کٹہرے کے اندر یہ اشعار کندہ ہیں

کوثر محمد رسول اللہ ۱۱۸۰ھ

رسول دیدہ اند ایں جا ولی واہل اللہ + بجاست گر شود ایں سنگ ہم زیارتگاہ
بنائے سال بہ تحسین و آفریں ہاتف + بگفت احاطۂ جائے نشست رسول اللہ

(۱۱۸۰ھ)
(۱۷۶۶ء)

پہلے یہ حوض رہٹ کے کنوئیں سے بھرا جاتا تھا جو مسجد کے شمال و مغرب کے کونے میں تھا باوجود اس قدر اونچائی کے بھی پانی برابر چڑھتا تھا اور اندر ہی اندر صحن مسجد میں پانی پونچ کر حوض لبریز رہتا تھا۔ یہ کنواں ۱۸۳۰ء میں خشک ہوگیا تھا جس کی مرمت مسٹر سیٹن رزیڈنٹ وقت نے کرادی تھی۔ یہ کنواں بھی شاہجہاں نے پہاڑی کاٹ کر بنایا تھا جس پر رہٹ یعنی چرخ لگا رہتا تھا۔ ہماری یاد تک موجود تھا اب چند سال ہوے کہ اُس سے پانی لینا بند کردیا گیا۔ حوض میں اب نل کا پانی آتا ہے۔ سنا گیا ہے کہ مینار اس صنعت سے بنائے گئے ہیں کہ اگر اتفاقاً کوئی مینار گرے تو صحن میں گرے تاکہ مسجد کی چھت اور گنبدوں کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے چنانچہ کئی دفعہ کے تجربے سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اس مسجد کی مرمت دفعۂ اول میں بزمانۂ اکبر شاہ ثانی ۱۸۱۷ء میں ہوئی تھی۔ دوسری مرتبہ ۱۸۵۱ء میں ایک کڑی ٹوٹ گئی تھی۔ تیسری مرتبہ ۱۸۲۳ء میں مسجد کے شمالی مینار پر بجلی گرکر مینار اور نیچے کا فرش دونوں شکستہ ہوگئے تھے مگر عمارت کو کچھ نقصان نہیں پونہچا جس کی مرمت برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کرائی گئی۔ چوتھی مرتبہ ۱۸۹۵ء میں جنوبی مینار پر ہماری یاد میں بجلی گری اور برجی کو نقصان پونہچا لیکن اور عمارت محفوظ رہی۔ اس مرتبہ نواب صادق علی خاں صاحب بہادر والی ریاست بہاولپور نے چودہ ہزار کے عطیئے سے مرمت کی گئی۔ نواب کلب علی خاں صاحب بہادر مرحوم و مغفور والی رامپور نے ۱۸۸۳ء میں ایک لاکھ پچپن روپیہ کے گراں قدر عطیئے سے ساری مسجد کی ایسی مرمت کرائی کہ گویا نیا کردیا۔ سید زماں شاہ صاحب کے اہتمام سے ۱۸۸۳ء میں مرمت شروع ہوئی اور ۱۸۹۶ء میں ختم ہوئی۔ بہاولپور کا روپیہ صرف مینار کی درستی میں صرف ہوا۔ گو یہ مینار دراصل مخروطی ہیں مگر اس میں بھی یہ صنعت رکھی گئی ہے اور ایسی بہتر باٹنی کی ہے کہ نیچے کھڑے رہ کر دیکھیئے تو نیچے سے اوپر تک یکساں نظر آتے ہیں چوں کہ دونوں میناروں پر زینہ ہے لوگ کثرت سے چڑھتے ہیں اوپر جاکر سارا شہر ہتیلی میں نظر آتا ہے۔ الوداع کے جمعہ کو بڑی خلقت جمع ہوتی ہے اندر بیرونجات سے لوگ ایسی کثرت سے آتے ہیں کہ مسجد بھر جاتی ہے اور تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی سیڑھیوں پر بھی نمازی ہی نمازی نظر آتے ہیں بلکہ سڑک کے اس پار محلۂ مچھلی والوں کی طرف نیز قلعے کے میدان تک میں نماز ہوتی ہے۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ الوداع کے دن ایک گنوار شمالی مینار پر چڑھا

ہوا سے اُس کی چادر اُڑ گئی اُسے لینے کو جھکا۔ جھونک نکل گیا صحن میں آن پڑا۔ دم تو گرتے گرتے ہی نکل گیا ہوگا مگر ساری ہڈیاں چورا چورا ہو گئی تھیں۔

مکبّر

چوں کہ مسجد میں نمازیوں کی کثرت مور و ملخ سے زیادہ ہوتی ہے خصوصاً جمعۃ الوداع میں کہ دس بجے دن کے بعد مسجد کے اندر جگہ کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مسجد، صحن، دالان، چھتیں، چھجے، برج، سب بھر کر سڑکیں تک رُک جاتی ہیں اور جہاں تک نظر جاتی ہے آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔ فی الواقع دلّی کی نماز الوداع عیدین کی نماز سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ بھلا اتنی دور تکبیر کی آواز کیسے جا سکتی ہے دو چار صفوں میں آواز گونج کر رہ جاتی ہے۔ اس لیئے شاہزادہ سلیم ابن معین الدین اکبر ثانی نے ۱۸۲۹ء میں پیش طاق یعنی محرابِ وسطی کے سامنے ایک مکبر سنگ مرمر کا بنوا دیا۔ جس وقت مکبر اس پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہتا ہے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دل لرز جاتے ہیں تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ کا سماں بندھ جاتا ہے اور وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔

کرۂ ارض

صحن مسجد کے شمال و مشرق کے کونے میں ایک کرۂ ارض بھی سنگ مرمر پہ بنا ہوا ہے۔

دھوپ گھڑی

اسی کے محاذی ایک دائرہ ہندی یعنی دھوپ گھڑی سنگ مرمر کی نماز کا وقت جاننے کے لیئے بنی ہوئی ہے۔

درگاہِ آثار شریف

مرا طاقتِ دیدنِ او کجاست ✦ کہ بے خود شوم ہر کہ نامش برد

اسی طرف کے دالان کے ایک حجرے میں آثار شریف جناب محمد رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام رکھے ہوئے ہیں پہلے یہ تبرکات شمال و مغرب کے دالان کے حجرے میں مسجد کی بائیں جانب تھے جس کے آگے اورنگزیب عالمگیر کے وقت میر الماس علی خاں خواجہ سرا نے مجحر سنگ سرخ کا جالی دار بنوا دیا تھا اور اس پہ یہ تاریخ کندہ تھی۔

پیشِ آثار مبارک سرورِ آخر زماں	در زمانِ شاہ عالم گیر خاقانِ جہاں
با سیادت ساخت دیوارِ محجر از سنگِ سرخ	بندۂ با اعتقاد از صدقِ دل الماس خاں
سالِ تاریخ بنا چوں میر جست از عقل و ہوش	گفت ہاتف بہرِ خود وا کرد الباب جناں

پھر اس کے بعد ۱۸۴۲ء میں ایک سخت آندھی آنے سے یہ محجر گر پڑا تھا بہادر شاہ بادشاہ

نے از سر نو اس مسجد کی تعمیر کرائی جو اب تک موجود ہے۔

تبرکات

یہ درگاہ شریف اور یہاں کے تبرکات بہت قدیم بتلائے جاتے ہیں۔ بعض تبرکات امیر تیمور کو بایزید بادشاہ روم سے پہنچے اور بعض قسطنطنیہ سے لائے گئے ہیں۔ موجودہ تبرکات یہ ہیں:-

(۱) چند پارے کلام مجید کے نوشتہ حضرت علی کرم اللہ وجہ

(۲) چند پارے کلام مجید کے نوشتہ حضرت امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام

(۳) کامل کلام مجید نوشتہ حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

(۴) چند پارے نوشتہ حضرت امام جعفر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

(۵) موئے مبارک حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۶) نعلین شریف (۷) قدم شریف (۸) غلاف مزار اقدس۔ (۹) پنجہ شریف حضرت مولیٰ علی شیر خدا۔

(۱۰) چادر مبارک جناب سیدۃ النسا حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا (۱۱) غلاف مبارک کعبہ شریف۔ یہ سب تبرکات اورنگ زیب کے وقت میں جامع مسجد میں رکھے گئے بادشاہان وقت ہمیشہ زیارت کو آیا کرتے تھے اور جمعۃ الوداع کو بارہ اشرفیاں نذر پیش فرماتے تھے۔ زمانِ سلاطین میں آثار شریف کی زیارت ماہ محرم کے پہلے جمعے۔ آخری چہار شنبہ۔ ماہ ربیع الاول میں دس سے بارہ تاریخ تک۔ ماہ ربیع الثانی میں گیارہویں تاریخ۔ جمادی الاولیٰ کی تیرھویں۔ جمادی الثانیہ کا پہلا جمعہ۔ رجب میں ۲۷ تاریخ شب معراج میں رجبی شریف کی مجلس اور میلاد شریف بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ جھاڑ۔ فانوس۔ مرد نگ قندیل۔ ہانڈیاں روشن ہو کر ۲۸ کو زیارت ہوتی تھی۔ شعبان کی چودہ۔ رمضان شریف میں جمعۃ الوداع۔ شوال کی بیسویں ذی قعدہ کی چوتھی۔ ذی الحجہ کی نویں۔ غرض تمام سال میں بارہ مرتبہ زیارت ہوتی تھی اور ہر جمعہ کو بعد نماز صرف قدم شریف کی زیارت ہوتی تھی۔ زمان شاہی میں اس کی معاش (۴۴۳) مواضع تھے عشرۂ محرم الحرام میں نیاز حضرت سید الشہدا اور بروز عاشورہ بڑے اہتمام سے ہوتی تھی۔ حضرت سید عبدالعزیز سجادہ نشین درگاہِ آثار مبارک قلعۂ معلیٰ میں جا کر بہادر شاہ بادشاہ کے خاص محل میں نیاز دیا کرتے تھے۔ مجلس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جملہ اقسام کی نعمتیں اور میوے مہیا ہوتے تھے۔ ایک مسند پر گاؤ تکیہ لگا ہوا اور پس پشت مسند ابو ظفر بادشاہ ایک مورچھل لیئے اُس

مسند پر مگس رانی کرتے تھے بادشاہ کے قریب ایک چینی کے پیالے میں صندل بھرا ہوا رکھا رہتا تھا اور شیر برنج کی قفلیاں۔ سجادے صاحب نے صلوٰۃ و السلام اور قران شریف پڑھا اور شجرۂ بادشاہانِ مغلیہ پڑھ کر دعا کی۔ بعد بادشاہ نے سجادے صاحب کے رخساروں پر صندل کی لکیریں بنائیں اور پھر قفلیاں نیاز کی تقسیم ہونے لگیں۔ بارہ خوان خاصے اور میوے کے سجادے صاحب کے پاس آتے تھے غرض یہ کہ بڑے خلوص عقیدت اور اہتمام سے نیاز کی جاتی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں گورنر جنرل دہلی میں آئے اور ۲ ذی قعدہ کو زیارت کرکے پانسو روپیہ نذر دی۔ کرنل طامسن نے برٹش گورنمنٹ سے دو سو روپیہ سالانہ عیدین کے مقرر فرماتے تھے۔ لارڈ میو۔ لارڈ نارتھ بروک۔ لارڈ لٹن۔ ڈیوک آف کیناٹ۔ لارڈ رپن لارڈ ڈفرن۔ لارڈ لینسڈون سب تشریف لائے۔ لارڈ کرزن تین مرتبہ آئے۔ لارڈ ہارڈنگ آئے مگر درگاہ کی کسی نے خبر نہ کی پھر دوبارہ خاص کر زیارت کی غرض سے آئے۔ تمام والیان ملک مثل امیر حبیب اللہ خان امیر کابل۔ حضور عالی نظام والیان رامپور۔ جاورہ۔ ٹونک۔ اندور۔ گوالیار۔ میسور سب ہی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اب بھی ہر جمعرات اور ۳۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۷۔ ۲۰۔ ۲۲۔ ان تاریخوں میں روشنی اور قرآن خوانی برابر جاری ہے۔ اب اس درگاہ کے سجادے حضرت سید محمد عبداللطیف صاحب حسینی لبابزرگ ہیں۔

مسجد کی ضبطی اور واگزاشت

شاہجہاں کے بعد ہر بادشاہ کے زمانے میں مسجد عمدہ حالت میں رہی مگر سنتے ہیں کہ ابوظفر بہادر شاہ کے وقت میں کچھ بدنظمی ہو گئی۔ غدر میں مسجد ضبط۔ نماز بند اور سرکاری پہرا چوکی قایم ہوگیا۔ کئی برس یہی حال رہا۔ خدا خدا کرکے ۲۷ دسمبر ۱۸۶۲ء کو مسلمانوں کی استدعا پر گورنمنٹ نے مسجد کو واگزاشت کردیا اور ایک منتظمہ کمیٹی کے سپرد اس کا انتظام کردیا جس کے دس مسلمان معززین دہلی ممبر ہیں۔ چونکہ انگریزوں کے ہاں جوتی پہن کر عبادت گاہ میں جانا معیوب نہیں بلکہ وہ تعظیماً سر برہنہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس مسجد میں بھی صاحبان انگریزی آیا کرتے تھے اور مسلمانوں کے دل اس حرکت سے آزردہ تھے۔ لارڈ کرزن بڑے دور اندیش اور حق پسند ویسرائے تھے۔ اُن کو تالیف قلوب کے ڈھنگ خوب معلوم تھے ۱۸۹۹ء میں جب دہلی تشریف لائے اور مسجد کا ملاحظہ فرمایا تو سب سے پہلے خود ہی جوتی پر موزہ چڑھا لیا

اور مسجد کو دو سو روپئے بھی جیب خاص سے عنایت فرمائے پھر تو یہ حکم ہی ہوگیا اور اب اسی پر عمل درآمد ہے۔

مسجد کی آمدنی اور خرچ

مسجد کی آمدنی تہ بازاری اور دکانوں کی قریب دو ڈھائی ہزار نقد سالانہ کے ہے۔ اور اسی کے لگ بھگ خرچ بھی ہے۔ رہی متفرق آمدنی جو رؤسا وغیرہ سے ہوتی ہے یا کبھی کوئی جلسہ یا دربار ہوا تو مسجد کی سیڑھیوں پر نشست کا ٹکٹ لگا دیا جاتا ہے یہ تعمیر وغیرہ میں صرف ہوتی ہے۔ یہاں کے امام جناب شمس العلما رحاجی سید احمد صاحب ہیں جن کو ریاست امدمت سرکار عالی نظام سے چار سو روپیہ ماہوار ملتی ہے۔ گو کہ مسجد کو بنے ہوئے (۲۷۷) برس ہوسنے آئے مگر کچھ اس ڈھنگ کی نفیس ونادر وخوش وضع عمارت ہے کہ جب دیکھو نئی ہی معلوم دیتی ہے جس پر ہمیشہ نور ہی نور برستا رہتا ہے۔

مسجد میں سور کا ذبح کیا جانا

خدا جانے کس قسی القلب کا کام تھا کہ مسجد کے ممبر پہ سور ذبح کرکے ڈال دیا۔ جس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور لوٹ پڑ گئی بازار کی دکانیں لٹ گئیں اور دہلی میں غدر مچ گیا جس کی سزا میں دہلی میں تعزیری پولیس مقرر کیا گیا تھا۔

مسجد میں جھاڑ کی چوری

ہزمیجسٹی امیر حبیب اللہ خاں صاحب جب دہلی تشریف لائے تھے تو انھوں نے پچاس ہزار روپیہ کا ایک چاندی کا بہت بڑا جھاڑ مسجد میں چڑھایا تھا جو بیچ کے در میں لٹکا رہتا تھا۔ خانۂ خدا کا بھی ڈر نہ ہوا باوجود پہرے چوکی کے وہ پورا جھاڑ ایسا چوری گیا کہ باوجود پولیس کی سعی وکوشش کے بھی برآمد نہیں ہوا۔

اقتباس از رپورٹ محکمہ آثار قدیمہ بابتہ سنہ ۱۶۔۱۹۱۷ء

مسٹر جے۔ ڈی بگلر نے جامع مسجد کے متعلق اپنی اس رپورٹ میں حسب ذیل ریمارک کیا ہے "زمانِ مابعد کی باقیات دہلی میں کثرت سے ہیں جن میں سب سے بڑی جامع مسجد ہے جو بلحاظ اپنی وسعت کے لاجواب ہے۔ اصلی مسجد سنگِ مرمر کی ہے جس کے سنگ مرمر ہی کے تین گنبد ہیں اور دونوں جانب دو میناریں سنگ مرمر اور سنگ سُرخ کی لمبی لمبی پٹیوں کی آئی

دالان۔ دروازے اور باقی تمام تر حصہ مسجد کا سنگ سرخ کا ہے مسجد کی بڑی تعریف کی جاتی ہے لیکن میرے خیال میں اتنی تعریف بے محل ہے۔ مسجد یقیناً بہت بڑی اور بڑی عالیشان ہے۔ صناعی بہت عمدہ ہے۔ اال سالا سنگِ مرمر بہت قیمتی ہے لیکن مسجد کی درمیانی محراب بمقابلے اِدھر اُدھر کی محرابوں کے اس قدر بڑی ہوگئی ہے کہ اُس کے سامنے ہر دو جانب کی محرابیں دب گئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے وسط میں گویا ایک بڑی بھاری اوٹ کھڑی کردی گئی ہے۔ علاوہ اس کے دالانوں میں روشنی کی کمی رہ گئی ہے۔ پھر دونوں جانب کی محرابوں پر ایسی بھاری بھاری اور بھدی اور غیر موزوں سفید کتبے (؟) لگادی ہیں کہ اُن سے محرابیں اور بھی دب گئی ہیں۔ اصل خوبی کی چیزیں جو [illegible] ہیں وہ اُس کے شان دار دروازے ہیں جن کے ادھر اُدھر ہوادار دالان ہیں اور اندر سے بڑھ کر باہر رونق ہے۔ مسجد کی سیڑھیوں کا ایک ایسا شان دار سلسلہ ہے جو دلی تو خیر اور کہیں بھی نظر نہیں آتا جس سے اس مسجد کو اور چار چاند لگ گئے ہیں۔ مسجد کی مرتفع کرسی اور سیڑھیاں ایسی خوشنما اور دل کش ہیں کہ وہ بجائے خود ایک قابل دید چیز ہے"۔

دارالشفا مسجد کے شمال میں شاہی دواخانہ موسوم بدر الشفا تھا۔

دارالبقا مسجد کے جنوبی دروازے کی طرف دارالبقا کا دارالعلوم تھا۔ اگلے زمانے میں اس میں طالب العلم رہتے تھے اور معقول و منقول پڑھا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ اُسی زمانے میں بالکل خراب و برباد ہو کر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ مولوی صدرالدین خاں صاحب صدرالصدور نے اپنی عالی ہمتی سے بصرف زر خطیر اس کو مرتب کیا اور شاہجہانی طور پر جو جو حجرے اس کے ٹوٹ گئے تھے اُن کو نئے سرے سے بنوایا تھا۔ طلبا کی خبرگیری بارچے کی خود فرماتے تھے۔ دارالشفا اور دارالبقا بہت پہلے ہی سے خراب وخستہ حالت میں تھیں غدر ۵۷ء کے بعد یہ دونوں عمارتیں گرا کر صاف میدان کر دیا گیا۔ یہ دونوں عمارتیں بھی مسجد کے ساتھ ہی ساتھ بنی تھیں۔

بازار زیر جامع مسجد اسی دروازے کے سامنے ایک بہت بڑا اور وسیع بازار تھا جو اس دروازے سے شروع ہو کر ترکمان اور دلی دروازے تک چلا گیا تھا۔ بازار تو اب بھی موجود ہے مگر بالکل معمولی حیثیت کا۔ وہ پہلی سی رونق اب نہیں رہی۔

ہرے بھرے شاہ صاحب کا مزار
۱۰۶۵ھ
۱۶۵۴ء

خاصانِ خدا خدا نباشند
لیکن ز خدا جدا نباشند

جامع مسجد کے شرقی دروازے کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر کسی قدر جانب شمال لب سڑک نیم کے درخت کے نیچے صوفی سرمد کی قبر سرخ رنگ کے کٹہرے کے اندر ہے اور اُن کے سرہانے سبز رنگ کے چوبی کٹہرے میں شاہ ہرے بھرے صاحب کا مزار ایک چبوترے پر ہے۔ ان دونوں مزاروں کے بیچ میں ایک نیم کا درخت حدِ فاصل ہے۔ نصف شمالی حصے میں ہرے بھرے صاحب کی قبر ہے اور نصف جنوبی قطعہ میں صوفی سرمد کی ہے۔ ہرے بھرے صاحب کی قبر کے سرہانے ایک پختہ طاق چراغاں کے لئے بنا ہوا ہے۔ آپ کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ مجاورین کہتے ہیں کہ آپ صوفی سرمد کے پیر و مرشد تھے جو اپنے وطن سبزوار سے ۱۰۶۵ھ ۱۶۵۴ء میں شاہجہاں کے عہد میں دہلی تشریف لائے تھے۔

صوفی سرمد کا مزار
۱۰۷۰ھ
۱۶۵۹-۶۰ء

مستور و مست ہر دو چو از یک قبیلہ اند
ما دل بعشوۂ کہ دہیم اختیار چیست

کہتے ہیں کہ سرمد پہلے یہودی تھے۔ دہلی کے قیام میں جہاں آپ کو تجارت کا شغل تھا مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ایک عرصہ دراز تک اسی کاروبار میں مصروف رہے۔ آپ بڑے عاشق مزاج تھے ٹھٹھے کے شہر میں کسی ہندو کے لڑکے کو آپ بہت چاہتے تھے مگر فوراً حال نے دامن کھینچا اور آپ پر مستی اور محویت کا ایسا عالم طاری ہوا کہ اُن کو اپنے تن من کی بھی خبر نہ رہی جامہ ظاہری تک سے غیریت کی بو آنے لگی۔ وہ لڑکا بھی آپ کی صحبت کے اثر سے مجذوب ہو گیا یعنی آپ ہی کے رنگ میں رنگ گیا۔ دونوں مل کر دلی آئے۔ صوفی صاحب کا جذبہ زوروں پر تھا لوگوں کا جمگھٹا ہونے لگا۔ شاہ جہاں کا زمانہ تھا۔ شہزادہ دارا شکوہ قدرتی طور پر مجذوبوں کا دیوانہ تھا۔

صوفی صاحب کا شہرہ سن کر فوراً حاضر ہوا اور پھر ایسی عقیدت بڑھی کہ اکثر آنے جانے لگا صوفی صاحب بھی دارا شکوہ کے معاون بن گئے چنانچہ آپ نے کئی قصائد بھی شاہزادے کی تعریف میں کہے۔ آپ کا کلام معجز نظام زبان زد خاص و عام ہے۔ ادھر تو شاہزادہ خود صوفی صاحب کے ہاں حاضر باش رہتا تھا ادھر بادشاہ کو بھی چپکے چپکے صوفی صاحب کی ملاقات کے لیئے ابھارتا رہتا تھا۔ مکرر سہ کرر عرض معروض کرنے سے بادشاہ کو بھی خیال ہوا۔ عنایت خاں رشتہ کو تفتیش حال کے لیئے مقرر فرمایا۔ عنایت خاں نے ہر چند جستجو کی کہ آپ کا اصلی حال کسی طرح معلوم ہو مگر کچھ پتہ نہ چلا۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

آخر مایوس ہو کر عنایت خاں نے بادشاہ کے سامنے یہ شعر پڑھا:-

بر سرمدِ برہنہ کرامات تہمت ست
کشفے کہ ظاہر است ازاں کشف عورت ست

بادشاہ نے فرمایا "بیک گزکرباش دہنِ خلق تواں دوخت"۔ جب عالمگیر کا زمانہ آیا تب بھی کھلے خزانے آپ دارا شکوہ کا ساتھ دیتے رہے۔ اورنگ زیب آپ سے ناراض ہو گیا۔ دارا شکوہ کے قتل کے بعد اورنگ زیب نے بلا بھیجا اور پوچھا کیوں جی! کیا یہ بات سچ ہے کہ تم نے دارا سے دلی کی سلطنت دلانے کا وعدہ کیا تھا؟ آپ نے جواب دیا۔ "ہاں میں نے اس سے ابدی سلطنت دلانے کا وعدہ کیا تھا"۔ عالمگیر نے ایک مرتبہ سرمد کو بلا کر کہا کہ "تم ننگے کیوں پھرتے ہو کپڑے کیوں نہیں پہنتے؟" آپ نے فی البدیہہ جواب دیا۔

آں کس کہ ترا اسریر سلطانی داد	ما را ہمہ اسبابِ پریشانی داد
پوشاند لباس ہر کہ را عیبے دید	بے عیباں را لباسِ عریانی داد

ایک دفعہ ملا عبدالقوی نے بادشاہ کے اشارے سے سرمد کو بلایا اور پوچھا کہ "چرا عریاں می باشی؟" سرمد نے جواب دیا کہ "شیطان قوی ست"۔ نوبت بایں جا رسید کہ آپ علی رؤس الاشہاد اپنے آپ کو خدا کہنے لگے۔ اورنگ زیب بھلا ایسے مزخرفات کب متحمل ہو سکتا تھا علماء سے فتویٰ لیا۔ سب نے قتل کی رائے دی اور آپ ۱۰۷۰ھ ۱۶۶۰ء

شہ روئی کا پھر ۱۲

میں شہید کیے گئے۔ صوفی لوگ کہتے ہیں کہ سرمد کا بے گناہ قتل کیا جانا ہی بڑا سبب سلطنت مغلیہ کے زوال کا تھا۔ آپ کے مزار کے سرہانے ایک پتھر کی تختی پر یہ تاریخ کندہ ہے:-

شاہِ سرمد بعہد عالم گیر
چوں سفر ساختہ بخلدِ بریں
گفت تاریخ اکبرِ مسکیں
لحد مرقد شہید سرمد ایں
۱۰۷۰ھ

سید شاہ محمد عرف ہینگا مدنی کی قبر
۱۰۸۵ھ — ۱۶۷۴ء

فرخا شہرے کہ تو بودی دراں
اے خنک خاکے کہ آسودی دراں

جامع مسجد کے شرقی دروازے کے سامنے صوفی سرمد اور ہرے بھرے شاہ کے مزاروں کے پاس جنوب کی طرف آپ کی قبر ہے جو زمین میں چند انچ دھنس گئی ہے۔ آپ کا حال سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم کہ آپ صوفی سرمد کے خلیفہ تھے۔

شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مزار
۱۱۴۲ھ — ۱۷۲۹ء

شکر نتواں گفت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ بن نیست اگر بادگرے ہست

حضرت قطب العالم مولانا شیخ کلیم اللہ صاحب جہان آبادی علیہ الرحمہ کا مزار جامع مسجد اور قلعے کے بیچ میں ہے۔ جامع مسجد کے شرقی دروازے سے تقریباً تین سو قدم کے فاصلے پر سبز چوبی کٹہرا نظر آتا ہے۔ قبر دُہرے چبوترے پر ہے۔ اوپر کے چبوترے پر آپ کی قبر ہے اور نیچے کے چبوترے پر دو اور کسی کی قبریں ہیں۔ قبر کا تعویذ سنگ مرمر کا ہے جس کے بیچ کی خلا میں مٹی بھری ہوئی ہے۔ آپ کے اوصاف و کمالات بے شمار ہیں۔ آپ بڑے ذی علم اور مقدس صاحب تفرید و تجرید تھے۔ سب سے الگ تھلگ گوشۂ عافیت میں اس طرح رہتے تھے کہ کوئی آپ کو نہ جانے۔

آپ قریشی النسب تھے۔ آپ کے والد کا نام شیخ نور اللہ مہندس تھا۔ جامع مسجد کے خوشخط کتبات آپ ہی نے لکھے ہیں۔ آپ ۱۴ رجادی الثانی ۱۰۶۶ھ میں پیدا ہوئے لفظ غنی تاریخ ہے۔ اکتساب علم کے بعد محبت الٰہی سے جوش کا غلبہ ہوا مرشد کامل کی تلاش میں بیت اللہ شریف پہنچے پھر ایک مجذوب کی بشارت کے موافق مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ یحییٰ مدنی علیہ الرحمہ سے بیعت کی۔ چند روز کے بعد قطبیت ملی۔ اس کے بعد جہاں آباد (دہلی) میں تشریف لاکر درس و تدریس میں مشغول ہوئے۔ آپ کو بظاہر قلتِ معاش تھی مگر دل غنی تھا اور اسی پر قانع۔ صابر اور شاکر تھے۔ بادشاہ فرخ سیر نے آپ کو مکان اور وظیفہ دینے کی ہر چند تمنا کی مگر آپ نے ہمیشہ انکار کیا اور ڈھائی روپیہ ماہوار جو آپ کا ذاتی کرایہ تھا اسی میں تنگی ترشی سے بسر کرتے رہتے۔ فقر کو فخر سمجھتے تھے۔ دن کو قال اللہ اور رات کو فقط اللہ اللہ کا شغل تھا۔ لوگوں کا ہجوم تھا عموم میں خصوص اور خصوص میں عموم تھا۔ چاروں سلسلوں میں اجازت تھی۔ ہزاروں مرید ہوئے سینکڑوں طالب علم تعلیم کے ساتھ تصنیف کا بھی خیال تھا۔ سواء السبیل تسنیم۔ عشرۂ کاملہ۔ تفسیر کلیمی کشکول۔ ردر وافض مرقع کلیمی۔ وغیرہ کتابیں آپ کی تصنیف ہیں۔ آپ کا وصال محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ میں ہوا۔ بانائی چبوترے کے شمال میں یہ تاریخ کندہ ہے اور اس کے پیچھے ایک طاق چراغاں کا بنا ہوا ہے۔

۱۷ اکتوبر ۱۷۲۹ء

فضل و کمالِ خویش بود	مرہم قلب ریش بود
سالِ وصالش گفتہ ہاتف	قطب زمانہ خویش بود

۱۱۴۲ھ

سید بھورے شاہ صاحب کی قبر

کو کہم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش

قلعے کی فصیل کے نیچے خندق کے دوسری طرف مابین لاہوری اور دلی دروازے کے دہرے چبوترے پر یہ قبر ہے جس کے نیچے کا چبوترا اینٹوں کا حال کا بنا ہوا معلوم دیتا ہے اوپر کا چبوترا۔ قبر کا تعویذ۔ چراغاں کا طاق سب چونے گچی کے پختہ بنے ہوئے

ہیں۔ سید بھورے شاہ صاحب کون بزرگ تھے اور ان کا انتقال کب ہوا اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

سنہری مسجد (زیر قلعہ)

۱۱۶۵ھ ۱۷۵۱ء

ای زیادِ غیر تو جائز نہی۔
بر لبش آرام اگر فرماں دہی

سلطنت مغلیہ کے انحطاط کے زمانے میں احمد شاہ کے عہد میں (۴۸-۱۷۵۴ء) جاوید خاں نامی ایک مشہور با اقتدار امیر تھا جو نواب قدسیہ بیگم کا مشیر خاص تھا اور جس کا خاتمہ احمد شاہ کے ہی زمانے میں عبرتناک طور پر ہوا۔ اس شہر میں اس نام کی تین مسجدیں ہیں جن میں سے ایک چاندنی چوک میں کوتوالی کے پاس اور دوسری فیض بازار کے شمال میں جو اب قاضی زادوں کی مسجد کہلاتی ہے روشن الدولہ کی بنوائی ہوئی ہیں جس کا ذکر علیحدہ آ چکا ہے۔ جاوید خاں کی مسجد بھی سنہری مسجد ہی کے نام سے مشہور ہے۔ جو قلعے کے میدان میں کوئی سو گز کے فصل سے بنی ہوئی ہے لطافت اور نزاکت اس کی بیان سے باہر خوبی اور خوشنمائی اس کی حد سے زیادہ ہے۔ قطع اس کی بہت خوب اور وضع اس کی نہایت مرغوب ہے۔ سر سے پاؤں تک سنگ باسی کی بنی ہوئی ہے اور دو مینار ہیں خوب صورت وہ بھی سنگ باسی کے ہیں۔ تین گنبد تھے سنہرے یعنی کاٹ کے گنبد بنا کر اس کے اوپر تانبے کی موٹی موٹی چادریں چڑھائیں تھیں اور چادروں پر سونے کے پترے منڈھ دیئے تھے اور اسی طرح تمام برجیاں اور کلسیاں اس مسجد کی سنہری ہیں اور اندر سے تمام در و دیوار سونے میں لپٹی ہوئی تھیں۔ امتداد زمانہ اور بارش کے اثر سے گنبدوں کا کاٹھ گل کر برج ٹیڑھے پڑ گئے تھے ۱۸۵۲ء میں بہادر شاہ ثانی بادشاہ کے حکم سے وہ برج اُتار کر پختہ چونے گچی کے جن پر سنگ سرخ کی مستطیل پٹیاں پڑی ہوئی ہیں بنوا دیئے گئے۔ برجیاں جوں کی توں اپنی حالت اصلی پر قایم ہیں۔ یہ مسجد ہر کہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کی مصداق ہے۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹی مسجد ہے جو مشرق سے مغرب تک (۵۰) فٹ اور شمال سے جنوب تک (۱۵) فٹ ہے لیکن بلحاظ عمدگی عمارت اور نفاست ساخت کے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یہ سلاطین مغلیہ کے زمانہ آخر کی عمارات کا

نقشہ سنہری مسجد متصل قلعہ
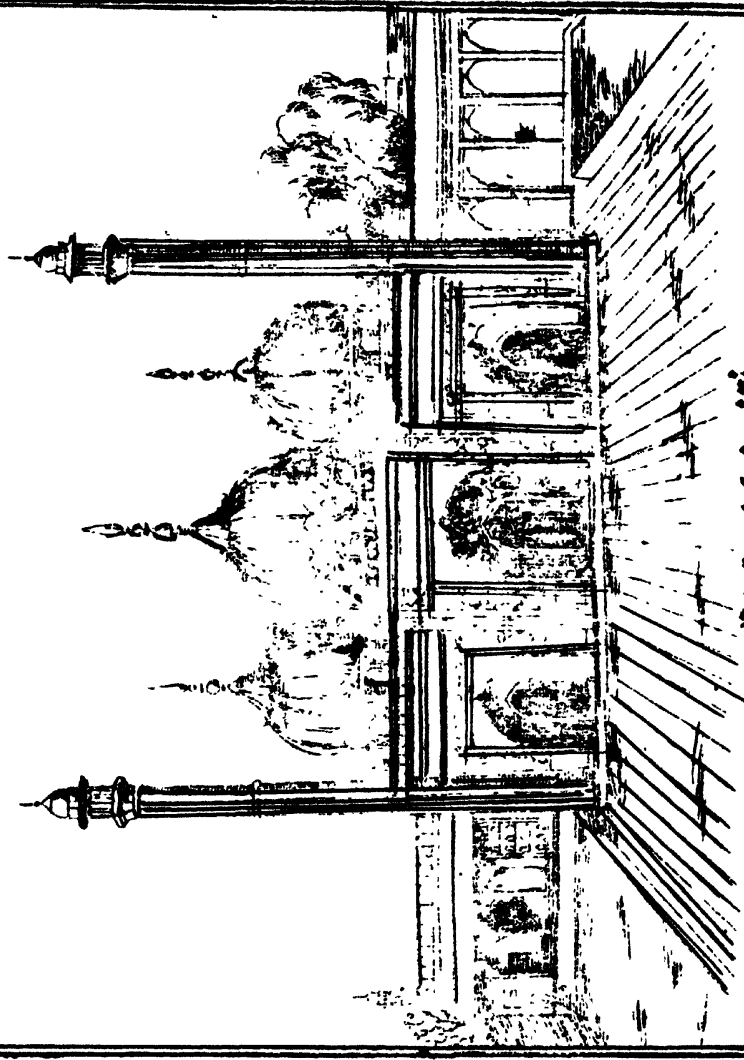
ایک بہترین نمونہ ہی۔ چھٹائی کے ساتھ اس قسم کا حیرت انگیز سڈول بنا ایک عجیب و غریب ترکیب ہی۔ تین شان دار اور خوش نما گنبدوں کے ادھر اُدھر پتلی پتلی تین کھنڈ کی مینارین ساٹھ ساٹھ فیٹ بلند جن پر ہشت پہلو سونے کے کلس کی بُرجیاں ہیں جن سے مسجد کی خوب صورتی کو اور چار چاند لگ گئے ہیں۔ یہ مسجد کسی زمانہ میں وسط آبادی میں ہوگی اب چوں کہ قلعہ کے اطراف کا میدان بالکل سپاٹ کر دیا گیا ہی یہ بیچاری مسجد اکیلی لب سڑک تیراہے پر کھڑی ہی۔ جنوب رُخ سڑک صحن مسجد کے اونچان کے برابر ہی البتہ مشرق کی طرف کی سڑک اس قدر پست ہی کہ اُدھر خوب صورت اور بلند دروازہ بنایا گیا ہی۔ اِس دروازے کی محراب پر سنگ تراشی کا نہایت عمدہ کام ہی اور دروازے کے پاکھوں پر چھوٹے چھوٹے خوش نما طاق اوپر سے نیچے تک بنے ہوئے ہیں جن پر ہر قسم کے نقش و نگار ہیں۔ یہ دروازہ دُہری محراب کا ہی جس کی بلندی کٹہرا چھوڑ کر (۱۳) فٹ (۵) انچ اور چوڑان (۸) فٹ (۷) انچ ہی۔ دروازے کے اوپر ایک بہت خوش قطع دوہرا کٹہرا صحن مسجد سے پانچ فٹ سات انچ اونچا بنا ہوا ہی جس میں برابر برابر چھوٹے چھوٹے محراب دار در لگا دیئے گئے ہیں جس کے اِدھر اُدھر چار چار سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جن پر سے ہم دروازے کے اوپر چڑھ جاتے ہیں۔ یہ دروازہ صحن مسجد سے پانچ فٹ، انچ اونچا ہی جس کے ہر دو جانب باہر وار کو دو بڑے بڑے محراب دار طاق ہیں۔ دروازے کے بیچ میں نو سیڑھیاں ہیں جن کو چڑھ کر ہم صحن مسجد میں پہونچ جاتے ہیں جس کے ادھر اُدھر چھوٹے چھوٹے چبوترے ہیں۔ پہلے اس دروازے کے ادھر اُدھر ایک ایک مینار بھی تھی جو غدر کے بعد تڑوا دی گئیں۔ صحن مسجد میں بھورے پتھر کے چوکے بچھے ہوئے ہیں۔ جو (۴ ۳) فٹ مربع اور اٹھارہ انچ اونچا ہی۔ مسجد اکہرے والان کی ہی جس میں تین در ہیں۔ بیچ کا محراب دار در پندرہ فٹ اونچا اور دس فٹ چوڑا ہی جس کی دونوں طرف اس سے کچھ چھوٹے اَور دو در ہیں۔ ان تینوں دروں کے اوپر پانچ فیٹ اونچا کٹہرا ہی۔ بیچ کی محراب کے اوپر کا کنگورہ بہ نسبت ادھر اُدھر کی محرابوں کے کنگورے کے کچھ بڑا ہی اور چھوٹے دروں کا اسی مناسبت سے چھ فیٹ پست اور چھوٹا۔ مسجد کی تین بنگڑی دار محرابی در ہیں جن میں سے بیچ کی محراب ادھر اُدھر کی

محرابوں سے کچھ زیادہ بڑی ہے۔ ان محرابوں پر عمدہ نقش و نگار ہیں بیچ کی محراب کے سامنے پتھر کا چوڑا چھجا لگا ہوا ہے اور باقی دو محرابوں کے سامنے ان کی بلندی کی مناسبت سے چھجے کی چوڑان کچھ کم رکھی گئی ہے۔ دالان کے تین حصے ہیں اور ہر حصہ پر ایک ایک کوٹھی دار گنبد ار اُس پہ سنہری کلس ہے۔ درمیانی گنبد کی بلندی پینتالس فٹ ہے اور ادھر ادھر کے گنبد اُس سے پانچ فٹ کم ہیں۔ درمیانی محراب کے ادھر ادھر چھت پر نہایت پتلی پتلی نازک دو مینار ہیں آٹھ فیٹ بلند استادہ ہیں جن پر خوب صورت گلدستہ بنا ہوا ہے اور پہلے سنہری کلس بھی تھا جواب نہیں ہے جس طرح محاذ مسجد میں صدر محراب کے ادھر ادھر دو پتلی پتلی مینا ریں اسی کے جواب میں اُسی طرح کے دو مینار مسجد کی پچھیت میں بھی ہیں۔ مسجد کا دالان شمال اور جنوب کی طرف بھی کھلا ہوا ہے۔ مسجد کی پچھیت کی دیوار کے دونوں سروں پر ایک ایک دیوار دوز بلند مینار ہے جو برجوں کو سہارا دیئے ہوے ہے ان پر برجیاں تو ہیں مگر کلس نہیں ہیں خدا معلوم بننے کے بعد گر گئے یا بنے ہی نہیں۔ مسجد کی پچھیت کی دیوار میں بھی تینوں محرابوں کے جواب میں زمین سے آٹھ آٹھ فیٹ اونچا ایک طاق بنا ہوا ہے اس مسجد کی دیواروں پر بھی مختلف رنگ کا کام اور سنہری کام تھا جس کی جھلک بعض بعض مقامات پر اب بھی نظر آتی ہے۔ ادھر اُدھر کے حصے بیچ کے حصے سے دو محرابوں کے ذریعے سے جدا کر دیئے گئے ہیں۔ ان محرابوں کے پاکھوں اور اندرونی رُخ پر نہایت نفیس نقش و نگار بنے ہوے ہیں اور بہت کچھ رنگ آمیزی اور سنہری کام تھا چنانچہ اب تک بھی کچھ کچھ باقی ہے۔ اس مسجد کا ممبر جہاں تھا اُس کا صرف نشان رہ گیا ہے ممبر ندارد۔ یہ مسجد ملیٹری (فوجی) حدود میں ہے اذان کا حکم نہیں نماز کوئی اکا دکا کبھی کبھار پڑھ لیتا ہے عمارت کا طرز بتلا رہا ہے کہ کم سے کم اس کا احاطہ ضرور رہا ہوگا مگر اب وہ بھی نہیں۔ مسجد کا اندرونی تمام حصہ سخت مرمت کا محتاج ہے گنبدوں کے اندرونی استرکاری جھڑ گئی اینٹوں نے دانت نکوس دیئے۔ جا بجا سے استرکاری کے کھپرے کے کھپرے اُتر گئے۔ اب یہ مسجد بالکل پھیکی پھیکی اور ٹنڈی ہے۔ سرسید نے لکھا ہے کہ اس مسجد کے بائیں طرف ایک کاٹھ کا دالان بنا ہوا تھا اور اس میں تبرکات رکھے تھے اور ہر برس اُن کی زیارت ہوتی تھی اور دائیں طرف بہت

خوب صورت حوض اور اُس میں فوارہ لگا ہوا تھا اُس حوض میں اُس کنوئیں میں سے جو اس مسجد کے متصل ہے پانی آتا تھا اور اب بہ سبب بے مرمت ہونے کے پانی نہیں آتا اور فوارہ نہیں چھوٹتا" کنواں تو خیر ہے مگر کاٹ کا والان کیا ٹک سکتا تھا۔ تبرکات خدا جانے کہاں رُل رلا گئے۔ حوض کا نشان ڈھونڈے بھی نہیں ملتا غالباً پاٹ دیا گیا۔ سر سید نے چشم دید حالات بہتر برس پہلے لکھے ہیں اس مدت مدید میں ساری کایا پلٹ ہوگئی۔ دروں کی پیشانی پر سنگ مرمر کی پانچ تختیاں لگی ہوئی ہیں جن پر سنگ موسیٰ کی پچیکاری سے یہ اشعار کندہ ہیں۔

شکر حق در عہد احمد شاہ غازی بادشاہ
خلق پروا داد گر شاہان عالم را پناہ

مسجدے کردہ بنا نواب قدسی منزلت
باد دایم فیض عام آں طرفہ مسجد گاہ

سعی نواب بہادر صاحب لطف و کرم
ساخت تعمیرِ چنیں جاوید عالی دستگاہ

چاہ و حوض صاف صحنش آبرو زمزم است
ہر کہ از آبش طہارت کرد شد پاک از گناہ

سال تاریخش چہ خورم یافت از الہام غیب
مسجد بیت مقدس مطلع نور الہ

اس قطعہ میں دو نام آئے ہیں ایک نواب قدسیہ بیگم کا جو اس مسجد کی بانیہ تھیں اور دوسرا نواب بہادر کا جن کے زیر اہتمام و نگرانی مسجد کی تعمیر ہوئی۔ نواب قدسیہ بیگم احمد شاہ کی والدہ تھیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بازاری عورت تھیں (دروغ بر گردن راوی) جو اوائل زمانِ سلطنت محمد شاہ میں (۱۷۱۹ء) حرم شاہی میں داخل ہوئیں اور جن کو ادھم بائی کا خطاب ملا اور مدتوں تک بادشاہ کی منظور نظر رہیں لیکن چوں کہ زمانہ یکساں نہیں رہتا تقدیر نے پلٹا کھایا اور وہ بادشاہ کی نظروں سے گر گئیں اور اس قسم کی بندش کی گئی کہ اُن کو بیٹے محمد شاہ سے بھی ملنے کی اجازت نہ تھی لیکن یہ حالت چندہی دنوں رہی پھر تو احمد شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی بیگم صاحب کا نیر اقبال ایسا چمکا کہ آپ کا مرتبہ سب بیگمات سے بڑھ ہو گیا۔ آپ کو پچاس ہزاری منصب ملتا تھا۔ نواب بہادر جاوید خاں سے بیگم صاحب کے بڑے گہرے روابط تھے انھیں کی وساطت سے بیگم صاحب رفتہ رفتہ مہام سلطنت میں ایسی دخیل ہوئیں کہ بادشاہ تو برائے

ام ہی رہ گیا اور سارا کاروبار یہی دو شخص کرتے تھے نتیجہ اس بلند پروازی کا یہ ہوا
کہ ابتری پھیلی اور احمد شاہ مع اپنی ماں کے مقید ہوا اور بیگم صاحب کحول کی گئیں۔ باوجودیکہ
ادسیہ بیگم ایک معمولی عورت تھیں لیکن اوصاف حسنہ سے متصف تھیں وہ محمد شاہ
کی بیگات اور بچوں پر بڑی مہربانی اور شفقت فرماتی تھیں۔ محمد شاہ کے عہد کا سب سے
بڑا خواجہ سرا جاوید خاں تھا جس کے سپرد تمام محلات شاہی کا انتظام تھا۔
اگرچہ جاوید خاں نہ لکھا تھا نہ پڑھا لیکن احمد شاہ کا تخت پر بیٹھنا تھا کہ اُس کا طوطی
بولنے لگا۔ دیوان خاص کی داروغگی کی خدمت اور شش ہزاری منصب سے سرفراز ہوا۔
احمد شاہ کے باپ کے زمانے میں لوگوں نے بیگم صاحب اور جاوید خاں کے تعلقات
کے نظر کرتے بیگم صاحب کو متہم بھی کر دیا۔ محمد شاہ کے مرنے سے میدان خالی ہو گیا
جاوید خاں بیگم صاحب کی آڑ میں حکمرانی کرنے لگا اور خلاف دستور محلات میں رات کو
بھی رہنے لگا۔ جاوید خاں کی بیباکانہ حرکات سے امرا بہت برآشفتہ تھے سب نے
سازش کر کے آخر کار اُس کو جان سے مروا دیا۔

بگوا باڑی اور بگوا بیگم کی قبر

ہر نفس آئینۂ دل سے ہی آتی یہ صدا
خاک تو ہو جا تو حاصل ہو جلا میرے لئے

سنہری مسجد کے عقب میں پریڈ گراؤنڈ پر بگوا باڑی ہے۔
باڑی کا لفظ باغیچہ پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے یہاں کوئی باغ تھا اب زمانے کی گردش سے
صرف ایک زنانی قبر بچ رہی ہے جس کا تعویذ سنگ مرمر کا ہے۔ جس کے اطراف ایک فٹ
بلند ٹوٹا پھوٹا احاطہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قبر بگوا بیگم دختر محمد شاہ بادشاہ کی ہے۔ غدر سے
پہلے یہ مقام بیگم صاحب کے نام پر سے "بگوا باڑی" کہلاتا تھا۔ یہاں ایک خانہ باغ
بھی تھا اور یہاں خاندان شاہی کے لوگ رہا کرتے تھے اور اسی کے پاس ڈگرو راج گھاٹ کا
تھانہ تھا۔ اسی مسجد کے مشرق میں ایک اور قبر ہے جو خدا معلوم کس کی ہے قبر کے تعویذ پر مٹا مٹایا
یہ کتبہ ہے:- آیۃ الکرسی۔ درود شریف کے بعد......... بیست وده ساله
وچہار ماہ سنہ ۱۱۴۲ھ بتاریخ ششم رجب (مطابق ۵ فروری سنہ ۱۷۲۹ء)

خاص بازار

مجلس یاراں پریشاں شد زباد تند دہر
برگ ریزی گوئی اندر گلستاں آمد پدید

جامع مسجد کے شرقی دروازے کے سامنے اس نام کا بازار تھا نہایت وسیع اور دل کشا اور سیدھا۔ اس بازار میں سب طرح کے سودے والوں کی دکانیں تھیں خصوصاً زر کاری بیچنے والے بہت بیٹھتے تھے اور ہمہ اقسام کی دستکاریاں ملتی تھیں غدر کے بعد سب ڈھا کر میدان صاف کر دیا گیا۔ جامع مسجد کے اس دروازے سے لے کر قلعے کے دلی دروازے کی طرف جو سڑک جاتی ہے اور سڑک خاص کہلاتی ہے یہ اسی اُجڑے ہوئے بازار کی نشانی ہے۔

خانم کا بازار

لکھ کر ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا
اُن کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

خاص بازار میں سے خانم کے بازار اور خاں دوران خاں کی حویلی کو رستہ جاتا تھا۔ خانم کا بازار بھی ایک بہت بڑا اور پُر رونق بازار تھا جو قلعے کی فصیل کے برابر سرا دگیوں کے مندر تک چلا گیا تھا جہاں اب ٹھنڈی سڑک ہے۔ یہ سارا میدان بھی صاف ہو گیا۔ غرض یہ کہ جامع مسجد کے دروازۂ شرقی کے محاذ میں جو صاف اور چٹیل میدان نظر آتا ہے یہ حقیقتاً فوجی اغراض اور دور اندیشی سے عمارات سے صاف کر دیا گیا اسی میں اب ایڈورڈ پارک بنا ہے اور پریڈ گرونڈ ہے۔ جلسوں کے مواقع پر اسی میدان میں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ تماشے وغیرہ کی کمپنیاں یہیں اپنے پنڈال بناتی ہیں۔ قواعد پریڈ بھی اسی میدان میں ہوتی ہے۔

سعد اللہ خاں کا چوک

گنبد گردندہ و خاکی کند
وای بر وکیں طمع از وی کند

سعد اللہ خاں شاہ جہاں کے وزیر تھے۔ یہ چوک بہت نفیس اور لطیف پُر رونق جا تھی اور کیوں نہ ہوتی کہ وزیرِ اعظم کے نام نامی سے منسوب تھی۔ اور

یہ شعر صادق آتا تھا۔ ؎

وزیرے چنیں شہریارے چناں جہاں چوں نہ گیرد قرارے چناں

غدر کے پہلے تک یہ چوک قایم تھا اور بڑی رونق اور چہل پہل کا مقام تھا۔ اب ہو کا میدان ہی جدھر دیکھو سنسان ہی۔

حوض لال ڈگی

سنہ ۱۸۴۶ - ۱۸۴۲ء

بگریہ گفت کہ آمد بے ستارۂ چشم
ستارہ کہ مرا بادیدنت بچشم نیامد

خاص بازار کے آگے قلعے کی فصیل کے نیچے جس مقام پر اگلے زمانے میں گلابی باغ تھا وہاں سرکار دولت مدار انگریزی کی طرف سے ایک چشمۂ فیض بنا ہی جو چشمۂ آفتاب و ماہتاب پر فوق لے گیا ہی۔ اس حوض کو سرتا سر سنگ سرخ کا بنایا ہی اور اسی سبب سے حوض لال ڈگی کہلاتا ہی۔ اس کے چاروں کونوں پر چار برج کٹہرے دار بہت خوش نما تھے اور دونوں طرف عرض میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ حوض بموجب حکم لارڈ الن برو (سنہ ۱۸۴۲-۱۸۴۴ء) گورنر جنرل کشور ہند پچاس ہزار روپیہ کے صرف سے بنا تھا جس کا طول ۸۰۰ فٹ۔ عرض ڈیڑھ سو فیٹ عمق دس گز ہی۔ نیچے حوض کا پانی اوپر درختان سایہ دار کی گنجانی کچھ عجیب لطف دکھاتی تھی۔ اس میں نہر سے پانی آتا تھا وہ نہر بند ہوگئی حوض سوکھا پڑا ہی۔ چاروں کونوں کے برج بھی گر گئے اب کچھ بھی لطف نہ رہا۔

کمپنی باغ جرنیلی حال لیڈی ہارڈنگ پردہ باغ یا زنانہ باغ

باغ زر آراستہ شد جاے بار
کردہ بر دابر جواہر نثار
بستہ سے دستہ گل دل فریب
کوشش صد دستہ نمودہ بزیب

سامنے سڑک کے دوسری طرف شرق کی جانب کمپنی باغ جرنیلی کا دروازہ ہی جو غدر کے بعد بنا ہی۔ گو یہ باغ کچھ ایسا بڑا نہیں مگر رونق اور بہار اور آراستگی کے اعتبار سے کسی سے کم بھی نہیں خوش نما گملوں کی قطاریں۔ جا بجا دروازے اُن پر بیلوں کی

نقشہ تلاب ڈگی
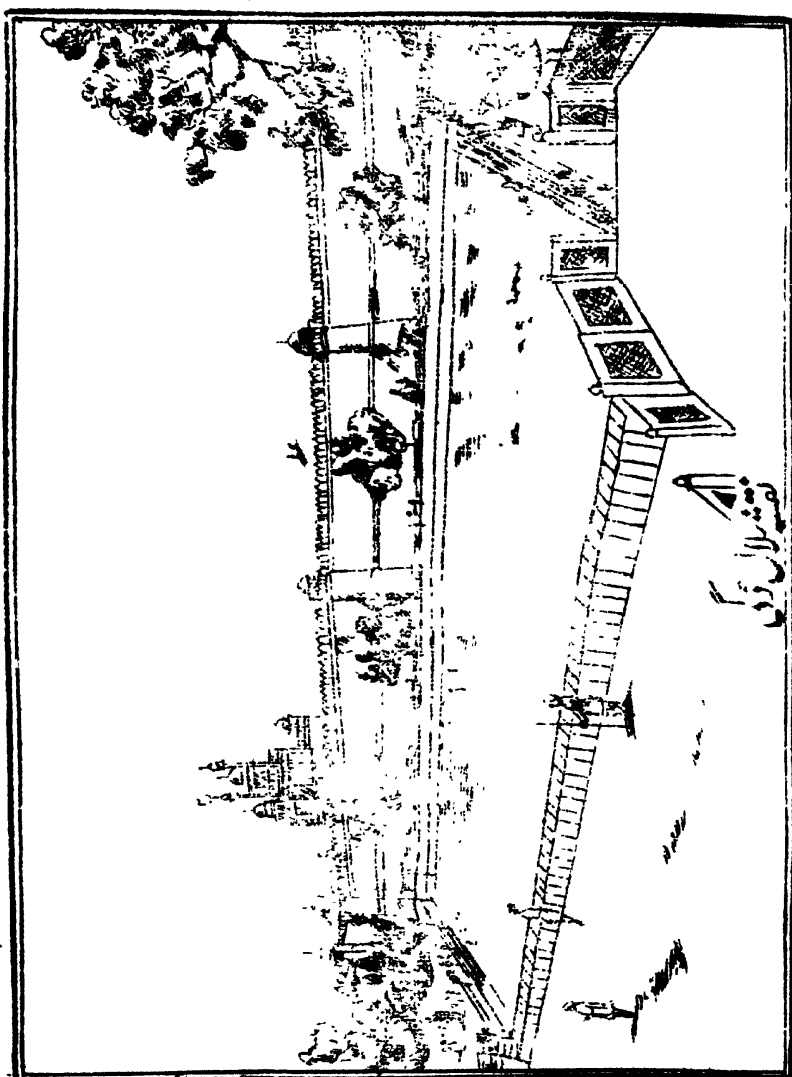
بہار ہیں تفریح اور سیر کے لیئے ایک اچھا مقام ہو گیند بلے کے فیلڈ اور ٹنس کورٹ دل بستگی کا سب ہی کچھ سامان ہو۔ اب یہ زنانہ باغ کر دیا گیا ہو جس کے گرد پردے کے واسطے پختہ دیوار اور کہیں کہیں جعفری کی ٹٹیاں لگا دی گئی ہیں۔ یوں تو روز کھلا رہتا ہو مگر عام طور پر پیر کے دن ہر قوم کی مستورات کثرت سے جمع ہوتی ہیں۔ پردے کا ایسا گہرا انتظام ہو کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ اس کے دروازے پر جس کے آگے غلام گردش کی دیوار ہو یہ نوٹس بخط انگریزی اور اردو لگا ہوا ہو۔ منجانب میونیسپل کمیٹی نوٹس۔ یہ پردہ باغ سرکار کی طرف سے میونیسپل کمیٹی کو مستورات شہر دہلی کی سیر و تفریح کے لیئے سپرد کیا گیا ہو بلا اجازت کمیٹی مذکورہ کسی مرد کو اس باغ کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہو اگر کوئی مرد بلا اجازت اس میں داخل ہوگا اس پر فوجداری مقدمہ بابت مداخلت بے جا چلایا جاوے گا۔

دریا گنج قلعے کے دلی دروازے کے برابر پریڈ گرونڈ کے پاس سنہری مسجد کے سامنے ایک لمبی سڑک فیض بازار سے دلی دروازے تک چلی گئی ہو۔ اس سڑک کے مشرق جانب میں غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے ایک ڈاک بنگلہ تھا اور اس ڈاک بنگلے کے مغرب میں بڑی بھاری اکبرآبادی مسجد شاہ جہاں بادشاہ کی بیگم صاحب کی تھی۔ یہ مسجد تو قلعے کے اطراف گولہ اندازی کے لیئے میدان صاف کرنے کی نذر ہوئی۔ سنہری مسجد سے ایک سڑک راج گھاٹ دروازے کو بھی گئی ہو۔ اس سڑک کی اوبھواڑ پر قدیم بپٹیسٹ چیپل (گرجا گھر) اور اس کے گرد عیسائیوں کا قبرستان تھا اب اس مقام کا نشان بتلانے کو صرف ایک بڑی اونچی سنگ باسی کی صلیب بنا دی ہو۔ سڑک اس سے آگے تک جہاں کٹنگ (درہ) تھا چلی گئی تھی لیکن یہ اغراض فوجی اس کٹنگ کو بھی بھر دیا گیا ہو اس لیئے اب راج گھاٹ دروازے سے گاڑیوں کے آنے جانے کا رستہ نہیں رہا۔ اس سڑک کے جنوب میں شہر کی فصیل کے پاس بہت سے چھوٹے چھوٹے مکانات غدر کے اول تھے۔ ایک ان میں سے اِن لینڈ ٹرینزٹ کمپنی کا مکان تھا جو گھوڑا گاڑی کا ٹھیکہ دار تھا اور چوں کہ کشتیوں کا پل اس زمانے میں راج گھاٹ دروازے کے سامنے ہی تھا

گھوڑے گاڑی کے ٹھیکے دار کا یہاں ہر وقت رہنا مسافروں کی آرام و آسائش کا باعث تھا۔ فصیل سے ملے ہوئے اور مکانات پادریوں یوریشین۔ کلارکوں۔ پنشن یافتہ لوگوں کے تھے جو اپنے بال بچوں سمیت یہاں رہتے تھے اُن سب کا صفایا غدر میں ہو گیا۔ چھاؤنی کا باغ راج گھاٹ کی سڑک کی سیدھی طرف تھا اور یہیں بنگال کی سفر مینا کی پلٹن (جو ۱۸۵۲ء میں رڑکی چلی گئی) رہتی تھی۔ اب اُن کے مکانات جھونپڑیاں وغیرہ سب صاف کر دی گئیں۔ باغ کے مشرق کی طرف سڑک ایک دو منزلہ مکان کی طرف جاتی ہے جس میں غدر میں جھجر کے نواب رہتے تھے اسی کے پاس ہندوستانی پلٹن کا میس ہوس تھا یہ وہ مکان تھا جس میں پہلے فیروز پور کے نواب شمس الدین رہتے تھے اور اُن کے بعد علی بخش خاں رہنے لگے جنھوں نے دریا کے پیٹے میں ایک باغ بھی لگایا تھا۔ میس ہوس اور خیراتی دروازے کے بیچ میں زینت المساجد ہے۔ خیراتی دروازے کے آگے پلٹن کی ہسپتال تھی جس میں عین اس دن تک جب کہ غدر ہوا رئیل کمپنی اٹھائیسویں نیٹ انفنٹری (پیدل پلٹن) کا پہرہ تھا۔ اس کے پاس مکان نمبر (۵) ہے جس کا دروازہ آڑ میں ہے۔ اس مکان کے باغ کے احاطے میں بادشاہی فوج کے "بل آف آرمز" بنے ہوئے ہیں۔ یہ مکان ایک پرانی بارہ دری تھی جس میں بعد میں اور کمرے بڑھائے گئے ہیں اسی میں راجہ کشن گڑھ رہتے تھے اور یہی وہی مکان ہے جہاں فریزر صاحب اُسی شام کو دعوت میں آئے تھے جس رات کو وہ مارے گئے۔ غدر میں اس مکان میں مسٹر آلڈول گورمنٹ پنشنر رہتے تھے اُنھوں نے تھوڑے ہی لوگوں سے باغیوں کا خوب مقابلہ کیا۔ باغیوں کے ساتھ دلّی کے بدمعاشوں کا بھی ایک جم غفیر تھا۔ یہ لوگ کہیں سے کئی توپیں بھی اُٹھا لائے تھے دو رات برابر مقابلہ رہا باغیوں کا مجمع اور زیادہ ہو گیا اور پانی کا ایک قطرہ محصورین کو نہ ملا آخرکار ان لوگوں نے جان بچا کر بھاگنے کی ٹھہرائی بمشکل مسٹر آلڈول اور ایک اُن کا لڑکا اُن کے نرغے سے جان بچا کر نکلے باقی سب پکڑ لیئے گئے اور وہیں اُن کو مار کر اُن کی نعشیں خندق میں ڈال دیں۔ آلڈول کی میم صاحب اور اُن کی لڑکیوں کو پہلے قلعے میں گھسیٹ لے گئے تھے لیکن

زینت المساجد
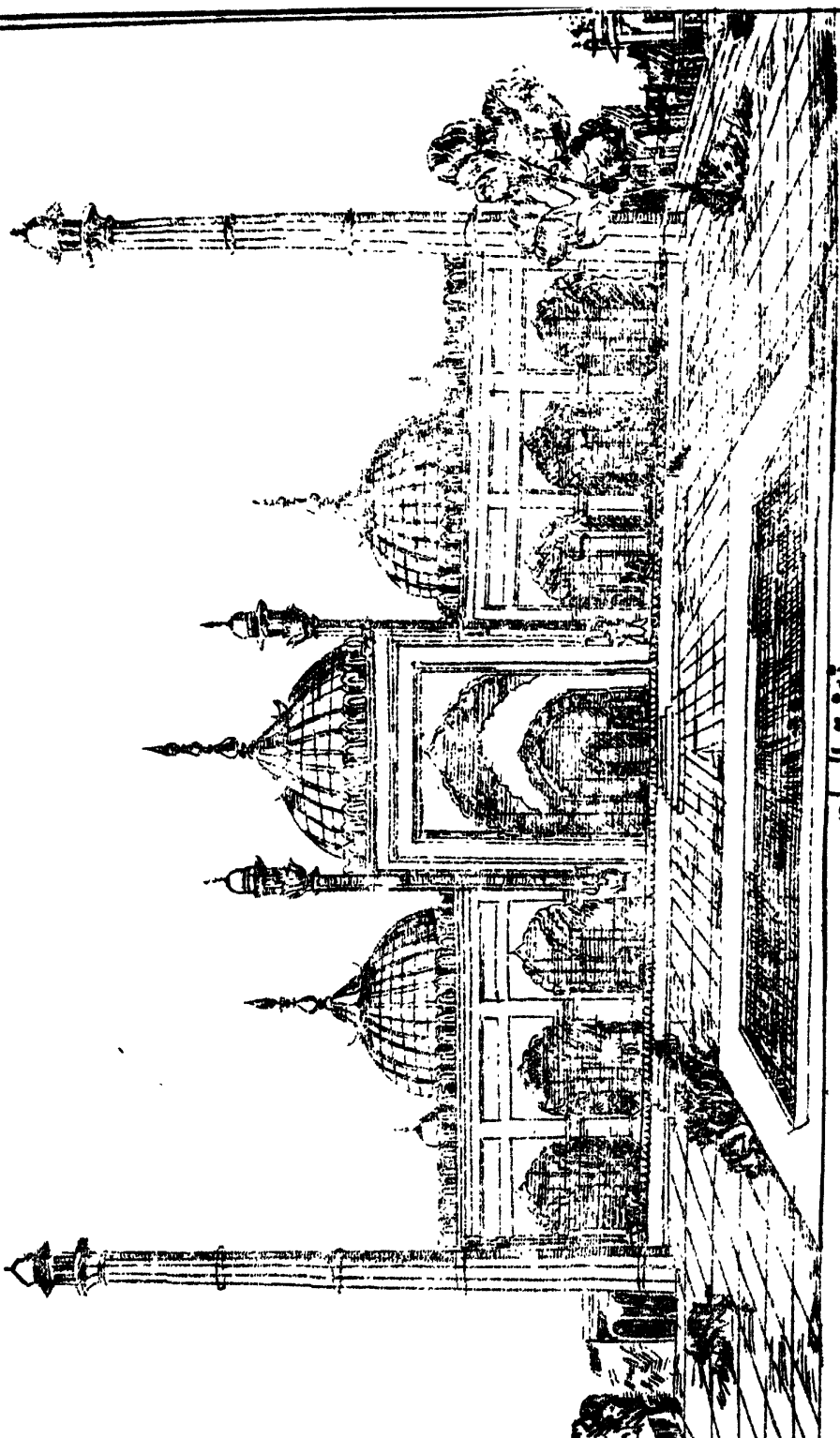
رشتۂ حیات مستعار باقی تھا ساری بیبیں اور اُن کے ننھے ننھے بچّے نقارخانے کے سامنے قتل کیے گئے مگر یہ وہاں سے بھی بچ کر نکل آے۔ اس مکان کے محاذ میں قدرے بلندی پر ایک اور مکان ہو جس میں بلّب گڈھ کا راجہ تھا۔ **فیض بازار** کے متعلق اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہو سوا اس کے اس بازار میں ایک نہر رواں تھی۔ جس کی نسبت مشہور ہو فیروز شاہ کے عہد میں بنی تھی لیکن نہیں کھلا کہ اس نہر میں پانی کہاں سے آتا تھا۔

صلیب پر کا کتبہ

The Cross marks the site of the ancient cemetry of Duryagunge, and is dedicated to the memory of those whose remains lie round. MDCCCXI

The dead men shall live together within,
My dead body shall they arise,
Awake and sing ye that dwell in this dust,
For the dew is as the dew of herbs
And the earth shall cast out her dead.

ترجمہ یہ صلیب دریا گنج کے قدیم قبرستان کی جگہ بتلاتی ہو اور یہ اُن لوگوں کی یادگار کے نذر ہو جن کی لعشیں یہاں اطراف میں دفن ہیں سنہ ۱۸۶۱ع مردے سب ایک ساتھ مل کر زندہ ہیں اور میرے جسم مردہ کے ساتھ وہ بھی (حشر کے دن) اُٹھیں گے۔ تم جو خاک میں پڑے ہو جاگو اور گاؤ۔ کیوں کہ (قطرات) شبنم جھاڑیوں پر ہوتے ہیں اور زمین اپنے مردوں کو اچھال دے گی۔

زینت المساجد

سنہ ۱۱۱۹ھ
۱۷۰۷ع

گرچہ از گردش دوَر سپہر
تافتہ رُہ سرِ من ہیچو مہر
در ہمہ آتش زنی از چار سو
روے نتابم ز تو از ہیچ رو

محلہ دریا گنج۔ لب دریا سے جمن خیراتی گھاٹ یا مسجد گھاٹ دروازے کے پاس یہ مسجد کہ شہر شاہ جہاں آباد کی مسجدوں میں جامع مسجد کے بعد اسی مسجد کا شمار ہوتا ہو۔ اس مسجد کو

موقع اور محل ایسا ملا ہو کہ باید و شاید۔ یہ مسجد جمنا کے جنوبی کنارے پر ایسے مرتفع
مقام پر بنائی گئی ہو کہ جمنا کے اُس پار سے جو عمارات شہر کا عجیب و غریب نظارہ
ہوتا ہی اُس میں سب سے پیش پیش یہی دلکش عمارت ہی اس کے لال لال منارے
دور دور سے دکھائی دیتے ہیں اور یہ مسجد کوسوں سے نظر آتی ہی۔ اول تو کرسی بہت
بلند پھر دریا کی طرف اس کے آگے اور کوئی عمارت نہیں۔ یہ مسجد فصیل شہر سے
کوئی تیس گز کے فصل سے دریا کی طرف سطح ارض سے چودہ فٹ بلند ہی مگر شہر کی
طرف سڑک کے برابر ہی۔ اس مسجد نے خداداد حسن پایا ہی ادھر مسجد کی فضا اور منبت
کاری اور پرچین سازی کی بہار اور اُدھر سبزہ زار اور فصیل شہر سے دریا کا ٹکراتے
ہوئے بہنا اور موجوں کا بل کھانا عجب عالم دکھاتا ہی۔ واقع میں جیسی کیفیت اور لطف
اس مسجد میں ہی بہت کم کسی مسجد میں ہوگا۔ سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی بنی ہوئی
ہی اور تینوں برج سنگِ مرمر کے ہیں اور اُن میں سنگ موسیٰ کی دھاریاں بنائی گئی
ہیں تاکہ چشم بد سے محفوظ رہے اور برجوں پر نہایت خوش نما سنہرے کلس ہیں کہ
اُن کی دمک آفتاب کی چمک کو مات کرتی ہی۔ مینار اس کے آسمان سے باتیں کرتے ہیں
شمسہ اس کا فلک سے بھی گزر گیا ہی۔ اس مسجد کے سات در ہیں بہت خوش نما بیچ کا در
بہت بڑا ہی اور اِدھر اُدھر کے تین تین در چھوٹے۔ صحن کے بیچ میں ایک حوض ہی
دلربا مانند چشمۂ آفتاب کے اور پُر نور مثل ماہتاب کے۔ اِس مسجد کے پاس ایک کنواں تھا
کہ اُس سے پانی اس حوض میں آیا کرتا تھا اب وہ کنواں بند ہوگیا۔" دریا کے رخ پر
اس چبوترے میں مشرق رویہ شمال سے جنوب کی طرف تیرہ حجرے ہیں جن میں
دو سہ دریاں ہیں اور تین محراب دار حجرے باقی سنگین چوکھٹ کی کوٹھریاں۔
یہ حجرے مختلف طول و عرض کے ہیں اور ان میں سے بعض میں ایک دوسرے
میں رستہ ہی اور بعض میں نہیں ان کی بلندی سطح زمین سے صحن مسجد کے فرش تک
چودہ فیٹ ہی اور اس کے اوپر آدھ فٹ بلند کٹہرا۔ ان کوٹھریوں کے ہر دو جانب
شمال و جنوب میں پختہ اور بلند محراب دار دروازے مسجد میں جانے کے ہیں جن میں بیس
بیس سیڑھیاں ہیں۔ جنوب رخ کا دروازہ مسجد گھاٹ دروازہ فصیل کے پاس ہی
اور شمال کی طرف کا دروازہ چُن دیا گیا ہی۔ ان دونوں دروازوں میں چوبی پٹ لگے

ہوئے ہیں مسجد میں آنے جانے کا صدر دروازہ جنوبی ہی تھا جو لب سڑک ہی اور اب آنے جانے کے واسطے ایک چھوٹا دروازہ مسجد کی پچھیت کی دیوار میں نکال لیا گیا ہی جو شاید پہلے کھڑکی رہی ہوا اس کے جواب کا دوسرا دروازہ مسجد کے جنوب میں بنا کر دیا گیا ہی یہ کوٹھڑیاں غالباً خدام کے رہنے اور مسافرین کے ٹھیرنے کے لیئے بنائی گئی تھیں۔ اب بہت خراب حالت میں ہیں لوگ جو گھٹوں کے پتھر اُکھاڑلے گئے ہیں اور بول وبراز کرتے ہیں۔ یہ سب کوٹھڑیاں صحن مسجد کے خلا اندر بنائی گئی ہیں اور لداؤ کی ہیں اور اُن کے سامنے ایک نصف دائرے کا وسیع میدان فصیل شہر سے محصور ہی صرف جنوبی طرف ایک دیوار پختہ چونے گچی کی تیس فٹ لمبی اور کوئی دوگز اونچی ہی اس میں ایک چھوٹا سا دروازہ اس صحن میں آنے جانے کے لیئے رکھ دیا گیا ہی جس میں چوبی چوکھٹ اور کواڑ لگے ہوئے ہیں یہ دیوار اُس زمانے کی نہیں ہی بلکہ حال کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہی۔ احاطہ کے شمال میں الیسر گز لمبی فصیل شہر چلی گئی ہی جس کے بعد فصیل کے باہر ایک بہت بڑا مدوّر برج جمنا کی ریتی میں ہی جس کے بیچ میں توپ پھرانے کا آہنی محور لگا ہوا ہی بنا ہوا ہی۔ فصیل کا اور اس برج کے بیچ میں غالباً خندق تھی جو اب بھر گئی ہی اور اب اسی پتھر کی کرکیا پٹاؤ پڑا ہوا ہی۔ اس برج کے محاذی اندر دار کو احاطے میں ایک رپٹ بنی ہوئی ہی۔ مسجد کے محاذ میں شرق کی طرف یہی فصیل ۵۲ گز تک اس احاطے میں شامل ہی اور اس مقام سے وہی پختہ دیوار کھینچ دی گئی ہی جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں فصیل آگے کو چلی گئی ہی اور یہیں قریب میں مسجد گھاٹ دروازہ ہی۔ صحن مسجد ایک سو بچانوے فیٹ لمبا اور ایکسو پندرہ فیٹ چوڑا ہی جس میں سنگ سرخ کے چوکے بچھے ہوئے ہیں اور جس میں سے شمال کی طرف کے کچھ چوکے اکھاڑ بھی لیئے گئے ہیں۔ یہ مسجد بہت کس مپرسی کی حالت میں ہی اس سبب سے چوکوں کی درازوں میں جابجا گھاس اُگ آئی ہی۔ صحن مسجد کے وسط میں ایک مستطیل حوض تینتالیس فیٹ لمبا اور تینتیس فیٹ چوڑا اور چار فیٹ عمیق ہی جس کے اطراف ایک پتلی سی نالی بنی ہوئی ہی اور چوطرف کوئی پانچ فیٹ چوڑے اور ایک فٹ بلند چبوترے پر سنگ مرمر کا حاشیہ لگا ہوا ہی حوض کے اندر پہلے سنگ مرمر کی

بندش تھی اب اُن ستوں کا پتہ نہیں اور اب حوض چونے گچی کا پختہ بنا دیا گیا ہے مسجد کے صحن کے چاروں طرف سنگِ سرخ کا دو فیٹ اونچا کٹہرا ہے جو شمال کی جانب کچھ اُکھڑ گیا ہے۔ مسجد ایک سو پچیس فیٹ لمبی اور ساٹھ فیٹ چوڑی ہے اور صحن سے کرسی چار فٹ اونچی ہے۔ اس مسجد میں سات در بنگڑی دار محرابوں کے ہیں بیچ کے در کے روکار پا کھوں اور پیشانی پر چوڑی چوڑی سنگ مرمر کی پٹیاں بہت خوش نما معلوم دیتی ہیں۔ جو فرش مسجد سے ڈیڑھ گز اونچی ہیں بیچ کے در کو چھوڑ کر باقی محرابوں کے روکار پر جامع مسجد کی طرح کی سنگ مرمر کی لمبی لمبی تختیاں نصب ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان پر کتابے کندہ کرائے مقصود تھے جو رہ گئے بیچ کا گنبد اٹھارہ فیٹ بلند ہے سنگ مرمر کا گرونہ بارہ فیٹ بلکس سات فیٹ سب ملا کر گنبد کی بلندی سینتیس فیٹ ہے۔ ادھر اُدھر کے گنبد چھت سے تینتیس تینتیس فیٹ بلند ہیں جن کے گرونے آٹھ فٹ اور گنبد سولہا اور کلس چھ فیٹ اونچے ہیں۔ مسجد کے ہر دو جانب بڑی بڑی چار کھنڈ کی سو سو فیٹ بلند مینارین ہیں جن کے اوپر سنگ سرخ کی برجیاں ہیں اور اُن کے قبے سنگ مرمر کے آٹھ دروں پر استادہ ہیں اور اوپر سنہری کلس ہیں۔ مسجد کے اندر کا دالان جو شمال و جنوب دونوں طرف کھلا ہوا ہے بہت چوڑا ہے البتہ باہر کا دالان جس کی چھت مسطح ہے بمقابلہ اُس کے کم ہے۔ صدر دالان کی چھت محراب دار ہے اور ان محرابوں ہی محرابوں پر جو بہت چوڑی ہیں گنبدوں کا بوجھ ہے۔ مسجد کا گنبد نما بیچ کا در تہرا بنا ہوا ہے جس کے سامنے پانچ سیڑھیاں ہیں اور ایسی ہی پانچ پانچ سیڑھیاں دونوں طرف کے بیچ کے در کے سامنے ہیں۔ یہ در (۴۲) فیٹ بلند اور (۳۵) فیٹ چوڑا ہے جس کے اندر ایک اور محراب (۳۰) فٹ اونچی اور (۲۰) فیٹ چوڑی ہے اور پھر اس کے اندر ایک محراب (۱۹) فیٹ اونچی اور (۱۲) فیٹ چوڑی ہے۔ دوسری محراب جو مسجد کے دوسرے دالان میں ہے دائیں بائیں کھلی ہوئی ہے جس سے اس دالان میں ادھر اُدھر جانے کا راستہ ہو گیا ہے۔ محراب کے دونوں جانب دو پتلی پتلی مینارین صحن مسجد سے (۵۰) فیٹ اونچی ہیں جن پر ہشت پہلو برجیاں اور سنہری کلس ہیں۔ دونوں میناروں کے درمیان مسجد کی چھت پر جو سطح زمین سے (۴۶) فٹ بلند ہے کنگورہ ہے۔ ادھر اُدھر کے چھوٹے در (۳۴) اونچے اور (۲۰) چوڑے

ہیں ان پر بھی کنگورہ ہے جو بیچ کی بیرونی محراب کے برابر اونچا ہے اور صحن مسجد سے (۳۴) بلند ہے۔ ان دروں کی محرابیں (۲۱) اونچی اور تیرہ فٹ چوڑی ہیں۔ ان کے فیل پا سے تین تین فٹ چوڑے ہیں۔ صدر دالان میں مسجد کی پچھیت میں حسب معمول دیوار دوز محرابیں ہیں۔ درمیانی صدر دیوار دوز محراب جس کے پاس سنگ مرمر کا ممبر تھا (اب وہ بھی نہیں رہا) یہاں بحالت سکونت باہر دار کرایک دروازہ پھوڑ دیا تھا اب وہ بند کردیا گیا مگر اُس کے آگے کی تین سیڑھیاں مسجد کے عقب میں موجود ہیں۔ مسجد کے شمال اور مغرب میں پختہ سنگ بست سہ دریاں بنی ہوئی ہیں اور اب اسی میں آنے جانے کا دروازہ ہے۔ یہیں شمال و مغرب کے کونے میں ایک کوٹھڑی بھی ہے۔ اور یہیں سے چھت پر جانے کا ایک چکر دار زینہ بھی ہے جس کی پہلی منزل تک تیرہ سیڑھیاں ہیں اور پھر بارہ۔ اور بجنسہ اسی طرح کا قطعہ مسجد کی دوسری جانب جنوب و مغرب میں بھی بنا ہوا ہے۔ یہ مکان غالباً امام۔ موذن۔ جاروب کش یا دیگر خدام مسجد کے لیئے بنا گئے تھے بزمان عمل دخل فوج اس مسجد کے پیچھے مسجد کی پچھیت کی دیوار سے ملا ہوا ایک لمبا برآمدہ جس میں تین دروازے تھے بنا ہوا تھا۔ فوج سے جب تخلیہ کرایا گیا غالباً اُسی وقت یہ برآمدہ نکال دیا گیا مگر تینوں دروں کے سامنے تین تین سیڑھیاں اور دروازوں کے نشان جن سے مسجد کی دیوار مجروح ہو گئی ہے باقی ہیں۔ مسجد کے پیچھے کچھ کھلی ہوئی زمین محصور کر کے لب سڑک ایک چوبی پھاٹک لگا دیا گیا ہے۔ اس صحن میں ایک پختہ سنڈری روم فوج کے قیام کی نشانی اب تک باقی رہ گئی ہے۔ چوں کہ مسجد غدر عرصہ تک سکونت کے کام میں لائی گئی ہے اس کے اندر جا بجا دیواریں اُٹھا کر جدا جدا کمرے بنا یئے تھے اب غالباً یہ دیواریں لارڈ کرزن کے زمانے میں نکال دی گئیں۔ اسٹیفن صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "مسجد کے عقب میں چار سنگ مرمر کے کشادہ برج تھے افسوس ہے کہ اب اُن کا کہیں پتہ نہیں اور چوں کہ اس مسجد میں من مانے توڑ پھوڑ کی گئی ہے حتی کہ زینت النسا بیگم کا مقبرہ بھی اُسی زمانے میں بہ اغراض فوجی ڈھا دیا گیا ان کا کون پرسان حال تھا سر سید نے آثار الصنادید میں جو غدر سے پہلے کی ہے لکھا ہے کہ" زینت النساء بیگم کا مدفن بھی اسی مسجد کے صحن میں شمال کی طرف ہے چنانچہ اُس کی قبر کے پاس ایک چھوٹا برج قبر کا رکھنے کا بنا یا ہے۔

اُس کے نیچے دو مجمر ہیں ایک مجمر سنگ باسی کا ہی اور اُس کے اندر ایک مجمر ہی سنگ مرمر
اس میں فرش بھی سنگِ مرمر کا ہی اور قبر کے سرہانے کتبہ ہی جو آگے درج کیا جاتا ہی۔ اب
اِن عمارتوں کا کہیں پتہ بھی نہیں۔ اس مسجد میں ایک عرصہ تک توپ خانہ رہا پھر برسوں
اس میں گوروں کا روٹی گودام بھی رہا جس سے رہی سہی رونق بھی جاتی رہی۔
زینت النسار بیگم نے اپنی قبر احاطۂ مسجد میں اپنے حین حیات بنوائی تھی جس میں وہ
۱۱۲۲ھ ۱۷۱۰ء میں مدفون ہوئیں۔ ایک قبر اب بھی صحن مسجد کے شمال میں ہی جو صرف
چونے گچی کی ہی اور یہی بانیہ مسجد کی قبر ہی جس کے اطراف سنگ مرمر کا چھوٹا سا
کٹہرا تھا اور لوح مزار پر کتبہ تھا جو اب نہیں رہا۔ ؎

جن کے محلوں میں ہزاروں رنگ کے فانوس تھے جھاڑ اُن کی قبر پر باقی نشاں کچھ بھی نہیں

قل یا عبادی الذین اسرفوا علے	انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ
ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا	انہ ھو الغفور الرحیم
مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است	سایۂ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است
امیدوار حسن خاتمہ فاطمہ زینت النسا بیگم	بنت بادشاہ محی الدین محمد عالمگیر غازی
انا راللہ یں ھانہ	سنہ ۱۱۲۲ ہجری

طینتِ پاک مسلماناں گوہر است
آب و تابش از یم پیغمبر است

شاہ صابر بخش کی خانقاہ

۱۲۳۷ھ
۱۸۲۱ء

روشن الدولہ کی سنہری مسجد واقع قاضی واڑہ
(فیض بازار) کے مقابل حضرت شاہ صابر بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ ہی
آپ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ایک بڑے بزرگ اور چشتیہ خاندان کے برگزیدہ شخص
تھے۔ آپ کے والد ماجد سید شاہ نصیر الدین ابن غلام سادات بن شیخ عبدالواحد
عرف نواب بشارت خاں برادر زادۂ حقیقی قطب العارفین حضرت شیخ محمد چشتی
قدس سرہ العزیز تھے۔ آپ نے بڑے بڑے مشایخ سے فیض باطن حاصل کیا
اور اپنے جد امجد شاہ غلام سادات سے خلافت پائی۔ اور اُنھوں نے شاہ محمد نصیر سے

اُنھوں نے شیخ محمد چشتی سے اُنھوں نے شیخ ابراہیم رام پوری سے ۱۴ ربیع الاول ۱۲۳۷ھ چار گھڑی رات گئے آپ کا وصال ہوا اور اسی خانقاہ میں مدفون ہوئے۔ ان کے بعد آپکے صاحب زادے سید عبد اللہ سجادہ نشین ہوئے اُنھوں نے ۲۲ شعبان ۱۳۰۴ھ (۲۶ دسمبر ۱۸۸۱ء) کو بہادر شاہ ثانی کے زمانے میں انتقال کیا۔ پھر سید امیر حسن اور سید مظفر حسین سلسلہ بسلسلہ سجادے ہوتے رہے۔ اب شاہ کرار حسین سجادے ہیں۔ بڑا عرس حضرت شیخ محمد صاحب کا تین دن ۴ ۲ محرم کو ہوتا ہے۔ ۱۱ رمضان کو حضرت غلام سادات کا اور ۱۱ ربیع الاول کو شاہ صابر بخش کا اور ۲۲ شعبان کو سید عبد اللہ کا۔ یہ معمولی عرس کیا گویا فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔

لب سڑک مسافر خانے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں اور دیوار پر ایک نہایت بدخط کتبہ چونے میں کھدا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسافر خانہ ہمارے آقائے ولی نعمی کی جانب سے تعمیر پایا ہے "مسافر خانہ منجانب نواب میر محبوب علی خاں بہادر شاہِ دکن دام ملکہ ۱۳۲۰ھ ہجری" صحن میں فرش چوکور کا ہے جس کی ایک جانب حضرت کے مزار کا ایک چوبی پیولین ہے جس کے تین تین در ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مزار شریف زیر سما تھا یہ چوبی قبہ بعد میں بنایا گیا ہے جو کچھ پائدار بھی نہیں۔ چبوترا دس فیٹ مربع اور سوا دو فیٹ اونچا ہے۔ نیچے کا حصہ سوا فٹ کا چونے پتھر کا ہے اور اس کے اوپر ایک فیٹ کا سنگ مرمر کا چبوترا ہے۔ جس پر دو قبریں ہیں داہنی طرف کی حضرت صابر بخش کی اور بائیں طرف آپ کے صاحبزادے سید عبد اللہ کی۔ سرہانے کچھ جگہ چھوڑ کر سنگ باسی کی ایک لمبی لوح دیوار میں لگی ہوئی ہے جس پر بخط نسخ و نستعلیق نہایت خوش خط یہ کتبہ ہے جو بہادر شاہ ثانی نے نصب کرایا تھا

محمد اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل یا عبادی الذین اسرفوا علی[1] انفسکم

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب

جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم

---

[1] کتبے میں ایسا ہی لکھا ہے۔ علےٰ چاہیئے۔ ۱۲

بادشاہا جرم ما را درگزار ما گنہ گاریم تو آمرزگار
تو نکوکاری و ما بد کردہ ایم جرم بے اندازہ بیحد کردہ ایم
بی گنہ نگذشتہ برمن ساعتے با حضور یک دل نکردم طاعتے
بر درآمد بندۂ بگریخت آبروی خود ز عصیاں ریخت
مغفرت دارد امید از لطف تو زانکہ خود فرمودۂ لاتقنطوا
بحر الطاف تو بے پایاں بود ناامید از رحمتت شیطاں بود
نفس و شیطان زد کریما راہ ما لطف تو باشد شفاعت خواہ ما

یہیں تین در کی مسجد پختہ بنی ہوئی ہے لیکن اس مسجد میں تعجب ہے کہ مینار نہیں ہے۔ بیچ کے در کی پیشانی پر کلمۂ طیبہ ہے۔ داہنی طرف کی محراب پر اذکروا اللہ کما ھداکم بائیں محراب پر اللہ۔ محمد۔ علی۔ فاطمہ۔ حسن۔ حسین بخط طغرا لکھا ہے۔ ۱۳۱۳ مسجد پرانی ہے مگر یہ کتبے سیئے روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں۔ طغریٰ میں ایک لفظ (بو) کا شروع بس ہے جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ صحن میں ایک حوض ہے ۱۴ فٹ × ۱۸ فٹ دو فیٹ عمیق بیچ میں فوارہ ہے۔ صحن میں اِملی۔ نیم۔ جامن۔ کھرنی۔ گوندنی گولر کے درخت ہیں جن میں بعض بہت پرانے اور بڑے ہیں۔ اور یہیں ایک کنواں بھی ہے اور بجانب جنوب ایک مجلس خانہ دوہرے دالان کا سامنے برآمدہ پانچ در کا ہے جو قدیم نہیں بعد میں بنا ہوا معلوم دیتا ہے جیسا کہ مسافر خانہ بعد میں بنا ہے۔ مسجد سے ملا ہوا مسافر خانہ ہے جس کی چار کھڑکیاں سڑک کی طرف کھلی ہوئی ہیں۔ یہ مسافر خانہ لداؤ کا ہے جس کا ایک ہال ۳۰ فٹ × ۲۲ فٹ ہے اور ایک کمرہ لداؤ کا اس کے سوا ہے۔

روشن الدولہ کی دوسری سنہری مسجد المشہور بہ قاضی زادوں کی مسجد

۱۱۵۷ھ
۱۷۴۴ء ۱۷۴۵ء

مسجد و دیر تو ئی کعبہ و بتخانہ یکے ست
ہر کجا گوش نہادم ہمہ غوغائے تو بود

یہ مسجد فیض بازار کے شمالی جانب محلۂ قاضی واڑے میں لب سڑک واقع ہے جسے روشن الدولہ نے اسی نام کی چاندنی چوک والی مسجد (جو کوتوالی کے پاس ہے) کے چوبیس برس ۱۱۵۷ھ ۱۷۴۴ء ۱۷۴۵ء میں
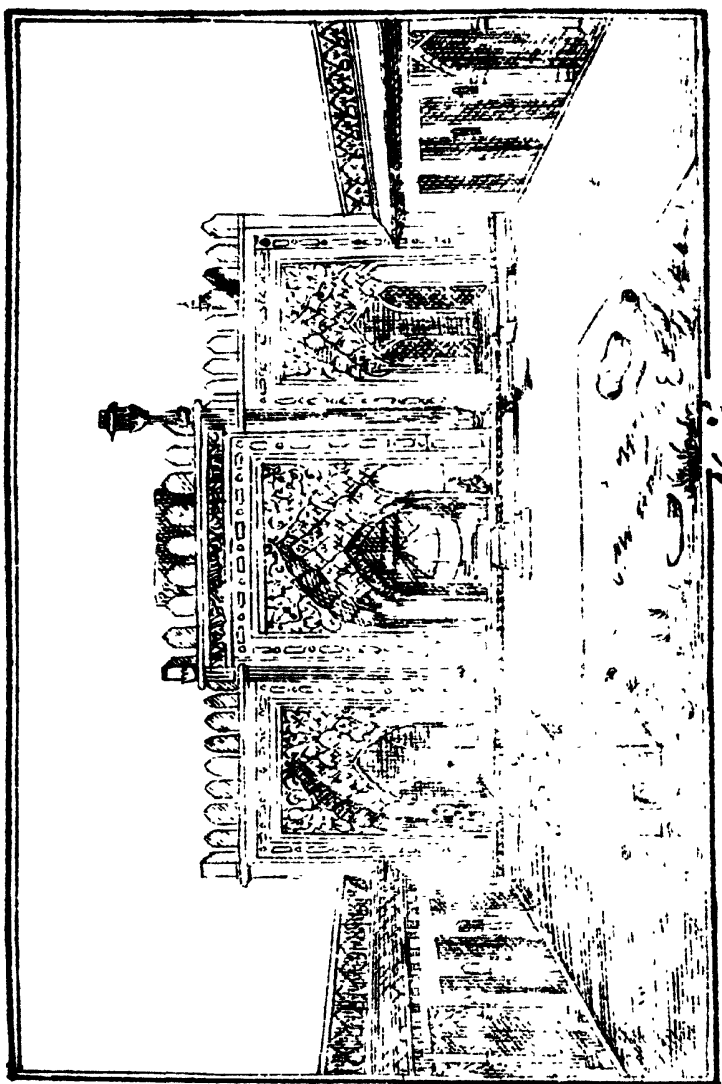
بنایا تھا۔ یہ مسجد فیض بازار کی سڑک سے نو فٹ اونچے چبوترے پر بنائی گئی ہے جو ۷۵ × ۴۳ ہے۔ صدر دروازہ مشرقی دیوار میں ۱۱ اونچا اور ۱۲ چوڑا اور چھ فیٹ گہرا ہے سات سیڑھیوں کا دو طرفہ زینہ چڑھ کر صحن مسجد میں داخل ہوتے ہیں جو چونے گچی کا ہے چھت پر چڑھنے کا بھی زینہ دونوں طرف کی بغلی دیواروں میں تیرہ تیرہ سیڑھیوں کا ہے مسجد کے شمال اور جنوب میں طلبا کے رہنے کے دالان بنے ہوئے تھے جن میں سے شمالی دالان تو گر گیا صرف ایک کوٹھڑی سڑک کے طرف کی کھڑی ہے وہ بھی گرنے والی ہو رہی ہے دوسری طرف کا دالان البتہ باقی ہے۔ مسجد تین در کی ہے جس کے دونوں طرف ایک ایک حجرہ امام اور موذن وغیرہ کے رہنے کے لیئے بنا ہوا ہے۔ اصل مسجد کا دالان ۵۵ × ۱۵ ہے مسجد کا ارتفاع چبوترے سے چھت تک ۲۶ ہے اور کنگورے سے اوپر تک اور ۳۰ ہے۔ بیچ کی محراب نو فیٹ چوڑی ہے اور ادھر ادھر کی آٹھ آٹھ فیٹ تینوں دروں کے سامنے دو دو سیڑھیاں ہیں۔ مسجد کے تین گنبد ہیں۔ بیچ کا بڑا ادھر ادھر کے اس سے چھوٹے۔ گنبدوں پر سنہری پتر کا خول چڑھا ہوا تھا۔ اسی سے سنہری مسجد کہلاتی تھی۔ یہ خول اتار کر قوالی کے پاس والی مسجد پر جڑ دیا گیا اور یہ گنبد بالکل ننگے بچے رہ گئے حتی کہ ان کو کلس تک بھی نصیب نہیں۔ نہ خول نکال لینے کے بعد کوئی پلاستر کیا گیا جس سے کچھ تو ان کی حفاظت ہو جاتی۔ دونوں مینار بھی ٹوٹ کر گر گئے صرف ٹھنڈ منڈ کھڑے ہیں۔ چھت پر کنگورہ اور بیچ کی محراب کے ادھر ادھر دو چھوٹی برجیاں ہیں جن پر کنول کھلے ہوئے ہیں۔ غرض مسجد بہت تباہ و خستہ حالت میں ہے۔ مسجد کے رو کار پر ایک ہی لمبی سطر میں بخط نستعلیق نہایت خوش خط یہ کتبہ سنگ مرمر کی جدا جدا تختیوں پر ایک ایک مصرعہ کھود کر سنگ موسی سے حروف بٹھلا کر تختیاں جما دی گئی ہیں۔

شکرِ حق کز یمنِ فیضِ سید عرفاں پناہ — شاہ بھیکہ آں مرشد کامل ولایت دستگاہ
در زمان شاہ اسکندر نشاں فرّ شید — معدلت گستر محمد شاہ غازی بادشاہ

یہ چاروں مصرعے ایک ہی سطر میں ہیں۔

روشن الدولہ ظفر خاں صاحبِ جود و کرم۔ کرد تعمیر طلائی مسجد عرش اشتباہ۔
مسجدے کاندر فضائے صحنِ قدرش آسماں۔ کردہ از خطِ شعاع مہر جاروبِ پگاہ

حوض صافِ او نشاں از چشمۂ کوثر دہد۔ ہر کہ از آبش وضو سازد شود پاک از گناہ۔
سالِ تاریخش رسائی یافت از الہامِ غیب۔ مسجدے چوں بیت اقصیٰ مہبط نور الٰہ ۱۱۲۵ھ
مسجد میں اب تو کوئی حوض رہا نہیں پہلے تھا جو پاٹ دیا گیا۔

گو یہ مسجد نواب روشن الدولہ ظفر خاں کی بنائی ہوئی ہے جو محمد شاہ کے زمانِ سلطنت میں طیار ہوئی مگر باقی کے شاہ بھیک کے نام پر بنائی تھی پہلے روشن الدولہ سے تعارف حاصل کیجئے پھر شاہ صاحب سے۔ روشن الدولہ کا اصلی نام خواجہ مظفر تھا۔ آپ خواجگان خاندان نقشبندیہ سے تھے۔ آپ کے دادا خواجہ محمد نصیر شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستان میں تشریف لائے تھے کھجوے کی لڑائی میں جو اورنگ زیب اور سلطان شجاع کے درمیان ہوئی تھی شاہزادے شجاع کے محل کی حفاظت کرنے میں کام آئے۔ خواجہ مظفر کے باپ عبدالقادر کا واقعات تاریخی سے کچھ تعلق نہیں ہے وہ درویشانہ گزران کرتے تھے اور فرخ سیر کے عہد میں مر گئے۔ خواجہ مظفر نے پہلے پہل شاہ عالم بہادر شاہ اول کے فرزند رفیع الشان کی ملازمت اختیار کی ملازمت اختیار کی اور بڑھتے بڑھتے منصب پانزدہ صدی و پانصد سوار کو پہنچے اور ظفر خاں کا خطاب پایا۔ رفیع الشان کے بعد یہ ملازمت چھوڑ چھاڑ شاہ بھیک کی طرف رجوع ہو گئے۔ جب مشہور ہوا کہ فرخ سیر پٹنے سے جہاں دار سے لڑنے کو چلا آ رہا ہے تو یہ بتعمیل ارشاد شاہ صاحب فرخ سیر کے پاس چلے گئے اور سید حسین علی خاں کی بدولت جو ایک امیر سادات[1] بارہ کے تھے بخشی سوم

[1] ضلع مظفر نگر میں کہ دوآبہ گنگ وجمن میں واقع ہے صدہا سال سے بارہ گاؤں مشہور چلے آتے ہیں۔ ان میں سادات کی آبادی ہے یہ سید صحیح النسب اور بڑے بہادر تھے۔ سلاطین سلف کے عہد میں انھوں نے بڑے بڑے کارنامے کیے۔ اکبری فوج میں بھی دلاوری کے جوہر سے کو سرخ رو کرتے رہے۔ اول اُن میں سید محمود بارہہ تھے کہ پہلے سکندر سور کے ساتھ قلعۂ مانکوٹ میں محصور رہتے۔ جب اکبری فوج نے محاصرے کا دائرہ بہت تنگ کیا تو سردار ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ یہ مع اپنے ہمراہیوں کے اکبری لشکر میں آ گئے اور ملازمت بادشاہی اختیار کی اُن کی خدمات جانفشاں نے منصب کا درجہ چلد ہزاری تک بلند کیا۔ اُن کے بیٹے سید ہاشم بارہہ ہمایری منصب تک پہنچے تھے کہ شہادت کا منصب نصیب ہوا۔ سید عبدالمطلب۔ سید عبداللہ خاں بارہہ وغیرہ نامی سردار اسی خاندان کے تھے۔ اور ہر میدان میں ایسے بے جگر ہو کر لڑتے تھے کہ اُن کی شجاعت آج تک ضرب المثل چلی آتی ہے۔ مرزا عزیز کوکلتاش کہا کرتے تھے کہ سادات بارہہ دولت اکبری کے فدائیں۔ اندہ بار اکبری ۲۲:

عہدے سے ممتاز ہوئے اور منصب پنج ہزاری و پنج ہزار سوار اور ظفر خاں رستم جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ جب فرخ سیر نے جہاں دار شاہ پر فتح پائی تو ان کا ستارہ اور چمکا ہفت ہزاری منصب اور ہفت ہزار سوار اور روشن الدولہ کا خطاب ملا۔ محمد شاہ کی بادشاہت میں بادشاہ کی رضاعی بہن زنام آثرالامرا میں نہیں ہی) کے منہ چڑھ گئے۔ بیگم صاحب کو بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ روشن الدولہ کے خوب گھرے رہے خوب ہاتھ رنگے۔ محمد شاہ کا زمانہ آیا تو اور اُچکے اور "یار وفادار" کا خطاب اور بڑھا۔ یہ "طرہ باز خاں" کے نام سے بھی مشہور رہتے کیوں کہ جب ان کی سواری نکلتی تھی تو کئی کئی طرے لگاتے تھے۔ غرض آدمی تھے بڑے سکّے جبڑے کے۔ لوگ ان سے خوش نہ تھے کچھ شکایتیں بھی سنی جاتی تھیں البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ اخلاق کے پُتلے۔ خلق مجسم اور فقرا کے بڑے معتقد اور داد و دہش میں بڑھے چڑھے تھے۔ ان کا انتقال ۱۱۴۹ھ ۱۷۳۶ء میں ہوا۔ شاہ بھیک صاحب کا اصلی نام سید محمد سعید تھا اور عرف سید میراں بھیک تھا آپ شاہ ابوالمعالی کے خلیفہ تھے۔ آپ کے آباواجداد کا وطن ترمذ تھا جہاں سے آپ کے مورث اعلیٰ سید زید ایک جماعت کثیر کے ساتھ ملک ہند میں کفار سے جہاد کرنے کو تشریف لائے تھے۔ پہلے آکر سیوانے میں اُترے وہاں کے راجہ نے آپ کو حالت نماز میں شہید کر ڈالا۔ آپ کے صاحبزادے راجہ سے خوب لڑے اور اُسے مار ہٹایا اور وہیں رہنے سہنے لگے سلطان شمس الدین التمش نے آپ کے صاحب زادوں کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ سُن کر اپنی ایک لڑکی بھی ان میں سے ایک سے منسوب کی۔ شاہ بھیک صاحب بڑے صاحب کشف وکرامات تھے۔ آپ کے معتقدین کثرت سے تھے جن میں ایک روشن الدولہ بھی تھے۔ آپ کی ولادت ۹ رجب ۱۰۴۲ھ ۲۷ مارچ ۱۶۳۲ء کو ہوئی اور (۸۹) سال کی عمر میں ۵ رمضان المبارک ۱۱۳۱ھ ۲۲ جولائی ۱۷۱۹ء کو وصال ہوا۔

فیض بازار

ہر سو نہرے دراں گلستاں
خیزاں وفتاں چو فیل ستاں

شہر دلی دروازے سے لے کر قلعے کے نیچے تک یہ بازار تھا جو اب دلی کے سارے بازاروں میں سب سے زیادہ ویران ہے۔ اس بازار کی جو حالت زمانِ شاہی میں تھی وہ سن کر زمانے کی ستمگاری پر حسرت و افسوس آتا ہے۔ یہ ایک بازار تھا وسیع و دلکش و دلربا۔ فرحت بخش و دل کشا جس کا طول ایک ہزار پچاس گز اور عرض تیس گز تھا ہر دو جانب اونچے اونچے شان دار مکانات بیچ میں نہر بہتی ہوئی ایک نفیس حوض بنا ہوا۔ سایہ دار گھنے درخت چھائے ہوئے جن سے کچھ تازگی اور بہار تھی۔ سبزہ فروشوں کی دکانوں سے دائمی شادابی اور سرسبزی کا نمونہ تھا۔ اس نہر اور حوض میں جیسا زور شور پیچ و تاب سے مرغولیں کھاتا لہریں مارتا پانی رواں تھا یہ خوبی شہر میں اور کسی جگہ نہ تھی۔ حقیقت میں یہ باغ ایک بہشت کا ٹکڑا تھا اور اس خوبصورتی کی نہر کسی بازار میں نہ تھی۔ یہ تو اس زمانے کا مذاق تھا اب رُت بدل گئی۔ باغوں اور گنجان آبادی کی جگہ اب کھلا میدان چھدری آبادی پسند کی جاتی ہے پس اب وہی حال اس ٹکڑے کا ہے کے دو طرفہ کچھ کچھ مکان تو باقی ہیں باقی وہ رونق کہاں ؟

برگ ریز آمدہ برگ گل و گلزار برفت | سُرخ روئی ز رخ لالہ و گلنار برفت
سرو بشکست و سمن زرد شد و نرگس خفت | گو بروایں ہمہ چوں از برِ من یار برفت

دلی دروازہ ۳۹-۱۶۳۸ء

یہ دروازہ شہر پناہ کا شہر جنوب رُخ کا آخری دروازہ ہے۔ اس کا نام **دلی دروازہ** اس وجہ سے پڑا ہے کہ یہ شہر میں داخل ہونے کا سب سے بڑا دروازہ یہی تھا۔ یہ دروازہ سادا اور معمولی پتھر کا بنا ہوا ہے اور اب تک قایم ہے۔ اب اس کے آگے کی دیوار روک کر رستہ ادھر اُدھر سے نکال دیا ہے۔

نواب صاحب پاٹودی کی مسجد اور کوٹھی

کہتے ہیں کہ جس وقت اول **شاہ جہاں بادشاہ** تشریف لائے اور **کلاں محل** میں مقیم ہوئے تو علما کے واسطے یہ مسجد بنوائی۔ غدر کے بعد **نواب صاحب پاٹودی** نے اس کے قریب زمین لی اور کوٹھی بنائی تو یہ مسجد نواب صاحب ہی کے نام سے مشہور ہوگئی۔ یہ مسجد نہایت خوشنما بنی ہوئی ہے اس میں چار حجرے اور بیچ میں ایک حوض نہایت پاکیزہ بنا ہے۔ مگر بالکل بے مرمت پڑا ہوا ہے ریاست سے بہت قلیل رقم ملتی ہے جس سے اس کی قدر ہوتی ہے مسجد کے شمالی گوشے پر ایک کنواں ہے وہ بھی

بہ عرت ہوا ہے اس مسجد میں ایک عربی کا مدرسہ شاہزادہ امیر الملک مرزا بلاقی صاحب کے اہتمام سے جاری ہے۔ اس مسجد کے جنوب میں نواب صاحب کی کوٹھی ہے۔ جو اب سلطان سنگھ صاحب نے خرید لی ہے

بپٹسٹ مشن ہال ۱۸۸۵ء

پاٹودی کے نواب صاحب کی کوٹھی کے مقابل بپٹسٹ مشن ہال ہے جس میں اس فرقے کے لوگ عبادت کرتے ہیں اتوار اور بدھ کو خاص کر کے جلسہ ہوتا ہے۔ یہیں پادری طامس صاحب اس کے مہتمم نہایت خلیق اور ذی مروت ہیں جیسے کہ اکثر پادری ہوتے ہیں۔ یہ عمارت ۱۸۸۵ء میں بصرفہ تیس ہزار روپیہ طیار ہوئی۔ اس عمارت کے متعلق ایک شفاخانہ ہے جس میں مفت علاج ہوتا ہے جنوب کی طرف فیض بازار ہے دونوں طرف بازار بیچ میں نہر بہتی تھی۔ یہیں محلہ نقارخانہ ہے جو پہلے دروازہ کلاں محل کے نام سے مشہور تھا کوچہ پرمانند کوچہ دکھنی راے اور ترکاری کی منڈی ہے پھر آگے مسجد روشن الدولہ ہے جو زیادہ تر قاضی زادوں کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اب پھر تنج راہ پر آیئے دریا گنج جانے والی سڑک پر چلیئے کونے والی مسجد سے ملا ہوا بیل کا کنواں ہے جس کا پانی بہت شیریں ہے اور لوگ دور دور سے آکر لے جاتے ہیں۔ پھر دریا گنج میں بیچ میں سے بھی زیادہ کوٹھیاں ہیں جن میں فوج کے اور دوسرے انگریز رہتے ہیں۔

وکٹوریا زنانہ ہسپتال ۱۹۰۶ء

زیر جامع مسجد مچھلی والوں میں ایڈورڈ پارک کے مقابل یہ بہت بڑی زنانہ ہسپتال ہے جو اندرون شہر اور وسط آبادی میں ہونے سے عورتوں کے لیئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس کی عمارت بڑی عالی شان۔ خوش نما اور وسیع ہے۔ اس کے روکار پر وکٹوریا زنانہ ہسپتال انگریزی میں بخط جلی لکھا ہوا ہے اور پھاٹک کے ایک پاکھے پر انگریزی اور دوسرے پر ہی کتبہ اردو میں ہے۔ اس کتبہ میں آنریری انجنیر ایل بابو مل اور جلہ زرچندہ صاحب معہ اور اس کے نیچے مستورات کے زر عطیہ کی تعداد لعمہ صاحب معہ تبلائی ہے اور اسم واری فہرست معطیان کی بھی دی ہے۔ دروازے کے ایک پاکھے کی برجی کے نیچے اردو میں اور دوسرے پاکھے پر انگریزی میں بھی یہی کتبہ ہے :-

بیادگار خدمات پادری ایس ایس طامس صاحب بحیثیت آنریری سکرٹری ہسپتال زنانہ ۱۹۰۶ء

ایڈورڈ پارک
سنہ ۱۹۱۱ء

شاد بہاں خسرو جنت نشیں
باد بجانِ تو زحق آفریں

جامع مسجد کے محاذی اس نام کا ایک پارک بنایا گیا ہی۔ جس کا سنگِ بنیاد خود ملک معظم جارج پنجم قیصر ہند ادام اللہ اقبالہم نے رکھا۔ مجسمہ کے لیئے چبوترہ پارک کے وسط میں بنا کر رکھا ہی مگر ابھی تک مجسمہ ولایت سے بن کر نہیں آیا۔ جنگ یورپ کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ اب چاروں طرف آہنی کٹہرے سے محاط کر دیا ہی اور چوطرف بجری کی سڑکیں ڈال کر ہریالی کے تختے بچھائے ہیں۔ غرض ابھی مکمل نہیں ہی جنوب میں ۲۹۲ فٹ شمال میں ۱۴۴ مشرق میں ۱۱۴۳ فٹ ہی اور جنوب کے سوا باقی تینوں طرف دروازے ہیں

مسجد اکبر آبادی
سنہ ۱۰۶۰ھ
۱۶۵۰ء

بت خانہ کھود ڈالیئے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیئے کہ خدا کا مقام ہی

فیض بازار ہی میں یہ مسجد تھی جو غدر کے بعد ڈھایا ڈھوئی کی نذر ہوئی۔ محل وموقع اُس کا موجودہ ایڈورڈ پارک ہی۔ جس وقت اُس کے لیئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون تھیں ویسے ہی ڈھک دی گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے خانۂ خدا اور یہ بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہو گئی۔ نقشہ اُس کا ملاحظہ فرمایئے اور آثار الصنادید سے اس کی کیفیت سنیئے۔ "یہ ایک مسجد ہی دل کش و دل ربا فرحت بخش و روح افزا سر سے پاؤں تک سنگ سُرخ کی اور اُس کے مکانات اور حجرے طالب علموں کے رہنے کے لیئے بنے ہوے ہیں۔ ضلع غربی سے ملحق کرسی دے کر بنائی ہی جس کی رفعت و شان کے آگے گنبد اخضر پست ہی اور جس کی عظمت و جلال کے آگے ملاء اعلیٰ گرد ہی۔ یہ مسجد فیض بنیاد اعزاز النسا بیگم محلِ شاہ جہاں بادشاہ نے سنہ ۱۰۶۰ھ میں مطابق سنہ ۲۲ جلوس بنائی ہی۔ ان بیگم کا خطاب اکبر آبادی محل تھا اسی سبب سے یہ مسجد بھی اکبر آبادی مشہور ہو گئی ہی۔ اس مسجد کے تین گنبد

مسجد اکبر آبادی
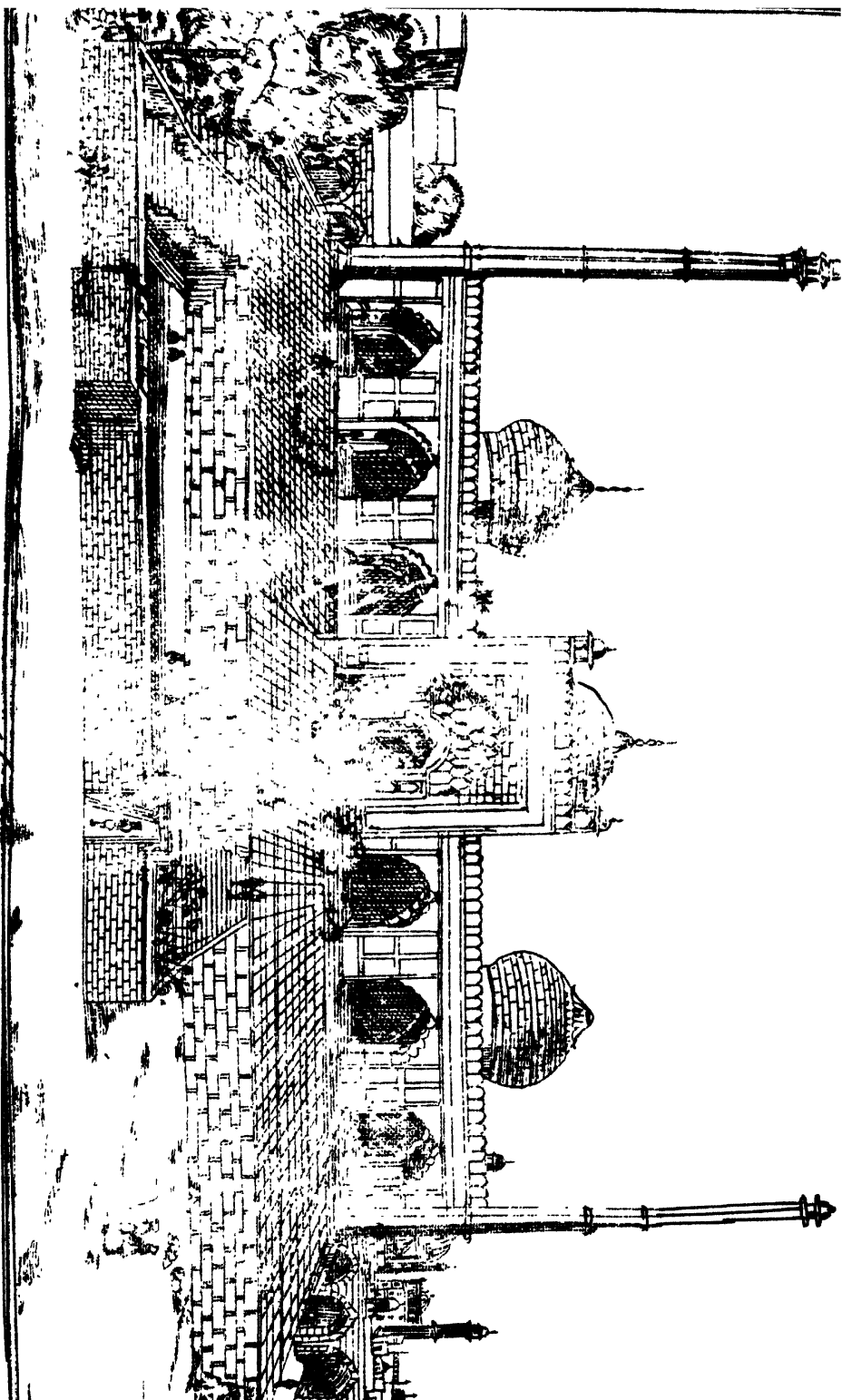
اور سات در ہیں۔ مسجد کی عمارت ۴۳ گز طول میں اور ستر ہ گز عرض میں نری سنگ سرخ کی اور اُس کا پیش طاق سنگ مرمر کا پرچین کار ہی اور اُس کے آگے ایک چبوترا ۴۳ گز طول ستاون گز عرض اور تین گز اونچا اس پر سنگ سرخ کا کٹہرا لگا ہوا ہی اور اس کے آگے ایک حوض ۱۲ × ۱۲ گز کا چشمۂ آفتاب ماہتاب پر شرف لے جاتا ہی اور نہر کا پانی اس میں آتا ہی۔ ؎ دراں صحن حوضے بصد آب وتاب۔ درخشندہ چوں چشمۂ آفتاب۔ اس کے گرد حجرے بنے ہوے ہیں ۱۵ × ۱۰ گز اور ہر حجرے کے آگے ایک ایوان ہی اور اُس کے سامنے سرتاسر چار گز عرض کا چبوترا۔ اس مسجد کے دو مینار ہیں بہت بلند من جملہ اُن کے شمالی مینار کی بُرجی کے صدمے سے ٹوٹ گئی ہی۔ مسجد کے دروازے پر یہ کتبہ بخط نسخ یہ ہی۔

این مسجد فیض انتما و سراے راحت جا و حمام نظافت اما چون لِے دلکشا کہ عبادتگاہ حق پرستان روزگار و روح افزاے متردان اقطار و نزہت گاہ آسمانیان و دار النفع زمینیان است در عہد سعادت مہد بادشاہ اسلام کہف انام ستارۂ والا پایہ پروردگار خلیفۂ برگزیدۂ کردگار رحمت اعمر ذی الجلال مظہر این دادار بیہمال ابی المظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہان بادشاہ غازی پرستار خاص بادشاہی پرستندہ با اخلاص ظل الٰہی موفقۂ خیرات و مبرات محرزۂ سعادات وحسنات اعز النسا مشہورہ باکبرآبادی محل بفرمان معلٰی بنا کردہ بجہت ابتغاے مرضاے الٰہی و اقتناے ثواب اخروی وحاصل سرٰی محتوی برمسجد باحقوق مرافق داخلہ وخارجہ وقف لازم شرعی نمودہ مقرر ساخت کہ اگر بمرمت این امکنہ احتیاج افتد آنچہ از حاصل این موقوف بعد الترمیم باقی ماند بخدمۂ مسجد و حمام و طلبۂ علم رسانند والّا تمام را بجماعۂ مسطورہ دہند این منازل منیعہ در عرض دو سال بصرف صد وپنجاہ ہزار روپیہ آخر شہر رمضان المبارک سال ہزار و شصتم ہجری مطابق بیست و چہارم جلوس عالم آرا صورت انجام پذیرفت ایزد تعالی اجر دین خیر جاری و نفع باقی بروزگار فرخندہ آثار پادشاہ دین پرور حق گزین

حقیقت گستر بانیۂ این مبانی عامرۂ معانی عائد گرداند آمین یا رب العالمین -

سنگم تھیٹر

طرفہ عروسے شدہ آراستہ
آئینہ از آب رواں خواستہ

زیر جامع مسجد مچھلی والوں میں وکٹوریا زنانہ ہاسپٹل کے قریب ہے۔ یہ لالہ سنگم لال کمشنری کا ہی جو دلی کے کل تھیٹروں میں بڑی عمارت ہے۔ اس میں بھی برقی پنکھے۔ روشنی اور تھیٹر کی کل ضروریات مہیا ہیں۔ اس میں ایک مرتبہ مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تھا جس کے پریزیڈنٹ ہز ہائینس سر آغا خاں بالقابہ تھے تھیٹر کے تماشوں کے سوا پبلک جلسے بھی اس میں ہوا کرتے ہیں -

خان دوراں خاں کی حویلی یا کھڑکی

زیر جامع مسجد مچھلی والوں کے محلے میں یہ کھڑکی خان دوراں خاں وزیر محمد شاہ بادشاہ کی حویلی کی تھی اب کھڑکی کا ایک ٹوٹا پھوٹا دروازہ رہ گیا ہے۔ یہاں جو گلی ہے اس میں متفرق مکانات بن گئے ہیں یہ گلی مولانا شاہ عبد العزیز صاحب مرحوم کے مدرسے ہوتی ہوئی کلاں محل کے پیچھے سے کوچہ چیلاں پرسے بنگش کے کمرے جانکلی ہے -

بازار مچھلی والاں

زیر جامع مسجد مچھلی والوں کا بازار ہے پہلے یہاں مچھلی والے کثرت سے رہتے تھے اور مچھلیوں کی منڈی تھی اس نام سے یہ بازار مشہور ہو گیا -

مچھلی والوں کی مسجد

اسی بازار میں یہ مسجد ہے جس میں پچیس تیس برس تک مولوی عبد الرب صاحب مرحوم وعظ کہتے رہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں از سر نو تعمیر ہوئی اور میاں عبد الرزاق جنت فروش نے اس میں ایک سنگین حوض بنوا دیا -

کٹرہ نظام الملک

مسجد کی پشت پر کٹرہ نظام الملک ہے اور یہیں منشی ظہور الحسن صاحب کا قومی پریس پہلے تھا۔ اب یہاں مچھلی کی منڈی ہے -

شیخ منگلو کا چھتہ (جامع مسجد کے جنوبی دروازے سے چتلی قبر تک)

شیخ منگلو کون تھے کوئی جانتا بھی نہیں۔ جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے یہ چھتہ ہی جس میں سے چوڑی والوں میں رستہ نکل جاتا ہی۔ اس چھتے کے پاس ہی۔

نواب فیض احمد خاں صاحب

کا دولت خانہ ہی۔ اللہ اللہ وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ دلی نوابوں جنگ وولاؤں کا مخزن تھا یا آج نام کو ڈھونڈے بھی کوئی نواب اصلی مفہوم میں نظر نہیں آتا۔ یہ نواب صاحب بھی دلی کے نہیں کرنال کے رئیس ہیں۔ ہم اسی میں مگن ہیں کہ ہماری دلی کی ناک سلامت ہی کوئی نواب نظر تو آتا ہی۔ نواب صاحب ممدوح شہر کے رئیس اعظم امیر ابن امیر ابن تعلیم یافتہ ذی خلق صاحب مروت۔ مسلمانوں کے ہی خواہ وہم درد ہیں۔ آپ کے والد بزرگ وار نواب محمد نجف خاں صاحب روٴسائے کرنال میں سے تھے یعنی نواب احمد علی خاں صاحب اعظم کرنال کے بھانجے تھے۔ نواب محمد نجف خاں صاحب نے بہ مقتضائے وقت گورمنٹ کی ملازمت اختیار کی۔ (۳۵) سال تحصیل دار اور ڈپٹی کلکٹر رہے۔ غدر میں دو تین لڑائیوں میں انگریزوں کا ساتھ دیا جس کے صلے میں سرکار سے جاگیر ملی۔ آپ ملازمت انگریزی سے کنارہ کش ہونے کے بعد سولہا سال تک ریاست ٹونک میں ممبر کونسل اور حاکم اپیل رہ کر پنشن یاب ہوے۔ ٹونک سے آکر چند ماہ کے بعد ۱۵ ارجون ۱۹۰۲ء کو وہ راستہ اختیار کیا جس پر امیر و فقیر سب کو جانا ہی۔ آپ سید محبوب علی صاحب کے قبرستان میں آسودہ ہیں۔ کیا ہی اچھے ہیں وہ لوگ جو بعد مرگ بھی نیکی سے یاد کیے جائیں۔ آپ کے خلف رشید نواب فیض احمد خاں صاحب ہیں جو اپنے والد ماجد کی نیکیوں اور خوبیوں کی زندہ یادگار ہیں۔ دلی کے قحط الرجال میں آپ کا دم غنیمت ہی۔ قابلیت۔ لیاقت۔ شرافت۔ امارت۔ تہذیب و اخلاق ہر اعتبار سے دلی کے لیے سرمایۂ فخر و ناز ہیں۔ اسی گلی میں مولوی سید محبوب علی صاحب کی مسجد ہی جو مولنا شاہ عبدالعزیز صاحب رح کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ آس موڑ پہ گلی کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں چھوٹی گلی

مولوی عبدالمجید صاحب کے مدرسے کے سامنے ہوتی ہوئی یہ چاوڑی بازار کے پچھلے دروازے میں جا نکلتی ہے۔ دوسری شاخ چوڑی والوں کے بازار میں گئی ہے۔ یہ بازار ایک طرف املی کی پہاڑی کے متصل تراہے سے جا ملا ہے دوسری طرف جوتے والوں کی مسجد سے آگے بڑھ کر جنوب کی جانب سیتا رام کے بازار سے جا ملتا ہے اور غربی جانب میں سید عبا شیتل داس کے حمام، مطبع مجتبائی اور مدرسہ طبیہ لوہے کے کارخانے پر سے گزرتا ہوا چاوڑی بازار میں جا نکلتا ہے۔

امام جی کی گلی

اس میں ہمیشہ سے جامع مسجد کے امام صاحبان رہا کرتے تھے۔ اس وقت شمس العلماء سید احمد صاحب امام ہیں۔ جن کو سرکار عالی نظام رام پور اور بھوپال کی ریاستوں سے معقول وظیفہ ملتا ہے۔

امام صاحب حال کو حکام مقامی میں بڑا رسوخ حاصل ہے۔ یہ خدمت جلیلہ امامت کی آپ کے خاندان میں عہد شاہ جہانی سے متوارث چلی آتی ہے۔ آپ سید صحیح النسب ہیں آپ کا سلسلہ دسویں پشت میں سید عبدالغفور شاہ امام السلطان بخاری سے ملتا ہے۔ جو امام السلطان حضرت سید جلال الدین عرف سید جلال بخاری کی اولاد میں سے ہیں جو اپنے زمانے کے مشہور اولیاء اللہ تھے جس وقت شاہ جہاں بادشاہ نے جامع مسجد بنوائی جو سید المساجد اور نور علی نور ہے تو اس مسجد کے شایاں امام بھی متقی۔ پرہیزگار اور سید الایمہ ہونا ضرور تھا۔ بخارے میں حضرت سید عبدالغفور شاہ کا شہرہ تھا۔ شاہ بخارا کی وساطت سے ۱۰۶۵ھ میں نہایت اعزاز و احترام سے طلب فرمایا اور ۱۰۶۶ھ میں منصب امامت پر ممتاز فرمایا اور دوگانہ عید الفطر کا سید صاحب کی اقتدا سے ادا کیا اور خطبہ کے بعد دست خاص سے بیش بہا خلعت دے کر امام السلطان کا خطاب اور جاگیرات عطا ہوئیں۔ اس کے بعد تا قیام سلطنت مغلیہ ہمیشہ شاہانہ دربار و اور جشنوں کے مواقع پر امام السلطان کے ساتھ مراسم اعزازی کا پورا لحاظ رہتا تھا۔ دست خاص سے خلعت مرحمت فرمانا۔ مذہبی گروہ میں تقدیم اور خطاب خاص کے ساتھ مخاطب فرمانا۔ سبز لباس کی خصوصیت وزراء و امراء کی طرح باریابی جیب خاص سے مصارف کا عطا ہونا یہ سب امام صاحب کی خصوصیات اس زمانے میں تھیں اورنگ زیب نے رسم تخت نشینی کا افتتاح بھی امام جامع مسجد سے کرایا اور خلعت گراں

بہادیا۔ یہی رسم ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ تک برابر قایم رہی اُن کی تاجپوشی کی تقریب میر احمد علی صاحب امام وقت نے ادا کی۔ اس کے بعد غدر پڑا اور بساط اُلٹ گئی۔ میر احمد علی کے فرزند حال امام صاحب کے والد سید محمد صاحب سر سید احمد خاں کے رشتہ دار اُن کے پاس چلے گئے۔ مسجد ضبط ہو گئی جب فتنہ فرو ہوا اور مسجد ضبطی سے واگزاشت ہوئی تو امام جی اپنی آبائی خدمت پر بحال ہوئے سید محمد صاحب نے (۷۲) برس کی عمر میں ۳ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ کو انتقال فرمایا ۱۱ اگست ۱۸۹۹ء اور شاہ ولی اللہ صاحب کی درگاہ میں مدفون ہوئے

ھوالغفور تاریخ وفات ہے۔ اس میں ایک مناسبت یہ ہے کہ آپ کے دادا کا نام ۱۳۱۷ھ **غفور شاہ** تھا۔ ان کے بعد آپ کے فرزند اکبر مولوی حاجی سید احمد صاحب امام ہوئے جنھوں نے اپنے والد کی زندگی ہی میں ۱۸۸۲ء سے امامت شروع کردی تھی۔ اب امام صاحب حال اس گلی میں نہیں رہتے بلکہ مچھلی والوں میں رہتے ہیں۔ دلّی کے منتخب لوگوں میں آپ کا شمار ہے۔ ایک فضیلت امامت مسجد جامع ہی کی آپ کے تعزز و احترام کے لیئے ایسی کافی دوانی ہے کہ دوسرے کسی اعزاز کو میری راے میں اُس پر تفوق دینا ترجیح بلا مرجح ہے۔

منشی امیر الدین فیض رقم

امام صاحب کے موروثی مکان کے پاس ہی حافظ سید منشی امیر الدین صاحب فیض رقم کا مکان ہے آپ خط نسخ کے وحید العصر اُستاد تھے جو اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اب خط نسخ کے لکھنے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔ فن خطاطی روبانحطاط ہے۔ سٹیل نب کے واسطے قلم نے جگہ چھوڑ دی ہے۔ خط نسخ و نستعلیق چاکر اب جنٹلمینی گھسیٹ کی گرم بازاری ہے جو نوک پلک۔ کشش دوائر۔ نشست الفاظ۔ تقطیع باطنی سے عاری ہے۔ نہ وہ روشنائی ہے جس کی صدہا برسوں کے بعد بھی چمک دمک ماند نہ ہوتی تھی نہ وہ خطاطی ہے کہ جس سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور ہوتا تھا۔ کاپی نویسوں کی قلت۔ خوشنویسوں کی سرد بازاری ٹیپ کے واسطے رستہ صاف کرتی جاتی ہے۔ دو چار خوش رقم اور خوش قلم جو رہ گئے ہیں وہ بڑے سے چل چلاؤ پر ہیں ان کے بعد مطلع صاف ہے۔ پیٹ کے دھندوں ہی سے فرصت

نہیں خط کو لے کر کیا چاٹیں۔

آب مٹیا محل کی طرف چلیئے تو چتلی قبر تک یہ گلیاں ملتی ہیں جن کے متعلق کسی خاص تذکرے کی ضرورت نہیں۔ داہنے ہاتھ کی طرف کوچہ رگھناتھ داس۔ حویلی بختاور خاں جس میں حسین بخش پنجابی کا مدرسہ ہے۔ بائیں ہاتھ کی طرف گلی کبابی۔ گلی عادل اچار والی۔ کٹڑہ گوکل شاہ جس میں

مولوی محمد حسین فقیر کی مسجد اور مدرسہ

۱۳۲۲ھ

مولوی محمد حسین فقیر کا مدرسہ ہے اور ایک عالی شان مسجد بھی ہے۔ مسجد کی کرسی کو اونچا کروایا ادھر ادھر حجرے بنائے ہیں صحن میں بیضوی حوض نہایت پاکیزہ۔ جمعہ جمعہ وعظ ہوتا ہے مولوی ابراہیم کا وعظ ہوتا ہے۔ اگلی گلی گڑھیا یا احمد علی خاں کی حویلی کہلاتی ہے۔ ادھر بھی مدرسے کا دروازہ ہے ایک کتبہ مسجد کے پیش طاق پر ہے اور دوسرا مدرسے کے دروازے پر۔

ایں مدرسہ از شان عطائے تو خدایا
مرفوع شد ایں قصر ہدایت فلک الحمد

بشنو غنی قول فقیر آمدہ تاریخ
ایں جا شدہ محراب عبادت فلک الحمد

آمیں اہل دین حق درس و نماز و وعظ میں
یہ عبادت گاہ خاص و عام مسجد بن گئی ۱۳۱۵

لکھ جناب مصطفی کی سال ہجرت اے فقیر
خوب زیبا رونق اسلام مسجد بن گئی

مدرسہ حسین بخش

۱۲۶۸ھ
۱۸۵۱-۵۲ء

پیش طاق پر "دار الهدیٰ والوعظ ۱۲۶۸ھ ۱۳۲۲ الوقف لا یبلا" لکھا ہوا ہے۔ یہ مسجد اور مدرسہ حسین بخش صاحب پنجابی سوداگر نے ۱۲۶۸ھ میں تعمیر کرا کر وقف کیا ہے جس میں علاوہ مسجد کے مدرسے کے لیئے دالان اور طلبار اور مدرسین کے لیئے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ "دار الهدیٰ والوعظ" سے تاریخ نکلتی ہے۔ اس مسجد میں مولوی کرامت اللہ خاں صاحب ایک عرصے سے جمعے کے جمعے وعظ فرمایا کرتے تھے لیکن مولوی ابراہیم سے کچھ مخالفت ہوتے ہیں مولوی صاحب نے بہتر یہی سمجھا کہ ع پائے مرا لنگ نیست ملک خدا تنگ نیست غرض توفیق و ہدایت سے ہی یہاں نہیں کہیں اور سہی اب قابل عطار کے کوچہ کی مسجد

ہیں وعظ فرماتے ہیں۔ دلّی میں سچ پوچھئے تو مولویوں میں سے سوا ے مولوی کرامت اللہ خاں صاحب کے اب کوئی نہ رہا۔ آپ ہندو راؤ کے باڑے میں تشریف رکھتے ہیں روز صبح کو کلام مجید کا ترجمہ مسجد میں بیان فرماتے ہیں بہت سن اور بیماریوں سے رنجور ہیں مگر ہمت میں جوان اور عزم میں استقلال ہے برابر سلسلہ رشد وہدایت کا جاری ہے۔ آپ عالم مستند۔ محدث وفقیہ ہیں۔ مولنا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولنا محمد یعقوب صاحب سے حدیث شریف کی سند حاصل کی ہے سنہ ۱۳۰۴ھ میں ملک عرب کو گئے چھ مہینے حرمین شریفین میں مقیم رہے اور جناب مولوی حاجی امداد للہ صاحب سے بیعت کی۔ اب خود وعظ فرماتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ آپ کے وعظ میں بڑا مجمع ہوتا ہے اور دل پر اثر ہوتا ہے لوگوں کو بے حد رقت ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ آپ کا دم اس زمانے میں دلّی کے لیئے بسا غنیمت ہے۔

ٹیا محل عزیز آبادی کی حویلی اور مسجد

جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے جو سڑک چلی گئی ہے وہ ٹیا محل کا بازار کہلاتا ہے یہاں بجانب دست راست اس نام کا ایک بڑا محل تھا سابق میں کچھ مکانات امراء کے بھی رہے ہوں گے اب تو معمولی لوگ رہتے ہیں اور یہ سارے کا سارا محلہ ٹیا محل کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ ٹیا محل کی وجہ تسمیہ کچھ معلوم نہیں ہوتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب قلعہ بن رہا تھا تو شاہ جہاں بادشاہ کی عارضی اقامت کے لیئے ٹیا محل بنایا گیا تھا۔ بعد میں یہ محل نواب عزیز آبادی بیگم کو جو کسی شاہزادے کی بیگم تھیں دے دیا گیا۔ اور اسی سبب سے آگے چل کر وہ عزیز آبادی کی حویلی کہلانے لگا کیونکہ ٹیا محل ہی کے سامنے عزیز آبادی بیگم کی حویلی تھی جو مدت تک نواب مغل بیگ خاں کے تصرف میں رہی۔ اس حویلی کے احاطے میں ایک شکستہ مسجد تھی جس کو مولوی صدر الدین خاں صاحب صدر الصدور نے بصرفۂ کثیر درست کرا کے ایک کنواں بھی کھدوایا۔ یہ مسجد وسعت میں اچھی خاصی ہے جس کا ایک گنبد اور دو مینار ہیں لیکن اس مسجد کا کوئی خاص نام نہیں ہے البتہ حویلی اور وہ احاطہ جس میں یہ حویلی ہے تاریخی لحاظ سے ایک بڑا مقام ہے کیونکہ اس کے احاطے میں بعض بہت پرانی عمارتوں کے کھنڈر ہیں اور لوگ انھیں کو ٹیا محل کا بچا کھچا حصہ بتلاتے ہیں۔ الغرض

بہادر شاہ ثانی نے یہ حویلی اپنے کسی پوتے کو دیدی۔ غدر کے بعد تمام مکانات شاہی ضبط ہوے اور پھر فروخت کیئے گئے تو نواب صاحب دوجانہ نے اس حویلی کو خرید لیا اور شیا محل اور عزیز آبادی کی حویلی دونوں نام جاکر اب یہ احاطہ نواب صاحب دوجانہ کے نام سے مشہور ہی۔

مولوی صدرالدین خاں کی حویلی

شیا محل سے سیدھے ہاتھ پر مولوی صدرالدین خاں کی حویلی ہی جو اُن سے پہلے ہزارہ بیگ کی حویلی کہلاتی تھی۔ مولوی صاحب نے اسے خرید کر نئے سرے سے بنوایا۔ یہ حویلی بہت خوش قطع ہی اور اس میں خانہ باغ۔ نہر فوارے۔ سب کچھ تھا۔ اب مکین کے ساتھ وہ رونق بھی گئی اور کچھ بھی نہ رہا۔

مولنا مولوی صدرالدین خاں بہادر

کسانیکہ راہ خدا داشتند
چنیں خرقہ زیر قبا داشتند

ایسے مستجمع اوصاف حمیدہ اور خصائل برگزیدہ کے تھے کہ آج ان کا نام نیک اور شہرۂ معدلت ضرب المثل ہی۔ خدا جانے اس دلی کی سرزمین میں کیا برکت خداوند تعالیٰ نے رکھی ہی کہ ایک سے ایک بڑھ کر لائق وفایق فیض رساں عالم پیدا ہوتا ہی اور ہزاروں کو مستفید کرکے اپنا نام نیک چھوڑ جاتا ہی۔ زمانہ جو فنا کرنے والا اور مٹانے والا ہی وہ بھی ان کی نیکیوں کو مٹا نہیں سکتا۔ بے شائبہ تکلف وبے آمیزش مبالغہ ایسا فاضل اور ایسا کامل سوا اس سرگروہ علمار کے بساط عالم پر جلوہ گر نہ تھا۔ لباس فقر میں مصروف طاعت ہونا اور فراغ عبادت کےلیئے گوشۂ خلوت اختیار کرنا امیروں کے لیئے ایک بہت مشکل معاملہ ہی۔ عدل وانصاف و فریاد رسی عبا دافضل عبادات ہی منصب **صدارت** کو اپنے ذمے لیا اور بلا رو ورعایت اور لگاؤ کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرتے رہے۔ لوگوں کے دلوں پر معدلت راست بازی۔ حق پژوہی۔ دیانت امانت کا نہ مٹنے والا سکہ بٹھا گئے۔ دلِ رنجور کے لیئے مرہم کافور ظالموں اشرار کے لیئے تادیب دہی میں مشہور۔ دبدبۂ وشوکت ظاہری سے ان کے دربار میں بار ملنا محال۔ کوئی زبان کھول سکے کیا مجال۔ باوجود مراتب بلند ومناسب ارجمند کے اخلاق

محمدی سے متصف ۔ افادۂ علوم و افاضت مسائل دین کے وقت ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو عام آزادی ۔ زود رنج ہر نہ ٹوک بسینہ تھا یا علم کا گنجینہ نظم و نثر عربی و فارسی و اردو میں لاجواب کلام آپ کا انتخاب ۔ عربی کے نظم و نثر بلیغ کا نمونہ ہم نے چھوڑ دیا فارسی اور اردو کی ایک ایک غزل کے چند اشعار نمونۃً پیش ہیں ۔ ناظرین پڑھیں اور مزہ لیں ۔

آتش عشق فلک دل و در جانم سوخت ۔۔۔ نہ انکہ از داغ دگر دید کہ نتوانم سوخت
دل ز خونناب جگر سوخت و مژگانم سوخت ۔۔۔ آخر ایں شعلہ بہ پیدا ایم و پنہانم سوخت
پنبۂ مرہم او مہر قیامت باشد ۔۔۔ عشق آن داغ کہ در سینۂ سوزانم سوخت

لب بند ہو تو روزنِ سینہ کو کیا کروں ۔۔۔ تھمتا تو مجھ سے نالۂ آتش عیاں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودا سے عشق میں ۔۔۔ اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
اے جذب شوق رحم کہ مد نظر ہے یار ۔۔۔ جا سکتی واں تلک نگہ ناتواں نہیں
کیا کچھ نہ کر دکھاؤں پہ اک دن کے واسطے ۔۔۔ ملتا بھی ہم کو منصب ہفت آسماں نہیں
ناز و نگہ روش سبھی لاگو ہیں جان کے ۔۔۔ پھر کون ادا وہ تیری کہ جو جانستاں نہیں
شب اس کو حال دل نے جتایا کچھ اس طرح ۔۔۔ ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں
وہ شاخ نخل خشک ہوں میں کنج باغ میں ۔۔۔ دیکھے بھی بھول کر بھی جسے باغباں نہیں
ملنا ترا یہ غیر سے ہو بہر مصلحت ۔۔۔ ہم کو تو سادگی سے تری یہ گماں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہ حزیں کے ساتھ ۔۔۔ اک قہر تھی بلا ۔ تھی قیامت تھی جاں نہیں
بے وقت آئی دیر میں کیا شورشیں کریں ۔۔۔ ہم پیر دیر بھی کدہ بھی نوجواں نہیں

آزردہ نے پڑھی غزل اک میکدے میں کل
وہ صاف ترکِ سینۂ پیر مغاں نہیں

روز ہجراں تو می سوخت مرا حسرت وصل ۔۔۔ در شب وصل تو اندیشۂ ہجرانم سوخت
پیچ گہ چرخ جفا پیشہ نمی ساخت بمن ۔۔۔ شکر ایزد کہ ز راہ شرر افشانم سوخت
رحمت از بہر عذابم کشش اسے نار جحیم ۔۔۔ کہ سراپا ے مرا خجلت عصیانم سوخت
شرر دوزخ جانتاب ببسے بود بلند ۔۔۔ چوں مقابل شدہ با سینۂ سوزانم سوخت

برگ جمعیت دیوان جزا برہم خورد
جنت از حسن تو و دوزخ از افغانم سوخت

باز آں بستر خارست وہاں بالش سنگ
سر شوریدہ کہ من زانوے یارانم سوخت

بزم افروز شبستاں نشدم از شمعم
بخت خوابیدہ سر خاکِ شہیدانم سوخت

دل پرورد و خوناب جگر سوخت مرا
آنکہ یک عمر با و ساختہ ام آنم سوخت

ہر نگہ کاں بتِ ترسا بچہ در کارم کرد
آتش تفتہ بود کز و خرمن ایمانم سوخت

گو نسیمے کہ ز شیرب وزد و سبز کند
خاست از بند سمومے کہ گلستانم سوخت

گر ز آتش سخنی ہیچ کس الم نفزود
لیکن آزردہ از وجان حسودانم سوخت

غزل اردو

نالوں سے مرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمیں و زمیں آسماں نہیں

قاتل کی چشم تر نہ ہو یہ ضبط آہ دیکھ
جیوں شمع سر کٹا پہ اٹھایاں دھواں نہیں

آنکھوں سے دیکھ کر تجھے سب ماننا پڑا
کہتے تھے جو ہمیشہ چنیں ہے چناں نہیں

کہتا ہوں اب یہ کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہے گی زباں اور زباں نہیں

اے بلبلاں شعلہ دم اک نالہ آفریں بھی
گم کردہ راہِ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں

اس بزم میں نہیں کوئی آگاہ ورنہ کب
واں خندہ زیر لب ادھر اشک نہاں نہیں

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیر مغاں نہیں

شیدی فولاد خاں کا بنگلہ

نوکری صاحب کی حویلی کے پاس سیدھی جانب شیدی فولاد خاں کا بنگلہ تھا۔ جو محمد شاہ کے عہد میں شہر کا کوتوال تھا۔ مگر مدتیں ہوئیں کہ اس بنگلے کا نام ونشاں تک نہ رہا۔ ہاں نام چلا جاتا ہے۔

چھپا میم کا چھتہ

یہ بھی ایک محلہ ہے صحیح وجہ تسمیہ تو معلوم نہیں ہوئی مگر نام پکار رہا ہے کہ کوئی کالی کلوٹی کرسٹانی رہتی ہوگی جس پر سے یہ نام پڑا۔

نواب مصطفیٰ خاں کی حویلی

چھپامیم کے چھتے میں سید کی طرف بہت اچھا عالیشان مکان اور کمرہ نواب صاحب کا تھا جو اُس کے بانی کی رفعت اور شان کو تبلاتا تھا لیکن اب کچھ نہیں رہا۔ متفرق چھوٹے چھوٹے مکانات بن گئے ہیں۔ ایک ہی کوچے کے دو نام ہیں کوئی چھپامیم کا چھتہ کہتا ہے کوئی نواب مصطفیٰ خاں کی حویلی۔

سید رفائی صاحب کی مسجد ۱۲۳۲ھ - ۱۸۱۰ء - ۱۸۱۷ء

یہیں یہ مسجد ہے جو بہت قدیم ہے لیکن چوں کہ سید صاحب اس مسجد میں بہت رہتے ہیں اور اس مسجد کی مرمت بھی کرائی ہے اس واسطے انھیں کے نام سے مشہور ہو گئی۔ یہ سید صاحب بڑے مقتدائے روزگار تھے اور اُن کے ہاں ایک مجلس بنام حضرہ ہوا کرتی تھی جس میں یہ قید تھی کہ اُس کے گرد وپیش کوئی عورت نہ ہو۔ آپ کے مریدین کے ہاتھوں میں چھرے ہوتے تھے اور وہ کلمہ طیبہ پڑھتے جاتے تھے اور اُن پر ایک حالت بے خودی اور وجد کی طاری رہتی تھی آپ کا وصال ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۷ء میں ہوا۔ ۱۳۰۶ھ میں نواب مولوی احسان الرحمن خاں صاحب نے اپنی اہلیہ مرحومہ کی وصیت کے موافق اس مسجد کی مرمت کرائی اور تین پختہ دکانیں تعمیر کرائیں جن کے کرایہ سے مسجد کی نگہداشت ہوتی ہے۔ مسجد پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

"محمد احسان الرحمن ابن مرحومی محمد یوسف الرحمن خاں حسب وصیت اہلیہ مرحومہ خود دوکاکین پختہ وحمام و متوضا وحجرہ وزینہ وغیر ذالک بر قطعۂ زمین متعلقۂ مسجد رفائی بنا کرد و برائے مصارف مسجد وقف نمود ۱۳۰۶ھ"

اعظم خاں کی حویلی اور مسجدیں

اب اس حویلی کا جو نواب اعظم کی بنائی ہوئی تھی پتہ بھی نہیں رہا بلکہ جو محلہ یہاں آباد ہے وہ سارے کا سارا اعظم خاں کی حویلی کے نام سے مشہور ہے۔ اس محلے میں دو مسجدیں ہیں دونوں کا کوئی خاص نام نہیں صرف محلے کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ ایک مسجد جس کے متولی منشی یعقوب علی ہیں اُس کی محراب وسطی پر یہ تاریخ کندہ ہے:

اولیا نام زنِ صالحہ او کرد بنا — رفت و بر بستر آرام تہ خاک بخفت

چو زوال وزرا گشت بنا مسجد نو
دل من سال تمامش "سبب تحسین" گفت

اسی محلے میں ایک چھوٹی مسجد ۱۲۶۳ھ اور بھی ہے جس میں کوئی خاص بات نہیں۔ ۱۰۵- ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۴ء)
اعظم خاں کی حویلی کے پھاٹک کے سامنے چتلی قبر ہے۔ یہاں سے ترکمان دروازے تک دو طرفہ یہ گلیاں ہیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف پہاڑی راجان پہاڑی درزیاں۔ گلی کمہاران۔ گلی چمڑے والی چھوٹی بڑی۔ اُلٹے ہاتھ کی طرف حویلی مہابت خاں جس کا صرف ایک دالان باقی رہ گیا ہے۔

چتلی قبر سرِ ازبالاے ترکمان دروازہ تا بلبلی خانہ

چتلی قبر ۷۹۳ھ ۱۳۹۱ء

اسی قبر کے نام سے محلہ اور بازار مشہور ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ مزار سید روشن صاحب شہید کا ہے جو کوئی بڑے بزرگ تھے اور کوئی چھ سو برس سے یہاں ہے۔ حال میں یہاں ایک کتبہ ۱۲ رجب ۷۹۳ھ ۱۳۹۱ء کا لگا دیا ہے۔ وجہ تسمیہ چتلی قبر کی یہ ہے کہ اس پر مختلف رنگوں کے نقش و نگار ہیں۔

سید جلال الدین صاحب کا مزار

اسی کے قریب سید جلال الدین کی قبر ہے جو ایک مکان کے اندر آگئی ہے۔ آپ سید روشن شہید کے برادر زادے تھے آپ کا عرس ۸ شعبان کو ہوتا ہے۔ ایک جانب ترکمان دروازہ اور یہ جگہ جو چتلی قبر اور اعظم خاں کی حویلی کے بیچ میں ہے ترا ہا ہو گیا ہے اب ہم پہلے ترکمان دروازے کا حال لکھتے ہیں۔

میر محمدی صاحب کی خانقاہ ۱۲۴۲ھ ۱۸۲۶-۲۷ء

اسی محلے میں آپ کی خانقاہ اور قبر ہے۔ آپ کا اصلی نام مولانا امام الدین تھا مگر مشہور میر محمدی ہی کے نام سے تھے۔ مرزا سلیم خلف اکبر ثانی بادشاہ آپ کے معتقد اور مرید تھے۔ جب آپ کا وصال ۱۲۴۲ھ ۱۸۲۶-۲۷ء میں ہوا تو مرزا سلیم شاہزادے نے فرطِ عقیدت سے آپ کو اپنے مکان کے صحن میں دفن کیا جو اب مرزا محمدی کی خانقاہ کے نام سے مشہور ہے ایک اونچے چبوترے پر تین قبریں بنی ہوئی ہیں۔ مشرقی جانب کی قبر میر صاحب کی ہے۔ درمیانی مرزا سلیم شاہ کی اور مغربی جانب مرزا صاحب کی اہلیہ خسرو زمانی بیگم کی اور باقی چار قبریں آپ کے مریدوں کی

ہیں۔ پہلے میر صاحب کا عرس بھی ہوتا تھا اب کچھ عرصے سے موقوف ہے۔

میر ہاشم کی حویلی اور شاہ آفاق صاحب کی مسجد

اس محلے میں عہد مغلیہ کی ایک قدیم مسجد ہے جو شاہ آفاق کی مسجد مشہور ہے۔ یہ مقام پہلے ایک تسبیح خانہ تھا جہاں بعد میں مسجد بنا دی گئی اور کچھ حال معلوم نہیں۔

شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ ۱۱۹۵ھ

میر محمدی کی خانقاہ کے آگے دست چپ کو شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ ہے۔ آپ سادات علوی اور اولیاے کرام میں سے تھے۔ آپ کا اصلی وطن موضع بٹالہ امرتسر کے قریب ہے۔ آپ کے والد شاہ عبداللطیف صاحب شاہ ناصرالدین قادری علیہ الرحمۃ کے مرید تھے جن کا مزار عیدگاہ محمد شاہی کے پیچھے شیدی پورے میں ہے۔ شاہ صاحب کے پیدا ہونے سے اول آپ کے والد نے حضرت علی کو خواب میں دیکھا فرماتے ہیں کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا اس کا نام میرے نام پر رکھنا اور آپ کے عم بزرگوار نے حضرت رسول اللہ صلعم کو خواب میں دیکھا آپ نے فرمایا کہ عبداللہ نام رکھنا اس لیئے آپ کا نام عبداللہ عرف غلام علی ہوا۔ آپ ۱۱۵۸ھ میں تولد ہوئے۔ "مظہر جود" تاریخ ولادت ہے۔ آپ جب سولہ برس کے ہوئے تو آپ کے والد نے شاہ ناصرالدین صاحب سے بیعت کرنے کو بلایا مگر جس رات آپ دہلی پہنچے اسی دن اُن کا وصال ہوگیا اس کے بعد آپ نے مرزا مظہر جان جاناں سے بیعت کی اور اُن کے بعد آپ ہی سجادہ نشین ہوئے۔ آپ نے ہمیشہ توکل سے بسر کی سینکڑوں طالبان خدا کا کھانا کپڑا اپنے سر رکھا۔ فقہ تفسیر حدیث کا درس دیتے تھے سالہا سال اسی طرح دروازہ فیض کھلا ہوا اور چشمہ خیر کا جاری رہا ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ ہفتے کے دن سفر آخرت اختیار کیا اور خانقاہ میں اپنے مرشد کے برابر دفن ہوئے نوراللہ مضجعہٗ تاریخ وفات ہے۔ آپ کے بعد شاہ ابوسعید صاحب مجددی جانشین ہوئے جن کا سلسلہ نسب حضرت مجدد الف ثانی تک پہنچتا ہے۔ پھر آپ حج کو گئے

ٹونکیوں کو ٹونک میں انتقال ہوا نعش دلی لائی گئی اور اپنے پیر کے پہلو میں آسودہ ہیں۔ ولادت آپ کی مصطفیٰ آباد عرف رام پور اور یہ مصرعہ تاریخ ہے ع۔ حافظ و عالم دلی بادا۔ عید کے دن کہ روز شنبہ تھا ۱۲۷۷ھ میں وفات پائی یَغفِرُ اللہُ مَضجَعَہ تاریخ وفات ہے۔ آپ کے چار صاحب زادے تھے۔ آپ کے بعد بڑے صاحب زادے شاہ احمد سعید صاحب مجددی سجادہ نشین ہوئے۔ منظہر یزداں تاریخ ولادت ہے۔ آپ حافظ تھے۔ مولوی فضل امام اور مفتی شرف الدین وغیرہ ۱۲۱۸ھ سے علوم عقلیہ اور مولوی رشید الدین خاں صاحب شاگرد مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث پڑھی اور خود مولانا۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے بھی شرف تلمذ تھا۔ بعد آپ کعبۃ اللہ گئے ۲ ربیع الاول سہ شنبہ کے دن ۱۲۷۷ھ میں ظہر اور عصر کے بیچ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روضے کے قریب مدفون ہوئے۔ آپ کے بعد آپ کے برادر اصغر مولانا شاہ عبدالغنی صاحب سجادہ ہوئے۔ جن کی ولادت ۵ شعبان ۱۲۳۵ھ ہے۔ پندرہ سال کی عمر میں مکہ معظمہ جاکر شیخ محمد عابد سندی مدنی سے علم حدیث حاصل کیا۔ حج سے واپس آکر مولانا شاہ اسحٰق صاحب نبیرۂ شاہ عبدالعزیز صاحب سے تکمیل کی۔ علم حدیث کا درس دینے لگے۔ آپ کے ارشد تلامذہ میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی مشہور محدث اور عالم ہیں۔ غدر کے بعد آپ نے ہجرت فرمائی اور بمقام مدینہ منورہ ۱۲۹۶ھ انتقال فرمایا شاہ احمد سعید صاحب کے قریب مدفون ہوئے شاہ احمد سعید صاحب کے پوتے شاہ محمد معصوم صاحب ہیں جو ۱۲۶۷ھ میں اسی خانقاہ میں پیدا ہوئے تھے بعد حج کو گئے دس حج ادا کیے اور بیس برس کے بعد پھر ہندوستان میں آئے۔ نواب کلب علی خاں صاحب رئیس نے بلا لیا اور وہیں رہ پڑے۔ مولانا شاہ محمد عمر صاحب فرزند دوم شاہ احمد سعید صاحب کے صاحب زادے مولانا شاہ ابوالخیر صاحب اس وقت سجادہ نشین ہیں جو ۱۲۷۲ھ میں اسی خانقاہ میں پیدا ہوئے۔ حافظ قرآن ہیں۔ غدر میں بیت اللہ تشریف لے گئے مولانا رحمۃ اللہ صاحب کرانوی مہاجر مکی اور مولوی سید حبیب الرحمٰن صاحب مہاجر اور سید احمد صاحب مکی سے علوم متداولہ میں کامل

لیاقت حاصل کی۔ کبھی کبھی شب کو حدیث شریف کا درس بھی دیتے ہیں اکثر ترجمہ کلام پاک بیان فرماتے ہیں۔ خلوت پسند زیادہ ہیں جلوت سے گھبراتے ہیں سوائے اپنے مریدوں کے جو زیادہ تر افغان لوگ ہیں دوسروں سے ملنے میں تامّل کرتے ہیں چنانچہ خانقاہ کا دروازہ بھی اکثر بند رکھتے ہیں۔ اس احاطے میں خانقاہ۔ ایک مسجد اور چند حجرے ہیں صحن خانقاہ میں چار قبریں ہیں۔ جن میں سے تین تو ایک اونچے چبوترے پر ہیں اور ایک نیچے بجانب شرق۔ چبوترے کے وسط میں شاہ صاحب کا مزار ہے۔ مشرق میں مرزا مظہر جان جاناں کا جو شاہ صاحب کے مرشد تھے اور مغرب میں شاہ ابوسعید کا جو شاہ صاحب کے مرید تھے۔ چبوترے کے نیچے والی قبر مولوی رحیم بخش کی ہے جو شاہ ابوسعید کے خلیفہ تھے اور جب شاہ صاحب مکہ معظمہ تشریف لے جاتے تھے تو آپ ہی خانقاہ کے نگراں رہتے تھے۔ آپ کی قبر پر صرف آیات کلام اللہ منقوش ہیں۔ مسجد اور قبروں کی مرمت حال میں ہوئی ہے اور یہاں تین کتبے حسب ذیل ہیں:-

(۱) مزار حضرت مرزا جانجاناں مظہر شہید قدس سرہ ۱۱۹۵ھ تاریخ دہم محرم۔

(۲) مزار حضرت شاہ عبداللہ معروف بہ شاہ غلام علی قدس سرہ ۱۲۴۰ھ تاریخ ۲۲ صفر۔

(۳) مزار حضرت شاہ ابوسعید احمدی قدس سرہ ۱۲۵۰ھ تاریخ یکم شوال۔

مرزا مظہر جانجاناں شہید ایک مشہور شاعر ہونے کے علاوہ بڑے مقدس بزرگ بھی تھے۔ آپ سادات اور خاندان تیموریہ سے تھے۔

بھوجلا پہاڑی داہنی جانب بھوجلا پہاڑی کی گلی ہے جو بلبلی خانہ اور شاہ ترکمان کی طرف جا نکلتی ہے۔ اس میں متعدد گلیاں پیچ در پیچ ہیں۔ گلی شعلیچیاں گلی حاجی سید احمد حسن۔ گلی نل والی۔ گلی پیپل والی۔ گلی اندھیری۔ گلی پہاڑی کشمیریاں گلی چھوت والی۔

موم گروں کا چھتہ اسی خانقاہ کے بالمقابل جانب دست راست موم گروں کا چھتہ ہے۔ یہ بھی دلی کا ایک محلہ ہے۔

شاہ گلن کی ڈگڈگی خانقاہ کے پاس یہ بھی ایک محلہ ہے۔ اصل جگہ جو شاہ گلن کی ڈگڈگی کہلاتی ہے وہ ایک دالان تھا جس میں ایک

چھوٹی سی دیوار چراغاں کی بنی ہوئی تھی اور اس میں شاہ کلن درویش مدار یہ فرقے کے رہا کرتے تھے اور روشنی کرتے۔ تھے اُن کی ڈگڈگی مشہور ہو گئی اور ایسے مکان کو اس فرقے کی اصطلاح میں ڈگڈگی کہا کرتے ہیں بعض لوگ یہ وجہ تسمیہ کہتے ہیں کہ شاہ صاحب کے دروازے پر ایک دھونسہ (نقارہ) رکھا رہتا تھا جو کوئی مہمان آتا ایک چوب لگاتا دو ہوتے تو دو چوب اسی طرح بیس چوبوں تک کا حکم تھا اور اگر اس سے زیادہ لوگ ہوتے تو گجر بجایا جاتا اسی وجہ سے یہ نام پڑ گیا۔ اور یہیں سے بُلبُلی خانہ اور ترکمان دروازے کو رستہ جاتا ہے

ترکمان دروازہ
سنہ ۱۶۵۸ء

شہر شاہجہان آباد کے جنوب و مغرب کے رخ کا دروازہ۔ چوں کہ شاہ ترکمان کے مزار کے پاس ہے اُنھیں کے نام سے دروازہ مشہور ہو گیا ہے۔

نامعلوم قبریں

ترکمان دروازے اور پولیس سٹیشن کے پاس چند قبریں پختہ ہیں اور اُن پر سفیدی ہوتی رہتی ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ کن بزرگوں کی ہیں۔

حیدر رضا کی قبر
سنہ ۱۲۰۳ھ
سنہ ۱۷۸۸-۸۹ء

شاہ ترکمان صاحب کی درگاہ میں ایک قبر سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہیں حیدر رضا صاحب کی قبر ہے جو مذہب اثنا عشری رکھتے تھے۔ اس پر یہ کتبہ ہے۔

نوجوان حیدر رضی بیگ اندریں قبر کہن ... از ازل پاکیزہ دیں بود و ہم پاکیزہ خو
چوں بضرب گولہ در ... بشد شہید ... با شہیداں رفت در جنت ولیکن سرخرو
سال فوتش را چو موزوں از خرد جستم بگفت ... داورا کن با حسین ابن حیدر حشر او
سنہ ۱۲۰۳ ہجری نبوی

بی ممولا کی قبر
سنہ ۱۲۴۲ھ
۲۶-۲۷-۱۸ء

اسی درگاہ میں سنگ مرمر اور سنگ ہاسی کی یہ قبر ہے اس پر کلمہ اور یہ عبارت کندہ ہے۔

"بتاریخ چہاردہم ذیقعد سنہ ۱۲۴۲ ہجری بی ممولا نور اللہ مضجعہا قفس عنصری را شکستہ با آشیانۂ فردوس پرواز نمود"

تحقیق خاں کی قبر
سنہ ۱۰۷۸
سنہ ۱۶۶۷-۶۸ء

محلۂ قبرستان میں مسجد قلندر بیگ کے جنوب میں۔ یہ قبر

نقشہ درگاہ حضرت شاہ ترکمان
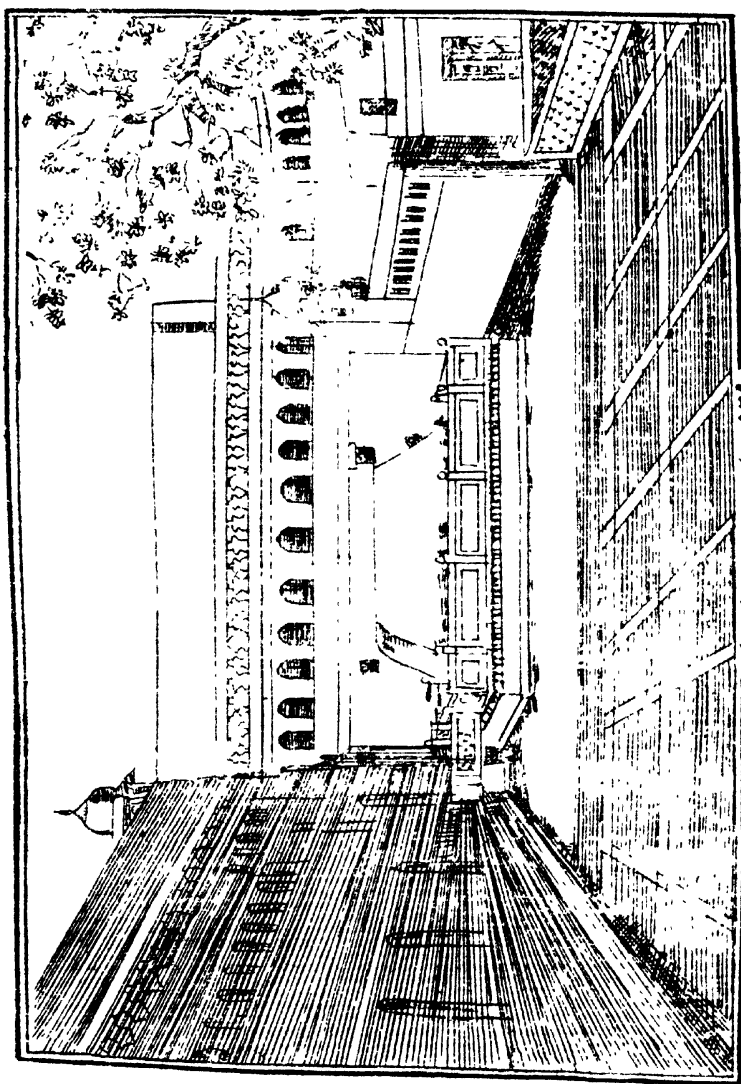
اینٹ اور چونے کی پختہ بنی ہوئی ہے۔ جس کا تعویذ نہایت نفیس اور مجلّیٰ سنگِ مرمر کا ہے اس پر یہ کتبہ ہے۔

و وھبنا لہ اسحٰق و یعقوب وجعلنا فی ذریتہ النبوۃ والکتاب و آتیناہ فی الدنیا

وانہ فی الاخرۃ لمن الصالحین

ہٰذا مرقد اسحاق بیگ مخاطب تحقیقخاں ۱۰۷۸

اللھم اغفرلہ ولوالدیہ

درگاہِ حضرت شاہ ترکمان

شمس العارفین بیابانی ۶۳۷ھ ۱۲۴۰ء

اے دل ز غبارِ جسم اگر پاک کنی۔
تو روحِ مجردی بر افلاک شوی
عرش ست نشیمنِ تو شرمت بادا
کائی و مقیمِ خطۂ خاک شوی

مسلمان فاتحین کے ساتھ جو بڑے بڑے علماء اور مشائخین سرزمینِ دہلی پر تشریف لائے تھے اور جن کے مریدین اور معتقدین کا ایک وسیع حلقہ اُن کے تابع فرمان اور پیرو ہدایت تھا اُن میں حضرت **شاہ ترکمان** صاحب بھی ایک بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کا اسم شریف **شمس العارفین** تھا اور **بیابانی** اس وجہ سے مشہور تھے کہ آپ تارک الدنیا تھے اور اکثر صحرا و بیابان میں بسر اوقات فرماتے تھے باایں ہمہ لوگ آپ کو گھیرے رہتے تھے اور آپ کے معتقدین کا ایک بڑا بھاری گروہ تھا۔ آپ کا مزار شریف اندرونِ شہر دہلی ترکمان دروازے کے پاس ہے۔ چنانچہ ترکمان دروازہ آپ ہی کے اسم نامی سے مشہور ہے۔ درگاہ محاط ہے مگر چھت نہیں ہے دیر ساہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں جمنا یہیں بہتی تھی۔ الغیب عند اللہ۔ آپ سہروردیہ خاندان کے سلسلے میں تھے جب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا شہید ہوا تو آپ کا سن شریف (۸۰) سال کا تھا۔ آپ کا وصال ۲۴ رجب المرجب ۶۳۷ھ ۱۸ فروری سنہ ۱۲۴۰ء میں بزمان سلطنت **معز الدین بہرام شاہ** ہوا۔ آپ کا عرس شریف اب تک سالانہ ہوتا ہے اور بسنت کا میلا بھی یہیں لگتا ہے۔ آپ کا مزار شریف چبوترے سمیت سنگ مرمر کا ہے۔ قبر کے گرد ایک پست کٹہرا ہے۔ آپ کے احاطے میں اندہ

چند قبریں بھی ہیں جو آپ کے مریدوں کی ہیں۔ کہتے ہیں آپ کی درگاہ معزالدین بہرام شاہ کی بنوائی ہوئی ہے لیکن بادی النظر میں قبر اور چبوترا دونوں زمانۂ مابعد کی تعمیر معلوم دیتے ہیں یہاں سے آگے چل کر ڈوموں کی گلی۔ گلی گڈریاں۔ گلی گدھے والاں۔ سیدھی طرف گلی میر مالی۔ گلی ماسٹر شیو پرشاد۔ گلی ڈکوتاں۔ کلیان پورہ۔ احاطہ میر بھکاری بائیں ہاتھ کو اور اس سے آگے ترکمان دروازہ آجاتا ہے۔

پھاٹک حویلی نواب مظفر خاں

ترکمان دروازے کے پاس ہے۔ قدیم مغلیہ عہد کا بنا ہوا عالی شان دروازہ ہے۔ یہ پھاٹک دراصل سید مظفر خاں کی حویلی کا ہے جو عہد شاہجہانی کے امیر کبیر تھے۔ اب حویلی کا پتہ نہیں اندرون احاطہ محلہ آباد ہوگیا ہے اور متفرق لوگ جن میں تیلیوں کا غلبہ ہے بستے ہیں۔ خاں جہاں لودھی نے سنہ ۳-۱۶۲۹ء میں بغاوت کی۔ نواب مظفر خاں لڑے اور خان جہاں کو قتل کیا۔ پنج ہزاری منصب اور اسی قدر سوار سے اور خان جہاں کا خطاب سرفراز ہوا۔

کلاں مسجد (عرف) کالی مسجد

سنہ ۷۸۹ھ
۱۳۸۷ء

یہ مسجد اندرون شہر دہلی محلہ بلبلی خانہ اور ترکمان دروازے کے پاس بہت بڑی اور قدیم عمارت ہے۔ جو جوناں شاہ المخاطب بہ خان جہاں ابن خان جہاں وزیر اعظم نے فیروز شاہ بادشاہ کے عہد میں ۲۰ جمادی الاخری سنہ ۷۸۹ھ ۲۸ جون ۱۳۸۷ء میں بنائی ہے۔ اصل میں کلاں مسجد ہے جسے عوام نے بگاڑ کر کالی مسجد کرلیا ہے اور ایک اعتبار سے کالی مسجد بھی صحیح ہے کہ بسبب کہنگی کے باہر وار ساری عمارت پر کائی جم کر کالی ہوگئی ہے مسجد ایک مستطیل عمارت ہے جو (۱۴۶) لمبی اور (۱۲۰) چوڑی۔ دیواروں کے آثار بہت بڑے یعنی چھ فٹ کے ہیں۔ اس مسجد کو موقع اور محل ایسا بہتر ملا ہے اور ایسی بلند کرسی دی گئی ہے کہ سوائے جامع مسجد اور قلعے کے اور کوئی عمارت اس شان و شوکت کی شہر میں نہیں ہے۔ یہ مسجد دو منزلہ ہے۔ پہلی منزل کی کرسی (۲۸) فٹ ہے جس میں متعدد دکانیں کرایہ کے واسطے بنائی گئی ہیں۔ دیوار سے ملی ہوئی کوٹھڑیوں میں دروازے اور ایک ایک سیڑھی ہے اور چبوتروں کے نیچے ہیں اُن میں اندر ہی اندر راستے ہیں۔ بالائی حصہ کنگنی تک (۳۸) فٹ اونچا ہے۔

کالی مسجد
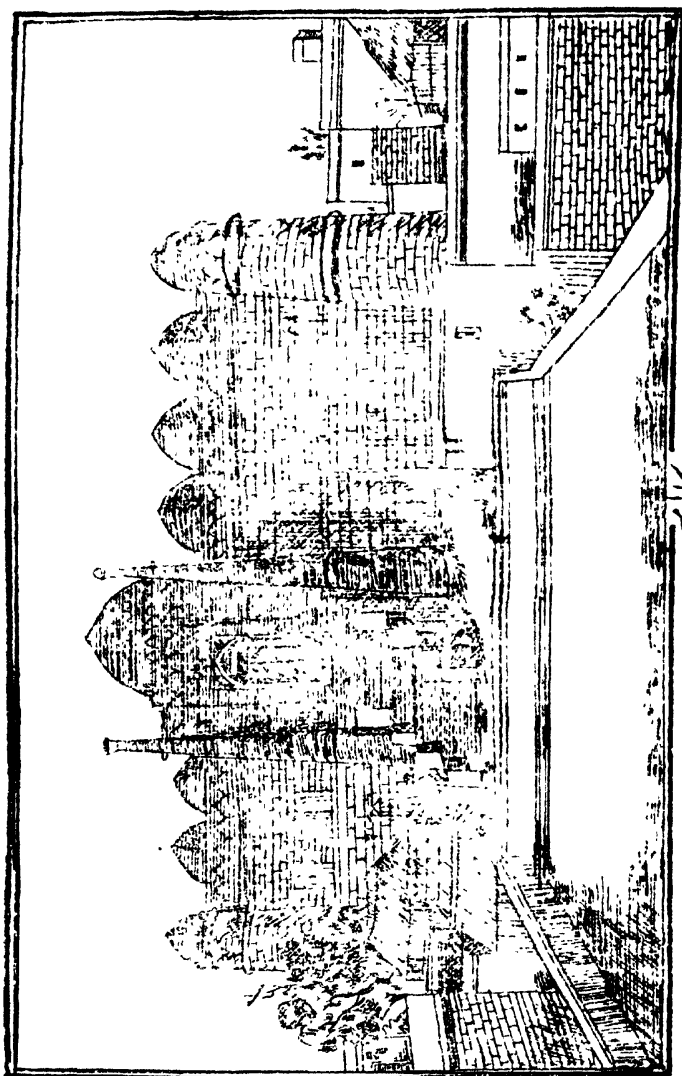
دونوں حصوں کی بلندی ملا کر ۶۶ فٹ ہے۔ یہ مسجد اُس مال مسالے کی بنی ہوئی ہے جو عہد فیروز شاہی میں مستعمل تھا۔ بنیاد کے پتھر بہت بڑے بڑے بن گھڑے ڈھیم کے ہیں جو نہایت عمدہ مسالے دار چونے سے جوڑے گئے ہیں جو ایسے پیوست ہو گئے ہیں کہ چھت کے گنبد کا سارا بوجھ ان ہی پر ہے اور یہ مسالے ہی کی خوبی ہے کہ پتھر جو بے قاعدہ لگائے گئے ہیں حتی کہ محرابوں میں ڈاٹ بھی نہیں لگائی گئیں مگر اب تک کسی جگہ سے ذرا بھی جنبش نہیں کھائی۔ اس کا مسالا اور چونے کی تیاری اس خوبی کی ہے کہ خدا جانے اس میں کیا کیا ملا دیا ہے کہ چونا پتھر اور اینٹیں سب ایک جرم ہو گئے ہیں اور چونے کی ایسی زبردست پکڑ ہے اور ایسا ایک جان کر دیا ہے کہ چونے سے اینٹ یا پتھر کسی طرح جدا نہیں ہو سکتا۔ مسجد کے اندر اور باہر دونوں رخوں کی استر کاری بہترین مسالے سے کی گئی ہے۔ دروازے کے پاس کی بچی بچی استر کاری کو غور سے دیکھنے سے کچھ کچھ نشان سیاہی مائل نیلے رنگ کا معلوم دیتا ہے جو غالباً کوئلے اور ناریل کے تیل۔ اور دوسرے مسالوں سے تیار کیا گیا تھا۔ اب استر کاری کا بہت تھوڑا حصہ دست برد زمانے سے محفوظ رہا ہے اور جو کچھ اب تک قایم ہے وہ مسجد کے اندر وار ہے جہاں نگہداشت اچھی ہے اور وقتاً فوقتاً سفیدی بھی ہوتی رہتی ہے۔ گنبدوں اور چھت کی کچھ جو آج تک علیٰ حالہ قایم ہے وہ مسالے ہی کی عمدگی ہے۔ غرض مسجد اب بھی مستحکم ہے اور موجودہ حالت میں بہت اچھی ہے اور جہاں کہیں چھلیں گر گئیں ہیں یا دیواروں کی جڑوں میں سے پتھر نکل گئے ہیں وہاں اینٹیں لگا کر داغ دوزی کر دی گئی ہے۔ مسجد میں جانے کی (۲۹) سیڑھیاں ہیں اور دو سیڑھیاں پٹے ہوئے دروازے میں داخل ہونے کی ہیں۔ دروازے اور محرابوں کے ستون سب اسی بھاری بھاری بن گھڑے پتھروں کے بنے ہوئے ہیں جیسے کہ اس زمانے میں عموماً عمارات میں لگائے جاتے تھے جس کی تفصیل کیتابانی صاحب نے کی ہے اسی پتھر کی دو دو انچ سے بھی کچھ زیادہ موٹی سلیں چار چار فٹ مربع مسجد کے صحن میں بچھی ہوئی ہیں اور اسی قسم کی بھاری بھاری سلیں چھجوں میں لگائی گئی ہیں اور اسی پتھر کے توڑے بھی ہیں ان توڑوں اور ستونوں پر نقش و نگار بھی بنے ہوئے ہیں چھجے کے اندر اور توڑوں کے اوپر سنگ سرخ کی تحریر ہے جیسا کہ عموماً شمالی ہندوستان میں رواج ہے لیکن فیروز شاہ کے زمانے میں اس قسم کی تحریر دیکھنے میں نہیں آئی البتہ اس زمانے سے اسی برس پہلے قطب مینار ہوتی مسجد

اور قطب الدین ایبک اور سلطان شمس الدین التمش کے زمانے کی دوسری عمارتوں میں
بھی اس طرز کا رواج کثرت سے پایا جاتا ہے۔ کھڑکیوں کی جالیوں میں سنگ سرخ ہی لگایا گیا ہے
کیونکہ وہ بہ نسبت سنگ خارہ کے نرم ہوتا ہے۔ اب تو یہ کھڑکیاں خالی ہیں لیکن ۱۸۴۲ء
کھڑکیاں جو دو منزلے کے چاروں طرف ہیں غالباً ان سب میں جالیاں لگی ہوئی تھیں
مگر اب کئی کھڑکیاں معمولی پتھر سے چن دی گئی ہیں۔ سنگ سرخ کی جالیاں مسجد اور
اندھیرے تہ خانے کے درمیان اب بھی موجود ہیں۔ یہ تہ خانہ مسجد کے عقب میں
دو طرف ہے لیکن مغرب کے رخ پر نہیں ہے۔ ان جالیوں کی کندائی بہت عمدہ ہے لیکن
ان پر بار بار چونا پھیر دیا گیا ہے جیسا کہ اب کوئی سو برس سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اسی طرح
قدسیہ بیگم کے مقبرے کے عمدہ نقش و نگار کے ستونوں پر جو کشمیری دروازے کے
باہر محمد شاہ کی والدہ نے بنوایا تھا پلاستر چڑھا کر ساری خوب صورتی کو ماند کر دیا ہے
دروازہ مشرقی دیوار سے (۳۰ گز) کے فاصلے سے ہے جس پر ایک گنبد ہے جس کی دونوں طرف
دو گلدستہ دم چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔ یہ مشرقی دروازہ سطح زمین سے (۲۰) فٹ بلند ہے جس کی پیشانی
پر یک ناصاف سنگ مرمر کی سل پر یہ کتبہ بخط نسخ کندہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) بفضل و عنایت آفریدگار در عہد دولت بادشاہ دین دار (۲) الواثق بتائید الرحمٰن ابوالمظفر فیروز شاہ السلطان
خلد اللہ ملکہ این مسجد بنا کردہ بندہ زادہ (۳) درگاہ جونانشہ[1] مقبول المخاطب خان جہان ابن خان جہان

؎ جونانشہ مقبول کے والد کا نام بعض مصنفین نے ملک مقبول لکھا ہے اور بعض نے ملک قبول۔ فرشتہ نے ایک جگہ مقبل لکھا ہے۔ چونکہ محمد تغلق شاہ کا نام جونا شاہ تھا اور اس کے بھتیجے فیروز شاہ تغلق نے اسی کے نام پر جونا پور آباد کیا۔ تو اسی طرح اس مسجد کے بانی کے باپ نے بھی اپنے بیٹے کا نام بادشاہ کے نام پر سے جونانشہ رکھا تھا۔ شمس سراج نے لکھا ہے کہ خان جہاں بانی مسجد کا باپ ہندو تھا اور اس کا اصلی نام کنو تھا۔ جب سلطان محمد تغلق کے زمانے میں مسلمان ہو گیا اور بادشاہ نے اس کا نام مقبول رکھا۔ جو سلطان محمد تغلق کے زمانے میں بڑے مراتب علی پر پہونچا۔ فیروز شاہ نے تخت پر بیٹھ کر قلمدان وزارت سپرد کیا اور خان جہاں کا خطاب دیا۔ اس کی وفات کے بعد خطاب و وزارت دونوں اس کے بیٹے جونانشہ کو دی گئی جس نے بیس سال وزارت کی جلیل القدر خدمت کو حسن و خوبی انجام دیا۔ بادشاہ کو ایسا بھروسہ تھا کہ ساری سلطنت کا کاروبار اسی کے سپرد تھا۔ فیروز شاہ کی سلطنت کے آخری زمانے میں خان جہاں جونانشہ سے شاہزادہ محمد خاں جو آگے چل کر محمد شاہ کے نام سے بادشاہ ہوا ناراض ہو گیا تھا جس کی وجہ سے جونانشہ کے عروج کا زوال ہوا۔ شاہزادے نے اسے ایسا تنگ کیا کہ گھر بار چھوڑ کر کوہستان میوات کو بھاگ گیا تھا۔ جہاں اس نے موضع مہتری میں کوکا چوہان کے ہاں جان بچانے کی غرض سے جا کر سر چھپایا۔ بادشاہ نے شاہزادے کو سارے اختیارات دے دیئے تھے اس نے سکندر خاں کی کو فوج دے کر خان جہاں کی گرفتاری کو بھیجا جب لشکر مہتری میں جا پہونچا تو کوکا چوہان ڈرا کہ اس کی جان کی خیر نہیں بے چارے خان جہاں کو قید کر کے سکندر خاں کے پاس بھیج دیا جس نے اسے دیکھتے ہی قتل کر ڈالا۔ اور اس کا سر کاٹ کر اپنے ساتھ دلی لے جا کر شاہزادے کے سامنے پیش کیا۔ خان جہاں جونانشہ نے دہلی و اس کے قرب و جوار میں سات مسجدیں بنائیں جن کا ذکر اپنی اپنی جگہ پر کیا جائے گا۔ ۱۲

خدا سے براں بندہ رحمت کند ہر کہ دریں مسجد (۴) بیاید بدعا خیر پادشاہ مسلمانان وایں بندہ بفاتحہ واخلاص یاد کند حق تعالیٰ ایں بندہ را بیامرزد (۵) بحرمۃ النبی عالہ مسجد مرتب شد بتاریخ دہم ماہ جمادی الآخر سنہ تسع وثمانین وسبعمائۃ

کتبے کے دیکھنے سے آپ معلوم دیتا ہی کہ حروف کھودتے وقت دوائر کشتوں میں چھوٹے چھوٹے گول گول سوراخ بنا کر ان میں سیسا پلا دیا گیا ہی اور بعد سطح ہموار کردی گئی ہی اور اسی وجہ سے حروف خوب جم کر دیرپا اور مستحکم ہوگئے ہیں لیکن پھر بھی زمانے نے تباہی کا ہاتھ دکھلایا ہی دکھلایا جا ہی سے سیسا جھڑ گیا ہی اور پہلی اور دوسری سطر کے دو تین حروف جھڑ گئے ہیں باقی اب تک بدستور قایم ہی۔ مسجد میں داخل ہونے کا رستہ ایک چوکون ڈیوڑھی ۱۳ × ۱۳ انچ اور ۱۳ × ۱۳ انچ کی ہی جس کے اوپر گنبد ہی۔ اس ڈیوڑھی کے دو دروازے پرانی وضع کی چولوں پر تھے۔ ایک اندروار ہی اور دوسرا باہروار۔ اب دروازے تو رہے نہیں صرف چولیں باقی ہیں جو بہت قدیم ہیں جن کی بھدی بناوٹ اور مینگم کام سے یہ خیال ہوتا ہی کہ یہ دروازہ غالباً مسجد کی بنا سے بھی پہلے کا ہی۔ مسجد کا صحن طول میں ساٹھ فٹ اور عرض میں اڑتالیس فٹ پختہ کا بنا ہوا ہی جس کے چاروں طرف دالان ہیں جن کا چھجہ بڑی بھاری چوڑی اور موٹی سلوں کا ہی جو بھدے توڑوں پر ٹکا ہوا ہی۔ صحن مسجد میں تین مردانی اور ایک زنانی قبریں ہیں۔ تین قبروں کے سرہانے چراغ دان ہیں لیکن بظاہر یہ قبریں ایسی پرانی نہیں معلوم دیتیں جیسی کہ روایت کی جاتی ہی کہ خان جہاں باپ اور اسی کے ہم نام اس کے بیٹے کی ہیں۔ یہ قبریں اینٹوں کی ہیں اور اینٹوں کا ہونا کچھ عجب نہیں کہ خود سلطان محمد تغلق بانی خاندان تغلق کا مقبرہ بھی اینٹوں ہی کا بنا ہوا ہی۔ ان قبروں پر کوئی کتبہ نہیں جس سے کوئی ٹھیک رائے قایم کی جا سکے کہ کن کی ہیں اور کس زمانے کی ہیں۔ مسجد کی اصلی عمارت مغرب کے رخ پر ہی۔ جس کے تین دالان ہیں اور جو تیکے گہے ہیں ہر گہہ میں پانچ پانچ در ہیں اور جنوب شمال کے دالانوں میں چار چار در اور مشرق کی طرف چار در اور ایک دروازہ جس میں ایک سلسلہ محرابوں اور گنبدوں کا ہی جو چھ دُہرے اور اٹھارہ اکہرے ستونوں پر لگے ہوے ہیں اور اسی طرح تین طرف دیوار دوز ستون ہیں۔ پندرہ گنبد تو اصل مسجد کے تہرے دالانوں پر ہیں جن میں سے

سلہ اب صحن مسجد میں کوئی بھی قبر نہیں ہی غدر کے بعد سب صاف کردی گئیں۔ ۱۲

بیچ کا گنبد اور گنبدوں سے تین فٹ اونچا ہے۔ اور اسی طرح شمال رویہ دالان پر پانچ اور جنوب رویہ دالان پر پانچ اور مشرق رویہ دالان پر چار اور صدر دروازے پر ایک سب ملاکر تیس گنبد ہیں۔ مغرب اور صدر دالان کے شمال اور جنوب پاٹ دئیے ہیں اور مغرب میں مسلسل لداؤ کی گیلری ہے جس میں روشنی اور ہوا کے لیئے بڑی بڑی سنگین جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ اور اسی سلسلے میں مسجد کے چاروں کونوں پر ایک ایک حجرہ بھی ہے۔ اس چھتے کے مغرب کے رخ پر چھت کی طرف تین کوٹھریاں نکالی گئی ہیں جن میں سے بیچ کی کوٹھڑی سب سے چھوٹی ہے۔ اس رستے کے اندرونی دیواریں اور اس میں داخل ہونے کے دروازے کے داہنی اور بائیں اوپر چڑھنے کا زینہ ہے۔ مسٹر ویس اینڈ کوپ نے اس عمارت کی نسبت حسب ذیل ریمارک کیا ہے۔ "اس عمارت کا گاؤدم طرز یعنی نیچے سے چوڑا اور اوپر سے پتلا اس زمانے کی قدیم عمارت کا ایک خاص طرز تھا۔ گاؤدم ستون جو صدر دروازے کی دونوں جانب ہیں اُن سے اس عمارت کا رنگ بالکل مصری طرز کا معلوم دیتا ہے اور یہی طرز اہل ہنود کی قدیم عمارتوں میں بھی پایا جاتا ہے جس کی بابت عام خیال ہے کہ اس ملک میں مصریوں ہی سے لیا گیا ہے۔ اس عمارت کے بالکل سیدھے سادے ستون اور سردل جو محرابوں کو تھامے ہوئے ہیں وہ نہایت غور سے دیکھنے کے قابل ہیں جن میں بعض جگہ ایک اور اکثر جگہ دو کھڑے پتھر یا ستون ایک تیسرے پتھر پر لگا دیا گیا ہے اور جس کے اوپر جو تھا پتھر بطور سردل کے رکھا گیا ہے۔ محرابوں اور گنبدوں کی عجیب وغریب ساخت اور وہ غیر معمولی گرفت کا مسالا جس سے بدون ڈاٹ کے یہ بھاری بھاری پتھر قایم ہیں یہ طرز بھی چودھویں صدی کے مسلمان بادشاہوں کی تعمیر کا تھا" مسجد کے موقعی حالت سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ مسجد ایک گنجان حصۂ آبادی میں بنائی گئی تھی اور جہاں سے اب شہر دہلی آباد ہے یہ مقام یا تو فیروزآباد کے مضافات میں تھا یا شہر فیروزآباد کا خود ایک جزو تھا۔ بشپ ہیبر اس مسجد کی نسبت لکھتے ہیں "کلاں مسجد ایک چھوٹی سی عمارت ہے جس میں کوئی بات بجز اس کی سادگی۔ استحکام۔ اور بڑی قدامت کے توجہ کے قابل نہیں ہے۔ طرز عمارت خاص افغانان فاتحین کا ہے جو قدیم زمانے کے مسلمانوں کی سادگی کا ایک (عمدہ) نمونہ ہے۔ یہ مسجد ملک عرب کی مسجدوں کا ایک نمونہ ہے جس کے صحن کے اطراف دالان ہیں اور جس کی چھت تمام لداؤ کے چھوٹے چھوٹے اور

نہایت مضبوط گنبدوں سے بنی ہوئی ہی جو ایک بالکل سادہ نمونہ ہی جس کی تشبیہ ہم قدیم زمانے کے نارمن لوگوں کی عمارات سے دے سکتے ہیں۔ اس مسجد میں مینار نہیں ہیں موذن چھت پر چڑھ کے اذان دیتا ہی فیروزشاہ تغلق نے اپنے آخری حصۂ عمر میں کئی ایک بڑی بھاری بھاری مسجدیں بنوا کر بڑا نام پیدا کیا ہی۔ یہ مسجدیں خان جہاں وزیر اعظم اور اس کے بیٹے جونانشہ کی بنوائی ہوئی ہیں جو خود بھی وزیر تھا اور جسے اپنے باپ کا خطاب "خان جہاں" بھی ملا تھا۔ مسٹر ٹرلٹ لکھتے ہیں کہ "خان جہاں اور اس کے بیٹے نے بہت سی عمارتیں بنانے کی وجہ سے بہت بڑی شہرت حاصل کی جس کا مرتبہ بنا سے عمارات کے لحاظ سے بادشاہ کے بعد ہی قرار پاتا ہی۔ البتہ یہ سمجھنا مشکل ہی کہ ان پست دالانوں کی عمارتوں میں جن کے اوپر نصف دائرے اور چھوٹے قطر کے گنبدوں کی قطاریں ہیں اس طرح کہ ایک گنبد دوسرے سے بالکل پیچیدہ ہوگیا ہی اور کہیں کہیں دروازوں پر ایک بڑا گنبد بھی بنا دیا ہو کیا خوبی ہی" یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہی کہ اب جو یہ مسجدیں کالی کالی بھیانک نظر آتی ہیں ان پر اس زمانے میں رنگ کی استرکاری ہوگی جو امتداد زمانے اور موسمی اثرات سے کالی پڑ گئی۔ مسٹر اے۔ اے رابرٹس لکھتے ہیں کہ عموماً یہ کہا جاتا ہو کہ خان جہاں اور اس کے بیٹے (جونانشہ) نے حسب ذیل سات مسجدیں بنوائی ہیں۔

(۱) دہلی سے آٹھ میل بجانب جنوب موضع کھڑکی میں ایک بہت بڑی مسجد۔

(۲) موضع بیگم پور کی مسجد۔ جو موضع کھڑکی کے شمال جنوب میں کوئی دو میل کے فاصلے پر بنی ہوئی ہی۔ یہ مسجد قطب صاحب کو جاتے وقت سڑک سے کوئی پاؤ میل ہٹی ہوئی بائیں ہاتھ کی طرف دکھلائی دیتی ہی۔

(۳) بیگم پور کے متصل کالو سرائے میں ایک چھوٹی سی مسجد۔

(۴) حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے پاس ایک مسجد جس پر ۷۷۲ھ یعنی دلی کی کالی مسجد سے سترہ برس بعد کا کتبہ لگا ہوا ہی۔

(۵) فیروز شاہ کے کوٹلے میں ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد۔

(۶) لاہوری اور اجمیری دروازے کے بیچ میں فصیل شہر سے ملی ہوئی ایک مسجد

(۷) کالی مسجد یا کلاں مسجد جو ترکمان دروازے میں ہی۔ ان ساتوں مسجدوں میں سے صرف

تین مسجدیں بڑی اور اچھی حالت میں ہیں یعنی دلی کی کالی مسجد۔ اور کھڑکی اور بیگم پور کی مسجدیں کالی مسجد سے آگے دائیں جانب نقارچیوں کی گلی ہے۔ اس سے آگے دائیں طرف **حویلی مظفر خاں** کا صرف ایک پھاٹک باقی رہ گیا ہے جس سے معدوم شدہ حویلی کی رفعت و شان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خدا کی قدرت کہ وہ حویلی نیست و نابود ہو کر اب وہاں بہت سے مکانات بن گئے اور ایک محلہ آباد ہو گیا جس میں زیادہ تر تیلی اور کام پیشہ لوگ رہتے ہیں۔ اس سے آگے **نواب قطب الدین خاں** کی گلی ہے

رضیہ سلطانہ بیگم اور شجیعہ بیگم کی قبریں اور مسجد

۶۳۷-۶۳۴ھ
۱۲۳۹-۱۲۳۶ء

بہت لوگ ایسے تھے جن کا ہمیشہ یہ معتقد کفن تھا شنیدن تھا
جو قبر پہ گئے ان کی کمولی تو دیکھا نہ تار کفن تھا نہ عضو بدن تھا

رضیہ بیگم سلطان التمش کی نہایت لایق اور قابل بیٹی تھی جو بلحاظ اپنی خداداد قابلیت اور ذکاوت طبعی کے سلطنت کی اہم اور سترگ ذمہ داریوں کے سرانجام دہی کے لیئے اپنے بھائیوں سے کہیں زیادہ اہل اور موزوں تھی۔ چنانچہ اس کے باپ نے انہیں وجوہ سے اپنے جین حیات اسی کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا اور اسی کے مطابق یہ بیگم اپنے باپ کی وفات کے بعد ۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء میں زیب دہ سریر سلطنت ہوئی۔ امرا و ارکین سلطنت ایک عورت کی حکمرانی کے شروع سے مخالف تھے۔ وزرا نے سازشیں شروع کیں اور خوب ہی تمرباد نکالے بھٹنڈے کے حاکم **ملک التونیہ** سے جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ امرا نے مخالفت کی اور میدان جنگ میں ہی ملکہ کو قید کر لیا اور دلی میں جھٹ **معز الدین بہرام شاہ** کو تخت پر بٹھلا دیا۔ اس کے بعد رضیہ بیگم نے ملک التونیہ سے نکاح کر لیا اور دو دفعہ بہرام شاہ سے لڑی آخر کار ۲۵ ربیع الاول ۶۳۸ھ ۱۲۴۰ء کو ماری گئی۔ رضیہ بیگم مسلمانوں کی پہلی اور آخری ملکہ تھی۔ اسے تخت پر بیٹھے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ عام ناراضگی پھیل گئی امرا نے اس کے بھائی معز الدین بہرام شاہ کو اُبھارا اور بہن بھائیوں کو لڑوایا اور آخر بیچاری رضیہ کو قتل کروا کر ٹھنڈک پڑی۔ منہاج السراج میں لکھا ہے کہ رضیہ بیگم ۲۴ ربیع الاول ۶۳۸ھ ۱۲۴۰ء کو اپنے بھائی سے شکست کھا کر قصبہ کیتھل کو بھاگی۔ فوج نے ۱۳ اکتوبر ساتھ نہ دیا تن تنہا رہ گئی اور گاؤں والوں کے ہاتھ آ گئی انھوں نے مار ڈالا۔ ابن بطوطہ

جب سکے گا بونگی آپ یہ فرماتے ہیں کہ "کسی کسان نے مار کر اپنے کھیت میں گاڑ دیا اور جب وہ ملکہ کا لباس بیچنے بازار میں لایا تو پکڑا گیا۔ قاضی کے سامنے کشاں کشاں لایا گیا اس کو جرم سے اقبال تھا۔ نعش جہاں گاڑی تھی اس مقام کی نشان دہی بھی کر دی۔ نعش وہاں سے برآمد کی گئی اور نہلا دھلا کر وہیں جلا بھی دی گئی اور قبر پر ایک چھوٹا سا مندر بنا دیا گیا جسے لوگ ایک متبرک مقام خیال کر کے زیارت کے واسطے جایا کرتے ہیں۔ یہ مقام دہلی سے ایک فرسنگ (۵ ½ میل) جمنا کے کنارے ہے" سبحان اللہ کیا بے تکی اڑائی ہے جس کا سر نہ پیر۔ مارد ں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ ابن بطوطہ جن مقامات کو اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا محض سنی سنائی باتوں پر جو جی میں آتا ہے لکھ مارتا ہے اور ایسے ہی بادہوائی تکے چلایا کرتا ہے۔ ابن بطوطہ کا یہ بیان سراسر ہفوات ہے۔ کسی بادشاہِ وقت کا اس کس مپرسی میں مارا جانا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ پھر مسلمان کی نعش کو جلانا اور جمنا کے کنارے مندر بنانا چہ معنی؟ کسی معمولی سے معمولی مسلمان کے ساتھ بھی ایسا برا سلوک نہیں کیا جا سکتا چہ جائیکہ بادشاہِ وقت اور وہ بھی سلطان التمش جیسے زبردست بادشاہ کی بیٹی۔ ؎

غیروں کو نہ ملا پاس میری قبر کے ظالم
مُردے کو مسلماں کے جلایا نہیں کرتے

مسٹر بگلر کو بھی رضیہ بیگم کی قبر کے مقام کی نسبت شک ہے کیوں کہ ابن بطوطہ نے یہ بھی نہیں بتلایا کہ آخر مندر کس نے بنوایا۔ بہرحال سرسید نے ٹھیک لکھا ہے اور دل لگتی بات بھی یہی ہے کہ رضیہ بیگم کی قبر اس کے بھائی معزالدین بہرام شاہ نے اسی سال جب کہ وہ قتل کی گئی بنوا دی۔ چنانچہ یہ قبر اب تک شہر دہلی ترکمان دروازے کے پاس بلبلی خانے کے محلے میں رجی سجی کی درگاہ کے نام سے عوام میں مشہور ہے۔ اور ہر کہ اور مہ کو معلوم ہے کہ یہ کس کی قبر ہے۔ بھلا شہر سے دور جمنا کے کنارے سے رضیہ بیگم کی قبر کو کیا تعلق ہے؟ - یہ قبر سنگ سرخ کے ۵۴ فٹ مربع احاطے کے اندر ہے۔ قبر کے گرد ۸ فٹ ۲ انچ اونچا جنگلا لگا ہوا ہے۔ دروازہ سنگِ سرخ کا ۶ فٹ - ۴ انچ اونچا موجود ہے۔ اس احاطے کی مغربی دیوار سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کی محراب ۶ فٹ بلند ۴ فٹ - ۸ انچ چوڑی ہے اور ۳ فٹ - ۳ انچ گہری ہے۔ احاطے کے شمال میں ایک سنگِ سرخ کے چبوترے پر برابر برابر دو زنانی قبریں چونے گچی کی پختہ بنی ہوئی ہیں۔ ایک قبر کے سرہانے

پختہ طاق تو بڑھ فیٹ اونچا چراغ روشن کرنے کا ہے اور اسی قبر کو لوگ رضیہ بیگم کی قبر کہتے ہیں۔ دوسری قبر اس کی بہن شجیعہ بیگم کی کہی جاتی ہے جس کا نام کہیں تاریخ میں نہیں ہے۔ یہ قبریں ۳ - ۵ بلند چبوترے پر آٹھ آٹھ فیٹ لمبی ہیں۔ اسی احاطے کے جنوب ومشرقی کونے میں اور دو قبریں بھی ہیں لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ کس کی ہیں۔

امیر خاں کا بازار (چتلی قبر سے تراہہ بیرم خاں تک)

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ چتلی قبر سے سڑک کی دو شاخیں ہوگئی ہیں ایک شاخ جو ترکمان دروازے کی طرف جاتی ہے اس کا حال تو ہم لکھ چکے اب دلی دروازے کی طرف کی شاخ کا حال ملاحظہ ہو۔ چتلی قبر سے آگے بڑھ کر دلی دروازے تک امیر خاں کا بازار کہلاتا ہے۔ نواب امیر خاں عمدۃ الملک محمد شاہ کے دربار میں بڑا مرتبہ اور رسوخ رکھتے تھے اور قمر الدین خاں وزیر اعظم اور نواب آصف جاہ بہادر کے ٹکر کے امیر تھے۔ ان دونوں کی پاس خاطر سے امیر خاں کو الہ آباد کی صوبہ داری پر بھیج دیا گیا۔ لیکن امیر خاں یہاں بھی کب خاموش بیٹھنے والے تھے ان کی بے چین طبیعت اور جاہ ومنزلت کی بلند پروازی نے ان کو چین نہ لینے دیا انھوں نے صفدر جنگ کو گانٹھ لیا اور ان کے ذریعے اپنے حریفوں کی چالبازیوں کی توڑ جوڑ کرتے رہے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور اپنے ہی ایک نمک حرام ملازم کے ہاتھ سے ۲۳ ذی حجہ سنہ ۱۱۵۹ھ [۶ جنوری سنہ ۱۷۴۷ء] کو شہید ہوگئے اور سارے منصوبے اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔

حویلی نواب بڈھن صاحب

نواب غلام نصیر الدین احمد خاں صاحب عرف بڈھن صاحب خلف نواب حمزہ علی خاں صاحب آپ رؤسائے شیخو پورہ برناوا ضلع میرٹھ میں سے ہیں۔ آپ کے بزرگ مناصب جلیلہ پر دکن میں رہے ہیں۔ نواب صاحب موصوف نہایت متقی پرہیزگار دین دار فقیر دوست رؤسا وشرفائے شہر میں سے ہیں۔ مکان کا بڑا پھاٹک ہے اوپر ایک بہت وسیع کمرہ اور اندر محل سرا ہے۔

کلو خواص کی حویلی

چتلی قبر سے کوئی ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے سے دائیں ہاتھ کی طرف تراہے جاتے ہوئے امیر خاں کے بازار میں یہ حویلی ہے۔ پہلے بہت بڑی حویلی تھی اب ٹوٹ ٹاٹ گئی کچھ دیواریں رہ گئی ہیں۔ جن سے اندازہ اس حویلی کی شان و شوکت کا کیا جا سکتا ہے۔ اب اس جگہ متفرق مکانات بن گئے ہیں۔ اسی کوچے کے سامنے **گلی موچیاں** ہے جس کا رستہ **اعظم خاں کی حویلی** کو نکل جاتا ہے۔ موچیوں کی گلی سے آگے بڑھ کر **کمہاروں کی گلی** ہے اور اس سے اگلی گلی **مرلی بانس والے** کی ہے۔

مدرسہ مولانا شاہ محمد اسحق صاحب

جس وقت شاہ عبد العزیز صاحب کی دختر نیک اختر یعنی مولنا شاہ **اسحق** صاحب کی والدہ کا انتقال ہوا۔ حضرت کو خیال ہوا بھتیجوں کے سامنے نواسے وارث نہ ہوں گے اس لیئے مولنا شاہ اسحق اور مولانا محمد یعقوب صاحبوں نے بھائیوں کے لیئے قطعۂ زمین علیحدہ خرید کرکے اُس میں عمدہ پختہ مکانات بنادیئے اور اُنھیں کے نام کر دیئے چنانچہ مولنا صاحب چند سال ان مکانوں میں رہے اُس کے بعد یک بیک خانۂ کعبہ کا شوق پیدا ہوا حج بیت اللہ کا ارادہ کیا تمام مکان اور اثاثہ بیع کر ۱۲۵۶ھ میں مع اہل و عیال کے ہجرت فرما گئے۔ اب اس مدرسے میں چھوٹے چھوٹے مکانات بن گئے ہیں۔ جہاں کسان وغیرہ غریب لوگ رہتے ہیں۔ یہیں ایک چھوٹی سی مسجد آپ ہی کے نام سے مشہور ہے جس میں آپ نماز پڑھا کرتے تھے۔ اب چونکہ یہ کل جائداد رای بہادر **لالہ شیو پرشاد** صاحب کی ہے اس لیئے اس **گلی پر مدرسہ رای بہادر لالہ رام کشن داس** کا تختہ لگا دیا گیا ہے۔

سوئی والوں کا محلہ

اس محلے میں دو مسجدیں ہیں (۱) جس کے متولی مولوی عبد الغنی ہیں شمال جنوب ۲۳ فٹ اور مشرق سے مغرب ۱۲ فٹ ۹ انچ۔ (۲) کے متولی حاجی بلاقی ہیں۔ یہ مسجد شمالاً جنوباً ۲۷ فٹ اور مشرق سے مغرب ۱۶ فیٹ ہے۔ گویہ دونوں مسجدیں سلاطین مغلیہ کے زمانے کی ہیں مگر ان میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کا ذکر کیا جائے۔

محلہ سوئی والوں کا حوض

اس محلے میں سب سے بڑی چیز نواب اعظم خاں خلف نواب امیر خاں عمدۃ الملک کی بارہ دری تھی اب دونوں تمارحوض ٹوٹ ٹاٹ گیا اور اس جگہ چھوٹے چھوٹے مکانات بن گئے ہیں۔ نواب امیر خاں کے دور دورے کا حال آپ سن چکے ہیں اُن کے بیٹے اعظم خاں کا کیا حشر ہوا تاریخ اور روایات دونوں اس سے ساکت ہیں۔ اس محلے میں حوض والی ایک مسجد ہے جس کے متولی امداد حسین ہیں۔ یہ مسجد شمالاً جنوباً ۲۳ فٹ اور شرقاً غرباً ۴۲ فٹ ہے۔ یہ مسجد بھی نواب اعظم خاں کی بنائی ہوئی ہے۔ اس مسجد کے شمال میں جس کے سرہانے طاق ہے مشرق والی قبر سید داؤد صاحب کی ہے جو شاہ ترکمان بیابانی کے خلیفہ تھے۔ اور دوسری قبر کے تعویذ اور طاق پر سفیدی کی تہ پر تہ چڑھ گئی ہے معلوم نہیں ہو سکتا کہ اصلی حالت قبر کی کیا تھی۔

بنگش کا کمرہ

یہ عالی شان مکان فیض اللہ خاں بنگش نے صرف زر خطیر بنوایا تھا جو جامع مسجد کے شمالی دروازے کے سامنے اس سڑک پر واقع ہے جو ٹیا محل چتلی قبر۔ ترا ہا بیرم خاں ہوتی ہوئی دلی دروازے کو نکل گئی ہے۔ بنگش دراصل ایک پہاڑ کا نام ہے جو صوبہ سرحدی شمال و مغرب میں کوہاٹ کے پاس ہے۔ اُس نواح سے جو لوگ دلی میں آئے اُنھوں نے بنگش کے نام سے شہرت پائی۔ سب سے پہلے بنگش ہندوستان میں شاہ عالم اول کے زمانے میں آئے ان لوگوں کا عروج محمد شاہ کے عہد میں ہوا۔ نواب محمد خاں غضنفر جنگ بنگش فرخ آباد آگرہ۔ اور الہ آباد۔ کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور یہ وہی علاقہ ہے جس پر آگے چل کر انھیں کے صاحبزادے نواب احمد خاں غالب جنگ خود مختارانہ حکومت کرنے لگے۔ فیض اللہ خاں نیک نام خاں کے بیٹے تھے جو محمد خاں کی سرکار میں سب سے بڑے پایہ کے آدمی تھے آپ میر عمارت تھے۔ رابعہ بیگم محل خاص محمد خاں کو عمارات کا بہت شوق تھا اس سبب سے فیض اللہ خاں مورد عنایت ہو گئے۔ چنانچہ انھیں کے اہتمام اور نگرانی میں بیگم صاحب نے کئی ایک سرائیں۔ مسجدیں۔ پُل اور محلات وغیرہ بنوائے جن میں سے اب بھی بعض موجود ہیں۔ محمد خاں کی وفات کے بعد بیگم صاحب ہی مالک و مختار رہیں اور کل کاروبار فیض اللہ خاں کے سپرد رہا اور فیض اللہ خاں ہی دربار

شاہی میں بیگم صاحب کی طرف سے وکیل ستھے۔ اسی سڑک پر آگے بڑھ کر تراہا اور مرزا خجستہ بخت کی حویلی ہے دروازے میں سے دائیں طرف امیر خاں کے گنج کو رستہ جاتا ہے اور بائیں طرف چیلوں کے کوچے اور کلاں محل کو۔

رنگ محل

زمانِ مغلیہ کا۔ رنگ محل اور اس کے قرب وجوار کی عمارتوں کی نوعیت اور شکل اب بالکل بدل گئی ہے۔ رنگ محل اور اس کے ساتھ کی اور عمارتیں بیرم خاں خانِ خاناں ہمایوں کا برادرِ نسبتی اور اکبر کے ریجنٹ خاندان کے کسی ممبر کی بنوائی ہوئی تھیں۔ اب رنگ محل کا بہت ہی تھوڑا حصہ رہ گیا ہے۔ یہیں **گنج میر خاں** ہے جو ایک بازار ہے اس میں **محلہ رکاب** اور **حویلی میر خاں** کا محلہ ہے۔

مرزا الٰہی بخش کا رنگ محل

تراہے میں یہ بھی ایک محل دورِ آخر مغلیہ کا بنایا ہوا ہے۔ جو اب نواب ملکہ جہاں بیگم اور نواب بادشاہ جہاں بیگم دختر مرزا ثریا جاہ مرحوم اور مرزا الٰہی بخش کے پوتیوں کے قبضے میں ہے۔ یہ محل مرزا جمشید بخت کا بنوایا ہوا ہے جن کو لوگ **مرزا کوڑا** کہتے ستھے۔ بعد میں مرزا الٰہی بخش نے خرید لیا جو وراثتہً شاہزادے ثریا جاہ مرزا کیوان شاہ بہادر گورگانی کو پونہچا۔ مرزا صاحب موصوف مرزا الٰہی بخش صاحب سمدھی بہادر شاہ بادشاہ کے صاحب زادے ستھے۔ گورمنٹ سے آٹھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ پاتے ستھے اور خاندان تیموریہ کے **چیف** ستھے۔ حکام داہل شہر آپ کا بڑا اعزاز کرتے ستھے افسوس کہ وہ بھی نہ رہے اب صرف اُن کی صاحب زادیاں رہ گئی ہیں جو تباہ شدہ مغلیہ سلطنت کی یادگار ہیں۔ یہ مکان کسی زمانے میں عجیب و غریب ہوگا اب بھی اندر کا دالان بہت آراستہ ہے۔ اب اس میں دلی **تحصیل کی کچہری** ہے۔

چاندنی محل

یہ بھی مرزا ثریا جاہ کا ہے اور دورِ آخری مغلیہ میں محمد شاہ کے وقت میں بنایا تھا اور شاہزادہ سلیم شاہ پسر اکبر شاہ ثانی کے قبضے میں تھا۔ پھر مرزا گوہر شاہزادے نے اپنی بہن حسینی بیگم سے جو شاہزادہ سلیم شاہ کی بیوی تھیں سے لیا اور آخر کار مرزا ثریا جاہ کے قبضے میں آگیا اُن کی وفات کے بعد اُن کی دونوں صاحب زادیاں مالک ہیں۔

واقع میں کسی زمانے میں عجیب غریب مکان تھا۔ حوض فوارہ باغیچہ سب کچھ موجود تھا گو اب اس کی حالت خراب ہے مگر پھر بھی شاہی محل ہے اب بھی جو بات ہے وہ جواب ہے۔ مرا ہاتھی بھی سوا سن کا ہوتا ہے۔

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

شاہزادہ مرزا بلاقی کا مکان

یہیں شہزادہ امیر الملک مرزا بلاقی گورگانی کا مکان ہے جو نہایت بزرگ اور پاک طینت مرنج و مرجاں شخص ہیں شاہزادے بھی ہیں اور باطن میں فقیر بھی ہیں سرکار عالی نظام سے وظیفہ پاتے ہیں۔ نہ کہیں آتے نہ جاتے ع ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را۔ ان کی آنکھیں دورِ آخر مغلیہ دیکھ چکی ہیں اب یہ زمانہ بھی دیکھ رہے ہیں۔ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن کے اصلی مصداق ہیں۔ ع جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔

رباعی

طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے
ہستی کو حبابِ آب دیکھا ہم نے
جب آنکھ ہوئی بند تو عقدہ یہ کھلا
جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

شیش محل

دورِ آخری مغلیہ کا بنایا ہوا۔ خراب و خستہ حالت میں ہے۔ یہ بھی محمد شاہ کے زمانے کا بنایا ہوا ہے اور اُس زمانے میں مرزا خورشید ابہاتی کے قبضے میں تھا۔ بعد اس کا نیلام ہوا اللہ مرزا ثریا جاہ نے خرید لیا۔ اب اس محل کی صرف جنوبی دیوار باقی رہ گئی ہے اور حصّہ ندارد ہے۔

کوچۂ فولاد خاں

کمرہ بنگش سے دائیں طرف فولاد خاں کا کوچہ ہے جو حبش خاں کوتوال دہلی کی اولاد سے تھے۔

کوچہ چیلاں

کوچۂ فولاد خاں میں داخل ہونے کے بعد کوئی پچاس قدم چل کر دائیں ہاتھ کو کوچۂ چیلاں ہے۔ اصل میں اس کا نام چہل کوچہ تھا کیونکہ اس میں متعدد کوچے تھے عوام میں چیلوں کا کوچہ مشہور ہو گیا گلی اولیا۔ گلی انبیا اب بھی موجود ہیں۔ یہیں خان بہادر شمس العلماء منشی محمد ذکاء اللہ خاں صاحب فلو آف دی الہ آباد یونیورسٹی کا مکان ہے۔ آپ حافظ ثناء اللہ صاحب کے صاحبزادے تھے جو نہایت دیندار پابند صوم صلوۃ تھے اور پنج وقتہ نماز جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ منشی ذکاء اللہ۔ مولوی نذیر احمد۔ مولوی ضیاء الدین خاں تینوں ہم جماعت تھے اور خدا کی عجیب قدرت ہے کہ یہ تینوں صاحب اپنی علمی لیاقت کی وجہ سے مشہور زمانہ ہوئے۔ جن کے حالات اپنی اپنی جگہ بیان ہوں گے یہاں منشی صاحب کا ذکر خیر وہ بھی مختصر کیا جاتا ہے۔ فن تاریخ اور ریاضی میں علی الخصوص مسلمانوں میں آپ کا جواب نہ تھا۔ آپ کی تصانیف ایک نہیں دو نہیں سینکڑوں ہیں۔ جتنی ضخیم کتابیں آپ نے تصنیف کیں اور ترجمہ کیں کسی اور نے نہیں کیں۔ مزاج میں بالکل سادگی تھی اور انکسار اس درجے تھا کہ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ پرانی وضع کے پابند تھے۔ شام کو ٹہلنے ضرور نکلتے تھے۔ بالکل عالمانہ اور فلسفیانہ طرز تھا۔ تعصب پاس نہ پھٹکا تھا۔ چھوٹے بڑے ہر کس و ناکس سے کشادہ پیشانی ملتے تھے اب۔ ان تینوں صاحبوں میں سے کوئی بھی نہ رہا۔ منشی صاحب نے ۷ رنومبر ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ گو شمس العلماء تھے مگر کہلاتے ہمیشہ **منشی** اور یہ لفظ تھا بھی بہت موزوں اتنا بڑا منشی یعنی لکھاڑ کوئی دیکھنے میں نہیں آیا۔ خدا جانے قلم تھا یا مشین دماغ تھا یہ معلومات کا ایک نامحدود و غیر متناہی ذخیرہ۔ ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں اور شاید ہوتے ہوں تو ہوتے ہوں مگر فی زمانا مسلمانوں میں تو نہیں ہوتے اور سارا ہندوستان چھان مارو ایک بھی ان جیسا نہ ملے گا۔ منشی صاحب کے مکان کے آگے **کوچۂ ناہر خاں** ہے۔ اسی کے پاس نواب خواجہ قاسم علی خاں عرف نواب **شرف الدین خاں** صاحب کی حویلی کا پھاٹک ہے آپ نہایت لائق اور باوضع دلی کے مشہور رؤسا میں سے تھے۔ آپ کے آبا و اجداد

کشمیر سے تاجرانہ دہلی آ بسے تھے۔ اور دلی میں کشمیری مال اور ریشم کی تجارت کرتے تھے اور دلی ہی میں رہ پڑے۔ ۷ شوال ۱۳۲۲ھ کو آپ نے انتقال کیا۔ بیرون ترکمان دروازہ متصل بوچڑ خانہ چونسٹھ کھمبے میں مدفون ہوئے۔ اس سے آگے دائیں طرف پھول کی منڈی سے رستہ نکل جاتا ہے اور بائیں طرف کالے خاں کی مسجد ہوتا ہوا فیض بازار میں جا ملتا ہے۔

حویلی نواب مصطفیٰ خاں

نواب مصطفیٰ خاں کی ایک حویلی تو چاہ رہٹ کے چھتے میں تھی وہ تو رہی نہیں۔ مگر چیلوں کے کوچے میں ایک بڑی بھاری حویلی نواب مصطفیٰ خاں کے نام سے مشہور ہے اس حویلی سے لگی ہوئی علی جان والوں کی ایک عالی شان عمارت ہے جس میں سے پہلے کوہ نور اور اور ہمدرد اخبار نکلتے تھے اور اب عربک سکول کی شاخ ہے۔ اس کے آگے کالے خاں کی مسجد۔ تمدن پریس۔ دفتر رسالہ خطیب و نظام المشائخ ہے۔

گلی راجاں

چیلوں کے کوچے میں ایک محلہ ہے اسی میں خواجہ میر درد کی بارہ دری تھی۔ اب بارہ دری تو رہی نہیں۔ خواجہ صاحب کی اولاد میں سید ناصر سعید صاحب نے احاطہ کھینچ کر ایک مکان کی شکل کر لی اور ایک مسجد خواجہ میر درد کی بنائی ہوئی تھی جو اب بھی ہے مگر از سر نو تعمیر پانے سے اس کی شکل و صورت باقی نہیں رہی۔

چھتہ حکیم آغا جان

یہ چھتہ حکیم آغا جان کے نام سے مشہور ہے۔ امر کا ایک سلاوی دروازہ تھا جس کو مخدوش حالت میں ہونے سے میونسپلٹی نے ۱۳۰۰ھ میں گروا دیا۔ اس کا بھی بڑا عبرت خیز واقعہ ہے۔ چھت اس قدر مضبوط تھی کہ ٹوٹتی نہ تھی اور کدالوں کے منہ پھرے جاتے تھے۔ ہمارے ایک عزیز عبدالعزیز نامی اُدھر سے گزرے کوئی دن کے دس بجے ہوں گے ان کی جو شامت آئی کھینچی ہیں آکر مزدوروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "ارے میاں کیا تماشہ بنا رکھا ہے لاؤ مجھے کدال دو میں آغا جان کا سر توڑ دوں" کدال لے اوپر چڑھ گئے ایک دو ہی کدالیں لگائی ہوں گی کہ چھتے کا ایک حصہ دھڑام سے آن پڑا عبدالعزیز صاحب کا نیچے کا دھڑ اس میں ایسا بے طور پھنسا کہ کسی سے بن نہ پڑا کہ انہیں نکال سکے۔ بلیاں کڑیاں سامان لانے

میں دیر ہوئی کئی گھنٹے وہ معلق رہے بہ ہزار مشکل اُن کو نکالا۔ صدر ڈاکٹر خانے میں لے گئے۔ دونوں ٹانگیں چورا ہوگئیں تھیں شام نہ ہونے پائی کہ دم نکل گیا۔ گئے تھے حکیم آغا جان کا سر توڑنے اور خود دام اجل میں گرفتار ہوگئے بزرگان دین کی بارگاہ میں سوء ادبی کا خوب مزہ چکھا۔ پہلے اس چھتے میں حکیم صاحب کے اعزہ اقربا رہتے تھے اب نہ وہ چھتہ رہا نہ وہ مکین۔ ایک محلے کی حیثیت ہوگئی ہے اور مختلف پیشہ ور لوگوں کے یہ چھوٹے چھوٹے گھر بن گئے ہیں۔

کلاں محل

شاہجہانی عمارت ہے قلعۂ معلیٰ کے بننے سے پہلے بادشاہ اس میں ہی مقیم تھے۔ کسی زمانے میں بہت بڑا محل تھا۔ موجودہ محل اس کے آٹھویں حصے سے بھی کم ہے۔ غدر کے بعد لالہ چھنا مل صاحب نے کوڑیوں کے مول لیا۔ پہلے نارمل کرل تھا۔ پھر ماڈل سکول رہا۔ اب عیسائی لوگ رہتے ہیں۔

املی محل

یہیں اس نام کی ایک پرانی مگر عالی شان عمارت املی محل کی ہے۔ یہ مکان بہت مخدوش حالت میں تھا حال میں سلطان سنگھ صاحب رئیس دہلی نے خرید لیا ہے اور اب نئے طرز پر بنوا رہے ہیں۔ اس کے آگے ایک گلی ہے جس کا نام کٹڑہ مہر پرور ہے اور آگے بڑھو تو کوچۂ دکھنی رائے اور اسی سے ملا ہوا محلہ نقار خانہ ہے۔

مدرسہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب

یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالی شان اور خوب صورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ بادشاہ دوروہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب جیسا نامور عالم و فاضل اس کا مہتمم محمد شاہ بادشاہ نے جناب شاہ ولی اللہ صاحب محدث کو پرانی دلی سے جہاں اب ان بزرگواروں کے مزار ہیں شاہ جہاں آباد یعنی موجودہ دہلی میں بلا کر ایک بڑا عالی شان مکان دیا تھا۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد اُن کے چاروں صاحبزادوں نے وہی مشغلہ جاری رکھا اور اس مدرسے نے تعلیم دینیات میں وہ نام پایا کہ ہندوستان میں شہرہ ہوگیا۔ جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں سے کوئی نہ رہا تو مولنا شاہ محمد اسحٰق صاحب نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمے لی۔ ۱۲۵۶ھ میں آپ نے ہجرت کی تو مولنا مخصوص اللہ صاحب اور مولنا محمد موسیٰ صاحب خلف حضرت مولنا شاہ رفیع الدین صاحب اس کی نگرانی فرمانے لگے۔ ان حضرات نے بھی ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا تو صرف مولوی محمد موسیٰ صاحب کے ایک صاحبزادے میاں عبدالسلام صاحب بہت صغر سن رہے اور ایک صاحبزادی کی

رہ گئیں - خاندان بھر میں کوئی ایسا نہ رہا جو عبدالسلام صاحب کو پڑہا لکھا تھا - غرض یہ سلسلہ جو کئی پشت سے اس خاندان میں جاری تھا بند ہوگیا - غدر میں مکانات لوٹ لیئے گئے - گرا دیئے گئے کڑی تختہ تک لوگ اُٹھا لے گئے - خانۂ خالی را دیو می گیرد - ایک شریف گردی تھی کہ الہی توبہ جس کی لاٹھی اُسکی بھینس جس کا جس پہ قابو چلا قابض ہوگیا اب متفرق لوگوں کے مکان اس جگہ بن گئے ہیں مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب مدرسے کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے - اس خاندان میں سوا ایک آدھ خاتون عصمت کے اور کوئی نام لیوا اور پانی کا دیا نہ رہا - ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جب تک لوگ قدر دان علم تھے اللہ ویسے ہی لوگوں کو پیدا بھی کرتا تھا اب جب کہ علم و دین کی قدر ہی نہ رہی تو پھر ایسے لوگوں کے پیدا ہونے یا باقی رہنے کی بھی ضرورت نہ رہی -

کھڑکی تفضل حسین خاں

یہاں کھڑکی تفضل حسین کی تھی جس کا رستہ محلی والوں میں جا نکلتا ہے - اب کھڑکی تو باقی نہیں - یہ گلی اس نام سے پکاری جاتی ہے اور یہیں ایک چھوٹی سی گلی گوندنی والی مشہور ہے -

یتیم خانہ انجمن موید الاسلام

انجمن مؤید الاسلام اس کی کفالت کرتی ہے - یہ انجمن ۱۳۱۰ھ سے قائم ہوئی اس کے اصل بانی جناب منشی محمد کرم اللہ خانصاحب رئیس دہلی تھے - اس انجمن کے اغراض مسلمانوں کے لاوارث بچوں کو پرورش کرنا اور اُن کو دینی و دنیاوی و اخلاقی تعلیم دینا - لاوارث محتاج میت کی تجہیز و تکفین - ویران مسجدوں کو آبادی میں حتی الامکان سعی کرنا ہیں اس یتیم خانے میں لڑکے اور لڑکیاں پرورش پاتی ہیں اور جناب خان بہادر مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی اس کے انتظام میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں -

روح اللہ خاں اور بقاء اللہ خاں کے کوچے

حویلی مرزا خجستہ بخت کے سامنے روح اللہ خاں اور حویلی کے برابر ہی بقاء اللہ خاں کا کوچہ ہے - یعنی دونوں کوچے آمنے سامنے ہیں - ان میں شہر کے لوگ آباد ہیں -

حویلی مرزا خجستہ بخت بہادر

یہ شاہ عالم ثانی کے بیٹے اور عرش آرامگاہ محمد اکبر شاہ ثانی کے بھائی خجستہ بخت بہادر کی حویلی ہے جس کی

تاریخ بہت خوب ہے۔ "مکان خجستہ بنیاد"۔

محلہ مفتیان مفتی اکرام الدین خاں صاحب مرحوم صدر امین کے نام سے مشہور ہے انہیں کی اولاد اس میں بستی ہے جس میں یادہ تر ناہی مولوی احسان الحق اور ان کے خلف اکبر خان بہادر مولوی محمد انوار الحق صاحبان تھے۔ ان صاحبوں کا تذکرہ شیخ عبدالحق صاحب کے ضمن میں گیا ہے مولوی انوار الحق صاحب مدتوں ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کے میر منشی رہے اور بہت نیک نامی عزت و احترام سے اس ذمہ داری کی خدمت کو انجام دیا۔ ذی علم۔ نہایت مقدس و محترم منکسر المزاج اور فقیر دوست بزرگ تھے بہت دنوں وکالت ریاست بھرت پور پہ بھی رہے بعد خود خانہ نشین ہوئے۔ مولوی انوار الحق صاحب نے ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۲۰ھ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۲ء یوم پنجشنبہ بوقت سہ پہر کو انتقال فرمایا اور ۲۵ رمضان المبارک جمعۃ الوداع کے مبارک دن جامع مسجد میں نماز جنازہ ہوئی جس میں ہزارہا مخلوق شریک تھی۔ خوشا نصیب کہ ایسا دن پایا۔ آپ اپنے جد امجد شیخ عبدالحق صاحب محدث کے مقبرے میں دفن ہوئے یہ چار بھائی تھے سب چل بسے اب ان کی اولاد ہے جن میں کئی صاحب سربرآوردہ معدودی ہیں۔ ۲۲ ربیع الاول کو اب تک حضرت شیخ کا عرس شریف کیا جاتا ہے۔ یہیں دائی کی مسجد ہے جس کا ذکر مسجدوں کے ضمن میں آیا ہے۔ دائی کی مسجد سے کوچہ تارا چند۔ چھتہ لال میاں۔ محلہ چوہان۔ کٹڑہ بدہان راؤ۔ کوچہ جلال بخاری۔ محلہ دھوبیان۔ کٹڑہ شہاب رائے۔ گلی مالیان۔ گلی گتا مصر۔ اور تراہے سے پھول کی منڈی جانے والے رستے میں فیض بازار تک محلہ وساں۔ کوچہ نیل کنٹھ۔ راستہ کوچہ تارا چند جھواڑہ اولیا مسجد۔ پھول کی منڈی۔ ملتے ہیں۔ اسی پھول کی منڈی میں سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم کا مکان ہے۔ جن کا ذکر مہندیوں کے ضمن میں آیا ہے۔

تراہہ بیرم خاں یہاں تین رستے ملتے ہیں اور اسی سبب تراہہ کہلاتا ہے۔ ایک رستہ تو یہی سڑک ہے جو جامع مسجد سے سیدھی دلی دروازے کو چلی گئی ہے۔ ایک رستہ بائیں طرف فیض بازار کو چلا گیا ہے۔ یہ مقام بیرم خاں خانخاناں کے نام سے مشہور ہے جو ہمایوں بادشاہ کا برادر نسبتی اور اکبر بادشاہ کا ریجنٹ تھا۔

دائی والی مسجد
۱۰۶۴ھ
۱۶۵۳-۵۴ء

یہ تین در اور ایک گنبد کی چھوٹی سی مسجد ہے جو ۳۴ × ۲۶ فٹ ہے۔ تاریخی واقعات سے غیر متعلق ہے۔ درمیانی محراب پر یہ کتبہ بہت خوش خط لگا ہوا ہے۔

وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ

شکر اللہ کہ گشت ایں مسجد	از شرف سجدہ گاہ اہل نظر
سال تاریخ او خرد وگفت	گشتہ آباد کعبۂ دیگر

اسی سڑک پر جو دلی دروازے کو جاتی ہے یہ مقامات ہیں کوچہ تارا چند۔ لال میاں کا چھتہ۔ کوچہ جلال بخاری۔ گلی گنا مصر۔

پھول کی منڈی
تراہہ بیرم خاں سے پھول کی منڈی

تراہہ بیرم خاں کے سامنے جو گلی جاتی ہے جہاں پیپل کا ایک بڑا پرانا درخت ہے وہ پھول کی منڈی کہلاتی ہے۔ پہلے یہاں گل فروشوں کی منڈی تھی۔ اور گل فروشوں کی دکانیں کثرت سے تھیں۔ جس سے دماغ عالم کا معطر ہوتا تھا۔ اگرچہ اب یہاں پھلارے نہیں بیٹھتے مگر نام چلا جاتا ہے۔ اسی میں کوچہ سعد اللہ خاں۔ کوچہ نیلکنٹھ اور اسی کے اندر ایک چھوٹی سی گلی تانت والی کہلاتی ہے۔

اولیار مسجد
۱۲۶۱ھ
۱۸۴۵ء

پھول کی منڈی میں اولیار مسجد ہے جو شمالاً جنوباً ۲۸ اور شرقاً غرباً تیرہ فیٹ ہے۔ باقی کوئی خاص بات نہیں ہے۔

سر سید احمد خاں مرحوم ومغفور کا مکان

مرے پر اپنے اور بیگانے سر سید کو روتے ہیں۔ خدا کے نیک اور مقبول بندے ایسے ہوتے ہیں انیسویں صدی کے مشہور مسلمان ہند میں سر سالار جنگ اعظم بسمارک آف انڈیا کے بعد ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر جواد الدولہ عارف جنگ کے۔ سی۔ اس۔ آئی وغیرہ تھے۔ آپ کو کون نہیں جانتا آپ کی لیاقت اور وجاہت کا کوئی مسلمان ہمارے دیکھتے نہیں ہوا۔ مسلمانوں کے فدائی تھے۔ قوم کی بہتری کے لیئے تن من دھن سب وقف کردیا تھا۔ وفادار سرکار کے ساتھ ہی محب ملک وقوم اور صاحب تصانیف بھی تھے۔

شبیہ سر سید احمد خاں بالقابہ (مرحوم)

اولیا مسجد کے پاس اُن کا دولت خانہ ہے جو اب اُن کے پوتے سید راس مسعود صاحب کے
قبضے میں ہے۔ آپ کے مفصل حالات جو صاحب دیکھنا چاہیں وہ مولوی الطاف حسین حالی کی کتاب
حیات جاوید دیکھیں آپ کی ولادت ۱۸۱۷ء کی ہے اور تاریخ وفات "غفر لہٗ" (۱۳۱۵ھ ۱۸۹۸ء) ہے اور آپ علی گڈھ
کالج کی مسجد میں مدفون ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد ملک عرب سے ہرات میں آئے اور بزمان سلطنت
اکبر ہندوستان میں آکر مورد مراحم و الطاف خسروانہ ہوئے۔ عالمگیر ثانی کے زمانے میں
سرسید کے دادا کو جواد الدولہ کا خطاب ہزاری پیدل اور پانسو سوار کا ملا۔ آپ کے والد ماجد سید
محمد متقی خاں بہادر کو بھی یہی منصب شاہ عالم ثانی کے عہد میں برقرار رہا اور پھر سید علیہ الرحمہ پر
یہ خطاب اور منصب اترا۔ جب کہ اُن کا سن شریف انیس سال کا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے اختتام کے
بعد ۱۸۳۷ء میں آپ سب سے پہلے دہلی کے صدر امین کے سررشتہ دار ہوئے اور درجہ بدرجہ
ترقی پاکر ۱۸۵۵ء میں بجنور کے سب جج مقرر ہوئے۔ انہی ایام میں غدر ہو گیا اور سید نے
پوری وفاداری گورنمنٹ کی کی اور جتنے انگریز اور میمیں بجنور میں تھیں اپنی جان پر کھیل کر اُن کی
جانیں بچائیں۔ ایک باغی نواب جس کا نام محمد خاں تھا آٹھ سو آدمیوں کی جمعیت لے کر بجنور پر
چڑھ آیا۔ یہ غلام قادر روہیلے کا رشتہ دار تھا جس نے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکلوا ڈالی
تھیں۔ سرسید اپنی جان ہتھیلی پر لے کر اس باغی کے پاس نہتے جا پہنچے اور اپنی
شیریں زبانی سے اسے شیشے میں اتار لیا اور اجازت دلوا دی کہ انگریز میرٹھ چلے جائیں۔
باغیوں نے یہ دیکھ کر کہ سرسید انگریزوں کا دم بھرتے ہیں۔ کئی بار اُن پر حملہ کیا مگر زندگی
تھی بچ گئے۔ دہلی میں اُن کا مکان اور اسباب لوٹ لیا اور رشتہ داروں کو قتل کر ڈالا
بڑی جوکھوں سے سید کی جان بچی۔ آخر غدر کا منہ کالا ہوا۔ گورنمنٹ نے سرسید کو
خلعت کے علاوہ دو سو روپیہ کی ماہوار پنشن دو پشت تک کر دی اور پھر تو بہت سے
خطابات ملے ویسرائے کی کونسل کے آپ ممبر ہوئے غرض دنیا کا کوئی ایسا اعزاز نہ تھا
جو آپ کو نہ ملا ہو۔ سب سے بڑا اور بہتر کام علی گڈھ کا بے نظیر کالج ہے جس کی نظیر سارے
ہندوستان میں نہیں ہے جو مسلمانوں کی سلف ہلپ کی دوامی یادگار ہے۔ سید احمد خاں اب
نہیں رہے لیکن کالج قایم ہے اور اُن کا نام زندہ ہے اور زمانہ دراز تک مسلمان اُن کے
احسانات کو یاد کرتے رہیں گے۔ جن کوتاہ اندیشوں نے اُن کی مخالفت کی اور اُن کے
نیک کاموں میں روڑا اٹکایا اور ان کو کافر ٹھیرایا تھا اب وہی اُن کا فخر کو علیہ الرحمہ کہتے ہیں اور اس کی

موت کو قوم کی موت سمجھتے ہیں۔ ؎ آنچہ دانا کند ناداں۔ لیک بعد از خرابی بسیار۔

نواب دبیرالدولہ کی حویلی اور لیا مسجد کے پاس۔ یہ مکان اول مہدی قلی خاں کا تھا جس کو نواب دبیرالدولہ نے خرید لیا تھا۔

نواب صاحب پچھلی صدی سے ایک بڑے پایہ کے امیر تھے۔ آپ سرسید مرحوم کے نانا تھے۔ آپ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے سفیر ہو کر شاہِ فارس کے دربار میں گئے تھے اور اُنھوں نے اپنے اہم دسترگ فرائض کو بہت اطمینان بخش طور پر انجام دیا۔ فارس سے واپس آکر آپ آوامد پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آپ اکبر شاہ ثانی کے وزیر اعظم رہے۔ بالآخر بمبئی میں کسی ہنگامے میں شہید ہوئے۔

عقب جامع مسجد از بالائے بازار پایہ والاں تاختم اسپلینڈ روڈ

عقب جامع مسجد کا نظارہ بھی قابلِ دید ہے۔ جامع مسجد کی سربفلک عمارت کی شان اور اس خانۂ خدا کی عظمت دل میں خود بخود موجزن ہوتی ہے۔ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی ہیبت کی دیوار کی اونچائی سفید سفید برجوں کی گولائی۔ قطار قطار برجیوں کی خوشنمائی میناروں کی لمبائی ایک عجیب و غریب نظارہ ہے۔ مسجد کے نیچے موقوفہ دکانیں ہیں جن میں اناج کی منڈی ہے شمالی گوشے سے لگا ہوا ایک مزار ہے۔ دھڑ کا الگ اور سر کا جدا۔ معلوم نہیں کس کا ہے۔ بعض لوگ صوفی سرمد کا مزار کہتے ہیں اور شرقی دروازے کے سامنے والے مزار کو مصنوعی بتلاتے ہیں۔ العلم عند اللہ۔ مگر شرقی دروازے کے محاذی جو مزار ہے اُس پر خلایق کا اژدحام رہتا ہے ایک بڑی دلیل اس کی اصلیت کی ہے۔

آنریری ہندو گرلز سکول بازار پایہ والوں کے بازار کی جانب ایک دو منزلہ عالی شان عمارت میں ہندو صاحبان کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔

نقشہ عقب مسجد جامع
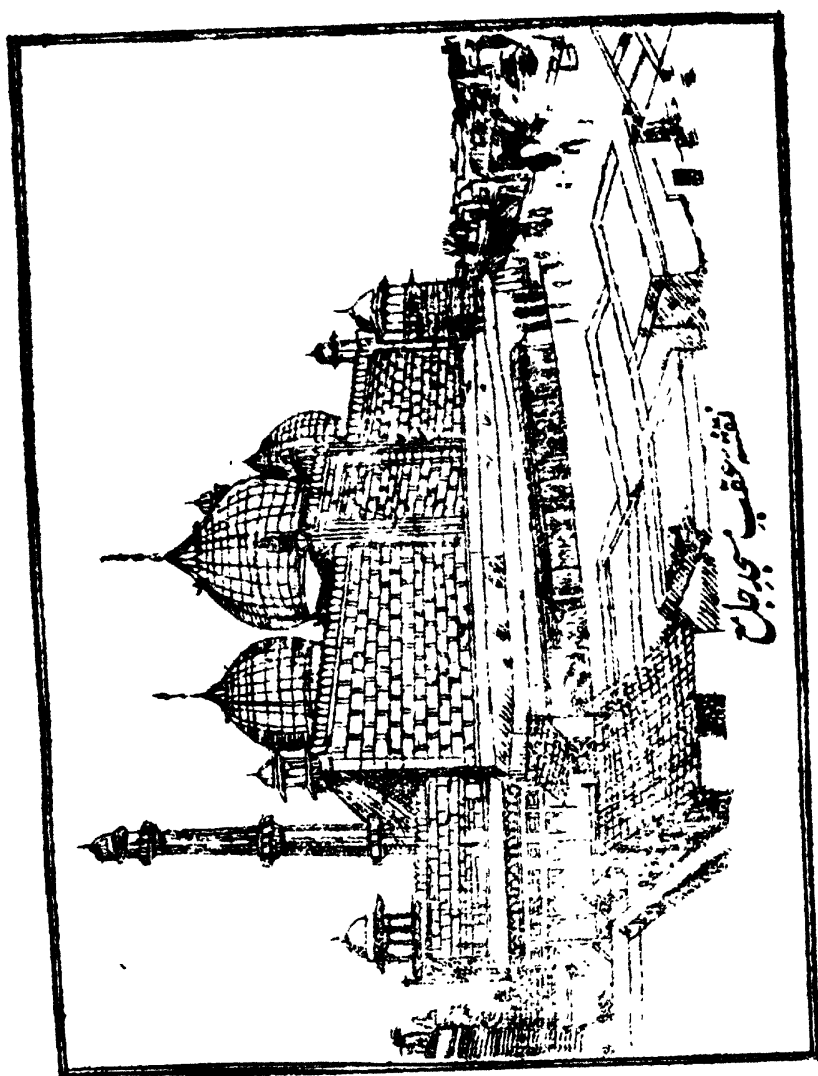
رہٹ کا کنواں

بہت بڑا نا کنواں ہے۔ شاہ جہاں بادشاہ کے وقت میں پہاڑ تراش کر بنایا گیا تھا۔ اسی سے جامع مسجد کے حوض میں پانی جاتا تھا۔ اس کے پاس پانی کے بڑے بڑے خزانے بنے ہوئے ہیں پہلے اُن میں پانی جمع ہوتا تھا پھر جامع مسجد کے حوض میں پانی چڑھایا جاتا تھا۔ اب جامع مسجد کی آب رسانی کا سلسلہ موقوف ہوگیا چوں کہ اس کنوئیں پر رہٹ لگا ہوا ہے لہٰذا اسی نام سے کنواں تو کنواں سارا محلہ موسوم ہوگیا۔

ڈاکٹر شیخ ضیاء الدین خاں

اسی محلے میں خان بہادر شمس العلماء مولوی شیخ ضیاء الدین صاحب ایل ایل ڈی کا دولت خانہ ہے۔ منشی ذکاء اللہ۔ مولوی نذیر احمد اور یہ دلی کالج کے نامی گرامی طلباء میں سے تھے۔ ایک ہی ساتھ پڑھے اور سب کے سب شمس العلماء ہو کر چلے۔ ضیاء الدین اور مولوی نذیر احمد دونوں اپنے علمی تبحر کی وجہ سے ایل ایل ڈی بھی ہوئے شیخ صاحب کا انتقال پہلے ہوا باقی دو صاحب آگے پیچھے تھوڑے ہی فرق سے گئے۔ شیخ صاحب داروغہ شیخ محمد بخش ساکن موضع لبسئی تحصیل دہلی کے قدیم باشندے تھے آپ اُن کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ داروغہ سب انسپکٹر پولیس کو کہتے ہیں فتح دہلی کے دن جب انگریزی فوج دلی میں داخل ہوئی تو وہ اپنے مکان ہی میں تھے قضائے کردگار اجل گولی کی شکل میں آئی۔ یہ خاندان گورنمنٹ کا خیر خواہ تھا۔ غدر میں دھیرج کی پہاڑی پر خبر رسانی کرتے تھے جن کے صلے میں کچھ اراضی انعام ملی ہوئی ہے۔ مولوی صاحب مولوی مملوک علی نانوتوی مشہور عالم کے شاگرد تھے اور مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور سے بھی فارسی تحصیل کی تھی۔ ایام غدر میں دہلی کالج میں مدرس ہوئے۔ چندے نارمل سکول میں پڑھاتے رہے پھر اسی کالج میں عربی کے پروفیسر ہوگئے۔ ۱۸۷۷ء میں کالج ٹوٹا تو بلحاظ اپنی اعلیٰ قابلیت کے اکسٹرا اسسٹنٹ ہوئے اختتام مدت پر پنشن لے لی۔ بڑے بھاری ادیب وقت تھے۔ چوں کہ ساری عمر سررشتہ تعلیم میں صرف ہوئی پڑھانے ہی کی دھن رہی تصنیف و تالیف کوئی نہ چھوڑی کئی برس ہوئے انتقال کرگئے اور اپنے ساتھ علم کا دفتر بھی لے گئے۔ آپ کے چار صاحب زادوں میں افسوس ہے کہ کوئی بھی ایسا نہ نکلا جو باپ کے

نام کو روشن کرتا۔

شیش محل قدیم زمانے کی عالی شان عمارت ہے اب اس میں فقیر چند کلا ناتھ کی دکان ہے جس میں ہاتھی دانت اور سنگ مرمر وغیرہ کی نوادرات و عجائبات فروخت ہوتے ہیں۔ اسی سلسلے میں اور کئی دکانیں اسی قسم کی ہیں۔ ان میں وہ چیزیں سجائی گئی ہیں جو کیوری آسی ٹیز یعنی عجائبات کہلاتی ہیں اور صاحبان انگریز ان مصنوعات اور نوادرات کو اکثر خرید کر کے ولایت بھیجتے ہیں۔

پایے والوں کا بازار یہ ایک بازار ہے وسیع اور دلکش جامع مسجد کے شمالی دروازے کے سامنے۔ اس بازار میں ترایا ہے کہ اس میں سے خانم کے بازار اور دریبے کو رستہ جاتا ہے۔ خانم کا بازار اب نہیں دریبہ البتہ موجود ہے۔ جہیز وغیرہ کے سیئے پلنگ چھپر کھٹ چوکیاں۔ شکن۔ گھڑونچیاں مختلف قسم کا چوبی سامان بنتا ہے۔ پایے اور صندوق بنانے والوں کی دکانیں کثرت سے ہیں اسی واسطے پایے والوں کا بازار مشہور ہوگیا۔ لالہ نراین داس رہتگی کا پنج منزلہ کوٹھا نہایت عالی شان بنا ہے۔ دیوالی دسہرے میں شیشے آلات وغیرہ سے سجایا جاتا ہے اور بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

سول ہاسپیٹل صدر شفاخانہ سرکاری ۱۸۶۸ء جامع مسجد سے اسپلینڈ روڈ پر صدر شفاخانے کی عالیشان اور بہت وسیع عمارت سنگ سرخ کی مغلیہ طرز کی ہے ہالوں پر برجیاں بنی ہوئی ہیں اس کا صدر دروازہ پایے والوں کے بازار کی طرف ہے۔ یہ شفاخانہ ۱۸۶۸ء میں بنایا گیا اور وقتاً فوقتاً بلحاظ ضرورت اور کثرت مرجوعۂ مریضین اس میں توسیع ہوتی رہی۔ اس کے متعلق دو برانچ ڈسپنسریاں بھی ہیں ایک لال کنواں بازار میں اور دوسری صدر بازار میں۔ صدر شفاخانے میں ہر قسم کی سہولت اور آرام بیماروں کا ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بیماروں کے لیئے کشادہ اور ہوادار کمرے ان میں سجے سجائے آہنی پلنگ اور بچھونے برابر لگے ہیں۔ یہاں کی صفائی اور حسن انتظام دیکھنے کے قابل ہے۔ اب آئی اینڈ ایر ہسپتال بھی کھل گئی ہے جس میں امراض چشم و گوش وغیرہ کا بھی علاج ہوتا ہے۔ مریضوں کی خوراک اور دیگر اخراجات ملا کر تخمیناً [illegible] صرف ہے کا سالانہ

خرچ میونسپل کمیٹی دیتی ہے۔ سول سرجن صاحب روزانہ مریضوں کو آکر دیکھتے ہیں۔ کئی تجربہ کار ڈاکٹر ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

لیڈی ڈفرن ہاسپٹل ۱۹۰۳ء

۱۹۰۳ء میں اسی ہسپتال میں ایک زنانی ہسپتال بھی کھل گئی ہے۔ جس کا سنگ بنیاد خود لارڈ ڈفرن گورنر جنرل کشور ہند (۱۸۸۴ء) نے اپنے دست مبارک سے رکھا تھا۔ سرکاری شفاخانوں کے سوا دلی میں پرائیوٹ میڈیکل پریکٹیشنرز کی بھی کچھ کمی نہیں اُن کا کاروبار بھی خوب چلتا ہے جن میں کئی مسلمان۔ ہندو اور بنگالی اور ولایت کے پاس شدہ ڈاکٹر ہیں اور بعض بعض ان میں سے ایسے مقبول انام ہیں کہ بہت لوگ اُن کے زیر علاج رہتے ہیں۔

یونانی اطبا کا مختصر تذکرہ

دلی والے زیادہ تر یونانی علاج کے معتقد ہیں اور میرے خیال میں انگریزی دواخانوں سے بھی زیادہ مرجع یونانی حکیم صاحبوں کا ہے۔ جن میں چوٹی کے حکیموں میں تو جناب حکیم محمود خاں صاحب مرحوم و مغفور کا خاندان ہے جو محتاج کسی تقریب و تعریف کا نہیں ہندوستان کے ہر کونے سے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں سب سے پہلے تو اسی خاندان میں نصف درجن مطب ہوتے تھے اب جناب مولوی حاجی حافظ حکیم اجمل خاں صاحب نواب حاذق الملک بہادر کا نام اور کام سب سے بڑھا ہوا ہے اور اسی خاندان میں جناب خان بہادر حکیم احمد سعید خاں صاحب اور اُن کے فرزند رشید جناب حکیم غلام کبریا خاں صاحب عرف حکیم بھورے اور جناب حکیم عبدالمجید خاں صاحب مرحوم کے ہر دو صاحبزادگان کے مطب جاری ہیں سچ یہ ہے کہ یہ گھرانا این خانہ تمام آفتاب است کا پورا مصداق ہے۔ موت کے سوا سب بیماریوں کا تیر بہدف علاج اگر ہے تو اسی خاندان میں۔ پھر ہندوستانی دواخانہ ایسا کھولا ہے اور اُس کو ایسی ترقی دی ہے اور وہ وہ ادویہ طیار ہوتی ہیں کہ سارے ہندوستان میں اس کا جواب نہیں۔ خداوند تعالیٰ اس سارے خاندان کو صحیح و سلامت رکھے۔ بھر بے غرض لاطمع۔ خلیق متواضع۔ غریب سے غریب کے گھر دوڑے جاتے ہیں۔ مریض کے ساتھ جان لڑا دیتے ہیں۔ ویسی ہی خدا نے عزت و آبرو بھی دی ہے۔ مدرسۂ طبیہ

اگ جاری ہے۔ یونانی کالج جدا بن رہا ہے دائیوں کا مدرسہ ان سب پر سہ گرہ ہے غرض خیر و برکت اور نفع خلایق کا سرچشمہ کہوں تو تنقیص مراتب اور کفران نعمت ہے یوں کہو کہ ایک بحر متواج لہریں مار رہا ہے اور سب کو سیراب کر رہا ہے۔ دلی میں اور بھی کئی نامور اور حاذق طبیب ہیں جن کے نام کہاں تک گنواؤں اُن میں ایک فرد فرید جناب حکیم ناصر الدین خاں صاحب عرف چنو میاں خلف الصدق جناب مرحوم و مغفور خاں حکیم رضی الدین خاں صاحب شفاء الملک ہیں جنہوں نے باوجود اس حداثت سن نوجوانی اور عالم شباب کے ایک بہترین نمونہ جوان صالح کا دکھلایا ہے اور لوگوں کو صرف اپنے بے نظیر اخلاق بلکہ اپنے لاجواب علاج معالجہ سے دوہری گراں بار منت سے ممنون احسان فرمایا ہے۔ مختصر یہ کہ باپ کی شہرت اور نام کو قایم رکھنا تو خیر میں اگر بلند کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ کو جناب حاذق الملک بہادر کی طرح قومی کاموں میں بھی شغف اور کمال دلچسپی ہے چنانچہ ۱۹۱۸ء کے آخر میں جو کامیاب جلسے اردو کانفرنس کے ہوئے اُس کی روح رواں آپ ہی تھے۔ اسی کے ساتھ حکیم رضی الدین خاں صاحب مرحوم مغفور کا کچھ تھوڑا سا حال لکھنا ضرور ہے۔ آپ ۱۲۶۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۶ء) کو (۶۸) سال کی عمر میں ہیضے سے انتقال فرمایا

علم مرحوم سے سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ تاریخ وفات کے چند شعر یہ ہیں۔

رضی الدین احمد خاں بہادر — تمہارا کیوں کے جھیلیں رنج فرقت
یہ کیا معلوم تھا کہنی پڑے گی — تمہاری اور مجھے تاریخ رحلت
پڑیں ایسی سخن گوئی پہ پتھر — تمہارا میں نکالوں سال رحلت
کہاں سے لاؤں پتھر کا کلیجہ — کروں کس دل سے اس میں غور و فکرت
تلاش مادے کا ہوش کس کو — کہاں وہ فکر کی اس غم میں جودت
مگر اتنا تو کہہ دیتے ہیں اب بھی — تمہاری تا نہ رہ جائے شکایت
رہے گی یاد لیکن سوگ کے ساتھ — شفاء الملک کی ناگاہ رحلت

حکیم صاحب مرحوم کو اُن کی وصیت کے موافق اُن کے جد بزرگوار نواب عضد الدولہ اعتماد الملک بہادر حکیم غلام نجف خاں صاحب کے پائین قدم شریف میں دفن کیا گیا۔

کوچہ اُستاد حامد

عہد مغلیہ۔ یہ دروازہ اسی نام کے کوچے کا داخلی دروازہ ہی جس میں پہلے کبھی اُستاد حامد کا مکان تھا۔ اُستاد حامد وہ مشہور شخص ہی جس نے شاہ جہاں کے عہد میں بڑی بڑی عمارتیں تیار کی ہیں اور چوں کہ اپنے فن میں کامل تھا اسی سبب سے اُستاد کہلاتا تھا۔ اس کوچے میں سادہ کار اور چاندی والے رہتے ہیں۔

کوچہ اُستاد ہیرا

عہد مغلیہ۔ یہاں ایک دروازہ ہی جو اُستاد ہیرا کے نام سے مشہور ہی اور اب یہ کوچہ بھی اسی نام سے پکارا جاتا ہی۔ اُستاد ہیرا بھی عہد شاہ جہانی کا بڑا معمار تھا جس نے لال قلعہ وغیرہ بہت سی عمارتیں بنائی ہیں۔ اب اس میں ہندو رہتے ہیں۔

ہاتھی والا کنواں

سول ہاسپٹل کے شمالی دروازے سے اور دریبے کی شرقی انتہا پر اس نام کا ایک بڑا عالی شان کنواں ابھی چند سال ہوے کہ تھا۔ لیکن چوں کہ وہ بیچ سڑک میں آگیا تھا راستہ کشادہ کرنے کے لیے پٹوا دیا گیا اور ایسا پٹوا دیا گیا کہ اب اُس کا نشان تک باقی نہ رہا۔ چوں کہ اس کوئیں پر چھت بھی تھی اور ایک برج سا تھا غالباً جس پر لاؤ چلانے کے چرسے تھے اس کی عمارت کے بڑے ہونے کے خیال سے ہاتھی کنواں کہلاتا تھا۔

اسپلینڈ روڈ کے مندر

اس سڑک پر پریڈ گراونڈ کے مقابل ایک سلسلہ مندروں اور شوالوں کا ہی جن کی تفصیل ہماری فہرست میں ملے گی یہاں صرف نام گنوائے جاتے ہیں۔ رامچندر جی۔ ست نارایَن داؤ جی۔ نرسنگ جی۔ جگرناتھ جی۔ گوپال جی۔

کوچہ بلاقی بیگم

اس کوچے میں منشی عمو جان کا عالی شان مکان ہی۔ اس کوچے کا مفصل ذکر دریبے کے بیان میں آیا ہی۔ کہ وہاں بھی یہ کوچہ نافذ ہی۔ اس میں اب ایک ہندو جینیوں کا یتیم خانہ ہی۔ اس کے بعد لہسوا کی گلی ہی۔ اور پھر بنگالی ہائی سکول ملتا ہی۔

عقب جامع مسجد یعنی چاوڑی بازار سے قاضی کے حوض تک

چاوڑی بازار

کوچۂ یار سے دیتا ہے جو واعظ تفضیل
بھلا ایسی جنت میں نرالی وہ فضا کون سی ہے

عقب جامع مسجد سے قاضی کے حوض تک (۷۰۰) قدم لمبا اور سیدھا یہ بازار چلا گیا ہے۔ چوں کہ یہ بازار بہت چوڑا ہے درحقیقت اس کا نام چوڑا بازار تھا جو کثرت استعمال سے چاوڑی بازار ہو گیا۔ یہ بازار اس سرے سے اس سرے تک دو منزلہ ہے نیچے بساطیوں۔ جفت فروشوں۔ کسیروں۔ لوہیوں۔ کاغذیوں۔ رفوگروں۔ حلوائیوں۔ غرض ہر قسم کی دکانیں ہیں اور کوٹھوں پر ارباب نشاط یا شاہدان بازاری حسن فروشی کرتی ہیں۔ خوب غضب بازار ہے۔ ٹھنڈے وقت یعنی مغرب سے کچھ پہلے اور بارہ بجے رات تک خوب چہل پہل رہتی ہے۔ دلی کے البیلے عاشق مزاج جوان دید بازی کے شوقین بن ٹھن کر خود اپنی آن بان پر مفتوں کوئے جاناں کے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ جس کو دیکھو اس کی نگاہ کوٹھوں کی طرف ہی جمی رہتی ہے۔ پھول والوں کی دکانیں ہیں "پھول ہیں موتیا کے" "دو کنٹھا لو موتیا کا" بارہ بجے رات تک برابر یہی آواز چلی آتی ہے۔ پھولوں کی لپٹ اور مہک سے دل و دماغ تازہ ہوتا ہے۔ جوڑیاں گاڑیاں۔ ٹمٹمیں۔ تانگے۔ موٹریں بڑی رات گئے تک کھڑی رہتی ہیں۔ کسی طرف طبلے پر تھاپ پڑتی ہے کہیں سے الاپنے کی آواز آتی ہے۔ چلتے ہوئے لوگ بھی کوٹھوں کے تلے ٹھٹک جاتے ہیں جو اناڑی ہیں اُدھر اُدھر دیکھ بھال کر جھٹ اوپر چڑھ جاتے ہیں۔ جن کو دولت کا نشہ ہے اور کسی کا ڈر نہیں بے فکرے ہیں وہ شرم و حیا کو گھر ہی میں چھوڑ آتے ہیں دندناتے کوٹھے پر چڑھ جاتے ہیں۔ ہمارے جیسے مردہ دل اگر کبھی بہ ضرورت اُدھر سے گزر گئے تو آنکھیں بند ہوتی ہیں نہ کان بہرے۔

ع ۔ سرود خانۂ ہمسایہ حسن رہ گزرے ۔

بہ تقاضائے سن و سال اب اس قابل تو نہ رہے کہ بلند پروازی کریں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔ گو گناہ میں براہ راست ملوث نہ ہوں گر ع عصمت بی بی ست از بیچادری تو بھی کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے نامۂ اعمال پر سیاہی کی ایک تہ ضرور چڑھ

جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ چاوڑی نہیں ہے پرستان یا اندر کا اکھاڑا ہے جس کی نسبت مولانا راسخ کے اس شعر پر ہمارا بھی صاد ہے۔

چاوڑی قاف ہے یا خلد بریں ہے راسخ
جگمگے حوروں کے پریوں کے پرے ملتے ہیں

چتلا دروازہ اسی کی بائیں جانب چتلا دروازہ ہے کہتے ہیں کہ اس کا اصلی نام چہل تن دروازہ تھا کیونکہ یہاں چالیس تن شہید ہوئے تھے جن میں سے ایک دو بزرگ تھے جن کی چتلی قبر مشہور ہے۔ اب کثرت استعمال سے چتلا دروازہ مشہور ہو گیا۔ اسی میں سے چوڑی والوں اور جامع مسجد کو رستہ نکل جاتا ہے اور سامنے اس دروازے کے چھیپی واڑہ خورد ہے چتلے دروازے کے اندر ہی گڑھیا کا محلہ ہے۔ آگے بڑھ کر چھتہ شاہ جی کا مشہور ہے۔ یہ رستہ سید ابکھور کی مسجد ہوتا ہوا بیچ میں دائیں بائیں ذیل کی گلیاں چھوڑتا ہوا کناری بازار دریبے میں جا نکلتا ہے۔ پہاڑ والی خورد پہاڑ والی کلاں ۔ چھیپی واڑہ کلاں ۔ دھرم پورہ ۔ ورنری والی ۔ لالہ گردھاری لال وکیل ۔ چیل پوری ۔ راے بہادر لالہ گنیشی لال کٹڑہ خوشحال راے ۔ کوچہ میر عاشق چاوڑی بازار میں بائیں جانب ایک بڑا محلہ ہے۔

شاہ جی کا مکان چھتہ شاہ جی میں ۔ دور آخر مغلیہ کا ۔ پھاٹک اور سارے کا سارا چھتہ شاہ جی کا مکان کہلاتا ہے جن کا اصلی نام نواب شادی خاں تھا۔ آپ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ہندوستان میں بلخ سے آئے تھے ۔ جب مرہٹے دلی پر قابض تھے تو انھوں نے مرہٹوں سے سازش کر لی اور بادشاہ کو جو وظیفہ مرہٹے دیتے تھے انھیں کی وساطت سے ملنے لگا ۔ شاہ جی اور ان کے ساتھ دو تین شخص اور جن میں سے ایک منشی بھوانی شنکر تھے دلی میں مرہٹوں کی طرف سے ایجنٹ مقرر تھے ۔ نواب شادی خاں ناظم تہ بازاری بھی تھے اور جب ایک کثیر مقدار کوڑیوں کی جمع ہو گئی تو انھوں نے بحصول اجازت شاہی "کوڑیا پل" بنوا دیا ۔ جس کا اب صرف نام ہی نام رہ گیا ہے ۔ پل کا تو

تو پتہ نہیں مگر وہ سڑک جو فوارے سے ملکہ کے باغ کے برابر برابر ریل کے سٹیشن کی طرف چلی گئی ہے وہ کوڑیا پل کی سڑک کہلاتی ہے۔ **شاہ جی کے چھتے** ہی میں عبدالصمد کا حمام ہے۔

شاہ بولا کا بڑ

شاہی زمانے میں یہاں ایک بڑا بڑ کا درخت تھا اور شاہ بولا نامی ایک فقیر یہاں رہتے تھے جن کی قبر اب تک یہاں موجود ہے۔ اب وہ بڑ کا درخت تو نہیں رہا مگر قبر سلامت ہے جس پر ایک چھوٹا سا نیم کا درخت سایہ کیے ہوئے ہے۔ اس کے سامنے ہی گاڑیوں کا اسٹینڈ ہے اور داہنے ہاتھ کو **نئی سڑک** چلی گئی ہے اور دوسری طرف گھنٹہ گھر کے پاس **چاندنی چوک** میں جا ملی ہے۔ شاہ بولا کے بڑ کے پیچھے **نائی واڑے** کا محلہ ہے۔ پھر **اجرٹن روڈ** یعنی نئی سڑک ملتی ہے۔ آگے اسی بازار میں **قاضی کے حوض** تک یہ گلیاں ملتی ہیں۔ داہنی **طرف** محلہ چرخے والاں۔ نیا بازار اس میں سنگ سرخ کی ایک قدیم مسجد از سر نو درست اور آراستہ کی گئی ہے۔ پہلے یہ مسجد نواب صاحب کی مشہور تھی اب پتھر والی کہلاتی ہے۔ اس پر یہ کتبہ ہے:۔

اللہ اکبر

آنکہ رکن الدولہ فیاض زماں	تجنی الملک و امیر اعظم ست
شکر للہ کرد در دہلی بنا	مسجد و چاہے کہ در عالم کم ست
بے تکلف گفت تاریخش نصیر	کعبۂ ثانی و چاہے زمزم ست

۱۲۲۸ھ

تاریخ تعمیر جدید

اس مسجد کو نواب رکن الدولہ۔ وزیر حضرت اکبر شاہ ثانی باہتمام شیخ پیر بخش معمار ۱۲۲۸ھ میں تعمیر کرایا تھا بعد ازاں نصیر الدین احمد خاں نبیرۂ نواب ممدوح نے باہتمام شیخ عبدالحق نبیرہ معمار مذکور ۱۳۳۲ھ میں از سر نو بنوایا۔

(کتبہ فیاض خاں سنگ تراش)

گلی حکیم بقا جس کا دوسرا رستہ قاضی کے حوض پر نکلتا ہے۔ بائیں طرف گلی تیاں گلی بابو مہتاب رائے۔ گلی راجہ کدار ناتھ۔ کمرہ حافظ داؤد صاحب جو نواب صاحب دوجانے کی عالی شان کوٹھی ہے۔ جس میں ایک حمام بھی ہے۔ محلہ کھاری کوئی۔ مراستہ

بازار چوڑی والاں جو مٹیا محل۔ کُبلی خانہ اور جامع مسجد اور جنیلے دروازے سے جانکلتا ہے گلی مرغاں۔ گلی رودشا اچار والی۔ گلی چاہ میراں والی۔ حکیم تھا والی گلی اس وجہ سے مشہور ہے کہ یہاں جو حکیم رہتے تھے وہ سب آنکھوں کے علاج کے لیئے مشہور تھے چنانچہ حکیم حسام الدین خاں صاحب عرف حکیم منجھلے اپنے فن میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور دور دور سے لوگ آنکھوں کے علاج کو آیا کرتے تھے۔ حکیم منجھلے کے بعد اُن کے صاحب زادے حکیم قیام الدین خاں صاحب تھے اور اب اُن کے بیٹے حکیم مکرم الدین صاحب ہیں۔ اور اسی خاندان میں حکیم لطیف حسین خاں صاحب تھے۔ دونوں صاحب آنکھ کے علاج میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اب دونوں کا انتقال ہو گیا۔ حکیم لطیف حسین خاں صاحب علاوہ ایک حاذق طبیب ہونے کے ذی علم تھے اور گورنمنٹ ہائی سکول دہلی میں عربی فارسی کے مدرس تھے چنانچہ راقم نے بھی جب کہ میں اس مدرسہ میں پڑھتا تھا آپ سے استفادہ کیا ہے۔ اسی جگہ میران والی گلی ہے اور آگے بڑھکر قاضی کا حوض ہے۔

دلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی کے آخری سرے پر جانب حوض قاضی گلی حکیم بقا کے مقابل یہ بہت بڑا برقی چھاپے خانہ ہے جس میں لیتھو اور ٹیپ اردو انگریزی ہندی سب قسم کی چھپائی کا کام ہوتا ہے۔

چاوڑی بازار میں سے چوڑی والوں کا محلہ اٹلی کی پہاڑی تک

یہ ایک لمبی اور تنگ گلی ہے جو چاوڑی بازار میں جامع مسجد سے آتے ہوئے بائیں ہاتھ کو پھٹ جاتی ہے۔ آگے چل کر ایک سڑک داہنی طرف پھٹ گئی ہے جو پنڈت پریم نراین کی سڑک کہلاتی ہے جو اندور ریاست میں بہت بڑے عہدے پر تھے۔ اس کے آگے ایک گلی بائیں جانب شیخ منگلو کے پھٹتے میں سے جو داہنی جانب پڑتا ہے ہوتی ہوئی جامع مسجد کے سامنے جانکلتی ہے اور یہیں سے بائیں جانب ایک گلی نکل کر جنیلے دروازے میں ہوتی ہوئی بازار چاوڑی میں جانکلتی ہے۔ جے اینڈ سنز پریس کے آگے داہنے ہاتھ کی طرف ایک بہت تنگ اور پیچدار گلی محلہ بدیاں چلی جاتی ہے جو ایک طرف سڑک پنڈت پریم نراین میں نکلتی ہے اور دوسری طرف بھوجو پہاڑی پر اب پھر سڑک بن گئی ہے تو ڈگری بننے والوں کی چف دکانیں ہیں جن کے سبب سے

یہ حصّہ **ڈوکری والوں کا محلہ** کہلانے لگا ہے اور اس کے بعد **املی کی پہاڑی** ہے۔
اب یہاں یہ سڑک اس بڑی سڑک سے جا ملتی ہے جو جامع مسجد کے محاذ سے شیامل
بازار میں سے گزر کر تیلی قبر۔ بازار اسا میر خاں اور ترا ہے پر سے دلی دروازے میں
جا نکلتی ہے۔ بازار چوڑی والوں میں یہ گلیاں ہیں۔ **داہنی طرف** گلی گڑھیا چوڑی گراں
کٹڑہ دھومی مل کاغذی۔ حویلی منشی کبیر علی تحصیل دار جس میں زنانہ شفاخانہ و مدرسہ
دائیاں جناب حکیم اجمل خاں صاحب حاذق الملک کا ہے۔ مطبع مجتبائی۔ گلی غلام نجف
والی۔ گلی میگزین اور ایک مسجد۔ سڑک پنڈت پریم نراین۔ گلی تخت والی۔ پھاٹک
میر شمس الدین جس میں بے اینڈ سنز پریس ہے یہیں مولوی امیر حمزہ کا مکان تھا۔ محلہ بریاں جہاں مولوی عبدالرحمن
راسخ مرحوم تھے۔ گلی سرخ پوشاں و مسجد الف خاں روشنائی فروش۔ املی کی پہاڑی
یہاں سید محمد میر خوشنویس کا مکان تھا۔ اور شاہ محمد علی کا مقبرہ اور ایک برج کی مسجد ہے
بائیں طرف کارخانہ لالہ بھانا مل گلزاری مل لوہیئے۔ حویلی ڈپٹی محمد سلطان خاں صاحب
جس میں حکیم صاحب کا مدرسۂ طبیہ ہے۔ حمام سیتل داس۔ گلی منہاریوں والی۔ گلی جوتے والاں
اور مسجد۔ گلی حکیم جی والی جس میں حکیم علی احمد خاں صاحب دو جانے والے مطب کرتے
ہیں۔ محلہ ڈوکری والاں۔ گلی مرزا ثریا جاہ۔ شاخ مدرسۂ زنانہ الاسلامیہ۔

مولوی سید امیر حمزہ مرحوم

سید امیر علی شاہ صاحب کے فرزند تھے۔ آپ عربی فارسی کے منتہی اور باایں ہمہ انگریزی بھی جانتے تھے۔ زہد و تقویٰ اور شرافت خاندانی کے اعتبار سے
آپ دلی کے مشاہیر میں سے تھے۔ شعر گوئی کا بھی شوق تھا اور کلام آپ کا چونکہ
درد بھرا اور تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا لوگوں کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ کچھ روز
ہندو کالج میں پروفیسر رہے مگر ازل سے ایک آزاد طبیعت لائے تھے بھلا نوکری کی قید
کب اٹھا سکتے تھے۔ گھر بیٹھے اور درس و تدریس کا مشغلہ رہا بہت سے لوگ آپ کے
شاگرد ہیں جو آج بڑے بڑے عہدوں پر ہیں سخاوت کا یکا تھا۔ پیسہ ہاتھ میں
ٹکتا نہ تھا۔ ادھر لا اُدھر دیا۔ اپنے پر تکلیف اٹھاتے مگر سائل کا سوال رد نہ کرتے
تھے۔ مختصر یہ کہ با خدا بزرگ تھے۔ ۸۴ سال کے سن میں رحلت فرمائی۔ آپ کے
دو صاحب زادے ہیں بڑے صاحب مولانا سید محمد ناصر فارغ التحصیل ہیں۔

شاعر بھی ہیں جن کے کلام کی خوبی کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا۔

می دانم آخر چوں دم دیدار می رقصم	گر نازم برین ذوقیکہ پیش یار می رقصم
خوشا رندی کہ پامالش کنم صد پارسائی را	زہے تقوی کہ من با جبہ و دستار می رقصم
تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون می ریزی	من آں بسمل کہ زیر خنجر خونخوار می رقصم

دوسرے صاحبزادے قاری سید حامد صاحب کم عمر اور زیر تعلیم اور ہونہار ہیں۔

مولوی عبدالرحمن صاحب راسخ

خلف جناب مولانا محمد حسین صاحب فقیر جن کا مدرسہ و مسجد کٹرہ گوکل شاہ میں ہے۔ محلہ بدلیاں میں ان کا مکان تھا۔ یہ صاحب علاوہ حدیث۔ تفسیر اور فقہ کے فارسی کے اہل کمال اور شاعر بے نظیر تھے۔ شرح مثنوی مولانائے روم اور ایک ضخیم دیوان مراۃ الخیال آپ کی یادگار ہے۔ عشقیہ اور نعتیہ کلام اردو دیوانوں میں ہے۔ آپ بڑے پایہ کے واعظ بھی تھے اور مولوی عبد الرب صاحب اور ان کے بیٹے مولوی محمد ادریس کے بعد آپ مچھلی والوں کی مسجد میں جمعہ کے وعظ کہا کرتے تھے۔ سننے والے کہتے ہیں کہ خوب کہتے تھے۔ آپ کے چند شعر ناظرین کی تفریح کے لیئے لکھتا ہوں۔

دل نشیں ہر تیر ہے درد نہانی کی طرح	تیغ قاتل حلق سے اُتری ہے پانی کی طرح
پھر جگر کی چوٹ ابھر آئی پھر اٹھا درد دل	ابھرے جوبن کی طرح اُٹھتی جوانی کی طرح

سر بالا می کشد سودائے من	شد تقضائے لامکاں صحرائے من
من بایں دیوانگی شیدائے تو	تو بایں فرزانگی لیلائے من

راسخ کی فاقہ مستی کو اللہ کی پناہ	کھاتا ہے سوکھے ٹکڑے بھگو کر شراب میں

سید محمد امیر خوش نویس کا مکان

یہیں سے ایک شاخ سڑک کی چوڑی والوں کے محلے کو پھٹ گئی ہے اسی جگہ کے سید محمد امیر خوش نویس کا مکان تھا جس پر نہایت خوش خط عاقبت بخیر باد لکھا ہوا تھا اور اسی کے پاس بھو جلا پہاڑی کا تھانہ تھا۔

شاہ محمد علی واعظ کا مقبرہ

سنہ ۱۱۳۱ھ ۱۹-۱۷۱۸ء

محلہ الی کی پہاڑی - ایک برجی مسجد کے پاس اس مقبرے میں تین قبریں ہیں - دو جو برابر ہیں وہ ایک سنگین کٹہرے کے اندر ہیں - ان میں سے ایک قبر شاہ محمد علی صاحب کی ہے اور دوسری اُن کے بھائی اسد اسکی - تیسری قبر زمین کے برابر ہوگئی ہے وہ خبر نہیں کہ کس کی ہے غالبًا شاہ صاحب ہی کے کسی معتقد کی ہوگی - شاہ صاحب بڑے مقدس بزرگ تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا مقصد وعظ اور تلقین مذہب ہی رکھا تھا اور آپ اکثر گجرات میں وعظ فرمایا کرتے تھے - گجرات کے صوبہ دار چنپت سنگھ کے مظالم سے تنگ آکر آپ مع اپنے ساتھیوں کے دہلی چلے آئے - یہاں آنے کے بعد چنپت سنگھ کی اشتعالک سے فرخ سیر نے آپ کو قلعہ کی چوبی مسجد میں قید کر دیا بادشاہ کو خواب میں اس حرکت ناشایستہ پر عتاب ہوا اور اُس سے متاثر ہو کر آپ کو مع آپ کے ہمراہیوں کے فوراً چھوڑ دیا - تب آپ جامع مسجد میں رہنے لگے اور وہیں درس وتدریس اور وعظ کا سلسلہ جاری رہا - شاہ صاحب نے جو عالمگیر ثانی کے مرشد بھی تھے سنہ ۱۱۳۱ھ ۱۹-۱۷۱۸ء میں انتقال کیا اور ایک برجی مسجد کے پاس دفن ہوئے -

مطبع مجتبائی دہلی

دراصل یہ مطبع منشی ممتاز علی صاحب خوش نویس کا تھا جب سنہ ۱۸۸۱ء میں وہ ہجرت بیت اللہ کو جانے لگے تو مولوی عبدالاحد صاحب نے خرید لیا - اس وقت مطبع کی ایک بہت معمولی حیثیت تھی - مولوی صاحب نے اپنی ذاتی قابلیت اور محنت اور صرف سے اس کو ایسی ترقی دی کہ اتنا بڑا اور کوئی مطبع اب دلی میں نہیں ہے - اس مطبع میں زیادہ تر دینیات کی کتابیں چھپتی ہیں - اب چھپائی کا کام کم ہوتا ہے - تھوک فروشی زیادہ ہے - مولوی صاحب رضوی سید ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام علی رضا سے ملتا ہے - خود بڑے نیک نفس - منکسر المزاج - ملنسار اور خلیق ہیں - بریلی کالج سے سنہ ۱۸۶۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی کا انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ سکول بدایوں میں تھرڈ ماسٹر مقرر ہوئے - سنہ ۱۸۷۵ء کو الہ آباد میں امتحان وکالت دے کر درجۂ اول کی سند حاصل کی اور اُسی سال انبالے کے رسالے پندرہ بنگال میں

ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ پھر ۱۸۹۳ء میں اس سلسلے کو منقطع کر کے ضلع میرٹھ میں وکالت کرنے لگے۔ آخرکار وکالت چھوڑ کر دلّی تشریف لائے اور مطبع کا کاروبار شروع کیا جس میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اپنی لیاقت اور وجاہت سے بڑے حکام میں بڑا رسوخ حاصل ہے اور بڑی عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دلّی کے نہایت سربرآوردہ اشخاص میں آپ کا شمار ہے۔ قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ اسی سال آپ کو خان بہادر کا خطاب ملا ہے۔ دہلی میں ایسا کوئی قومی جلسہ یا اہم کام نہ ہوگا جس میں آپ سب سے آگے نہ ہوں۔ دل کھول کر قومی کاموں میں جان و مال سے شرکت کرتے ہیں۔ جامع مسجد۔ مسجد فتح پوری۔ عربک سکول۔ یتیم خانوں وغیرہ کے ممبر ہیں۔ رات دن اسی دھن میں لگے رہتے ہیں بلکہ سچ پوچھیئے تو اب مطبع کی طرف زیادہ توجہ نہیں کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بہت کچھ دیا ہے۔ بڑے صاحب جائداد ہیں مسلمانوں کی فلاح اور ان کی بہبودی آپ کا نصب العین ہے اور حکام تک ان کی ضروریات پہنچانے کے لیئے آپ سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ قوم میں اگر ایسے شیدائی اور چند لوگ ہو جائیں تو مسلمان نکبت و ادبار سے نکل جائیں۔

فضی کے حوض سے سیتارام کا بازار تا بلبلی خانہ

یہ ایک معمولی بازار ہے حلوائی وغیرہ متفرق دکان دار بیٹھتے ہیں کوئی خاص بات اس بازار میں نہیں ہے نہ کوئی بڑی عمارت ہے البتہ ادھر اُدھر دو طرفہ گلیاں نکل گئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے داہنی طرف شیش محل یہ قدیم زمانہ کا ایک عالی شان محل ہے۔ گلی تھان سنگھ۔ کوچہ پاتی رام۔ جس کے اندر سر رام بیرسٹر ایٹ لا کا حالی کا بنا ہوا عالی شان مکان ہے۔ گلی نئی بستی۔ گلی اندر والی۔ گلی بیری والی۔ گلی لودھان۔ املی کا محلہ۔ کوچہ خسر لفینگ گلی اوگر۔ مکان بندو یتیم خانہ۔ مکان حکیم قاسم علی خاں بوریئے والے مرحوم۔ کوچہ شہیدی قاسم۔ اور اس کے اندر گلی کشمیریاں۔ گلی نیلا والی۔ چاہ نورنگ رائے ہے جس میں سے املی کے محلے کو رستہ نکل جاتا ہے اور ایک گلی بوریئے والوں کی ہے یہاں سے رستہ عقب کلاں مسجد کو چلا گیا ہے۔ اور عقب کلاں مسجد میں گلی نقار چیاں کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں اس کے علاوہ حوض

مظفر خاں۔ جال والا کنواں جو بہت بڑا تھا اب جال ڈال کر محفوظ کر دیا گیا۔ گلی ڈکوتاں بھی ہیں۔ کٹڑہ گوکل شاہ۔ گلی چھمن رنگریز والی۔ کٹڑہ حاجی خاں۔ بائیں طرف اینگلو ورنیکولر حمایت الاسلام کا پرائمری سکول۔ اور یتیم خانہ۔ گلی سرخاں۔ طویلہ لالہ بالا پرشاد۔ کوچہ کاشغری۔ گلی لالہ گردھاری لال والی۔ کوچہ سربلند خاں۔ گلی محاذی تھان نیچے بیراں۔ کوچہ راجہ سوہن لال۔ مندر گمنٹہ مہادیو۔ گلی ٹکسالیاں خورد۔ سڑک پنڈت پریم نرائن کی گلی جو چوڑی والوں میں جانکلتی ہے اس کے نکڑ پر رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ کی عالی شان حویلی ہے جس پر یہ کتبہ ہیں۔ اور آگے چل کر یہ گلیاں ہیں۔

بشن کردہ تعمیر سنبت ہی بود	سال انجام بے نظیر مکاں
۱۹۳۱	۱۲۸۲
چوں بفضل ایزدی تعمیر گشتہ ایں مکاں	ظاہری و معنوی ایں مصرعہ حاصل میشود
نیک و زیبا و خجستہ فال ہجری سال آں	از مسیح ہشتاد چار و یک ہزار و ہشت شد
۱۲۹۱ھ	۱۸۷۴ء

گلی کشمیریاں۔ گلی پیپل والی بازار سیتارام۔ گلی چوڑی گراں۔ گلی رائے بہادر لالہ رام چھیل اب پھر بڑی سڑک پر جو قاضی کے حوض سے آتی ہے آخری حصہ میں بلبلی خانہ کے پاس بابو نین سکھ داس کی عالی شان حویلی ہے جس میں اب میونسپل بورڈ ہائی سکول ہے۔

حکیم قاسم علی خاں بوریئے والے حکیم محمود خاں صاحب کے شاگرد تھے اور دلی کے اچھے حکیموں میں ان کا شمار تھا حال میں انتقال ہو گیا۔ اب ان کے صاحبزادے ہاشم علی خاں صاحب مطب کرتے ہیں۔ بوریئے والے اس واسطے مشہور ہو گئے کہ آپ کے بزرگوں نے ایک محلہ بسایا تھا جس میں زیادہ تر بوریئے والے رہتے تھے اسی وجہ سے اس نام سے مشہور ہوئے۔

حبیب اللہ شاہ علیہ الرحمہ کا مزار چھمن رنگریز کی گلی میں جو مسجد ہے اس کے صحن میں آپ کا مزار ایک کھلی چار دیواری کے اندر ہے۔ آپ قادریہ خاندان کے کوئی بزرگ تھے جن کا زمانہ دوسو ادوسو برس کا کہا جاتا ہے اور کچھ حال معلوم نہیں۔ ۱۴ر شوال کو عرس ہوا کرتا ہے۔

نقشہ اجمیری دروازہ
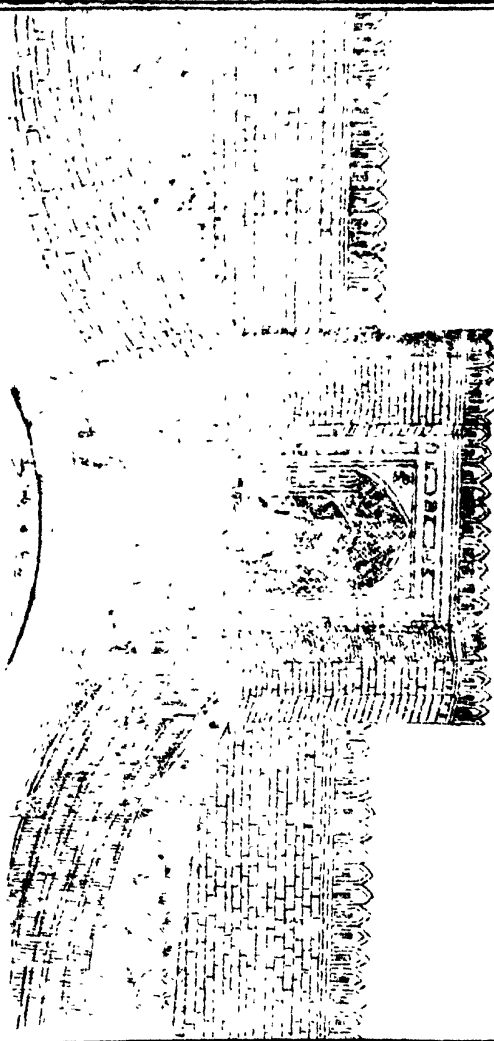
قاضی کے حوض سے اجمیری دروازے تک

یہ بھی ایک وسیع اور کشادہ اور سیدھا بازار ہے جس میں موچی۔ بقال۔ لوہار وغیرہ بیٹھتے ہیں۔

مسجد و مدرسہ مولوی محمد یعقوب صاحب آپ مولانا کریم اللہ صاحب کے صاحبزادے تھے۔ مولوی کریم اللہ صاحب جامع علوم وفنون تھے خصوصاً دینیات میں دست گاہ کامل رکھتے تھے۔ بڑے متوکل اور قانع تھے باوجود عیال داری اور تاہل کے دنیا کی طرف کم رجوع کرتے تھے۔ بیشتر اوقات تدریس طلبار میں مصروف رہتے تھے۔ مولوی کریم اللہ صاحب بھی اپنے باپ کی طرح حنفی مذہب کے جید علمار میں سے تھے یہ بھی متوکل اور درس و تدریس کے شایق تھے۔ فتاوی نویسی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ جمعہ کے دن وعظ بھی فرماتے تھے۔ اب بھی مدرسہ جاری ہے۔ داہنی طرف کوچہ فتح النسا بیگم۔ حویلی رجنا بیگم (رضیہ بیگم) گلی شاہ تارا۔ کوچہ دیوان سنگھ۔ کوچہ مصطفی بیگ۔ گلی بنسی کے ملے والی۔

بائیں طرف کٹرہ شیخ رانجھا۔ کٹرہ فیض بخش۔ محلہ کرولی۔ گلی لوہاراں۔ گلی بندوق والی۔ محلہ بندوق والاں۔ گلی کونڈے والی۔ گڈ بیلا والی۔ مادھورام بدہ سنگھ لوہیے کا کارخانہ۔ (۱) کروڑی نظے میں جانے کا دروازہ ہے۔ دور آخری مغلیہ کا بنا ہوا ہے۔ یہ دراصل نواب وزیر کے گنج کا پھاٹک تھا اب یہ مقام محلہ کرؤوری کہلاتا ہے۔ (۲) دروازہ کوچہ رجنا بیگم۔ محمد شاہ کے زمانے کا۔ رضی النسار بیگم کو غالباً بگاڑ کر رجنا بیگم کرلیا ہے جو نواب قمرالدین خاں کی صاحب زادی تھیں یہ دروازہ بیگم صاحب کی حویلی کا تھا جو ایک جزو تھی نواب قمرالدین خاں کے مکان کا۔ (۳) کوچہ فتح النسا بیگم کے سرے پر۔ محمد شاہ کے زمانے کا۔ یہ بیگم نواب قمرالدین خاں کی تیسری صاحبزادی تھی یہ دروازہ بیگم صاحب کی حویلی کا تھا جو ایک جزو تھی نواب قمرالدین خاں کے مکان کا اب وہ حویلی تو باقی نہیں مگر اس جگہ جو مکانات بن گئے ہیں وہ کوچہ انھیں کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔

اجمیری دروازہ ۱۱۳۹-۱۷۲۴ء شہر کے جنوب و مغربی جانب کی فصیل میں تھا۔ اب فصیل تو توڑ تاڑ ڈالی گئی صرف دروازہ برقرار رکھا ہے۔ جو شہر پناہ کے

دوسرے دروازوں کی طرح شان دار ہے۔ دروازے کے سامنے احاطے کی دیوار کھینچ کر آمد و رفت کا رستہ بند کر دیا ہے اور اسی کے سامنے عربک سکول ہے۔ پہلے اجمیری دروازے کے جو طرف مکان ہی مکان تھے اب جدھر دیکھو صاف سپاٹ میدان ہے۔

قاضی کے حوض سے بازار سرکی والاں۔ لال کنواں۔ کٹرہ بڑیاں سے ہوتے ہوئے بانس تک

قاضی کا حوض ۱۲۶۴ھ

قاضی کے حوض کے تھانے کے پاس چوراہے کے نزدیک یہ حوض تھا جہاں اب حوض پاٹ کر ترکاری کا مارکٹ بنا دیا گیا ہے۔ یہ باؤلی کی طرح کا ایک بہت بڑا حوض تھا جسے معتبرالدولہ نے ۱۲۶۴ھ میں بنوایا۔ اس میں نہر آتی تھی۔ نہر بند ہوئی تو حوض بے کار ہو گیا نہر کے ساتھ وہ بھی نذار د ہو گیا۔ اس پر ایک سنگ مرمر کی تختی پر یہ قطعۂ تاریخ تھا:-

آب در منبع ایں نہر جدید | کرد چوں معتبرالدولہ رواں
ہاتفِ غیب بوصفِ فیضش | گفت تاریخ بہ فیض رساں

اب یہ بازار قاضی کے حوض کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقام پر چوراہا ہے ایک سڑک چاوڑی بازار سے آکر ملتی ہے جو سیدھی اجمیری دروازے کو چلی جاتی ہے دوسری سیتارام کے بازار سے آتی ہے اور بازار سرکی والاں لال کنوئیں بڑیوں کے کٹڑے سے ہوتی ہوئی نئے بانس سے نکل کر کھاری باؤلی کے بازار کے شارع عام میں جا ملتی ہے۔ اس بازار کے شروع سے آخر تک داہنے بائیں یہ گلیاں ملتی ہیں۔

داہنی طرف گلی حکیم بقا جس کا دوسرا رخ چاوڑی کی طرف نکلتا ہے اور رستہ چرخے والوں میں بھی نکلتا ہے۔ محلہ بیل چھادو جس میں چھیتہ سوئی جی۔ (اسی میں منشی بلاقی داس صاحب کا میور پریس ہے) اس میں سے رستہ شیر افگن خاں کی بارہ دری میں بلی ماروں میں جا نکلتا ہے بکر بسٹ ہال۔ گلی جاجم پوریاں۔ لال دروازہ کٹڑہ قاضی۔ حویلی میر افضل۔ دواخانہ ہمدرد جس کے سرپرست حکیم شفاء الملک مرحوم تھے۔ گلی قاسم جان جس کے اندر نواب ضیاء الدین کی

حویلی - مکان خان بہادر ہادی حسین خاں صاحب مرحوم - کوٹھی نواب صاحب لوہارو - مرغ خانہ جس میں نواب احمد سعید خاں صاحب رہتے ہیں - احاطہ کالے صاحب راس میں پنجابی رہتے ہیں، مکان نواب شجاع الدین خاں - کوٹھی نواب احمد سعید خاں جس میں پنجابی رہتے ہیں - مدرسہ عنایت اللہ خاں - دواخانہ ہندوستانی - اب پھر سڑک پر آئیے - مدرسہ میر جملہ اب مدرسہ باقی نہیں ہی صرف نام ہی نام رہ گیا ہی اور محلہ اسی نام سے مشہور ہی - لال کنواں بستیع ڈسپنسری - بازار لال کنواں - گلی اچار والی - گلی میر جملہ - گلی چابک سواراں - کٹرۂ غلام محمد خاں - گلی ستیہ زمان شاہ - کٹرۂ بڑیاں میں گلی کندہ لکتاں جس کے اندر ایک بہت پرانی قبر سنگ مرمر کی ہی اور ایک چوبی کٹہرا بعد کا بنا ہوا ہی لوگ کہتے ہیں کہ پہلے اس قبر کا بہت بڑا چبوترا سنگ مرمر کا تھا لوگوں نے مکان بڑھا بڑھا کر سارا چبوترا داب لیا - اس قبر کی لوح سنگ مرمر کی ہی جس پر کتبہ ہی لیکن افسوس ہی کہ پتھر ٹوٹ گیا جس کی وجہ سے پڑھا نہیں جاتا نہ صاحب قبر کا پورا نام باقی ہی البتہ سنہ صاف ہی - قبر کے تعویذ پر طغری کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کا ہی جس کے نیچے کلمۂ طیبہ ہی - باقی کتبہ یہ ہی -

هوالله

زہی مرقد خاں خاندار ....ر

سپہدار دارا .... سلطان شدہ

...... خدا و محمد .... تاریخ .....

شد سال رحلت غلا ... ۱۱۶۳ ......

کلن کا حمام - اب پھر بڑیوں کے کٹرے کے نکڑ پر آکر نئے بانس کی طرف چلئے تو یہ گلیاں ملیں گی - گلی تماشہ کلاں جس کے اندر کوچہ نواب مرزا کا دوسرا سرا چھتے میں سے گذر کر گلی کلالاں میں سے ہوتے ہوتے بڑیوں کے کٹرے میں جا ملتا ہی -

پھر نئے بانس کی سڑک پر آئیے :- یہاں سے بازار نیا بانس شروع ہوتا ہی جس میں گلی تماشاں خورد ہی آگے کھاری باؤلی کا بڑا بازار ہی -

بائیں طرف - منڈی نمک - لال مسجد - تھانہ حوض قاضی - حویلی بدل بیگ خاں - پھاٹک الٰہی بیگ خاں - کوچۂ نور اللہ خاں - کوچہ پنڈت جس میں گلی سوار خاں جس میں خان صاحب مولوی سید احمد صاحب

مصنف فرہنگِ آصفیہ رہتے تھے۔ مسجد سوار خاں۔ گلی چاہ جنگلی جو محلہ نیاریوں میں جانکلتی ہے۔ گلی حافظ عزیز الدین وکیل۔ مکان پیرجی عبد الصمد صاحب۔ مکان مولوی سید عبد اللہ شملے والے۔ کرزن پریس یہیں اُمراؤ مرزا صاحب حیرت رہتے ہیں۔ محلہ شاہ گنج۔ محلہ گھوسیاں شیش محل۔ گلی شاہ تارا۔ (یہاں اجمیری دروازے کی سڑک ملتی ہے) اب پنڈت کے کوچے سے باہر پھر شارع عام پر آئیے۔ کٹڑہ ہیجڑاں۔ کمرہ آدینہ بیگ خاں جس میں جناب حکیم رضی الدین خاں صاحب شفار الملک مرحوم کا دولت خانہ ہے اور سید محمد میر صاحب وکیل میرٹھ والے بھی یہیں رہتے ہیں۔ دواخانہ ڈاکٹر عنایت الرحمان عرف فرانس والے۔ محلہ رودگراں اس کے اندر سید منصور علی کی قبر اور شرف الدولہ کے مدرسے کا دروازہ اور مدرسہ نواب ارادت مند خاں شرف الدولہ کی قبر۔ احاطہ ججن صاحب۔ گلی میر مداری۔ گھنٹے کا کنواں۔ مستنصر پریس جس کے آگے فراش خانے کی کھڑکی ہے۔ پھر شارع عام پر دواخانہ ڈاکٹر عطاء اللہ خاں جس کے پیچھے ایک چھوٹی سی گلی نجاراں کی ہے کٹڑہ شیخ چاند۔ گلی بہرام بیگ۔ کٹڑہ سپھدار خاں۔ کمرہ زینت محل۔ گلی مردھان فراش خانہ جس کے اندر گلی سموساں۔ نگینہ محل جس میں مدرسہ منظرالاسلام ہے۔ گلی انباوالی۔ گلی راجان۔ گلی چاہ شیریں یا کوچہ حکیم حامد خاں۔ مکان حکیم بدرالدین خاں مرحوم۔ جن کے صاحب زادے حکیم شجاع الدین خاں مطب کرتے ہیں۔ چھتہ راجاں۔ کٹڑہ شہنشاہ۔ کٹڑہ ھندہ۔ مرزا اکبر علی خاں مرحوم قرولی والے کا مکان۔ مکان خان بہادر ڈپٹی ناصر علی خاں صاحب۔ چہ ہیا کا چھتہ۔ گلی امینہ بیگم۔ سنگی بیگ کا پھاٹک۔ گلی خان بیگ خاں۔ کٹڑہ دھوبیاں۔ گلی آخونجی والی۔ فراش خانے کے باہر۔ مسجد تہور خاں کا بازار۔ گلی بیباں۔ گلی سیرس والی۔ حمام عبد الرحمٰن۔ مسجد تہور خاں۔ گلی کناری والی۔ کوچہ سنجو گی رام جس میں اہل ہنود کے مندر ہیں جن کی تفصیل فہرست میں ہے۔ نیا بانس۔ کھاری باؤلی۔ بنڑیوں کے کٹڑے میں بائیں طرف گلی کلالاں۔ گلی کمہاراں۔ حمام بید و زیر مسجد فتح پوری امپیریل ٹرکش باتھ جو دلی کے تمام حماموں میں سب سے بہتر ہے۔ دروازہ جنوبی مسجد فتح پوری۔

بکرسٹ ہال ایک پختہ عمارت کیبرج مشن کے متعلق ہے اس میں پادری صاحبان لکچر دیا کرتے ہیں اور لوگوں کو متوجہ کرنے کا سہل لٹکا یہ ہے کہ اخبار

منت دیکھنے کو ملتا ہے۔ ع چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار کا معاملہ ہے۔

حویلی عبدالرحمٰن خاں کا دروازہ

۱۲۲۱ھ
۱۸۰۶ء

بازار سرکی والاں میں اس عالی شان دروازے کی پیشانی پر سنگ مرمر کی تختی پر سیاہ حروف سے "حویلی عبدالرحمٰن خاں صاحب ۱۲۲۱ھ" کندہ ہے۔ عبدالرحمٰن خاں عہد شاہ جہانی کے ایک معزز اور متمول رئیس شاہ جہان آباد کے تھے۔ منشی کرم اللہ خاں عرف ننھے خاں صاحب اس کے مالک تھے اب اُن کا انتقال ہو گیا۔ بی بی اُن کی مالک ہیں۔

لال دروازہ

بازار لال کنواں پنڈت کے کوچے سے ذرا آگے بڑھ کے کرچونکہ اس پر برجی کا سرخ رنگ ہو رہا ہے اس سبب سے لال دروازہ مشہور ہے۔ دراصل یہ مرزا مغل بیگ خاں کی حویلی کا دروازہ تھا۔ اب یہیں نواب سراج الدین خاں سائل دہلی کے مشہور شاعر کا دولت خانہ ہے۔

نواب سراج الدین خاں صاحب سائل

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

آپ نواب شہاب الدین خاں صاحب مرحوم کے منجھلے صاحب زادے اور جناب نواب فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کے داماد ہیں۔ نہایت وجیہ و شکیل جن کے چہرے ہی سے آثار شرافت و نجابت و امارت چمکتے ہیں۔ ذی لیاقت خوش گفتار۔ با مذاق۔ متواضع منکسر المزاج اخلاق حسنہ کے پُتلے ہیں۔ کلام ان کا غالب اور داغ کا رنگ لیے ہوئے ہے مستند اور قادر الکلام اپنے وقت کے باکمال شاعر ہیں۔ کلام میں علاوہ لطف سخن کے ایک بڑی صفت یہ ہے کہ زبان سے نکل کر دل میں اُتر جاتا ہے۔ پڑھنے کا طرز خاص ایسا ہے کہ جس سے اضعافاً مضاعفہ رونق ہو جاتی ہے یہ طرز اور لہجہ کچھ ایسا مقبول خاطر ہوا ہے کہ بہت سے لوگ اس کا تتبع کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اصل اصل ہی ہے اور نقل نقل ہی۔ آپ کی اہلیہ کو ریاست حیدرآباد دکن سے معقول منصب ہے داغ مرحوم

مغفور کی گودیوں میں پلے ہیں شاعری ان کی میراث ہے۔ اور مجھ سے نسبت خاص یہ ہے کہ میرے قبلہ و کعبہ والد مرحوم کے عزیز تلمیذ ہیں چند رسالے عربی کے ان سے پڑھے ہیں اور بیشتر حضوری کا شرف حاصل کیا ہے۔ پبلک جلسوں میں اکثر آپ اپنی برجستہ نظموں سے آڈینس کی رونق بڑھاتے اور حاضرین کو محظوظ کرتے ہیں۔

آپ کا کلام سننے سے سیری نہیں ہوتی یہی دل چاہتا ہے کہ کچھ اور پڑھیں۔

آپ کے کلام کا نمونہ دینا ایک مشکل کام ہے کیوں کہ سارا کلام آراستہ اور جواہر میں تولنے کے قابل ہے جس غزل پر نظر پڑتی ہے وہی دل میں کھب جاتی ہے۔ اس لیے انتخاب کو تو میں نے چھوڑا اور آپ کے قلمی دیوان میں سے کوئی سی بھی ایک غزل لے کر نمونۃً پیش ہے اس سے شائقین اندازہ کرسکتے ہیں کہ شستگی زبان۔ محاورہ بندی۔ نفاست نزاکت۔ معاملہ نگاری کونسی بات ہے جو حضرت سائل کی زبان پر نہیں ہے۔

غزل

غیر سے روٹھے رہے تکرار ہو کر رہ گئی — گردشِ قسمت نے لیں بیدار ہو کر رہ گئی
فیضیابِ زخم دامن دار ہو کر رہ گئی — یعنی پھولوں کی چھڑی تلوار ہو کر رہ گئی
اپنے کوچے میں اٹھایا حشر عالم چھوڑ کر — دو قدم ہی شوخیِ رفتار ہو کر رہ گئی
جس جگہ تھے داغ جس جا زخم تھے ناسور تھے — حسرتِ دل بھی وہاں آزاد ہو کر رہ گئی
قتل کی نیت میں قاتل کس لیے آیا خلل — یہ بتا دے کیوں طلب تلوار ہو کر رہ گئی
غیر کی گردن میں کافر کیش کی باہیں پڑیں — کیا اجل اس کے گلے کا ہار ہو کر رہ گئی
پہلے تھی بجلی کی جائی اب لہو کی آب ہے — نامزد تیغِ ستم گلنار ہو کر رہ گئی
آج واعظ نے فقط ذکر قیامت ہی کیا — تیری شرحِ شوخیِ رفتار ہو کر رہ گئی
شرم آتی ہے یہ سن کر دل بتوں کو دے دیا — یوں کہو دل پر خدا کی مار ہو کر رہ گئی
میکشو کیوں ہجو کی پر شیخ کی پگڑی نہ لی — جاؤ بس تم سے ہمارے یار ہو کر رہ گئی
جھٹپٹا ہوتے ہی قاصد کہہ گیا فرصت نہیں — عیش کی شب میری شامِ تار ہو کر رہ گئی
ابنِ عمران کا فسانہ سن کے جی سا چھٹ گیا — دل میں پیدا حسرتِ دیدار ہو کر رہ گئی
آپ فرماتے تھے اب ہم کریں گے دیکھ بھال — دل ہی خاطرِ بیمار ہو کر رہ گئی

قید طاعت کی ملامت مکافردین دار میں
سیمہ بن کر رہ گئی زنار ہو کر رہ گئی
تا قیامت فتنے اُٹھیں گے ترے کپڑے سے رُوئی
ہو گئی اور شوخی رفتار ہو کر رہ گئی
جور گلچیں سے اُڑے بلبل کے اس درجہ حواس
شاخِ گل پر نقش بر دیوار ہو کر رہ گئی
اُن کے تیور دیکھ کر سائل کیا ہوتا سوال
بات اتنی اس قدر دشوار ہو کر رہ گئی

پھاٹک بدل بیگ خاں

یہ حویلی بدل بیگ خاں کا ایک دروازہ لب سڑک بازار سرکی والاں ہی جو دور آخری مغلیہ کا بنایا ہوا ہی۔ اب مسٹر جسٹس محمد رفیق کے قبضے میں ہی اس کے اندر ایک وسیع اور خوش نما کشادہ چبوترے پر ایک بارہ دری بنی ہوئی ہی۔

حویلی بدل بیگ خاں

اس حویلی کا دوسرا پھاٹک لب سڑک ہی جس کے مالک محمد سلام اللہ خاں خلف خان بہادر مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ہیں۔ اندر بہت بڑی حویلی وسیع صحن اور نہایت دل کشا دالان ہیں۔ موجودہ دروازہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے ۱۲۷۰ھ ۵۴-۱۸۵۳ء میں بنوایا تھا۔ جس پر یہ کتبہ ہی:-

ھوالحکیم

نہادہ بنا احسن اللہ خاں
سرِ راہ بدانساں درِ دلکشا
کہ غالب پی سالِ تاریخ او
رقم زد "درِ دلکشا حبذا"
۱۲۷۰
فقیر محمد امیر رضوی

یہ دروازہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب کا بنوایا ہوا ہی جو بہادر شاہ ثانی کے عہد کے طبیب شاہی تھے۔ انھوں نے یہ مکان لے کر یہ دروازہ لب سڑک بنوایا۔ بدل بیگ خاں جن کے نام سے حویلی مشہور ہی اُن کا اصلی نام ترکی جنگ تھا یہ اوائل زمانۂ شاہ عالم ثانی (۱۱۷۳ھ-۱۲۲۱ھ ۱۷۵۹ء-۱۸۰۶ء) میں سمرقند سے آئے تھے اور امیر الامرا مرزا نجف خاں کے تحت میں رسالدار مقرر ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے خاندان والوں سے ہرات کے گورنر سے کچھ ان بن ہو گئی تھی اس لیے ہرات چھوڑ کر دلی

آسے۔ ان کا موروثی پیشہ طبابت نہ تھا بلکہ آپکے والد نے طبابت اختیار کی۔
حکیم احسن اللہ خاں صاحب بڑے نامی گرامی اور پایہ کے آدمی تھے۔ آپ کو اکبر شاہ ثانی
نے طبیب شاہی مقرر کیا اور خطاب عمدۃ الملک حاذق الزماں کا دیا بہادر شاہ ثانی
کے عہد میں آپ کا مرتبہ اور رسوخ اور بڑھا اور آپ کو احترام الدولہ عمدۃ الحکما
معتمد الملک حاذق الزماں ثابت جنگ کا خطاب ملا۔ بہادر شاہی عہد میں آپ کا
وہ رسوخ اور اعتماد تھا کہ کوئی کام بدون آپ کی صلاح و مشورت کے نہ ہوتا تھا۔
حکیم صاحب کا ایک مکان تو دلی میں بھی ہے۔ دلی والا مکان در اصل نواب قمر الدین خاں کا
بنایا ہوا ہے۔ اس حویلی کا کیا ٹھکانا تھا یہاں سے اجمیری دروازے تک اس کا سلسلہ
چلا گیا تھا اور اسمیں متعدد قطعات تھے۔ نواب صاحب کا سارا خاندان اور حشم خدم
سب اسی میں رہتے تھے۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد حویلی کے کئی ٹکڑے
ہو گئے جن میں کا سرت ایک قطعہ نواب بدل بیگ خاں کو ملا اور اب بھی انھیں کے نام سے مشہور ہے۔

حمام پھر اس مکان کو حکیم احسن اللہ خاں نے لیا اور حکیم صاحب نے اسی کے احاطے میں
ایک حمام طیار کیا۔ حمام کے اندر ایک دیوار میں سنگ مرمر کی تختی پر یہ
کتبہ لگا ہوا ہے۔

ہو الحکیم

(۱) مرتب گشت ایں حمام دلخواہ — بتعمیر فقیر احسن اللہ

محمد امیر رضوی

سنگ مرمر کی تختی پر باہر کی دیوار پر یہ دوسرا کتبہ ہے:۔

(۲) بہ علی احسن اللہ خاں بنا کرد — یکے گرما بقدسی نشیمن
پے سالش کہ یارب جاوداں باد — بفرق بانی خود سایہ افگن
بجستم روے لفظ آں گاہ گفتم — شدہ تعمیر ایں حمام احسن
سمت ۱۹۰۹ سنہ ۱۸۵۲ء — ۱۶ ج سنہ ۱۲۶۸ھ

وزیر الملک اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کے والد کا نام اعتماد الدولہ امین خاں تھا جو مشہور
میر جملہ کے بیٹے تھے۔ اعتماد الدولہ امین خاں کی وفات کے بعد نظام الملک عہدۂ

جلیلۂ وزارت سے سرفراز ہوے لیکن تعلقات درباہ نہ ہونے سے خود دست کش ہو گئے اور قمر الدین خاں کو محمد شاہ نے سنہ جلوس ششم میں قلمدان وزارت سپرد کیا چنانچہ تا بدم مرگ وہ اپنے عہدے پر قایم رہے آخرکار سرہند پر احمد شاہ ابدالی کی لڑائی میں گولی لگ کر زندگی اور وزارت دونوں کا ساتھ ہی ساتھ خاتمہ ہوا۔

کٹڑہ آدینہ بیگ خاں

کٹڑہ آدینہ بیگ خاں کا دروازہ لال کنوئیں بازار میں دور آخر مغلیہ کا بنا ہوا ہی جس کے قابض حال حکیم

ناصر الدین خاں صاحب عرف چھٹو میاں

صاحب زادۂ حکیم رضی الدین خاں صاحب شفار الملک مرحوم ہیں۔ اندر بہت سے مکانات اور چھوٹی چھوٹی تنگ گلیاں ہیں۔ حکیم صاحب موصوف کا دولت خانہ **شفامنزل** اور مطب بھی یہیں ہی۔

گلی قاسم جان

دروازۂ حویلی کالے صاحب۔ دور آخر مغلیہ۔ اب کالے صاحب کی حویلی تو باقی نہیں محلہ اسی نام سے مشہور ہو گیا ہی۔ یہ دروازہ اور حویلی نواب قاسم خاں کی بنائی ہوئی تھی جن کا ذکر نواب احمد خاں کی مسجد کے ذیل میں آیا ہی۔ یہ حویلی بعد میں حاجی غلام نصیر الدین کے قبضے میں آئی جن کو لوگ میاں کالے صاحب کہا کرتے تھے اور جو اکبر شاہ ثانی اور اُن کے جانشین کے زمانے میں تھے آپ بڑے پرہیزگار اور مقدس بزرگ تھے

نواب احمد سعید خاں صاحب طالب

آپ نواب محمد ضیار الدین خاں صاحب بہادر سابق رئیس لوہارو کے صاحب زادے اور جاگیر دار لوہارو ہیں۔ نہایت پابند وضع خوش رو اور خوش خو ہیں۔ ہر شخص آپکے اخلاق وسیع اور صفت انکسار کا مداح ہی۔ آپ نہایت ذکی۔ ذہین ہیں۔ ذی علم۔ خوش طبع۔ خوش مزاج۔ موزوں طبع۔ شاعر بلند خیال امیرابن امیر ہیں۔ طالب تخلص کرتے ہیں۔ بڑے پرگو شاعر ہیں۔ مرزا غالب مرحوم سے تلمذ رکھتے ہیں۔ پانسو روپیہ ماہوار ریاست لوہارو سے وظیفہ پاتے ہیں۔ بلحاظ تعزز خاندانی گورمنٹ نے آپ کو اکسٹرا اسسٹنٹ کے عہدۂ جلیلہ پر مقرر کیا تھا مگر نوکری کی پابندی سے خود آزادی حاصل کرلی۔ آپ کا کلام نمونۃً ذیل میں درج کیا جاتا ہی

ناظرین اس سے آپ کی قادر الکلامی کا اندازہ کر سکتے ہیں ؎

اَلِف اللہ کا جس دم ہوا عنوانِ دیواں تھا　　تو ہر مصرع مکانِ لامکاں کا سرو بستاں تھا

سنو صاحب دلو مجھ سے کہ کیا رخسارِ جاناں تھا　　صحیفہ ابن آزر کا۔ ابو القاسم کا قرآں تھا

محمد اور احمد۔ جیسے ہیں الحمد سے مشتق　　یوں ہی نورِ محمد اشتقاقِ نورِ یزداں تھا

کھلی احباب پہ حق کی طرف سے تیری یکتائی　　مدیم المثل تجھکو بھی سمجھنا عین ایماں تھا

شبستانِ حقیقت میں جو بزم انبیا دیکھی　　تو سب میں رحمۃ للعٰلمیں شمعِ فروزاں تھا

بھلا رازِ محبت کیوں کہ چھپتا اس کی محفل میں　　سراسر سینہ بریاں تھا۔ برابر دیدہ گریاں تھا

نظر افروزِ عالم تھی ازل سے یہ غزل **طالب**
کہ مطلع مہرِ رخشاں اور مقطع ماہِ تاباں تھا

اگرچہ دل ہمارا آتشِ فرحت سے سوزاں تھا　　ہوا سے ضبط سے لیکن چراغِ زیرِ داماں تھا

کھلی تھیں جب تلک آنکھیں تو یہ عالم گلستاں تھا　　مگر جب ہو گئیں وہ بند۔ پھر خوابِ پریشاں تھا

لگی تھی آگ یاں۔ ہر رونگٹے میں سرکشی لے کے　　مگر ان کے لیئے نظارۂ سروِ چراغاں تھا

بہار آئی۔ یہ سن کر یوں ہوئی محوِ طرب بلبل　　کہ ہر کنجِ قفس اس کی نظر میں اک گلستاں تھا

مصیبت کا کبھی ہوتی ہے باعث پاک دامانی　　فروغِ عارضِ عصمت۔ خوفِ ماہِ کنعاں تھا

وہ سوتے بے تکلف تھے نگاہِ شوق تھی بیباک　　پراگندہ پڑے تھے گل۔ کھلا گلچیں کا داماں تھا

ہمارا جذب۔ ظاہر میں بتاتے تنگ ظرفی ہیں　　کہ اُن کا تیر جو دل توڑ کر نکلا پر افشاں تھا

یہ نکتہ ہم نے معلوم کیا۔ ہر اک کام کی تہ میں　　نہیں چاہا تو وہ دشوار تھا۔ چاہا تو آساں تھا

بنا ہے آج **طالب** صوفیٔ صافی۔ مگر کل تک　　ہوائے نفس میں اڑتا۔ غریقِ بحرِ عصیاں تھا

نواب شجاع الدین خاں صاحب تاباں

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے **داغ**
اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں

آپ نواب شہاب الدین خاں صاحب مرحوم کے خلف اصغر ضیاء الدین خاں نیر کے نبیرے ہیں۔ نہایت خوش خصال شیریں مقال۔ خوش طبع۔ خلیق۔ فن شعر میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں چار بیاض قلمی ضخیم مختلف اقسام کی نظموں سے مملو آپ کی یادگار ہیں۔ شاعری کا خوب ملکہ ہے۔ فکر سخن کا یہ حال ہے کہ فی البدیہہ دس بیس شعر کہہ دینا آپ کے آگے کچھ بات نہیں

نواب حسین علی خاں مرحوم شاداں اور انور اور داغ سے آپ کو تلمذ ہے۔ اب خود استادی کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ افسوس کہ باوجود کوشش کے بھی کلام کا نمونہ میسر نہ ہوا۔

سید منصور علی کی قبر

محلہ رودگراں۔ محاذی میدان والی مسجد۔ ایک چھوٹے سے کٹہرے کے اندر تین قبریں ہیں۔ بیچ میں سید منصور علی کی اور اِدھر اُدھر آپ کے بیٹے اور بیوی کی۔

شرف الدولہ کے مدرسے کا دروازہ اور مدرسہ

رودگروں کے محلے میں ارادت اللہ خاں جن کو لوگ ارادت مند خاں بھی کہتے تھے اُن کے مدرسے کا ایک دروازہ ہے جس کا کوئی خاص نام نہیں ہے۔ یہ محمد شاہ کے عہد کے امرا میں سے تھے اور ان کا خطاب شرف الدولہ تھا۔ اب نرا دروازہ ہی دروازہ باقی رہ گیا ہے۔ مدرسہ کی عمارت تباہ ہو کر اب اس محلے کا نام ہی محلہ مدرسہ ارادت اللہ خاں پڑ گیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں مدرسہ اس جگہ تھا۔ سلطنت محمد شاہ کے پانچویں سنہ جلوس میں نواب صاحب کو راجہ اجیت سنگھ کی مہم پر بھیجا گیا تھا جس نے علم بغاوت بلند کر کے اجمیر اور سانبھر پر قبضہ کر لیا تھا اور بڑھتے بڑھتے نارنول تک آ گیا تھا۔ نواب صاحب کے ساتھ راجہ جے سنگھ سوائی۔ محمد خاں بنگش۔ گوپال سنگھ راجہ بھدادر بھی تھے۔ لشکر کی تعداد ایک لاکھ سوار اور دو سو زنجیر فیل تھے۔ راجہ اجیت سنگھ کے آ رے گئے ہوش و حواس جاتے رہے۔ سراسیمہ ہو گیا اور سر پیاؤں رکھ کر نارنول سے نو دو گیارہ ہو گیا اور گڑھ پٹی کے قلعے میں جا کر پناہ لی اور چند دنوں وہیں چھپا رہا پھر موقع پا سانڈنی سوار ہو جودھ پور جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے صلح کا پیغام دیا اور اپنے بیٹے ابھے سنگھ کو بطور یرغمال کے دربار شاہی میں بھیج دیا۔

نواب ارادت مند خاں شرف الدولہ کی قبر

اسی جگہ دوہرے چبوترے پر نواب صاحب کی قبر ہے۔ نیچے کا چبوترا سنگ سرخ کا ہے اور اوپر کا

مع قبر کے تعویذ کے بالکل سنگ مرمر کا ہے۔ قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ نیچے والے چبوترے پر دو قبریں آپ کے اقربا میں سے کسی کی ہیں جن میں سے ایک پر ۱۱۸۱ھ کندہ ہے (۱۷۶۷ء)

نواب موسلےٰ خاں کی قبر
۱۱۸۱ھ

نواب ارادت مند خاں کی قبر سے مغرب کی طرف اسی نیچے والے چبوترے پر نواب موسلی یار خاں کی قبر ہے جس پر یہ کتبہ ہے:-

آیاتِ قرآنی

چوں سفر کرد از جہاں نوابِ سی یار خاں | کرد ماتم ہر یکے از دوستانش بیگماں
سالِ تاریخش چو جستم از خیالِ خویش گفت | باد یارب قصر دلگزار ایں در آنِ آں

بتاریخ ششم ماہ محرم ۱۱۸۱ھ ہجری از دار (ا) لفنا بدار بقا رحلت نمود

(۱۹ ارمارچ ۱۷۶۷ء)

احاطہ مجن صاحب کا دروازہ

آدو دگروں کے محلے میں۔ شاہ جہاں کے زمانے کا بنا ہوا ہے۔ احاطہ اب نہیں رہا صرف مکانات ہیں اور یہ دروازہ باقی ہے۔ اس میں زردوز وغیرہ پیشہ ور رہتے ہیں۔

لال کنواں

بدل بیگ خاں کی حویلی کے آگے سنگ سرخ کا بنا ہوا ایک کنواں تھا جو اب بھی ہے مگر اب لال ہرمچی کا رنگ کیا ہوا ہے اور اسی کے پاس لال کنوئیں کی برینچ ڈسپنسری (شفاخانہ) ہے۔ یہ سارے کا سارا بازار اس کنوئیں ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

کٹرہ سپہدار خاں کا پھاٹک
۱۲۶۲ھ
۱۸۴۶ء

دور آخری مغلیہ کا بنا یا ہوا لال کنوئیں کے بازار میں ہے اب پٹیالے سٹیٹ کے علاقے میں ہے۔ دراصل یہ دروازہ زینت محل کا ہے۔ اب اس کٹہرے میں مکانات ہیں اور ایک محلے کی حیثیت رکھتا ہے۔

زینت محل
۱۲۶۲ھ
۱۸۴۶ء

یہ محل باہر سے تو کچھ معلوم نہیں دیتا مگر اندر کی محل سرائیں بہت عالی شان کشادہ اور وسیع ہیں جیسے کہ شاہی عمارات میں ہوتی ہیں۔ لب سڑک صرف ایک دو منزلہ کمرہ ہے جو زینت محل کے کمرے

کے نام سے مشہور ہی۔ اس کا بڑا عالی شان پھاٹک لب سڑک ہی۔ یہ محل سارے کا سارا مع کمرے کے پٹیالہ سٹیٹ کے قبضے میں ہی۔ شاہی کر غدر کے بعد خیر خواہی سرکار میں ملا ہی۔ اس کے دروازے پر ایک سنگ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ بہادر شاہ بادشاہ آخری کا طبع زاد لگا ہوا ہی۔ زینت محل بہادر شاہ ثانی سلطنت مغلیہ کے آخر بادشاہ کی بیگم تھیں۔

کرد اے ظفر زینت محل تعمیر تصرب بدل۔ شد بر محل سال بنائیں خانۂ زینت محل،

فراش خانہ تال کنوئیں بازار کی سڑک پر صرف دروازہ ہی دروازہ رہ گیا ہی اندر ایک وسیع محلہ ہی جس میں مختلف محلے ہیں آخری سرے شہر کے جنوب مغرب کی طرف فراش خانے کی کھڑکی تھی جس میں سے پہاڑ گنج اور قدم شریف کو رستہ جاتا تھا اب یہ کھڑکی اور فصیل سب توڑ کر میدان صاف کر دیا گیا اور ایک چوڑی سڑک لاہوری دروازے سے اجمیری دروازے تک نکال دی۔

قلعے کے لاہوری دروازے سے چاندنی چوک ہوتے ہوئے فتح پوری کی مسجد تک

بازار جانب دارالسلطنت لاہور یہ ایک بازار تھا ایسا وسیع کہ عرصۂ جہان بھی اس کے آگے تنگ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں ہر قسم کے سودے والوں کی دکانیں تھیں اور مال و اسباب اور اشیائے نادرہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ بازار قلعے کے لاہوری دروازے سے فتح پوری کی مسجد تک تھا مگر پہلے اس کے حصوں کے نام الگ الگ تھے۔ پہلا حصہ اردو بازار کہلاتا تھا اس کے آگے ترپولیہ در کوتوالی بازار تھا پھر چاندنی چوک اور اس سے بڑھ کر بازار فتح پوری۔ غرض یہ کہ یہ بازار من اولہا الی آخرہا چالیس گز عریض تھا۔ بیس گز ادھر اور بیس گز ادھر اور بیچ میں سرتاسر نہر جاری تھی

اور گرد نہر کے دو طرفہ درختان سایہ دار کی قطار یہاں سے وہاں تک تھی اور اس بازار میں علاوہ دکانوں کے بڑے بڑے محل اور عجیب و غریب عمارات تھیں۔

اُردو کا مندر ۱۲۵۶ء

قلعے کے لاہوری دروازے کے پاس لالہ رام چند کی تولیت میں مندر ہے۔ جو شاہجہاں کے عہد کا ہے بنا ہوا اس شہر میں جینیوں کا یہ سب سے قدیم مندر ہے۔ چونکہ یہ مندر بادشاہی جینی فوجی لوگوں کا تھا اس سبب سے اردو کا مندر کہلانے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے ایک مرتبہ یہاں کی نوبت بند کرا دی تھی لیکن باوجود حکم شاہی کے بھی نوبت بجا کی۔ مگر کوئی شخص نوبت بجاتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ بادشاہ سلامت خود بہ نفس نفیس ملاحظہ کو تشریف لائے اور جب اطمینان ہو گیا کہ واقعی اس مندر میں کوئی بھی نہیں رہتا تو حکم صادر فرمایا کہ یہ نوبت بدستور بجا کرے کسی مزاحمت کی ضرورت نہیں۔ اس مندر کی بنا کی نسبت یہ مشہور ہے کہ پہلے یہ لشکری مندر تھا اور صرف ایک راؤٹی میں کسی جینی سپاہی نے اپنی ذاتی پوجا کے لیئے ایک مورت رکھ لی تھی بعد میں یہاں مندر کی عمارت بن گئی۔ بہرحال یہ مندر مقامی لوگوں کے نزدیک بڑی مقدس جگہ خیال کی جاتی ہے۔ بائیں ہاتھ کی طرف جو ایک بڑا مندر بنا ہوا ہے وہ سمت ۱۹۳۵ میں سنگ مرمر کا بنایا گیا اور اس میں جو مورتیں ہیں سب زمانہ حال کی ہیں۔ ہمارے محاذ میں پرانا مندر ہے جس میں تین مورتیں ہیں۔ بیچ والی مورت پارس ناتھ کی ہے۔ یہ سب سمت ۱۵۴۸ کی ہیں جو سوا چار سو سال کی قدامت کی پائی جاتی ہیں۔

اپا گنگا دھر کا مندر غالباً ۱۸۶۱ء

قلعے کے لاہوری دروازے کے پاس یہ مندر ہے جو لالہ بھولو مل کی سپردگی میں ہے۔ مندر کے پھاٹک پر دائیں بائیں یہ کتبہ ہے:-

(جینی دروازہ - کھنّا (بخط ناگری) اور صرافی خط میں بھی یہی الفاظ ہیں) سیدھے ہاتھ کی طرف:- Stairs and gate built by Madho Ram Khanna - انگریزی۔

ترجمہ۔ مادھو رام کھنا کا بنایا ہوا دروازہ اور سیڑھیاں۔ (بخط ناگری)

یہ زینہ اور دروازہ لالہ سر ٹول جی کے پوتے لالہ کشن چندر جی کے بیٹے مادھو رام کھنا نے بنوایا۔ یہیں ایک سطر اُردو کتبے کی بھی ہے جو اسی مضمون کا ہے۔ گیارھویں سیڑھی پر بخط ناگری (۱) زینہ اور دروازہ بشمبر دیال کی یاد میں بنوایا گیا سرگباس ہوئے شراون شکلا سمت ۱۹۴۶ (۲) دویں سیڑھی پر بخط انگریزی- Stairs and gate built in memory of-

ٰ بڑا مندر باہر سے سرخ رنگ کا ہے جس پر انگریزی میں دیگامبر جین پنچایتی بڑا مندر لکھا ہوا ہے۔ ۱۲

Bishambhar Dial Died on 16th August 1907

ترجمہ سیڑھیاں اور دروازہ بشمبر دیال کی یادگار میں بنایا گیا جنھوں نے ۱۶ راگست ۱۹۰۷ء کو وفات پائی - منڈپ کے پاس کی سیڑھی پر بخط انگریزی :- مدن موہن لال کھتری ۱۹۰۳ء اس کے نیچے یہی نام بخط صرافی ایک سطر میں لکھا ہوا ہے اور چاروں برنجی دروازوں پر نام بشمبر دیال کا ناگری میں کندہ ہے۔ یہ مندر ابتدا ر سیندھیا مہاراج کی ملازمت میں ایک مرہٹہ برہمن آپا گنگا دھر نامی کا بنایا ہوا ہے - یہ مندر گوری شنکر یعنی پاروتی اور شیو کا ہے اور انھیں دونوں کی مورتیں اس میں ہیں اور ان کے نیچے شیو کا لنگ اور پاروتی - گنپتی - نندی - گروڈا کی مورتیں ہیں اور ایک طاق میں ہنوماں کی مورت ہے - اس مندر کے ہر سہ جانب مختلف قسم کی شیشہ کاری کا کام ہے - داہنی طرف ایک چھوٹا سا مندر رادہا اور کرشن کا بنا ہوا ہے - بائیں جانب جمناجی کا مندر ہے اور وہیں قریب ایک طاق میں گنپتی کی مورت رکھی ہوئی ہے - یہ مندر تاریخی لحاظ سے اس واسطے زیادہ وقیع ہے کہ مرہٹوں نے جو دہلی پر چند روزہ تسلط کر لیا تھا اُس زمانے کی اُن کی بنائی ہوئی صرف یہی ایک یادگار اس شہر میں ہے - یہ مندر بڑے موقع سے عمدہ مقام پر بنایا گیا ہے کیونکہ یہ اس سڑک پر واقع ہے جو دریائے جمنا کے اشنان کے گھاٹوں کو جاتی ہے - اس میں سارے دن مرد اور عورتیں برابر درشن کو جاتی رہتی ہیں - عمارت کے تین حجرے ہیں اور تینوں میں بافراط سنگ مرمر لگایا گیا ہے جن کے اندر تمام سنہری ملمع چڑھا ہوا ہے - اصلی مندر تو ایسا کچھ بڑا اور عمدہ نہ تھا مگر بعد میں اس میں بہت اضافہ اور آراستگی کی گئی ہے -

پتھر والا کنواں

آسپلینڈ روڈ کے اختتام پر جہاں وہ چاندنی چوک کو مڑتی ہے سراوگیوں کے مندر کے محاذی کرشنا تھیٹر کے پاس ایک قدیم کنواں ہے - اس کا پانی نہایت ہلکا اور شیریں ہونے سے اکثر رؤسائے شہر یہیں کا پانی پیتے ہیں - ہر وقت اس پر بھیڑ لگی رہتی ہے - اس کے پاس ایک کھلا ہوا قطعۂ اراضی ہے جس میں اکثر تماشے کی کمپنیاں سرکس وغیرہ آکر ٹھیرتے ہیں اور نیشنل کانگرس کا وسیع پنڈال بھی ۱۹۱۸ء میں یہیں بنا تھا طبیہ کانفرنس اور اس کے متعلق نمائش بھی یہیں ہوئی تھی - قومی جلسے پبلک پارٹیز اور ایٹ ہوم وغیرہ کی تقاریب اسی میدان میں ہوتی ہیں - چونکہ یہ زمین ملیٹری حدود میں ہے اس کی

ملہ جانب سرک یہ عبارت ہے طبیہ روکار بنمائی گوری شنکر ماشور کا عفذ ۱۸۱۵ء یہی عبارت انگریزی اور ناگری میں ہے - ۱۲

اجازت بھی وہیں سے ملتی ہے۔

بنارسی کرشنا تھیٹر و کرشنا بلڈنگز
سنہ ۱۹۱۱ء

آمد بہار بشد چمن ولالہ زار خوش
دیکھتے ست خوش بہار کہ وقت بہار خوش

یہ تھیٹر نہایت وسیع اور عالی شان دہلی لندن بینک کے پاس ہے اور یہیں عمارت کا ایک بہت بڑا وسیع دو منزلہ نئی تعمیر کا خوشنما بلاک ہے جس میں رنگٹن ٹائپ رائیٹر۔ لارنس اینڈ میو عینک ساز وغیرہ اور کئی یوروپین تجار کی دکانیں ہیں۔ کرشنا تھیٹر کی عمارت میں بڑی وسعت اور گنجائش ہے چنانچہ حال میں مسلم لیگ کے اجلاس اسی میں ہوئے۔ میرے خیال میں پانچ ہزار آدمی اس میں سمائی ہو سکتی ہے کہ نیچے کی نشستوں کے علاوہ ایک کشادہ گیلری بھی ہے۔ برقی پنکھوں اور روشنی کے علاوہ ہر طرح کا سامان آسائش ہے۔ اس سارے بلاک کے دو مالک ہیں بالک رام کھتری اور نول کشور صاحب وکیل۔ اس سڑک کے بائیں جانب کوچہ چودھری ہے جس میں مطبع قیصر ہند ہے آگے کوچہ سکھانند ہے۔ اور سڑک پر پیارے لال صاحب وکیل کا مکان امپیریل بک ڈپو کی دکان

شمرو کی بیگم کی کوٹھی
دلی لندن بینک
شملہ الائنس بینک
پنجاب بینکنگ کمپنی

ای زر تو خدائی لیکن بخدا
ستار عیوبی و قاضی الحاجاتی

یہ کوٹھی چاندنی چوک کے شمال میں ہے جو پہلے شمرو کی بیگم کی کوٹھی تھی یہ ایک کوٹھی نہایت دل کشا اور فرحت بخش بڑی عالی شان بہت عمدہ۔ بہت اونچی کرسی دے کر بنائی ہے اور اس کرسی میں کمرے اور گودام اور شاگرد پیشہ کے لیے بیوتات بنوائے ہیں اس پر یہ کوٹھی ہے کہ ایک وجہ اس کا رشک ارم ہے جس میں بڑے بڑے ہال اور برآمدے ہیں علاوہ خوبی عمارت کے ایک وسیع اور پر فضا باغ ہے جس میں سرو کے درختوں کی خوشنمائی اور نہر کے زور شور سے بہنے کا عجیب لطف ہے۔ اب نہر تو نہیں رہی باغ البتہ موجود ہے۔ اس کوٹھی میں

قدیم سے دلی لندن بنک ہی اسی کوٹھی کے ایک مکان متعلقہ میں ہے۔ بنک کے نیجر مسٹر بیرسفرڈ اُن کی میم صاحب اور لڑکیوں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو باغیوں سے سخت مقابلہ کیا جس میں سارے کا سارا خاندان مارا گیا جو سب کے سب کشمیری دروازے کے پاس والے گرجا میں مدفون ہیں۔ اب حال میں اس میں شملہ الائینس بنک اور پنجاب بینکنگ کمپنی بھی شامل ہوگئے ہیں۔

سمرو کی بیگم

یہ بیگم میرٹھ ضلع کے ایک مسلمان کی لڑکی تھیں جو ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ بیگم صاحب نے ایک سیاح والٹر رین ہارڈٹ (Reinhardt) سے شادی کر لی تھی جو سمرو کے نام سے مشہور تھا۔ سمرو صاحب نے جو فوج کھڑی کی تھی ۱۷۷۶ء میں انھوں نے بادشاہ دہلی کی خدمت میں پیش کر دی اور خود میرٹھ کے قریب سردھنے میں رہنے لگے۔ اسی سال سمرو صاحب نے آگرے میں انتقال کیا جن کی قبر وہاں اب تک موجود ہے اور بیگم صاحب ان کی جگہ سٹیٹ کی مالک بنیں۔ ۱۷۸۱ء میں بیگم صاحب نے رومن کیتھولک فرقہ عیسائیان کا مذہب قبول کیا۔ ان کی فوج کے سردار یوروپین تھے اور ۱۷۸۷ء-۱۷۹۲ء میں جارج طامس ان کی ملازمت میں تھے۔ ۱۷۹۳ء میں بیگم صاحب نے پوشیدہ طور پر اپنے ایک عہدہ دار لی ویسو یا ویسولٹ (le Vaiseau or Vaisoult) سے شادی کر لی۔ یہ بڑا تند خو اور سخت گیر تھا جس کے طرز عمل سے بلوہ ہوگیا۔ لی ویسو جان بچا کر بیگم کو لے کر بھاگا لیکن دونوں گرفتار ہوگئے۔ بیگم نے خنجر بھونک لیا اور ان کے شوہر نے سمجھا کہ ان کا خاتمہ ہوگیا تو اُس نے گولی مار کر اپنے سر کو پاش پاش کر دیا۔ بیگم کا زخم کاری نہ تھا بچ گئیں۔ ان کو گرفتار کر کے نہ صرف معزول کیا بلکہ کئی دن تک توپ کے منہ کو باندھ رکھا۔ طامس صاحب جن سے غدر میں یہ لڑنے کی طیاریاں کر رہی تھیں انھوں ہی نے بیگم کی جان بچائی اور پھر ان کو اپنے مرتبہ سابق پر قایم کرا دیا۔ ۱۸۰۳ء میں ان کی فوج نے اسائی مقام پر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن سیندھیا کی بربادی کے ساتھ انھوں نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ بیگم صاحب نے ۸۰ سال کی عمر میں ۴ رشوال ۱۲۵۱ھ میں انتقال کیا جن کی ایک عمدہ یادگار سردھنے کا بے نظیر گرجا ہے۔

۲۱

وہ مدفون ہیں **بشپ ہیبر** بیگم صاحب سے ۱۸۲۵ء میں ملے تھے وہ لکھتے ہیں کہ
"یہ ایک بہت چھوٹی ڈیل کی سی عجیب وضع قطع کی بڑھیا عورت تھی جس کی چمک دار
آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ باایں ہمہ حسن جمال کی جھلک اب بھی شکل و شمائل
میں موجود تھی" یہ ایک بڑے حوصلے اور جرأت اور ہمت کی عورت تھی اور کئی بار
اس نے بہ نفس نفیس فوج کی سرگردگی کی ہے۔ اس کی خیرات و مبرات کی طول طویل
فہرست سے اس کی دین داری کا ثبوت ملتا ہے لیکن مزاج آگ بگولا تھا ایک مرتبہ
دو باندیوں کو اتنے کوڑے لگوائے کہ وہ بے ہوش ہوگئیں اور اسی حالت میں
ان کو زندہ گڑوا دیا۔ بیگم صاحب کے مرنے کے بعد جاگیرات ضبط ہو کر کمپنی بہادر کے
قبضے میں آگئیں اور متروکہ و اثاث البیت جو تقریباً پچاس لاکھ روپیہ کی مالیت کا تھا
وہ ان کی وصیت کے بموجب بیگم صاحب کی آغوشی لڑکی کے شوہر کو دیا گیا۔

تاریخ وفات

شمرو بیگم عفیفۂ نیک سرشت	جنت بگزید کرد آں جا منزل
آمد ز سماں ندا بگوش ناگاہ	تاریخ وفات اوست داغے بر دل

۱۲۵۱ھ

بیپٹسٹ چرچ (گرجا)

شمرو کی بیگم کی کوٹھی سے آگے بڑھ کر اس نام کا ایک گرجا فرقۂ
بیپٹسٹ کا ہے جس کی عمارت بڑے بڑے اونچے
کشادہ دروں کی بہت خوش نما اور خوب صورت ہے۔ یہ گرجا بھی
قدیم ہے۔

خونی دروازہ

چکا چاک خنجر ز میدان کیں
بہفتم فلک شد ز روئے زمیں

بازار دریبہ کلاں کے سرے پر چاندنی چوک کے طرف یہ
دروازہ دور آخری مغلیہ کا بنا ہوا ہے۔ اب دروازہ اور محراب تو باقی نہیں صرف ادھر ادھر کے
دو پاکھے اور ان پر دو چھوٹی چھوٹی برجیاں رہ گئی ہیں۔ **خونی دروازہ** اس وجہ سے
نام پڑا ہے کہ **نادر شاہ** نے جب ۱۷۳۹ء میں دلی کو لوٹا تو اسی دروازے کے سامنے
باشندگان دہلی کا بڑا قتل عام ہوا۔ پہلے اس دروازے کا سامنے والا حصہ بازار کا

نقشہ مسجد شرف الدولہ
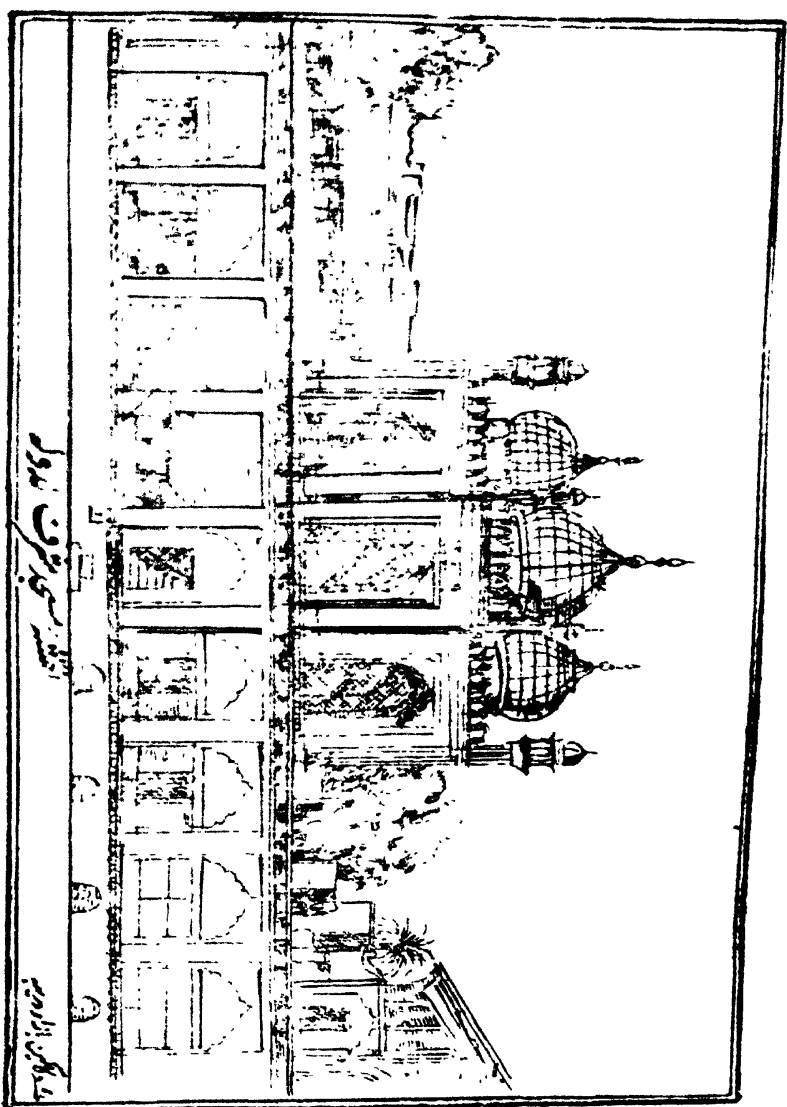
لاہوری بازار یا اردو بازار کہلاتا تھا اب سارے کا سارا چاندنی چوک ہی کہلاتا ہے
یہ تفریق جاتی رہی۔ اس کے اندر بہت بڑا اگرچہ بیچ اور تنگ بازار اس نام کا ہے جس کا
دوسرا سرا سول ہسپتال کے سامنے پائے والوں کے بازار میں نکلتا ہے
یعنی جامع مسجد کی طرف۔ دراصل اس بازار کا نام دُربے بہا تھا کثرت استعمال
سے دریبہ ہوگیا اور بازاروں کی طرح وسیع نہیں بلکہ لکھنؤ کے چوک کی طرح تنگ ہے
دو گاڑیاں مشکل سے نکل سکتی ہیں۔ عموماً زرکوب۔ گوٹے کناری والے۔ جلد ساز۔
کتب فروش۔ سادہ کار۔ صراف۔ عطر فروش۔ کنگھی فروش۔
سُرمے والے۔ کلا فروش۔ کھلونے والے۔ وغیرہ پیشہ وروں کی دکانیں اس کثرت
سے ہیں کہ ع جائے تنگ ست و مردماں بسیار کا مقولہ یہیں صادق آتا ہے۔
گلاب گندھی مشہور عطر ساز الف خاں مشہور سیاہی اور واسطی قلم فروش
کی دکان اسی بازار میں ہے۔ دریبہ کلاں کے اندر یہ گلیاں ہیں:-
داہنی طرف کوچۂ شاہ۔ کوچۂ جیٹ مل۔ کناری بازار۔ گلی پہاڑ والی۔ کوچۂ
سیٹھ جس میں سے شاہ جی کے چھتے میں رستہ نکل جاتا ہے۔ کوچۂ سیٹھ میں سنگین
ایک مندر بھی ہے۔ بائیں طرف کوچۂ سکھانند۔ کٹرہ مشروع گلی کنجس گلی کنجڑاں والی۔
گلی سنگ تراشاں۔ بلاقی بیگم کا کوچہ۔

مسجد شرف الدولہ
۱۱۳۵ھ
۲۳-۱۷۲۲ء

بازار دریبۂ کلاں میں سر راہ یہ مسجد ہے جو عموماً نواب صاحب
کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد نہایت دل کشا
اور بہت خوب صورت ہے۔ اگرچہ یہ مسجد ساری چونے
اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے لیکن گنبد اس کے سنگین
ایک خاص قسم کے سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں جس میں زردی کی جھلک مارتی ہے اور
اس کی سنہری کلسوں اور پتھر کی رنگت میں ایک لطف آمیز مناسبت ہے۔ اس مسجد میں
ندرت یہ ہے کہ دو منزلہ ہے۔ نیچے دکانیں ہیں اور اوپر مسجد۔ دکانوں ہی کے کرایے سے
مسجد کی نگہداشت ہوتی ہے۔ متولی اس کے نواب احمد سعید خاں اور نواب
احمد رشید خاں صاحبان ہیں۔ مسجد کے تین گنبد سنہری کلس کے ہیں۔ پندرہ
سیڑھیاں چڑھ کر صحن مسجد میں داخل ہوتے ہیں جس میں پتھر کا فرش ہے۔ مسجد کی

پیشانی پہ کتبہ ہے :۔

در زمانِ شہِ خورشید سریر	ظلِ حق ماہ زمین شاہِ زماں
ناصرالدین کہ محمد شاہ است	تیغِ او کفر شکن دردوراں
شرف الدولہ بنا فرمودہ	سجد و مدرسۂ عالی شاں
ایں دو بیت الشرف علم و عمل	ہمچو سعدین فلک کردہ قراں
سالِ تاریخ بنا گفت خرد	قبلۂ حج ارادت کیشاں

۱۱۳۵ھ

اس مسجد کے پاس جو مدرسہ ہے اس کو بھی نواب شرف الدولہ محمد شاہی نے ۱۱۳۵ھ میں بنایا تھا۔ نواب صاحب کا مفصل حال ردہ گراں کے محلے میں جہاں انھیں کا مدرسہ اور دروازہ ہے آیا ہے۔

کناری بازار یا دریبۂ خورد دریبۂ کلاں میں سے گلاب گندھی کی دکان سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر دائیں جانب یہ بازار ہے گو یہ بھی تنگ ہے۔ مگر بہت آباد ہے اس میں گوٹے کناری والے ٹوپی فروش۔ کانٹے والے۔ اور بہت قسم کے اہل حرفہ بیٹھتے ہیں اس کے اندر کئی محلے ہیں اول بائیں جانب کوچۂ عالم چند پھر گلی انار جس سے دھرم پورے کو رستہ جاتا ہے اس سے بائیں جانب چھتہ پرتاب سنگھ ہے۔

موتی بازار آگے ہی سیدھے ہاتھ کی طرف ایک پھاٹک کے اندر ایک گلی چلی گئی ہے جس کا دوسرا پھاٹک چاندنی چوک میں نکلتا ہے یہی موتی بازار کہلاتا ہے اس میں پہلے موتیوں کی جلا کرنے والے اور نگینے ساز بھی بیٹھتے تھے اب کچھ گھڑی ساز ہیں باقی کاچھیوں کی دکانیں ہیں جو سبزی ترکاری بیچتے ہیں۔

لال مسجد دریبے میں سر راہ کے موڑ پر دو چار قدم بڑھ کر بائیں طرف دکانوں کے اوپر یہ مسجد ہے۔ یہ دکانیں رہن تھیں حاجی محمد اسحٰق صاحب سوداگر صدر بازار نے دکانیں چھڑائیں اور اپنے ذاتی صرفے سے اس مسجد کو پختہ اور سنگین بنوادیا نیچے تین دکانیں بھی بنوا دیں جن کا کرایہ بارہ روپیہ مہینا آتا ہے جس کی نگرانی انجمن موید الاسلام کے ذمے ہے۔

کوچۂ بلاقی بیگم

لال مسجد سے نکل کر دائیں جانب یہ کوچہ ہے۔ غدر سے پہلے خوب آباد تھا اب وہ چہل پہل اور آبادی کی کثرت نہ رہی۔ اس کوچے میں ہندو مسلمان سب ملے جلے رہتے ہیں۔

بدرالدین علی خاں مُہرکن کی مسجد

سنہ ۱۲۸۷ھ

یہاں بدرالدین علی خاں مہرکن کی ایک مسجد ہے جو نہایت ہوادار جگہ ہے اس میں اُن کے صاحب زادے سعادت اللہ خاں نے ایک مختصر سا عربی مدرسہ بھی جاری کر رکھا ہے۔ مسجد کی پیشانی پر یہ کتبہ ہے۔

برائے حضرت سبحان و رحمٰن
شد ایں مسجد بنا صد شکر و احساں
تمامی ملک خود زرعی و سکنی
نمودم وقف آں را از دل و جاں
ازاں نصفے برائے وارثاں ست
دگر بہر سا کیں مستحقاں
بریں تقسیم اگر حجت کند کس
ز حاکم منع کردندش مسلماں
الٰہی تا بحشر ایں را نگہدار
ز بیع و رہن غصب و جملہ نقصاں
بگو سال از سر اللہ نقشی
مساکیں جائے بدرالدین علی خاں

۱۲۵۷ + ۳۰ = ۱۲۸۷ھ

گردوارہ آسیس گنج سری گرو تیغ بہادر صاحب جی

سنہ ۱۶۷۵ء

کوتوالی کے پاس (۳۱۰) برس اول کا بنا ہوا سکھوں کا مندر ہے۔ اس میں زمانۂ حال کے تین گورمکھی کتبے ہیں جن میں کوئی تاریخی بات نہیں۔ یہ گردوارہ گرو تیغ بہادر کی یادگار میں بنا ہے جس میں اُن کا سمادھی اور سکھوں کی متبرک کتابیں گرنتھ صاحب رکھی ہیں۔ مہاراجہ صاحب پٹیالہ و راجہ صاحب جیند و نابھ اس کے خرچ کے متکفل ہیں۔ گروجی کا سر سنہ ۱۶۷۵ء پوس سدھ (۵) بکرم سمت ۱۷۳۲ میں ۔۔۔۔۔۔ گیارہ بجے دن کے اورنگ زیب کے حکم سے قلم کیا گیا تھا۔ اورنگ زیب نے گرو صاحب کو چالیس دن تک قید کر رکھا مگر وہ برابر ادی گرنتھ سے حمد کے گیت گاتے رہے۔ آپ گرو ہرگوبند کے

صاحب زادے اور سکھوں کے نویں گرو تھے۔ گرو ہرکشن کی وفات کے بعد بڑے جھگڑوں سے ان کو گدی پر بٹھایا تھا۔ انھوں نے شہرت اور عروج میں اپنے نامور والد سے بھی زیادہ نام پیدا کیا۔ گدی کے لیے آپ کا بالمقابل دعوے دار آپ کا بھتیجا رام تھا لیکن جب اسے ناکامیابی ہوئی تو اس نے اپنے کامیاب حریف تیغ بہادر سے جن کا اب بڑا عروج تھا یوں بدلہ لیا کہ بادشاہ سے جا لگائی کہ گرو صاحب کے ارادے سلطنت کے خلاف ہیں۔ بادشاہ نے تیغ بہادر کو دہلی بلوا بھیجا لیکن راجہ جے پور کی سفارش سے جان بچ گئی اور وہ پٹنے میں جا کر پانچ چھ برس رہے۔ اس کے بعد پھر وہ پنجاب کو واپس آئے اور پھر کچھ ریشہ دوانیاں اور لوٹ مار کرنے لگے اس وجہ سے اورنگ زیب نے ان کو گرفتار کر کے سر قلم کرا دیا۔ بڑ کا درخت جہاں سر قلم کیا گیا اسی زمانے کا ہے۔ گورو صاحب کی تصویر مندر کے اندر آویزاں ہے جہاں جہاں خون کے قطرے گرے سکھ لوگ اس کو بہت متبرک مقام مانتے ہیں۔ ان کا سر کوئی انھیں کا چیلہ اورنگ آباد دکن لے گیا اور دھڑ موضع رکاب گنج بیرون اجمیری دروازے میں مدفون ہے وہاں بھی ایک مندر بنا ہوا ہے۔ سنتے ہیں کہ اسی مندر کے مغربی گوشے میں ایک مسجد تھی جو غدر کے بعد منہدم کر دی گئی اور وہ جگہ مندر میں شامل کر لی گئی۔

کوتوالی چبوترا

گندم از گندم بروید جو زجو
وز مکافات عمل غافل مشو

سنہری مسجد سے لگی ہوئی چاندنی چوک میں یہ ایک قدیم عمارت ہے جو بالعموم **کوتوالی چبوترہ** کہلاتی ہے۔ بادشاہی زمانے میں بھی اسی عالی شان عمارت میں شہر کی کوتوالی تھی اور اب بھی اس کے اگلے حصے میں دلی کا صدر پولیس سٹیشن ہے اور یہاں جو انسپکٹر پولیس متعین ہے وہ قدیم دستور کے موافق **کوتوال شہر** ہی کہلاتا ہے۔ اس عمارت کی اصلی حالت یہ تھی کہ یہاں ایک چوک تھا اسی گز مربع اور اس میں حوض اور اس کے جنوب میں کوتوالی چبوترا تھا اور جانب شمال ترپولیہ تھا اور رستہ جاتا تھا اب نہ وہ چبوترا باقی ہے نہ ترپولیہ۔ کہتے ہیں کہ یہ مقام ہمیشہ آفت خیز رہا ہے ایک زمانہ تھا کہ یہاں دریا بہتا تھا اور اس مقام پر بھنور پڑتا تھا کہ ہزارہا کشتیاں غرق ہوتی تھیں پھر ایک زمانہ آیا کہ یہاں گھنا جنگل ہو گیا اور شیروں کا مسکن ہو گیا کہ کسی ذی روح کو زندہ

نقشۂ مسجد سنہری کوتوالی
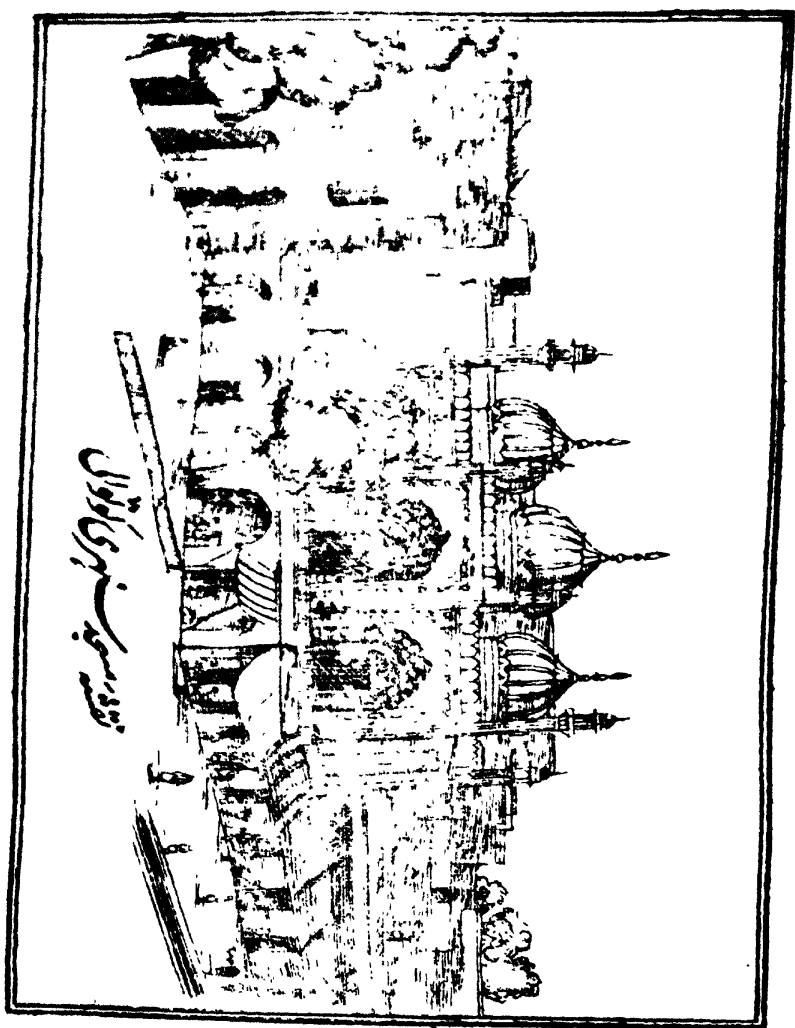
نہیں چھوڑتا تھا اب یہاں شہر کی کوتوالی ہی چور ڈاکو پکڑے جاتے ہیں اور طرح طرح کی عقوبتیں بھگتتے ہیں اور اسی چبوترے سے ملی ہوئی سنہری مسجد ہی۔ ~~

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

اس مکان کے پچھلے حصے میں ایک مشہور عالم مولنٰا فخرالدین کا مکان تھا جو قطب صاحب کی درگاہ میں مدفون ہیں۔ ایام غدر میں یہ بڑا معرکۃ الآرا مقام تھا کوتوالی چبوترے کے سامنے ہی اُن تین شاہزادوں کی نعشیں لٹکائی گئی تھیں جن کو غدر ۱۸۵۷ء میں ہڈسن نے گولی کا نشانہ بنایا تھا اور یہیں برابر برابر پھانسیاں گاڑی گئیں تھیں جن پر باغیوں کو سر جان تھیافلس مٹکاف صاحب کے سامنے لٹکایا جاتا سر تھیافلس کا عالی شان محل مع بیش بہا مال و اسباب کے غدر میں لوٹ لیا گیا تھا اس سبب سے صاحب موصوف بہت برافروختہ تھے۔

روشن الدولہ کی پہلی سنہری مسجد ۱۱۳۴ھ ۱۷۲۱ء

وہ بھی برہم میں بھی راضی قتل کا ساماں درست
اب رواں گردن پہ گر شمشیر اُلٹی ہو تو ہو

جنرل کننگہم نے عمارات قدیمہ کے متعلق جو یادداشت گورنمنٹ آف انڈیا میں بھیجی تھی اس میں اس مسجد کے لیئے یہ ریمارک کیا ہی۔ بعض عمارات فی الاصل ایسی شاندار او رو قیع نہیں ہیں کہ گورنمنٹ اُن کی نگہداشت کرے مگر اُن میں واقعات تاریخی کی ایک ایسی خصوصیت ہی کہ اُن کا بقا ضروری ہو جاتا ہی۔ چنانچہ مثلاً شہر دہلی کے بازار چاندنی چوک میں ایک چھوٹی سی مسجد روشن الدولہ (ظفر خاں) کی ہی جسے اُس نے ۱۱۳۴ھ ۱۷۲۱ء میں بعہد محمد شاہ (۱۷۴۸-۱۷۱۹ء) شاہ بھیک کے لیئے بنایا تھا۔ جہاں ۱۱ ذی حجہ ۱۱۵۱ھ (۲۲ مارچ ۱۷۳۹ء) مرزا نادرشاہ نے چند گھنٹے بیٹھ کر شہر کی لوٹ اور قتل عام کا تماشہ جو اُس مسجد کے اطراف میں ہو رہا تھا دیکھا تھا۔ یہ مسجد (۴۸) فٹ لمبی اور (۱۹) فٹ چوڑی ہی۔ اس کا چبوترا

لہ اس واقعہ کی تاریخ "کل مغل بے حیا"۔ "دلی خراب شد"۔ "قتل عام" سے نکلتی ہی۔
۱۱۵۱ھ ۱۱۵۱ھ ۱۱۵۱ھ

ب زمین سے گیارہ فٹ بلند ہی اور لب سڑک واقع ہی۔ اس مسجد کا دروازہ کچھ شان دار نہیں ہی بلکہ صرف (۶) فٹ اونچا اور ۳ فٹ (۷) انچ چوڑا سادی محراب کا ہی۔ یہاں سے آٹھ تنگ سیڑھیاں چڑھ کر صحن مسجد میں پہنچتے ہیں جہاں بھورے پتھر کے چوکے بچھے ہوے ہیں صحن مسجد پچاس فٹ لمبا اور بائیس فٹ چوڑا ہی۔ یہ مسجد تمام سنگ بست اور پختہ ہی۔ مسجد کے تین محراب دار در ہیں۔ بیچ کی محراب دس فٹ اونچی ہی اور ادھر اُدھر کی محرابیں اس سے ایک ایک فٹ نیچی ہیں۔ بیچ کی محراب سے ادھر اُدھر پتلے پتلے دو منار ہیں جن کے اوپر ہشت پہلو بُرجیاں ہیں جن کے قُبّے اور کلس سنہری ہیں۔ ان مناروں کی بلندی بیس فٹ ہی۔ مسجد کی دونوں جانب پینتیس پینتیس فٹ بلند منار ہیں جن کے اوپر چار چار ستونوں کی سنہری بُرجیاں اور کلس ہیں۔ دو بلند مناروں کے جواب میں مسجد کی پچھیت میں دو منار ہیں مگر بلندی میں کم تھے جن میں سے جنوبی رُخ کا منار ٹوٹ کر بُرجی الگ دھری ہوئی ہی شمال رُخ کا اپنی حالت پر قایم ہی۔ مسجد کے دالان کے تین قطعے ہیں اور تینوں دالانوں پر تین سنہری گنبد ہیں جن میں سے بیچ کا گنبد بہ مقابلہ ادھر ادھر کے گنبدوں کے بڑا ہی۔ اس کے بُرج فیض بازار کی مسجد کی طرح ٹوٹ گئے تھے لیکن ان دونوں مسجدوں کے بُرجوں کو ملا کر اس مسجد کے بُرج پھر نئے سرے سے بنا دیئے گئے ان پر تانبے کی چادروں کا خول چڑھا کر بہت گہرا سنہرا ملمع کر دیا گیا ہی جس کی چمک دمک آج تک بھی ویسی کی ویسی ہی قایم ہی۔ بیچ کا گنبد مسجد کی چھت سے اٹھارہ فٹ اونچا ہی اور ادھر اُدھر کے گنبد پندرہ پندرہ فٹ بلند ہیں اور صحن مسجد سے ان کی بلندی (۵۴) اور (۴۲) فٹ ہی۔ مسجد کی پیشانی پر لمبی ایک سطر میں سنگ مرمر کی ایک پتلی سی تختی پر یہ کتبہ ہی:-

بہ عہد بادشاہ ہفت کشور	سلیماں فر محمد شاہ داور
بہ نذر شاہ بھیک آں قطب آفاق	شد ایں مسجد بہ زینت در جہاں طاق
خدایا نیست لیک از روے احساں	بنام روشن الدولہ ظفر خاں
بتاریخش ز ہجرت تا شمار است	ہزار و یکصد و سی و چہار است

۱۱۳۴ھ

مسجد کے متعلق ایک چھوٹا سا مکان مدرسہ کا بھی ہی جو قدیم نہیں ہی۔ مسجد کے جنوب میں اس کا دروازہ ہی بارہ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے کوٹھے پر پہنچ جاتے ہیں۔ مسجد کے داخلی دروازے پر ایک نئے پتھر پر یہ کتبہ لگا دیا ہی:۔

الوقف لاہیملک

مدرسہ [۱] اسلامیہ مسجد سنہری ۱۳۱۵ھ ہجری

روشن الدولہ اور شاہ بھیکہ دونوں کے حالات ہم سنہری مسجد واقع فیض بازار کے ضمن میں لکھیں گے۔ نادر شاہ درانی نے ۱۷۳۹ء میں جو ہیبت ناک قتل عام دہلی میں کیا اُس کی کیفیت حسب ذیل ہی:۔ اورنگ زیب کا پوتا محمد شاہ تخت پر بیٹھا اور ناچ رنگ ولہو ولعب میں مشغول ہوگیا۔ مہتاب باغ اور حیات بخش دونوں باغوں کو سجا کر طلسمات کا نمونہ کردیا۔ نہروں میں فوارے پڑے رہتے تھے ان میں بیٹھتا اور سَین کرتا۔ برسات کے موسم میں قطب صاحب کے ہرے بھرے جنگل میں جا رہتا۔ حکم تھا کہ ابر سیاہ ہمارا نقیب ہی جب گرجنے کی آواز آئے فوراً کمر بندی ہو جایا کرے۔ ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ نظام الملک آصف جاہ کو انتظام کے لیئے دکن سے بلایا گر وہ سلطنت کا رنگ بدلا دیکھ کر واپس چلے گئے۔ آصف جاہ کا جانا تھا کہ نادر شاہ درانی کابل ہوتا ہوا دلّی کے ارادے سے آگے بڑھا جب بہت ہی قریب آگیا تو شہر میں کھلبلی پڑ گئی۔ بادشاہی آرام طلب فوج نے یہ دن کاہے کو دیکھا تھا سنتے ہی سٹپٹا گئے جوں توں کرکے جنگ کا سامان فراہم کیا خدا خدا کرکے دو مہینے میں کرنال پوہنچے اور بارات کی طرح جا اُترے مغلوں کے لشکریوں کا لباس کچھ ایسا عجیب و غریب تھا اور اُن کی شکل و شمائل بھی ایسی بد قطع تھی کہ دلّی والے اُن کا ٹھٹھہ اُڑانے لگے۔ آخر نادر شاہی فوج سے مقابلہ ہوا عیش پرور دہ فوجیں پریشان ہوکر بھاگیں خان دوراں زخمی ہوا۔ برہان الملک شجاعت کی داد دے رہا تھا اور دل کھول کر لڑ رہا تھا۔ ہاتھی پہ بیٹھا تیر پر تیر چلا رہا تھا کہ قزلباشوں نے چاروں طرف سے آگھیرا۔ ایک نیشاپوری اُس کا ہم وطن گھوڑا دوڑا کر پہنچا اور آواز دی کہ ای محمد امین! دیوانہ شدۂ

---

[۱] اب یہ مدرسہ اُٹھ کر کے مسجد پانی پتیاں واقع کشمیری دروازے میں چلا گیا ہی۔ ۱۲

کہ جنگ میں کمی و بے اعتمادی کی گئی۔ برہان الملک نے ہاتھ روک لیا اور نادر شاہ کے پاس لے گیا۔
اس نے جرم بخشی کر کے بہت عنایت کی اور دو کروڑ روپیہ مصارف جنگ کے کر پیش لوٹ جانے پر راضی ہو گیا
برہان الملک نے نادر شاہ کو بادشاہ سے ملایا بڑے لطف سے ملاقات ہوئی۔ نادر شاہ نے لوٹ جانے کا
سامان کر دیا بعض بد اندیشوں نے برہان الملک کی خیر خواہیوں کو اپنی طرف منسوب کر کے محمد شاہی
دربار میں خطابات پائے جس سے برہان الملک کو برہمی پیدا ہوئی اور اس نے نادر شاہ کو خزانے کے
بے شمار جواہرات کی طمع دلائی۔ نادر شاہ پلٹ کر شہر میں آیا اور شہر پر قبضہ کیا۔ نادر شاہ کے دہلی
فتح کرنے کے بعد تیسری رات کو شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ محمد شاہ نے نادر شاہ کو قلعے میں
قتل کر ڈالا۔ قزلباش جو نادر شاہ کی فوج کے لوگ تھے ان پر شہری ٹوٹ پڑے
رات بھر شہر میں تلوار چلی اور تین ہزار سپاہیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ آدھی رات کو یہ خبر
نادر شاہ بادشاہ کو پہنچائی گئی۔ اس نے اس خبر کو بالکل غلط اور ناممکن الوقوع سمجھ کر
بغرض دریافت اصل حقیقت ایک سوار کو دوڑایا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ واقعی نادر کی فوج
کے چند لوگ مارے گئے۔ نادر شاہ کو بہت غصہ آیا اور اس نے اپنے دو ہزار جزائرچیوں کو
حکم دیا کہ قلعہ کے دروازے پر قبضہ کر لیں اور عوام الناس پر گولی چلائیں چنانچہ جو جمعیت
دروازے پر تھی ماری گئی اور تھوڑے عرصے کے لیئے شہر کا ہنگامہ فرو ہوا
لیکن صبح ہوتے آگ پھر بھڑک اٹھی۔ نادر شاہ تب قلعے سے سوار ہو کر روشن الدولہ
کی مسجد میں آیا اور بہت سے اپنے آدمی بچشم خود قتل ہوتے دیکھے آنکھوں میں خون
اتر آیا اور اس ہنگامے کی حالت کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور اپنے جزائرچیوں اور
تین ہزار فوجیوں کو جو اور ساتھ تھے صبح کے سات بجے حکم دیا کہ اپنی اپنی تلواریں
سونت لیں اور شہر میں جو ہندی ملے اسے قتل کریں کوئی بچنے نہ پائے جو شخص ملبوس
ملے اس کا لباس زندگی قطع کریں۔ قتل۔ غارت گری۔ لوٹ مار اور اس کے ساتھ کسی
طرح کا ظلم اٹھا نہ رکھا جائے غرض یہ کہ کوئی شخص بچ نہ سکے۔ سات بجے صبح سے چار بجے
شام تک مسلسل قتل عام ہوتا رہا۔ گلی کوچوں میں خون کے ندی نالے بہ گئے گھروں
میں آگ لگ گئی۔ بڑے بوڑھوں کی فریادیں آسمان تک جانے لگیں بدمعاش تو
شہر چھوڑ کر بھاگ گئے ساری بلا شرفائے شہر کے سر پڑی چیش مشار کوتوال
شہر نے ہزاروں جانوں کے تہ تیغ ہو جانے کی رپوٹ گزرانی۔ قتل کا ہیبتناک

منظر مقامات ذیل بجلی آسمانی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے لاہوری دروازے سے پرانی عید گاہ تک جو جہاں نما کے قریب ہی۔ شمال میں پاری مسجد تک۔ جنوب میں شہر کے دہلی دروازے کے باہر جامع مسجد اور پہاڑ گنج کے اطراف خوب گھمسان قتل ہوا اور جو لوگ زندہ پکڑے گئے اُن کے سر جمنا کے کنارے لے جا کر اُڑا دیئے گئے۔ سب سے پہلے جوہریوں۔ صرافوں۔ ساہوکاروں اور سوداگروں کی دکانیں لوٹی گئیں۔ دریبہ کا بازار جس میں جوہری اور تاجر کثرت سے تھے خوب دھڑی دھڑی کرکے لوٹا گیا اور اسی وجہ سے اس بازار کا مغربی دروازہ آج تک "خونی دروازے" کے نام سے مشہور ہی۔ خال خال امرائے شہر جو ہمراہیان نادر شاہ سے بحسن سلوک پیش آئے تھے وہ اور اُن کے معدودے چند اڑوسی پڑوسی قزلباشوں کی مدد سے اس لوٹ مار سے بال بال بچے رہے ایک بڈھے خواجہ سرا نے محمد شاہ سے تمام حال عرض کیا جب بادشاہ نے قتل عام کی خبر سنی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے آبدیدہ ہوا اور یہ شعر پڑھا ؎ دیدۂ عبرت کشا قدرت حق را ببیں۔ شامت اعمال ما صورت نادر گرفت اور پھر گھبرا کر اپنے ایک معتمد کو نادر شاہ کے پاس بھیجا اور خواہان عفو تقصیر ہوا۔ نادر شاہ کا دل کچھ پسیجا اور محمد شاہ کی خاطر سے قتل سے ہاتھ روک لیا" ایک دوسری روایت یہ ہی کہ دوپہر کے قریب جب عالم میں کہرام مچ گیا اور کوئی صورت امن کی نظر نہ آئی تو آصف جاہ وزیر اعظم نادر شاہ کے وزیر کی طرف دوڑے اور تلوار گلے میں ڈال سر برہنہ نادر شاہ کے پاس گئے نادر شاہ کا طبیب خاص مرزا مہدی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا کہ آصف جاہ ایک بڑی لمبی چوڑی عرضی لے کر پہنچے جس میں رحم کی درخواست کی گئی تھی۔ حکیم جی نے آصف جاہ سے کہا کہ بھلا اس طول طویل عرضی کا یہ کیا موقعہ ہی اس کے پڑھتے پڑھتے تک تو دلی کا صفایا ہو جائے گا آپ اسے مختصر کیجیے۔ آصف جاہ نے بحالت سراسیمگی کہا اچھا پھر آپ کو جو مناسب معلوم ہو وہی کیجیے۔ مرزا مہدی آصف جاہ کو بادشاہ کی حضوری میں لے گئے۔ آصف جاہ ترساں ولرزاں بادشاہ کے سامنے خاموش کھڑے ہو گئے ان کی حالت خود صورت سوال تھی نادر شاہ کے دل میں بھی خدا نے رحم ڈالا اور غصہ ٹھنڈا پڑا نادر شاہ نے

فرمایا چہ می خواہی؟ وزیر نے یہ شعر پڑھا ؎ کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی۔ مگر کہ زندہ کنی خلق و او باز کشی۔ نادر شاہ نے شرما کر سر جھکا لیا اور تلوار نیام میں کی اور فرمایا کہ "بریش سفیدت بخشیدم"۔ یہ سنتے ہی ایرانی فقیر "امان امان" کہتے ہوئے دوڑے شہر میں امن ہو گیا۔ مورخ لکھتا ہے کہ" فوج کے نظم ونسق کی یہ حالت تھی کہ ادھر بادشاہ کے منہ سے یہ حکم نکلا اُدھر اس سختی اور اہتمام سے قتل بند ہوا کہ جو جہاں تھا اور جس حال میں تھا وہیں اس نے اپنا ہاتھ تھام لیا حتیٰ کہ جن لوگوں کے گلے پر تلوار رکھی تھی فوراً ہٹا لی گئی"۔ بعد اس کے محمد شاہ نے نادر شاہ کی دعوت کی کھانے کے بعد عمدۃ الملک نے چائے کی پیالی بھری مگر سوچنے لگا کہ پہلے کس کو دوں اگر پہلے اپنے بادشاہ کو دیتا ہوں تو نادر کا غصہ معلوم کہیں ایسا نہ ہو کہ سر بھٹے کی طرح اڑا دے اور اگر نادر کو دوں تو میرے آقائے ولی نعمی کے کشیدہ خاطر ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ آخر اس کی تیزی طبع اور فطانت نے جوہر دکھائے اور اس نے محمد شاہ کے سامنے پیالی پیش کرکے عرض کی کہ "شاہاں بہ شاہاں می دہند" اس لیاقت اور سنجیدگی پر دونوں بادشاہ بہت مسرور ہوئے۔ **لطیفہ** نادر شاہ نے محمد شاہ کے دربار کی ایک طوائف نوربائی کا گانا سنا اور بہت محظوظ ہوا اور بہت کچھ انعام اکرام سے سرفراز فرما کر ارشاد کیا "نوربائی! روے ہند را سیاہ کن بیا کہ بہ ایرانت بریم" نوربائی سنتے ہی حیران ہو گئی اب کیا کروں میری جان کی خیر نہیں فی البدیہہ اس نے ایک غزل شروع کی جس کے دو شعر یہ تھے:۔

من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی	سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی
نزدیکت ایں چنینم دوراں چناں کہ گفتم	نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

نادر شاہ بہت خوش ہوا اور اس کا مطلب سمجھ کر اپنے ارادے سے درگزرا۔ جاتے وقت نادر شاہ جتنا خزانہ اور جواہر ہاتھ لگے تھے مع تخت طاؤس کے اپنے ساتھ لے گیا۔ محمد شاہ رنگیلے ہی مشہور ہو گئے تھے پھر عیش و عشرت میں پڑ گئے اور تیس برس سلطنت کرکے ۱۷۴۸ء میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

فوارہ لارڈ نارتھ بروک

غم زدگاں را بطرب دل کشائے
گم شدگاں را بکرم رہ نمائے

کوتوالی کے سامنے نزا ہے پر ایک بلند اور شان دار خوش نما فوارہ لارڈ نارتھ بروک (سنہ ۱۸۷۲ء) کے زمانے کا بنا ہوا ہی۔ جس کے بنانے میں دس ہزار روپیہ صرف ہوا اس کے اوپر دہات کا نہایت وزنی پیالہ لگا ہوا ہی۔ پھول پتے بھی نفیس بنے ہوے ہیں۔ تمام فوارے پر سیمنٹ کی استر کاری ہی۔ یہاں سے ایک سڑک ملکہ کے باغ کے برابر کوڑیا پل سے ہوتی ہوئی ریلوے سٹیشن کی سڑک سے جا ملی ہی اور دوسری قلعے سے سیدھی فتح پوری کی مسجد کو چلی گئی ہی۔ فوارے کی سیڑھیوں سے پہر کو اکثر عیسائی اور آریا لوگ وعظ کہا کرتے ہیں۔ بڑا ٹھٹھ ا رہتا ہی۔

راما تھیٹر
سنہ ۱۸۹۸ء

در باغ با ترانۂ بلبل دریں ہوا
ستی خوش ست وبادہ خوش ست وخمار خوش

یہیں فوارے کے مشرق میں راما تھیٹر کی نہایت خوش قطع عمارت ہی رائے بہادر لالہ رام کشن داس صاحب نے بصرف کثیر بنوایا تھا جس میں عمدہ عمدہ رنگ برنگ آمیزی کی تصویریں بنی ہیں اور برقی روشنی اور پنکھے غرض ہر قسم کا سامان آسایش موجود ہی۔ اکثر تھیٹریکل کمپنیاں اس کو کرایہ پر لے کر اس میں تماشہ کرتی ہیں۔ تماشوں کے لیئے یہ مکان بہت موزوں ہی خصوصًا اس وجہ سے کہ وسط شہر میں گھنی آبادی کے اندر ہی۔

اندر پرست بنگالی سکول
سنہ ۱۸۹۹ء

اس میں صرف بنگالیوں کے لڑکے تعلیم پاتے ہیں اس کا تعلق کلکتہ یونیورسٹی سے ہی کوئی پچاس ساٹھ لڑکے ہیں اور پانچ مدرس وہ بھی بنگالی ہیں۔ اس کے بانی ڈاکٹر ہیم چندر سین تھے جو ایک بورڈ کے زیر اہتمام چلتا ہی۔ یہیں ڈاکٹر صاحب موصوف کا امپیریل مڈیکل ہال ہی۔ جو ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں بڑی رونق پر تھا اب اُن کے عزیز چلاتے ہیں مگر وہ رونق تو اُن کے دم کے ساتھ تھی سو گئی۔

بازار کوڑیا پُل

ملکہ کے باغ کے برابر جو سڑک گئی ہی وہی بازار کوڑیا پُل کہلاتا ہی جس میں بہت کثرت سے بیٹھتے ہیں۔ دائیں طرف کٹڑہ سائستہ خاں۔ برف خانہ۔ کٹڑہ چاہ اندارا۔ کلن کی چھوٹی بڑی سرا۔ توپ خانے کی سرا۔ برف خانے کی سرائے انہیں اسکی وجہ تسمیہ ہم شاہ جی کے مکان کے ضمن میں لکھ آئے ہیں کہ نواب شادی خاں مہتمم تہ بازاری سے تہ بازاری کے محصول میں کوڑیاں کثرت سے بہنے ہوئی تھیں۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں نواب صاحب نے بادشاہ سے اجازت لے کر ان کوڑیوں سے ایک پل بنایا تھا لیکن اب پل کا وجود نہیں رہا پل جاکر سارے بازار کا یہی نام پڑ گیا۔

مور سرا

دنیا ہم نے سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آتی جانی دیکھی

غدر سے پہلے یہاں کاغذی محلہ تھا۔ غدر کے بعد ۱۸۶۱ یا ۶۲ء میں ہیملٹن صاحب کمشنر نے بہ صرف ایک لاکھ پانسو سترہ روپیہ سرا بنائی اور ابتدا اس کا نام ہیملٹن سرا مشہور ہوا اس کے بعد مور صاحب انجینیر نے اس کی برجی پر مور کی تصویر لگائی لوگ مور سرا کہنے لگے چاہے اسے مور کی شکل سے منسوب کر دیا انجنیر صاحب کے نام سے سنہ ۱۹۰۱ء میں منسپل کمیٹی نے اس کو ایک لاکھ پینسٹھ ہزار میں ایسٹ انڈیا ریلوے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس میں ریلوے کے ملازمین رہتے ہیں۔ عمارت بہت وسیع عمدہ اور پختہ ہی۔

پون ٹوٹی یعنی چنگی کی چوکی

اس کے متصل ترا ہے پر چنگی کی چوکی ہی جو پون ٹوٹی کہلاتی ہی ہی۔ یہاں سے ایک سڑک دریا کی طرف جاتی ہی اور صدر ڈاک خانے کے قریب ریل کے ڈاٹ والے پل کے پاس چوراہے مل جاتا ہی۔ چنگی کی چوکی کے سامنے شمالی جانب ریل کے کاٹ کا او ور برج ہی۔ یہ پل بہت

بڑا ہی ریلوے سٹیشن کے سدی چوڑان کو قطع کرتا ہے اس وجہ سے بہت لمبا ہی جو اُس طرف صدر ڈاک خانے ۔ کچہریوں ۔ کشمیری دروازے گندے نالے وغیرہ کے رستے پر جا نکلتا ہی چنگی سے کے پاس ہی ملکہ کے باغ کا ایک دروازہ بھی ہے ۔

ریلوے سٹیشن

مانع وحشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہی مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دراصل یہ اسٹیشن ای آئی آر کا ہے ۔ پہلے سندھ پنجاب دہلی ریلوے جو اب ان ڈبلیو آر کہلاتی ہے اُس کا سٹیشن ہیملٹن روڈ پر تھا جہاں اُس کا مال گودام ہے اور راجپوتانہ مالوہ ریلوے کا سٹیشن موری دروازے کے پاس تھا ۔ یہی تین ریلیں تھیں ۔ اسٹیشن الگ الگ اور دور دور ہونے سے مسافروں کو بڑی مصیبت کا سامنا تھا ۔ ساری لینوں کا اب ایک جائنٹ سٹیشن ہو گیا ۔ میرے خیال میں سوائے بمبئی کے وکٹوریا ٹرمنس سٹیشن کے دلی سے بڑا کوئی سٹیشن نہیں ۔ ۱۹۰۳ء سے بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا رہتا ہے ۔ وسیع اور کشادہ پلیٹ فارم ہیں ۔ رات دن یکساں ہی ہر وقت ٹکٹ ملتا ہے ۔ مسافروں کے ٹھیرنے کے بڑے بڑے ہال ہیں ۔ لمبان اسکی یوں سمجھیے کہ ڈفرن برج سے شروع ہو کر ڈاٹ کے پُل تک چلی گئی ہے اور چکلان ملکہ کے باغ سے لے کر اُدھر ہیملٹن روڈ تک ہے ۔ شہر میں بھی چاندنی چوک کا بکنگ آفس ہے جس سے مسافروں کو بڑی آسانی ہے ۔ پارسل بھی یہیں سے لیتے ہیں ۔ یہ سٹیشن اس وقت ذیل کی ریلوں کا مبدا اور منتہا ہے ۔ ای آئی آر یعنی پورب لین دلی سے اُدھر کلکتے تک ۔ ان ڈبلیو آر یعنی پنجاب لین ۔ جو پہلے سندھ پنجاب دلی ریلوے کہلاتی تھی ۔ اودھ رُہیلکھنڈ ریلوے کا غازی آباد مراد آباد سکشن جی آئی پی آر یعنی بمبئی لین ۔ بی بی اینڈ سی آئی آر براڈ گیج یعنی چوڑی پٹری کی جو متھرا ناگدا لین کہلاتی ہے اور میٹر گیج یعنی چھوٹی پٹری کی جو پہلے راجپوتانہ مالوہ ریلوے کہلاتی تھی اور دہلی سے احمد آباد تک ہے ۔ نارتھ ویسٹرن پنجاب ریلوے ۔ ہندوستان بھر میں دلی سے

ہوا کوئی جنکشن نہیں ہے۔ اسٹیشن کے اندر جانے کے لیئے آدھ آنے کا پلیٹ فارم ٹکٹ ہے۔ دلی کے سٹیشن کے اندر بڑے بھاری بھاری ویٹنگ روم ہیں اور ان کے علاوہ سٹایرنگ روم بھی ہیں جن میں فرسٹ سکنڈ کلاس کے مسافر شب باش رہ سکتے ہیں۔ یہاں کے ریفرشمنٹ روم بھی اعلیٰ پیمانے پر ہیں مختلف بُک سٹال بھی ہیں جن میں تازہ جانزہ اخبار رسالے منتخب انگریزی ناول کثرت سے ملتے ہیں۔ غرض مسافروں کی دلچسپی کا کافی سامان ہے جس سے سفر جو بصورت سقر کہلاتا تھا اب سفر سبیل الظفر ہوگیا۔ سب سے بڑھ کے ندرت یہ ہے کہ مختلف پلیٹ فارموں کے زمین کے اندر سامانوں کے ٹھیلے پہ نچانے کا نادر اسپرنٹس لگا ہوا ہے جو بڑے صرفہ سے بنا ہے اور جس سے سامان کے حمل ونقل میں بے انتہا سہولت ہوگئی ہے۔ گھڑیاں متعدد ہر ہر پلیٹ فارم پر لگی ہوئی ہیں جن میں بجلی کا تار لگا ہوا ہے اور اُن سب کا وقت اسی تار سے یکساں رہتا ہے۔ ٹکٹ ہر درجے کا ہر وقت ملتا ہے۔ شبانہ روز ٹکٹ گھر کھلا رہتا ہے جب چاہو ٹکٹ لو اور بفراغت داطمینان سفر کرو

گرجا رومن کیتھولک

سنہ ۱۸۶۶ء

عیسائی فرقہ رومن کیتھولک کا یہ گرجا اس سڑک کے اخیر پہ واقع ہے جو ریلوے سٹیشن سے کمبوہ گھاٹ کو جاتی ہے۔ یہ عمارت نہایت خوش نما اور عالی شان ہے چھیاسٹھ ہزار روپیہ کی لاگت سے یہ گرجا بنا ہے جس کے چو طرف ایک عمدہ باغ لگا ہوا ہے اسی احاطے میں پادری صاحب کے رہنے کی کوٹھی بھی ہے اس کے آگے ہی چوراہہ ہے ایک سڑک ریلوے کے ڈاٹ دار پل کے تلے سے نکل کر سیدھی دلی دروازے کو چلی گئی ہے۔ اس چوراہہ کے شمالی جنوبی گوشے میں ایک چھوٹے سے مثلثی ٹکڑے میں ایک مختصر باغیچہ لگا دیا ہے جس کے تینوں طرف پتھر کا کٹہرا ہے اور بیچ میں ایک فریزل فوارہ لگا ہوا ہے ریل کے پل کی نہایت مستحکم ڈاٹ لگی ہوئی ہے پہلے یہ پل ۱۹ گز کا تھا بعد میں (۱۹) فیٹ اور بڑھایا گیا اور چوڑا ایسا لگایا ہے کہ معلوم نہیں دیتا۔ اس پل کا نام لوتھین برج ہے۔

شاہ آبادانی صاحب کا مزار

سنہ ۱۱۲۰ھ

پچکیوں کے سامنے میدان میں جانب غرب نہر کے شمالی کنارے پر شاہ آبادانی علیہ الرحمۃ

مرزا ہے۔ آپ مستند اولیاء میں سے مانے جاتے ہیں چشتیہ مجددیہ نقشبندیہ ہر سہ سلسلہ میں آپ اجازت رکھتے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے آپ کے والد بزرگوار میاں نور جمال سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ شاہ صاحب سنہ ۱۱۵۱ء میں پیدا ہوئے سن رشد کو پہنچنے کے بعد دہلی تشریف لائے اور مولانا محمد ذکریا علیہ الرحمۃ کے مرید ہوئے جو اپنے زمانے کے عارف کامل تھے۔ مولانا کے وصال کے بعد شاہ صاحب مرجع خلائق بنے مولانا فخرالدین علیہ الرحمۃ سے صحبتیں رہیں۔ آپ نے ۶۹ سال کی عمر میں ۱۸ ربیع الثانی سنہ ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی۔ اب تک آپ کا عرس ہوتا ہے۔ چونکہ آپ کا مزار فوجی حدود میں ہے اجازت لینی پڑتی ہے قلعے کے لاہوری دروازے سے نکل کر ایک رستہ قلعے کے پاس شمالی جانب میں دریا کی طرف چلا جاتا ہے دوسری سڑک خندق سے ملی ہوئی جنوبی دروازے کی طرف آتی ہے۔ تیسری بیچ والی سڑک نہایت چوڑی اور وسیع سیدھی مسجد فتح پوری تک چلی گئی ہے۔ سوائے گھنٹہ گھر کے اور کوئی چیز بیچ میں حائل نہیں ہے یہی چاندنی چوک کا شارع عام ہے سراوگیوں کے مندر کے پاس چوراہہ پڑتا ہے۔ چاندنی چوک والی سڑک کو چھوڑ دیجئے ٹھنڈی سڑک کو لیجئے جو پنچکیوں سے ہوتی ہوئی کشمیری دروازے کو نکل جاتی ہے۔ یہیں پنچکیاں تھیں جو نہر کے زور سے چلتی تھیں اور دہلی میں شہر بھر کا آٹا پستا تھا۔ یہ وہی نہر تھی جو چاندنی چوک پر اسی نام سے مشہور تھی اور کہیں سعادت خاں کی نہر بن جاتی تھی۔ اب پنچکیاں بیکار ہیں شہر بھر میں متعدد آئیل انجن ہیں اور سب سے بڑھکر گنیش فلور ملز اور کئی اور ملز۔ آٹا تو آٹا سٹیم میں وہ طاقت خدا نے دی ہے منٹوں میں سارے شہر کو پیس کر دھر دے۔ پرانا زمانہ گیا بادی اور آبی چکیوں کی جگہ اب بھاپ اور اس سے بڑھکر برقی قوت وہ کام کر رہی ہے کہ انسان کی عقل دنگ ہے۔ یہ زمانہ آسمان پھاڑ کے تھگلی لگانے کا ہے۔ جو بات نہ ہو جائے عجیب نہیں ہے۔ اب پھر چاندنی چوک میں آئیے تو بائیں جانب حویلی جگل کشور ہے کٹڑہ شہنشاہ۔ دریبۂ خورد ہے۔ اس سے آگے موتی بازار کا دروازہ ہے جو دریبۂ خورد میں نکل جاتا ہے اور دوسرا رستہ نابوالڑے سے بنی لوہانی سڑک پر

جانکلا ہی اور مالی واڑے میں رائے بہادر لالہ سری کشن داس صاحب ساہو کار جوگڑ والے مشہور ہیں عالی شان مکان ہی جو دہلی کے مشہور ساہو کار اور رئیس ہیں۔

بینک آف بنگال سا ئینشہ کا ہوا ہی روشناس۔ اب عیارِ آبروئے زر کھلا مختلف مقامات پر رہا ہی پہلے موری دروازے تھا پھر کشمیری دروازے رہا پھر چاندنی چوک کے ایک کٹڑے پر تھا آخر کار بینک نے سینٹ اسٹیفنز زنانہ ہاسپٹل کی عمارت خرید لی جو سنگ سرخ کی بہت سنگین سہ منزلہ نہایت خوش نما بنی ہوئی ہی ہسپتال کی عمارت ۱۸۸۴ء میں بہ صرف زرِ کثیر پادری ونفلڈ صاحب کی میم کی یادگار میں بنائی گئی تھی۔ اس کا تعلق بھی ایس پی جی مشن سے تھا۔ اب ہسپتال شہر کے باہر تیس ہزاری باغ کے میدان میں چلی گئی ہی۔ شہر کی بعدت بیماروں کی زحمت پھر عورتوں کی نقل و حرکت کا کچھ لحاظ نہ کیا گیا۔ پردہ نشین عورات کے لئے ہوئی نہ ہوئی برابر ہی تا تریاق از عراق آوردہ شود مارگزیدہ مردہ شود۔ اسی طرح چاندنی چوک میں اور بہت سے بنک ہیں جن میں سے بعض مشہور بنکوں کے نام یہ ہیں:۔ چارٹرڈ بینک الہ آباد بینک۔ نیشنل بینک آف انڈیا۔ کمرشل بینک۔ بینک آف اپر انڈیا پنجاب نیشنل بینک۔ مرکنٹیل بنک۔

کٹڑہ دھولیہ یہ وہ مقام ہی جہاں سے دسمبر ۱۹۱۲ء میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا تھا۔ اس کے آگے بائیں جانب کٹڑہ نوری شنکر۔ کٹڑہ نواب صاحب یعنی رکن الدولہ۔ داہنی طرف کوچہ سنگھیاں۔ کچا باغ۔ بائیں طرف کٹڑہ چوباں۔

اشرفی کا کٹڑہ بائیں طرف یہ کٹڑہ ہی جس میں کپڑہ فروشوں کی تھوک فروشی کی دکانیں ہیں۔ ادھا اسی سے ملا ہوا ہی کٹڑہ بنگی ہی۔

نقشہ گھنٹہ گھر و ٹاؤن ہال وغیرہ
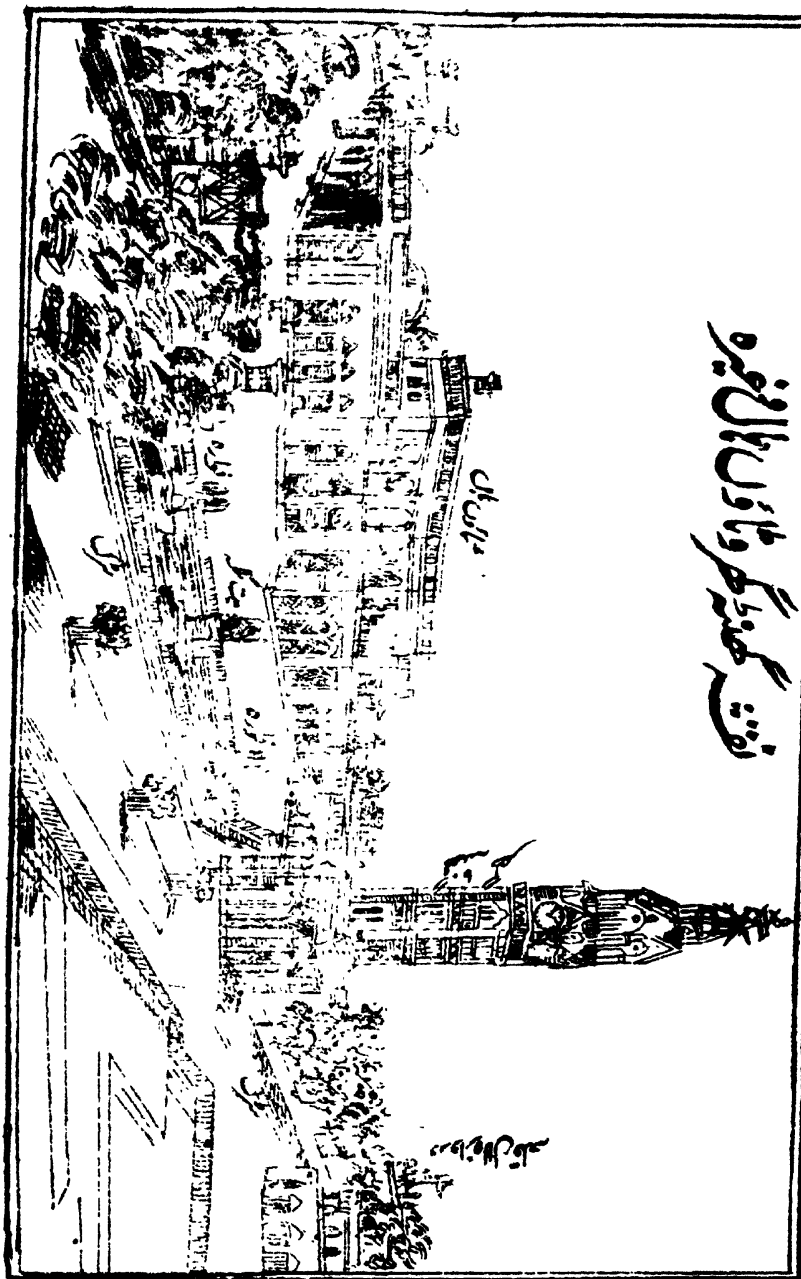
نٹووں کا کوچہ

گھنٹہ گھر سے پہلے ملکہ کے باغ کی مشرقی دیوار سے ملا ہوا داہنے ہاتھ کی طرف یہ ایک بڑا محلہ ہو جس میں اب ہنود اور مسلمان دونوں رہتے ہیں مسلمانوں میں سادہ کار۔ مستور رہتے ہیں اور چند کارخانے ڈھلیتوں کے ہیں۔

گھنٹہ گھر
سنہ ۱۸۶۸ء

غافل تجھے گھڑیال یہ کرتا ہی منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی

قلعے کے لاہوری دروازے سے لے کر فتح پوری تک سارے سایہ دار درخت کاٹ کر میدان صاف ہوگیا ہو۔ سایہ اب نام نہیں رہا۔ گرمیوں کے دنوں میں غالب کے یہ شعر بے ساختہ وہاں سے نکلیں گے ؂

رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاں دار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

آدمی سائے کو ترسیں گے ؂

جانب سایہ شدہ مردم رواں — سایہ بدنبالہ مردم دواں

اب اس حق ہو کے میدان میں حضرت گھنٹہ گھر صاحب تن تنہا ٹٹروں ٹوں کھڑے ہوئے حق اللہ پاک ذات اللہ پکار رہے ہیں۔ گھنٹہ گھر کے مشرق اور مغرب میں دو چھوٹے چھوٹے سنگ مرمر کے لمبوترے حوض کنڈالیوں کی طرح کے بنے ہوئے ہیں جن پر ذیل کے کتبے اردو انگریزی میں ہیں۔ مشرق کی طرف۔ یہ کھیل واسطے مویشیوں کے پانی پینے کے لالہ ابھے پرشاد صاحب آنریری سکرٹری پنجرا پول و آنریری مجسٹریٹ دہلی نے سنہ ۱۹۱۲ء میں تیار کرائی۔ مغرب کی طرف۔ یہ کھیل لالہ مدن موہن لال کھتری خلف لالہ رام چند صاحب نے سنہ ۱۹۱۲ء میں تعمیر کرائی۔ یہ گھنٹہ گھر نہایت بلند اور خوب صورت مربع مینار ہو جس کے نیچے کے حصے میں چاروں طرف در ہیں

اس میں تخمیناً پچیس ہزار پانسو روپیہ لاگت آئی ہے۔ اس میں بہت بڑا گھر بجنے والا گھنٹہ لگا ہوا ہے جس کے ڈائل یعنی سوئیاں چاروں طرف ہیں۔ پاؤ آدھا پونا سب بجاتا ہے۔ گھنٹے کی قیمت پانچ ہزار اٹھارہ روپیہ ۳ر۶ پائی دلی آکر پڑی گو گھنٹے کی آواز بلند ہے اور ہوا کے رخ پر دور دور جاتی ہے گو اتنے بڑے شہر میں صرف ایک گھنٹہ گھر سارے شہر کو چوکنا رکھنے کو بالکل ناکافی ہے۔ اس کے اوپر ایک چھلی بنی ہوئی ہے۔ جو اسمات اربع تبلاتی ہے۔ جہاں اب گھنٹہ گھر ہے کسی زمانے میں یہاں ایک ہشت پہلو حوض تھا جس کے چاروں طرف سو سو گز میں مثمن بازار تھا در اصل یہی چاندنی چوک تھا۔ اس چوک کے گرد نصف دائرے کی شکل میں اب بھی بزازوں کی دکانیں ہیں اور شام کو سودے والے بیٹھتے ہیں۔ جب سے نہر بند ہو گئی اور بیچ کی پٹڑی توڑ دی گئی بازار کی رونق جاتی رہی ورنہ اس پٹڑی پر قلعے کے لاہوری دروازے سے لے کر فتح پوری کی مسجد تک سودے والے۔ ترکاری فروش۔ میوہ فروش۔ کپڑے والے شربت والے کثرت سے بیٹھتے تھے پٹڑی کے ٹوٹ جانے سے اُن کا شیرازہ بکھر گیا جس کے بینگ جہاں سمائے چلا گیا چاندنی چوک میں جو جامعیت تھی اور زبان زد خلائق تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا وہ سب اب خواب خیال کی سی باتیں ہیں۔ بیچ کی چوڑی سڑک سواریوں کی آمد و رفت کے لیئے ہے دائیں بائیں دکانوں کے سامنے چوکوں کی پٹڑیاں بنا دی ہیں وہ پیدل رہ روؤں کے واسطے مخصوص ہیں۔

نئی سڑک (اجرٹن روڈ)

چاندنی چوک میں گھنٹہ گھر سے جنوب کو یہ نئی سڑک نکلی ہے جس کا انگریزی نام اجرٹن روڈ ہے۔ یہ بھی دلی کا پر رونق بازار ہے جو دوسری طرف شاہ بولا کے برطے کے پاس سے جا نکلی ہے۔ اس میں۔ بزاز۔ گھڑی ساز۔ درزی۔ شال دوز وغیرہ پیشہ وروں کی دکانیں ہیں۔ گھنٹہ گھر سے جاتے ہوئے داہنے ہاتھ کو کٹڑہ دھوبی، مسجد حوض والی۔ کوچۂ خان چند۔ گلی حاجی علی جان پٹھوسے۔ گلی بیل والی۔ بائیں ہاتھ کو کٹڑہ بھنگی۔ کٹڑہ بہشتی واس۔ گلی جوتے والاں۔ مالی واڑہ۔ کٹڑہ غفور بخش معروف بہ کٹ پیس مارکٹ جسے عموماً کٹڑہ سیٹے والاں کہتے ہیں۔ روشن پورہ جو ایک وسیع محلہ تھا جس کے بیچ میں سے نئی سڑک نکل جانے سے کچھ حصہ سڑک کے

اس طرف رہا کچھ اس طرف محاذ میں ہو گیا۔ اور اسی میں چھتۂ تن سکھ رائے
اور پھر چیبرے خانہ ہے۔ جس میں حضرت شاہ صدر جہاں علیہ الرحمہ کا مزار ہے
آپ قادریہ خاندان کے بزرگ ہیں۔ آپ کا وصال سنہ ۱۱۰۸ھ میں ہوا۔ ۱۲۔ ۱۳ ذی الحجہ کو
عرس ہوتا ہے۔ روشن پورے میں لب سڑک داہنی طرف بابو مدن گوپال بیرسٹر
کی کوٹھی ہے۔ جن کے صاحب زادے لالہ سری رام ایم اے مشہور مصنف
خم خانۂ جاوید ایک لائق باپ کے لائق بیٹے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر بائیں
جانب میونسپل بورڈ سکول ہے۔ اب نئی سڑک ختم ہوئی اور ہم شاہ بولا کے
بڑکے پاس چاوڑی بازار میں نکل آئے۔

بیگم یا ملکہ کا باغ

سنہ ۱۰۶۰ھ
۱۶۵۰ء

بعالم چنیں باغ نامد پدید۔ نہ قصر این چنیں چشم افلاک دید
خیاباں کز و چشم بد باد دور۔ کتاب چمن راست بین السطور
زہر مصرعۂ شاخ گل بے درنگ۔ برآورد سر معنی رنگ رنگ

صبا نکہت غنچہ وا می کند — گریبانِ صبرم قبا می کند
کماندار شاخ چمن بستہ صف — دلم در رہِ تیر حسرت ہدف
شکر خندۂ غنچۂ یاسمن — نمک می زند بر دلِ ریش من
زفیض ہوائے لطافت نقاب — ز شبنم شود شکر صبح آب
ز خاکش اگر اوج گیرد غبار — ہوا رہ کند ابرِ یاقوت بار
ز کیفیت اعتدال ہوا — دمِ روح در آستینِ صبا

یہ باغ دراصل شاہ جہاں بادشاہ کی چہیتی اور تیسری صاحب زادی
جہاں آرا بیگم[1] نے سنہ ۱۰۶۰ھ ۱۶۵۰ء میں بنوایا تھا جو چاندنی چوک کے بازار میں

---

[1] جہاں آرا بیگم شاہ جہاں بادشاہ کی بیٹی تھی اس کی ماں ممتاز محل کے نام کو تاج بی بی کے
دو حلقے نے غیر فانی بنا دیا ہے ۲۱ صفر سنہ ۱۰۲۳ھ ۱۶۱۴ء بدھ کو جب یہ پیدا ہوئی اس کا باپ شہزادگی
کے عالم میں چتوڑ فتح کرنے گیا تھا۔ اس تقریب پر اس کے دادا جہانگیر بادشاہ نے
بہت خوشی منائی ہوش سنبھالنے پر جہاں آرا کو مذہبی تعلیم دی گئی اور اس کے بعد اس نے
فارسی عربی میں دستگاہ حاصل کی۔ یہ شاہزادی اپنے باپ کو بہت عزیز تھی بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ

گھنٹہ گھر کے سامنے تھا۔ اس باغ کی وضع قطع میں بسبب مرور زمانے کے بہت کچھ تغیر و تبدل ہو گیا ہے۔ باغ کا طول ۹۷۰ گز اور عرض

جب اس کی موت کا وقت قریب ہوا تو وصیت کی کہ اس کے متروکہ میں سے نصف جہاں آرا کو دیا جائے اور باقی نصف چاروں بیٹوں شجاع، مراد، دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں تقسیم کر دیا جائے۔ ۱۰۵۳ھ میں شاہجہاں نے حکم دیا کہ اس کا جشن سالگرہ منعقد کیا جائے۔ قلعۂ معلیٰ کی خاص طور پر سجاوٹ کی گئی اور دربار خلافت میں نہایت ہی بڑے پیمانے پر تیاریاں شروع ہوئیں کہ عین سالگرہ کے دن محل میں جہاں آرا کا دامن شمعدان سے چھو گیا جس سے تمام کپڑوں میں آگ لگ گئی اور سارا بدن جل گیا۔ شاہجہاں نے جو سنا تو گھبرایا ہوا اندر آیا اور جہاں آرا کا سر اپنے گھٹنے پر رکھ کر بہت رویا۔ خوشی کے بدلے کہرام مچ گیا۔ بادشاہ نے رد بلا کے لیے ساٹھ ہزار روپیہ اسی وقت خیرات کیا اور بڑے بڑے حاذق اطبا کا علاج معالجہ خاص اہتمام سے شروع ہوا۔ ایک انگریز ڈاکٹر بوٹن نامی جو فن میں کمال رکھتا تھا سورت کے بندر میں آیا ہوا تھا بادشاہ نے اسے طلب فرمایا۔ ہر رات ایک ہزار روپیہ کا توڑا شاہزادی کے سرہانے رکھا جاتا اور صبح کو فقیروں کو بانٹ دیا جاتا۔ جہاں آرا بے چاری پورے پانچ مہینے صاحب فراش رہی اور بادشاہ متواتر غمگین رہا۔ خدا خدا کر کے شاہزادی کو صحت ہوئی جس کی خوشی میں بادشاہ نے وہ عظیم الشان جشن کیے جن میں ایک کروڑ روپیے کے قریب خرچ ہوا۔ ڈاکٹر بوٹن جس کے علاج سے غسل صحت ہوا تھا چاندی میں تلوایا گیا اور اس خدمت کے صلے میں ایک فرمان ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام شرف صدور پایا کہ ملک بنگال میں بلا مزاحمت احدے کوٹھیاں کھول کر تجارت کریں۔ شہزادی کے غسل صحت کی تہنیت میں حاجی محمد خاں قدسی نے بادشاہ کے حضور میں ایک قصیدہ گزرانا پانچ ہزار روپیہ سے سرفراز ہوئے اس قصیدے کی ایک بیت یہ ہے:-

تا افسردہ از شمع چنیں سینۂ ادبی   پروانہ ز عشق شمع را سوختہ است

اگرچہ جہاں آرا ناز و نعم کی پلی ہوئی لاڈلی بیٹی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاہزادی تھی جتنا غرور کرتی اور کھنچتی اور جتنے خرابی کے لچھن اختیار کرتی کم نہ تھا مگر اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں لیکن اس میں غرور نام کو نہ تھا اور ملنساری اور انکساری کا خاص جوہر تھا۔ محل میں ادنیٰ اور اعلیٰ سب اس کے اخلاق حسنہ کے گرویدہ اور ثنا خواں تھے۔ یہی سبب تھا بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ

(۹۰۴۵ گز) تھا۔ اس باغ کی وہ چار دیواری تو اب رہی نہیں جس میں جا بجا برج بنے ہوئے تھے۔ غدر کی لوٹ کھسوٹ میں ٹوٹ پھوٹ گئے۔ اب صرف چار برج رہ گئے

کہ اس نے تمام محل کے دلوں کو مٹھی میں لے لیے تھے۔ چھوٹے بڑے سب اس کی راہ میں آنکھوں کا فرش بچھاتے اور جہاں اس کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ بادشاہ اس پر سے تصدق ہوتا اور آبرو بڑھاتا تھا۔ نفاست پسندی و نازک مزاجی کے باوجود فضول تزک و احتشام ناپسند کرتی تھی۔ عمر بھر عالم شاہزادگی اور جاہ و حشم میں سادگی کا خاص طور پر لحاظ رکھتی تھی۔ جہاں آرا اس قدر صاحب الرائے تھی کہ اس کی گرہ کشائی سے امور ریاست کی گتھیاں اس سے ملک میں کم کھلیں گی۔ ہر بات کے دونوں پہلوؤں پر غور کرتی تھی اور اس سے صحیح نتیجہ نکالتی تھی اس وجہ سے بادشاہ کے مزاج میں بہت دخیل تھی اور سلطنت کے اکثر اہم معاملات اسی کے ہاتھ میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شاہجہاں کسی بات پر اورنگ زیب سے ناراض ہو گیا اور اس کا منصب اس سے لے لیا گیا اور دکن کی صوبہ داری سے معزول کر دیا گیا۔ تمام امرائے دربار اور بیگمات نے سفارش کی مگر شاہجہاں کے کان پر جوں نہ چلی۔ جہاں آرا مزاج شناس تھی موقع و محل مناسب پا کر اس طرح سلسلہ جنبانی کی کہ معاملہ صاف جاگیر بحال اور صوبہ داری پھر مل گئی۔ اس کی سخاوت کے بھی بہت سے قصے مشہور ہیں۔ بڑی عالی حوصلہ بلند خیال تھی۔ مذہب کی سخت پابند تھی۔ قرآن شریف کی تلاوت اور حدیث پاک کا مطالعہ کبھی ناغہ نہ ہوتا۔ خدا ترسی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ یہ شہزادی اپنی مادری زبان ترکی تو جانتی ہی تھی مگر عربی فارسی میں بھی اچھی دستگاہ رکھتی تھی۔ انشا پردازی اور شعر گوئی کا بھی چسکا تھا۔ زیادہ تر فارسی اور کبھی کبھی عربی میں طبع آزمائی کرتی تھی۔ اس کا فارسی کلام فصاحت اور سلاست کا اعلیٰ نمونہ۔ بیہودہ بندش سے پاک۔ مضامین اخلاق و مذہب پر ہیں۔ اس کا زیادہ تر وقت پڑھنے لکھنے ہی کے مشغلے میں گزرتا تھا۔ ایک روز شہزادی باغ کی سیر کر گئی میر سعدی طہرانی لب بام کھڑا تھا۔ بآواز بلند اپنا یہ مطلع پڑھا۔ **مطلع** برقعہ برخ افگندہ برد ناز بباغش۔ تا نگہت گل بیختہ آید بدماغش۔ شہزادی سن کر مسرور ہوئی اور پانسو روپیے دیئے۔ مرزا محمد علی ماہر نے ایک مختصر مثنوی شہزادی کی مدح میں لکھ کر عنایت خاں استاد کے ذریعے سے گزرانی۔ اس پر بھی پانسو روپیے انعام دیئے۔ جس کا ایک بیت یہ ہے:-

بذات او صفات کردگار است

کہ خود پنہاں و فیضش آشکار است

بقیہ صفحہ ۲۳۲

ہیں۔ جن میں سے دو تو باغ کے احاطے کے شمالی رُخ پر موجود ہیں۔ تیسرا اصطبل کے کٹہرے کے پاس ہے اور چوتھا اُس مقام پر ہے جہاں عجائب خانے کے شیر دیکھے جاتے تھے۔ یہ برج بیس فیٹ اونچے اور پندرہ فیٹ بلند چبوترے پر بنے ہوئے ہیں۔ شہر دہلی کی نہر جس کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے سارے باغ میں پھیلی ہوئی تھی جو اب بند کر دی گئی۔ اس باغ میں عجیب و غریب مکانات بسیرگاہیں۔ بارہ دریاں نشیمن بنے ہوئے تھے جن میں سے صرف ایک بارہ دری باقی رہ گئی ہے اور وہ وہی ہے جس میں حیوانات رکھے جاتے تھے اب اس عمارت کا صرف آتا حصہ دستبرد زمانے سے بچ رہا ہے کہ [illegible] ایک کمرہ [illegible] فٹ طول ۳۰ فٹ عرض اور اُنیس فیٹ اونچا ہے جس میں کچھ دنوں لیبریری (کتب خانہ) رہی اب میونسپل کمیٹی کے دفاتر ہیں۔ گو اس باغ کی وہ شان اب نہیں رہی مگر پھر بھی خوش منظر مقام ہے اور شہر کے وسط میں اس سے بہتر سیرگاہ اور کوئی نہیں۔ پرانے درخت کاٹ دیئے گئے نئے نئے چمن لگائے ہیں جگہ جگہ بنچیں پڑی ہیں بیچوں بیچ میں ایک نہایت خوبصورت گول چبوترہ بنا ہوا ہے۔ جس کے ادھر اُدھر ہری گھانس کے تختے ہیں۔ چبوترے کے گرد پھولوں کے گملے دھرے ہیں بیچ میں

شاہجہاں کی زندگی میں تخت کے لیئے بیٹوں میں جو کشاکشی اور خونریز جنگیاں ہوئیں گر آخر اورنگ زیب کو فتح نصیب ہوئی اور شاہجہاں کو عزلت میں بٹھا گئے تو جہاں آرا بیگم نے روشن آرا کے خلاف دنیاوی جاہ و ثروت کو لات مار کر اپنے بوڑھے باپ کا ساتھ دیا اور اُس کی خدمت گزاری سے سعادت دارین حاصل کی۔ جہاں آرا کو صوفیائے کرام سے بڑی عقیدت تھی خود بھی خاندان چشتیہ میں مرید تھی۔ اپنے فارسی میں ایک کتاب مونس الارواح لکھی ہے جو کہ حضرت خواجہ غریب نواز کی لاجواب سوانح عمری ہے۔ ۵ ستمبر ۱۶۸۱ع (۳ رمضان ۱۰۹۲ھ) کو جہاں آرا نے اس جہان کو خیرباد کہا اور اس کا تن خاک سلطان جی کے تلے اسی کے تعمیر کردہ مقبرہ میں سپرد خاک کیا گیا اور اس کا خطاب نواب جنت آب صاحبۃ الزمانی مقرر ہوا۔ یہ مقبرہ درگاہ حضرت سلطان المشائخ میں خالص سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ یہ معمولی سی نفیس عمارت زبان حال سے اپنی آغوش میں [illegible] سونے والی کی نفاست مزاجی کا اعلان کر رہی ہے۔ اس نے وصیت کی تھی کہ میرا تین کروڑ کا اثاثہ درگاہ شریف کے خادموں کو دے دیا جائے۔ مگر اورنگ زیب کی حمایت شعار طبیعت نے اس عذر شرعی کی بنا پر کہ وصیت ایک ثلث سے زیادہ پر نافذ نہیں ہو سکتی صرف ایک کروڑ کا اسباب دیا۔ سنگ مزار پر خاص اسی کا لکھا ہوا شعر کندہ ہے جو کہ یاس اور بے کسی کی زندہ تصویر ہے:۔ بغیر سبزہ نپوشد الخ

(دیکھو مقبرہ جہاں آرا کا بیان)

بیچ پڑے ہیں۔ پہلے بینڈ بجتا تھا اب موقوف ہو گیا۔ یہیں ایک حوض تھا اور اسی کے پاس وہ سنگ مرمر کا حوض تھا جو اب قلعے میں ہے۔ اس حوض میں فوارہ لگا ہوا تھا اور بیچ میں سے نہر رواں تھی۔ اب تمام چھوٹی چھوٹی نالیوں سے پانی دوڑتا اور جا بجا لان یعنی ہری دوب کے تختے مثل فرش مخملیں کے بچھے ہوئے ہیں جن کی گھاس مشین سے کتر کر ہموار کی جاتی ہے۔ ایک طرف چھوٹا سا مکان بنا ہوا ہے جس میں آنریری مجسٹریٹ کچہری کرتے تھے اب خالی پڑا ہے۔ کسی زمانے میں اس مکان میں چڑیا گھر تھا۔ اس باغ کے چھ دروازے ہیں۔ ایک دروازہ ڈاکٹر ہیم چندر کی دکان اور فوارے کی طرف تھا وہ بند کر کے ہارڈنگ لیبریری کے سامنے لگا دیا ہے۔ دوسرا کاٹ کے پل کے سامنے تیسرا حوپائی کی سرائے کے سامنے اور یہیں بیڈن کلب ہے اور دو دروازے چاندنی چوک میں گھنٹہ گھر کے سامنے۔ حال میں ریلوے سٹیشن کے سامنے سے ایک سڑک نکالی گئی ہے اور چونکہ کلارک صاحب کمشنر کی رائے سے نکالی گئی ہے لہذا کلارک روڈ کہلاتی ہے۔

قیصرۂ ہند ملکہ وکٹوریا آنجہانی کا مجسمہ
سنہ ۱۹۰۱ء

ناصر حق شاہ فرشتہ سرشت
یاد بجان تو ز حق آفرین

ملکہ کے باغ میں ٹون ہال اور گھنٹہ گھر کے بیچ میں لب سڑک چاندنی چوک ملکۂ وکٹوریا آنجہانی کا یہ رویں مجسمہ جیمس کوزنز سکنر صاحب نے بنوایا ہے جو ایک بیٹھی ہوئی تصویر ہے۔ جس کے چاروں طرف کتبہ بخط انگریزی و اردو و ناگری ہے:-

انگریزی کتبہ جنوبی رخ پر گھنٹہ گھر کی طرف

Victoria Regina et Imperatrix Given to Delhi by James Cousons Skinner Son of Major James Skinner and grandson of Colonel

James Skinner C. B. February A.D. 1901

(ترجمہ) ملکہ وکٹوریا قیصرہ۔ دہلی کو عطا کیا جیمس کرزن ووسکنہ ولزیجر جیمس سکنر و نبیر جیمس سکنر سی۔ بی۔ فروری سنہ ۱۹۰۱ء۔

انگریزی کتبہ شمال کی طرف

In their prosperity will be our strength in their contentinent our security and in their gratitude our best reward and may the God of all power grant to us and to those in authority under us, strength to carry out these our wishes for the good of our people.

اُردو کتبہ مشرق کی طرف

اُن کی مرفہ الحالی ہماری سلطنت کا استحکام۔ اُن کی رضامندی ہمارا اطمینان اُن کی احسان مندی۔ ہمارا نہایت عمدہ صلہ ہی × خدا ے قادر مطلق۔ ہمکو اور ہمارے ماتحت حکام کو توفیق دے کہ رعایا۔ کی فائدہ رسانی کے بارے میں ہماری نیت ہی اُس کو × پورا کریں +

یہ بت ولایت کے ایک نامور کاریگر کی دستکاری کا عمدہ نمونہ ہی جس کے نصب کرنے میں ڈہائی ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اس مجسمے کی دائیں بائیں طرف دو دل ربا چمن بنے ہیں جن میں دو خوشنما فوارے ہیں۔ ٹون ہال کے سامنے یہ چھوٹا سا ٹکڑا ابھی اچھی خاصی تفرج گاہ بن گیا ہی۔

فیض نہر

سنہ ۱۲۹۱ھ
۱۲۹۱-۹۲ء

دیکھتے ہیں جلوۂ گلہاے رنگا رنگ ہم
مثل نرگس جب تلک ہی اس چمن میں چشم وا
آخرش ہوگا وہی اک دن خزاں کے ہاتھ سے
جو کہ عالم اپنا اس نشو و نما سے پہلے تھا

ہے غنیمت کوئی دم نظارۂ رنگِ بہار
پھر کہاں یہ گلشن اور گل اور یہ سبزہ یہ ہوا

اصل نام اس نہر کا جو شہر میں جاری تھی فیض نہر تھا لیکن یہی نہر عام طور پر سعادت خاں کی نہر کہلاتی تھی مگر کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ سعادت خاں کون صاحب تھے اور ان کے نام پر یہ نہر کیوں مشہور ہوئی۔ یہ نہر ۶۹۱ ھ ۱۲۹۱-۹۲ء میں بزمان جلال الدین فیروز شاہ خلجی موضع خضر آباد سے سفیدوں تک جہاں شاہی شکارگاہ تھی کھولی گئی۔ ۱۰۶۵ھ ۱۶۶۲-۱۱۵۶ء میں شہاب الدین خاں صوبہ دار دہلی نے اس کی مرمت کرا کے "نہر شہاب" نام رکھا۔ ظن غالب ہے کہ امتدادِ زمانہ سے نام میں کچھ تغیر تبدل ہو گیا ہے۔ ۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸-۳۹ء میں شاہجہاں بادشاہ نے پھر اس کی مرمت کرائی اور سفیدوں سے قلعۂ معلی تک اس کی توسیع کرائی۔ پھر ۱۸۲۰ء میں گورنمنٹ انگریزی کی جانب سے مرمت ہوئی اور حال میں بلحاظ حفظان صحت نہر بالکل پاٹ کر بند کردی گئی۔

جہاں آرا بیگم کی سرائے
سنہ ۱۰۶۰ھ ۱۶۵۰ء

عبث دنیائے فانی سے مری جاں دل لگانا ہے
نہیں کے جائیگا کچھ ساتھ یاں سب چھوڑ جانا ہے
مسافر تو ہے اور دنیا سرا ہے بھول مت غافل
سفر ملکِ عدم کا کوئی دم میں کرکے جانا ہے

بیگم کے باغ کے ساتھ یہ سرا بھی بنی تھی۔ باغ تو خیر اجڑا پجڑا موجود ہے مگر سرائے کا سرے سے پتہ ہی نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اسے گورنمنٹ نے ڈھوا کر سارا میدان صاف کرا دیا۔ کیا کرشمۂ قدرت الٰہی ہے۔ کوئی بناتا ہے اور کوئی ڈھاتا ہے اب سرائے کی جگہ دہلی انسٹیٹیوٹ کی عمارت بنی ہوئی ہے۔ گو وہ سرا صفحۂ دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹادی گئی مگر ہم سے کچھ اُس کا حال سن لیجئے۔ اس سرائے کے دو دروازے تھے۔ جنوب رخ کا دروازہ بازار چاندنی چوک کے سامنے تھا دوسرا شمال میں گویا باغ ہی کا دروازہ تھا۔ سرائے کے صحن

میں دو بڑے بڑے کنوئیں اور ایک مسجد تھی۔ صحن کے چاروں طرف دو منزلہ بہت بڑے بڑے کمرے تھے جن میں مسافر کثرت سے اترا کرتے تھے اور پھیری والے سوداگر بھی دکانیں لگا کر سامان فروخت کیا کرتے تھے۔ برنیر نے اس سرا کا حال یوں لکھا ہے کہ "یہ کاروان سرا ایک بڑی چوکون عمارت ہے جس کے چاروں طرف دو منزلہ حجرے ہیں جن کے پیش میں برآمدے ہیں۔ یہ سرا ممالک غیر از بکٹ غیرہ کے تجار کی فرودگاہ ہے۔ یہ لوگ سرا کے حجروں میں بآرام و آسائش بڑی حفاظت سے رہتے ہیں اور چونکہ سرا کا دروازہ رات کو بند ہو جاتا ہے لہذا کسی قسم کا کھٹکا باقی نہیں رہتا"

ٹمون ہال

سنہ ۱۸۶۳ء

طاقِ بلندش بفلک گشت جفت ۔ چوں رسد فلک اندر نہفت
کنگرہ طاقش بزبان دراز ۔ پیش فلک گفت سخنہائے راز

یہ بہت خوش نما اور عالی شان ہال ہے جو سنہ ۱۸۶۳ء میں بنایا گیا۔ آٹھ برس کے عرصے میں کل عمارت مع دوسرے کمروں کے سنہ ۱۸۷۱ء میں مکمل ہوئی ٹمون ہال کے شمالی ہال میں بڑی بڑی محرابیں بنی ہوئی ہیں دیواروں پر بہت عمدہ کام کیا ہوا ہے۔ فرش پہلے پختہ تھا مگر سنہ ۱۹۰۳ء کے دربار میں ساڑھے چار ہزار روپیہ کی لاگت سے سنگ مرمر کا فرش بنایا گیا۔ چوطرفہ بڑی بڑی چوکھٹوں اور گیلریوں میں بڑے بڑے نامور انگریزوں اور بعض ہندوستانیوں کی بڑی بڑی تصویریں ہیں جن میں بعض قد آدم سائز کی ہیں آویزاں ہیں۔ اسی ٹمون ہال میں سرکاری جلسے اور میٹنگ۔ بڑے بڑے لیکچر اور جلسے ہوتے ہیں اس کی بالائی منزل پر پبلک لیبریری تھی جو اب ہارڈنگ لیبریری میں ضم کر دی گئی اور اسی عمارت کے شمال میں ایک کمرے میں ایک مختصر ذخیرہ مردہ جانوروں۔ عجیب عجیب چیزوں اور نادر تصاویر کا ہے۔

ہارڈنگ لیبریری (کتب خانہ)

سنہ ۱۹۰۲ء

کمپنی کے باغ میں شرقی جانب بازار کوڑیا پل کی سڑک پر فوارے سے کچھ آگے بڑھ کے لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل (سنہ ۱۹۰۵-۱۹۱۰ء) کی یادگار میں یہ

لیبریری حسب تحریک جناب ہیلی صاحب بہادر چیف کمشنر صوبۂ دہلی یہ عالیشان اور وسیع عمارت جس پر ایک گنبد ہو بصرف ... بنائی گئی ہو جس سے پبلک مستفید ہوتی ہو اور دہلی جیسے شہر کے لیئے ایسی ہی ایک بڑی اور عمدہ لیبریری کی جو اعلیٰ پیمانے پر ہو سخت ضرورت بھی تھی۔

قابل عطار کا کوچہ

ملکہ کے باغ کی مغربی دیوار سے ملا ہوا اسی طرف ہو۔ اس میں ٹوپی والے پارچہ فروش اور بزاز رہتے ہیں۔ اس میں ایک بڑی مسجد بھی ہو۔

کوچہ رایمان

جو عموماً رحمن کا کوچہ کہلاتا ہو۔ اس کوچے کا دوسرا دروازہ چوبی ہاروں میں نکلتا ہو دور آخری مغلیہ کا بنا ہوا ہو اور اب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب حاذق الملک بہادر کی ملکیت میں ہو۔ اس محلے میں دنداں ساز اور مصور اور زیادہ تر مسلمان رہتے ہیں۔ یہ رستہ ایک برج کی مسجد کے پاس ہوکر بازار بلی ماراں میں جا نکلتا ہو۔ شروع کوچے پر ایک مسجد ہو۔ پہلے یہ مسجد چھوٹی تھی ۱۳۱۰ھ میں غفور بخش صاحب سوداگر پھیرے والے نے اس کو وسعت دے کر دو منزلہ بنوایا اوپر کے درجے میں مدرسہ ہو چھوٹے چھوٹے بچے قرآن شریف پڑھتے ہیں اس مسجد کے جنوب میں ایک بڑا حوض سنگین بنا ہوا ہو جس کے اوپر مکانات ہیں جس میں طلباء رہتے ہیں۔ اس مسجد کی کفالت غفور بخش صاحب ہی کرتے تھے۔ اب اُن کے بیٹے محمد فضل عظیم و محمد کریم الدین متکفل ہیں۔ اسی محلہ میں مولوی جمیل الرحمن صاحب راشد کا مکان ہو جو ایک ذی علم فقیر دوست صوفی منش شخص ہیں۔ آپ سینٹ سٹیفنز مشن کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اب اجمیر شریف میں رہنے لگے ہیں آپ مولوی حافظ حاجی شاہ محمد عبدالرحیم صاحب ہادی قادری کے صاحبزادے ہیں جو بہت بڑے عالم اور صاحب تقویٰ تھے اور آپ نے کئی کتابیں جیسا ان صرفیہ مرآۃ القرآن قرأت و تجوید میں۔ روضۃ النعیم تذویج الایامیٰ وغیرہ وغیرہ لکھی ہیں ملک ہریانہ میں آپ نے بہت کفر و بدعت کو دور کیا اور جھجر ضلع رہتک میں جامع مسجد

اور مدرسۂ قوت الاسلام رحیمیہ آپ ہی کی سعی موفور کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ میں (۵۵) سال کی عمر میں انتقال کیا قد رضی اللہ عنہ ۱۳۰۵ تاریخ وفات ہے۔ آپ درگاہ حضرت خواجہ باقی اللہ میں آسودہ ہیں سڑک بائیں طرف کوچۂ پنچہ پنداں اور کٹڑہ بنارسی داس دیا شنکر ہیں اور داہنی طرف گلی سیدا نیاں۔

کٹڑہ حاجی قطب الدین

اس میں بھی کپڑہ فروشوں کی تھوک فروشی کی دکانیں ہیں۔

محلے بَلّی ماراں

گھنٹہ گھر سے فتح پوری جاتے وقت بائیں ہاتھ کی طرف ایک سڑک پھٹتی ہے۔ یہ بھی شہر کا ایک بازار ہے جس میں متفرق قسموں کی دکانیں ہیں۔

وجہ تسمیہ اس کی کوئی تو کہتا ہے کہ پہلے یہاں دریا بہتا تھا اور بلّی لگتی تھی اس واسطے بلّی ماراں ہوا لیکن زیادہ تر یہ روایت دل لگتی ہے کہ اس محلے میں کثرت سے ملّاح رہتے تھے اُن کی وجہ سے یہ نام پڑا۔ لیکن دلّی والے عوام زیادہ تر بِلّی ماراں بکسر الرار بولتے ہیں جو یقیناً غلط العام ہے۔ سب سے بڑے رئیس اس محلے کے ہمارے مخدوم و مکرم جناب حکیم محمد اجمل خاں نواب حاذق الملک بہادر ہیں اُن کا آبائی مکان جو بجائے خود ایک محلہ ہے یہیں ہے۔ نیز شمس العلماء مولوی محمد عبدالحق صاحب مرحوم مفسر تفسیر حقانی کا مکان بھی یہیں ہے۔ جو نواب صاحب لوہارو کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ اب نواب صاحب لوہارو قاسم جان کی گلی میں رہتے ہیں۔ رئیس حال آنریبل ہز ہائینس نواب سر امیر امیر الدین احمد خاں بہادر فخر الدولہ کے۔ سی۔ آئی۔ ای ہیں۔ آپ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کے بانی نواب احمد بخش خاں تھے وہ مرزا عارف جان بیگ بخاری مغل کے بیٹے تھے۔ مرزا عارف جان بیگ شاہ عالم بادشاہ کے عہد سلطنت میں ہندوستان آئے اور شاہی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اُن کی شادی مرزا محمد بیگ صوبہ دار اٹک کی لڑکی سے ہوئی اور یہ بھی سنا گیا ہے کہ وہ اپنے خسر کے قایم مقام بھی ہو گئے تھے۔ نواب احمد بخش خاں صاحب نے چند سال تک مرہٹوں کی ملازمت کرنے کے بعد راجہ صاحب الور کی

رفاقت اختیار کی۔ راجہ صاحب موصوف نے اُن کو لوہارو کا علاقہ عطا کیا اور لارڈ لیک کے یہاں سفیر مقرر کر کے بھیج دیا۔ نواب احمد بخش خاں کمانڈران چیف موصوف کے ساتھ اکثر معرکوں میں شریک رہے اور اُن کی شجاعانہ کارروائی اور اعلیٰ خدمات خصوصاً معاملۂ عہدنامۂ الور کے صلے میں ضلع فیروزپور میں پانچ محال کی جاگیر مع سند عطا ہوئی۔ مرزا احمد بخش خاں کو خطاب فخرالدولہ دلاور الملک رستم جنگ بھی عطا ہوا تھا۔ اُنھوں نے ۱۸۲۷ء میں انتقال کیا اور قطب مینار دہلی کے قریب مدفون ہوے۔ اُن کے بعد اُن کے بیٹے نواب شمس الدین خاں اُن کے جانشین ہوے مگر بدقسمتی سے فیروزپور والی جاگیر ضبط ہو گئی۔ صرف لوہارو جو راجہ صاحب الور کی طرف سے ملا تھا اس خاندان کے قبضے میں رہ گیا۔ وہ لاولد فوت ہوے اُن کے بعد لوہارو نواب امین الدین احمد خاں و نواب ضیاء الدین احمد کے تحت حکومت رہا۔ من بعد باہمی نااتفاقی ہونے سے ضیاء الدین احمد خاں کو اٹھارہ ہزار روپیہ سالانہ کا گزارا دے کر گورنمنٹ نے ریاست سے سبکدوش کر دیا۔ نواب امین الدین احمد خاں ۱۸۲۷ء میں اپنے والد کے جانشین ہوے اور ۱۸۶۹ء تک حکومت کر کے انتقال کیا جن کے بعد اُن کے بیٹے نواب علاء الدین احمد خاں جانشین ہوے اُن کو ۱۸۷۴ء میں ارل نارتھ بروک گورنر جنرل نے خطاب نوابی عطا کیا اور اُس کے ساتھ ہی خطابات فخرالدولہ دلاور الملک رستم جنگ بھی تسلیم کیے گئے۔ نواب علاء الدین خاں نے ۱۸۸۲ء میں انتقال اور ۱۸۸۵ء میں نواب امیرالدین احمد خاں مسند ریاست پر بیٹھے۔ آپ کے حسن انتظام اور اعلیٰ قابلیت کی قدردانی میں گورنمنٹ سے آپ کو ۲۲ رجون ۱۸۹۷ء میں کے سی آئی ای کا خطاب مرحمت فرمایا۔ آپ نے وائسریگل کونسل اور پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کی کرسی کو بھی زینت دی ہے۔ آپ کا دارالحکومت لوہارو ہی مگر دلی کے باشندے ہیں اور یہاں بھی رہتے ہیں۔ آبادی پندرہ ہزار اور محاصل ریاست کا (۲۷) ہزار روپیہ سالانہ ہے۔

جمال الدین اور **فیض الحسن** صاحبان عطاران اور **ہندوستانی دواخانہ** سب یہیں ہیں۔ اس محلے میں یہ گلیاں ہیں:— داہنی طرف **گلی سوداگران**

گلی گپتے والاں - حویلی حسام الدین حیدر - کٹڑہ بجاریاں - یہیں سے قاسم جان کی گلی کو رستہ جاتا ہے - کٹڑۂ عالم بیگ - مدرسۂ حقانی امینیہ نواب صاحب لوہارو کی کوٹھی کے بالاخانے پر ہے - بارہ دری شیر افگن خاں - بارہ دری اب نہیں رہی گلی اسی نام سے مشہور ہے - گلی رائے بہادر شیو سہائے مل - گلی میراں والی گلی لالہ دل سکھ رائے خزانچی - گلی اور مسجد تعلبی بیگم - نیا بازار جہاں لوہے بیٹھتے ہیں اور جو چاوڑی بازار میں جانکلتا ہے - **بائیں طرف**:- گلی اٹو - دارالعلوم اسلامیہ نعمانیہ دہلی سنہ ۱۳۰۸ھ - مکان حکیم غلام رضا خاں صاحب مرحوم جہاں اب حکیم غلام کبریا خاں صاحب عرف حکیم بھورے فرزند جناب خان بہادر حکیم احمد سعید خاں صاحب مطب کرتے ہیں - مکان جناب حکیم محمود خاں صاحب مرحوم - کوچۂ رائیان کا دوسرا پھاٹک - گلی بتو خاں - پھاٹک رشید خاں جس میں سے مالی واڑے اور نئی سڑک کو رستہ جاتا ہے - کٹڑۂ بلاقل - اب **چرخے والوں کا بازار** شروع ہوا - گلی پاسباں - گلی کالیستھاں - محلہ چرخے والاں اس میں مکان حکیم نواب جان صاحب کا ہے - کوچۂ بی بی گوہر - مسجد سند و گھوسن - آگے چاوڑی بازار -

حویلی حسام الدین خاں حیدر کا پھاٹک

دورِ آخر مغلیہ کا بنا ہوا ہے - حسام الدین حیدر لکھنؤ کے کوئی رئیس تھے - پھر دہلی میں رہنے لگے - ان کے دو بیٹے منظفر الدولہ اور نواب حسین مرزا بہادر شاہ ثانی کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے - نواب حسین خاں لال قلعے کے ناظر تھے -

نیل کا کٹڑہ

عموماً کھتری صاحبان متمول اور خوش حال لوگوں کے مکانات ہیں - اس میں کئی مندر اور دو مسجدیں ہیں جن میں کی ایک بڑ والی مسجد کہلاتی ہے نیل کے کٹڑے کا ایک رستہ باغ دیوار میں نکل جاتا ہے - لالہ شیو پرشاد صاحب سی - آئی - ای جو چھنا مل والے مشہور ہیں ان کا ایک عالی شان مکان بھی اسی کٹڑے میں ہے - جس کے

لمبے لمبے کوٹھے چاندنی چوک بازار کی بہترین عمارت سمجھی جاتی ہیں اور جلسوں وغیرہ کی تقاریب میں اُن پر رنگ برنگ کی بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ لالہ شیو پرشاد صاحب سی آئی ای دلی کے بڑے رؤسا میں سے ہیں۔ آپ کھتری صاحبان میں سب سے معزز اور ممتاز خاندان کے ممبر ہیں یعنی رای بہادر لالہ رام کشن داس صاحب متوفی کے جانشین ہیں۔

کٹڑہ ریوڑی

بائیں طرف۔ پہلے یہاں ایک بڑا محلہ تھا جس میں تارکش کثرت سے رہتے تھے۔ اب تھوڑے مکان رہ گئے باقی مکانات توڑ کر ایک کٹڑہ بنا دیا ہے جو الہ دیا دالوں کا کٹڑہ کہلاتا ہے اس میں مارواڑی کپڑے والے آڑھتیوں کی دکانیں ہیں۔ کٹڑے کے ایک کونے پر ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جو کٹڑہ ریوڑی کی مسجد کہلاتی ہے۔ اور اسی میں میونسپل برینچ سکول ہے۔ داہنی طرف کوچۂ برج ناتھ ہے۔

کوچۂ گھاسی رام

عہدِ مغلیہ کا پھاٹک داہنی طرف ہے۔ جس پر اب مسماۃ دُرگی دختر **کلیان سنگھ** قابض ہے۔ اس میں ہندو ہی ہندو رہتے ہیں۔ جن میں زیادہ تر کھتری ہیں۔

حویلی حیدر قلی خاں

بائیں طرف دورِ آخر مغلیہ کا پھاٹک ہے۔ اب یہاں بھی محلہ بستا ہے جو اس حویلی کے نام سے مشہور ہے اور اس عالی شان دروازے کے مالک چودھری نارین سنگھ ہیں۔ سید حسین علی صاحب ساداتِ بارہ میں سے تھے جو محمد شاہ اور اس کے قبل کے دو بادشاہوں کے عہد کے بڑے مقتدر وزیر تھے اُنھوں نے حیدر قلی خاں کو محمد شاہ کے عہد میں توپ خانے کا کمانڈر مقرر کر دیا۔ حسین علی اور اُس کے بھائی سید عبداللہ کی غیر محدود طاقت اور خود مختاری سے امرا کشیدہ خاطر اور بد دل تھے اور حیدر قلی بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ لوگوں کو گمان ہے کہ حسین علی کے قتل میں بھی شریک تھا۔ یہ بات صحیح ہو یا نہ ہو مگر اتنی بات تو ضرور تھی کہ یہ کھلے خزانے ساداتِ بارہ کی مخالفت پر ہر وقت آمادہ رہتا تھا اور ساداتِ بارہ اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ حسین علی کے قاتل سے بدلہ لیں۔ لیکن حیدر قلی خاں

زبردست تھا اُس نے اپنی خصومت کا اظہار اس طرح پر کیا کہ سید عبداللہ کو قید کردیا وہ بے چارہ قید کاٹتے کاٹتے اور مصیبت جھیلتے جھیلتے چندہی دنوں میں قیدخانے میں مرگیا۔ حیدرقلی خاں بجلدوا اپنی خیرخواہی کے ہفت ہزاری منصب اور اسی قدر سواروں کے مرتبے پر پوہنچے اور معزالدولہ ناصرجنگ کا خطاب پایا۔

مسجد فتح پوری

سنہ ۱۰۶۰ھ ۱۶۵۰ء

بستہ مکاں راجہات وصفات۔ ہم زمکاں فارغ وہم ازجہات
بے ہمہ جاؤ بہمہ جا درون۔ در ہمہ جاؤ زہمہ جا برون

چاندنی چوک کے مغربی سرے پر نواب فتح پوری محل صاحب بیگم شاہ جہان بادشاہ کی بنوائی ہوئی نہایت عمدہ شاندار۔ خوب صورت۔ سر سے پا تک سنگ سرخ کی بنی ہوئی مسجد ہے۔ سارے شہر میں بس یہی مسجد ایک گنبد کی ہے جس کے دونوں جانب اونچی اونچی مینارین ہیں۔ یہ عمارت نہایت مضبوط ہے جس کا بڑا بھاری گنبد دور سے بہت بھلا دکھائی دیتا ہے۔ یہ مسجد پہلے زمانے میں بڑی پر رونق تھی اور جس مقام پر بنی ہے وہ بھی شہر کا مرکز تھا اب بھی اس مسجد کی حالت اچھی ہے اور اس کے گرد و پیش بازار ہے جہاں ہر وقت بھیڑ بھاڑ لگی رہتی ہے۔ مسجد کے تین بڑے بڑے دروازے ہیں جن پر سنگ سرخ کا کنگورہ اور ادھر ادھر برجیاں ہیں ان میں سے ہم مسجد کے وسیع صحن میں داخل ہوتے ہیں جو اسی گز مربع ہے اور جس میں تمام سنگ سرخ کے چوکے بچھے ہوے ہیں۔ شمال اور مشرق کی طرف کے دروازے تیس فیٹ اونچے اور ستائیس فیٹ چوڑے ہیں۔ جنوب کی طرف کا دروازہ ستائیس فیٹ مربع اور صرف دس فیٹ گہرا ہے۔ اس دروازے کی ڈیوڑھی آٹھ فیٹ چوڑی اور گیارہ فیٹ اونچی ہے۔ مغرب کی طرف اصل مسجد کے دُہرے دالان ہیں جس کے دائیں بائیں بڑے بڑے کمرے ہیں۔ مسجد کی ہر جانب مسلسل دکانیں ہیں جس میں سے مشرق اور شمال کی طرف علاوہ دکانوں کے دو منزلہ بڑے بڑے شاندار کمرے بعد میں بنائے گئے ہیں جن میں مختلف تاجروں وغیرہ کے آفس رہتے ہیں اور بیش قرار کرایہ پر

نقشہ مسجد فتحپوری
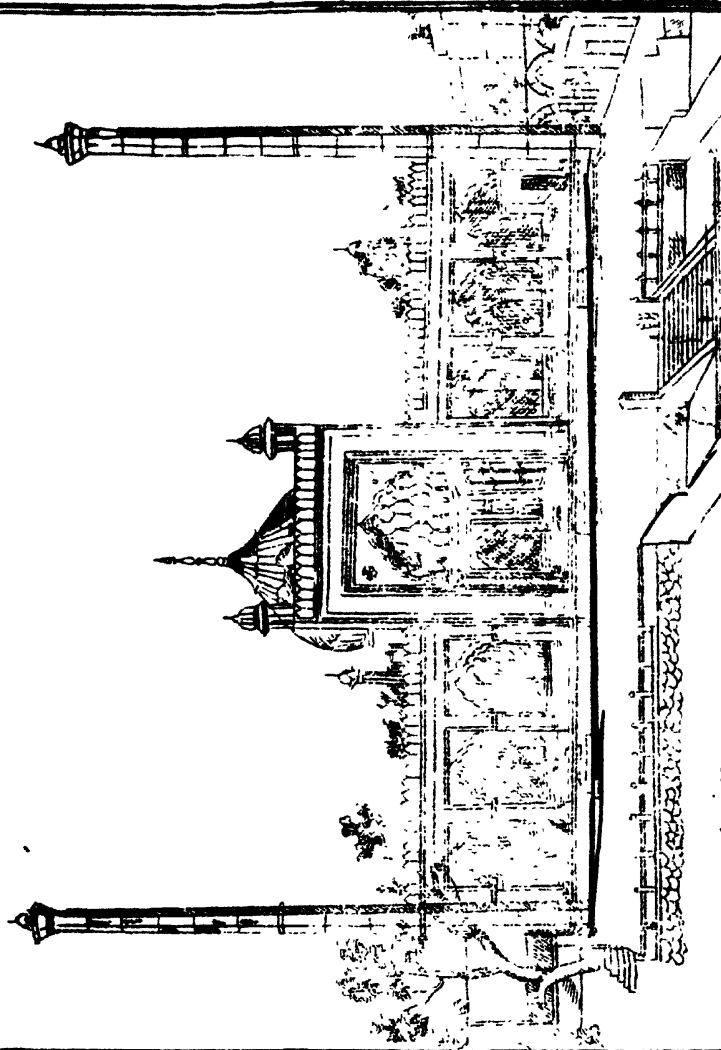
دیئے جاتے ہیں۔ صحن مسجد میں ایک بہت بڑا حوض ۱۶ گز × ۱۴ گز ہے۔ حوض اور
مسجد کے درمیان کا چبوترا ۱۲۰ × ۹۰ فٹ ہے۔ اب تو سارے صحن میں فرش
ہوگیا ہے اور جتنی دکانیں مسجد کے احاطے کے اندر تھیں سب نکال کر کل حصّہ
مسجد میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اصل مسجد ۳½ فٹ اونچے چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔
جس کے دالان ۱۲۰ × ۴۰ فٹ ہیں۔ پیش طاق یا صدر محراب بہت اونچی اور گہران میں
۱۶ فٹ ہے۔ اس پر بھی کنگورا اور دونوں طرف بڑی بڑی بُرجیاں ہیں اور اسی طرح
مسجد کی پچھیت میں چار چھوٹی چھوٹی برجیاں ہیں۔ محراب اور برجیوں پر سنگ
مرمر کی پٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ مسجد کا ایک ہی بڑا بھاری گنبد ہے جس پر بڑی نفاست
سے استرکاری کی ہوئی ہے اور سیاہ اور سفید دھاریاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس گنبد کا
کلس بھی چونے گچی ہی کا ہے۔ پیش طاق کے ہر دو جانب بارہ فیٹ کے فصل
سے دو دو دالان تین تین دروں کے بنگڑی دار محرابوں کے ہیں جو تیس فیٹ
اونچے اور دس فیٹ چوڑے ہیں۔ ان کی چھتوں پر بھی کنگورا ہے۔ مسجد کے
دونوں مینار اسّی اسّی فیٹ بلند ہیں جن کی برجیاں پہلے پتھر کی کھلی ہوئی تھیں
بعد میں چونے گچی کی بنا دی گئیں۔ مسجد کی چھت کے تینوں طرف کنگورا ہے۔
مسجد کے عقب میں چار مینار سنگ سُرخ کے صرف دس دس فیٹ اونچے ہیں
جن پر کنول بنے ہوئے ہیں۔ کنگورے کے نیچے چوڑا سنگیں چھجہ ہے لیکن پیش طاق
کے سامنے کنگرہ ہونے سے نہیں ہے۔ مسجد کے پیش طاق اور نیز دوسرے دروں کے
سامنے تین تین سیڑھیاں ہیں۔ تمام ستونوں کے بالائی اور زیرین حصّے پر
نقش و نگار کھدے ہوئے ہیں۔ مسجد کا گنبد پھیلا ہوا کوٹھی دار وضع کا ہے۔
جو پتھر اور گچ کے چار فیٹ اونچے اسطوانے پر قایم ہے۔ گنبد سنگ خارا کا ہے جس پر
ایسی استرکاری کی گئی ہے کہ دور سے سنگ مرمر کا معلوم دیتا ہے اور سیاہ اور سفید
آڑی دھاریوں نے اسے اور پُر رونق کر دیا ہے۔ ممبر سنگ مرمر کا ہے جس کی چار
سیڑھیاں ہیں۔ اس مسجد میں بس خالص سنگ مرمر کی یہی ایک چیز ہے۔ مسجد کے
صدر دالانوں میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ مسجد کی دونوں جانب سنگ سرخ
کے ستونوں کی قطاریں تھیں جس سے مسجد کے دو طرفہ دو حصّے الگ الگ ہو گئے ہیں

کچھ عرصہ ہوا کہ مسجد کی چھت کی حالت مخدوش ہو گئی تھی اس سبب سے پتھر کے ستونوں کی اور دو قطاریں بیچ میں بطور اڑواڑ کے مضبوط کر دی گئی ہیں۔ قدیم ستون سنگ سرخ کے ہیں اور اُن کے بیچ میں یہ ستون جو لگائے گئے ہیں وہ سفیدی مائل سنگ خارا کے ہیں گو ذرا پتلے ہیں مگر شاندار ہیں اسی طرح پیچھے دار کو دوسری قطار لگائی گئی ہے اور پچھیت کی دیوار میں بھی اڑواڑ کے ستون اس خوبی سے لگائے گئے ہیں کہ کوئی بدنمائی نہیں معلوم دیتی جس طرح ممبر کے پاس گہری محراب ہے اسی طرح دونوں جانب کے قطعات میں بھی ایک ایک دیوار دار محراب ہے۔ مسجد کا درمیانی حصہ جو گنبد کے نیچے ہے چالیس فیٹ مربع ہے اور اس کے دونوں جانب کے حصے کچھ زیادہ لمبے ہیں مسجد کے شمال اور جنوب میں دونوں طرف سے آنے جانے کا ایک ایک دروازہ بعد میں نکالا گیا ہے جو ۱۴ اونچا اور دس فیٹ چوڑا ہے۔ کتبۂ ذیل مرمت کے بعد پیش طاق کے اوپر سنگ مرمر کی تختی پر کھدا ہوا ہے:-

دید چوں ایں مسجد رفعت پناہ (۱۲۸۹ھ ۔ ۱۸۷۲ء) پشتِ گردوں خم پئے تعظیم شد
سالِ ترمیم از سر لوحش بگفت مسجد عالی نکو ترمیم شد

بجانب حاجی محمد تقی باہتمام حاجی قطب الدین و غلام محمد طالبان دعائے خیر

بانیہ مسجد جزاہا اللہ احسن الجزا رے بڑی پیش بینی کی کہ مسجد کے تینوں طرف متعدد دکانیں بنوا دیں جس کی معتدبہ آمدنی سے مسجد کے مصارف باحسن الوجوہ چلتے ہیں ورنہ آج اس مسجد کی حالت بھی دوسری مساجد کی طرح چندوں اور خیرات کی محتاج ہو جاتی۔ غدر کیا آیا تھا گویا دلی پر قہر خدا تھا یہ خانۂ خدا بھی اُس کی زد میں آگیا اور نہ صرف دکانیں ضبط کر لی گئیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ اُنتیس ہزار کو نیلام بھی ہو گئیں بھلا مسلمانوں میں اتنا دم کہاں تھا کہ لیتے لالہ چھنّامل صاحب نے جن کا شمار دلی کے بڑے رئیسوں میں تھا اُنھوں نے جھٹ خرید لیں مسلمان منہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ تازہ تازہ غدر ہوا تھا انگریزوں کے دلوں میں بھی غصہ بھرا ہوا تھا کسی نے داد فریاد نہ سنی۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں انجمن راشد بن صلح کل اسلامیہ کی طرف سے جائداد وقفی اور تنسیخ نیلام کی درخواست دی گئی۔ حاکم وقت تھا

رحم دل اور مہربان مل گئی۔ گورنمنٹ نے لالہ کو پانچ آنے سیکڑا سود کے حساب سے ایکلاکھ دس ہزار روپیہ دیکر دکانیں خریدنا چاہیں اور اسکے معاوضہ میں ایک موضع تحصیل پلول میں دینا چاہا مگر لالہ صاحب نے انکار کیا۔ ۱۸۹۴ء میں اس جائداد کا کرایہ بذریعۂ تحصیل وصول ہوکر سرکار میں جمع ہونے لگا۔ ۱۲۹۵ھ میں کرایہ مجتمعہ اور اُس موضع کی آمدنی سے جو پچیس ہزار میں نیلام ہوا ایک لاکھ دس ہزار روپیہ اصل وسود لالہ صاحب کو دے کر باقی پندرہ سو روپیے اور مسجد کی کل جائداد گذاشت کرکے مسلمانوں کو بن داموں خریدلیا۔ ع شکر نعمت ہائے تو چندان کہ نعمت ہائے تو۔ مسجد کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد فرمایا جس کے دس ممبر مسلمانوں میں کے سربرآوردہ لوگ مقرر ہوئے اور نگرانی ڈپٹی کمشنر صاحب ضلع کی ہے۔ حساب باقاعدہ رہنے لگا۔ اور اب تک وہی کمیٹی ہے جو مسجد کا کام نہایت حزم واحتیاط سے باحسن الوجوہ چلارہی ہے۔ ہم نے مسجد کی پہلی حالت دیکھی ہے کہ احاطے کے اندر لوہیوں کی دکانیں تھیں اور اونٹ گاڑی کا اڈا۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر غرض مسجد میں گھستے ہی دم خفا ہوتا تھا یا اب دیکھتے ہیں کہ سارے میں پختہ فرش ہی نئے نئے دالان بن گئے ہیں۔ جدھر دیکھو اُدھر صفائی یا پہلے کوڑے کے ڈھیر لگے تھے یا اب غلال کو تنکا ملنا مشکل ہے۔ فرش فروش درست جھاڑے وبہارے نکھری ستھری۔ بجلی کی روشنی پانی کے نل۔ سرد وگرم پانی کے سقایے کورے کورے مٹکے اور بدھنیاں دھری ہوئی۔ طہارت خانے دُھلے دھلائے صاف غرض کمیٹی نے اپنے فرض کو اس خوبی سے ادا کیا کہ جس کی مثال مسلمانوں میں ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ ۱۳۲۱ھ میں تمام صحن میں چوکے بچھا دیئے گئے اور وضو کی نالیاں پختہ بنائی گئیں۔ مسجد کے اندروار کی ساری دکانیں کرایہ داروں سے خالی کراکے اس میں لڑکے قرآن شریف پڑھتے ہیں۔ صحن مسجد میں چند قبریں ہیں جن میں حضرت نانو شاہ اور شاہ جلال صاحب کے مزار بھی ہیں۔ قبروں کے گرد تین فیٹ اونچی خام دیوار کا احاطہ تھا جو ازحد بدنما معلوم دیتا تھا اسے تڑواکر چار فیٹ چھ انچ اونچی سنگ سرخ کی جالیاں لگواکر اندر فرش بھی چوکوں کا کرادیا گیا اور ایک خوشنما اور سنگین دروازہ ۶ فٹ اونچا لگاکر مسجد کے صحن کو دلکش بنادیا۔ احاطے کے

اندر جو عارضی دکانیں لکڑی کے تختوں کی بناکر اوپر جست کی چادریں ڈال دی تھیں وہ آخور کی بھرتی سب نکال کر نیلام کر دی گئی یہ سارا کام ۱۳۳۲ھ تک پورا ہوا اور مسجد کی ایک شکل نکل آئی۔ میں نہیں سمجھتا کہ شہر بھر میں اور کوئی مسجد ایسی آراستہ ہو۔ یہ تو بمبئی اور مدراس کی مسجدوں کی طرح دلہن بنی ہوئی ہے۔ ۱۳۳۵ھ میں شمالی رُخ پر ایک سنگ بست دو منزلہ دالان بہ صرفۂ ساڑھے چودہ ہزار اور ۱۳۳۶ھ میں مسجد کے مغربی شمالی کونے میں دوسرا ایک اور دالان بہ صرفہ پندرہ ہزار چارسو چار روپیے کے بن کر طیار ہو گئے جن میں مدرسہ ہے اس کے علاوہ اور جا بجا چھت کے سلیں غدر میں گولوں کے صدمے سے چٹخ گئی تھیں وہ سب درست کرا دی گئیں۔ یہ ساری مرمت اور کام امانی میں زیر نگرانی ممبر صاحبان ہی ہوئے ہیں اور اس خوبی سے ہوئے ہیں کہ کم خواب میں کم خواب ہی کا پیوند لگا ہے یعنی جوڑ میں جوڑ ملا دیا ہے کام چغلی نہیں کھاتا بلکہ ایسا معلوم دیتا ہے کہ یہ دالان مسجد ہی کے ساتھ کے بنے ہوئے ہیں۔ پھر کفایت ایسی کہ اس سے بڑھ کے ناممکن۔ دکانات کا کرایہ پہلے اللہ کے نوسو ۹۰۰ نہ تھا اب السا ہے ہے۔ مسجد اور مدرسہ کا خرچ جا کر بھی کمیٹی کے پاس دس پانچ ہزار کی سلک ہی رہتی ہے جس کا خازن بنک بنگال ہے۔

مزار حضرت میراں شاہ نانوں تخمیناً سنہ ۱۰۶۰ھ

آپ حضرت کلیم اللہ جہاں آبادی علیہ الرحمہ کے ہم عصر تھے۔ آپ کا وطن تھانیسر تھا اور سلسلۂ نسب کئی واسطوں سے شیخ جلال تھانیسری علیہ الرحمہ سے ملتا ہے۔ آپ ظاہری و باطنی کمالات حاصل کر کے دہلی تشریف لائے اور حریم مسجد فتح پوری میں ایک حجرے میں رہا کرتے تھے۔ کثرت سے لوگ آپ سے فیض یاب ہوتے تھے۔ تقریباً اسی سال کی عمر میں آپ کا وصال ہوا اور اسی احاطے میں آپ آسودہ ہیں۔

مزار حضرت شاہ جلال

آپ حضرت نانوں شاہ صاحب کے خلیفہ تھے اور آپ ہی کے حجرے میں بیٹھ کر ساری عمر یاد الہی اور توکل میں بسر کی با ایں ہمہ مساکین اور فقرا کو آپ کی طرف سے کھانا تقسیم ہوتا تھا اور لنگر جاری تھا۔ بعد وفات آپ بھی

اپنے مرشد کے پاس دفن ہوئے - باقی اور مزار آپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ہیں - ان دونوں بزرگوں کا عرس ربیع الاول کی آٹھویں شب اور نویں کو دن میں ہوتا ہے پچیس روپیہ سالانہ بابت مصارف عرس اور دو روپیہ ماہوار جاروب کشی وغیرہ مسجد فنڈ سے دیئے جاتے ہیں -

مدرسۂ عربی اس میں چار مدرس فارسی ایک عربی اور ایک رسی قرآن کل چھ مدرس ہیں - ڈھائی سو روپیہ ماہانہ کا خرچ ہے - مذہبی تعلیم انتہائی درجے حدیث شریف اور فقہ معقول و منقول کی ہوتی ہے - بیرونجات کے طلبا ر کثرت سے ہیں اُن کے روٹی کپڑے کا کوئی سہارا نہیں - گھر گھر سے روٹیاں مقرر ہیں - مسجد فتح پوری کا صحن بہت کشادہ ہے جس میں مغرب کی طرف چھوڑ کر تین طرف حجرے بنے ہوئے ہیں - بازار کھاری باؤلی کی طرف شمالی دروازہ ہے ادھر پندرہ در کا دو منزلہ دالان ہے جس میں مدرسہ ہے اس کے محاذ میں چوڑیوں کے کٹڑے کی طرف جنوبی دروازہ ہے جس کے دونوں جانب آٹھ آٹھ در کے دالان اور حجرے ہیں شرقی دروازہ چاندنی چوک کی طرف ہے جس کے اوپر سفید سنگ مرمر کی تختی پر **مسجد فتح پوری** لکھا ہوا ہے اس دروازے کے دونو جانب چودہ چودہ در کے دالان ہیں صحن کے بیچ میں سنگ مرمر کا نہایت خوش نما حوض ہے اور اسی کے پاس نان نوشاہ وہلال شاہ صاحب کے مزارات ایک احاطے کے اندر ہیں - جنوبی دروازے کے پاس آبدار خانے اور طہارت خانے ہیں اور یہیں ایک خام کیاری اور قدیم کنواں بھی ہے - صحن میں چھ بڑے بڑے درخت ہیں

منشی بھوانی شنکر کا مکان
نمک حرام کی حویلی

مشن روڈ

کوچۂ گھاسی رام - دورِ آخر مغلیہ - یہ بڑی عالی شان حویلی ہے جس کے دو پھاٹک جنوب و مغرب رویہ میں مغرب کی طرف کا پھاٹک بہت بلند اور شاندار ہے جس پر سنگین نشیمن بنے ہوئے ہیں - منشی بھوانی شنکر ذات کے کھتری تھے اور مرہٹہ گردی میں منشی صاحب ہی

بڑے سربرآوردہ رئیس اور دولت مند تھے۔ منشی صاحب پہلے ریاست گوالیار میں بخشی تھے۔ جب مرہٹوں نے دلی پر تسلط کیا تو منشی جی کو ایک بڑی ذمہ داری کی خدمت پر دلی بھجوادیا۔ لیکن منشی جی انگریزوں سے مل گئے اور مرہٹوں نے انھیں اس سازش کے الزام میں موقوف کردیا۔ لیکن انگریزوں نے منشی جی کو پنشن دی جو اُن کی اولاد پر جاری رہی۔ چوں کہ انگریزوں سے وہ مل گئے تھے مرہٹے انھیں نمک حرام کہنے لگے اور ان کا مکان نمک حرام کی حویلی مشہور ہوگیا۔ منشی جی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اُنھوں نے انگریزوں سے شکایت کی جو اس زمانے میں دلی پر قابض تھے۔ چنانچہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے احکام جاری ہوے اور عام منادی کی گئی کہ نہ تو کوئی منشی جی کو نمک حرام کہے نہ ان کے مکان کو نمک حرام کی حویلی۔ لیکن یہ منادی بمصداق الانسان حریص علی ما منع اور رنجک کا کام دے گئی اور ہر شخص کی زبان پر یہی چڑھ گیا۔ بھلا خلق کا حلق کوئی بند کرسکتا ہے۔

کچہری بھوانی شنکر

دورِ آخر مغلیہ۔ بازار فتح پوری۔ چھتہ بھوانی شنکر۔ یہ مکان منشی جی کی کچہری کا تھا یہ نہایت عمدہ شاندار دو منزلہ مکان ہے جس میں متعدد دالان اور کمرے ہیں سٹیشن کی طرف سے جو بڑی سڑک ملکہ کے باغ کے برابر فتح پوری کو آتی ہے اُسی پر یہ حویلی ہے۔ دو منزلے کوٹھے کے بیچ میں ایک برآمدہ نشین کی کی طرح کا آگے کو نکلا ہوا بہت خوش نما سنگین بنا ہوا ہے جس میں پچیکاری کا کام بھی ہے۔ اس حویلی کے دروازے میں ایک بجانب مغرب دوسرا جنوب رویہ چاندنی چوک کی طرف۔ پہلا دروازہ بڑا اعظیم الشان ہے اور یہی بھوانی شنکر کے چھتے کا صدر دروازہ ہے۔

گندی گلی

مسجد فتح پوری سے احمد پائی کی سرائے کو جاتے ہوے بائیں ہاتھ کی طرف ایک بہت لمبی گلی ہے۔ یہاں عموماً کھتری لوگ رہتے ہیں۔ یہ گلی حبش خاں کے پھاٹک میں جاکر نکلتی ہے۔ اس کے بعد گلی لاہوریاں ہے۔

دھرم سالہ لالہ پچھمی نارائن

اسی گلی کے محاذ میں داہنے ہاتھ کو پچھمی نارائن کا دھرم سالہ ہے۔ یہ صاحب آنریری مجسٹریٹ اور میونسپلٹی کے وائیس پریزیڈنٹ تھے۔ اس دھرم سالے میں ہندو مسافر اترا کرتے ہیں۔ آگے چھتہ جان نثار خاں ہے۔

گلی باغ دیوار

گرجا کے سامنے ملکہ کے باغ کی جنوبی دیوار سے لگی لگی جو گلی چلی گئی ہے وہ گلی باغ دیوار کہلاتی ہے یہ گلی نیل کے کٹڑے میں نکل گئی ہے۔ اس کے اندر نہایت عالی شان دھرم سالہ چھنامل والوں کا ہے جلالا امراؤ سنگھ صاحب نے بنوایا ہے یہ نہایت خوبصورت اور مستحکم عمارت ہے اکثر اہل ہنود بیرونجات سے یہاں آکر ٹھیرتے اور آرام پاتے ہیں غربا کے لیئے سدابرت جاری ہے

گرجا سنہ ۱۸۶۵ء

مشن روڈ پر ایس پی جی مشن کا ایک خوشنما گرجا ہے۔ جس کا سنگ بنیاد بشپ صاحب کلکتہ نے سنہ ۱۸۶۵ء میں خود تشریف لاکر رکھا اس کی تعمیر میں ساڑھے اٹھارہ ہزار روپئے صرف ہوئے اور ایک ہی سال میں اتنی بڑی عمارت بن کر طیار ہو گئی۔ اس پر ایک نہایت اونچا چو پہلو منار ہے جس پر ایک بڑا گونجنے والا گھنٹہ لگا ہے۔ اسی کے پاس سنیٹ اسٹیفن کا کتب خانہ بھی ہے جس میں عیسائی مذہب کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔

شب سہائے کی سرائے

جس طرح احمد بائی کی سرا مسلمانوں کی ہے اسی طرح شب سہائے کی سرا سے ہنود صاحبان کی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔

رہ رو ہمیشہ چاہیئے باندھے کمر رہے
دنیا وطن نہیں ہے کہ اسے لپٹ رہے

احمد بائی کی سرائے
سنہ ۱۳۰۲ھ
۱۸۸۴ء

یہ سرائے شیخ احمد بائی پنجابی کی بنوائی ہوئی ہے اس کا

صدر دروازہ ملکہ کے باغ کے غربی دروازے کے سامنے ہے۔ صدر دروازہ اس کا ۲۸ فٹ عمق میں اور گیارہ فیٹ عریض بہت بلند اور شان دار ہے جس کے اوپر کمرہ ہے اور دروازے کی دونوں جانب ایک ایک درا ہے صدر دروازے کی پیشانی پر ایک سنگ مرمر کی تختی پر صرف سرائے شیخ احمد پائے کندہ ہے۔ دونوں سہ دریوں پر یہ اشعار روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں :-

شمالی صحنچی پر
سرائے شیخ احمد پائی ازیں اعوذ بکلمات اللہ التامۃ سز اگر تاریخ تعمیرش بپرسی
خجستہ بربنا شد بہجت آباد کل شیطان الھامۃ ومن عین لامۃ بفرح سرائے جان فزایا

جنوبی صحنچی پر
جب یہ عمارت دلکشا بن چکی اعوذ بکلمات اللہ التامۃ مز سال یوں لکھ از سر جان خرد
یار اسدم طبع نے مجھسے کہا کل شیطان الھامۃ ومن عین لامۃ شیخ احمد پائی کی ہے یہ سرا
سرائے کے اندر غرب میں دس کوٹھڑیاں نیچے ۱۳۰۲ھ

اور اسی قدر اوپر ہیں سامنے برآمدہ ہے۔ یہ برآمدہ ۵ سے ہے۔ جس کی دونوں جانب شمال جنوب میں چھ چھ کوٹھڑیاں دو منزلہ ہیں ان کے سامنے بھی ۵ فٹ کے ٹپے کا برآمدہ ہے۔ صحن ۵۰ فٹ × ۲۸ ہے۔ صدر دروازے کے دائیں طرف لب سڑک پانچ دکانیں اور اوپر دو بالاخانے ہیں اور اسی طرح بائیں طرف دکانیں اور اوپر ایک کمرہ ہے۔ سرائے سے لگی ہوئی ایک مسجد ہے جو احمد پائی کی مسجد کہلاتی ہے اُس کے کنوئیں پر سنگ سرخ کی تختی پر یہ کتبہ ہے۔
"مسجد و چاہ موقوفہ شیخ احمد پائی" یہ مسجد سرائے کے ساتھ بنی تھی یہ تاریخ دوبارہ
۱۳۳۶ھ مرمت کی ہے۔ اب اس سرائے کے مالک
شیخ حاجی محمد یعقوب سوداگر خلف شیخ احمد پائی مرحوم ہیں۔

احمد پائی کی سرائے کے نکڑ پر سے کابلی دروازے تک (کوئینز روڈ)

دلی کی سڑکوں میں چاندنی چوک چھوڑ کر یہ بڑی کشادہ اور سیدھی سڑک جسے کوئینز روڈ یعنی ملکہ کی سڑک کہتے ہیں۔ ریل کے ڈاٹ والے پل لوتھین برج سے لے کر کابلی دروازے تک ناک کی سیدھ چلی گئی ہے اور مٹھائی کے پل

سے جاملی ہو۔ کابلی دروازہ اب نہیں رہا۔ اس طرف کا دروازہ اور فصیل دونوں میدان صاف کرنے کو توڑ دیئے گئے اب کابلی دروازے کا پتہ یہ ہو کہ لاہوری دروازے کے باہر جو نیا بازار بنا ہو اور ایک چوڑی سڑک برٹن سپیچن روڈ نکل گئی ہو اس کے خاتمے پر کوئینز روڈ آکر ملتی ہو یہ دروازہ تھا۔ احمد پائی کی سرائے قصبے نکڑ پہ سے یا یوں سمجھیے کہ ملکہ کے باغ کے مغربی دروازے کے سامنے سے جہاں مشن روڈ اور کوئینز روڈ ملتی ہیں داہنی طرف تو سارے میدان میں ریل پھیلی ہوئی ہو اور ڈوفرن برج ہو۔ بائیں طرف الفنسٹن کیچر پلیس ہو جس میں مستقلاً بائیسکوپ کا تماشہ ہوتا ہو۔ اس کے نہر سعادت خاں کا نام رہ گیا ہو نہر تو بند کر دی گئی۔ نہر پہ کیمبرج مشن کی عالی شان کوٹھی اور نواب وزیر کی بارہ دری کا پھاٹک۔ مولوی حفیظ اللہ خاں کی مسجد۔ آم والی مسجد اور ان کے بیچ میں نراین داس کا مندر اور شوالا ہو۔ ان کے پیچھے گولر والی مسجد، یہیں پولیس سٹیشن ہو یہاں میونسپلٹی نے دو مارکٹ بنائے تھے ان میں سے ایک میں گوشت فروخت ہوتا ہو دوسرا خالی پڑا ہو۔ اور اسی کے پاس ایک گلی بتنوں والی ہو۔

کیمبرج مشن ۱۸۵۵ء

احمد پائی کی سرائے کے پاس ترا ہہ ملتا ہو۔ سٹیشن کی طرف کا رستہ چھوڑ کر شرقی رخ پر کابلی دروازے کی طرف چلیئے۔ بائیں ہاتھ کے رُخ پر نہر سعادت خاں کے اس طرف کیمبرج مشن کی بڑی عالی شان سرمئی رنگ کی وسیع کوٹھی ہو جو ۱۸۵۵ء میں قایم ہوا مگر غدر میں سب معاملہ درہم برہم ہو گیا۔ پھر ۱۸۵۹ء سے از سر نو سلسلہ شروع ہوا۔ مشن نے یہ کوٹھی نیلام میں کوڑیوں کے مول بارہ ہزار میں خرید لی یہ کوٹھی اوائل میں نواب بہادر جنگ کی تھی جو ضبط ہو گئی تھی۔ اس مشن کے متعلق ۱۸۵۹ء میں پادری سکلٹن صاحب نے کلاں مسجد کی طرف ایک مشن کھولا جس کی شاخیں ریواڑی۔ کرنال۔ شملہ وغیرہ مختلف مقامات میں تھیں۔ اسی کے متعلق ۱۸۶۷ء میں ایک زنانہ شفا خانہ کھولا گیا اور ۱۸۷۴ء میں شفا خانے کے لیئے چاندنی چوک میں ایک عالی شان عمارت طیار کی گئی جس میں اب بنک بنگال ہو اور شفا خانہ تیس ہزاری کے باغ

کے میدان میں مٹھائی کے پل کے پاس ایک نئی عمارت میں جو اسی کے واسطے بنائی گئی تھی چلا گیا۔ ۱۸۸۱ء میں ہائی سکول میں جو چاندنی چوک میں تھا کالج کلاس کھولی گئی جو آگے چل کر سینٹ اسٹیفنز کالج ہوگیا اور کشمیری دروازہ کے پاس اُس کی عمارت ہے۔ ۱۸۶۳ء میں عیسائیوں کے لیے متعدد جگہ بستیاں بنائی گئیں۔ پہلی بستی پادری لفرائے صاحب[۵] نے دریا گنج میں تعمیر کرائی دوسری بستی مع گرجا اور مکان کیٹیکسٹ پادری میٹ لینڈ صاحب نے اجمیری دروازے کی طرف طیار کرائی۔ تیسری بستی سبزی منڈی میں بنی۔ اسی مشن کی میمیں اور زنینش ہندوستانی عورات کو گھر گھر پھر کر تعلیم دیتی ہیں۔ سینا پرونا اور موزے گلوبند بننا اور طرح طرح کا کارڈ ھنا بھی سکھاتی ہیں اور مقصد اصلی اُن کا یعنی انجیل پڑھانا اُس کی بھی ترویج دیتی ہیں۔

پھاٹک نہر سعادت خاں

یہ نواب وزیر کی حویلی کا صدر دروازہ ہے۔ دورِ آخر مغلیہ کا بنا ہوا ہے۔ رای بہادر شیو پرشاد سی آئی ای رئیس دہلی کی ملکیت ہے۔ یہ دروازہ دو منزلہ تھا اب کی چھت مخدوش ہونے سے اُتار دی گئی۔ اس پر دو منزلہ کمرے بنے ہوئے ہیں اور رای صاحب کی طرف سے ان کی ترمیم و نگہداشت ہوتی ہے۔ چوں کہ نہر سعادت خاں پر واقع ہے اس واسطے اسی نام سے مشہور ہے اسی کے آگے الفنسٹن پکچر پیلیس ہے جس میں روزانہ بائسکوپ کا تماشہ دکھلایا جاتا ہے۔

بارہ دری نواب وزیر

دورِ آخر مغلیہ پھاٹک نہر سعادت خاں کے پاس حویلی نواب وزیر کے متعلق ایک بارہ دری بنی تھی جس کے درمیانی دالان کا کچھ حصہ۔ محراب دار پھاٹک اور چند ملحقہ حجرے اب تک موجود ہیں اس کی حال میں رای بہادر شیو پرشاد صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ نے بڑے وسیع پیمانے پر درستی کرائی ہے

[۵] یہ صاحب بہت برسوں تک پنجاب کے لاٹ پادری تھے پھر کلکتہ کے بشپ یعنی سارے ہندوستان کے مٹرا پولیٹن یعنی سب سے بڑے لاٹ پادری رہے اسی سال مارچ کے مہینے میں اُن کا انتقال ہوا ہے۔

رنگ محل کے شمالی و مغربی دروازے

پھاٹک نہر سعادت خاں کے پاس۔ رنگ محل کا شمالی دروازہ۔ دورِ آخر مغلیہ کا بنا ہوا لالہ امیر سنگھ وغیرہ کے قبضے میں ہی۔ یہ دروازہ دو دروں کا ہی یہ دروازہ رنگ محل کا تھا جو نواب وزیر کی حویلی کا زنانہ حصہ تھا۔ رنگ محل کے آثار تک بھی اب باقی نہیں رہے بلکہ ساری کی ساری جگہ میں مکانات بن گئے ہیں رنگ محل کے نام کے ساتھ جو کچھ باقی رہ گیا ہی وہ صرف یہ دو دروازے ہیں اور کچھ حصہ دیوار کا باقی رہے نام اللہ کا۔

دل ہی نہ رہا امید کیسی؟
جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

ڈفرن برج سے موری دروازہ۔ چھوٹا دروازہ۔ اور فصیلوں کے برابر برابر والی گلی

ڈفرن برج لارڈ ڈفرن ۱۸۸۴ء - ۱۸۸۸ء میں گورنر جنرل رہے۔ انھیں کے نام پر یہ پل بنا ہی۔ کوئینز روڈ پر ایس پی جی مشن کے آگے داہنے ہاتھ کی طرف ایک چوڑی سڑک موری دروازے کو چلی جاتی ہی اسی کے شروع میں ایک بڑا المبایل ریلوے کی مختلف لینوں پر بنا ہوا ہی۔ پھر کوئینز روڈ آگے وار کابلی دروازے کو چلی جاتی ہی۔

موری دروازہ ڈفرن برج سے اترتے ہی تراہہ ملتا ہی داہنے ہاتھ کی طرف کی سڑک ہیملٹن روڈ کہلاتی ہی اور بائیں ہاتھ کی چھوٹے دروازے کو چلی گئی اور ڈفرن برج کی سڑک سیدھی چلی گئی ہی جہاں فصیل کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہی وہیں موری دروازہ تھا جو رستہ کشادہ کرنے کو غدر کے بعد گرا دیا گیا۔ موری گیٹ کی سڑک پر یہ مقامات ہیں:۔

ڈفرن برج سے اُترتے ہی بائیں طرف دی کراؤن فلور ملز آٹا پیسنے کی گھرنی۔ آگے بڑھ کر اسی سڑک پر راجپوتانہ ریلوے کے قدیم سٹیشن کی عمارت۔ ریل والوں کے کچھ کوارٹر فصیل سے پاس پھوٹا دروازہ جہاں اب کوئی دروازہ نہیں صرف نام باقی ہے اور اسی نام کا ایک بورڈ ٹونگا دیا گیا ہے اب بیرون شہر آگئے۔ اب پھر پلٹ کر ڈفرن برج کو آئیے اور موری دروازے کی طرف چلئے تو۔ داہنی طرف سنیٹ سٹیفنز سکول اندر گلی میں نسا در ل رنگی لال موٹر سیکل ایجنٹ کی بڑی بھاری دکان جس میں پہلے نارتھ بروک ہوٹل تھا۔

بائیں طرف مسجد راسے بیل کوچۂ معظم خاں۔ اونچی مسجد اور مدرسۂ حمیدیہ رحیم اللہ سوداگر بمبئی کی بنائی ہوئی کوچۂ ٹبلاں شیعوں کی مسجد (نواب احمد مرزا صاحب کی) کوچۂ مغلاں رام پور سٹیٹ فیکٹری فرنیچر۔ موری دروازے کے پاس داہنی طرف فصیل کے برابر ایک لمبی سڑک چلی گئی ہے جو اس سرے پر کشمیری دروازے کے پاس جا نکلتی ہے۔ اس گلی کا کوئی خاص نام نہیں اس میں بائیں ہاتھ کو تو مسلسل فصیل چلی گئی ہے داہنے ہاتھ کی طرف یہ عمارتیں ہیں۔ بھارت نیشنل کول ٹریڈنگ کمپنی ڈنلاپ ربڑ ٹایر کمپنی۔ خان بہادر حاجی بخش الٰہی صاحب سی آئی ای سوداگران سگرٹ سول ایجنٹ مسرز ڈبلیو۔ ڈی اور ایچ۔ اوولز وایجنٹ لپٹن کمپنی جہانگیر منزل۔ فرحت منزل ایک معمولی سی اپولو ہوٹل۔ بیچ بیچ میں اور کچھ کوٹھیاں بھی ہیں۔ یہاں ایک گلی ہے جس میں دلی کے مشہور حکیم اشرف علی صاحب کا مطب تھا اب اُن کے صاحبزادے نذیر احمد صاحب مطب کرتے ہیں باپ بیٹے دونوں دہلی کے مشہور معالجین میں شمار کیئے جاتے ہیں۔

بازار کھاری باؤلی

دلی کے مشہور بازاروں میں کا ایک بازار یہ بھی ہے۔ جو اناج کی بڑی بھاری منڈی ہے۔ جس میں لاکھوں روپیہ کا بیوپار ہوتا ہے۔ یہ بازار بہت کشادہ ہے جو مسجد فتح پوری کے شمالی نکڑ سے شروع ہو کر لاہوری دروازے پر ختم ہوتا ہے۔

اس بازار میں زیر مسجد فتح پوری لوہیوں اور سبزی فروشوں کی دکانیں ہیں پھر اناج والوں اور پنساریوں کا سلسلہ ہے۔ آب اس بازار کی سیر کیجئے۔

داہنی طرف۔ کٹڑہ پارچہ (الیشور بھون) اس میں آڑھتی رہتے ہیں۔ کٹڑہ میدگران۔ کٹڑہ جیبن بخش جس میں پنساریوں کے گودام ہیں۔ پھاٹک حبش خاں کٹڑہ تمباکو صدر دروازہ۔ کوچۂ چیلاں۔ کٹڑہ دیاشنکر۔ کٹڑۂ بنسی دھر لاہوری دروازہ۔

پھاٹک حبش خاں

شاہ جہاں کے عہد کا بنا ہوا ہے۔ کھاری باؤلی کے بازار میں ہے اس پھاٹک کے نام سے ہی محلہ مشہور ہوگیا ہے۔ اب اس محلے میں پنجابی کثرت سے بستے ہیں۔ یہ پھاٹک حبش خاں کا بنایا ہوا ہے جن کا اصلی نام سیدی مفتاح تھا۔ یہ شاہجہاں و اورنگ زیب کے عہد میں تھے۔ اس دروازے کی مرمت بعد میں فولاد خاں نے کی جو حبش خاں ہی کی اولاد میں اور جب نادر شاہ نے دہلی پر تاخت کی تو یہی حبش خاں شہر دہلی کے کوتوال تھے۔ سدی مفتاح حبشی النسل تھے اور دراصل وہ نظام شاہی بادشاہان احمد نگر کے غلام تھے۔ ان کا بڑا اعتماد تھا اور قلعہ اودگیر ضلع بیدر مملکت سرکار عالی نظام کے قلعہ دار بھی رہ چکے ہیں۔ سدی مفتاح نے نظام شاہیوں کی طرف سے افواج شاہجہانی کو قلعۂ اودگیر میں گھسنے نہ دیا اور خوب مقابلہ کیا آخر کار مغلوب ہوا اور قلعہ حوالہ کرکے ۱۰۶۴ھ میں زمرۂ ملازمین شاہجہانی میں شریک ہوگیا۔ دربار شاہجہانی سے حبش خاں کا خطاب۔ سہ ہزاری منصب اور پندرہ سو سوار ملے۔

حبش خاں کے پھاٹک کے اندر بہت گنجان اور گھٹا گھٹس آبادی ہے۔ رستہ بالکل تنگ ہے۔ دو گاڑیوں کا گزرنا ناممکن۔ گلیاں اس سے بھی زیادہ سکڑی۔ بنارس کی کیفیت نظر آتی ہے۔ پھاٹک کے اندر دو طرفہ زیادہ وقت کو کو اور عطاروں حلوائیوں وغیرہ کی دکانیں ہیں اور پھر اندر جاکر بڑے بڑے متمول پنجابیوں کے مکانات ہیں۔ دلّی کی تجارت کا بڑا حصّہ پنجابیوں کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھنے کو ان کی دکانیں معمولی نظر آتی ہیں مگر لاکھوں روپیوں کے وارے نیارے ہوتے ہیں۔ ولایت سے براہ راست مال منگوا تے اور ہول سیل اور ریٹیل کی بڑی منڈی ہے۔ **داہنی طرف**۔ مسجد ایک چھ۔ کٹڑہ پیرڑاں گلی

سرس والی جس میں میاں صاحب کا مکان تھا۔ گلی مولوی عبدالحکیم اسی میں میاں صاحب کا مدرسہ ہے۔ مکان مولوی عبدالرشید صاحب۔ اب یہاں چوراہا ہے۔ سامنے وار تیلیوں کا پھاٹک اور اندر اسی نام کا محلہ اور اس کے آگے بارہ دری نواب وزیر اور پھر بارہ دری کے مقابل ایک پھاٹک کے اندر پنجابیوں کے مکانات ہیں۔ یہ پھاٹک "طوطا میدا کا تکیہ" کہلاتا ہے۔ یہی رستہ نہر سعادت خاں کے پھاٹک کو نکل جاتا ہے۔ تیلیوں کے پھاٹک سے اندر ہی گھی کا کٹڑہ ہے جس میں اب مکانات ہیں۔ **بائیں طرف**۔ تمباکو کا کٹڑہ۔ گلی مینگا بیگ اور اسی کو دھوبیوں کا کٹڑہ بھی کہتے ہیں اور یہیں میاں صاحب کی مسجد ہے۔ اس کے آگے کوچۂ مولوی قاسم ہے اس میں بہت ہی گلیاں ہیں۔ داہنی طرف گلی محمد ذکریا محتسب کی مسجد۔ گلی امیر بخش۔ باغیچی گیندا مل۔ رنگ محل جس کی اونچی اونچی دیواریں اور کچھ دالان باقی ہیں۔ بائیں جانب۔ گلی نواب محمد باقر۔ گلی حاجی انعام اللہ۔ گلی ساگ والاں مسجد رمضان شاہ۔ چھوٹا رنگ محل۔ چھوٹا چبوترہ۔ گلی چمڑے والاں۔ اب نہر سعادت خاں آگئی۔ کوٹھی ایس پی جی مشن ہوس کے غرب میں ایک چھوٹی سڑک ہے جو نہر سعادت خاں کی بڑی سڑک سے آن ملتی ہے۔ تیلیوں کے پھاٹک کے سامنے ایک اور چھوٹی سی گلی ہے جو گندی گلی کہلاتی ہے جو مشن روڈ پر جا نکلتی ہے۔

گلی تیلیاں

اس گلی کا دروازہ دور آخری مغلیہ کا بنا ہوا ہے۔ اب بہادر شیو پرشاد سی آئی ای کے قبضے میں ہے۔ یہ دروازہ نہایت خوش نما بنا ہوا ہے جس کے دونوں جانب پہرے والوں کی نشست کے لیے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ حویلی نواب وزیر کی وسیع عمارت کا یہ بھی ایک دروازہ ہے۔ نواب وزیر کا اصلی نام معلوم نہیں ہوتا روایت یوں ہے کہ نواب اودھ نے یہ حویلی کسی گوئیے کو دے دی تھی۔ قیاس اس بات کا مقتضی ہے کہ ابوالمنصور صفدر جنگ نواب وزیر اودھ نے یہ حویلی بنائی ہو تو کچھ دور نہیں۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ صفدر جنگ ہی اودھ کا پہلا گورنر تھا جسے نواب وزیر کا خطاب ملا تھا مگر اس کی سکونت دہلی میں نہ تھی۔ اس دروازے کی

شان و شوکت اور جس مقام پر حویلی تھی اُس کی وسعت کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ہو نہ ہو ایسی عمارت ایسے ہی پایہ کا ایک امیر بنا سکتا ہے۔ چوں کہ صفدر جنگ اور دوسرے اودھ کے نواب جو اُن کے بعد ہوئے کبھی دلّی آئے نہیں اور نہ اُن کو ایسی عظیم الشان حویلی کی کوئی ضرورت تھی تو یہ بہت قرین قیاس ہے کہ کسی گویئے کو بخش دی گئی ہو۔

گلی تیلیاں گھی کے کٹڑے کی طرف سے

دورِ آخر مغلیہ۔ یہ بھی **نواب وزیر** کی حویلی کا ایک سہ درہ دروازہ ہے جس کی چھت گر گئی ہے۔ دروازے کی دونوں جانب پہرے والوں کی نشست کی بیٹھکیں بنی ہوئی ہیں۔

گلی تیلیاں گھی کے کٹڑے کا داخلی دروازہ

دورِ آخر مغلیہ۔ خراب وخستہ۔ ایک احاطے کا دروازہ ہے جو غالباً **نواب وزیر** کی حویلی کا ہوگا پہلے اس احاطے میں **گھی کی منڈی** تھی اسی سبب سے **گھی کا کٹڑہ** مشہور ہوگیا

شمس العلما مولنا سید نذیر حسین عرف میاں صاحب محدث دہلوی

۱۲۲۰ھ–۱۳۲۰ھ
۱۸۰۵ء–۱۹۰۲ء

حبش خاں کے پھاٹک میں **سرس والی** گلی کے اندر متصل مکان مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب واعظ دہلی آپ کرایہ کے مکان میں رہتے تھے ذاتی مکان آپ کا کوئی نہ تھا۔ آپ **سورج گڈھ** ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے اور ماں باپ دونوں طرف سے سید تقوی تھے آپ کے والد ماجد کا نام سید جواد علی تھا آپ کے بزرگ اورنگ زیب کے زمانے میں عہدۂ قضا پر مامور تھے ۱۲۳۶ھ میں جس وقت مولنا شاہ سید احمد صاحب بریلوی اور مولنا **شاہ اسمٰعیل** صاحب شہید دہلوی پٹنے تشریف لے گئے تو آپ وہاں موجود تھے کچھ دنوں الٰہ آباد میں رہ کر علم حاصل کیا بالآخر ۱۲۴۳ھ میں دہلی تشریف لائے **پنجابی کٹڑے** کی اورنگ آبادی مسجد میں رہا کرتے تھے اور مولوی **محمد عبدالخالق** صاحب سے جو مولنا شاہ اسحٰق صاحب کے ارشد تلامذہ سے تھے چند کتب عربی پڑھیں اور اسی طرح

مولنا شاہ عبدالقادر اور مولنا شاہ رفیع الدین صاحبان بن شاہ ولی اللہ صاحب سے پڑہا اور کئی علماے جید و نامور سے استفادہ کیا۔ جب آپنے تحصیل علوم سے فراغ حاصل کیا مولوی عبدالخالق صاحب (راقم کے نانا مولوی عبدالقادر صاحب کے والد) کے اس قدر منظور نظر ٹھیرے کہ انھوں نے اپنے اُستاد مولنا شاہ محمد اسحاق صاحب اور اُن کے بھائی مولنا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہما کی راے اور مشورے سے ۱۲۴۲ھ میں اپنی بنا زادی کا نکاح آپ سے کردیا۔ اس کے بعد آپنے مولنا شاہ محمد اسحاق صاحب علیہ الرحمہ سے حدیث و تفسیر پڑھی اور تیرہ برس تک آپ کی خدمت میں رہکر بہت سے فیوض اور برکات حاصل کیئے۔ غرض آپ ایسے مرتبہ کمال کو پونہچ گئے کہ اپنے استاد علام کے سامنے فتویٰ دیتے اور فیصلے کرتے تھے اور حضرت استاد اُن کو پسند کرتے اور خوش ہوتے تھے اور آخر ایسا ہوتا تھا کہ حضرت استاد الاساتذہ بعض مشکل اور ادق مسائل میں آپ کا امتحان کرتے تھے اور آپ کا جواب شافی سن کر مطمئن ہوجاتے تھے ماہ شوال ۱۲۵۸ھ میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے آپ کو اجازت علوم حدیث وغیرہ سے مسند فرماکر مسند الوقت کردیا اور اسی سنہ میں جب آپ ہند کو خیرباد کہکر مہاجر بیت اللہ ہونے لگے افادہ اور افتار اور وعظ اور تذکیر اور درس وتدریس کے لیئے آپ ہی کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر فرمایا جس منصب عالی کو آپنے مدۃ العمر اس عمدگی اور خوبی اور نیک نامی سے نباہا کہ ہر شخص آپکا ثناخوان رہا چنانچہ آثار الصنادید میں لکھا ہے کہ زندۂ اہل کمال و اسوۂ ارباب فضل و افضال مولوی نذیر حسین بہت صاحب استعداد ہیں خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد کامل بہم پونہچائی ہے کہ اپنے نظائر و اقران سے گوے سبقت لے گئے ہیں روایت کتب میں آج بے نظیر ہیں باوجود اس کمال اور استعداد کے مزاج میں خاکساری اور حلم گویا کوٹ کوٹ کر بھرا ہے باعتبار سن کے جوان اور بہ اعتبار طبیعت حلم اور وضع متین کے پیر ہیں سنہ ۱۲۷۰ھ تک آپ کو فقہ وغیرہ تمامی علوم وفنون سے ایک خاص مذاق اور لگاؤ تھا لیکن اسکے بعد قرآن اور حدیث کے درس وتدریس کی محبت آپ پر ایسی غالب ہوئی کہ

آپ اس کے مصداق ہو گئے۔ ؎

ما انچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الاحدیث دوست کہ تکرار می کنم

ایسے ہی مشتغلین بالحدیث کو اہل النبی اور اصطلاح صوفیہ صافیہ میں اس مقام کو فنا فی الرسول کہتے ہیں وَلَنِعْمَ مَا قِیْلَ۔

اَھْلُ الْحَدِیْثِ ھُمْ اَھْلُ النَّبِیِّ وَاِنْ لَمْ یَصْحَبُوْا نَفْسَہٗ اَنْفَاسَہُمْ صَحِبُوْا

سارے ہندوستان اور نیز ہندوستان کے باہر بھی یمن۔ بخدیستوس۔ اندلس افغانستان۔ کشمیر۔ خراسان۔ کاشغر۔ برہما۔ چین۔ یاورانک آپ کے ہزارہا شاگرد پھیلے پڑے ہیں۔ آپ کا علمی تبحر اور تقدس محتاج بیان نہیں۔ خاکسار کی والدہ کے حقیقی پھوپھا ستھے۔ عرصے سے آپ کا یہ معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد مولانا شاہ عبد القادر صاحبؒ کے ترجمۂ قرآن شریف کے دو تین رکوع روزانہ سب کو پڑھایا کرتے ستھے اس کے بعد حدیث شریف کا درس ہوتا تھا۔ اس ترجمہ خوانی میں آپ بعض ایسے نکات قرآنی و مطالب ایمانی بیان فرماتے ستھے کہ سامعین و حاضرین کو ایک لطف خاص حاصل ہوتا تھا جس سے طلبا بہت سے مطالب حل کر لیتے ستھے اور بہت سے خطرات و شکوک رفع کر لیتے ستھے۔ دس بجے آپ مسجد سے سیدھے اپنی صاحب زادی کے گھر تشریف لاتے اور تخت پر بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے۔ کثرت اشغال علم حدیث اور جواب استفتا وغیرہ سے آپ کو تالیف و تصنیف کی زیادہ فرصت نہ ملی لہذا محض ضرورت وقتی کے لحاظ سے چند رسالے آپ نے لکھے ہیں معیار الحق واقعۃ الفتوی۔ واقعۃ البلوی۔ ثبوت الحق الحقیق۔ فلاح الولی باتباع النبی۔ ابطال عمل المولد۔ اور ایک رسالہ عورتوں کے زیوروں کے بیان میں اور کوئی تصنیف دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہاں اگر آپ کے فتاویٰ سب جمع کیے جائیں تو اس قدر ہیں کہ کئی جلدوں میں بھی نہ سماتے۔ بزرگان دین کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ ان پر کفر کا فتویٰ ہو جائے۔ یہ سلوک بھی آپ کے ساتھ ہو چکا سنہ ۱۳ھ

لہ ہ ملان فن حدیث کا شمار حضرت رسول مقبول کے ساتھیوں میں ہوا ہے گو انہوں نے آپ کی جسمانی صحبت نہ پائی ہو تو بھی روحانی فیضان سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ ۱۲

میں جب آپ حج کو تشریف لے گئے تو وہاں بہت کچھ ادھم ہی مگر الحق یعلو ولا یعلیٰ سارے فتاوے تارعنکبوت کی طرح بے بنیاد ثابت ہوئے اور آپ اس آزمائش میں بھی پورے اُترے۔ جب آپ مع الخیر والعافیۃ حج کرکے واپس تشریف لائے تو ریلوے سٹیشن پر خلقت کا ایسا ہجوم تھا کہ کم دیکھنے میں آیا ہی اور کیوں نہ ہوتا کہ یہ استقبال ایک ایسے بزرگ کا تھا جو کہ لاکھوں مسلمانوں کا مقتدیٰ تھا۔ موافق ومخالف دونوں آپکے علم وفضل کی شہادت میں متفق اللسان تھے۔ دوست ودشمن دونوں آپکے مناقب و محامد سے رطب اللسان۔ یہ جلال واعزاز اُس اخلاق کا ثمرہ تھا جو حق تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا تھا اور یہ عام قبولیت اُس قبولیت خداوندی کا عکس ہی جس کا حدیث شریف میں ذکر وارد ہی کہ جب خداوند تعالیٰ کسی بندے کو دوست بنا لیتا ہی تو اس سے محبت کرنے کا تمام آسمان وزمین والوں کو حکم دیتا ہی اور اُس کی قبولیت کو عام میں پھیلا دیتا ہی۔ میں نے خود اچھی طرح میاں صاحب کو دیکھا ہی۔ سارے شہر میں اسی پیارے نام سے پکارے جاتے تھے۔ لباس بالکل سادہ تھا اکثر لنگی اوڑھتے تھے شہر میں پا پیادہ پھرتے تھے مگر سبحان اللہ کیا خدا داد عزت تھی کہ جدھر سے گزر جاتے تھے لوگ کھڑے ہو جاتے تھے پھیرے دیکھتے تو قدرت خدا کا ایک جلوہ تھا ایسی عزت ایسی توقیر کسی بادشاہ وقت کی ہوتی ہو تو ہوتی ہو۔ بھلا ایسے شخص کو خطاب کی کیا ضرورت تھی مگر سرکار نے شمس العلماء کا خطاب آپ کو گھر بیٹھے دیا۔ خطاب کی سنکر آپ نے فرمایا "میاں خطاب سے کیا ہوتا ہی ہمارے لئے پورا خطاب قرآن مجید میں حنیف مسلم موجود ہی۔ دنیاوی خطاب سلاطین سے ملا کرتا ہی یہ گویا اُن کی خوشنودی کا اظہار ہی مجھے کوئی نذیر کہے تو کیا اور شمس العلماء کہے تو کیا میں نہایت خوش ہوں کہ ہر ایک میاں صاحب کہتا ہی۔ بھائی سادات کے لئے اس سے بڑھ کر پیارا لفظ نہیں اس لفظ کی برکات سے میری درویشانہ طرز میں فرق آئے بس یہی خدا کا فضل ہی"۔ آپکے ایک ہی صاحب زادے مولوی سید

شریف حسین صاحب تھے جو علم و فضل اور تقویٰ میں باپ کے قدم بقدم تھے اور درس و تدریس کا سارا بار خود اٹھائے ہوئے تھے وہ باپ کی حیات میں ہی قضا کر گئے۔ اُن کے دو صاحب زادے تھے بڑے مولوی عبد السلام اور چھوٹے مولوی ابو الحسن۔ دونوں میں بلاکم و کاست میاں صاحب کے صفات حسنہ تھیں کیوں کہ خود انھیں سے تعلیم پائی تھی اور اُن ہی نے پالا پوسا مولوی عبد السلام صاحب نے سال گزشتہ فلج سے انتقال کیا اب صرف مولوی ابو الحسن صاحب باقی ہیں۔ خدا اُن کو رکھے کہ میاں صاحب کی نشانی ہیں اور انھیں سے اُن کا نام چلتا ہے مولوی ابو الحسن صاحب بھی حدیث شریف کا درس دیتے ہیں اور جس طرح میاں صاحب کے زمانے میں مدرسہ تھا ویسا ہی چلا رہے ہیں۔ ابو الحسن صاحب کے سوا میاں صاحب کی ایک صاحب زادی ہیں جو تواتر صدمات سے بہت ناتواں ہیں مرض الموت میں مجھے کئی دفعہ میاں صاحب کی قدم بوسی کا اتفاق ہوا بجز کبر سنی کے کوئی خاص مرض نہ تھا۔ پلنگ پر لیٹے رہتے تھے اور ہاتھ میں تسبیح رہتی تھی ہر وقت عالم بے خودی اور استغراق کا رہتا تھا۔ نماز کے وقت خود ہشیار ہو جاتے تھے۔ کروٹیں بدلتے اور بے چین ہو جاتے۔ اُٹھا کر سہارا دے کر بٹھا دیا نماز پڑھ لی پھر سکون کی حالت ہو جاتی تھی۔ یہی حال تسبیح و تہلیل کا تھا اگر تسبیح ہاتھ سے چھٹ گئی تو بس بے چین ہو گئے پھر دے دی پڑھنے لگے۔ ۱۰ رجب روز دوشنبہ سر مغرب ۱۳۲۰ھ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء انتقال فرمایا اور شیدی پورے کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ایسے بڑے عالم اور فاضل اجل کی وفات کے سینکڑوں قطعات و قصائد عربی و فارسی لکھے گئے ہم صرف اُن میں سے ایک دو قطعے اور چند ملدے یہاں لکھتے ہیں۔

شیخنا الا معی نذیر حسین — من بنی ہاشم بنی غالب
زبدۃ الاتقیاء شیخ الکل — مرجع الناس صادق صائب
اخذ با لکتاب و السنۃ — امرا بالفروض و الواجب

ماحی المنکرات والبدعة — قلبه فی الضیاء ی القالب
مظہر العلم حاجی الحرمین — دائماً نحو ربہٖ راغب
قد توفی خلال شہر رجب — غاب نجم الہدایة الثاقب
اختفی النور اظلم الدہلی — کسفت شمس دیننا الواصب
اسئلوا الله اخی فی الرحمہ — ثم صلّوا اخبارة الغائب

قُلت فی عامہ باخلاص
دخل الجنة میاں صاحب

من رحلة سیدی نذیر القمقام ۱۳۲۰ھ — عینای دوامع ودمعی قد دام
ارخت لعامہ بقلب حزن — قد مات محدث امام علام
توفی ہادی الناس مجتہد حبر — قضی نحبہ ہادی البریة عاید ۱۳۲۰
عام الوفاة اتی لی ملتجاء بجا — رضی الاله عن الامام عامہ ۱۳۲۰

قطعہ تاریخ از آغا سنجر طہرانی

ای دریغا محدث دہلی۔ سید قوم و عالم و فاضل۔ حضرت مولوی نذیر حسین
شد بہ بزم وصال حق واصل کشتی عمرت ار طوفاں۔ بسلامت رسید بر ساحل۔
ہم بہ منزل رساند بارے را۔ کہ بیک عمر بودیش حامل کرد جا در حریم قرب الٰہ
کش بُد از جان و ہم ز دل مائل۔ شد بہ بزم وصال لم یزلی۔ اجار شاد و نشد بالل گشت
باشوق باقی باسر۔ شد چو نقش فنا از و زائل۔ نقش امکاں ز لوح ہستی شست
پس ز بزم وجوب شد قابل تا ز خود رست با خدا پیوست۔ آں خدا جوے عالم عامل
عین معشوق گشت تا برخاست۔ آنچہ می بود درمیاں حائل چشم بد دور ای تعالی اللہ
جوہر جاں شد و چکید ز دل۔ بندۂ خاص کبریا امروز۔ شد بالطاف کبریا نائل
از مجمع بحر بجوے سال وفات۔ سنجر ای مرد زیرک و عاقل۔ سال تاریخ
آں خجستہ خصال۔ مرازیں شعر می شود حاصل۔ مرد والا گہر نذیر حسین۔ ۸۲۰
عالم با محدث کامل۔ ۵۰۰

؎ مجمع بحر سے مراد حروف منقوطہ ہیں۔ ن ذ ی ی ن ش۔ ۱۲۰

از مولوی سید جمیل احمد سہسوانی

دریغ رحلت شیخ زماں نذیر حسین — کہ جس کی ذات سے روشن تھا نام علم حدیث
کیا زمانے کو علم حدیث سے روشن — زمین پر تھے وہ ماہ تمام علم حدیث
ہزاروں ہند میں گزرے حدیث داں لیکن — انھیں کے حصہ میں تھا فیض عام علم حدیث
جہاں کو مست کیا اتباع سنت کا — پلا کے کیف سے لبریز جام علم حدیث
حدیث پڑھنے کو آتے تھے دور دور لوگ — ہزاروں کر گئے آکر تمام علم حدیث
فقیہ و فلسفی و منطقی زمانے کے — ہوئے سب ان کی بدولت غلام علم حدیث
انھیں کی ذات سے شہرت تھی اس کی شہر بشہر — انھیں کے دم سے تھی دلی مقام علم حدیث
الٰہی ان پر ہیں تیری رحمتیں نازل — ہزار اہل شرع میں تا احترام علم حدیث

جمیل ورد زباں رات دن ہے یہ تاریخ
جہاں سے اٹھ گیا اپنا امام علم حدیث

۱۳۲۰ھ

سزد بماتم شیخ جہاں نذیر حسین — سرشک خوں بفشانند گر صغار و کبار
یتیم شد ز وفاتش دریغ علم حدیث — ز رحلتش فن تفسیر حیف شد بے یار
اصول و فقہ فغاں می زنند در غم او — بسانِ بلبل شیدا بہ ہجر فصل بہار

نوشت نکہت محزوں دعائیہ تاریخ
بود جلیس بخاری و مسلم و بزار

۱۳۲۰ھ

جان کھو کر کیوں نہ روئیں اہل دیں — آج تک دیکھی نہیں اس غم کی موت
کون ہے جس کو نہیں سوہان روح — نائب فخر بنی آدم کی موت

ورد خلقت ہے یہ تاریخ وکیل
موت اس عالم کی ہے عالم کی موت

چو شد بخلد رواں شیخ کل نذیر حسین — بعلم و فضل ز اہل زمانہ بردہ سبق
لیغفر از پی سال رحیل او گفتم — لیغفر ست بہ پس ماندگاں ابشا بحق

۱۳۲۰ھ — ۱۳۲۰ھ

سال رحلت کہا یہ تمکیں نے	بجھ گیا اب چراغ دہلی کا
قدمات محدث امام علام	رحلت جناب سید محدث
۱۳۲۰ھ	۱۳۲۰ھ
انتقال امام و محدث زماں	رفت ای وا سے محدث دہلوی
سیدی جناب محمد نذیر حسین	محدث مکمل محقق مفسر
۱۳۲۰ھ	۱۳۲۰ھ

مولنا سید نذیر حسین صاحب قبلہ کا بہت مختصر حال ہم نے لکھا ہے۔ گنجایش مانع طوالت ہے۔ جن صاحبوں کو اس علامۂ دہر کے مفصل حالات دیکھنے کا شوق ہو وہ الحیاۃ بعد المماۃ مصنفہ فضل حسین صاحب مظفر پوری صوبۂ بہار ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کتاب بڑی کاوش و تفتیش سے لکھی گئی ہے جس میں میاں صاحب کی لیئف کے ہر پہلو پر عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ اس کے ایک اور مختصر سوانح عمری حسرۃ العالم بوفاۃ محدث العالم بھی ہے جس کو مولوی سید محمد عبد الرؤف صاحب نے چھپوایا ہے جو نواسے ہیں مولوی سید شریف حسین صاحب ابن مولنا شیخ مرحوم کے۔

مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب

مولوی صاحب موصوف جبش خاں کے پھاٹک کی سرس والی گلی میں رہتے ہیں۔ مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے سمدھی تھے یعنی مولوی شریف حسین صاحب مرحوم کے خسر تھے۔ آپ کے والد کا نام گاماں خاں تھا۔ آپ کی ولادت کی تاریخ معلوم نہیں ۳ رمضان ۱۳۱۲ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کے والد ماجد مولنا شاہ عبد القادر صاحب محدث دہلوی کے مرید تھے۔ آپ نے نو برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ ایک روز کسی موقع پر مولنا اسمٰعیل شہید دہلوی آپ کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ میاں قرآن شریف کا کوئی رکوع سناؤ۔ آپ کے والد نے کہا کہ حضور جہاں سے آپ فرمائیں وہیں سے سنا دے۔ مولنا شہید نے ایک مشکل رکوع جہاں بہت متشابہ تھے بتایا تو

آپ نے بالکل صحیح پڑھ کر سنایا۔ مولنا شہید خوش ہوے اور گلے لگا کر خوب بھینچا اور دعا کی آخر نوبت بہ ایں جا رسید کہ آپ عالم جید اور ایک بے نظیر واعظ ہوے۔ آپ نے بعد حفظ قرآن مجید کے کچھ کتابیں مولوی عبدالخالق صاحب خسر مولوی نذیر حسین صاحب سے پڑھیں۔ اور کچھ شاہ اسحاق صاحب دہلوی سے بھی پڑھیں اور آخر میں فقہ۔ تفسیر اور حدیث شیخ الکل حضرت میاں صاحب (مولوی نذیر حسین صاحب) سے پڑھی اور سند حاصل کی۔ اس زمانے میں دلی میں بڑے نامور واعظ دو ہی تھے احناف میں مولوی عبدالرب صاحب اور اہل حدیث میں آپ۔ آپ کا وعظ عالمانہ اور بڑا اثر تاثیر تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ قرآن وحدیث کا دریا بہ رہا ہے یا یوں کہیے کہ سمندر میں سے دُر بے بہا نکال کر سامعین کے سامنے بکھیر رہے ہیں۔ خاکسار اپنی خوش نصیبی سے دونوں صاحبوں کی مجالس وعظ میں بارہا حاضر رہا ہے۔ واقعی بات اور حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ دونوں صاحب اپنی اپنی جگہ لاجواب تھے۔ ان صاحبوں کی زبان میں ایک ایسا اثر تھا کہ لوگوں کے دل اپنے قابو میں کر لیتے تھے اور بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لگا دیتے تھے۔ حافظہ اور سلسلہ سخن کا یہ حال تھا کہ بحر متواج لہریں مار رہا ہے۔ آمد تھی آورد نہ تھی۔ تقریر اور طرز بیان ایسا شستہ اور مسلسل کہ مضامین اُمڈے چلے آتے تھے۔ تامل۔ غور۔ کی ضرورت نہ تھی۔ نہر سعادت خاں پر آپ کے والد ماجد نے ایک مسجد آباد کی تھی جس کے نیچے نہر جاری تھی اور اوپر مسجد تھی اور اُسی کے ساتھ ایک پُر فضا کمرہ بھی تھا۔ مسجد میں ایک شیریں اور ٹھنڈا کنواں تھا اُس پر درختوں کا گھنا سایہ دلی کی گرمیوں میں یہ جگہ بلا مبالغہ جنت کا ایک ٹکڑا معلوم دیتا تھا۔ ہر دوشنبہ کو صبح کو آپ کا وعظ اُسی مسجد میں ہوتا تھا۔ مسجد کچھا کچھ لوگوں سے بھر جاتی تھی۔ دربار شاہی میں بھی آپ کی بڑی توقیر واحترام تھا لال قلعے سے ہمیشہ پالکی آپ کے لیئے آیا کرتی تھی اور قلعے کے شاہی محلات میں آپ کا وعظ ہوا کرتا تھا۔ بہادر شاہ بادشاہ آپ کی بہت وقعت اور تعظیم کرتے تھے اور تحفہ تحائف بھی بھیجا کرتے تھے اور خلا ملا تھا۔ آپ نے کچھ بیٹے

اور چار بیٹیاں چھوڑیں جن میں سے اب صرف دو بیٹے ہیں اور ایک بیٹی جو مولوی شریف حسین صاحب مرحوم کی زوجہ ہیں غرض آپ کا دم غنیمت تھا اور پرانے لوگوں کی طرح اپنی وضع کے بڑے پکے اور سادی وضع کے بزرگ تھے۔ آپ بھی میاں صاحب کے ساتھ شیدی پورے کے قبرستان میں آسودہ ہیں۔ سمدھی سمدھی دنیا میں بھی ساتھ ساتھ تھے وفات کے بعد بھی ساتھ ہیں۔ افسوس ہی کہ آپ کے صاحب زادوں میں سے کسی نے باپ کی جگہ نہ سنبھالی اور یہ فیض کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کو بند ہوگیا ؎

میراث پدر خواہی علم پدر آموز
کیں مال پدر خرچ تواں کرد بدہ روز

کھاری باؤلی کے بازار کا داہنا رخ ختم ہوا۔ **بائیں طرف** بنگش کی سرا وہ باؤلی جس کے نام سے یہ بازار مشہور ہی۔ گلی بتاشاں۔ بازار نئے بانس کا شمالی آخری سرا۔ اس کے آگے کٹرہ فضل عظیم چھترے والے۔ لاہوری دروازہ جہاں سے فصیلوں میں رستہ جاتا ہی اور اب بیرون شہر صدر بازار وغیرہ ہی جس کا بیان علیحدہ کیا جاوے گا۔

سرا بنگش مسجد فتح پوری کے قریب۔ دورِ آخری مغلیہ۔ لالہ نرائن داس کے قبضے میں ہی۔ اب سرا کا کام نہیں دیتی بلکہ اس میں مختلف قسم کی دکانیں۔ اناج کی آڑھتیں لگ گئی ہیں۔ لوگوں نے مال گودام بنا لیئے ہیں۔ اس کا دروازہ جو لب سڑک بازار کھاری باؤلی میں ہی بہت عالی شان ہی یہ دروازہ کا ہے کو ہی بجائے خود ایک عمارت ہی جس کے آگے ہشت پہل صحن ہی۔ بنگش کا حال بنگش کے کمرے کے بیان میں دیکھو۔

کھاری باؤلی سنہ ۹۵۲ھ ۱۵۴۵ء کوچۂ نواب مرزا میں جو قدیم مسجد شیر شاہ کے زمانے کی بنی ہوئی ہی (سنہ ۴۵-۱۵۳۹ء) اُس کے احاطے کی شمالی دیوار سے ملی ہوئی یہ باؤلی تھی جو اب

وہ گئی اور دکانوں میں دب گئی لیکن اُس کا پتہ اور نشان بلکہ باؤلی کی صورت بھی اب تک معلوم دیتی ہی یہ باؤلی بہت قدیم اور شاہ جہاں آبادی کی آبادی سے بہت پہلے کی ہی یعنی ۹۵۲ھ ۱۵۴۵ء عہد اسلام شاہ بن شیرشاہ میں عماد الملک خواجہ عبداللہ نے ایک کنواں بنایا تھا چھ برس بعد یعنی ۹۵۸ھ ۱۵۵۱ء میں اس کنوئیں کو باؤلی بنا دیا۔ جب شاہ جہاں نے شہر بسایا تو یہ باؤلی بھی شہر میں آگئی۔ اب یہاں بازار کے علاوہ بہت سے مکانات بن گئے ہیں اور یہ دلی کا ایک مشہور محلہ ہوگیا ہی۔ اس باؤلی پر حسب ذیل کتبے تھے:

کتبۂ دروازہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ یا اللہ

کتبۂ اندرونی پیشانی چوکھٹ یہ کتبہ برابر پڑھا نہیں جاتا ہی جو الفاظ پڑھے نہیں گئے وہ بعینہٖ نقل کردیے گئے۔ پہلے کتبے میں لادر ہی اور دوسرے میں لاذر۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ باشتفتے دب بعونت تمام شد ایں باوری وچاہ درماہ رمضان سنہ نعصد دپنجاہ وہشت ہجری بر درح محمد مصطفیٰ رسول درگاہ حضرۃ الدولہ درزمانہ عادل اسلام شاہ بن شیرشاہ بناکردہ کارکردیں از جلہ بشے خواجہ عماد الملک عرف عبداللہ لادر قریشی بندگان کن باوری آمید وار عنایت ومرحمتک گردد بایں سرے بالتک۔

کتبۂ دیوار شمالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

درعہد زمان سلطان السلاطین ابوالمظفر اسلام شاہ بن شیرشاہ سلطان خلد اللہ ملکہ وسلطانہ بناکرد ایں چاہ بتوفیق بر درح رسول اللہ ملک عماد الملک عرف خواجہ عبداللہ لاذر قریشی بدار الملک حضرت دہلی فی سنۃ اثنتے وخمسین وتسعمائۃ۔

گلی تباشاں (کلاں) اس گلی کے دو سرے ہیں شمالی رخ کھاری باؤلی میں ہی اور جنوبی سنئے بانس میں۔ اس میں اچار والے کھانڈ والے بیٹھتے ہیں۔ چونکہ مٹھائی کے کھلونے اور بتاسے بتاستے کثرت سے

بنتے ہیں اسی وجہ سے بتاشوں کی گلی کہلاتی ہے۔ اس میں سے اگر کھاری باؤلی کی طرف سے آئیں تو داہنے ہاتھ کو گلی بتاشاں خورد ہے جس کا دوسرا سرا لئے بانس میں جا نکلا ہے اور بائیں ہاتھ کو کوچہ نواب مرزا ہے جس کا دوسرا رستہ گلی کلالاں پر سے ہوتا ہوا بڑیوں کے کٹڑے میں جا نکلا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب

بآبِ ہندیِ تیزی دہد بہ آبِ سخن
ز تیغ مصریِ گوہر دہد زکانِ بیاں

بہ نثر داغ نہد بر جبینِ نظمِ حریر
بہ نظم باج ستاند ز گفتۂ سحباں

خرد پناہ فرو نزانہ کہ در آفاق
چنیں یگانہ نیامد پس از ہزار قراں

چناں نگارۂ سخن را بدانش آراید
کہ نوکِ خامۂ معنی بہ نخ نگارستاں

کوچۂ نواب مرزا ہی میں جناب خان بہادر شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ محمد نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور ایل ایل ڈی۔ ڈی او ایل کا دولت خانہ ہے۔ جو دلی کے مشاہیر میں سے تھے۔ آپ کے مفصل حالات جس کسی کو دیکھنا ہو حیات النذیر ملاحظہ فرمائیں۔ مختصر یہ ہے کہ ۲۳ جمادی الاولی ۱۲۵۲ھ ۶ ستمبر ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے اصلی وطن بجنور تھا۔ بچپن سے تحصیل علم کا شوق تھا۔ پہلے جناب مولوی نصراللہ خاں خورجوی سے جو بجنور میں ڈپٹی کلکٹر تھے عربی پڑھتے رہے بعد ۱۸۴۲ء میں دہلی آئے اور پنجابی کٹڑے کی مسجد میں مولوی عبد الخالق صاحب کے پاس پڑھتے رہے پھر دلی کالج میں داخل ہو کر تکمیل علوم کی۔ گجرات میں مدرس ہوئے پھر الہ آباد میں سب انسپکٹر مدارس اور کانپور ضلع میں تحصیلدار بعد مدتوں ڈپٹی کلکٹر رہے اور آخر کار ریاست حیدرآباد دکن میں کمشنر اور بورڈ آف ریونیو کے عہدہ جلیلہ سے پنشن لے کر خانہ نشین ہوئے اور تیس سال برابر پنشن سے مستفید ہوتے رہے اور ۱۵ جمادی الاولی سنہ ۱۳۳۰ھ روز جمعہ کو اس جہان فانی سے ملک جاودانی کو سدھارے ۳ مئی سنہ ۱۹۱۲ء۔ ملازمت کی حالت میں سب سے پہلے مجموعہ تعزیرات ہند کا ایسا بے نظیر ترجمہ کیا جو آج تک مسلم و مستند اور مرجوع و معمول ہے

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل - ایل - ڈی ڈی - او - ایل

اسی سے کے ملنے میں ایک ملائی گھڑی اور ڈپٹی کلکٹری لی۔ سر ولیم میور صاحب بالقابہ لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے عہد میں مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ مبادی الحکمت وغیرہ کتب لکھ کر ہزار ہا روپیہ اور ایک پیش قیمت قیمتی گھڑی گورنمنٹ سے انعام پایا اور ملکی دنیا میں شہرت لازوال حاصل کی۔ خانہ نشینی کے بعد بھی کئی کتابیں مثل ابن الوقت۔ محصنات۔ رویائے صادقہ۔ ایامیٰ وغیرہ کے لکھیں۔ پھر اس کوچے کو چھوڑ دینیات کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوئے۔ سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد کلام مجید کا بے نظیر اردو ترجمہ کیا جو ہندوستان بھر میں مقبول خاص و عام ہوا خدا کرے کہ جس کا کلام پاک ہے اس کی بارگاہ اقدس میں بھی مقبول ہو۔ الحقوق والفرائض کے تین حصے۔ اجتہاد وغیرہ سب مذہبی کتابیں لکھیں۔ سر سید کے ساتھ لکچر دینے شروع کئے انجمن حمایت الاسلام مدرسۂ طبیہ دہلی ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں جاتے اور اپنے پرزور اور لاجواب بیان سے فیض عام پہونچاتے چنانچہ چالیس لکچروں کا ضخیم مجموعہ دو جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ گھر بیٹھے شمس العلماء ایل ایل ڈی۔ ڈاکٹر اوایل ہوئے۔ جہاں یہ سب عروج ہوا وہاں چاند کو ایک داغ بھی لگا کہ اُمہات الاُمہ کا قضیہ نامرضیہ پیش آیا جس کے سبب سے اواخر عمر میں لکچر دینا بالکل ترک کر دیا۔ اُمہات الامۃ کے مندرجہ واقعات سے تو کسی کو انکار ہو نہیں سکتا تھا لیکن طرز عبارت پر اعتراض تھا جس کو حاسدین اور مخالفین نے نمک مرچ لگا کر میں کا بیل بنا دیا۔ کفر کا فتویٰ دیا ؎

یک مومن با صفا دہم کافر
پس در ہمہ ملک یک مسلماں نبود

جو گروہ علماء کا معراج الکمال ہے۔ بڑے بڑے بزرگان دین پر کفر کے فتوے ہوئے قید کئے گئے۔ دار پہ کھینچے گئے کوڑے لگائے گئے۔ حتیٰ کہ قتل کیے گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خوارج کیا کہتے ہیں۔ حضرت ذوالنون مصری حسین ابن حلاج (منصور)۔ حضرت جنید بغدادی۔ حضرت امام غزالی۔

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب سر سید احمد خاں، شمس العلماء مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔ غرض اسی طرح سائم بڑے اور پر بزرگان اور اکابرین دین کے ناموں کی فہرست میرے پاس موجود ہے جو کافر اور مرتد ٹھیرائے گئے تو بے چارہ نذیر احمد کس شمار قطار میں تھا۔ اگر ان میں سے کسی ایک کافر (نقل کفر کفر نباشد) کے ساتھ بھی نذیر احمد کا حشر ہو جائے تو یہ فتوائے کفر يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي[1] کا فرمان خداوندی ہو جائے گا۔ ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس مارچ ۱۹۱۰ء میں دلی میں ہوا تھا اور جناب نواب سراج الدین خاں صاحب سائل نے ایک نظم لکھی تھی مگر عین وقت پر اُن کو پڑھنے سے بہ حکمت عملی باز رکھا گیا اب ہم چند بند اُس کے جو امہات الامہ سے متعلق ہیں لکھ دیتے ہیں اہل انصاف ملاحظہ فرمالیں۔ میں جو کہ مرحوم کا بیٹا ہوں ایک امر مابہ النزاع میں میرا کچھ لکھنا باپ کی حمایت پر محمول ہوگا حالانکہ راستی موجب رضائے خدا است باپ ہو یا کوئی ہو حق بات لگی نہیں جا سکتی لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ[2]۔

دسمبر میں سنا تھا ندوہ بھی دلی میں آئے گا	کوئی بنیاد ڈالے گا کوئی تعمیر ڈھائے گا
غرض چرچے پڑے کانوں میں اُس کی آمد آمد کے	بہت سے ہتمم تائید کے دیکھے بہت ریجے
بیان وہ جو کیا پھر بتا دوں کس طرح آیا	کیا تھا پنج دل کھتوں نے دعوتِ دیئے ایسا
تھی خدمت اہل دین کا مدعا بضمن کچھ منشا	صراحت سے جو نظم و نثر میں ہو جائے گا افشا

تمامی اہل ندوہ کو توجہ چاہیئے اس پر
وگرنہ ابتری کا مرتبہ ہو جائے گا بدتر

حسد کی آگ بھڑکی ہے جہاں آباد میں ایسی	بپا آفت ہوئی کوئی نہ میری یاد میں ایسی
نہ دوری آنکھ نے دیکھی کبھی الحاد میں ایسی	نہ ضد ثابت ہوئی باہم کبھی اضداد میں ایسی

---

[1] جس روح کو خدا کی طرف سے اطمینان و تسلی ہے اُس سے کہا جائے گا) اے روح مطمئن اپنے پروردگار کی طرف چل تو اُس سے راضی (اور) وہ تجھ سے راضی۔ پھر (خدا اُس کو حکم دے گا کہ) ہمارے (خاص) بندوں میں جا اور ہماری بہشت میں جا داخل ہو۔

[2] ہم کو ہمارے عمل تم کو تمہارے عمل۔ ۱۲

فسادوں نے نفاقوں سے کمر باندھی ہے غارت پر
یہ غارت گر پڑے ہیں ٹوٹ کر دیں کی عمارت پر

فساد اب دین کے دنیا میں بھی ہونے لگے برپا — کہ عالم عالموں پر دے رہے ہیں کفر کا فتویٰ
پھر ایسے شخص میں مقتدیوں کا ٹھکانا کیا — کسے یہ راست گو سمجھیں کسے جانیں ہے جھوٹا

اصول دین میں افراطاً فروع دیں تھے داخل
مگر ایجاد ذاتی نے کیئے اغراض بھی شامل

اگرچہ ندوہ کو ایسے تضایا سے نہیں مطلب — مگر کیا لطفی کا بھی نہیں ہے یاد کوئی ڈھب
زباں سے لا ابالی کہنے کا بھی حاصل نہیں منصب — فقط یہ دیکھنے ہی دیکھنے کے مولوی ہیں سب

تمہارا مدعا تعلیم ہے تعلیم میں دیں ہے
نصابوں میں کہیں بغض و حسد ہے فتنہ و کیں ہے

نذیر احمد ایل ایل ڈی پہ چلا ہے کفر کا خنجر — ہے اسکا سو لسو چرچا ہے اس کا شور و غل گھر گھر
کسی ملا نے مفتی سے کبھی پوچھا بھی گھر جاکر — قدم کیوں دین کی حد سے نکالا آپنے باہر

اگر سہواً خطا یہ ہوگئی ہے توبہ کر لیجئے
وگرنہ بحث سے تسکین و اطمینان کر دیجے

فقط عبدالاحد[1] نے حاذق[2] دوراں سے باتیں کیں — نتیجہ یہ ہوا وہ موجب فتنہ کتابیں لیں
یہیں تصدیق کر بیجے نہیں دیں یا انہونے دیں — اسی تصنیف پر بس تہمتیں تکفیر کی سب تھیں

پھر اس پہ احتیاطاً مولوی صاحب نے توبہ کی
مگر تکفیر باقی ہے اس صورت سے جیسی تھی

ہوا اعلان نہ اس فتوے کی صورت اُن کی توبہ کا — جناب مولوی عبدالاحد نے کیا کیا بدلا
جو کچھ وعدہ کیا تھا اُس کا ہونا چاہیئے ایفا — وہی انسان انساں ہے جو ہوا قرار اسکا پورا

نذیر احمد کو صدمہ کیوں نہ ہوگا اس تغافل سے
علاقہ کیا تھا ایسے کام میں نکس و تامل سے

اسی کے تحت میں نقصان ہے اک بھاری خلائق کا — کہ بالکل درس ہے موقوف ایسے مرد فائق کا
ہے دل دکھا ہوا اس سے ایل ایل ڈی جیسے لائق کا — لحاظ و پاس رکھنا چاہیئے رسم و علائق کا

[1] مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی۔ [2] حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب حاذق الملک بہادر

کسی صورت سے یہ الجھن سلجھ جائے تو اچھا ہی
مرے نزدیک اس میں دیر جتنی ہو وہ بے جا ہی

شکایت کا فسانہ تا کجا ندوے سے کہنا ہی | کہاں تک ابتلا اس ابتلا میں ہم کو رکھنا ہی
عذاب اس قسم کا تا زیست مردوں کو سہنا ہی | جو رسوائی کا دھبہ تھا وہ دینداروں کا گہنا ہی

کلہاڑی مارتے ہیں پاؤں پر یہ اپنے ہاتھوں سے
رہے جاتے ہیں ندوے کے مطالب ایسی باتوں سے

مخالفین نے کتاب کو جلوا دیا جب بھی کلیجے میں ٹھنڈک نہ پڑی۔ مرحوم کی وفات پر سارے ملک ہندوستان میں رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا اخبارو میں کالم کے کالم نکلے۔ انجمنوں نے جلسے کرکے تعزیت کے رزولیوشن پاس کیئے۔ سینکڑوں تاریخیں وفات کی ہوئیں اُن میں سے صرف چند تاریخیں یہاں لکھی جاتی ہیں۔ آپ درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں اندرون احاطہ آسودہ ہیں اور لوح مزار پر یہ دو تاریخیں کندہ ہیں۔

عربی

فجع الوری موت الاریب الفاضل | و ھو المحقق للخفی و الجلی
قال الولا تاریخه بیداهة | وصل الذین یا حمد ھالعلی

۱۳۳۰ھ

فارسی

علامۂ دین نذیر احمد | مُد رحمت کبریا حیاتش
خواجہ ز بشیر گفتہ برخواں | واغفرلہ بی حسن وفاتش

۱۳۳۰ھ

اور چند مادے یہ ہیں:۔

(۱) سر ایمان وقلب دین بریدہ | رفعنا ذکرک آمد وفاتش
(۲) سر اصلاح قومی حیف رفتہ | ھو خیر ثوابا ابدا سال حلت
(۳) سال وفات از سر و پائے کتاب | انی لکم منه نذیر مبین
(۴) لا بی بی المغفرا

۱۳۳۰ھ

(۵) کر چکے نقل مکاں سو سے کرتہ خاک | ہو چکی منزلِ اول ارم پاک کی طی
سال: جھوالطف | کسکو معلوم نہیں قبر نذیر احمد ہی

(۵) جب آئیں تو کچھ درود پڑھ کر جائیں
ملحوظ رہے لطیف یہ مصرعۂ سال
(۶) لطیف از پئے نام و نشان سالِ رحیل
(۷) آہ از مرگ نذیر احمد کہ او
بذلہ گو و نکتہ سنج و خوش بیاں
معنی قرآں بہ تفصیلے نوشت
زیست کرد بیکسی فرزانگاں
پانزدہ روز از جمادی آخر
عصر ایں جا کرد و مغرب در جناں
چوں بہ یوم جمعہ رحلت یافتہ
(۸) داغ دین نبی
۱۳۳۰ھ

یہ حق ہے مسلمانوں پر اس تربت کا
مدفن یہی ہے مولوی نذیر احمد کا
ہمیں بس است ۔ مزار نذیر احمد خاں ۱۳۳۰ھ
نیک خصلت بود و خوش افعال ہم
سر برآوردہ بہ قیل و قال ہم
بود آساں پیش او اشکال ہم
در نگاہش بود قسمہ دال ہم
ماند با اہل جہاں خوشحال ہم
ہست فرخ بنگر و اعمال ہم
دال بہ مغفور آمد سال ہم
دال/۴ + مغفور/۱۳۲۶ = ۱۳۳۰ھ
(طالب دہلوی)

کشمیری دروازے سے لوتھین روڈ ہو کر ریل کے پل (لوتھین برج) تک

کشمیری دروازہ
۱۶۳۸-۳۹ء

شہر میں داخل ہونے کا شمالی دروازہ ۔ شاہ جہاں کے وقت کا بنا ہوا ہے ۔ چوں کہ اس دروازے پر غدر میں بہت بڑا معرکہ رہا لہٰذا بطور یادگار جوں کا توں برقرار رکھا ہے کیوں کہ گولوں کی مار سے فصیل اور دروازے کا کنگورا چھلنی ہو گیا ہے ۔ یہ دروازہ دو دروں کا یعنی ڈبل ہے ۔ ایک محراب میں سے لوگ داخل ہوتے ہیں اور دوسری میں سے باہر نکلتے ہیں ۔ یہاں ایک پتھر کی بڑی سل پر دونوں محرابوں کے بیچ کے پاکھے کی دیوار پر یہ کتبہ ہے :-

On the 14th September 1857 the British force stormed Delhi. It was after sunrise on Thursday that this undermentioned party advancing from Ludlow Castle in the face of a heavy fire and crossing the bridge which had been

almost totally destroyed, lodged powder bags against and blew in the right leaf of the gate, thus opening the way for the assaulting Column.

Lieutenant Duncan Home } Bengal Engineers
" Philip Salkeld } " " Mortally Wounded
Sergeant John Smith } Bengal Sappers ...
" A. B. Carmichael } and ... Killed
Corporal F. Burgess } Miners ... Killed
Bugler Hawthorne (52nd foot)
Soobadar Toola Ram } Bengal Sappers
Jemadar Bis Ram } and
Havildar Madhoo } Miners ... Wounded
" Tilok Singh } ... Mortally Wounded
Sepoy Ram Heth } ... ... Killed

This memorial is placed here as a tribute of respect to these gallant soldiers by General Lord Napier of Magdala Colonel Royal Engineers and Commander-in-Chief in India 1876.

—— 000 ——

ترجمہ - ۱۴ / ستمبر ۱۸۵۷ء کو افواج انگریزی نے دہلی پر حملہ کیا - اس دن طلوع آفتاب کے بعد مصرحۂ ذیل پارٹی لڈو کیسل سے ایک شدید گولہ باری کا مقابلہ کرتے ہوئے اس پل پر سے جو بالکل برباد کر دیا تھا عبور کر کے بارود کے تھیلے دروازے کے سامنے جما کر اس کا دروازہ کا داہنا پٹ اڑا کر حملہ آور پارٹی کے لیئے رستہ کھول دیا -

لفٹننٹ ڈنکن ہوم	انجنیر بنگال	
فلپ سالکلڈ	ایضاً	سخت مجروح
سارجنٹ جان سمتھ	بنگال سیپرز	مقتول
سارجنٹ اے بی کارمائیکل	"	مقتول
کارپورل ایف برجس	مینرز	مقتول
بگلر ہاتھورن	(۵۲) پیدل	
صوبیدار ٹلارام	بنگال سیپرز	زخمی
جمعدار بسرام		
حوالدار مادھو	"	زخمی
حوالدار تلوک سنگھ		مہلک طور پر زخمی
سپاہی رام ہیتھ	مینرز	مقتول

یہ یادگار بطور فریضۂ تعظیمی ان بہادر سپاہیوں کے **جنرل لارڈ نیپیر آف میگڈالا** کرنل مد ایل انجنیرز و سپہ سالار افواج ہند نے ۱۸۷۶ء میں نصب کی - کشمیری دروازے سے بائیں ہاتھ کو جو سڑک چلی گئی ہے وہ کچہریوں کی طرف جاتی ہے ضلع کی ساری کچہریاں اسی جگہ ہیں جن میں سے ایک وسیع قطعہ گھرا ہوا ہے - کشمیری دروازے سے ایک سڑک سیدھی لوتھین برج تک چلی گئی ہے یہ لوتھین روڈ کہلاتی ہے اور اس پر کشمیری دروازے کے متصل دو طرفہ یورپین سوداگروں کی بہت سی دکانیں ہیں اور جو دوسری عمارات ہیں اُن سب کی تفصیل حسب ذیل ہے - **داہنی طرف** - میوزیم آف انڈین آرٹس - کنگ کنگ اینڈ کو - رینکن اینڈ کو سنہ ۱۸۷۷ء - میڈم کلیر زنانہ درزی - دہلی موٹر اینڈ انجنیرنگ کمپنی - رام چندر اینڈ سنز خیاط - ڈاکٹر سمتھ دنداں ساز - پیارے لال اینڈ سنز موٹر انجنیرز - حسین بخش اینڈ کو مالک ایشریم ہوٹل دہلی و شملہ - الیس عبد الغنی سیکل سٹور و ساز و سامان چرمی دہلی اور میرٹھ - ایشوری پرشاد اینڈ کو موٹر اینڈ سیکل فروشندہ - نجارا ہاؤس - گک اینڈ موڈی مصور - گوپی ناتھ نیلام والے - ٹی آر پربٹ گارج (کارخانہ موٹر) **بائیں طرف** - ای بلومر اینڈ کو

ڈی میکر و پولو اینڈ کو۔ سگرٹ اور انگریزی تاکو والے۔ منٹن اینڈ کو اسلحہ والے۔
جی آر پاکر اینڈ کو خیاط۔ یو بیرا سے اینڈ کو ۱۸۸۳ء گیند بنے والے۔ ایم گرین ہل
اینڈ کو۔ آر دت مصور۔ سینل جاپان ہوس۔ پرو ونشیل سیکل اینڈ موٹر
کمپنی۔ ہارتھ اینڈ کو موٹر انجنیرز۔ الکٹرک ہوس۔ ایچ ایس اوبرا اینڈ کو
سوداگران فرنیچر۔ سینٹ اسٹیفنز کالج کا بورڈنگ ہوس
شگن چند مصور۔ بی ایم کھنا اینڈ سنز پارچہ فروش۔ بیبیٹی مٹھائی ساز۔ ہری ناتھ
اینڈ کو کشمیر ہوس۔ وسٹ اینڈ کو دندان ساز۔ انڈر ووڈ ٹیپ ریٹرز۔
بورڈنگ ہوس گورمنٹ ہائی سکول۔ گورمنٹ ہائی سکول جو پہلے کالج تھا
میگزین۔ صدر ڈاک خانہ۔ انگریزی قبرستان۔

سینٹ جیمس کا گرجا
۱۸۲۶ء

کشمیری دروازے کے پاس لوتھین روڈ پر یہ گرجا ہے۔ یہ گرجا کرنل جیمس سکنر بہادر سی۔ بی کا بنوایا ہوا ہے جو پہلے مہاراجہ سیندھیا (گوالیار) کی ملازمت میں تھے۔ لیکن مہاراجہ انگریزوں

ﻟﮯ سکنر صاحب ۱۷۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد قسل کے سکاچ کمپنی کی سروس میں ایک عہدہ دار تھے آپ نے ایک راجپوت قوم کی عورت سے شادی کر لی تھی۔ مہاراجہ سیندھیا کی سروس میں ڈی بائن De Boigne کی علیحدگی کے بعد ۱۷۹۶ء میں آپ مقرر ہوئے اور بہت سے معرکوں میں شریک رہے لیکن ۱۸۰۳ء میں جب سیندھیا اور کمپنی میں جنگ چھڑ گئی تو سارے انگریز افسر ملازمت سے علیحدہ کر دیئے۔ سکنر صاحب نے لارڈ لیک کے تحت میں اس شرط پہ ملازمت کر لی کہ میں اپنے قدیم آقا یعنی سیندھیا کے مقابلے میں نہیں لڑنے کا۔ بغرض سکنر صاحب کو پرفسر بارسس کی کمان ملی جو جنگ دہلی سے فراغت ہو کر آیا تھا۔ ۱۸۰۵ء میں لارڈ لیک کے ساتھ ہلکر کے تعاقب میں بیاس گئے۔ جنگ کے اختتام پر بہ سالار فوج یاگرا الیکن پھر ۱۸۰۷ء میں ہریانہ کے انتظام کو بھیجے گئے۔ گورکھا اور پنڈاریوں کی لڑائی ۱۸۱۵ء میں ان کے رسالے کی نفری ہزار تک بڑھا دی گئی ۱۸۲۵ء میں بھرت پور کے مقابلے میں سکنر نے بڑا نام پایا۔ ۱۸۲۸ء میں جب کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل کی روپڑ میں ملاقات ہوئی تو بہ ع اپنے رسالے کے بلائے گئے تھے۔ ۱۸۲۸ء میں سکنر صاحب کو برٹش گورمنٹ میں لفٹننٹ کرنل کے عہدے پہ ترقی ملی اور سی۔ بی کا خطاب بھی ملا۔ سکنر صاحب کو ہندوستانی لوگ عموماً سکندر صاحب کہتے تھے۔ ہانسی میں رہا کرتے تھے کہ وہی ان کے رسالے کا مستقر تھا لیکن دلی میں بھی ان کا ایک عالی شان مکان اندرون کشمیری دروازہ تھا۔ سکنر صاحب نے ۱۸۴۱ء میں ہانسی میں انتقال کیا اور وہاں سے ان کا جنازہ بڑی دھوم سے لا کر اس گرجا میں دفن کیا گیا۔ اب ان کے رسالے کا نام فرسٹ ڈیوک آف یارکس اون لانسرز (سکنرز ہارس) اور سکنر صاحب کا تیسرا رسالہ ہے۔ ۱۲

گرجا گھر
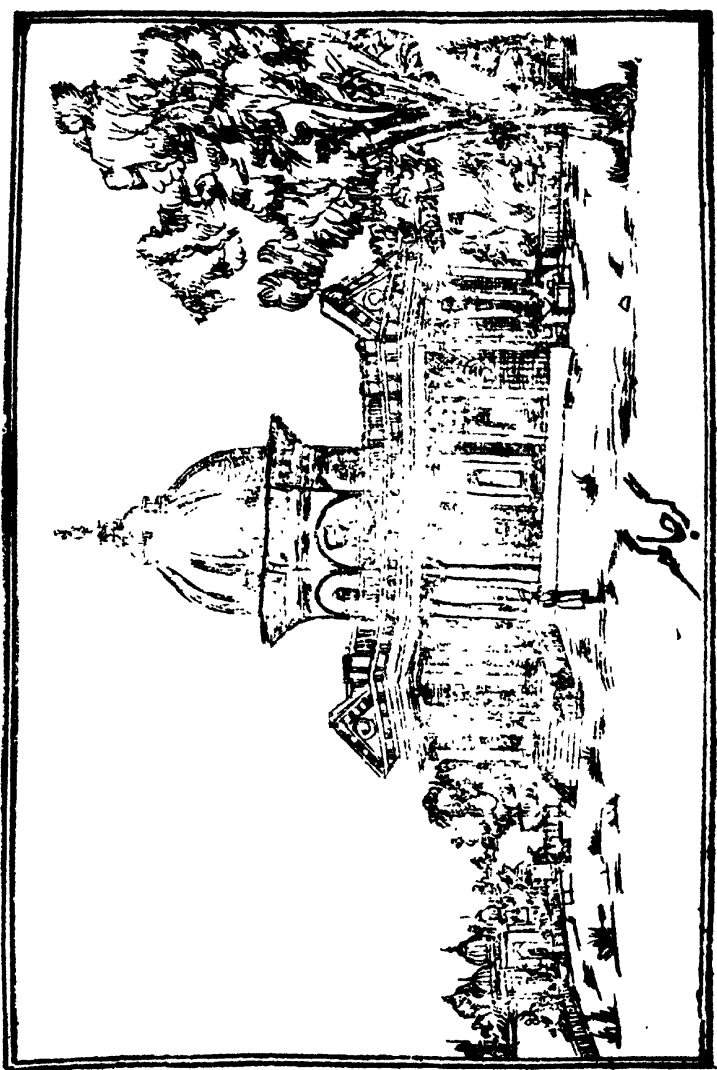
سے لڑنے کو کھڑے ہوئے تو سکنر صاحب اُن کی نوکری چھوڑ ایسٹ انڈیا کمپنی
کی ملازمت میں ہو گئے اور یہاں اُنھوں نے ایک رجمنٹ سواروں کی کھڑی
کی جو سکنر صاحب کے رسالے کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ جب سکنر صاحب
یونیارا کی لڑائی میں سخت زخمی ہوئے تو انھوں نے منت مانی تھی چنانچہ
اُنھوں نے یہ گرجا ۱۸۲۶ء میں بنوانا شروع کیا جو دس برس میں بن کر
تیار ہوا۔ اس کی تعمیر میں نوے ہزار روپیہ خرچ ہوا یہ سارے کا سارا روپیہ
جیمس سکنر صاحب نے اپنی جیب خاص سے دیا۔ بعد ان کے ان کی اولاد نے
اس گرجا میں بہت کچھ صرف کیا۔ یہ عالی شان عمارت دو بنگال انجنیروں کی
عقل رسا کا رہین ہے۔ میجر رابرٹ سمتھ نے بنیاد سے لے کر کارنس تک بنایا
اور کپتان ڈی بوڈی (Captain De Bude) نے باقی
ماندہ کام پورا کیا۔ یہ عمارت بہت خوش قطع اور شان دار ہے گنبد گرجا کی ہے جس پر سنہری
صلیب ہے۔ کمروں میں سنگ مرمر کا فرش ہے۔ غدر کی گولہ باری خاص کر اس
وجہ سے کہ کشمیری دروازے کے نزدیک تھا گرجا کے گنبد کو بہت صدمہ پہنچا۔
یوں تو کئی گولے اس پر گرے مگر ایک گولہ عین گنبد پر پڑا اور گنبد کو توڑ دیا چنانچہ
۱۸۶۵ء میں اس کی درستی کرا دی گئی اور چھت میں لوہے کے گرڈر جب ہی
ڈالے گئے۔ غدر میں گرجا کے گنبد پر بجائے کلس کے ایک بڑا بھاری
گولہ تانبے کے پتر کا تھا اور اس پر صلیب بنی ہوئی تھی اس کا تو گولیوں سے
ستھراؤ کر دیا ناچار اسے اُتارنا پڑا اور اس کی جگہ دوسرا گولہ چڑھا دیا گیا۔
یہ گولہ اب گرجا کے صحن میں ایک چبوترے پر بطور یادگار کے رکھ دیا گیا ہے
جس میں (۷۹) سوراخ گولیوں کے ہیں اور صلیب میں (۱۳) سوراخ پڑے
ہوئے ہیں۔ اس چبوترے پر یہ کتبہ بخط انگریزی لگا ہوا ہے:۔

This Cross Ball which former-
-ly crowned the adjacent church
remained unmoved throughout
the stress and storm of the seige of Delhi

When the Church was repaired they were removed and placed here in 1883, by the Rev: H. W. Griffith, M.A. Chaplain.

(ترجمہ) یہ صلیب اور گولہ جو پہلے ملحقہ گرجا کی چوٹی پر تھا۔ دلی کے محاصرے کے سارے شدید طوفان کے زمانے میں اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ گرجا کی مرمت کے وقت ۱۸۸۳ء میں انہیں ریورنڈ۔ اچ۔ ڈبلیو گریفتھ صاحب ایم۔ اے پادری نے یہاں اُتروا کر رکھوا دیا۔

دوسرا کتبہ جو گرجا کے ایک دروازے کے روکار پر ہے:-

The peal of 4 Bells in This belfry was presented to Saint James Church, Delhi, By Stanley Edgar Skinner 1st (B.Y.O.) Lancers "Skinner's Horse" and Alice Georgiana Skinner grand children of the late Colonel James Skinner C.B. by whom this Church was built. 1902

(ترجمہ) اس سٹی کے چار گھنٹے سٹینلی ایڈگار سکنر فرسٹ (ڈی۔وائی۔او) لانسرز "سکنرز ہارس" اور ایلس جارجی اینا سکنر جو مرحوم کرنل جیمس سکنر سی۔ بی اس گرجا کے بانی کے پوتے (پوتیوں) نے ۱۹۰۲ء میں سینٹ جیمس گرجا واقع دہلی کو نذر دیئے۔

مسٹر فریزر کی قبر ۱۸۳۵ء

گرجا کے صحن میں مغرب کی طرف سڑک کے رُخ پر مسٹر فریزر کی قبر ہے جو ۱۸۳۵ء میں قتل ہوئے۔ جن کا مفصل ذکر ہندو راؤ کے مکان کے ضمن میں آیا ہے۔ یہ قبر سنگ مرمر کی ہے جس پر دو شیر بٹھائے گئے تھے اور قبر کے گرد آہنی کٹہرا تھا یہ قبر بھی فریزر صاحب کے دوست کرنیل سکنر صاحب نے بنوائی تھی۔ غدر میں کٹہرا اور شیر سب توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا اور سنگ مرمر

کے ستون جو بعد غدر مدتوں تک بکھرے پڑے رہے تھے وہ غالباً اسی قبر کے سہارے ہوں گے اب اس قبر پہ انگریزی کے دو کتبے حسب ذیل ہیں:-

تیسرا کتبہ

Sacred to the Memory of William Fraser Esquire Late Commissioner and Agent to the Lieutenant Governor, at Delhi and a Local Major of Skinner's Horse, cruelly murdered by an assasin 22nd March 1835.

(ترجمہ) یادگار مقدس ولیم فریزر صاحب کمشنر و ایجنٹ لفٹنٹ گورنر بمقام دہلی اور مقامی میجر سکنرز ہارس کے جو ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو بے رحمی سے ایک قاتل کے ہاتھ سے ہلاک ہوئے۔

چوتھا کتبہ

The remains interred beneath this Monument were once animated, by as brave and sincere a Soul, as was ever vouchsaved by his Creator. A brother in friendship, has caused it to be erected, that when his own frame is dust, it may remain as a Memorial for those who can participate in lamenting the sudden and melancholy loss of one dear to him as life.

William Fraser. Died 22nd March 1835

(ترجمہ) اس یادگار کے نیچے اس شخص کی خاک ہے جس کے جسد خاکی میں خالق نے ایسی ایک روح ودیعت کی تھی جو شاید ہی کسی کو دی گئی ہو۔ ایک بھائی نے بادائے حق دوستی یہ (یادگار) بنوائی ہے کہ جب خود اس کا اپنا جسد خاک

ہو جاوے تو یہ ایک یادگار ان لوگوں کے لیئے باقی رہے جو ایک ایسے شخص کے اچانک اور رنج دہ نقصان میں جو اُسے جان سے بھی زیادہ عزیز تھا شرکت رکھتے ہیں۔ ولیم فریزر۔ تاریخ وفات ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء

یادگار مقتولین غدر ۱۸۵۷ء

فریزر صاحب کی قبر سے ملی ہوئی پیچھے وارسٹرک کی طرف ایک چبوترا اور اس پر سنگ مرمر کی ایک خوب صورت اور مثمن صلیب بہ یادگار مقتولین غدر کھڑی کی گئی ہے۔ اس صلیب کے چاروں طرف انگریزی۔ فارسی۔ عربی۔ ہندی میں ایک ہی کتبہ ہے جس کی نقل نیچے آتی ہے۔ اس میں مسٹر برسفرڈ منیجر دلی بنک کے سارے کا سارا خاندان میٹھی نیند سو رہا ہے اور مسٹر کالن بھی یہیں ہیں غرض سب اکیس نفر مظلومین مقتولین کی نہایت الم ناک یادگار ہے۔ باغیوں نے چن چن کر جہاں جو انگریز ملا مارا لیکن تاہم بعض رحم دل خدا کے بندے ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر انگریزوں کو پناہ دی۔ مسٹر ہرن نے جو اپنی کتاب کے صفحہ (۴) پر لکھا ہے کہ ایک میم کو ۱۹ اگست تک چھپا رکھا اور اسی تاریخ اُسے برٹش کیمپ میں پونچا دیا یہ ذکر مسز لیمن کا ہے جن کی جان راقم کے نانا مولوی عبدالقادر صاحب نے بچائی تھی اور کئی مہینے تک اُن کو اپنے گھر میں چھپا رکھا اور اُن کے زخموں کی مرہم پٹی کی اور اپنی جان ہتھیلی پر دھر کے ان کو انگریزی کیمپ میں پونچا دیا۔

صلیب پر کا کتبہ

(۱) انگریزی

Sacred to the Memory of
those who were murdered at
Delhi in May MDCCCLBII
and in gratitude to GOD for the
mercy in having spared a
remnant of his people to erect
the Cross. Psalm CTXXEi

اس صلیبی یادگار کے نیچے چبوترے کی زہ پر ایک کتبہ اُن لوگوں کے نام کا ہے جو برسفرڈ صاحب کے خاندان سے مارے گئے یعنی اُن کے صرف نام کندہ کر دیئے گئے ہیں اور وہ یہ ہیں:- جاسن برسفرڈ۔ سارا برسفرڈ۔ ربیکا برسفرڈ۔ شارلٹ برسفرڈ۔ ایگنس برسفرڈ۔ کیتھرین برسفرڈ۔ (فارسی) بیادگاری آں نصرانیاں کہ باہ مئی در سنہ یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت عیسوی در دہلی بظلم مقتول شدند و بشکر گزاری ایزد تعالیٰ کہ چند از بندگان خود را از راہ رحم نگہداشت ایں صلیب را تیار کردند۔ زبور ۱۲۶ (عربی) هٰذا التذکرة النصاری الذین قتلوا فی شهر من سنة سبع وخمسین بعد الف و ثمان مائة فی المدینة دهلی والشکر لله الرحیم الذی ابقی قلیلا من عباده فبنوا هذا الصلیب۔ زبور ۱۲۶

سر طامس مٹکاف کی قبر

سنہ ۱۸۵۳

گرجا کے شمال و مشرق کے کونے میں سر طامس تھیافیلس مٹکاف بارٹ۔ بی۔ سی۔ ایس کی قبر سرتاپا سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے جو سر جان تھیافیلس مٹکاف کے والد تھے اور آخر الذکر صاحب غدر میں دلی کے جائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ جن کی جان بڑی مشکل سے بچی۔ اس قبر کے گرد ایک نہایت نفیس سنگ مرمر کا جالی دار کٹہرا ہے۔

سلہ سر چارلس تھیافیلس بیرن مٹکاف ۱۷۸۵ء میں کلکتے میں پیدا ہوئے اور کمپنی کی ملازمت میں ۱۸۰۰ء میں داخل ہوئے۔ ہلکر اور بھرت پور کے مقابلے میں جو جنگ ۱۸۰۴ء میں ہوئی تھی اس میں لارڈ لیک کے لشکر کے ساتھ یہ پولیٹکل آفیسر تھے اور ڈیگ میں گولہ باری کے وقت فصیل کے شگاف پر سب سے پہلے یہی پہنچے۔ ۱۸۰۶ء میں یہ دلی کے رزیڈنٹ کے مددگار تھے۔ ۱۸۰۸-۹ء میں رنجیت سنگھ کے پاس سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ ۱۸۱۱-۱۹ء میں دلی کے رزیڈنٹ رہے اور دوبارہ ۱۸۲۵-۲۷ء میں پھر رزیڈنٹ تھے۔ ۱۸۳۳ء میں آگرے کے گورنر رہے اور ۱۸۳۵-۳۶ء میں قائم مقام گورنر جنرل رہے۔ ۱۸۳۶-۳۸ء میں لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی۔ گورنر جمیکا ۱۸۳۹-۴۲ء۔ گورنر جنرل کنیڈا ۱۸۴۳-۴۵ء۔ ۱۸۴۵ء میں ''پیر'' یعنی لارڈ بنائے گئے اور ۱۸۴۶ء میں انتقال کیا۔ مٹکاف صاحب کے خاندان کا تعلق دلی سے نصف صدی سے زیادہ رہا ہے۔ ''مٹکاف ہوس'' کے بانی انھیں کے چھوٹے بھائی تھے۔

یہ وہی کٹہرا ہی جس کا ذکر قطب صاحب کی درگاہ کے بیان میں نوابان جھجر کے ضمن میں آیا ہی۔ یعنی یہ تعویذ مع کٹہرا سارے کا سارا جھجر والوں نے اپنی ہڑوار کے لیئے خریدا تھا لیکن غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں معاملہ کچھ ایسا درہم برہم ہوا کہ مسلمان کی قبر کا تعویذ ایک انگریز کی قبر پہ لگا دیا گیا۔ اس پہ یہ کتبہ بخط انگریزی ہی

Here rests the body of Sir Thomas Theophilus Metcalf Bart Bengal Civil Service. Died the 3rd of November 1853. Aged 58.

ترجمہ یہ مرقد سر طامس تھیافیلس مٹکاف بارٹ بنگال سول سروس کا ہی (جنھوں نے) ۳ نومبر ۱۸۵۳ء میں بعمر ۵۸ (سال) انتقال کیا۔

خاندان سکنر کی ہڑوار

گرجا ہی کے احاطے میں سکنر صاحب کے خاندان کی ہڑوار ہی۔ جس میں کئی نہایت نفیس قبریں سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔ اطراف آہنی جنگلا لگا ہوا ہی۔

اس کے احاطے کی منڈیر میں یہ کتبہ ہی:۔

The Sepulchral family vault and Monument of the "Skinner Family" alloted by the Lord Bishop of Calcutta and Metropolitan in India; agreeably to his Lordship's Faculty.
Dated 12th March 1856.

ترجمہ یہ ہڑوارڈ خاندان سکنر کی کلکتے کے لارڈ بشپ اور ملک ہند کے مٹروپالیٹن نے حسب اقتدار حاصلۂ خود ۱۲ مارچ ۱۸۵۶ء کو مقرر کی ۔ کٹہرے کے پاس ایک بہت خوب صورت زنانی قبر سنگ مرمر کی بڑی شان دار بنی ہوئی ہی۔

سردار بہو کی قبر
۱۸۸۴ء

یہ قبر ایلس اینی - الگزینڈر سکنر کی زوجہ کی ہے جنہوں نے ۲۲ جنوری ۱۸۸۱ء کو ۲۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس پر کی انگریزی عبارت و نظم بہت دل چسپ ہے نیچے نقل کر دی گئی۔

Deeply regretted by all
"The Lord gave and the Lord hath taken away, blessed be the name of God" Job 1. 21.
Where the silent willow weeps
A friend, a wife, a mother sleeps
Her infant image here below
Sits smiling at her father's woe
This Memorial is erected by her
disconsolate husband 1884

ترجمہ سب کو نہایت رنج ہوا۔ "خدا ہی نے دیا اور خدا ہی نے لے لیا۔ مبارک ہو خدا کا نام - جوب (۱) - (۲۱) "جس مقام پر کہ خاموش بید (وہ ایک قسم کی جنگلی جھاڑی) رو رہی ہے (اس مقام پر) ایک دوست - ایک بیوی - ایک ماں (خواب غفلت میں) سو رہی ہے - اس کی چھوٹی سی شکل جو اس کے نیچے ہے اپنے باپ کے غم (و اندوہ) کو دیکھ (دیکھ) مسکرا رہی ہے" یہ یادگار (اس مرحومہ کے) بے قرار شوہر نے ۱۸۸۴ء میں بنوائی۔

اشعار اردو

گدبانوے اسکنر الکسنڈر آنکہ — برگزیدہ طریق عیسوی بہر نجات
سردار بہو خطاب ایلس اینی — صد حیف کہ از قضای یافت وفات
در بست و سوم ز جنوری یکشنبہ — ہجدہ صد و ہشتاد و یکم از سنوات

جس نے کی تیرے گدائی کی — اس کو خواہش نہ بادشاہی کی
جس نے سینہ کیا نہ صاف اپنا — اس نے کیا خاک پارسائی کی

کانیکی سے درگزر مت کر — اس میں جو ہو رضا الٰہی کی
اس سے بہتر ہے سکندر تیرا — نکلے دم یاد میں الٰہی کی

انگریزوں کی ساری قبروں پر کتبے بالالتزام ہوتے ہیں۔ اور قبریں بھی اسی احاطے میں اور اس کے باہر بھی ہیں مگر چوں کہ اُن میں کوئی خاص بات نہ تھی ہم نے اُن کو چھوڑ دیا۔ سکنر صاحب کا خاندان دلّی میں الک صاحب والوں کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی مستورات میں سے اکثر پیرو اسلام اور پابند صوم و صلوۃ تھیں اور بعض تیتر بٹیر کچھ ادھر کچھ اُدھر غرض یہ خاندان عیسائیت اور اسلام کی ایک عمدہ معجون مرکب تھی۔ جن سے بہت سے کار خیر ہوئے۔ اب بھی اس خاندان کے چند ممبر ہیں جو پیرو اسلام ہیں۔

ملحقہ مکانات گرجا کے پیچھے جو مکانات ہیں وہ سو سوا سو برس کے اُدھر کے ہیں۔ سول کورٹ کے پاس والا مکان ۱۸۵۷ء میں سمتھ صاحب کا مکان کہلاتا تھا جس میں غالباً مسٹر جارج ہنری سمتھ کلکٹر کمشنر سرحد شمال مغرب رہتے تھے۔ اس مکان میں کئی تہ خانے ہیں۔ سینٹ جیمس کے چرچ کے پار دہلی گزٹ چھپتا تھا جس کے ایڈیٹر مسٹر پلیس اور نایب ایڈیٹر مسٹر ویگن ٹربیر Wagentreiber تھے اور یہیں سے ڈلہی سکیچ بک یا انڈین پنچ بھی نکلتا تھا۔ اس مکان کے سامنے جو کھلا ہوا ٹکڑا اراضی کا ہے وہ رزیڈنسی کا باغ تھا جس میں گورنمنٹ کالج اور اب ڈسٹرکٹ بورڈ سکول ہے۔ کشمیری دروازے سے جو سب سے زیادہ قریب مکان ہے اس میں میجر ڈابر کمشنر تعمیرات عامہ رہتے تھے۔ کرنل سکنر کا مکان وہ تھا جس میں مدتوں بنگال بنک تھا۔ اب یہ مکان ای آئی آر والوں نے لے لیا ہے۔ اب جہاں سینٹ سٹیفنز کالج ہے اس کے پیچھے احمد علی خاں کا مکان تھا جس کی جگہ اب چھوٹے چھوٹے کئی مکانات بن گئے ہیں لیکن غدر کے بعد کچھ دنوں یہاں فوج کی بارکیں تھیں۔ یہاں پہلے سڑک کو بہت گھماؤ دینا پڑا تھا کہ ۱۸۵۳ء میں یہیں کمپنی کے چیف جج کے رہنے کا مکان تھا لیکن ایام غدر میں اس مکان میں مسٹر رابرٹس گورنمنٹ کالج کے ہیڈ ماسٹر رہتے تھے

سینٹ سٹیفنز کالج
سنہ ۱۸۹۰ء

آتنا بڑا شہر اور سرکاری کالج ندارد جو قدیم کالج تھا وہ ۱۸۷۷ء میں توڑ دیا گیا۔ ضرورت تعلیم کی مسلم تھی ۱۸۹۰ء میں یہ مشن کالج قایم ہوا جس کا بنیادی پتھر سر جان الیسٹ کے سی۔ ایس۔ آئی نے رکھا اور ۱۸۹۱ء میں پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر جیمس لایل صاحب بالقابہ نے افتتاح فرمایا۔ یہ کالج ریورنڈ آلنٹ صاحب پادری نے بڑی کوشش سے کئی ہزار روپیہ چندہ جمع کر کے بنوایا ہے۔ اور خوب چل رہا ہے اس کے متعلق بورڈنگ ہوس بھی ہے اور کالج کی بڑی عمارت دو منزلہ نہایت خوش وضع اور سنگین کشمیری دروازے کے پاس لب سڑک ہے۔ مدتوں آلنٹ صاحب خود پرنسپل رہے پھر پادری ایف سی اینڈرو نے پرنسپل رہے اب پادری رُدرا صاحب ایم۔ اے پرنسپل ہے۔ اس کالج کے متعلق شہر میں کئی برانچ سکول ہیں جن میں کثرت سے لڑکے پڑھتے ہیں۔ مسلمانوں میں ظاہری تو نام بہت ہے ان کا کوئی کالج نہیں۔ ع

گر جاں طلبی مضایقہ نیست
گر زر طلبی سخن درین است

جناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب حاذق الملک بہادر کچھ لوگوں کو ابھار رہے ہیں مگر ہنوز روز اول ہے۔ ع

کالج و مدرسے کے بیاں کر کے فائدے
وہ یا تو چھوٹتے ہی ٹکا سا جواب دے
یا وعدہ ہو کہ تا بقیامت وفا نہ ہو۔
گر گنئے پاؤں قوم کی خانہ خرابیاں
دیوار و در کو دیکھ ہو لگ جائیں ہچکیاں
ای قوم تیری ہمت و غیرت کو کیا ہوا
یہ قوم ہائے قوم ہے مصداق صم و بکم

چندے کی امیں سے آرزو و التجا کروں
یا چپ رہے کے اُس سے بیٹھے گلا کروں
میں خضر تو نہیں کہ ہمیشہ جیا کروں
محفل میں شور و شیون و ماتم بپا کروں
گر حال زار قوم یہ قصد بکا کروں
تو ہی قصور وار تو کس کا گلہ کروں
ناخن کہاں سے لاؤں کہ یہ عقدہ وا کروں

ہندوؤں نے اپنا کالج مدتیں ہوئیں کہ بنا بھی لیا اور ہم ابھی منصوبے ہی کا نقشہ کر رہے ہیں ہندوؤں نے یونیورسٹی بنالی اور ہم ابھی قواعد ہی بنا رہے ہیں۔ الجر

حکیم صاحب ممدوح کی اَن تھک کوشش سے قرول باغ میں طبیہ کالج بڑے بھاری سکیل پر بڑی سرگرمی اور اعلیٰ پیمانے پر بن رہا ہے۔ اب رہا اسلامیہ کالج اگر کبھی دیر سویر بنے گا بھی تو جناب حکیم صاحب ہی کی کوشش سے بنے تو بنے ورنہ اور کسی کو نہ اس طرف توجہ ہے نہ شوق۔ حکیم صاحب تن تنہا کیا کر سکتے ہیں۔ ایک سور ما چنا کیا بھاڑ کو پھوڑ سکتا ہے؟۔

سینٹ اسٹیفنز کالج کے صدر دروازے کے سامنے پورچ (برآمدہ) ہے دروازہ دو منزلہ اور بہت شاندار ہے جس کے دونوں جانب چوپہل برجیاں ہیں۔ اور بیچ میں ایک گھڑیال لگی ہوئی ہے اور اس پر ایک صلیب بنی ہوئی ہے۔ اس کالج کے صدر دروازے پر یہ کتبہ ہے:۔

ADDIE GLORIAM

St: Stephen's College

محراب کی داہنی طرف۔ (اردو میں) اپنے سارے دل خداوند کریم پر توکل کر اور اپنی سمجھ پر تکیہ مت کر اپنی ساری راہوں میں اس کا اقرار کر اور وہ تیری رہنمائی کرے گا۔ محراب کی بائیں طرف خداوند کا خوف دانا (ل)[1] کا شروع ہے اُن سب کی جو اس پر عمل کرتے ہیں اچھی سمجھ ہے اُسکی ستائش ابد تک قائم ہے۔

روکار پر بائیں طرف۔ آؤ سب . . . . بوڑھے . . . . لے ہو۔ ناگری کتبہ مٹ گیا۔ روکار پر داہنی طرف۔ جوان انتی . . . . . کس طرح . . . . کیے (ناگری) تیرے کلام کے مطابق بڑی خوب توجہ کرنے سے۔ دروازے کے پاکھے پر شال کی طرف سنگ مرمر کی تختی پر:

To the Glory of God and for the advance-
ment of sound learning and religious
education
St Stephen's College DELHI
This stone was laid by Sir Charles A. Elliot
K.C.S.I. On Friday April 11th 1890.

---

[1] یہاں کچھ پانی ٹپکنے سے اڑ گیا ہے جس کے آخر کا صرف (ل) رہ گیا ہے۔ ۱۲

ترجمہ جل وعلی شانہ۔ تبحر علم کی ترقی اور مذہبی تعلیم کے لیئے سینٹ سٹیفنز کالج کا پتھر (بنیاد) سر چارلس اے ایلیٹ کے سی ایس ای نے دیروز جمعہ اپریل (کی) گیارھویں ۱۸۹۰ء کو رکھا۔ گرجا کے اندر ہال میں جنوب کی طرف

Jesus said I am the light of the world he that followeth Me shall not walk in darkness but shall have the Light of Life

ترجمہ یسوع نے کہا کہ میں دنیا کی روشنی ہوں جو میری پیروی کرتا ہو وہ تاریکی میں نہیں چلے گا بلکہ اُس کو زندگی کی روشنی ملے گی۔ ہال کے شمال کی طرف (اردو میں)

یسوع نے کہا راہ اور حق اور زندگی میں ہوں | جب وہ یعنی روح الحق آئیگی تو وہ ساری سچائی کی راہ بتائیگی | سچائی جانوگے اور سچائی تمہیں آزاد کریگی

سائنس لیبارٹیری پر (سنگ مرمر کی تختی)

To the glory of God
am
For the advancement of Science
By
R. Humphreys Esqr. I. C. S.
16th July 1907

ترجمہ جل وعلا شانہ۔ ترقی تعلیم سائنس کے لیئے یہ سنگ بنیاد آر ہمفریز صاحب آئی سی ایس نے ۱۶ جولائی ۱۹۰۷ء کو رکھا۔

کالج کے سامنے سڑک پار ایک عمدہ اور وسیع بورڈنگ ہوس دارالاقامہ ہے جس کے دروازے کے ادھر ادھر دو برجیاں ہیں۔ بورڈنگ ہوس پر سنگ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ ہے:-

This wing of the Boarding House was projected by The Reverend John W. T. Wright M. A. of the

Cambridge Mission, Professor in St Stephen's College from 1883 and Principal from 1898 till his unexpected death, at Dalhousi Sept 1902. It was erected in fulfilment of his purpose by his family and European friends in token of their affectionate regard.

ترجمہ - بورڈنگ ہوس کا یہ ضلع کیمبرج مشن کے پادری جان - ڈبلیو - ٹی رائیٹ ایم - اے نے بڑھوایا جو ۱۸۸۳ء میں سینٹ سٹیفنز کالج کے پروفیسر تھے اور ۱۸۹۸ء سے اُن کی خیر متوقع وفات تک جو ڈلہوزی میں ستمبر ۱۹۰۲ء کو واقع ہوئی پرنسپل (بھی) رہے - یہ (ضلع) اُن کے مقصود کی تکمیل کے لیئے اُن کے خاندان کے (لوگوں) اور یورپین احباب نے (مرحوم کی محبت کے اظہار کی نشانی کے طور پر) بنوایا -

کتب خانۂ داراشکوہ گورنمنٹ کالج میونسپل بورڈ سکول

تو تعین روڈ پر - عہد شاہجہانی - داراشکوہ شاہجہاں کا فرزند اکبر تھا - جس سے شاہجہاں کی حیات میں تخت پر اورنگ زیب سے لڑائی ہوئی - جس میں داراشکوہ نے شکست پائی اور مارا گیا - اس عمارت کے بڑے بڑے نہایت اونچے اونچے کھلے در ہیں جن کے بالائی حصے میں تختہ بندی کر دی گئی ہی اس کے دروازے کے ستون پر ایک تختی پر یہ کتبہ بخط انگریزی لگا ہوا ہی :-

گورنمنٹ ہائی سکول

سابقاً

کتب خانہ داراشکوہ خلف شاہجہاں	۱۶۳۷
مکان مسکونہ علی مردان خاں مغل وبسرائے پنجاب	۱۶۳۹
سرڈیوڈ اختر لونی بارٹ کی رزیڈنسی	۱۸۰۳

گورنمنٹ کالج

۱۸۰۴ - ۱۸۷۷ء

مدرسۂ ضلع

۱۸۷۷ - ۱۸۸۶

میونیسپل بورڈ سکول

۱۸۸۶ - ۱۹۰۴

دارا شکوہ کا کتب خانہ گیا۔ علی مردان خاں کا کچھ دخل نہ رہا۔ رزیڈنسی نہ رہی کالج کا پتہ نہیں سب جا چکے ضلع کا مدرسہ تھا اب وہ بھی میونیسپل بورڈ سکول رہ گیا۔ انٹرنس یعنی میٹریکیولیشن تک کی پڑھائی ہی آگے پڑھو تو مشن کالج میں جاؤ یا ہندو کالج میں۔ لیکن ایک پرانا مقولہ ہی کہ ہسٹری ریپیٹس اٹ سلف یعنی واقعات لوٹا پوٹا کرتے ہیں۔ کسے امید تھی کہ دلی یوں اُجاڑ ہو کر دار السلطنت ہو جائیگی تو کیا عجب ہی کہ دار السلطنت کی پاس خاطر سے پھر گورنمنٹ کالج بھی بن جائے حکام وقت کی توجہ شرط ہی۔ اگر ایک نگاہ کرم ادھر ہو جائے تو بس بیڑا پار ہی

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے ابر کرم بحر سخا کچھ تو ادھر بھی

تار گھر کلکتہ دروازے سے نصف میل کے قریب جو دلی کا قدیم **ڈاک بنگلہ** تھا اور یہی نام پرانے لوگوں کی زبان پر اب تک چڑھا ہوا ہی اسی میں صدر تار گھر تھا۔ اسی کے سامنے ایک ستون اُن تار کے عہدہ داروں کی یادگار میں کھڑا کیا گیا ہی جو غدر میں کام آئے۔ اور جس سے نیز اُن دو کم عمر سگنلروں کی یاد تازہ کرنا مقصود ہی جو اس معرکۂ عظیم میں جب کہ موت سامنے کھڑی تھی ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے اور انبالے کو وہ مشہور پیغام تار برقی دوڑا دیا جس کی بدولت ملک پنجاب بال بال بچ گیا۔

تختی کے سامنے وار

Erected on the 19th April 1902
by the Members of the Telegraph Departments
to commemorate the loyal and devoted
services of the Delhi Telegraph Office Staff.

on the eventful 11th May 1857. On that day two young signallers,
William Brandish and J. W. Pilkington, remained on duty till ordered to leave, and by telegraphing to Amballa information of what was happening at Delhi, rendered invaluable service to the Punjab Government.
In the words of Sir Robert Montgomery:—
"The electric telegraph has saved India".

ترجمہ ممبران محکمہ تار نے اُن خیر خواہانہ اور وفادارانہ خدمات کے انصرام کی یادگار میں بنائی جو دہلی تار برقی آفس کے سٹاف نے ۱۱مئی ۱۸۵۷ء کے ہولناک دن کیں۔ اُس دن دو نوجوان سگنلر ولیم برنڈش اور جے ڈبلیو پلکنگٹن جب تک اُن کو چلے جانے کا حکم نہیں دیا گیا اُس وقت تک وہ اپنی ڈیوٹی پر مستعد رہے۔ دہلی میں جو کچھ گزر رہا تھا ان واقعات کی اطلاع بذریعہ تار انبالے دینے سے انھوں نے پنجاب گورنمنٹ کی انمول خدمت گزاری کی۔ سر رابرٹ منٹگمری صاحب کے الفاظ یہ ہیں:۔ "تار برقی نے ہندوستان کو بچا لیا"۔

The Delhi Telegraph Office Staff	پیچھے وار

on the 11th May 1857 consisted of the following:—
Dharles Todd, Assistant-in-Charge, Killed near Cable House, on left bank of river Jumna, on the morning of the above date, while endeavouring to restore telegraphic communication with Meerut
W. Brendish, Signaller, retired 1st Septem

ber 1896. J. W. Pilkington, Signaller, voluntarily returned to Telegraph Office from Staff Tower, and signalled despatch to Commander-in-Chief. Taken prisoner after doing so, but escaped. Died, Roorkie, 24th March 1867.

ترجمہ- ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو دہلی کے تار گھر میں یہ لوگ تھے :- ڈھارلش ٹاڈ- اسسٹنٹ انچارج- جو جمنا کے بائیں کنارے کیبل ہوس کے پاس اسی تاریخ صبح کو ایسی حالت میں مارے گئے کہ وہ میرٹھ سے تار گھر کا سلسلہ درست کرنے کی کوشش میں مصروف تھے- ڈبلیو بریڈش سگنلر- جو کم ستمبر ۱۸۹۶ء میں پنشن سے کر سبک دوش ہوئے تھے جے ڈبلیو- پلکنگٹن سگنلر جو سٹاف ٹور سے از خود تار گھر میں چلے آئے اور انھوں نے کمانڈران چیف کو وہ مراسلہ تار پر روانہ کیا جس میں دلی کے غدر کا حال تھا- اس کے بعد ہی ان کو باغیوں نے پکڑ کر قید کر لیا لیکن پھر نکل بھاگے- رڑکی میں ۲۴ مارچ ۱۸۶۷ء کو وفات پائی-

تار کی نقل

Dated 11th May 1857

We must leave office. All the bungalows are being burnt down by the sepoys of Meerut. They came in this morning. We are off don't roll today. Mr C. Todd is dead - we think he went out this morning and has not returned yet. We heard that nine Europeans were killed. Good bye

— ooo —

ترجمہ مورخہ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء ہم کو آفس چھوڑنا ضروری ہے- میرٹھ کے سپاہی سارے بنگلے جلا رہے ہیں- یہ لوگ آج صبح یہاں پہنچے- ہم جا رہے ہیں آج گھنٹی نہ بجانا- ہمارا خیال ہے کہ مسٹر سی ٹاڈ مر گئے کیوں کہ آج صبح باہر گئے

تھے اور اب تک واپس نہیں آئے - ہم نے سنا کہ نو پور میں قتل کیے گئے۔
اچھار خصت - یہ تار دلی سے انبالے گیا - اُسی دن دوپہر کے بعد اس کی ایک نقل میجر جنرل سر - ایچ برنارڈ سی - بی - کمانڈنگ آفیسر ضلع سرہند کو بھیجی گئی - اُنھوں نے ڈاک سے اس کی ایک نقل سر ہنری لارنس چیف کمشنر جو اتفاق سے چند دنوں کے لیئے راول پنڈی آئے ہوئے تھے اور ایک نقل جنرل اینسن کمانڈر ان چیف شملہ کو بھیجی - یہ تار تمام فوجی سٹیشنوں کو بھیجا گیا اور جو نقل سر جان لارنس کو پہونچی تھی وہ اب تک سکریٹریٹ کے دفتر میں محفوظ ہے - اس تار کا پتہ حال میں ۱۹۰۶ء میں ملا جو گورمنٹ کے پرانے دفاتر میں جو لاہور میں ہیں اُن میں نکلا -

میگزین یا سلاح خانہ

دارا شکوہ خلف اکبر شاہجہاں بادشاہ کے محل کی جگہ پر یہ میگزین تھا اور انگریزی بیوٹو انجنیر پرادنشل ورک کی کچہری بھی عجب نہیں کہ اسی محل کا ایک جز رہی ہو - کیوں کہ وہاں کئی تہ خانے پرانے زمانے کے نکلے تھے - شہر کی فصیل اور ڈاک خانے کے پیچھے جو دریا کی طرف محل کی دیوار تھی اس سے شہر کی فصیل کو فاصلہ ہے - شہر پناہ میں یہاں نیچے کو پھیلے ہوئے پشتے بنا دیئے ہیں لیکن فصیل کے زیادہ قدیم حصے میں جو پانی برج کی طرف ہے اس قسم کے ممٹے نہیں ہیں - علاوہ بریں پرانی گری پڑی عمارتوں کے بڑے بڑے پتھریاں فصیل کی جڑ میں لگے ہوئے ہیں جن سے فصیل کی قدامت کا پتہ چلتا ہے - کسی وقت میں اس مکان میں گولہ بارود کا یہاں ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا اور یہ مقام شمالی حصۂ ہند میں سب سے بڑا گودام تھا لیکن سر چارلس نیپیر کمانڈر ان چیف وقت نے قلعہ سے اس قدر نزدیک اور ناف شہر میں چھاؤنی سے دور اتنا بڑا گودام گولے بارود کا رکھنے پر سخت اعتراض کیا - بدیں وجہ بہت سی بارود اور کارتوس ایک دوسرے میگزین میں جو پہاڑی پر بنا ہوا تھا منتقل کر دیئے گئے لیکن پھر بھی بارود کی کافی مقدار کارتوس بنانے کو یہاں رہتی ہی تھی اور یہیں سے دوسرے میگزینوں کی سربراہی کی جاتی تھی - کچھ توپیں بھی یہاں تھیں اور اسی وجہ سے

غدر میں باغیوں کو یہ آسانی ایسی بڑی بڑی توپیں ہاتھ آگئیں جو کہ اپنے ساتھ کبھی نہ لا سکتے تھے۔ اب جہاں صدر ڈاک خانہ ہے یہ **اصلحہ خانہ** تھا جس کے پاس ہی بارود کا کوٹھا تھا اور اس میدان میں جہاں کہ بڑا تار گھر ہے یہیں توپیں رکھی جاتی تھیں۔ اس کے پیچھے اور دو چھوٹے میگزین تھے جن کو غدر میں اپنی جان پر کھیل کر خود اُن نو بہادر انگریز سورماؤں نے اڑا کر ملک پر اپنی جان قربان کر دی جن کی یادگار کا کتبہ صدر دروازے پر لگا ہوا ہے۔ اب پرانی عمارت کا حصہ صرف یہی ایک دروازہ باقی رہ گیا ہے۔ یہیں دو دالان اس جگہ تھے جہاں کہ اب اگزیکیوٹو انجنیر کا آفس ہے جن میں مختلف قسم کا سٹور تھا۔ سڑک کی اس طرف جس پر پتھر کی فرشی تھی اور جس پر میگزین کی وجہ سے حقہ یا چرٹ پینے کی سخت ممانعت تھی **ورک شاپ** تھی جس کے دو پھاٹک میگزین کے احاطے کے سامنے ہی تھے۔ ورکشاپ کی پشت پر جو مقامات تھے وہ سارے کے سارے پیڑ آ گئے ہیں۔

کتبہ

On 11th May 1857
Nine resolute Englishmen
Lt: Geo: Dobree Willoughby, Bengal Artillery
In Command
Lieutenant William Raynor.
Conductor G. William Shaw
Conductor Jhon Scully.
Sergeant Bryan Edwards.
Lieutenant Geo: Forrest.
Conductor John Buckley.
Sub Conductor William Crow.
Sergeant Peter Stewart.
Defended the Magazine of Delhi for

more than four hours against large number of the rebels and mutineers, untill walls being scaled, and all hope of success gone, these brave men fired the Magazine. Five of the gallant band perished in the explosion, which at the same time destroyed many of the enemy.

This Tablet

Making the former entrance gate to the Magazine, is placed by the Govern-ment of India.

ترجمہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو۔ نو ارادے کے مستقل انگریزوں۔ لفٹنٹ جارج۔ ڈوبری ویلوبی۔ توپ خانۂ بنگال۔ کی کمان میں لفٹنٹ ولیم رینار۔ کنڈکٹر جی ولیم شا۔ کنڈکٹر جان سکلی۔ سارجنٹ بریان ایڈورڈز۔ لفٹنٹ جاسج فارسٹ کنڈکٹر جان بکلے۔ سب کنڈکٹر ولیم کرو۔ سارجنٹ پیٹر سٹیو ارٹ نے دہلی کے میگزین کو بلوائیوں اور باغیوں کے جم غفیر کے مقابلے میں چار گھنٹے سے اوپر سنبھالے رہے لیکن جب کہ باغی سیڑھیاں لگا لگا کر دیواروں پر چڑھنے لگے اور امداد کی اور کوئی اُمید باقی نہ رہی تو ان بہادروں نے میگزین کو پھونک دیا۔ جس دھماکے میں اس بہادر گروہ کے پانچ آدمی ہلاک ہوئے لیکن ساتھ ہی اس کے دشمنوں کے بھی بہت سے آدمی برباد ہوئے۔ یہ تختی قدیم میگزین کے دروازے پہ اس جگہ سرکار انگریزی نے نصب کرائی ہے۔

انگریزوں کا سب سے پرانا قبرستان

صدر ڈاک خانے کے احاطے سے جانب جنوب ملا ہوا انگریزوں کا سب سے پہلا اور پرانا قبرستان ہے جو ۱۸۰۵ء میں چھوڑ دیا گیا اور نیا قبرستان کشمیری دروازے کے باہر بنا لیا گیا۔ پُرانے قبرستان میں دو قبریں خاص ذکر کے قابل ہیں ایک طامس مٹکاف کی ہے جس کے

کتبے سے معلوم ہوتا ہی کہ سکنر صاحب نے بنوائی تھی اور اس پر ایک سائبان بھی ہی۔ دوسری لفٹنٹ رنیار کے چھوٹے بچے کی ہی۔ یہ وہی رنیار صاحب ہیں جو میگزین کی حفاظت میں جان پر کھیل گئے۔

کشمیری دروازے سے سڑک نصیر گنج جو کشمیری دروازہ بازار مشہور ہی ہیملٹن روڈ تک

اس سڑک کے ابتدائی حصے پر داہنی جانب کچھ یورپین تجار کی دکانیں ہیں فخرالمساجد ہندو کالج۔ مسجد پاتی پتیاں ہیں۔ بائیں طرف نواب حامد علی خاں صاحب کا بہت بڑا بھاری امام باڑہ ہی جس میں اب محمد مصطفیٰ محمد یوسف کا گاڑی کا بہت بڑا کارخانہ ہی۔ یہ امام باڑہ شہر میں سب سے بڑا ہی۔ کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ ہردیان سنگھ والوں کے قبضے میں کیسے آیا۔ سنتے ہیں کہ انھوں نے پچاس ہزار کو خرید لیا۔ یہ عمارت ایسی پختہ عالی شان شاہی زمانے کی بنی ہوئی ہی اور ایسے وسیع احاطے کے اندر ہی کہ پچاس ہزار تو اس پر سے نچھاور کر دیئے جائیں۔ بیچنے والوں کو خدا جانے ایسی کیا مجبوری تھی کہ کوڑیوں کے مول دے دیا۔ بڑے کشادہ کرسی دار دالان اور شہ نشین سہ دریاں چبوترے ہیں کہ یادش بخیر ہالوں کی چھتوں پر نقاشی کا ایسا نفیس کام ہی کہ جس کا جواب نہیں یہ امام باڑہ لکھنؤ کے حسین آباد کے مشہور امام باڑے کی وضع قطع کا ہی مگر اب تو بالکل ویران اور تباہ حالت میں ہی اور آخر میں پولیس سٹیشن ہی۔ **داہنی طرف**۔ طامس کک اینڈ سنز ساہوکار وایجنٹ مسافران بحری وبرّی۔ بابو لال جوہری۔ ہیملٹن اینڈ کو جوہری۔ یوسپرا اینڈ سنز۔ فلپس اینڈ کو۔ جاپان فین آرٹس (عجائبات) جے بی نارٹن اینڈ سنز لمٹیڈ کنسلٹنگ انجنیر حفظان صحت۔ دالٹرالک اینڈ کمپنی اسلحہ ساز۔ بنٹو سو کمپنی مٹھائی ساز۔ جس کے اوپر ڈاک خانہ اور تار گھر ہی۔ کیونسٹر علی گڈھ کے مکھن فروش یہ مکان فخرالمساجد کا ہی جس کی بالائی منزل پر دیا بشبابر وقف متعلقہ فخرالمساجد ۱۲۳۳ھ لکھا ہوا ہی۔ ہندو کالج۔ گلی موچی والی

مسجد باقی پتیاں۔ اور یہیں فخر المساجد ہی۔ کوٹھی رائے بہادر لالہ سلطان سنگھ رئیس[1] دہلی۔

فخر المساجد

۱۱۴۱ھ
۲۹-۱۷۲۸ء

کشمیری دروازے کے پاس کشمیری دروازہ بازار میں لب سڑک یہ مسجد ہی۔ اسکا انتظام بھی کمیٹی مسجد فتح پوری کے سپرد ہی۔ یہ مسجد **کنیز فاطمہ عرف فخر النساء بیگم** نے اپنے شوہر **شجاعت خاں** کی یادگار میں ۱۱۴۱ھ ۲۹-۱۷۲۸ء میں بنوائی تھی۔ شجاعت خاں اورنگ زیب کے عہد میں من جملہ امرائے سربرآوردہ کے تھے۔ آپ اکبرآباد (آگرے) میں قلعے کی افواج کے کمانڈر تھے بڑھتے بڑھتے توپ خانے کے افسر اور چار ہزاری منصب اور ڈھائی ہزار سواروں کے کمانڈر ہوے۔ ان کا اصل نام **رعد انداز بیگ** تھا اور ۱۰۸۳ھ ۷۳-۱۶۷۲ء میں آپ کو شجاعت خاں کا خطاب ملا اور خطاب ملنے کے ایک ہی سال بعد افاغنہ کی لڑائی میں مارے گئے۔ مسجد کا چبوترا ۴۰ گز × ۴۴ ہی جو آٹھ فیٹ اونچا ہی مسجد کے شرقی جانب لب سڑک پانچ چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی ہیں جن کے کرائے کی آمدنی سے مسجد کی نگہداشت ہوتی ہی۔ صحن مسجد میں ۴۰ × ۳ گز کا فرش ہی جس کے گرد ایک چھوٹی سی منڈیر ہی۔ صحن مسجد تین طرف سے محاط ہی اور مغرب کی طرف خود مسجد ہی۔ شمال اور جنوب میں سہ دریاں ۲۳ × ۱۴ فیٹ اور آٹھ فیٹ اونچی ہیں۔ ان سہ دریوں میں ایک ایک حجرہ بھی ہی۔ صحن سے مسجد ڈھائی فیٹ اونچی ہی۔ اس کے تین در سنگین دار محرابوں کے ہیں۔ مسجد کے پیش میں تمام سنگ مرمر لگا ہوا ہی جس میں سنگ سرخ کی پٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ چھت کے پیش میں بھی سنگ مرمر کا کنگورہ ہی۔ جو بیچ کی محراب پر ادھر ادھر کے دروں سے چار فیٹ اونچا ہی۔ مسجد کے دو مینار ہیں جن میں سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی عمودی پٹیاں پڑی ہوئی ہیں جن پر ہشت پہلو برجیاں سنہری کلس کی ہیں۔ ان مناروں کے پیچھے نہایت خوب صورت شان دار گنبد ہیں ان پر بھی مناروں کی طرح کی ایک ایک سفید ایک ایک سیاہ پٹیاں پڑی ہوئی ہیں اور

---

[1] لالہ صاحب جینی صاحبان کے اعلیٰ ممبروں میں سے ہیں۔ آپکے بزرگان محکمہ کمسریٹ کے بڑے مشہور اور ذی عزت گماشتے تھے۔ لالہ صاحب موصوف بہت لائق نوجوان ہیں۔ شہر میں ان کا بڑا اعزاز ہی حکام رس اور ہندوؤں کے لیڈر ہیں۔ آپ رفاہ عام کے کاموں میں بڑا حصہ لیتے ہیں۔ رائے بہادر کا خطاب ہی اور میونسپل کمشنر ہیں۔ م

نقشہ فخر المساجد
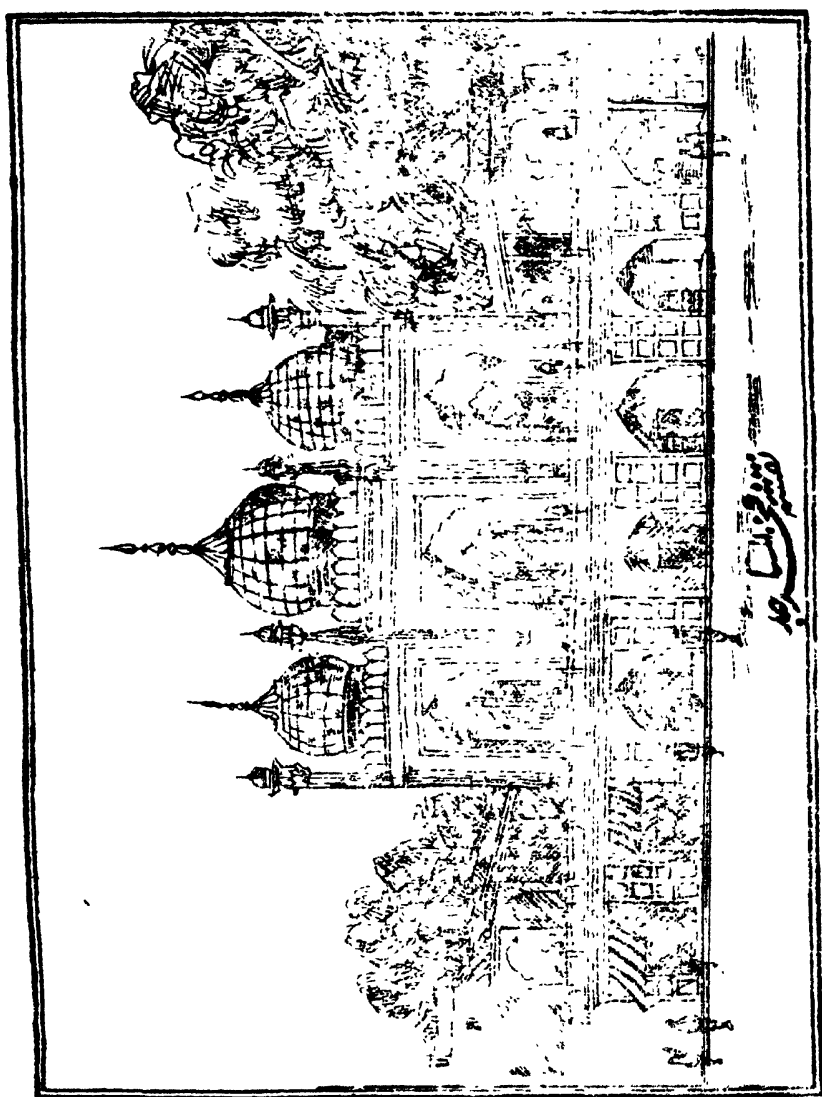
اوپر ملمع کے کلس ہیں - فرش اندرون دالان مسجد سنگ مرمر کا ہی اور مصلوں پر سنگ سُرخ کی تحریر ہی - فرش زمین سے ۴ فٹ تک دیواروں میں سنگ مرمر لگا ہوا ہی اس سے اوپر بھورا پتھر ہی - مسجد کی پچھیت کی دیوار میں ممبر کے پاس جو سنگِ مرمر کا ہی ایک دس فیٹ اونچی دیوار دوز محراب ہی - گنبدوں کے اندر پلاستر ہی - مسجد کی بائیں طرف کی دیوار میں ایک دروازہ ہی اور سیدھی طرف مُلّا کے رہنے کی ایک کوٹھری ہی - ۱۸۵۷ء کے غدر میں چوں کہ کشمیری دروازے پر بڑا معرکہ تھا اور یہ مسجد وہیں قریب میں ہی گولوں کی زد سے یہ بھی نہ بچ سکی - بائیں جانب کی دیوار اور اُدھر ہی کے دالان گولوں کی بھرمار سے نقصان پہونچا اور شمال مشرق کے جانب کی مینار کی بُرجی بھی شکستہ ہو گئی جسے لوہے کی ٹانکی لگا کر جوڑ دیا ہی - مسجد کا صدر دروازہ شمال و مشرق کے کونے میں ہی کل آٹھ سیڑھیاں ہیں جن میں سے کچھ سیڑھیاں دروازے کی چھت کے اندر بھی آ گئی ہیں - مسجد کے دروازے پر "فخر المساجد" اور بیچ کی محراب کی پیشانی پر یہ کتبہ ہی :-

بارضائے حق تعالیٰ از طفیلِ مرتضیٰ	خانِ دیں پرور شجاعت خاں بجنت یافت جا
یادگارش ساخت ایں مسجد بفضلِ مصطفیٰ	صدرِ خاتوناں کنیزِ فاطمہ فخر جہاں

سنہ ۱۱۴۱ھ

مسجد کے شمال میں ایک نئی عالی شان دو منزلہ عمارت طرز جدید کی بنا دی ہی جس پر "الوقف لا یملک" لکھا ہوا ہی - نیچے دکان ہیں علی گڈھ کی نمکین کی دکان کیونٹر (Caventer Aligarh Diary) ہی جس کا ستر روپیہ ماہانہ کرایہ آتا ہی -

ہندو کالج ۱۸۹۹ء

سینٹ اسٹیفنز کالج کے محاذ میں ایک وسیع کوٹھی میں یہ کالج ہی جو ہندو صاحبوں کی عالی ہمتی کی زندہ یادگار ہی - کوٹھی کے دروازے پر Hindu College Established 1899. لکھا ہوا ہی (ہندو کالج جس کی بنا سنہ ۱۸۹۹ء میں ہوئی) یہ مکان کالج کے واسطے بنایا نہیں گیا بلکہ یہ کوٹھی دراصل کرنل سکنر صاحب کی تھی ان سے لالہ سلطان سنگھ صاحب نے خرید کر کالج کے ہاتھ فروخت کر دی - اس کے

احاطے میں ایک بیس در کا نہایت نفیس بورڈنگ ہوس بنا ہوا ہے جس میں چار بڑے
بڑے کشادہ کمرے ہیں جن میں بورڈر رہتے ہیں اس کے دروازے پر یہ کتبہ ہے

Sri Ram Ashram. Built by the sons of the late Diwan of Alwar 1917

ترجمہ سری رام آشرم جس کو متوفی دیوان الور کے صاحبزادوں نے سنہ ۱۹۱۷ء میں
بنوایا۔

مسجد بانی پتیاں
سنہ ۱۱۴۳ھ

یہ مسجد تیسری دروازے فخر المساجد اور ہندو کالج کے پاس نصیر گنج کی سڑک پر ہے۔ یہ مسجد پہلے ایک احاطے کے اندر تھی جس کے اندر کئی پختہ مکان اسی مسجد کے متعلق تھے۔ اس مسجد تین در کی ہے دونوں طرف شمال و جنوب کے دالان کرائے پر چلتے تھے۔ یہ مسجد لطف اللہ خاں صادق کی بنائی ہوئی ہے چنانچہ پیش طاق پر "مسجد لطف اللہ خاں صادق" کندہ ہے۔ اس مسجد کی یہ حالت جو اب ہم اوپر لکھ آئے ہیں بالکل نہیں رہی۔ اب نہایت وسیع اور شاندار دو منزلہ و سہ منزلہ عمارات صحن مسجد کے گرد بن گئی ہیں اور ابھی تعمیر جاری ہے مولوی محمد امین الدین صاحب جنہوں نے تن من دھن سب خدا کی راہ میں لگا دیا ہے چندے سے بنوا رہے ہیں۔ میں مسجد کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ اللہ اکبر دلی میں بھی ایسی جگہ ہے۔ اس کا بہت بڑا عالی شان دروازہ جس پر سہ دری کا بنگلہ ہے دیکھ کر ہی دل باغ باغ ہو جاتا ہے اندر جاؤ تو کچھ عجیب نظارہ ہے یہ دروازہ دہرا ہے بیرونی دروازے اور اندرونی دروازے کے بیچ میں لداؤ کی ڈیوڑھی ہے جس کے داہنے بائیں ایک ایک سہ دری ہے۔ اندر ابھی پرانی مسجد اصلی حالت میں کھڑی ہے جو بالکل معمولی ہے پیش طاق کے ادھر ادھر دو دو در ہیں چھت سپاٹ لداؤ کی اوپر کنگورا اور دونوں طرف چھوٹی چھوٹی میناریں ہیں۔ اسے ابھی ہاتھ نہیں لگایا ابھی شمالی اور چند دالان دو منزلہ نئے بنے ہیں۔ شمال کی طرف کے دالان میں دو منزلہ سات حجرے طلبا کے رہنے کے ہیں جس کے دونوں طرف زینے اور سہ منزلہ پر ایک تین در کا کمرہ بنا ہوا ہے اور اسی طرح کا

جنوب میں ہے۔ مغرب کی طرف اصل مسجد ہے جو دو منزلہ بنائی جائے گی۔ مشرق میں
صدر دروازہ ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں جس کے ادھر ادھر دو مقفر سہ دالان ہیں
سہ طرفہ عمارت طلباء کا دارالاقامہ۔ مدرسہ امینیہ۔ مہتمم و مدرسین کے رہنے کے حجرے
دارالافتاء۔ دارالحدیث۔ کتب خانہ وغیرہ سب ضروریات کو کفتی ہے مجھ کو نہیں معلوم
ہوتا کہ کس دماغ نے یہ نقشہ اختراع کیا ہے اور آیا کوئی ایسا شخص جو فن انجینیری
میں کمال نہ رکھتا ہو ایسی خوش قطع اور نفیس عمارت بنا سکتا ہے۔ ساری عمارت پختہ
اور سنگ بست نہایت مستحکم۔ شان دار اور ہوادار ہے جس کے دیکھنے سے
دل کو سرور اور آنکھوں میں نور آتا ہے۔ اصل مسجد کی لمبان ۹۵ فٹ - ۴ فٹ ہے۔ صحن جس میں
چوکے بچھے ہوئے ہیں ۴۴ فٹ - ۴۲ فٹ چوڑا ہے۔ گرد کے جدید دالان ۹۵ فٹ - ۴ فٹ لمبے
۱۵ فٹ - ۱۲ فٹ چوڑے ہیں۔ پہلی اور دوسری منزل کی سولہ سولہ سیڑھیاں ہیں اور
تیسری کی چودہ۔ بیچ صحن میں سنگ سرخ کا ایک مربع حوض ہے۔ سنگ سرخ کا
پہلا چبوترہ ۲۲ فٹ - ۲۲ مربع اور ۱ فٹ - ۱ اونچا ہے دوسرا چبوترا ۲۰ - ۸ مربع ۹ ½ اور نیچا ہے جس کا
حاشیہ سنگ مرمر کا ہے۔ بیچ میں فوارہ ہے۔ صدر دروازے پر نہایت خوش کتبات
حسب ذیل ہیں:- پیشانی پر ایک ہی لمبی سطر میں یہ عربی کا کتبہ ہے
اور دونوں بازوؤں پر فارسی کے قطعات ہیں۔

المدرسة العربية الاسلامية الامينية الرفيعة البناء كشجرة طيبة
أصلها ثابت وفرعها في السماء التي أسست على التقوى من أول يوم
أسست فيه وضع أساسها في سنة ألف وثلثمائة وخمس عشر من المسجد
المطلي ولبثت فيه سبع عشرة سنة إلا قليلا ثم انتقلت منه في سنة
ألف وثلثمائة وأربع وثلثين إلى هذا المسجد المعروف بمسجد
پانی پتیان بعد ما بنيت هذه العمارة الرفيعة والمنازل
المنيفة على نفقة الجماعة من أهل الجود الذي فاضت روضة
مخضلة التي تأوي إليها أولوا الأحلام والنهى وكلها من قوته
لوجه الله تعالى شانه۔

داہنی طرف پاکھے پر

تاریخ آغاز قیام مدرسۂ امینیہ عربیہ دہلی

امین الدین بیمن فضل یزداں | نہادہ طرح باغ علم وعرفاں
بزنزدیں مسجدے فرخندہ جائے | بنا شد مدرسہ اخلاص عنواں
چوں شد معمور گنج علم وحکمت | سن تاسیس از جستند یاراں
رسید الہام حق بکفایت اللہ | کہ تاریخش بگو گلزار رضواں

۱۳۱۵ھ

بائیں طرف پاکھے پر

تاریخ تعمیر جدید مدرسۂ امینیہ عربیہ دہلی

سپس این نغز وفرخندہ مقاش | عطا فرمود حق از روئے احساں
ببذل ہمت اہل کرم شد | مثال گنبد خضرا اشش بنیاں
قبولش کن خداوندا برحمت | لوجہ اللہ وقف ست ایں دبستاں
بار غشں مخزن علم وگیا ست | بخواں وز حق طلب کن اش ایاں

۱۳۴۴ھ

مدرسۂ امینیہ اس مدرسہ کو مولوی محمد امین الدین صاحب اورنگ آبادی نے چندے سے سنہری مسجد واقع چاندنی چوک میں جاری کیا۔
مولوی محمد امین الدین صاحب دکن سے ۱۳۰۳ھ میں دیوبند آئے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہوکر ۱۳۱۲ھ میں دہلی آئے اور ۱۳۱۵ھ میں اس مدرسہ کو کھولا۔ اس مدرسے میں علوم دینیہ اور جملہ علوم وفنون کی تکمیل نصاب نظامیہ کے موافق کی جاتی ہے۔ عربی علم ادب۔ حدیث شریف تفسیر۔ فقہ وغیرہ سب مضامین داخل کورس ہیں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ حصول معاش کی غرض سے پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات، مولوی فاضل، منشی فاضل وغیرہ کے لیے بھی طلبا تیار کیے جاتے ہیں۔ یہاں کے طلبا زبان عربی کی نوشت وخواند اور تقریر پر بخوبی قادر ہوتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم بھی یہاں کے بعض طلبا کو علم ادب پڑھانے کے لیے خاص طور پر کچھ وقت دیا کرتے تھے۔ اس مدرسے کے طلبا گورنمنٹ کے مدارس میں بھی بھیجے جاتے ہیں۔ اس مدرسہ کے صدر مدرس ومفتی مولوی کفایت اللہ صاحب شاہجہان پوری تعلیم یافتہ دیوبند ایک بڑے محدث فقیہ اور ادیب ہیں اور آپ کے علاوہ اور

کئی تنخواہ یاب اور بلا تنخواہ کے علماے جید زمرۂ مدرسین میں شامل ہیں۔ جو صاحب تنخواہ پاتے ہیں وہ برائے نام صرف حقیقی ضرورتوں کے بقدر لے لیتے ہیں ورنہ ان صاحبوں کے علمی تبحر اور خدمات کے اعتبار سے کہنا پڑتا ہے کہ۔ ع۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ طلبار کی کثرت کی وجہ سے یہ مدرسہ تین سال ہوئے کہ سنہری مسجد واقع چاندنی چوک سے سجد پانی پتیاں میں منتقل کیا گیا اب صرف تعلیم قرآن کا مدرسہ سنہری مسجد میں رہ گیا ہی اس مسجد کی تولیت بھی مولوی امین الدین صاحب کے سپرد ہی۔ مدرسہ کا حساب کتاب بالکل باقاعدہ اور اطمینان بخش حالت میں ہی۔ سالانہ رپورٹیں شائع ہوتی ہیں۔ تعداد طلبار ۱۷۶ ہر روئے رپورٹ ۱۳۲۵-۲۶ھ جن میں عربی خواں (۱۲۵) فارسی خواں (۲۶) قرآن خواں (۲۱)، طلبہ مختلف دیار و امصار کے ہیں۔ آمدنی چندے کی گھٹتی بڑھتی رہتی ہی جس کا اوسط پانسو روپیہ ماہانہ ہی اور خرچ بھی اسی کے لگ بھگ ہی۔ یہاں سارے ملک ہندسے فتوے آتے رہتے ہیں اور اُن کے جوابات باقاعدہ لکھے جاتے ہیں۔ عمارت کی مد جدا ہی اُس پر اب تیس ہزار روپیہ خرچ ہو چکا ہی اور کام برابر جاری ہی۔ سر سید احمد خاں نے اگر علی گڈھ کالج کے لیے لاکھوں روپیہ چندہ جمع کیا تو اُن کی وجاہت کو اس میں بڑا دخل تھا مگر میاں محمد امین بے چارے کو کون جانتا ہی اور ان کا کہا دباؤ کسی پر کیا پڑ سکتا ہی۔ نہ یہاں دینے سے کوئی دنیا میں نام آوری ہی نہ سر سید کی خوشنودی سے پیش قرار نوکری یا خطاب مل سکتا ہی یہاں کا دینا تو بس خالصاً لوجہ اللہ ہی۔ ایسی حالت میں ایک بالکل معمولی شخص کا اس قدر رقم خطیر جمع کرنا بجز تائید غیبی کے قوت بشری سے خارج ہی بریں ہم اس سے ہم کو یہ سبق بھی ملتا ہی کہ سچی سعی ہمیشہ مشکور ہوتی ہی اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ مَعَالِيَ الْاُمُوْرِ۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔

ہیملٹن روڈ

جو لوتھین برج سے شروع ہو کر ریلوے لین کے برابر برابر ڈفرن برج کی سڑک سے تقاطع کرتی ہوئی چھوٹے دروازے میں سے شہر کے باہر نکل گئی ہی۔ اس سڑک کے بائیں جانب تو ریلوے سٹیشن کے حدود کی

شمالی اونچی دیوار اس سرے سے اس سرے تک چلی گئی ہے۔ ایک جگہ او ور برج ہے اور دوسری جگہ سندھ پنجاب دہلی ریلوے کے قدیم سٹیشن کی عمارت ہے جس میں اب گڈز شیڈ یعنی مال گودام ہے۔ داہنی طرف :- نواب سلطان مرزا کی مسجد (شیعان) اگلی گلی۔ مسجد علی احمد شاہ۔ بچھی مسجد نمبر (۱) لب سڑک جس پر دھوالغنی مسجد حنفیہ" لکھا ہوا ہے۔ چھوٹا بازار جس کے اندر گلی دھوبی واڑہ۔ مسجد منشی قادر بخش اس کے سامنے کی گلی مندر بابو برجھو دیال جو کشمیری دروازہ بازار سے تھانے کے سامنے نکلتی ہے۔ مسجد عبد اللہ شاہ معروف بہ شاہ جی۔ زنانہ پرائمری سکول میونسپل بورڈ۔ ست گھرا۔ کھڑکی ابراہیم علی خاں۔ گلی حاجی محمد اشرف۔ اب پھر سڑک پر آئے۔ گلی نعل بندان۔ زینت باڑی کشمیری دروازہ بازار اور ہملٹن روڈ کے جنکشن سے تا زینت باڑی گورا بازار کہلاتا ہے کہ کسی زمانے میں اسی نواح میں گوروں کی فوج رہتی تھی۔ مسجد آسیب بیگم اور مدرسہ مولوی عبد الرب صاحب۔ گندا لالہ۔ جس میں گلی قلعی گروالی اور اسی نام کی ایک مسجد۔ مسجد خضر بنگلہ سید فیروز۔ کوٹھی جیمس سکنر صاحب۔ گلی رہجان۔ گلی باغ بھکاری۔ امام باڑہ۔ درگاہ پنجہ۔ مسجد کھجور والی (شیعان) جس پر ۱۲۸۲ھ کندہ ہے۔ مسجد خضر بنگلہ سے ایک گلی موری دروازے کی سڑک سے جا ملتی ہے اس میں یہ گلیاں ہیں۔ گلی بڑوالی۔ گلی املیان سنگھ۔ گلی دھوبیان۔ گلی سوئی والان۔ محلہ تور والاں۔ سینٹ سٹیفنز مشن سکول جس کا ذکر موری گیٹ پر بھی آیا ہے۔

درگاہ پنجہ شریف

گندہ نالہ۔ گلی پنجہ۔ دورِ آخر مغلیہ۔ اس درگاہ کا ایک بڑا احاطہ ہے۔ احاطے کے اندر مسجد اور ایک دالان ہے جس میں حضرت علیؓ کا پنجہ اور کچھ تبرکات ہیں۔ اس احاطے میں بہت سی قبریں ہیں جس میں سے صرف دو خاص طور پر تذکرے کے قابل ہیں۔

(۱) مرزا محمد کی قبر

سنہ ۱۲۳۵ھ
۲۰-۱۸۱۹ء

درگاہ میں دالان کے پاس مشرق کی طرف۔ قبر کے تعویذ پر یہ کتبہ ہے :-

یا غفار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آں مرزا محمد واں حاوی علوم حامی دیں وشیعیہ اولادِ مصطفےٰ
جاں می دمید در تنِ دین محمدی از نطقِ بیروح پرورانفاس وجانفزا
شد جان دیں برون فرد گفت سال او در شیونش گریہ بگو وا محمدا

وا اے افسوس محمد سفر از دار فنا کرد

(۲) ابوالقاسم کی قبر

۱۲۲۷ھ
۱۳ - ۱۲ - ۱۸۱۲ء

درگاہ کے دالان کے سامنے۔ قبر کا تعویذ زمین کے برابر ہو گیا ہے جس پر یہ کتبہ ہے:۔

ابوالقاسم محمد شفیع یوم صابش بادشاہ ۱۲۲۷ھ

نامعلوم قبریں

ٹکھڑ کی ابراہیم علی خاں۔ عہد مغلیہ۔ سنگین احاطے کے اندر ایک سنگ مرمر کی قبر ہے جس کے گرد آیت الکرسی لکھی ہوئی ہے۔ دوسری چونے گچی کی ہے پتہ نہیں چلتا کہ یہ قبریں کن کی ہیں۔ ایک بڈھا کوئی اسی برس کی عمر کا کہتا تھا کہ اُس نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ سنگ مرمر والی قبر حاجی عطاء اللہ کی ہے اور دوسری اُن کی بی بی کی ہے۔
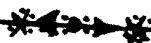
فہرست اُن مسجدوں کی جن کا ذکر اس کتاب میں نہیں آیا

نام مسجد	محلہ	کیفیت
آخوندجی	فراش خانہ	پہلے یہ مسجد ۱۱۰۵ھ (۹۴-۱۶۹۳ء) میں بنی تھی دوبارہ ۱۳۰۸ھ (۹۱-۱۸۹۰ء) میں بنی۔
آسیہ بیگم کی مسجد	ہیملٹن روڈ	سنہ ۱۳۰۴ھ میں یہ مسجد سڑک پر بہت خوش نما بنی ہوئی ہے جو دلی کے بہت بڑے مشہور واعظ مولوی عبدالرب صاحب کی بنوائی ہوئی ہے اور جس میں ایک مدرسہ عربی علوم دینیہ کا بھی ہے۔ انہیں مولوی صاحب نے سہارنپور کی مشہور جامع مسجد بنوائی تھی۔ یہ مسجد درحقیقت مولوی صاحب نے اپنی بیٹی آسیہ بیگم کے نام پر بنائی تھی کہ وہ جوان مرگئی۔ مولوی صاحب کے بعد ان کے صاحبزادے مولوی محمد ادریس صاحب نے تکمیل کرائی۔ مسجد دالان در دالان کی ہے۔ پانچ در ہیں۔ صحن میں حجرے کے پیچھے ہیں صحن کے آخری حصے پر ایک نفیس حوض اور کنواں ہے۔ چاروں طرف طلبہ کے لیے حجرے اور دالان بنے ہوئے ہیں چھت پر بھی دو کمرے ہیں۔ مدرسہ خوب چل رہا ہے۔ یہ حوض اور کنواں میری والدہ اور بڑی بہن مرحومہ کے زرِ عطیہ سے بنا ہے۔ مسجد بہت اچھی حالت میں ہے۔ چندے سے مدرسہ چلتا ہے۔ مولوی عبدالرب صاحب میرے نانا مولوی عبدالقادر صاحب کے حقیقی برادر کہین تھے۔ پیش طاق پر یہ کتبہ ہے جو بعد میں لگا دیا گیا ہے۔ هو الباقی

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			مسجد آسیہ بیگم حنفیہ تعمیر شدہ باہتمام مولوی محمد ادریس صاحب مرحوم ابن مولانا مولوی محمد عبد الرب صاحب سال تعمیر سنہ ۱۳۲۰ھ
(۳)	آقا سیتا	کوچہ چیلاں	شمال جنوب ۱۶ - مشرق مغرب ۱۱
(۴)	آم والی مسجد	کابلی دروازہ	نہر سعادت خاں پر پولیس کے تھانے کے پاس مسجد حاجی محمد عبد الغنی صاحب میونسپل کمشنر دہلی کے والد حاجی قطب الدین صاحب کی بنوائی ہوئی ہے اس کے صحن میں پہلے آم کا درخت تھا جس سے اس کا نام ایک آم والی مسجد پڑ گیا۔ مسجد کے پرانے طرز کو چھوڑ کر نئے طرز کی مسجد نہایت خوش نما پختہ اور عمدہ بنی ہوئی ہے۔ جس میں بجلی کی روشنی پانی کا نل سب کچھ ہے۔ چھوٹی سی جگہ میں بڑی معقول تراش خراش کی ہے اصل مسجد کا صرف ایک دالان نما کمرہ دلداؤ کا ہے جس میں تین چوبی دروازے لگے ہوئے ہیں۔ صحن میں چوکے کا فرش ہے۔ داہنی طرف تین دروازے سڑک کی طرف ہیں ان میں بھی کواڑوں کی جوڑیاں چڑھی ہوئی ہیں۔ بائیں طرف تین در کا خوش نما دالان اس کے دوسرے پر ایک اور کمرہ۔ مسجد کے دالان کی چھت کے چاروں کونوں پر چار نازک چھوٹے چھوٹے مینار۔ چھت کے گرد نہایت خوشنما دوہرا کٹہرا۔ سامنے وار آبدار خانہ غسل خانہ وغیرہ اس کے اوپر بھی کمرے بنے ہوئے ہیں صدر دروازہ نئے طرز کا نہایت ہی نفیس جس کے محاذ اور دائیں

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			بائیں نشیمن بنے ہوئے۔ دروازے کے ادھر ادھر ایک چھوٹی مینار۔ دروازے کا ڈزین لاجواب ہے۔ میں نے زمانۂ حال کی کسی مسجد کو ایسا خوش نما اور آراستہ نہیں دیکھا۔ جو نماز نہ پڑھتا ہو اس کا بھی دل چاہے کہ دو رکعت یہاں پڑھ لے۔ صدر دروازے کی ڈیوڑھی میں ایک طرف مسقف کنواں۔ سڑک پر سے چھ سیڑھیاں چڑھ کر صحن مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ صدر دروازے کی پیشانی پر بہت اونچا یہ کتبہ ہے:- ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ مسجد کے باہر تھوڑا سا کھلا میدان ہے اس میں ایک بہت پرانا بڑ کا درخت پھیلا ہوا ہے۔
(۵)	املی کی پہاڑی	املی کی پہاڑی	اسی مسجد کے نام سے محلہ مشہور ہو گیا ہے۔ قدیم۔ چھوٹی معمولی۔
(۶)	املی والی (۱)	سوداگران	معمولی ترمیم شدہ۔ کتبے سے جو پیش طاق پر ہے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۱۳ھ ۹۶-۱۸۹۵ء میں از سر نو بنی ہے۔
(۷)	ایضاً (۲)۔	مسجد تھور خاں	قدیم۔ معمولی نئے سر سے بنی ہوئی۔
(۸)	ایضاً (۳)۔	بلی ماران	قدیم۔ مولوی سلیم الدین خاں کی بنائی ہوئی۔ شمال سے جنوب ۳۵ف - ۹ا - مشرق سے مغرب - ۴م۔
(۹)	انار والی	فراش خانہ گھنٹہ لگا کنواں	خیر النسا بیگم نے جو یحییٰ ہاشمی کی اولاد سے تھیں ۱۱۰۲ھ ۹۱-۱۶۹۰ء میں بنائی ہے۔ صحن میں انار کا درخت ہونے سے یہ نام پڑا۔ پیش طاق پر سنگ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ ہے:- ایں مسجدے کہ کعبۂ ارباب طاعت است　　اسلام را بجائے اساسش بجا بود ہر کس ز روئے عجز گریزد بدر گہش　　گر بیش از گناہ نباشد روا بود خیر النساء کہ بانی ایں قبلۂ دعا ست　　روئے دلش ہمیشہ بسوئے خدا بود

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			از اولاد برگزیدۂ نیکی ہاشمیت — آں سیدہ کہ صالحۂ بیرۂ بود سالِ بنائے او چو طلب کردم از خرد — گفتا بگو کہ مسجد خیر النساء بود
(۱۰)	ایضاً	کوچۂ رانگان	اسی نام کی یہ ایک مسجد چھوٹی سی کوچۂ رانگان بازار چاندنی چوک میں بھی ہے۔
(۱۱)	اونچی ۔	کوچۂ سعد اللہ خاں	قدیم۔ تیس فیٹ مربع۔
(۱۲)	ایضاً	گلی سرخ پوشاں	قدیم۔ چھوٹی۔ شاہ سرخ پوش کی بنائی ہوئی ہے اور اسی نام سے یہ گلی مشہور ہوگئی۔ اس مسجد کی درستی حال ہی میں ہوئی ہے
(۱۳)	ایضاً ۔	اجمیری دروازہ۔ شاہ تارا کی گلی۔	قدیم۔ نو سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔
(۱۴)	ایضاً ۔	محلہ بلی ماراں	نواب صاحب لوہارو کی کوٹھی کے پاس سنہ ۱۲۲۷ھ - ۱۸۱۲ء - پیش طاق پر یہ کتبہ ہے: چوں مسجد نفیس و دلچسپ و وسیع — تیار شد از فضل کریم مطلق ہاتف بہ نشاط سال تاریخ گفت — بنیاد نہادہ اسکر خانۂ حق
(۱۵)	ایضاً ۔	کوچۂ رانگان	یہ مسجد تین گنبد اور محراب دار دروں کی ہے۔ بالائی منزل پر مسجد ہے اور نیچے پانچ دکانیں۔
			سنہ ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء مختصر۔ دو منزلہ۔ اوپر مسجد۔ نیچے ایک دکان۔ پیش طاق پر خانۂ خدا ۱۲۶۱ھ۔ یہی تاریخ ہے۔
(۱۶)	ایک برجی ۔	املی کی پہاڑی ۔	اس مسجد کا کوئی برج نہیں۔ بہت چھوٹی ہے لیکن چونکہ اس کے قریب میں گنبد شاہ محمد علی واعظ کا ہے شاید اسی لحاظ سے ایک برجی کہلانے لگی۔
(۱۷)	ایضاً ۔	کوچۂ رایمان	آفاغنہ کے زمانے کی۔ شمال سے جنوب ۵ گز ۹ انچ۔ مشرق سے مغرب ۱۴ - ۱ -
(۱۸)	ایضاً ۔	پھاٹک حبش خاں ۔	عہد تغلق۔ بیچ میں ایک گنبد ہے اور ادھر ادھر لداؤ کی چھت ہے

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۱۹)	ایضاً	پنگے والاں	" " " " " " "
(۲۰)	باغیچی والی	"	قدیم - مختصر - افضل یار خاں متولی -
(۲۱)	بہاء الدین بھرکن	دریبہ کلاں	سنہ ۱۲۵۰ھ - یہ چھوٹی سی دو منزلہ مسجد بہاء الدین مشہور بھرکن کی بنوائی ہوئی ہے جس میں سڑک پر سے دس سیڑھیاں چڑھ کے جانا ہوتا ہے۔ مغربی جانب کی دیوار کے بیرونی حصے پر سیاہ زمین پر سفید حرفوں میں یہ کتبہ ہے :- چوں آفتابِ دینِ توحید ذوالجلال　بنمود رخ ز مطلع ایں غرہ کمال ای عابدانِ دہر چو ایں سجدہ گاہ نو　بینید در رکوع مدامید چوں ہلال ——— بندۂ مسکین بہاء الدین علی خاں ز نیاز　کرد ایں تعمیر بہر خالق رب العلا از سر برکات ہاتف سال تاریخش بگفت　مہبطِ فیضِ الٰہی مسجدِ نیکو بنا
(۲۲)	بڑ والی	چھتہ پرتاپ سنگھ گلی پیپل والی	سنہ ۱۲۶۵ھ - چھوٹی - دروازے پر ھو الغنی سنہ ۱۰۶۰ ہجری لکھا ہوا ہے -
(۲۳)	ایضاً	گندا نالہ	دروازے سے لگا ہوا بڑ کا درخت ہے - درخت کی جڑ میں ایک منڈوا بنا ہوا ہے جو کسی سید کا تھان ہے جس کی پرستش اہل ہنود کرتے ہیں -
(۲۴)	بڑی مسجد	کوچہ میر عاشق	قدیم - حافظ نور الدین متولی -
(۲۵)	بڑھیا والی	چیلا دروازہ	یہ قدیم مسجد کسی بڑھیا کی بنائی ہوئی ہے جس کا نام معلوم نہیں
(۲۶)	ایضاً	موری دروازہ محلہ ڈھوڑ والاں	" " " اس کے تین در ہیں بیچ کے در کو تین چھوٹی محرابوں میں تقسیم کر دیا ہے -

نقشہ مسجد پنجابی کٹرہ

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۲۷)	بھٹیاری والی	چھتہ لال میاں محلہ چوہان	قدیم۔ شمال سے جنوب ۲۰ فٹ۔ مشرق سے مغرب ۱۲ فٹ ۸ انچ۔
(۲۸)	بیری والی	عقب کلاں مسجد	قدیم۔ ؍ ۲۵ فٹ ۸ انچ۔ ؍ ۱۸ فٹ۔ حاجی قبہ کی بنائی ہوئی ہے جو صحن مسجد میں دفن ہیں۔
(۲۹)	پلاؤ والی	قبرستان۔	قدیم۔ صحن میں پلاؤ کا درخت ہے جس کے پتے بخار کا مجرب علاج ہے۔ میر مینڈ کی مسجد بھی اس کو کہتے ہیں۔ غالباً انہیں کی بنائی ہوئی ہوگی۔
(۳۰)	پنجابیاں	تمی ۔۔ ان۔	حسام الدین حیدر کی حویلی کے پاس۔ قدیم معمولی
(۳۱)	پنجابی کٹرہ	ریلوے اسٹیشن آئی آئی	پنجابی کٹرہ ایک محلہ تھا جس میں پنجابی (مسلمان تھے) رہتے تھے۔ اس کٹرے میں ایک مسجد بھی مصفا اور دل ربا سنگ سرخ کی نہایت خوش وضع اور خوب صورت تھی جس میں (مولوی عبدالخالق صاحب (راقم کے نانا مولوی عبدالقادر صاحب کے والد) اور مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی (مولوی عبدالخالق صاحب کے داماد) درس وتدریس فرماتے تھے اور دن رات قال اللہ وقال الرسول کا ذکر رہتا تھا۔ اس مسجد میں مکانات دل چسپ اور ایک بہت پاکیزہ حوض تھا۔ اس مسجد کا صحن پہلے بہت وسیع تھا لیکن لوگوں نے اپنے اپنے مکان بڑھا کر بہت سی زمین صحن مسجد کی دبالی لیکن پھر بھی دلی کی بہترین مساجد میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ یہ مسجد نواب صاحب اورنگ آبادی بیگم صاحب نے جو اورنگ زیب بادشاہ کی محل تھیں اسی بادشاہ دیں پناہ کے عہد میں بنوائی تھی

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			اور اپنے اعمالِ نیک کی یادگار چھوڑا تھا۔ یہ مسجد ریل میں آگئی اور اس کا نشان تک باقی نہ رہا۔ یہ مسجد اس جگہ تھی جہاں کہ دلی کا بڑا ریلوے سٹیشن ہے۔ میرے نانا صاحب کو جو اس مسجد کے امام تھے اُن کی حیات تک گورنمنٹ سے پندرہ روپیہ ماہوار پنشن نامی کی ملتی رہی مگر عمارت مسجد کا کچھ معاوضہ نہ ملا کہ وہ شاہی عمارت تھی۔
(۳۲)	پھول والاں	دریبۂ کلاں۔	قدیم۔ اوپر مسجد۔ نیچے تین دکانیں۔
(۳۳)	پیری جی	بارہ دری شیر افگن خاں	قدیم۔ جناب حکیم محمود خاں صاحب (جو حکیم اجمل خاں صاحب کے والد تھے) کے بزرگوں کی بنوائی ہوئی ہے۔ شیر افگن خاں کی بارہ دری جس پر سے محلہ مشہور ہے ڈھا دی گئی اور وہاں اب مکانات بن گئے۔ تاریخ میں کئی شیر افگن خاں ہیں یہ عزت الدولہ صفدر جنگ تھے جو محمد شاہ کے زمانے میں تھے جن کا مقبرہ مشہور ہے۔
(۳۴)	پیپل والی	گنج امیر خاں۔	قدیم۔ نواب اعظم خاں کے مکان کے عقب میں شمال سے جنوب ۳۴ فٹ۔ مشرق سے مغرب ۱۸ فٹ۔
(۳۵)	ایضاً	کوچۂ شریف بیگ	قدیم۔ معمولی۔
(۳۶)	ایضاً	کوچۂ رائیان	قدیم۔ شمال سے جنوب ۴ فٹ ۔ ۹ انچ۔ مشرق سے مغرب ۔ ۲۳ فٹ ۔ ۹ انچ۔ صحن وسیع اور ایک حوض۔
(۳۷)	تہور خاں	تہور خاں کی مسجد متصل نیا بانس	۲۰۔ سنہ ۱۱۴۲ھ ۱۷۲۷ء لب سڑک۔ بالائی منزل پر مسجد اور نیچے چار دکانیں زینے کی سترہ سیڑھیاں۔ پیش طاق پر یہ کتبہ ہے:۔ (۱) بدوران محمد شاہ تہور خاں نامی بنا فرمود مسجد را بتوفیقِ خداوندی

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			بزار و کیسہ پل بود و تا ایں بنائے خیر بسعی خان عالیشان مرتب شد بخو بندی (پنچے کے دروازے پر) **مسجد حنفیہ** دریں مرکز آمد زنارادت بیقین شام وسحر خانۂ ارغیب ندا و دریافیض بسیر یہ دوسرا کتبہ زمانِ حال کا ہے اور مسجد کا برآمدہ بھی جدید ہے۔ تہور خاں محمد شاہ کے زمانے میں شاہجہاں پور کے زمیندار تھے۔ ان کے بعد سنہ ۱۱ جلوس محمد شاہی میں ان کے برادر نسبتی محمد افضل خاں زمیندار ہوئے۔
(۳۸)	تکیے والی	گندا نالہ	معمولی مرمت شدہ۔
(۳۹)	جامن والی	متصل کلاں محل	قدیم۔ از سر نو تعمیر شدہ۔ پہلے حکیم مینا نامی کسی صاحب نے بنائی تھی۔
(۴۰)	جوتے والاں	چوڑی والاں	قدیم۔ حال میں درست کرکے توسیع کی گئی ہے۔ اس مسجد میں حوض اور بجلی کی روشنی بھی ہے۔ جوتے والوں نے خوب بنا سنوار کے رکھا ہے اور جا بجا کلام مجید کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔
(۴۱)	چاندی والاں	رہٹ کا کنواں	قدیم۔ معمولی۔
(۴۲)	چندا گھوسی	محلہ گھوسیاں عقب کلاں مسجد۔	قدیم۔ چھوٹی۔ چندا گھوسی نے اس کو درست کرایا اس لیے اُسی کا نام پڑ گیا۔
(۴۳)	چوبی	مہتاب باغ	مہتاب باغ سے آگے نکل کر دو مکان شاہی مطبخ کے تھے جو چھوٹا خاصہ اور بڑا خاصہ کہلاتے تھے اس کے پاس ایک مسجد تھی چوبی احمد شاہ نے ۱۱۶۴ھ - ۱۷۵۰ء میں بنوائی تھی باغ کے ساتھ وہ مسجد بھی صاف ہو گئی۔ جب وہ مسجد ہی نہیں رہی تو ہم اس کی نوعیت کیا لکھ

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			سکتے ہیں۔ اس مسجد کے دروازے کا کتبہ تمہ العصائد میں لکھا ہوا ہے ہم نقل کر دیتے ہیں چوں کہ اس کتاب میں یہ کتبہ تھا تو آج مل گیا ورنہ مسجد کے ساتھ کتبہ بھی معدوم ہو جاتا۔ بانی مسجد شہ دیں پناہ ۔ کہ شد یادور ف دولت سرمدی برو ہر کہ آنجا سجود نیاز ۔ باوارِ طاعت شود مہتدی خرد را بحیرت فرو رفت پے ۔ چو فکر تاریخ را مبتدی بگفتا سروش از سپہر برتری ۔ بہ بیتِ شرف مسجد احمدی ۱۱۶۴ ہجری
(۴۴)	چھوٹی	چھتہ لال میاں	قدیم۔ شمال سے جنوب ۲۵ مشرق سے مغرب دس فیٹ
(۴۵)	ایضاً	کوچہ میر عاشق	قدیم۔ معمولی۔
(۴۶)	حاجی امان اللہ	ترکمان دروازے سے جو سڑک چتلی قبر کو جاتی ہے متصل خانقاہ غلام علی	سنہ ۱۱۹۹ھ ۔ پیش طاق کے کتبے کا پہلا مصرع مٹ گیا دوسرا یہ ہے:- ..خرد گفت از سال او ۔ زہے مسجدے پُر ز نور خدا
(۴۷)	حافظ داؤد	محلہ قبرستان	اصل مسجد بہت قدیم تھی لیکن از سر نو بن گئی ہے۔
(۴۸)	حافظ حبیب اللہ	کوچہ گوکل شاہ	قدیم۔ یہ مسجد کوچہ گوکل شاہ میں کہی جاتی ہے لیکن درحقیقت کوچہ عاقل خاں میں ہے۔ جو اورنگ زیب کے زمانے کے ایک بڑے امیر تھے۔ مسجد کے صحن کے شمال میں حافظ حبیب اللہ صاحب کی قبر ہے۔ تعویذ قبر کا سنگ مرمر کا ہے جس پر آیات قرآنی کندہ ہیں۔
(۴۹)	حافظ نظام علی عطا	میر مہدی کی گڑھ کے پاس	قدیم۔ مختصر۔
(۵۰)	حامد علی خاں	ہیملٹن روڈ	سنہ ۱۲۵۷ھ ۱۸۴۱ء۔ اونچے چبوترے پر سترہ سیڑھیاں چڑھ کر جانا ہوتا ہے۔ صحن میں بجانب مشرق ایک دالان ہے۔ مغرب میں دُہرے دالان کی ہے۔ مسجد کے

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			جنوب مشرق کے کونے میں ایک حوض قتنین کا شیعہ لوگوں کا ہے۔ یہ مسجد اعتمادالدولہ حامد علی خاں صاحب وزیر اعظم بہادر شاہ ثانی کی بنائی ہوئی ہے۔ پیش طاق پر **غالب** کا یہ قطعہ کندہ ہے۔ اعتمادالدولہ کز افراط جود — ہست درپیش کفش قلزم غدیر دیدہ ور حامد علی خاں کز صفا — بیند اسرار ازل را در ضمیر ساخت در دہلی بایوان مسجدے — تا شود طاعتگہ برنا و پیر غالب آں طوبی نشین عندلیب — زد بانداز سخن سنجی صفیر شد نظیر کعبہ در عالم پدید — سال تعمیرش بود "کعبہ نظیر" ۱۲۵۷ اہتمام مولوی تیغ علی ۱۲۵۷ھ
(۵۱)	حکیم جی	میٹھے کنوئیں کی گلی فراش خانہ۔	قدیم۔ مختصر۔
(۵۲)	حکیم آغاجان	چھتہ آغاجان کوچۂ فولادخاں پھول کی منڈی	قدیم۔ یہ مسجد اہتمام علی خاں کوتوال برادر فولادخاں کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس کا چبوترا بھرتی میں آگیا ہے۔ اہتمام خاں شاہ جہاں کے دربار کا ایک امیر تھا۔ پہلے وہ بارہ ہزاری منصبدار اور پانسو سواروں کا افسر تھا بعد میں دو ہزار دوصدی اور آٹھ سو سوار ملے اور دو دفعہ کوتوالی کی خدمت ملی اس کا انتقال ۱۰۵۶ھ ۱۶۴۶ء میں ہوا۔
(۵۳)	حکیم شریف خاں	بلی ماراں	۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء۔ یہ مسجد دو منزلہ ہے اوپر گنبد۔ مسجد کے نیچے پانچ دکانیں۔ صحن کے شمالی سرے پر چودہ سیڑھیوں کا زینہ ہے۔ یہ جناب حکیم حافظ

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			محمد اجمل خاں صاحب نواب حاذق الملک بہادر کے دادا صاحب کی بنائی ہوئی ہے۔ حکیم شریف خاں پسر حکیم اکمل خاں دہلی کے مشہور طبیب تھے جن کو سلاطین مغلیہ کی جانب سے علاوہ جاگیر کے اشرف الحکماء کا خطاب بھی تھا۔ حکیم شریف خاں صاحب ایک خاندانی طبیب تھے جن کا وقار، رسوخ و اعتماد دربار شاہی اور پبلک میں یکساں تھا۔ بانی خاندان وسط ایشیا کے رہنے والے تھے اونکا خفر سے بابر بادشاہ کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے۔ اکبر کے زمانے میں آپ آگرے میں مقیم تھے جہاں آپ کے آبا و اجداد کی علمیت اور تقدس کا بڑا شہرہ تھا۔ حکیم محمد فاضل خاں صاحب نے بڑا نام پایا۔ اورنگ زیب کے عہد میں حکیم واصل خاں صاحب دہلی تشریف لائے جن کے صاحبزادگان حکیم اکمل خاں اور حکیم اجمل خاں سہ ہزاری منصب اور دو لاکھ کا محاصل جاگیر رکھتے تھے۔ اور اکمل خاں صاحب کو اکمل المتقین الملک کا خطاب تھا۔ اس مسجد کے پیش طاق پر یہ کتبہ ہے:۔ شکر خدا بسعی محمد شریف خاں ــ شد طرح مسجدے کہ بود کعبۂ صفا برخاست چوں ندائے اذاں مطلب عقل ــ گفتا بجوے سال وے از خانۂ خدا ۱۲۶۱ھ
(۵۴)	حکیم مہر علی شاہ	کھاباغ	قدیم۔ مہر علی شاہ کی بنائی ہوئی ہے۔ صحن مسجد میں کئی قبریں انھیں کے خاندان کے لوگوں کی ہیں جن میں سے ایک قبر شاہ عبداللطیف کی ہے جو مہر علی شاہ کے مرشد تھے اس کا کتبہ اب قبر سے علیحدہ ایک چھوٹے سے احاطے میں رکھا ہوا ہے۔ ھو اللطیف الخبیر چو رفت از جہاں شاہ عبداللطیف ــ ازیں واقعہ خستہ دل شد امیر تاریخ آں گفت الف زآہ ــ علیم سلیم لطیف خبیر
(۵۵)	حمام والی	چوڑی والاں	قدیم۔ مختصر۔

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۵۶)	حوض والی	اجرن بوڑھی شرک	اسی نام کی ایک مسجد محلہ حوض سوئی والاں میں ہے جس کا ذکر سید داؤد کی قبر کے ضمن میں آچکا ہے۔ یہ مسجد بھی قدیم ہے۔ شمال سے جنوب ۳۰-۹۔ مشرق سے مغرب ۴۳-۹ جس میں ایک وسیع صحن اور حوض بھی ہے۔
(۵۷)	خلیفہ جی	کوچہ چاند خاں	حال میں ترمیم ہوئی ہے۔ شمال سے جنوب ۳۰-۷۔ مشرق سے مغرب ۱۲-۹۔
(۵۸)	خواجہ تراب (طرب)	بازار سیتا رام	۱۰۶۳ھ ۱۶۵۲-۵۳ء اس مسجد کا انتظام مسجد فتح پوری کی کمیٹی کے سپرد ہے مسجد شمال سے جنوب ۳۶ اور مشرق سے مغرب ۱۳-۹ ہے۔ یہ مسجد نہایت مستحکم از سرتاپا سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ صحن اس کا نہایت وسیع ہے جس کے ایک حصے میں سنگ سرخ کا فرش ہے۔ اس کے تین گنبد ہیں۔ پیش طاق کے کتبے میں جن دکانوں کے وقف کرنے کا ذکر ہے وہ دکانیں مسجد کے شمال میں اب بھی موجود ہیں مگر عرصہ ہوا کہ مسجد سے اُن کا تعلق باقی نہ رہا۔ "در سال ۲۶ جلوس حضرت ظل اللہ شاہجہاں بادشاہ غازی صاحبقران ثانی کہ موافق ۱۰۶۳ ہجری بانی ایں مسجد وچاہ خواجہ طرب توفیق اتمام ایں مسجد شریف یافتہ وجہ محصول شش دکان متعلقہ آنرا برکس نیکہ در اوقات خمسہ باقامت امر اقامت واذان قیام نمایند وقف گردانید"
(۵۹)	خواجہ میر درد	کوچہ نواب خان نزد بارہ دری	یہ مسجد خواجہ میر درد کی بنائی ہوئی ہے جو ایک مشہور

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۶۰)	خوجن صاحب	پنڈت کا کوچہ گلی عزیزالدین	شاعر تھے - (۱۷۴) برس ہوئے کہ از سر نو تعمیر کی ہجری سنہ ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۱-۵۲ع - شمال سے جنوب ۲۶ فٹ - ۹ انچ - مشرق سے مغرب ۱۲ فٹ - ۹ انچ - بیرونی دروازے کی پیشانی پر یہ کتبہ ہی:- محمد عربی کا بروئے ہر دو سرا ہست　کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او چراغ و مسجد و محراب و منبر　ابوبکر و عمر عثمان و حیدر بنائے مسجد مرزا محمد جان برکی در سنہ یکہزار و یکصد و شصت و پنج ہجری
(۶۱)	عرس بسا	الی واڑہ	محمد شاہ کے زمانے کی یہ ایک چھوٹی سی مسجد تین گنبدوں اور تین دروں کی ہی - صحن میں

سنگ سرخ کا فرش ہی - جس کے جنوب و مشرق کے کونے میں ایک ہشت پہلو حوض ہی - ایک چھوٹا سا داخلی دروازہ شمال کی طرف ہی - اس کے بعد ایک لمبی سی ڈیوڑھی ہی - صحن کے مغرب میں دو قبریں ہیں - اس قبر پر دوازدہ اماموں کے نام اور "تحریر شعبان سنہ ۱۵ مقدس ما . . ." کندہ ہی - دوازدہ اماموں سے معلوم ہوتا ہی کہ جن کی یہ قبر ہی وہ شیعہ مذہب تھے - کتبہ ناتمام اور ناقص ہو مٹ گیا ہی برابر پڑھا نہیں جاتا - سنہ ۱۵ غالب جلوس محمد شاہی ہوگا - احمد حسین دندان ساز متولی مسجد کی وجہ تسمیہ کے واقعے کے یوں ناقل ہیں کہ وقت بنانے شاہجہان آباد امرا اور درباریوں اور عہدہ داروں کو مکانات بنانے کو زمینات دی گئی تھیں دو بھائی انور اور منور کے نام کے شاہجہاں بادشاہ کے آہن گر تھے ان کو بھی جامع مسجد کے پاس ایک ٹکڑا زمین کا ملا تھا جو اُستاد حامد مشہور میر عمارت شاہجہانی کے پاس تھا چنانچہ کوچہ اُستاد حامد موجود ہی محمد شاہ کے عہد میں محمد علی عرف نظر محمد جو انھیں دونوں بھائیوں کی اولاد میں تھا وہ ہولی کے جھگڑے میں غضب کرن داس جوہری کے ہاتھ سے مارا گیا - غضب کرن داس نے خود یا اُس کے لوگوں میں سے کسی نے ہولی کا رنگ نظر محمد پر ڈال دیا تھا - بات

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی اور نظر محمد کی جان گئی۔ اس قصور میں جوہری کا مکان ضبط کرکے نظر محمد کے لوگوں کو دے دیا گیا۔ اس مکان کے ایک حصے میں تو یہ مسجد بنی اور دوسرے میں امام باڑہ اب وہ امام باڑہ تو رہا نہیں مسجد البتہ موجود ہے۔ جس قبر پر کتبہ ہے وہ نظر محمد کی بتائی جاتی ہے لیکن ہم کو اس روایت کے قبول کرنے میں کہ نظر محمد مارا گیا ذرا احتمال اس وجہ سے ہے کہ نظر محمد کے قتل کے ساتھ ہی اس قدر جلد مکان کا ضبط ہونا اور مسجد اور امام باڑہ کا بن جانا اور پھر اس میں نظر محمد کا دفن بھی ہو جانا قرین قیاس نہیں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ نظر محمد اس جنگ میں زخمی ہوا ہو اور اسے جوہری کا مکان مل گیا ہو اور اس جگہ مسجد بن گئی ہو جب وہ مرا ہو۔
(۶۲)	درگاہ والی مسجد اور صدر جہاں کی قبر	چیرو خانہ متصل چھتہ ترسکھ رائے	قدیم۔ معمولی۔ اسی کے پاس درگاہ کے پختہ احاطے میں صدر جہاں کی سنگ مرمر کی قبر ہے۔ صدر جہاں اکثر قاضیوں کا خطاب ہوتا ہے۔ نہ قبر پر کوئی کتبہ ہے۔ نہ کسی سے زبانی ان بزرگ کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔
(۶۳)	دھوبیان	دلی دروازہ شہر	قدیم۔ شمال سے جنوب ۲۴ فٹ - ۲ انچ - مشرق سے مغرب ۱۱ فٹ - معمولی۔
(۶۴)	راجاں	چھتہ پرتاب سنگھ گلی پیپل والی	سنہ ۱۰۶۱ھ ۱۶۵۱ء اندرون مسجد دروازے پر کلمۂ طیبہ اور یہ سنہ کھدا ہوا ہے۔ بیرونی دروازے پر جو پیپل والی گلی کی طرف ہے اور جس کے سامنے کنواں ہے اُس

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			کنوئیں کے متعلق یہ کتبہ ہے:۔ "چاہ مسجد راجان ۱۱۰۲ ہجری"
(۶۵)	ساے بیل	سوری دروازہ کوچہ معطر خاں	قدیم سہ دری۔
(۶۶)	رحیم علی وکیل	نئی سڑک ڈبائی واڑہ	قدیم۔ معمولی۔
(۶۷)	رمضان شاہ	کوچہ مولوی قاسم	سنہ ۱۲۱۶ھ ۱۸۰۱-۰۲ء۔ یہ مسجد سڑک سے بلند ہے۔ اس کی چھت مسطح ہے اور گنبد نہیں ہیں۔ پانچ در کی مسجد ہے۔ کتبے کا ایک پتھر یہاں خالی دھرا ہوا ہے۔ یعنی کہیں نصب نہیں ہے۔ اس پر علاوہ آیات قرآنی کے یہ کتبہ ہے:۔ "بانیہ امیر النساء زوجۂ نواب یعقوب علی خاں مرحوم خوشدامن نواب منصور خاں سنہ ۱۲۱۶" نہ کوئی امیر النسا کو جانتا ہے نہ یعقوب علی خاں کو مگر منصور خاں البتہ شاہ عالم ثانی کے درباریوں میں ایک صاحب تھے۔ جن کا اصلی نام صفدر خاں تھا جو دیار مشرق سے کم سنی میں شاہ عالم کے ساتھ آئے تھے۔ صفدر خاں بڑا متمول ہو گیا تھا اور جس وقت غلام قادر نے شاہ عالم کو کھول کیا تو صفدر خاں نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے اور بادشاہ کا ساتھ دیا مگر اس کی کچھ چلی نہیں۔
	رنڈی کی مسجد	لال کنواں محلہ سرکی والاں	دیکھو لال مسجد نمبر (۲)
(۶۸)	ساربان	نہر سعادت خاں محاذی کٹڑہ نارائن داس	قدیم۔ یہ مسجد نہر سعادت خاں کے سیدھے کنارے پہ بنی ہوئی ہے۔ بلا گنبد تین در کے دہرے دالان ہیں صحن کے مشرق میں ایک حجرہ ہے جس کے پاس

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۶۹)	سبز	کٹرہ آدینہ بیگ خاں	دروازے کے سامنے ایک محراب ہے جس میں سے پہلے زمین کے اندر اندر نہر تک رستہ تھا لوگ اس میں سے جا کر وضو کر لیتے تھے۔ اب نہر بند ہوگئی یہ رستہ بھی بے کار ہے۔ ۱۱۹۲ھ ۸۰-۱۷۷۸ء۔ دو منزلہ۔ اوپر مسجد جس میں سڑک پر سے دس سیڑھیاں چڑھ کر داخل ہوتے ہیں نیچے چار دکانیں ہیں۔ پیش طاق پر یہ کتبہ ہے:- آدینہ بیگ کہ ہست خان عالیشان بکار نیک خدا بس کہ داد توفیقش بنا نمود چو باغ ارم یکے مسجد چنانکہ کعبہ نوشتن سزد حق نقش خرد کتابۂ او را ازیں کہ میگوید دنیا نچانہ دین است سال تاریخش ۱۱۹۲ تاریخ میں آدینہ بیگ خاں کے نام کا ایک ہی شخص گزرا ہے جس کی وفات ۱۱۷۲ھ ۵۹-۱۷۵۸ء میں ہوئی۔

اگر اسی آدینہ بیگ سے یہاں مراد ہے تو ضرور ہوا کہ مسجد پہلے بنی اور کتبہ بہت دنوں بعد لگایا گیا ہوگا۔ آدینہ بیگ آرین نسل کا تھا۔ اس کے باپ کا نام چنو تھا جو لاہور کے پاس موضع شرق پور میں رہتا تھا۔ آدینہ بیگ نے مغلوں میں پرورش پائی اور بڑا قابل محاسب تھا۔ اس کی ملازمت کی ابتدا موضع کنک کی محصول داری سے ہوئی جو لدھیانے کے پاس ہے۔ اس کمتر خدمت سے وہ بڑھتے بڑھتے خدمت جلیلۂ صوبہ داری سلطان پور پر پہنچا۔ اس کے بعد وہ ملک دوآب (جالندھر) کا صوبہ ہوا جس کا انتظام اس نے بڑی خوبی سے کیا۔ نہایت ہوشیار۔ زیرک اور امور سلطنت کا ماہر تھا اور ہمیشہ لاہور کے گورنروں کا مورد عنایات رہتا تھا۔ ابدالی سرداروں اور سکھوں کی دشمنی سے اپنی قوت اور وقار میں انحطاط دیکھ کر اس نے اپنی مدد کو مرہٹوں کو بلوایا چنانچہ ان کی مدد سے سرہند اور لاہور کا کل حصہ فتح کر لیا لیکن افسوس کہ وہ اپنی فتوحات سے کچھ متمتع نہ ہو سکا اور زمان قریب میں ۱۱ محرم

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			سنہ ۱۲۰۵ھ عالمگیر ثانی میں انتقال کر گیا۔ فرحت الناظرین میں اس کا خطاب "بہرام جنگ" لکھا ہے
(۷۰)	ستھو گھوسن	چرخے والاں	سنہ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء۔ یہ مسجد دو منزلہ تین گنبد اور تین دروں کی ہے۔ اوپر مسجد نیچے چار دکانیں ہیں۔ پیش طاق پر یہ کتبہ ہے:- مسجد و دو دکان [illegible] ہمہ وقف شد زوجۂ ستھو گھوسن / وارث بر [illegible] اگر شود زوجہ [illegible] دست [illegible] الہجرۃ النبوی سنہ [illegible]
(۷۱)	سرکی والاں	نواب بیگم خاں کی حویلی کے پھاٹک پر	سنہ ۱۲[illegible]ھ / ۱۸۵۳-۵۴ء۔ دو منزلہ۔ اوپر مسجد۔ نیچے دکانیں شمال سے جنوب ۴۳ فٹ۔ مشرق سے مغرب ۱۵ فٹ۔ تین گنبد اور تین در۔ صحن۔ سڑک پر سے گیارہ سیڑھیاں چڑھ کر صحن مسجد میں داخل ہوتے ہیں
(۷۲)	سڑک والی	روشن پورہ	قدیم۔ مختصر۔
(۷۳)	ستوجی	بازار لال کنواں	قدیم مختصر۔ مولوی ثناء اللہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ مولوی صاحب کا عرف ستوجی تھا۔
(۷۴)	سوار خاں	کوچہ پنڈت۔ گلی سوار خاں	سنہ ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴-۹۵ء۔ دروازہ پر "مسجد علی محمد خاں حنفی ۱۲۰۹" لکھا ہوا ہے۔
(۷۵)	شہتوت والی	چھتہ مہتاب خانہ میں توالی گلی	قدیم معمولی۔
(۷۶)	شیش محل	حویلی مہر خاں۔ محلہ تیلیاں	قدیم۔ شمال سے جنوب ۱۸ فٹ۔ مشرق سے مغرب ۲۰ فٹ۔
(۷۷)	شیعوں کی مسجد	سورتی دروازہ	قدیم۔ سڑک پر سے ایک تنگ زینے میں سے پانچ سیڑھیاں چڑھ کے اوپر جانا ہوتا ہے۔ گنبددار مسجد ہے۔ جنوب مشرق کے گوشے میں ایک چھوٹا سا حوض ہے

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			جو قطبین کہلاتا ہے۔
(۷۸)	صوفی جی۔	پکھنیوں کی گلی کشمیری دروازہ	سنہ ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء — آیات کلام اللہ کے ساتھ یہ تاریخ لکھی ہوئی ہے اور کچھ حال اس کا معلوم نہیں۔
(۷۹)	غازی الدین کی مسجد	نہر پھاٹک نہر سعادت خاں کے محاذی	سنہ ۱۱۳۴ھ — دراصل یہ مسجد غازی الدین خاں کی بنائی ہوئی ہے لیکن چونکہ دہلی کے ایک بڑے مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب اس مسجد میں بالالتزام

وعظ کیا کرتے تھے لہذا اب انھیں کی مسجد مشہور ہے۔ اس کے تین چھوٹے چھوٹے دروازے صحن کی شمالی دیوار میں ہیں۔ صحن کے جنوب اور مشرق کی طرف حجرے بنے ہوئے ہیں ان میں سے مشرقی رخ کے دو منزلہ ہیں۔ مسجد کے تین گنبد اور تین در ہیں۔ بانی مسجد غازی الدین خاں کا اصل نام احمد بیگ عرف کوکا تھا جو معز الدین جہاندار بادشاہ (۱۷۱۲–۱۳ء) کا رضاعی بھائی تھا اور اسی کا ملازم بھی تھا آگے چل کر کچھ سوء مزاجی کی وجہ سے شاہزادہ عظیم شاہ کا سلسلۂ ملازمت اختیار کر لیا۔ عظیم شاہ نے اسے اپنے بیٹے فرخ سیر کے ساتھ بنگالے بھیج دیا۔ بہادر شاہ کی وفات کے بعد فرخ سیر تخت سلطنت کا دعوی دار ہوا اور احمد بیگ کو غازی الدین خاں کا خطاب دے کر جنگ کی طیاری کرنے کا حکم دیا۔ جب فرخ سیر نے اپنے چچا جہاندار شاہ پر فتح پائی تو احمد بیگ کو شش ہزاری منصب پانچ ہزار سوار اور غالب جنگ کا خطاب ملا۔ سید حسین علی اور بھائی کے سید عبد اللہ شروع سے دونوں سے مخالفت رہی انھوں نے احمد بیگ اور فرخ سیر دونوں کو قید کر دیا۔ بعد میں بزمانِ سلطنت محمد شاہ۔ قطب الملک سید عبد اللہ کبیر احمد بیگ سے دوستی گانٹھ لی اور بادشاہ کے خلاف سید عبد اللہ سے جا ملا۔ لیکن آخر کار محمد شاہ نے احمد بیگ کی خطاؤں پر عفو کا پردہ ڈال کر اس کا منصب وغیرہ بحال کر کے اس کو اس کے پہلے مرتبے پر قائم کر دیا۔ اس مسجد کے پیش طاق پر یہ کتبہ ہے

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			از فیوضاتِ خدا و مصطفیٰ و پادشاہ — غازی الدین خاں با مہر و دین متیں کرد احیا مسجدے و نہر از بہر خلق — ہر ستونِ پایہ اش چوں سدِ اسکندر متیں آبِ نہرش خاک دہلی جو او گرش — سبز پیدا شد چو آبِ خضر و سدۂ میں ہر در و نقشش ہمہ چوں چشمِ مست خوباں طرز — ہر ستونِ پایہ اش چوں سدِ اسکندر متیں بے شک بے شبہ بگیرد دامنش سجا — ہر کہ اللہ برزمیں ثانی حرا مسجد حسیں سالِ تاریخِ نظم از فضلِ حق گفتا کہ شد — مسجدے احمد بنا از رحمت العالمین سنہ ۱۱۵۵ھ اس کا حال صدر محراب کے ذیل کے کتبے سے واضح ہوگا۔
(۸۰)	غلام علی چشتی	گلی سنگھی والی عقب کلاں مسجد	"مسجد مولوی محب اللہ ساکن دہلی بمساحت زمین مسجد و چاہ غلام چشتی یکصد و چہل و چہار ذرعہ معماری و دو صد و دو ذرعہ زمینِ قبرستان مملوکہ مرزا الٰہی بیگ ولد محمد بیگ بنام مسجد مندرجہ بالا کرا جارۂ غلام چشتی بفاصلہ جانب مشرق بست و ہشت قدم واقع است ۱۱۹۰ ہجری بسبیل اللہ وقف کردہ شد"۔
(۸۱)	فرینچاس	کوچہ قابل عطار کے پاس	قدیم۔ پنجابی کھتری فرینچاس کہلاتے ہیں جو نومسلم ہیں مگر اب بھی ذات کی پابندی کرتے ہیں اور اپنی برادری کے باہر شادی نہیں کرتے۔
(۸۲)	قاضی کے حوض والی	قاضی کا حوض	سنہ ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸-۱۹ء۔ شمال سے جنوب ۹۰ فٹ۔ مشرق سے مغرب ۲۴ فٹ۔ بہت قدیم کہی جاتی ہے لیکن مفتی کریم اللہ صاحب نے از سر نو بنوایا اور توسیع بھی کی۔ مسجد کے جنوب مشرق کے کونے میں ایک مکان ہے جس کے دروازے پر "باغ نبی اللہ ۱۱۳۰" لکھا ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں باغ بھی تھا عجب نہیں کہ اسی باغ کی جگہ یہ مکان بنا ہو اور باغ کا کتبہ اس مکان کے دروازے پر لگا دیا ہوگا۔

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۸۳)	غلام نبی کی مسجد	موری دروازہ محلہ ڈوروالاں	یہ مسجد از سر نو بنائی گئی ہے اور توسیع بھی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔
(۸۴)	قاضی زادوں کی	فیض بازار	یہ وہی روشن الدولہ کی سنہری مسجد ہے جس کا ذکر علیحدہ آچکا ہے
(۸۵)	قبروں والی	گلی شاہ تارا	سنہ ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء۔ شمال سے جنوب ۳۰ فٹ ۹ انچ مشرق سے مغرب ۱۴ فٹ ۱۰ انچ۔ تین گنبد۔ تین در۔ صحن میں دو طرفہ دالان بحجرے۔ پیش طاق پر ایک سنگ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ ہے:۔ بود پاینده خان بیرجنگ خطاب　　رفت بر دار فنا سے ثواب [illegible] بعد بیگم المش این بنا بنمود　　ہمچو قطب فلک الارض "اختر بحساب" ۱۲۰۱ مسجد ہی کے صحن میں پاینده خان کی قبر سنگ مرمر کی ہے جس پر یہ کتبہ ہے:۔ پاینده خانی شرف دہر کز دانش　　موصوف باوصاف حسن و کماہی [illegible]ی کہ بلندی سنبوء قدر رفیعش　　بگذاشت بہ چرخ برین داس الاہی سپہبد سرکردہ کہ میدان جنیش　　امروز بمغفوری فرداش گواہی از بحر فنا رخت بد بردہ جہاں را　　بگذاشت در امواج چو کشتی ماہی تاریخ چو جستم "آخرت الملک کمالی" ۱۲۰۱　　عشرش بحسین ابن علی بادا الٰہی
(۸۶)	قصابن	متصل دہلی دروازہ جاٹ واڑہ چھتہ لال میاں متصل فصیل	قدیم۔ معمولی۔
(۸۷)	قطب الدین خاں نواب مولوی	بلبلی خانہ	سنہ ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء اس مسجد میں گنبد نہیں ہیں صرف برجیاں ہیں مسجد دوہرے دالانوں کی ہے اندر کے دالان کے در چوبی ہیں باہر کے سنگین۔ اندر کے دالان میں منبر کے پاس کی محراب پر یہ کتبہ ہے "دعو المستعان مسجد ملت حنفیہ"

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			دالانوں کے ہر دو جانب ایک حجرہ ہے۔ اس مسجد میں ایک تہ خانہ بھی ہے۔ مسجد کے عقب میں کا[illegible] ہیں۔ پہلے اس میں مدرسے کا مکان بھی تھا جو شکستہ

ہوگیا۔ مسجد کی سمت کی دیوار میں کتبہ لگا ہوا ہے "مسجد المعروف نواب قطب الدین خاں مرحوم" اور ایک پتھر صحن مسجد میں رکھا ہوا ہے جس پر یہ کتبہ ہے

سال مکان بزرگ ساختاز یب [illegible] مدرسہ و مسجدے کردہ بنا شاہ حسین

شاہ حسین نواب صاحب کے استادوں میں سے تھے غالباً نواب صاحب نے اس مسجد کی ترمیم کرائی ہوگی جو آپ کے نام سے مشہور ہے۔ شاہ حسین صاحب کی قبر صحن مسجد میں تھی جس کے اطراف سنگ سرخ کی جالیاں تھیں وہ حال میں صاف کر دی گئی ہے۔ اب قطب الدین خاں شہرۂ آفاق ہیں فقہ و حدیث مولنا شاہ اسحق سے حاصل کی۔ بڑے صاحب تقویٰ اور متشرع تھے۔ وضع و لباس بالکل سادہ مثل اپنے استاد مولنا شاہ اسحق کے تھا۔ اخلاق وحلم علاوہ فضل و کمال علمی کے ایسا تھا کہ اوروں میں کم پایا گیا۔ فقہ اور حدیث کے بڑے جید عالم تھے تقویٰ اور ورع کا تو حساب نہیں۔ آپ کے اجداد والا تبار عالی خاندان والا دودمان ہمیشہ پیشگاہ سلطنت سے مناسب جلیلہ رکھتے تھے۔ زمانہ آخر میں بھی آپ کو تقرب سلطانی سے وہ عزت وجاہ حاصل تھا جیسا کہ آپ کے علم و فضل کے شایاں تھا۔ جو تھے دن آپ استاد کی پیروی اور خلق کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے وعظ فرمایا کرتے تھے۔ اکثر رسائل عام فہم زبان اردو میں لکھے جن سے خلق اللہ کو بڑا فائدہ پہنچا۔ مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ زبان اردو میں بہت سلیس اور شستہ کیا ہے۔ آپ ہجرت کر کے بیت اللہ چلے گئے تھے اور وہیں آپ نے رحلت فرمائی۔ آپ کے صاحبزادے نصیر الدین خاں بھی گزر گئے اولاد نرینہ باقی نہیں۔ نواب صاحب کی دو پوتیاں تھیں جن میں سے بڑی خاکسار کی خوشدامن نے حال میں انتقال کیا چھوٹی مرزا ایوب بیگ و داؤد بیگ متولیان مسجد کی والدہ ہیں بقید حیات ہیں۔ ان کی دینداری پابندی صوم و صلوٰۃ سے کچھ اندازہ نواب قطب الدین خاں کے تقدس کا کیا جا سکتا ہے کہ تیسری پشت تک تقویٰ و ورع کا یہ حال باقی ہے۔ مسجد ملی ہوئی نواب قطب الدین خاں کی حویلی ہے اور یہ گلی بھی نواب صاحب کے نام سے مشہور ہے

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۸۸)	قلندر بیگ	محلہ قبرستان ترکمان دروازہ	زمانہ نامعلوم - اس میں اس قدر ردو بدل اب ہوا ہو کہ پچھلی حالت معلوم نہیں ہو سکتی سہ دری

طول ۹ فٹ ۴ انچ × ۹ عرض ۲۲ فٹ × ۱۰ پر کمٹیں لگا کر کواڑ چڑھا کر کمرہ نما کر دیا ہو۔ شمال کی طرف ایک حجرہ بھی ہو۔ سپاٹ چھت کڑیوں اور شہتیروں کی ہو۔ نہ برج ہیں نہ مینار۔ چاروں کونوں پر چار برجیاں اور پیش طاق کے ادھر ادھر ایک ایک برجی اسی طرح کل چھ برجیاں ہیں جو کے بنچے ہوئے ہیں جس کا طول عرض - ۱۵ فٹ - ۶ × ۷ فٹ ہو اور جنوب میں حجرے صحن میں ہشت پہل حوض اور ایک کنواں ہو اب نل سے پانی آتا ہو۔ صدر دروازہ مشرق میں بہت بڑا عالی شان ہو دوسرا اس سے چھوٹا شمال میں ہو۔ شرقی دروازے کی پیشانی پر یہ کتبہ ہے

ھوالمستعان

متولیان مسجد محمد احمد و محمد اکرام ابنان محمد اسمٰعیل جوہری

سنہ ۱۳۳۰ھ

دوسرا کتبہ شمالی دیوار کے باہر وار یہ لگا ہوا ہو:-

تعمیر مسجد باہتمام خاص محمد اسمٰعیل جوہری متولی مسجد سنہ ۱۳۳۰ھ

مسجد کے جنوب رخ کو مسجد کے متعلق ایک مکان ہو جس میں لڑکیوں کا مدرسہ ہو جس کے پیش دالان پر یہ کتبہ لگا ہوا ہو:-

الوقف لا یملک

یہ مکان متعلق مسجد ہو متولی محمد اسمٰعیل جوہری سنہ ۱۳۳۴ھ

مسجد کے شمال میں ایک مکان مدرسہ کا ہو جس پر یہ کتبہ ہو:-

الوقف لا یملک

۱۳۲۸ھ

ایک دالان پر یہ کتبہ ہو:-

یہ کٹڑہ خاکسار بشیر الدین حسن وائس پریسیڈنٹ میونسپلٹی نے اپنی لاگت سے بنوا کر مدرسہ انجمن محمدی کے نام واسطے تعلیم طلبا ء وقف کیا سنہ ۱۳۳۵ھ اس کے علاوہ ایک

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			کمرہ اور ۱۳۳۲ھ کا بنا ہوا ہے اُس پر بھی مندرجۂ بالا کتبہ ہے۔
(۸۹)	کالے خاں	کوچۂ چیلاں	قدیم۔ شمال سے جنوب ۱۲ فٹ۔ مشرق سے مغرب ۱۱ فٹ ۸ انچ۔ معمولی۔
(۹۰)	کپتان والی	بارہ دری شیر افگن خاں	قدیم۔ مختصر اور معمولی۔
(۹۱)	کپٹے والی	گلی ملاں گلی کپٹے والی	ایضاً۔
(۹۲)	کروڑا	گلی قاسم جان	۱۲۲۳ھ۔ ایک چھوٹی سی مسجد تین گنبدوں کی ایک اونچے چبوترے پر بنی ہوئی ہے جس کے تین در ہیں۔ یہ مسجد محمد خاں کی بنائی ہوئی ہے جو بزبان اکبر شاہ ثانی کروڑا یعنی وصول کنندہ محصول کی خدمت پر مامور تھے اس کے پیش طاق پر یہ کتبہ ہے: چوں بتائید جناب کبریا ۔ خوش مرتب گشت این طاعت سرا مصرع تاریخ آں ہاتف بگفت ۔ کردہ کایں مسجد محمد خاں بنا ۱۲۲۳ھ
(۹۳)	کریم بخش استاد	بوملا باپی گلی جوت والی	قدیم مختصر معمولی۔
(۹۴)	کوئلہ والاں	گلی شاہ تارا	قدیم۔ مختصر شاہ تارا جس کا کوچہ مشہور ہے نواب قمر الدین خاں کی صاحب زادی تھیں۔ یہیں نواب صاحب کا مکان تھا جس میں وہ بھی رہتی تھیں۔ چنانچہ مسجد کے پاس اب تک ایک پھاٹک کا نشان موجود ہے جو غالباً نواب کے محل ہی کا ہوگا۔ یہ مسجد کوئلے والوں کی بنائی ہوئی ہے۔
(۹۵)	کہار والی	کوچۂ چیلاں متصل گلی اولیاء	قدیم۔ کوئی صاحب رحیم اللہ خاں تھے اُن کی بنوائی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کہار والی کیوں نام پڑ گیا۔ شمال سے جنوب ۳۲ فٹ۔ مشرق سے مغرب ۱۰ فٹ۔

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۹۶)	کھاری باؤلی	کوچۂ نواب مرزا	شیر شاہ کے زمانے کی۔ شمال سے جنوب ۹۲ فٹ۔ مشرق سے مغرب ۴۴ فٹ۔ ۸ انچ۔ تین گنبد تین در۔ پست اور بھاری محراب ہیں۔ عمارت کا طرز افاغنہ کا سا ہے پس شیر شاہ یا اس کے کسی جانشین کے زمانے کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے تحت بھی دکانیں ہیں۔ اس کی مرمت۔ فرش پختہ۔ غسل خانہ حمام راقم کی والدہ صفیہ بیگم مرحومہ نے بنوایا ہے۔ مسجد میں ایک کھاری کنواں بھی ہے۔
(۹۷)	کھجور والی	بنگش کے کمرے کے پاس	قدیم۔ متولی انجمن اسلام شمال سے جنوب ۳۴ فٹ۔ ۹ انچ۔ مشرق سے مغرب ۱۴ فٹ۔ ۴ انچ۔ مسجد کے دروازے پہ یہ کتبہ ہے:۔ "این ہر شش دو کانہا مع چاہ و بالاخانہ وقف مسجد است"
(۹۸)	ایضاً	کھجور کی مسجد	قدیم۔ مختصر۔ ان دونوں مسجدوں کے صحن میں کھجور کا درخت ہونے سے یہ نام پڑا۔ پیش طاق پہ یہ کتبہ جدید لگا ہوا ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ مسجد حنفیہ از سر نو بن گئی یہ سجدہ گاہ سب کی بن آئی تمنائے دلی شاد و خرم ہو کے سنیئے اس کا سال "کیا حسین و خوشنما مسجد بنی"
(۹۹)	گڈریا	محلہ گڈریا متصل ترکمان دروازہ	زمانہ نامعلوم۔ حال میں ترمیم ہوئی ہے یکم رجب سنہ ۱۳۳۱ھ۔ تین درکی لداؤ کی آہنی گرڈر پڑے ہوئے۔ سامنے برآمدہ۔ محاذ میں دالان۔
(۱۰۰)	گدیاں۔	جٹواڑہ قریب آئی مسٹر زہ	دورِ آخر مغلیہ۔ معمولی۔

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۱۰۱)	گڑھ کپتان	مسجد جلاوبہاڑی	۱۲۳۵ھ ۲۰-۱۸۱۹ء - شمال سے جنوب ۲۳ فٹ - مشرق سے مغرب ۲۷ فٹ - ۲ ۱/۲ - یہ گڑھ کپتان کون صاحب تھے کچھ پتہ نہیں چلتا - مسجد کے دروازے پر یہ کتبہ ہے:- اللہ صاحب ق محمد امیر الدین گڈھ کپتان مسجد حنفیہ ۱۲۳۵ھ مرمت کنندہ میاں سراج الدین ۱۳۲۳ھ
(۱۰۲)	گولر والی	فراش خانہ	قدیم - مختصر - دو منزلہ اوپر اکہرے دالان کی سامنے چوبی سائبان - چھت لداؤ کی گرد راہنی پڑے ہوے - صحن میں چوکے بچھے ہوے - گنبد ندارد مسجد کے دو طرفہ ایک ایک چھوٹی برجی ہے - مسجد کے نیچے تین دکانیں - سو گھا سیڑھیوں کا زینہ ہے - اس کی تعمیر از سر نو ۱۳۱۵ھ ۹۸-۱۸۹۷ء میں ہوئی ہے سنگ ساہی کی تختی پر نہایت فرش خط میں طاقیہ پر کتبہ ہے:- وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احداً ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیہا اسمہ وسعی فی خرابہا - اولئک ما کان لہم ان یدخلوہا الا خائفین لہم فی الدنیا خزی ولہم فی الاخرۃ ۱۳۱۵ھ عذاب عظیم محمد
(۱۰۳)	گوندنی والی	متصل کلاں محل - گوندنی والی	قدیم حال میں درستی ہوئی ہے شمال سے جنوب ۱۳ فٹ - مشرق سے مغرب ۱۲ فٹ - ۲ ۱/۲ -
(۱۰۴)	ایضاً ۲	فراش خانہ	قدیم - معمولی -

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۱۰۵)	لال مسجد	بازار سرکی والاں قریب حوض قاضی	یہ مسجد سنہ ۱۲۳۳ھ میں سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ شمال سے جنوب ۴۹ فٹ۔ مشرق سے

مغرب ۱۴ فٹ۔ دو منزلہ اوپر مسجد نیچے چھ دکانیں ایک مکان جس میں لکڑی کا کارخانہ ہے۔ تین گنبد۔ تین در۔ لب سڑک (۱۰) سیڑھیوں کا زینہ پیش طاق اور محرابوں پر نفیس نقش و نگار بنے ہوئے ہیں صحن میں چوکوں کا فرش ہے۔ بیچ کا گنبد بڑا ادھر ادھر گنبدیاں اور پیش طاق پر دونوں جانب چھوٹی چھوٹی میناروں پر چھوٹی برجیاں۔ یہ مسجد ایک طوائف مبارک بیگم کی بنائی ہوئی ہے جو کسی انگریز کی داشتہ تھی اسی نے یہ مسجد اور ایک پاس والا مکان جو اب قاضی کے حوض پولیس سٹیشن کے قریب ہی بنوایا تھا۔ رنڈی کی مسجد ہونے سے پہلے اس میں نماز نہ ہوتی تھی اب جب سے مرمت ہوئی نماز ہونے لگی۔ پیش طاق پر سنگ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ ہے:۔

مبارک بیگم ایں مسجد بنا کرد — کہ باشد برتر از چرخ مقوس
کم از بیت المقدس نیست شانش — بگو ایں ثانی بیت مقدس ۱۲۳۹

لب سڑک مسجد کا بڑا دروازہ ہے جس میں لکڑی کا کارخانہ ہے اور ادھر ادھر دو اس سے چھوٹے دروازے ہیں ان کی محرابوں کی پیشانی پر یہ کتبے ہیں:۔

(۱) بیچ کے در پر:۔ الحمد للہ کہ ایں مسجد و عمارات متعلقہ آں در سنہ ۱۳۱۶ھ بعہد میجر ڈیوس صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی سرکار دولتمدار بہ انجمن موید الاسلام دہلی مفوض گشت و مرمت و درستی آں بصرف دو ہزار روپیہ عطیہ شیخ بخش الٰہی صاحب سوداگر زیر اہتمام انجمن موصوف بعمل آمد

(۲) (داہنی طرف)۔ ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیہا اسمہ وسعی فی خرابہا اولئک ما کان لہم ان یدخلوہا الا خائفین ۵

کتبہ سید احمد

(۳) بائیں طرف۔ انما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ فعسیٰ اولئک ان یکونوا من المہتدین

امام جامع مسجد دہلی

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۱۰۶)	لال مسجد	بازار لال کنواں	قدیم - دو منزلہ - اوپر مسجد نیچے دکانیں - کوئ خاص بات نہیں -
(۱۰۷)	لطف اللہ	×	دیکھو مسجد باقی تپیاں
(۱۰۸)	مبارک بیگم	×	دیکھو لال مسجد نمبر (۱)
(۱۰۹)	محبوب علی مولوی	چھتہ شیخ منگلو زیر جامع مسجد	قدیم - شمال سے جنوب ۲۷ ہاتھ - مشرق سے مغرب ۱۳ ہاتھ - محبوب علی دلی کے ایک مشہور مولوی تھے جو مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد تھے
(۱۱۰)	محتسب	پھاٹک حبش خاں کوچہ مولوی قاسم	سنہ ۱۱۳۶ھ (۲۴-۱۷۲۳ع) - یہ مسجد بہت وسیع صحن کی ہے جس کے مشرق رو بہ طلبار کے حجرے ہیں جس میں مدر مدرسہ ہے - صحن میں ایک بڑا حوض بھی ہے - تین گنبد تین در - ابو سعید کی بنائی ہوئی ہے جو زمان شاہی میں دہلی کے محتسب تھے - ان کے مورث اعلی محمد تقی چلپی شاہجہاں کے عہد میں فارس سے آئے تھے اور آتے ہی مورد عنا شاہی ہو گئے اور ان کے صاحبزادے کو صدر محتسب کی خدمت موروثی طور پر دی گ کہ انہیں کے خاندان کے لوگ اس خدمت پر مقرر کئے جائیں گے پیش طاق پر یہ کتب در زمان داور عالم پناہ سے داد رس — بادشاہ دیں محمد شاہ غازی جم حشم مسند آرائے شریعت میر عدل احتساب — ناصب اعلام دین و بادم دیر و صنم کردہ در دلی بنائے مسجد گردوں شکوہ — کز تماشائش نگہ شد ناظر بیت الحر چوں فضائے خاطر صاحبدلاں صحنش وسیع — گنبدش چوں گنبد گردوں منقش یکقلم از پئے تاریخ اتمامش سروش غیب گفت — در کعبۂ ثانی بنائے بوسعید با کرم ۱۱۳۶
(۱۱۱)	مرزا فخر اللہ بیگ	فراشخانہ - پل کے پاس	قدیم - معمولی -
(۱۱۲)	مرزا مغل بیگ خاں	لال دروازہ سبانا لال کنواں	قدیم - معمولی -
(۱۱۳)	منشی شیر علی	کوچہ سربلند خاں محلہ چوڑی والاں	سنہ ۱۰۹۱ھ (۸۱-۱۶۸۰ع) تین در کی بہت مختصر مسجد ہے جس کے پیش طاق کلمۂ طیبہ اور سنہ ۱۰۹۱ھ لکھا ہوا ہے منشی شیر علی کا بس

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
			نام ہی نام رہ گیا اور کچھ پتہ نہیں چلتا۔
(۱۱۴)	موچیوں کی مسجد	متصل اجمیری دروازہ	سنہ ۱۱۱۰ھ ۹۹-۱۶۹۸ء۔ شمال سے جنوب ۳۵ فٹ ۹ انچ۔ مشرق سے مغرب ۱۲ فٹ ۹ انچ۔ اونچے پر بنی ہوئی ہے سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں پہنچتے ہیں۔ تین گنبد تین در صحن میں سنگ باسی کے چوکوں کا فرش ہے در حوض شمال میں محراب دار دروازہ جس کی پیشانی پر سنگ مرمر کی تختی پر سیاہ حروف میں یہ کتبہ ہے:- حبذا مسجد کہ شد ز شرف سجدہ گاہے گدا و شاہنشاہ شد نمایش بعہد عالمگیر بطفیل نبی رسول اللہ گفت تاریخ این حرم ہاتف در کہ کعبہ بنا خلیل اللہ
(۱۱۵)	مولوی محمد باقر	کشمیری دروازہ پنجے کی گلی	سنہ ۱۲۷۱ھ ۵۵-۱۸۵۴ء یہ مسجد امامیہ لوگوں کی ہے۔ دُہرے دالان ہیں۔ اندر کے دالان میں پانچ در ہیں اور باہر والے میں صرف تین۔ صحن مسجد میں ایک چھوٹا سا حوض ہے جسے "قُلتین" کہتے ہیں۔ داخلی دروازے کی پیشانی پر یہ کتبہ ہے:- ھو العلی الاعلی مسجد شیعیان اہلبیت طاہرین سنہ ۱۲۷۱
(۱۱۶)	مولوی عطاء اللہ	کشمیری دروازہ کھڑکی ابراہیم علی خاں	قدیم۔ یہ مسجد اور ایک مقبرہ جس کا ذکر علٰحدہ آئے گا اور کچھ کوٹھڑیاں ایک ہی پختہ احاطے میں ہیں۔ مسجد سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے کوٹھے پر طلبائے عربی کے رہنے کا کمرہ ہے۔ یہ مولوی عطاء اللہ کی بنائی ہوئی ہے جو عہد مغلیہ میں کسی بڑی خدمت پر تھے

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۱۱۷)	مومنان	گلی ڈکوتاں عقب کلاں مسجد	۹۰-۱۸۸۹ء ۱۳۰۶ھ - تین در کی مختصر پیش طاق پر یہ کتبہ ہے: ۱۳۰۶ھ ہجری مسجد حنفیہ مومنان متعلقہ مسجد ۵۰ گز زمین اور دکان مع چبوترہ
(۱۱۸)	میاں جی صاحب	پنڈت کا کوچہ	اصلی مسجد شاہجہاں کے زمانے کی تھی بعد میں آخری مغلیہ عہد میں بنی۔ اصلی مسجد منہدم ہو گئی ہے اسی پر دوبارہ مسجد بنائی گئی ہے۔
(۱۱۹)	میاں صاحب	پھاٹک حبش خاں دھوبی کا کٹرہ	اورنگ زیب کے زمانے کی۔ آبادی بیگم صاحب محل اورنگ زیب نے ابتداءً سنگ سرخ کی بنوائی تھی۔ دوبارہ تعمیر کی گئی ہے۔ چوں کہ مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی اسی مسجد میں پڑھاتے تھے اور ان کو لوگ بالعموم میاں صاحب کہتے تھے انھیں کے نام سے مشہور ہو گئی ہے۔
(۱۲۰)	میدان شاہی	محلہ رودگراں	قدیم معمولی۔ احاطۂ مسجد میں سید یاقوت شاہ کی قبر ہے جن کے لیئے یہ چھوٹی سی مسجد بنائی گئی تھی۔
(۱۲۱)	میر افضل	بازار لال کنواں حویلی میر افضل	۱۸۰۶ء ۱۲۲۱ھ - یہ مسجد دو بیگموں نے مرزا مجتو کی معرفت بنوائی تھی۔ اس کے کتبے کا پتھر مسجد کے ایک حجرے میں رکھا ہوا ہے:- بعون اللہ تعالیٰ این مسجد نو احداث بی بی صاحبہ والدہ شیخ علی احمد مرحوم سجادہ نشین فتحپور و خانم صاحبہ والدہ مرزا رحیم بیگ خاں باہتمام مرزا مجتو بشہر رجب ۱۲۲۱ھ ہجری تیار شد۔
(۱۲۲)	سیر داری	فراش خانہ۔ گلی سیر داری	قدیم۔ معمولی۔

نشان سلسلہ	نام مسجد	محلہ	کیفیت
(۱۲۳)	نبی بخش	دلی دروازہ	یہ مسجد پہلے اُس جگہ تھی جہاں کہ اب جنگی کی چوکی ہے۔ حالیہ مقام پر از سر نو نبی بخش سقے نے بنوائی جس کے پیش طاق پر یہ کتبہ ہے :- "نبی بخش سقائی بانیٔ مسجد"
(۱۲۴)	نقیب الاولیاء	عقب کلاں مسجد	قدیم - معمولی نقیب الاولیاء کی بنوائی ہوئی ہے۔
(۱۲۵)	نواب احمد سعید خاں	گلی قاسم جان متصل حویلی کالے صاحب	۱۹۲۳ء ۱۷۶۹ء - دو منزلہ - اوپر مسجد نیچے چار دکانیں جو شمالی محراب کے پاس ہیں۔ قاسم خاں کی بنائی ہوئی ہے جن کا خطاب سہراب جنگ تھا۔ انھیں کے نام پر قاسم جان کی گلی مشہور ہے۔ قاسم خاں کے باپ عبد الرحمن بخارا سے آئے تھے اور شاہ عالم ثانی کے زمانے میں نایب وزیر تھے جن کی حسن خدمات کی جلدو میں سہراب جنگ کا خطاب اور شمس آباد اودھ جاگیر ملی تھی۔ نواب احمد سعید خاں صاحب جن کے نام سے یہ مسجد مشہور ہے ان کا ذکر گلی قاسم جان میں ملاحظہ ہو۔

فہرست اُن مسجدوں کی جن کا کوئی خاص نام نہیں اور جن کا ذکر اس کتاب میں جداگانہ طور پر نہیں کیا گیا

نمبر سلسلہ	محل	مختصر حال
۱	فیض بازار اور دریا گنج کی سڑکیں جہاں ملتی ہیں	عہد مغلیہ - معمولی کہتے ہیں کلو تمباکو فروش کی بنائی ہوئی ہے۔

نمبر سلسلہ	محل	مختصر حال
(۲)	محلہ رکاب	عہد مغلیہ۔ شمال سے جنوب ۴ گز۔ مشرق سے مغرب ۸ گز۔
(۳)	کوچۂ چیلاں	ایضاً۔ ۲۶ گز۔ ۱۹ گز۔ کہتے ہیں کہ مفتی میرلال کی بنوائی ہوئی ہے جو بڑے مشہور اور ذی علم شخص تھے۔ ان کا اصلی نام رحمت علی خاں تھا جن کا خطاب سراج العلماء اور ضیاء الفقہا تھا۔
(۴)	پھول کی منڈی کوچۂ ناہر خاں	عہد مغلیہ۔ شمال سے جنوب ۱۳ گز۔ مشرق سے مغرب ۱۳ گز۔ پیرجی حسن عسکری کی بنائی ہوئی کہتے ہیں۔
(۵)	پھول کی منڈی کوچۂ دکھنی راؤ	عہد مغلیہ متصل گرجا۔ ۳ گز۔ ۱۱ گز۔
(۶)	ایضاً۔ نقار خانہ	عہد مغلیہ نواب صاحب باڑودی کے مکان کے پاس۔ ایک بڑی مسجد مع صحن وسیع اور تین گنبد جس کے مشرقی کونے میں حوض ہے۔ اونچے پر بنی ہوئی ہے دروازہ مشرق کی طرف ہے۔ جس کی دونوں جانب دس دس سیڑھیوں کا دہرا زینہ ہے۔
(۷)	ایضاً۔ کھڑکی یا حویلی خان دوراں خاں	عہد مغلیہ۔ مختصر۔ دہلۂ اول میں آغا جان نے بنائی تھی بعد میں قریب الانہدام ہونے سے حال میں مرمت ہوئی ہے
(۸)	محلہ گڑھیا یا حویلی امیر علی خاں زیر جامع مسجد	بہت قدیم مسجد ہے مگر از سرِ نو بنائی گئی ہے
(۹)	کٹرۂ گوکل شاہ	عہد مغلیہ شمال سے جنوب ۲۴ گز۔ مشرق سے مغرب ۹ گز۔
(۱۰)	موچیوں کی گلی کلاں محل	بہت قدیم مگر حال میں ترمیم ہوئی ہے اور پیش طاق پر صرف کلمۂ طیبہ لکھا ہوا ہے۔
(۱۱)	جامع مسجد سے جو سڑک دلی دروازے کو جاتی ہے	چتلی قبر اور بنگش کے کمرے کے بیچ میں۔ بہت قدیم مگر بعد میں درست کی ہوئی۔

نمبر سلسلہ	محل	مختصر حال
(۱۲)	ایضاً	ایضاً عہد مغلیہ اور مختصر مگر بعد میں مولوی محمد اسحق صاحب نے درست کرائی۔
(۱۳)	ترکمان دروازہ	دروازے کے پاس ہی ۔ سنہ ۱۰۸۷ھ ۱۶۷۶ء ۔ تین گنبد تین در جنوب میں ایک حجرہ ۔ یہ مسجد صالح بہادر کی بنائی ہوئی جو سنہ ۱۰ جلوس عالمگیر میں بجائے خانزاد خاں کے چاندنی کے فوجدار مقرر ہوئے تھے پیش طاق پر یہ کتبہ ہے:۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ بنائے مسجد صالح بہادر بن جبین سلطان بدوسنہ ۱۹ عالمگیر شاہ
(۱۴)	بھوجلا پہاڑی ۔ گلی راجی داس	قدیم ۔ مختصر ۔
(۱۵)	ایضاً	″ ۔ ″ ۔
(۱۶)	اندھیری گلی	″ ۔ ″ ۔
(۱۷)	گلی مشعلچیاں	″ ۔ شاہجہاں کے عہد کی ہے جس کی ازسر نو ترمیم ہوئی ہے ۔ پیش طاق پر کلمۂ طیبہ اور ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء کندہ ہے مگر لوگ کہتے ہیں کہ یہ سنہ نہ بنا کا ہے نہ ترمیم کا ۔ یہ پتھر کہیں اور کا ہے ۔ کلمہ منقوش ہونے سے یہاں نصب کر دیا گیا ۔
(۱۸)	چتلا دروازہ شاہ بولا کا بڑ	قدیم ۔ حاجی علی جان والوں کے خاندان کے کسی صاحب کی بنوائی ہوئی ہے ۔
(۱۹)	گلی مرغاں کوچہ میر عاشق	قدیم معمولی ۔
(۲۰)	بُنگلی خانہ	قدیم ۔ مختصر ۔ محمد شفیع صاحب کی بنوائی ہوئی ہے جو سید حسن رسول نما کے عزیزوں میں سے تھے ۔
(۲۱)	محلہ نمدے والاں	قدیم ۔ معمولی ۔

نمبر سلسلہ	محل	مختصر حال
(۲۲)	موضع قاضی کوچہ فخر النسا بیگم	قدیم۔ مختصر۔ صحن مسجد میں سید ابابار اللہ کا مزار ہے۔
(۲۳)	نیاریاں	قدیم۔ معمولی۔
(۲۴)	نصیبیں۔ فراش خانہ۔ رجی کا کٹرہ	″ ۔ ″ ۔
(۲۵)	فراش خانہ۔ احاطہ محن صاحب	شاہجہاں کے عہد میں ایک بزرگ خار شاہ تھے اُن کی بنائی ہوئی ہے۔
(۲۶)	″ کٹرہ دھوبیاں	قدیم۔ معمولی۔
(۲۷)	″ کٹرہ بترو	″ ۔ ″ ۔
(۲۸)	″ گلی راجاں	″ ۔ ″ ۔
(۲۹)	″ چھتہ راجاں	″ ۔ مرمت شدہ۔
(۳۰)	″ چھپاکا چھتہ	″ ۔ ″ ۔
(۳۱)	رودگراں۔ مدرسہ ارادت مند خاں	عہد مغلیہ۔ معمولی۔
(۳۲)	″ کٹرہ شیخ چاند	″ ۔ ″ ۔
(۳۳)	بازار لال کنواں۔ گلی چابک سواراں	″ ۔ ″ ۔ مرمت شدہ۔
(۳۴)	″ فتح پوری۔ گو ندنی کا کٹرہ۔ بیدو کے حمام کے پاس	عہد مغلیہ۔ معمولی۔ بلند مقام پر واقع ہے۔
(۳۵)	بڑیوں کا کٹرہ	عہد مغلیہ۔ معمولی
(۳۶)	بلی ماراں۔ کوچہ قطبی بیگم۔	″ ۔ ″
(۳۷)	چہپل مہادیو۔ چھتہ صوفی جی	غدر کے بعد سے اُجڑ گئی مسلمان جو اس کے متکفل تھے

نمبر سلسلہ	محل	مختصر حال
		دوسری جگہ جا رہے مسجد گرا کر ڈھیر ہو گئی۔
(۳۸)	بازارلال کنواں۔ گلی قاسم جان مدرسۂ عنایت الله	زمانہ نامعلوم۔ مختصر۔
(۳۹)	متصل حوض قاضی	عہد مغلیہ۔ مختصر۔ حکیم بقاء الله کی بنائی ہوئی۔ دومنزلہ۔ اوپر مسجد نیچے دو دکانیں۔ دس سیڑھیوں کا زینہ ہے۔
(۴۰)	کوچہ نیچہ بندان۔ چاندنی چوک	" ۔ معمولی۔ پھر سے بنی ہوئی۔
(۴۱)	چھیرہ خانہ۔ قریب چھتہ مدن گوپال	" ۔ " ۔ "
(۴۲)	چھیرہ خانہ	" ۔ " ۔ متولی عبدالرزاق۔
(۴۳)	"	" ۔ " ۔ " ۔ دومنزلہ۔ اوپر مسجد۔ نیچے دکانیں۔
(۴۴)	"	" ۔ متولی عبدالرشید۔ اونچے پر بنی ہوئی ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر جانا ہوتا ہے۔
(۴۵)	دھرم پورہ چھتہ شاہ جی	شاہ بولا کے بڑ کے پاس۔ قدیم۔ معمولی۔
(۴۶)	دریبہ کلاں متصل شروع کا کٹرہ	عہد مغلیہ۔ تین گنبد۔ تین در۔
(۴۷)	" ۔ کنجوں کی گلی۔	" ۔ شکستہ۔ اہل اثنا عشریہ کی مسجد ہے۔ یہ مسجد اوپر نیچے بنی ہوئی ہے۔ دراصل دو دالان کی مسجد تھی۔ اندرونی دالان سڑک سے ملا ہوا تھا جس کے نیچے دکانیں تھیں۔ یہ دالان اور دکانیں تو متولیوں نے فروخت کر دیں۔ رہا اگلا دالان اس میں بھی اب گودام ہے۔ غرض مسجد کا صرف نام رہ گیا ہے۔
(۴۸)	" ۔ کوچہ استاد حامد	عہد مغلیہ۔ استاد حامد کا جو کوچہ ہے اس کے پھاٹک پر بنی ہوئی ہے
(۴۹)	کوڑیا پل سرائے توپ خانہ۔	عہد مغلیہ۔ اب جس جگہ سرائے ہے پہلے یہاں توپ خانہ تھا۔ مسجد توپ خانہ اٹھنے سے پہلے کی ہے۔ بعد میں توپ خانہ جا کر اس جگہ سرائے بن گئی۔

نمبر سلسلہ	محل	مختصر حال
(۵۰) (۵۱)	چاندنی چوک۔ گلی بیدانی- نٹوروں کا کوچہ	عہد مغلیہ۔ مختصر۔ یہ مسجد اانی بیگم زوجہ الٰہی بخش صاحب کی بنائی ہوئی ہے امام باڑے کے پاس سنہ ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۷۵۲-۵۳ء۔ مختصر جو چبوترے بنی ہے۔ پیش طاق پر آیات کلام مجید کے علاوہ یہ کتبہ ہے: ز فیض اقدس الطُّب لطف احمد — بنائے قبلۂ عالم نما شد بعہد سعد احمد شاہ غازی — سعید القدر اسی بجا شد سروش غیب گفت در بےنقصان — تمنی کعبۂ عالی بنا شد
(۵۲) (۵۳)	نیل کا کٹرہ " گلی تلیا	عہد مغلیہ سنہ ۱۱۶۹ھ [illegible] فصیح الدین۔ تین گنبد۔ تین در۔ معمولی۔ لب سڑک۔ تیرہ سیڑھیوں کا زینہ۔ اوپر مسجد۔ نیچے تین دکانیں۔
(۵۴)	کشمیری دروازہ چابی گنج	" یہ مسجد دو منزلہ ہے اوپر مسجد۔ نیچے تین دکانیں۔ تین گنبد۔ تین در۔ زینہ چڑھ کر مسجد میں جاتے ہیں۔ یہ مسجد عاشوری خانم کی بنوائی ہوئی ہے
(۵۵)	ایضاً گندہ نالہ کنجنیاں کی گلی	سنہ ۱۰۱۵ھ مطابق ۱۶۰۶-۰۷ء۔ بانی علی احمد شاہ۔ مختصر جس کے بیچ کے در پر یہ کتبہ ہے:- بعہد نور الدین جہانگیر ابن شاہ اکبر — بحمد اللہ علی احمد شدہ ایں بقعہ را بانی جہاں بانی شدہ در فکر تاریخ بنائے او — ز فیض حق ندا آمد بنا شد کعبۂ ثانی سنہ ۱۰۱۵ ہجری
		امام باڑے
(۱)	امام باڑہ نٹوروں کا کوچہ	دور آخری مغلیہ۔ تہرے دالان تین تین دروں کے ہیں۔ امام باڑے کا ایک بڑا احاطہ ہے لیکن بہت ردی حالت میں ہے۔ امام باڑے ہی میں متولی محمد عسکری صاحب رہتے ہیں جن کے آبا و اجداد کا یہ امام باڑہ بنایا ہوا ہے

له صورت نویسی پڑھا نہیں جاتا۔ ۱۲

نمبر سلسلہ	محل	مختصر حال
(۲)	امام باڑہ موری دروازہ دھوبی واڑہ	نواب احمد مرزا صاحب کا امام باڑہ مشہور ہے۔ دور آخری مغلیہ کا بنا ہوا ہے۔ امام باڑہ ایک وسیع احاطے میں ہے جس میں کئی دالان تین تین دروں کے ہیں۔ اندر کے دالان میں تین قبریں ہیں ایک تو بانی کی اور دو اُن کی بیویوں کی۔ علاوہ اس کے باہر کے دالان اور احاطے میں متعدد قبریں اُنہیں کے خاندان کے لوگوں کی ہیں۔ یہیں ایک چھوٹی سی قبر محمد حسین خاں کے انگوٹھے کی ہے جو بانی کے دادا تھے۔ محمد حسین صاحب کا انگوٹھا کسی لڑائی میں کٹ گیا تھا جسے اُنھوں نے خود یہاں لاکر دفن کر دیا۔ یہ امام باڑہ سیف الدولہ سید رضی خاں بہادر صلابت جنگ کا بنایا ہوا ہے جو شاہ عالم ثانی کے دربار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے وکیل تھے۔ چنانچہ نواب سید احمد مرزا صاحب کے پاس سید رضی خاں کی مہر جس میں سیف الدولہ اور صلابت جنگ کے خطابات کندہ ہیں ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۱ء کی موجود ہے۔

فہرست اہلِ ہنود کے شوالوں[ف] کی جن کا ذکر اس کتاب میں جداگانہ طور پر نہیں کیا گیا

ف: ہندوؤں کے مندروں میں عموماً پانچ چھ مورتیں برابر یا آمنے سامنے ہوتی ہیں بعض جگہ اُن کے لیے الگ الگ طاق بھی نہیں ہوتے لہٰذا اتنا معلوم ہوتا ہے کچھ تو ضیح ہندوؤں کے عبادت خانوں کی کر دی جائے۔ شوالہ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں شیو کی پوجا سب مقدم مرجح ہو۔ جیسا کہ ہر دیو داس کے شوالے کے کتبے سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں شیو کا لنگ اور پاربتی کی مورت کا استھاپن کیا گیا تھا اور اسی سبب سے وہ شوالا یعنی شیو کی جگہ کہلاتا ہے۔ بعض مندروں میں طاقوں میں اور بھی کئی کئی مورتیں ہوتی ہیں اس سبب غیر قوم والوں کو اس کا امتیاز مشکل ہے کہ یہ مقام شوالا ہے یا کسی اور دیوتا کا مندر۔ دلی میں دو مندر ایسے بھی ہیں جو دوسرے دیوتاؤں کے نام پر بنائے گئے ہیں اس لیے اُن کو شوالا نہیں کہا جا سکتا۔ مندروں کے حالات دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ اور کثرت سے شیو ہی کی پوجا ہوتی چلی آئی بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شیو کے مقابلے میں دوسرے دیوتا بہت کم پوجے جاتے ہیں۔ ۱۲

نشان سلسلہ	نام شوالہ	محلہ	کیفیت
(۱)	امر سنگھ	محلہ کچا باغ - کوچہ مہاجنی	بن کر ۲۰۰ سال ہوئے - قابض حال بہادر سنگھ کے دادا امر سنگھ کا بنایا ہوا ہی - اس میں شیو کا لنگ اور دو مورتیں پاربتی کی ایک گنپتی ایک کرتیکا سوامی اور ایک نندی کی ہی - سیدھے ہاتھ کی طرف اور ایک چھوٹا سا مندر ہنومت کا ہی -
(۲)	باباجی	چھت شاہجی محلہ چھیپی واڑہ کلاں	آخر دور مغلیہ - یہاں پہلے قدیم شوالا تھا جو گر گیا اسکی جگہ ۲۸ - برس ہوے کہ کلکتہ کے لالہ لاتا پرشاد نے یہ عمارت بنوائی - جس میں دو لنگ شیو کے جو دونوں اچل (یعنی نا قابل نقل مکان) ہیں - انھیں کے پاس پاربتی - گنپتی کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں سیدھی طرف درگا - بھیرو - گنگا - ہنومت کے بت ہیں - سالانہ تقریب سنجی کی اسوج کے مہینے میں ہوتی ہی - تین چار دن تک مورتوں کو باجے گاجے کے ساتھ گشت کرایا جاتا ہی -
(۳)	بڑا شوالہ -	نیل کا کٹڑہ	کوئی سو برس اول کا - راے بہادر لالہ شیو پرشاد سی آئی - ای کے دادا کا بنایا ہوا ہی - تعمیر ۱۸۲۳ء - ۱۲۳۹ھ - راے بہادر صاحب چوتھی پشت میں ہیں - شوالے میں شیو کا لنگ - پاربتی - گنپتی - کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں - طاق میں ہنومان ہی - ان کے علاوہ اور دو مورتیں ایک رادھا کی دوسری کشن کی ہیں جو کوئی آٹھ برس ہوے کے بٹھائی گئی ہیں -

نشان سلسلہ	نام شوالہ	محلہ	کیفیت
(۴)	بڑ والا	ایضاً	کوئی دو سو برس کا پرانا۔ دو چھوٹے چھوٹے مندر شیو کے ہیں ان دونوں میں شیو کا لنگ پاربتی گنپتی اور نندی کی مورتیں ہیں۔ ان میں سے بڑے مندر میں کرتیکا سوامی کی مورت بھی ہے سیدھی طرف کے طاق میں ہنومت کی مورت سیندور سے رنگی ہوئی ہے۔ کنجی مل جوہری نے نو سال ہوئے کہ مرمت کرادی تھی۔ مندر میں بڑ کا درخت ہے اسی وجہ سے بڑ والا مشہور ہے۔
(۵)	پیپل مہادیو	پیپل مہادیو	ماگھ سُدی پنجمی بکرم سمت $\frac{۱۸۶۶}{۶۱۸۰۹}$ مندر کی بیرونی دیوار پر ایک پنج سطری کتبہ بخط دیوناگری ہے جو صاف پڑھا نہیں جاتا جسے ہم بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ حال کا بھی ایک سہ سطری کتبہ اسی مضمون کا ہے:-

(१) कला.. हिमांशु संमितस.. यो विक्रमस्य

(२) प्रभो..तिथौ स.

(३) मस्थापयत् ॥१॥ वृद्धो (?)

(४)... पचानन लक्षाराम हर हरेश्वर !

(५)... सलम्बोदरः ॥ शुभमस्तु १८६६

آخری سطر میں اس کے باقی بھی رام اور ست ہے۔ یہ مندر لبھو رام کھتری رام کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں شیو کا لنگ گنپتی۔ پاربتی۔ نندی۔ ہنومت اور بھیرو کی مورتیں ہیں۔ شیو کی مورت بہت خوب صورت ہے جو جے پور سے لائی گئی تھی۔

نشان سلسلہ	نام شوالا	محلہ	کیفیت
(۶)	توپ خانے والا	دھرم پورہ بھوت والی گلی	دور آخر مغلیہ۔ چنی لال قابض حال کے دادا لالہ دیوکی نندن کا بنایا ہوا ہے۔ وہ توپ خانے کے بہم رسانی سامان کے ٹھیکے دار تھے اور ایام غدر میں اُنھوں نے برٹش گورنمنٹ کو بحالت محاصرۂ شہر فراہمی سامان میں بڑی مدد دی تھی۔
(۷)	چندی مصر	دھرم پورہ	کوئی دوسو برس پہلے کا۔ پھولن جی کایستھ کا بنایا ہوا۔ اس میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی۔ اور نندی کی مورتیں ہیں طاقوں میں ہنومت اور بھیروں کی مورتیں ہیں۔ مندر کے احاطے میں ایک منقش پتھر کی کسی عمارت کا دھر دیا ہے۔
(۸)	چودھری ہمت سنگھ	کھجور کی مسجد	دور آخر مغلیہ۔ ہمت سنگھ کے باپ لالہ موتی لال نے بنایا تھا جو ساڑھے پانچ فیٹ مربع ہے۔ اس میں پاربتی۔ گنپتی۔ برمھ دیو۔ نندی اور ہنومت کی مورتیں اور شیو کا لنگ ہے۔
(۹)	دھونی مل کھنا	نیل کا کٹڑہ گلی گھنٹیشور مہادیو	ستر برس پہلے کا۔ مندر میں شیو کا لنگ اور پاربتی۔ گنپتی۔ سورج نارائن۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں۔
(۱۰)	راگھو مصر	پیپل مہادیو	دوسو برس پہلے کا۔ سیو کا لنگ۔ پاربتی گنیش۔ کرتیکا سوامی کی مورتیں۔
(۱۱)	رنگی مصر	نیل کا کٹڑہ۔ نئی بستی	سمت ۱۸۹۱ / ۱۸۳۴ء یہ مندر چھنگا مصر کا بنایا ہوا ہے اور مرمت رنگی مصر نے کی ہے۔ شیو کا لنگ۔ گنپتی اور نندی کی مورتیں ہیں اور طاق میں ہنومت

نشان سلسلہ	نام شوالہ	محلہ	کیفیت
			اور درگا کی مورتیں ہیں۔
(۱۲)	ساول جی	مالیواڑہ بھوج پورہ	دور آخر مغلیہ۔ سیو کا لنگ گنپتی کی دو مورتیں اور اور ایک ایک مورت۔ پاربتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی
(۱۳)	سدانند دویا	مالیواڑہ پتلی گلی	اساڑھ سُدی ۱۳ بکرم سمت ۱۹۰۹ ء۱۸۵۲ - مندر کی بیرونی دیوار پر بخط دیوناگری یہ کتبہ ہی اور نیچے اس کے اردو کی ایک سطر ہے:- شوالہ سری مہاراج پنڈت کنھیا لال جی کا سری سمت ۱۱۹۰۹ ساڑھ شکلا ۱۳ ——— شوالہ سری مہاراج پنڈت کنھیا لال جی کا سمت ۹۰۹ اساڑھ سُدی تیج۔ مندر کے اندر بخط ناگری سترہ سطر کا یہ لمبا کتبہ ہی جس کی عبارت بجنسہ نقل کی جاتی ہی۔

(۱) سری الیوتھا شوالے۔ (۲) سری من مہاراج پنڈت کنھیا لال جی کا پتا مہاراج سالگ رام جی وکرپارام جی کے کی (۳) سمت ۱۸۹۶ میں برشا سے مکان اُن کا گر پڑا تھا سمت ۱۸۹۸ میں اسی جگہ کی چوطرفی دیوار کچی۔ (۴) کھچ اکر سری مہادیو جی کو ستھیاپت کیا اور دیوان خانہ اپنے واسطے بنوایا سمت ۱۹۰۷۔ (۵) تک اُسی طور رہا سمت ۱۹۰۸ میں شوالا بننا شروع ہوا بیچ نگہبانی مہاراج جوالی (۶) سمجھ جی کے۔ سمت ۱۹۰۹ میں بن کے تیار ہو گیا اور پرتشٹا تی اساڑھ شکلا تیج کو بڑ (۷) ی دھوم سے سالگرام جی نے کری کس واسطے پنڈت جی مہاراج کا شریر بیمار تھا اور۔ (۸) رایک مہینے دس دن بعد پرتشٹا کے کیلاش باسی ہو گئے سمت ۱۹۱۴ میں غدر ہوا سمت ۱۹۱۵ - (۹) و ۱۶ میں سنے

نمبر سلسلہ	نام شوالہ	محل	کیفیت
			سڑک نکالی دیوان خانہ سڑک میں آگیا دام اُس کے سرکار سے سالگرام - (۱۰) جی مہاراج لے اُنھوں نے دیوار سڑک کی طرف بنوائی اور

زمین دبالی سمجانی سے مو (۱۱) ل لے گرتہ خانہ بنوایا اور اُس
کے اوپر چار دیوار کھڑی کروا کر چھوڑ دیا تھا۔ (۱۲) سمت ۱۹۲۸ میں دوکان
کی صورت زینہ وغیرہ دین مٹھن لال نے بنوایا نول میستری سے سمت ۱۹۴
(۱۳) میں دوسرا کے بازونل نھوارے کا آلہ بھیرو جی کا وچھت تدری بنوائی
ومرمت شکست - (۱۴) ریخت کی یہی داس کروا تار بتاہی کُل نویں اسباب
اسی دین نے چڑھایا ہے سمت ۱۹۴۹ - (۱۵) مہاراج سالگرام جی شیولوک باس
ہوے بعد اُن کے ہر طور کی سیوا یہی چر نوراگی کر رہا - (۱۶) ہے - یہ دیوستھا
آگیاں انکول سری شیوجی مہاراج کے دین پنڈت مٹھن لال رائے بہادر
پنشنر (۱۷). نے کھدوائی ہے اور جو کسی کے نام کو مٹاتا ہے بھگوت مہاراج اُس
کے سات کل کے نام کو مٹا دیتے ہیں۔

سمت ۱۹۴۵ - اساڑھ - شُکلا ۱۳ اسنیوار

رائے بہادر مٹھن لال - سدانند ویدمال نگران شوالے کے تایہ تھے جنھوں نے
یہ کتبہ کھدوایا - مندر کے اندر لنگ - پاربتی - گنپتی - برمھ دیو اور نندی
کی مورتیں ہیں - طاق میں سیدھی طرف لالہ بھیرو - ہنومت اور کالی دیوی کی مورتیں ہیں

نمبر سلسلہ	نام شوالہ	محل	کیفیت
(۱۴)	سرون	کوچۂ گھاسی رام	دور آخر مغلیہ - ایک مورت بھیروں کی سیندور میں لپٹی ہوئی باہر سے ہی نظر آتی ہے - مندر کے اندر مہادیو اور پاربتی کی سنگ مرمر کی مورتیں بیل پر بیٹھی ہوئی بنی ہوئی ہیں - قدیم مندر بہت چھوٹا تھا - یہ نئی عمارت گھڑے ہوئے پتھروں کی

نمبر سلسلہ	نام شوالہ	محلہ	کیفیت
			سمت ۱۹۶۹ میں بنی ہے۔ مندر کے متصل ایک دو منزلہ کمرہ پجاریوں کے لئے بنا ہوا ہے۔
(۱۵)	کالی پرشاد	گندی گلی	سو برس پہلے کا۔ کالی پرشاد کے پردادا اچنتا مصر کا بنایا ہوا ہے بعض کہتے ہیں کہ ٹانک چند گوسائیں کا بنایا ہوا ہے لیکن اب اس کی پجارن مساۃ پردو ہے جو کالی پرشاد کی لڑکی ہے۔ مندر میں شیو کا لنگ۔ پاربتی گنپتی اور نندی کی سنگ مرمر کی مورتیں ہیں طاق میں ہنومت کی مورت ہے۔
(۱۶)	گورکھ ناتھ	نیل کا کٹرہ۔ گلی دھوبیاں	غدر کے بعد بنا ہے۔ للتا بی بی اور دھنوتی کا بنایا ہوا ہے۔ گورکھناتھ دھنوتی کا شوہر اور للتا کا خسر تھا جس کے نام سے مندر مشہور ہے۔ مندر میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں۔ داہنی اور بائیں طرف ہنومت کی مورتیں ہیں۔
(۱۷)	گوری شنکر	کھاری باولی	دور آخر مغلیہ۔ سیڑھیوں پر یہ کتبہ بخط ناگری ہے: سری گنیش نام یہہ شوالہ پنڈت گوری شنکر کا ہے۔ متی بیساکھ سدی ۱۳ سمت ۱۹۵۶ کھوکی نے بنوایا ہے تو یہ مندر پرانا مگر از سر نو سمت ۱۹۵۶ میں بنا ہے۔ اس میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی اور نندی کی مورتیں ہیں اور طاق میں ہنومت کی مورت ہے
(۱۸)	گوبا	نئی سڑک گلی پیرو محلہ مالی واڑہ	تقریباً سو سال کا۔ شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی برہم دیو کی مورتیں مندر میں ہیں۔ ایک عورت نے جس کا نام

نمبر سلسلہ	نام شوالہ	محلہ	کیفیت
			کرایا تھا بنایا ہے۔
(۱۹)	گھاسی رام	چھتہ شاہ جی۔ نائی واڑہ	(۶۹) برس کا۔ گھاسی رام کھتری کا بنایا ہوا ہے۔ ا[ن] آبا و اجداد میں سے جتمال محمد شاہ کا ملازم تھا چوں کہ غدر میں گھاسی رام نے باغیوں کا ساتھ دیا[تھا] یہ مندر ضبط ہو گیا۔ شیو کا لنگ اور نندی مورت کے علاوہ طاق میں پاروتی اور گنپتی کی مورتیں بھی ہیں
(۲۰)	گھنٹیشور مہادیو	نیل کا کٹرہ۔ گلی گھنٹیشور مہادیو	اس مندر کے لنگ کو بہت قدیم بتلاتے ہیں [چنا]نچہ اس زمانے کا ہے جب کہ سو بھاری سمہتیا اور [پد]م پران لکھی گئی ہیں۔ مہامہوپادھیا پنڈت بانکے ر[ائے]

اور دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ سو بھاری سمہیتا اور پدم پران م[یں] جو کاسی کا ذکر آیا ہے وہ ہو نہ ہو نیل کا کٹڑہ ہی ہے کیوں کہ کاسی کو اس میں ودیا پورہ بھی لکھا ہے اور گھنٹیشور مہاراج کو وسوبسور لکھا ہے۔ علاوہ بریں نیل کے کٹڑے ہی کا نام [ودیا] پورہ ہونے کا ثبوت اس مکان کے قبالے سے بھی ملتا ہے جس میں کہ پنڈت جی موصو[ف] رہتے ہیں۔ چنانچہ کارونیشن دربار کی قدیم تاریخ اندرپرست کے صفحہ (۷) میں بھی پنڈت جی [نے] یہی لکھا ہے لیکن با ایں ہمہ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نیل کا کٹڑہ ہی ودیا پورہ ہے یع[نی] کاسی اور ودیا پورہ دونوں ایک ہی مقام کے نام ہیں۔ کیونکہ کاسی (بنارس) [کو] بھی ودیا پورہ کہتے ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ ودیا پورہ نام کے دو مقام رہے ہو[ں] نیل کے کٹڑے کے مندر کا نام وسوبسیر ہونا بھی کوئی یقینی ثبوت اس امر کا نہیں ہے ایسی بہت سی مثالیں [ہیں] ہیں کہ ایک ہی نام اور ایک وابستہ کی بنا پر کئی کئی مختلف مقامات ہیں۔ وسوبسیر کے معنے رب الع[المین] کے ہیں اور یہ لقب شیو کے دوسرے لنگوں کا بھی ہے۔ اس لیئے اس امر کی تحقیق اور قول فیصل کے لیئے ابھ[ی] منتظر باقی ہے۔ اگر دلی میں کوئی کتاب ایسا نکل آئے جس میں کاسی کا نام درج ہو تب البتہ کہا جا سکتا ہے کہ مذ[کورہ] بالا دونوں کتب میں جو کاسی کا ذکر آیا ہے اس سے نیل کا کٹڑہ ہی مراد ہے لیکن تب بھی قول مرجح یہی ہوگا [کہ] کاسی سے بنارس ہی مراد ہے۔ چوں کہ اس مندر میں گھنٹے کثرت سے ہیں اس واسطے گھنٹیشور کہلاتا

نمبر سلسلہ	نام شوالہ	محلہ	کیفیت
(۲۱)	لالہ منشی مرلال	چیمرہ خانہ	دور آخر مغلیہ۔ مختصر۔ جس میں شیو کا لنگ۔ پاربتی گنیش۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں۔
(۲۲)	لالہ شام لال	کناری بازار چیل پوری	تخمیناً ۷۰ سال کا۔ رائے شام لال کا بنایا ہوا ہے۔ مندر میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ درگا۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں۔ پاربتی اور درگا سے مراد واحد ہے۔ لیکن درگا کو سمجھا جاتا ہے کہ اس نے راکشس مہی پاسور مارا ہے اور پاربتی صرف شیو کی بی بی ہے اور اسی واسطے دو جداگانہ مورتیں ہیں۔
(۲۳)	لالہ فتح سنگھ	بلی ماراں۔ کوچہ بی بی گوہر	دور آخر مغلیہ۔ شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی۔ نندی۔ ہنومت۔ ٹھاکر جی (کشن) کی مورتیں ہیں۔ یہ مندر لالہ فتح سنگھ کا بنوایا ہوا ہے۔
(۲۴)	لکشمی نراین	ایضاً	دور آخر مغلیہ۔ شیو کا لنگ۔ پاربتی گنپتی۔ نندی۔ ہنومت کی مورتیں ہیں۔ بانی کا نام وہی ہے جو شوالے کا نام ہے۔
(۲۵)	مانک چند پوخر تاجر	نیل کا کٹرہ	وکرم سمت ۱۹۰۲۔ سکے ۱۷۶۹ ماگھ شکلا پنچمی۔ منگل۔ اس مندر میں یہ کتبہ بخط ناگری ہے:۔ (۱) سری گنیش نمسکار سمت ۱۹۰۲ شاکے ۱۷۶۹ ماگھ شکلا پنچمی شنی دنے وشویشر ناتھ نانک چند نے شیو ستھاپن کیا۔ کمرے میں داہنے ہاتھ کی طرف یہ دوسرا کتبہ ناگری کا ہے:۔ (۱) یہ چھتر لالہ مانک چند جی کا۔

نمبر سلسلہ	نام شوالہ	محلہ	کیفیت
			(۲) سمت ۱۹۰۲ میں۔ (۳) لالہ وشیشور ناتھ مانک چند شیو ستھاپن کیا یہ مندر وشیشور ناتھ اور مانک چند دو صاحبوں نے جو ذات کے کھتری تھے بنوایا ہے۔ مندر میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنیش۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں۔ طاق میں داہنی طرف ہنومت اور بائیں طرف انا پران کی مورتیں ہیں۔
(۲۶)	نایک	چھتہ پرتاب سنگھ گلی پیپل والی	(۲۸) برس پیشتر کا۔ اس مندر کی کوئی اٹھائیس برس ہوئے کہ کسی حجام نے مرمت کرائی تھی اور بعض کہتے ہیں کہ حجام کی بیوی گینڈو نائن نے مرمت کی تھی اور اسی وجہ سے نایک کا شوالہ کہلاتا ہے۔ اس میں پاربتی۔ گنیش اور نندی کی مورتیں ہیں اور طاق میں ہنومت کا بت ہے۔
(۲۷)	وسویسو ناتھ	گندی گلی پیپے کی گلی	دور آخر مغلیہ۔ ایک پختہ احاطے میں منڈوے کے اندر ہے۔ وسویسر ناتھ کا بنایا ہوا ہے۔ معمولی
(۲۸)	ہردیو داس	محلہ بلی ماران۔ پاسیوں کی گلی	بکرم سمت ۱۹۰۷ جمعہ ماگھ شکلا (۶)۔ دروازے پر ایک چھ سطر کا کتبہ بخط ناگری لگا ہوا ہے:۔

सम्मिते हायने स्वस्मिन्सप्त वाङ्क निशाकरैः

माघे शुक्ले घटे लग्ने दाश्रेषपुर्यां भृगोर्दिने १

बलदेवसुतो यस्य हरदेवस्तथा परः

श्री मन्महेशदासेन स्थापितौ गिरिजा शिवौ २

सं० १९०७ मा० शु० ६ भृ०

نمبر سلسلہ	نام شوالہ	محلہ	کیفیت
			یہ مندر پدمن نارائن قابض حال کے دادا جیس رام کا بنوایا ہوا ہے۔ جو مورتیں اس مندر میں ہیں ان کی صراحت کتبے میں موجود ہے۔ اصل مورت شیو کی ہے باقی اور مورتیں بھی ہیں۔ لنگ کے سامنے ایک مجسم ٹی سی مورت نندی کی ہے۔ داہنی طرف اشٹ بھج اور بائیں طرف گنپتی اور برمھ دیو کی مورتیں ہیں اور دروازے کے سامنے ہی ہنومت کا بت ہے۔ پاربتی شیو کی بی بی ہے۔ بیل اس کی سواری کا ہے اور گنپتی اس کا بیٹا ہے۔ برمھ دیو بھی انھیں کے متعلقین میں سے ہے۔ لیکن ہنومت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ممکن ہے کہ یہ مورت بعد کے زمانے میں رکھ دی گئی ہے۔

فہرست اُن شوالوں کی جن کا کوئی خاص نام نہیں ہے

نمبر سلسلہ	محلہ	کیفیت
(۱)	کوچۂ میر عاشق گلی مرغاں	۱۸۵۰ء ۔ بابو بنسی دھر قابض ہیں۔ معمولی۔
(۲)	محلہ باولیاں کوچۂ سربلند خاں	دورِ آخری مغلیہ۔ معمولی۔ اس میں دو لنگ ہیں اور پاربتی۔ گنپتی۔ برمھ دیوی اور نندی کی مورتیں ہیں۔
(۳)	بازار سیتارام کوچۂ فخر بیگ	ایضاً۔ اس میں پاربتی۔ کرتیکا سوامی گنیش اور نندی کی مورتوں کے علاوہ شیو کا ایک بڑا لنگ بھی ہے۔ سامنے دو طاق ہیں

نمبر سلسلہ	محلہ	کیفیت
(۴)	املی محلہ گلی کشمیریاں	رام سیتا۔ لکشمن کی مورتیں سنگِ مرمر کی ہیں۔ اور ایک دوسرے طاق میں بھیروں کی مورت سیندور لگی ہوئی ہے۔ ایضاً۔ اس میں پاربتی۔ گنگا۔ کرتیکا سوامی۔ نندی کی مورتیں اور شیو کا لنگ ہے۔
(۵)	املی محلہ کوچہ پاتی رام	دورِ آخر مغلیہ۔ یہ شوالا صرف ایک چھوٹا سا منڈوا مکان مسکونہ کے نیچ میں ہے۔ اس کی تعمیر از سر نو ہوئی ہے۔ اس میں پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں۔
(۶)	جٹواڑہ یا کونڈے والان	ایضاً خستہ حالت میں ہے۔ پندرہ بیس برس ہوئے کہ لنگ بھی کوئی اٹھا لے گیا۔ چند ٹوٹے پھوٹے ستون ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن شوالے کے حدود ابھی برقرار ہیں
(۷)	نیا بانس کوچہ سنجوگی رام	ایضاً ہرجی مل کھتری نے بنایا تھا۔ اس میں پاربتی۔ گنپتی اور کرتیکا سوامی کی مورتیں ہیں۔ سامنے ہی ایک چھوٹا سا مندر ٹھاکر جی کنھیا جی یا کشن کا ہے۔ سیدھی طرف اور ایک چھوٹا سا مندر گنگا کا ہے اور بائیں طرف ہنومت کا۔
(۸)	نیا بانس	عہد شاہجہانی۔ یہ شوالہ کوئی معقول عبادت گاہ ہے کیوں کہ بہت سے گھنٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ نیا منڈپ ۱۸۸۳ء میں بنا ہے جس پر دیوناگری انگریزی۔ اردو میں یہی سنہ لکھا ہوا ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی مورتیں پاربتی۔ گنپتی۔ برہما دیو اور نندی کی ہیں اور شیو کا لنگ بھی ہے۔
(۹)	تلی واڑاں۔ کوچہ بی بی گوہر	دورِ آخر مغلیہ۔ لالہ منا لال کا بنایا ہوا ہے جس میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ ہنومت اور بھیروں کے بت ہیں۔
(۱۰)	ایضاً۔ گلی دولسکھ رائے	اسی نوّے برس کا شوالہ ہے میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی۔

نمبر سلسلہ	محلہ	کیفیت
		برہمدیو۔ کرتیکا سوامی ہنومت اور وشنو کے چرن پڑے ہیں۔ یہیں ایک چھوٹا سا مندر ٹھاکر جی (کرشن) کا ہے جس میں رادھا اور کرشن کی مورتیں ہیں۔ یہ شوالا لالہ گنگی رام صاحب کا بنایا ہوا ہے جو لالہ دل سکھ رائے کے باپ اور مسٹر فریزر ریزیڈنٹ دہلی کے خزانچی تھے۔
(۱۱)	گلی حکیم بقا قریب حوض قاضی	ڈیڑھ سو سے دو سو برس پہلے کا معمولی شیو کا لنگ۔ پاربتی گنپتی۔ نندی اور ہنومت کے بت اس میں ہیں۔ یہ شوالا ایک مکان مسکونہ کے اوپر بطور ایک پویلین کے بنا ہوا ہے۔
(۱۲)	کھجور کی مسجد	ایک سو پندرہ برس پہلے کا۔ راج نراین لال ہیڈ سٹرایٹ لا کے دادا منشی جیون لال نے موجودہ شوالے کو اور کچھ جائداد کے ساتھ ہی ۱۱۱ برس پہلے خرید لیا تھا۔ شوالا ۹ × ۹ مربع ہے لیکن اس کی تعمیر کا سال معلوم نہیں ہوتا۔ شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی اور نندی کی مورتیں اس میں ہیں۔
(۱۳)	دھرم پورہ۔ گلی پہاڑ والی خورد	دوسرا آخر مغلیہ۔ بہادر سنگھ کی بہن جوزؔ دیوی نے غدر سے کچھ برس پہلے بنایا تھا۔ یہ شوالا ایک اونچے مقام پر گنبد دار ہے داخلی دروازہ سہ دری میں سے ہے جس کے آگے ایک سنگ سرخ کا چبوترا ہے جس پر تیرہ سیڑھیاں چڑھ کے جاتے ہیں۔ اس میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنیش اور کرتیکا سوامی کی مورتیں ہیں۔ پاربتی کی مورت بہت خوب صورت بنی ہوئی ہے۔ طاق میں گنیش کی ایک مورت رکھی ہوئی ہے۔
(۱۴)	کوڑیا پل۔ اندرا کنواں	دو سو برس کا۔ اس کی مرمت مہنت رانجھ داس نے کرائی تھی۔ اس میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی اور نندی کی مورتیں ہیں

نمبر سلسلہ	محلہ	کیفیت
		اور طاق میں ہنومت کا بت ہے۔ ایک دوسرے چھوٹے سے مندر میں ہنومت کا ایک اور بت اور گنیش اور کرشن کے برنجی بت ہیں۔ مندر کے پاس ہی اندارا کنواں ہے جس کے نام سے محلہ مشہور ہو گیا ہے۔ یہ کنواں بہت پرانا عہد مغلیہ سے پہلے کا بنجاروں کا بنایا ہوا کہا جاتا ہے۔ کوڑیا پل کی وجہ تسمیہ کا بیان شاہی کے مکان کے تحت میں ملے گا۔
(۱۵)	نٹوں کا کوچہ	آخر دور مغلیہ۔ معمولی۔ کوئی کہتا ہے چندے سے بنا ہے کوئی کہتا ہے ہنسال کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں سیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی۔ نندی اور ہنومت کے بت ہیں۔
(۱۶)	نیل کا کٹڑہ دھوبیوں کی گلی	(۱۳۳) برس پہلے کا۔ بعض کہتے ہیں کہ غدر سے کچھ ہی پہلے بنا ہے گنگا مصر (بھنٹا مصر) کا بنا ہوا ہے جس کی چھٹی پشت میں قابض حال گوکل چند ہیں۔ اس میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کے بت ہیں۔ سیدھی طرف طاق میں ہنومت کا بت ہے اور بائیں طرف سیو۔ پاربتی اور گنپتی کی مورتیں ہیں۔
(۱۷)	کشمیری دروازہ گندہ نالہ کنجنیوں کی گلی۔	قریب ۹۳۔ برس پہلے کا۔ اجودھیا پرشاد کھتری اور ٹھاکر داس بقال کا بنایا ہوا۔ قابض حال کھتری امراؤ سنگھ اُن کی چوتھی پشت میں ہیں۔
(۱۸)		آنگن میں دو چھوٹے چھوٹے مندر ہیں ایک شیو کا اور دوسرا ہنومت کا۔ شیو کے مندر میں شیو کی مورت پاربتی اُس کی گود میں بیٹھی ہے اور پاربتی کی ایک علحدہ مورت بھی ہے اس کے علاوہ گنیش۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں۔ ہنومت کے مندر میں ہنومت کی مورت سیندور میں رنگی ہوئی ہے اور اس کے علاوہ اور کئی چھوٹی چھوٹی برنجی مورتیں ہیں۔ اس شوالے میں اندر باہر کوئی تیس گھنٹے لٹک رہے ہیں۔

نمبر سلسلہ	محلہ	کیفیت
(۱۹)	چوڑی والاں گلی کشمیریاں	کوئی سو برس اول کا - اس کے دروازے پر زمانہ حال کا ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس پر ناگری میں :- "پنڈت بسن نارائن ہکسر" کھدا ہوا ہے - اس شوالے میں شیو کا لنگ - پاربتی اور نندی کی مورتیں ہیں -
(۲۰)	کھاری باؤلی - گلی تماشا رغبران	پھاگن کرشنا (۵) جمعرات سمت ۱۹۰۷ / ۱۸۵۰ء - دروازے پر ذیل کا کتبہ سنسکرت میں کندہ ہے

श्री श्रः पायात् ॥१ कपूरजाति राजन्य वंशे (वंशे) जातस्य धीमतः ॥
श्रीमद्विजय रामस्य पत्नी कुर्य्या (कुर्य्या) पतिव्रता ॥२॥ धर्मेहि भर्तुर्निधनादनन्त
रम्वित्तं (वित्तं) मदीयम्विनियोजितंतथा ॥ नूत्नालये श्रेष्ठतरे सुखप्रदे कार्यो प्रति
ष्ठा मय काश धूर्जटेः ॥३॥ चिन्तयन्त्यन पत्येत्थं स्वर्गता दैवयोगतः ॥ अवशि
ष्टेन रिक्थेन तस्यास्तु वचनादपि ॥४॥ मुन्याङ्का श्राङ्क गोत्राभिर्म्मिते वैक्रमाब्दे घने
फाल्गुनासित पञ्चम्या (म्यां) गुरुचुर्थे गुरुवासरे (गुरुवासरे) ॥६॥ सं० १९०७ फा० शु० ५ गु०

جس کا مطلب یہ ہے - مقدس شیو محافظ رہے - چونکہ میں وفادار اور باعصمت بیوی شوہر
والش مند وجے رام کی ہوں اور فرقہ کپور چھتریوں میں پیدا ہوئی ہوں - مجھ کو چاہیے کہ میرے
شوہر کی وفات کے بعد اس کی تمام دولت امور مذہبی (یا خیرات) میں خرچ کروں
مزید براں (انتھا) اور (تتھا) یہ بھی چاہیے کہ سیو کا لنگ اس باموقع اور عمدہ نئے مندر
میں بٹھاؤں - جب وہ (عورت) اس خیال میں تھی وہ مرگئی (بہشت کو چلی گئی) - بدقسمتی سے
لاولد مری) - اس کی دولت سے جو باقی رہی اس کے سب سے چھوٹے دانش مند کو
جیٹھو مل نے اس (متوفیہ) کی زبانی ہدایت کے موافق اس نے شیو وجے رام کا لنگ جو
وجے رام کے نام سے موسوم تھا) برہمنوں کے ہاتھوں سے سمت بکرمی ۱۹۰۷ میں
جمعرات کے دن پانچویں سدی فالگن جب کہ چاند کا قران مجمع النجوم سے تھا اور اس پر تو اشتری
دچھتراں براج رہا تھا سمت ۱۹۰۷ فالگن کری ۵ - جمعرات کے دن - مبارک باد

اُن مندروں کی فہرست جن کا ذکر اِس کتاب میں نہیں آیا۔

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
(۱)	اُماہیسور	الی محلہ گلی لیسوا	تخمیناً (۸۰) برس پہلے کا۔ معمولی۔ مندر میں مہادیو پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی۔ نندی اور ہنومت کی مورتیں ہیں۔ بائیں طرف ہنومت کا ایک اور بُت سیندور ملا ہوا ہے۔
(۲)	باباجی رام	چھتہ پرتاب سنگھ گلی پیپل والی	تخمیناً دو سو برس سے اوپر کا۔ دو مندر ملے ہوئے ہیں۔ ایک شیو کا ہے جس میں پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کے بت علاوہ شیو کے لنگ کے ہیں اور دوسرے مندر میں رادھا اور کرشن کے بت ہیں
(۳)	بابو گلاب داس	گلی کدار ناتھ	دور آخر مغلیہ۔ راجہ کدار ناتھ کا بنایا ہوا ہے چنانچہ انھیں کے نام سے یہ گلی مشہور ہو گئی ہے۔ کدار ناتھ کے والد کے متعلق ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے جس سے اُن کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شروع شروع میں قلعے میں پرورش پاتے تھے۔ اس زمانے میں تخت دہلی پر ایک نابالغ شاہزادہ حکمران تھا اور کدار ناتھ کے والد گارڈین اور نایب السلطنت تھے (؟) ان ماموں صاحب نے شاہزادے کو زہر دینے کا ارادہ کیا جس کی خبر کدار ناتھ کے والد کو لگی انھوں نے فوراً شاہزادے کی والدہ کو خبر کی وہ بے چاری ڈر کی ماری شاہزادے کو لے کر آگرے بھاگ گئی شاہزادے نے بجلدواس خیر خواہی کے جس سے اس کی جان بال بال بچ گئی چنے نوش کے بیٹے کو مرزا راجہ کدار ناتھ کا خطاب دیا۔ اس میں رام سیتا لچھمن کی مورتیں ہیں سامنے ایک بت

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
			ہنومان کا اور سیو کا لنگ ہے۔
(۴)	بڑا مندر یا لاڈلی جی کا مندر	نیل کا کٹرہ۔ گلی گھنٹیشور مہادیو	تقریباً سمنت بکرماجیت۔ نول گو سوامی پردیو ناگجی کا بنایا ہوا۔ انھوں ہی نے رادھا اور کشن کی مورتیں بھی رکھیں۔ چونکہ نول گو سوامی لاڈلی جی (رادھا) کی پوجا کے بڑے معتقد تھے اسی وجہ سے یہ مندر لاڈلی جی کا مشہور ہوگیا۔ اس میں دو مورتیں ہیں ایک رادھا کی دوسری کشن کی۔ رادھا کی مورت پیتل کی ہے اور کشن کی سنگ سیاہ کی۔ داہنی طرف ایک چھوٹے سے مندر میں تلسی کی نقرئی مورت ہے۔
(۵)	بھیرو جی	کوچہ گھاسی رام	دور آخر مغلیہ۔ ایک پتھر سیندور ملا ہوا باہر ہی سے نظر آتا ہے جو بھیرو کہلاتا ہے۔ مندر کے اندر مہادیو۔ پاربتی۔ کی مورتیں سنگ مرمر کی ہیں جو بیل پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ قدیم مندر چھوٹا سا تھا۔ نیا مندر گھڑے ہوئے پتھروں کا سمت ۱۵۶۹ میں بنا ہے۔ مندر سے ملا ہوا دو منزلہ کوٹھڑی پوجاری کے رہنے کی ہے۔
(۶)	بھیرو	نیا بانس	تخمیناً سو سال کا۔ معمولی۔ ایک پتھر پر سیندور لگا ہوا جو بھیرو کہلاتا ہے۔
(۷)	توپ خانے والا	دھرم پورہ	دور آخری مغلیہ۔ اسی کو سری گوسائیں کا مندر بھی کہتے ہیں۔ دروازے پر بخط دیوناگری "سری کشوری مندر" کندہ ہے نیچے مندر ہے اوپر رہنے کا مکان ہے۔
(۸)	جھجھر والا	چھیپی واڑہ کلاں	دور آخری مغلیہ۔ دو چھوٹے چھوٹے مندر ملے ہوئے ہیں۔ (۱) رادھا کشن کا۔ (۲) شیو کا۔ پہلے میں رادھا کشن کی مورتیں ہیں اور دوسرے میں پاربتی۔

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
(۹)	جھجھر والا	چاندنی چوک	گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی۔ سیدھے طرف کے دو طاقوں میں گنگا اور ہنومان کی مورتیں ہیں۔ سوا سو برس کا۔ بانی ہرویجی۔ چونکہ یہ جھجھر کے رہنے والا تھا اس واسطے یہی نام پڑ گیا۔ قابض حال ہرویجی اُن کی چھٹی پشت میں ہے۔ ایک مندر میں توراوا کی سنگ مرمر کی مورت ہے اور کرشن کی سنگ سیاہ کی اور دوسرے مندر میں جو خوالہ پشیکا [illegible] پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں اور طاق میں ہنومان کا بت ہے۔
(۱۰)	جوہری والا	مالی واڑہ	تخمیناً دو سو سال کا۔ داہنی طرف بھیرو کا بت ہے بیچ میں سنبھو (تیرتھن کر سوم) ہماری داہنی طرف اور سنبھو کی بائیں جانب نیمی ناتھ بائیسویں تیرتھن کر کی مورت ہے اُس کی بائیں جانب اور ہماری سیدھی طرف ویمل ناتھ تیرھویں تیرتھن کر کی مورت ہے۔ ہماری بائیں جانب اور سنبھو کی داہنی طرف نمی ناتھ اکیسویں تیرتھن کر کی مورت ہے جس کے سیدھے طرف اور ہمارے بائیں طرف پارسناتھ تیئسویں تیرتھن کر کی مورت ہے۔ مندر اوپر کی منزل پر ہے۔ ۱۵ گز لمبا اور ۲۵ گز چوڑا ہے اور کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں کے زمانے کا جینیوں کا بنایا ہوا ہے لیکن اب کوئی پچاس برس ہوئے کہ دوبارہ بنا ہے۔ مندر کے اندرونی تمام حصے پر سنہری کام کیا ہوا ہے۔ چالیس برس ہوئے کہ یہ ساری آراستگی ہوئی ہے۔
(۱۱)	جوہری والا	چیل پوری	تقریباً سو برس پہلے کا۔ بیچ والی مورت سومتی کی ہے جو پانچویں تیرتھن کر ہے ادھر ادھر کی دو دو مورتیں پتھر آدی ناتھ کی ہیں۔ ہمارے داہنے اور بائیں ہاتھ کو چیت ناتھ کی مورتیں ہیں جو دوسرا تیرتھن کر ہے۔ ہمارے

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
(۱۲)	جوہری	چیرہ خانہ	بائیں طرف اور آدی ناتھ کے داہنے نیمی کی مورت ہے جو بائیسواں ترتھن کر ہے۔ بہاری داہنی طرف کے طاق میں بھیروں کا بُت ہے۔ اس مندر کے ستون اور فرش سنگ مرمر کا ہے اور اندر سنہرا کام ہے۔ دور آخر مغلیہ۔ اس مندر میں بیس پچیس مورتیں ہیں۔ ان میں سے بڑی مورت بھیروں کی ہے جو سیندور میں رنگی ہوئی ہے اُس کے سامنے پارس ناتھ کا بت ہے جو تیئسواں ترتھن کر ہے۔ داہنی طرف سری پاسا گیارھویں ترتھن کر اور بائیں طرف رشابھا پہلے ترتھن کر کے بت ہیں۔ مندر ۱۸ فٹ × ۱۰ فٹ ہے جو جینیوں کے فرقہ سیوتمبرا کا ہے۔ یہ لوگ اپنے بتوں کو سفید کپڑے پہنا کر بنا سنوار کے رکھتے ہیں
(۱۳)	جوتی پرشاد	فتح پوری بازار گلی لوہاریاں	کوئی دو سو برس پہلے کا۔ جوتی پرشاد نے تقریباً پندرہ سال کے اول مرمت کرائی تھی۔ اس میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں۔
(۱۴)	بھیا مصر	نیل کا کٹرہ۔ بوبھائی کی گلی	سمبت ۱۹۰۴ (۱۸۴۷ء) اس مندر کے دروازے پر بخط ناگری دس سطروں کا یہ کتبہ ہے:-

(۱) سری گنیش نام اونکارا یہ پرم۔ (۲) سروسوتی مستا بھوُ من مندر آتا۔
(۳) سندر رچے سیٹھ گستری بات سدا ہیئے۔ (۴) وسا وسا وسو شکمی رہو مہاراج
(۵) دھن سپتا سے رہے بھرے جگد مبا را۔ (۶) سکھے لاج سرکش بھالا درس رم
(۷) سے جو پوجے جیت لگایا چورسی کی۔ (۸) پھندا سوت چت ا ای جی دلایا۔
(۹) سموت ۱۹۰۴ تھاپڑ گھٹ بھاٹ جگدیو۔ (۱۰) متوز کیوٹ و بساکی واجپار سکھے ابا۔

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
			مطلب تعریف ہے نامہ گنش کی۔ بڑی فیاض سرد چوہرتی کی لڑکی ذات کی چھتری ہے نے اس بہت خوب صورت اور مبارک مندر کو بنایا۔ ہمیشہ دیوتی کا بھروسہ رکھو۔ مہاراج تم اور تمہاری اولاد ساتھ خوشی اور دولت کے زندہ رہے۔ جگدمبا رکالی۔ معنوی معنے دنیا کی ماں، تمہاری عزت قایم رکھے وہ جو دیوتی کی پرستش ولی عقیدت سے کرتا ہے وہ اُس کا پھل پائے گا اور آخری نجات جو سامی جون (پیدایش کے) ایک لمحے میں ختم ہو جائیں گی۔ (جب مندر بنا) سمت بکرم ۱۹۰۴ تھا۔ امبا (دیوی) ساکھ نغطی ترجمہ (شرم سے بچا سے) قایم رکھے مشہور بھلت جگدیو برہمن کی بٹیا سیو راے کا۔ اول تو کتبے پر سفیدی پھیر دی ہے دوسرے حروف بھی اچھی طرح کھدے ہوئے نہیں ہیں۔ عبارت بھی قاعدے کی رو سے غلط ہے لیکن چوں کہ نظم اور دوہا ہے اس لیئے قرینے سے پڑھی گئی ہے۔ سرو مہرانی نے یہ مندر بنایا ہے بجاے اس کا بھانجا تھا۔ یہ مندر کالی دیوی کا ہے جس کی مورت سنگ سیاہ کی ہے۔ طاق میں ایک اور مورت سنگ سیاہ کی ہے۔
(۱۵)	جینیوں کا مندر	دہلی دروازہ	دور آخر مغلیہ۔ لالہ الیسری پرشاد خزانچی کا۔ اس میں سب سے پرانی مورت سمت ۱۸۳۰ کی ہے۔ باقی مورتوں پر بائیں طرف سمت ایک پر ۱۹۲۰ اور دو پر ۱۹۳۵ کندہ ہے۔ اور داہنی طرف کی دو مورتوں پر ۱۹۳۰ اور ایک پر ۱۹۳۵ کندہ ہے۔ باقی اور تین مورتوں پر سمت ۱۹۶۷ فاگن سُکلا ۳ کھدا ہوا ہے۔ مندر میں ترتھنکروں کی چوبیس مورتیں ہیں۔ سنگ سیاہ کی نیمی ناتھ کی ہیں۔ بائیں طرف بیچ والی آدی ناتھ کی مورت ہے اس کے بائیں نیمی ناتھ اور داہنی طرف سپ ترشی کی۔ مندر میں بہت ساری

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
			کے بیل بوٹے ہیں اور چھت رنگین ہے۔ کہا جاتا ہے قلعے کے پاس جب جینیوں کا مندر بنا تو جین مت والوں میں کچھ جھگڑا پڑ گیا اور دو فرقے ہو گئے ایک نے تو وہی قدیم مندر قلعے کے پاس والا سنبھالا اور دوسرے فرقے نے اپنا مندر الگ بنا لیا۔
(۱۶)	جینیوں کا مندر	کھجور کی مسجد	۷۶ برس پہلے کا۔ ایک شخص آیا مل نامی نے جو محمد شاہ بادشاہ کی کسریٹ میں ملازم تھا وہ جب معتوب ہوا تو اس ڈر سے کہ کہیں گھر نہ ضبط ہو جائے اس نے اپنے سارے گھر کو ایک مورت بٹھلا کر مندر مشہور کر دیا۔
(۱۷)	ایضاً	براداریہ سیٹھ کا کوچہ	یہ جینیوں کے دیگامبر فرقے کا تیسرا مندر دلی میں ہے ۱۸۳۳ء سنتی ناتھ کی مورت کے چبوترے پر سمت ۱۹۲۳ اور آدی ناتھ کا سمت ۱۹۲۹ دیس سُو ۳ کندہ ہے۔ اس مندر کے دروازوں پر پیتل چڑھا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر چھ برس میں ہوئی۔ مندر کے اندر چبوترے پر آدی ناتھ کی مورت ہے ہمارے بائیں ہاتھ کو دو مورتیں چندرا پربھو کی ہیں۔ مندر کے تین طرف دالان ہیں۔ مندر اور دالانوں کے ستون سنگِ مرمر کے ہیں۔ ہماری سیدھی طرف کے طاق میں پچیکاری کا کام ہے۔
(۱۸)	ایضاً	ایضاً۔ ایضاً	۱۸۳۱ء۔ چندرا پربھو کی سنگِ مرمر کی ایک مورت پر سمت ۱۹۳۵ ماسو۔ دوسرے پر سمت ۱۵۴۹ ورش دیساکھ سُدی ۵۔ تیسری پر ۱۸۹۳ پھاگن سُد گیارہ۔ کندہ ہے۔ اس میں تین مورتیں

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
(۱۹)	چرنداسی	بلی ماراں گلی داساں	چندرا پربھو کی ہیں دو سنگ مرمر کی ایک برنجی بت چاندی کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ اندراجی صراف نے ایک دزاتی (کابلی) سے اپنی جائداد مال اسباب فروخت کرکے پانسو روپے کو لی اور یہی سب سے بڑی مورت ہے جس پر سمت ۱۴۱۵ اکندہ ہے تخمیناً ڈہائی سو برس اول کا۔ اس میں رادہا اور کشن کی مورتیں ہیں۔ یہ مندر چرنداسی فرقے کا ہے جن کا موجد چرن داس تھا جو دراصل بھارگو ذات کا تھا۔ چرنداسیوں نے ذات کی تفریق کو بالکل اٹھا دیا ہے اور انتیاجیوں کے سوا سب اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ بشنی سادھو ہیں۔ وید کو مانتے ہیں۔ یہ کسی دوسرے فرقے کو برا نہیں کہتے۔ چرنداس نادرشاہ سے ملا تھا نادرشاہ نے اُسے قید کردیا۔ اس فرقے کے لوگ اپنے مرشد کے کمالات بہت کچھ اور بڑے وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ گوکہ نادرشاہ نے چرنداس کے بیڑیاں ڈلوادی تھیں مگر وہ اپنی کرامت سے دو بجے رات کے بیڑیوں سمیت جیل خانے سے نکل نادرشاہ کے خواب میں اس طرح جا پہنچے کہ کسی کو خبر بھی ہوئی نادرشاہ متحیر ہوا اور ان کی کرامت دیکھ کر معاف کردیا اور نہایت مہربانی سے پیش آسنے لگا۔ محمد شاہ بھی چرن داس کی تعظیم کرتا تھا اور شاہ عالم ثانی نے چار مواضع مشاہد پور ضلع گڑگانوہ میں۔ گاؤدی ضلع میرٹھ میں۔ ناگلا ضلع بلند شہر میں۔ گنگوتنا ریاست پٹیالے میں۔ اس فرقے کو جاگیر دیئے تھے جو اب تک بحال و برقرار ہیں (؟)۔ چرنداسی شادی نہیں کرتے۔ چیلوں کو متبنیٰ کرلیتے ہیں۔ چرن داس نے سمت ۱۸۳۰ / ۱۷۷۳ء میں سوا سو سال کی عمر میں انتقال کیا۔
(۲۰)	جچدہاری	محلہ بدلیاں	دورآخر مغلیہ۔ اس میں دو لنگ ہیں اور پاربتی گنیش۔ برہم دیو نندی کی مورتیں ہیں۔

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
(۲۱)	چھوٹا مندر بھانو کمار جی کا مندر	نیل کا کٹڑہ	تقریباً بکرم سمت ۱۸۰۰ اس میں دو مورتیں ہیں ایک رادہا کی ایک کرشنا کی۔ یہ مورتیں پیچ رسی ہیں۔ کرشنا کی مورت رادہا کی مورت سے زیادہ کالی ہے۔ یہ مندر راجہ مرلی دھر گوسوامی کا بنایا ہوا ہے۔ مندر ۲۱۔ ۳ + ۱۲۔ ۳ ہے۔ بھانو کمار جی جن کے نام سے یہ مندر مشہور ہے راجہ مرلی دھر کے بیٹے تھے۔ یہ مندر در اصل کسی بڑے آدمی کا مکان معلوم دیتا ہے۔ ایک چھوٹے سے دروازے کے آگے صحن ہے۔ آدھے صحن میں چبوترا ہے۔ مندر لاکر تین پیچ در سے دالان ہیں ایک کے پیچھے ایک۔ فرش سنگ سیاہ اور سنگِ مرمر کا ہے۔ دالانوں میں آئینہ بندی کا کام ہے۔
(۲۲)	حکیم اجیت سنگھ اور جیون سنگھ کا مندر	مالی واڑہ۔ چھتہ من گوپال	تقریباً سو برس اوّل کا حکیم اجیت سنگھ کی لڑکی تھانی کا بنایا ہوا ہے۔ مندر ۹ گز ۹ + ۲۱ گز ۹ ہے۔ جیون سنگھ حکیم جی کا داماد تھا۔ پچھوا قابض حال جو تھی پشت میں ہے۔ عمارت کے دو حصے ہیں۔ ہمارے سامنے وار رادہا اور کشن کا مندر ہے اور داہنی طرف شوالا ہے جس میں پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں۔
(۲۳)	دیوان سنگھ	اجرٹن روڈ نئی سڑک کے آگے گلی کشتمن لال	یہ مندر دیوان الہو والیہ کا بنوایا ہوا ہے اس میں رادہا کشن۔ ہنومان کی مورتیں ہیں اور ایک شوالا بھی ہے جس میں پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی۔ نندی اور بھیرو کی مورتیں ہیں

کیفیت	محلہ	نام مندر	نشان سلسلہ
کوئی سو برس اول کا۔ راجہ بجے سنگھ راسے کا بنایا ہوا جو اکبر شاہ ثانی کے عہد میں وزیر تھے۔ اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا مندر کشن کا بھی ہے۔ جس میں رادھا کشن کی مورتیں ہیں۔ شوالا بھی ہے جس میں پاربتی گنیش۔ برہمہ دیو اور ہنومان کی مورتیں ہیں۔	پیپل پہاڑی	راجہ جی	(۲۴)
تخمیناً دو سو برس کا ہے کہتے ہیں کوئی ایک سادھو تھا جو ہر وقت رام رام کہتا تھا اور اسی مندر میں رہتا تھا اس سے یہ نام پڑا۔ دوسری روایت وجہ تسمیہ کے متعلق یہ ہے چند مارواڑیوں نے مل کر یہ مندر بنایا تھا اور کسی ایک شخص کے نام وہ موسوم نہیں کیا جا سکتا تھا اس وجہ سے رام کا مندر نام رکھا گیا کہ رام ہی کی مورت اس میں ہے۔ لیکن پہلی روایت ہی زیادہ قرین قیاس ہے کیوں کہ رام کا مندر نہیں کہلاتا بلکہ رام رام کا مندر۔ اس میں تین مورتیں ہیں۔ رام کی مورت سنگِ سیاہ کی بیچ میں ہے اور داہنی طرف لکشمن اور بائیں طرف سیتا۔ لکشمن اور سیتا کی مورتیں سنگ مرمر کی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا مندر ہنومان کا بھی ہے۔	مادھو داس کا باغیچہ	رام رام	(۲۵)
ڈیڑھ سو برس اول کا۔ سیڑھیوں کے اوپر ناگری میں یہ کتبہ پانچ سطروں کا ہے:- (۱) سری سیتل پوری دربار پرانا اس کے۔ (۲) مالک پانچ پنچ ہیں براہمن اور۔ (۳) بنا ہمی یوک گرک چھرنے۔ (۴) نیا بنوا دیا پنچایتی ہنیو۔ (۵) کی نے سمت ۱۹۴۰	چھتہ پرتاب سنگھ یا گلی پیپل والی	سیتل پوری	(۲۶)

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
			مندر کا بالائی حصہ تیرہ فیٹ مربع ہے۔ نیچے پوجاری کے رہنے کی کوٹھڑی ہے جو پنچایت کی منڈلی کے کام بھی آتی ہے۔
(۲۷)	شادی رام	چاوڑی بازار کوچۂ دیا رام۔	دور آخر مغلیہ۔ بانی شادی رام۔ بائیں طرف ٹھاکر جی یعنی کشن کا مندر ہے جس میں حسب معمول رادھا اور کشن کی مورتیں ہیں۔ سیدھی طرف ایک چھوٹا سا مندر ہنومان کا ہے۔ اس مندر میں ایک شوالا بھی ہے جس میں پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں۔ احاطے کے اندر ایک دھرم سالہ بھی ہے جس میں خاص دنوں میں کثرت سے برہمنوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔
(۲۸)	صاحب سنگھ	چھیپی واڑا کلاں	دورِ آخر مغلیہ۔ قابض حال اندر نراین۔ جن کے والد رائے بہادر صاحب سنگھ نے تخمیناً ۴۲ برس ہوئے کہ اس مندر کی مرمت کرائی تھی۔ مندر ۲۹ فٹ - ۲ انچ × ۲۷ فٹ - ۲ انچ ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے مندر ہیں پہلے میں رادھا اور کشن۔ پاربتی۔ گنپتی۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی مورتیں ہیں اور دوسرے میں شیو کی مورت ہے اور طاق میں ہنومان ہے۔
(۲۹)	قنوجی رائے	الی محلہ۔ کوچۂ پاتی رام	تخمیناً کوئی ڈھائی سو برس اوّل کا۔ قنوجی رائے کا بنایا ہوا جس کی مرمت سمت ۱۹۰۱ مطابق سنہ ۱۸۴۴ء میں ہوئی۔ کنوئیں میں کتبہ خط نسخ کا ہے جسے محکمۂ آثار قدیمہ کے ماہر فن بھی اب تک نہیں پڑھ سکے ممکن ہے کہ اس سے کچھ اور زیادہ پتہ چلتا۔ اس کے

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
			پاس جو کنواں ہے وہ نیماروں کا کنواں کہلاتا ہے۔ اس مندر میں رام سیتا اور لکشمن کی مورتیں ہیں ان کے سامنے ایک لنگ ہے اور پاربتی۔ گنیتی کرتیکا سوامی اور گنپتی کی مورتیں ہیں۔ داہنی طرف ہنومان اور بائیں طرف بھیروں کے بت ہیں۔
(۳۰)	کالیسو ناتھ	بازار سیتارام	سوا سو سے ڈیڑھ سو برس اول دورِ آخر مغلیہ کا گو یہ ایک چھوٹا سا مندر ہے لیکن لوگ بہت کثرت سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ کالیسور ناتھ بھی شیوجی کا ایک نام ہے۔ لوگوں کی منت مرادیں بہت آتی ہیں۔ ایک سو چار تو گھنٹے لگے ہوئے ہیں۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ یہاں آکر منت ماننے سے بانجھ عورتوں کے بچہ ہو جاتا ہے۔ اس میں پاربتی۔ گنیتی۔ برھم دیو۔ کرتیکا سوامی اور نندی کی برنجی مورتیں ہیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف طاق میں بھیرو اور بائیں طرف ہنومان کے بت ہیں۔
(۳۱)	کیسرن	الی محلہ چوک شاہ مبارک	دورِ آخر مغلیہ۔ اس پر زمانہ حال کا کتبہ شش سطری ناگری میں دروازے پر یہ لگا ہوا ہے:۔ (۱) سری۔ (۲) مندر۔ (۳) سوامی دین دیال جی مہاراجہ کا۔ (۴) پنچایتی کسیروں کا بنا۔ (۵) سمت (۶) ۱۹۶۰ سمت۔ یہ مندر سوامی دین دیال کے نام پر بنا ہے۔ اس میں کوئی بت نہیں۔ اس میں ہر اتوار اور پیر کو چراغ جلا کر پوجا کی جاتی ہے۔ اس مندر کی مرمت سمت ۱۹۶۳ میں ہوئی تھی

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
(۳۱	کشمیریاں	بازار سیتارام کوچہ شریف بیگ	دورِ آخر مغلیہ - مندر میں پاروتی - کرتیکا سوامی - نندی - رام - سیتا اور لچھمن کی مورتیں اور شیو کا لنگ ہی
(۳	گجراتی	دریبۂ کلاں لٹو شاہ کا کوچہ	سنہ ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹-۶۰ء - اس میں شیو کا لنگ - پاربتی اور نندی کی مورتیں ہیں - طاق میں ایک دوسری مورت گنپتی کی ہی - قبالے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ مندر بنانے کے لیئے زمین سنہ ۱۱۷۳ھ میں خرید کر ایک چھوٹا سا مندر مٹھن لال نگر نے بنوا دیا ہی -
(۳	گلاب رائے مہر چند	چاندنی چوک کوچۂ سکھانند	مغلیہ زمانے کا - لالہ ایشری پرشاد سرکاری خزانچی - یہ مندر دو منزلہ لالہ گلاب راے کا بنایا ہوا ہی - اوپر مندر ہی نیچے انھیں کے لوگ رہتے ہیں - لالہ گلاب راے کے باپ سہارن سنگھ تھے جنھوں نے سہارن پور بسایا تھا اور جن کو اکبر بادشاہ نے ایک جاگیر بھی دی تھی - اس خاندان کے سب سے پہلے شخص گلاب راے آے اور یہاں آکر ایک مہاجنی کوٹھی کھولی - گلاب راے کی زندگی تک کاروبار ... چلا بعد اس کے بیٹے نے دکان کا نام گلاب راے مہر چند رکھا چنانچہ یہ قدیم ... ن اب بھی موجود ہی - چھٹی پشت میں سالگ رام نے بادشاہی نوکری چھوڑ دی سنہ ۱۸۲۵ء میں گورمنٹ نے ان کو اپنا خزانچی مقرر کیا - انھوں نے غدر میں ... منٹ کی بڑی خیر خواہی کی - اس مندر میں بشمول چندر پربھو آٹھویں ترتھن کر پارسناتھ ... یں ترتھنکر اور مہاویرا چوبیسویں ترتھن کر کے کوئی تیس مورتیں ہیں -
(۱	گنڈو	نیا بانس - کوچۂ سنجو گی رام	کوئی تراسی برس پہلے کا - دورِ آخر مغلیہ - اوپر مندر ہی نیچے چار دکانیں ہیں - تیرہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہیں گنڈو کسی ہندوانی

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
			مورت کا بنایا ہوا ہے - مندر میں رادھا کا بت سنگ سیاہ کا ہے اور کشن کا سنگ مرمر کا - اسی احاطے میں شوالہ بھی ہے جس میں پاربتی - گنیش - برہما اور نندی کی مورتیں ہیں - سیدھے ہاتھ کی طرف کے طاق میں بھیرو اور ہنومان سیندور میں پٹے ہوئے ہیں بائیں طرف کے طاق میں دُرگا کی مورت ہے -
(٣٦)	مادھوداس	باغیچہ مادھوداس	یہ مندر ساڑھے تین سو برس پیشتر کا کہا جاتا ہے - اس مندر میں چرن پڑ کے نقش قدم ہیں جن پر بخط ناگری یہ کتبہ ہے :- (۱) یہ چرن پڑ کا سری مہنت ، الگھو داس جی کے ہے - (۲) سموت ۵ ۴ ۹ ۱ ساون ودی ۳۰ مادس منگل وار - یہاں بالا دیو داس کا چرن پڑ کا بھی ہے جس پر یہ کتبہ ناگری میں ہے :- جیٹھ متی ۳ ۵ ۹ ۱ سموت سری [illegible] منڈپ میں ایک تختی پر یہ کتبہ ناگری اردو انگریزی میں ہے :- مادھو داس کی باغیچی - (۲) پرم رمی سندر یہ دھرتی - (۳) نہیا امت جاسے ہیں برنی - سمبت ۱۹۳۳

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
			ترجمہ ادھوداس کی باغیچی - یہ زمین بہت پیاری اور اچھی ہے جس کی عظمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا (یعنی اس کا جواب نہیں ہے) اور حیطۂ بیان سے خارج ہے۔ ایک سفید سنگ مرمر کی تختی پر ناگری میں یہ کندہ ہے:- (۱) داس نند رام پتھر والا دلی (۲) سمبت ۱۹۲۹- اور ایک تختی پر ست نراین کے مندر پر ایک کتبہ حال کے مہنت نے لگایا ہے جس میں کوئی تاریخی دلچسپی نہیں لہذا نقل نہیں کیا گیا - یہ مندر ادھوداس کا ہے جو بشنی ساد ھو تھے - کہا جاتا ہے کہ اکبر شاہ ایک مرتبہ ادھوداس کے پاس آیا اور دیکھا کہ بہت سی چکیاں خودبخود چل رہی ہیں - بادشاہ یہ کرامت دیکھ کر متحیر ہوا اور چاہا کہ کچھ دے لیکن سادھو نے کہا کہ مجھے بس آپ کی مہربانی کافی ہے - ہندوستان میں ہر سادھو سے کچھ نہ کچھ کرامت منسوب کر دی جاتی ہے یہ بھی اُسی قبیل کی ہے - اس مندر کے صحن میں اور کئی مندر ہیں - (۱) رام کا ہے جس میں رام کی مورت بیچ میں ہے - لچھمن کی سیدھی طرف اور سیتا کی بائیں طرف - رام کی مورت سنگ سیاہ کی ہے باقی دونوں سنگ مرمر کی - (۲) رام کے مندر کے سامنے رامیسور مہادیو کا مندر ہے جس میں پاربتی گنیتی اور نندی کی مورتوں کے علاوہ سیو کا لنگ بھی ہے - (۳) مہنت مادھوداس کی گدی ہے جس میں دیوجی یعنی بالا رام کا مندر بھی ہے - اس میں بالا رام اور ریوتی کی مورتیں ہیں - ریوتی کی مورت قابل دید اور ایسی خوب صورت ہے کہ دلی میں اور کوئی مورت اس کے مقابلے کی نہیں ہے - (۴) جمنا جی کا مندر - (۵) ست نراین کا مندر جس میں سنگ مرمر کا عمدہ تراشا ہوا بت ہے اور اسی پر زمانۂ حال کا وہ کتبہ ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے (۶) گنگا کا مندر جس میں سنگ مرمر کی مورت ہے - (۷) رادھا اور کشن کا مندر جس میں سنگ سیاہ کی مورتیں ہیں - (۸) لکشمی اور نراین کا مندر - اس میں کی دونوں مورتیں سنگ مرمر کی ہیں - (۹) ہری ناتھ کا مندر - اس کے علاوہ ایک بت کدار ناتھ کا ہے - تین گنیتی کے اور ایک پاربتی کا -

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
(۳۷)	نانک چند کھتری	کوچۂ گھاسی رام	تخمیناً (۶۳) برس اول کا۔ لالہ لچھمن داس نے چند سال ہوئے کہ درست کرایا ہے۔ اس میں شیو کا لنگ۔ پاربتی۔ گنپتی۔ برمھ دیو اور نندی کے بت ہیں
۳۸	موہن لال گوسائیں	چاندنی چوک کوچۂ سکھانند	تخمیناً (۳۹) برس اول کا۔ اس میں رادھا اور کشن کی مورتیں ہیں اول الذکر سنگ مرمر کی ہے اور ثانی الذکر سنگ سیاہ کی۔ موہن لال بانی مشہور کوتیا اور شاعر تھا۔ قابض حال شیو شنکر اس کی چوتھی پشت میں ہے۔
(۳۹)	نارائن داس	ڈفرن برج کے پاس	تخمیناً (۳۷) سال اول کا۔ قابض حال لالہ رام ناتھ کے دادا نارائن داس کا بنایا ہوا ہے۔ بائیں طرف ہنومان کا مندر ہے۔ جس کی بائیں جانب گنیش کا بت اور رادھا اور کشن کی برنجی مورتیں ہیں۔ نیچے طاق میں ایک طرف گنیش کی مورت اور شیو کا لنگ ہے اسی کے پاس چھوٹی چھوٹی مورتیں پاربتی۔ گنیش اور نندی کی ہیں مندر کے سامنے ایک شوالا بھی ہے جس میں دھرم سالہ ہے۔ اس لنگ کا نام نرمادیوز ہے
(۴۰)	نوا	چیل پوری	سمبت ۱۸۶۴ / ۱۸۰۷ء لالہ ہرسکھ رائے نے پانچ لاکھ کے صرف سے سات برس میں بنوایا ہے۔ ممکن ہے کہ مندر کی لاگت میں تھوڑا بہت کچھ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ بہت روپیہ لگا ہے لالہ ہرسکھ رائے راجہ صاحب بھرت پور کے کونسلر تھے۔ چبوترے کے بیچ میں آدی ناتھ پہلے ترتھن کر کی مورت ہے۔ اس کے پیچھے دوا پا

نشان سلسلہ	نام مندر	محلہ	کیفیت
			(دربان) ہیں۔ داہنے اور بائیں ایک ایک طاق ہی اُس میں بہت سی مورتیں ہیں۔ بائیں طرف ایک چھوٹے سے مندر میں تین سو مورتیں ہیں۔ مندر جینیوں کا بہت عمدہ بنا ہوا ہی۔ اُس کے سامنے کی ڈیوڑھی اور تینوں دالان جس کے ستون سنگِ مرمر کے ہیں بلحاظ کاریگری کے دیکھنے کے قابل ہیں۔ سنگ مرمر کا کام اور چھوٹے چھوٹے ستونوں پر جو پھولوں کے ہار لپیٹے ہیں بڑی محنت اور نفاست کا کام ہی۔ تیرہ سیڑھیاں چڑھ کر پہنچتے ہیں۔ صدر دروازہ جس میں سے مندر میں جاتے ہیں برنجی ہی۔ یہ مندر جینیوں کے دیگامبر فرقے کا ہی
(۱۴)	ہنومان جی	پیپل مہادیو	دورِ آخر مغلیہ۔ مختصر۔ حال درست ہوا ہی۔ اس میں ہنومان کی مورت سیو کا لنگ اور ایک بیل ہی۔

فہرست۔ وہ مندر جن کا کوئی خاص نام نہیں ہی

نشان سلسلہ	محلہ	کیفیت
(۱)	گلی مرغان	بالکل ابتر حالت میں گرا پڑا کھنڈر۔
(۲)	اسی محلہ کوچہ ہر سُکھ رائے	مختصر۔ قابلِ حال بشمبھر ناتھ کے دادا سرن لال کا بنایا ہوا ہی۔
(۳)	چاندنی چوک کوچہ سکھانند	تخمیناً سوا سو برس اول کا۔ اس میں چاندپربھو اور پارسناتھ کی مورتیں ہیں۔ جینیوں کے دیگامبر فرقے کے ایک شخص صاحب سنگھ کا بنایا ہوا ہی۔ اس فرقے کی مورتوں کی ایک خصوصیت یہ ہی کہ وہ بالکل برہنہ ہوتی ہیں۔
(۴)	مالی واڑہ۔ بید واڑہ	تخمیناً پونے دو سو برس اول کا۔ بالا خانے پر جینیوں یعنی سراوگیوں کا ایک عمدہ ساخت کا مندر ہی بیچ میں چندرپربھو کا بُت ہی اور اُس سے ذرا اوپر مہابیر کا۔ اس کی بائیں طرف بہوبل کی بت ہی اور چھوٹی چھوٹی دو یا ڈھائی سو مورتیں اور ہیں۔ یہ مندر پنچایتی ہی۔

عجائب خانہ آثار قدیمہ واقع ممتاز محل اندرون قلعہ

دلّی میں چالیس برس تک میونسپل کی طرف سے ٹون ہال میں عجایب خانہ رہا۔ کہتے ہیں کہ ۱۸۶۵ء میں مسٹر ایف۔ ایچ۔ کوپر ڈپٹی کمشنر وقت نے اس کی بناڈالی تھی۔ شروع شروع تو مقامی عہدہ داروں نے بڑی توجہ کی۔ وافر چندے جمع ہوئے اور سامان بھی مختلف اقسام کا جمع کیا گیا لیکن شروع ہی سے اس کی کل بگڑی ہوئی تھی۔ کچھ چیزیں تو عجائبات سے جمع کی گئیں اور کچھ فضول بھرتی کی تھیں۔ نہ کوئی باقاعدہ کیوریٹیر تھا نہ کافی سرمایہ۔ چنانچہ ۱۸۸۶ء کے کیٹالاگ (فہرست) کے دیکھنے سے اس اندھیر کھاتے کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ بودھ زمانے کے نفیس تراش کے بتوں کے پہلو بہ پہلو جے پور کے زمانۂ حال کی ساخت کی شوخ رنگ کی مورتیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہیں جانوروں کی بھُس بھری ہوئی بھدی کھالیں۔ ملکی ساخت کی نادر اشیاء کے ساتھ مٹی کے کھلونے جو عجائب خانے سے زیادہ بچوں کے گھروندوں سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے سجائے گئے تھے۔ غرض ایک عجب طوفان بے تمیزی برپا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں ایک ماہر علوم طبعی کے سیاح نے لارڈ کرزن کو عجائب گھر کی غیر منتظم اور گڈ بڈ حالت کی طرف توجہ دلائی کہ وہاں کی تنظیم بالکل بے سر پیر کی تھی۔ لاٹ صاحب نے اس معاملہ کو محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرد کیا اور کچھ ہدایات بھی دیں۔ بہرحال عجائب خانے کو حشو وزوائد اور غیر ضروری اشیاء سے پاک کیا گیا۔ بالآخر ڈاکٹر وگل کی رپورٹ بابت ۱۹۰۱ء سے یہ قرار پایا کہ قلعے کے نوبت خانے (نقار خانے) میں ایک تاریخی عجایب خانہ قایم کیا جائے جس میں قلعۂ معلّی کے متعلق زمانۂ قدیم کے تاریخی نوادر جمع کئے جائیں لیکن اس وقت حکام مقامی نے اس کی مخالفت کی۔ ۱۹۰۲ء میں سرجان مارشل محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر ہوئے اور اُنھوں نے پھر اس بات پر زور دیا۔ لارڈ کرزن نے سرجان کی تحریک سے اتفاق فرمایا لیکن پھر بھی اس کارروائی نے ۱۹۰۷ء تک کوئی عملی صورت اختیار نہ کی کیونکہ اُس وقت تک نوبت خانہ فوجی عہدہ داروں کے مصرف میں تھا اور یہاں نے عجائب گھر کو توڑ کر ایک نئی عمارت کی تلاش تھی۔

خدا خدا کر کے سنہ ۱۹۰۷ء میں پرانے عجائب گھر کو جو دلی جیسے شہر پر ایک بدنما داغ تھا بند کیا گیا۔ بہت سی چیزیں بعد زمانے کے بتوں کے مجموعے لاہور کے عجائب خانے کو دے دی گئیں۔ اندور کھیڑا ضلع بلند شہر کے بہت سے پتھر کے تراشیدہ ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے لکھنؤ کے عجائب خانے میں بھیج دیئے گئے اور تین گھڑے ہوئے بت جینیوں کے زمانے کے جو غالباً متھرا سے لائے گئے تھے اب بھی میونسپل میوزیم میں رکھے ہیں۔ جنوری سنہ ۱۹۰۹ء سے آثار قدیمہ کا عجائب خانہ نوبت خانے میں کھولا گیا اور بہت سی نوادر اشیاء جمع کی گئیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے اشیائے نادرہ اور قدیم خریدنے کے لیئے نہایت کشادہ دلی سے سرمایۂ وافر سے امداد دی گئی اور سالانہ پانسو روپیہ سے گرانٹ کی رقم بڑھا کر ہزار روپیہ کر دی گئی۔ اب چوں کہ دلی دارالسلطنت ہو گیا ہے امید کی جاتی ہے کہ عجائب خانہ ہر اعتبار سے بہت کچھ ترقی کرے گا۔ ابھی اس امر کا تصفیہ نہیں ہوا ہے کہ میوزیم کی مستقل عمارت علیحدہ بنے گی یا ممتاز محل ہی میں رہے گا یا کہیں اور جائے گا۔ بالفعل موجودہ عمارت میں زمانے کی وہ نوادر اشیاء سجائی جائیں گی جن کو قلعۂ شاہجہانی سے خاص تعلق ہو جہاں لوگ قلعہ۔ محلات شاہی اور باغات کو دیکھ کر محظوظ ہوں تو خیر اتنا تو ہو کہ وہ عجائب خانے میں قدیم زمانے کی ان عجیب و غریب خوب صورت اشیاء کو دیکھ کر اور زیادہ لطف اٹھائیں۔ تاریخ ہند اور آثار قدیمہ کے دل دادوں کے لیئے اس قسم کا عجائب خانہ گو وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو لیکن جب کہ وہ عین اسی عمارت میں ہو جس نے عہد مغلیہ کا عروج۔ بہ تدریج اس کا تنزل اور آخر کار وہ سنسنی خیز واقعات جن سے برٹش گورنمنٹ کا نیر اقبال چمکا زمانے کا سارا اتار چڑھاؤ دیکھا ہو۔ یہ سب باتیں ایک آثار قدیمہ کے متلاشی سکالر کے لیئے کچھ کم قابل قدر نہ ہوں گی۔ شائقین آثار قدیمہ پرانے مرقعوں اور تصاویر سے اپنے ذہن میں ان لوگوں کا نقشہ جما سکتے ہیں جن کی صورتیں صفحۂ قرطاس پر منقوش ہیں اور جو (جیسا کہ تم خود) شام کے وقت جمنا کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا مزہ لیتے تھے یا یوں سمجھو کہ شہنشاہ ذی جاہ امراء و درباریوں کے موقر اور زندہ دل جھرمٹ کے بیچوں بیچ میں (جیسے چاند کے

گرد تارہے) اُن باغوں کی روشوں پر خراماں گل گشت فرمارہے ہیں جن باغوں کی قدیم موقعی حدود مع عمارات قدیمہ تبلانے کے لیئے ہم نے اب نشان اندازی بھی کردی ہے۔ اس عجائب گھر کے اکثر نوادرات دربار تاجپوشی میں مستعار دی گئیں تھیں جن کا ذکر مسٹر جے پی طامسن ائی سی ایس نے اپنے خاص کیٹالاگ میں کیا ہے۔ ....

ممتاز محل جس میں اب عجائب خانہ ہے یہ زمانہ محل شاہی تھا لیکن ۱۸۵۷ء میں جب کہ انگریزوں نے قلعے پر قبضہ کرلیا تو وہ فوجی اغراض کے لیئے لے لیا گیا اور چند روز پیشتر تک سارجنٹوں کا میس تھا۔ ۱۹۰۲ء میں حدود آثار قدیمہ میں جو ترمیمات تجویز کی گئیں تھیں اُن کی تکمیل اکتوبر ۱۹۱۱ء تک نہیں ہوئی اُسی میں ہز آنر سر لوئیس ڈین صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر پنجاب کے ایما کے موافق یہ محل آثار قدیمہ کے عجائب خانے کے واسطے منتخب کیا گیا تھا۔ اس کی دیواروں پر کئی کئی تہیں چونے کی چڑھی ہوئی تھیں اُن کو جب کھرچوایا گیا تو اندر سے اُن تمام نقاشیوں کے نشانات نمودار ہوئے جو سفیدی سے ڈھک گئے تھے چنانچہ اب بھی درمیانی ہال اور شرقی جانب کے بیچ کے کمرے میں نقش ونگار نظر آتے ہیں۔ قلعۂ دہلی کا پرانا نقشہ جو دریا کے رخ سے بنایا گیا ہے اور جو عجائب خانے میں محفوظ ہے اُس کے دیکھنے سے ممتاز محل کی سابقہ اور اصلی حالت معلوم ہوتی ہے کہ اس کے چاروں کونوں پر چھتریاں تھیں جن پر سنہرے کلس چڑھے ہوئے تھے۔ (انتخاب از دیباچۂ کیٹالاگ مرتبۂ مسٹر گارڈن سینڈرسن سوپرنٹنڈنٹ محمدن وبرٹش مانیومنٹس حلقۂ شمالی آگرہ واعزازی کیوریٹر عجائب خانہ آثار قدیمہ دہلی مطبوعہ ۱۹۱۳ء) جن صاحبوں کو اس عجائب خانے کی موجودات سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق ہو ان کے لیئے سب سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ بچشم خود دیکھیں اور یہ ممکن نہ ہو تو اس کی فہرست منگوا لیں جو صرف سات آنے میں ملتی ہے لیکن فہرست سے وہ لطف نہ آئے گا جو دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس عجائب خانے میں جُدا جُدا حصے ہیں۔

پہلا حصہ۔ تراشیدہ بت۔ ستون۔ تختیاں۔ کتبے۔

(۱) مسلمانوں کے عہد سے پہلے (۲) پٹھانوں کے عہد کے (۱۲۰۰ء تا ۱۵۰۰ء)

(۳) دور مغلیہ (سنہ ۱۵۵۷ تا سنہ ۱۸۰۰ء) (۴) فرنیچر کرسیاں وغیرہ ومتفرق اشیاء (۵) اسلحہ (۶) مواہیر وانگشتریاں۔ (۷) فرامین (۸) تصاویر اور مرقعے (۹) فوٹوگراف (۱۰) نقشے (۱۱) غدر کی بچی کھچی چیزیں۔

کچھ متفرق کتبے

(۱) نقار خانے کی دیوار میں یہ کتبہ جو سنگ سُرخ کا بجنسہ قطب صاحب کی لاٹ اور علائی دروازے کی طرح کا ہے۔ نصب کردیا گیا ہے جو ۴ - ۲ لمبا اور ۴ - ۱ چوڑا ہے۔ اس کے حروف جابجا سے ضائع ہوگئے ہیں بریں ہم جہاں تک پڑھا جاسکتا ہے وہ یہ ہے:-

السلطان المعظم شاھنشاہ الاعظم (مالک رقاب الامم) سلطان السلاطین العالم (الشمس) الدنیا والدین غیاث الاسلام والم(سلمین) ذوالامان لاھل الایہ (مان) وارث (ملک) سلیمان ابی المظفر ایلتمش السلطا-

یہ پتھر اوکھلے میں ملا تھا۔ (۲) موضع ارچینی میں جو قطب صاحب کے قریب ہے ایک کتبہ دس فیٹ لمبا دو فیٹ چوڑا ملا تھا جس پر (۲۸) سطریں بخط نستعلیق ۱۱۲۷ھ ۱۷۱۵ء سکہ جلوس فرخ سیر کی پنجۂ مبارک رسول مقبول کے متعلق کندہ ہیں یہ بھی نقار خانے کی دیوار میں لگادیا گیا ہے۔ جس کا مفصل ذکر ہم نے قطب صاحب کے بیان میں کیا ہے۔ (۳) یہ کتبہ سنگ مرمر کی تختی پر ہے جو موضع حوض خاص میں ایک کوئیں میں ملا تھا اور اب عجائب خانے میں ہے۔

تاریخ چاہ خاص۔ بنا فرمود چاہی ہمچو زمزم ۔ سکندر شاہ لودی شاہ عالم

خلیفہ بن خلیفست شاہ عادل	زعدلش بیخ اسلامست محکم
وھی اندر دہ است کز گشت شیریں	بگردش از دو جام اجناس مردم
وراں دم بود عامل بیگخانی	منور بن خواصخان اعظم
ز رجب یازدہ بودست ماہے	سنہ نھصد دگر بُد پانزدھم

(۴) یہ کتبہ قصبۂ مہرولی میں ملا تھا جو اب عجائب خانے میں ہے۔ (سنہ ۹۱۵ھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فان لم یسأل الانسان تغضب	وو عدلک ان یجیب السائلینا
دعوتک ربنا حق المبینا	واسأل حاجتی بک مستعینا

عُطاشًا عارض . . . بلا ماءٍ فاروا العاطشینا
ونحن السائلین کرھت ربی ونحن السائلون رالیات جمیعًا
اذا ما العاجز الظمان یاتی ویرجو الماء باب المحسنینا
وکاسنی فی یدی ھذا القدیر ارید الماء رب العالمینا
فانت الحق بالاحسان حقا علینا یا ملاذ المنسکینا
یصیر فی اناہ العذب لطیفًا ورفقًا یا کریم العاجزینا
الی المعروف عبدک یا کریمی ترحم انت خیر الس احمینا
فماء المزن اصیب فی غدیری مداما کان باکا ید القرینا
تعال العبد عصیان وجرم ومنک کمال ستر المجرمینا
انا العبد الفقیر بباب ربی وانت اللہ یغنی العالمینا
ویا رب اعف ما نجینا الھی لا تو اخذ ان نسینا

ان کے علاوہ اور کتبے بھی عجائب خانے میں ہیں جن کا ذکر ہم نے موقع بموقع کیا ہی

قلعۂ دہلی کی خواب گاہ میں "مغل روم"

آنریبل مسٹر ڈبلیو۔ ایم ہیلی صاحب بہادر چیف کمشنر دہلی کے ایما کے مطابق خواب گاہ میں کا ایک کمرہ (اسی خواب گاہ کا مشرقی حصہ مثمن برج کہلاتا ہی جس میں جھروکہ ہی) محلات شاہی کی دلچسپی بڑھانے کو مغلئی طرز پر سجایا گیا ہی۔ خواب گاہ کی عمارت کے جنوب و مغرب کے کونے والا کمرہ سب سے پہلے آراستہ کیا گیا ہی اور قصد یہ ہی کہ بہ تدریج اس کے ملحقہ کمرے بھی اسی طرح سجا دیئے جائیں۔ اس میں جتنی چیزیں رکھی گئیں ہیں سب بلا استثناے احدے مغلیہ زمانے کی ہیں بلکہ بعض تو خاص قلعہ ہی کے محلات سے دستیاب ہوئی ہیں۔ غرض اس سے صرف اس زمانے کا طرز ماندو بود بتلانا ہی۔ اس میں قالین کا فرش ہی۔ مسند تکیہ مغرق لگا ہوا ہی۔ شاہ جہاں بادشاہ کی خاص تلوار۔ حقہ۔ اگالدان وغیرہ سامان قرینے سے لگا دیا ہی اور ایسا معلوم ہوتا ہی کہ گویا ابھی کوئی شخص یہاں سے اُٹھ کر گیا ہی عہد مغلیہ میں معزز صاحبوں کے مکانات۔ بیٹھکوں وغیرہ کے سجانے کا بھی یہی طرز تھا جو ہم فی زمانا آئے دن دیکھتے ہیں۔ مغربی طرز ماندو بود

او رہا رہے سامان آسایش میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ جن لوگوں کو نئی روشنی نے منور نہیں کیا یعنی وہ یورپین طرز پر نہیں رہتے اُن کے ہاں فرنیچر یا اُٹھاؤ چیزوں کی یورپ کی طرح کثرت نہیں ہوتی کیوں کہ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان جیسے گرم ملک میں کمروں کو فرنیچر سے کھچا کھچ بھر دینے کی جگہ اسی طرز میں کچھ راحت ہے۔ دور مغلیہ کے زمانے کے اُن مرقعوں سے جن میں کمروں کا اندرونی نقشہ دکھلایا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب خانہ عموماً مسند تکیہ لگا کر تخت یا چوکی پر نشست رکھتے تھے۔ جس کے گرد فواکہات اور مٹھائی کی کشتیاں حقہ اور کہیں تلوار۔ خنجر۔ پیش قبض کٹار وغیرہ ہتھیار بھی فوری ضرورتوں کے لحاظ سے پاس ہی دھرے رہتے تھے ایک چھوٹی سی تلوار جو ظفر تکیہ یا گپتی عصا کہلاتا تھا اُس کا رواج زیادہ تھا جس کا دستہ بیساکھی کی طرح کا ہوتا تھا اور اُسی پر ٹیکا دے کر بیٹھا کرتے تھے۔ برنیر نے اُمرائے وقت کے مکانات مسکونہ کا بیان حسب ذیل کیا ہے اور بادشاہوں کے محلات کا بھی یہی طرز تھا لیکن یہ بات محتاج بیان نہیں کہ بادشاہ بادشاہی تھے اُن کے مکانات کی آراستگی اور اُن کے تمول و احتشام کا کیا پوچھنا۔

دور مُغلیہ کے مکانات کی حالت اَندر سے

"ایک اچھے گھر کے اندر ہمیشہ چار انچ موٹی دری کا فرش رہتا تھا جس پر گرمیوں میں سفید براق سی چاندنی بچھی رہتی تھی اور جاڑوں میں ریشمین قالین۔ کمرے کے صدر میں ایک یا دو پھول دار مغرق ریشمین کار چوبی کام کی مسندیں لگی رہتی ہیں۔ جس پر صاحب خانہ یا جو کوئی معزز آجائے بیٹھتے ہیں۔ ہر مسند پر ایک بڑا گاؤ تکیہ اسی قسم کا سہارا لگا کر بیٹھنے کے لیئے ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اور تکیئے بھی دوسرے لوگوں کے لیئے گرد میں لگے رہتے ہیں۔ چھت سے پانچ چھ فیٹ نیچے دیواروں میں مختلف قسم کے (چھوٹے بڑے) طاق رہتے ہیں جن میں بلوری گلدان اور گملے سجے رہتے ہیں۔ چھت نقشین طلع کاری کی ہوتی ہے لیکن انسان یا حیوان کی کوئی تصویر نہیں ہوتی کیوں کہ تصاویر کا رکھنا مذہبًا مسلمانوں میں منع ہے۔"

بڑی بڑی عمارات اور محلات شاہی کی حالت محمد صالح مورخ ہم عصر شاہ جہاں

بادشاہ نے اپنی کتاب "عمل صالح" موجودہ عجائب خانہ لاہور کے صفحات ۹۲-۱۰۰ میں یوں لکھی ہی کہ "رنگ محل اور دیوان خاص میں مختلف قسم کی بیش قرار رنگین دریوں اور کشمیری نہایت شوخ سرخ رنگ کے قالینوں کا فرش رہتا تھا - دیوان عام کی چھت اور دیواریں نہایت عجیب و غریب قسم کے مختلف رنگوں کے پارچوں سے سجی ہوئی تھیں - پردے مخملی زر بفت اور کمخواب اٹلی یا دوسرے یورپین ممالک کے بنے ہوے یا چینی ساخت کے ریشمیں چھپے ہوے ہوتے تھے" دالانوں کے سامنے سایہ کی غرض سے بڑے بڑے شامیانے بھی تانے جاتے تھے چنانچہ اُن کے کڑے چھجوں میں اب تک لگے ہوے موجود ہیں -

اس مغل روم کے بنانے سے محض یورپین سیاحوں کو مغلیہ مذاق طرز اندو بود کا نمونہ دکھلانا مقصود ہی کہ یہ لوگ کس طرح رہتے سہتے اور زندگی بسر کرتے تھے ورنہ ہم ہندوستانیوں کے لیئے تو اس میں کوئی ندرت اور دلچسپی ہی نہیں - کیوں کہ جنھوں نے اس گئے گزرے زمانے میں بھی امرا و رؤسائے ہندوستان کے سجے سجائے محلات دیکھے ہیں اُن کی نظروں میں بھلا یہ کیا جچے گا - چوں کہ مغل روم میں زیادہ تر پابندی اس بات کی ملحوظ رکھی گئی ہی کہ جو چیز ہو وہ حتی المقدور اصلی ہو اور اصلی چیزوں کا اب دستیاب ہونا متعذر اس سبب سے مغل روم اپنی سجاوٹ میں ایک معمولی گھریلو دیوان خانے سے جو متوسط الحال لوگوں کے شایاں ہی کچھ زیادہ ممتاز نہیں ہی -

قلعہ کے دلّی دروازے کے سنگین ہاتھیوں کی اصلی جا کا قول فیصل

آن پتھر کے ہاتھیوں کا مفصل ذکر ہم قلعہ کے بیان میں کر آئے ہیں - ان ہاتھیوں کی نسبت مختلف مصنفین نے ایسے غیر واقع بیانات لکھے ہیں کہ جن سے ایک گونہ مغالطہ پڑ گیا ہی اور بہت کچھ غلط مبحث ہو گیا ہی - اس خلجان کے رفع کرنے کے لیئے ہم کو اُس مدلل اور مسکت آرٹیکل کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہی جو نہایت شرح و بسط سے محکمۂ پیمایش آثار قدیمہ کی رپورٹ سنہ ۱۹۰۵-۶ء میں چھپا ہی اور جس پر سے مسٹر آر فرو ڈ ٹنگر سابق کیوریٹر

عجائب خانہ نے ۲۰ راکتوبر ۱۹۰۸ء میں یہی تبصرہ لکھا ہے۔ ذیل کے بیان کا ماخذ وہی رپورٹ ہے۔ ان ہاتھیوں اور اُن پر کے مجسموں کے متعلق یہ خیال کہ وہ گوالیار سے آگرہ اور پھر آگرے سے دلّی لائے گئے بہت آسانی سے بے بنیاد ثابت ہو سکتا ہے۔ زیادہ تر قرین قیاس یہ ہے کہ ان پر کے مجسمے کسی خاص شخص کے مجسمے نہ تھے بلکہ محض معمولی تھے اور اسی طرح ہاتھی بھی معمولی جنگلی ہاتھی تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ مجسمے دور مغلیہ کے بنے ہوئے ہیں لیکن ہاتھی البتہ اپنی طرز ساخت میں بالکل ان مجسموں سے جدا ہیں۔ ان ہاتھیوں کا تذکرہ پہلے پہل برنیر نے کیا ہے جس کی تائید چند سال بعد ایم ڈی تھیونیاٹ سیاح نے بھی کی ہے۔ آگے چل کر ایشیاٹک ریسرچز صفحہ ۴۲۹ ۱۷۰۹ء میں بیان کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب کے حکم سے ان ہاتھیوں کو نکال دیا گیا اور اسی روایت کو مع شیی زاید سر سید نے بھی نقل کیا ہے کہ بادشاہ نے مذہبی خیال سے ان کے ٹکڑے کرا دیئے تھے۔ پھر ان ہاتھیوں کی کچھ خبر نہ ملی تا آں کہ ۱۸۶۳ء میں قلعہ ہی میں ان ہاتھیوں کے (۱۲۵) ٹکڑے گڑے ہوئے نکلے ۱۸۶۶ء میں انھیں ٹکڑوں کو بہ مشکل جوڑ جاڑ کے ایک ہاتھی ملکہ کے باغ میں کھڑا کیا گیا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں اسی ہاتھی کو چاندنی چوک کے قریب استادہ کیا گیا اور دس برس بعد ایک تیسری جگہ ٹاؤن ہال کے سامنے نصب کیا گیا۔ ۱۹۰۳ء میں موجودہ مقام پر یہ ہاتھی کھڑے کیئے گئے لیکن وقت یہ پیش آئی کہ اس قدر شکستہ اور خستہ حالت میں تھے کہ ان کے اصلی ٹکڑے کام میں نہ آ سکتے تھے اس لیے ایک ایسے یورپین صناع کے سپرد یہ کام کیا گیا جو کہ ہندوستانی طرز میں مہارت کامل رکھتا تھا۔ اس طرح اُس کی نگرانی میں ہندوستانی لوگوں نے جو ٹکڑے کار آمد تھے جوڑ جاڑ کر یہ ہاتھی بنا کر کھڑے کیئے۔ رہی یہ بات کہ یہ ہاتھی بادشاہی زمانے میں کہاں کھڑے تھے اس میں پس و پیش کی کوئی وجہ ہی نہ تھی اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مسئلہ پر کیوں بحث چھڑی اور شک و شبہ کا کیا محل تھا۔ برنیر نے ہاتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ اس دروازے سے قلعے میں داخل ہونے کے بعد ایک لمبی اور کشادہ گلی ملتی ہے جس کے بیچوں بیچ

میں نہر کا پانی بہتا ہے"۔ ایم ڈی تھیونباٹ بھی اس نہر کا ذکر کرتا ہے۔ اس قسم کی گلی کہ جس کے بیچ میں سے نہر رواں ہو صرف ایک ہی سڑک تھی جو قلعہ کے دلی دروازے سے قلعے میں آتی تھی جیسا کہ نہ صرف قلعے کے پرانے نقشوں سے ثابت ہے بلکہ اس نہر کے نشانات اب تک بھی موجود ہیں علاوہ برین نیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ قلعہ کا دوسرا بڑا دروازہ ایک لمبی اور خاصی کشادہ سڑک ہے جس کے دونوں جانب بجائے دالانوں کے چبوترے اور ان پر دکانیں ہیں ..... یہاں لداؤ کی محراب دار بلند اور لمبی چھت ہونے سے اور زیادہ آرام ہو گیا ہے چھت میں بڑے بڑے روشن دان رکھنے سے ہوا اور روشنی خوب آتی ہے"۔ اس سے زیادہ واضح طور پر قلعے کے لاہوری دروازے کا بیان اور کیا ہو سکتا ہے۔ سر سید نے آثار الصنادید میں جو کچھ لکھا ہے غدر سے پہلے لکھا ہے جب کہ سینہ بسینہ روایات کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ دلی دروازے کو ہتیا پول دروازہ بھی کہتے تھے ہتیا = ہاتھی۔ پول = دروازہ) یہ نام اس واسطے پڑا تھا کہ اس دروازے کے سامنے پہلے پورے قد کے دو بڑے بڑے پہاڑ کے پہاڑ ہاتھی کھڑے تھے" ہمارے قول اور خیال کی مزید تائید اگر اور کچھ درکار ہو تو اس موقع کو دیکھیئے کہ دلی دروازے کے دہ کونے جہاں کہ اب ہاتھی کھڑے کیے گئے ہیں یہی ان کا اصلی مقام تھا۔ اسکے علاوہ بھی جب اس مقام پر کھدائی کی گئی تو وہاں پہلے کی بنیاد اور نشانات ایسے ملے کہ رہا سہا شک بھی جاتا رہا۔

موجودہ شہر دہلی کا مقام۔ آبادی اور عام حالات

وان آر لک نے دلی کو ہندوستان کا روم کہا ہے۔ فنچ تاجر اسے سات قلعوں اور باون دروازوں کا شہر بیان کیا ہے۔ برنیر اور ٹیورنیر نے اس کی شان و شوکت عظمت او تمول کے متعلق کئی پرزور مضامین لکھے ہیں۔ سچ پوچھیئے تو ملک معظم جارج پنجم کے دور میں اس کا دار السلطنت ہونا کوئی انوکھی بات نہ تھی کیوں کہ یہ شہر تو سات صدیوں سے بھی زیادہ تک راج دھانی اور دار السلطنت رہ چکا ہے۔ شہر روم سے ایک مناسبت تو یہ تھی اس کے علاوہ روم کے سات پہاڑوں کو دلی کے سات

شہروں سے بھی مشابہت ہے۔ غرض یہ کہ روم اور دلی کی مشابہت بڑی حیرت خیز ہے۔ علاوہ ازیں ساری دنیا کا کوئی شہر بھی واقعات تاریخی کے لحاظ سے دلی کی ہمسری نہیں کر سکتا اور شہر وینس کی طرح دہلی کا بھی چپہ چپہ بلکہ ہر پتھر اپنی ایک جداگانہ تاریخ سے وابستہ ہے۔ دلی دنیا کے سب سے قدیم شہروں میں کا ایک شہر ہے اور اس کو ملک ہندوستان کی پالیٹکس سے زمانے گزر گئے کہ تعلق رہا ہے اور سنہ ۱۵ ق۔ م سے تو اس کی تاریخ بالکل صحیح و صاف موجود ہے۔

دلی کے تاریخی واقعات ایسے ہی مشہور رہیں جیسے کہ نینوا۔ ببیلان کے ہیں اس کے سات اُجڑی ہوئی بستی کے عظیم الشان قلعوں۔ عالی شان محلوں۔ بھاری بھاری کنوؤں۔ شان دار مندروں اور شوالوں۔ مسجدوں کا۔ دریائے جمنا اور پہاڑی کے بیچ والی پٹی پر بارہ سے لے کر پندرہ میل تک سلسلہ چلا گیا ہے۔ عالی شان عمارات آثار قدیمہ کے لحاظ سے کسی طرح روم۔ ایتھنز۔ قاہرہ۔ وینس اور قسطنطنیہ سے کم تر درجے پر نہیں ہے دلی کا دیکھنا کوئی منہ کا نوالا نہیں کہ آدمی ایک دن میں دیکھ سکے اس میں آگرے اور بنارس سے بھی زیادہ مقامات دیکھنے کے قابل ہیں اور دلی یقیناً سارے ہندوستان میں سب سے بڑھ کر تاریخی اور نہایت دل چسپ شہر ہے۔ اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ جس دلی میں ہم بستے ہیں یہ بالنسبتہ زمانۂ حال کی آباد شدہ ہے لیکن شاہان مغلیہ کے دور دورہ۔ شان شوکت۔ دبدبہ اور جبروت کے آوازے شہر کی فصیل سے اب بھی ٹکرا رہے ہیں۔ مسٹر جی ڈبلیو فارسٹ نے اپنی کتاب Cities of India (بلاد ہند) میں لکھا ہے کہ دلی ہندوستان کے تمام شہروں کی ملکہ ہے۔ (ہمارا محاورا یہ ہے کہ سارے شہروں کی ناک ہے) گو اُسے بارہا لوٹا لاٹا اور فوج کھسوٹ کر بالکل ننگا کر دیا لیکن اُس شہر کی قدرتی اور موقعی بے نظیر دل چسپی کو جو اتنی بڑی سلطنت کا دار السلطنت تھا کون مٹا سکتا تھا۔ اس کی سر بفلک فصیلوں پر کھڑے ہو کر ذرا چاروں طرف ایک نگاہ تو دوڑاؤ۔ تمہاری نظر کے سامنے ایک وسیع میدان بھوری زمین کا ہے جس میں جابجا کھڈے کھودرے نالے۔ ٹیلے۔ دوسرے جن میں جا بجا درخت بھی کھڑے ہیں اور

آخرکار ہماری نگاہ پہاڑوں کے ایک لمبے سلسلے پر جس پر درخت کا نام نہیں دور سے نارنارنجی اور ارغوانی دُھندلاہٹ کے افق پر ختم ہوگی۔ اسی وسیع سپاٹ اور چٹیل میدان میں بہت سی بچی کھچی یادگاریں ہیں۔ بڑی بڑی عالی عمارتوں کے پس ماندہ حصے۔ بڑے بڑے سورماؤں۔ بڑے بڑے بزرگوں کے مقابر جن کو دیکھ کر روم جیسے شاہی شہر سے بھی زیادہ شان و عظمت کا منظر پیش نظر ہوتا ہے۔ دلی صرف ایک شہر ہی کی یادگار نہیں ہے بلکہ وہ یکے بعد دیگرے کئی قوموں کی نشانی ہے۔ لیٹیم اور کمپینیا کے میدانوں میں لاطینوں کے آنے سے بھی آٹھ صدی پہلے آرینوں کے ایک گروہ نے اس ملک کے قدیم باشندوں کے ایک گروہ کو بدر کرکے دریائے جمنا کے کنارے شہر اندر پرست کی بنیاد ڈالی پھر وحشی مسلمانوں کا دور دورہ آیا جس نے ہندوؤں کی سویلیزیشن کی دھول بکھیر دی اور دھوئیں اُڑا دیئے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں دلی سات سو برس سے زیادہ تک راج دہانی رہا لیکن اب اُس زمانے کی آبادی اور جلوس کے مقامات کا صحیح صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ دلی کی ساری بستیاں دریائے جمنا کے مغربی کنارے کے وسیع پر (جو تخمیناً تیس مربع میل تک پھیلا ہوا ہے) کسی نہ کسی جگہ لیکن یکے بعد دیگرے سب شہر اُجڑتے گئے ایک کو چھوڑا دوسرا بنایا تاآں کہ موجودہ دلی بھی جمنا کے کنارے ہی غالباً کسی پرانے شہر کی جگہ پر بسائی گئی۔ یونانی مورخین نے جنھوں نے سکندر اعظم کی جنگوں کا ذکر کیا ہے یا چینی سیاحوں نے جو چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان آئے تھے دلی کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ جس سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ مہا بھارت کے ہندو راجاؤں کا شہر ضرور اُس زمانے میں ویران تھا اور یہ جو روایت ہے کہ دلی آٹھ صدی تک ویران رہ کر پھر آباد ہوئی بے بنیاد نہیں معلوم دیتی۔ تاریخی تسلسل حالات کو بغور دیکھنے سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ مابعد کے اُن کل شہروں کو جو دلی کے نام سے مشہور رہیں یکے بعد دیگرے چھوڑنے پڑے یہاں تک کہ شاہ جہاں نے قلعہ اور جامع مسجد بنا کر موجودہ دہلی کی نال گاڑ دی۔ یہ بات توجہ کے قابل بھی ہے کہ غزنوی حملہ آوروں کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد گیارھویں صدی کے وسط میں دلی خوب آباد تھی پھر کیا وجہ ہے کہ دلی کی سرزمین پر کئی کئی شہر بنے

اور اُجڑ بھی گئے۔ اس کی کئی توجیہیں کی گئیں ہیں لیکن واقعات سے خود صحیح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ اکبر بادشاہ نے فتح پور سیکری کو کیوں چھوڑا تھا خود ابو الفضل نے اس کی وجہ پانی کی خرابی اور اسی وجہ سے آب و ہوا کی نادرستی بتلائی ہے گرم ملکوں میں ضروریات زندگی میں سب سے زیادہ آب تازہ کی افراط ہے جہاں کہ موسم بارش کے اول کے مہینوں میں غضب کی گرمی اور آفتاب کی تمازت ہوتی ہے گرد و نواح کے میلوں وسیع ریتیلے میدانوں پر کی جھلستی ہوئی گرم ہوا اور آندھیوں کا گرد و غبار لاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے سارے بڑے بڑے شہر بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے آباد کیے گئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے جہاں دو دریاؤں کا سنگم ہوتا ہے وہ مقام بہت بڑا خیال کیا جا سکتا ہے۔ دہلی۔ متھرا۔ قنوج۔ پریاگ (الہ آباد) اجودھیا (فیض آباد) کاسی (بنارس) یہ سب شہر بڑے بڑے دریاؤں پر واقع ہیں جس خطہ پر لاٹانی قطب مینار کھڑی ہے یہ سب سے پرانی دلی کی نشانی ہے۔ لوہے کی لاٹ کے کتبے کے موافق سب سے پہلا شہر گیارھویں صدی کے وسط میں راجہ اننگ پال نے بنایا تھا جس کا خاندان تقریباً ایک صدی تک حکم راں رہا۔ پھر چوہان راجپوتوں کا دور دورہ رہ کر تھوار خاندان کا نمبر آیا بارھویں صدی کے بیچ میں دہلی کا راجہ وسال دیو تھا جو پرتھی راج دہلی کے راجہ کا نانا تھا۔ پھر مسلمانوں کے حملے شروع ہوئے اور اگرچہ ایک عرصے تک پرتھی راج افغانوں کی مداخلت کو قوت سے روکے رہا لیکن آخر کار افاغنہ کا غلبہ ہوا اور شہر اُن کے قبضے میں آگیا۔ مسلمانوں کا سب سے پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک تھا۔ اُس وقت سے لے کر لارڈ لیک کے فتح تک (ستمبر ۱۸۰۳ء) دہلی میں مسلمانوں کی حکومت رہی اور یہی ایشیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔

دلی کا محل وقوع

شاہ جہاں آباد دلی کا عرض بلد شمالی ۲۸ درجہ ۳۹ دقیقہ ۴۰ ثانیہ اور طول بلد شرقی ۷۷ درجہ ۱۷ دقیقہ ۵ ثانیہ ہے۔ سطح سمندر سے ۸۰۰ فیٹ مرتفع ہے۔ یہ شہر جمنا کے مغربی کنارے پر بسا ہوا ہے اس کا فصل کلکتہ سے ۹۵۶ میل۔ بمبئی سے ۹۸۲ میل ہے۔ شاہ جہان آباد کا وجود صرف ۱۶۳۰ء میں ہوا ہے اور ۱۶۳۰ء سے لے کر ۱۶۵۰ء تک جتنے شہر دریائے

جمنا کے کنارے اور پہاڑی کے درمیانی لمبے وسیع میدان میں یکے بعد دیگرے آباد کیئے گئے شاہ جہاں آباد اُن شہروں میں کا سب سے آخری اور سب سے زیادہ شمال رُخ کو ہٹا ہوا شہر ہے۔

مردم شماری و خانہ شماری سنہ ۱۹۱۱ء

سنہ ۱۹۱۱ء کی پچھلی مردم شماری کے رو سے شہر دہلی کی آبادی (۲۳۲۸۵۷) نفوس ہیں اور تعداد امکنہ کی اس وقت (۳۹۸۹۷) ہے یہاں کی آبادی ہندو۔ مسلمان۔ جین سکھوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ مسٹر فین شا لکھتے ہیں کہ شاہ جہاں آباد کا شہر بدررو برج سے جو جنوب و مشرق کے کونے میں ہے دریائے جمنا کے داہنے کنارے کنارے اور کوہ اراولی کی شمالی شاخ کے بیچ میں جو ایک لمبی پٹی زمین کی سوا دو میل تک چلی گئی ہے اُس پر آباد ہے۔ شہر کے ردکار کا ایک بڑا حصہ قلعے کی فصیل سے رُکا ہوا ہے یہ قلعہ سنہ ۵۸-۱۶۳۸ء میں شاہ جہاں نے بنایا تھا جو سب سے بڑا بانی عمارات گزرا ہے۔ دریا کی طرف قلعے کے بھاری اور شاندار سنگ سُرخ کی فصیل۔ برج۔ برجیاں۔ کنگورے۔ دروازے جب نظر کے سامنے آتے ہیں تو آدمی ہک دھک رہ جاتا ہے۔ فصیل قلعے کے اندر کا رقبہ طول میں ایک ہزار گز اور عرض میں پانسو گز ہے جس میں باوجودیکہ انگریزوں نے فوجی ضروریات اور بارگوں کے لیئے گنجایش نکالنے کے واسطے بہت کچھ توڑ پھوڑ کیا اور متعدد عمارات صفحۂ ہستی سے مٹا دیں لیکن پھر بھی بہت سے محلات اور عمارات نہایت خوب صورت اور قابل دید موجود ہیں۔ فصیل کا شمالی حصہ جو غدر سنہ ۵۷ء کے سبب سے مشہور ہو گیا بدررو بُرج سے لے کر شاہ برج تک جو زیادہ تر موری برج کے نام سے مشہور ہے پونے تہائی میل تک چلا گیا ہے۔ موری برج سے اجمیری دروازے تک فصیل کا مغربی ضلع سوا میل کا ہے اور جنوبی فصیل کے ولزلی برج تک بھی یہی فصل ہے اس طرح شہر کا کل محاط سوا تین میل ہے۔ فصیل کے شمالی حصے میں ہی کشمیری دروازہ ہے جو غدر میں بڑے معرکے کا مقام رہا ہے۔ مغربی فصیل میں کابلی دروازہ۔ لاہوری دروازہ۔ فراش خانے کی کھڑکی اور اجمیری دروازہ تھے جس میں سے اب سوائے اجمیری دروازے کے کوئی باقی نہیں رہا۔ جنوبی فصیل میں

ترکمان اور دلی دروازے ہیں۔ دریا کی طرف خیراتی اور راج گھاٹ کلکتہ اور نگمبود دروازے ہیں۔ جن میں کلکتہ دروازہ اب نہیں رہا کیلا گھاٹ اور بدررو دروازہ دونوں بند کردیئے گئے ان دروازوں سے ٹریفک میں بڑی چپقلش تھی راستہ کشادہ کرنے کو گرا دیئے گئے فصیل شہر جس کا دور چھ میل کا تھا اور گرد خندق تھی جا بجا سے صاف کردی گئی اب جو دروازے رہ گئے ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ گرا سے جانے والے ہیں البتہ ایک کشمیری دروازہ اپنی حالت پر رہے گا وہ بطور یادگار غدر محفوظ کیا گیا ہے۔ چاندنی چوک کے بازار نے شہر کو دو غیر مساوی حصّوں میں تقسیم کردیا ہے جو قلعہ کے لاہوری دروازے سے فتح پوری کی مسجد تک ایک میل سے کچھ اوپر ہی اوپر سیدھا چلا گیا ہے۔ قلعے کے لاہوری دروازے کا فصل جتنا کشمیری دروازے سے ہے اُتنا ہی قریب قریب دہلی اور اجمیری دروازوں سے بھی ہے۔ شہر میں یوں تو جا بجا متعدد سڑکیں ہیں لیکن شہر کے شرقی حصے میں ایک بڑی سڑک شارع عام کشمیری دروازے سے دلی دروازے تک نکالی گئی ہے جو پرانے میگزین پر سے قلعے کے سامنے سے ہوتی ہوئی جامع مسجد کو سیدھے ہاتھ کی طرف چھوڑتی ہوئی دھر دلی دروازے تک چلی گئی ہے۔ شہر کے مغربی حصے میں ایک اور سڑک بازار لال کنواں اور سرکی والاں کی ہے جس کی قاضی کے حوض پر آکر تین شاخیں ہوگئیں ہیں۔ مغرب کی طرف اجمیری دروازے کو ایک سڑک چلی گئی ہے جنوب میں سیتارام کے بازار سے ہوتی ہوئی ترکمان دروازے کو اور مشرق میں چاوڑی بازار سے جامع مسجد تک۔ ایک اور بڑی سڑک اجرٹن روڈ (نئی سڑک) گھنٹہ گھر کے سامنے سے نکل کر جس کی بلندی ۱۲۰ فٹ ہے شاہ بولا کے بڑ پر چاوڑی بازار میں جاملی ہے۔ شہر کے جنوب و مشرقی کونے میں فصیل اور فیض بازار کے بیچ میں دریا گنج ہے جس میں نیٹو فوج کی ایک رجمنٹ سوار و پیدل کی رہتی تھی۔ باقی دو کمپنیاں برٹش انفنٹری اور ایک کمپنی رایل گیریزن کی قلعے میں رہتی ہے۔ شہر کے لاہوری دروازے کے باہر مغربی جانب فصیل شہر کے شمالی حصے میں صدر بازار ہے جس کے

نیچے قدم شریف اور عیدگاہ - کشن گنج - پہاڑ گنج -

مغربی نہر جمنا اور پہاڑی کا جنوبی سرا ہی - پہاڑی کے سرے کے نصف میل مغرب کی طرف سبزی منڈی اور باغ روشن آرا ہی اور یہی چیزیں اس طرف دیکھنے کے قابل ہیں - شہر کی شمالی فصیل کے باہر - کشمیری اور موری دروازے کے باہر سول سٹیشن ہی - جس کے جنوبی جانب ۱۸۵۷ء میں گردا گرد توپ خانہ پڑا ہوا تھا - یہیں قبرستان - نکلسن کا باغ اور قدسیہ باغ ہیں جن کی مغربی حد رج (پہاڑی) اور مشرق میں جمنا ہی - پہاڑی سے آگے بڑھ کر پرانی چھاؤنی ہی جو غدر میں برباد ہوگئی اور یہیں جون سے ستمبر تک انگریزی فوج شہر کا محاصرہ کیے پڑی رہی - اسی جگہ مغرب رخ پر نجف گڑھ کی جھیل سے جو نہر نکالی ہی وہ ہی جس کے اوپر ۱۸۵۷ء کا فوجی قبرستان ہی نہر کے پرے بڑی سڑک کے شمال میں باوری کا وہ میدان ہی جہاں کہ ۱۸۷۷ء میں امپیریل اسمبلج (شاہی دربار) ہوا تھا اور یہیں اس سے بھی بڑھ کر یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو دربار تاج پوشی ہوا تھا - یہ مقام کشمیری دروازے سے ساڑھے تین میل اور پہاڑی سے ڈیڑھ میل ہی - اسی بڑی سڑک سے ڈھائی میل اوپر وار جہاں باوری کے میدان کی طرف رستہ مڑتا ہی باولی کی سرا کے میدان جنگ کے مغرب میں کچھ چیدہ چیدہ درخت شالامار کے مشہور باغ سے رہ گئے ہیں - دلی دروازے سے نصف میل پر دریا گنج کی چھاؤنی کے جنوب ومشرق کے کونے میں فیروز شاہ کے کوٹلے کا کھنڈر ہی جس میں فیروز شاہ نے بودھ لوگوں کی پتھر کی لاٹ کھڑی کی ہی جو اب تک موجود ہی اس کے جنوب میں ایک میل آگے پرانا قلعہ یا اندرپت ہی - اندرپت کے جنوب رُخ پر دو میل پر ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ ہی - جس کے گرد اور بھی کئی عمارتیں ہیں اس طرح شہر کے جنوب کی طرف دریا کے کنارے تک کی قابل دید عمارتیں ختم ہوئیں - یہاں سے مغرب کی طرف پلٹو تو پہلے حضرت شاہ نظام الدین اولیا کی درگاہ بائیں طرف نظر آوے گی - وہاں سے ڈھائی میل جنوب کی طرف مبارک پور ہی جس کے شمال میں لودھیوں کے مقبرے ہیں -

لودھیوں کے مقبروں سے نصف میل آگے نواب صفدر جنگ کا مقبرہ ہے جو اجمیری دروازے کی سڑک سے چھ میل ہے۔ یہاں سے قطب مینار اور پرانی دہلی جنوب کی طرف پانچ میل ہے۔ صفدرجنگ کے مقبرے سے اسی سڑک پر ڈیڑھ میل پر مغرب کی طرف فیروز شاہ کا مقبرہ ہے اور مشرق کی طرف بیگم پور کی مسجد اور کئی اور عمارتیں ملتی ہیں۔ پرانی دلی میں قطب مینار راے پتھورا کا مشہور مندر مسجد قوۃ الاسلام۔ علائی دروازہ سلطان التمش کی قبر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ شریف یہ سب مقامات قابل دید ہیں۔ ماسوا اس کے قلعے کی بھاری اور پرانی فصیل اور کئی عمارتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ قطب صاحب سے پانچ میل بجانب مغرب شہر تغلق آباد کا عالی شان قلعہ اور فصیل اور تغلق شاہ کا مقبرہ ہے۔ ان سب تاریخی مقامات کے علاوہ وہ میدان جنگ جمنا کے بائیں کنارے دلی سے پانچ چھ میل کے قریب ہے جہاں لارڈ لیک[1] نے ۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء کو بڑی بھاری لڑائی لڑی تھی۔

---

[1] "وائی کونٹ لیک آف ڈہلی اینڈ لسواری" ۱۷۴۴ء میں پیدا ہوا اور چودہ برس کی عمر میں گارڈز (فوج) میں داخل ہوا۔ جرمنی۔ امریکہ اور فلینڈرز میں کام کیے اور جب اوائل ۱۷۹۸ء میں آیرلینڈ میں بلوا ہوا تو اسی کی کمان تھی لوگوں نے اس کی غیر معمولی سختی اور بدنظمی کی شکایت کی ۱۸۰۰ء میں ہندوستان میں کمانڈر ان چیف (سپہ سالار) ہو کر آیا اور شمالی حصہ ہند میں اس نے مرہٹوں کی زبردست طاقت کا قلع قمع کرنے میں بڑا نام پایا ۱۸۰۳ء میں سیندھیا سے جو لڑائی ہوئی وہ لارڈ ولزلی کے ایما سے ہوئی تھی تاکہ فرانسیسیوں کے جنرل ایم پیرون (M. Perron) نے جو دریاے جمنا کے کنارے ایک سٹیٹ قایم کیا تھا اس کا قلع و قمع ہو۔ ایم پیرون ایک فرانسیسی سپاہی تھا جو بڑے مشہور ڈی بوئن (De Boigne) کی جگہ سیندھیا کے باقاعدہ فوج میں مقرر ہوا تھا اس نے ملک دوآبہ پر قبضہ کر کے اپنا مستقر علی گڈھ مقرر کیا تھا اور شاہ عالم بادشاہ کی مدد سے ایک خود مختار رئیس بن گیا تھا۔ اور خفیہ طور پر بونا پارٹ سے مراسلت بھی رکھتا تھا لہٰذا لارڈ ولزلی نے چاہا کہ اس کانٹے کو نکال دیا جاوے۔ علی گڑھ میں شکست پانے کے بعد ایم پیرون نے اپنے آپ کو انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ تب بورکوئن (Bourquin) نے کمان لی لیکن ۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء کو لارڈ لیک نے اسے دلی کی لڑائی میں شکست دی جو ہمایوں کے مقبرے کے محاذ کے میدان میں ہوئی تھی۔ بڑی فتح لسواری مقام پر یکم نومبر کو ہوئی جب سیندھیا سے صلح ہو گئی تو اندور کے مرہٹہ راجہ ہلکر نے جنگ چھیڑ دی اور اس کے ساتھ بھرت پور کا راجہ بھی شریک ہو گیا۔ لارڈ لیک نے ڈیگ پر گولہ باری شروع کی مگر بھرت پور کے چار حملوں میں ناکام رہا۔ لیکن راجہ نے اس نوبت پر صلح کی خواہش کی۔ ہلکر یلغار پنجاب کی طرف چلا تاکہ رنجیت سنگھ سے مدد لے لیکن دریاے بیاس کے کنارے ہی سمجھوتا ہو گیا اور ہلکر لوٹ گئے دب بیٹھا۔ لیک ۱۸۰۴ء میں پیر یعنی لارڈ بنایا گیا اور ۱۸۰۸ء میں وفات پائی ۱۲۳

صنعت وحرفت

دلی کی صنعت ودستکاری مختلف اقسام کی ہی۔ زیورات سادہ کاری۔ جڑاؤ۔ کندن۔ ڈایمنڈکٹ۔ظروف برنجی اورتانبے کے۔ ہاتھی دانت پرقلمی تصاویر۔ مٹی کے برتن۔سلمہ ستارے کاکام۔ زردوزی۔ تصویرسازی۔ جوتیاں۔ ٹوپیاں۔ سوزن کاری۔ کامدانی۔ رفوگری ملمع سازی۔ وغیرہ وغیرہ۔ صدہا برس سے دہلی کے زیورات۔ سادہ کاری اورجڑاؤکاشہرہ ہی لیکن اب یہ صنعت وکاریگری بہ مقابلہ عہد مغلیہ کے بوجہ قدرداں نہ ہونے کے روبہ انحطاط ہی۔ ہاتھی دانت پر چھوٹی چھوٹی تصویریں بنانا جوبڑا باریک اورکاریگری کاکام ہی وہ صرف ایک دوخاندانوں میں باقی رہ گیا ہی۔ زمانۂ حال میں کیسکٹ اوراسی قسم کی دوسری اشیاء ہاتھی دانت کی بہت نفاست سے طیار کی گئیں ہیں ایک بڑی ندرت اس کام میں یہ ہی کہ اقلیدس کی شکلیں بھی ٹھیک بنائی جاتی ہیں۔ برتن نقلی چینی کے بنائے جاتے ہیں جو بہت نفیس ہوتے ہیں یہ ہنر بھی دو ہی ایک گھرانوں میں باقی رہ گیا ہی۔ زردوزی سلمہ ستارے کاکام بہت کثرت سے اور انواع واقسام کانہایت عمدہ ہوتا ہی جس کی بڑی بڑی دکانیں چاندنی چوک میں ہیں۔ اگرچہ اب یورپین طراش تراش کووضع قطع میں زیادہ دخل ہی لیکن پھر بھی قدیم طرز کے نمونے بھی میسر آسکتے ہیں۔ بہرحال یہ کام بڑی ترقی پرہی۔ تارکشی یعنی سونے چاندی کے تار کھینچنے کے کام میں بہت سے لوگوں کو روزی ملتی ہی ان لوگوں کو کندلہ کش کہتے ہیں میونسپلٹی نے ایک ورک شاپ بڑے پیمانے پر کھولی ہی جس میں اُن کی نگرانی میں سونا چاندی گداخت کیا جاتا ہی۔ اس ورک شاپ کاایسا اعتبار اوربھروسہ سارے ملک میں ہی کہ اس کامارک دیکھنے کے بعد اس کے خالص ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اس خدمت کے معاوضہ میں اس ورک شاپ کو یعنی میونسپلٹی کو پچیس ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہی۔ زمانۂ حال میں کئی ملیں اورکارخانجات کھلنے سے شہر کی بڑی ترقی ہوئی ہی۔ یہ کارخانے پارچہ بافی اوردوسرے اقسام برف۔ کشید شراب وغیرہ کے ہیں جو سٹیم کی طاقت سے چلتے ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں دہلی کلاتھ اینڈ جنرل ملز۔ ہنومان اینڈ مہادیو سپننگ اینڈ ویونگ ملز۔ کشن کاٹن

سپننگ مل - جمنا کاٹن سپننگ مل - آٹا پیسنے کے یہ کارخانے ہیں - ناردرن انڈیا فلور مل گنیش فلور مل - جان فلور مل - تین شکر بنانے کے کارخانے - تین کارخانے روئی کے بنوسے نکالنے کے - ہندو بسکٹ فیکٹری - اور بہت سے چھوٹے موٹے مطابع - لوہیوں کے کارخانے جس میں ہر قسم کا کام بنتا اور ڈھلتا ہے اور جو برقی قوت سے چلتے ہیں اس طرح اس وقت کوئی چالیس کارخانے جاری ہیں جن میں ہزارہا آدمی پرورش پاتے ہیں : - دلی نہ صرف ایک بڑا بھاری تجارت گاہ ہے بلکہ خود اس شہر میں صدہا قسم کی چیزیں بنتی ہیں - سب سے پہلے تجارت اور حرفت کو اکبر بادشاہ نے ترقی دی - اُس نے سارے ہندوستان - فارس حتی کہ یورپ تک سے چن چن کر کاریگروں کو سمیٹا - سر جارج برڈووڈ اپنی کتاب "انڈسٹریل آرٹس آف انڈیا" میں لکھتے ہیں کہ "امرا - روسا اور سرداروں کی توجہ اور شوق اور تہذیب یافتہ لوگوں کی خوش مذاقی کا سبب تھا کہ ہندوستان کی صنعت و حرفت اس اعلیٰ درجے کی تکمیل کو پہنچی - آئین اکبری (۱۵۹۶ - ۱۶۰۵ء) میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ شاہان مغلیہ اپنے محلوں میں ہر فن و کمال کے چنندہ کاریگر ہندوستان میں ہر خطے سے رکھا کرتے تھے" کہتے ہیں کہ اکبر بادشاہ کو خود نقاشی اور مصوری کا بڑا شوق تھا اور اُس نے بہت سے کاریگر اور ملازموں کو اس لیئے جمع کیا تھا کہ اُن میں آپس میں منافست لاگ ڈانٹ رہے اور ایک کو دیکھ کر دوسرا سبقت لے جانے کی کوشش کرے اور اس طرح صنعت اور حرفت کو ترقی ہو - بادشاہ ہفتہ میں ایک بار بنفس نفیس ہر کاریگر کے کام کو ملاحظہ فرماتا تھا اور اُن کے کام کے اعتبار سے اُن کو سرمایہ کی امداد دی جاتی تھی اور بلحاظ ان کی کارگزاری اور دستکاری کے اُن کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جاتا تھا - سلاح خانے میں بھی بادشاہ خود جا کر قسم قسم کے ہتھیاروں کی ساخت کو ملاحظہ فرماتے تھے جو تمام تر انھیں کارخانوں میں طیار کیے جاتے تھے - شاہی لباس خانے کے کارخانے میں ہر ملک کے بننے والے زردوز - کارچوب والے موجود تھے اور جو کچھ وہ بناتے تھے بڑی حفاظت سے توشک خانوں میں رکھا جاتا تھا اور یہی چیزیں خلعتوں اور انعاموں میں دی جاتی تھیں چوں کہ بادشاہ خاص طور پر اس طرف متوجہ تھا لوگ بھی آئے دن نئی نئی ایجادیں کرتے

رہتے تھے اور جب دیکھو ایک نئی طرز نکالتے اور ہر چیز کو درجۂ کمال پر پونچاتے تھے - فارس یورپ اور چین کے ساختہ پارچہ جات ان کو دکھلا کر ان کا شوق تیز کیا جاتا تھا - بادشاہ کو ادنی اور پشمینے اشیار کا بہت شوق تھا بالخصوص شال بہت مطبوع خاطر تھے - آئین اکبری میں اُن تمام مختلف اشیار کی فہرست دی گئی ہے جو محلات شاہی میں طیار کی جاتی تھیں جن کی تفریق بلحاظ تاریخ طیاری - قیمت رنگ اور وزن کے کی گئی ہے - اکبر بادشاہ کے ہاں جوہری - سنار - جڑئیے - سیم بافت نگینہ ساز - حکاک - جوہر تراش - مہر کن وغیرہ وغیرہ ہر قسم کے کاریگر کثرت سے موجود رہتے تھے

سر جان چارڈن نے ۱۶۶۴ء میں بلاد مشرق کی سیاحت کی ہے وہ اپنے روزنامچہ سیاحت (جرنل ڈی وائج - لنڈن ۱۶۸۶ء - ایمسٹرڈم ۱۷۱۱ء) میں لکھتے ہیں کہ بادشاہ اور امرا سے فارس سب کاریگروں کو اپنے اپنے کارخانوں میں رکھتے تھے - سر جان نے ان کارخانوں کا مقابلہ گرینڈ ڈیوک آف فلارنس اور لاور کی گیلریوں سے کیا ہے - یہ لوگ اپنے کارخانوں میں عمدہ اور نامی کاریگروں کو (بڑی بڑی) تنخواہیں اور روزینے دے کر رکھتے ہیں اور مال مسالا سب اپنی طرف سے دیتے ہیں جو کام عمدہ اور نفیس اور لایق پسند بناتو ان کی حوصلہ افزائی کو انعام اکرام دینے کے علاوہ اُن کے مشاہروں میں توقیر کی جاتی تھی - ان لوگوں کی ملازمتیں موروثی اور نسلاً بعد نسل تھیں چنانچہ اب بھی ریاستوں میں یہی دستور ہے کہ باپ کی نوکری بیٹا پاتا ہے - لندن کے انڈین میوزیم (عجائب خانے) میں ایک بہت بڑا پیالہ اُس زمانے کا بنا ہوا تھا جس پر حکاکوں کی تین پشتوں کو یکے بعد دیگرے کام کرتے گزر گئے - اس سے اندازہ ان لوگوں کی دیدہ ریزی کا کیا جا سکتا ہے - اور صرف یہی طرز عمل ہے جس کی بدولت صنعت و حرفت میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے چنانچہ اب بھی مختلف قسم کی صنعتیں خصوصاً شال بافی وغیرہ کشمیر - جے پور حیدرآباد دکن ریاستوں کے کارخانوں میں قایم و برقرار ہیں" دلی میں چمڑے کی تجارت بھی بہت ہے - یہاں کی جوتیاں سارے ہندوستان میں مشہور ہیں جو بڑی خوبصورت نازک اور نفیس ہوتی ہیں - سادی کے علاوہ طرح طرح کے بیش قیمت سلمہ ستارے - سپاٹ کام کی دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں سادہ اور جڑاؤ زیورات

ٹیکے ۔ جھومر ۔ ہار ۔ بالیاں ۔ مچھلی ۔ آویزے ۔ سہارے ۔ بجلیاں ۔ جھلنیاں ۔ جھمکے کے بالے ۔ ست لڑا ۔ ہار ۔ ہنسلا ۔ گلوبند چمپاکلی ۔ دُھگدگی ۔ ہیکل ۔ نادعلی ۔ گجرے دانیاں ۔ مگر مرکیاں ۔ چھلّے یعنی سہارے کڑے چھڑے ۔ جوڑیاں ۔ پچھے جھانجن ۔ پازیب ۔ بُل ۔ انگوٹھی ۔ چھلّے ۔ چٹکی چھلّے ۔ جوڑ ۔ جوشن ۔ نونگے ۔ بھوج بند ۔ تعویذ ۔ ہزاروں قسم کے زیورات خالص سونے کے یا جڑاؤ یا میناکاری کام کے غرض سینکڑوں قسم کے زیور بنتے ہیں ۔ یہاں کے سنار اور سادہ کار اور جڑئیے بہتر سے بہتر کام بناتے ہیں جس کی نقل یورپ میں بھی شاید ہی ہو سکے ۔ ایک بڑی دستکاری ہاتھی دانت کی تختیوں پر تصویر سازی کی ہے ۔ ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر کیسی باریکی اور نفاست کی قلم سے تصویر شخصی اور عمارات کی ہو بہو اُتارتے ہیں کہ بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ گو یہ تصاویر فوٹوگراف پر سے لی جاتی ہیں مگر ان کے بنانے کی بڑی ندرت ہے ۔ اگرچہ یہ تصاویر بیش قیمت ہوتی ہیں مگر ویسا ہی کام بھی ہے اور یورپ تک اس دست کاری نے نام پایا ہے اور یہاں کے مصوروں کو کئی تمغے نمائشوں میں سے ملے ہیں ۔ غرض یہ کہ دلی ہر قسم کی صنعت و حرفت کا معدن ہے اور یہاں ہزاروں روپیہ روزانہ کا بیوپار ہوتا رہتا ہے ۔

تجارت
دلی تجارت کی بڑی بھاری منڈی ہے ۔ چونکہ یہاں مختلف ریلوے لینیں آگئی ہیں لہذا یہاں کے لیئے میدان تجارت چو طرف کھلا ہوا ہے ۔ دلی میں زیادہ بیوپار کلکتہ اور بمبئی سے ہے اور ولایت سے راست بھی مال کی درآمد ہے ۔ یہاں کی اشیائے درآمد یہ ہیں :۔ ادویہ ۔ روئی ریشم ۔ غلہ ۔ اجناس روغن دار ۔ گھی ۔ دہات ۔ نمک ۔ سینگ ۔ چمڑا اور ہمہ قسم کے پارچہ جات جو یورپ سے آتے ہیں ۔ برآمد کی اشیاء بھی قریب قریب یہیں ہیں ماسوا ان کے تماکو ۔ شکر ۔ تیل ۔ زیورات سنہری اور روپہلی گوٹا اور لیس دلی کے تجار کا بیوپار ساری دنیا سے ہے ہندوستان ہی میں سندھ ۔ کابل الور ۔ بیکانیر ۔ جے پور ۔ دوآب پنجاب سے زیادہ تر داد و ستد ہے ۔ دہلی میں متعدد یورپین بنک ہیں جن کا ذکر بنکوں کے ضمن میں آیا ہے ۔ ہندوستان کے کل بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں یہاں ہیں اور بہت سے روئی اور غلّے کے سوداگروں

ایجنٹ یہاں مستقل رہتے ہیں۔ تجارت کا بڑا بھاری مرکز چاندنی چوک کے بازار کو سمجھیے جہاں ہر قسم کے تجار کی دکانیں اور گودام ہیں اور جو دہلی کا سب سے بڑا اور لاجواب بازار ہے۔ دوسرے شہروں میں ایک بڑی دقت یہی ہے کہ کپڑا ایک بازار میں ملتا ہے تو سامان خورد و نوش دوسرے میں۔ برتن تیسرے میں تو کتابیں چوتھے میں جس میں خریداروں کو بڑی زحمت ہے برخلاف اس کے چاندنی چوک کا بازار جو طول میں ایک میل اور عرض میں سو گز ہے۔ معدن ہے کل اشیاء اور ہر قسم کے مال و اسباب کا۔ دنیا کا ہمہ قسم کا سامان اسی ایک بازار میں ملتا ہے دلی میں مثل مشہور ہے کہ "لڑکے کی بری بازار میں کھڑی" یعنی دلی کا ایک بازار ایسا ہے کہ شادی کا سامان آناً فاناً میں ہو سکتا ہے اور یہ بات سچ بھی ہے۔ پیسہ چاہیئے جس کے پاس پیسہ ہے وہ ہتیلی پر سرسوں جما سکتا ہے اور جو چاہے وہ کام منٹوں میں کر سکتا ہے۔ ہر قسم کا سامان طیار ملتا ہے۔ زیورات گھڑے گھڑائے۔ کپڑے سلے سلائے ٹنکے ٹنکائے موجود۔ غرض وہ کونسی خدا کی نعمت ہے جو چاندنی چوک میں نہیں مل سکتی۔ پھر زحمت دوا دوش نہیں۔ ٹہلتے ہوئے چلے جائیے اور پل بھر میں سب کام کرلائیے۔ خلاصہ یہ کہ ایک سوئی سے لے کر موٹر کار تک لے لیجئے چاندنی چوک کا بازار سارے ہندوستان میں یکتا تھا بیچ میں نہر رواں تھی جس کی دونوں جانب گھنے سایہ دار درخت تھے اور دو طرفہ مسلسل دکانیں عالی شان اور مکانات اور کوٹھے۔ سڑک کے چوڑا کرانے کو نہر بند کر دی گئی اور سارے پرانے درخت بھی کٹوا دیئے گئے۔ جن لوگوں نے چاندنی چوک کو پہلے دیکھا ہے ان کو تو اب اجاڑ نظر آتا ہے۔ نئی روشنی والوں کو یہ سپاٹ میدان بھلا لگتا ہو تو لگتا ہو دکانوں میں انواع و اقسام کا سامان بھرا پڑا ہے۔ کشمیری چادریں۔ شال۔ کمخواب زربفت۔ سنہری روپہلی زردوزی کام کی چیزیں۔ ہر قسم کے کپڑے۔ زیورات تانبے پیتل کے باسن۔ دریاں۔ قالین۔ غرض وہ کیا چیز ہے جو یہاں نہیں ہے۔

تعلیم

۱۸۷۷ء تک دہلی میں گورنمنٹ کالج تھا جو لاہور میں پنجاب یونیورسٹی قایم کرکے توڑ دیا گیا اب سینٹ اسٹیفنز کالج ۱۸۹۰ء سے قایم ہے اور ہندو کالج ۱۸۹۹ء سے۔ اب میونسپل بورڈ ہائی سکول

اور چھ برینچ سکول سینٹ سٹیفنز ہائی سکول اور اُس کی دو برنچیں - اینگلوعربک سکول اور اُس کی تین شاخیں ہیں ایک سنسکرت ہائی سکول ہے - پنجابی سکول مسلم سکول - اور کئی پرایوٹ سکول ہیں - اسی طرح کئی زنانہ سکول ہیں - کوئین میری ہائی سکول - زنانہ مشن سکول - اندر پرستھ گرلز سکول - اور کئی برنچیں ہیں - نارمل سکول بھی ہے - مدرسۂ طبیہ - اور اس کے متعلق طبیہ زنانہ سکول ہے - شہر کے باہر لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج کی عالی شان عمارت ہے جو بڑے پیا نے پر زنانہ میڈیکل کالج ہے جس میں تمام یورپین سٹاف ہے - قرول باغ میں طبیہ اور ایورویدک کالج کی عالی شان عمارت زیر اہتمام جناب حکیم اجمل خاں صاحب حاذق الملک بن رہی ہے جس میں طب یونانی وانگریزی و ویدک کی تعلیم ہوگی -

ہوٹلیں سرائیں اور مسافر خانے سب سے بڑی ہوٹل میڈنسز ہوٹل ہے جو بیرون کشمیری دروازہ سول سٹیشن میں لڈلو کیسل کے پاس ہے - دہلی کی ہوٹلوں میں یہ سب سے بہتر ہے - انتظام اور مکانیت سب اعلیٰ درجے کا ہے - موری دروازے کے باہر لارینز ہوٹل ہے اور البین - وڈلینڈ سیسل کئی ایک ہوٹلیں ہیں - دو چھوٹے رسٹ ہوس قطب میں ہیں ایک ادھم خاں کے مقبرے میں جو رسٹ ہوس ہے اُس میں اُترنے کے لیئے صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی کی اجازت حاصل کرنی ضرور ہے - ریلوے سٹیشن کے پاس بڑی بھاری احمد بائی کی سرائے ہے - ریلوے سٹیشن سے کوئی پاؤ میل پر گھنٹامل والوں کا ایک بڑا دھرم سالہ اہل ہنود کے واسطے ہے - اب دلی میں کوئی ڈاک بنگلہ نہیں ہے البتہ ریلوے سٹیشن میں رٹائرنگ روم ہیں - جو لوگ ریل کی گڑبڑ اور ہر دم کے شور و غل سے نہ گھبراتے ہوں وہ ان میں ٹھیر سکتے ہیں

ڈہلی الکٹرک ٹریمویز اینڈ لائٹنگ کمپنی دہلی میں برقی قوت سے شہر کے کل بڑی بڑی شاہراہوں پر ٹریموے چلنے لگی ہے اور اسی طرح ساری سڑکوں پر برقی روشنی ہوتی ہے جس سے سارا شہر رات کے وقت جگمگا اُٹھتا ہے مکانوں میں بھی کثرت سے بجلی کی روشنی اور برقی پنکھے لیئے گئے ہیں - دلی کی قیامت کی گرمی

اور نوئیں یہ پنکھے جنت کی ہوا کھلاتے ہیں۔ بجلی کا بڑا کارخانہ پورہوس۔جی۔
آئی۔پی ریلوے صدر سٹیشن کے عقب میں وہ بہت اونچا بنا ہی جہاں سے
چوطرف برقی قوت پھیلائی جاتی ہی اور جو شبانہ روز بلا توقف ساعتے ہر وقت اپنے
کام میں لگا رہتا ہی۔

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہی داغ
اُردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں

زبان جو زباں ہم تم بولتے ہیں وہ اردو کہلاتی ہی۔ تمام ہندوستان کی لنگوافرینگا
اردو ہی ہے۔ اس میں بھی دلّی اور پھر لکھنؤ کی اردو منتخب ہی اور لال قلعے
کی اردو سب سے زیادہ مستند اور شستہ اور فصیح اور بامحاورہ سمجھی جاتی ہی۔
شاہان مغلیہ کی زبان بھی اردو ہی تھی اور انھیں کی گودوں میں یہ زبان پلی اور پرورش
پائی۔ دہلی اجڑ کر لکھنؤ بسا اردو کی نئی نویلی دلہن کو اہل لکھنؤ نے آغوش محبت
میں لیا اور خوب بناؤ سنگھار سے سنوارا۔ اس اعتبار سے دلّی میں اردو کی ٹال
گڑی ہی اور لوگ دہلی والوں کی زبان سے ہر موقع و محل پر سند پکڑتے ہیں چنانچہ
داغ صاحب کا شعر ہم نے اوپر لکھ دیا ہے۔

ذکر مشائخین کرام و علمائے عظام و دیگر بزرگان دہلی[1]

مردم او جملہ فرشتہ سرشت — خوش دل و خوش خوے چو اہل بہشت
ہر ہمہ نزدیک دل و گرم خون — رفتہ چو جاں در تن مردم درون
ہر سر مو بر تن ایشاں ہنر — دادہ در موے تنگانی بسر
وز قلمے ہر چہ برآرد قلم — وانچہ نگنجد بزبان قلم
بیشتر از علم و ہنر بہرہ مند — زاہل سخن خود کہ شمارد کہ چند

[1] بیشتر ذکر احوال بزرگان دین و علمائے و مشاہیر وقت کا اپنے اپنے موقع سر
اس کتاب میں آچکا ہی۔ جن صاحبوں کا ذکر رہ گیا تھا وہ اس ضمیمے میں
درج کیا جاتا ہی۔ ۱۲

خداوندتعالیٰ نے اس خطۂ زمین کو کچھ عجیب غریب خاصیت عطا فرمائی ہے کہ سلطنتوں کے عروج و زوال و معرکہ ہائے جنگ و جدال کے قطع نظر یہ سرزمین بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں کی خاک سے بڑے بڑے نامور علماء اور حکماء غرض ہر طبقے کے بہترین لوگوں کا یہ معدن رہا ہے اور یہیں وہ سب سرمایۂ ناز و افتخار آسودہ ہیں۔ ان سب کے حالات کے لیئے ایک جداگانہ کتاب درکار ہے۔ یہاں علی سبیل الاختصار تھوڑے سے ارباب کمال ظاہری و باطنی کا حال لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:۔

حضرت مولنا شاہ ابوسعید حضرت شاہ غلام علی صاحب کے خلیفۂ اعظم تھے آپ کے انتقال کے بعد یہی سجادہ نشین ہوئے۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے جو حضرت شاہ صاحب کے پیران پیر تھے اور واقع میں حضرت شاہ صاحب بھی آپ کو ویسا ہی سمجھتے تھے اور نہایت تعظیم و تکریم فرماتے تھے۔ علاوہ علو نسب کے صفات ذاتی اور کمالات ظاہری اور باطنی ایسے تھے کہ جن کا حد و حساب نہیں۔ حافظ کلام اللہ اور عاشق رسول اللہ علوم دینی آپ کو بہت مستحضر تھے اور دن رات اُنھیں کے درس میں گزارتے تھے۔ علم قرات میں یگانۂ روزگار تھے۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور کمال قرأت سے پڑھتے کہ لوگ دور دور سے سننے آتے۔ پہلے پہل تو آپ نے مولنا شاہ درگاہی صاحب علیہ الرحمۃ سے کہ بڑے اولیائے وقت سے تھے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تھی اور نسبت باطن بخوبی حاصل کرکے پیری و مُریدی کی اجازت لی تھی۔ لیکن اپنے خاندان کی نسبت نے زور کیا اور طریقۂ نقشبندیہ کی طرف کھینچا تو آپ نے دوبارہ حضرت شاہ غلام علی صاحب سے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی اور از سرنو تمام مقامات کو حاصل کیا۔ آپ کی شکل و شمایل بہت نورانی تھی بے اختیار آپ کی صحبت میں حاضر رہنے کو دل چاہتا اور جب تک بیٹھتے وسوسۂ شیطانی ایک نہ آتا اوقات آپ کی بعینہٖ حضرت شاہ صاحب کی اوقات تھی صرف خالصًا للہ مشق خط نسخ قلم خاں صاحب سے کی اور کلام اللہ لکھ کر وقف کیئے اگرچہ تعلقات ظاہری اہل و فرزند آپ کے حضرت شاہ صاحب کی نسبت زاید تھے لیکن ویسی ہی بےتعلقی بھی

حاصل تھی۔ باہمہ او بے ہمہ سے بھی کچھ زیادہ قدم رکھا تھا۔ اتباع سنت نبوی صلعم بدرجۂ کمال تھا۔ کوئی بات خلاف سنت نہ کرتے اور ہر دم پیروی سنت ہی کا خیال رکھتے۔ اخلاق محمدی اس وسعت سے تھا کہ ہر شخص ملنے والا یہی جانتا تھا کہ جیسی عنایت اور شفقت آپ کو میرے حال پر ہے اس سے سوا دوسرے پر نہیں۔ حقیقت میں تواضع کو بدرجۂ کمال پہونچایا تھا اور سخاوت کو حد سے زیادہ اختیار کیا تھا۔ حضرت شاہ صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو ابو سعید سے فخر ہے۔ میں نے اگر تقصیری کی تو کیا کہ کسی کا کچھ غم نہیں رکھتا۔ ابو سعید کو دیکھو کہ باوصف علائق دنیاوی کے کیا اپنے معبود کی عبادت میں مصروف ہے کہ گویا مطلق کچھ تعلق ہی نہیں رکھتا۔ آپ کی صحبت سے ہر شخص کو ایک فیض ملتا اور اجماع خاطر اور توجہ الی اللہ حاصل ہوتا۔ بعد انتقال شاہ صاحب کے آپ اُن کی جگہ مسند ارشاد پر بیٹھے اور سالہا سال لوگوں کو آپ کے فیض صحبت سے علو مراتب اور کمال مدارج حاصل ہوئے کہ اسی اثنا میں آپ کو غلبہ محبت حضرت رسالت پناہی کا ہوا اور آپ زیارت حرمین شریفین کو تشریف لے گئے۔ بروقت مراجعت ٹونک میں آپ نے انتقال کیا۔ آپ کے لاشہ مبارک کو دلی میں لاکر خانقاہ میں حضرت شاہ صاحب کے پہلو میں دفن کیا۔ ولادت آپ کی سنہ ۱۱۹۶ھ میں ہوئی اور یہ مصرع تاریخ ولادت ہے ع۔ حافظ و عالم و ولی بادا۔ وفات آپ کی سنہ ۱۲۵۰ھ میں عید کے دن ہفتہ کو ہوئی اور یہی نور اللہ مضجعہ آپ کی وفات کی تاریخ ہے اور یہ قطعہ تاریخ وفات بھی ہے۔ قطعہ۔

امام و مرشد ما شاہ بوسعید سعید | بعید فطر چو شد واصل جناب خدا
دلے شکستہ و مغموم گفت تاریخش | ستون محکم دین نبی فتادہ زپا

مولنا شاہ احمد سعید صاحب

آپ شاہ ابو سعید صاحب کے بڑے بیٹے اور جانشین۔ والد ماجد کی طرح حافظ کلام اللہ و مطیع سنت رسول اللہ۔ اپنے پیروں کی طرح سلسلۂ ارشاد تلقین و استغراق جاری رہا۔ علم حدیث و فقہ و تفسیر میں درجۂ کمال تھا۔ دن رات مشغلہ درس و تدریس ہی کا تھا۔ مسائل دینی آپ کے فیض سے حل ہوتے تھے اور فتوے شرع شریف آپ کی

ہوئے مستعمل کیئے جاتے تھے۔ ولادت آپ کی ۱۲۰۸ھ میں ہوئی اور مظہر ربانی اُس کی تاریخ ہی۔ آپ نے شاہ غلام علی صاحب سے بیعت کی تھی اور اپنے والد ماجد سے بہت فیض حاصل کیا تھا۔

مولانا شاہ عبدالغنی صاحب آپ بھی جناب شاہ ابوسعید صاحب کے فرزند ہیں اور حقیقت میں فخر خاندان تھے۔ آپ کا طور ہی جدا تھا اور رنگ ڈھنگ ہی نرالا۔ آپ بھی حافظ کلام اللہ اور محدث تھے آپ کی ولادت ۲۵ شعبان ۱۲۳۴ھ میں بروز شنبہ عشا کے وقت ہوئی۔ خورد سالی ہی میں شاہ غلام علی صاحب آپ کو توجہ دیا کرتے تھے۔ جب بڑے ہوئے اپنے والد ماجد سے بیعت کی اور طرح طرح کا فیض حاصل کیا بعد اُن کے انتقال کے مرزا شاہ غفور بیگ صاحب سے کہ بڑے خلفاے حضرت شاہ غلام علی صاحب کے تھے اور قوت نسبت بدرجۂ کمال رکھتے تھے ہزار در ہزار فیض حاصل کیئے۔ اوقات آپ کی بہت خوب مسجد میں بیٹھے رہنا اور طریقۂ محمدی کا برتنا بس یہی آپ کا مقصود اصلی تھا۔ اس تقوے اور ورع کو خیال فرمایئے کہ صرف اس خیال سے کہ ہندوستان میں جو طریق بیع و شرا بعض بعض فواکہ وغیرہ کا جاری ہی او روہ نے شرع شریف کے درست نہیں اُن چیزوں کے مزے تک سے آپ واقف نہ تھے۔ فانی السنت محوی الشریعت اور شہسوار میدان طریقت اگر پوچھو تو در اصل آپ تھے۔ جو شخص ادنی ادنی باتوں میں ایسا محتاط ہو تو اسی پر سے اندازہ کیجئے کہ بڑی بڑی باتوں میں کیا درجہ احتیاط اور کیا رتبہ اتقا کا ہوگا۔

حاجی علاءالدین احمد صاحب آپ شاہ آفاق صاحب کے خلیفہ اور سجادے تھے آپ اپنے مرشد کی طرح بڑے بزرگ تھے۔ تمام عمر فقیری میں بسر کی دُنیا وما فیہا سے خبر نہ رکھی تھی۔ آپ کا نسب خواجہ یوسف ہمدانی تک منتہی ہی۔ توکل علی اللہ اور عشق رسول اللہ ہر وقت آپ کے برتاؤ میں ہی۔ عالم جوانی میں فریضۂ حج ادا کیا۔ اور آخر عمر تو سے سال میں آپ بصارت سے معذور ہو گئے تھے اور پاؤں سے اُٹھ نہیں سکتے تھے طاقت نے جواب دے دیا تھا

مگر ہر دم شغل جاری اور صوم وصلوٰۃ قایم سبحان اللہ کیا لوگ تھے کہ کسی حالت میں اپنے معبود کی یاد سے ایک لمحہ غافل نہیں۔

مولنا فخر الدین علیہ الرحمۃ آپ کے والد بزرگوار مولنا نظام الحق والملۃ والدین ساکن موضع نکرون من مضافات لکھنؤ تھے نسب آپ کا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک پونہچتا ہے اور والدہ ماجدہ آپ کی زبدۂ اولاد حضرت مخدوم سید محمد گیسو دراز سے ہیں۔ اگرچہ مولد جناب موصوف کا اورنگ آباد دکن ہے لیکن دہلی میں مدۃ العمر تشریف فرما رہے۔ والد ماجد حضرت مرحوم مغفور کے اوائل حال میں اورنگ آباد سے دلی میں وارد ہوے۔ اگرچہ اول میں فقط تحصیل علوم رسمی مدنظر تھی لیکن چوں کہ مشیت ایزدی یہ تھی کہ آپ کے خاندان سے لوگوں کو فیض پونہچے اس لیے حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کی خدمت میں جن کا سلسلہ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی تک پونہچتا ہے فائز ہو کر شرف بیعت سے مشرف ہوے اور بعد اکتساب علوم ظاہری ومعنوی خلافت سے سرفراز ہوے اور آخرالامر اورنگ آباد معاودت کی اور سالہا سال خلق کو فیض یاب کر کے ۱۱۴۲ھ میں وفات پائی۔ مولنا نے اپنے والد ماجد سے تحصیل علوم ظاہری و باطنی کے بعد خلافت پائی اور بعد اس کے چند روز نواب نظام الدولہ ناصر جنگ اور ہمت یار خاں کی سرکار میں بسر کی۔ بعد چندے وہاں سے اجمیر شریف آے اور چندے حضرت خواجہ صاحب کے آستانہ پر حاضر رہے اور بعد ۱۱۶۵ھ میں دہلی آے۔ یہاں بھی آپ سے بہت لوگوں کو فیض پونہچا۔ جتنے امراء ذوالاقتدار اور سلطان عہد تھے آپ کی بیعت سے مشرف ہو کر آپ سے فیض یاب ہوتے تھے۔ لیکن حضرت باوجود اس ہجوم ارباب دنیا کے ہر ادنی کے ساتھ وہ خلق محمدی خرچ کرتے کہ اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ آپ بالکل سادی وضع رہتے اور لباس درویشانہ اور جبہ اور عمامہ فقیرانہ کے چنداں مقید نہ ہوتے کتاب نظام العقائد اور رسالۂ مرجیہ اور فخر الحسن حضرت کی تالیفات سے ہیں۔ اُن کا دیکھنا آپ کی مہارت علمی پر دلیل قاطع و برہان ساطع ہے سن شریف (۸۰) تک پونہچا اور ۱۱۹۹ھ میں عالم بقا کو راہی ہوے "خورشید دوجہانی" آپ کی رحلت کی تاریخ ہے مزار آپ کا متصل دروازۂ چار دیواری مرقد مبارک حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے واقع ہے۔

حضرت مولنا قطب الدین صاحب

حضرت موصوف کے فرزند ارجمند ہیں اور حضرت کی وفات کے بعد مسند خلافت پر متمکن رہے۔ آپ کی تعریف یہی کافی ہے کہ ایسے چمن کے نونہال اور ایسے نونہال کے ثمر تھے۔ ؎
اصل و فرعے را کہ بینی حاصل یک ہا اند آفتاب و پرتوش از ہم جدا نتواں گرفت
۱۷ محرم الحرام سنہ ۱۲۰۰ھ میں آپ کا وصال ہوا اور جوار حضرت شاہ قطب صاحب میں آسودہ ہیں۔

حاجی غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب

حضرت مولنا قطب الدین صاحب کے فرزند ارجمند ہیں آپ نہایت متواضع۔ منکسر المزاج اور مسکین تھے۔ کسی دم وظیفہ و وظائف سے خالی نہ رہتے تھے۔ بات بھی کم کرتے تھے۔ جب کوئی پوچھے تو ناچار جواب دینا ہی پڑتا تھا۔ اگرچہ اس وقت ظاہر میں زبان شغل سے باز رہتی تھی لیکن دل اسی طرح مشغول حق رہتا تھا۔ بہادر شاہ بادشاہ اور جمیع امراے عظام آپ کے نہایت معتقد تھے۔ جس مجلس میں آپ تشریف لے جاتے تھے ہر شخص بے اختیار دوڑتا اور قدموں پر گرتا اور اپنی سعادت ابدی سمجھتا تھا۔ آپ پر شوق الہی غالب ہوا تو اپنے دادا صاحب سے فیض حاصل کرنے کو دل چاہا اگرچہ وہ فیض سینہ بسینہ آپنے اپنے والد مرحوم سے پایا تھا لیکن یہ شوق ایسا ہے اور یہ نعمت وہ ہے کہ طالب اسکا بس نہیں کرتا جتنا دیتے جاؤ اُتنا ہی اور مانگتا ہے آپ نے سفر اختیار کیا اور زیارت حرمین شریف سے مشرف ہوے اور پاک پٹن شریف تشریف لے گئے اور شاہ سلیمان کی خدمت میں حاضر ہوے۔ کہتے ہیں کہ شاہ سلیمان صاحب اس بات کو نہایت غنیمت سمجھے اور اُن کے قدوم میمنت لزوم سے بہت فخر کیا۔ چند مدت آپ وہاں رہے اور جو کچھ فیض اور برکات اپنے دادا کے تھے اُن کی پھر تجدید کی اور رخصت ہوکر دہلی تشریف لاے اور یہیں انتقال کیا۔

خواجہ محمد نصیر صاحب

آپ کے صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ حیطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ آپ نواسے تھے خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے جو بڑے نامی گرامی مشایخ تھے اور اُن کا نام تمام عالم میں مشہور ہے۔ ولادت

آپ کی ۱۱۵۸ھ میں ہوئی۔ آپ نے چھٹ پنے ہی میں خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ سے بیعت کی تھی۔ آپ دس ہی برس کے تھے کہ خواجہ صاحب نے انتقال کیا آپ کو اکثر علوم خصوصاً ریاضیات میں بڑا دخل تھا۔ علم موسیقی بھی خوب جانتے تھے کہ بڑے بڑے استاد بھی آپ کے سامنے کان پکڑتے اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے۔ علم حساب کو اس سے بھی زیادہ جانتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں فنوں میں آپ کی تصنیفات کے رسالے موجود ہیں۔ یہ توصفات ظاہری تھے کمالات باطنی میں ان سے بھی کہیں رتبہ بڑھا ہوا تھا۔ وہ مقام ہی اور تھا۔ کمالات باطنی خواجہ میر اثر سے کہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے حاصل کیے۔ جب خواجہ میر اثر کا انتقال ہوا تو خواجہ میر صاحب کے فرزند سجادہ نشین ہوئے جب اُن کا بھی انتقال ہوگیا تو آپ سجادے ہوئے۔ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیویں کو مجلس مین نوازی کی آپ کے روبرو ہوا کرتی تھی۔ آپ کو صبر میں درجۂ کمال تھا اور دنیا سے مطلق لگاؤ نہ تھا۔ آپ بڑے عالی خاندان تھے۔ نسب خواجہ میر درد کا نواب ظفر خاں جہانگیری تک پہونچتا ہے اُن کے پوتے خواجہ محمد ناصر صاحب منصب داران شاہی میں سے تھے کہ یکایک خداطلبی کا شوق ہوا اور شیخ سعد اللہ المعروف بہ شاہ گلشن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مدت تک فیض حاصل کیا اور اس دنیائے دوں کو چھوڑ چھاڑ کر بموجب ہدایت شاہ گلشن صاحب کے خواجہ محمد زبیر صاحب سے بیعت کی اور بہت جہد اور مجاہدہ کیے اور قطب وقت ہوئے کہ اب تک یہ سلسلہ بہ سلسلہ چلا آتا ہے۔ والد ماجد آپ کے میر کلو صاحب اکبرآبادی بہت صحیح النسب سادات سے تھے اور نسبت دامادی کی خواجہ میر درد سے رکھتے تھے اور بیعت بھی انہیں سے کی تھی۔ ۲ شوال ۱۲۶۱ھ کو آپ نے وفات پائی۔ کبھی کبھی آپ شعر بھی کہا کرتے تھے اور رنج تخلص کرتے تھے۔

حضرت شاہ غیاث الدین قدس سرہٗ

اولاد حضرت خواجہ مودود چشتی علیہ الرحمۃ سے تھے۔ آپ کا عرف "خواجہ لکھنادی والا" تھا۔ بہ سبب حسن اوقات و کثرت طاعات کے معتقنات روزگار سے تھے۔ آپ کو خلق

مجسم کہنا چاہیئے۔ آپ کے اوضاع و اطوار خلق محمدی کے مصداق تھے۔ رات دن اوراد و وظائف میں مصروف رہتے تھے۔ بڑے بزرگ تھے ہزاروں ہی آپ سے مستفید ہوتے تھے۔

مولانا محمد حیات آپ پنجاب کے رہنے والے تھے اُسی نواح میں تحصیل علوم سے فراغ حاصل کر کے چندے مختلف مقامات ہند میں طالب علمی کی اور اسی سلسلے میں دہلی تشریف لائے۔ ابتداءً شاہ سید صابر علی معروف بہ صابر بخش رح کی خانقاہ میں فروکش ہو کر درس علوم معقول و منقول میں مصروف رہے۔ چوں کہ آپ کے علم و فضل کا شہرہ دور دور تھا طلبا مختلف دیار و امصار کے حاضر ہو کر دولت علم سے مالا مال ہوتے۔ ازبس کہ آپ کی طبیعت میں ترک غالب تھا آپ پاک پٹن تشریف لے گئے اور حضرت سلیمان صاحب کی خدمت سے مشرف ہوئے وہاں سے بعد تصفیہ قلب و تزکیۂ نفس پھر دہلی آئے ان دنوں شاہ صابر بخش صاحب کا وصال ہو چکا تھا خانقاہ میں نہ رہ کر ایک مسجد میں کہ قریب قلعے کے تھی رہنے لگے۔ آپ کی وجہ سے وہ مسجد ایسی آباد ہوئی کہ ساری خلقت وہیں ٹوٹی پڑتی تھی۔ آثار الصنادید میں اُس وقت آپ کا سن شریف ستر سال کا لکھا ہوا ہے۔

حضرت سید احمد صاحب آپ سادات عظام و مشایخ کرام سے تھے۔ آپ کا وطن بریلی تھا۔ حصول علم کا شوق آپ کو دہلی کھینچ لایا اور حضرت مولانا عبد القادر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مسجد اکبرابادی میں رہنے لگے اور علم صرف و نحو میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ ازبس کہ ذوق درویشی اور مسکینی طینت میں تھی اکثر خدمت مسجد اور اُن درویشوں اصحاب کی جو دور دراز سے حصول علم باطنی کے لیئے مولانا عبد القادر صاحب کی خدمت میں آتے تھے مصروف رہتے اور اپنی اوقات کو طاعات و عبادات میں بدرجۂ غایت مصروف کیا تھا۔ اکثر مولانا ے مغفور فرماتے تھے کہ اس بزرگ کے احوال سے آثار کمال ظاہر ہوتے ہیں اور مادہ اس سعادت منش کا ترقی مدارج علیا کے قابل نظر آتا ہے آپ نے مولانا شاہ عبد العزیز صاحب سے بیعت کی بعد آپ چندے ٹونک کی طرف

نواب امیر خاں کی رفاقت میں رہے ازبس کہ شجاعت اور جواں مردی سادات صحیح النسب کا جوہر ہے اُس اثنار میں تردوات عظیمہ آپ سے ظہور میں آئے۔ پھر آپ ترک دنیا فرما کر دہلی تشریف لائے اور مسجد اکبر آبادی میں رہنے لگے۔ اس اثنار میں مولوی عبد القادر صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اور مولوی محمد اسمٰعیل قایم مقام علوم رسمی کی درس وتدریس میں مصروف تھے اور اہل باطن کی طرف چنداں ملتفت نہ ہوتے تھے اس وجہ سے طالبان فیض باطنی کا ہجوم آپ کے پاس رہنے لگا۔ پھر آپ نے حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا اور اپنے ساتھ قریب ایک ہزار آدمیوں کے لے گئے جن کے مایحتاج اور خرچ کے آپ خود متکفل رہے اور ادائے فریضۂ حج کے بعد پھر ہندوستان آئے۔ آپ چونکہ ترویج رسوم شرعیہ وامر بالمعروف بہت کرتے تھے اور منہیات کا رواج آپ کی وجہ سے بالکل اُٹھ گیا تھا۔ طرفہ یہ کہ کلکتے میں جب تک آپ رہے شراب مطلق بکنے نہ پائی اور کلال خانے بند رہے اور اُس نواح میں آپ کے مُریدوں کی کثرت لاکھوں سے بھی بڑھ گئی اور آپ کے اکثر خلفا کو قطب اوتاد کا مرتبہ حاصل ہوا اور چونکہ ازروے کشف باطن آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کو مع اکثر مومنین پاک اعتقاد کے سعادت شہادت ہونے والی ہے مولٰنا شاہ اسمٰعیل اور مولٰنا عبد الحی کو اجازت ہوئی کہ اطراف ہندوستان میں وعظ کہو اور بشیتر جہاد اور فضیلت شہادت بیان کرو ہر چند یہ اس کا منشا نہ جانتے تھے اور سمجھ نہ سکے کہ اس ارشاد کا کیا سبب ہے لیکن جو کہ مرید باخلاص تھے سرمو تجاوز نہ کیا اور فرمان بجا لائے۔ ان سے لکھو کھا مردم شاہ راہ ہدایت پر آئے اور شوق ماہو الحق دل میں جم گیا اور جہاد کی افضلیت ذہنوں میں بیٹھ گئی اور خود بخود چاہنے لگے کہ اگر جان و مال راہ الٰہی میں صرف ہو تو عین سعادت ہے۔ بعد مدت کے ان بزرگوں کو حضرت نے لکھا کہ اب ہمارے پاس چلے آؤ۔ یہ تو جاں نثار تھے ہی بمجرد حکم کے مشتاقین وعظ کو نیم جاں چھوڑ کر حاضر خدمت ہو گئے اور حضرت ان کو لے کر کوہستان کی طرف چلے گئے اور یہ ہنوز اس کے منشا سے واقف نہیں۔ جب تیغ تار پہنچے قوم افغان باآں کہ بڑے وحشی اور تندخو ہوتے ہیں حضرت کے ایسے معتقد ہوئے کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت امامت کی کی اور عہد

کیا کہ اگر حضرت جہاد کریں تو ہم سر فروشی کو حاضر ہیں۔ آپ نے سکھوں سے جہاد کیا چنانچہ افاغنہ کے سوا کوئی ایک لاکھ آدمی ہندوستان کے جمع ہوئے اور خطبہ آپ کے نام کا پڑھا گیا۔ دور دور امامت کی شہرت ہوئی۔ چند منزل تک عُشر جو اسلام میں ایک قسم کا خراج ہے آپ کے پاس آنے لگا۔ پشاور اور بعض اور مقامات سکھوں کی عملداری سے نکل کر غازیان اسلام کے قبض و تصرف میں آ گئے۔ سکھوں کی باوجود اس شان و شوکت و شان ظاہری کے آپ کا ایسا دبدبہ اور رعب دل پر چھا گیا کہ ملک دینے پر راضی ہوئے سچ ہے۔ ع - ہیبت حق ست ایں از خلق نیست۔ لیکن حضرت کو چونکہ اشاعت اور ترویج اسلام مرکوز خاطر تھی قبول نہ کیا۔ کئی سال تک یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ مولوی عبدالحی صاحب نے بیماری سے انتقال کیا۔ بعد اس کے قوم افاغنہ جو بندۂ زر اور بڑے لالچی ہیں سکھوں کی اغوا سے آپ سے منحرف ہو گئے اور عین معرکۂ جنگ میں آپ سے دغا کی۔ از بس کہ مشیت الٰہی مقتضی اس کی تھی کہ آپ کا مرتبہ درجۂ شہادت سے بلند کیا جاوے بالاکوٹ کے قریب آپ نے مع مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب اور بہت سے مسلمانوں کے شہادت پائی۔

رسول شاہیوں کا بیان

آرسول شاہ صاحب کا سلسلہ خانوادۂ سہروردیہ میں ہے اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک پہنچتا ہے۔ آپ پر جذب بہت غالب تھا اور ہمیشہ کوہستان اور بن میں پھرا کرتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن آ کر کوئی ٹکڑا ٹیڑا مل گیا تو منہ میں ڈال لیا ورنہ اس کی بھی پروا نہ تھی اور جس طرح کہ اہل جذب کا دستور ہے اسی طرح اپنے معبود کی عبادت میں مصروف رہتے اور دنیا و مافیہا سے خبر نہ رکھتے۔ کثرت جذب اس قدر تھی کہ تکالیف شرعیہ اُن پر سے ساقط ہو گئیں تھیں۔ لباس کی بھی کچھ قید نہ تھی۔ کوئی چیتھڑا سر پر باندھ لیا باندھ لیا ورنہ یہ بھی نہیں اسی طرح کبھی لنگوٹ کس لیا ورنہ یہ بھی نہیں غرضکہ عالم جذب میں رہتے اور صدہا کرامات اور خرق عادات آپ سے صادر ہوتے۔ آپ سادات بہادر پور مضافات الور سے تھے اصلی نام آپ کا سید عبدالرسول تھا وہاں کے لوگ بہت معتقد تھے۔ راجۂ الور بھی آپ کا معتقد تھا نشو و نما اپنی ریاست کا آپ ہی کی ذات فیض آیات سے سمجھتا تھا۔ آپ کو ابتدا ہی سے ایک جذب تھا۔ بارہ برس کی

عمر میں شاہ نعمت اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک دم میں جذب الی اللہ حاصل ہوا جنگل اور پہاڑوں میں نکل گئے اور شبانہ روز یاد الٰہی میں بسر کی۔ بعد وفات تکیہ رسول شاہیوں میں بمقام الور آپ کو دفن کیا بعد بسبب ایک حادثہ کے آپ کی ہڈیاں اکھاڑ کر فیروز پور جھرکے میں مدفون کیا۔

مولوی شاہ حنیف صاحب اصلی نام آپ کا مظفر حسین ہے۔ وطن میرٹھ۔ آپ ایک زبردست عالم خاندانی امیر تھے۔ نسب آپ کا نواب خیر اندیش خاں اور نواب فرحت اندیش خاں تک پونچتا ہے۔ ہمیشہ درس وتدریس میں معروف رہتے اور مسجد میں بیٹھے رہتے کہ یکایک رسول شاہ صاحب کا ایک فقیر پونچا اور آپ سے کہا چلو رسول شاہ بلاتے ہیں آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ فوراً ساتھ ہو لیے۔ وہاں پونچتے ہی آپ پر بھی اپنے پیر کی سی حالت جذب طاری ہو گئی اور اسی طرح عالم جذب میں بسر کی اور صدہا کرامات اور خرق عادات آپ سے ظاہر ہوئیں اول اپنے پیر کی طرح پہلے الور بعد فیروز پور جھرکے میں مدفون ہوئے۔ کبھی کبھی آپ عالم جذب میں شعر بھی کہتے تھے۔ ایک مثنوی گیان چوسر بطریق تصوف اور ایک شرح گلستاں آپ کی یادگار ہے۔ چند شعر آپ کے تبرکاً درج ہیں:-

(۱) دلِ بے خطرہ مظہر ذات ست | بحر بے موج عین مرآت ست
(۲) خدارا چہ جوئی تو خود را بجو | چو خود را بیابی تو ئی جملہ او
(۳) تو ببین خود را سر مو یک نفس | تا بدانی خالق خود ہر نفس
(۴) گر نبودے خود مقیم اندر بدن | کی شدے قایم زخود دیوار تن
(۵) گر نبودے باغباں در باغ تن | کی شدے رونق بہار ایں چمن

شاہ فدا حسین صاحب آپ کا اصلی نام خواجہ نجیب الدین احمد ہے۔ آپ خواجہ یوسف ہمدانی کی اولاد سے ہیں۔ اٹھارہ برس کی عمر سے فقیری اور خاکساری اختیار کی۔ بعد فراغ علوم تصوف میں بڑی دست گاہ حاصل کی فصوص الحکم وغیرہ کتب مشکلہ تصوف خوب پڑھاتے تھے۔ دنیا سے مطلق لگاؤ نہ تھا۔ اخلاق و خاکساری بدرجۂ کمال تھی۔ گوشہ نشینی و زاویہ گزینی حد سے سوا تھی۔ صحبت عوام الناس بہت ناپسند فرماتے تھے اور ہمیشہ تنہا بیٹھے رہتے تھے۔ تمام عمر خاک بدن سے

لی اور اینٹ سرہانے رکھی اور زمین پر یا پتھر پہ پڑے رہتے۔ بیس برس تک
الور میں اپنے پیر مولوی محمد حنیف کی خدمت میں رہے ان کی وفات کے بعد سجادہ
نشین ہوئے اور پھر دلی تشریف لے آئے اور چالیس برس تک ایک ہی حجرے
میں بیٹھے رہے۔ بعد اس کے الور کے راجہ بنے سنگھ نے بڑی تمنا اور آرزو
سے آپ کو بلایا کہ پھر آکر اسی تکیے میں رہیں۔ اگرچہ آپ کو اس زمانے
میں بسبب لحوق امراض متعددہ ہوش و حواس ظاہری نہ تھے لیکن آپ کے
مریدآپ کو اسی حال میں وہاں لے گئے اور چند مدت بعد وہیں آپ نے
۱۸ محرم ۱۲۵۹ھ میں جمعرات کے دن انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ آپ
کی ذات کبھی مغتنمات روزگار سے تھی اور صدہا خرق عادات آپ سے ظہور میں
آئیں۔ آپ حقیقت میں خاتم سلسلہ رسول شاہیہ ہوئے۔ آپ کی ذات فیض
آیات سے اس سلسلے کی رونق تازہ ہو گئی تھی۔ خلفا آپ کے بلاد دور دراز میں گئے
ہیں چنانچہ تبت اور سراندیپ اور مشہد وغیرہ بلاد میں رسول شاہی فقیر موجود ہیں
کبھی کبھی آپ شعر بھی فرماتے تھے۔ مثنوی بن موسر آپ کی طبع زاد ہے۔ اشعار فارسی

مرا عجز دیدن دیدار وجہ الله کارے نیست در دنیا
شفاعت را بجز ذات رسول الله بارے نیست در عقبیٰ

خویشتن را خود عیاں فرمودہ | صورتے از جسم و جاں ہنمودہ
کل نفس واحدہ فرمودہ | واحد فی کل نفس بودہ
اگر بخلوت دل یک زمانہ بنشینی | درون کعبۂ دل صورت خدا بینی
نسبت طاعت بخود عصیاں بود | نسبت عصیاں بخود عرفاں بود
چوں بہ ہر صورت بہ بینی یار را | خود بخود واقف شدی اسرار را
خویشتن را نیست دانستن وجود حق بود | از وجود خویش ہست دانستن شہود حق بود
عین ذات تو بود وحدت وجود | ایں صفات تو بودہ وحدت شہود
غیر وحشت نیست کثرت را وجود | غیر کثرت نیست وحدت را شہود

دین علی شاہ صاحب کا بیان علی حدہ آچکا ہے۔

خانم صاحب
ایک باخدا عورت تھیں۔ نہایت صاف باطن۔ بلی ماروں کے قریب شیر افگن خاں کی حویلی میں رہتی تھیں۔ ہر چند جذب مزاج پر غالب تھا لیکن نہ اس قدر کہ خود رفتگی کی نوبت پونہچے۔ بیشتر لوگ آپ کے پاس آتے اور جو آپ کہہ دیتیں وہی ہوتا۔

بائی جی
ایک عورت تھیں باکمال شہر شاہ جہاں آباد کے باہر پرانی عیدگاہ کے قریب ایک چھپیر میں تمام عمر بسر کردی معلوم نہیں کہ اصلی نام کیا تھا مگر لوگ بائی جی بائی جی ہی پکارتے تھے۔ اثناے کلام میں اکثر آیات قرانی فرماتی رہتی تھیں خصوصًا انا اعطینا کا بہت ورد تھا اور صاحب کرامت تھیں جو کہتیں وہی ہوتا۔

حاجی غلام علی نقیب الاولیار
زمانہ شاہی میں نقیب الاولیار کا بہت معزز عہدہ تھا۔ خبرگیری تمام فقیروں اور گوشہ نشینوں کی اور ان لوگوں کا وظیفہ وغیرہ سب اس سے متعلق تھا۔ اگرچہ دور آخر مغلیہ میں وہ بات نہ رہی تھی مگر نام چلا جاتا تھا۔ غرض کہ خواجہ غلام علی اسی عہدے پر مامور تھے اور نہایت صاحب کمال آدمی تھے صاحب نسبت اور عشق رسول مقبول میں چور۔ نماز وظیفے کے سخت پابند۔ صحبت فقرار و درویشوں سے فیض یاب۔ اسی شوق میں زیارت حرمین شریفین کی اور ہمیشہ روضۂ منورہ رسول مقبول کی یاد میں رویا کرتے تھے۔ آپ حضرت خواجہ ناصر الدین عبد اللہ احرار کی اولاد میں سے تھے جن کی تعریف میں مولٰنا جامی فرماتے ہیں ؎

چو فقر اندر لباس شاہی آمد
بتدبیر عبید اللٰہی آمد

آپ کے بزرگ محمد شاہ کے وقت میں ہندوستان میں آئے اور پہلے یہ عہدہ خواجہ رفیع الدین صاحب کو ملا پھر خواجہ محمد مراد اُن کے بھانجے کو اُن کے بعد خواجہ غلام علی صاحب کو۔ "غلام علی" تاریخ ولادت ہے اور یہ سجع ہے ؎ علی امام من است ومنم غلام علی آخرکار ۱۵ ذی حجہ ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی اور ترکمان دروازے کے باہر چونسٹھ کھمبے میں مدفون ہوئے۔

اطبار و حکمار

حکیم احسن اللہ خاں صاحب کا ذکر علیحدہ آچکا ہی۔

حکیم غلام نجف خاں صاحب ابن حافظ محمد مسیح الدین شیخو پوری ساکن شیخو پور کہ بدایوں کے مضافات سے ہی۔ اصل میں شیخ فاروقی ہیں اور بسبب عنایت سرکار شاہی کے خطاب خانی سے سرفراز ہوے۔ جد ششمیں ان کے شیخ فرید المخاطب محتشم خاں امراے جلیل الشان عہد جہاں گیری شاہ جہاں سے تھے کہ منصب پنج ہزاری ذات و پنج ہزاری سوار سے سرفراز تھے۔ بموجب آپکی خواہش کے جہانگیر بادشاہ نے چار ہزار بگہ اراضی موضع مولیا میں سے آبادی وسکونت کے واسطے مرحمت فرمائی۔ اُس سرزمین میں ایک قلعے کی بنیاد ڈالی اور اُس کا نام جہانگیر کے نام پر شیخو پور رکھا کیوں کہ ایام شاہزادگی میں جہانگیر کا نام مرزا شیخو ہی مشہور تھا۔ والد شیخ فرید صاحب کے نواب قطب الدین خاں نبیرہ حضرت سلیم چشتی فتح پور سیکری کی اولاد میں سے ہیں۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں صوبہ دار صوبہ بہار اور جہانگیر کے عہد میں منصب پنج ہزاری ذات وسوار و خلعت خاصہ و شمشیر و اسپ خاصہ بازین مرصع اور عنایات شاہانہ سے سرفراز ہوکر دارالملک بنگالہ اور اوڑیسہ کی صوبہ داری سے کہ پچاس ہزار سوار کی جاے تھی مامور ہوے۔ حکیم غلام نجف خاں صاحب اپنے خالو میر سید علی صاحب کے ساتھ پانچ سال کی عمر میں دہلی آئے۔ میر صاحب پہلے گورمنٹ انگریزی میں تحصیل دار رہے آخر کار نواب گورنر جنرل بہادر کے میر منشی ہوئے۔ ازبس کہ فن طب اشرف فنون ہو حکیم صادق علی خاں صاحب ولد احکم الحکما حکیم شریف خاں سے تحصیل کی اور مشق نسخہ نویسی و علاج معالجہ حاذق الملک حکیم احسن اللہ خاں کی خدمت میں بہم پہنچائی چوں کہ اُن کو حکیم احسن اللہ خاں سے قرابت قریبہ بھی تھی اُن کی تعلیم میں کمال کوشش کی یہاں تک کہ یہ شہر کے مشاہیر اطبا سے ہوے اور حضور بادشاہ سراج الدین بہادر شاہ سے خطاب عضد الدولہ اعتماد الملک حکیم غلام نجف خاں بہادر پایا پھر بعد سرکار کمپنی بہادر سے عہدہ طبابت

مامور رہے۔ قدرت الٰہی سے ایسا دست شفا پایا تھا کہ وہ امراض جن کو نادوا اور سلا علاج کہتے تھے آپ کی ادنیٰ توجہ سے زائل ہو جاتے تھے۔ جناب شفاء الملک حکیم رضی الدین خاں صاحب آپ کے پوتے تھے جنھوں نے طبابت میں بڑا نام پایا اور اب اُن کے صاحب زادے حکیم ناصر الدین خاں صاحب عرف چنو میاں قدم بقدم اپنے والد ماجد و جد امجد کے دہلی کے چوٹی کے طبیبوں میں ہیں۔ آپ کا مطب بھی صبح سے شام تک بیماروں سے بھرا رہتا ہے۔ علاوہ شہر کے لوگوں کے دور دور سے لوگ آتے ہیں اور صحت پاکر اپنے وطنوں کو جاتے ہیں۔

حکیم صادق علی خاں صاحب و دیگر اطبائے نامی گرامی

حکیم صادق علی خاں صاحب سرآمد حکما حکیم شریف خاں کے صاحبزادے تھے اور اپنے والد ماجد کی طرح فن طبابت میں یکتائے روزگار تھے جن کی قدامت کا شہرہ دور دور بلاد و امصار میں تھا۔

اسی طرح حکیم امام الدین خاں صاحب بڑے نباض تھے۔ ان کے بزرگوں کو سرکار شاہی سے مناصب جلیلہ اور مراتب بلند عطا ہوتے رہے ہیں اور یہ خود بھی حضرت جہاں بانی کی طرف سے عہدۂ طبابت پر مامور تھے۔ حکیم غلام حیدر خاں صاحب ارشد تلامذہ حکیم شریف خاں سے تھے اساتذۂ کرام مثل مولانا شاہ عبد العزیز صاحب و مولوی رفیع الدین و مولوی عبد القادر صاحب ارفع اللہ درجاتہم سے سالہا سال استفادہ کیا اور انواع و اقسام کے فیوض حاصل کیئے شفائے کامل ان کے دست حق پرست میں ودیعت تھی۔ حکیم نصر اللہ خاں آپ بھی احکم الحکما شریف خاں کے شاگرد تھے۔ پہلے نواب فیض محمد خاں رئیس جھجر کی سرکار میں طبیب تھے۔ بعد اس کے اور معزز عہدوں پر رہے پھر بہ نظر قدامت نواب عبد الرحمٰن خاں رئیس جھجر کے ہاں مامور رہے۔ حکیم فتح اللہ خاں برادر کہین حکیم نصر اللہ خاں نواب اکبر علی خاں رئیس پاٹودی کی سرکار میں عہدہ طبابت پر مامور تھے۔ حکیم پیر بخش خاں حضرت بادشاہ خلد آرام گاہ محمد اکبر شاہ کی پیشگاہ سے بخطاب حکیم دوراں مخاطب تھے۔ آپ کے آباواجداد کا وطن تھانیسر تھا لیکن خود ان کا مولد اور مسکن شاہجہان آباد تھا۔ تحصیل علم طب حکیم نصر اللہ خاں صاحب سے

اور مشق نسخہ نگاری و معالجہ مرزا حکیم احسن اللہ خاں کی خدمت میں کی اور اس فن میں دستگاہ کامل بہم پہونچائی۔ ایک عرصہ تک نواب بہادر جنگ رئیس بہادر گڈھ کی سرکار میں طبیب رہے حکیم حسین بخش خاں یہ بھی نھانیسر کے رہنے والے تھے۔ جمیع فنون و علوم مثل معقول و منقول و حکمت و ہندسہ ہیئیات میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ پہلے رئیس جھجر کے ہاں طبیب تھے بعد حضور سراج الدین بہادر شاہ میں اور صاحب عالم مرزا فخر الدین بہادر کی سرکار میں عہدہ طبابت پر رہے۔ ان کے علاوہ حکیم غلام حسن خاں حکیم محمد یوسف خاں حکیم عبد الحکیم معروف بہ آتو خاں سب بڑے بڑے حکیم گزرے ہیں۔ زمانہ حال کے نامی گرامی حکیموں میں سب سے بڑا ہوا مرتبہ جناب حکیم محمود خاں صاحب کا تھا جن کے فرزند اکبر حکیم محمد عبد المجید خاں صاحب حاذق الملک حکیم محمد واصل خاں صاحب دونوں صاحب کمال تھے۔ حکیم حسام الدین خاں صاحب عرف حکیم منجھلے حکیم بدر الدین خاں صاحب حکیم غلام رضا خاں صاحب حکیم اشرف علی صاحب۔ یہ سب صاحب بھی دہلی کے بڑے نامی گرامی اطبار تھے اا۔ اب جو موجود ہیں اُن کا ذکر اپنی اپنی جگہ آچکا ہے۔

مجذوبوں کا بیان

سید عسکری صاحب

سید حسن رسول نما کے نواسوں میں ہیں پہلے سپاہی پیشہ تھے اور نوکری چاکری کیا کرتے تھے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ کا گور الہ کی طرف ہوا اور آپ مولوی محمد حنیف صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ شعر پڑھا ؎

مستم چناں بکن کہ ندانم ز بیخودی
در عرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت

یہ سن کر آپ نے ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور کہا کہ جاؤ اپنے نانا کی قبر پر جا بیٹھو۔ اُس وقت سے ایک جذب غالب ہوا اور بالکل مست الست ہو گئے سر سید نے خود دیکھا ہے کہ آپ حضرت سید حسن رسول نما کے مزار کے پاس زنجیروں سے

جکڑے ہوئے بیٹھے رہتے تھے ۔ مجال نہ تھی کہ کوئی آپ کی طرف نگاہ بھر کے دیکھ سکے ۔ آثار الصنادید لکھنے سے پہلے ہی آپ کا انتقال ہو چکا تھا۔

میر قطبی صاحب سادات کبار میں سے تھے ۔ اوائل حال میں مصروف عبادت رہتے تھے اور چوں کہ ہمیشہ سے سلوک پر جذب غالب تھا رفتہ رفتہ نوبت از خود رفتگی کی پونہچی اور ترک لباس کرکے ستر عورت سے بھی فارغ ہوگئے ۔ اکثر اوقات خرق عادات و کرامات جلی آپ سے سرزد ہوئیں عرصہ ہوا کہ انتقال کر گئے ۔

شاہ عبد النبی صاحب کملائے دہر سے تھے ۔ اوائل حال میں رہنے کا کوئی مقام مقرر نہ تھا جہاں جگہ ملی پڑ رہے کبھی کسی کونے میں کبھی دیوار کے سایہ میں بسر کرتے ۔ جب تک مولنا شاہ عبد القادر صاحب زندہ رہے اکبر آبادی مسجد میں رہتے تھے ۔ رات کسی کونے میں پڑ جاتے اور صبح سے شام تک مسجد کے سامنے نہر کے ایک منبع پر بیٹھے رہتے برسوں اسی طرح گزار دیئے ۔ وہیں اہل حاجت آپ کی خدمت میں پونہچتے ۔ مولوی عبد القادر صاحب بھی طالبان با اخلاص کے سامنے اکثر آپ کی تعریف بیان فرماتے ۔ جب مولوی صاحب بیمار ہوئے اور صاحب فراش ہوئے جبکہ نوبت نفس واپسیں کی پونہچی یہ بزرگ اپنا بستر کندھے پر ڈال کسی طرف کو چلے گئے چوں کہ یہ امر خلاف عادت تھا لوگ اس حرکت سے متعجب ہوئے ۔ آپ کے پاس جاکر دیکھا تو کلمات تاسف آپ کی زبان پر جاری تھے اور یہ کہتے تھے کہ اب قدر دان ہمارا دنیا سے چلا گیا ہم یہاں رہ کر کیا کریں گے اور اس طرح چلے گئے کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کدھر گئے کچھ دیر کے بعد مولنا کا انتقال ہوا چوں کہ وہ کبھی مسجد کے اندر نہیں جاتے تھے اور باہر سر راہ بیٹھے رہتے تھے ۔ مولنا کے انتقال پر آگاہ ہوجانا آپ کا کشف تھا ۔ تھوڑے دنوں بعد پھر آکر جامع مسجد کے ایک حجرے میں رہنے لگے ۔ کرامتیں آپکی اکثر مشاہدہ ہوئی ہیں اور باوجود غلبۂ جذب کے نماز کی طرف بھی اکثر مصروف رہتے تھے لیکن پابند اوقات معینہ کے نہ تھے اور اکثر ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے قرآن مجید لکھا کرتے تھے اور کسی سے بات نہ کرتے

تھے مرتے دم تک یہی ایک حالت رہی۔ اکثر صاحب مقدور آپ کی خبر گیری کرتے خصوصاً بخشی بھوانی شنکر جو دہلی کے روساء میں سے تھے دو وقتہ دہی اور پیڑے جو آپ کی خوراک تھی بھیجا کرتے تھے اور یہی کھاتے تھے جس سے نہ کوئی نقصان ہوا نہ کبھی بیمار پڑے باوجودیکہ ستر برس کی عمر تھی لیکن رنگ ایسا سُرخ و سفید تھا جیسا کہ عالم جوانی میں ہوتا ہے۔ تمام عمر میں ایک ہی دفعہ بیمار ہوئے جو مرض الموت تھا۔ مدتیں ہوئیں کہ اس سرائے چند روزہ کو چھوڑ کر عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

میر احمد دیوانہ آپ کے ابتدائی حالات تو کچھ معلوم نہیں ہمیشہ ازخود رفتہ اور جنون زدہ رہتے تھے مگر اس پر بھی اہل غرض کا ہجوم رہتا تھا اور بہت کچھ آپ سے منفعت پہنچتی۔ شب و روز بہ حلّی قبر کے نواح میں جہاں کہیں کسی دکان میں جگہ خالی ملی رات کو پڑ رہتے تھے۔ باوجود ازخود رفتگی کے کسی نے آپ کو برہنہ نہیں پایا۔

علمائے دین

مولوی رشید الدین خاں صاحب جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول عالم باعمل تھے۔ آپ مولنٰا رفیع الدین کے شاگرد تھے اور اُن کی خدمت میں ایسا اخلاص وافر رکھتے تھے کہ حضرت موصوف آپ کی تربیت میں مادام الحیات ایسے مصروف تھے جیسے کہ باپ اپنے بیٹے کی تربیت میں۔ اگرچہ کسب کمال آپ کے دونوں بھائیوں مولنٰا عبد العزیز اور مولنٰا عبد القادر رحمۃ اللہ علیہما سے بھی کیا تھا لیکن تکمیل جمیع فنون مولنٰا رفیع الدین صاحب سے ہی کی۔ ہرچند سب علوم و فنون متداولہ میں تبحر کامل رکھتے تھے لیکن خاص کر علم ہیئاۃ و ہندسہ میں بہت ملکہ تھا۔ مدۃ العمر فرقہ امامیہ کے علماء سے مباحثہ و مناظرہ کیا اور باہم تحریریں بھی اس بحث میں متعدد رسالے فراہم ہو گئے۔ طریقہ مناظرے کا ایسا جواب تھا کہ تقریر یا تحریر میں خصم کو بجز اعتراف عجز کے چارہ نہ تھا۔ تقویٰ و زہادت و تشرع و عبادت محتاج بیان نہیں۔ ہرچند حکام وقت چاہتے تھے کہ آپ کو عہدۂ قضا سپرد کریں تاکہ ان کی نیک نیتی اور عدل و انصاف سے خلق اللہ کی حق رسی ہو لیکن چونکہ اپنی اوقات کو بیشتر ترتیب مستفیضان کمال میں مصروف رکھتے تھے

قبول نہ کیا لیکن جب احباب کا بہت تقاضا اور احکام کی طرف سے ایسا ہوا تو کمال قناعت سے مدرسی مدرسۂ شاہجہان آباد قبول کی۔ ازبس کہ ایثار و کرم جبلی تھا سو روپیہ کی تنخواہ اُن کو ہرگز کفایت نہ کرتی تھی اور ہمیشہ خدمت فقرا اور مساکین کیا کرتے تھے اور قدمے و درمے وسخنے ہر وقت امداد کو موجود رہتے تھے۔ رباعی

بے دل ز دار در ز طبع اہل ہمت
آثار سخا جلوہ بجندیں صورت
با بے خرداں پند و بہ محتاجاں سیم
با خورداں لطف و با بزرگاں خدمت

عمر آپ کی قریب ستر برس کے تھی۔ آخر عمر میں ارادہ بیت اللہ کا کیا۔ چوں کہ ارادۃ اللہ غالب علی ارادۃ الناس مرض صعب میں مبتلا ہوئے۔ اور وفات پائی۔ بسبب کثرت توغل علوم دینیہ اور مباحث علمی انشاے نظم کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوتے تھے مگر تکلیف خطاب اور بہانۂ جواب سے گاہ گاہ نثر عربی کا اتفاق ہوتا تھا۔ عربی عبارت کا نمونہ ہم نے بخوف طوالت چھوڑ دیا۔

مولانا مولوی عبدالحی صاحب آپ مولانا عبدالعزیز صاحب کے داماد اور شاگرد تھے بڑے بھاری عالم اور ہر فن کے اُستاد کامل تھے۔ ایک مدت تک درس و تدریس کا مشغلہ رہا آخر میں سید احمد صاحب سے جن کا ذکر اولیاء و صلحاء کے ضمن میں آچکا ہے پہنچ کر بیعت کی اور تادم زیست اُن کے سایۂ عاطفت سے کبھی علحدہ نہ ہوئے انہیں کے ساتھ حج بھی کیا وہاں سے واپس آکر چندے وعظ فرماتے رہے بعد مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب کے ساتھ ترغیب جہاد فی سبیل اللہ میں سرگرم رہے۔ جب سید صاحب اس ارادے سے کوہستان کی طرف تشریف فرما ہوئے اُسی نواح میں چند سال تک رفیق رہے اور پھر مرض بواسیر کی شدت سے سفر ناگزیر اختیار کیا۔

مولانا مولوی اسمٰعیل علم برکش ای آفتاب بلند

تبال ای دل رعد چوں کوس شاہ
خراماں شو ای ابر مشکیں پرند
ببار ای ہوا قطرۂ ناب را
بخند ای لب برق چوں صبح گاہ
بگیر ای صدف در کن این آب را

برای دُور از قعر دریائے خویش تاج سر شاہ کن جائے خویش

آپ بڑے مشہور جامع کمالات صوری و معنوی نکتہ سنج کلام الٰہی و حدیث نبوی عالم معقول و منقول تھے۔ آپ کو مولنٰا شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولنٰا شاہ رفیع الدین صاحب اور مولنٰا شاہ عبدالقادر صاحب غفر اللہ لہم کے ساتھ نسبت برادر زادگی کی تھی اور چوں کہ ان کے والد کے انتقال کے بعد اپنے فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا اور آپ کی نواسی بھی ان سے منسوب تھی لہذا آپ کی تعلیم و تربیت میں خاص اہتمام فرماتے تھے۔ پندرہ سولھا برس کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہو گئے۔ بیشتر کتب علم معقول پر حواشی تحریر کیئے اور ایک رسالہ منطق میں لکھا اور ایک رسالہ قرۃ العینین فی اثبات رفع یدین تالیف کیا اور اسی طرح متعدد رسالے آپ کی یادگار ہیں۔ اوائل حال میں ازبس کہ فیض باطن کا بہت خیال تھا۔ جناب میر احمد صاحب قدس سرہ العزیز کی خدمت میں اعتقاد بہم پہنچا اور اُن سے کسب فیض باطن کیا اور پیر کی رفاقت ہی میں مناسک حج ادا کیئے اور وہاں سے ہندوستان واپس آکر ہدایت و ارشاد سے خلق اللہ کو راہ راست دکھائی اور وعظ و نصائح سے اہل غفلت کے کان کھول دیئے اور آوازہ اعلام سنت و ہدم بنیان شرک و بدعت کا سب کے کانوں تک پہنچ گیا۔ بعض لوگوں نے آپ کی مخالفت شروع کی اور درپے اذیت ہو گئے کیوں کہ اُن کی طرف سے لوگ ضعیف العقیدہ ہو گئے تھے لیکن چوں کہ حق اور راہ راست پر تھے ہدایت و ارشاد سے باز نہ آئے اور خلق کو یہاں تک توفیق اختیار سنت نبوی اور ترک بدعات و احداث کی ہوئی کہ لوگ واحدانیت کے رنگ میں رنگ گئے اور مفسدوں کا بازار سرد ہو گیا اور لوگوں نے جان لیا کہ یہ لوگ بالطمع اخذ و جر ہم کو سبز باغ دکھلاتے رہے۔ اب لوگوں کو ایسی توفیق نماز کی ہوئی کہ مسجد جامع میں نماز جمعہ کے واسطے ایسی کثرت ہونے لگی جیسی عیدگاہ میں نماز عیدین پر ہوتی ہے۔ آپ کی عادت یوں تھی کہ روز جمعہ اور سہ شنبہ کو مسجد جامع میں وعظ فرماتے تھے۔ ہزاروں آدمی جمع ہوتے تھے۔ بدعتی لوگ جو بھڑکا دیتے تھے وعظ میں ایسی زبردست اور مدلل تقریر فرماتے تھے کہ لوگوں کے سارے شک دھل جاتے تھے۔ پھر آپ جہاد کے

فضائل بیان فرمانے لگے جس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کا آئینہ باطن مصفا اور مجلی ہو گیا
اور راہ حق میں ایسے سرگرم ہوئے کہ بے اختیار چاہنے لگے کہ سر اُن کا راہ خدا
میں فدا ہو اور جہاں اُن کی اعلائے لواے دین محمدی میں صرف ہو۔ پیر کی طلب
تشریف لے گئے اور بہ اتفاق حضرت ممدوح جہاد پر کمر باندھی اور کوہستان میں
تشریف لے جاکر اطراف ہندوستان میں خطوط طلب بھیجے۔ اس نواح سے
لوگ جوق جوق روانہ ہوئے اور سوائے کوہستانیوں کے صرف ہندوستانی
کوئی ایک لاکھ آدمی سے زیادہ آپ کے پاس جمع ہو گئے اور کار نمایاں راہ خدا
میں ظہور میں آئے۔ تائید الٰہی سے آپ کا رعب کفار کے دلوں میں ایسا متمکن ہوا
کہ آپ کا نام سن کر مقابلے کی جرأت نہ کرتے اور بھاگ جاتے۔ اتفاق تقدیر
سے لشکر کفار کو غلبہ ہوا اور قلعہ بالاکوٹ کے نواح میں ہمراہ پیر طریقت اور اکثر
مسلمین غزاۃ کے شہید ہوئے۔ آپ کی تصانیف متعدد ہیں جن میں زیادہ تر
متداول تقویۃ الایمان ہے۔

زبدۃ المحدثین مولٰنا محمد اسحاق صاحب

گہر نثار کند بر سر زباں چشم
مرا چو نام شریف تو بر زباں آید

آپ مولٰنا شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے ہیں۔ تمام
علم حدیث شاہ صاحب سے حاصل کیا اور بیس برس کامل
آپ کے حضور میں بیٹھ کر پڑھاتے رہے۔ امتناع سنت سے کوئی کام آپ سے
سرزد نہ ہوتا تھا۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے صورت اور سیرت دونوں عطا کی تھیں۔
آپ کی صورت سے آثار صحابیت ظاہر ہوتے تھے۔ حج کو تشریف لے گئے۔ وہاں
سے واپس آکر مواعظ و نصائح سے خلق کو راہ ہدایت دکھاتے رہے بعد ایک مدت
کے ازبس کہ شعائر اسلام میں ضعف اور رسوم کفر و بدعات میں قوت آتی جاتی تھی
نیت مصمم کر کے تمام قبائل کو ہمراہ لے کر راہی مکہ معظمہ ہوئے اور بادصفیکہ تمام
سکنائے شہر اور سلطان وقت بہ منت سماجت مانع آئے مگر چوں کہ شوق
ملا ہوا الحق غالب تھا آپ چلے ہی گئے اور مکہ معظمہ میں جاکر وطن اختیار کیا اور بسبب
کثرت کرم کے آپ کا کیسہ ہمیشہ خالی رہتا تھا خصوصاً اُن لوگوں کی مراعات کی وجہ سے

جو ہندوستان سے حج کو آتے تھے۔ آپ چھ برس دیار عرب میں رہے اور وہیں انتقال فرمایا۔ چوں کہ آپ کو حدیث نبوی کی خدمت سے ایک لمحہ فرصت نہ تھی نظم ونثر کی طرف مطلق التفات نہ تھا۔ اس واسطے آپ کا کوئی کلام دستیاب نہیں ہوا

مولنا محمد یعقوب آپ مولوی محمد اسحاق صاحب کے برادر کہیں تھے۔ بڑے ذی علم تھے لیکن خلق۔ قناعت اور استغنار میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اکثر دیکھا گیا کہ جب کوئی شخص کچھ ہدیہ لایا قبول نہ کیا جو کچھ سرمایہ اپنے پاس تھا اُسی میں خواہ تنگی سے ہو یا فراغی سے بسر کرتے تھے اور حسب استعداد اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے رہتے تھے۔ آپ بھی اپنے بھائی کے ساتھ ہجرت کر کے مکۂ معظمہ چلے گئے تھے۔ جب تک شاہ جہان آباد میں رہے گوشہ نشین رہے سوائے شبانہ روزی عبادت کے اور کسی بات سے واسطہ نہ تھا اور یہی حال ہجرت کے بعد بھی رہا۔

مولوی عبدالخالق صاحب آپ کے علم وفضل کا مرتبہ بلند تھا اور تقویٰ وشعار ترویج ملت واعلائے دین میں ہمیشہ ساعی رہتے تھے اور بہت لوگ آپ کے ارشاد ہدایت سے راہ راست پر آئے اور بہت شائقین تحصیل کمال کو آپ کی خدمت سے فوائد علمی سے بہرۂ وافی ملا۔ آپ کی وضع بہت سادی اور متین اور کلام بہت رزین۔ اخلاق بہت وسیع امانت دیانت بدرجۂ غایت اس جامعیت کے ساتھ کوئی کم نظر سے گزرا ہی۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے بڑے مولوی محمد عبدالقادر راقم کے نانا اور چھوٹے مولوی عبدالرب واعظ وہاں مسجد جامع سہارن پور۔ دونوں حافظ وحاجی اور دہلی کے مشاہیر میں تھے۔ مولوی عبدالقادر صاحب کا سجع یہ تھا۔ ھوالقادر الخالق الخیر۔ مولوی خیراللہ مولوی عبدالخالق صاحب کے والد تھے۔ مولوی محمد عبدالحامد صاحب خان بہادر ڈپٹی کلکٹر مولوی عبدالقادر صاحب کے فرزند کہیں تھے۔ جنھوں نے میرے والد مولوی نذیر احمد صاحب سے تعلیم پائی تھی اور اُنھیں کی تعلیم وترتیب کا نتیجہ تھا کہ ڈپٹی کلکٹری کے درجے کو پہنچے۔ مولوی عبدالقادر محلات شاہی کے امام اور بیگم ولی عہد کے اُستاد تھے۔ قلعے میں بڑی عزت تھی اور تا زیست اُن کی

تنخواہ جاری و برقرار رہی - غدر میں مسٹر لیسن کی جان بچائی جس کے صلے میں برٹش گورنمنٹ سے بہت کچھ سلوک ہوا۔ مولوی عبدالقادر طبیب بھی تھے یعنی باقاعدہ علم طب پڑہا تھا لیکن مطب نہیں کرتے تھے یوں علاج معالجہ سے انکار بھی نہ تھا۔ میرے والد جب وطن مالوف بجنور سے بحالت صغر سنی دہلی بغرض حصول علم آئے تو پنجابی کٹرے کی مسجد میں رہتے تھے جو مولوی عبدالخالق صاحب کی تولیت میں تھی - چونکہ میرے والد علم کے شوقین تھے اور یہ لوگ بڑے قیافہ شناس اور زیرک تھے آئندہ کی امید پر مولوی عبدالقادر صاحب نے اپنی بڑی صاحب زادی کو اُن سے منسوب کردیا اور خدا کا شکر ہی کہ یہ تعلق بہت سازگار رہا۔

مولوی محبوب علی صاحب سادات کبار سے ہیں - علم وحدیث و فقہ میں اقران و امثال میں میز و ممتاز - تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ جناب مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان رفیع الارکان سے کی - ان فنون میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ تمام مسائل مستحفظ و مستحضر تھے -

مولوی نصیرالدین صاحب شافعی مولنا محمد اسحاق صاحب کے شاگرد تھے - کتب درسیہ خصوصًا دینیات میں بہت اچھی مہارت رکھتے تھے - باوصفیکہ بسبب علوم دینی مرجع عوام و خواص ہیں خصوصًا تقرب بادشاہی سے سرفراز ہیں لیکن امر حق کے اظہار میں کسی کا پاس و لحاظ مطلقًا نہیں رکھتے خواہ اُس کے اظہار میں اپنا ہی نقصان کیوں نہ ہو - امر واجبی کو کبھی نہیں چھپاتے اس امر میں گویا شمشیر برہنہ کا حکم رکھتے ہیں - ایسے زمانہ ناپرساں میں الیساق گو بس غنیمت ہی اور پھر قناعت اور استغنا اور متانت وضع اور سلامتی ایسی تھی کہ کچھ بیان نہیں کیا جاسکتا -

مولنا فضل امام آپ علوم عقلیہ و فنون حکمیہ و علوم ادبیہ کے بحر ذخار تھے - باوجود ان کمالات کے خلق و علم کا کچھ حساب نہ تھا - ہمیشہ سرکار حکام وقت میں مناصب بلند سے سرفراز اور ابنائے عہد سے ممتاز رہے - پایۂ ہمت آپ کا بلند تھا اور سلوک آپ کا حق پسند بسبب کثرت

ایثار کے تنگ دستی خلائق دیکھ نہ سکتے تھے اور بہ سبب خلق وسیع کے ہر عاجز و زبوں کی مدد کرتے۔ اگرچہ وطن اصلی آپ کا خیرآباد تھا لیکن شاہجہان آباد میں اس طرح رہنے لگے کہ یہیں کے رؤسا میں آپ کا شمار تھا۔ بعد ایک عرصۂ دراز کے ترک روزگار کر کے وطن مالوف کو تشریف لے گئے اور وہیں ۵ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ کو رحلت فرمائی۔

مولانا محمد فضل حق آپ مولانا فضل امام کے خلف الرشید ہیں تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ اپنے والد ماجد کی خدمت بابرکت سے کی۔ آپ فخر خاندان بلکہ فخر جہان تھے۔ منطق و حکمت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ باایں ہمہ کمالات علم ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا کہ چار دانگ عالم میں اس کا شہرہ بلند ہوا۔ ۱۲۱۲ھ میں آپ پیدا ہوئے اور وقت تصنیف آثار الصنادید آپ کا سن شریف (۵۲) سال کا تھا۔ آثار الصنادید میں آپ کی نظم و نثر عربی کا انتخاب دیا ہے جس کو ہم نے بخوف طوالت نظر انداز کیا۔

مولوی نور الحسن شاگرد رشید مولانا محمد فضل حق کمالات علم و فضائل خلق و حلم میں یگانۂ روزگار جدت ذہن اور رسائی فہم میں یکتا۔ فاضل اجل معقول و منقول میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ خلق مجسم۔ علم مصور۔ وقار متشکل۔ خلق ایسا کہ بندگان الٰہی کی دل شکنی آپ کے نزدیک خانۂ خدا کی بنیاد گرانے سے کم جرم نہیں رکھتی اور حلم ایسا کہ اس کی مثال نہیں دیکھی گئی۔ ان کمالات پر زہد و تقوی ایسا کہ جس نے دیکھا ہے وہی اس کی قدر جان سکتا ہے لکھنے میں وہ کب آ سکتا ہے۔

مولوی کرامت علی صاحب خلف الرشید مولوی حیات علی صاحب خوش نویس اور شاگرد رشید مولانا فضل امام صاحب۔ فضل و کمال ان کا حد تقریر اور حیطۂ تحریر سے زیادہ ہے۔ استحضار مسائل اس مرتبہ کو پہنچا ہے کہ ہر مسئلہ پیش نظر ہے۔ بتلاش معاش حیدرآباد دکن تشریف لے گئے اور وہاں ان کے علم و فضل کی کافی قدر ہوئی کہ ہزار روپیہ منصب مقرر ہوا اور وہیں کے ہو رہے۔ اب بھی ان کے خاندان کے لوگ حیدرآباد میں موجود ہیں۔

متفرق علماء

ان کے علاوہ اور بھی کئی صاحب علم و فضل تھے جن کے حالات بخوف طوالت چھوڑ دیئے گئے اور صرف نام لکھنے پر اکتفا کیا گیا۔ مفتی سید رحمت علی خاں عرف میرلال - اخون شیر محمدؒ جنھوں نے حج کو جاتے جاتے راستے میں ۹ ۲ر صفر ۱۲۵۷ھ کو انتقال کیا۔ مولوی امان اللہ۔ مولوی محمد جان مدت تک سرکار انگریزی میں عہدہ سررشتہ داری فوجداری پر مامور رہے اور اپنا کام نہایت ہوشیاری اور دیانت سے انجام دیا اگرچہ نظم و نثر ان کی طبع زاد بہت ہیں لیکن اختصاراً یہاں مخمس کے صرف دو بند لکھے جاتے ہیں۔ ؎

در عشق بیوفائی کہ در آزارت کند ‏ ‏ ‏ ایں ہمہ آسودگیہا جملہ دشوارت کند

بے خبر از خویش و بر عالم خبردارت کند ‏ ‏ ‏ گوہر یکے تا نگاہ تیر در کارت کند

انتقام من کشد جائے گرفتارت کند

ای بسے تابانہ داری ہر زبان گفتار عشق ‏ ‏ ‏ دانست بے تاب و طاقت داشتہ آزار عشق

تا کجا آخر صبوری باید اندر کار عشق ‏ ‏ ‏ می بری از حد شفائی پیش یار اظہار عشق

ترسم ایں بے طاقتی ہا عاقبت خوارت کند

مولوی نوازش علی - مولوی رستم علی خاں - حاجی محمد - ملا سرفراز - وغیرہ وغیرہ -

قرار و حفاظ

مولویوں اور علماء کے علاوہ بہت سے مشہور قرار و حفاظ تھے جن کے حالات لکھنے میں غیر ضروری طوالت ہو گی۔ یہاں صرف نام لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے :- قاری قادر بخش - حافظ احمد - قاری محمد بیگ قاری احمد - حافظ عبدالرحیم - حافظ تو اب بھی بہت ہیں مگر فن تجوید اب بالکل رو با نحطاط ہے۔ لوگوں کو پیٹ کے دھندوں سے اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اس زمانے میں سرے سے نماز ہی کی ضرورت نہیں رہی حافظ قرآن ہونا اور قرأت سیکھنا تو امر آخر ہے۔

زمان مابعد کے علماء

مولوی سید ناصرالدین محمد ابوالمنصور امام المناظر	آپ اپنے رنگ میں بلاشک و شبہ تمام ہندوستان میں لاثانی تھے۔ آپ فراش خانے میں میرمداری کی گلی کے

قریب سے تھے۔ آپ کی ولادت ۲۷ رمضان ۱۲۳۷ھ یوم شنبہ میں ہوئی۔
آپ ستائیس سال تک اپنے جد بزرگوار سید فاروق علی صاحب کی زیر تعلیم رہے
جو بڑے بابرکت اولیاء اللہ سے تھے اور جمیع علوم عربیہ دینیہ حاصل کیے۔ بعد سات
سال تک لکھنؤ میں حضرات اہل تشیع سے صحبت رہی اور مطالعۂ کتب مذہبی کا
۳۷ سال کی عمر میں خدمت تائید اسلام و تردید مطاعن اہل ظلام میں سرگرم ہوئے۔
بعد غدر سات برس مجمع اہل کتاب میں اس طرح بسر ہوئی کہ بجز مزاولت کتب
اہل کتاب کوئی دوسرا شغل نہ تھا۔ اسی مدت سات سال میں کتب دینیہ اہل کتاب
بالتفاسیر عبرانی و یونانی اور اُن کی تواریخ قدیم سبقاً سبقاً پڑھیں۔ توریت
وانا جیل ہی نہیں بلکہ کل ادیان کی کتابوں کا جس قدر آپ کو علم تھا شاید ہی کسی کو
ہو۔ بلا کی طبیعت پائی تھی۔ آپ کی تصانیف صرف ردّ نصاریٰ میں سو سے کم نہ ہوں
گی۔ آپ کی کسی کتاب کا جواب عیسائی نہ دے سکے۔ بارہا پادریوں نے
جمع ہو کر جواب لکھنا چاہا مگر عاجز آ گئے۔ علاوہ مستقل تصانیف کے آپ نے
بڑے بڑے پادریوں کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کا جواب نہ ہو سکا
آپ کبھی کبھی نظم بھی لکھتے تھے۔ فارسی میں ایسی مہارت تھی جیسے کوئی اہل
زبان ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید کی ایک بسیط تفسیر آپ نے بزبان فارسی
ترتیب دی تھی۔ جس کا بہت تھوڑا حصہ چھپا باقی رہ گیا۔ نہایت دلیر اور بے دھڑک
بولنے والے تھے۔ حق گوئی کے مقابلے میں کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔ مخالفین
اسلام کے ایسے دانت کھٹے کیے تھے کہ وہ نام سن کر لرز جاتے تھے۔
امام فن مناظرۂ اہل کتاب کا لقب مولوی محمد قاسم عبد العبد و شمس العلما و سید نذیر حسین صاحب
اور بڑے بڑے علمائے زمانہ نے آپ کو دیا تھا۔ شاہجہاں پور کے خدا شناسی
کے میلے میں پنڈت دیانند جی سے علاوہ مولوی محمد قاسم صاحب کے مرحوم
نے بھی بحث کی تھی اور آخر میدان مباحثہ امام مرحوم ہی کے ہاتھ رہا۔ جس دن
چودھویں صدی کا آغاز ہوا ہے مرحوم نے دہلی کے سب سے بڑی شاہ راہ پر
ایک ایسا زبردست وعظ کہا تھا کہ سننے والے اب تک یاد کرتے ہیں
اُس وقت خلقت کا وہ ہجوم تھا کہ سارے راستے رک گئے تھے لوگوں کے

ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہو گئے تھے۔ کئی گھنٹے تک آپ کا وعظ رہا پھر اس کے بعد سوائے تصنیف و تالیف کے آپ نے کبھی وعظ نہیں کہا بڑے بڑے رئیس اور امیر آپ کے معتقدوں میں تھے۔ آپ نے سنہ ۱۳۲۱ھ میں انتقال فرمایا اور کلو کے تکیے میں مدفون ہیں۔ ان بزرگوں کے گزرنے کے بعد وہ صحبتیں ہی نہیں رہیں وہ باتیں ہی خواب و خیال ہو گئیں۔ وہ پاکبازانہ خیالات وہ خلوص اور محبت وہ اسلامی جوش اخوت اور سادگی اور بے ریائی ان سب باتوں کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔ اُمید نہیں کہ پھر زمانہ ایسے پاک طینیت اصحاب پیدا کرے اور دنیا اُن کے لطف صحبت سے فیض یاب ہو۔ مولوی صاحب صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ جن میں سے نوید جاوید وہ کتاب ہے جس میں ابتک قیامت تک جو اعتراضات اسلام پر عقلاً و نقلاً وارد ہو سکتے ہیں سب کا معقول و مسکت جواب دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑا کام کیا ہے اور چند کتابیں یہ ہیں :۔

دولت فاروقی۔ صحیح تاریخ بیت المقدس مع مضامین مناظرہ۔ استیصال۔ جواب رسالۂ مسیح الرجال انجام الخصام۔ جواب رسالۂ تفتیش اسلام میزان المیزان جواب میزان الحق مصنفۂ پادری فانڈر صاحب مصباح الابرار۔ جواب مفتاح الاسرار مصنفۂ پادری فانڈر صاحب انعام عام۔ جواب رسالۂ آئینۂ اسلام مصنفۂ پادری عماد الدین صاحب۔ رقیمۃ الوداد۔ رسالۂ نیاز نامہ مصنفہ صفدر علی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لحن داؤدی جواب نغمۂ طنبوری مصنفۂ پادری عماد الدین۔ عقوبۃ الضالین۔ جواب ہدایت المسلمین مصنفۂ پادری عماد الدین الحق مرّ۔ جواب رسالۂ اظہار حق مرسوم۔ جواب رسالۂ نبی المعصوم۔ تصحیح التاویل۔ جواب تفسیر مکاشفات سبیل نجات۔ جواب رسالۂ طریق حیات۔ نمونۂ تحریف۔ تسویل القسیس جواب رسالۂ اصل فواایش و زوال دین محمدی مصنفۂ پادری وِلسن صاحب۔ حرز جان۔ جواب رسالۂ اصلیت قرآن تنزیہ الکاملین۔ جواب رسالۂ تنبیہ الغافلین۔ تنقیح البیان جلد اول و ۲ جواب تفسیر القرآن جلد اول و ۲ جواب تفسیر القرآن جلد ۱ و ۲ مصنفہ سرسید احمد خان۔ ضمیمۂ تنقیح البیان جواب رسالۂ دافع البہتان مصنفہ سرسید احمد خان۔ تریاق حصہ ۱-۲ جواب تہذیب الاخلاق۔ تادیب۔ جواب پندرہ سوالات اسرار مساکین

فضایل غربا۔ تجلیل التنزیل تفسیر قرآن مجید بزبان فارسی غیر مطبوعہ۔ آپ کے دو صاحب زادے ہیں بڑے مولوی سید ناصر علی صاحب۔ آپ مشہور ادیب اور رسالہ صلائے عام کے ایڈیٹر اور مالک ہیں۔ چونکہ علمی شوق آپ کو اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے اس لیئے محض اپنی علمی مذاق پورا کرنے کے لیئے آپ نے یہ رسالہ نکالا ہے جس میں عمدہ ادبی مضامین ہوتے ہیں اور بہت آب و تاب سے نکلتا ہے۔ آپ محکمۂ نمک کے ڈپٹی تھے۔ عمدہ خدمات کے صلے میں آپ کو خان بہادری کا خطاب ملا ہے۔ اب معقول پنشن پاتے ہیں لیکن کام کے آدمی سے بے کار نہیں بیٹھا جاتا۔ ریاست پاٹودی میں پھر کچھ سلسلہ ملازمت کا نکال لیا ہے آپ کے چھوٹے بھائی مولوی نصرت علی صاحب مالک نصرت المطابع ہمہ تن اپنے والد ماجد کے قدم بقدم تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے ہیں اور اپنے باپ کی طرح یہ بھی صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ فن تاریخ میں تاج التواریخ دو جلدوں میں حالات دربار تاج پوشی ۱۹۰۳ء عہد لارڈ کرزن۔ دوسری جلد حالات دربار تاج پوشی اعلیٰ حضرت ملک معظم جارج پنجم ۱۹۱۱ء۔ تاریخ تیموریہ تاریخ اودھ۔ مراۃ السلاطین حالات سلاطین روئے زمین مع تصاویر گلدستۂ رؤسا حالات والیان ریاست ہائے ہندوستان ۱۸۸۸ء تاریخ انگلستان مع تصاویر۔ قیصریہ تاریخ روم مع تصاویر۔ کتب خوش نویسی قطعات نصرت خیابان ارم۔ جواہر زواہر۔ جواہر بے بہا۔ کتب مناظرہ۔ معیار۔ کلمۃ الحق۔ تحریف انجیل۔ محاکمہ۔ امان الایمان تخطیہ۔ کتب دینیہ۔ عصمت۔ صلاح فلاح۔ فیروزۃ النکاح۔ رہنمائے عظیم الحجاب کتب مفیدہ۔ نصرت اللغات۔ تعلیم المعلم۔ اتالیق ترکی۔ نصرت العلوم والفنون۔ برگ سبز۔ تاریخ پیشہ وران ہند۔ تاریخ خلفائے اربعہ و دوازدہ امام۔ مراسم شادی و غمی اہل اسلام و ہنود۔ تاریخ علمائے حال۔ تاریخ اقوام۔ اسباب عالم اسباب گلدستۂ شاداب وغیرہ وغیرہ۔ آپ کے نانا مولوی محمد مہدی صاحب (جن کا ثانی علم و فضل میں سوائے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب شاید اور کوئی رہا ہو) بڑے بڑے کاملین شیخ امام بخش ناسخ و مرزا خانی استاد مرزا رجب علی بیگ سرور آن کے دائمی رفیقوں اور ہم جلیسوں میں سے تھے

اور آپ کے دادا مولوی سید محمد علی صاحب متخلص بہ ناظر تھے جن کے دنیوی مناصب و علمی مراتب محتاج بیان نہیں۔ رزیڈنسی ناگپور میں بعہدہ میر منشی سرفراز تھے اور نواب صدیق علی خان رکن اعظم ناگپور سے اتحاد مثل یگانوں کے تھا۔ بھنڈار متعلقہ ناگپور جو نامور کوٹھی قیام گاہ صوبہ تھی وہ انھوں نے ناگپور سے روانگی کے وقت چھوڑ دی تھی۔

مولوی عبدالحق صاحب دہلی کے اس زمانے کے مشہور علمار میں سے تھے بلحاظ اصل تھے۔ آپ کی تفسیر حقانی کلام مجید کی مفصل اور جامع تفسیر اردو زبان میں ہے۔ کلام مجید کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے مگر کچھ چلا نہیں۔ آپ کی کتاب البیان مذہبی لٹریچر میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ جس کا ترجمہ انگریزی میں بھی کرادیا گیا ہے تاکہ یورپین اقوام بھی حقانیت اسلام سے کماحقہ واقفیت حاصل کریں۔ مولوی صاحب بڑے ذی علم اور ادیب تھے۔ درس و تدریس تصنیف و تالیف کا مشغلہ مدت العمر رہا۔ بہت سادہ مزاج اور آشتا پرست آدمی تھے۔ حیدرآباد سے آپ کو معقول وظیفہ امداداً ملتا تھا۔ اور آخر عمر میں کلکتہ مدرسہ میں عربی کے پروفیسر تھے۔ سرکار سے بلحاظ اپنی علمی قابلیت کے شمس العلمار کے خطاب یافتہ تھے۔ حال میں آپ کا انتقال ہوگیا اور افسوس ہے کہ دلی کے علمار میں کا ایک بڑا ممبر کم ہوگیا۔

مولوی سید احمد حسن صاحب دہلی کے معزز سادات میں سے ہیں۔ حدیث اور فقہ میں شمس العلمار مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ علم طب بھی بالاستیعاب حاصل کیا ہے۔ علاوہ محدث و فقیہ ہونے کے بڑے بھاری ادیب بھی ہیں۔ شمس العلمار مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے بڑے داماد ہیں۔ بڑے صاحب تقویٰ و ورع ہیں۔ سنت نبوی کے سختی سے پابند ہیں۔ اگرچہ کئی مواقع پیش قرار ماہوار کی انگریزی ملازمت کے ہوئے مگر نہیں کی۔ بالآخر حیدرآباد دکن میں ملازم ہوئے اور ضلع کے تعلقدار یعنی کلکٹر بشاہرہ ہشت صدی عرصۂ دراز تک رہے اور وہیں سے حج کو تشریف لے گئے۔ حافظ کلام الٰہی بھی ہیں۔ علاوہ حدیث اور فقہ کے آپ کو قانونی ملکہ بھی خوب ہے۔ بڑی دیانت

امانت خدا ترسی اور نیک نامی سے ملازمت کا زمانہ گذارا اب بہ حصول پنشن چار صدی خانہ نشین ہیں۔ باوجودیکہ ضلع کی حکومت حاصل تھی مگر مزاج میں غایت درجہ کا حلم وانکسار اور خلق ہے اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ تنخواہ سے کچھ سروکار نہ تھا۔ ہمیشہ سے شوق تعلیم وتعلم کا رہا۔ کتب بینی تصنیف وتالیف کے سوا اور کچھ مشغلہ نہ رہا۔ پہلے آپ نے قرآن شریف پر ایک بسیط حاشیہ بنام احسن القوائد لکھا۔ جو بہت مقبول ومطبوع ہوا۔ پھر ایک نہایت مفصل اور جامع وحاوی تفسیر کلام مجید بزبان اردو موسوم بہ احسن التفاسیر سات جلدوں میں مع ایک مقدمے کی لکھی جو کثرت سے رائج ہے اور بہترین تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ علاوہ اس کے دو کتابیں آپ کی فن حدیث میں بزبان عربی تحشی شدہ ہیں۔ ایک "تنقیح اللغات فی تخریج احادیث المشکوٰۃ" ہے اور دوسری ابن حجر کی بلوغ المرام کا حاشیہ موسوم بہ "بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام" ہے اب بھی احکام القرآن ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ ہمیشہ سے گوشہ نشینی اور کم سخنی کے عادی ہیں۔ نام ونمود ونمائش سے کوسوں دور۔ اسی وجہ سے لوگ آپ کے حالات سے کم واقف ہیں۔ بعد خانہ نشینی کے مسجد جامع فتح پوری کی ممبری چند روز کی مگر اس سے بھی دست کش ہو کر ع۔ ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را۔ پر عمل پیرا ہیں۔ آپ کو دیکھ کر قرون اولی کے بزرگ یاد آتے ہیں۔ ہمیشہ پند ونصائح وتبلیغ احکام الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ دلی میں آپ کا دم بسا غنیمت ہے۔ آپ نرے مولوی ہی نہیں ہیں بلکہ زمانۂ حال کے تازہ ترین طرز کا بھی لازوال خزانہ ہیں۔ آپ کی تصانیف دیکھنے سے آپ کے تبحر علمی کا اندازہ ہو سکتا ہے اور جو لوگ آپ کی صحبت سے مستفید ہوتے ہیں وہی کچھ آپ کی سچی اور بے لوث طرز زندگی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اور جس کسی کو ایک سچے اور راست باز دین دار مسلمان کا نمونہ دیکھنا ہو وہ آپ کو دیکھ لے۔

مولوی سید احمد صاحب
فرہنگ آصفیہ

آپ نے چون کر ڈاکٹر فیلن صاحب کے ساتھ ترتیب وتالیف لغت اردو میں شریک غالب تھے بڑی شہرت پائی۔ خود بھی تصنیف وتالیف کا مشغلہ ساری عمر جاری رکھا۔ آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف فرہنگ آصفیہ ہے جو آپ کے

گھر میں آگ لگ جانے سے ناتمام رہی علاوہ اس کے زنانہ لٹریچر میں آپ نے کئی عمدہ کتابیں لکھی ہیں جن میں رسوم دہلی - جیتر بہنیلی - زیادہ مروج ہیں - آپ کی آخری تصنیف لغات النسا ہے - آپ کی علمی خدمات کے صلے میں سرکار سے خان صاحب کا خطاب تھا اور سرکار عالی نظام سے معقول وظیفہ پاتے تھے - اور گو آخر عمر میں بصارت نے جواب دے دیا تھا مگر مرتے دم تک اپنا مشغلہ تصنیف جاری رکھا - سال گزشتہ انتقال فرمایا - آپ کا طرز تحریر بہت نہایت شستہ اور مقبول انام تھی خصوصاً عورتوں کی بول چال کا چربہ خوب اتارتے تھے - زمانۂ حال اور طرز جدید کے مصنفوں میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا ۔

مولوی راشد الخیری پورا نام محمد عبدالراشد ہے - مولوی محمد عبدالقادر صاحب کے پوتے اور مولوی حافظ عبدالواجد صاحب کے صاحبزادے ہیں - اور خاکسار کے ماموزاد بھائی - پہلے مخزن کے ایڈیٹر تھے اور اب ایک زنانہ رسالہ عصمت نکالتے ہیں - شروع شروع کچھ دنوں وعظ کہنا شروع کیا تھا اور بہت اچھا ڈھنگ ڈالا تھا - بہت لوگ آپ کی طرف جھک پڑے تھے کیوں کہ تقریر آپ کی تحریر سے بھی زیادہ دل آویز تھی اور اور عجب نہیں کہ اگر یہ مشغلہ جاری رہتا تو جناب مولوی عبدالرب صاحب دہلی کے مشہور واعظ کے قایم مقام ہو جاتے مگر کچھ ایسے اسباب ہوئے کہ آپ نے وہ رستہ چھوڑ دیا - ان کی تصانیف زیادہ تر زنانہ لٹریچر کی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ آپ کا طرز بیان - بندش مضامین دل چسپی اور واقفیت کا ایک خاص طرز لیئے ہوئے ہے - آپ کی زبان میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ جو بات قلم سے نکلتی ہے دل میں گڑ جاتی ہے - عورتوں کی لٹیف اور اُن کی بول چال کے آپ اُستاد ہیں اور یہ بات مانی ہوئی ہے کہ ٹریجڈی لکھنے اور غم آلود مرقع کھینچنے میں آپ کو کمال ہے اور خواجہ حسن نظامی نے جو آپ کو مصور غم کا خطاب دیا اُس کے آپ پورے پورے مصداق ہیں - آپ کی تصانیف میں صالحات - صبح زندگی - شام زندگی - بنت الوقت - الزہرا وغیرہ پڑھنے اور بہو بیٹیوں کے پڑھانے کے قابل ہیں -

ذکر بلبل نوایان سواد جنت آباد حضرت شاہجہان آباد

پذیرفتہ از ہر فنے روشنی
جداگانہ ہر فنے یک فنی

مولانا امام بخش صہبائی بلحاظ نسب والد کی طرف سے آپ کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک اور والدہ کی طرف سے حضرت غوث الثقلین سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پونہچتا ہی - کمالات ظاہری و باطنی وحسن واخلاق وحمائد اطوار میں مشہور روزگار تھے - فنون سخنوری تحقیق لغت واصطلاحات زباندانی و تدقیق مقامات کتابی وتکمیل عروض وقافیہ ومعمامیں کمال بہم پونہچایا کہ ہر فن میں انتخاب اور لاجواب تھے - نظم ونثر دونوں میں قدرت کاملہ رکھتے تھے ایک رسالہ نثر میں ریزۂ جواہر پانچ جزو کا بادشاہ وقت محمد بہادر شاہ کی مدح میں بڑی قابلیت سے لکھا ہی ایک انشائے مکاتیب نہایت عمدہ ہی - آپ کی نظم ونثر کے الفاظ لآلی شاہوار اور معانی یاقوت آبدار کی برابری کرتے ہیں - نثر کا انتخاب ہم نے چھوڑ دیا ریزۂ جواہر سے چند اشعار لکھتے ہیں اور نیز تھوڑا سا کلام فارسی جس سے اندازہ جناب صہبائی کی خداداد قابلیت کا ہو جائے گا -

شہنشاہے کہ از بس ارجمندے — گزارد پاے بر فرق بلندے
فلک جاہے کہ از والائی قدر — نگاور راندہ بر پیشانی بدر
ملک قدرے کہ از وے دوش شاہی — طرازش جستہ از فضل الٰہی
نہیبش گر زند بر سنگ خارہ — رگش در جنبش آرد چون شرارہ
شرر را تہر او گر بر فروزد — چو کاغذ سنگ خارا را بسوزد
چو شیر از صیت عزمش رفتہ از ہوش — گریزد آورد در سوراخ خر گوش
فلک گفتے سپر خود را عدو یش — ہلال از نعل توسن زد بر دیش
بسطر تیغ بہر زینت سن حرف — ز خون دشمنانش رنگ شنجرف
ز تیرش زخم اعدا تادم صور — برنگ چشم عاشق گشتہ ناسور
ہنوز دستش تیغ بر کف نارسیدہ — بفرق دشمنش عمدا رسیدہ

اشعارِ فارسی

یارب آں کُن بجنونِ دلِ دیوانۂ ما — کہ شود بالِ پری نالۂ مستانۂ ما
حسن بر خود غلط و عشق نظر بازِ غیور — شمع داغ ست ز خودداری پروانۂ ما
ہستیِ اہلِ فنا دقتِ شتاب دگر ست — رفتنِ رنگ بود شمع بہ کاشانۂ ما
طرفہ کاں بُت برِ رخِ کعبہ رواں ہم خندد — دست در گردنِ غیر ست ز جانانۂ ما

دیگر

کن آشنائے لب دو سہ حرف عتاب را — از بہر مادہ آتشہ ساز ایں شراب را
رنگِ زخم چو گل بپر پرواز می زند — دارم خزاں رسیدہ بہارِ شباب را
دارد اثر ز چینِ جبیں موج خندہ دات — یک رنگ کردہ نازِ تو لطف و عتاب را
امروز تا کرشمۂ لطفش چہ می کند — رحمت فگندہ است بغر و احساب را
چوں شمع آرمیدنِ عمر ست اضطراب — دارد سرورِ رنگ بہارم شراب را
وحدت ہزار جلوہ فتادہ ست دیدہ ام — در دیر کعبہ رنگ عذاب و ثواب را

صہبائیا بہ وسعتِ رحمت نگاہ کن
یکسو نبہ شمارِ گناہ و ثواب را

محمد مومن خاں مومن آپ بھی بڑے پایہ کے شاعر گزرے ہیں۔ چند مثنویاں اور متعدد قصائد و انشائے نثر باعبارات حسین و مضامین رنگین آپ کی یادگار ہیں۔ آن کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں دونوں بھائی سلطنت مغلیہ کے دورِ آخری میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے میں موضع بلابا پرگنۂ نارنول میں جاگیر پائی جب سرکار انگریزی سے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اُس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن وینۂ حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کردی پنشن مذکور میں سے حکیم غلام نبی خاں صاحب نے اپنا حصہ لیا اور اس میں سے حکیم

بھیر خاں صاحب سے ایک قصیدۂ مدحیہ شکریہ میں کہہ کر راجہ صاحب کو دیا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرت دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

سوا اس قصیدے کے اور کوئی مدح کسی دنیا دار کے صلہ وانعام کے توقع پر نہیں لکھی۔ وہ اس قدر غیور رہتے تھے کہ کسی عزیز دوست کا ادنی احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ راجہ کپور تھلا نے انھیں ساڑھے تین سو روپیہ مہینا کرکے بلایا اور ہزار روپیہ سفر خرچ بھیجا یہ بھی جانے کو تیار ہوئے مگر معلوم ہوا کہ وہاں ایک گوئیے کی بھی یہی تنخواہ ہے۔ کہا کہ جہاں میری اور گوئیے کی برابر تنخواہ ہو میں نہیں جاتا جس طرح شاعری کے ذریعے سے انھوں نے روپیہ نہیں پیدا کیا اسی طرح نجوم۔ رمل اور طبابت کو ذریعہ معاش کا نہیں کیا۔ جس طرح شطرنج ان کی دل لگی کی چیز تھی اسی طرح نجوم رمل اور شاعری ایک دل کا بہلاؤ سمجھتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں فرماتے ہیں کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا اُن کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت تھی۔ لطیفہ۔ ان کی عالی دماغی اور بلند خیالی ایسی تھی کہ شعراے متقدمین ومتاخرین میں سے کسی کی بلاغت یا فصاحت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ یہ اُن کا قول مشہور تھا کہ گلستان سعدی کی تعریف میں لوگوں کے دم چڑھے جاتے ہیں۔ اس میں ہے کیا ؟ گفت گفتہ اند گفتہ اند۔ کہتا چلا جاتا ہے اگر ان لفظوں کو نکال دو تو کچھ بھی نہیں رہتا۔ ایک دن مفتی صدرالدین خاں کے مکان پر بھی یہی کہا۔ مولوی احمدالدین کرسانوالہ مولوی فضل حق کے شاگرد بیٹھے تھے انھوں نے کہا کہ قرآن شریف میں کیا فصاحت ہے۔ قال قال۔ قالوا قالوا ہے۔ تاریخ میں ہمیشہ تعمیہ اور تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر ان کی طبع رسانے اسے محسنات تاریخ میں داخل کردیا چنانچہ اپنے والد کی تاریخ وفات لکھی ہے ؎

بہ من الہام گشت سال وفات
کہ غلام نبی بحق پیوست

غلام نبی کے اعداد کے ساتھ حق ملائیں تو پورے سنہ وفات نکل آتے ہیں اپنے صغیر سن بیٹے کی تاریخ فوت کہی۔ ؎

خاک بر فرق دولت دنیا
من فشاندم خزانہ بر سر خاک

خزانہ کے اعداد سر خاک یعنی خ کے ساتھ ملانے سے ۱۱۶۳ھ ہوتے ہیں۔ تاریخ چاہ۔ ع۔ آب لذت فزا جام بگیر۔ آب لذت فزا کے اعداد جام کے اعداد میں ڈالو تو ۱۱۶۵ھ حاصل ہوتے۔ ایک شخص زین خاں حج کو گیا۔ رستے سے پھر آیا۔ چوں بیاید ہنوز خر باشد ۱۲۵۶ھ تاریخ کہی۔ شاہ محمد اسحاق صاحب کی ہجرت کی تاریخ کہی ؎

گفتیم وحید عصر اسحاق — بر حکم شہنشہ دو عالم
بگذاشتہ دار حرب امسال — جا کرد وہ بمکۂ معظم

وحید عصر اسحاق کے اعداد مکۂ معظم کے اعداد کے ساتھ ملا دو اور دار حرب کے اعداد اس میں سے خارج کرو تو ۱۲۵۶ھ سال ہجرت نکلتا ہے۔ ایک شخص قلعۂ دلی سے نکالا گیا۔ ع۔ از باغ خلد بیروں شیطان بے حیا شد۔ تاریخ کہی۔ باغ خلد کے اعداد میں سے شیطان بے حیا کے اعداد نکال ڈالیں تو ۱۲۵۳ھ رہتے ہیں۔

شاہ عبد العزیز صاحب کی وفات کی تاریخ۔ ؎

دست بے داد اجل سے بے سر و پا ہو گئے — فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

الفاظ مصرع آخر کے اول و آخر کے حرفوں کو گرا کر بیچ کے حرفوں کے عدد لے لو تو ۱۲۳۹ھ رہتے ہیں۔ ان کے معمے بھی متعدد ہیں۔ مگر ایک لا جواب تھا ایسا نہیں سنا گیا۔ یعنی مہتاب راے۔

ہے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا — ہم اُلٹے۔ بات اُلٹی۔ یار اُلٹا

پہیلیاں بھی کہیں۔ یہاں ایک پہیلی گھڑیاں کی لکھی جاتی ہے۔

نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی بلائے — نہ لفظ اور معنی سمجھ میں کچھ آئے
نہیں چور پر وہ لٹکتا رہے — زمانے کا احوال بکتا رہے
شب و روز غوغا مچایا کرے — اسی طرح سے مار کھایا کرے

کوٹھے سے گرنے کے بعد انھوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ دن یا پانچ مہینے یا پانچ برس میں مرجاؤں گا چنانچہ پانچ مہینے میں مر گئے۔ گرنے کی تاریخ خود ہی کہی تھی۔ دست و بازو بشکست۔ مرنے کی تاریخ ایک شاگرد نے کہی ماتم مومن خاں۔ دلی دروازے کے باہر مہندیوں کے جانب غرب۔ زیر دیوار

مومن خاں صاحب نے بھی اپنا حق پایا۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی اس میں سے ایک چوتھائی ان کے والد کو اور اُن کے بعد اُس میں سے ان کا حصہ ملتا رہا۔ ان کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں ہوئی۔ ان کے بزرگ جب دلی آئے تو چیلوں کے کوچے میں رہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ وہاں سے بہت قریب تھا۔ ان کے والد کو شاہ صاحب سے کمال عقیدت تھی۔ جب یہ پیدا ہوئے تو حضرت ہی نے آکر کان میں اذان دی اور مومن خاں نام رکھا۔ گھر والوں نے اس نام کو پسند نہ کیا اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا۔ لیکن شاہ صاحب ہی کے نام سے نام پایا۔ بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پونہچایا۔ اُن سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ حافظہ کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سنتے فوراً یاد کر لیتے تھے۔ اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سن سنکر بعینہٖ اسی طرح ادا کر دیتے تھے۔ جب عربی میں کسی قدر استعداد ہو گئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انھیں کے مکتب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔ تیز طبیعت کا خاصہ ہی کہ ایک فن پر دل نہیں جمتا۔ اس نے بزرگوں کے علم طبابت پر ٹھہرنے نہ دیا۔ دل میں طرح طرح کے شوق پیدا ہوے۔ شاعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا۔ اس کو اہل کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پونہچائی۔ ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ ایسا ملکہ بہم پونہچایا کہ احکام سن سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور اُن کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا نہ زائچہ کھینچتے نہ تقویم دیکھتے۔ پوچھنے والے سے کہتے کہ تم خاموش رہو جو میں کہتا جاؤں اُس کا جواب دیتے جاؤ۔ پھر مختلف باتیں پوچھتے جاتے تھے اور سائل اکثر کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل میں اپنی نجوم دانی کو ظاہر کیا ہی ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس　　　　آسمان بھی ہی ستم ایجاد کیا

شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا ومافیہا کی خبر نہ رہتی تھی اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ دہلی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔ شعر و سخن سے انھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اُسے اور بھی چمکا دیا تھا۔ اُنھوں نے ابتدا میں اپنا کلام شاہ نصیر کو دکھلایا لیکن چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور پھر کسی کو اُستاد نہیں بنایا۔ ان کے نامی شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ صاحب تذکرۂ گلشن بے خار خلف نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں مظفر جنگ بہادر رئیس پلول اور ان کے چھوٹے بھائی نواب اکبر خاں اور بہت سے لوگ تھے رنگین طبع۔ رنگین مزاج۔ خوش وضع خوش لباس۔ کشیدہ قامت سبزہ رنگ سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال اور ہر وقت انگلیوں سے اُن میں کنگھی کرتے رہتے تھے۔ ململ کا انگرکھا۔ ڈھیلے ڈھیلے پائینچے اُس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔ ایسی دردناک آواز اور دل پذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ باوجود مذاق شاعری نیک خیالوں سے ان کا دل خالی نہ تھا نوجوانی میں مولنا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے کہ مولوی اسمٰعیل صاحب کے پیر تھے۔ انھوں نے کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا۔ راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ دہلی میں رہتے تھے اور اُن کی سخاوتیں شہر میں مشہور تھیں وہ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ سر راہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ خاں صاحب کا اُدھر سے گزر ہوا لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر یہی ہیں۔ راجہ صاحب نے آدمی بھیج کر بلوایا عزت و تعظیم سے بٹھایا۔ کچھ نجوم کچھ شعر و سخن کی باتیں کیں اور حکم دیا کہ ہتنی کس لاؤ۔ ہتنی حاضر ہوئی وہ خاں صاحب کو عنایت کی انھوں نے کہا کہ مہاراج میں غریب آدمی ہوں اسے کہاں سے کھلاؤں گا اور کیوں کر رکھوں کہا کہ سو روپئے اور دو۔ خاں صاحب اُسی پر سوار ہو کر آئے اور پہلے اس سے کہ ہتنی روپئے کھائے اُسے بیچ کر فیصلہ کیا اسی پر اوج نے کہا تھا ؎

جھنوں میں وہ مومن مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو ہتنی کا دان لیتا ہے

تو مکہ معظمہ کے فاضل اجل و عالم باعمل حضرت شیخ عبداللہ سراج حنفی سے آپ نے صحاح کے ابتدائی حصے تبرکاً پڑھے اور جب تک وہاں قیام رہا آپ برابر اُن سے فیض حاصل کرتے رہے۔ مدینہ منورہ میں شیخ محمد عابد صاحب سندھی سے اکثر حدیث شریف کی کتابوں کے خاص خاص مقامات پڑھے اور روایت کرنے کی اجازت حاصل کی۔ ان کے علاوہ مولوی کرم اللہ صاحب محدث علیہ الرحمۃ سے جو خلیفہ حضرت شاہ غلام علی صاحب کے تھے آپ نے کچھ علوم پڑھے۔ آپ بے انتہا خلیق اور صاحب مروت تھے ہمیشہ رات کے تین بجے نماز تہجد کے واسطے بیدار ہوتے اور نماز تہجد اور صبح کے درمیان مسنون قیلولہ کے بعد صبح کی نمازیں جا کر سفر ہو یا حضر اول جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے اور اکثر مسجد سے واپس آکر اشراق تک وظائف و اذکار ختم کرنے کے بعد دنیا کے کاروبار میں لگ جاتے۔ نواب مرحوم اس قدر کم گو تھے کہ سننے والے آدمی کو خود داری کا گمان ہوتا تھا لیکن اُن کے جلسے میں کسی ادنیٰ یا اعلیٰ کی غیبت کا گزر نہ تھا اور اُن کی صحبت متین اور مہذب ظرافت اور لطیفوں سے خالی نہ تھی یعنی زہد خشک سے جو ریا کے درجے تک پونہچتا ہے بری تھے۔ دینی اور دنیوی جو کچھ بات تھی بناوٹ اور تصنع سے کوسوں دور تھی۔ آپ کو گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا پیرانہ سالی کے زمانے میں بھی اسی شوق کی یادگار کے طور پر ان کا اصطبل گھوڑوں سے بھرا رہتا تھا۔ نواب صاحب بزرگان دین کی خدمت میں بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ آپ نے سب سے پہلے مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب سے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے اور دہلی کے مشہور محدث اور اکابر شیوخ سے تھے بیعت کی۔ ان کے وصال کے بعد شاہ ابوسعید و شاہ احمد سعید سجادہ نشین حضرت شاہ غلام علی صاحب نقشبندی مجددی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ فیوض باطنی کرتے رہے آخر میں حضرت شاہ عبدالغنی صاحب نے آپ کو سلسلہ علیہ نقشبندیہ میں سند خلافت بھی عطا کی۔ شاہ صاحب ان کو اپنے خلفاے اجل سے سمجھتے تھے اور اپنے مریدین کو تکمیل کے واسطے نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے سنہ ۱۲۸۵ھ میں آپ حج کو تشریف لے گئے تھے وہاں آپ کو ایک ہولناک واقعہ پیش آیا کہ جدہ سے

آگے چل کر جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا اور مسافر کشتیوں کے ذریعے سے ایک ویران جزیرے میں اُتار دیئے گئے وہاں چند دنوں رہنا پڑا بالآخر ساحل لیث پر بخیر و سلامت جا اُترے اور وہاں سے براہ یمن عازم مکہ معظمہ ہوئے چنانچہ آپ نے اپنا سفرنامہ بھی لکھا ہے جس کا فارسی نام رہ آورد اور عربی میں ترغیب السالک الی احسن المسالک ہے اور جس کا ترجمہ ۱۹۱۰ء میں اردو میں بھی ہوگیا ہے۔ غرض دو برس چھ دن کے بعد ۲۳ ذی حجہ ۱۲۵۶ھ کو وطن مالوف کو واپس تشریف لائے۔ ایام غدر ۱۸۵۷ء ہندوستان کے عمائد اور شرفاء پر جو مصیبت گزری ہے خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے نواب صاحب بھی لپیٹ میں آگئے اُن کا دار الریاست جہانگیر آباد خطرناک حالت میں تھا نواب صاحب اُس کو چھوڑ کر بمقام خان پور جو جہانگیر آباد سے چند میل کے فاصلے پر ہے اپنے عزیز دوست عبد اللطیف خاں صاحب رئیس خان پور کے ہاں اقامت گزیں ہوئے۔ ٹھاکروں نے قلعۂ جہانگیر آباد پر قبضہ کر لیا اور نواب صاحب کے عالی شان اور خوش نما محلوں کو آگ لگادی۔ تمام قیمتی اور بے تکلف اثاث البیت جل کر خاک سیاہ ہوگیا یہاں تک کہ اُن کا گراں بہا کتب خانہ اور اُن کی اپنی تصانیف جس میں اردو و فارسی کا کلام بھی شامل تھا آگ کے شعلوں کی نذر ہوگیا۔ جس وقت بھیم سنگھ اور اُس کے ساتھی ٹھاکروں نے جہانگیر آباد میں یہ ہنگامہ فساد برپا کر رکھا تھا حسن اتفاق سے ریاست رام پور کی فوج دہلی جانے کے لئے جہانگیر آباد سے گزاری۔ اس فوج کا افسر نواب یوسف علی خاں فردوس مکان والی رام پور اور نواب مصطفیٰ خاں کے دوستانہ تعلقات سے واقف تھا اس لئے اُس نے ٹھاکروں کے مقابلے میں نواب صاحب ممدوح کے تابعین کی مدد کی اور اُن کو از سر نو قلعۂ جہانگیر آباد پر قبضہ دلادیا۔ نواب صاحب پر بغاوت کا الزام بھی لگایا گیا تھا اور کچھ عرصے تک یوسف زندان بنائے گئے مگر آخر کار گلو خلاصی ہوئی اور نواب صاحب بفضل خداوندی مامون و مصئون رہے اور مدارج و مناصب بھی برقرار رہے۔ مصائب غدر میں ایک دن نواب صاحب پیادہ پا محافظین کے ساتھ سڑک پر جا رہے تھے اس اثنا میں آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا" تیری شان کریمی کے قربان! کاتنی ہی سزا دی ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ سزا کا مستوجب ہوں" شمس العلماء منشی ذکاء اللہ

احاطہ مدفون ہوئے - شاہ عبد العزیز صاحب کا خاندان بھی یہیں مدفون ہی - غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں - استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجے پر پہونچایا ہی - معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کیے ہیں - اسی وجہ سے جو شعر صاف ہوتا ہی اُس کا انداز جرأت سے ملتا ہی اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے - اشعار مذکورہ میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دل کش تراشیں ہیں کہ اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں - چند اشعار فارسی و اردو یہاں درج کیے جاتے ہیں -

ہم تاب وصل نیست من بے نصیب را
خود دشمن خودم نشناسم رقیب را

از کف دشمن گرفتم جام را
می شناسم گردش ایام را

دشمن فغاں نکردہ و آہم اثر نداشت
این نیلگوں لباس فلک داد خواہ کیست

با کفر و آستان کلیسا ترا چہ کار
مومن بدیں بہار شکستن برائے کیست

دی شب کہ گوش در پس دیوار داشتم
گفتی حکایتے و شنیدم دریں چہ بحث

خواہم غضب صال تو خندیدن آں قدر
کاندر زمانہ خندہ نماند برائے صبح

فزوں ز زلف کشد خط سبز تو دل را
بدیدہ بیش خلد سبزہ کہ تو خیز است

خوش آں دم کز ہجوم شکوہ تلخی زیر لب یاں
تو بر خیزی ز ناز و حسرتے در دامن آویزد

پہلوئے غیر پر زش نکنم چارہ کہ نیست
چشم آنم کہ نگاہ غلط انداز کند

ظلمت شب بر قرار و صبح ناپیدا ہنوز
حسرتے بے جا مرا از خواب عدم برداشتم

ای کہ تلخ از سخن تلخ تو شد عیش مرا
می توانی کہ تلافی بشکر خند کنی

اردو اشعار

ای مرگ آکہ میری بھی رہ جائے آبرو
رکھا ہی اُس نے سوگ عدو کی وفات کا

شکل مانند پری اور یہ افسون وفا
آدمی کا نہیں مقدور بچانا دل کا

اُس سے میں شکوے کی بجا شکر ستم کر آیا
کیا کروں تھا مرے دل میں سو زباں پر آیا

آپ مرتے تو ہیں پر جیتے ہی بن آئی گی
شیفتہ ضد پہ جو اپنی وہ ستم گر آیا

اس طرف کو بھی نگہ تا سر مژگاں آتی
بارے کچھ کچھ اثر گریۂ پنہاں دیکھا

کب طالع خفتہ نے دیا خواب میں آنے
وعدہ بھی کیا وہ کہ وفا ہو نہیں سکتا

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

نواب مصطفیٰ خاں حسرتی و شیفتہ

نواب محمد مصطفیٰ خاں نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں صاحب بہادر مظفر جنگ کے فرزند تھے اور نواب ولی داد خاں خاندان بنگش سے تھے۔ جب کہ دہلی میں خاندان بنگش کا عروج تھا وہ کوہاٹ سے دہلی تشریف لائے اور اپنے صاحبزادے نواب مرتضیٰ خاں صاحب کی شادی اس زمانے کے مشہور سپہ سالار اسمٰعیل بیگ خان ہمدانی کی صاحبزادی نواب اکبری بیگم صاحبہ سے کی اور جو فوج مرہٹوں سے اُس وقت برسرپیکار تھی اُن میں عہدہ دار ہوئے۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی میں انگریزی سلطنت کی بنیاد قایم کی اُس وقت نواب مرتضیٰ خاں صاحب کو لارڈ صاحب موصوف نے دہلی کے قریب ہوڈل پلول کا علاقہ بطور جاگیر عطا کیا۔ اس دور میں جو سات رئیس با اختیار بنائے گئے تھے من جملہ اُن کے نواب مرتضیٰ خاں بھی تھے۔ ۱۸۱۴ء میں نواب ممدوح نے جہانگیر آباد کا علاقہ جو پہلے راجہ کھودس رائے کی ملکیت تھا اور بعلت عدم ادائے مال گزاری نیلام ہوا خرید لیا اور گورنمنٹ سے سند تعلقہ داری عطا ہوئی۔ نواب صاحب کی رحلت کے بعد ہوڈل پلول کے علاقہ کو گورنمنٹ نے واپس لے لیا اور اُس کے عوض میں اراکین خاندان کی پنشن مقرر کر دی جو غدر ۱۸۵۷ء تک جاری رہی۔ نواب مرتضیٰ خاں نے جہانگیر آباد کا علاقہ اپنی حیات میں صاحبزادے مصطفیٰ خاں کے نام منتقل کر دیا تھا جو اُن کے بعد اُن کی اولاد کی ملکیت میں آیا اور اس وقت تک قایم و برقرار ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کی ولادت ۱۸۰۶ء میں بمقام دہلی ہوئی۔ میاں جی مالا مال[1] سے جو دہلی کے ایک مشہور بزرگ اور سربرآوردہ معلمین میں تھے اُن سے فارسی عربی کی تعلیم پائی اور علوم مروجہ حاصل کیے۔ حضرت حاجی مولانا محمد نور[2] دہلوی نقشبندی سے بھی جو جامع علوم ظاہر و باطن تھے خاص کر فن حدیث و تجوید میں استفادہ حاصل کیا۔ علوم دین سے آپ کو ایسا شوق و شغف تھا کہ طلب کی تشنگی کسی وقت فرو نہ ہوتی تھی۔ ۱۲۵۵ھ میں جب کہ آپ کو حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوئی

---

[1] میاں جی صاحب کا مزار حضرت نظام الدین کی درگاہ شریف میں نواب صاحب کے سرہانے ایک چھوٹے چبوترے پر ہے۔ [2] حاجی صاحب کا مزار سورت میں ہے جب آپ دوبارہ بہ ارادۂ حج جا رہے تھے رستے میں بمقام سورت ۱۲۵۲ھ میں وصال ہوا۔ ۱۲

اشعار ریختہ

خو ہو گئی ہجراں میں تڑپنے کی شب وصل
گر چین ہو دل کو بھی مجھے آرام نہ ہوگا

منقوش دل خلق ہے یہ بیز کی خوبی
کتنا ہی کرے ظلم وہ بدنام نہ ہوگا

عشق کیوں ورد جاں شوق ہے کیوں سینہ تنگ
دشمنی دل شکنی شیوۂ احباب نہیں

گلۂ چرخ عبث شکوۂ جاناں بے جا
یاس و حرماں کو مرے حاجت اسباب نہیں

گزرے ہے میری خاک پہ غیروں کے ساتھ وہ
فتنہ اٹھا ہے گرد پس کارواں نہیں

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں
بےچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

کھولا جو دفتر گلہ اپنا زیاں کیا
گزری شب وصال ستم کے حساب میں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش
وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

لبوں پہ جان ہے ایسی بھی کیا ہے بے دردی
نہ قرض دیتے ہو بوسہ نہ مستعار مجھے

شب ہجراں سنے کہا قصۂ گیسوئے دراز
شیفتہ تو بھی دل زار نے سونے نہ دیا

تاب بوسے کی کسے شیفتہ وہ دیں بھی اگر
کر چکی کام یہاں لذت دشنام اپنا

سودا زدہ جیتے ہی ہوا شیفتہ افسوس
تھا دوست ہمارا ابھی سنبھل جائے تو اچھا

دل زار کا ماجرا کیا کہوں
فسانہ ہے مشہور سیماب کا

محبت نہ ہرگز جتائی گئی
رہا ذکر کل اور ہر باب کا

پڑے کمے صبر آرام کی جان پہ
مری جان بے صبر و بے تاب کا

کیا حال تمہارا ہے ہمیں بھی تو بتاؤ
سب بے وجہ کوئی شیفتہ اف اف نہیں کرتا

تم لگ بھی غضب ہو کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

مشاطہ کا مصور سہی سب بناؤ میں
اس نے ہی کیا نگہ کو بھی پرفن بنا دیا

شکایت کو اس نے سنا بھی نہیں
کھلا غیر پر راز پنہاں عبث

جاتے ہیں اور منع کی طاقت نہیں مگر
رہ جائیں آپ وہ مجھے ناچار دیکھ کر

خیر جو گزری سو گزاری پہ یہی اچھا ہوا
خط دیا تھا نامہ بر نے اس کو تنہا دیکھ کر

یا ہو سکے کسی سے علاج اپنا شیفتہ اُس گل پہ غش ہیں جس میں محبت کی بو نہیں

شاہ نصیر نصیر تخلص۔ نصیرالدین نام تھا مگر چوں کہ رنگت کے سیاہ فام تھے اس لیئے گھرانے کے لوگ میاں کلو کہتے تھے۔ وطن ان کا خاص دہلی تھا۔ والد شاہ غریب نام ایک بزرگ تھے کہ اپنی غربت طبع اور خاکساری مزاج کی بدولت اسم بامسمیٰ غریب تھے۔ نیک نیتی کا ثمرہ تھا کہ نام کی غریبی کو امیری میں بسر کرتے تھے۔ شہر کے رئیس اور امیر سب ادب کرتے تھے۔ ان کے بزرگوں کے نام چند گاؤں دربارشاہی سے آل تمغا معاف تھے۔ ملّا ماجرا اور ہرسانہ علاقہ سونی پت میں سلیم پور علاقہ غازی آباد میں۔ وزیر آباد شہر دہلی کے پاس جہاں مخدوم شاہ عالم کی درگاہ ہے اور اب تک ۷ رجادی الاولیٰ کو وہاں عرس ہوتا ہے۔ اب فقط مولرن ایک گاؤں تلب گدھو کے علاقے میں سیّد عبداللہ شاہ اُن کے سجادہ نشین کے نام واگزاشت ہے۔ غرض کہ شاہ غریب مرحوم نے اس اکلوتے بیٹے کو بڑی ناز و نعمت سے پالا تھا اور استاد اور ادیب نوکر رکھ کر تعلیم کیا تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ وہ کتابی علوم میں کماحقہٗ کامیاب نہ ہوئے البتہ نتیجہ اس کا اہل علم سے بہتر حاصل تھا کیوں کہ جو وہ کہتے تھے اسے عالم کان لگا کر سنتے تھے۔ جو لکھتے تھے اس پر فاضل سر دُھنتے تھے۔ ان کی طبیعت شعر سے ایسی مناسب واقع ہوئی تھی کہ بڑے بڑے ذی استعداد اور مشّاق شاعر مشاعروں میں منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سلسلۂ تلمذ دو واسطہ سے سودا اور درد تک پونہچتا ہے کیوں کہ یہ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے اور وہ قائم الدین قائم کے قائم نے سودا سے بھی اصلاح لی اور میر درد سے بھی اُنھوں نے انگریزی عملداری میں زندگی بسر کی لیکن شاہ عالم کے زمانے میں شاعری کا جوہر دکھانے لگی تھی اور خاندانی عظمت نے ذاتی کمال کی سفارش سے دربار تک پونہچا دیا تھا۔ سیاحی کی دولت میں سے جو سرمایہ انھیں حاصل ہوا وہ بھی شاعری کی برکت سے تھا۔ جس کی مسافت جنوب میں حیدر آباد تک اور

تاقل سے تھے کہ دہلی میں نواب صاحب کو مرض سرطان عارض ہوا ڈاکٹر اپریشن کیا کرتا تھا اور ناقص حصہ گوشت کا کاٹا کرتا تھا جس سے سخت تکلیف ہوتی تھی اور اوپر والوں سے دیکھا نہ جاتا تھا چنانچہ ایک روز صاحب زادے محمد علی خاں بے اختیار رونے لگے لیکن نواب صاحب کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ آتا تھا۔ صاحب زادے صاحب سے کہا "میاں! اس جسم خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی کی بات ہو۔ انسان کو اپنی مصیبت پر رونا چاہیئے۔ ذکاء اللہ خاں صاحب فرماتے تھے کہ ایسا ضبط و استقلال میں نے آج تک کسی شخص میں نہیں دیکھا۔ آپ نظم و نثر دونوں پر قدرت کاملہ رکھتے تھے اور حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ دیوان فارسی و ریختہ کے علاوہ آپ کے رقعہ جات فارسی بھی پڑھنے کے قابل ہیں جن سے آپ کی اعلیٰ درجے کی انشاپردازی اور بلاغت کا اظہار ہوتا ہی یہ مکاتیب جا بجا تصوف سے مالا مال ہیں۔ نواب صاحب کی ایک اور مبسوط کتاب گلشن بے خار شعرا کا تذکرہ ہی جو ۱۲۵۰ھ میں چھپا اس تذکرے میں اُس زمانے کے اردو شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہی اور کلام سے پہلے ہر شاعر کا مختصر حال ہی اور اُس کے کلام کی نسبت رائے زبان فارسی میں لکھی ہی کیوں کہ اُس وقت اردو زبان ایسی رائج نہ تھی۔ ۱۸۶۹ء میں ترسٹھ سال کی عمر میں آپ نے رحلت کی اور دہلی میں درگاہ سلطان المشائخ میں اپنے جد امجد کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ ذیابیطس کا عارضہ پہلے سے تھا وقت آخر ہاتھ میں ایک کالا دانہ نکلا وہی موت کا بہانہ ہوا۔ اپنا کفن بیت اللہ شریف سے ہمراہ لائے تھے اُسی میں کفنائے گئے۔ آپ کی وفات کی تاریخ اس آیت سے برآمد ہوتی ہی:-

وجزاهم بما صبروا جنة وحريرا

یہ مادہ تاریخ مولنا حالی کا ہی جو آپ کے مزار پر کندہ ہی۔ اور دو قطعات وفات یہ ہیں:-

(۱) چو رفت از جہاں مصطفیٰ خاں امیر — کہ بود اصل پاکیزہ و پاک فرع
خداوند تقوی خدا وند زہد — فقیر آشنا سالک راہ شرع
شد از فوت آں بے سروپا تمام — وفا۔ کرم۔ بذل و تقوی و ورع

(۲) چوں رئیس ابن رئیس نامدار — کرد رحلت زین جہانِ بے بقا

حال تاریخ وفاتش فی البدیہہ … ملہم غیبی بمن کردہ عطا
کز سر رازے بباید گفت ایں … رحمت حق بر محمد مصطفیٰ
۱۲۶۸ھ

آپ کا تفصیلی حال جن صاحب کو ملاحظہ فرمانا ہو وہ آپ کا کلیات ملاحظہ فرمائیں جس کو خاص اہتمام سے مع مختصر سوانح عمری کے آپ کے صاحب زادے نواب محمد اسحٰق خاں صاحب مرحوم و مغفور نے نظامی پریس بدایوں میں چھپوایا ہے۔ ہم بخوف طوالت چند اشعار متفرق آپ کے نمونتہً لکھتے ہیں :—

خندہ چہ خوش شیوہ ایست از پس خشم و عتاب … لذت دیگر بود زخم نمک سود را
کار ہمت نہ بہ اندازۂ طاقت باشد … مرغ بسمل شدہ را ہم سر پروازے ہست
دم جاں بدور تو ہر چہ کہ دارد دانیم … از ادب گرچہ نگوئیم کہ اعجازے ہست
خواجہ را شوق نظر بازی و من می ترسم … کہ دریں جمع حریفے قدر اندازے ہست
سخن آمد و آورد تفاوت دارد … صور را گرمی ہنگامۂ افغانم سوخت
بر طرۂ پر شکن چہ نازی … آخر ز دلم شکستہ تر نیست
آغاز محبت ست ای چشم … ہنگام ترادش جگر نیست
واعظ ایں گونہ صنم را نگزارد مومن … یا بخلدم ببر و یا بجہاں حوریا
جانم بلب رسیدہ و چشمم براہ تست … دارم زعمر رفتہ امید وفا ہنوز
آہ از تیغ و رشک تیزی او … آرزوے بریدہ ام کہ مپرس
تو خوش کہ دل بردی زمن من خوش کہ از روز ازل … جان دشمن در خانہ بود از خانہ بیروں کردمش
یا فلک آدم ندارد غیر راہ … یا حدیث مردم آزاری غلط
عمر کوتاہ دادہ اند مرا … گو شب غم بود دراز چہ باک
بپاسے آں صنم آخر چہ کردہ ام مومن … کہ پیش کعبہ ام از طواف از نماز خجل
عصمتم طعنہ بتقدیس ملایک می زد … بتمناے قبولت ہمہ تقصیر شدم
فردا حذر ز نالۂ محشر گداز کن … امروز فکر کار من اے کارساز کن
گر پاے نازنین تو رنجد میا میا … از دور بر جنازۂ مومن نماز کن
جوش رحمت کار بر ما تنگ کرد … توبہ بر لب رفت باراں آمدہ
اے چشم چہ دیدی از نگاہش … بے وعدہ در انتظار چونی

اور ادب پیدا کرتی تھی وہ اگر رنگت کے گورے چٹے نہ تھے مگر نور معنی سے سرتاپا معمور تھے۔ بدن چھریرا اور کشیدہ قامت تھے۔ جس قدر ریش مبارک مختصر اور وجاہت ظاہری کم تھی اُس سے ہزار درجہ زیادہ خلعت کمال نے شان وشوکت بڑھائی تھی۔ شاہ صاحب باوجودیکہ اس قدر صاحب کمال تھے اور محفلوں میں اعزاز واکرام کے صدر نشین ہوتے تھے اس پر نہایت خوش مزاج اور یار باش تھے بوڑھوں میں بوڑھے بچوں میں بچے بن جاتے تھے۔

لطیفہ۔ ایک دفعہ بھولو شاہ کی بسنت میں شاہ صاحب آئے چند شاگرد ساتھ تھے انھیں لے کر تیس ہزاری باغ کی دیوار پر بیٹھے اور تماشہ دیکھنے لگے۔ کسی طوائف نے بہت سا روپیہ لگا کر نہایت زرق برق ایک کارچوبی رتھ بنوائی تھی۔ شہر میں جابجا اُس کا چرچہ ہو رہا تھا۔ رنڈی رتھ میں بیٹھی چھم چھم کرتی سامنے سے نکلی۔ ایک شاگرد نے کہا اُستاد اس پر کوئی شعر ہو۔ اُسی وقت فرمایا۔ ؎

اس کی رتھ کا کلس سنہری دیکھ — شب کہا ماہ سے یہ پروین نے

بھر پرواز یہ نکالی ہے — چرخ بیضے سے مرغ زریں نے

لطیفہ ایک ایسے ہی موقع پر کوئی رنڈی اودی رضائی اوڑھے سامنے سے نکلی۔ وسمے کی چمک عجب لطف دکھاتی تھی۔ ایک شاگرد نے پھر فرمایش کی۔ آپ نے کہا۔ ؎

اودی وسمے کی نہیں تیری رضائی سر پر — مہ جبیں رات ہے تاروں بھری چھائی سر پر

تاریخ۔ ایک دفعہ شاہ نظام الدین کی سترھویں میں گئے۔ میر باقر علی صاحب ایک سید خاندانی دلی کے تھے۔ شہر سے درگاہ کو چلے راہ میں کسی نے مار ڈالا۔ درگاہ میں خبر پہنچی تو اُن کی جواں مرگ اور مرگ ناگہانی پر سب نے افسوس کیا۔ شاہ صاحب نے اُسی وقت تاریخ کہی کیا بے عدیل تخرجہ کیا ہے۔ ؎

بر شب عرس حضرت محبوب
میر باقر علی چہ گشت شہید
بے شش و پنج گفتم ایں تاریخ
ہر کہ ۲ در ۱ بگشت بود یزید

حاضر جوابی

ایک دن سلطان جی کی سترھویں میں گئے اور باؤلی پر جاکر ایک طاق میں بیٹھ گئے - حقہ پی رہے تھے کہ اتفاقاً ایک نواب صاحب آنکلے - شاہ صاحب سے صاحب سلامت ہوئی - وہیں بہت سی ارباب نشاط بھی حاضر تھیں اور ناچ ہو رہا تھا - اُس عالم زرق برق پر اشارہ کرکے نواب صاحب نے فرمایا "استاد! آج آپ بھی بالا کے طاق ہیں - بولے "جی ہاں جفت ہونے کو بیٹھا ہوں آپ تشریف لائیے" **لطیفہ** - ایک دفعہ دکن کو چلے نواب جھجر مدت سے جاتے تھے چوں کہ مقام مذکور سر براہ تھا اور گرمی شدت سے پڑتی تھی - برابر سفر بھی مشکل تھا اس لیئے وہاں گئے اور کئی دن مقام کیا - جب چلنے لگے تو رخصت کی ملاقات کو گئے - نواب صاحب نے کہا گرمی کے دن ہیں - دکن کا سفر دور دراز کا سفر ہے - خدا پھر خیر و عافیت سے لائے مگر وعدہ فرمائیے کہ اب جھجر میں پھر کب آئیے گا؟ ہنس کر بولے کہ "جھجر کی چاہ تو وہ ہی گرمی ہیں" **لطیفہ** - عیسیٰ خاں اور موسیٰ خاں دو بھائی دلی میں تھے - مال و دولت کی بابت دونوں میں کچھ جھگڑا ہوا - عیسیٰ خاں ناکام ہوے - موسیٰ خاں نے کچھ عدالت کے زور سے کچھ حکمت عملی سے سارا مال مار لیا - شاہ صاحب نے بطور ظرافت چند شعر کا قطعہ کہا جس کا ایک مصرعہ یہ تھا - ع - ہوئی آفاق میں شہرت کہ عیسیٰ خاں کا گھر موسا - لطف یہ کہ دونوں بھائی شاعر تھے ایک کا تخلص آفاق دوسرے کا شہرت تھا - ان میں سے بھی کسی بے مغزے نے کچھ واہیات بکا تھا - شاہ صاحب کے بزرگوں کی خوبیاں بیان کرکے خود ان کی شکایت کی تھی - چوں کہ روشن پورے میں رہتے تھے اس کا اشارہ کرکے کہا - ع

بعد اُن سب کے شاہ صاحب نے ۔۔۔ خوب روشن پورہ کیا روشن

چند اشعار

پشت لب پر ہے یہ تیرے خط ریحان ایسا ۔۔۔ منہ تو دیکھو کے لکھے یاقوت رقم خال ایسا

خود بخود طاق سے شیشہ جو گرا ای ساقی ۔۔۔ روح تھی کس کی بھی مینائے مئے ناب میں بند

قدم نہ رکھ مری چشم پُر آب کے گھر میں ۔۔۔ بھرا ہے نوح کا طوفاں حباب کے گھر میں

کبھو نہ اُس رُخ روشن پہ چھائیاں دیکھیں ۔۔۔ گھٹائیں چاند پہ سو بار چھائیاں دیکھیں

مشرق میں لکھنؤ تک پہنچی ۔ اگرچہ دربار شاہی کے علاوہ تمام شہر میں بھی ان کی قدر و عزت ہوتی تھی مگر جن لوگوں کی عادتیں درباروں میں بگڑی ہوتی ہیں اُن کے دل تعلیم یافتہ حکومتوں میں نہیں لگتے اسی واسطے جب انگریزی عمل جاری ہوئی تو انھیں دکن کا سفر کرنا پڑا ۔ دکن میں دیوان راجہ چندو لال کا دور دورہ تھا ۔ اگرچہ کمال کی قدر دانی اور سخاوت اُن کی عام تھی مگر دلی والوں پر نظر پرورش خاص رکھتے تھے اور بہت مروت سے پیش آتے تھے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ خود شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے ۔ غرض وہاں شاہ صاحب کے جواہرات نے خاطر خواہ قیمت پائی لیکن دلی کا چٹخارہ ایسا نہیں کہ انسان بھول جائے اس لیئے انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر پھر دلی آئے اور تین دفعہ پھر گئے ۔ دکن میں اُن کے لیئے فقط دولت کے فرشتے ہی نے ضیافت نہ کی بلکہ شاعری کی زہرہ آسمان سے اُتری اور شمس ولی کے عہد کا پرتو پھر دلوں پر لاڈالا ۔ شعر گوئی کے شوق جو برسوں سے بجھے چراغوں کی طرح طاقوں میں پڑے تھے دل دل میں روشن ہوگئے اور دماغوں کی محنتیں اُن پر تیل ٹپکانے لگیں ۔ پہلی دفعہ جب لکھنؤ گئے تو سید انشا مصحفی جرأت وغیرہ سب موجود تھے اور بعض غزلیں جو ان معرکوں سے منسوب و مشہور ہیں وہ مصحفی کے دیوان میں بھی موجود ہیں ۔ لکھنؤ کے پہلے سفر کا وہ زمانہ تھا کہ بزرگان با اخلاق و امرائے رتبہ شناس موجود تھے وہ جوہر کو پہچانتے تھے اور صاحب جوہر کا حق مانتے تھے ۔ جو جاتا تھا عزت پاتا تھا اور شکر گزار آتا تھا ۔ لیکن دوسری دفعہ جو گئے تو رنگ پلٹا ہوا تھا شیخ ناسخ کے زمانے نے عہد قدیم کو نسخ کر دیا تھا اور خواجہ آتش کے کمال دماغوں کو گرمائے ہوا تھا ۔ جوانوں کی طبیعتیں زوروں پر تھیں ۔ نئی نئی شوخیاں انداز دکھاتی تھیں انوکھی تراشیں پرانے سادہ پن پر مسکراتی تھیں ۔ چنانچہ جس حریف کا نشان منزلوں کے فاصلے سے دکھائی دیتا تھا جب پاس آیا تو سب گردنیں ابھار ابھار کر دیکھنے لگے یہ زبردست شاعر کہن سال مشاق جس کا بڑھاپا جوانی کے زوروں کو چٹکیوں میں اُڑاتا تھا جس دن وہاں پہنچا تو مشاعرے میں شاید دو تین دن

باقی تھے ہر اُستاد نے ایک ایک دو دو مصرعے طرح کے بھیجے اور بعض دو دو گروہ عارض ہوا مگر وہ ورد کے ٹھہرتے ہی اُٹھ بیٹھے اور آٹھ غزلیں طیار کرکے مشاعرے میں پونچے۔ افسوس کہ اُس موقع پر بعض جہلا نے جن سے کوئی زمانہ اور کوئی جگہ خالی نہیں اپنی یاوہ گوئی سے اہل لکھنؤ کی عالی ہمتی اور مہماں نوازی کو داغ لگایا چنانچہ ایک معرکے کے مشاعرے میں شاہ صاحب نے آٹھ غزلیں فرمائش کی کہہ کر پڑھیں اور ایک غزل اپنی طرح کی ہوئی بھی پڑھی جس کی ردیف و قافیہ عسل کی مکھی تھا۔ اس پر بعض اشخاص نے طنز کی۔ کسی شعر پر کہا سبحان اللہ کیا خوب مکھی بیٹھی ہے۔ کسی نے کہا حضور یہ مکھی تو نہ بیٹھی۔ ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلا نے لگا۔ شاہ صاحب نے اُسی وقت کہا کہ "جنھیں چاشنی سخن کا مذاق ہے وہ لطف ہی اُٹھاتے ہیں ہاں جنھیں صفرائے حسد کا زور ہے اُن کا جی متلایا ہی چاہیئے"۔ شاہ صاحب چوتھی دفعہ پھر دکن گئے اور ایسے گئے کہ پھر آنا نصیب نہوا۔ ذوق شاہ صاحب کی اُستادی کو ہمیشہ زبان ادب سے یاد کرتے تھے اکثر افسوس سے کہا کرتے تھے کہ چوتھی دفعہ دکن جانے کا قصد تھا جو سرِراہ ملاقات ہوگئی۔ ذوق نے کہا کہ اب آپ کا سن ایسے دور دراز سفر کے قابل نہیں فرمایا کہ "میاں ابراہیم! وہ بہشت ہے بہشت۔ میں بہشت میں جاتا ہوں۔ چلو تم بھی چلو"۔ آخر حیدرآباد میں جہان فانی سے رحلت کی اور خاص مخدوم موسیٰ کی درگاہ میں دفن ہوئے کسی شاگرد نے چراغ گل سے تاریخ نکالی۔ دیوان اپنا کوئی مرتب نہیں کیا دہلی میں میر حسین تسکین (شاگرد رشید مومن خاں) ایک طباع اور نازک خیال شاعر تھے اُن کے بیٹے عبداللہ بھی صاحب مذاق اور سخن فہم شخص تھے اُنھوں نے بڑی محنت اور کاوش سے ایک مجموعہ جمع کیا تھا نواب صاحب رام پور نے جو قدردان سخن تھے ایک رقم معقول دے کر وہ نسخہ منگالیا۔

شاہ صاحب نہایت نفیس طبع اور لطیف مزاج تھے۔ خوش پوشاک خوش لباس رہتے تھے اور ہمیشہ ایک وضع کے پابند تھے جیسا کہ دہلی کے قدیم خاندانوں کا دستور ہے۔ اُن کی وضع ایسی تھی کہ ہر شخص کی نظروں میں عظمت

سب سے ملاؤ ابرو ہم سے نفاق رکھو
اس دوستی کو اپنی بالائے طاق رکھو

دیکھیے دل میں کیوں جگہ اُس آہ بے تاثیر کو
جس میں پیکاں بھی نہ ہو رکھنا ہی کیا اُس تیر کو

یہ عالم اُس کے خط سبز نے دکھایا ہی
کہ جس کو دیکھ کے عالم نے زہر کھایا ہی

دل کا کیا مول بھلا زلف چلیپا ٹھہرے
تیری کچھ گانٹھ گرہ میں ہو تو سودا ٹھہرے

جنبش لب یہ قیامت ہی کہ جی اُٹھے ہم
آج اک بات میں تم رشک مسیحا ٹھہرے

در پردہ آنکھ یار سے لڑائی ہو رات سے
تار نگہ کو رشتہ ہی چاک قنات سے

نواب محمد ضیاءالدین خاں نیّر

آپ جناب فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر والی فیروز پور جھرکہ کے خلف رشید ہیں اور علاوہ قرابت قریبہ کے نسبت تلمذ کی مرزا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں رکھتے تھے۔ توجہ اُستاد سے کلام ان کا سخن قدما کے ہم پایہ ہی۔ رئیس ابن رئیس کے علاوہ ذی علم و صاحب کمال تھے فن تاریخ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اخلاق نہایت وسیع۔ آپ کا کلام نظم و نثر دونوں جواہر ہیں تولنے کے قابل ہی۔ غالب کے دیوان پر آپ نے ایک مفصل تقریظ نثر میں لکھی ہی جو قابل دید ہی یہاں ہم چند اشعار فارسی اور اردو کے نمونۃً لکھتے ہیں جن سے کسی طرح سیری نہیں ہوئی مگر کیا کریں کہ قلت گنجائش مانع ہی۔

بس است طول خدایا شبان تار مرا
بیاض صبح مدہ چشم انتظار مرا

مکن ہلاک کہ شادم بہ نارسائی خویش
بروے من بگشا چشم اعتبار مرا

نمود تیرہ چو شب روے روشنان سپہر
نچاک سائے سر نخوت اعتبار مرا

دلش بسوخت چو بر کارہاے بے مزدم
وفا نتیجہ بہ از مزد داد کار مرا

کنی نہ گر قدم رنجہ خنجرے بفرست
مخواہ در شب ہجراں تہی کنار مرا

بوجہ زردی رو ہم شمر داز عشاق
رواج داد زر کامل العیار مرا

نمودہ سعی بہ سیہ برگی من و خجلم
بکینہ نیست چو پا مزد روزگار مرا

فرشتہ خوش نبود عیب جوئی شرم آید
ز رسم و راہ نوا ہائے کاتبان مرا

ز تیرہ روزی و آشفتگی و رنجوری
بسنج خال رخ و زلف چشم یار مرا

کشود گر خم زلفی دے دراں بستم — کہ دادہ اند دریں جبر اختیار مرا
اگر نیامدن دوست ماتمے دارد — سفید بہر چہ شد چشم انتظار مرا
نشر سے وشور نشور دلی و نفخۂ صور — فلک ز پہلوے تیرے نگاہدار مرا

اشعار اردو

ہو ملتی ارض ہم کو یہ ضعف تواں نہیں — کل اُس کے گھر گئے پہ قدم کا نشاں نہیں
جب چاہو آؤ دل میں کہ ہے آپ کا مکاں — یاں خوف شحنہ و خطر پاسباں نہیں
حیرت میں ہوں کہ نوک مژہ نیشتر مثال — کھبتی ہیں گر جگر میں تو کیوں خوں چکاں نہیں

نکلے آنکھوں سے وہیں جذب ہوے دامن میں — بجز اشکوں کے کوئی گوہر نایاب نہیں
جتنے ہو نغمہ سرا اُتنے ہی خونریز بھی ہو — چھیڑ نشتر کی چلی جاے جو مضراب نہیں

ہے تصور مرا اُس خاطر نازک پہ گراں — جتنا ہو اپنے کو ہر غم سے گھلایا کیجے
نقش بر سنگ ہے دھیان اپنا تمھارے دل پر — خوش ہوں مٹنے کا نہیں لاکھ مٹایا کیجے
تلخ کامی سے مذاق اپنے میں یکساں ہے تو پھر — عوض زہر نہ کیوں قند ہی کھایا کیجے
بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہش — لے کے گل قبر پر رخشاں کبھی نہ آیا کیجے

نواب ضیاء الدین خاں صاحب نے ۳۰ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو انتقال کیا۔ شمس العلماء شبلی نعمانی نے یہ مرثیہ کہا ہے:۔

گرم ہنگامہ شوای نالۂ دلہا برخیز — از پی برہمی عالم امکاں برخیز
تو ہم ای آہ جہاں سوز لباماں برخیز — ای جنوں باز بہ تاراج گریباں برخیز

چشم خوں نابہ فشاں خواست چو طوفاں کردن
خوش شعر شوای دل۔ کہ توانم سرد ساماں کردن

دو جہاں ایں ہمہ درہم شدہ چوں ست و چہ ہست — آسماں حلقۂ ماتم شدہ چوں ست و چہ ہست
مہر داغ دل عالم شدہ چوں ست و چہ ہست — اختراں دیدۂ پُرنم شدہ چوں ست و چہ ہست

شاہِ روز برگ کہ۔ باتم بنشست
از چہ۔ لیلائے شب آشفتہ و درہم بنشست

تا چہ ہست اینکہ دل از نالہ نیاسود ہنوز   ہمچناں زخم جگر ہست نمک سود ہنوز
اشک از دیدہ برآید جگر آلود ہنوز   آتشے ہست ہمانا کہ رود دود ہنوز

فاش گویم کہ سخن گوے زماں روے نہفت
تیرہ شد دہر کہ نیر زجہاں روے نہفت

آں طراز سخن آں یوسفِ کنعانِ سخن   آں کہ آراست ز نو زلفِ پریشانِ سخن
آں کہ صد پایہ فرود از سخنش شانِ سخن   آں کہ لعل و گہر افشاند بدامانِ سخن

دو سہ روز است کہ از جامِ اجل مدہوش است
عالمے زو بسخن ماندہ و او خاموش است

آں گراں پایہ کہ دوں مرتبہٗ اوست سخن   شاعرے کز دم کلکش ہمہ جادو ست سخن
فیض او بیں کہ بایں رنگ باین بوست سخن   خواجہ او بود و نواں گفت کہ ہندو ست سخن

اینک از دستِ اجل جیبِ وجودش چاک است
پایہٗ فن بفلک بردہ و خود در خاک است

علم و فن را بجہاں داد گرے بود۔ نماند   نکتہ سنج سخن و دیدہ ورے بود۔ نماند
در جہاں محفلِ ہنر را ثمرے بود۔ نماند   نظم را خامہ او بال و پرے بود۔ نماند

ایں سخن گریہ بروز سیہت باید کرد
اے ہنر رحم بحال تبہت باید کرد

شبلیا دست درداماں ادراک بزن   شیشۂ صبر دریں حادثہ بر خاک بزن
اے جنوں جیب و گریباں خرد چاک بکن   تو ہم اے نالہ سراپردہ بر افلاک بزن

گرنہ خوں گشتہ بمژگاں ترم می آئی
آخر اے دل بچہ کارے و گرم می آئی

مولوی محمد حسین آزاد دہلی کے شرفا میں سے ہیں۔ وہاں کے پرانے کالج میں علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ فن شعر استاد ذوق سے

حاصل کیا۔ مدتوں گورمنٹ کالج لاہور کے فارسی و عربی کے پروفیسر رہے۔ بیسیوں کتابیں اردو اور فارسی میں تصنیف و تالیف کیں جن میں سے بعض اب تک مدارس سرکاری کے کورس میں داخل ہیں۔ ان کی کتب آب حیات (تذکرۃ الشعرا) نیرنگ خیال۔ دربار اکبری۔ بہت مشہور ہیں۔ یہ کہنا کہ اردو لیٹریچر نظم و نثر میں آپ نے ایک نئی روح پھونک دی ہے کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ آپ نظم و نثر دونوں کے بے نظیر استاد تھے۔ نظم تو آپ کی جیسی برجستہ اور پر اثر ہوتی تھی ظاہر ہے مگر نثر میں بھی وہ دل آویزی اور شیرینی ہے کہ نظم سے بھی زیادہ مزہ دیتی ہے۔ انھیں تصانیف کے صلے میں جشن جوبلی کے موقع پر سرکار نے آپ کو شمس العلما کا خطاب دیا۔ اور آخر عمر میں کچھ ایسے صدمات پہنچے کہ مزاج جادۂ اعتدال سے منحرف ہوگیا اور ہر وقت جذبہ کی حالت رہتی تھی اسی حالت میں انتقال کیا اور آپ کی وفات سے اردو علم ادب کا بڑا عالم متبحر اور قادر کلام فرد دنیا سے ناپید ہوگئی۔ آپ کی نظمیں پرانے طرز عاشق معشوق کے فضول خیالات سے مبرا ہیں۔ نیچر کے مناظر آپ اس خوبی سے باندھتے تھے کہ سوائے مولوی الطاف حسین صاحب حالی کے اور کوئی اس میدان میں ایسا کامیاب نہیں ہوا جیسے کہ آزاد تھے۔ آپ کا سارا کلام آراستہ و پیراستہ ہے اس میں انتخاب کی گنجائش نہیں اور اس کتاب میں اور بھی زیادہ جا کی قلت ہے بریں ہم ایک چھوٹی سی نظم میں سے چند بند لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شام کی آمد اور رات کی کیفیت

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
ہیں روز و شب زمانے کے پیہم قدم ترے
کلفت سے دن کی ہو گیا منہ تیرا زرد ہے
ہوتا زمانہ بس کہ ہے وابستہ شام سے

عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے
اور ڈالی اس پہ شام نے غربت کی گرد ہے
اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے

دامان کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو

آ اے شب سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو | عالم میں شاہزادیٔ مشکیں نسب ہے تو
آمد کی تیری شان تو زیب رقم کروں | پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں
ہوناوہ بعد شام شفق میں عیاں ترا | اُڑنا وہ آبنوس کا تخت رواں ترا
تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں | لہرانا پرنیاں و حریر سیاہ میں
چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پر | فرماں نشان میں اُڑے گا جہان پر

تا صبح ہووے کارگہ روزگار بند
آرام حکم عام ہوا اور کار بار بند

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی | ہاتھوں سے مشک اُڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم | کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں | اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں
بجلی ہنسے تو رخ ترا دینا بہار ہے | شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو دیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے | اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی | اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پر اور شاہ تخت پر | ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر
ہے بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے | ویران دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی | چوکا ہے بلکہ راہزن نابکار بھی
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے | عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں | سب آ گئے ہیں نیند کے اس دم لپیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے خواب عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہے تھم گیا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر | بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پر
کھوئے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے | رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے

اُس کے عمل کا توڑنا تیرا ہی کام ہی   سکہ ہی اب ستاروں کا اور تیرا نام ہی
محنت ثمر تھا اُس کا تو راحت ہی پھل ترا
چاندی تھا اُس کا حکم تو سونا عمل ترا

عالم ہی اپنے بستر راحت پہ خواب میں   آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورت امیدوار ہی   اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہی
مجھ کو تو ملک سے ہی نہ ہی مال سے غرض   رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض
یارب یہ التجا ہی کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

اے رات یہ جو تونے سرِ شام آن کر   سجادۂ سیاہ بچھایا ہی تان کر
اور اس پہ حق پرست کہ یادِ خدا میں ہی   بیٹھا رہ فنا پہ ہوائے بقا میں ہی
اُس کو اُسی کی ذات سے ہی لَو لگی ہوئی   اور دل میں دم بدم ہی تک و دو لگی ہوئی
کب تک رہے حباب گلا گھونٹ کر
اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ پھوٹ کر

دل وے سا جو شیر محبت کے جام ہی   ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہی
ہر چند کام کاج سے ہی گھر کے تھک رہی   بچے کو ہاتھ سے ہی برابر تھپک رہی
اور کہتی ہی کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے   ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اُچھل پڑے
ماں کو تو سوتے جاگتے اس کا ہی دھیان ہی
کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہی

پر جائے حیف حال اسی جاں بلب کا ہی   سب جس کو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہی
دن بھر دوا غذا میں رہا غیر حال ہی   لیکن ہی اب یہ حال کہ بچنا محال ہی
بتی چراغ عمر کی ہی جھلملا رہی   اور بے کسی سرہانے ہی آنسو بہا رہی
اے رات مجھ کو فکر یہی بار بار ہی   اس کی تو زندگی کوئی دم کا شمار ہی
کون اس کا ساتھ دیوے گا ہو صبح جب تلک
روئے گا کوئی شام سے مردے کو کب تلک

آزاد آفریں تری لطف زبان کو   پر کروٹ اب ہی رات نے دی آسمان کو

سب اپنے اپنے کام میں ہیں دل دیئے ہوئے
تو کیوں ہی بیٹھا بادۂ غفلت پیئے ہوئے
کوئی گھڑی تو ہوش میں خود سے بھی کام لے
وقت سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ

یہ کیا کہا کہ داغ کو پہچانتے نہیں
وہ ایک ہی تو شخص ہے تم جانتے نہیں

سلطنت مغلیہ کے ساتھ شاعری کا پرانا دور بھی ختم ہوا۔ پرانی طرز کی شاعری کی آخری کڑی حضرت داغ دہلوی تھے جو دہلی میں ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۶ھ میں چہارشنبہ کے دن پیدا ہوئے اور ۹ ذی الحجہ یوم الحج سنہ ۱۳۲۲ھ (۲۵ فروری ۱۹۰۵ء) کو بمقام حیدرآباد دکن وفات پائی یہ بھی عجیب بات ہے کہ آپ کا نام مع تخلص نواب مرزا داغ تاریخ وفات ہے۔ آپ کے والد کا نام نواب شمس الدین خاں تھا آپ کا خاندانی سلسلہ محمد بن حنیفہ سے ملتا ہے۔ مرزا صاحب کے پردادا نواب عارف خاں صاحب مع اپنے بھائی کے عالمگیر ثانی کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے اور ان دونوں بھائیوں نے شاہ عالم بادشاہ کو صوبۂ بنگال کی مہم میں مدد دی جس کے صلے میں بادشاہ نے نواب شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب مرحمت فرمایا۔ اس کے بعد لبقیۃ الامرا امیر الدولہ نواب نجف خاں صاحب کی مصاحبت میں رہے۔ مرزا صاحب کے دادا نواب احمد بخش خاں صاحب نے بھرت پور کی مہم میں سرکار انگریزی کو بڑی مدد دی۔ اس وفاداری کے صلے میں جنرل لیک کی سفارش پر گورنمنٹ سے فخر الدولہ رستم جنگ کا خطاب عطا ہوا اور ریاست فیروز پور جو پنجاب میں ہے مرحمت کی چنانچہ فخر اللہ کے خاندان میں اب تک لوہارو کی ریاست چلی آتی ہے۔ سنہ ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) میں مرزا صاحب کے والد نے انتقال کیا جب آپ بہت کم سن تھے آپ کی والدہ آپ کو ساتھ لے کر قلعۂ معلےٰ میں چلی گئیں اور اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ صاحب عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد شاہ دہلی کے سایۂ عاطفت میں گزرانا اور نواب شوکت محل بیگم خطاب پایا۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں آپ نے

مولوی غیاث الدین صاحب غیاث اللغات سے پڑھیں جن کی تکمیل مولوی سید احمد حسین ولد میر غلام حسین صاحب شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم کے درس میں ہوئی۔ سید امیر صاحب پنجہ کش دہلوی اور مرزا عباد اللہ بیگ صاحب سے آپ نے فن خوش نویسی حاصل کیا۔ اُس زمانے میں چوں کہ فن سپہ گری کی نہایت قدر تھی اس لیئے آپ نے بانک اور علی کی پھنکیتی اور شہسواری سب ہنر حاصل کیئے قدر اندازی۔ چو رنگ اور سینا کے فن صاحب عالم مرزا رفیع الملک بہادر سے حاصل کیئے۔ آپ کی ہونہار طبیعت کا رجحان شروع ہی سے شاعری کی طرف تھا۔ بادشاہ اور ولی عہد دونوں خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے صاحب عالم مرزا ولی عہد بہادر نے داغ کو بھی ذوق ہی کا شاگرد کر دیا۔ اس وقت آپ کی عمر کوئی بارہ برس کی تھی۔ تیزی طبع کی وجہ سے بہت جلد ترقی کی۔ مرزا صاحب نے سب سے پہلے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مشاعرے میں یہ مطلع پڑھا جو ایک بارہ برس کے لڑکے کے لیئے ایک فال نیک تھا۔ ؎

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں　　کس لیئے پھر یہ ٹھہرتا دل بے تاب نہیں

پھر وہ ترقی کی کہ گلزار داغ میں جو مرزا صاحب کی غزل موجود ہے وہ عروج کلام کا ایک لاجواب ثبوت ہے جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

بے کسی صدمۂ ہجراں کی مجھے تاب نہیں　　کاش دشمن ہی چلے آئیں جو احباب نہیں

محلہ زینت باڑی کے مشاعرے میں جو غزل پڑھی اُس کا مقطعہ یہ تھا۔ ؎

لگ گئی چپ تجھے ای داغ حزیں کیوں ایسی　　مجھ کو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا

اس کو سنتے ہی مولوی امام بخش صاحب صہبائی آفریں صد آفریں کہتے ہوئے اُٹھے اور مرزا صاحب کو گلے سے لگا لیا۔ ایک بادشاہی مشاعرے میں جس میں بادشاہ سلامت بھی رونق افروز تھے مرزا صاحب نے تنگی وقت کے سبب بلا اصلاحی غزل اُستاد کی اجازت سے پڑھی جس میں کا ایک شعر یہ تھا۔ ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی　　کسی کا اس طرح یا رب نہ دنیا میں بھرم نکلے

یہ سن کر بادشاہ نے اپنے پاس بلایا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ مفتی صدر الدین خاں صاحب صدر الصدور۔ مرزا نوشہ حضرت غالب۔

حکیم مومن خاں صاحب مومن جیسے باکمال استاتذہ آپ کی تیز فہمی اور شوخی مضامین کے معترف ومداح رہتے تھے۔ ایام غدر سے کچھ دنوں پہلے آپ کے مربی وسرپرست صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر نے بعارضۂ ہیضہ انتقال فرمایا اور یہی انتقال آپ کی مصیبتوں کی ابتدا ہی۔ اس انتقال کی آپ نے یہ تاریخ کہی تھی ؎

غم فتح الملک سلطاں چہ بلائے جان ودل شد　　دہش مقام جنت زکرم کریم غفار
چو زداغ سال رحلت دل دردمند سید　　بکشیدہ آہ حسرت دو صد و دوازدہ بار

(۲۱۲) میں اگر آہ کے عدد یعنی (۶) سے ضرب دی جائے تو ۱۲۷۲ ہوتے ہیں۔ ولی عہد کے انتقال کے بعد غدر کی آفت آئی جس نے لوگوں کو خانماں برباد کر دیا۔ داغ رام پور چلے گئے وہاں نواب یوسف علی خاں بہادر المتخلص بہ ناظم رئیس رام پور اپنی حیات تک ہمیشہ بطور مہماں نوازی کے سلوک کرتے رہے۔ نواب مرحوم کے بعد نواب کلب علی خاں بہادر نے جو قدر دانی فرمائی وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ ریاست رامپور میں باقاعدہ ملازم ہوکر رئیس کی مصاحبت میں رہنے لگے۔ کارخانۂ اصطبل۔ گاڑی خانہ۔ فراش خانہ۔ کنول خانہ۔ شتر خانہ آپ کے سپرد ہوا نواب صاحب آپ کی بڑی قدر فرماتے تھے۔ گو رام پور میں اور بھی بڑے بڑے شاعر تھے خصوصاً جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی جو رئیس کے اُستاد بھی تھے لیکن مرزا صاحب ایسے ہر دل عزیز تھے کہ ہمیشہ حضوری میں حاضر رہتے تھے اسی طرح مرزا صاحب پینتالیس برس رام پور میں رہے۔ آپ نے اس اثنا میں بریلی۔ شاہجہاں پور۔ آگرہ۔ بھوپال۔ کلکتہ وغیرہ مقامات کا سفر بھی کیا اور جا بجا مشاعروں میں شرکت بھی فرمائی۔ ہر جگہ آپ کا کلام مقبول انام ہوتا تھا اور داد ملتی تھی لیکن آپ کے مزاج میں شیخی اور تعلّی اور انانیت بالکل نہ تھی اور نہ کبھی کسی کے کلام پر اعتراض کیا۔ نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد آپ برداشتہ خاطر ہو گئے اور ۱۸۸۷ء میں آپ رام پور سے رخصت ہو کر دہلی آئے اور مختلف مقامات کی سیر کرتے رہے۔ چوں کہ حیدرآباد میں بڑے اہل کمال جمع تھے اور حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ بہادر مرحوم ومغفور بڑے قدر دان علم تھے داغ صاحب ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد پہنچے

تمام شہر میں آپ کی آمد آمد کی دھوم مچ گئی ۔ حضور پر نور بندگان عالی متعالی کے دربار میں باریابی ہوئی یہ قصیدہ سنایا ۔ ؎

میں ہوا بادیہ پیما طرف ملک دکن ۔۔۔ سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گرد دامن
نازنینوں کی کمر بید کی شاخ لرزاں ۔۔۔ موجۂ ریگ رواں زلف پریشاں کی شکن

آپ نے اس شرف یابی کی یہ تاریخ کہی ؎

قدم بوس حضرت کا حاصل ہوا ۔۔۔ بڑے شوق سے اور ارمان سے
حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر ۔۔۔ یہ کہہ دو ملے داغ سلطان سے

چوں کہ نیاز مند بھی اُن دنوں حیدرآباد میں تھا مجھے معلوم ہے کہ کچھ عرصے تک آپ حیدرآباد میں رہے اور کئی بار باریاب ہوئے مگر وقت نہ آیا تھا آپ دلی چلے آئے اور بمبئی بنگلور وغیرہ تشریف لے گئے ۔ اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں آپ کی یاد ہوئی دس مہینے کے بعد آپ پھر حیدرآباد آئے اور برابر ساڑھے تین برس تک اُمیدواری کی سختیوں کو نہایت استقلال سے برداشت کیا ۔ آخر ۲۶ جمادی الثانیہ ۱۳۰۸ھ کو نو بجے شب کے فرمان رحمت نشان مع غزل سربمہر لفافہ میں صادر ہوا جس کو چند چوبدار لے کر حاضر ہوئے تھے ۔ علاوہ فرمان کے زبانی پیغام بھی تھا کہ آٹھ بجے صبح کے دربار میں حاضر ہیں آپ نے اُسی وقت غزل کو دیکھ کر بعد اصلاح گزران دیا اور حسب الطلب دوسرے دن حاضر ہو کر نذر گزرانی ۔ اسی تاریخ سے سلسلہ اُستادی شاگردی کا قایم ہوا ۔ اس کے بعد ۲ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ کو ایک مراسلہ محکمۂ پولیٹکل فینانس سے صادر ہوا کہ سرکار نے آپ کے نام چار سو پچاس روپیہ کا وظیفہ ابتدائے ورود سے منظور فرمایا ہے ۔ یہ وظیفہ تین سال تک ملتا رہا ۔ ۲ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو آپ کا وظیفہ ہزار روپیہ ماہوار ہوا جس کی تاریخ داغ صاحب نے یہ کہی ہے ۔ ؎

ہو گیا میرا اضافہ آج دونے سے سوا ۔۔۔ یہ کرم اللہ کا ہے یہ عنایت شاہ کی
اس ترقی کی کہو اے داغ یہ تاریخ تم ۔۔۔ ابتدا سے اپنی ساڑھے پانسو نقدی بڑھی

پھر تو سرفرازی پر سرفرازی ہونے لگی ایک گاؤں مع ایک باغ کے ۱۳۱۲ھ میں سرفراز ہوا ۔ ایک شغہ گھڑی بھر نہ زنجیر طلائی اور ایک مرتبہ دو تلواریں ملیں جن کی تاریخیں یہ ہیں ۔ ؎

سخاوت شجاعت ہمیشہ ہے توام | وہ آصف میں پائی وہ آصف میں دیکھی
لکھو اس گھڑی داغ تاریخ زیب | مرصع منور گھڑی شاہ نے دی

عطیات پیہم کا کب شکر ہو | کہ فدوی کو کیا کیا عنایت ہوا
بدیہی کہو داغ تاریخ تم | یہ سونے کا توڑا عنایت ہوا

تیز ہیں تیز لگا ہوئے بھی دھاریں ان کی | یہ وہ تلواریں ہیں زخموں کا نہیں جن کے علاج
گھاٹ دونوں کے بہت خوب ہیں دونوں یکتا | جوہر و آب کی یہ شکل کہ بحر مواج
مغربی اور جنوبی ہیں یہ دونوں بے مثل | سر بسر ہیں سر بد خواہ انھیں کے محتاج
میرے قبضے میں ہے تاریخ عطائے شاہی | لکھ دے اے داغ۔ عنایت ہوئیں تلواریں آج

اسی قسم کی تاریخیں بلا تعمیہ و تخرجہ فی البدیہہ کہتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت نے دو شیر شکار فرمائے تو آپ نے قطعۂ تاریخی کہا جس کا مادہ یہ ہے "شاہ آصف نے شیر مارے دو" مرزا صاحب کی جو قدر و منزلت حیدرآباد میں ہوئی اس سے پہلے کسی شاعر کو یہ عزت دکن میں نصیب نہیں ہوئی۔ اعلیٰ حضرت کے اُستاد ہونے کے علاوہ آپ شاہی سٹاف میں بھی داخل تھے اور ہر دربار میں مثل امرائے عظام و رؤسائے ذوی الاحتشام کے آپ بھی باریاب ہوتے تھے۔ سواری آپ کی ہمیشہ سرکاری اصطبل سے آتی تھی۔ مرزا صاحب کے کلام کو جو مقبولیت عام حاصل ہوئی ہے اس کی مثال اس زمانے میں ڈھونڈے نہیں ملتی۔ کوئی شہر حتی کہ قصبہ ایسا نہ نکلے گا جہاں کہ لوگ داغ کو نہ جانتے ہوں۔ ہزارہا غزلیں آپ کی ارباب نشاط کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں اور آئے دن گائی جاتی ہیں۔ آپ کے ابتدائی کلام میں۔ قصیدہ۔ واسوخت۔ قطعہ۔ مخمس۔ رباعی۔ خطوط۔ مسدس۔ عرائض وغیرہ ہر قسم کا کلام موجود تھا لیکن افسوس کہ غدر میں تلف ہو گیا۔ اس دیوان کے بعد رامپور میں گلزار داغ۔ آفتاب داغ۔ اور مثنوی فریاد داغ تصنیف فرمائی پھر حیدرآباد پہنچ کر مہتاب داغ چھپوایا اس کے بعد ایک اور مبسوط اور آخری دیوان جمع فرمایا تھا جو کسی غاصب ناانصاف نے تلپٹ کر دیا۔ ہر چند تلاش اور کوشش

کی گئی اور انعامی اشتہار دیئے گئے مگر ایسے ظالم نے دبایا تھا کہ پھر پتہ ہی نہ لگا
کچھ اشعار اس گم شدہ دیوان کے کچھ اس کے بعد کے نواب سراج الدین احمد خاں صاحب
سائل (آپ کے داماد) کے پاس محفوظ ہیں ممکن ہے کہ صاحب موصوف
اُسے ملک کے سامنے پیش کریں۔ آپ کی شعرگوئی کا بھی ایک خاص
ڈھنگ تھا یعنی جب شعر کہا احباب اور شاگردوں کے مجمع میں کہا۔ فکر شعر
کے لیئے خواہ مخواہ تخلیہ کی ضرورت نہ تھی۔ آپ شعر کہتے تھے اور کوئی
شاگرد لکھتا جاتا تھا۔ جب کہنے بیٹھتے تھے تو ایک دریا اُمنڈ آتا تھا چنانچہ
مثنوی فریاد داغ صرف دو دن کی فکر کا نتیجہ ہے۔ طبیعت اس قدر منجھ گئی
تھی کہ ذرا غور وفکر کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ دس پندرہ منٹ میں پوری
غزل کہہ دیتے تھے۔ تمام ہندوستان میں آپ کے بے شمار
شاگرد ہیں۔ ڈاک پر جو غزلیں آتی تھیں کبھی خود دیکھتے کبھی سن کر اصلاح
دیتے جو شاگرد سامنے ہوتا اُس سے خود پڑھواکر سُنتے۔ حیدرآباد پہنچنے
سے قبل رام پور میں آپ نے علم اُستادی بلند کیا جس کا پھریرا تمام
ہندوستان میں لہرا رہا تھا۔ آپ کو خانی اور بہادری کا خطاب و دربار
شاہی سے تھا۔ ۲۷ ربیع الثانی سنہ ۱۳۱۱ھ کو پیشگاہ اعلیٰ حضرت سے "بلبل ہندوستان
جہاں اُستاد بیرالدولہ فصیح الملک نواب ناظم جنگ بہادر" ملا مگر فصیح الملک بہادر
داغ دہلوی سے مخاطب کیئے جاتے تھے۔ باوجود اس قدر اعزاز واحتشام
کے غرور۔ تکبر۔ یا نخوت آپ کو چھو تک نہیں گئی تھی۔ بڑے ذی خلق منکسر المزاج
متواضع اور ملنسار تھے۔ خوش گو اور خوش گفتار ایسے تھے کہ آپ کے پاس سے
اُٹھنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ لوگوں کا بڑا جمگھٹا لگا رہتا تھا جو آتا شگفتہ خاطر ہو کر جاتا
چھوٹے بڑے امیر غریب سب کے آگے بچھے جاتے تھے۔ فراخ دل۔ فراخ
حوصلہ۔ سیر چشم۔ مخیر سب صفتیں خداداد تھیں۔ گانا بھی شوق سے سنتے
تھے۔ آپ کی شادی پندرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ آپ کی اہلیہ نے
سنہ ۱۳۱۵ھ میں حیدرآباد میں وفات پائی۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادی
ہیں جو سائل صاحب کی اہلیہ ہیں اور جن کو بھی حیدرآباد سے چار سو روپیہ ماہانہ

منصب ہے۔ ایک نواسہ بھی ہے وہ بھی منصب دار ہیں حیدر آباد میں ہی رہتے ہیں۔
آپ حاجی تھے۔ پابند صوم وصلوٰۃ۔ شراب کے نام سے نفرت تھی حتیٰ کہ ڈاکٹری
دوا بھی استعمال نہ کرتے تھے مرزا صاحب نے جو کچھ شہرت عزت اور ناموری
حاصل کی تھی وہ سب حلم بردباری جفاکشی اور محنت کا نتیجہ تھا وہ ہمیشہ تکلیفوں
اور مصیبتوں کا بڑے استقلال کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے اور آخرکار کامیاب
ہوتے تھے۔ زمانۂ قیام حیدرآباد میں بھی لوگوں نے آپ کے عروج مراتب پر
رشک کرکے آپ کو بدنام کرنا چاہا تھا جس کے لیئے مختلف طریقے اور وسائل
اختیار کیئے گئے یہاں تک کہ اخباروں میں مضمون چھپوائے گئے ہجویں بھی
کہی گئیں مگر آپ نے اپنی زبان یا قلم سے کسی کی نسبت کچھ نہ کہا اور کہا تو یہی کہا
کہ میں نے اس معاملے کو خدا کے سپرد کیا کہ وہی منتقم حقیقی ہے۔ جس قدر مرزا صاحب
کے شاگردوں کی کثرت تھی اُس سے زیادہ اُن کے ملاقاتیوں اور دوستوں کا
ایک بہت بڑا گروہ تھا اُن میں سے مولوی عبدالحق صاحب منطقی خیرآبادی اور
جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی نور اللہ مرقدہا سے بہت خصوصیت تھی
اور ہمیشہ ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ منشی صاحب مرحوم سے جیسی کچھ خصوصیت
تھی اُس کا حال اُن خطوط سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے جو ایک نے دوسرے کے پاس
زمانۂ مفارقت میں بھیجے تھے۔ یا اُن اشعار سے پتہ چلتا ہے جو دلی جذبات
سے مجبور ہو کر دونوں کی زبان سے بے ساختہ نکل گئے ہیں اُن میں کے
دو شعر یہاں درج کیئے جاتے ہیں :-

(۱) کہاں ہم اے امیر اور اب کہاں داغ — وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں کے
(۲) اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ — ملتے امیر احمد وسید جلال سے

مرزا صاحب کو دوران سر اور درجع مفاصل کی شکایت بہت ستاتی تھی باایں ہمہ
ہمیشہ شگفتہ خاطر اور خندہ رو رہتے تھے۔ غرض یہ کہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے
ہیں اردو زبان کی شاعری کا خاتمہ آپ کی ذات پر ہوا ؎

جناب داغ کا مرنا ہے شاعری کی موت
وہ مرگئے ہیں تو سمجھو کہ اس کی آئی موت

مانا کہ اب بھی جابجا شعرا طرزِ قدیم کے کم اور جدید کے بہت نظر آتے ہیں
مگر جو اثر داغ کے کلام میں ہے وہ اُنہیں کا حصہ تھا۔ ؎

(۱) گئی اردو کی رونق داغ کے ساتھ
(۲) وہی دم تھا غنیمت۔ وہ نہیں ہے
(۳) داغ ہی کے دم سے تھا لطفِ سخن
خوش بیانی کا مزا جاتا رہا

آپ کے کلام میں سے انتخاب کرنا کارے دارد۔ سارا کلام آراستہ ہے اس میں سے چھانٹنا آسان کام نہیں۔ جن صاحبوں کو شوق اور قدر ہو وہ داغ کے دواوین ملاحظہ فرمائیں۔ ہم یہاں صرف تبرکاً بہت تھوڑے سے متفرق اشعار لکھتے ہیں۔

عیب نکلا جو ہنر پیدا کیا
ہم نے کھویا جس قدر پیدا کیا

کھوے دیتا ہے مجھے دنیا سے وہ
جس کو میں نے ڈھونڈ کر پیدا کیا

شرم ہے پیدا سیئے کی اُس کے ہاتھ
جس نے مجھ کو بے ہنر پیدا کیا

اُس کی صورت دیکھتے رہتے ہیں ہم
دیکھیے کس وقت ہو ارشاد کیا

باعث گریہ نہ پوچھ اے ہم نشیں
کیا کہوں میں آگیا تھا یاد کیا

ڈوبتے ہیں عرق شرم میں غیرت والے
ڈوب مرنے ہی پہ جب آئے تو دریا کیسا

نامہ بر تو نے بھی دیکھا ہے اُسے سچ کہتا
گات کیسی ہے پھبن کیسی ہے نقشہ کیسا

دیکھتے ہو طرف سنگ در آتے جاتے
مجھ کو دیکھو کہ ہوا ناصیہ فرسا کیسا

غیر کے غم میں وہ خاموش تھے میں نے پوچھا
جی ہے کیسا تو کہا تیرا کلیجہ کیسا

تو ہی اپنے ہاتھ سے جب دل ہا جاتا رہا
دل کو بھی پروا نہیں جاتا رہا جاتا رہا

مرگ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال
دشمنی کا لطف شکووں کا مزا جاتا رہا

حرص دامن گیر دنیا مال دنیا بے ثبات
جس قدر حاصل کیا اُس سے سوا جاتا رہا

تمہاری بزم تو ایسی ہی تھی نشاط افزا
رقیب نے بھی اگر پی مجھے سرور آیا

تری گلی میں رہے بازگشت مثل نفس
کہ جتنی دور گیا واپس اُتنی دور آیا

الٰہی رشک مصیبت کی آب رو رکھنا
یہ بے کسی میں بُرے وقت پر ضرور آیا

دل کا کوئی حال دمِ بسمل نہیں ہوتا — کم بخت کلیجہ بھی تو شامل نہیں ہوتا

ملتے ہیں ترے چاہنے والے میں ترے ڈھنگ — جو تجھ میں مٹ گیا مجھے اُس نے مٹا دیا

یوں ہوگئی نجات یہ تدبیر بن پڑی — ناصح کو ہم نے غیر کے پیچھے لگا دیا

کوئی بھی طولِ روزِ جزا سے غرض نہ تھی — میری شبِ فراق کی ضد نے بڑھا دیا

کیا غضب ہے نہیں انسان کو انسان کی قدر — ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا

ہوگئی بارِ گراں بندہ نوازی تیری — تو نہ کرتا اگر احسان تو احساں ہوتا

وہ کاش مرے قتل کو آتے مگر آتے — ارمان تو اے گردشِ ایام نکلتا

آسماں ہو کہ زمانہ ہو غرض کوئی ہو — تم جسے دوست بنا لوگے وہ ہو جائے گا

ناامیدی تیرے صدقے تو نے دی راحت مجھے — کم ہوا جب ایک ارماں ایک دشمن کم ہوا

عالمِ یاس میں گھبرائے نہ انسان بہت — دل سلامت ہے تو حسرت بہت ارمان بہت

قتل ہونے نہ دیا شکر جفا نے مجھ کو — کام آتے ہیں برے وقت میں احسان بہت

جوابِ وصل نکلا آپ کے منہ سے نہیں بن کر — شکایت بھی یہاں آئی تو لبِ آفریں بن کر

یہاں ہم بدنصیبوں کو جو حصے میں نہیں آتی — الٰہی رہ گئی کیا خوبیٔ قسمت وہیں بن کر

در پردہ جو مضمون اُسے میں نے لکھا ہے — ہے کاتبِ اعمال کی تحریر سے باہر

جب وہ آنکھوں میں سمائے مرے دل میں آئے — بند ہوں ناصحِ نافہم یہ راہیں کیوں کر

مرے دل کی کیوں کر نہ ہو پائمالی — بہت اس میں ارمان آئے گئے ہیں

فرشتے بھی دیکھیں تو کھل جائیں آنکھیں — بشر کو وہ جلوے دکھائے گئے ہیں

جو بھلے ہیں وہ بروں کو بھی بھلا کہتے ہیں — نہ برا سنتے ہیں اچھے نہ برا کہتے ہیں

دنیا میں ان بتوں نے جلایا ہے اس قدر — دوزخ بھی میرے واسطے جنت سے کم نہیں

بتانِ ماہوش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں — کہ جس کی جان جاتی ہے اسی کے دل میں رہتے ہیں

ہمیں دشوار جینا عار تم کو قتل کرنے سے — بڑی مشکل میں رکھتے ہو بڑی مشکل میں رہتے ہیں

کیا کہوں تجھ کو جو بے مہر و فسوں گر نہ کہوں — جب کہ دنیا کہے اس بات کو کیوں کر نہ کہوں

بات کہنے کا مزا کیا جو غلط تم سمجھو — گر یقیں ہو تو کہوں گر نہ ہو باور نہ کہوں

غیر کا حال چھپانے سے کوئی چھپتا ہے — گر کسی وجہ سے میں آپ کے منہ پہ نہ کہوں

یہ اُٹھنا بیٹھنا محفل میں اُن کا رنگ لائے گا — قیامت بن کے اٹھیں گے بھبوکا بن کے بیٹھے ہیں

دو باتوں کی فریاد ہے درگاہ خدا میں
رحم آئے ترے دل میں اثر میری دعا میں

ممکن نہیں کہ تیری محبت کی بو نہ ہو
کافر اگر ہزار برس دل میں تو نہ ہو

قاتل اگر نہ شوخ ہو خنجر نہ تیز ہو
رگ رگ میں سیلے قرار ہمارا لہو نہ ہو

دل کو مسل مسل کے ذرا ہاتھ سونگھیے
ممکن نہیں کہ خون تمنا کی بو نہ ہو

بات کا زخم ہے تلواروں کے زخموں سے سوا
کیجیے قتل مگر منہ سے کچھ ارشاد نہ ہو

جور کے بعد ہے اب حرف تسلی کیسا
اس سے فرمائیے جس کو وہ گھڑی یاد نہ ہو

پچھتاؤ گے بہت مرے دل کو اجاڑ کر
اس گھر میں اور کون ہے مہماں تمھیں تو ہو

شب وصل ایسی کھلی چاندنی
وہ گھبرا کے بولے سحر ہو گئی

میری صورت بنی تو خاک بنی
قسمت اے صورت آفریں بنتی

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے
مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

جواب اس بات کا اس شوخ کو کیا دے سکے کوئی
جو دل لے کر کہے کم بخت تو کس دل سے ملتا ہے

سب سے تم اچھے ہو تم سے مری قسمت اچھی
یہی کم بخت دکھا دیتی ہے صورت اچھی

حسن معشوق سے بھی حسن سخن ہے کم یاب
ایک ہوتی ہے ہزاروں میں طبیعت اچھی

جو ہے آغاز میں بہتر وہ خوشی ہے بدتر
جس کا انجام ہو اچھا وہ مصیبت اچھی

درد الفت کے مزے لیتے ہیں لینے والے
خون دل زہر نہیں ہے کہ جو کھائے کوئی

ان کا قاصد لے چلا ہے دل مرا
تازہ فرمائش نئی سوغات ہے

ماتم ہے طفل اشک کا یا دل کا سوگ ہے
کیوں مردمان دیدہ سیہ پوش ہو گئے

مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

چلے آتے ہیں دل میں ارماں لاکھوں
مکاں بھر گیا مہماں آتے آتے

تری آنکھ پھرتے ہی کیسا پھرا ہے
مری راہ پر آسماں آتے آتے

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اڑ گیا آندھیاں آتے آتے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو
اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی

نگہ یار کو میں دل میں جگہ دوں لیکن
چور ہو جب کوئی مہماں تو عزت کیسی

دھمکیاں دیتے ہو تم جذبۂ دل کی اے داغ
بندہ پرور یہ محبت میں حکومت کیسی

موت

داغ صاحب کو وجع مفاصل اور دوران سر کی شکایت تھی آخر کار فالج میں وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپ کی وفات کے قطعات تاریخی بے شمار ہیں جن میں سے چن کر ہم یہاں لکھتے ہیں

(۱) آج بزم سخن میں داغ نہیں — سوگ جاری ہو اہل محفل پر
بلبل ہند اُڑ گیا افسوس — اب فغاں ہو لب عنادل پر
اس مسافر کو تھا خیال امیر — مل گیا جاکے اُن سے منزل پر
باغ بن جائے قبر داغ امیر — گل شگفتہ ہوں تو وہ گل پر
ہو یہ تاریخ رحلت استاد — آہ کیا داغ دے گئے دل پر

(۲) رو کے لکھ اُستاد کا سال وفات — شاعری اردو کی بیخ ہو گئی
سال زبر و بینہ میں اور لکھ — حیرت دل خستہ ختم شاعری

(۳) کیوں نہ ہو اس غم سے جگر پاش پاش — آج ہوے حضرت استاد فوت
حیرت دل خستہ یہ تاریخ ہے — تیرہ سو بائیس کہو سال موت

(۴) دست برد خزاں سے اے حیرت — ہائے ویراں سخن کا باغ ہوا
مبتلا درد و غم میں ہے ہر ایک — دل ہوا دم ہوا داغ ہوا
لوگ اُجڑا دیار کہتے ہیں — آج دلی کا گل چراغ ہوا
دم نکلتا ہے سن کے یہ تاریخ — آج راہی جہاں سے داغ ہوا

(۵) کیا شان کرم ہے دیکھ حیرت — بلبل کو خدا نے کیا دیا داغ
دریا کو گہر فلک کو انجم — جنت کو۔ نواب میرزا داغ
قضا کی ہے فصیح الملک نے آہ — آہ آہ دل میں ہیں داغ نہاں
صد حیف وہ دل کو دے گئے داغ — شور اُٹھا داغ لاولد مر گئے
کہتے تھے وہ مرتے وقت دم گریارب — عاصی کے گناہ بخش دے تو
آئی یہ ندا کہ ہم نے بخشا — بس داغ حزیں بہانہ آمد تو
نویں ذی الحجہ کی شب ہوئے رخصت — داغ چھاتی پہ داغ دھر بھی گئے
غل تھا میت پہ عید قرباں میں — ہائے وہ داغ آج مر ہی گئے
جان سوزاں وصال داغ ہوا — نامناسب ملال داغ ہوا
نویں ذی الحجہ ماہتاب گیا — روز امجد زوال داغ ہوا

۱۳۲۲

ماہ ذی حجہ میں ہوئی شب وصل
گیا دنیا سے لطف زینت شعر
سن کے یک لخت یہ کلام بدی
ای عطا کیا کہوں رضائے حق
تیرہ سو بارہ تھے فصلی داغ جب جنت گئے
ای لحد اب داغ لاکھوں دل میں ہے

حضرت داغ کیا مرے ساغر
گھٹ گیا جاہ سخن کا بالکل
لیکن اب اس کو کیا کرے کوئی
عید کے دن آج کیوں ہر شخص ہے
سنتے ہیں داغ اس جہاں سے اٹھ گئے
متقی لکھدو یہ تاریخ وفات

از سر افسوس شیدا نے لکھا
ہائے از جور سپہر کینہ توز
از پی تاریخ سال انتقال
حسرتا داغ دہلوی ای دوں
گفت انور بسال رحلت او
داغ شدہ حیف داغ شدہ
۱۳۲۲ھ - الہی - ۱۲ ۱۴

گلزار میرارم کے سلے گانٹ ن داغ
از خون دل بصفحہ عالم برائے سال
رحلت بر بست چوں فصیح الملک
سال تاریخ رحلتش کیفی
اک زمانہ جس کو کہتا ہے فصیح الملک داغ
یہ قیامت تک کسی کے دل سے ملنے کا نہیں

حج اکبر مآل داغ ہوا
انقطاع جمال داغ ہوا
فکر بد انتقال داغ ہوا
لایق فہم حال داغ ہوا
تیرہ سو بائیس ہجری میں عطا ہے انتقال
داغ نواب میرزا کہیئے

چمن نظم کا گلکھا چھوٹا
بس اسی بات کا افسوس ہوا
حکم اللہ کا - رضینا بقضا
۱۳۲۲ = ۱۹۰۵ء

مبتلائے درد غم رنج و محن
جو کے ستے استاد نواب دکن
وقت عصر انیس سو اور پانچ سن
انتقال میرزا نواب داغ
داغ عالی طبع زیر خاک خفت
داغ دانا وائے مرد - انور بگفت

از سموم اجل چو گل پژمرد
شاعر نیک ہند داغ بمرد
گفتا بمرد داغ حمیدہ صفات ہائے
۱۹۰۵ء

مُردہ ہے ہے نامور نواب ناظم یار جنگ
کیفی نوشت بلبل ہندوستاں برفت
از پی مغفرت دعا گفتم
داغ نواب میرزا گفتم
مٹ گیا وہ صفحۂ ہستی سے کیفی آج ہی
مادہ تاریخ کا داغ فصیح الملک ہے

کتبۂ لوح مزار

رفت از دہر چوں فصیح الملک | لرزہ افتاد در تمامی ہند
اوستاد نظام آصف جاہ | بود لطف شاہ حامی ہند
راست برقامتش قبائے سخن | زیب بر روئے خطاب جامی ہند
سلک نظمش بسان سلک گہر | جوہری سخن نظامی ہند
شد وفاتش بشام یوم الحج | دفن شد روز عید سامی ہند
آہ دل۔ برکشید و سائل گفت | مدفن پاک داغ نامی ہند

شعرا کے ضمن میں اور کئی شعرا کا حال لکھنا رہ گیا ہے کیونکہ یہ کتاب تذکرۂ شعرا نہیں ہے مثلاً نواب زین العابدین خاں بہادر عارف۔ نواب غلام حسین خاں بہادر محو۔ نواب ذوالفقار علی خاں آذر۔ مولوی عبداللہ خاں علوی۔ مولوی محمد حسین ہجر۔ میر نثار علی نثار۔ میر نظام الدین ممنون۔ وغیرہ وغیرہ۔ بریں ہم جو کچھ ہم نے لکھ دیا ہے وہی غنیمت ہے کیوں کہ میں دیکھتا ہوں تو کتاب کا حجم بڑھتا چلا جاتا ہے۔

دوسرا باب

عمارات بیرون شہر جو فصیل کے قرب وجوار میں ہیں

دربار شاہی ۱۹۱۱ء کا یادگاری ستون

سبزی منڈی کے آگے شہر دہلی سے تخمیناً تین میل کنگز وے ریلوے سٹیشن کے پاس جہاں کہ سنہ ۱۹۰۳ء کا دربار ہوا تھا اور بڑا عالی شان ایمفی تھیٹر بنا تھا وہ خطہ ملک معظم اور ملکہ معظمہ دام اقبالہما کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہو کر عرش بریں کی ہمسری کرنے لگا ہے۔ اس جگہ ۔ مربع نہایت مرتفع وکشادہ چوہرے چبوترے پر جس کی (۳۱) سیڑھیاں ہیں ایک پر ایک بہت بلند گاؤدم لاٹ پچاس فیٹ اونچی بیادگار دربار جشن تاجپوشی حضور ملک معظم جارج پنجم قیصر ہند کھڑی کی گئی ہے سارا چبوترا اور سیڑھیاں سنگ بالکی کی ہیں۔ لاٹ کی بیٹھک یعنی حصۂ زیریں

آٹھ فیٹ مربع اور ۱۱۔ ۱/۲ بلند سنگ ابری سبز کے قسم کے نادر پتھر کا ہی جو بہت صفائی سے پالش کیا گیا ہی۔ جس سے کے جوہر منجلی ہو گئے ہیں۔ اس میں ایسی صفائی اور جلادی گئی ہی کہ نظر پھسلتی ہی۔ لاٹ کے پانچ حصّے ایک کے اوپر ایک پیوست کیے گئے ہیں مگر جوڑ صاف معلوم دیتا ہی۔ اوپر کے چار حصّے کسی اور قسم کے بھورے پتھر کے ہیں جو صاف کرکے سنگ مرمر سے ملتا جلتا سا ہو گیا ہی پہلے تین حصّے مساوی گیارہ فیٹ چار چار انچ کے ہیں۔ باقی اوپر کے دو حصّے (انداز اً) آٹھ آٹھ فیٹ کے معلوم دیتے ہیں۔ اس طرح ستون کی بلندی پچاس فیٹ سے کسی طرح کم نہیں ہی۔ نیچے کا حصّے کو میں نے ناپ لیا اوپر کے حصّے کو بوجہ بلندی کے ناپ نہ سکا صرف اندازے پر سے اُن کا طول لکھ دیا ہی۔ مگر زیادہ فرق نہ نکلے گا۔ لاٹ کے حصۂ زیرین پر جنوب رخ پر انگریزی اور شمال کی سمت میں اردو بخط نستعلیق۔ تین فیٹ ۱۱ ۱/۲ انچ لمبی اور دو فٹ چوڑی پیچ رسی تختی پر ذیل کا کتبہ ہی:۔

Here on the 12th day of December 1911
His Imperial Majesty King George V
Emperor of India
Accompanied by the Queen Empress
in Solemn Durbar
Announced in person to the Governors
Princes and people of India
His Coronation celebrated in England
on the 22nd day of June 1911
and received from them
their dutiful homage and allegiance.

اُردو کا کتبہ

اس جگہ ۱۲۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو اعلیٰ حضرت اقدس جارج پنجم قیصر ہند نے بہمراہی عالیہ حضرت اقدس ملکۂ معظمہ دربار

نقشہ کوٹھی جناب صاحب کلاں بہادر
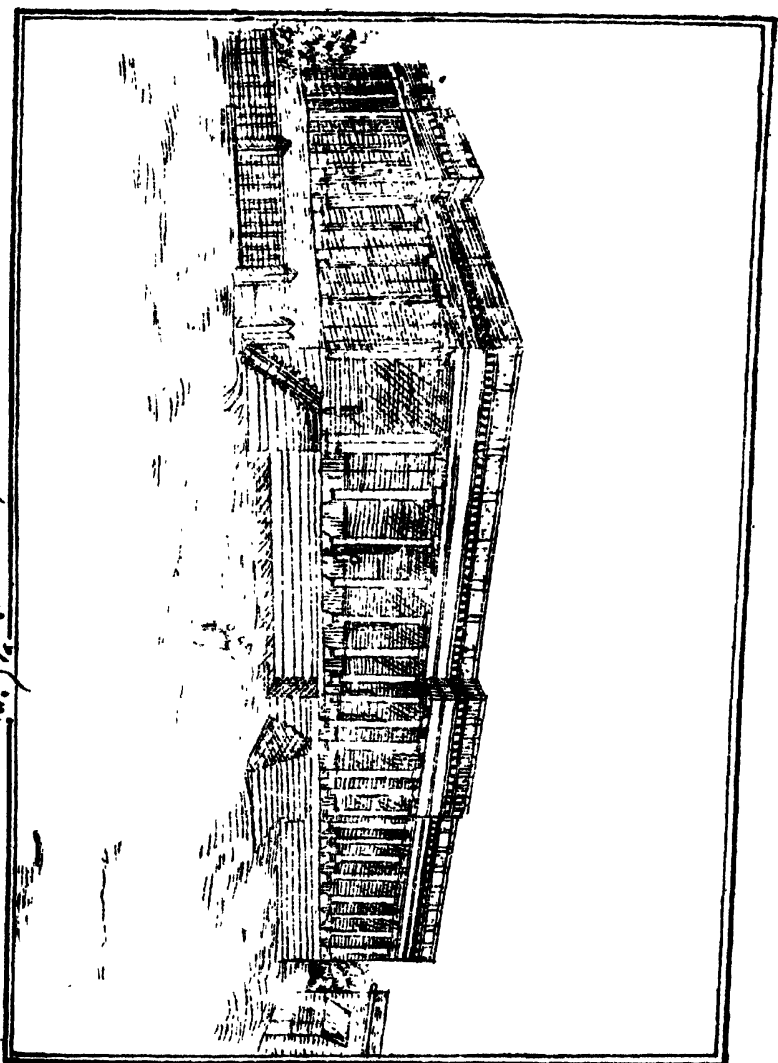
بذات اقدس خود حکام والیان ریاست اور ہندوستان کے لوگوں کو اعلان
حضرت موصوف کی رسم تاجپوشی ۲۲- جون ۱۹۱۱ء کو انگلستان میں
اور مشار الیہم نے اعلیٰ حضرت اقدس ممدوح کی خدمت میں اپنی
اور اطاعت کے فرض کو ادا کیا۔

ن دربار پارک ۱۹۰۳ء

نجف گڑھ کی جھیل کے شمال میں کوئی پاؤمیل
سیدھی طرف ایک سڑک ہو جو علی پور روڈ سے
جاملتی ہو یہ وہی مقام ہو جہاں ایڈورڈ ہفتم ہندوستان
شہنشاہ کا جشن تاجپوشی ہوا تھا۔ یہاں اب بھی ایمفی تھیٹر کے
موجود ہیں۔ یہ ایمفی تھیٹر طرز مغلیہ کا مسقف بنایا گیا تھا۔ اس کے گرد
بند پانی روکنے کے لیئے بنادیا گیا ہو کیوں کہ موسم بارش میں چوطرف کا
آکر اکھٹا ہوتا ہو۔ یہاں ایک پارک بنادیا گیا ہو۔ یہاں ایک یادگاری
نصب کیا جانے والا ہو جو اُس عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہوگا جس کا
یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو لارڈ کرزن نے کیا تھا۔

ہاؤس

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

کشمیری دروازہ بجانب شمال کوئی ایک میل پر یہ عالی شان کوٹھی
تھیافلس مٹکاف ریزیڈنٹ کی بنائی ہوئی ہو جو دربار مغلیہ میں معظم الدولہ امین الملک
یار خاں فرزند ارجمند بجان پیوند فیروز جنگ صاحب کلاں بہادر کے
سے مخاطب کیئے جاتے تھے انھیں کی قبر سینٹ جیمس کے گرجا میں
ایک بلند ہوادار مقام بیرون شہر لب دریا بنی ہوئی ہو۔ احاطہ اس کا
ہو اور اس میں کئی کوٹھیاں عالی شان خوشنما اور نہایت وسیع بنی ہوئی ہیں
طرح آرام و آسایش کے لحاظ سے لاجواب ہو۔ اس کے وسیع کمرے اور ہال اور
دیدنی ہو۔ کوٹھی کی کرسی بہت اونچی ہو جس کے نیچے متعدد حجرے اور گرمیوں
کے کئی وسیع تہ خانے ہیں۔ انھیں تہ خانوں میں نوکروں نے انگریزوں کو
چھپادیا تھا اور یہیں سے لفٹنٹ ڈیئبرٹ غدر میں بھاگے تھے۔ غدر میں

انھیں کے بیٹے سر جان تھیافلس مٹکاف دلی کے جائنٹ مجسٹریٹ تھے محاصرۂ دہلی کے وقت باغیوں نے اس کوٹھی کو خوب لوٹا اور اُن کی جان بڑے خطرے میں تھی جو بال بال بچ گئی۔ سرکار کی طرف سے ان کی امداد کا شکریہ بھی ادا کیا گیا۔ اب یہ کوٹھی گورنمنٹ آف انڈیا کے قبضے میں ہے بہت کچھ توسیعات کرکے درست کی گئی ہے۔ کوٹھی کاہے کو ہے بجائے خود ایک قلعہ ہے۔ گرمیوں میں گورنمنٹ آف انڈیا کے عہدہ دار رہتے ہیں اور جاڑوں میں جب نواب ویسرائے بہادر شملہ تشریف لے جاتے ہیں تو اس میں چیف کمشنر صاحب بہادر رہتے ہیں۔ کنگز وے ریلوے سٹیشن سے جو دلی سے براہ راست تین میل ہے سلسلہ عمارات کا شروع ہوجاتا ہے اور یہ ساری عمارتیں جدید اور انگریزی طرز کی ہیں جن میں بیشتر انگریز لوگ ہی رہتے ہیں اور یورپین تجار کی دکانیں بھی ہیں۔ یہ کنگز وے روڈ کہلاتی ہے۔ علی پور اور راج پور روڈ پر بھی اسی طرح کوٹھیاں ہی کوٹھیاں ہیں۔ شہر کے باہر کا کل حصہ یورپین ٹون سمجھنا چاہیئے۔ ویسرائے کی کوٹھی اور کونسل ہال وسکریٹریٹ کی عالی شان وسیع عمارتیں مٹکاف ہوس۔ لڈلو کیسل۔ کرزن ہوس وغیرہ وغیرہ سب اسی نواح میں ہیں۔ دہلی کی سب سے مشہور ہوٹل میڈنز ہوٹل ہے جس میں ڈاک خانہ اور تار گھر بھی ہے بہت عالی شان اور وسیع ہے اس کے بعد سسل البین۔ وڈ لینڈ اور چھوٹی موٹی کئی ہوٹلیں بنی ہیں۔

رج یعنی پہاڑی

شہر کے شمال کی طرف مشہور رج (پہاڑی) ہے جہاں غدر میں انگریزی لشکر ۸ جون ۱۸۵۷ء کو شہر کے محاذ میں آنے سے بیشتر پڑا تھا۔ باغیوں نے ہلّا کیا اور اس مختصر فوج کو منتشر کرنا چاہا کہ اتنے میں نکلسن کی فوج شہر کے محاصرے کو آن پہنچی۔ محاصرہ کا کام ۷ ستمبر سے شروع ہوا اور ایک ہفتے کے مختصر وقت میں مورچے وغیرہ طیار کرنے اور دو دن اور ایک رات گولہ باری کرنے کے بعد شہر پر حملہ کیا گیا اور ۱۴ ستمبر کو شہر میں داخل ہوگئے لیکن پھر بھی باغی ۲۰ ستمبر تک برابر بچی توڑ کر لڑتے رہے آخر پانچ دن تک گلی کوچوں میں مقابلے کرنے کے بعد ٹھنڈے حال ہوگئے اور ۲۰ ستمبر کو انگریزوں نے کل شہر پر قبضہ کرلیا اور دیوان خاص میں ملکہ معظمہ آں جہانی کا جام صحت بڑی مسرت سے نوش کیا گیا۔ پہاڑی سے

سے لے کر شہر کی فصیل تک ایسے کئی مقام ہیں جہاں وہ بڑے بڑے معرکے ہوئے جن کی بدولت ہندوستان اس آفت سے بچ گیا۔

پکٹ مونڈ (قراول کی ٹیکری)
فلیگ سٹاف ٹور (باؤ ٹہ)

کشمیری دروازے سے لڈلو کیسل اور میٹکاف ہوس کے برابر سڑک علی پور ہی جو چیف کمشنر صاحب کی کوٹھی کے پاس سے پہاڑی کے درے کی طرف چلی گئی ہے۔ یہاں سڑک کی دو شاخیں ہو گئی ہیں بائیں طرف کی شاخ مدور فلیگ سٹاف ٹور (باؤ لے ٹ) کو جاتی ہے جو رِج (پہاڑی) پر بنا ہوا ہے۔ سیدھے ہاتھ کی طرف کی سڑک کے پاس ایک ٹیکری ہے جو حقیقت میں اینٹوں کا پزاوا تھا۔ اسی پر دہلی کے محاصرے کے زمانے میں انگریزی فوج کا قراول پڑا ہوا تھا۔ اب بھی یہاں کچھ کچھ نشان دمدموں کے باقی ہیں۔ فلیگ سٹاف ٹور (باؤ لے ٹ) کی گول برج نما پختہ عمارت سرخ رنگ کی چداہی بنی ہوئی ہے۔ اول تو یہ عمارت خود اونچی ہے پھر ایک اونچی پہاڑی پر بنانے سے بلندی اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ اس برج کے تین طرف دروازے ہیں جن میں لوہے کا کٹہرا لگا ہوا ہے۔ عمارت لداؤ کی ہے۔ جس کے گرد ۱۱-۶ چوڑی غلام گردش ہے۔ پہلی منزل میں چھبیس اور دوسری میں چودہ جملہ چالیس سیڑھیاں ہیں۔ اوپر کھلا ہوا حصہ ہے مسقف نہیں ہے۔ ایک چوبی سائبان پڑا ہوا ہے جس کے بیچ میں ایک اونچا چوبی مستول ہے اور اسی پر جھنڈا اڑتا ہے۔ اس جگہ چار فیٹ اونچی منڈیر بطور کٹہرے کے ہے۔ برج کی پہلی منزل کی بلندی ۲۲ فٹ اور دوسری کی ۲۶ - جملہ ۴۸ فٹ ہے۔ پہلی منزل میں منڈیر کے چوطرف چودہ جھانکیاں ہیں اور اسی طرح دوسری یعنی بالائی منزل میں سات جھانکیاں ہیں۔
نیچے والا یعنی پہلا چبوترا ۳ - ۱ اونچا اور دَوْر میں ۱۷۰ - ۱ ہے۔ اس میں اور اس کے اوپر کے چبوترے میں ۸ - ۲ جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ دوسرے چبوترے کے اوپر جو چار فیٹ اونچا ہے چھوڑ کر اصلی برج بنایا ہے۔ یہ چبوترے ملا لیں تو اونچان ۵ - ۱ اور بڑھ جائے گی۔ برج کا دور ۱۳۶ - ۲ ہے۔ تینوں دروازوں کے سامنے دوسرے چبوترے پر تین تین سیڑھیاں بعد میں بنا دی ہیں جن کو چڑھ کر ٹور میں داخل ہوتے ہیں۔ باؤ لے ٹ پر چڑھنے سے شہر کا عمدہ منظر پیش نظر ہوتا ہے۔ سامنے ہی دار گورنمنٹ سکریٹریٹ کی

عالی شان عمارت سر بفلک کھڑی ہے۔ بائیں جانب مٹکاف ہئوس جسے سر طامس مٹکاف رزیڈنٹ دربار شاہ دہلی نے ۱۸۴۴ء میں بنوایا تھا۔ انھیں کے صاحب زادے غدر کے دنوں میں دہلی کے جائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ دریا پر ریل کا پل دکھلائی دیتا ہے جو ٹھیک اسی مقام پر بنا ہے جہاں کہ غدر سے پہلے کشتیوں کا پل تھا۔ ریل کی سڑک اسی زمانے میں بننی شروع ہوئی تھی۔ ریلوے کے پل کے ختم پر قلعے کی سرخ سرخ فصیل شروع ہو جاتی ہے جس کے اندر اب کثرت سے بارکیں بن گئی ہیں اور قلعے کے لاہوری دروازے پر برٹش گورمنٹ کا جھنڈا اڑتا ہوا دور سے نظر آتا ہے۔ اس کے بعد باؤنٹے پر سے قریب تر کشمیری دروازے کے پاس سینٹ جیمس کے گرجا کا خوش نما گنبد دکھلائی دیتا ہے اس سے اور ادھر میڈن ہوٹل کی دیواریں جامع مسجد کے برجوں اور مناروں کی سیدھ میں نظر آتی ہیں اور ریلوے سٹیشن کے مینار بھی درختوں کے اوپر نکلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب سیدھے ہاتھ کی طرف نظر دوڑائیے تو کاٹن اور فلور مل (روئی اور آٹے کی کل) کی گھرنی معلوم ہوتی ہے یہ وہی کونا ہے جہاں کے موری دروازہ تھا۔ اس سے آگے بڑھ کے کشن گنج اور سبزی منڈی کی لمبی لمبی چمنیوں کے ساتھ لال لال فتح گڑھ کا مینار غدر کی یادگار کھڑا ہے۔ ان مقامات کے علاوہ پہاڑی پر سے اسوکا کا سنگین ستون۔ ہندو راؤ کی کوٹھی۔ رسدگاہ۔ چوبرجی مسجد (جس کا اب ایک ہی برج رہ گیا ہے) پھر سرخ فلیگ سٹاف ٹور اور وہاں سے ذرا زیادہ دور پر توپ خانے کی پرانی ہسپتال کے کھنڈر ہیں۔ ٹیکری کے نیچے ہی جمنا کے کنارے پر میگزین ہے اور سفید سفید گنبد جو نظر آتا ہے وہ چندراول کا گاؤں ہے اور سب سے آخر دہلی کے کارخانۂ آب رسانی کی بلند چمنی ہے اور اس طرح ایک چکر کاٹ کے ہم پھر مٹکاف ہئوس کو آن پہنچتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس ٹیکری پر انگریزی فوج تھی اور دریا کے کنارے کچھ درختوں کی آڑ میں غنیم نے اپنا توپ خانہ انگریزی فوج پر گولہ باری کرنے کو جما رکھا تھا۔

قدیم حجرہ فلیگ سٹاف ٹور کے مغرب وجنوبی جانب کوئی دو ڈھائی قدم پر فتح گڑھ کے منارے سے آتے ہوئے بائیں طرف لب سڑک ایک چھوٹی سی بہت پرانی عجب نہیں کہ فیروز شاہ کے عہد کی ہو

نقشہ باغ قدسیہ

عمارت بنی ہوئی ہے۔ جس کا ایک ہی کمرہ ۲۰ فٹ ۴ ۱/۲ انچ × ۲۰ فٹ ۴ ۱/۲ انچ ہے۔ جس کے چاروں طرف دروازے ہیں اور چھت صندوق نما لداؤ کی ہے۔ یہ عمارت کچھ زیادہ اونچی نہیں ہے۔ یا تو یہ کہ اس کے گرداگرد کوئی عمارت رہی ہوگی وہ سب گر گرا گئیں اور صرف یہ حجرہ رہ گیا یا یہ کہ بجائے خود کسی خاص غرض سے بنایا گیا ہو جس کی نسبت اس وقت بلحاظ موجودہ حالت کے کوئی صحیح رائے قایم نہیں کی جا سکتی۔ اس کے فرش میں اینٹوں کا چوکا بچھا ہوا ہے جو بعد کا معلوم دیتا ہے۔

قدسیہ باغ

۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۸ء

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — رو کشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لیے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

یہ باغ کشمیری دروازے کے باہر دریائے جمنا کے کنارے ہے۔ یہ باغ بڑا لمبا چوڑا اور وسیع قطعۂ اراضی میں پھیلا ہوا ہے۔ نواب قدسیہ بیگم صاحبہ محل محمد شاہ بادشاہ نے جو احمد شاہ بادشاہ کی والدہ تھیں۔ یعنی ایک بادشاہ کی بیوی اور دوسرے بادشاہ کی ماں تھیں ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۸ء میں بنوایا تھا ان کا اصلی نام ادھم بائی تھا۔ یہ بیگم بڑی بیدار مغز ہوشیار اور زیرک تھی۔ بات بات میں وہ نتایج پیدا کرتی تھی کہ بڑے بڑے عقل مند دنگ رہ جاتے تھے مگر افسوس کہ محمد شاہ کی متلون المزاجی۔ غیر استقلالی۔ عیش پسندی نے اسے بھی غارت کیا۔ محمد شاہ صرف کاہل و عیش پسند ہی نہ تھا بلکہ حکومت کے قواعد و ضوابط اور سلطنت کے آئین و آداب سے بھی بے بہرہ تھا۔ اسی کی غفلت اور بے پروائی سے سلطنت مغلیہ پر ایک عام زوال کی گھٹا چھا گئی اور سارے ملک میں غدر مچ گیا۔ صوبوں کے حکمراں خود سر ہو گئے اور ہر ایک نے بغاوت کی جہاں سوز آگ بھڑکا دی۔ مرہٹوں نے یہاں تک زور باندھا

کہ دارالسلطنت کو لوٹ لیا اور یہ بربادی اور غارت گری ایسی سخت ہوئی کہ پھر دلّی کو کبھی پنپنا نصیب نہ ہوا اسی اثنا میں قہر خدا نادر شاہ کی شکل میں مثل بلائے آسمانی نازل ہوا۔ بے گناہ اہل شہر کے سر بھٹّے کی طرح اُڑنے لگے ہر گلی کوچے میں نادریوں کی خونریز تلواروں نے قیامت بپا کر دی خدا کی بے گناہ مخلوق ایک ایسی کثیر تعداد میں قتل کی گئی کہ شاہ راہوں کے رستے کشتوں کے پشتوں سے اٹ گئے۔ اس عظیم الشان واقعہ کے بعد نادر شاہ اسّی کروڑ کا مال واسباب لوٹ کھسوٹ کر پلٹا۔ دلّی والوں کو یہ سارا خمیازہ محمد شاہ رنگیلے کی بدولت بھگتنا پڑا۔ نواب قدسیہ بیگم کی طبیعت نہایت موزوں تھی وہ شاعرہ بھی تھی اور رعنائیؔ تخلص کرتی تھی۔ اُس کا ایک یہ شعر مشہور ہے ؎

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سُکھ ہوا
کم بخت کیسی آنکھ لگی اور دکھ ہوا

عام طور پر یہ بات زبان زد خلایق ہے کہ بیگم صاحب کو یہ باغ بنا بنایا مل گیا تھا جس کو اُنھوں نے اپنے شوق اور سلیقے سے خوب بنایا سنوارا۔ عالی شان عمارتیں بنوا کر کھڑی کر دیں۔ متعدد ذرائع آب رسانی بنوائے جن کے بمبوں کے نشانات اب بھی نظر آتے ہیں۔ اب یہ باغ نہیں رہا بلکہ بمقابلۂ حالت ماسبق کے جنگل کہا جائے تو بجا ہے۔ نہ کوئی بڑی عمارت باقی رہی نہ چمن۔ اب نہ کوئی محل ہے نہ بارہ دری۔ ہاں جا بجا عمارات شکستہ کے ملبے کے ٹیلے دیکھ لو جن سے سمجھ لو کہ یہاں محل تھا وہاں بارہ دری تھی۔ پچھلی شان وشوکت۔ عظمت اور آراستگی کی یادگار۔ مشتے نمونہ از خروارے سب جا جو کے ایک صدر دروازہ اور دوبارہ دریاں۔ تین ٹکڑے دیواروں کے وہ بھی متفرق چند گری پڑی کوٹھڑیاں زمانے کی برباد اور فنا کن رفتار کا مقابلہ کر رہی ہیں اور اپنا نمونہ دکھلا کر یاد دلا رہی ہیں کہ اسی جنگل میں منگل تھا۔ یہیں سبزہ لہلہاتا تھا۔ یہیں نہریں دوڑتی تھیں۔ یہیں فوارے چھوٹتے تھے۔ یہیں جلسے اور جشن ہوتے تھے۔ آج جن کو تم ملبے کا ڈھیر کہتے ہو یہی عالی شان محلات نفیس ساز وسامان سے آراستہ تھے۔ انھیں میں بادشاہ بیگمات۔ شہزادے شہزادیاں۔ لونڈیاں۔ باندیاں۔ قلماقنیاں۔ اُرْدا بیگنیاں۔ گارڈنیں۔ خواجہ سرا

چوبدار - پھرا کرتے تھے - اسی زمین کے ٹکڑے نے بادشاہ اور حرم محترم کے قدم چومے ہیں جس کو آج تم روندر ہے ہو - تم کیا روندر ہے ہو بلکہ جہاں گدھے لوٹ رہے ہیں اور چرر ہے گائیں بھینس اور بکریاں چرا رہے ہیں - جہاں عطر - تیل - پھلیل - گلاب - چنبیلی کے کنٹر کے کنٹر لنڈھائے جاتے تھے آج بکریوں کی مینگنیوں کے ڈھیر اور گوبر کے چوتھ لگے ہیں - مویشی کے پیشاب سے وہ زمین سینچی جارہی ہے جہاں کیوڑے اور گلاب کے قرابے کے قرابے لنڈھائے جاتے تھے - غرض یہ کہ جو مقام عیش وعشرت تھا آج وہی جگہ حسرت کدہ اور مرقع عبرت ہے

عجب ہیں قدرت کے کارخانے خدا کی باتیں خدا ہی جانے
وہ شان اپنی لگا دکھانے خدا کی باتیں خدا ہی جانے
کھلا نہ بھید و کل پردہ یاروں خدا ہی جانے کہ کل کو کیا ہو
ہوئے ہیں عاجز ہزاروں سیانے خدا کی باتیں خدا ہی جانے
کسی کے سر پر ہے تاج شاہی کوئی لیئے کاسۂ گدائی
کوئی ہے صحرا میں خاک چھانے خدا کی باتیں خدا ہی جانے
بہت نجومی نجوم والے کسی نے قرعے رمل کے ڈالے
کوئی نہ قدرت کا بھید جانے خدا کی باتیں خدا ہی جانے
کسی کی وقعت کسی کی ذلت کسی پہ غصہ کسی پہ رحمت
خدا کی حکمت خدا ہی جانے خدا کی باتیں خدا ہی جانے

اب باغ میں بڑے بڑے پرانے درختوں اور چوڑی چوڑی بجری کی سڑکوں کے سوا کوئی سامان تفریح طبع کا نہیں ہے البتہ ایک دروازہ بجانب مغرب نہایت مستحکم سنگ بست بنا ہوا ہے جو ۹ گز اونچا - ۱۳ گز لمبان میں اور ۵ گز چکلان میں ہے - تاکہ محل کا سامنا نہ ہو ایک پردے کی دیوار دروازے کی محرابوں کے سامنے کھڑی ہوئی ہے دروازے کے ادھر ادھر دو دیوار دوز ستون ہیں جن پر گلے بنے ہوئے ہیں - دروازے کے دونوں جانب تھوڑی دور تک پختہ کوٹھڑیوں کی ایک قطار رہ گئی ہے وہ بھی جا بجا سے شکستہ لیکن طرز عمارت پڑا بول رہا ہے کہ سارا باغ اسی نہج پر محاط تھا جس کا اب صرف یہ ٹکڑا نظر آتا ہے - باغ کے شمال ومغرب کے کونے میں

ایک دیوار موجود ہی جہاں چرس لگاکر باغ میں پانی دیا جاتا تھا۔ اس دیوار کے جنوب مغرب میں پھر ایک لین کوٹھڑیوں کی کوئی پانسو فیٹ لمبان میں اور چارسو فیٹ چکلان میں چلی گئی ہی جس کے بیچ میں ایک صحن ہی۔ کہا جاتا ہی کہ اسی قسم کی عمارات دروازے کی سیدھی جانب بھی تھیں اور ان دونوں کے بیچ کے قطعے میں بھی کوٹھڑیوں کی ایک قطار تھی اور ان دونوں قطعات کے درمیان ایک دروازہ تھا۔ یہ چیزیں اب صفحۂ زمین پر موجود نہیں ہیں۔ باغ کا مشرقی حصّہ تو اب صفاچپٹ میدان ہی لیکن اُس میں بھی جا بجا آب رسانی کے ذرائع کے کھنڈر موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہی کہ سارے باغ میں یہی حصّہ زیادہ پر رونق اور آباد تھا اور کچھ تعجب نہیں کہ شاہی محل بھی یہیں رہا ہو۔ باغ کے شمال اور جنوب میں دو دیواریں اور کھڑی ہیں جن میں اُسی قسم کی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں جیسی کہ صدر دروازے کے ہر دو جانب ہیں اور انھیں دیواروں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی بارہ دری باقی رہ گئی ہی۔ ان کوٹھڑیوں کی کرسی پانچ فیٹ بلند ہی اور کوٹھڑیوں کا عرض و طول ۳۰×۲۰ فیٹ ہی جن کے سامنے دار تین محراب دار دروازے ہیں۔ یہ بارہ دری جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہی نہایت خوش نما اور عظیم الشان تھی جس میں بڑے بڑے وسیع اور دلچسپ شہ نشین تھے مگر افسوس کہ اب یہ بارہ دری جا بجا سے ڈھ گئی ہی بیرونی سطح پر بے شمار برساتیں گزرجانے سے تمام استرکاری پر ہیبت ناک سیاہی دوڑ گئی ہی۔ اینٹوں اور پتھروں پر اکثر جگہ سبز سیاہی مائل کائی کی تہیں چڑھ گئی ہیں۔ اندر کی حالت اس سے بھی بدتر ہی کہ چونا اور استرکاری اینٹوں کو چھوڑ چکی ہی اب صرف گرنے ہی کی کسر باقی رہ گئی ہی۔ اس کی چھتیں گو بڑی خوب صورتی اور خوش نمائی سے نقش و نگار سے آراستہ کی گئیں تھیں مگر افسوس کہ خوش نمائی اور رونق کو اُس کے عروج کا زمانہ اپنے ساتھ لے گیا اور بخت سیہ نے اُسے اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ اس بارہ دری کے عقب میں ایک نفیس پائیں باغ تھا جو شادابی اور تروتازگی میں بے نظیر تھا مگر برسوں کی کس مپرسی اور تغافل نے باغبانوں کی حیرت انگیز صنعت اور تعجب خیز کاریگری کو خاک میں ملا دیا تاہم اس گئے گزرے حال میں بھی اس کا پُر فضا اور سبز چمن اور ہری ہری گھانس کے مصفا اور مسطح وسیع تختے پائیں باغ کے امیرانہ شوق اور فراغ حوصلگی اور
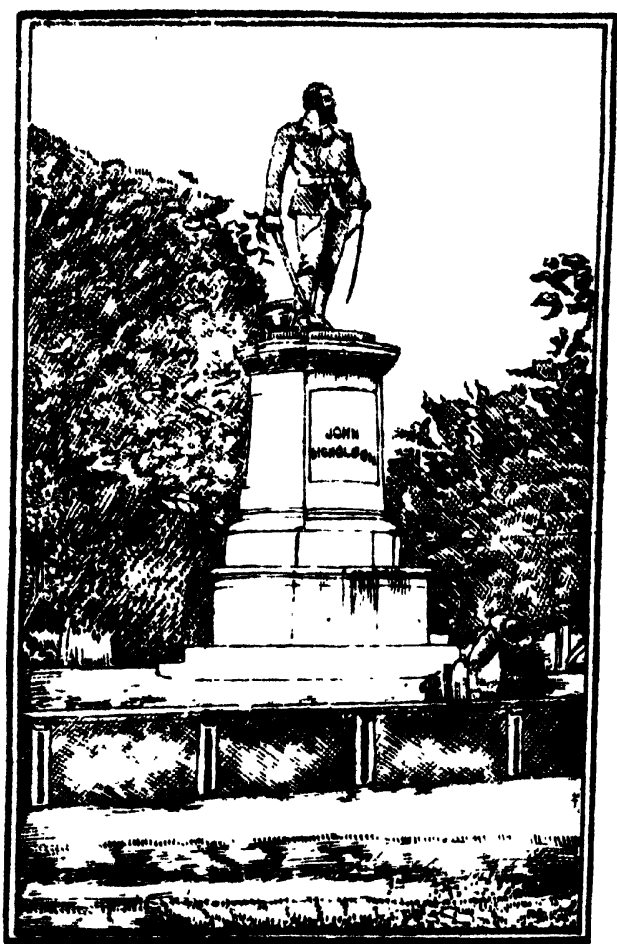
جان نکلسن کا مجسمہ

دریا دلی کا بہت بڑا ثبوت دے رہے ہیں سا تھا اس کے پچھلی اور موجودہ حالت کو جب اپنے تصور اور خیال میں مقابلہ کرتے ہیں تو کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہی۔ اصل میں باغ کے تین دروازے تھے جن میں سے ہم نے صرف ایک کا ذکر اوپر بیان کیا ہی جو مغرب میں ہو اور وہی صدر دروازہ ہی اس کے علاوہ اور دو دروازے تھے ایک احاطے کی شمالی دیوار میں بارہ دری کے پاس دوسرا مغربی کونے میں جس کا اب صرف نشان ہی نشان رہ گیا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ یہاں بھی ایک دروازہ تھا۔ باغ کے جنوب و مشرق کے کونے میں ایک مسجد بھی تھی ایام غدر میں اُس پر توپوں کے گولے اس کثرت سے برسے کہ مسمار ہو گیا اب مسجد کی صورت تک بھی باقی نہ رہی۔ یہ مسجد نہایت خوش وضع اور شان دار از سرتا پا سنگ سُرخ کی بنی ہوئی تھی۔ تمام صحن میں پختہ فرش تھا در و دیوار میں عمدہ پچیکاری کا کام تھا جس میں نہایت عمدہ بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ اس کی تعمیر میں زر خطیر صرف ہوا تھا لیکن افسوس کہ اب وہ بالکل ویران اور غیر آباد پڑی ہی۔ عمارت بالکل بوسیدہ اور خراب و خستہ ہو گئی صحن میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا رہتا ہی۔ خاک کے تودوں نے فرش کو چھپا رکھا ہی غرض ویرانی اور وحشت کی پوری تصویر ہو۔ یہ مسجد بھی غالباً کسی محل کے پاس تھی۔ محل کا محل بھی اب نہیں معلوم ہوتا۔ اس باغ کا موقع اور محل ایسا نفیس ہی کہ باید و شاید۔ باغ کے مشرقی کنارے پر برآمدے سے ملا ہوا دریا رواں تھا اب دریا بھی خفا ہو کر باغ سے دور ہٹ گیا اور اُس نے ایسی بے رُخی اختیار کی کہ خبر تک بھی نہ لی کہ جس باغ کو اُس نے اپنی آبیاری سے برسوں تر و تازہ رکھا تھا اب کس مپرسی کی حالت میں ہی۔ غرض یہ باغ اس شعر کا مصداق تھا۔ ؎

آبِ رواں ہو سبزہ پہلو میں یار ہو
مدت سے یہ ہوس ہی کہ ایسی بہار ہو

نکلسن صاحب کا مجسمہ اور کورٹ
۱۸۵۷ء

جنرل نکلسن اُس دستۂ فوج کے ساتھ تھے جس نے کشمیری دروازے کے پاس کی فصیل میں جب

شگاف پڑ گیا تو حملہ کیا تھا۔ عین اسی وقت ایک دوسرا دستہ بدرر و برج کی طرف طرف سے گھس آیا اور تیسرا کشمیری دروازے سے۔ یہ تیسرا دستہ دڑاتا جامع مسجد تک جا پونہچا اور نکلسن اور دستوں میں سے کچھ فوج لے کر فصیل فصیل لاہوری دروازے کی طرف بڑہا کہ چوتھا دستہ اُدھر سے آنے والا تھا لیکن چوتھا دستہ پسپا ہوا۔ نکلسن وہاں سے ہٹ کابلی دروازے پر جا پونہچا جہاں سے ایک تنگ گلی لاہوری دروازے کو جاتی ہی اور اُسی میں باغیوں نے تمٹ کا ٹھٹ لگا ہوا تھا دو مرتبہ جھجکا جھجکا کر حملہ کیا مگر دونوں دفعہ ناکامیابی رہی تیسرا حملہ نکلسن صاحب نے بالذات کیا اور حملے کے شروع ہی میں اُن کے سینے میں گولی لگی یہ دن ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کا تھا۔ نو دن تک جنرل صاحب موت و حیات کے درمیان جھولتے رہے اور آخرکار یہ بے نظیر جنرل اور جیوٹ سردار ۲۳ ستمبر کو ساڑھے نو بجے دن کے صفحۂ دنیا پر اپنا نام فاتح دہلی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے یادگار چھوڑ گیا۔ ان کی عمر (۳۵) سال کی تھی۔ یہ کشمیری دروازے کے باہر اُس قبرستان میں دفن کیئے گئے جو ان کے مجسمے کے پیچھے ہی۔ فتح دلی کی یادگار میں وہ کوٹ جو جنرل صاحب زخمی ہونے کے وقت زیب تن کیئے ہوے تھے دلی کے آثار قدیمہ کے عجائب خانے میں بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا گیا ہی جنرل نکلسن کا بت رُوبروئے کشمیری دروازے کے سامنے ایک اونچے اور شاندار اور وسیع مثلثی شکل کے چبوترے پر قدسیہ باغ کے ایک حصے میں کھڑا ہی جو باب نکلسن گارڈن کے نام سے مشہور ہی اُس بت کے دیکھنے سے چہرے پر سطوت و جبروت۔ رعب و داب کی ایسی شان نظر آتی ہی جس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ منہ کا رُخ کشمیری دروازے کی طرف پھرا ہوا ہی۔ داہنے ہاتھ میں جھکی ہوئی شمشیر برہنہ ہی۔ بایاں ہاتھ نیام پر ہی۔ بائیں ہی طرف طمنچہ قبورسے میں لگا ہوا ہی۔ داہنا قدم ذرا گھٹنہ خمیدہ آگے بڑھا ہوا ہی اور دوسرا قدم ذرا پیچھے ہی۔ گویا زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں:۔ "ہاں بڑھے چلو" بت پر ایک سیدھا سادا کتبہ صرف جان نکلسن کے نام کا لگا ہوا ہی:۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
کہ دیکھو خوش نما لگتا ہی جیسے چاند بن گہنے

ہندوستانی لوگ ان کو نکلسن صاحب کہتے ہیں۔ یہ بت خاص اس مقام پر نہیں بنایا گیا جہاں کہ نکلسن صاحب زخمی ہوئے تھے۔ یہ مجسمہ طامس براک آر۔ اے کا بنایا ہوا ہی۔ جو اس فن میں دست گاہ کامل رکھتے ہیں اُنھوں ہی نے آگرے میں ملکۂ معظمہ آنجہانی کا اور بمبئی میں سر رچرڈ ٹمپل کے نفیس بُت بنائے ہیں نکلسن صاحب کے مجسمے کا طرز و انداز۔ مہیب جنرل کے چہرے کا اصلی رعب داب بہت خوب بنایا ہی اور یہ صناعی براک صاحب کی بہترین صنعت سمجھی جاتی ہی۔ نکلسن صاحب کے زخمی ہونے کا اصلی مقام تو کابلی دروازے کے قریب تھا لیکن بت کشمیری دروازے کے پاس غالباً اس سبب سے نصب کیا گیا ہی کہ وہیں قریب میں جنرل صاحب کی قبر ہی۔ جس پر یہ کتبہ ہی:-

قبر پر کا کتبہ

The grave of Brigadier-General John Nicholson who led the assault at Delhi but fell in the hour of victory mortally wounded and died September 23, 1857. Aged 35.

ترجمہ۔ یہ قبر بریگیڈیر جنرل نکلسن کی ہی جو دلی کے حملے کے پیش رو تھے لیکن فتح کے وقت مہلک زخم لگنے سے گرے اور ۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بعمر (۳۵) سال انتقال کیا۔

باغ میں توپ خانہ

قدسیہ باغ نے ایام غدر میں بھی بڑا حصہ لیا ہی۔ مارسر بیٹری اور واٹر بیسچ بیٹری نمبر ۳ توپ خانے یہیں تھے۔ اس باغ کے محاذ میں پانی برج[1] اور کشمیری برج[2] کے شگاف ہیں اور جنوب مشرق کے کونے کے باہر نکلسن کا باغ اور وہ قبرستان ہی جس میں نکلسن مدفون ہی۔

---

[1] یہی واٹر بیسچن (پانی برج) در اصل بدرو برج ہی جسے کاغذات سرکاری میں موریا (Moira) بیسچن لکھا ہی۔

[2] کشمیری برج کا اصلی نام علی برج تھا۔ ۱۲

لڈو کیسل

اس کے شمال مغرب کے کونے میں لڈو کیسل کی مشہور عمارت ہی جس میں بزمانۂ غدر ۱۸۵۷ء مسٹر سیمن فریزر کمشنر دہلی رہتے تھے اور اب دہلی کلب ہی۔ نمبر ۲ بیٹری کے بائیں سکشن کا مقام اس لڈو کیسل ہی کی مشرقی دیوار سے ملا ہوا تھا۔

ٹیلر صاحب کا مجسمہ ۱۸۵۷ء

دہلی کی فتح کا سہرا جن کے سر رہا ہی ان میں جنرل سر الگزینڈر ٹیلر جی۔ سی۔ بی۔ آر۔ ای بھی ہیں جن کا نہایت شاندار مجسمہ موری دروازے کے باہر ہی ایک کشادہ چبوترے پر کھڑا ہوا ہی۔ جنرل کا یہ سٹیچو (بُت) کے دیکھنے سے دل پر نقش ہوتا ہی۔ بائیں طرف کرچ لٹکی ہوئی ہی اور ہاتھ میں ایک ملوہ کاغذ کا ہی اور سیدھے ہاتھ میں کوئی کتاب ہی۔ سیدھا پاؤں آگے بڑھا ہوا کچھ جھکا ہوا۔ بایاں پیچھے۔ جنوب رخ منہ کیے ہوئے بالکل طیار اور مستعد۔ اس پر انگریزی میں یہ دو کتبے ہیں:-

(جنوب کی طرف) الگزینڈر ٹیلر ۱۸۵۷ء

1857

Alexander Taylor

شمال کی طرف آہنی تختی پر (۱) کتبہ:-

General Sir Alexander Taylor G.C.B.R.E.
Who was a Captain in the Bengal Engineers-
Conducted a series of daring and often solitary
reconnaisances under these walls on
ground of which the enemy were in full
possession determined the sites of the
batteries and evolved the plan of attack
which resulted in the capture of
Delhi September 14th 1857

— ooo —

(ترجمہ) جنرل سر الگزینڈر ٹیلر جی سی بی۔ آر ای۔ جو بنگال انجینرز کے کپتان تھے۔

جو مسلسل اور دلیرانہ اور بااوقات (تن) تنہا فصیل کے نیچے اُس قطعۂ زمین پر
جس پر کہ غنیم بنا ہوا قابض و متصرف تھا حملہ کرنے کے مواقع و محل مناسب کی
طرح اندازی پر غور و خوض کیا کرتے تھے۔ اُنھوں ہی نے اپنی تجویز صائب سے
توپ خانے کے محل و مواقع قرار دیئے اور اُس حملے کا منصوبہ ٹھیرایا جس کی (احسن
تدبیر کی بدولت) ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی فتح ہوئی۔ (۲) دوسری تختی پر
جو نمبر (۱) کے نیچے ہی لگی ہوئی ہے:-

This memorial is erected by his few surviving comrades, by his brother Officers of the Royal Engineers, by the men of Cooper's Hill College, and by his friends.
1914

ترجمہ۔ یہ یادگار (مرحوم کے) چند پس ماندہ ساتھیوں۔ اُس کے بھائی چارے
کے عہدہ دار شاہی انجنیروں۔ (انجنیروں کے) کوپرز ہل کالج کے لوگوں اور
اُس کے دوستوں نے ۱۹۱۴ء میں بنوائی۔

بھولو شاہ صاحب کا مزار (۱۲۰۱ھ)

کابلی دروازہ تو اب رہا نہیں مگر اُس کی جگہ سب کو معلوم ہے۔ اُسی کے پاس آپ کا مزار ہے۔ آپ سلسلۂ قادریہ کے بزرگ تھے۔ سنہ ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا۔ مست روز الست تاریخ وفات ہے۔ آپ کے مزار کے برابر ہی آپ کے خاص مرید شاہ محمد حفیظ صاحب کا مزار ہے جن کے برابر آپ کے صاحب زادے شاہ غلام محمد صاحب مدفون ہیں۔ ۱۹ محرم کو بھولو شاہ صاحب کا عرس ہوتا ہے۔

مٹھائی کا پل

کابلی دروازے کے پاس ہے اس کی وجہ تسمیہ صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن یہ پل بہت قدیم ہے کیوں کہ نادر شاہ کے قتل عام کے حالات میں اس کا ذکر موجود ہے۔ یہاں سے ایک سڑک شہر کے بہت آباد حصے صدر بازار کی طرف جاتی ہے اور پل کے پاس کی آبادی تیلی واڑے کی منڈی کہلاتی ہے۔

مقبرۂ زیب النسا بیگم

۱۱۱۳ھ
۱۷۰۲ء

دلی شہر کے کابلی دروازے کے باہر نواب زیب النسا بیگم
عالم گیر بادشاہ کی بڑی صاحب زادی کا مقبرہ تھا جن کا
انتقال ۱۷۰۲ء ۱۱۱۳ھ میں ہوا۔ یہ مقبرہ اور مسجد عالم گیر کے عہد میں
بنی تھی جو ریل کی سڑک میں آنے کی وجہ سے مسمار ہو گیا۔
افسوس اس زمانے میں عمارات قدیمہ کی حفاظت کا کوئی قانون نہ ہونے اور ریلوے والوں
کی غفلت سے ناقابل تلافی نقصان ہوگیا۔ یہ وہ شاہزادی تھی جو عالم گیر جیسے جلیل القدر
بادشاہ کی گود میں کھیلی۔ ممتاز محل اور شاہ جہاں جیسے باشان وشوکت شہنشاہ کے
دلوں کا سرور بنی اور آج یہ عالم ہے کسی ہر کر ڈھونڈے بھی اس کی قبر کا نشان تک بھی
نہیں ملتا۔ جن صاحبوں کو شوق ہو وہ اس کو سوانح عمریاں دیکھیں جو کئی صاحبوں نے
لکھی ہیں۔ ہم علی سبیل الاختصار کچھ حال لکھ دیتے ہیں۔ یہ عالم گیر کی پہلونٹی کی بیٹی تھی جو ۱۰ شوال ۱۰۴۸ھ کو
دلرس بانو بیگم کے بطن سے پیدا ہوئی۔ شاہی طریقے سے
جشن منایا گیا۔ قلعے میں شادیانے بجنے لگے۔ بے شمار زر وجواہر
لٹائے گئے۔ مدت تک غربا اور رعایا کو انعامات تقسیم کرنے کا
سلسلہ جاری رہا۔ زیب النسا بیگم کی تربیت کے لیے کئی قابل اور
لائقہ خاتونیں مقرر کی گئیں مگر دودھ صرف میاں بائی پلاتی تھی جب
خیر سے شاہزادی سوا سال کی ہوئی تو حافظہ مریم معلمہ مقرر ہوئیں
قرآن شریف ختم کرنے کی خوشی میں بادشاہ نے معلمہ کو تین ہزار

زیب النسا

اشرفیاں عطا کیں۔ زیب النسا نے فارسی اور عربی۔ معقول و منقول میں کافی دستگاہ
حاصل کی اور بڑے بڑے فضلا اور علما اس کی خدمت میں باریاب رہتے تھے لیکن اس کے
اساتذہ میں زیادہ مقرب ملا سید اشرف تھے۔ چوں کہ قدرت سے اسے نازک
خیالی کا ایک خاص حصہ ملا تھا اس لیے ملا صاحب کی اصلاح سے وہ اشعار موزوں
کرنے لگی اور عربی شعر کہا کرتی تھی لیکن پھر فارسی کی طرف جھک گئی اور مخفی تخلص
کرتی تھی چنانچہ دیوان مخفی اس کی یادگار ہے۔ زیب التفاسیر بھی اسی کی تصنیف ہے۔ عبارت
بہت مقفی مسجع اور شستہ لکھی تھی۔ زیب التفاسیر کو اسی نے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ زیب المنشآت
خطوط و رقعہ جات کا مجموعہ ہے۔ مزاج میں نفاست کے ساتھ سادگی بہت تھی زیور کا

بھی زیادہ شوق نہ تھا تاہم ایک مالا سے مروارید جس میں تین مرصع تعویذ تھے گلے میں پڑی رہتی تھی اور کانوں میں جڑاؤ کرن پھول ۔ شادی کی نہیں ۔ کشمیر میں چشمۂ احول کے گرداگرد شہزادی نے ایک نہایت پر تکلف باغ اور عمارات بنوائی تھیں ۔ طبیعت میں جدت بہت تھی ایک ابرک کا خیمہ طیار کرایا جو نہایت وسیع خوشنما اور بے نظیر تھا ۔ شہزادی خلقتہً بڑی ملنسار ۔ رحم دل اور خلیق تھی ۔ غصے میں بھی وہ مسکرا دیتی تھی ۔ اپنی خواصوں سے بہنوں کی طرح سلوک کرتی تھی ۔ عالمگیر اپنی فاضل بیٹی کو بہت چاہتا تھا اور بیٹوں کے برابر عزت و قدر کرتا تھا اور جب وہ کسی باہر شہر سے آتی تھی تو شہزادوں کی طرح اس کا استقبال کیا جاتا تھا ۔ ۱۱۱۳ھ میں جب کہ عالمگیر دکن کی فتوحات میں مصروف تھا تو اس نے دہلی میں انتقال کیا ۔ عالمگیر کو ایسی لایق و فایق بیٹی کی موت کا بڑا صدمہ ہوا ہر چند بڑا صابر اور ضابط تھا مگر آنسو نکل ہی آئے مرحومہ کے ایصال ثواب کے لیئے صدقہ و خیرات کے احکام صادر ہوئے کلام میں لوچ تھا ۔ حاضر جوابی اور فی البدیہہ گوئی میں اس کا مثل نہ تھا ۔

اب ہم اس کے چند اشعار نمونتہً لکھتے ہیں جس سے اندازہ اس کی قادر الکلامی کا کیا جا سکتا ہے اور یہ غلط خیال بھی رفع ہو سکتا ہے کہ عورتوں میں حصول علم کی قابلیت نہیں ۔ قابلیت تو ضرور ہے مگر تعلیم دلانے والا البتہ چاہیئے :-

بشکند دستے کہ خم در گردن یارے نشد
کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد

صد بہار آخر شد و ہر گل بفرقے جا گرفت
غنچۂ باغ دلِ ما زیب دستارے نشد

پئی تفرج ایں چرخ بے مدار کن
نظر بشاہجہان و بحال دارا کن

قضا قضا نشود ای عزیز من ہرگز
تو خواہ فال ببیں خواہ استخارہ کن

اشک در خون طپیدہ می آید
یا دل از راہ دیدہ می آید

در عدم ہم زعشق شورے ہست
گل دامن دریدہ می آید

آغشتہ خوں بشام شفق از نگاہ کیست
مشعل بکف گرفتہ فلک دادخواہ کیست

ای صدف تشنہ بمیر و سوئے نیساں منگر غزل بہر یک قطرۂ آب ہمت تشنگاں فند

گرچہ من لیلی اساسم دل چو مجنوں در نوا ست سر بصحرا می زدم لیکن حیا زنجیر پاست
بلبل از شاگردیم شد ہم نشین گل بباغ در محبت کاملم پروانہ ہم شاگرد ماست
در تہاں خونیم ظاہر کرد رنگ تازہ ایم رنگ من اندر نہاں چوں سنگ سرخ اندر حناست
بس کہ بار غم بروں انداختم بروز گار جام نیلی کرد ابیک میں چو نسبت او زماست

دختر شاہم ولیکن رو بفقر آوردہ ام
زیب و زینت سو فقیم و نام من زیب النسا ست

مصرعہ زیب النسار - از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم - جواب ناصر علی - گویا رسید بر لب زیب النسا لبم
یہ جواب سن کر بہت پیچ و تاب آیا اور یہ جواب لکھا:-

ناصر علی بنام علی بردہ پناہ ورنہ بذوا لفقار علی سر بریدمت

ایک دن زیب النسار جامۂ سبز پہن کر لب بام کھڑی تھی ناصر علی نے کہا -

ع سبز پوشے بلب بام نظر می آید -

زیب النسار نے فی البدیہ جواب دیا - ع - نہ بزاری نہ بزور و نہ بزر می آید
ایک دفعہ شاہزادی دروازے میں کچھ اندر کچھ باہر کھڑی تھی کہ ناصر علی کے منہ سے بے دھڑک یہ مصرعہ نکل گیا ع نیمے دروں نیمے بروں اُدھر سے آ گئے شاہ جہاں - ناصر علی کے کاٹو تو لہو نہیں مگر واہ رے طبیعت کا زور فی البدیہ شعر پڑھا:-

از ہیبت شاہ جہاں لرزد زمین و آسماں
انگشت حیرت در دہاں نیمے دروں نیمے بروں

اس طرح کے بہت سے قصے مشہور ہیں - ہم بخوف طوالت اس بیان کو یہیں ختم کرتے ہیں - زیب النسار کے مزار پر بخط نسخ یہ کتبہ تھا:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کل من علیہا فان - ھذا مرقد البنت الکبرے للعبد - المذنب العاصے وھی المحفوفۃ برحمۃ الرحیم الکریم الحافظ ذیب[1] النسا المرجو من عباد اللہ الصالحین - ان یدعوا لہا بالغفران والرضوان تاریخ فوتہا قولہ سبحانہ و دخلی جنتی
۱۱۱۳

[1] اصل کتبے میں یوں ہی تھا - ۱۲

داہنی جانب

تیس ہزاری کا میدان یہاں پہلے ایک بہت بڑا اور وسیع باغ تھا جو بالکل اُجڑ گیا حتی کہ کوئی درخت تک باقی نہ رہا اور صاف چٹیل میدان ہوگیا یا آبادی کے لیئے جگہ نکالنے کو صاف کردیا گیا۔ اب نام ہی نام رہ گیا۔

سینٹ اسٹیفنز زنانہ ہسپتال یہ ہسپتال پہلے چاندنی چوک میں تھا اب جس میں بنک بنگال ہو۔ یہ زنانہ ہسپتال بہت بڑا مشن کا ہو۔ شہر کے باہر اور آبادی سے دور ہونے سے شہر والی مستورات کو تو چنداں مفید نہیں مگر پھر بھی مریض کثرت سے آتے ہیں۔ عمارت بہت وسیع ہو جس میں لیڈی ڈاکٹر کے رہنے کے مکانات کے علاوہ بیماروں کے رہنے کے متعدد وسیع اور ہوادار وارڈ بنے ہوے ہیں۔ غرض ہر اعتبار سے یہ ایک عمدہ اور اول درجے کا زنانہ شفاخانہ ہو۔

پھوس کی سرای کی مسجد یہ ایک چھوٹی سی قدیم مسجد ہو جو پہلے پھوس کی سرای کے متعلق تھی اب سڑک بیچ میں جانے سے سرا سے جدا ہو گئی ہو۔ مسجد کے باہر ایک بڑا اور پختہ کنواں بھی ہو۔

کوئین میریز ہائی سکول ۱۹۱۲ء ہر بارتاج پوشی ملک معظم جارج پنجم وام اقبالہم کے بعد ہی مٹھائی کے پل سے آگئے تیس ہزاری کے میدان میں پھوس کی سرا کے پاس شرفاء کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیئے مسز ہیلی نے جو چیف کمشنر صاحب دہلی کی خاتون ہو کھولا۔ اس کی عمارت بہت عالی شان اور خوش نما ہو جس میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیئے بڑے بڑے ہال بورڈنگ اور سپورٹس کے لیئے میدان ہو۔ معمولی مدارس نسوانیہ سے اس کی فیس کچھ گراں رکھی گئی ہو تاکہ منتخب اور معزز گھرانوں کی لڑکیاں ہی اس میں شریک ہوسکیں۔ اس مدرسے کی پرنسپل مس جرڈ ڈی ایم۔ اے ایک نہایت لایق اور خلیق لیڈی ہیں اور بھی کئی یوروپین گریجو اٹ

لیڈیاں مس فن ایم۔ اے۔ مس سینکچواری۔ بی۔ اے اور ہندوستانی خاتونیں ہیں۔ ذریعہ تعلیم کا زبان انگریزی ہی۔ اردو۔ فارسی۔ ہندی بھی بطور سکنڈ لینگوایج کے سکھلائی جاتی ہی۔ یہاں لڑکیاں میٹریکیولیشن کے درجے کے واسطے طیار کی جاتی ہیں اور مضامین وہی ہیں جو سرکار سے اینگلوورنیکولر مدارس کے لیئے مقرر ہیں۔ لڑکیوں کو اُمور خانہ داری سکھانے پر خاص توجہ کی جاتی ہی۔ سینا پرونا اور کارڑھنا بھی سکھایا جاتا ہی۔ عیسائی طریقے پر مذہبی اور اخلاقی تعلیم بھی دی جاتی ہی۔ سات برس تک کے لڑکے بھی کنڈر گارٹن میں داخل کیئے جاتے ہیں بہت سی کم سن لڑکیاں اور لڑکے اس سے مستفید ہوتے ہیں لڑکیوں کو نے جانے اور گھر پونہچانے کے لیئے گاڑی مدرسے کی طرف سے آتی ہی۔ پردے کا انتظام بہت سختی سے ہی۔ سات برس کا بچہ بھی نہیں جاسکتا۔ سال گزشتہ لیڈی چیمسفورڈ ویسراے کی بیگم محترمہ نے سالانہ جلسے میں تقسیم انعام فرمایا تھا اور بہ نفس نفیس زبان اردو میں بہت شستگی اور روانی سے تقریر فرمائی تھی۔ سال حال لیڈی منرو کمانڈر ان چیف کی زوجہ صدر نشین جلسۂ تقسیم انعام تھیں۔ چوں کہ یہ مدرسہ پادری میم صاحبوں کا ہی وہ لوگ قومی ہمدردی کے لحاظ سے براے نام کچھ معاوضہ اپنی خدمات کا پاتی ہیں۔ عمارت میں پچاس ہزار روپیہ صرف ہوا ہی جس میں سے نصف گورمنٹ سے ملا ہی اور اسی طرح سرکاری گرانٹ بھی ملتا ہی باقی صرفہ اس پی جی مشنری سوسائٹی کا ہی۔ غرض یہ کہ دلی کے شرفا کی لڑکیوں کے لیئے یہ ایک قابل قدر انسٹی ٹیوشن ہی جس میں تخمیناً [illegible] لڑکیاں اور دس کم عمر لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ گو اس مدرسے میں بقدر بائبل کا بھی ایک سبق ہوتا ہی لیکن تعصب سے قطع نظر کرکے دیکھا جاے تو انجیل پڑھنا مسلمانوں کو منع نہیں ہی۔ مسلمان اُسے کلام الٰہی مانتے ہیں اور جو کلام ربانی ہی تو اُس میں سواے پند و نصائح اور عمدہ دینی اور دنیوی تعلیم کے اور کیا ہو سکتا ہی۔ ع۔ متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد۔

دہلی سٹیشن سکول | ریل والوں کا سکول ہی۔

بائیں جانب

وٹینری ہاسپٹل مٹھائی کے پل سے اُتر کر بائیں جانب جانوروں کا دواخانہ ہے جس میں مویشی کا علاج ہوتا ہے۔

پھوس کی سرائے یہ سرائے کسی زمانہ میں بہت بڑی رہی ہوگی اب تو سرائے کا پتہ بھی نہیں۔ جب ہوگی تو یہ نام اس وجہ سے پڑا ہوگا کہ اس میں پھوس کی جھونپڑیاں ہوں گی اب یہاں متفرق کٹڑے بن گئے ہیں اور کچھ بازار کی دکانیں ہیں۔ کٹڑوں میں کثرت سے کمہار اور گھسیارے رہتے ہیں۔ دلی شہر میں اگر ویرانہ اور غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے انبار دیکھنا ہو تو یہ خطہ ملاحظہ فرمایئے

کٹڑہ چودھری ناتھو سنگھ پھوس کی سرائے کے ایک حصّے میں ناتھو سنگھ چودھری کا کٹڑہ ہے جو ذات کا جاٹ ہے۔ اس کٹڑے میں چاروں طرف کوٹھڑیاں بنا کر سرائے کی طرز کا بنا لیا ہے جس میں جھڑا کمہار اور گھسیارے اور بہت میلے کچیلے زٹیل لوگ رہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ اس کٹڑے میں جو چیز دیکھنی ہے وہ ایک مقبرہ ہے۔

لاٹ کی بیگم کا مقبرہ
راحت میں بسر ہوئی کہ ایذا گزری - کیوں کر تاریک گھر میں تنہا گزری
اے کنج لحد میں سونے والو افسوس - کس سے پوچھیں کہ تم پہ کیا گزری

لاٹ کی بیگم کا ٹوٹا پھوٹا خراب وخستہ حالت میں زمانہ قدیم کا بنا ہوا مقبرہ ہے جو اسی کٹڑے کے ایک کونے میں کھڑا ہے۔ یہ عمارت ہشت پہلو ہے اوپر کا سارا پلاستر جھڑ گیا۔ دیواروں کی چھلیں گر گئیں اور جا بجا کھنڈانے پڑ گئے۔ اس میں سات طاق نا کھڑکیاں چوطرفہ ہیں اور داخلی دروازہ شمال رویہ ہے۔ اندر ایک قبر ہے جس پر حسرت اور وحشت دونوں برستی ہیں۔ کتبہ کوئی ہے نہیں جس سے پتہ چل سکے کہ کس کا مدفن ہے۔ تعویذ تک لوگ اُکھاڑ کر لے گئے۔ عوام میں مشہور ہے کہ کسی بیگم کا مقبرہ ہے جن کا نام لاٹ کی بیگم تھا۔ ممکن ہے کہ لاڈلی بیگم کی یہ خرابی ہو کیوں کہ جس زمانے کی یہ عمارت ہے اُس زمانے میں لاٹ کا پتہ کہاں تھا اور لاٹ کی بیگم کو اس قسم کے مقبرے سے جو اسلامی طرز کا ہے کیا تعلق ؟ -

موتی باغ

اب تو ذرا سا باغیچہ ہے مگر نام موتی باغ ہی چلا جاتا ہے اندر دیکھیے تو باغ کی جگہ میونسپل ورک شاپ ہے۔ دروازے پر ایک تختی پر انگریزی اردو میں "موتی باغ کیسری چند بالمکند جوہریان" لکھا ہوا ہے۔

پل بنگش

بنگش کا حال تو کمرۂ بنگش کے ضمن میں ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں چوراہا ہے ایک سڑک ستون یادگار غدر کو چلی گئی ہے اور اس کے مقابل کی ہندوراؤ کے باڑے کو اسی پر یہ قدیم پل نہر کا ہے۔ دوسری سڑک میس ہزاری کے میدان سے سبزی منڈی کو چلی گئی ہے۔

میوٹنی موریل (یادگار غدر)

فتح گڑھ کا منارہ

۱۸۵۷ء

تشکل منارہ چو ستونے زسنگ
از پی سقف فلک شیشہ رنگ
آں کہ ز زر بر سرش افسر شدہ است
سنگ ز نزدیکی خور زر شدہ است

یادگار ہائے غدر کی نسبت مسٹر رینالڈز بالز لکھتے ہیں کہ وہ معرکۃ الآرا مقامات ہیں جو دلی کے مہتم بالشان محاصرے اور حملے کی یاد کو ہمیشہ تازہ کرتے ہیں۔ اُن انگریزوں کی تو کہی نہیں جاتی کہ جو واقعات تاریخی اور آثار قدیمہ کے شایق نہیں ورنہ فی الحقیقت ہر انگریز کے لیئے یہ مقامات بڑی قدر و منزلت اور فخر کی چیزیں ہیں۔ دہلی کے محاصرے کے مفصل حالات غدر کے ضمن میں آئیں گے یہاں اُن کا دُہرانا بے سود ہے۔ محاصرۂ دہلی کو من جملہ واقعات غدر کے ایک معمولی واقعہ سمجھنا ایک سخت غلطی ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ معرکہ سارے غدر کی جان تھا۔ دلی جیسے شاہی شہر کی فتح پر سارے ملک ہندوستان کی بازیافت منحصر تھی اور وہ یہی شہر ہے کہ جس کی فصیلوں کے چوطرف مشرقی اقبال کی فتح و نصرت کا جھنڈا گاڑنے کے لیئے کیسے کیسے معرکے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے مدبران وقت اس امر پر متفق الرائے تھے کہ دلی کا ہاتھ سے نکل جانا گیا یا بہ استثنائے چند بندروں کے سارے ہندوستان کا حل جانا تھا البتہ اس میں شک نہیں کہ فوجی نقطۂ نظر سے یہ معاملہ کچھ بہت اہم نہ تھا کیوں کہ دلی کا محاصرہ سچ پوچھیئے تو کوئی محاصرہ ہی نہ تھا

میوٹینی موریل یادگار غدر فتح گڈھ منارہ
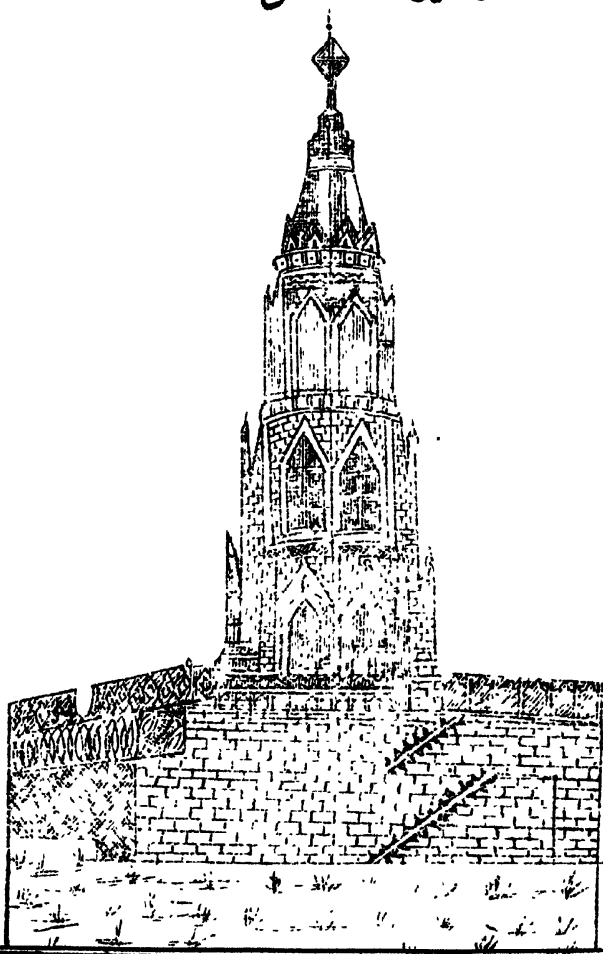
کیوں کہ شہر کے اندر کوئی دشمن قلعہ بند ہو کر تھوڑا ہی بیٹھا ہوا تھا نہ اس کے
سر کرنے میں کچھ لمبا زیادہ عرصہ لگا اور نہ اس مرکز پر کوئی جرار لشکر جمع کیا گیا۔
چار درجے کی سنگ سرخ کی یہ عمارت نہایت خوشنا ہشت پہلو سبزی منڈی کی
طرف پہاڑی کے اس مقام پر جہاں کہ ایام غدر میں انگریزی لشکر کا کیمپ تھا
بیادگار مقتولین و مجروحین بنائی گئی ہے۔ یہ عمارت نیچے سے ہشت پہلو گاؤ دم اور
(۱۱۰) فیٹ بلند ہے اس کے اندر قطب صاحب کی لاٹ کی طرح چکر دار زینہ ہے جس میں
اٹھتر سیڑھیاں ہیں اندر واز بجلی سے محفوظ رکھنے کے لیے تانبے کی موٹی اور گول
چکر دار سلاخ ذُمر شروع سے نیچے تک لگی ہوئی ہے۔ ممٹی لداؤ کی ہے جس پر کوئی
۵ فٹ اونچی چوبی صلیب چڑھی ہوئی ہے۔ اوپر چاروں طرف روشن دان ہیں جن میں سے
ہر طرف سے شہر کی ساری عمارتوں کا نہایت لطف انگیز نظارہ ہوتا ہے۔ ہمایوں کا مقبرہ
اور قطب صاحب کی لاٹ بھی صاف نظر آتی ہے۔ ستون کے گرد سات بڑی بڑی
سنگ مرمر کی تختیاں لگا کر ان پر کتبے ہیں جن میں لشکر کی تفصیل لڑائیوں اور
معرکوں کی صراحت اور ان تختیوں کے نیچے مقتول عہدہ داروں کے نام ہیں۔
آٹھویں جانب شمال و مغرب کی طرف دروازہ ہے اور اسی کے اندر اوپر چڑھنے کا
زینہ ہے۔ یہ ستون بڑی کرسی دے کر کئی چبوتروں پر بنایا گیا ہے۔ پہلے چبوترے
کی تین سیڑھیاں ہیں دوسرے کی سترہ تیسرے کی نو چوتھے کی پانچ۔ نیچے کا
چبوترا ۱۴۴ × ۵ فٹ ۷ طول و عرض اور (۵ فٹ) اونچا ہے۔ دوسرا ۴ فٹ ۳ تیسرا گیارہ فیٹ
چوتھا چھ فیٹ پانچواں ۳ فٹ ۶۔ اس طرح پانچوں چبوتروں کی اونچان ۲۷ فٹ ۹
ہوئی۔ اور پھر چوں کہ منارہ ایک بہت اونچی پہاڑی پر بنا ہوا ہے اس واسطے سطح
زمین سے بہت زیادہ بلند ہے۔ اوپر کے دو چبوتروں پر آہنی جنگلا لگا ہوا ہے نیچے کے
چبوترے پر زنجیر پڑی ہوئی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ غدر جیسے عظیم الشان واقعہ کے
شایاں یہ یادگار نہیں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں سڈول پنا نہیں ہے اور
لوگوں نے طعناً اس کی شکل اس دوربین کی سی بتلائی ہے جو نیچے سے چوڑی اوپر
پتلی ہوتی ہے اور نلوے کی شکل کی ہوتی ہے جو گھومنے سے کھلتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اس
میں شک نہیں کہ اگر اسے بیس پچیس فیٹ اور اونچا بناتے تو زیادہ شاندار اور خوش نما ہوتی

چوں کہ یہ ستون بہت اونچا بنا ہوا ہی اور گرد اس کے کشادہ چبوترے ہیں اور بالکل کھلے وسیع میدان میں شہر کے گرد و غبار اور مکانات کی چپقلش سے الگ تھلگ ہی ایک نتھری ہوئی صاف اور فرحت افزا ہوا کا مخزن ہی جہاں انگریز کثرت سے شام کو ہوا خوری کو آتے ہیں۔ ہندوستانی بہت کم جاتے ہیں کہ اُن کو جنگل میں جاکر نیچر کی صنعت کاریوں کے دیکھنے سے کیا سروکار اور عمدہ ہوا کی کیا قدر اُن کو چاندنی چوک کی ریل پیل۔ دریبے کی کشمکش اور چاوڑی کی دید بازی سے کب فرصت ہی جو یہاں آئیں اور گھڑی دو گھڑی یہاں کی صحت بخش ہوا سے اپنی روح اور دماغ کو تازہ کریں۔

پہلا انگریزی کتبہ مغرب رویہ[1]

In memory of the officers and soldiers British and Native of the Delhi Field Force who were Killed in action or died of wounds or disease between the 30th May and 20th September 1857. This monument has been erected by the comrades who lament their loss and by the Government they served so well.

بریگیڈیر جنرل جے نکلسن کمانڈنگ چہارم پیدل بریگیڈ۔ کرنیل سی چیسٹر اجیٹن جنرل افواج۔ کپتان سی ڈبلیو رسل چوتھویں نیٹو انفنٹری اردلی آفیسر۔ کپتان جے ڈبلیو ڈی لاین چھٹویں نیٹو انفنٹری اردلی آفیسر۔

دوسرے انگریزی جنوب رویہ کتبے کا ترجمہ

فہرست اُن رجمنٹوں کی جو محاصرۂ دہلی میں مابین ۳۰ مئی اور ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کے حاضر تھیں۔

ہیڈ کوارٹرز پہلا بریگیڈ سواروں کا توپ خانہ پہلی دوسری۔ تیسری۔ چوتھی اور پانچویں ٹرپ سواروں کا توپخانہ
تیسرا " " دوسری اور تیسری ٹرپ تیسرا بریگیڈ "

[1] اس کا اردو ترجمہ کتبہ نمبر ۳ شمال رُخ پر ملاحظہ ہو۔۱۲

ی کمپنی پہلی پلٹن پیدل سواروں کا توپ خانہ   تیسری کمپنی تیسری پلٹن پیدل توپ سواروں کا توپخانہ
ٹرز چھٹی پلٹن   ؍؍   چوتھی کمپنی چھٹی پلٹن   ؍؍
سری اور تیسری کمپنیاں سکھ   ؍؍   دستہ توپ خانے کے رکروٹوں کا

انجنیران

یگون گارڈ۔ نویں لانسرز۔ چوتھی اڑیگیولر کیولری۔ پہلی دوسری اور پانچویں پنجاب کیولری۔
ارس۔ ایچ ایم آٹھویں پیدل۔ لیٹ الفنٹری۔ ساٹھویں رائفلز۔ اکسٹھویں
رویں پیدل۔ پہلی دوسری بنگال فیوزیلیرز۔ سرمور اور کماؤں کی پلٹنیں۔ گائیڈ کور
ہ انفنٹری۔ پہلی دوسری چوتھی پنجاب انفنٹری۔ بلوچوں کی پلٹن۔ بے ہتیار کے پاؤنیرز

سی نیگن توپ خانہ۔ لفٹننٹ ای ایچ ہلڈز برینڈ۔ لفٹننٹ ایچ جی ٹیٹر کنز۔ لفٹننٹ
ڈیکنز۔ لفٹننٹ ایف اس ٹینڈی انجنیر۔ لفٹننٹ پی سٹیلکلرڈ۔ لفٹننٹ ای جونز۔
ئی ایم گرین سرش ہر مجسٹریز جو بیسویں فٹ انجنیر۔
توپ خانے کے رکروٹوں کا۔

ے انگریزی جنوب رویہ
کتبے کا اردو ترجمہ

فہرست اُن معرکوں کی جو دہلی اور اُس کے نواح میں دہلی فیلڈ فورس (افواج میدان جنگ) نے مابین ۳۰ مئی اور ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کے لڑے۔

ی لڑائی   غازی الدین نگر کی لڑائی   بادلی کی سرائے کی لڑائی   ہندراؤ کے مکان میں جو عہدہ دار تھے اُن سے لڑائی
،   ۳۱ مئی   ۸ جون   ۹-۱۰-۱۱ جون

فلیگ سٹاف (باوٹے) پر حملے

سٹاف) ٹور اور سبزی منڈی   مٹکاف کے قراول پر حملہ
۱۲ جون   ۱۳ جون

نج پر حملہ   انگریزی کیمپ پر حملہ   سبزی منڈی کا معرکہ   علی پور کا معرکہ
جون   ۹ تا ۲۰ جون   ۲۳-۲۷-۳۰ جون   ۴ جولائی

انگریزی کیمپ پر حملہ — ۹ رجولائی
سبزی منڈی کے معرکے — ۱۴ تا ۱۸ رجولائی
ٹرپولن گنج کا معرکہ — ۲۰ رجولائی
مٹکاف ہئوس کا معرکہ — ۲۳ رجولائی
کشن گنج کا معرکہ — یکم اگست
قدسیہ باغ کا معرکہ — ۱۲ر اگست
نجف گڈھ کی لڑائی — ۲۵ راگست

محاصرہ

نمبر(۱) توپ خانہ طیار کرکے مسلح کیا گیا۔ ۷ ر ستمبر
نمبر(۲) قلعہ شکن توپ خانہ طیار کرکے مسلح کیا گیا ۸-۹-۱۰ر ستمبر
نمبر(۳) قلعہ شکن توپ خانہ طیار کرکے مسلح کیا گیا ۱۰-۱۱ر ستمبر
نمبر(۴و۵) مارٹر توپ خانے طیار کرکے مسلح کیئے گئے۔ ۱۰-۱۱ر ستمبر
فصیلوں کا توڑنا اور گولہ باری۔ ۱۱-۱۲-۱۳ر ستمبر
دلّی پر گولہ باری۔ ۱۴ر ستمبر
میگزین پر قبضہ۔ ۱۶ر ستمبر
قلعہ پر قبضہ کیا ۱۹ر ستمبر۔
آخر کار دشمن نے شہر کو خالی کر دیا۔ ۲۰ ر ستمبر

اسسٹنٹ سرجن اس ہور۔ لفٹننٹ کرنل آر اسے یول لفٹننٹ ڈبلیو ڈبلیو ہاگسن
چھٹی ڈریگون گارڈ نویں لانسرز اور ڈبلیو آر رِوِیٹ
لفٹننٹ ڈبلیو ایچ مونٹس ٹننٹ لفٹننٹ جے ایچ بریڈشا ہرمیجسٹیز آٹھویں کنگز رجمنٹ
ہرمیجسٹیز آٹھویں کنگز رجمنٹ ہرمیجسٹیز باونویں لئیٹ انفنٹری۔ کپتان ایف اینڈ روز اور
انسیئن ڈبلیو ایچ نیپیئر
ہرمیجسٹیز ساٹھویں شاہی بیفلر

چوتھے انگریزی مشرق رویہ کنبے کا اردو ترجمہ	نقشہ تعداد مقتولین و ملوکین و مجروحین و مفقودین افواج میدان جنگ دہلی من ابتداے ۳۰ رمئی نعایت ۲۰ ر ستمبر ۱۸۵۷ء

نام فوج	ہر نمبر کی اصلی تعداد فوج	مقتول — افسر — یورپین	مقتول — افسر — ہندوستانی	مقتول — نان کمیشنڈ افیسرز اور سولجرز — یورپین	مقتول — نان کمیشنڈ افیسرز اور سولجرز — ہندوستانی	مجروح — افسر — یورپین	مجروح — افسر — ہندوستانی	مجروح — نان کمیشنڈ افیسرز اور سولجرز — یورپین	مجروح — نان کمیشنڈ افیسرز اور سولجرز — ہندوستانی	بے پتہ — نان کمیشنڈ افیسرز اور سولجرز — یورپین	بے پتہ — نان کمیشنڈ افیسرز اور سولجرز — ہندوستانی	مجموعہ مقتولان و زخمی
سٹاف	×	۴	×	×	×	۹	×	×	×	×	×	۱۳
توپ خانہ	۱۳۵۰	۴	۱	۳۳	۲۶	۲۳	۱	۲۱۶	۴۹	×	۲	۳۶۵
انجنیئر	۷۲۲	۳	۲	۴	۳۳	۱۹	۱	۲	۴۰	×	۹	۱۳۸
چھٹا ڈریگون گارڈ	۱۲۳	۱	×	۱۸	×	۲	×	۹	×	×	×	۳۰
نویں لانسرز	۳۹۱	۱	×	۲۶	×	۲	×	۶۴	×	×	×	۹۳
چوتھی انفنٹری پہلی کیولری	۷۸	×	×	×	×	×	×	×	۳	×	×	۳
پہلی پنجاب کیولری	۱۴۷	×	×	×	۱	۱	×	×	۵	×	×	۷
دوسری " "	۱۱۴	×	×	×	×	×	×	×	۳	×	×	۳
تیسری " "	۱۰۷	×	×	×	×	×	۱	×	۳	×	×	۴
ہڈسنز ہارس	۴۶۲	×	×	×	×	۱	۵	×	۵	×	×	۱۱
ہر مجسٹیز آٹھویں پیدل	۳۲۲	۳	×	۴۱	×	۷	×	۱۲۹	×	×	×	۱۸۰
" ۵۲ لائٹ "	۳۰۲	۱	×	۱۸	×	۴	×	۷۳	×	۵	×	۱۰۱
" ۶۰ رائفلز	۳۹۰	۴	×	۱۰۹	×	۱۰	×	۲۶۶	×	×	×	۳۸۹
" ۶۱ پیدل	۴۰۲	۲	×	۳۰	×	۷	×	۱۱۲	×	۵	×	۱۵۶
" ۷۵ پیدل	۴۵۹	۵	×	۷۹	×	۱۴	×	۱۸۴	×	۳	×	۲۸۵
پہلی بنگال فیوزیلیرز	۴۲۷	۳	×	۹۵	×	۱۱	×	۲۱۰	×	×	×	۳۱۹
دوسری " "	۳۷۰	۴	×	۷۹	×	۶	×	۱۵۶	×	×	×	۲۴۵
سرمور بٹالین	۲۱۲	۱	×	×	۸۵	۶	۸	×	۲۱۹	×	×	۳۱۹
کماؤں "	۳۱۲	۱	×	×	۲۰	۲	۳	×	۳۳	×	۵	۶۴
گائیڈ کور	۵۰۵	۲	۵	×	۶۵	۶	۱۰	×	۲۱۵	×	×	۳۰۳
بقیہ میزان برکتبہ نمبر ۵	۴۲۷۵	۳۹	۸	۵۴۲	۲۳۱	۱۳۰	۲۹	۱۴۲۵	۵۹۵	۱۳	۱۶	۳۰۲۸

لفٹنٹ اے ہمفریز
بیسویں نیٹو انفنٹری متعینہ
ساٹھویں رائفلز
اسٹنٹ ای اے ال فلپس ڈی سی
گیارھویں نیٹو انفنٹری ایضاً
لفٹنٹ ٹی گیبٹ اور اسٹنٹ اس بی الکنگٹن
ہر مجسٹیز بانوے ویں رجمنٹ

کپتان ڈبلیو جے ناکس
ہر مجسٹیز پچھتر ویں رجمنٹ
لفٹنٹ جے آئی راس فٹز جرالڈ
اے ہیریسن
ای ڈی برسکو
ہر مجسٹیز پچھترویں رجمنٹ

پانچویں انگریزی شمال رویہ کتبے کا اردو ترجمہ

(تکملہ) نقشہ تعداد مقتولین و مہلوکین و مجروحین و مفقودین افواج میدان جنگ دہلی از ۳۰ مئی لغایت ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء

نام فوج	تعداد [illegible]	مقتول – افسر – یورپین	مقتول – افسر – نیٹو	مقتول – نان کمیشنڈ آفیسرز اور سولجرز – یورپین	مقتول – نان کمیشنڈ آفیسرز اور سولجرز – نیٹو	مجروح – افسر – یورپین	مجروح – افسر – نیٹو	مجروح – نان کمیشنڈ آفیسرز اور سولجرز – یورپین	مجروح – نان کمیشنڈ آفیسرز اور سولجرز – نیٹو	بے پتہ – نان کمیشنڈ آفیسرز اور سولجرز – یورپین	بے پتہ – نان کمیشنڈ آفیسرز اور سولجرز – نیٹو	میزان [illegible]
پچھلے کتبے کی میزان	۷۲۷۵	۲۹	۸	۵۴۲	۲۳۱	۱۳۰	۲۹	۱۴۲۵	۵۹۵	۱۳	۱۲	۳۰۲۸
چوتھی سکھ انفنٹری	۴۱۴	۱	۲	×	۴۳	۳	۷	×	۱۰۶	×	×	۱۶۲
پہلی پانیرز انفنٹری	۶۶۴	۳	۳	×	۷۱	۵	۵	×	۱۴۱	×	×	۲۲۸
دوسری ایضاً ایضاً	۶۵۰	۱	۱	×	۴۱	۲	۴	×	۱۰۳	×	×	۱۵۲
چوتھی ایضاً ایضاً	۵۴۱	۱	×	×	۹	×	۲	×	۵۹	×	×	۷۱
بلوچ پلٹن	۳۲۲	۱	×	×	۷	×	۱	×	۴۸	×	۱	۵۸
بے ہتھیار پاینیرز	×	×	×	۱	۲۴	×	۱	۱	۱۲۸	×	×	۱۵۵
صدر میزان	۹۸۶۶	۴۶	۱۴	۵۴۳	۴۲۲	۱۴۰	۴۹	۱۴۲۶	۱۱۸۰	۱۳	۱۷	۳۸۵۴

گوشوارہ

	عہدہ دار – انگریز	عہدہ دار – ہندوستانی	نان کمیشنڈ آفیسرز اور سولجرز – انگریز	نان کمیشنڈ آفیسرز اور سولجرز – ہندوستانی
مقتول	۴۶	۱۳	۵۴۳	۴۲۶
مجروح	۱۴۰	۴۹	۱۴۲۶	۱۱۸۰
بے پتہ	×	×	۱۳	۱۷
میزان	۱۸۶	۶۳	۱۹۸۲	۱۶۲۳

لفٹنٹ ڈبلیو کر وزیر
ہر مجسٹیز پچھترویں رجمنٹ
میجر سی او جیکب
پہلی بنگال فیوزلیرز
کپتان جی جی میک بارنٹ
پچپنویں نیٹو انفنٹری متعینہ پہلی فیوزلیرز

لفٹنٹ ای سپیک بینسٹھویں نیٹو انفنٹری
متعینہ پہلی بنگال فیوزلیرز
لفٹنٹ اس - ایچ جیکسن اور لفٹنٹ دوم
ڈی ایف سٹبرف دوسری بنگال فیوزلیرز
لفٹنٹ سی ایف کیمبیراڈ تیسویں نیٹو انفنٹری
متعینہ سکنڈ بنگال فیوزلیرز

چھٹا کتبہ اردو شمال رویہ

دہلی کے جنگی فوج کے انگریزی اور ہندوستانی افسر اور سپاہی جو ۳۰ مئی اور ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کے درمیان لڑائی میں مارے گئے اور یا زخمی یا بیمار ہو کر مر گئے اُن کے یادگاری کے واسطے اُن کے ساتھیوں نے جن کو اُن کی موت کا رنج ہی اور سرکار نے جس کی خدمت میں وہ اس طرح کام آئے یہ یادگار بنوایا فقط

انسیئن او۔ سی۔ والٹر ۴۵ نیٹو انفنٹری
متعینہ دوسری بنگال فیوزیلیرز
انسیئن ای سی وھیٹلی ۵۴ نیٹو انفنٹری
متعینہ سرمور پلٹن
لفٹننٹ جے ایچ برون ۳۳ نیٹو انفنٹری
متعینہ کماؤں پلٹن

لفٹننٹ جے پارک تیسری نیٹو انفنٹری
متعینہ چوتھی سکھ انفنٹری
کپتان ڈبلیو جی لا دسویں نیٹو انفنٹری
متعینہ پہلی پنجاب انفنٹری
لفٹننٹ ای جے ٹریورز
سکنڈان کمانڈ فرسٹ پنجاب

ساتواں ہندی کتبہ شمال رویہ

وہی عبارت بخط ہندی ہی جو کہ اردو میں ہی۔

لفٹننٹ ڈبلیو ایچ لمسڈن
اجیٹن پہلی پنجاب انفنٹری
انسیئن جے اس ڈیوڈسن ۲۶ نیٹو انفنٹری
متعینہ دوسری پنجاب انفنٹری
لفٹننٹ آرپی ہمفریز چوتھی پنجاب انفنٹری

لفٹننٹ کیو بیٹی کمانڈنٹ آف کیولری گیڈز کور
" اے ڈبلیو مرے چالیسویں نیٹو انفنٹری
متعینہ گیڈز کور
" سی بی بٹشیریئن بلوچی پلٹن

کوشک شکار یا جہاں نما

۷۵۵ھ ۱۳۵۴ء

در دست اجل کہ نیست درماں او را
بر شاہ و گدا ست حکم و فرماں او را
شاہے کہ بحکم دوش کرماں[۱] می خورد
امروز ہمیں خورند کرماں او را

یہ محل فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۵ھ ۱۳۵۴ء میں موجودہ شہر دہلی کے شمال مغرب

---

[۱] پہلا کرماں شہر کا نام ہی اور دوسرا کرم کی جمع ہی۔ ۱۲

پہاڑی پر شہر فیروز آباد کے باہر بنوایا تھا۔ یہ فیروز شاہ کا شکار خانہ تھا جس کا پتہ صرف دو نصف منہدمہ عمارات چوبُرجی اور پیر غیب سے چلتا ہی جہاں اب اسوکا کا دوسرا ستون کھڑا ہوا ہی۔ اس محل کو امیر تیمور نے لوٹ لاٹ کر تباہ کر دیا جس کی نسبت امیر موصوف نے لکھا ہی کہ "پہاڑی پر ایک عمدہ عمارت جمنا کے کنارے واقع تھی"۔ امیر تیمور کے خوشامدی مورخ یزدی نے لکھا ہی کہ "فیروز شاہ نے ملہم غیبی کی صدا پر اس کا نام "جہاں نما" اس وجہ سے رکھا تھا کہ اس کی تقدیر میں امیر تیمور جیسے بادشاہ کے اقدام مبارک سے افتخار حاصل کرنا لکھا تھا"۔ شمس سراج لکھتا ہی کہ اسوکا کے دوسرے ستون کو بھی فیروز شاہ نے اُسی حزم و احتیاط سے منتقل کیا تھا جیسا کہ ہم پہلے ستون کا ذکر کر آئے ہیں اور کوشک شکار میں بڑے دھوم دھڑکے تزک و احتشام سے اُسے نصب کرایا۔ اس ستون کے استادہ کرنے کے بعد اس کے اطراف آبادی شروع ہوگئی اور امرا و ارکان دولت نے اپنے اپنے مکانات بنا لیے۔ "پیر غیب" کے نام سے جو اُجڑی پُجڑی عمارت ہی اس کو لوگ شکار خانے کا محل بتلاتے ہیں جس پر اب ٹرگنامٹریکل سروے کا سٹیشن بنا ہوا ہی۔ اس محل کی گرد کی عمارات تو سب گر گئیں صرف درمیانی جو کچھ حصہ اب باقی رہ گیا ہی وہ ایک لمبوترا قطعہ ۶۲ فٹ × ۲۵ فٹ کا ہی۔ لیکن موقع دیکھنے سے ایسا معلوم دیتا ہی کہ یہ محل مشرق کی طرف پہاڑی کے سرے تک چلا گیا تھا یعنی پورے ۱۰۰ فٹ تک اب بھی اس کی دیواروں کے نشانات موجود ہیں۔ اس عمارت کے شمالی طرف دو منزلہ صدر دروازہ معلوم دیتا ہی لیکن اب تو وہ صرف ایک بے چھت کے مربع کمرے کی محراب معلوم دیتا ہی۔ جس کے سامنے ۵۰ × ۳۰ فٹ کی عمارت کا ایک نشان ہی۔ اس منہدم کمرے کی داہنی طرف ایک پشتیبان ہی جو بالائی منزل تک چلا گیا ہی جس پر ایک اور محراب دار کمرے کی چار دیواری ہی جس کے مشرق میں ایک پتھر کا ستون ہی اور غرب کی طرف پشتے کا نصف بالائی حصۂ محراب کو تھامے ہوئے ہی۔ اس بے چھت کے کمرے کے عقب میں اور ایک کمرہ اسی عرض و طول کا ہی جو بالکل پٹا ہوا ہی۔ سامنے والے کمرے کی شرقی دیوار عمارت کا شمالی

مشرقی سب سے آگے وار کا انتہائی حصہ ہو اور مغرب کی طرف تو وہی پشتہ ہو جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں - سامنے کا کمرہ پھاٹک کی طرح کا ہی جو عمارت کی شمالی دیوار سے تین چار فیٹ آگے نکلا ہوا ہی - یہ دیوار جہاں تک کہ پہلی منزل کے متعلق ہو دروازے کی سطح کے برابر بلند ہی جس کا آثار ۴ ۱۰ چوڑا ہی لیکن پہلی منزل کی چھت تک پہونچتے پہونچتے دیوار کا آثار تین فیٹ کم ہوجاتا ہی - اس دیوار میں نہ دروازہ ہی نہ کھڑکی - دروازے کے کونے میں ایک ہشت پہلو پشتہ ہی جو دو منزلے پر پہونچ کر مدوّر ہوگیا ہی -
عمارت کے مشرقی رُخ کی حیثیت کچھ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی - شمالی جانب ایک چھوٹا سا دو منزلہ کمرہ معلوم دیتا ہی جس کی تحتانی منزل میں بے چھت کی تین محرابیں اور دروازوں کی علامت موجود ہی جو دس فیٹ اونچے اور تین فیٹ چوڑے ہیں - اس کے بالاخانے پر دروازوں کے اوپر ایک محراب دار دروازہ ہی - جنوب کی طرف ایک لیست مگر چوڑا کماندار دروازہ ہی جسے اب چُن دیا گیا ہی لیکن جب کھلا ہوا تھا تو جنوبی رُخ کا دروازہ یہی تھا جس میں سے شمال سے جنوب تک ایک سیدھا رستہ نکل گیا ہی -
اس دروازے سے مغربی رخ پر دو زینے ہیں - ان زینوں سے ہم عمارت کی چھت پر پہونچتے ہیں - ان میں سے ایک زینے میں سولہ سیڑھیاں ہیں اور دوسرے میں اُنتیس پہلی منزل کی بلندی ۱۵ فٹ ۸ انچ ہی اور دوسری منزل کی اونچان ۲۰ اس طرح موجودہ عمارت کی کل بلندی ۳۵ فٹ ۸ انچ ہی - مغربی جانب سوائے ایک بڑے بھاری پست کمان دروازے کے اور کوئی چیز باقی نہیں رہی - اس دروازے کے ادھر اُدھر پشتیبان ہیں - اس دروازے میں سے مشرق سے مغرب تک کا پورا منظر ہی - اس لمبان میں دو رستے اور دو کمرے ہیں - اس دروازے کے پاس کے کمرے کی چھت میں ایک روشن دان ایک فٹ قطر کا ہی جس میں سے آسمان دکھلائی دیتا ہی - شمالی دروازے کی سیدھی طرف جو غالبًا اس محل کا صدر دروازہ ہی ۲۶ سیڑھیوں کا ایک زینہ ہی جو دو منزلے پر جانے کا رستہ ہی - یہاں زینے سے ملی ہوئی مسجد سے ہاتھ کی طرف ۲ فٹ - اونچے چبوترے پر ایک پختہ قبر ۶ فٹ ۸ انچ لمبی ۴ فٹ چوڑی ۱ فٹ ۱۱ انچ اونچی کسی بزرگ کی ہی - جسے لوگ پیر غیب کی درگاہ کہتے ہیں - اس قبر کی بائیں طرف مسجد کی محرابیں ہیں جن میں یہ خصوصیت ہی کہ درمیانی اور اس کے

سید سے جانب کی محرابیں تو مغربی دیوار میں ہیں اور بائیں طرف کی محراب شمالی دیوار میں رکھی گئی ہے اور بیچ کی محراب دیوار میں بطور زاویہ قائمہ کے ہے۔ یہاں دو منزلہ دو حجرے ہیں۔ ان حجروں کی چھت پر سادی دیوار کی منڈیر بطور جنگلے کے ڈھائی فیٹ اونچی ہے جس پر جنوب رخ کے زینے سے پہنچتے ہیں۔ جنوبی رخ کے حجرے کی چھت پر پختہ مگر بیچ میں سے خالی اسطوانہ ہے جو چار فیٹ اونچا اور ڈھائی فیٹ قطر کا ہے۔ جس کے دونوں طرف سوراخ ہیں جن پر چار انچ قطر کی سنگ خارا کی ایک سل ڈھکی ہوئی ہے۔ ان سوراخوں میں سے نیچے کی منزل سے اوپر تک آسمان نظر آتا ہے ان سوراخوں سے جو اوپر تلے رکھے گئے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں رکھے ہیں لیکن ان میں کوئی نہ کوئی سائنس کی بات ہے ضرور۔

چندراول واٹر پمپنگ سٹیشن

کوشک شکار کے جنوب میں ایک بہت بڑا وسیع چبوترا نہایت اونچے ٹیلے پر بنا ہوا ہے جس کی لمبائی ۳۰۵ فٹ ۱-۶ چوڑائی ۱۵۲ فٹ ۱-۶ بلندی ۲ فٹ ۶ انچ ہے۔ سارے شہر میں پانی اسی حوض سے تقسیم ہوتا ہے جس پر ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور چاروں طرف پمپ لگے ہوئے ہیں۔

اسوکا کا ستون نمبر (۲)

پیر غیب کے جنوب میں تھوڑی دور پر اسوکا کا دوسرا ستون ہے جس کو فیروز شاہ نے کوشک شکار میں ایستادہ کرایا جو کوٹلے والی پہلی لاٹ سے کوئی چار میل کے فاصلے پر ہے فرخ سیر کے زمانۂ سلطنت میں بارود کا میگزین اُڑ جانے سے (جس کی تصدیق بجز زبانی روایات کے کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی) یہ ستون گر کر پانچ ٹکڑے ہو گیا تھا۔ پادری ٹفن تھیلر (Tieffenthaler) جو سنہ ۱۷۴۳ء سے ۱۷۶۶ء تک ہندوستان میں تھا وہ اس روایت کی تصدیق کرتا ہے کہ اس ستون کو خود اُس نے دیکھا تھا۔ لوگ دیکھنے والے موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ کچھ بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ہم نے اس ستون کو صحیح سالم کھڑا دیکھا ہے۔ لیکن برنٹ صاحب نے (Burnt) جو ۱۸۳۳ء میں اس کا نقشہ آثار نے دلی گئے تھے اُنھوں نے اس کے پانچوں ٹکڑے یک جا کرائے تھے یہ ستون تھا ہوا ۳۳ فٹ لمبا اور ۳۰-۲ قطر میں نکلا۔ برنٹ صاحب کا خیال ہے کہ ستون کا

بالائی حصہ دو فیٹ کا ضائع ہوگیا ہے۔ اگرچہ کوٹلے والی لاٹ سے یہ تھم چھوٹا ہے مگر سطبری میں زیادہ ہے۔ جنرل کننگھم کی رپورٹ میں اس کی پیمائش ملا کر لمبان ۳۲ فٹ ۹ ۳/۴ درج ہے۔ کتبے کے نیچے کا حصہ ۱۸ فٹ آور اوپر کا حصہ ۱۲ فٹ ہے۔ بالائی حصے کا قطر ۲۹ ۱/۲ اور حصۂ زیرین کا قطر ۸۲ و ۳۵ ۱ انچ ہے۔ یہ ستون گاؤدم ہے جس کا اُتار چڑھاؤ فی فٹ انچ کا پانچواں حصہ ہے۔ ۱۸۳۸ء میں ہندو راؤ نے فریزر صاحب کی کوٹھی کے ساتھ اس ستون کو بھی خرید لیا تھا (جس کے صحن میں اس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے) جس نے آخرکار ان ٹکڑوں کو بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کو تحفۃً دے دیا تھا۔ جن انجنیر صاحب کو حکم ملا تھا کہ ستون کو کلکتے بھیج دیں اُنھوں نے رپورٹ کی کہ اس کے بھیجنے میں بہت صرفہ پڑے گا۔ برٹ صاحب کی تحریک اور ایشیاٹک سوسائٹی کی منظوری سے صرف وہ حصہ ستون کا کہ جس پر کتبہ تھا کاٹ کر کلکتے بھیج دیا گیا جہاں وہ مسٹر جیمس پرنسیپ نہایت مشہور و نامور ماہر فن آثار قدیمہ کے بت کے چبوترے کے نیچے لگا دیا گیا تھا لیکن پھر ۱۸۶۶ء میں وہ حصہ دلّی کو واپس کر دیا گیا جس کے ایک سال کے بعد مسٹر کیمبل انجنیر نے پانچوں ٹکڑے جوڑ کر کھڑا کر دیا۔ اب یہ ستون سنگ خارا کے دوہرے چبوترے پر کھڑا ہے۔ پہلا چبوترہ دس فیٹ مربع اور تین فیٹ اونچا ہے اور دوسرا ۷ ۱/۲ مربع اور ۲ ۱/۲ اونچا ہے۔ اب بھی پانچوں ٹکڑے جہاں جہاں سے ٹوٹے تھے صاف معلوم دیتے ہیں۔ نیچے سے لے کر چوتھے ٹکڑے تک کتبہ ہے مگر بالکل غیر واضح لیکن مسٹر پرنسپ نے بہت غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ من و عن اسوکا کے دوسرے کتبوں کی نقل ہے۔ اب اس ستون کے چبوترے پر بخط انگریزی یہ کتبہ لگا دیا گیا ہے:

This pillar was originally erected at Meerut.

In third Century B.C. by King Asoka

It was removed thence and set up in the Koshak Shikar Palace near this

by the Emperor Firoz Shah A.D 1356. Thrown and broken in five pieces by the explosion of a powder Magazine, A.D. 1713-1719, it was restored and set up in this place by the British Government A.D. 186

(ترجمہ) تیسری صدی قبل مسیح میں بادشاہ اسوکا نے اس ستون کو ابتداءً بمقام میرٹھ نصب کرایا۔ وہاں سے فیروز شاہ شہنشاہ نے ۱۳۵۶ء میں منتقل کرکے محل کوشک شکار میں اسی مقام کے قریب استادہ کرایا۔ ۱۷۱۳-۱۹ء میں بارود کے میگزین کو آگ لگ جانے سے یہ ستون گرکر پانچ ٹکڑے ہوگیا۔ سرکار انگریزی نے درست کراکے اس جگہ پر ۱۸۶۷ء میں کھڑا کرادیا۔

ہندو راؤ کا مکان یہ مکان دراصل ولیم فریزر[1] ایجنٹ گورنر جنرل متعینہ دہلی نے ۱۸۳۰ء میں بنایا تھا۔ یہ بہ لحاظ موقع اور محل کے ایسی جگہ بنا ہے کہ سارا شہر یہاں سے دکھائی دیتا ہے اور کسی رخ کی بھی ہوا چلے مگر اس میں ضرور آئے گی۔ فریزر صاحب کے مارے جانے کا واقعہ یوں ہے کہ فیروز پور جھرکہ کے نواب شمس الدین سے اور فریزر صاحب سے رنجش ہوگئی تھی۔ رنجش کی بنا کی دو وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔ انگریز تو کہتے ہیں کہ نواب اول درجے کا بدچلن شخص تھا اور فریزر صاحب چونکہ ہمیشہ صلاح و مشورے سے اس کی روک تھام کرتے رہتے تھے یہ اسے ناگوار تھا۔ ہندوستانی اس واقعہ کی بنا یہ بتلاتے ہیں کہ فریزر صاحب نواب صاحب کے رشتے کی کسی بیگم سے جو خواجہ نواب کی منظور نظر تھی ناجائز تعلقات رکھتے تھے چنانچہ یہ بات بچے بچے کی زبان پر ہے بلکہ لوگوں نے اس کا ایک گیت بھی بنایا ہے جو طوائف گاتی ہیں۔ غرض اصل بنا سے رنجش کچھ بھی ہو نواب فریزر صاحب کی جان کا لاگو ہوگیا تھا اور اپنے حصول مطلب کے لیے اس نے چند بدمعاشوں کو جو کرنیل سلیمن صاحب کی بلی موری (Bulwem ars Ward) میں رہتے تھے جو ایک گلی ہے جو چاندنی چوک

[1] مسٹر ولیم فریزر (۱۷۸۴ء-۱۸۳۵ء) ۱۷۹۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ دلی میں ۱۸۳۲-۱۸۳۵ء تک رزیڈنٹ رہے۔ سکنرز ہارس کے سکنڈان کمانڈ بھی تھے اور ۱۸۰۶ء میں محاصرہ بھرت پور میں نمایاں خدمات کیں کشمیری دروازے کے پاس والے سینٹ جیمس گرجا میں مدفون ہیں ان کی قبر ان کے دوست لفٹنٹ کرنل جیمس سکنر نے بنوائی ہے۔ ۱۲

میں نکلتی ہی۔ بہت دنوں تک یہ بدمعاش تاک میں لگے رہے مگر کوئی موقعہ ہاتھ نہیں لگا۔ آخرکار ایک دفعہ کا ذکر ہی کہ فریزر صاحب راجہ کشن گڈھ کی دعوت میں دریا گنج گئے تھے وہاں سے لوٹتیوں کو اپنے گھر آتے آتے اندھیرا ہو گیا۔ فریزر صاحب موری دروازے کی سڑک سے جا رہے تھے وہاں سے وہ پہاڑی کی مشرقی جانب اپنے مکان کی طرف پلٹے۔ اس موڑ پر ایک سوار دکھائی دیا جو آگے آگے چلا جا رہا تھا وہ ٹھٹکا جوں ہی فریزر صاحب کی گاڑی اُس کے پاس سے گزری اُس نے گولی چلائی اور ایسا جھپٹ کر شہر میں جا گھسا کہ جو سوار فریزر صاحب کے ساتھ تھے وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ بعد میں قاتل گرفتار ہوا اور اُسے پھانسی کی سزا ملی۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اصل قاتل جھاڑیوں میں دبکا ہوا تھا اور وہیں سے اس نے گولی چلائی اور وہیں سے ریاست الور میں جا کر ایسا روپوش ہوا کہ پھر ملا ہی نہیں۔ نواب صاحب بطور دھر لیئے گئے اُن پر مقدمہ قایم ہوا۔ تحقیقات ہوئی۔ اُن کی اشتعالک سے فریزر صاحب کا مارا جانا ثابت ہوا اور ۱۰ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو اُن کو کشمیری دروازے کے باہر پھانسی دی گئی۔ اُن کی نعش لٹکے لٹکے ہی مغرب کی طرف ہو گئی لوگ اس سے کہنے لگے کہ بے گناہ تھے درجہ شہادت کا پایا۔ فریزر صاحب کے مرنے کے بعد اس مکان کو ہندو راؤ نے خرید لیا جو ایک مرہٹہ سردار بیجا بائی (بیوہ مہاراجہ دولت راؤ سیندھیا راجۂ گوالیار جو اپنے شوہر کی وفات کے بعد خود گدی نشین ہوئی مگر نو سال کے بعد معزول کی گئی اور اپنے بھائی کے ساتھ جان کمپنی کے دامن میں جا کر پناہ لی) کا بھائی تھا۔ ہندو راؤ کچھ عرصہ تک تو کشن گنج میں رہا اور یہ مکان خریدنے کے بعد اس میں اُس نے اپنا سیجتے خانہ رکھا۔ یہ عجیب اتفاق ہی کہ غدر میں جو گولہ باری اس مکان پر ہوئی وہ کشن گنج کی طرف سے ہوئی جہاں یہ پہلے رہتا تھا۔ ہندو راؤ غدر سے اول ہی مر گیا تھا مگر غدر تک مکان انھیں کے اعزہ و اقربا کے قبضے میں تھا۔ بعد غدر کے سرکاری ضبطی میں آ گیا اور گورنمنٹ کی جانب سے اس کی درستی بھی کرائی گئی اور موسم بارش میں جب کہ آب و ہوا خراب ہوتی ہی تو قلعے کے گورے اسی میں جا کر رہتے ہیں اور یہ بطور سینیٹوریم (دارالصحت) کے استعمال کیا جاتا ہی۔ اس مکان کے عقب میں مسلمانوں

سکے عہد سے بھی پہلے کی ایک باؤلی[1] ہی اور باقی قدیم عمارتیں فیروز شاہ کے کوشک شکار سے متعلق ہیں - رسدگاہ کے پاس ٹرگنامٹریکل سروے کا بنچ مارک ہی اور اسی سبب سے غالبًا یہ مقام اب رسدگاہ کے نام سے زیادہ تر مشہور ہی -

چوبرجی[2] اس عمارت کو بھی لوگ کوشک کا ایک جزو فیروز شاہ ہی کی تبلاتے ہیں - کوشک کے احاطے میں نہیں ہی بالکل اس سے ملی ہوئی ہی - اس عمارت کے طرز اور مال مسالے سے بھی اس امر کی صاف تصدیق ہوتی ہی - ہی تو یہ بھی مقبرہ ہی مگر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس کا ہی - یہ عمارت لمبوتری ۱۹ × ۹ پتھر چونے کی ہی جس پر استرکاری کی ہوئی ہی - اس میں جانے کا دروازہ جنوب رخ پر ہی جس پر تین مربع کھڑکیاں ہیں - دروازے کی بغلی میں ایک ایک چھوٹا محراب دار دروازہ ہی جو ساڑھے پانچ فیٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہی - یہ عمارت کے مشرقی جانب تین محراب دار دروازے اور ہیں جن میں سے درمیانی دروازہ بغلی دروں سے بڑا ہی - دروازے کے اوپر سات کھلے

---

[1] اب اس پر "شکار گراہ" کا بورڈ لگا ہوا ہی اور فیروز شاہ کی باؤلی کہلاتی ہی اور جب کوشک شکار کے حدود میں واقع ہی تو قرینہ قوی اس امر پر دال ہی کہ فیروز شاہ کی بنوائی ہوئی ہوگی اب یہ باؤلی بالکل حالت انہدام میں ہی - اس باؤلی میں ایک بہت بڑا تہ خانہ اب تک موجود ہی جو ہندوراؤ کے مکان کے نیچے وھر تک چلا گیا ہی - ۱۲

[2] یہ باڑے کی مسجد کہلاتی ہی اب اس کی وہ حالت بھی نہیں ہی جو کہ اوپر لکھی گئی ہی - صدر دروازہ اس مسجد کا شرق رویہ ہی یہ عمارت دو منزلہ ہی - دُہرا زینہ آمنے سامنے پندرہ پندرہ سیڑھیوں کا ہی - چھت پر اب صرف دو دربرابر کے اور دو ادھر ادھر اُس سے چھوٹے اور ۵ لمبی اور ۱۱ - ۸ اونچی دو دالانوں کی درمیانی دیوار رہ گئی ہی - سامنے صحن ہی - جنوب رخ کا صرف ایک حجرہ باقی رہ گیا ہی جس پر ایک برج قایم ہی اور اسی کے اندر سے زینہ ہی صحن میں ایک پختہ قبر ہی جس کا چبوترا ۱۱ مربع اور ایک فیٹ اونچا ہی - قبر کے اوپر کی شہ نشین بھی اب نہیں رہی - اس مسجد کا دوسرا دروازہ جنوب رویہ چوکی دار ہی - عمارت موجودہ کا ارتفاع ۲۷ ہی - دروازے کی کل اونچان ۲۶ - ۸ - محراب دروازہ کی اونچان ۱۱ - ۳ چوڑان دس فیٹ خالص دروازے کی اونچان ۷ - ۲ اور چوڑان ۵ - ۴ ہی - کوشک شکار سے لے کر یہاں تک عمارتوں ہی عمارتوں کا سلسلہ تھا جن میں بہت سی صاف کر دی گئیں بعض بعض کے کھنڈر باقی ہیں اسی طرح اس مسجد کے گرد بھی عمارتیں تھیں وہ سب گر گرا گئیں خود مسجد ہی کی عمارت پوری باقی نہیں ہی باوٗلی مسقف حصہ تو سب گر گیا پیچھے کا حصہ باقی ہی - چار برج جا بجا کر اب صرف ایک باقی رہ گیا ہی - گورمنٹ نے ادھر ادھر کے کھنڈر صاف کر کے مسجد کے گرد ۱۰ × ۸۰ کا ایک چبوترا لال بجری کا بنا کر مسجد کو کھنڈروں کے زمرے میں سے نکال کر فی الجملہ ایک شان نکال دی ہی - یہ ساری عمارت لداؤ کی پختہ اور اُسی طرز کی ہی جیسے کہ کوشک شکار -

طاق ہیں جن کے سامنے ایک بھاری چھجا ہے۔ شمالی رُخ بھی اسی طرح کا ہے جیسے کہ مشرقی ہے۔ مغربی جانب اندرونی دیوار سے ملی ہوئی ایک مسجد ہے جس کی صرف ایک ہی محراب مغرب رویہ باقی رہ گئی ہے۔ اس مکان کی پہلی منزل میں نو کمرے ہیں۔ سب سے بڑا کمرہ بیچ والا ہے جس میں ایک قبر بھی ہے جس کے چاروں کونوں پر چار کمرے اور چار کوٹھڑیاں ہیں۔ مغرب کی طرف کے درمیانی کمرے میں مسجد تھی جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ قبر پر اب کوئی تعویذ نہیں ہے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہاں قبر تھی مگر دومنزلے پر قبر کا تعویذ موجود ہے۔ دومنزلے پر چڑھنے کے لیئے صدر دروازے کے دونوں طرف عمارت کی جنوبی دیوار میں دو زینے ہیں۔ دومنزلے کی چھت پر چاروں کونوں پر ایک ایک برج ہے جن میں سے تین برقرار ہیں صرف شمال مغرب کی طرف کا بجلی سے گر گیا ہے اور بجلی کے گرنے سے قبر کو بھی صدمہ پونہچا ہے۔ جنوب مشرق اور جنوب مغرب کی برجیوں کے بیچ میں عین قبر کے اوپر ایک چھوٹی سی شہ نشین ہے جس میں پتلے پتلے تین در شمال رویہ ہیں اور چھت کی دیوار میں اسی کے جواب میں تین مربع کھڑکیاں ہیں۔ جنوب مشرق اور شمال مشرق کی برجیوں اور شمال مشرق اور شمال مغرب کی برجیوں کے بیچ میں خالی دیواریں ہیں جس میں اسی طرح کی کھڑکیاں ہیں جیسی کہ مشرقی دیوار میں۔ مغرب کی جانب مسجد کے اوپر ایک چھوٹا سا حجرہ چھت کے بیچوں بیچ میں ہے اور اسی میں قبر کا بالائی تعویذ ہے جس کی اصل تحتانی منزل میں اسی کے نیچے ہے۔

سبزی منڈی صدر بازار کے آگے شہر کے مضافات میں ہے۔ چوں کہ اس طرف باغات وغیرہ کثرت سے تھے جن میں سے محلدار خاں۔ روشن آرا۔ چیٹھی نویس کا مختصر سا باغ جس میں ایک نفیس بارہ دری نما بنگلہ اور چھوٹا سا حوض اور تختہ ہاے چمن آراستہ ہیں۔ موجود ہیں۔ ادھر ہر قسم کا میوہ اور ترکاری اور آم وغیرہ دور سے آتے اور منڈی میں فروخت ہوتے ہیں اس سبب سے سبزی منڈی کہلانے لگی ورنہ اب شہر کی آبادی اس سے جا ملی ہے ہزاروں مکان اور بیسوں کوٹھیاں اور گھرنیاں اور ملیں بن کر جزو شہر ہو گیا ہے۔ گنیش فلور مل ہندو بسکٹ فیکٹری۔ برف کے کارخانے سب یہیں ہیں۔ سبزی منڈی میں فگش کے پل سے آگے داہنی جانب گوشت کی مارکٹ۔

سڑک پرانی چھاؤنی - مندر رام دوار کا - کٹڑہ الٰہی بخش پہلے یہ ایک تکیہ تھا - مسجد
پیلو والی - کٹڑہ لالہ امرناتھ - ڈاک خانہ - گلی پنچانہ والی - گلی شاہنشاہ - کٹڑہ جگنا تھ
جوتی پرشاد - کٹڑہ گل خاں - کٹڑہ لعل - کٹڑہ ریوڑی - گلی آہن گراں - گلی ملکہ گ
اور یہی سقیم پور بھی کہلاتا ہے - باغ کوٹھی شورا - خالصہ ملز - دہلی فلور ملز وغیرہ کارخانجا
ہیں - باغ لالہ گوکل چند جوہری - باغ اچار والا یہی باغ دکھنی راؤ کے باغ کے
نام سے بھی مشہور ہے اس کے آگے لب سڑک ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کا سارا
صحن سڑک میں آگیا ہے اس پر ۱۲۰۱ ہجری کا کتبہ ہے - بائیں طرف - بابو پراگ نرا
آگرے والے کی ائیس فیکٹری - مسجد نیار والی جو نواب قطب الدین خان کی کہلاتی
محتاج خانہ جو در اصل محبوب علی خاں خوجہ کی سرائے تھی لبعد غدر کے محتاج خانہ
اور اب یکوں تانگوں کا سٹینڈ ہے - سبزی منڈی یہاں ترکاری بکتی ہے - وسط صحن
میں ایک چبوترا ہے جس پر ترکاری بکتی ہے اس میں شمال کی طرف (۲۵) اور جنوب
میں (۱۷) محراب دار حجرے دکانوں کے لیئے بنے ہوئے ہیں - بادشاہی زمانہ
میں ملک پنجاب سے رائیوں[1] کو جو باغبانی کا کام کرتے تھے یہاں بسایا گیا تھا -
گلی چھجو لاہور والے - سڑک لال مسجد جس کے اندر کنیا پاٹ شالا آریہ - گلی پیپل والا
کٹڑہ دھنی شاہ - گلی تعالاں یہاں کئی چھوٹی چھوٹی مسجدیں ہیں اور مغل پورہ کہلاتا ہے -
اب پھر بازار میں آگئے - بستی کلاں پنجابیاں یہیں نکڑ پر ایک مسجد پنجابیوں کی ہے - بستی
خورد - بڑی بستی - کٹڑہ اگر خاں - یہاں لعل مسجد ہے جو روشن آرا بیگم کی کسی دایہ نے
بنوائی تھی اور روشن آرا بیگم کے باغ کے صدر دروازے کے قریب ہی اسے
بڑی مسجد بھی کہتے ہیں گلی رحیم بخش سکریٹری - سڑک روشن آرا باغ لالہ پریشہ
داس ساہو دہلی جس پر ۵ جولائی ۱۹۰۲ء لکھا ہوا ہے - باغ موتی لال ہزاری لال -
باغ ہرنراین گوپی ناتھ - باغ گربال رائے انبا پرشاد جس میں روئی کی ملز ہے - باغ

[1] رائیں لوگ شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں آئے - یہ لوگ زراعت پیشہ زمیندار ہیں یشیر گڈ
میں ان کے پیر و مرشد محمد فاضل شاہ صاحب قادریہ تھے - ان لوگوں کو نواح سبزی منڈی
میں رہنے کو زمین بادشاہ نے دی تھی اور سبزی فروشی کا کام کرتے تھے چنانچہ اب
رائیں لوگ یہاں کثرت سے آباد ہیں - ۱۲

لالہ سنگم لال اس باغ میں بہت پرانی قبریں ہیں - اور یہاں متعدد باغ ہیں جو کسی خاص تذکرے کے قابل نہیں -

باغ روشن آرا

۱۰۶۰ھ

باغ رنگیں صورتِ رخسارِ یار
سبزۂ خط سبزہ اُس میں آشکار
سرو مثلِ قامتِ خوب بتاں
نرگس اس میں رشکِ چشمِ مہ وشاں

غنچہ اُس میں جوں دہان تنگِ یار ۔ مثلِ زلفِ یار سنبل پر بہار
صحنِ گلشن خوانِ نعمت تھا مگر ۔ میوۂ انواع اُس میں جلوہ گر
شعلہ ساں ہر سمت سیبِ لالہ رنگ ۔ جوں زنخدان بتانِ شوخ و شنگ
خوشۂ انگور اُس میں جلوہ گر ۔ آبلے جوں سینۂ عشاق پر
تاک کی یوں ناشپاتی پر بہار ۔ جس طرح فرہاد و شیریں ہمکنار
کیا ہی لالہ گوں رونق فزا ۔ بوستاں میں جلوہ گر مریخ تھا
یہ حسرسیفے کے چمن میں رنگ ڈھنگ ۔ جیسے چھیک روبتانِ سبزہ رنگ

جلوہ افروزی یہ اک سو ہو کنار
وقفِ فندق جیسے انگشتانِ یار

یہ باغ شہر کے باہر سبزی منڈی کی طرف ہو جس کو اورنگ زیب کی چہیتی بہن روشن آرا بیگم نے جو داراشکوہ کے خلاف تھی بنوایا تھا۔ برنیر لکھتا ہو کہ "اورنگ زیب کی یہ بہن سیرت اور صورت عقل و فراست میں اپنی بہن جہاں آرا سے کم تھی" لیکن سر ایڈورڈ سلیوان نے لکھا ہو کہ "بڑی خوش مزاج۔ شاندار اور بلند حوصلہ تھی اور اپنی بہن سے کسی بات میں کم نہ تھی" روشن آرا نے اس باغ کی بنا ۱۰۶۰ھ میں اُس وقت ڈالی کہ جب اُس کے باپ شاہ جہاں نے دلی کی بنا ڈالی تھی اور اپنے امرا اور اعزہ کو مختلف مقامات پر قطعات اراضی آباد کرنے دیئے تھے اورنگ زیب کے سنہ ۱۳ جلوس میں جو ۱۶۷۱ء کے مطابق ہوتا ہو انتقال کیا اور اسی باغ میں ہمیشہ کو آرام کیا۔

رخصت ہی باغباں کہ ذرا دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائگا

اس باغ کی اب اصلی حالت تو باقی نہیں جو شاہان مغلیہ کے زمانے میں تھی وہ سما خواب وخیال ہی جس کا تصور بھی محال ہی۔ اب تو صرف بڑے بڑے پرانے درخت کھڑے سر دُھن رہے ہیں۔ چوڑی چوڑی باغ کے اندر سڑکیں نکالی گئیں ہیں۔ کچھ تختوں میں ہری ہری دوب جادی گئی ہی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

اُڑا کے باد خزاں لے گئی کہاں ہیہات ۔ کہ گل تو کیا کوئی کانٹا بھی اب چمن میں نہیں

کرنل کریک رافٹ کمشنر دہلی نے پرانی اور فرسودہ عمارات کو گروادیا اب صرف ایک حصہ پختہ نہر اور باغ کے مشرقی دروازے کا باقی رہ گیا ہی۔ روشن آرا بیگم کا مقبرہ البتہ اب بھی اچھی حالت میں ہی۔ اس مقبرے کی چھت ہموار ہی۔ چبوترہ مقبرہ کا ۱۵۹ فٹ مربع اور تین فیٹ اونچا ہی۔ مقبرہ کے چاروں طرف چار چار سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر آتے ہیں۔ چبوترے کے گرد دو فیٹ اونچی منڈیر ہی۔ اس منڈیر سے مقبرہ ۵ فٹ کے فاصلے پر ہی اور ۹۹ فٹ مربع اور اکیس فیٹ اونچا ہی۔ اس بلندی میں چھت پر کی چار فیٹ اونچی منڈیر بھی شامل ہی۔ مقبرے کے چاروں کونوں پر چار منزلہ کمرے ہیں اور ایک بیچ کا ہال ہی۔ اس بیچ کے ہال اور کونوں کے کمروں کے درمیان برآمدہ ہی۔ کونوں کے کمروں میں چاروں طرف سے رستہ ہی اور دو منزلے پر جس کا زینہ دیوار میں ہی اسی قسم کے کمرے اوپر بھی ہیں۔ کونوں کے کمروں کے بیچ میں چار بھاری بھاری ستون ہیں جن پر کنگرے دار محرابیں ہیں اور نہایت عمدہ استرکاری کی ہوئی ہی۔ ان ستونوں کے سروں اور بیٹھکوں اور تھم کے ایک ثلث حصے تک نقش ونگار کھدے ہوئے ہیں۔ ستونوں کی اگلی قطار سے چھ فیٹ کے فاصلے پر اسی قسم کے ستونوں کی اور چار قطاریں ہیں۔ چھت کے چاروں کونوں پر چورخی برجیاں پانچ یا چھ فیٹ مربع ہیں جن کے کلس پتھر کے ہیں اور گرد ایک چوڑا چھجہ ہی۔ عمارت کے وسط میں ایک مربع کمرے میں روشن آرا بیگم کی قبر ہی جس کا دروازہ جنوب رخ پر ہی اور بالین قبر شمال کی طرف ہی۔ باقی طرف پتھر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں جن پر حال میں پلاستر چڑھا دیا گیا ہے

اب بھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ دراصل جالیاں کس قسم کے پتھر کی تھیں۔ جس کمرے میں قبر ہی وہ دس فیٹ مربع ہی اور اس کا فرش سنگ مرمر کا ہی۔ اس چوکھنڈی کی چھت نہیں ہی بلکہ قبر کا بالکل زیر سما ہی۔ اس چوکھنڈی کے چاروں کونے میں شامیانہ تاننے کے چار سوراخ ہیں۔ قبر کے تعویذ کے بیچ میں کچی مٹی ہی اور قبر اُسی وضع کی ہی جیسی کہ اُن کی بہن جہاں آرا بیگم کی ہی۔ قبر ۵-۱ لمبی اور ۲ اونچی ہی جس کے سرہانے سنگ مرمر کا طاق بنا ہوا ہی۔ باغ کے فواروں اور نالیوں میں جو کسی زمانے میں اس کی رونق اور آرایش کا باعث ہوں گی اب سوائے ایک بڑے حوض کے جو باغ اور مقبرے کے مشرق میں ہی کچھ باقی نہیں رہا۔ حوض ۲۷ لمبا اور ۱۲۴ چوڑا ہی۔

دکھائیں سینکڑوں نیرنگیاں زمانے نے ہنسنے جو آج تو کل غم سے اشکبار ہوئے
طفولیت سے شباب اور شباب سے پیری کلی سے پھول ہوئے پھول ہو کے خاک ہوئے

بیڈن پیویلین

۱۹۱۷ء میں باغ کے مشرقی رخ پر کرنل ایچ۔ اسی بیڈن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی کے نام پر دہلی میونسپلٹی کی طرف سے ایک کرکیٹ پیویلین بنایا گیا ہی جس میں دو کمرے دو باتھ روم اور سامنے ایک برآمدہ اور اُس کے آگے کرکیٹ فیلڈ ہی۔ اس پیویلین کی طیاری میں لعہ صرف ہوا ہی۔

محلدار خاں کا باغ

۱۱۴۱ھ
۲۹-۱۷۲۸ء

تماشائے گل کا مزا آج ہی۔
کہ گھنگور چھائی گھٹا آج ہی
سحاب کرم آج شوروں پہ ہی
تمنا پیاسوں کی زوروں پہ ہی

عجب لہلہاتا ہی سبزہ کہیں بیاں جس کی خوبی کا ہوتا نہیں
ستم غنچوں کا مسکرانا کہیں غضب پھولوں کا کھلکھلانا کہیں
کہیں لطف سے ہی رواں آب جو کہیں بھینی بھینی ہی پھولوں کی بو

دلی کے شمال و مغرب میں کوئی چار میل پر سبزی منڈی کے آگے محلدار خاں کا باغ ہی جس میں عید کے بعد تیرت کا میلا ہوتا ہی۔ محلدار خاں محمد شاہ کے زمانے کے

ایک معزز عہدہ دار تھے انھوں نے یہ باغ ۱۱۴۱ھ و ۲۹-۱۷۲۸ء میں بنایا جو بالکل کرنال کی
سڑک کے کنارے ہے۔ باغ بہت وسیع اور کئی ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا ہے۔ اسکا
صدر دروازہ لب سڑک ہے جس کی دو محرابیں چودہ فیٹ اونچے اور نو فیٹ چوڑی
اور ۵ فٹ ۴ گہری ہیں۔ اس کے چھتے میں دو دو کمرے اِدھر اُدھر بنے ہوئے
ہیں۔ یہ دروازہ تمام سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے۔ دروازے سے کوئی ۱۸۰ فٹ پر
ایک بارہ دری چالیس فیٹ مربع ہے جس کا چبوترہ ساٹھ فیٹ مربع اور چار فیٹ اونچا
ہے۔ بارہ دری کے چاروں کونوں پر چار کمرے ہیں اور اُن کے بیچ میں تین تین
دروں کے دالان ہیں جن کے بیچ میں ایک چوکون کمرہ ہے۔ بارہ دری کا بہترین
حصہ سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے اور چبوترے کے چاروں طرف سیڑھیاں ہیں۔ چھت
کی منڈیر کے علاوہ چاروں طرف چوڑا چھجہ بھی ہے۔ بارہ دری کے پاس ہی سنگ سرخ کا
ایک گہرا حوض ۳۰ فٹ مربع ہے۔ جس میں دہلی کی نہر سے پانی آیا کرتا تھا۔ یہ باغ محلدار خاں
کے بازار کی مشرقی حد پر تھا جس کی اُجڑی ہوئی دکانوں کے نشانات اب تک باقی
ہیں۔ باغ اور بازار کے درمیان ایک وسیع احاطہ تھا جس کی شمالی اور جنوبی دیواروں
میں تین دروازے جو "ترپولیہ" کے نام سے مشہور تھے۔ شمالی دروازہ اب تک
کرنال کی سڑک پر موجود ہے جس کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ شہر شروع ہو گیا۔ اس
کے جوڑ کا دوسرا دروازہ سڑک سے ہٹا ہوا بائیں طرف کچھ فاصلے پر ہے۔ پہلا دروازہ
مستطیل شکل کا گہرائی میں ۵۰ فٹ لمبا اور ۴۸ فٹ ۳ انچ چوڑا ہے۔ جس کے تین در ہیں۔ بیچ کی محراب
۱۴ فٹ ۷ انچ اور ادھر اُدھر کی محرابیں ۱۴ فٹ ۳ انچ چوڑی ہیں لیکن بلندی میں سب برابر کی سترہ
سترہ فیٹ کی ہیں۔ چھت پر دو فیٹ اونچا کنگورہ ہے اور ادھر اُدھر کی دیوار میں دروازے
پر چڑھنے کا زینہ ہے۔ اس پہلے دروازے سے دوسرے دروازے تک ۲۵۰ گز کا
فاصلہ ہے۔ ان دروازوں پر سنگ مرمر کی تختی پر سنگ موسیٰ کی پچیکاری سے لکھا ہوا ایک کتبہ ہے۔ دوسرا
دروازہ بھی کچھ تھوڑے سے فرق سے اسی قبیل کا ہے صرف فرق اتنا ہے کہ دروازوں
میں جو حجرے ہیں اُن میں سے ایک دوسرے میں آنے جانے کے رستے
مختلف طور پر بنائے گئے ہیں۔ اس دوسرے دروازے کی بغلی میں دو چھوٹے چھوٹے
مینار بھی ہیں جو پہلے دروازے میں نہیں ہیں خدا جانے تھے ہی نہیں یا بعد میں گر پڑے

اوّل کتبہ باغ محل دار خاں
بر دروازہ

خداداد صد آرزو در جہاں | بنا گشت از فضلِ حق ایں مکاں
پئ باغ تاریخ گفتم عیاں | فدائے محمد محل دار خاں
بہ نذرِ خدا کردہ باغ جناں | غلام نبی ناظر محل دار خاں

دوسرا کتبہ ترپولیہ کے دروازے پر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بفضل خدا و رسولِ زماں | چناں رستہ بازارِ ترپولیہ
بنا کرد ناظر محل دار خاں | کہ مانند بوستانِ گیتی نشاں
زہاتف ندا آمدہ ایں چنیں | کہ باشد ابد مستقل ایں مکاں

۱۱۴۱ھ

مبارک باغ یا اختر لونی گارڈنز

کابلی دروازے سے ۳ میل پر ہے۔ اصل نام تو مبارک باغ تھا مگر بعد میں اختر لونی صاحب کے نام سے شہرت پاگیا۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے کے باغوں میں یہ سب سے بہتر تھا مگر اب تو باغ کا صرف نام ہی نام رہ گیا ہے۔ سر ڈیوڈ اختر لونی (Ochterlony) بارٹ سنہ ۱۷۵۸ء-۱۸۲۵ء ۱۸۰۳ء میں دلی کے رزیڈنٹ مقرر ہوئے۔ بھرت پور کی جنگ میں ان کا کام لارڈ ایمہرسٹ کو پسند نہ آیا اور اسی وجہ سے ۱۸۲۵ء میں مٹکاف صاحب کا نمبر ان سے آگے کر دیا گیا اس ناکامیابی سے دل شکستہ ہو کر ۱۸۲۵ء میں انتقال کیا ورنہ یوں اُنھوں نے شمالی حصۂ ہند میں بڑے بڑے نمایاں کام کیے ہیں۔ خدا کسی کو بنا کر نہ بگاڑے

بادلی کی سرائے کا میدان کارزار

تو ضلع آزادپور سے ایک میل آگے بڑھ کر جہاں علی پور روڈ بڑی سڑک سے ملی ہے ایک مغلیہ زمانے کا ... سرائے کسی بادشاہ کی بنائی ہوئی ہے پہلے سرائے کے اندر سے سڑک جاتی تھی لیکن جب سے بڑی سڑک نکلی تو یہ سرائے کے باہر مشرقی کنارے پر سے چلی گئی ہے۔ گاؤں کے شمال میں دو ٹیلے اور ایک پرانی عمارت ہے جو کسی کا مقبرہ معلوم دیتا ہے۔ پاس والی ٹیکری پر ایک قبر کسی کی ہے جو لڑائی میں کام آیا۔ اسی ٹیلے پر غنیم نے اپنی بھاری بھاری توپیں چڑھا رکھی تھیں جن سے انگریزی فوج کو جو ۸ جون ۱۸۵۷ء کو تڑکے ہی وہاں پونچی تھی بہت نقصان پونچا۔ اس میدان جنگ کے مغرب میں اب ای آئی ریلوے کی انبالہ کالکا لین کی سڑک ہے۔

شالامار باغ اُس سے پرے جو درخت ہیں وہ شاہ جہاں کا شالامار باغ ہی جو ۱۰۵۳ھ ۱۶۴۳ء میں بنا تھا اور پنجاب یا کشمیر جاتے جاتے شاہ جہاں کا پہلا مقام یہی تھا - اسی باغ میں اورنگ زیب کی تاجپوشی کا جشن ہوا - غدر میں اس کو تباہ کر دیا اور ۱۸۰۳ء سے کے بعد اسی جگہ رزیڈنٹ صاحب موسم گرما بسر کرتے تھے - باغ کے اُدھر نہر ہی جس کے اُس سرے سے کنارے پر سے انگریزی سوار اور توپ خانہ چکر کاٹ کر آیا تھا کہ بارش کے موسم کی وجہ سے نالے چڑھے ہوئے تھے اور ساری زمین دلدل ہو رہی تھی - ٹیلے پر چڑھ کر ہم دیکھیں تو ہم کو اندازہ ہو سکتا ہی کہ کس دلیری اور جرأت سے نمبر ۷ پلٹن سیدھی توپوں پر جا پڑی - غنیم کو سنگینوں پر دھر لیا اور سرائے کی دیوار تک اُن کو دباتے چلے گئے - اس لڑائی میں بہت سے سپاہی سرائے کے اندر کام آئے -

حضرت شاہ فرہاد صاحب کا مزار چیچی نویس کے باغ کے پاس اور ایک دوسرے باغ میں شاہ فرہاد صاحبؒ کا مزار ہی - آپ بڑے باخدا بزرگ ابو العلائی خاندان کے تھے - آپ شاہ دوست محمد صاحب کے خلیفہ ہیں جن کا مزار اورنگ آباد میں ہی اور شاہ دوست محمد صاحب خلیفہ ابو العلیٰ صاحب کے تھے - آپ کا مزار دو سوا دو سو برس سے اس مقام پر ہی - ۲۵، ۲۶ رجادی الثانیہ کو عرس ہوتا ہی - آپ کے خلفاء کے مزارات بختیار پور (لکھنؤ) وغیرہ دیگر مقامات میں ہیں - آپ کے سلسلے کے خلیفہ آغا محمد داؤد صاحب حیدرآباد دکن میں ہیں آپ ہی نے اس باغ کو ساڑھے پانچ ہزار میں خرید کر پیرجی فیض محمد صاحب کے تفویض کیا ہی جو شاہ عزت اللہ صاحب کے مزار واقع قصبۂ بگڑ ضلع شیخاواٹی ریاست جے پور میں رہتے ہیں اور یہاں بھی خدمت کرتے ہیں - اس باغ سے مالگذاری سالانہ وصول ہوتا ہی یہی معاش ہی -

حضرت شاہ آفاق صاحب کا مزار
۱۲۵۱ھ — ۱۱۶۰ھ

سبزی منڈی کے قریب مغلپورہ میں گنیش فلور ملز کے متصل ایک چھوٹی سی مسجد کے عقب میں آپ کا مزار ہی - آپ کا سلسلۂ نسب حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی تک چھ واسطوں سے پہنچتا ہی -

آپ کے والد ماجد کا نام احسان اللہ اور دادا کا نام شیخ محمد اظہر تھا جن کو عالمگیر نے نواب ظہیر الدین خاں کا خطاب دیا تھا آپ خلیفۂ اعظم حضرت ضیاء اللہ نقشبندی کے ہیں۔ غرض کہ شاہ صاحب علاوہ شرافت حسبی و نسبی و فضائل علم ظاہری کے سلوک باطنی میں بھی اپنے وقت کے جیّد صاحب نسب تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ غلام علی صاحب مجددی دہلوی نے کتاب سید المرشدین کے حاشیہ پر آپ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ "حضرت شاہ محمد آفاق سلمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ضیاء اللہ سے جو حضرت خواجہ محمد زبیر کے خلفاء میں ہیں اس خاندان کی نسبت سرگرمی کے ساتھ حاصل کی ہے اور اس وقت حلقہ اور مراقبہ اور افادۂ نسبت میں ممتاز ہیں" آپ اپنے اکثر مریدوں کو بعد تعلیم آپ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے جب آپ صاد فرماتے اُس وقت تکمیل پوری سمجھی جاتی۔ آپ کے کمالات اور مجاہدہ اور زہد اور مکاشفہ تمام عالم میں مشہور ہے پیروی سنت رسول مقبول بدرجۂ غایت ملحوظ رکھتے تھے مسکینی اور کسر نفسی حد درجے تھی اپنے تئیں بہت ہی کم تر سمجھتے تھے اور اسی فروتنی کا سبب تھا کہ آپ لوگوں کی نظروں میں بہت محترم تھے۔ ؎

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
ہر کہ خود را دید او محروم شد

آپ کے مرید ہزارہا اور خلفاء بے شمار تھے۔ اُن میں سے صرف دو خلفاء کے نام نامی لکھتا ہوں جو خود بڑے ذی مرتبت بزرگ اور شہرۂ آفاق ہیں۔ اول مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی (ضلع اناؤ) دوم مولانا شاہ نصیر الدین صاحب دہلوی جو نواسے تھے مولانا شاہ رفیع الدین کے اور داماد تھے مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب مہاجر بیت اللہ اور اولاد تھے حضرت سید امام ناصر الدین سونی پتی کے آپ کابل تشریف لے گئے وہاں بھی قبول عظیم پایا کہ زماں شاہ وہاں کا بادشاہ آپ سے بہت عقیدت رکھتا تھا جس کا مزار سرہند میں حضرت امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رح کے روضۂ مبارک کے سامنے ایک بڑے گنبد میں ہے آپ کا مرید ہوا شاہ صاحب کی ولادت ۱۱۶۰ھ میں

ہوئی اور وفات ۲ محرم الحرام روز چہار شنبہ ۱۲۵۱ھ - قطعۂ تاریخ یہ ہے :-

چوں جنابِ شاہِ آفاق از جہاں کرد رحلت سوے جنات نعیم
گفت سالِ رحلتش خیر حزیں خلد را ما واے او کن ای کریم

ایک مادہ تاریخ کا یہ بھی ہے

از سرِ پاس گفت اہل جہاں شاہِ آفاق رفت از دنیا

حضرت کا جہاں اب مزار ہے اس جگہ خواجہ محمد زبیرؒ کو (جو آپ کے دادا پیر تھے) غسل دیا تھا اور تختہ غسل کا اسی جگہ رکھا تھا - اس جگہ کو حضرت نے عقیدت مندی سے خواجہ صاحب کی اولاد سے تبرکاً خریدا اور حسب وصیت خود اسی جگہ دفن ہوئے آپ کی دو صاحبزادیاں تھیں - بی بی امۃ العائشہ عرف بینڈھو جو میاں نثار رضا بن نثار احمد سے منسوب تھیں اور دوسری امۃ الفاطمہ عرف بتی بیگم جو شیخ احمد رسا بن میاں پیر بادشاہ سے بیاہی گئیں - ان کے بطن سے دو صاحبزادیاں پیدا ہوئیں (۱) گوہر آرا بیگم جو میاں عزیز احمد کے نکاح میں آئیں - (۲) گیتی آرا بیگم جن کا عقد حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی سے ہوا -

لاہوری دروازہ

فصیل شہر کا یہ دروازہ دُہرا تھا جیسا کہ کشمیری دروازہ ہے لیکن زمانۂ حال کی طرز معاشرت اس بات کی مقتضی ہے کہ شہر محصور نہ ہو - دروازوں سے سڑکوں کی رکاوٹ نہ ہو - اسی خیال سے کلکتہ دروازہ موری دروازہ کابلی دروازہ لاہوری دروازہ اور کئی دروازے اور کھڑکیاں مع فصیل کے توڑ دی گئیں - چنانچہ کابلی دروازے سے لے کر اجمیری دروازے تک فصیل توڑ دی گئی - اب بھی جن کو قدیم دروازوں کی نوعیت معلوم کرنی ہو وہ کشمیری - اجمیری - ترکمان - دلی دروازوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر سکتے ہیں -

---

مسجد ناشری

سنہ ۱۰۶۰ھ / ۱۶۵۰ع

نام منظور ہو تو فیض کے اسباب بنا
پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

بآثار کھاری باؤلی کے اختتام اور صدر بازار کے شروع پر لاہوری دروازے کے باہر (جو اب توڑ دیا گیا ہے) جی آئی پی ریلوے کے گودام کے

نقشہ مسجد سہ بندی
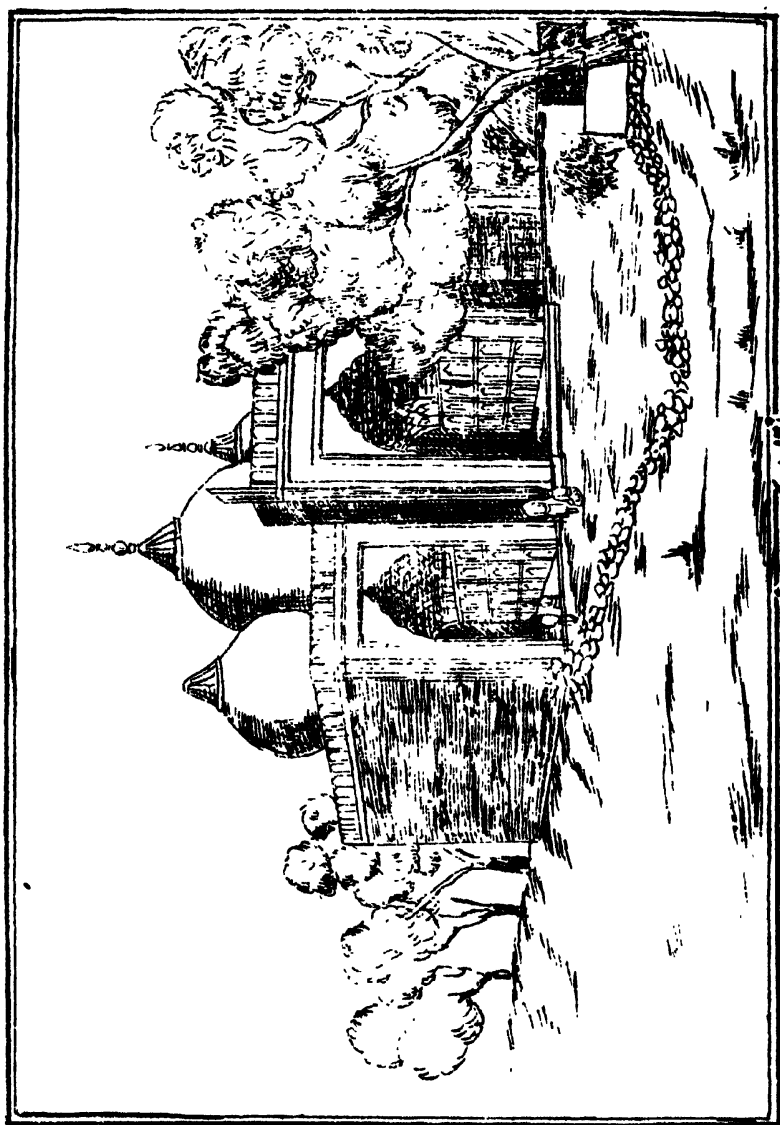
قریب لب سڑک بائیں ہاتھ کو یہ مسجد ہے جو شاہ جہاں کے محل سرہندی بیگم صاحبہ نے ۱۰۶۰ھ میں بنوائی تھی۔ گو یہ مسجد کچھ بہت بڑی نہیں مگر نہایت مرتفع بہت ہی پختہ اور مستحکم سرتاپا سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ مسجد کے تین در بنگڑی دار محراب کے ہیں جن پر کنگورا بنا ہوا ہے۔ مسجد کا طول ۹۰ گز ہے۔ عرض ۱۷ گز اور چھت کی بلندی منڈیر تک ۲۲ گز ہے۔ دروں کی محرابیں ۱۹ بلند اور چھت پر کنگورا ہے اس مسجد کے تین گنبد سنگ سرخ کے کلس دار ہیں۔ درمیانی گنبد بیس فیٹ اور ادھر ادھر کے گنبد پندرہ فیٹ اونچے ہیں۔ مسجد پتھر چونے کی پختہ بنی ہوئی ہے۔ اندرونی دیوار میں سنگ سرخ کی سلیں لگی ہوئی ہیں۔ فرش مسجد اینٹوں کا ہے جس پر گچ ہوئی ہوئی ہے۔ اس مسجد کا صحن پہلے بہت وسیع تھا اور محاط تھی اور چوں کہ مردہ اکرام کی سرا یہیں تھی اور چو طرف سے لوگوں کی آمد و رفت یہاں ہوتی تھی مسجد بہت آباد تھی اور ہر وقت کی نماز بڑی جماعت سے ہوا کرتی تھی۔ چوں کہ سرکار کمپنی بہادر کے حکم سے گرد کی عمارات منہدم کی گئیں اور میدان صاف کیا گیا اب وہ صورت مسجد کی نہ رہی۔ احاطہ باقی نہیں اور مسجد ایک معمولی حیثیت کی رہ گئی گو بانگ و صلوٰۃ اب بھی ہوتی ہے مگر وہ بات کہاں

مردہ اکرام کی سرائے

۱۲۱۸ھ
۱۸۰۳ء

اس مسجد کے متصل اس نام کی ایک سرائے تھی جو کھدوا دی گئی۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ سرائے ایسی آباد تھی کہ کثرت آمد و رفت و ہجوم خلایق سے تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی اور اس سرا کے دروازے کے باہر شام کو ہجوم سودا بیچنے والوں کا اس کثرت سے ہوتا تھا کہ وہ خود ایک بڑا بازار معلوم دیتا تھا اور انواع و اقسام کی چیزیں ملتی تھیں اور خریداروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے اس سرا کی تاریخ جو اس کے دروازے پر کندہ تھی اُس کا مادۂ تاریخ بہت عمدہ اور برجستہ ہے:-

امشب کرمے کن بسرائے اکرام

نیا بازار

سرہندی مسجد کے سامنے ایک سڑک نکال دی ہے جس کا نام برن بیسچین روڈ ہے جس کے دو طرفہ دو منزلہ سہ منزلہ مکانات نیچے دکانیں اوپر بنگلے طرز جدید کا انگریزی نما بازار بنا دیا گیا ہے جو رفتہ رفتہ آباد

ہو رہا ہے۔ زیادہ تر اس میں انگلش فیشن کی دکانیں رہ سکتی ہیں کابلی دروازے سے لے کر اجمیری دروازے تک ایک چوڑی اور سیدھی نئی سڑک نکال دی ہے جو فصیلوں کے برابر برابر چلی گئی ہے۔

جی آئی پی دلی صدر سٹیشن ٹریموے کارٹ شیڈ والکٹرک پاور ہوس

لاہوری دروازے سے سیدھی سڑک ریل کے پل پر سے ہوتی ہوئی ہندو راؤ کے باڑے کو چلی گئی ہے۔ یہیں دلی صدر کا ریلوے سٹیشن ہے جس کے پیچھے ٹریموے گاڑیوں کا گودام اور بجلی گھر کا بہت اونچا استون ہے جو علاوہ ٹریموے کو برقی طاقت پہنچانے کے سارے شہر کے برقی روشنی برقی پنکھے اور دوسری مشینیں پریس اور چکیاں وغیرہ چلاتا ہے۔ یہ انجن بہت زبردست طاقت کا ہے۔

صدر بازار

ریلوے پل اور نہر کے پل سے اتر کر صدر بازار ہے جو حال کا بسایا ہوا ہے یہاں دو طرفہ پنجابی تاجروں کی ہول سیل کی دکانیں ہیں جو بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر باعتبار کاروبار کے لاکھوں کا بیوپار ہوتا ہے اور براہ راست یورپ سے مال آتا ہے۔ یہیں ٹین کے اور پنکھوں کے اور متفرق کارخانے ہیں۔

چوراہا

صدر کا بازار جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں ایک یہی سڑک ہے جس کا ہم اوپر ذکر آئے ہیں جو لاہوری دروازے سے آتی اور ہندو راؤ کے باڑے کو چلی جاتی ہے اور دوسری شمال کی طرف سبزی منڈی کو جاتی ہے جس کا ایک حصہ مٹھائی کے پل تک کاٹھ بازار کہلاتا ہے اور جنوب کی جانب قطب روڈ ہے جو درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ پر سے داہنے ہاتھ کو پہاڑ گنج کی بستی چھوڑتی ہوئی جنتر منتر اور رائے سینا (نئی دلی) مقبرہ صفدر جنگ پر سے سیدھی قطب صاحب کو چلی گئی ہے۔ قطب روڈ پر پنجابی سکول ہے اور اسی طرح روئی کی منڈی میں حاجی محمد صدیق اللہ والے نے ایک پرائیوٹ مدرسہ اپنے خرچ سے جاری کیا ہے جس میں پنجابیوں کے لڑکوں کے سوا اور بھی بچے انگریزی اردو کی تعلیم باقاعدہ طور پر پاتے ہیں اور زیادہ تر کوشش اس بات کی کی جاتی ہے کہ ان لڑکوں کو بک کیپنگ یعنی بہی کھاتے کی ترتیب اور تجارتی حساب کتاب

کی قسمت پڑھت سکھائی جائے - اس سڑک پر خواجہ باقی باللہ صاحب کی درگاہ کے پاس ایک مسجد ہے اس کے آگے ہادی علی شاہ قلندر کی مسجد اور قبرستان ہے اس سڑک پر ایک قدیم چھوٹی سی مسجد ہے جس کے کمپونڈ میں پانچ گنبد مسلسل ہیں اور ایک علیحدہ - مسجد میں حلال خور رہتا ہے اور گنبدوں میں امراض متعدی کی ہسپتال ہے جس میں ہیضے اور طاعون کے مریض رکھے جاتے ہیں گنبدوں میں مریضان امراض متعدیہ کا رکھا جانا تو کچھ ایسی بات نہیں مگر مسجد میں حلال خور کا رہنا محل حیف ہے - اور پھر مسجد بھی گری پڑی نہیں بلکہ درست حالت میں - یہ کمپونڈ مسجد کا نہیں ہے بلکہ متفرق گنبدوں اور مسجد کے گرد کمپونڈ بنا دیا گیا ہے - اس کمپونڈ میں شمال کی طرف دس بارہ قبریں بھی ہیں - اس کے مقابل سڑک کے دوسری طرف انجمن والی مسجد ہے جس میں اکثر جنازے کی نماز پڑھائی جاتی ہے - اس کے بعد ایک مسجد بندریا والی مسجد کے نام سے مشہور ہے جس کا سارا صحن قطب روڈ میں آگیا ہے اب صرف سڑک کے کنارے تین در اور تین گنبد باقی رہ گئے ہیں -

جارج بلڈنگ اسی چوراہے کے پاس داہنے ہاتھ کو نصف دائرے کی شکل کی جو دو منزلہ عالی شان عمارت ہے جس میں پنجابی دکان دار بیٹھتے ہیں وہ اس نام سے مشہور ہے - صدر بازار میں حسب ذیل مشہور مقامات ہیں :- (داہنی طرف) کاٹھ کی سرائے - حافظ جی کی سرائے - روئی کی منڈی - گھی کی منڈی - ڈپٹی گنج - (بائیں طرف) گلی کاٹھ بازار - سرائے محمد اسحق اللہ والے گلی منڈی پان - گلی ڈاک خانے والی - جس کے اندر ایک بڑی مسجد سات دروں کی کشادہ صحن مولوی عبدالوہاب کی ہے جس کے سامنے برآمدہ ہے - درمیانی محراب پر یہ کتبہ ہے :-

زہی ایں مسجد عالی بنائے　　شد از عبدالغنی تعمیر خوشتر
عجب صالح جوان از اہل حدیث　　خدا دارا او اور از ندہ باشد
بن سال بنائش گفت حافظ　　چو فرخ قبلۂ اللہ اکبر

حاجی عبدالغنی پسر حاجی عبدالرحمن سنہ ۱۳۱۴ھ

مغربی دروازے پر وان المساجد للّٰہ فلا تدعوا مع اللہ احدا کندہ ہے -

یہ مسجد زیادہ تر وہابیوں کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ایک مدرسہ دارالکتاب والسنتہ ہے۔ کٹڑہ نبی بخش جس کے اندر دی نارائن پرنٹنگ ورکس کا ٹیپ کا چھاپے خانہ ہے۔ گلی بزازاں۔ گلی گیارہ۔ پہلے یہ کنجروں کی گلی کہلاتی تھی اور اب بھی کنجر ہی رہتے ہیں۔ چوکی پولیس صدر بازار۔ یہاں پر بھی چوراہہ ہے جو بارہ ٹوٹی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پہلے نل کی بارہ ٹوٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک تو وہی شاہ راہ ہے جو لاہوری دروازے سے ہندوراؤ کے باڑے کو جاتی ہے۔ داہنی طرف بہادر گڈھ روڈ ہے اور بائیں طرف قصاب پورہ۔ بہادر گڈھ روڈ پر چمڑے والوں کے گودام ہیں۔ قصاب پورے کے رستے میں دو مارکیٹیں ہیں ایک گوشت کی ایک ترکاری کی۔ شفاخانہ سرکاری۔ گلی برنا۔ محلہ مونڈھے والاں۔ مسجد شاہ گل جو بہت قدیم اور وسیع ہے مگر اب تیسری مرتبہ ترمیم ہوئی ہے۔ شاہ گل کوئی بزرگ نقشبندیہ خاندان کے تھے۔ اس مسجد میں ایک وسیع حوض ہے۔ عقب مسجد میں شاہ گل صاحب کا مزار ایک احاطے کے اندر ہے۔ شاہ گل کی مسجد کے آگے اور آٹھ مسجدیں ہیں۔ گھنٹے والی۔ چھپر والی۔ درزی والی۔ حاجی محمد جان والی باقی غیر معروف۔ اب پھر بارہ ٹوٹی کے چوراہے سے آگے چلیے۔ گوڑیا کے مندر والی گلی۔ گلی برنے والی۔ گلی دھرم سالے والی اس کے اندر ایک بڑا دھرم سالہ ہے اور بنیوں کا مندر۔ گلی چودھری نتھن سنگھ۔ گلی مہر سنگ جاٹ۔ میونسپل زنانہ ہاسپٹل۔ گلی مندر والی۔ جس میں جینیوں کا مندر ہے اور تین ٹھاکر دوارے۔ گلی اہیراں۔ گلی امراؤ والی۔ گلی رنگریزاں۔ گلی درزیاں گلی نئی بستی۔ گلی ممتن جمعدار۔ مسجد مولوی کرامت اللہ خاں صاحب جو بہت وسیع اور قدیم ہے۔ یہاں پھر چوراہہ ہے ایک صدر کی وہی بڑی سڑک ہے جو سیدھی چلی آرہی ہے اور روح اللہ خاں کی سرا کو چلی جاتی ہے اس پر ایس پی جی مشن گرل اسکول دی کلاتھ جنرل ملز۔ گنیش فلور ملز ہے اس کے بعد روح اللہ خاں کی سرا کا ریلوے سٹیشن ہے جو پنجابی سرا بھی کہاتا ہے۔ داہنے ہاتھ کی طرف کی سڑک ہندوراؤ کے باڑے سے ہوکر بنگش کے پل پر سے سبزی منڈی کی بڑی سڑک میں جاملی ہے اور بائیں طرف شیدی پورے کا بڑا قبرستان پنجابیوں کا ہے اور

چونے کی بھٹیاں ہیں اس کے بعد شیدی پورے کی آبادی ہے یہاں بھی دو پرانی
مسجدیں اور مندر ہیں۔ جہاں چونے کے بھٹے ہیں وہ بڑی چونہ کی کہلاتی ہے۔
ہندو راؤ کے باڑے کے تین احاطے تھے۔ باڑے کے معنے محلے کے
ہیں ورنہ ہندو راؤ کا مکان تو برج یعنی پہاڑی پر ہے۔ ان تین احاطوں میں ایک
باغ تھا۔ دوسرا فیل خانہ جو اب تک اسی نام سے مشہور ہے تیسرا شیش محل شیش محل
کے متصل ایک اور احاطہ خل سرائے یا اصطبل کے تھا اور وہ دیوان کشن داس کو
مع شیش محل اور فیل خانے کے مہاراجہ ہندو راؤ نے عطا کیا تھا۔ اس کا نام
اب کشن گنج ہے۔ کشن گنج اور شیش محل کے درمیان ایک کٹڑی بنام کٹڑی روغن
زرد مشہور تھی۔ مگر کہیں شیش محل تو اب رہا نہیں کشن گنج وہ مقام ہے جہاں ۱۸۵۷ء کے
غدر میں بماہ مئی و اگست مورچہ بندی ہوئی تھی۔ غدر کے بعد سے شیش محل
اور کشن گنج میں مسلمان پنجابی رہتے ہیں جو پہلے پنجابی کٹڑے میں رہتے تھے۔
چوں کہ پنجابی کٹڑہ سارے کا سارا ریل میں آگیا جہاں اب بڑا اسٹیشن ہے پنجابی
یہاں آن بسے۔ جس احاطے میں باغ تھا اس کے محاذ میں اُفتادہ اراضی
اور منہدمہ مکانات تھے وہ جگہ اب ہندو راؤ کے باڑے اور اچھے جی کی باغیچی کے
نام سے مشہور ہے۔ اس میں بھی پنجابی سوداگر ہیں۔ فیل خانے اور شیش محل
کے جنوب رُخ ایک کونا تکیہ معماران کے نام سے آج تک مشہور رہی۔ اس
میں معماروں کا قبرستان تھا جو بوجہ کثرت آبادی بند کرادیا گیا لیکن پرانی قبریں محاط
کرکے محفوظ کردی گئیں۔ پہلے ایک فقیر پڑا رہتا تھا اب سنسان اور ویران
ہے۔ کشن گنج میں آبادی ہونے سے پہلے مسلمانوں نے بجائے مسجد کے
ایک عارضی پنچایتی چبوترا بنالیا تھا اُسی پر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ جنوبی دروازے
کے پاس جو اب محلے کی آمد و رفت کا صدر دروازہ ہے سقوں کے قبرستان کا
ایک تکیہ تھا۔ مداری سقے سے وہ زمین حافظ غلام رسول خاں صاحب ویران نے
خریدی اور بہ اعانت مسلمانان ایک مسجد تعمیر کی ۱۳۱۹ھ میں حاجی حکیم امجد علی صاحب آنریری مجسٹریٹ
و نبیرۂ حافظ صاحب مرحوم نے بہ اضافہ زمین نہایت خوب صورت اور رفیع الشان مسجد از سر نو
بنوادی۔ حافظ غلام رسول جو ویران تخلص کرتے تھے ایک بڑے پایہ کے

شاعر تھے۔ خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق ؔ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔
چنانچہ موجودہ دیوان ذوق حضرت ویرانؔ کے تو ہی حافظہ کا نمونہ ہی جو انھوں نے
محض اپنی یاد پر سے لکھوا دیا۔ جناب ظہیر ؔ نے اس کا دیباچہ فارسی میں لکھا ہی۔
ذوق کی وفات کے بعد بہادر شاہ بادشاہ نے ان کو قایم کیا تھا کہ دو سال بعد غدر
ہو گیا اور ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ حضرت ویرانؔ اہل قلعہ کی بربادی
کے بعد کشن گنج میں آن رہے اور سنہ ۱۳۰۵ھ میں انتقال کیا اور اپنے انتقال کی
تاریخ خود ہی دو سال پہلے خاک سدۂ خواجہ کہی چنانچہ درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ
میں یہی مادہ لوح مزار پر کندہ ہی۔ آپ کی یادگار حکیم امجد علی صاحب ہیں جن کا شمار
اپنی نیک نفسی اور خلق کی وجہ سے مشاہیر شہر میں ہی۔ ہندو راؤ کے باڑے میں
پنجابیوں کی ایک مسجد چھوٹی مسجد کے نام سے مشہور ہی جو نہایت خوب صورت
اور کشادہ تین گنبدوں کی ہی۔ صحن میں حوض اور کنواں اور برقی روشنی ہی۔ اس کے
بعد پچی گلی ہی۔ ہندو راؤ کے باڑے اور فیل خانے کے بیچ میں سے جو ایک
بڑی سڑک جاتی ہی وہ بہادر گڑھ روڈ ہی۔ جو بہادر گڑھ سے آکر کاٹھ بازار کی
سڑک میں مل گئی ہی۔ کشن گنج سے تیلی واڑے کی طرف مدرسۂ دار الہدیٰ
اور مسجد۔ مدرسۂ خیر النسا بیگم ہی جس کے دروازے کی پیشانی پر یہ کتبہ ہی:۔

مدرسۂ خیر النسا بیگم ۱۳۴۲ھ

بتوفیق ایزدی ایں عمارت بیادگار اہلیۂ خود تعمیر نمودہ بنام آں مرحومہ یعنی
مدرسۂ خیر النسا بیگم ۱۳۴۳

موسوم ساختہ وقف اللہ برائے تعلیم نمودم۔ الواقف (حاجی فخر الدین پٹنہ والے)
اس مدرسہ میں انگریزی کی تعلیم بھی ہوتی ہی۔ پانچ جماعتیں اور ۱۳۸ طلبا ہیں۔ پانچ
ماسٹر اور ایک ہیڈ ماسٹر ہی۔ خرچ تخمیناً دو سو روپیہ ماہوار کا ہی۔ اب محلہ تیلی
واڑہ شروع ہوا۔ گلی تیلیاں۔ گلی پنیہاری۔ مسجد حافظ اسمعیل صاحب اس
مسجد پر صرف مسجد حنفیہ بخط نسخ لکھا ہوا ہی۔ مندر بنسی بھگت مہادیو۔ گلی شب جی
والی۔ شب کا مندر تیلیوں کا۔ گلی مچھلی والی اس گلی کے اندر سکھوں کا ایک
گوردوارہ ہی۔ اب مٹھائی کے پل کے پاس کاٹھ بازار میں رستہ مل گیا ہی۔

پُرانی عیدگاہ

حضرت خواجہ شاہ باقی باللہ صاحب کی درگاہ کے پاس صدر میں ہی۔ یہ عمارت طرز عمارت سے جیسی عالی شان ہی ویسی ہی قدیم بھی ہی اور عہد مغلیہ سے پہلے کی بنی ہوئی معلوم دیتی ہی۔ اس پر کوئی کتبہ نہیں جس پر سے زمان تعمیر مشخص کیا جا سکے نہ آثارالصنادید میں اس کا ذکر ہی۔ موجودہ حالت اس کی عیدگاہ کی نہیں رہی بلکہ ایک سراے بن گئی ہی جس میں کثرت سے بھٹیارے اور میلے کچیلے کام پیشہ لوگ رہتے ہیں جنھوں نے چاروں طرف جھوپڑیاں اور چھپر ڈال رکھے ہیں۔ صحن میں بکری گھوڑے۔ بیل۔ بھینسیں باندھی جاتی ہیں۔ خلیل الرحمٰن صاحب پنجابی نے اراضی سرکار سے خرید لی ہی اور اس کے کرایہ کی آمدنی سے وہ متمتع ہوتے ہیں چوں کہ وہ مسلمان ہیں لہذا غربی رُخ پر جو مسجد بنی ہوئی ہی صرف وہ اپنی اصلی حالت پر قایم ہی جس کی اُنھوں نے مرمت کرا دی ہی اور دالان کے درمیان میں فتح پوری کی مسجد کی طرح ایک جدید دیوار کھینچ کر جس میں محرابیں رکھ دی ہیں چھت کو جو پتھر کی سلوں کی ہی ٹیکا لگا دیا ہی۔ اس نئی دیوار میں پیش طاق کے ادھر ادھر آٹھ آٹھ در رکھے ہیں۔ قدیم عمارت اس مسجد کی بہت مستحکم ہی ایک بہت اونچا پیش طاق آگے بڑھا ہوا ہی جو محراب تک چالیس فیٹ اور چھت تک پچاس فیٹ اونچا اور ۴۴ - ۹ چوڑا ہی۔ باقی ادھر اُدھر تین تین در ۲۴ بلند محراب دار ہیں جو کنگوروں تک تیس فیٹ اونچے اور چوڑان میں ۱۶ - ۹ ہیں۔ پچھیت کی دیوار میں ممبر کے پاس جو محراب ہی وہ نو فیٹ گہری ہی اور اس کی دونوں جانب تین تین دیوار دوز محرابیں ۵ - ۲ کے عمق کی ہیں۔ لمبان مسجد کی ۱۵۴ ہی۔ دالان کی چوڑان ۲۲ ہی اور پیش طاق کے سامنے جو ممبر سے ملا ہوا ہی پیش طاق کی گہران چھوڑ کر دالان کی چوڑان ۲۸ تک ہی۔ صحن مسجد میں پیش طاق اور صرف ادھر اُدھر کے دروں کے سامنے چوکے بنے بچھے ہوے ہیں جن کا طول ۷۶ اور عرض ۱۸ - ۱۰ ہی باقی کچی زمین ہی۔ یہیں ایک کنواں بھی ہی پیش طاق پر حال میں ایک کتبہ لگا دیا ہی۔ جس کے اشعار بہت ہی غیر موزوں ہیں۔

کتبہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ واللہ غالب علیٰ امرہ انما یعمر مساجد اللہ من امن باللہ و الیوم الآخر واقام الصلوٰۃ وأتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ -

رکھ لیا نام میر اظلیل الرحمٰن اس نام کے لایق کیا مجھ پر احسان

میں اور حرم گھر کی مرمت مولا سلے میں ترے الطاف پہ قربان بجان

یہ تو مسجد کا حال ہوا اب صحن عیدگاہ جس میں گھوڑے بیل بندھتے ہیں اور لید اور گوبر سے اٹی پڑی ہی وہ ساڑھے چھ سو فیٹ مربع ہی جس کے چاروں طرف فصیل نما پختہ چار دیواری اور اُس میں وسیع حجرے اور پیش دالان تھے - اب سوائے جانب جنوب ایک حصے کے جس میں بیس در رہ گئے ہیں جن کا ہر در ۹ - چوڑا ہی اور پیچھے وسیع کوٹھڑی ہی سب حصار گر گیا یا گرا دیا گیا اور نئی دکانیں بنالیں - یہ کوٹھڑیاں اتنی بڑی تھیں کہ بیچ میں ایک دیوار کھینچ کر آدھی کوٹھڑی لب سڑک سر بازار نکال دی اور آدھی اندر وار عیدگاہ کے صحن میں ہی - اس عیدگاہ کے تین دروازے تھے صدر دروازہ مشرق میں تھا اور اُس سے چھوٹے دروازے شمال جنوب میں - غرض کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی وسیع اور شان دار اور نفیس عیدگاہ ہونے پر جدید عیدگاہ بنانے کی کیا ضرورت داعی ہوئی تھی - اگر جدید عیدگاہ نہ بنتی تو یہ عیدگاہ آج غلاظت کا گنج نہ ہوتی -

نئی عیدگاہ پرانی عیدگاہ سے آگے بڑھ کر ایک ٹیلے پر نئی عیدگاہ بنی ہوئی ہی اور اب اسی میں عیدین کی نماز ہوتی ہی - یہ عیدگاہ عالمگیر کی بنائی ہوئی ہی اُس کا صحن ۵۰۰ فٹ مربع ہی جس میں سے ۳۰۰ فٹ مربع تو حال میں ایک دریا دل پنجابی نے پختہ کرا دیا - ڈیڑھ سو فیٹ ابھی خام ہی - صحن میں (۱۲۰) صفیں ہیں - فی صف پانسو آدمی آتے ہیں - یہ عیدگاہ عہد عالمگیری کی بنی ہوئی ہی - مغرب رو یہ دیوار میں سو دیوار دوز محرابیں ہیں اور بیچ میں منبر کے پاس ایک بڑا پیش طاق ہی - مغرب شمال جنوب میں طرف احاطے کی دیوار بشمول کنگورا دس فیٹ اونچی ہی اور مشرقی دیوار ڈھائی گز بلند ہی - شمال اور جنوب میں دو چھوٹے چھوٹے دروازے تیرہ فیٹ اونچے اور آٹھ آٹھ فیٹ چوڑے اب نکالے گئے ہیں - مشرق میں صدر دروازہ بیس فیٹ بلند اور

سلہ یہ ترکیب غلط ہی لیکن ظل العام فصیح ہی ۱۲ -

نقشہ درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ

دس فیٹ چوڑا ہی صحن میں پختہ کبتر ہی اور جہاں تک صحن پختہ ہی اُس کے بیچ نیچے ہی پچاس فیٹ مربع نیا بنا ہوا پختہ حوض ہی۔ غدر کے بعد عیدگاہ بھی منہدم ہو گئی تھی قطب الدین صاحب پنجابی نے اُسے چھوڑایا اور بڑا کام کیا۔

درگاہ حضرت خواجہ محمدؒ باقی باللہ قدس سرہ العزیز

مقام	سال تعمیر	بانی
صدر بازار کے مغرب میں	۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء	بزمانہ اکبر بادشاہ

آپ کا مزار مبارک چونے گچی کا زیر سما ہی۔ آپ کا اصلی نام سیّد رضی الدین احمد ہی۔ خواجہ محمد باقی باللہ کا خطاب مرشد سے عنایت ہوا۔ آپ ۹۷۱ھ میں بمقام کابل پیدا ہوئے اور وہی آپ کا وطن تھا ظاہری علوم کا وہیں اکتساب کیا پھر فیوض باطنی مدینہ منورہ میں حضرت خواجگی امکنگی علیہ الرحمۃ سے حاصل کیئے اور بعد حصول اجازت اپنے مرشد کے بعہد اکبر شاہ بادشاہ ہندوستان تشریف لائے اور دہلی میں مقیم ہوئے۔ آپ کا وصال چالیس سال کی عمر میں ۲۵ جمادی الثانی روز دوشنبہ ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء میں ہوا۔ اور اسی تاریخ آپ کا عرس ہوتا ہی۔ آپ کی درگاہ شریف شہر کی آبادی کے اندر صدر بازار میں شہر کے مغرب رخ واقع ہی۔ یہ مقام زیارت گاہ بہت متبرک اور نورانی ہی۔ آپ بزرگ خاندان علیٰ سادات اور سلسلۂ نقشبندیہ میں کامیاب ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ تاج الدین نارنولی وغیرہ آپ کے خلیفہ ہیں۔ آپ ہندوستان میں نقشبندیہ خاندان کے پیران پیر مانے جاتے ہیں اگر آپ کی ذات بابرکات نہ ہوتی تو یہ طریقۂ نقشبندیہ ملک ہند میں نہ جاری ہوتا۔ یہ مزار ایسی فیض و برکت کا ہی کہ جس کے بیان سے یہ عاجز قاصر ہی۔ آپ کے کرامات و خوارق متجاوز البیان ہیں اب تک بھی آستانۂ مبارک مرجع خلائق ہی اور اکثر اہل احتیاج با اعتقاد آپ کے حضور سے فائز المرام ہوتے ہیں ایک تصرف حضرت کا صریح ظاہر ہی کہ چبوترہ مزار شریف کا سنگین اور زیر سما ہی جس کے پتھر تپ جاتے ہیں پاؤں دھرنے کی تاب نہیں رہتی مگر مزار مبارک اور اس کے اطراف اندرون احاطہ عین تابستان کے نصف النہار میں مانند یخ کے سرد رہتا ہی۔ غرض یہ کہ آپ بڑا بزرگ اور صاحب کشف و کرامات تھے

آپ کے ظاہری و باطنی کمالات وزہد وتقوی واتباع سنت آفتاب کی طرح روشن ہیں۔
آپ کے معمولات شریفہ یہ تھے "کم بولنا" "کم سونا" "کم کھانا" اور ہر روز بعد نماز عشا
تا نماز تہجد دو ختم قرآن شریف فرماتے اور بعد نماز تہجد کے فجر تک اکیس بار لیسین شریف
تلاوت فرماتے جب صبح صادق طلوع ہونے لگتی تو آپ فرماتے کہ الہٰی رات کو کیا ہوا
کہ اس قدر جلد ختم ہوجاتی ہے۔ آپ کی درگاہ میں ہزارہا لوگ مدفون ہیں اور آپ کے
پائیں اور قرب وجوار میں دفن ہونے کی ہر شخص آرزو رکھتا ہے اور اسی وجہ سے
دہلی کا سب سے بڑا مدفن یہی ہے اور درگاہ کے چاروں طرف دور دور جہاں تک نظر دوڑتی
ہے قبریں ہی قبریں نظر آتی ہیں۔ آپ کے مزار کے دو چبوترے ہیں پہلا چبوترہ
چوبیس فیٹ مربع ہے جس کے اطراف اٹھارہ انچہ اونچا پختہ احاطہ تھا۔ دوسرا
چبوترا بارہ فیٹ مربع ہے جس کے اطراف ایک فٹ اونچی منڈیر ہے۔ پہلے چبوترے
کے گرد سجادے صاحب حال نے چار دیواری چھ فیٹ اونچی بنواکر اُس میں چوطرف جالیاں لگائیں
ہیں۔ اسی پر آپ کی قبر شریف زیر سما ہے۔ قبر کے سراہنے کی دیوار میں چار بڑے
بڑے طاق ہیں جن میں چراغوں کے رکھنے کی جھانجیاں بنی ہوئی ہیں اور اسی میں
دو طاق نذر ونیاز چڑھانے کے ہیں مزار سے ملی ہوئی داہنی طرف ایک مسجد ہے جس کی
چھت مسطح ہے۔ مسجد پانچ درکی ہے۔ بیچ کی محرابیں اونچی ہیں اور اس کے دونوں طرف
کی محرابیں کم بلند ہیں۔ مسجد کی دونوں طرف کی دیواروں میں پتھر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔
اول درجے میں سنگ ابری کا سہ دَرہ قابل دید اور لاجواب ہے۔ سنتے ہیں کہ محمد شاہ
بادشاہ کے عہد میں کوئی سوداگر ایران سے فروخت کے لیئے بادشاہ کی خدمت میں
لایا تھا بادشاہ اُس کو اسّی ہزار روپیہ دیتا تھا لیکن اُس نے فروخت نہ کیا اور حضرت کی
نذر کردیا۔ حضرت کے نواسے حضرت شاہ نظام الدین صاحب صوبہ دہلی نے مسجد تعمیر
کراکر اس میں لگا دیا۔ یہ مسجد بوسیدہ ہوگئی تھی ۱۳۱۹ھ میں سید مظفر علی صاحب
نقشبندی عرف پیرجی صاحب سجادۂ درگاہ شریف نے جو حضرت کی تیرھویں پشت
میں ہیں اپنی سعی اور چندے کی امداد سے بحسن وخوبی تمام دوبارہ تعمیر کرایا پہلے یہ اکہرے
دالان کی مسجد اور صحن بالکل نشیب میں تھا مسجد کے دُہرے دالان بنواسے اور صحن
میں بھرتی کرکے بہت خوشنما کردیا اور پیش طاق پر یہ کتبہ لگا دیا:۔

سبحان اللہ

حمد اللہ خدائے ذو الجلال | سال تاریخش چہ خوش تقدیر شد
مدعا و مقصد کلی نصیب | حیرت دل خستہ بس دلگیر شد
از در فیض خدائے شد بلند | مسجد کعبہ نما تعمیر شد

۱۱۹ ہجری

درگاہ کے جنوبی دروازے پر یہ اشعار کندہ ہیں :-

خواجہ باقی آں امام اولیا | عارف باللہ اسرار نہفت
نکہت بستان سرائے انبیا | از نہال جعفری خوش گل شگفت
چوں کہ بد مشرب فنا اندر بقا | محو حق گشتہ ز اسرار صفت
رخت بستہ زیں سرائے بے بقا | چوں ندائے ارجعی از حق شنفت
سال تاریخ وصالش خسروی | باقی باللہ "نقشبند" وقت گفت

مزار مبارک کے سرہانے یہ قصیدہ لکھا ہوا ہے جو پہلے ایک لکڑی کے تختے پر نہایت پائدار سیاہی سے لکھا ہوا تھا لیکن لکڑی فرسودہ ہوجانے سے سجادہ صاحب حال نے سنگ مرمر کی تختی پر نہایت خوش خط کندہ کرا دیا ہے :-

قبلۂ ارباب معنی کعبۂ اصحاب دیں | مظہر فیض الٰہی صاحب علم الیقیں
حامی دین نبی اکمل امام المتقیں | مورد فضل گرامی آل ختم المرسلیں
کاشف اسرار مطلق واقف علم الیقیں | محو ذات اقدس و باللہ باقی بالیقیں
غوث اعظم عروۃ الوثقیٰ ز رب العالمیں | قطب ارشاد جہاں ہم معنی حق الیقیں
کامل عالی طریقہ مہدی راہ متیں | بحر عرفان الٰہی مقتدا ر العارفیں
راضی و مرضی حق بر ذات شان آدمیں | ایں کرامت ہست از محبوب رب العالمیں
نور ربے چوں بر جبینش تافت از حق المبیں | شد ز یمن نیتش روشن قلوب المومنیں
کر تو اتم گفت روح آں خلاصہ واصلیں | ہست ذات خواجہ باقی مرحمت العالمیں
نعمت اللہ باقی بود باقی شد یقیں | مرجع انس و ملک از فضل رب العالمیں
خواجگی الکنہ شد مرشد آں شاہ دیں | لیک مشرب اولیں و ہم بہار آخریں
چوں کمالش وصل دائم بود معنی دل نشیں | شد وصال غیب او آخر عمر اربعیں

داں ز ہجرت بعد الف اثنا عشر بودہ سنیں | از وفات قطب دوراں تکیہ گاہِ مسلیں
ہر کہ آید بر مزارش از سر صدق و یقیں | حاجتش گردد روا ہم مقصدِ دنیا و دیں
عاجز و عاصی بدرگاہش ہمی ساید جبیں | تا بیابد نظر رحمت ہم نجات یوم دیں
باد نازل رحمت رضوان رب العالمیں | بر محمد خواجہ باقی ز اولیائے مقبلیں

نقل ابیات سابقہ در عہد سجادہ نشینی میر منظفر علی صاحب بقلم آثم ابو المعظم سراج الدین احمد (رسائل) گردید۔

آپ کے مزار شریف سے مشرق کی جانب ایک قبر چھوڑ کر دوسرا مزار حضرت کی والدہ ماجدہ مرحومہ کا ہی۔ ایک آستانہ میں آپ کے دونوں صاحب زادے حضرت خواجہ کلاں اور حضرت خواجہ خورد کے مزارات ہیں۔ اسی جگہ نظام الدین احمد عرف شاہ جی کا مزار ہی جن کا اجمیری دروازے کے متصل تالاب اور جاؤڑی بازار میں چھتہ مشہور ہی اور یہیں عالم گیر بادشاہ کے استاد ملا جیون اور مرزا مظہر جان جاناں کے استاد اور حافظ قاری شاہ عبد العزیز صاحب الملقب بہ شاہ مقبول احمد قادری اور شاہ عبد العدل صاحب نقشبندی اور دیگر بزرگان دین کے مزارات ہیں۔ اور یہیں راقم کے والد ماجد جناب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ ڈی او ایل کی قبر ہی۔ بیرون احاطۂ حافظ غلام رسول صاحب ویراں شاعر کا مزار دروازے سے ملا ہوا ہی جس پر یہ شعر کندہ ہی۔ ؎

فاتحہ مرقد ویراں پہ بھی پڑھتے جانا
اُن سے کہہ دو جو ہیں اس رہ سے گزرنے والے

جناب مولوی محمد عبد القادر صاحب (راقم کے نانا) امام مسجد اورنگ آبادی و اتالیق مرزا فخرو ولی عہد بہادر و جناب مولوی محمد عبد الرب صاحب واعظ (برادر کہین مولوی عبد القادر صاحب) بانی مسجد جامع سہارن پور اور بڑے بڑے علماے و مشایخ و شعرا کے مزارات یہیں ہیں۔

شہر خموشاں و یاد رفتگاں

ن گور غریباں میں ہوا میرا گزر — دل کے داغ اُبھرے ہوئے دیکھے بساط خاک کا
ہی تھیں جا بجا ٹوٹی ہوئی قبریں جہاں — عالم اسباب کی نیرنگیوں کو دیکھ کر
تھی ہر طرف سے بو چراغ کشتہ کی — اُف معاذ اللہ وہ عالم کہ ٹکڑے ہو جگر
قبروں پر کہ جو تھے مجلس آرا وجود — شمع روشن تھی نہ تھی اک چادر گلہائے تر
تھیں صرف ناکامی پر اُن کی حسرتیں — کوئی ماتم کرنے والا تھا نہ کوئی نوحہ گر
تھا ایک ہیبت ناک غربت کا خروش — اک ادا سے خامشی چھائی ہوئی تھی شمع پر
عالم اور بھیانک رات اور وہ بے کسی — ہل گیا دل عالم گور غریباں دیکھ کر
سناٹا سا میرے دل میں پیدا ہو گیا — اُف یہ وحشت ناک قبریں اور یہ منظر الحذر
کسی کھینچے لیے جاتی تھی مجھ کو اس طرف — گو نجتی تھی پردۂ ظلمت میں خاموشی جدھر
دل بہنے لگا آنکھوں سے۔ دھیان آیا مجھے — دفن اسی عبرت سرا میں ہے میرا مشفق پدر
پر ایک سناٹا سا ہے چھایا ہوا — ڈوبتے تاروں سے پیدا ہیں کچھ آثار سحر
تے تارو ذرا مجھ کو تمہیں تعلیم دو — ضبط میں کیوں کر کروں آنسو یہ عالم دیکھ کر
ہوائے سرد کے جھونکو تمہیں کہتے چلو — طول غم میں ٹھنڈی سانسیں کس طرح ہوں مختصر
قبرستاں گواہی دے تو ہی اس بات کی — میرا دل ویراں زیادہ ہے کہ یہ تیرا کھنڈر

قبر سے ایک آواز

م اے ساکنان بزم ہستی السلام — اُس جگہ ہم ہیں کہ تم سے کر نہیں سکتے کلام
بھی اس بزم میں تم سب سے سرگرم سخن — ہو گئے ہیں آج مجبوری سے ہم پنبہ دہن
ح آکر ملیں ہم ہل نہیں سکتے یہاں — دور ہیں تم سے بہت اب ہم کہاں اور تم کہاں
ارک تم کو اس دنیا کا منظر دیکھنا — جب کبھی فرصت ملے ہم کو بھی مڑ کر دیکھنا
و برگ عالم ہستی وہی ہے کیا نہیں — یہ بتاؤ یاد کرتے ہو ہمیں بھی یا نہیں
تے ہی دیکھتے کیا رنگ دنیا ہو گیا — ہائے کیا سمجھے ہوئے تھے ہم یہاں کیا ہو گیا
ب تھا ان دوستوں کا جلوۂ برق آفریں — آنکھ جب کھولی تو دیکھا وہ کہیں اور ہم کہیں

یں جدا دل سے ہوا مجھ سے جدا دل ہوگیا   دفعتہً کیسا یہ پردہ آکے حائل ہوگیا

ممکن ہو کہ کسی صاحب کو مُردوں کی تاریخ سے دل چسپی نہ ہو اور وہ اعتراض کر بیٹھیں کہ صرف کتاب کا حجم بڑھانے کو قطعات تاریخی ٹھونس دیئے ہیں۔ اس خدشے کو رفع کرنے کے لیئے عرض ہو کہ قبروں کو نہایت بے دردی سے ضائع کیا جا رہا ہو اس خیال سے بھی ان قطعات کا ضبط قلم ہوجانا ایک عمدہ یادگار ہو دوسرا خیال یہ ہو کہ ان میں سے اکثر قطعات بلحاظ بندش و خوبی عبارت و استخراج مادۂ تاریخ لاجواب ہیں یہ سارے قطعات بجاے خود ایک عمدہ لٹریچر ہو جس سے دنیا کی بے ثباتی اور اپنی موت سامنے کھڑی ہو جاتی ہو اور طبائع انسانی میں صفت انابت الی اللہ اور تزکیۂ نفس پیدا کرتی ہو۔ سارے قبرستان میں ڈھونڈ ماریئے سو دو سو برس پیشتر کی کوئی قبر نہ ملے گی۔ اوّل تو کدال اور پھاوڑے کو خدا سلامت رکھے وہ ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور پھر پہلے زمانے میں معمولی قبروں کو پختہ کرنے اور اُن پر کتبے لگانے کا اس کثرت سے رواج نہ تھا جیسا کہ اب ہو۔ پرانی قبریں بہ تعداد کثیر نابود ہوگئیں ہیں اور روز بروز ہوتی چلی جارہی ہیں۔ زمانہ خود فنا پر کمر بستہ ہو جس کا دل چاہے اس شہر خموشاں میں جاے اور دیکھ لے کہ پکی پکی قبروں کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہیں جن کا مال مسالا بتدریج کھسکا کر خود غرض لوگ مستفید ہو رہے ہیں اور اس طرح رہا سہا نشان بھی ان لوگوں کا مٹتا چلا جارہا ہو۔ رہے نام اللہ کا!

بیرون احاطۂ درگاہ شمالی طرف

(۱) راقم کی والدہ ماجدہ کی قبر پر:—

یَا فَتَّاحَ کُلِّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ

مَاتَتْ وَافْجَعَتِ الْقُلُوْبُ بِمَوْتِهَا
عَظُمَ الْمُصَابُ وَيَوْمُنَا يَوْمٌ عَصِرٌ

مَنْ لِلْعُفَاةِ وَلِلْاَرَامِلِ بَعْدَهَا
مَرْعًى كَمَا اَشْجَارُ نَخْلٍ مُنْقَعِرٌ

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَى الْفِرَاقِ لِعِلْمِنَا
اَنَّ الْمَمَاتَ لِكُلِّ حَيٍّ قَدْ قُدِرَ

وَطَلَبْتُ عَامَ وَفَاتِهَا فِيْ جُمْلَةٍ
فَسَمِعْتُ هَاتِفَةً تَقُوْلُ لَهَا غُفِرَ

۱۳۱۵ھ

بومراکا نئیاں ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۱۶ ہجری

(۲) ابھی تو نہ تھی سال بھر کی بھی عمر — کہ جاں سے گئیں دختر حامدہ
لکھ ای سیدہ اس کا سالِ وفات — گئیں ماں کی آغوش سے شاہدہ
۱۹۰۳ء

ازہر حسین

(دیگر) جو پوچھے سیدہ کوئی کہ مدفن — یہ کس کا ہے لبغل میں شاہدہ کے
بتا دینا اُسے یہ تربتِ پاک — ہے لعل بے بہا کی حامدہ کے

(۳) ہے یہ معصوم تیسرا بچہ جس کا ننھا سا ہے یہ تودۂ خاک — سیدہ لکھ دے اس کے بہر نشاں اظہر حامد کی تربت پاک

(۴) خاکسار کے شیر خوار بچے کی لوح مزار — یا اللہ کل من علیہا فان ۱۳۲۴ھ
بشیر الدین بشیر الدین کا بیٹا — ہوا آدھے برس کا ہو کے رخصت
بشیر اس گور کی صورت ہے شاہد — کہ اک معصوم بچے کی ہے تربت

(۵) یہیں مولوی حاجی حافظ محمد عبد القادر صاحب راقم کے نانا ۱۲۹۳ھ اور ایک چھوٹے سے احاطے کے اندر ان کے بھائی مولنا عبد الرب رحمتہ اللہ علیہ ۱۳۰۵ھ مولنا محمد ادریس رحمتہ اللہ علیہ کی قبور ہیں۔

(۶) کتبے کا اوپر کا حصہ پتھر کو لونی لگ کر جھڑ گیا صرف ھو الباقی اور پہلی سطر کے آخر میں کمالات صوری اور دوسری سطر کے آخر میں سلطان حسن پڑھا جاتا ہے۔ باقی یہ قطعہ بخط عربی ہے:—

حضرت سلطان حسن خاں عالم نیکو عمل — چوں سفر کرد ندازد نیا سوے باغ نعیم
بہر سالِ رحلت ایشاں بگوشِ دل رسید — ایں ندا از عالم بالا لہم اجر عظیم

(۷) ھو الباقی۔ چوں فخر محمد بن یامین مرد نیکنام — جانب ملک بقا ناگاہ از دار الفنا ۱۲۹۵ھ
بہر سالِ رحلت او زد رقم نوکِ قلم — رفتہ از دار الفنا بگزید او ملک بقا ۱۲۹۵ھ

(۸) اندرون احاطہ۔ ھو الحکیم مسیح الزمان ہدیں خان چو شد — بحکم قضا سوے دار البقا
پے سالِ تاریخ مسکیں بگفت — شدہ بدر حکمت ببرج فنا ۱۳۲۱ھ

(۹) اندرون احاطہ۔ یا حی یا قیوم۔
ای دریغا حضرت مضطر کو کیسے وقت میں — خانہ ویراں کردیا اے ہستی خانہ خراب
سال رحلت لکھ ظہیر اک آہ بے سر کھینچ کر — واصل جنت ہوئی وہ بانوے عصمت مآب
۱۳۲۳ھ

(۱۰) اندرون احاطہ - میر محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ

(۱۱) لوح سنگ مرمر - ھو الرحیم -

حضرت مسعود غوث وقت قطب الاولیا کاشف سر حقیقت در شریعت مقتدا
کرد رحلت جست تاریخش جیلی دل بگفت یا گنج شیخ المشائخ یا چراغ دین ما
۱۳۰۹ھ ۱۳۰۹ھ

(۱۲) ھو الغفور یادگار وفات سید میر بادشاہ صاحب خلف اکبر سید میر جان صاحب کہ بتاریخ ۵ ار صفر ۱۳۰۳ھ مطابق یکم نومبر ۱۸۸۵ء واقع شد ایں سنگ نصب کردہ شد
چھوڑی جو منصفی تو عدم میں برو جاہ صدر الصدور خلد بنے میر بادشاہ
۱۸۸۵ء

(۱۳) بسم اللہ رحمۃ اللہ علی حالہا و علی مرقدہا - بیادگار وفات نصیر بیگم صاحبہ اہلیہ سید محمد میر بادشاہ صاحب مرحوم بنت سید محمد خاں صاحب برادر بزرگ ڈاکٹر سید احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرستہ العلوم مسلماناں کہ بتاریخ ہشدہم جمادی الاولی ۱۳۳۵ھ واقع شد ایں سنگ لوح نصب گردید
۱۳۳۵ھ

رفت از دار فنا سوئے جناں مادر میر چشم و قلبش بخدا ناظر و مسرور بباد
بہر تاریخ وصالش چو رضا فکر نمود ہاتف غیب ندا داد کہ مغفور بباد
۱۳۳۵ھ

(۱۴) ھو الباقی - تاریخ ارتحال شیخ الوقت محمد مرزا جان قدس سرہ العزیز القادری چشتی نظامی کہ در سیوم ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ روز شنبہ روح پاکش بخلد بریں آسود - برائے انتباہ اہل ایقان منقوش گردیدہ -

ماہ سپہر رفعت خورشید چرخ عظمت دُر یتیم حقیقت درویش میرزا جاں
واقف ز سر مکنوں عالم بعلم بیچوں لمعات نور وحدت از روئے او نمایاں
شد زیں جہان فانی در دار ملک باقی دوری گزید اینجا واصل شدہ بجاناں
ایں امتیاز خستہ از صدمہ دل شکستہ گشتہ ملول و محزوں کاں مایہ بود شایاں
در فکر سال بود ناگاہ گفت ہاتف
گردیدہ وای پنہاں مہر منیر عرفاں
۱۳ ھ ۱۴

(۱۵) ھو الموجود - جائے میرزا مہر عالم تیموری ۱۳۲۲ھ

سارا عالم ہے تیرہ و تار یک ذرہ ذرہ بھی ہو گیا بے آب
چھپ کر ابر قضا میں کہتا ہے عالم افروز مہر عالم تاب
گفتار سیبے صبری اصغر

(۱۶) بسم اللہ۔ کل من علیہا فان الخ۔ اہلیہ خاں صاحب مولوی حبیب الرحمٰن خاں رسالدار

خدا بخشے مرحومۂ نیک خو — تو کچھ فکر تاریخ احقر نہ کر
ہر ایک دیکھ کر خود سمجھ جائے گا — یہ تاریخ لوح۔ قضا و قدر ۱۳۲۵ھ

(۱۷) ہو الباقی۔ در خلد برادرم خدا باشد — مستغرق رحمت سراپا باشد
تاریخ وفات گفت داغ غمگیں — محو جنت امیر مرزا باشد ۱۳۱۳

(۱۸) بیرون دروازہ شمالی درگاہ — رب اغفر وارحم

فاتحہ مرقد دیرا ں پہ بھی پڑھتے جاؤ — اُن سے کہہ دو جو ہیں اس در سے گزرنے والے

اغفر یا احد ۶۸۶

۱۳۰۵

مادۂ تاریخ وفات فاضل اجل شاعر بے بدل غفران مآب + فیض انتساب حضرت مولانا مولوی حافظ غلام رسول صاحب ویراں طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ کہ بعین حیات گفتہ + بتاریخ ہفتم محرم الحرام روز یکشنبہ ۱۳۰۵ھ ہجری راہی ملک بقا شد۔
خاک سدۂ خواجہ

(۱۹) اللہم اغفر ھا۔ باغ عدن کی مالن ہوا جیبہ۔ ۱۳۱۴ھ

(۲۰) اندرون درگاہ — شد برمضان چو از خدائے پاک — قربت سید کبیر علی
از لحد آمدہ صدا بیرون — تربت سید کبیر علی ۱۲۲۸ھ
۲۴ نومبر ۱۹۰۵ء روز جمعۃ الوداع رمضان ۱۳۲۳ھ

(۲۱) اللہ اکبر۔ کل من علیہا فان۔

جاں خود را چوں بحق تسلیم کردہ والدش — عبد رحمٰن کرد جیب و دامن خود چاک آہ
کلک حامد سال او بے روئے اندیشہ نوشت — آہ رفت حاجی سراج الدین زیر خاک آہ

۲۰ نومبر ۱۹۱۰ء مطابق ۱۷ ذیقعد ۱۳۲۸ھ اس دار فانی سے ملک بقا کو راہی ہوئے۔

(۲۲) اللہ اکبر بہشت بانصیب آفتاب بیگم را — کز جہاں بجہاں دگر خراماں شد
نوشت داغ جگر تفتہ مصرع تاریخ — بہ جیب زیر زمیں آفتاب پنہاں شد ۱۳۰۵

(۲۳) یاغنی الاکبر ۱۳۲۵
نیک خو نیک سیر زوجۂ انوار الحق — نیک دل نیک نظر روش نیک چلن
آہ نکلا نہ کوئی حسرت و ارمان کا — حیف پھولا نہ پھلا عہد جوانی کا چمن
پیر کا روز تھا اور چوتھی جمادی الاول — عمر بائیس کی تھی چھوڑ گئیں دار محن
یہی اخگر کی دعا ہے یہی تاریخ وفات — یا احد خلد میں ہو شاہجہاں کا مدفن

(۲۴) ھو الباقی یبعہ اللہ
کیا دار فانی سے اس نے سفر — بنایا مکان جنت پاک میں ۱۳۲۵
کہوں اس کی تاریخ کیا اے پذیر — الم جس کا ہے ہفت افلاک میں
سر آہ سے لکھ دے سال وفات — ملا عیش دنیا ہی سب خاک میں

(۲۵) وقل رب اغفر وارحم۔ تاریخ وفات سید علی صاحب ۱۸ اگست ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۸ء ۱۸۸۵ء

(۲۶)
ای دادر یغ خان بہادر امیر علی — جا پونچے جلد جنت عنبر سرشت میں
از بسکہ ان کے سر میں بھری تھی ہوائے قدس — رہنا کیا قبول نہ دنیائے زشت میں
دیکھا جو فکر سال میں ہاتف نے یوں کہا — کھدے کہ آ گئے وہ ریاض بہشت میں

(۲۷و۲۸) غفرلہا[1]
عجب مولود خوان و وعظ گو تھی بزم نسواں کی — وفات عائشہ خانم کا ماتم کیوں نہ ہو دل میں
ہوئی سشنبہ کو جب چھبیسویں ماہ چہارم کی — مقام اس نے کیا جا کر عدم کی پہلی منزل میں
سر مصرعہ قلم کرکے کہا ہاتف نے ای گشتہ — چلو مولود پڑھنے عائشہ حوروں کی محفل میں

(۲۹) ھو الباقی۔
اڑا کے خاک بہت زیر خاک آیا ہوں — بجز امید نہ کچھ اپنے ساتھ لایا ہوں ۱۳۲۸
گناہگار خطا کار بندہ ہوں لیکن — نہ ہے نصیب کہ خواجہ کے زیر سایہ ہوں

فانا العبد العاجز مرزا محمد ابراھیم بیگ عفا اللہ عنہ

(۳۰)
رحلت چو کردہ فاطمہ خانم کہ بودہ است ۱۳۲۴ — امید واز بخشش و انعام فاتحہ
کریم از سروش تاریخ آں سال — گفتا نجات باشد از نام فاطمہ

(۳۱) ھو الکبیر ھو العظیم
زوجہ اپنی بنت الفضال سوئے جناں — رحلت پا کر ہو گئیں مدفون زیر زمیں ۱۱۸۴ھ
سال عزیز اب لکھدے تو کر رب سے دعا ۱۳۳۲ — مریم خانم پاسے الہی خلد بریں

(۳۲) تاریخ وفات۔ ہادی راہ مستقیم حضرت مولوی حافظ حاجی شاہ محمد عبدالرحیم صاحب قادری دہلوی ۱۳۲۹ھ
مرے والد ماجد و پیر ھدا — کہ تھے حضرت مولوی عبدالرحیم
وہ جو یہاں سے گئے سوئے دار بقا — تو جمیل کو صدمہ فراق کا تھا

[1] مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی لوح مزار کا کتبہ بازار کھاری باؤلی کے بیان میں درج ہے۔ ۱۲

انھیں روزوں میں ایک سروش غدا کسی کام کو تھا ادھر آ نکلا
میں نے حالِ جناب اُس سے پوچھا قدر رضی اللہ عنہ کہا

(۳۳) قطعۂ تاریخ - فاضل بمثیل مولانا کریم اللہ رفت چوں ز زیر زمیں آں آفتاب اوجِ علم ۱۳۰۵ھ
آسماں از سر کلاہ افگند بہر سال گفت در زمیں گردیدہ پنہاں آفتاب اوجِ علم ۱۲۹۰ھ

(۳۴) تاریخ وفات سید محمود علی بی۔ اے مرحوم خلف سید ببر علی۔ قطعہ
نوجوان ذی شان و عالی دودماں سید محمود علی یاسنے گیا
میں نے رضواں سے جو پوچھا اُس کا حال حکم رب العالمیں جو ہے بتا
یاس بولا وہ بآواز حزیں جائے اب خلد بریں میں گھر ملا ۱۳...ھ

(۳۵) یا غفار۔ ناگہاں شد راہی ملک عدم با غم و درد و الم محسن جہاں
گفت سائل مصرعۂ سال وفات راہِ عقبیٰ یافتہ با عزّ و شان ۱۳۰...ھ

(۳۶) یا ذا الجلال اللہ اللہ والاکرام

تاریخ وفات نواب محمد رضا علی خاں صاحب بہادر غفر اللہ لغفرانہ
چو نواب ذی رتبہ عالی مکاں ز دنیا سوئے آخرت شد رواں
بگفتا چنیں سالِ رحلت غریب کہ بادا مقیم ریاضِ جناں ۱۳۱۱ھ

(۳۷) بسم اللہ۔ انا للہ الخ۔ مرقد سیدہ عفیفہ والدہ جناب نواب سید محمد اسمٰعیل علی شاہ رئیس قصبۂ سرودھنہ ضلع میرٹھ تاریخ وفات۔

سہ شنبہ نہم روز اولی ربیع فردوس را کرد خلوتکدہ
بگو صدق تاریخ او باادب اجل کردہ گل شمع عفتکدہ ۱۳۰۹ھ

(۲) سید اسمٰعیل شاہ نیک خو مادرش خلوتگرفتہ در بقا
در ربیع الاول و روز دہم آں دو شنبہ بود ہی جانگزا
بہر تاریخ وفاتش صدق گفت در پناہ دامن خیر النسا ۱۳۰۹ھ

(۳۸) خواجہ حسام الدین حیدر رحمۃ اللہ علیہ

(۳۹) ھو اللہ مہماں نواز بجنت رفت ۱۳۳۵ھ

۱۳۳۵ھ

(۴۰) ۷۸۶ - اللہ اکبر - الٰہی جنت نصیب ہو - ایک بی بی نیک - زوجہ بابو غلام قادر صاحب امرتسری
ستائیسویں تھی ماہ محرم کی سحر تا | توڑا اجل نے رشتہ جو اس کی حیات کا
پر ہوگا اس کا حشر شہ کربلا کے ساتھ | یہ خوب مل گیا ہے وسیلہ نجات کا

زوجہ بابو غلام قادر امرتسری | شد زتیرہ خاکدان دہلی در دار البقا
تیر آسہے سر کشید و میر گفت از بہر سال | یا الٰہی باد زیر دامن خیر النسا

(۴۱) (باہر واز) ۷۸۶ - یا غفار - راہی سوئے فردوس ہوئی جب بشیر تاریخ کے جویا ہوئے انوار احمد
سائل سے کہا ہاتف غیبی نے کہا | لکھ فخر جہاں پاک ادا کا مرقد

کھویا سے فردوس فخر جہاں
۱۳۳۳

(اندر وار) ۷۸۶ و بہ نستعین خواہر انوار احمد چوں گذشت | مرقدش از نور حق معمور باد
بود نامش گفت ہاتف سال فوت | سیدہ فخر جہاں مغفور باد

(۴۲) ۷۸۶ و بہ نستعین کون آسودہ ہے میان لحد | خاک مرقد ہے عنبر بو مشکیں
کہدو سائل بفرق بسم اللہ | سید پاک میر فخر الدین
۱۳۳۴

(۴۳) سنگ مرمر کا تعویذ اور لوح -
اس عفیفہ نے کیا آج جہاں کو خالی | جو کہ سنتی تھیں بصد شوق بیان جنت
پوچھا جو وقت تو رضواں نے کہا سال وفات | کیجیے شوق سے آرام میان جنت
۱۳۱۵

مسس طامس ہدر لی صاحبہ نے ۱۹ اپریل ۱۸۹۸ء کو رحلت فرمائی

(۴۴) ۷۸۶ - ھو الکفیل ھو الظاھر
سگئے نوجوانی میں ملک بقا کو | الف خاں کے بیٹے محمد عمر خاں
وہ ہمسایہ خواجہ میں جائے ملی ہے | برستا ہے ہر دم جہاں نور یزداں
عزیز احقر الملک تاریخ احسن | لکھو وائے مرگ محمد عمر خاں

جد یہ عزیز غریب ۱۳۳۰ | عزیز تاریخ بہتر ۱۹۱۲ (۱۳۳۰)

رفت قاسم خاں زدار بے ثبات | یافت دخل خلد تاریخ وفات

تاریخ ششم سنہ ۱۲۹۶ ہجرۃ المقدس ماہ ذالحجہ

(۴۶) ھو الغفور الرحیم۔

مژدہ چوں میرزا بہادر بیگ　　گفت یاراں بخیر باد انجام

دل ز آہے برآرد گو تاریخ　　گیرد در گلشن ارم آرام

(۴۷) قطعۂ وفات نواب احمد علیخاں صاحب بہادر مرحوم عرف شہریار دولہ نوسا اسد قدہ

چوں احمد علی خاں عالی جناب　　بحکم الٰہی در آمد بخلد

نمودم چو فکر اے غریب اندکے　　پئے سال گفتم مخلد بخلد ۱۳۱۰

(۴۸) ھو العزیز۔ مادری بیگم نظیر زینب وبنت رسول　　تاج نسواں زوجۂ نواب جاں

ہوگئیں رخصت سرائے دہر سے　　آج مسکن ہوگیا باغ جناں ۱۳۲۴ھ

(۴۹) ھو الباقی ۔ قطعہ تاریخ وفات جناب محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمہ

مفتی و فاضل و عالم بود آثار سلف　　مولوی یعقوب صاحب واعظ سحر البیان

از قضائے ایزدی اندر ربیع اولیں　　روز پنجشنبہ نہم تاریخ رفتہ زیں جہاں

از سر آہ گفت مسکیں بہر سال ارتحال　　شد از یں دنیائے دوں ہگز ید در جنت مکاں ۱۳۲۴ھ

(۵۰) بسم اللہ۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ　　الٰہی مری اما کو بخشد بجبو

مرقد رابعۂ زمانہ سیدتنا والدۂ ماجدہ مولنا محمد جمال الدین سنہ ۱۳۰۹ سہارنپور مونک کہ

بروز چہارشنبہ ہفتم رمضان المبارک سنہ ۱۳۰۹ ہجری رحلت فرمودند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا۔

(۵۱) بسم اللہ - آیتہ الکرسی - چوں جان خویش بجاں بخش داد صاحب جان + بیافت جنت فردوس سال او بجزا ۱۲ھ ۹۲

(۵۲) لوح سنگ مرمر۔ ھو الغفور

زبدۂ اہل عرفاں قطب کامل غوث و پیر　　آنکہ بزدانش نظام الدین احمد نام گفت

واصل خلد بریں گردید و سید سال آں　　جائے او خلد بریں شد از سر الہام گفت ۱۲۲۲

(۵۳) خط نستعلیق نہایت خوش خط۔ بسم اللہ۔ تاریخ وفات خواجہ غلام بہاؤ الدین خلف

خواجہ زین الدین سنہ ۱۱۶۳ھ۔

میکرد چوں رضای خدا جاوداں طلب　　تاریخ گشت طالب رضوان جاوداں

(۵۴) ایک نفیس چو کھنڈی کے اندر جس میں سنگ مرمر اور سنگ موسی کا پٹا پٹی کا فرش

ہے اور ایک دروازہ مغرب کو اور دوسرا جنوب کو ہے۔ دو قبریں سنگ مرمر کی ہیں ایک کی

لوح پر دو طرفہ یہ کتبہ بخط عربی ہے اور دوسری قبر سادی ہے۔ ھو الغفور۔ بسم اللہ ۔ کُلُّ من علیھا فان الخ۔ قطعہ تاریخ وفات حضرت قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین مقرب بارگاہ احد جناب مولنا حافظ شاہ عبدالعزیز صاحب الملقب بشاہ مقبول احمد قادری دہلوی انار اللہ برہانہ واوصل الینا فیضانہ۔

شیخ کامل عاشق حق حضرت عبدالعزیز ۔۔۔ چوں بعہد خلد با صد راحت و آرام خفت
سال و ماہ و روز و تاریخ وفاتش چنیں بیر ۔۔۔ عشرۂ ماہ محرم بود دوشنبہ بود گفت

۱۲۹۶ سنہ ہجری

(۵۵) بسم اللہ حافظ عبد الغنی کو مرقد میں ۔۔۔ نقل خواجہ دفیض صحبت ہے
فاتحہ پڑھتے جاؤ بہر خدا ۔۔۔ دخل خلد ہے سال رحلت ہے ۱۲۹۸ھ

گفتار حقیر احقر دہلوی ۲۲ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ

(۵۶) یا فتاح بسم اللہ ۔ قطعہ تاریخ رحلت جناب حاجی حافظ عبداللہ صاحب مرحوم

حافظ نیک عمل شیخ اجل عبداللہ ۔۔۔ چوں بفردوس بریں رفت ازیں عارضہ گاہ
سال ترحیل سر لوح مزارپاکش ۔۔۔ ثبت گردید کہ او داخل فردوس شدہ ۱۳۰۱

کہ بتاریخ چہارم ماہ رمضان المبارک شب دوشنبہ واقعشد

(۵۷) سنگ مرمر کا تعویذ ایک چو کھنڈی کے اندر ہے جو درگاہ کی مسجد سے شمال کی طرف بالکل ملی ہوئی ہے۔ تعویذ پر نودونہ نام باری تعالی کے منقوش ہیں اور یہ عبارت ہے۔

تواریخ جاں گداز
۱۳۰۲ ہجری

مرقد پاک زوجہ × × × نواب محمد ابراہیم علیخاں

(۵۸) ھو الباقی ۔ مادہ سنہ تاریخ ۔ ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء

زوجۂ ابن الف خاں از قضا مرحوم شد ۔۔۔ لاجرم مغفور ایزد کرد سالش از کرم ۱۳۲۶
دفن شد در نقل خواجہ رحمۃ اللہ علیہ ۔۔۔ سال دیگر گفت احقر داخل بیت الحرم ۱۳۲۶ھ

اشعار دلفریب گفتار احقر

(۵۹) ھو الحی یکل شی ھالک الا وجھہ ۱۹۱۶ء شب بست وہفتم ۱۳۳۴ سنہ اور رمضان ۔

رہے صاحب بخت و واصل بحق ۔۔۔ حق آگاہ حق بیں بحق با سپاس
بشب قدر بود کہ شد ایلعزیز ۔۔۔ وصال الف خاں ایزد شناس ۱۳۳۴ھ

بیرون احاطۂ درگاہ جانب جنوب

(۶۰) ۷۸۶ آستان حضرت خواجہ پہ جو آیا کرے -
فاتحہ اس قبر پہ للہ پڑھ جایا کرے - ستاۃ اکبری خانم زوجۂ
حافظ احمد بیگ ۵ ماہ صفر ۱۳۳۴ھ وفات یافت
(دیگر) ھوالغفور الرحیم - بسم اللہ - کلمہ

فاتحہ مرقد پر ان پہ بھی پڑھتے جاؤ اُن سے کہدو جو ہیں اس در گزرنے والے
آج بتاریخ ۲۴ ذیحجہ ۱۳۲۱ھ کو عبد اللہ خاں مرحوم ولد وزیر خاں فوت ہوئے
شہر دہلی فراشخانہ -

(۶۱) بسم اللہ (ظفری) ای دل نبالہ ساز کہ لخت جگر نماند وی دیدہ خوں ببار کہ نور نظر برفت
واحسرتا کہ بتاریخ یکم ستمبر ۱۹۱۴ء مطابق ۱۰ شوال ۱۳۳۲ھ بروز سہ شنبہ برخوردار
لخت جگر میاں عزیز الرحمن نے آغوش تربت میں استراحت کی انا للہ وانا الیہ راجعون

(۶۲) بسم اللہ - ھو الباقی - قطعۂ تاریخ وفات محمد حفیظ اللہ خاں خلف محمد غلام رسول
ٹھیکہ دار دہلوی

جبکہ نور نظر غلام رسول گیا دار فنا سے سوے بقا حیف معصوم کی تھی عمر قلیل پانچ سال دو ماہ ایک ہفتہ
تھی اُنتیس ماہ رجب کی بدھ کا دن وقت صبح انور تھا تھا سراپا وہ رحمت باری شرم داد و صفا کا بیاں ہوگیا
جو کوئی آئے اسکے مدفن پر - فاتحہ پڑھکے یہ کہے اللہ - دے خدا اس کے والدین کو صبر - کریہ تھا جن کا غنچہ سربستہ
فکر تاریخ کا تھا اس کی سعید و غیب سے یکبیک یہ آئی ندا - تھا ہمارا - بلالیا ہم نے اور جدائی کا رنج سب کو کھا
اس کے ماں باپ نے تڑپ کر بس
یہ کہا - آہ پسر حفیظ اللہ

(۶۳) بسم اللہ - از جہاں رفت چو آں سید الطاف حسین چشم از دیدن نیرنگی عالم بست
بہر تاریخ چو از پیر خرد پرسیدم گفت در خلد مقامش پی تاریخ خوش است ۱۳۳۲

(۶۴) ھو اللہ - قبر ممتاز بیگم مبرور - آنکہ بودہ ہمہ ستودہ صفات جود صبور بودہ جانکہ مولودش ۱۳۱۹ ہجری
سال گو - وقف مستعار ثبات ہاتف غیب از سر افسوس
باغم و رنج گفت سال وفات

(۶۵) مسقف حجرے میں اوپر سنگ سرخ کی سل پٹی ہوئی - اللہ اکبر - ھو الغفور الرحیم
فاطمہ جان حافظہ ہم حاجیہ عصمت نژاد چوں ازیں اندوہ خانہ شد سوے باغ بہشت

بہر سالِ رحلتش خامہ سرِ لوح مزار درجناں جاوید با خیر النسا بادا ایں نوشت ۱۲۹۴ھ

(۶۶ و ۶۷) چبوترے سے احاطے کے اندر صحن کے تین کونوں پر بڑے بڑے نیم کے درخت سایہ کیے ہوئے ہیں دو قبریں ہیں (۱) ۷۸۶ "وفات ماسٹر محمد سلطان خاں ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ" (۲) ھو الباقی

بمرگ ناگہانی چوں قضا کرد	جمیل الدیں جوانی نازنینی
غنی بنوشت تاریخ وفاتش	بجنت رفت آں پاکیزہ دینی

بتاریخ بست و ہفتم شہر ربیع الاول ۱۳۱۰ھ یوم پنجشنبہ وفات یافت

(۶۸) لوح سنگ مرمر۔ بسم اللہ۔

ای چرخ ہائے ہم سے جفا آج کس لیے	ہم زندہ اب تلک تھے امید بہار پر
اب کب تلک جیئیں گے بس اب وقت ہی خیر	جیتے تھے اب تلک تو دنوں کے شمار پر
لختِ جگر کو خاک میں تو نے ملا دیا	یہ ظلم ناروا تھا اس امیدوار پر
حور فلک کو ہائے جہاں سے اٹھا لیا	آیا نہ تجھکو رحم مرے حال زار پر
نور جہاں سے آج جہاں میں تھا اک فروغ	وہ بھی گیا جہاں سے لحد کے کنار پر
تاریخ عیسوی شب تیرہ ہی کیا لکھوں	آج اک چراغ بھی نہیں اس کے مزار پر
تمیں روشن آرا بیگم عمر چودہ سال کی	مرقد ہی یہ انھیں کا زمیں سبزہ زار پر

بتاریخ ۸ ماہ رجب ۱۳۲۰ھ ہجری روز شنبہ وفات یافت۔

(۶۹) خواجہ نور احمد خاں نقشبندی فرزند امام جعفر صادق نبیرہ سید احمد کاشانی بست و یکم ماہ ذو الحجہ ۱۲۴۶ ہجری

(۷۰) کل شی ھالک الا وجھہ۔

ہزار سہ صد و بست و دوازسن ہجری	دو شنبہ بست و نہم از رجب بخلد و عدن
برفت گفت لا الٰہ الا اللہ	فدائی حضرت حق حاجی امیر حسن

(۷۱) بسم اللہ۔ کلمہ۔ حافظ شرف الدین صاحب پیش امام مسجد ۲۷ تاریخ ذیحجہ ۱۲ ۱۳۔

(۷۲) تاریخ وفات۔ خواجہ امداد حسین انصاری پانی پتی سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ۱۳۱۱

(۷۳) سنگ باسی نہایت خوب صورت کٹہرے دار قبر۔ یا غفور یا ودود ۱۳۰۳۔ بسم اللہ۔

قطعۂ تاریخ بیادگار حضرت مخدوم سید امیر علی شاہ گلیم پوش نی السیفی چشتی وقادری رحمۃ اللہ علیہ

صوفی با صفا تھے وہ درویش باکمال
حافظ یہ اُن کا مصرع سال وفات ہے
رحلت جہاں سے کر کے کیا خلد میں قیام
سید امیر شاہ علے اتقیا امام
۱۳۲۵ھ

(۷۴) تاریخ وفات سلطان بیگم صاحبہ۔
نورجہاں کی والدہ سلطان بیگم آج
واں گنج خوبرو ئی چھپا زیر خاک و خشت
مقطع میں دو طرح سے عیاں ہے سن وفات
۱۹۰۸
دختر سے ملنے آئیں لحد کے کنار پر
یا اشک بہ رہے ہیں رخ گلعذار پر
اول جو ہو نظر تو فقط نقطہ وار پر
۱۹۰۸

چوتھی اگست اور چھپا ماہ اے فروغ
(دیگر) آج مرگ مادر نورجہاں کا چار سو
سال تاریخ وفات اُس کا لکھو تم یہ تفسیر
(۷۵) اس جہاں سے جب محمد نور مرد کابلی
غیب سے آئی ندا لکھ سال ہجری ای عزیز
کیا دو چراغ بھی نہیں اُن کے مزار پر
ایک عالم میں نظر آتا ہے ماتم جابجا
درد غم رنج و محن سلطان بیگم نے دیا
شوق حق میں موت سے غش کھائے پڑا ہی پر گئی
الہ الہ اللہ و داخل بجنت اب ہوئی

(۷۶) قرولی کے نواب کا تکیہ
مرزا اکبر بیگ نواب قرولی کا مزار اس تکیہ میں ہے جس کا محافظ اب فیروز شاہ نقیر ہے۔ اس میں کئی قبریں انھیں کے خاندان کی ہیں مگر کسی پر کتبہ نہیں ہے۔

(۷۷) عارف حسین رسول شاہیوں کا تکیہ
سنگ سُرخ کا ایک ہشت پہل برج قدیم بنا ہوا ہے جس کے اندر ایک ہی قبر ہے یہیں ایک قدیم زمانے کی ایک شکستہ مسجد بھی ہے۔

(۷۸) ناگ پھنی کا تکیہ
یہ تکیہ میاں حبیب حسین کا ہے جو دہلی کے شاہزادے تھے جیپور میں مرے اور ہاتھی خانے میں ان کا مزار ہے

(۷۹) کلو کا تکیہ
یہ قبر مولوی ابو المنصور امام فن مناظرہ کی ہے جو فراش خانے میں رہتے تھے۔ آپ خان بہادر ڈپٹی مولوی ناصر علی صاحب کے والد ماجد تھے۔ بڑے محدث فقیہ اور مفسر تھے جن کے ہاں نصرت المطابع تھا کتبہ ایسا خراب لگایا ہے کہ چھاپے خانے کی سِل پر لکھ دیا سارے حرف اُس کے اُڑ گئے بہت کوشش کی مگر پورا پڑھا نہیں گیا۔ جو پڑھا جا سکتا ہے وہ یہ ہے:۔

طغری جس میں محمد اور منصور دو لفظ نکلتے ہیں۔ بسم اللہ ۶ لوح مزار سید ابو المنصور

بر مزارم نہ چراغے نہ گلے می باید ای عزیزاں فقط الحمد و گلے می باید

کردہ ام خدمت اسلام بدور آخر بامن امداد ز الرسلے می باید

... ادب ... سپہر خموش طرح بریں جانہ شور سے نہ غلے می باید

ہر کہ در دعوت اسلام تگ و دو دارد بر صراطش ... دولت نہ پلے می باید

مست از یک نظر لطف خدایم منصور در بہشتم غزکتابے نہ غلے می باید

(۸۰) بسم اللہ۔ وہ چہ از چرخ کہن بیداد بر بنیاد شد خانہ ویراں زبد گشت و شرع بے بنیاد شد

آہ بنام محمد صاحب خلق حسن رفت ازیں عبرت سرا و ملک دیں برباد شد

ہفتم از شہر ربیع الاول و یوم الاحد کرد منزل در جناں واز بند غم آزاد شد

خلد شد ہر ہفت از جوش نشاط مقدمش درگروہ قدسیاں شور مبارکباد شد

مصرع سال وفاتش ریخت از کلک عزیز مہر دیں افروز طالع در جناں آباد شد

۱۳۴۲ھ

(۸۱) بسم اللہ۔ تاریخ وفات حسرت آیات ڈاکٹر مرزا محمود بیگ مرحوم

مرزا محمود بیگ ڈاکٹر آہ بود ار سلوے عہد در دنیا

اولین ربیع و شش تاریخ روز جمعہ شدہ سوے عقبی

طب یونانی دیدہ ڈاکٹری در ہمہ داشت او ید طولی

لیک افسوس ہیچ تدبیرے پیش اصلا نرفت پیش قضا

مضطر زار گفت سال وفات رفتہ حقا بجنت الماوا

۱۳۴۸ھ

(۸۲) عقب مسجد سہ برجی — شاہ امان درویش دہلوی المعروف لعل شہباز قلندر قدس سرہٗ از بزرگان سلسلۂ مداریہ قلندریہ بود و سلسلہ کہ از وے جاری شد بہ لعل شہبازی مشہور است

(۸۳) کلمہ۔ اہل حرفہ نامور عبد الکریم جنکی دہلی مالی واڑہ میں دکان تھی۔ دفعتہ وہ حج بیت اللہ گئے آئے حاجی کرکے حج اپنے مکاں۔ پھر حالت میں نہ دنیا کے پھنسے۔ اقربا سے مل کے لی راہ جناں نو ربیع ثانی کا ہی حادثہ۔ جسکے غم میں گھر کے ہیں خورد و کلاں۔ لوح کے بانی میاں عبد الوہاب فاتحہ کے واسطے ہے یہ نشاں۔ لکھ عزیز دہلوی سال وفات۔ خلد میں نواب پٹوہ بیگماں۔

۱۳۱۴ھ

(۸۴) بسم اللہ۔ کلمہ تاریخ وفات تجمل شاہ خاں عرف نواب دولہا خاں صاحب ساکن ریاست رام پور

محلہ کھیر قلندر خاں ۔ ۱۰ ر محرم ۱۳۳۴ھ روز جمعہ مطابق ۱۹ ر نومبر ۱۹۱۵ء

قطعہ اجل آگئی تجھکو غربت میں حیف　　جواں مرگ جانباز حسرت نصیب
رہی آرزو آخری دید کی　　رہے منتظر سب عزیز و قریب
قضا کا نہیں کوئی آخر علاج　　یہاں سب ہیں عاجز حکیم و طبیب
محرم کی دسویں تھی جمعہ کا دن　　مہینا بھی دن بھی عجیب و غریب
سن رحلت افسوس محمود نے　　لکھا - "واے نواب دولہا غریب"

(۸۵) بسم اللہ کلمہ - تڑپنا مرا خاک پر دیکھ لینا　　ذرا جانے والوں ادھر دیکھ لینا ۱۳ ۴۴
میں سوتا ہوں مرقد میں شان الٰہی　　طفیل کرم اک نظر دیکھ لینا

تاریخ وفات رحمن بخش مرحوم ۱۰ ر شوال ۱۳۲۵ھ یوم پنجشنبہ عمر ۲۵ سال یہ شخص خادم مولوی اسلم صاحب کا ہے -

(۸۶) بسم اللہ - ھو الحی القیوم خاک ہو عمر رواں کا اعتبار　　اس کو سب کہتے ہیں عمر بے وفا
ہستی فانی ہے یہ ناپائدار　　آدمی پانی کا ہے اک بلبلا
حیف ہے صد حیف ہے عبدالمجید　　ہو گئے ہیں راہی ملک بقا
ماسٹر تھے آپ اک سکول کے　　آپ تھے علم و ہنر کے رہنما
آپ کے اخلاق کی اوصاف کی　　شہر دلی میں تھی شہرت جابجا
کیوں نہ پھر احباب اپنے سر دھنیں　　یار جب دنیا سے ایسا اٹھ گیا
آئی ہے بیوقت مرگ ناگہاں　　شق کلیجہ کیوں نہو ماں باپ کا
طے کیئے تھے عمر کے چوبیس سال　　یک بیک جو کوس رحلت بج گیا
تھا محرم کا مہینا سر بسر　　ذکر ہو تیئسویں تاریخ کا
سنہ ہجری تیرہ سو تیئس تھے　　حادثہ جانسوز جب واقع ہوا

(۸۷) لوح سنگ مرمر - ھو الغفور -
فاتحہ مرقد حسرت پہ تو پڑھتے جاؤ　　عرض ہے اُن سے جو اس رہ میں گزرنے والے
اجل آگئی تجھ کو غربت میں حیف　　جوانمرگ جانباز حسرت نصیب
رہی آرزو آخری دید کی　　رہے منتظر سب عزیز و قریب
قضا کا نہیں کوئی آخر علاج　　یہاں سب ہیں عاجز حکیم و طبیب

مرقد پر حسرت بی فیروز بیگم منظفر نگری کہ در عالم شباب بعمر ۱۹ سال ایک طفل شیر خوار چھوڑ کر ۳۰ جون ۱۹۱۷ء کو ماہ رمضان المبارک میں عالم غربت میں داغ جدائی دیا۔ ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد۔

دعا گو۔ م۔ علی۔ یاد آتی ہے مجھے تیری وفا تیرے بعد

(۸۸) اللہ

دریغا حسرت مرگ جوانی — چنیں دردیست کو را نیست درماں
ہمیں نیشے رگ جاں می خراشد — کہ شد ایں حورو ش در خاک پنہاں
برسم دلبری مختار جاں بود — گر مختار جانہا بر واز وجاں
بوقت ظہر روز چار شنبہ — دوم آخر جمادی رحلتش داں
بجنت ہمنشیں حور عیں شد — ترحم کرد بر وے عفو یزداں
چو جستم از وفاتش سال ہجری — ندا آمد نثار ناز و حیراں
نظر کن از سر اکرام خالق — بگلزار جناں بینی خراماں

(۸۹) تمام بخط عربی۔ ھو۔ محمد بی بی آں کان فضیلت — کہ در فن حقایق ذو فنوں شد
ازیں گلشن ولش نگرفت ناگہ — اجل سوئے بہشتش رہ نموں شد
ز حافظ خواستم تاریخ فوتش — روانی آہ از حافظ بروں شد

(۹۰) تمام بخط عربی۔ یا غفار بحق لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ بسم اللہ صاحبہ قبر نے بحکم رب العالمین مالک یوم الدین ملک فنا سے ملک بقا کو ہجرت کی انا للہ وانا الیہ راجعون

واقعہ۔ واقعہ بست و چہارم شہر شعبان پنجشنبہ ۱۳۰۶ھ

(۹۱) ھو العزیز۔ مدفونہ ہذا المرقد۔ قطعہ تاریخ قتل بی نظیر جہاں مسماۃ نظیر جان کہ با فساد عبد الحی نامراد از دست بیداد نراین راؤ خانہ برباد نامراد نہ جاں داد۔

صبحدم مرغ چمن با گل نو خاستہ گفت — ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست برنجیم و لے — ہیچ عاشق سخن تلخ بمعشوق نگفت
یاد دارم کہ شنید ایں سخن ور دح نظیر — ہمچو زلف سیہ خویشتن از غم آشفت
وز دو نرگس بگل تازہ فشاند آب و یکے — آہ سر داز دل پر درد برآورد و بگفت
ہیچگہ ہمچو من از دست جفائے عاشق — ہا ہیچ معشوق ستمدیدہ بخاک و خوں خفت
پیش عشاق بہ بد گفتن و آنہم از ناز — ہیچ معشوق چو من ترک جہاں جاں گفت

پیکر دیو بہ پیش نظر خلق ہنوز ظرفہ حالیکہ پری روئے پس پردہ نہفت
بارے اودر دل غمزدہ بگفت مرا اشک الماس صفت گوہر جان و دل سفت
گفتم آخر کہ تو کی رفتی ازیں غم خانہ ای کہ جاروب غمت خانۂ دل پاک برفت
تاکہ تاریخ بگویم کہ دریں جا ہر کس ہر چہ بشنفت ز حال تو پریشان بشنفت
جان بے تن ز سر گریہ و آہ و زاری قصۂ غصہ ہر کرد کہ جاں رفت بہ مفت

(۹۲) شیخ ابراہیم ذوق ۱۲۶۹ کا مزار ایک احاطے کے اندر ہے جس میں سات قبریں اور ہیں۔ نقل کتبہ شیخ صاحب کے بیان میں دی گئی ہے۔

(۹۳) ھو الغفور۔ قطعۂ تاریخ وفات البخانہ خلیفہ سید محمد محسن صاحب متین مجسٹریٹ پٹیالہ

چو بنت محمد علیخان ذیشان کہ بود انجمن آرا بیگم بنامے
ازیں دار دنیائے دوں کردہ رحلت بفردوس اعلیٰ نمودہ مقامے
شنیدہ متین سال وفاتش ز ہاتف کہ آں یافت قصر دار السلامے

(۹۴) بسم اللہ۔ کل من علیہا فان الخ رباعیات از منیر دلگیر رنجور ۱۷ ۱۳ مہجور نالاں و پریشاں

منال بسر قبرم ز ہجر من ایجاں کہ مردہ نیستم و خواب میکنم اینجا
دراں زماں کہ پئی من بتربتم آئی ہمیں بخواہ کہ وصلم نصیب تو بادا

ولہ۔ خدا کیواسطے تربت پہ اسکی اے حضرات جو آسکے ہو تو ذرا عرض یہ سنتے جاؤ
کسی کلی پھول تہ خاک آج ہے پنہاں اُٹھا کے ہاتھ ذرا فاتحہ پڑھتے جاؤ

سال وفات۔ یہ لکھ سال رحلت تو اے منیر کہ یارب بحق نبی بخش دے
لوح سنگ سر ہر تربت پاک بی بی اہلیہ حافظ احمد نورانی

(۹۵) حیف صد حیف کہ سجاد علی رفت ازیں دہر سوئے دار سرور
ہاتف غیب ندا زد ز فلک سال تاریخ وفاتش مغفور ۱۳۲۶
تاریخ پیدائش ۲۰ شوال ۱۳۲۳ھ سال وفات ۲۰ ربیع الاول ۱۳۲۶ھ

(۹۶) بخط نسخ ھو الغفور وفات زوجہ محفوظ علی قیاسی مجھی ہے خاک کے پردہ میں جا کے مستورہ
سن وفات یہ بہزو نے حسب حال لکھا کہ حور عین سے ملی آج جا کے مغفورہ ۱۳۲۱ھ
بتاریخ ۱۳ ماہ رجب یوم پنجشنبہ رحلت نمود

(۹۷) ھو الباقی بکلمہ حسرتا حاجی عظمت اللہ سانپ نے کاٹا وہ شہید ہوا

فکر تاریخ کرکے یاس نے آہ — اوسکی بخشش ہوئی یہ سال لکھا

۱۲ رجادی الثانی سنہ ۱۳۲۶ ہجری

(۹۸) اللہ الصمد ابست دوم رماہ سید صیام بود — مظہر حسین الفتہ اہل جہاں برید
مولد بہ گرہ کہ قصبہ لب گنگ واقع است — قبرش بدہلی اسے فلک این مصلحت چہ بود
الصدق نکتہ سنج بگو بہر رحلتش — از گلبن زیاض جوانی بگل بچید

(۹۹) اللہ ہو الغنی۔ چو ازیں باغ جہاں سلطانخاں — سوی فردوس سعلی بشتافت ۱۲۹۴ ہجری
سال نقلش سر لوح تربت — شد رقم جنت فردوس بیافت

(۱۰۰) ہو الغفور۔ آمد از سروش غیب تعشی خستہ راندا — وای کزایں جہاں بدر رفت محمد النسا ۱۲۹۶ ۱۲۸۸

بعمر ہشت سال ۱۵ ذیقعدہ شب شنبہ

(۱۰۱)[1] تمام بخط نسخ

بخشو کا تکیہ

یا اللہ

بہر تاریخ التجا کردم — بجناب کریم رب غفور
گفت از غیب ہاتفی یارب — باد با مہر فاطمہ محشور

۱۱۵۰ طاق

برحمت ابدی پیوستہ

(۱۰۲)[2] محاذ لوح - غفر لہ۔ بسم اللہ قطعہ تاریخ وصال شاہ الہی بخش صاحب مغفور از فکر بلیغ حکیم سید محمود علی شاہ متوطن بچھرایوں ضلع مراد آباد خادم خاص شاہصاحب ممدوح۔

شاہ من حضرت الہی بخش بود — عارف وکامل و ولی و متقی
آنچہ میفرمود می گشتی ہماں — از لسان الحق ہمیگفت آں ولی
چوں وصالش شد بذات ذوالجلال — حاصلش آمد تمنا سیے ولی ۱۳۱۷
گفت ہاتف سال بزم وصل او — خوش خراماں رفت در باغ علی

[1] یہیں ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ [2] یہ مزار ایک وسیع اور بلند چبوترے پر ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بزرگ پانی دم کرکے دیتے تھے اس سے شفا ہوتی تھی اس سبب سے آبخورہ شاہ مشہور ہے۔ ۱۲ لوح مزارات کے کتبوں کی نقل میں پابندی رسم خط کی نہیں کی گئی جیسا لکھا ہوا تھا ویسا ہی لکھ دیا گیا ہے۔ ۱۲

(۱۰۳) بخط نسخ ولہ - اللہ اکبر! حیف صد حیف کہ آں عیسیٰ دوراں بفلک رفت
بہ عقب لوح کز فیض دمش بود ہمہ اہل جہاں شاد

آں ہادی حق خضر رہِ دین الٰہی — کز مقدم او گلشن جنت شدہ آباد
ملہم پی تاریخ وصالش چو فرورفت — ملہم زرہ گوش دل از غیب ندا داد
آں بندۂ توحید و فدائی شریعت — مرغوب خدا آمد و مرغوب نبی باد

(۱۰۴) اللہ اللہ الباقی (مدفن) من کل فانی
بسم اللہ حضرت شیخ محمد قدرت اللہ ازیں جہان فانی بعالم جاودانی رحلت فرمود
یاذوالجلال والاکرام

قدرت اللہ رفت چوں سوئے عدم — نکہت رحمت بیامد فوج فوج
کلک گلچیں سال تاریخش نوشت — خلد شد جاگیر آں اعز واوج

(۱۰۵) پسر جب مجھسے میرا جدا ہوگیا — تو داغ جگر پر الم ہوگیا
چراغِ چمن ہائے گل ہوگیا — تو برباد خانہ چمن ہوگیا
چھپا نور چشم جو آنکھوں سے مری — تو آنکھوں میں عالم سیاہ ہوگیا
محمد احمد خاں اس جہاں سے گزر گیا — تو بیان الم بس ختم ہوگیا
تاریخ ۲۵ ماہ ربیع الثانی ۱۲۹۹

(۱۰۶) بسم اللہ آہ چوں زوجہ بشیر احمد — رفت از دہر سوے دار فنا
ھوالحی القیوم گفت تاریخ رحلتش رونق — بی بی نیک حیف کرد قضا

(۱۰۷) شملے والے عبداللہ صاحب کی باغیچی

عقب امپریل آئل سوپ اینڈ جنرل ملز کمپنی لمیٹڈ وعقب دواخانہ امراض متعدی - اندرون باغیچی ایک خوب صورت سی کٹہرے دار قبر پر سنگ مرمر کی لوح اس کتبے کی لگی ہوئی ہے اور یہاں ایک مسجد بھی ہے -

ھوالباقی

تو عزم سفر کردی ورفتی ز بر من — بستی کمر خویش وشکستی کمر من
اے وریناکہ میرا مان اللہ — رفت ازیں جا سوئے عدم آباد

روز رحلت کہ از صفر یک بود خانہ پر شد ز شیون و فریاد
گفت رضواں بجو پدر وحش را مسکن ایں بکاخ جنت باد

(۱۰۸ و ۹) قطب روڈ کے کنارے (۱) شیخ المشائخ میاں شیر علی صاحب الحسن گڈی رحمت اللہ علیہ وصال تاریخ × × × سنہ ہجری نبوی مرحمت مرقد ہذا تاریخ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ ہجری نبوی ۲۴ رجنوری ۱۹۱۹ء خادم پیرجی مہر علی شاہ حسن گڈہی ۔ (۲) بسم اللہ ۔ آستانۂ قطب الاعظم محبوب عالم معدن الجود والکرم مخزن فیض اتم شیخ المشائخ حضرت پیرجی امیر علی شاہ صاحب عامل وکامل اولیاء قادری الحسن گڈہی رحمۃ اللہ علیہ کہ خلافت از غوث دوران قطب زمان قطب الاقطاب حضرت سید شاہ طہٰ قطب الدین مخدوم جہانیانی قادری الکوتانوی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ وصال ۲۵ ر ذیحجہ یوم پنجشنبہ ۱۲۷۰ھ ہجری نبوی عمر ہشتاد وہفت سال سال بود نور اللہ مرقدہ ۔ مرقد ہذا احد امجد فقیر مہر علی عفر لہٗ ۔ مرقد شریف کی تعمیر تاریخ ۲۴ ر ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ نبوی خادم پیرجی فقیر مہر علی ولد میاں پیرجی مہربان علی شاہ صاحب ساکن قصبہ حسن گڈھ ضلع رہتک ۔

تکیہ دین علی شاہ شب و روز جذب کی حالت میں رہتے تھے ۔ اکثر موتیا کھان کی طرف پھرا کرتے تھے اور وہیں کسی گوشے میں پڑ رہتے تھے ۔ پھر قدم شریف کے نواح میں ایک گنبد میں رہنے لگے ۔ بسبب کمال ازخود رفتگی کے برہنہ مطلق رہتے تھے اور ہجوم خلایق کے وقت کلمات بے صرفہ زبان پر بہت جاری رہتے تھے لیکن اہل حاجات جب اُن کلمات کی طرف توجہ کرتے تھے تو وہ باتیں جو اہل ظاہر کے نزدیک طائل اور بے محل ہیں بعینہ اُن سب کے مطالب اور حاجات کا جواب ہوتی تھیں اور طرفہ یہ کہ سوالات مختلف کا جواب اُنھیں باتوں سے ہر ایک کو حاصل ہوجاتا تھا اور اکثر اوقات خوارق عادات آپ سے ظاہر ہوتی تھیں ۔ یہاں ایک مسجد بے چھت کی ہے محض چبوترا بنا ہوا ہے اور اُسی کے صحن میں آپ کا پختہ مزار ہے جس پر بخط عربی "دین علی شاہ مجذوب رحمۃ اللہ علیہ" لکھا ہوا ہے ۔ چبوترے کے نیچے تہ خانہ ہے جس کے اندر کئی پختہ قبریں ہیں ۔ گنبد کا پتہ نہیں چلتا کہ کس کا ہے مگر طرز عمارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت قدیم ہے اس میں بھی دو قبریں ہیں ۔ بجانب مشرق

نقشہ درگاہ قدم شریف

توشہ خانے کی بیرونی دیوار میں سنگ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ لگا ہوا ہی:۔
بانی ایں بنا و مولف ایں تاریخہا مشیر خاص مدار المہام راجہ دینا ناتھہ بہادر راجہ کلانور ملازم سرکار دار السلطنت لاہور۔

تاریخ اول

پی تقدیم امر زین علی شاہ — بنای تکیہ و مسجد لحد چاہ
نمودہ راجہ دینا ناتھہ تعمیر — کہ گرد و خدمتش مقبول آن شاہ
خرد تاریخ تعمیرشس رقم زد — زفیض حق بود ایجاب درگاہ
۱۲۹۴ ہجری

تاریخ دوم

از پی تقدیم امر حضرت کون و مکاں
یعنی آں عارف کہ آمد دین علیشہ اسم آں
کرد تعمیر بنای مسجد و چاہ و لحد — راجہ دینا ناتھ از صدق ارادت بیگماں
سال تاریخش موذن بانگ زد بی ربی ہم — کامیاب از درگہ او جملہ مخلوق زماں
۱۲۹۴ ہجری

قدم شریف یا مقبرۂ فتح خاں ۱۳۱۳ء ۷۷۶ھ

بر لوح سر تربت خود نقش تو کندیم
تا روز قیامت سر ما و قدم تست

لاہوری دروازے کے جنوب میں کوئی ڈیڑھ میل کے فصل سے یہ درگاہ بہت نامی گرامی ہی جو درحقیقت شاہزادہ فتح خاں کی قبر ہی اور اس پر نقش قدم جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لگا ہوا ہی۔ یہ قدم شریف معجزات نبوی سے بہت صحیح و سندی ہی اس کو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت خلیفہ عہد فیروز شاہ میں مکۂ معظمہ سے دہلی تک اپنے سر پر رکھ کر لائے تھے۔ ۷۷۶ھ ۱۳۱۳ء میں جب شاہزادہ فتح خاں کا انتقال ہوا جس کو سلطان فیروز شاہ تغلق بہت چاہتا تھا یہ قدم اُس کی چھاتی پر لگا دیا اور اس کے گرد مدرسہ اور مکانات اور مسجد بنادی اور متصل چاردیواری کے ایک بہت بڑا حوض بنوادیا۔ یہ ساری عمارت پختہ بنی ہوئی ہی۔ جس کے سات دروازے ہیں جن میں سے دو اب بند ہیں۔ یہ عمارت ایک مستطیل چبوترے پر واقع ہی جو ۸ فٹ ۳۰۶ ہی اور ۵½ فٹ بلند۔ اس کا صدر دروازہ مشرق میں ہی مشرق اور مغرب میں پختہ دالان ہیں جن کے چاروں کونوں پر چار برجیاں ہیں۔ ان دالانوں میں فیروز شاہ تغلق خاندان کے اور لوگوں کی قبریں ہیں اور پھر آگے چل کر کچھ تاجر پیشہ لوگ بھی جو یہیں آس پاس

رہتے تھے دفن ہو گئے۔ ان دونوں دالانوں کے بیچ میں ایک بے قاعدہ مستطیل احاطہ ہی جس کی دیواروں میں ساڑھے چار فٹ اونچے چوکے کھڑے کر دیئے ہیں۔ اندرونی احاطے کی جنوبی دیوار میں آنے جانے کے لیئے ایک چھوٹا سا دروازہ لگا ہوا ہی جس کے بعد ایک پٹی ہوئی ڈیوڑھی ۸ گز لمبی اور ۹ گز چوڑی ہی جس کی چھت ہر دو طرف کی دیواروں کی طرف ڈھلواں چھپر نما ہی۔ یہ چھت چھبیس ستونوں پر کھڑی ہی۔ چھت کے چاروں کونوں پر چار چار در کی پست برجیاں ہیں۔ چھت کے اطراف چوڑا چھجا ہی۔ اس مسقف حصے کے شمال میں فتح خاں کی قبر ہی جس پر ایک چپٹا سنگ مرمر کا تعویذ نو فٹ لمبا۔ ساڑھے چار فٹ چوڑا اور ڈیڑھ فٹ اونچا چھوٹے سے حوض کی شکل کا ہی اور اس کے بیچ میں تختۂ سنگ قدم شریف ساڑھے تین فٹ لمبا اور ڈہائی فٹ چوڑا رکھا ہوا ہی جس پر پورا نقش قدم مبارک کا نمایاں ہی جو عین سینے پر ہی۔ جو پاتی اور پھول اور کبھی کبھی دودھ اور شربت سے لبالب بھرا رہتا ہی۔ جس میں سے مجاورین بطور تبرک زائرین کو دیتے ہیں اور دور دور لیے جاتے ہیں اور یہ شعر پڑھتے ہیں؎

ای خضر دل اس کے پینے سے نجات ہی۔ پانی قدم شریف کا آب حیات ہی

حقیقت میں حوض کوثر اس حوض سعادت ماخذ کا ایک قطرہ ہی اور چشمۂ حیوان اُس عین العیون کرامت کا ایک رشحہ۔ قبر کے اطراف کسی شخص عقیدت منش منشی محمد یوسف نے سنگ مرمر کا دو فٹ اونچا کٹہرا بنوا کر اس کے گرد یہ اشعار کندہ کرائے ہیں حوض میں ہر وقت پانی بھرے رہنے سے یہ اشعار مٹ مٹا گئے ہیں اور اب بہ مشکل پڑھے جاتے ہیں:۔

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پاے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

چو یوسف در قدم گاہے محمد — محجر را بہ توفیق خدا ساخت
پی تاریخ اتمام بنا یش — شنیدم ہاتفے گفتہ "بجا ساخت"
۱۰۶۷ھ

اور پیشانی دروازے پر یہ شعر مرقوم ہی:۔

تسلیم سرافراز چو با یک قدم شریف — تاریخ بر آمد "بایک قدم شریف"

اندرون احاطہ ایک قبر ہی جس کا پتہ نہیں کہ کس کی ہی۔ اس گنبد کے بناتے کے تھوڑے عرصے کے بعد ایک مسجد بھی بنائی گئی۔ جس کو مسجد "چورا یا قدم شریف" کہتے ہیں اور خان جہاں کی مسجدوں کی وضع قطع کی ہی۔ درگاہ کے کئی دروازے ہیں اُن میں سے ایک دروازے پر یہ اشعار کندہ ہیں:-

نبی گم کناں رہنمائے محمد	ہدایت دہندہ ہُدائے محمد
خوش آں مدرسہ منبر دبار گاہ	کہ در وے بباشد ثنائے محمد
شکستہ دلاں رہ شدہ مرہمے	دل دردمنداں دوائے محمد
عرش گشتہ در زیر پائے او مسلّم	ہر آں کو شدہ خاک پائے محمد
منم از سگان سگِ کوئے او	شدہ شیرواں از گدائے محمد

عرف شیرواں[1] خاں ابن ریحان حبشی ساری بود بتاریخ
بست سوم ربیع الثانی ۱۰۸۲　ایں ابیاتہا را در تحریر آورد

یہاں کی خدمت اکثر لوگ موجب حصول سعادت اور مایۂ افتخار سمجھتے تھے چنانچہ دروازہ سومی کی پیشانی پر یہ کتبہ موجود ہی:-

محمد سیر تحویلدار	لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ۱۱۱۴	عالمگیر شاہی چینی خانہ

اب یہ مقام زیارت گاہ خاص و عام ہی۔ ہر سال ماہ ربیع الاول میں بارھویں تاریخ تک بہت دھوم دھام سے میلہ لگا رہتا ہی۔ تمام خلقت جمع ہوتی ہی۔ پنکھے چڑھتے ہیں۔ دور دور کے درویش اور فقرا اکثر آستانہ بوس ہوتے ہیں۔ ہزاروں ملنگ آتے ہیں اور دھمال کرتے ہیں۔ اکثر علما و مشایخ بھی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں۔ یہ مقام بھی دہلی کے واسطے اور شہروں پر

[1] اوائل عہد سلطنت عالمگیر بادشاہ میں ایک شخص شیرواں خاں نامی حبشی تھے جن کا ذکر تذکرۂ اولیائے دہلی میں اس طرح لکھا ہی کہ "محب درویشاں مخلص خدا اندیشاں شیرواں خاں حبشی عزیز صالح و صاحب درد بود۔ ہمواره تیمار داری فقرا و محتاجان و مسکینان و مستمندان می نمود و گوئے سبقت در رسیدن خدمت صاحب دلاں از سائر اقرانِ خود بر بود۔ بزمانیکہ داشت شعر ہم می گفت۔ چنانچہ ایں ابیات نعت بدروازۂ نقش قدم ثبت نمود و در ۱۰۸۳ھ رخت حیات بر بست رحمۃ اللہ علیہ"

بڑا شرف و مباہات ہی کہ یہ مکان سعادت توامان شریف مقدم خیر البشر سے قدم اشرف اخضر پر رکھتا ہی بلکہ یہ وہ نقش پا ہی کہ عرش بھی اُس کے نیچے فرش ہونے کو اپنا فخر جانتا ہی۔ حالات فیروزشاہ میں منقول ہی کہ یہ بادشاہ بڑا دین دار تھا اور علماء و فقراء سے نہایت عقیدت و ارادت رکھتا تھا چنانچہ تفصیل اُس کی خیر جاریہ کی کتب تواریخ میں اس طرح مندرج ہی کہ اس نے اڑتیس برس چند ماہ کے زمان سلطنت میں چالیس مسجدیں۔ تیس مدرسے۔ بیس خانقاہیں۔ دو سو رباط۔ تیس شہر۔ سو حوض۔ چالیس بند آب۔ سو کوشک۔ ڈیڑھ سو کنوئیں۔ دس حمام۔ پانچ دار الشفا۔ دس منارے۔ سو مقبرے۔ ڈیڑھ سو پُل۔ باغات بے حد و بے شمار بنوائے۔ جب کہ بادشاہ کو خبر تشریف آوری حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمتہ اللہ علیہ کی ملی استقبال کو حاضر ہوا اور قدم مبارک کو اپنے سر پر رکھکر شہر میں لاکے[1] اور حضرت مخدوم کی خدمت سے سعادت دنیا و آخرت حاصل کی بعد تھوڑے دنوں کے شاہزادہ فتح خاں نے وفات پائی تو وہ نقش قدم اشرف اپنے جگر گوشہ کی تربت پر تیمناً و تبرکاً رکھا قدم رسول کی نسبت مختلف اقوال ہیں یہ امر مختلف فیہ ہی کہ معجزہ رسول اکرم کا تھا یا نہیں چنانچہ اس پر کئی رسالے لکھے گئے ہیں جن میں ایک رسالہ "سیف المسلول علی من انکر اثر قدم الرسول۔ قاری محمد فرید الدین شہید نے لکھا ہی۔ اور ایک اردو کا رسالہ" الاستشفاع والتوسل

[1] انتخاب از تولیت نامۂ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کہ در عہد حضرت ظل سبحانی شاہ جہاں بادشاہ غازی مرتب شد "مخدوم انام سید جلال الدین بخاری معروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت نبیرۂ قطب مدینہ و فرد حقیقت حضرت سید جلال الدین بخاری از ممالک حجاز نقش قدمے مظہر البرکات والاعجاز از جناب رسالت مآب سید المرسلین . . . . بہ اشارات و بشارات غیبی ولاریبی دریں دیار ہند آوردند سلطان آں عصر فیروز شاہ یک منزل پیادہ پا بہ استقبال آں شتافتہ وہم در اثنائے راہ از مخدوم درخواستہ کہ چنیں آثار کرامت بار از زیارت گاہ عوام سازد و تعمیر ابنیہ عالیہ جہت انتصاب آں پرداز دو آنچہ افنان الشان است مگر ہر کہ از ما سبقت برحلت آخرت نماید بر سینۂ او جائے ایں نقش اعظم باشد" غرض یہ کہ سلطان مذکور نے کمال عظمت و اجلال سے اس قدم فیض شیم کے لیئے ایک کوٹھے میں چھوٹا سا قلعۂ سنگیں با حصار متین و دروازہ ہائے رفیع مسجد حظیرہ طیار کرکے بہ تعظیم تمام رکھا اور بعد انتقال شہزادۂ فتح خاں کے مرحوم کے سینے پر نصب کرایا۔ یہ بھی لکھا ہی کہ فیروز شاہ نے ایک کروڑ تیرہ لاکھ نقد خلیفۂ مصر کے پاس بھیجا کر حضرت مخدوم صاحب کے ذریعہ سے منگوایا تھا ۱۲

باثار الصالحین و سید الرسلؐ حافظ محمد عمر صاحب دہلوی الملقب بہ شاہ سراج الحق نے لکھا ہے جسے اس مسئلہ کی کرید ہو دیکھ لے۔ ہم کو صرف یہ بتلانا ہے کہ بڑے بڑے بزرگ اور بڑے بڑے عالم اور باخدا لوگ قدم رسول کی بڑی عظمت کرتے تھے اور اُن کا عمل ہم جیسے لوگوں کے لیئے ایک بڑی سند ہے۔ کتاب تذکرۃ العلماءٌ میں حضرت شاہ محمد اکرم حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ باقی باللہ قدس سرہ العزیز کے حالات میں لکھتے ہیں کہ آپ ہمیشہ بوقت شب در درگاہ قدم شریف حاضر می شدند وتمام شب نزد قدم مبارک آں سرور مراقبہ می فرمودند تا آں کہ کمال ظاہری و معنوی حاصل شد"۔ حضرت شیخ الشیوخ شاہ عبدالحق محدث دہلوی اپنے بھائی کو تحریر فرماتے ہیں۔

گاہے بسوئے مقام خواجہ — آئی و شوی غلام خواجہ
آں خواجہ کی قطب چرخ دین ست — ماہِ فلک و شہِ زمین ست
آرے گزری بہ حوض سلطاں — چوں خضر بنوشی آب حیواں
بخشندہ حیات جاودانی — یارب کہ ہمیشہ زندہ مانی
بستر زاں بعرس حضرت — شیخ دوجہاں نظام ملت
گہ کردہ ز شوق پاے تاسر — آئی سوے مقدم پیمبر
بوسی قدم شریف اورا — مالی رخ خود بخاکِ آں پا
خلقش ہمہ کعبہ می شمارند — زاں اہل صفاش سعی دارند
آں کعبہ چو در مقام دہلی ست — زاں کعبہ خور و نام دہلی ست
دہلی و ہزار جاے دل کش — ہر جا چو بہشت جاوداں خوش

مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب زیارت کو تشریف لے جاتے یہ شعر فرمایا کرتے:-

ایں قدم گاہ مبارک خاکش رضوان شد — چہ عجب روح الامیں ہم بروش دربان شد

اور بھی اکابر دین متین مثل مولنا شاہ عبدالقادر صاحب و مولنا شاہ رفیع الدین برادران خورد حضرت شاہ صاحب موصوف و مولنا شاہ محمد کاظم صاحب و مولنا رشید الدین خاں صاحب و حضرت مولنا شاہ غلام علی صاحب و مولنا شاہ احمد سعید صاحب و مولنا مفتی محمد اکرام الدین خاں صاحب و مولنا حاجی محمد قاسم صاحب

وغیرہم یہ سب حضرات بکمال خشوع وخضوع وحسن ادب جاکر فیض یاب ہوتے رہے۔ اب ہم علامہ شرف الدین بوصیری صاحب قصیدہ بردہ کا ایک شعر اور دوسرا ابن خطیب محدث کا لکھ کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں:۔

(۱) اَوْ یَلْتَثِمُ التُّرَابُ مِنْ قَدَمٍ	جوں ہی آپ کے قدم مبارک کو مٹی چومتی ہی
کَانَتْ حَیَاءً مِنْ مَشْیِھَا الصَّفْوَاءِ	تو پتھر شرم وحیا سے نرم (پانی پانی) ہو جاتا ہی۔
(۲) وَکَذٰلِکَ لَا اَثَرَ مَشْیِکَ فِی الثَّرٰی	آپ کے چلنے سے مٹی پر تو نشان نہ پڑتا اور
والصَّخْرُ قَدْ غَاصَتْ بِہٖ قَدَمَاکَ	پتھر میں آپ کے دونوں قدم دھنس جاتے تھے

اس کا مجلس خانہ بہت بوسیدہ ہو گیا تھا حاذق الملک حکیم محمد عبدالمجید خاں صاحب مرحوم اور مولانا قاری حافظ محمد عمر صاحب المعروف بہ سراج الحق صاحب کی کوشش سے دوڈھائی ہزار روپئے کے صرفہ سے اس کی مرمت کرائی گئی۔ اور داہنی طرف درگاہ کے دروازے پر یہ کتبہ لگا دیا گیا ہی:۔

هوالعزیز

بسال بست ونہم بعد یک ہزار وسہ صد	زہجرت شہ کونین ہادی برحق
بدرگہ قدم پاک آں شہ لولاک	کہ ہست مرجع خلق ورشک ہر جوسق
حریم ومسجد ومجلس سرا کہ رازسیم	نمود شاہ محمد عمر سراج الحق
دوشنبہ بستم ذیقعدہ بود کانجا میں	بنائے کار بتوفیق قادر مطلق

بروح پاک مرایں صاحب نشان قدم
درود باد صباح ومسا زرب فلق

طوطی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کا مزار

قدم شریف کے پاس کلو کا تکیہ دہلی کا مشہور قبرستان ہی۔ یہیں ایک جگہ املی اور پیپل اور نیم کے تین درخت برابر واقع ہیں جن کے متصل ایک شکستہ چار دیواری کے اندر طوطی ہند شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ دہلی کے آخری بادشاہ کے استاد آرام

فرماتے ہیں اور سرہانے سنگ باسی کی لوح لگی ہے اور اُس پر یہ قطعہ کندہ ہے:-

اللہ اکبر

طوطی ہند حضرتِ اُستاد ذوق نے
لی گلشن جہاں سے جو باغ جناں کی راہ
سالِ وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر
کہہ ذوق جنتی زسرِ بخشش الہ
سنہ ۱۲۷۱ ہجری

افسوس ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں نے ہم جز اُپر کر ایسے بڑے شاعر نامور فخر ہندوستان کا مزار یوں کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے اور چار دیواری[۵] جا بجا سے گر پڑی ہے اگر جلد توجہ نہیں کی گئی اور یہی غفلت رہی تو تھوڑے ہی دنوں میں ان کے مزار کا پتہ چلنا بھی دشوار ہو جائے گا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

چوں کہ شیخ صاحب ہندوستان کے بڑے نامی گرامی شاعر تھے لہذا ہم اُن کے کچھ مختصر حالات بھی یہاں لکھ دیتے ہیں جو شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد ارشد دار فوغ تلامذہ ذوق کے قلم جادو رقم کا کرشمہ ہیں:- آپ کے والد ایک غریب سپاہی تھے اور کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے۔ نواب لطف علی خاں نے انھیں معتبر اور با لیاقت سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ صاحب ۱۱ ذی حجہ سنہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے حافظ غلام رسول شوق سے پائی جو وہیں محلے میں بچّے پڑھایا کرتے تھے۔ چوں کہ اُن کے ہاں شعر شاعری کا بہت چرچہ رہتا تھا ان کو بھی چسکا پڑ گیا۔ جو ایک بہت بڑا ثبوت الصحبۃ تاثر کا ہے کچھ دن حافظ جی ہی سے اصلاح لیتے رہے بعد شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے لیکن تحصیل علم سے غافل نہ ہوئے۔ میاں عبدالرزاق اسی محلے میں ایک ذی علم شخص تھے اُن کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے اور کئی برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور ساتھ ہی شعر شاعری کا بھی مشغلہ تھا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر بھی شاعر تھے ان میں اُن میں نوک جھوک ہونے لگی شاہ صاحب اصلاح میں پہلو تہی کرنے لگے۔ اگرچہ لوازم شاعری جو ایک سخنور کے لیے

[۵] اس چار دیواری کے اندر ذوق کی قبر ملا کر آٹھ قبریں ہیں۔ ۱۲

چاہئیں سب ان کی طبیعت میں جمع تھے لیکن ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے نہ دُنیا کے معاملات کا تجربہ تھا نہ کوئی ان کا دوست ہم درد تھا اس لیئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی اسی قیل وقال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی۔ دوش پا۔ آغوش پا۔ شاہ صاحب کے پاس لے گئے اُنھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ اُستاد کی غزل پر غزل کہتا ہے اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا یہ وہاں سے کبیدہ خاطر ہو کر چلے آئے۔ اُن دنوں ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔ دل میں شوق اور ولولہ تھا مگر غزل بے اصلاح تھی پڑھتے ہوئے ہچکچاتے تھے کہ ابتدائی مشق تھی سر شام اسی فکر میں ٹہلتے ٹہلتے جامع مسجد کی طرف نکل گئے آثار شریف میں فاتحہ پڑھی حوض پر آئے وہاں میر کلو حقیر بیٹھے تھے۔ چوں کہ مشاعروں میں آنے جانے سے تعارف ہو گیا تھا اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے۔ میر صاحب نے کہا کیوں میاں ابراہیم خیر تو ہے آج کچھ مکدر سے معلوم ہوتے ہو شیخ صاحب نے جو کچھ کہنا تھا کہا اور اپنی غزل سنائی اُنھوں نے کہا بے تامل پڑھ دو کوئی اعتراض کرے گا تو ہم دیکھ لیں گے چنانچہ وہ غزل یعنی۔ رکھتا ہر قدم ہے یہ وہ ہوش نقش پا۔ سنائی جس کی بڑی تعریف ہوئی۔ اُس دن سے ان کی جرأت بڑھ گئی اور بے اصلاح غزلیں مشاعروں میں پڑھنے لگے۔ چاروں طرف اُن کے کلام کا شہرہ ہو گیا اور ارباب نشاط میں بھی ان کی غزلیں پھیل گئیں۔ اکبر شاہ بادشاہ کو شاعری کا مذاق نہ تھا۔ مرزا ابوظفر ولی عہد بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے وہ شعر کے شیدا تھے اور ظفر تخلص کرتے تھے اور شعرائے وقت کا وہاں مجمع رہتا تھا اور خوب طبع آزمائیاں ہوتی تھیں۔ میر کاظم حسین بے قرار۔ ولی عہد بہادر کے ملازم خاص تھے اُنھوں نے ان کی تعریف کی اور اُن کی وساطت سے یہ قلعۂ معلی میں باریاب ہوئے۔ شاہ نصیر جو ولی عہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین کے سپرد یہ کام ہوا۔ انھیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب بہادر کو جو تکار پور سندھ وغیرہ سرحدی اضلاع سے لے کر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے تھے اُنھیں ایک ایسے میر منشی کی ضرورت تھی جو قابلیت اور علمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو میر کاظم حسین نے اس عہدے کے لیئے ولی عہد سے سفارش چاہی۔ مرزا مغل بیگ جو

جو مختارِ کل تھے وہ اسی تاک میں لگے رہتے تھے کہ ولی عہد کے پاس کسی کو جمنے نہ دیں اس پیچ سے شیخ
بہ آسانی ٹل گیا اور وہ چلے گئے۔ چند روز کے بعد شیخ صاحب ولی عہد کے پاس حاضر ہوئے تو کیا دیکھتے
ہیں کہ تیراندازی ہو رہی ہے انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ بھئی میاں ابراہیم استاد تو دکن گئے۔
میر کاظم ادھر چلے گئے اور تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ غرض اسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر
دی کہ ذرا اسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے
اور کہا کہ "بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو"۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ممتاز محل خاطر سے اکبر شاہ
کبھی مرزا سلیم۔ کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولی عہدی کے لیئے کوشش کرتے تھے
کہ مرزا ابو ظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا اور ولی عہد
کو بجائے پانچ ہزار کے صرف پانسو روپیئے مہینا ملتا تھا۔ غرض چند روز اصلاح جاری
رہی اور آخر کار سرکار ولی عہدی سے چار روپیہ مہینا بھی ہو گیا۔ اس وقت
لوگوں کے دلوں پر بادشاہ کا رعب وداب کچھ اور تھا۔ چنانچہ کچھ ولی عہدی
کے مقدمے پر خیال کر کے کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کر کے باپ نے اکلوتے
بیٹے کو اس نوکری سے روکا لیکن ادھر تو شاعروں کی دل لگی کے جمگھٹ
نے ادھر کھینچا۔ اُدھر قسمت نے آواز دی کہ چار روپیہ نہ سمجھنا یہ ایوان
ملک الشعرائی کے چار ستون قایم ہوتے ہیں۔ موقع کو ہاتھ سے نہ جانے
دینا۔ چنانچہ شیخ صاحب ولی عہد کے اُستاد ہو گئے۔ چند سال کے بعد ایک قصیدہ
اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے
صنائع و بدائع صرف کیئے تھے جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎ جب کہ سرطان و اسد مہر کا
ٹھیرا مسکن۔ آب وایلولہ ہوئے نشو نمائے گلشن۔ اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا
خطاب عطا کیا اُس وقت ذوق کی عمر اُنیس برس کی تھی۔ خاقانی ہند کے خطاب پر
لوگوں نے بڑے چرچے کیئے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کہن سال اور نامی
شاعروں کے ہوتے ساتے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنا دیا اور ایسا عالی درجہ کا
خطاب دیا۔ ایک جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا جس قصیدے پر یہ
خطاب ہوا ہے اُسے بھی تو دیکھنا چاہیئے چنانچہ قصیدۂ مذکور لاکر پڑھا گیا۔ میر کلو حقیر
کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے۔ سن کر بولے کہ بھئی

انصاف شرط ہی۔ کلام کو بھی تو دیکھو ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعراء بنایا تو کیا برا کیا۔ چنانچہ خود ذوق فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی با انصاف بھی بول اٹھتا ہی۔ سینے خبروں میں باخبری نکل آتا ہی چھتیس برس کی عمر تھی جب کہ جملہ منہیات سے توبہ کی اور اُس کی تاریخ کہی ۔ ع ۔ ای ذوق بگو سہ بار توبہ۔ جب ولی عہد بادشاہ ہوگئے تو مرزا مغل بیگ وزیر ہوئے اور ذوق کو صرف تیس روپیہ مہینا ملتا رہا۔ پھر بھی اُنھوں نے اپنی زبان سے ترقی کے لیئے نہیں کہا۔ تخت نشینی کے بعد پہلا قصیدہ بہادر شاہ کے حضور میں جو گزرانا اُس کا مطلع یہ تھا:۔

روکش ترے رُخ سے ہو انور سحر رنگ شفق   ہی ذرہ تیرا پر تو نور سحر رنگ شفق

ان کی عادت تھی کہ فکر سخن میں ٹہلا کرتے تھے اور شعر موزوں کرتے تھے چنانچہ جب کوئی عالی مضمون چستی اور درستی کے ساتھ موزوں ہوتا تو اُس کے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے:۔ ؎

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہی   ای کمال افسوس ہی تجھ پر کمال افسوس ہی

میاں عبدالعزیز خاں صاحب ایک مرد بزرگ صاحب نسبت محقیر فراش خانے کی کھڑکی میں رہتے تھے۔ شیخ بھی اُن سے بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ اس عالم میں ایک دن اُن کے پاس گئے اور کہا کہ تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے اب یہ عالم ہی کہ الف کے نام ب نہیں جانتے۔ زبان تک درست نہیں مگر جو کچھ ہیں مرزا مغل بیگ ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ خدائی کارخانے ہیں۔ عقل ظاہر بین کام نہیں کرتی مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہی وہ اُس کو بھی تو نہیں دی ہی۔ جس دعوے سے تم دربار میں کھڑے ہو کر اپنا کلام پڑھتے ہو اس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہو سکتا ہوگا۔ ادنی ادنی منشی متصدی اس کے لکھتے پڑھتے ہوں گے وہ کیسا ترستا ہوگا کہ نہ اُن کے لکھے کو سمجھ سکتا ہی نہ اُن کا جھوٹ سچ معلوم کر سکتا ہی۔ شیخ نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی۔ چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترقی تمام ہوگئی۔ تمام کنبہ قلعے سے نکالا گیا۔ نواب حامد علی خاں مختار ہو گئے تب اُستاد شاہی کا سو روپیہ

مہینا ہوا ہمیشہ عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے مبارک باد کے پڑھتے تھے اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے - اور آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوے جب شفا پائی اور انھوں نے ایک قصیدہ غرا کہہ کر نذر گزرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ملا پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہہ کر گزرانا جس کا مطلع ہی - ع - شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت - اُس پر ایک گاؤں جاگیر ہوا - جس رات کی صبح ہوتے انتقال ہوا قریب شام پیشاب کی ضرورت سے خلیفہ نے اٹھایا طشت چوکی پائنتی لگی ہوئی تھی - ہاتھ کا سہارا دیا اور انھوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا طاقت نے یاری نہ دی تو کہا - آہ ناتوانی - خلیفہ صاحب نے کہا شاعر لوں ہی کا ضعف ہو گیا - حافظ ویران بھی بیٹھے تھے وہ بولے کہ آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں - مسکرا کر فرمایا کہ اب تو کچھ اُس سے بھی زیادہ ہی - مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے کہا سبحان اللہ اس عالم میں بھی مبالغہ قایم ہی خدا اسی مبالغہ کے ساتھ توانائی دے - رات اسی حالت میں گزری صبح ہوتے ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کا دن تھا سترہ دن بیمار رہ کر وفات پائی - مرنے سے تین گھنٹے پہلے - یہ شعر کہا تھا -

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

خاص حالات اور طبعی عادات

شیخ قد و قامت میں متوسط اندام تھے - چنانچہ خود فرماتے ہیں :- آدمی سے ہی بالا آدمی کا مرتبہ پست ہمت ہو وے پست قامت ہو تو ہو - رنگ سانولا چیچک کے داغ بہت تھے کہتے تھے کہ نو دفعہ چیچک نکلی تھی مگر رنگت اور وہ داغ کچھ ایسے مناسب اور موزوں واقع ہوے تھے کہ چمکتے تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے - آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں - چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا اور بدن میں پھرتی پائی جاتی تھی - بہت جلد چلتے تھے - اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے اور وہ اُن کو نہایت زیب دیتے تھے - آواز بلند اور خوش آیند - جب مشاعرے میں پڑھتے تھے تو محفل گونج اُٹھتی تھی - اُن کے پڑھنے کا انداز اُن کے کلام کی تاثیر کو زیادہ زور دیتا تھا - اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے - کسی اور سے

ہرگز نہ پڑھواتے تھے۔ حافظہ ایسا قوی تھا کہ چھٹپنے کی باتیں یاد تھیں خوف خدا ایسا تھا کہ کبھی کوئی جانور اپنے ہاتھ سے ذبح نہیں کیا۔ ایک دفعہ برسات کا موسم تھا بادشاہ قطب میں تھے یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے اُس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے ع شب کو میں اپنے سربستر خواب راحت۔ چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں اور جو گرتے تھے اُنھیں لینے کو باران کے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا ان کے سر پہ آن بیٹھی اُنھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ اُنھوں نے پھر اُڑا دیا جب کئی دفعہ ایسا ہو تو ہنس کر کہا کہ "اس غلیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے" آزاد اور ویران دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ ویران نابینا تھے اُنھوں نے پوچھا "حضرت! کیا؟" آزاد نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھی۔ ذوق نے کہا بیٹھے کیوں کر؟ جانتی ہے کہ مُلّا ہے عالم ہے حافظ ہے۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیۡدُ۔ پڑھ کر کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا کہے گا۔ اور بِسۡمِ اللّٰہِ اللّٰہُ اَکۡبَرُ کر دے گا۔ دیوانی ہے جو تمھارے سر پر آئے۔ آستنے بڑے صاحب نظر تھے کہ خود فرماتے تھے کہ ساڑھے سات سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات۔ ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اسی قسم کی کتابیں گویا اُن کی زبان پر تھیں شعرائے عجم کے ہزاروں شعر انھیں ازبر تھے۔ گفتگو کے وقت بڑے تڑاتے سے وہ شعر سند دیتے تھے۔ خیر یہ باتیں چنداں تعجب کی نہیں کیوں کہ جس فن کو وہ لیئے بیٹھے تھے یہ سب اُس کے لوازمے ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مؤرخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں خصوصًا تصوف میں ایک عالم خاص تھا کہ جب تقریر کرتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔ پھر جو کہتے تھے ایسے کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ رمل و نجوم کا ذکر آتے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر میں انھیں خدا نے ایک ملکۂ راسخہ دیا تھا اور لطف یہ کہ اکثر احکام مطابق واقعہ ہوتے تھے۔ علم طب کو خوب حاصل کیا مگر کام نہ کیا۔ خوف آتا۔ کہ ایسا نہ ہو میرے دوائی سے کسی کا خون ہو جائے۔ موسیقی کا بھی چند روز شوق رہا اور کچھ حاصل کیا

کیا مگر خاندیس سے ایک بڑا صاحب کمال گویا آیا اُس سے ملاقات ہوئی باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے اُسے تین سو برس کی عمر چاہیئے سو برس سیکھے۔ سو برس سُنتا پھرے اور سو برس بیٹھ کر اندوں کو سنائے اور اُس کا لطف اُٹھائے۔ یہ سن کر دل برداشتہ ہو گیا اور یہ خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا صاحب کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہو گئے اس پر بھی جو کلاونت ہو گا وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ عطائی ہے۔ سپاہی زادے سے ڈوم بننا کیا ضرور؟ نجوم و رمل کا بھی شوق کیا اُس میں بھی دستگاہ پیدا کی ایک صاحب کمال مغل پورے رہتا تھا اُس سے نجوم کے مسائل حاصل کیا کرتے تھے اُس نے باتوں باتوں میں کہا کہ ایک ستارے کا حال اور اُس کے خواص معلوم کرنے کے لیئے (۷۷) برس چاہئیں۔ یہ سن کر اُس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا۔ ایک دن ذوق گئے بادشاہ سلامت محل میں تھے خبر ہوئی برآمد ہوئے۔ مٹھی بند کر کے پوچھا کہ بھئی میاں ابراہیم اپنے نجوم سے حساب کر کے بتاؤ۔ ہمارے ہاتھ میں کیا ہے؟ ذوق دل میں شرمندہ ہوئے۔ حساب کر کے عرض کی کہ گوشت کی بو معلوم ہوتی ہے۔ بادشاہ ہنس پڑے اور مٹھی کھول کر دکھا دی وہی تھی۔ ہاتھ میں ایک سونے کی انگوٹھی تھی وہ مرحمت فرمائی۔ انھوں نے اُس دن سے توبہ کی۔ پھر کبھی موقعہ ہی آ جائے تو حساب کر کے دیکھ لیتے تھے۔ وہ بات نہیں تھی۔ لکھن لعل کے گنج میں ایک جوتشی پنڈت تلسی رام تھے اُنھوں نے ۶۷-۶۸-۶۹ عمر تبلائی تھی۔ یہ سن کر شیخ کے چہرے پر آثار ملال ظاہر ہوئے اور خدا کی قدرت کہ (۶۸) برس کی عمر میں انتقال ہوا اگرچہ عقلاً اور نقلاً احکام نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہیئے لیکن یہ ایک واقعہ تھا اس لیئے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا۔ ایک مرتبہ بادشاہ کے غسل صحت کے جشن کے لیئے یہ قصیدہ لکھا۔ ؎

نہ ہے نشاط کہ گر سینچیئے اُسے تحریر　　عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

اور پڑھتے پڑھتے یہ شعر پڑھا۔

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ　　کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

آزاد نے کہا "سبحان اللہ" رنگینی اور یہ زور۔ ظہوری کا ساقی نامہ ہوگیا چپ ہو گئے

پھر کہا کہ اس میں زور آتا جاتا ہے میں گھُلا جاتا ہوں اس کی جوانی ہے اور میرا بڑھاپا
اِن کی طبیعت کو خدائے تعالیٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن
اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا اور اسی میں خوش تھے ۔ ایک تنگ و تاریک مکان تھا
جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی بچھی تھی ۔ دو طرف اتنا رستہ تھا
کہ ایک آدمی چل سکے ۔ حقہ منہ سے لگا رہتا تھا ۔ چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے لکھے
جاتے تھے ۔ یا کتاب دیکھے جاتے تھے ۔ گرمی جاڑا برسات ۔ تینوں موسموں کی
بہاریں وہیں بیٹھے بیٹھے گزر جاتی تھیں ۔ اُنھیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی ۔ کوئی میلہ کوئی عید
اور کوئی موسم بلکہ دنیا کے شادی و غم سے انھیں سروکار نہ تھا ۔ جہاں اوّل روز
بیٹھے وہیں بیٹھے اور جب ہی اُٹھے کہ دنیا سے اُٹھے ۔ ہر وضو کے بعد ایک
لوٹے سے برابر کلیاں کیے جاتے تھے ۔ ایک دن آزاد نے سبب پوچھا ۔
متاسف ہو کر بولے کہ خدا جانے کیا کیا ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں ۔ خیر یہ بھی
ایک بات ہے ۔ پھر ذرا تامل کر کے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور یہ مطلع اُسی وقت
کہہ کر پڑھا ۔ ؎

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے ۔۔۔ کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر بادشاہ کی غزل کہتے تھے ۔ آدھی بجے تک
اُس سے فراغت ہوتے تھے پھر وضو کر کے اور وہی ایک لوٹے پانی سے
کلیاں کر کے نماز پڑھتے ۔ پھر وظیفہ شروع ہوتا ۔ زیرِ آسمان کبھی ٹہلتے جاتے کبھی
قبلہ رو ٹھیر جاتے ۔ اگرچہ آہستہ آہستہ پڑھتے تھے مگر اکثر اوقات اس جوشِ دل
سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا گویا سینہ پھٹ جائے گا ۔ وظیفہ پڑھ کے دعائیں
شروع ہوتی تھیں ۔ یہ گویا ایک نمونہ تھا ان کی طبیعت کی نیکی اور عام نیک خواہی کا ۔
اُس میں سب سے پہلے یہ دعا تھی کہ الٰہی ایمان کی سلامتی ۔ بدن کی صحت ۔ دنیا کی عزت و
حرمت ۔ پھر ۔ الٰہی میرے بادشاہ کو با دولت و اقبال صحیح و سالم رکھ ۔ اُس کے دشمن
رد ہوں وغیرہ وغیرہ ۔ پھر میاں اسمٰعیل یعنی اپنے بیٹے کے لیے ۔ پھر اپنے عیال
اور خاص خاص دوستوں کے لیے ۔ یا جو کسی دوست کے لیے خاص شغل
درپیش ہو وغیرہ وغیرہ ۔ ان کے دروازے کے سامنے محلّے کا حلال خور رہتا

اُن دنوں میں اُس کا بیل بیمار تھا۔ دعائیں مانگتے مانگتے وہ بھی یاد آگیا۔ کہا کہ الٰہی بنا حلال خور کا بیل بیمار ہو اسے بھی شفا دے۔ بے چارہ بڑا غریب ہی بیل مرجائے گا تو یہ بھی مرجائے گا فقرا، اور بزرگان دین کے ساتھ اُنھیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اُس کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی۔ علما، اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ با ادب یاد کرتے تھے اور کبھی اُن پر طعن تشنیع نہ کرتے تھے۔ **ذوق** اور اُن کے دیکھنے والوں کے لیئے بڑے فخر کی بات یہ ہو کہ خدا نے کمال شاعری اور ایسا اعلیٰ درجہ قادر الکلامی کا دیا چند آدمیوں سے انھیں ناراضی یا رنج بھی پہونچا مگر تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا۔ خدا ہر شخص کو اُس کی نیت کا پھل دیتا ہو۔ اُس کی شان دیکھو کہ اڑسٹھ برس کی عمر پائی مگر خدا نے اُن کی ہجو بھی کسی کے منہ سے نہ نکلوائی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ زبان جو ہر لطیف ہی اسے بدی سے آلودہ نہ کرنا چاہیئے۔

عموماً انداز کلام

کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہو کہ مضامین کے ستارے آسمان سے تارے اُتارے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے اُنھیں ایسی شان وشکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہو کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انھیں قادر کلامی کے دربار سے ملک سخن پر حکومت مل گئی ہو کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارے کی بو سے بساتے ہیں کہ اول میں نشتر سا کھٹک جاتا ہو اور منہ سے کبھی واہ نکلتی ہو اور کبھی آہ نکلتی ہو۔ معلوم ہوتا ہو کہ ان کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں اور ترکیب الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں مگر جسے جہاں سجتا دیکھتے ہیں وہ گویا وہیں کے لیئے ہوتا ہو۔ وہ طبیب کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کون سا ہو کہ سادگی میں رنگ دے جائے گا اور کون سا رنگینی میں۔ جس طرح کامل مصور کی تیزی قلم اُس کے رنگوں کی شوخی کو روشن کرتی ہو۔ اسی طرح ان کے مضمون کی باریکی کو اُن کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہو۔ اُنھیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے۔ گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستے پلا دیا۔ اسی وصف نے نادانوں کو غلطی میں ڈالا ہو جو کہتے ہیں کہ ان کے ہاں عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی

باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کے ہونٹوں میں خدا نے عجب تاثیر دی تھی کہ جو لفظ اُن سے ترکیب پا کر نکلے ہیں۔ خود بخود زبانوں پر ڈھلتے آتے ہیں۔ جیسے ریشم پر موتی۔ خدا جانے زبان نے کسی آئینے کی صفائی اُڑائی ہے یا اُنھوں نے الفاظ کے نگینوں پر کیوں کر جلا کی ہے۔ جس سے کلام میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے۔ حقیقت میں اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کلام اُن کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشے کو قلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے۔ اسی واسطے ہر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر بھی کرتا ہے۔

قدم شریف کی قبور

(۱) تاریخ وفات مرحومہ نصیب النسار

جب کہ نصیب النساء کے عزیزوں کو داغ — کر گئی دنیا سے کوچ اور ہوئی داخل خلد
اہلِ عزا سب ہوئے طالب سالِ وفات — غیب سے آئی ندا وہ ہوئی داخل خلد
۱۳۰۲ھ

(۲) ۷۸۶۔ قطعۂ تاریخ وفات بسم اللہ جان بصنعت تعمیہ

ہو گئیں سب ماں کی بندا جان اب افسوس ہے — اس بھرے گھر میں ہی تھیں اک بزرگ خاندان
شوق نے مصرعہ لکھا از انتہائے آرزو — دیکھیے وہ خلد میں سیار ہیں بسم اللہ جان
۱۳۲۸ھ

(۳) سنگ مرمر کا چبوترا اور کٹہرا اور قبر چو کھنڈی کے اندر۔

سنگ مرمر کی لوح کے سامنے وار

یا فتاح۔ بسم اللہ۔ مزار پر انوار۔ قطب العالم سلطان العاشقین زبدۃ التارکین معارف آگاہ حضرت خواجہ مستان شاہ کابلی چشتی قدس سرہ العزیز۔ بتاریخ ہفدہم ذیقعدہ ۱۳۲۰ھ المقدس وصال یافتند۔

تاریخ وصال

از القائے ربانی و فیض روحانی — بقلب مرید ازلی خاکسار محرم علی چشتی

اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمداً حبیبہ و رسولہ

سنہ ۱۳۲۰ ہجری المقدس

تعمیر ہذا باہتمام حلقہ بگوش ازلی خاکسار محرم علی چشتی متولی درگاہ شریف ہذا در سنہ ۱۳۲۹ ہجری اتمام یافت۔

لوح کے پیچھے

یا اللہ بسم اللہ - غزل از دیوان آتشکدۂ وحدت مصنفہ حضرت خواجہ کابلی قدس سرہٗ العزیز

شعلہ دارد آتش جلوہ از دل صد چاک ما — سوخت از برق تجلی دامن افلاک ما
گر سبوے سنگ شکست اے عاشقاں باشد چہ پاک — بادۂ جاں شد معلق تا ابد در خاک ما
کم نمیگردد ز میناے دلم حسن پری — ریشہ دارد از ازل تا ابد ایں تاک ما
زندۂ جاوید باشد واصلان بزم عشق — لا یموتون گفتہ اینجا سید لولاک ما

ہست مستغرق بذات ذوالنن مستان شاہ
می بر آید تا ابد نور ازل از خاک ما

(۴) لوح سنگ مرمر - گئیں ملک عدم میں دلدارہ — جس کے صدمے سے دل دو نیم ہوا
ھو اللہ کیسی پرور دہی میں تاریخ — ہی یہ تاریخ - رنج عظیم ہوا [۱۲۸۵]

اندرون درگاہ بسمت جنوب

چبوترا - کٹہرا - قبر و لوح سنگ مرمر درگاہ کے جنوبی والان میں - بسم اللہ - قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات اہلیہ آنریبل محمد رفیق جج ہائی کورٹ الہ آباد -

ہست ایں مرقدِ خورشید زمانی بیگم — آنکہ از دار فنا رفت بگلزار بقا
آہ چوں بست و نہم از مہ اپریل آمد — رفت آں صالحہ بربست ازیں کہنہ سرا
لکھنؤ را نہ پسندید و بہ دہلی برگشت — چشم دل بستہ بہ نقش قدم خیر ورا
تیرہ شد خانۂ آباد رفیق ذی جاہ — دل بدرد آمد ازیں واقعۂ جانفرسا
شمع ایں مصرع تاریخ بیفروخت صفی — قبر نورانی خورشید زمانی اینجا

(۵) ھو الباقی چوں عبد نبی خاں شد صید اجل مبرم — ناکام سپردندش ہم ں گنج نجاک اندر
از عمر گراں مایہ پنجاہ و دو منزل را — طے کرد و رسید آخر در پاے پدر اندر
استادہ بیالینش گفتم کہ سر بر کن — گفتا کہ بہل یسرم در پاے پدر بہتر [۱۳۳۵]

(۶) ھو الحکیم غلام نبی خاں طبیب لبیب — سرافروز و اقبال مند و سخی
پس از شصت و شش سال بربست رخت — ز دنیاے ناپائدار و دنی
نجاکش سپردند اینجا کہ ہست — زیارتگہ نقش پاے نبی
ہمی رفت در سال فوتش سخن — کہ خود روح آں پیکر مردمی

بگفت از سر حق و صدق و یقیں | بہ پاسے بنی بہ غلام نبی

بیرون درگاہ جنوب رخ

(۷) کچا تعویذ۔ ان اللہ غفور الرحیم۔ قبر بیگم صاحبہ ثانیہ فخر الدولہ بہادر پنجم نواب لوہارو متوفیہ بتاریخ بست ویکم جمادی الاولی ۱۳۳۶ھ

(۸) یا فتاح۔ بسم اللہ کلمہ

موت کی خورشید پر چھائی گھٹا | ہے جہاں آنکھوں میں مردم کی سیاہ
صدق تاریخ اس کی رحلت کی لکھو | ہائے شاں خورشید بیگم آہ آہ

بتاریخ ۲۰ ماہ شوال مطابق ۹ جنوری ۱۹۰۴ء بروز شنبہ بوقت چار بجے ۱۳۲۲ شام خورشید جہاں ساکن قصبہ لونی نے اس دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کیا۔

(۹) لوح سنگ مرمر۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت

ننھی سی قبر دیکھ کے کی فکر سال فوت | عرصہ گزر گیا جو بہت قیل و قال میں
دلسوز نے نکل کے یہ سائل سے کہہ دیا | بچہ ہے خوش جمیل مزار جمیل میں

۳۰ شعبان ۱۳۲۹ھ بروز جمعہ مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۱۱ء

(۱۰) قبر سنگ مرمر۔ نواب محمد ابراہیم علی خاں بہادر فرماں روائے ریاست پاٹودی۔ تاریخ وفات سیزدہم صفر المظفر ۱۳۳۶ ہجری

(۱۱) لوح سنگ مرمر۔ کلمہ۔ قدسی لقب نواب اختری بیگم بانوے فخر الدولہ پنجم والی لوہارو در شہر محرم الحرام ۱۳۲۵ ہجری وفات یافت

(۱۲) لوح سنگ مرمر۔ ھو الغفور۔

آہ ممتاز حسین خاں نواب | روح دنیا سے اُن کی خُلد گئی
تھے وہ بے شک رئیس پاٹودی | قدم پاک میں ہے قبر بنی
از سر آہ فکر سال تھا یاس | بولا رضواں خدا نے بخشش کی

۱۸۹۸ء

(۱۳) لوح سنگ مرمر۔ ھو الغفور الرحیم۔

جونپور است کہ مشہور بہر شہر و دیار | بود رونق ز رئیسے صفت خلد اورا
نام نامی ست عیاں مولوی حیدر حسین | داشت افعال حسن خُلق بیاں عقل رسا
ارض دہلی ز مزارش چو گلستاں آباد | گشت گل شمع حیات از ستم باد فنا
شعر تاریخ گہر گفت بطرز تازہ | ہر دُر سلک مضامیں صفت مہر غور[۱] بضیا

[۱] ایسا ہی پڑھا جاتا ہے ۱۳۰

چار طور ست عیاں صنعت بیت آخر | عقدہ ام واز عنایات خدا سے دوسرا
شمع ساں سال شد از مصرعۂ اول روشن | از شب آخر مصرع سحر سن پیدا
غیر منقوطه و منقوط حروف آخر | میکند جوہر تاریخ بہر آئینہ وا
اے سوے ملک بقا رحلت پاک عارف | سن ہجری بود و ماہ جمادی الآخر

۱۲۹۲ ۲۹۲ ۱۲۹۲ ۱۲۹۲

(۱۴) ھوالباقی كمآ قالوا ادرج وریحان جنات نعیم

الیك لهم جنات عدن تجری ۱۳۱۷ ہجری

تاریخ ۱۳ر شوال ۱۳۱۷ہجری کو اس دار فانی سے شاہ جہاں بیگم نے رحلت کی

(۱۵) قبر لوح سنگ مرمر۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا تاریخ شعبان المعظم

خان بہادر میر بو صالح کہ بود | صالحے از صالحان با صفا
حق طلب کردش کہ نگذارد کسے | دور تر از خویش صالح خویش را
بلکہ ہر کس را امید واثق است | صالحاں را می نوازد خود خدا
سال وے جستم ز باب اعتقاد | صالح ما خلد طوبی یافتہ

۵۸۱ ۱۳۱۸

۱۸۱ + ۱۳۱۸ = ۱۸۹۹ ع

(۱۶) قبر و لوح سنگ مرمر۔ بانوے ولیعہد لوہارو دولہن بیگم صاحبہ

بسم اللہ۔کلمہ یکم محرم رحلت نمود و تاریخ شد مغفور بادا۔

(۱۷) قبر و لوح سنگ مرمر۔ کوئی گر مرقد ہذا پہ آسے | دعاے مصرعۂ تاریخ پڑھ کے
اللہ اللہ یہ نقش قدم نبی پڑی ہے | الہی بخش صدقہ سے نبی کے

(۱۸) ھوالغفار۔ ایں جہ سوتے بود در افزا دریں عالم کزاں | بود غمگیں ہر کسے از او گدا یا بادشاہ بود
برسوال از نام و سال نوث پاسخ داد دل | کانتقال با ملال۔ مرزا نوشاہ بود

(۱۹) کلمہ۔ بسم اللہ۔ فضیلت پناہ حقائق و معارف آگاہ روشن ضمیر قطب ذاتی سید شہاب الدین شہید سید بخاری رسول دار تحریر فی التاریخ سیز دہم شہر ذی الحجہ سنہ۔

بیرون صدر دروازہ درگاہ شریف

(۲۰) بسم اللہ۔ کلمہ۔ قطعۂ تاریخ وفات مجموعۂ حسنات منشی حافظ محمد وزیر صاحب لکھنوی۔

وزیر محمد جواں مرد محسن | طرفدار و غمخوار بیچارگاں
ازیں رہ گزر چوں بماہ صیام | بحکم قضا و قدر ناگہاں

ط مثبت حروف سے سنہ کا ہندسہ جمع کیا ہے۔ ۱۲

بینو مونیا مبتلا گشتہ آخر سفر کرد و بپست ساماں بشارت آسو برق آمد زغیب کلاہ بخشید اور ساجناں
۲۳ رمضان المبارک ۱۳۱۹

(۲) قدم شریف کی فصیل کے متصل جنوب میں ہو۔

یادگار غالب معجز بیاں میر مہدی سید والا تبار بُرکلامش سر بسر آہ و فغاں چوں تخلص بو مجروح نگار
کرد از دنیا چو آہنگ سفر گفت اغفر لی الٰہی جناب طالبا دیگر مرنجاں فکر را راز فوتش خود اغفرلی برآر

(۲۳) محمد حبیب علی خاں ولد نظام علی خاں رئیس قصبہ سلطان پور۔ تاریخ وفات ۲ رمضان المبارک ۱۲۸۶ ہجری

پہاڑ گنج دہلی کے مضافات میں ایک بستی ہو۔ زمان شاہی میں جب دلی کی آبادی اور پھیلاؤ کا ٹھکانا نہ تھا تو ضرورتاً بیرون فصیل شہر بھی جہاں سر چھپانے کو جگہ ملی تو لوگوں نے مکانات بنا لیئے۔ گو پہاڑ گنج اب ایک جداگانہ بستی کی حیثیت رکھتا ہو مگر اگلے زمانے میں گویا دلی کا ایک محلہ تھا۔ اُس زمانے میں یہاں امرار کے محلات بھی تھے اب گھٹ کر ایک گاؤں کی حیثیت پر آن لگا ہو مگر دلی کے قرب نے شہریت کی روح اس قریہ میں بھی پھونک دی ہو۔ اب آبادی اس کی تخمیناً بارہ ہزار ہو یہاں زیادہ تر پیشہ ور لوگ چاندی والے اور سادہ کار اور وہ لوگ رہتے ہیں جو شہر کے سر توڑ کرایے کے متحمل نہیں ہوسکتے یہاں کی بہت سی زمین گورنمنٹ نے لے کر جدید عمارات بنالی ہیں چنانچہ ملازمین کے بہت سے کوارٹر اس میں بن گئے اور بنتے چلے جارہے ہیں۔ لیڈی ہارڈنگ زنانہ میڈیکل کالج کی پر شکوہ عمارت بھی پہاڑ گنج ہی کی سرزمین پر ہو۔ پہاڑ گنج کی بستی کے سرے پر ایک بہت وسیع باؤلی تھی جسے پٹوا کر ایک محلہ آباد کیا گیا ہو جو اب مدار چونے والا کے نام سے مشہور ہو۔ باقی کچھ قدیم مسجدیں دست برد زمانے سے بچ رہی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ بستی کے شمال رخ آبادی سے آگے ایک مقام **ملتانی ڈھانڈا** کے نام سے مشہور ہو اس میدان میں ایک قدیم مسجد تین در تین گنبد کی ہو جس میں ایک کنواں ہو سیچے تہ خانہ ہو اور مسجد کے قریب چند قبریں ہیں۔ اب یہ مسجد ویران ہو اور جنگل میں ہو لیکن ضرور پہلے آبادی سے گھری ہوئی ہوگی ورنہ جنگل میں سوائے عید گاہ کے کوئی مسجد نہیں بنایا کرتا۔ اسی کے قریب تین در اور تین برج کی ایک پرانی مسجد **بارہ ربیع العصر** کے نام سے مشہور ہو۔ ایک اور قدیم مسجد **قدرا گھوسی** کے نام سے مشہور ہو اور اسی کو بعض لوگ **جنگل والی مسجد** بھی کہتے ہیں اس میں تین در تین برج آگے مختصر صحن اور کنواں ہو۔ یہ مسجد اب بھی اس وجہ سے آباد ہو کہ اس کے قریب کچھ آبادی ہو۔ پوسلے والے رہتے ہیں پہاڑ گنج کی آبادی میں اب پندرہ مسجدیں نئی ہیں باؤلی محلے میں دو مسجدیں قاضی جی کی مسجد۔ محلہ چاندی والوں میں دو مسجدیں۔ لوہاروں کی مسجد

نقشہ درگاہ حضرت سید حسن رسول نما
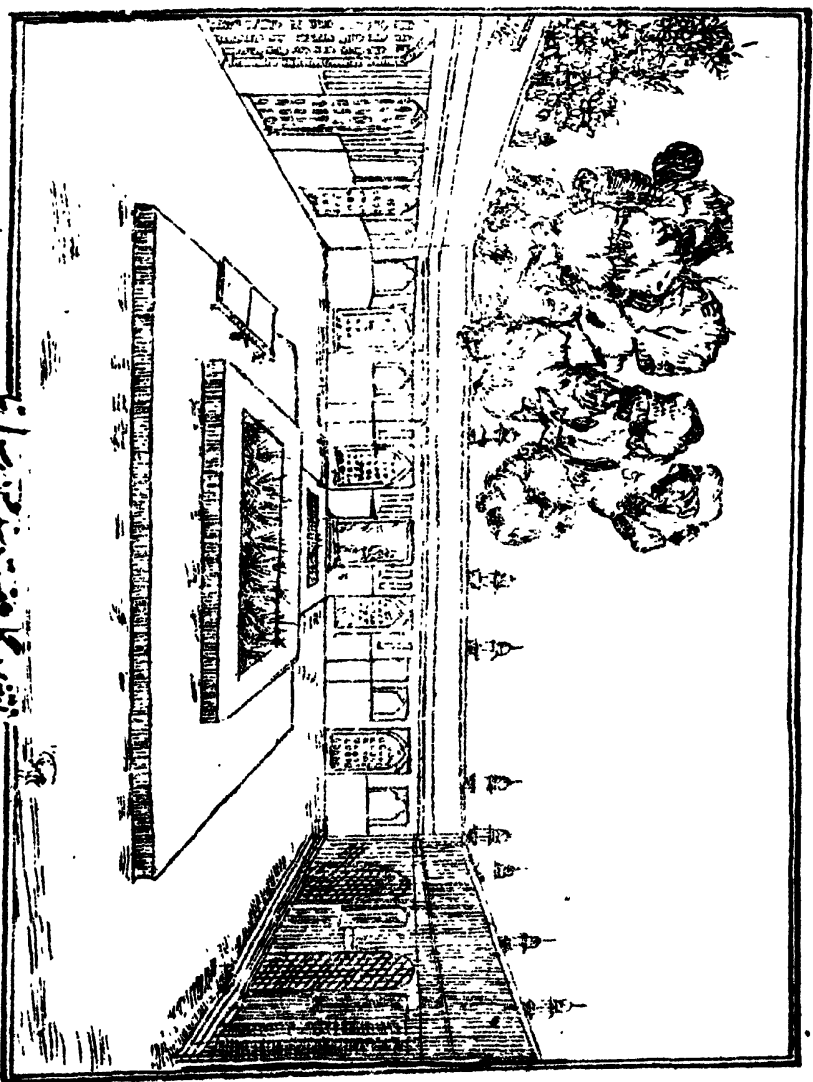
چونے والوں کی مسجد۔ پان کے دریبے میں دو مسجدیں۔ کوٹھی شورے کی مسجد۔
لب سڑک شارع عام پر دو مسجدیں۔ ہیجڑے والی مسجد۔ مسجد حاجی محمد عمر محمد اسحاق
غریب شاہ کی مسجد۔ اہل ہنود کے چھوٹے موٹے مندر بھی جابجا پھیلے ہوئے
ہیں جن میں سے ایک نیا مندر درگاہ حضرت سید حسن رسول نما کے سامنے ہے جو
بالکل مسجد کی شکل کا ہے اور نئی طرز کا بنا ہوا ہے دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ ڈیزائین
کسی انجینیر کا ہے جب ہی یہ جدت ہے۔ بڑے بڑے محلوں کی تفصیل یہ ہے۔
منڈی تیل۔ گلی موچیاں۔ کٹڑہ میر بخش۔ پولیس سٹیشن۔ شفا خانہ سرکاری۔ ڈاکخانہ۔
گلی حلوائیاں۔ کٹڑہ رائے جی۔ بستی کمھاراں۔ منڈی دال۔ گلی ڈور والاں۔ کوٹھی
شورہ۔ نایک کٹڑہ۔ پھاٹک مصری خاں۔ گلی مدار چونے والا متصل باؤلی۔

درگاہ سید حسن رسول نما ۱۱۰۳ھ قطب روڈ پہاڑ گنج سے ذرا آگے بڑھ کے آپ کا
مزار مہبط انوار الٰہی ہے۔ آپ اولیا سے کبار میں سے تھے۔
آپ کا لقب "رسول نما" اس سبب سے پڑا تھا کہ آپ کو حضرت رسول مقبول صلعم کی
جناب میں ایسا تقرب حاصل تھا کہ آپ جس کو چاہتے تھے حضرت سرور کائنات
کی زیارت سے مشرف کرا دیتے تھے سنہ ۱۱۰۳ھ میں آپ کا وصال ہوا آپ کے مزار کے سرہانے
سنگ مرمر کی تختی پر بہ خط نسخ یہ شعر کندہ ہے۔

حسن رسول نما افتخار آلِ حسین — اویس قرنی ثانی و ثالث حسنین

آپ کی درگاہ ایک بڑے وسیع پختہ احاطے کے اندر ہے جس کا شاندار دروازہ ہے
اصل درگاہ کا احاطہ ۷ گز مربع ہے۔ درگاہ مسقف نہیں ہے زیر سما ہے اور خلاف دوسرے
مزارات کے آپ کا مزار آپ کے پاس آپ کے صاحبزادے ناصر علی
اور دو پوتوں کے مزار بیچ میں سے بالکل خام ہیں بعد میں حاشیہ پختہ کرکے متن
بدستور رکھا گیا ہے۔ ان قبروں کے گرد ایک خوب صورت آہنی کٹہرا لگا دیا گیا ہے۔
درگاہ کے گرد چاروں کونوں پر چار دروازے اور نو نو در کی غلام گردش ہے بہ ہیئت
مربع ہے اس کے دروازے پر بخط نسخ یہ مصرعہ تاریخ وفات سنگ مرمر کی تختی پر کندہ ہے۔
ع۔ رسول نما بارسول باقی شد۔ کتبہ العبد المذنب یاقوت رقم خاں عرف عباد اللہ ۱۱۰۳
آپ کا عرس شریف ۱۱ شعبان المعظم کو ہوتا ہے درگاہ کے جنوب میں ایک ۸ گز مربع پختہ

اور سیڑھی دار حوض ہے۔ درگاہ بہت صاف ستھری اور بلحاظ تعمیر اچھی حالت میں ہے۔
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجادے صاحب کی طرف سے با حسن الوجوہ نگرانی کی جاتی ہے
یہ درگاہ نیو کنٹونمنٹ رائے سینا کے حدود میں آگئی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ گو اور
ساری اراضی سرکار نے لے لی مگر درگاہ کی حرمت مدنظر رہی اور برقرار رکھی گئی۔
اصل درگاہ کے باہر کمپونڈ کے اندر درگاہ کے متوسلین کے مکانات اور قبریں ہیں
قبریں ہیں جن کے کتبے ہم نقل کرتے ہیں :۔ درگاہ کے مشرق میں :۔

(۱) یا غفار۔ سجادہ نشین سید احمد حسن کی ما
رضواں نے انکی سال کی اسطرح دی ندا
عصمت پناہ پھانسی گئیں جب وہ پیش رب
گوشہ جنان کا گوشہ نشین کو ملا ہے اب

(۲) ہو القدوس۔ قدسیہ بیگم گئیں دنیا سے آہ
از سر افسوس ہاتف نے کہا
داخل جنت ہوئیں وہ بالیقین
اب یہ جنت کو گئیں گوشہ نشین

(۳) سنگ مرمر۔ دنیا سی میر احمد علی آج چل بسے
تاریخ فوت انکی با واب لکھ بشیر
افسوس ایسے شخص کہاں پیدا ہوتے ہیں
سید حسن رسول نما کے پڑوتی ہیں

هو الحکیم

(۴)
بَکَتِ الْعُیُوْنُ اَمَاتُرِیْدُ جُمُوْدًا
اَبْکَتْ شِرَبْقَا صَادِقًا فَحُسُوْدًا
اَسَفَتْ لِفَقْدِ الطِّبِّ عَصْرَ تَوَامِهٖ
فَاسَتْ وَهَلْ بَاْسًا تَحِسُّ نَفِیْدًا
اَمْلَتْ عَلٰی مَثْوَاهُ یَوْمَ مَعًا دِهٖ
قَبْرُ الَّذِیْ فِی الطِّبِّ کَانَ حَمِیْدًا

(۵) هو الحکیم۔ چوں شدہ واصل حق واصل خاں
(سنگ مرمر) از خرد سال وصالش جستم
باز گوا نچہ بگفتے اول
ایں چنیں مرد گزین فرد زماں ۱۳۰۹ھ
گفت دشوار نگیری آسان
کہ شدہ واصل حق واصل خان

حکیم واصل خاں صاحب کے وفات کی ایک اور تاریخ ہم کو یاد ہے :۔ ۱۳۲۲ھ
آں نکتہ دان علم طب حاذق زماں
رفتہ ز دہر و برق پی سال فوت او
کز دست پر شفاش جہانے بسود شد
واصل بجود رحمت رب ودود شد

(۶) سنگ مرمر۔ ان اللہ عزوجل حی ومیت وهو حی لا یموت
مرقد پاکیزہ حاذق الملک۔ کلیم طینت ارسطو حکمت۔ افضل الحکما بو علی سینا ے ہند۔
طبیب دانا امام طب حکیم ابو سعید محمد عبد المجید خاں۔ ابن حکیم محمود خاں قدس سرہ ۱۲

لے کتبات کی نقل مطابق کتابت کے کر دی گئی ہے۔ سہ۔ زوجہ سید محمد حسن سجادہ۔ سہ ۱۳۴۰ یہ افسوس بیجا موقع ہے۔ ۱۲

روزِ چہارم بیست و سہ ربیع الاولی - اوائل سنیہ یکہزار سہ صدو نوز دہ ہجری بتخ ۱۹ صبح شنبہ وقت ... داعی حق را لبیک اجابت فرمود ۱۹ و چابک بجناں شتافت - ۱۴ وجنت نصیب زندگانی جاودانی یافت - ۱۴

یا صمد نور مضجعہ

محمود زادہ حاذق ملک انس جہاں گذشت | کو بود در جہاں شہ باتخت و تاج طب
عبد المجید خاں فلک فر وفات کرد | کو بود از وجود شریفش رواج طب
از دوستاں زدار جہاں رفت آں کسی | کو بود در جہاں سبب ابتہاج طب
لقمان عصر و بوعلی سینائے عہد بود | اوہم خراج علم گرفتی و تاج طب

سنجر بسال ماہ بجوہر گرفت و گفت
اکنون خموش شد بمصائب سراج طب

(۷) ھو العلی الحکیم - چناں رقمزدہ سہراب مصرعۂ تاریخ
طبیب صادق وکامل حکیم صادق بود

درگاہ کے جنوب میں - (۸) ھو العلی الاعلی -

ناگہاں چوں غلام احمد خاں | کردہ رحلت بسوی خلد بریں
ازغضب[1] ہاتفم بگفت کہ ہاے | مہر تاباں نہاں شدہ بزمیں

جان محمد مصوّر کا احاطہ درگاہ کے مغرب جانب ایک احاطہ جان محمد مصور کا کہلاتا ہے جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ جان نامی انگریز تھا جو مشرف بہ اسلام ہوا اس احاطے کے اندر تین قبریں ہیں :-

(۹) ھو العزیز امانت خاں چو از دنیا سفر کرد | فلک گفتہ - امانت خاں جواں حیف
(مرمر) سکنہ دانا پور ۱۳۰۱ھ

(۱۰) (مرمر) قطعۂ تاریخ - افسوس کرد رحلت نواب با ولایت | جان محمد آید گر اسم او بجوانی
از بہر سال رحلت آمد ندای ہاتف | بادا مقام او در خلد جاودانی

(۱۱) (مرمر) بسم اللہ - بروز ہشتم شعبان وشام یکشنبہ | غریق ہو کے گیا قطب الدین بجلد بہشت
مجھے یہ فکر تھی اسے داغ کیا کہوں تاریخ | کہا سروش نے کہدے شہید پاک سرشت ۱۳۰۲ ہجری

مسجد اسی احاطے کے پاس ایک خوب صورت سی مختصر مسجد درگاہ کے احاطے کے

[1] یہ غضب بھی غضب ہے ممکن ہے کہ سبقت رحمتی علی غضبی = الاغضب ہو ۱۲

اندر ہی جس کے صحن کے پائین میں مسماۃ عظیمن کسی عفیفہ کی سنگ مرمر کی قبر ہی جس کے تعویذ کے گرد آیۃ الکرسی ہی اور اوپر (۱۲) عظیمن متوطن ریواڑے چہار دہم ذیحجہ ۱۲۲۴ھ وفات یافت کند۔ ہی۔ کہتے ہیں کہ ان بیوی کے زر مہر سے یہ مسجد بنی ہی۔

درگاہ کے صدر دروازے کے اندر ہی ایک قبر پر (۱۳) ھو الغفار

گوہر آرا بیگم عفت شعار | رفت از دنیا بملک جاوداں
گفت دل در سال فوتش اینچنیں | قصر جنت بہر او با حوریاں

(۱۴) غفور الودود

حق ز کلک قضا بخط غبار | زد رقم بر مزار و منزل من
وہ کہ ہر گہ کہ سبزہ در بستان | بدمیدی چہ خوش بدی دل من
بگذر ای دوست تا بوقت بہار | سبزہ بینی رسیدہ بر گل من
حضرت سید محمد را | داد جنت خدای عادل من

نوشۂ میر گفت تاریخ او
شد سوی عرش بدر کامل من

سنہ

مزار حضرت خدا نما
سنہ ۱۱۰۶ھ
۱۶۹۱ء

حضرت رسول نما کی درگاہ کے مغرب میں کوئی آدھے میل پر ایک پہاڑی پر بولی بھٹیاری کے محل کے پاس جہاں سے رخ سامنے ہی آپ کا خام مزار ہی۔ آپ کے حالات سے بھی کتب ساکت ہیں۔ سنتے ہیں کہ آپ اورنگ زیب کے زمانے میں تھے واللہ اعلم بالصواب۔ آپ کی درگاہ کے احاطے کی چار دیواری پر یہ کتبہ لگا ہوا ہی

میر افضل خدا نما رحمۃ اللہ علیہ

عارف کامل و شیخ زمانہ بود و تارک دنیا متوکل بے ریا۔ بہ عشق و محبت یگانہ۔ از نگاہ فیض وارشادش صدہا کس بمرتبہ فنا رسیدہ خامۂ ہیدن۔ او خدا نمائی است و خاصہ شنیدن و خدا آگاہی چوں وقت در رسید در سنہ ۱۱۰۶ھ رحلت فرمود

مزار حضرت نور نما رح

اس درگاہ سے تخمیناً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ایک چار دیواری کے اندر حضرت نور نما رحمۃ اللہ علیہ کا

مزار ہے اور صرف کتبہ پر حضرت نور نما رحمۃ اللہ لکھا ہوا ہے۔

تکیہ شاہ میر

حضرت نور نما کی درگاہ سے کوئی ایک ہزار قدم کے فاصلے پر بجانب شمال شاہ میر کا تکیہ ہے جس پر یہ کتبہ ہے۔ ھو۔ صاحب میر شاہ۔

بی پرستی ازاں نقش خود بر آب زدم کہ تا خراب کنم نقش ہر پرستیدن

۲ ذیقعد ۱۳۰۵ھ ہجری

مزار حضرت جہاں نما

یہیں پاس چنبیلی والے باغ کے نکڑ پر آپ کا مزار ہے۔ لوگ آپ کے اوصاف و کرامات بہت کچھ کہتے ہیں مگر کسی تاریخ میں آپ کی ولادت یا وفات کا کچھ ذکر دیکھنے میں نہیں آیا۔ بہر حال نام اور شہرت دونوں اس پر دال ہیں کہ آپ بھی کوئی باکرامت ولی تھے۔ یہاں اور بھی بہت سی قبریں ہیں جن پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ حضرت رسول نما۔ خدا نما۔ نور نما۔ جہاں نما۔ آپ سب اصحاب کرام کا زمانہ قریب قریب کا ہی معلوم ہوتا ہے۔

بولی بھٹیاری کا محل

۷۵۵ھ ۱۳۵۴ء

یہی ہستی چند روزہ بھی ہے
کہ دو دن میں ہے ذخیرۂ عیش ملی

اجمیری دروازے سے دو میل آگے پہاڑ گنج کی حدود میں سید حسن رسول نما کی درگاہ کے آگے یہ مشہور مقام ہے جس کے متعلق سوائے زبانی روایات کے تاریخی سند تو کچھ ہے نہیں۔ یہ محل ایک پہاڑی پر بولا خاں پٹھان نے بنوایا ہوا ہے اور بعض لوگ بو علی بختیاری کسی بزرگ کا بنایا ہوا کہتے ہیں۔ غرض یہ کہ اصل نام کو بگاڑ کر بھوری یا بولی یا بھولی بھٹیاری کا محل کر دیا ہے لیکن بو علی بختیاری ہی زیادہ موزوں و قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ یہ مکان ایک مرتفع پہاڑی پر بنایا گیا ہے کہ جس پر سے دور دور کی سیر دکھلائی دیتی ہو اور موسم برسات میں جابجا پانی کا بہنا اور سبزے کا لہلہانا ایک عجیب لطف دیتا ہے۔ یہ بند یعنی ٹیلہ ۱۸ گز لمبا اور ۱۲ چوڑا اور ۳۴ اونچا ہے۔ جواب بھی درست حالت میں ہے۔ سر سید نے لکھا ہے کہ یہ بند فیروز شاہ تغلق کے وقت میں بنا تھا یہاں پون پرچھا کا ایک بہت بڑا میلہ ہوتا ہے جس میں شہر کے تمام برہمن جوتشی اور رمال اور نجومی جمع ہوتے ہیں اور ہوا دیکھنے جاتے ہیں

ایک جھنڈی گاڑ کر ہوا دیکھتے ہیں اور ہزارہا آدمی ہندو مسلمان تماشائی جمع ہوتے ہیں۔

راجہ کا بازار یا جے سنگھ پورہ اور کلالی باغ

حضرت سید حسن رسول نما کی درگاہ کے پاس راجہ کا بازار تھا جسے جے سنگھ پورہ کہتے تھے اور درگاہ سے کوئی دو سو قدم بجانب جنوب کلالی باغ تھا۔ یہ سب مقامات اب ناپید ہیں سرکار نے زمین لے کر سپاٹ میدان کر دیا ہے اور بہت سے کوارٹر رائے سینا کے محکمہ جات کے کلارکوں کے بن گئے ہیں اور بنتے چلے جا رہے ہیں۔ کلالی باغ میں ڈھایا ڈھوئی سے صرف ایک مسجد بچ رہی ہے چونکہ وہ بے مرمت اور خستہ حالت میں ہے کوئی دن جاتا ہے کہ وہ خود بخود شہید ہو جائے گی۔

لیڈی ہارڈنگ زنانہ میڈیکل کالج

یہیں لیڈی ہارڈنگ زنانہ میڈیکل کالج ہے جو ایک بڑی عالی شان اور وسیع عمارت ہے جس میں اعلیٰ درجے کی ڈاکٹری تعلیم عورتوں کو دی جاتی ہے۔

رائے سینا

اس کے آگے رائے سینا ہے۔ یعنی نئی دلی جو دلی کے دارالسلطنت قرار داد ہونے کے بعد بن رہی ہے۔ سڑکیں وغیرہ سب بن گئیں بہت سی عالیشان عمارتیں بن کر طیار ہو گئیں کچھ طیاری کے قریب ہیں۔ جنگ یورپ کے سبب سے کام ڈھیل میں پڑ گیا تھا اب خدا کے فضل اور بہ اقبال ملک معظم جارج پنجم ادام اللہ اقبالہم کے پانچ سال کے عالمگیر اور خوں ریز لڑائی کے بعد ہمارے سرکار کی جیت ہوئی ہے۔ پھر وہی لیل و نہار ہے اور وہی بہار۔ اگر خدا نے چاہا تو بہت جلد نئی دلی کی تکمیل ہو جائے گی۔ اب بھی کئی محکمے وہاں چلے گئے ہیں۔ ~

بباش شہا باسلامت مدام
فلک چاکر و بخت و دولت غلام

	بانی	سال تعمیر	مقام
مقبرہ و مدرسہ غازی الدین خاں	غازی الدین خاں نظام الملک	۱۱۲۲ء ۱۷۱۰ء	بیرون اجمیری دروازہ

یہ عمارت دلی کی مشہور اور دلکش عمارتوں میں ہے جس کی وضع ہندو سراسنک طرز کی ہے

نقشہ مدرسہ نواب غازی الدین خان
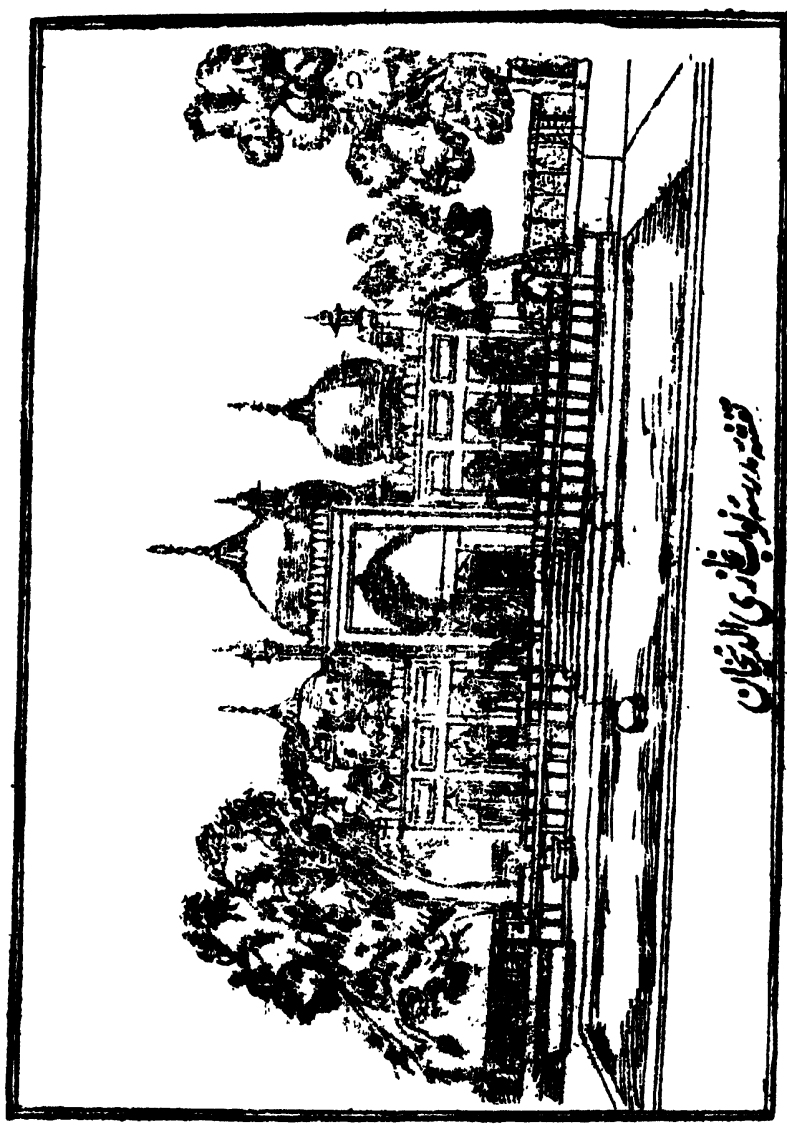
اس عمارت کی خوب صورتی اور طرز تعمیر دور دور سے سیاحوں کو متوجہ کرتا ہے۔ میر شہاب الدین پسر خواجہ عابد قلیچ خاں جو مشہور مقدس بزرگ شیخ شہاب الدین سہروردی کے خاندان سے تھے شاہنشاہ اورنگ زیب اور اُن کے جانشین شاہ عالم بہادر شاہ کے زمانے کے بڑے نامور امیر کبیر تھے جو سلطنت کے اعلیٰ ترین مرتبے تک پہنچے تھے۔ آپ نے جودھپور کے راٹھور راجپوتوں کے معرکوں میں بڑی نام آوری حاصل کی اور پیشگاہ سلطانی سے بہ صلہ ان خدمات کے "غازی الدین خاں" کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ مرہٹوں کے سردار سنبھاجی کی لڑائی بھی آپ نے سر کی اور نمایاں فتح پاکر "فیروز جنگ" کا خطاب ملا اور دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ بیجاپور کی ۱۶۸۶ء کی لڑائیوں میں آپ نے ایسی بڑی فتح حاصل کی کہ لوگ اُس کامیابی کی جزو اعظم آپ ہی کو تصور کرتے ہیں۔ اورنگ زیب آپ کی کارگزاریوں سے ایسا مسرور ہوا کہ اپنی سوانح میں ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ "بیجاپور میرے فرزند مخلص (غازی الدین خاں فیروز جنگ) کی امداد سے فتح ہوا"۔ گولکنڈہ کی لڑائی میں بھی آپ ہی سب سے آگے بڑھے رہے اور آپ ہی نے ابوالحسن تاناشاہ کو گرفتار کیا اور قید کرکے لائے۔ اگرچہ آخر عمر میں آپ کی بصارت زائل ہو گئی تھی بااین ہمہ آپ ملکی معاملات میں حسب عادت مستمرہ مصروف و منہمک رہتے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد آپ کو بہادر شاہ نے گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا اور وہیں احمد آباد میں آپ نے ۱۱۲۲ھ ۱۷۱۰ء میں انتقال کیا۔ وہاں سے آپ کا جنازہ دہلی لایا گیا اور بیرون اجمیری دروازہ مدرسے کے صحن میں جو آپ ہی نے اپنی حین حیات بنوایا تھا آسودہ کئے گئے۔

آپ کے صاحب زادے چین قلیچ خاں المخاطب بہ نظام الملک آصف جاہ مورث اعلیٰ خاندان عالیہ سرکار نظام دکن تھے۔ جنھوں نے ۱۷۴۸ء میں وفات پائی۔ آصف جاہ کے بڑے صاحب زادے نے بھی امور عظام سلطنت دہلی میں بڑا حصہ لیا اور خان دوراں خاں کی وفات اور نادر شاہ کی واپسی ۱۷۳۹ء کے بعد امیر الامراء غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی کا موقر و معزز خطاب پایا۔ آپ نے جب کہ آپ اپنے بھائی ناصر جنگ کے انتقال کے بعد اپنے مقبوضات واپس لینے حیدرآباد جارہے تھے نوراستہ ہی میں ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۲ء میں بمقام اورنگ آباد وفات پائی۔

آپ کی نعش بھی دلّی لائی گئی اور اپنے دادا کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ آپ نے ایک صاحب زادہ چھوڑا جن کا نام عماد الملک غازی الدین خاں ثالث تھا جنہوں نے احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ کی لڑائی میں ۱۷۶۱ء میں بڑا نام پایا۔ آپ مولانا فخر الدین کے (جو بڑے مشہور اور مقدس بزرگ تھے اور جن کا وصال ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں ہوا) ہم عصر تھے۔ آپ فارسی، عربی، ترکی زبانوں کے بڑے ادیب تھے۔ آپ نے علاوہ دوسری تصانیف کے ایک مثنوی بھی مولانا کی شان میں لکھی ہے۔ اس خاندان کا شجرہ یہ ہے:

- شیخ شہاب الدین سہروردی
  - عالم العلماء شیخ اسمٰعیل
    - شیخ بہاء الدین
    - قلیچ خاں شیخ میر عابد
      - میر شہاب الدین غازی الدین خاں اوّل
        - چین قلیچ خاں نظام الملک آصفجاہ
          - غازی الدین خاں ثانی
            - غازی الدین خاں ثالث
          - ناصر جنگ
          - صلابت جنگ
          - مظفر جنگ
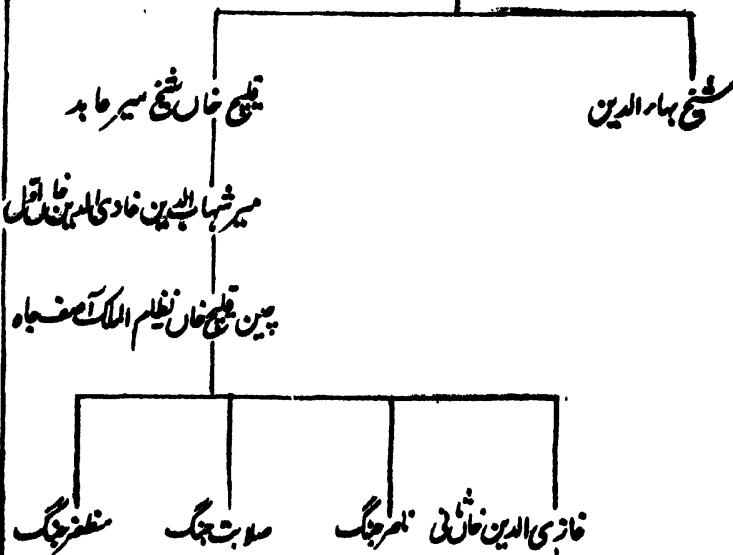
اس زمانے کے امراء اور متمول اشخاص کا دستور تھا کہ دینی اور دنیوی تعلیم کے لیئے مدارس اور مساجد اور اپنے لیئے مقابر بنوایا کرتے تھے اسی طرح نواب غازی الدین خاں نے بھی یہ عمارت بنوائی تھی۔ یہ عمارت مربع اور دو منزلہ تمام سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے جس کا

وسیع احاطہ تین سو گز مربع ہی۔ اس کے تین دروازے بہت بڑے عالی شان
اور نہایت خوب صورت ہیں خصوصاً مشرق کی طرف کا صدر دروازہ۔ مدرسے کے اندر
قدم رکھتے ہی اس کی عمارت کی خوب صورتی دروازوں ہی سے دل نشین ہو جاتی ہی
صدر دروازہ مشرقی دیوار میں ہی جس کی دو جانب اور دو چھوٹے چھوٹے دروازے بھی
ہیں جن کا راستہ صدر دروازے میں آ ملتا ہی۔ اندر جا کر ایک نہایت خوشنما اور وسیع صحن
۴ گز مربع ملتا ہی جس کے تین رخوں پر متعدد دو منزلہ پختہ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ تہ
مغرب میں ایک نہایت خوش نما اور وسیع مسجد جو سراپا سنگ سرخ کی ہی نظر آتی ہی۔ مسجد کے
تین دالان ہیں اور تین تین در ادھر اُدھر اور بیچ میں ایک بلند تہری بنگڑی دار محراب
جس کے روکار پر سنگ مرمر کی پٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ سرخ پتھروں میں سفیدی کا جوڑ
بڑا بھلا معلوم دیتا ہی۔ اس محراب کے دونوں طرف چوکون بارہ فٹ اونچے کھمبوں پر
ہشت پہلو برجیاں ہیں جن کے اوپر سنگ مرمر کے قبے ہیں اور ان کے جواب
میں مسجد کی پچھیت کی دیوار میں بھی دو برجیاں ہیں۔ اسی طرح مسجد کے چاروں کونوں پر
پست چوکور کھمبوں پر برجیاں ہیں۔ ان آٹھ برجیوں کے سوا مسجد کی پچھلی دیوار
کے دونوں کونوں پر پتلی پتلی دیوار دوز دو منار ہیں نیچے سے مسجد کی چھت سے
کچھ اوپر تک ہیں جن پر کنول کے پھول کی طرح کا گلدستہ بنا ہوا ہی۔ مسجد کے
چو طرف حسب معمول سنگین کٹہرا ہی۔ مسجد کی شمالی اور جنوبی دیواروں میں باہر وار ایک
بڑی محراب اور اس کے دونوں طرف مربع کھڑکیوں میں سنگ سرخ کی نفیس جالیاں
لگا کر بند کر دیا گیا ہی۔ مسجد کی پچھیت کی دیوار میں جوابی دیوار دوز محرابیں ہیں اور صدر محراب
کے پاس داہنی طرف کو منبر ہی۔ اندر کے دالان میں صرف بیچ کے گنبد کے نیچے
سنگ موسیٰ کی باریک تحریر کے چوالیس مصلے ہیں اور باقی دالانوں میں سنگ باسی کا
فرش ہی۔ کرسی مسجد کی بقدر دو سیڑھیوں کے ڈھائی فٹ اونچی ہی۔ فرش صحن مسجد کا
سنگ باسی کا ہی جس کی لمبان (۸۸) فٹ۔ عرض (۴۴) فٹ۔ ارتفاع ۵ فٹ ہے
چبوترے کے چاروں طرف سنگ سرخ کا ایک فٹ کا کٹہرا ہی۔ اور بجانب مشرق
پانچ سیڑھیاں ہیں۔ چھت پر جانے کا آٹھ سیڑھیوں کا زینہ ہی۔ مسجد کے تین
گنبد چونے گچی کے ہیں۔ بیچ کا گنبد بڑا ادھر اُدھر کے اس سے چھوٹے۔ ادھر ادھر

گنبدوں کے کلس ٹوٹ گئے اب صرف بیچ کے بڑے گنبد کا ایک کلس باقی ہے مسجد کے محاذ میں ایک بہت وسیع اور عمیق حوض ۴۲ مربع تھا جو اب پاٹ دیا گیا ہے۔ مسجد کے چبوترے کے نیچے ہی ایک چونے گچی کی زنانی قبر ہے جسے کسی محدثہ کی بتلاتے ہیں۔ صحن مسجد کے متصل شمال مغرق کے کونے میں ایک کنواں تھا جس پر آہنی گرڈ ڈال کر پاٹ دیا گیا ہے اور ذرا سامنے کھول کے ایک پمپ لگا دیا گیا ہے۔ مسجد کے شمال اور جنوب اوپر نیچے دو چبوترے دو دو فٹ بلند ہیں۔ دونوں شمالی رخ کے چبوتروں کی لمبان ۸۰ فٹ۔ ۷ انچ اور چوڑان ۳۰ فٹ۔ ۹ انچ ہے۔ اسی طرح کا دہرا چبوترا جنوب میں بھی ہے شمالی چبوترے کے بالائی حصے کے نیچے ۲۳ فٹ۔ ۷ انچ لمبا اور ۳۰ فٹ۔ ۹ انچ چوڑا تہ خانہ ہے نیچے کا چبوترا کھلا ہوا ہے۔ اوپر کے چبوترے کے شمالی ضلع میں تہ خانہ چھوڑ کر ایک سنگ سرخ کا دہرا دالان تین در کا ہے جس کے اندر کی چھت لداؤ کی اور باہر کڑیوں کی ہے اس کا طول ۳۶ فٹ۔ ۵ انچ عرض ۱۴ فٹ۔ ۸ انچ ہے۔ دالان کے طولانی دونوں سروں پر ایک ایک برجی ہے۔ اسی طرح نیچے کے چبوترے پر بھی ایک دہرا دالان ہے مگر وہ پانچ در کا ہے۔ جس کے اندر کے حجرے اور پیش دالان کی چھت پتھر کی سلوں کی ہے۔ اس کا طول ۴۴ فٹ اور عرض ۳۶ فٹ۔ ۵ انچ ہے۔ یہ دالان استادوں اور علماء کے رہنے کے تھے اور بجنسہ ایسے ہی دالان اس کے جواب میں دوسری طرف جنوب رخ پر ہیں۔ ان میں سے بالائی چبوترے کے اُس دالان کی جو مقبرے کے محاذ میں ہے ایک برجی جنوب و مغربی کونے کی گر گئی ہے اور دالان ٹنڈا نظر آتا ہے۔ جنوبی حصے کے اوپر کے چبوترے پر سنگ مرمر کا کھلا ہوا مجمر ۱۲ فٹ۔ ۷ انچ لمبا اور ۱۲ فٹ۔ ۲ انچ چوڑا ہے جس کے اطراف سنگ مرمر کی چار چار نہایت نفیس اور باریک نقش و نگار کی کھدی ہوئی جالیاں ہیں جو نو نو فٹ بلند ہیں اور بیچ میں ایک دروازے کی جالی ہے۔ اور فرش بھی سنگ مرمر کا ہے۔ دو طرف شمال اور جنوب میں کھلے ہوئے دروازے ہیں۔ شمالی دروازہ مسجد کی دیوار کے قریب ہے اور جنوبی دروازے کے سامنے دو سیڑھیاں سنگ مرمر کی ہیں۔ اس دروازے کے ہر دو جانب پتلی پتلی بہت خوب صورت مناریں ہیں اور اسی طرح شمالی دروازے پر بھی اور گو کہ مغرب اور مشرق میں کھلا ہوا دروازہ نہیں ہے مگر وسط کی جالی پر جو بمنزلہ دروازے کے ہے دو دو منار ہیں اور چار منار چاروں کونوں پر اس طرح جملہ

بارہ منار ہیں جو بہت نازک ہونے سے وہ ٹوٹ بھی گئے - مقبرے کے اندر کا چبوترا ۲ ۱/۲ فٹ بلند ہے مقبرے کے اطراف جالی دار سنگ مرمر کا کٹہرا ایک فٹ بلند ہے مقبرے کے اندر صرف تین قبریں سنگ مرمر کی برابر برابر ہیں جن میں سے بیچ کی میر شہاب الدین غازی الدین خاں اول بانی مدرسہ کی ہے - داہنی طرف اُن کے بیٹے چین قلیچ خاں نظام الملک کی ہے اور بائیں طرف اُن کے پوتے غازی الدین خاں ثانی کی ہے - مقبرے کے باہر بجانب شرق چار بڑی اور دو بچوں کی سنگ مرمر کی قبریں ہیں جو غالباً اسی خاندان کے لوگوں کی ہوں گی - اندرونی اور بیرونی احاطے کے درمیان بھی سنگ مرمر کا فرش ہے - مقبرے کے باہر ایک دوسرا احاطہ ۴۴ × ۴۳ فٹ ہے جس کی مشرقی دیوار میں نو نو جالیاں دس دس فٹ بلند کسی عمدہ قسم کے ملگجے پتھر کی ہیں اور ایک دروازہ جنوب رخ کا کھلا ہوا ہے جس کے پٹ سنگ مرمر کے کسی زمانے میں سنتے اب نہیں ہیں اور شمال رخ پر دروازہ تو نہیں رکھا مگر پتھر کی سل میں عین مین دروازے کی شکل بنا کر بند کر دیا ہے جو دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چوکھٹے میں سنگ مرمر کے پٹ بھڑے ہوئے ہیں - اس تختی پر منبت کاری کے بیل بوٹے بڑی نفاست سے بنے ہوئے ہیں - ان جالیوں کا کام بھی قابل دید ہے - جالیوں کے اوپر دو فٹ اونچا جالی دار کٹہرا ہے جس کے ساتھ ہر ہر جالی کے دونوں طرف پتلی پتلی صراحی دار برجیاں تھیں جو تعداد میں آٹھ ہیں سب کی سب شکستہ ہیں - اسی طرح کی جالیاں مغرب کی دیوار میں بھی ہیں لیکن مغرب میں کوئی دروازہ نہیں رکھا گیا تھا بلکہ اُدھر دو پتھر کی سلیں دروازہ نما رکھی گئی تھیں جن میں سے ایک اپنی اصلی حالت پر قایم ہے اور دوسری سل نکال کر پھینک دی ہے صرف کھلی چوکھٹ رہ گئی ہے - مقبرے کے بیرونی احاطے کی مشرقی اور مغربی دیواریں تو ان جالیوں کی بنی ہوئی ہیں شمال اور جنوب کی طرف کوئی دیوار نہیں ہے شمال رخ پر مسجد کی دیوار آگئی ہے اور جنوبی رخ پر دالان ہیں مقبرے کا کل حصہ نہایت بے مرمت ہے - فرش ناہموار - خراب میلا جالیاں اور برجیاں جابجا سے شکستہ - افسوس ہے کہ جس مدرسہ کی اس قدر خطیر آمدنی ہو اور جس میں ایک بڑا بھاری ہال ہزار ہا روپیہ لگا کر بنایا گیا ہو اور جس میں ڈیننگ ہال کی وسیع عمارت بنی ہو وہاں اس مدرسہ کے بانی کی اصلی یادگار اس کس مپرسی کی حالت میں ہو

لہ الحمدللہ کہ اس تحریر کے بعد بیشگاہ خداوندی اعلیٰ حضرت نظام دکن دام اقبالہم سے سترہ ہزار روپیہ کی خطیر رقم یہاں کی مرمت کے لیے منظور فرمائی گئی ہے اور اب امید ہے کہ اچھی طرح درستی ہو جائے گی - مترجم

بس کہ زیں مژدہ جان بخش بخود بالیدم   غنچہ ساں در بر ما تنگ ہمی گشت قبائے
چوں بہ بالیش ز اندازۂ خواہش بخشید   بیش ز اندازۂ خواہش دہدش اجر خدائے

جس کے فیض جاریہ کا یہ سب کچھ ظہور ہے۔ نیچے کے چبوترے پر پائیں باغ بنا دیا ہے۔ اس چار دیواری کے اندر چند خوش نما درخت تھے جن میں سے اب کوئی کوئی باقی رہ گیا ہے۔ اب ہم مدرسہ کی عمارت کا بیان کرتے ہیں۔ شمالی اور جنوبی سمت کی قطاروں میں دو منزلہ چالیس چالیس کمرے ہیں جس کے سامنے ایک وسیع برآمدہ ہے مشرقی جانب وسط میں صدر دروازہ ہے جس کے ادھر اُدھر دو مسقف چھوٹے دروازے ہیں جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ ان کے بیچ میں ایک گنبد نما ہال ہے جس کے دائیں اور بائیں رُخ پر دو منزلہ چالیس کمروں کی ایک قطار تھی جن کی پچھیت کی دیوار ایک ہی تھی۔ ان میں سے بیس کمروں کا رخ مشرق کو تھا اور بیس کا عمارت کے اندروالے جنوب کو۔ یہ کمرے طلبار کی رہائش کے واسطے تھے جن کی حیثیت میں اب کچھ تبدیلی کردی گئی ہے اور اسی جگہ دو زینے سترہ سترہ سیڑھیوں کے ہیں ان کے علاوہ شمال میں اور تین جنوب میں چار زینے اور باہر آنے جانے کے راستے ہیں۔

عمارت کے چاروں کونوں پر بائیس بائیس فٹ مربع برج ہیں اس عمارت کے سامنے تا بہ خندق ایک وسیع میدان اجمیری دروازے کے باہر تک تھا۔ شمال مغرب اور جنوب کی طرف دوسری شاندار عمارتیں اور امرا کے مقبرے تھے جن کے نشانات اب تک بھی کچھ کچھ باقی ہیں۔ انھیں عمارتوں میں مولٰنا فخر الدین کا مدرسہ بھی تھا جہاں وہ خود درس دیا کرتے تھے اور جہاں اُنھوں نے ۱۷۹۹ء میں انتقال کیا اور غسل کے بعد قطب صاحب میں دفن ہوئے۔ جس مقام پر آپ کو غسل دیا گیا تھا وہ جگہ بڑی متبرک خیال کی جاتی ہے۔ مسجد کے پچھواڑے چند گز کے فصل سے نیم کے درخت کے نیچے ایک ہشت پہل گڑھے میں دو سنگ مرمر کی قبریں ہیں جو نہیں معلوم ہوتا کہ کس کی ہیں۔ اس چبوترے سے (جو ڈہائی فٹ اونچا ہے اور جس پر سنگ مرمر سنگ موسیٰ اور سنگ سرخ کا چوکڑی کا شکستہ اُکھڑا اُکھڑا فرش ہے) ایسا معلوم دیتا ہے کہ پہلے اس پر گنبد تھا جو گر گیا کیوں کہ گنبد کی موجودگی کی علامات اب تک موجود ہیں۔ قبروں کے تعویذوں پر قابل دید نقش و نگار اور آیات قرآنی منبت خط نسخ میں

---

[۱] کتاب سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ اجمیری دروازے کے پاس سنگ مرمر کے چبوترے پر نواب قمر الدین خاں وزیر کی قبر تھی جس کا اب کہیں پتہ نہیں۔

کندہ ہونے کے علاوہ رنگ برنگ کے پتھروں کی پچیکاری کا کام تھا جس کا کچھ کچھ حصہ اب بھی باقی ہے۔
(۱) پہلی قبر کے تعویذ کے اطراف پوری آیۃ الکرسی ھو العلی العظیم تک اور ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب والشہادہ ھو الرحمن الرحیم تا سبحان اللہ عما یشرکون ہے۔ (۲) دوسری قبر کے تعویذ کا نقشہ یہ ہے۔
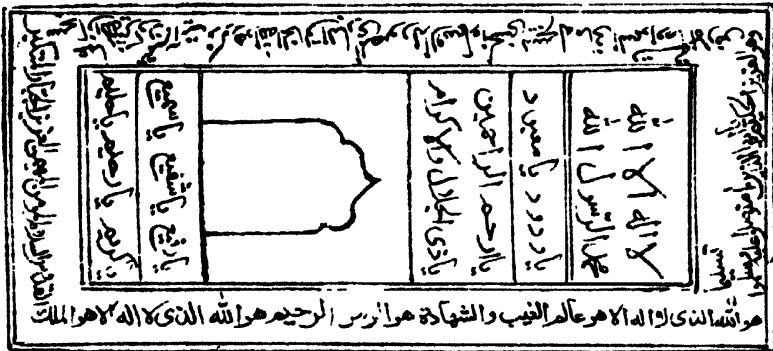
مدرسہ جس طرح اب کھلے میدان میں ہے پہلے کبھی یہ حالت نہ تھی نہ شہر دہلی کے قرب میں اتنا وسیع میدان مل سکتا تھا بلکہ چوطرف عمارات سے گھرا ہوا تھا اب اگرچہ وہ سب عمارات ڈھاکر میدان صاف کردیا ہے یعنی مدرسہ کی شرقی حد سے تا بہ اجمیری دروازہ ایک مکان بھی نہ رہا اب ۱۹۱۵ء میں میونسپل کمیٹی نے مدرسہ کا ایک کمپونڈ اجمیری دروازے کے رخ پر بناکر ایک پھاٹک لگادیا ہے یعنی حدود مدرسہ کی حد بندی ہوگئی۔ مدرسہ کے اطراف میں اوپر کی لکھی ہوئی دو قبروں سے اور آگے مغرب کی طرف بڑھ کے ایک بڑا قبرستان ہے جس کا بڑا حصہ جی۔ آئی۔ پی دلی آگرہ کارڈ ریلوے[1] میں آکر نشان تک نہ رہا صرف ایک تہ خانے کا پختہ چبوترہ سولہ گز مربع اور ایک گز اونچا اور اس کے پاس کچھ تھوڑی سی قبریں باقی رہ گئیں ہیں جو ریلوے لین سے بالکل مل گئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس جگہ ایک مسجد بھی تھی جو آگرہ دہلی کارڈ لین نکلنے کے وقت ریل میں آگئی چنانچہ اس حوض کا نشان جو صحن مسجد میں تھا اب بھی باقی ہے۔ مگر ریل کی زد سے یہ تہ خانہ

---

[1] یہ لین یکم اپریل ۱۹۰۵ء کو کھلی ہے۔ ۱۲

بچ گیا۔ تہ خانے کے اندر حافظ سعد اللہ نقشبندی اور اُن کے صاحب زادے کی چبوترے پر دو قبریں پختہ چونے گچی کی ہیں۔ حافظ صاحب کا نام تو لکھا ہوا ہی دوسرے صاحب کی قبر پر کوئی کتبہ نہیں۔ چبوترے کی بندش۔ اس کے کونے۔ اُس کی کرسی سب بتلا رہی ہی کہ اس پر ایک وسیع گنبد تھا جو گر گیا چبوترا باقی رہ گیا۔ عام طور پر قبریں تہ خانے کے اندر نہیں بنائی جاتیں نہ اس کی ضرورت ہی تہ خانے میں وہی قبریں بنائی جاتی ہیں جن پر گنبد ہوتا ہی اور گنبد میں اُس کا بالائی تعویذ بنا دیا جاتا ہی اور اندر تہ خانے میں اصل قبر رہتی ہی۔ اسی طرح مدرسہ کے جنوب مغرب میں ایک ۱۱½ گز مربع اور ایک گز اونچا پختہ چبوترا ایک پرانے نیم کے درخت کے نیچے ہی جس پر سنگ مرمر کے تعویذ کی دو قبریں ہیں ایک پر اطراف آیۃ الکرسی کھدی ہوئی ہی دوسری کے تعویذ کے بالائی رخ پر اللہ اور اس کے نیچے کلمۂ طیبہ ہی۔ جہاں بانیان مقابر کا پتہ نہ چلے جن میں ہزارہا روپیہ خرچ ہوا اور آسمان سے پڑے باتیں کر رہے ہیں وہاں ایسی چھوٹی موٹی قبروں کا کون جانے کہ کس کی ہیں اور خود اُن بزرگوں کا جو اس میں آرام کرتے ہیں یہ منشا تھا کہ اُن کا نام چلے اسی وجہ سے کسی صاحب کے نام کا کتبہ نہیں لگایا گیا۔ اب اس مدرسے کے متعلق اور کچھ تاریخی حالات الی زماننا ہذا سنیئے۔ ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے دلی فتح کی تو مرہٹوں کی یورشوں کا بڑا دھڑکا لگا رہتا تھا جو دکن سے آکر لوٹ مار کرتے تھے ایسی حالت میں شہر کی فصیل کے باہر ایسی بڑی عمارت کا رہنا دور اندیشی سے بعید تھا اس لیئے مدرسہ اور اُس کے آس پاس کی عمارتوں کو ڈھاکر میدان صاف کر دینے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ مدرسہ کا ایک اور عظیم الشان دروازہ جو موجودہ دروازے کے علاوہ تھا اور اُس کے ساتھ کی عمارتیں اور چاروں کونوں کے چار برج سب ڈھا دیئے گئے لیکن چوں کہ عمارت نہایت پختہ اور سنگ بست تھی اس کا ڈھانا کچھ آسان نہ تھا اس کے ڈھانے ہی کے لیئے ہزارہا روپیہ۔ اور وقت درکار تھا جب تک کہ ایک گز بھر دیوار ٹوٹتی تھی کئی ایک کدالیں ٹوٹ جاتی تھیں اور عمارت بھی بسبب خوبی کے یادگار سلف تھی اس کا انہدام موقوف کر کے ایک خندق اُس کے گرد کھدوا کے اس کو شہر کے اندر شامل کر لیا۔ اب شہر کی فصیل اور برج سب توڑ کر میدان صاف کر دیا گیا ہی صرف اجمیری دروازہ تن تنہا کھڑا ہی۔ مسجد کے پیچھے

ایک برج تھا جو "اکبر شاہ کا برج" کہلاتا تھا۔ سنہ ۱۸۲۵ء میں گورنمنٹ نے ایک علوم مشرقی کا دار العلوم قایم کیا جس کے مدرس اول مولوی رشید الدین خاں صاحب ایک بڑے عالم متجر تھے۔ اس کالج نے علمی درس گاہ کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل کی اور بڑے بڑے جید علمار اس سے نکلے جیسے کہ فخر زمانہ سر سید احمد خاں۔ بالقابہ شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں شمس العلما رمولوی ضیاء الدین خاں ایل ایل ڈی شمس العلمار ڈاکٹر نذیر احمد خاں بہادر ایل ایل ڈی۔ ڈی او۔ ال (خاکسار کے والد ماجد) وامثالہم۔ یہ کالج اسی عمارت میں سنہ ۱۸۴۲ء تک رہا بعد میں کشمیری دروازے کے قریب رزیڈنسی کی عمارت میں رہا جس میں پہلے دہلی کالج تھا جو سنہ ۱۸۷۷ء میں شکست ہوا اور اب گورنمنٹ ہائی سکول ہی لیکن مدرسہ کی عمارت کالج کے پرنسپل کے تفویض رہی جو طلبائے بورڈنگ ہوس کے کام آتی تھی اور ایک علوم مشرقی کا کالج بطور بڑے کالج کی برانچ کے چندے سے کھولا گیا۔ اس کے بعد یہ عمارت پرنسپل سے لیکر اس میں کلکٹر صاحب ضلع نے ایک ہندوستانی دواخانہ کھولا جس کا نام "دار الشفائے یونانی" رکھا جہاں ایک طبیب رہ کر مفت دوائیں دیتا تھا۔ مریض لوگ انھیں کمروں میں رہا کرتے تھے۔ غدر کے بعد یہ عمارت پولیس کو مل گئی اور فروری سنہ ۱۸۹۰ء تک پولیس لین اس میں رہی جب سر جیمس لائل لفٹنٹ گورنر پنجاب کی مہربانی سے اس مدرسے کو یہ عمارت دے دی گئی۔ مشرقی جانب کے کمروں کی دورخی لین میں آٹھ کمرے جماعتوں کے لیئے سترہ ہزار کی لاگت سے گورنمنٹ نے درست کرا دیئے کیوں کہ مدرسے کے فنڈ میں اس قدر خطیر رقم کی گنجایش نہ تھی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں پھر دوبارہ گورنمنٹ نے پانچ ہزار روپیہ مدرسے کی عمارت کی مرمت کے لیئے عطا کیئے جس میں تین ہزار روپیہ سکول فنڈ سے ملا کر تمام عمارت کو ٹھیک ٹھاک کر لیا گیا۔ تمام کمروں میں اینٹوں کے چوکوں کا فرش کیا گیا اور سنہ ۱۹۰۸ء میں تمام کمروں میں دروازوں کی جوڑیاں چڑھا دی گئیں چوں کہ مدرسے کے لیئے ایک وسیع کھیل کے میدان کی ضرورت تھی شمال کی طرف خندق بہ صرفہ دو ہزار روپیہ پاٹ کر زمین سنہ ۱۹۰۹ء کو ہموار کر کے گھانس لگا دی گئی۔

ذرائع آمدنی

سید فضل علی خاں صاحب دراصل دلی کے باشندے تھے جو لکھنئو پہنچے چلے گئے اور وہاں شاہ اودھ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ بڑھتے بڑ

بعد نواب غازی الدین خاں حیدر ۱۸۲۹ء وزیر اعظم کے عہدۂ جلیلہ سے ممتاز و سرفراز ہوئے۔
اور پندرہ مہینے قلمدان وزارت آپ کے سپرد رہا۔ آپ نے ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ اہل دہلی
کی تعلیم کے لیئے گورنمنٹ کے تحویل فرمایا۔ نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں نے
اس پیش قدر عطیہ کے بعد ہی ۱۹ شوال ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء میں بمقام لکھنؤ وفات پائی اور وہیں
آپ حسب وصیت خود میر خدا بخش کی کربلا میں مدفون ہوئے۔ اس گراں قدر عطیہ کے
ساتھ علوم مشرقی کے کالج کا سرمایہ بھی ملا دیا گیا جو اسی عمارت میں قایم تھا ۱۸۴۴ء
میں صدر دروازے کی پیشانی پر اندر وار آپ کے عطیہ کی یادگار میں یہ کتبہ نصب کیا گیا۔

کتبہ
نہ بر لوح نقشے بماند و لیک جزائے عمل ماند و نام نیک
بیاد حسنات نواب اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علیخان بہادر سہراب جنگ
کہ یک لک و ہفتاد ہزار روپیہ برائے ترقی علوم مدرسہ ہذا واقعہ دہلی خاص مولد و موطن
خویش بصاحبان کمپنی انگریز بہادر تفویض نمودہ اند منقوش گردیدہ در ۱۸۲۹ء عیسوی

یہ روپیہ بہ شکل پرامسری نوٹوں کے ۱۸۸۳ء تک بطور پراونشیل فنڈ کے رہا اس کو قدیم مدارس
اضلاع مقامی بورڈ کے سپرد کر دیئے گئے۔ یہ مدرسہ بھی مقامی کمیٹی کے زیر اہتمام دے دیا
گیا اور اس کی رقم پراونشیل فنڈ سے علیحدہ کر کے دہلی ڈویزن کے کمشنر صاحب کے
تفویض کی گئی اور وہی اس کے منتظم قرار پائے۔ اس فنڈ کی رقم بڑھتے بڑھتے
ایک لاکھ نوّے ہزار پانسو تک پہنچ گئی جس کی سالانہ آمدنی سم ۵۶۵ سہ ہے۔
دوسرے ذریعہ آمدنی میں فیس کی رقم قریب تیرہ ہزار روپیہ کے ہے اور پراونشیل
گرینٹ عدللمعہ ۔ اس طرح ۱۶-۱۹۱۷ء میں بشمول تیرہ ہزار روپیہ بچت سال گزشتہ
قریب سینتالیس ہزار روپیہ کے ہوئی جس میں سے تینتالیس ہزار روپیہ خرچ
جا کر چار ہزار روپیہ سلک رہی۔

منتظمین مدرسہ کے فنڈ کی ٹرسٹی گورمنٹ ہے جس نے لوکل کمیٹی کو جس کے
بارہ سربرآوردہ ممبر ہیں اختیارات دے دیئے ہیں۔ اس کمیٹی
کے میر مجلس صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی ہیں۔ انسپکٹر مدارس اور ڈائرکٹر صاحب

تعلیمات اکس آفیشیو ممبر ہیں۔ بارہ ممبروں میں سے ایک شخص کا انتخاب بطور سکرٹری کے ہوتا ہے۔

عمارت کا اضافہ یوں تو عمارت میں بہت کچھ ردوبدل ہوا ہے۔ مگر دو عمارتیں خاص کر ذکر کے قابل ہیں۔ اس مدرسے میں ایک بڑے ہال کی ضرورت تھی جو حال میں اٹھارہ ہزار کے صرفہ سے قدیم عمارت مدرسہ کے جنوب میں ایک گلی چھوڑ کر بنایا گیا ہے۔ یہ ہال ۹۷ فٹ ۲½ انچ لمبا اور ۳۵ فٹ ۴ انچ چوڑا ۲۱ فٹ بلند نہایت وسیع اور خوش نما بہت عالی شان لوہے کے گرڈر ڈال کر بڑی کفایت سے بنایا گیا ہے۔ جس کے سامنے ۹۷ فٹ × لمبا اور ۱۲ فٹ ۱ چوڑا برآمدہ ہے۔ کل رقبہ ۳۴۹۶ مربع فٹ ہے اور گنجایش (۱۳۰۰ ۸) مربع فٹ بالائے سطح ارض ہے۔ دوسری عمارت ڈیننگ ہال کی ہے جو مسجد کے ایک طرف شمال میں ہے۔ جو دالان در دالان ہے جس میں (۵) در ہیں اور ڈاٹ کی چھت ہے۔ ہال کی لمبان ۸۴ فٹ ۹ انچ ہے۔ اندر کا دالان ۱۷ فٹ ۳ انچ چوڑا ہے اور باہر کے برآمدے کی چوڑان گیارہ فٹ ایک انچ ہے۔ جس کے سامنے ایک چبوترہ ۶۷ فٹ ۹ انچ لمبا اور ۳۴ فٹ ۳ انچ چوڑا ہے۔ ڈیننگ ہال کی لاگت ڈہائی ہزار روپیہ ہے۔ اس مدرسے میں ۴۴ معلمین ملازم ہیں۔ اور تعداد طلبا کی ۱۱۲۳ ہے۔

اسلامی کالج بننے کی خبر اب مدرسہ میں مٹریکیولیشن یعنی انٹرنس تک تعلیم ہوتی ہے جناب مولوی حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب حاذق الملک بہادر کو خیال پیدا ہوا ہے کہ اسے کالج کے درجے تک پہنچا دیں۔ چنانچہ بمصداق الدال علی الخیر کفاعلہ حکیم صاحب ہی کی کوشش اور وجاہت سے ایک معتد بہ رقم چندہ کا وعدہ ہو گیا ہے جس میں سے کچھ وصول بھی ہوئی ہے مگر کام کی رفتار سست ہے۔ حکیم صاحب کا حال یہ ہے کہ ایک انار و صد بیمار ان پر طبیہ کالج ہی کا بھاری بوجھ ہے۔ جب تک توجہ کی یکسوئی نہ ہو اور رات دن اسی کی دھن نہ لگی ہو یہ توقع کہ اینگلو عربک سکول کالج ہو جائے گا ناممکن العمل نہیں تو دیر طلب ضرور ہے۔ مدرسہ کے کمپونڈ کے دروازے کے دونوں طاقوں پر حال میں سنگ مرمر کی دو تختیاں لگائی گئیں ہیں۔ جن پر بخط انگریزی یہ کندہ ہے:۔ داہنی طرف۔ اینگلو عربک سکول ادا ۱۸۹۰ء پولیس لینس ۱۸۹۰–۱۸۲۰ء بائیں طرف کالج و مقبرہ فیروز جنگ اول مدرسہ ۱۸۵۷–۱۷۹۰ء

شاہ جی کا تالاب

اجمیری دروازے کے باہر لب سڑک یہ بہت بڑا وسیع تالاب ہے اب بالکل مٹی سے اٹ گیا ہے تھوڑا سا پانی بیچ میں کھڑا ہوا ہے۔ تالاب کے گرد نفیس اور پختہ گھاٹ بنے ہوئے ہیں۔ دو طرف کی سیڑھیاں بالکل ٹوٹ گئیں۔ دو طرف کی باقی ہیں اور اچھی حالت میں ہیں۔ یہ سیڑھیاں گھڑے ہوئے پتھر کی ہیں۔ تالاب ہشت پہلو ہے جس کا ہر ضلع (۲۴۰ قدم) ہے۔ چھ ضلع سالم ہیں ایک مغرب و جنوب کے گوشے کا آدھا ٹوٹا ہوا ہے اس کی مرمت اینٹوں سے کی گئی ہے اور جنوبی ضلع بالکل ٹوٹ گیا ہے۔ پانی تک (۱۱) سیڑھیاں ہیں پھر سیڑھیوں کے بعد چاروں طرف پختہ فرش ہے۔ شاہ جی کا اصلی نام نواب شادی خاں تھا جو بلخ کے رہنے والے اور شاہ عالم ثانی (سنہ ۱۷۵۹-۱۸۰۶ء) کے وقت میں آئے تھے یہ تالاب انھیں کا بنایا ہوا ہے اور کوڑیا پل بھی انھیں کا۔ چھتہ شاہ جی کے ضمن ہی میں ان کا مفصل ذکر آ چکا ہے سنا جاتا ہے کہ اس تالاب کو پاٹ دینے کا ارادہ ہے اور اسی وجہ سے کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ پاٹنے میں کچھ صرف نہیں ہوتا خدا سلامت رکھے کوڑے کرکٹ کو۔ گرتا بھی جاتا اور خود بخود بھرتا بھی جاتا ہے۔ اب رہا بنوانا اس کے لیئے خزانے کا منہ کھولنا پڑتا ہے تو اب کسے پڑی ہے کہ اس تالاب کو درست کرائے اور ضرورت ہی کیا ہے صاف میدان میں جو لطف ہے اس کا کیا کہنا۔ جہاں تک نظر جائے صفاچٹ۔ نگاہ کو روکنے والی کوئی چیز نہ ہو یہی آج کل کا فیشن ہے۔ اس گڑھے میں دھرا کیا ہے جس میں پانی جمع ہو کر سڑے اور عفونت پیدا ہو۔ ہیضے کا معدن۔ پھر مچھروں کا مخزن یعنی ملیریا کا سوت اس سے تو خس کم جہاں پاک یہی بہتر ہے کہ ذرا سا ٹوٹا پھوٹا جو رہ گیا ہے وہ بھی برابر کر دیا جائے۔

ترکمان دروازے سے باہر جا کر تقریباً سو قدم کے فاصلے پر سڑک ملتی ہے جو دائیں طرف شاہ جی کے تالاب پر سے ہوتی ہوئی اجمیری دروازے سے جاملی ہے اور بائیں طرف دلّی دروازے تک چلی گئی ہے ترکمان دروازے سے نکل کر اس سڑک پر تراہہ واقع ہوا ہے۔ سامنے سیدھی سڑک بوچڑ خانے کو جاتی ہے۔ دائیں بائیں دو قبرستان پڑتے ہیں۔ بائیں طرف چولسنٹھ کھمبا اور اس کے اندر ایک مسجد ہے یہاں شاہ فدا حسین صاحب رسول شاہی علیہ الرحمہ بیٹھتے تھے اور اس مقام پر اسی خاندان کے لوگ مدفون ہیں جن کا تفصیلی حال آگے آئے گا

یہاں سے آگے سڑک کے بائیں طرف تقریبًا پانسو قدم پر۔

مولانا سید محبوب علی صاحب ۱۲۸۰ھ کا مزار ہے جو اپنے زمانے کے مستند علماء میں سے تھے اور مولانا شاہ عبد العزیز صاحب کے ارشد تلامذہ واعاظم خلفاء میں سے تھے۔ آپ سید جعفری نقوی رضوی تھے آپ کی پیدائش یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۰۰ھ کی ہوا اور دہم ذی حجہ سنہ ۱۲۸۰ھ میں رحلت فرمائی۔

خواجہ میر درد کی باغیچی اور قبرستان ترا ہے سے داہنی جانب مغربی اور جنوبی گوشے کے درمیان باغیچی سے مسجد کی مسجد کی دیوار نظر آتی ہے۔ اس باغیچی کے درخت تو سب کٹ کٹا گئے صرف قبرستان ہی قبرستان رہ گیا ہے جس میں کئی بزرگوں کے مزار ہیں۔

خواجہ ناصر زیر علیہ الرحمہ آپ سید صحیح النسب شاہ سعد اللہ المعروف بہ شاہ گلشن قدس سرہ کے خلیفہ تھے۔ عندلیب تخلص کرتے تھے نالۂ عندلیب آپ کی تصنیف ہے۔

خواجہ میر درد علیہ الرحمہ ۱۱۳۳-۹۹ھ دوسرا مزار آپ کے صاحب زادے خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کا ہے۔ آپ کی ولادت ذیقعدہ ۱۱۳۳ھ روز شنبہ میں ہوئی۔ ظاہری اور باطنی دونوں علوم کے خزانہ تھے۔ نالۂ عندلیب کی مبسوط شرح لکھی۔ علم الکتاب نام رکھا۔ نالۂ درد آہ سرد۔ دردِ دل۔ شمع محفل وغیرہ آپ کی تصنیفات ہیں۔ ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو صبح صادق سے پہلے (۶۶) برس کی عمر میں انتقال فرمایا لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے

هو الناصر

ذو الشاکرین اول المحبین خواجہ میر علی محمد المتخلص بہ درد تحیات اللّٰہ علیہ ولوالدیہ

وعلی من توسّل الیہ

خورشید ضمیر خواجہ میر درد ست	ہم میر و فقیر خواجہ میر درد ست
ہم بدر منیر خواجہ میر درد ست	ہم مرشد و پیر خواجہ میر درد ست

خواجہ محمد میر اثر تیسرا مزار ان کا ہے جو خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے اس پر یہ کتبہ ہے:۔

از لبسکہ غلام خواجہ میر یم اثر — زیر اقدام خواجہ میر یم اثر
از رحمت حق زندۂ جاوید شویم — ہرگاہ بنام خواجہ میر یم اثر

خواجہ ناصر وزیر ۱۲۹۹ھ

چوتھا مزار خواجہ میر درد کے پوتے ناصر وزیر کا ہے جنھوں نے ۱۲۹۹ھ میں عین عالم جوانی میں انتقال کیا۔ اب خواجہ ناصر سعید اور خواجہ ناصر نذیر فراق آپکے نبیرے موجود ہیں۔

چولسٹھ کھمبا

ترکمان دروازے کے باہر بوچڑ خانے اور مہندیوں کے پاس چولسٹھ کھمبے کی ایک بڑی عالی شان اور نہایت مستحکم عمارت زمانۂ قدیم بلحاظ طرز تعمیر عہد افاعنہ کے زمانے کی بنی ہوئی معلوم دیتی ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں ہے نہ آثار الصنادید میں اسکا بیان ہے۔ یہ عمارت لمبوتری ہے مشرق میں دوہری قطار پانچ پانچ عالی شان محراب دار دروں کی ہے جن کی اونچان ۱۰ ۱/۲ اور چوڑان ۸ ۔ ۵ ہے۔ محاذ میں تمام چوڑا اور سنگین چھجا بھاری بھاری توڑوں پر لٹکا ہوا ہے۔ یہ عمارت ۱۰۱ فٹ لمبی اور ۵۶ فٹ چوڑی اور ۴۴ ۱/۲ اونچی ساری لداؤ کی ہے۔ شمال اور جنوب میں ایک ایک چھوٹا در ہے اور چار چار در اور ہیں ذرا اونچی سطح پر ان سے اُتر کر پانچ پانچ در ہیں۔ یہ عمارت کا طولانی حصہ ہے۔ جس کے شمال اور جنوب کے کونوں پر پشتیبان کی طرح کے دو سنگین دیوار دوز مینار بطور فیل پایوں کے چوڑے ہیں ایک ادھر اور ایک ادھر۔ اس عمارت کے محاذ میں بجانب مشرق دوہرا دالان پانچ دروں کا ہے جس کے دس در ہوئے۔ یہ دالان ۴۲ ۱/۲ لمبے اور ۱۳ فٹ ۱ انچ چوڑے ہیں۔ شمالی اور جنوبی دالانوں میں تین تین در ہیں یعنی دو دو دالانوں کے چھ در ہوئے۔ اس طرح جملہ سولھا در ہوئے چار چار در کا ایک مربع حصہ ہوکر ۱۶ × ۴ = ۶۴ کے اسی حساب سے چولسٹھ کھمبا کہلاتا ہے۔ اس کے اندر صحن کے مغرب میں اکہرے دالان اور سپاٹ لداؤ کی چھت۔ کی ایک مسجد بلا مینار کی ہے۔ مسجد کے تین در ہیں جس کے ستون دُہرے ہیں اور ہر سہ جانب چوڑا اور بھاری سنگین چھجہ مضبوط اور بھاری توڑوں پر لٹکا ہوا ہے۔ یہ در اونچان میں ۱۲ فٹ اور چوڑان میں ۷ ۱/۲ ہیں۔ شمال جنوب میں ایک ایک حجرہ ہے اور صحن کے داہنے بائیں دہرے دروں کی سہ دریاں ہیں۔ اوپر چڑھنے کا زینہ دو طرفہ بارہ سیڑھیوں کا ہے اوپر جاکر زینہ پھٹ کر ایک طرف

مسجد کی چھت پر گیا ہی دوسری طرف سہ دریوں اور چونسٹھ کھمبے پر جاتا ہی۔ چونسٹھ کھمبا اور مسجد یہ دونوں عمارتیں بہت پائدار ہیں البتہ چونسٹھ کھمبے کا حصہ جانب جنوب کا دالان گرگیا ہی۔ باہر ایک کنواں بھی اُسی زمانے کا ہی۔ چونسٹھ کھمبے کے چاروں طرف قبرستان ہی قبرستان ہی۔ حاجی غلام علی نقیب الاولیا جن کی وفات ۵ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ میں ہوئی یہیں مدفون ہیں۔ یہ قبرستان بخشی کا تکیہ اور کالے کا تکیہ کہلاتے ہیں۔ اب چونسٹھ کھمبا اور مسجد دونوں ویران ہیں کاریگر چونسٹھ کھمبے کے دالانوں میں ریشم کا بانا کھولا کرتے ہیں۔ چونسٹھ کھمبے کی شمالی دیوار سے ملا ہوا ایک پست احاطہ ہی جس میں دو قبریں ہیں جن پر سنگ مرمر کی دو مدوّر سلوں پر یہ کتبے ہیں :-

مرقد

(۱) حکیم خواجہ کاظم علی خاں خلف خواجہ ہاشم علی خاں ابن نواب دبیرالدولہ زین العابدین خاں بہادر پنجم ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۰ ہجری کہ نیم شب روز آدینہ رخت سفر ازیں جہاں گزران بربست

خواب گاہ

(۲) نوبادۂ باغ جوانی حکیم محمد مظفر علیخاں خلف الصدق حکیم خواجہ کاظم علیخاں کہ بعد از تحصیل علوم درسیہ و تکمیل فنون طبیہ در عنفوان شباب بعمر بست و چار سالگی روز دوم از عشرہ محرم الحرام ۱۳۲۴ھ آخر روز شب دوشنبہ بجوار رحمت حق پیوست

ولی حسن کی چوکھنڈی چونسٹھ کھمبے کے مشرق میں ایک چوکھنڈی ہی ۸ فٹ لمبی ۵ فٹ ۱ انچ چوڑی ۶ فٹ ۱۰ انچ اونچی ہی جس کے سامنے ۱۲ × ۱۸ فٹ کا پختہ چبوترا بنا ہوا ہی۔ جس کے چاروں طرف جالیاں اور اندر ایک قبر ولی حسین کی ہی۔ دروازے کی پیشانی پر یہ کتبہ ہی۔ نئی بنی ہوئی ہی۔ سال کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

یا اللہ

ایں روضہ شد منور با نور صبحگاہی

رسول شاہیوں کا مقبرہ اختیار الدولہ کا گنبد چونسٹھ کھمبے کے جنوب میں ایک پختہ پست دری ہی جس پر ایک بہت بلند اور پھیلا ہوا گنبد ہی۔ جس پر چونے گچی کا کلس ہی اور چھت لداؤ کی ہی۔ اس میں ہر چہار طرف پانچ پانچ در ہیں۔ یعنی کل بیس در ہوئے۔ یہ در بہت پست اور تنگ ہیں ۵ فٹ ۱/۲ انچ اونچے اور ۲ فٹ ۱/۲ انچ چوڑے

چبوترے۔ اس مقبرے کے گرد پختہ صحن ہے جس پر بہت سی متفرق قبریں ہیں۔ یہ مقبرہ رسول شاہیوں کا ہے۔ جن کی قبریں اطراف پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اصلی مقبرہ اختیار الدولہ خواجہ علی احمد خاں احراری کا ہے اور مقبرے کے اندر ایک ہی قبر ہے۔ اس کے شمال میں ایک منہدمہ کنواں ہے جس کی منڈیر کے گرے ہوئے بڑے بڑے ڈھیم پڑے ہیں۔ صحن میں ایک بڑا قدیم بڑ کا درخت ہے۔

فخر جہاں کی چوکھنڈی یہیں چونسٹھ کھمبے کے جنوب میں ایک چوکھنڈی ہے جس کے اندر یعقوب بیگ ایوب بیگ۔ فخر جہاں کی قبریں ہیں اور باہر اسمٰعیل خاں اور قمر الدین کے علاوہ اور دوسری قبریں بھی ہیں۔ یہ چوکھنڈی ۱۲ فٹ مربع ہے جس کی دیواریں نو فیٹ اونچی ہیں۔ جنوب کی طرف دروازہ ہے جس کی پیشانی پر یہ کتبہ ہے:

ھو الغفور

دنیا کو جو دیکھا تو یہ عبرت کی جگہ ہے	ہر چشم دم نزع بحسرت نگراں ہے
چھوڑا نہ اجل نے شہ لولاک لما کو	آخر کو یہی گور سکونت کا مکاں ہے
پوچھا یہ نئی قبر پُر ارمان ہے کس کی	ہاتف نے کہا "مقبرۂ فخر جہاں ہے"

۱۳۰۱ھ

سعیدہ بیگم کی چوکھنڈی بست دری کے شمال میں ایک اور ۱۲½ مربع چوکھنڈی ہے جس کے بیچ میں نیم کا درخت ہے۔ اس کے دو در ہیں اور دو ہی قبریں ہیں ایک مساۃ سعیدہ بیگم بنت خواجہ ابو الحسن خاں احراری متوفیہ ۸ رجب دوشنبہ ۱۲۷۷ھ اور دوسری خدا جانے کس کی ہے۔

گھر آرا بیگم کا مجمرا بست دری کے مغرب میں ایک چھوٹا سا مجرہ ۸ فٹ × ۵ ہے جس میں ایک ہی قبر ہے اور اس پر یہ کتبہ ہے:-

ھو

گوہر نیکو گھر آرا بیگم	آہ تہ خاک گرفتہ مقام
کرد رقم سال وفاتش اماں	یافت بفردوس برین او مقام

۱۲۹۴ سنہ ہجری

یہیں مجرے کے باہر چبوترے پر دو قبریں اور ہیں دونوں کے کتبے یہ ہیں:-

(۱) انہ ھو الغفور الرحیم

مرقد مولوی خواجہ فضل خاں کہ بعمر ہشتاد سال در عشرۂ آخر ماہ مبارک رمضان ۱۳۱۸ھ یوم پنجشنبہ

وفات یافت و در جوار نیاکان خانوادۂ خویش مدفون گردید (۲) مولوی سید نیک عالم ضا شعبان

بارہ دری اس کا بھی ذکر کسی کتاب میں نہیں جو نسٹھ کھمبے کے شمال میں تھوڑی ہی دور یہ عالی شان اور نفیس عمارت ہے۔ یہ بھی چونسٹھ کھمبے کے ساتھ کی ہی بنی ہوئی ہے اور اس لیئے یہ بھی عہد افاغنہ کی کہی جاسکتی ہے۔ اب تو اس کا زیادہ تر حصہ منہدم ہوگیا صرف ایک ہال اور دو حجرے رہ گئے ہیں۔ یہ ہال دُہرا تھا۔ پیش دالان کی چھت لمبان میں آدھی گر گئی اور آدھی ویسی ہی معلق کھڑی ہے۔ اب اس کے گرد تار گھیر دیا گیا ہے۔ یہ عمارت ایسی پائدار تھی کہ شاید ابھی اور صدہا برس نہ گرتی لیکن لوگوں نے کھود کھود کر اس کی دیواروں کو کھوکھلا کردیا۔ جہاں تک ہاتھ پونہچا اینٹ اور پتھر نکال لے گئے اور جو حصہ اس صدمے سے گرا وہ مال مغتنم سمجھ کر سمیٹ لیا۔ کسی کو درد نہ آیا کہ ہم کیا ظلم وستم کرتے ہیں۔ یہ عمارت ۳۲ فٹ × ۳۴ اب قایم ہے جس کی چھت مسطح لداؤ کی ہے اور ۳۲ فٹ لمبا حصہ لوٹ گیا جس کی علامات صاف موجود ہیں اُسے ملالیں تو اس عمارت کی لمبائی ۶۹ فٹ ہوتی ہے۔ اوپر کس قسم کی عمارت تھی کچھ پتہ نہیں چلتا مگر قرینے اور سیڑھیوں کی موجودگی سے معلوم دیتا ہے کہ دو منزلہ مکان تھا۔ اب شکستہ حالت میں اس کا ارتفاع بیس فیٹ ہے۔ جو ہال بیچ رہا ہے ۳۴ فٹ - ۹ انچ × ۱۴ فٹ - ۸ انچ اور ۱۷ فٹ - ۳ انچ اونچا ہے اور ایسا ہی ہال سامنے تھا۔ جو گرگیا۔ مشرق میں تہ خانے کا دروازہ ہے۔ اتنا ہی بڑا تہ خانہ بھی ہے۔ اندر کوئی جا نہیں سکتا۔ اس بارہ دری کا احاطہ تو اب رہا نہیں لیکن احاطے کی دیوار کے نشان چوطرف موجود ہیں جو بہت وسیع تھا۔ عمارت کی نفاست کا حال میں کیا لکھوں اب تو کھنڈر ہے مگر اس سے بھی اس کی شان وشوکت معلوم دیتی ہے اور دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ ساری عمارت پختہ اور چونے گچی کی ہے۔ جس میں بہت کثرت سے پتھر بھی لگادیا گیا تھا ادھر ادھر دو بڑی بڑی نفیس اور عالی شان محرابیں اور اُن پر شہ نشین تھے پہلے دالان کا پیش طاق موجود ہے جو گیارہ فیٹ بلند اور ۸ فٹ - ۸ انچ چوڑا ہے۔ باہر کے دالان میں دونوں جانب بھی محرابیں ہیں جو اس سے کچھ کم ہیں۔ غرض یہ کہ عمارت اب بھی دیکھنے کے قابل ہے گو ساری استرکاری جھڑگئی ہے اس سے معلوم دیتا ہے کہ کوئی دقیقہ اس کی آراستگی اور رنگ آمیزی اور نقش ونگار کا چھوڑا نہ تھا۔ اب جب کہ چاروں طرف ہل پھر گیا تو کیا باقی رہ سکتا ہے مگر پھر بھی سوائے

اینٹوں کے ٹکڑوں اور پتھر کے ریزوں کے دور دور تک اور کچھ نظر نہیں آتا جو صاف دلیل اس بات کی ہو کہ اس سارے خطّے میں عمارات پھیلی ہوئی تھیں جو اسی بادشاہی کے متعلق تھیں یا بیوتات ہوں گے چنانچہ اب تک بھی پختہ فرش اور چبوترہ موجود ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں کوئی اور عمارت تھی جس کے اوپر کا حصّہ گر کر نشانہ ہوا چوں کہ ہل اس سنگین فرش پر نہ چل سکتا تھا ناچار اسے چھوڑنا پڑا ورنہ اس کا مٹا دینا کون سی بڑی بات تھی۔

کوشک انور مہندیاں

سنہ ۷۵۵ھ
۱۳۵۴ع

بحر ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

دہلی کے جیل خانے کے متصل ترکمان اور دہلی دروازے کے بیچ میں یہ ایک عجیب و غریب عمارت تھی جو اب کھنڈر ہو جس کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم نہیں کی جاسکتی کہ کیا تھی اور کس نے بنائی تھی۔ یہ کوشک فیروز آباد کے حصار کے اندر تھا جو بلحاظ ہیئت گذائی کے شاہی سکونت کے قابل تو تھا مگر ہاں کسی اور مصروف کے لیئے بنایا گیا ہو تو خبر نہیں یہ عمارت ۱۱۸ x ۸۸ فٹ اور بارہ فیٹ اونچے چبوترے پر بنی ہوئی ہو۔ نیچے کے مکانات در در سے بنے ہوئے تھے اور چاروں کونوں پر چار بُرجیاں تھیں اور ایک برجی بیچوں بیچ تھی۔ چبوترہ کسی زمانے میں پختہ تھا چنانچہ کہیں کہیں اب بھی اُس کا نشان موجود ہو۔ برج سوائے ایک کے سب گر گئے۔ یہ برج گول ۱/۲ ۹ فٹ مدوّر اور ۲۰ فٹ اونچے تھے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ یہ عمارت فیروز شاہ تغلق کے زمانے کی نہیں معلوم دیتی لیکن اگر اس عہد کی سمجھی جائے تو پھر اس کی تعمیر کا سال سنہ ۷۵۵ھ ۱۳۵۴ع قرار پائے گا۔ غرض کسی کو نہیں معلوم کہ یہ عمارت کس غرض سے بنائی گئی تھی اور اس کی نوعیت کیا تھی مگر عوام الناس میں یہ مشہور ہے۔ کہ کوئی نواب سے تھے جن کو حضرت غوث الاعظم کی جناب میں نہایت عقیدت تھی اور ہندوستان میں بعضے بعضے لوگوں نے یہ رسم نکالی ہو کہ ہر برس حضرت غوث پاک کی مہندیاں بھرا کرتے ہیں یعنی بانس کی کھپچیوں کی ایک اونچی سی بُرجی تعزیئے کی طرح بنی دتی لگا کر بنا کر اُسے روشن کرتے ہیں۔ وہ نواب صاحب بھی مہندی اُٹھایا کرتے تھے۔ جب کہ وہ نواب ہوئے اور اللہ نے اُن کا رتبہ بڑھایا اور صاحب ثروت ہوئے تو انھوں نے یہ عمارت

مہندی کی شکل کی بنادی اور ہر برس اس میں روشنی کیا کرتے تھے اور بہت سا کھانا پکاکر خیرات کرتے تھے جب سے اس عمارت کا نام مہندیاں مشہور ہوگیا ہے مگر یہ نہیں معلوم وہ نواب کون تھے جنھوں نے یہ مکان بنوایا۔ انھیں مہندیوں کے قریب ایک میدان ہی جس میں تمام عزیز و اقارب خاندان مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز کے آسودہ ہیں۔ چنانچہ جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولوی رفیع الدین صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب قدس اللہ اسرارہم کے مزار اسی مقام پر ہیں۔

مولانا شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ جیل کے عقب میں مہندیوں میں فرش مسجد سے ملا ہوا آپ کا مزار مبارک ایک احاطے کے اندر ہی یہ مسجد بہت پرانی قدیم وضع کی تین در کی ہی کوئی گنبد نہیں ہے۔ چھت لداؤ کی سپاٹ ہی مضبوط اور اچھی حالت میں ہے۔ حال میں مرمت کی گئی ہی اور دالان کے اندر اور صحن کا نصف فرش پختہ کرادیا گیا ہے۔ جھاڑو بہارو ہوتی رہتی ہے۔ یہ وہ متبرک مسجد ہے جس میں حضرت خواجہ باقی باللہ جیسے مقتدا لوگ جاروب کشی کیا کرتے تھے اور حضرت شیخ عبدالعزیز جیسے پیشوا عبادت کیا کرتے تھے۔ تذکرۃ العابدین میں آپ کا مولد جونپور ۸۹۸ھ اور آپ کے والد ماجد کا نام شیخ حسن طاہر خلیفۂ قاضی حضرت خاں لکھا ہی اور تحفۃ الاحبار میں آپ کا وطن اصلی اُچھ (ملتان) درج ہے۔ شیخ حسن صاحب اپنے زمانے کے بڑے عالم اور برگزیدہ بزرگ ہو گزرے ہیں۔ سلطان سکندر شاہ کی استدعا پر دہلی تشریف لائے اور ہر بیع منزل عرف بجی منڈل میں اقامت فرمائی اور ۹۰۹ھ میں انتقال فرمایا اور وہیں آپ کی قبر ہے۔ سلطان اور اس کا بیٹا فتح خاں آپ سے کمال عقیدت رکھتے تھے جس وقت شیخ حسن صاحب نے رحلت فرمائی آپ کا سن شریف صرف دو ال کا تھا اس حساب سے سن ولادت ۹۰۷ھ ہوتا ہی بچپنے ہی سے بزرگی کے آثار چہرے سے نمایاں تھے۔ جب سن تمیز کو پہنچے تو مولانا سید محمد بخاریؒ سے اکتساب علوم کیا اور مولانا کے صاحب زادے سید حاجی عبدالوہاب صاحب سہروردیؒ سے تصوف کی کتابیں پڑھیں اور انھیں سے بیعت ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ بیعت شیخ رکن الدین ابوالفتح سے ملتا ہی۔ شیخ عبدالوہاب صاحب کو شیخ عبداللہ قریشی

سے بھی فیض حاصل تھا۔ شیخ عبدالعزیز ادھر تو سید عبدالوہاب سے مجاز تھے اُدھر دوسرے اور مشایخین سے بھی فیض یاب تھے۔ ایک دن شیخ وقت قاضی حضرت ضا نے اپنے صاحب زادے شیخ عبداللہ کی زبانی کہلا بھیجا کہ تم کو بلایا ہی۔ حضرت یہ سنتے ہی جو کچھ مال واسباب تھا رہ خدا میں دے ظفر آباد گئے اور نہایت تجرد کے ساتھ تین سال مسلسل مجاہدے میں مشغول رہے۔ جب تکمیل ہوگئی تو قاضی صاحب کے ارشاد سے پھر دلی آئے اور چوں کہ شوق و ذوق غالب تھا سید ابراہیم ایرجی کی خدمت میں رہ کر تصوف کی تکمیل کی اور خرقۂ قادریہ حاصل کیا۔ اس کے بعد مسند ارشاد پر قایم ہوئے۔ تمام عمر ذکر و شغل رہنمائی و ہدایت خلق اللہ میں بسر کی۔ رضا تسلیم صبر۔ حلم۔ شکر۔ تواضع۔ شیوہ رہا ہمیشہ حالت ذوق و شوق میں مستغرق رہتے تھے۔ ۲۰ جمادی الثانیہ ۹۷۵ھ میں (۷۲) سال کی عمر میں اس آیت کی تلاوت کرتے کرتے آپ کا خاتمہ ہوا۔ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ کسی کتاب میں میری نظر سے شکر بار مشہور ہونے کی وجہ نہ ملی۔ باعتبار لفظی تو یہ معلوم ہوتا ہی کہ شکر کی بارش ہوتی تھی اور یہ بات کچھ عجب نہیں کیوں کہ خاص رائچور ملک دکن میں قلعے کے کالی دروازے کی شرقی دیوار سے ملا ہوا میر علاءالدین صاحب کا مزار ہی۔ مزار کے پاس پیلو کا درخت اب موجود ہی جس سے شکر جھڑتی تھی گو اب اس کے دیکھنے والے زندہ نہیں ہیں مگر ہاں وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے اپنے باپ دادا کی زبانی شکر کا برسنا سنا ہی۔ آپ کی پختہ قبر چھوٹے گھی کی بیچ میں ہی اور دائیں بائیں ایک ایک پکی قبر بیچ والی قبر سے چھوٹی ہی جن میں سے ایک تو آپ کی اہلیہ کی ہی دوسری کوئی صاحبزادی کی بتلاتا ہی کوئی کسی کی۔ حضرت کی قبر کے سرہانے حال ہی ایک سنگ سرخ کی تختی پر یہ کتبہ لگا دیا ہی ورنہ یہ بھی نہ معلوم ہوسکتا کہ یہ مدفن کس بزرگ کا ہی

از مشاہیر مشایخ چشتیہ بود و بعلوم شریعت و طریقت و حقیقت عالم کامل و زمان خود یادگار اکابر مشایخ چشت واز اہل سماع بود و در وقت رفتن ہم بذوق تمام حالت رفت و ختم او بریں آیت شد فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ شیخ عبدالحق دہلوی تاریخ وفات او چنیں فرمودہ۔ قطعہ

شیخ کامل عارف دوران خود عبدالعزیز آنکہ میدا داہل دل را مجلسش یاد از بہشت

ہر چہ از او صافِ اہل اللہ در عالم بود | حق تعالےٰ زاول فطرت بذات او سرشت
یادگارِ اہلِ چشت او بود در دوران خود | گشت از آن تاریخ و نقش یادگارِ اہلِ چشت
۹۷۵

مولوی سمیع اللہ خاں صاحب اور اُن کی اہلیہ کی قبور

آپ کے مزار مبارک کی داہنی طرف ذرا اونچے چبوترے پر شیخ عبدالعزیز صاحب کے احاطے سے لگی ہوئی دو پختہ قبریں ہیں ایک مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی اور دوسری اُن کی بیگم صاحب کی۔ آپ افضل العلماء محمد حمید اللہ خاں نواب سر بلند جنگ بہادر۔ ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لا سابق چیف جسٹس حیدر آباد دکن کے والد اور والدہ ہیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے والد ماجد منشی محمد عزیز اللہ خاں صاحب تھے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کا مکان پھول کی منڈی میں ہے۔ آپ نے بڑے بڑے علماء خصوصاً مولانا مملوک علی صاحب مشہور عالم و فاضل سے تعلیم پائی۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں منصفی کا امتحان دیا اور سنہ ۱۸۵۸ء میں منصف مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں علی گڈھ تبدیل ہوئے اور سنہ ۱۸۶۲ء میں تخفیف میں آکر ہائی کورٹ کے وکیل مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں سب جج ہوئے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں لارڈ نارتھ بروک گورنر جنرل اپنے مشن کے ساتھ مصر لے گئے اس خدمت کے صلے میں سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا۔ مصر سے واپسی پر رائے بریلی کے ڈسٹرکٹ جج اور پھر سشن جج رہے۔ نومبر سنہ ۱۸۹۲ء میں پنشن لی سنہ ۱۸۹۳ء میں بمقام شملہ ایک کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں دلّی میں ایک عربی کا مدرسہ کھولا تھا جو کچھ دنوں جاری رہ کر بند ہو گیا۔ پھر علی گڈھ میں سر سید احمد خاں اور مولوی صاحب نے جو علی گڈھ میں سب جج تھے سکول جاری کیا جو موجودہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج مدرستہ العلوم مسلمانان ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں فریضۂ حج ادا کیا اور سنہ ۱۳۲۶ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ کتبہ نمبر (۱) آپ کی قبر پر ہے اور کتبہ نمبر (۲) آپ کی بی بی کی قبر پر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) بگلگشت جناں گشتہ خراماں | سمیع اللہ خاں شادان و مسرور
بتاریخ وفاتش فکر کردم | سروش غیب ناگہ گفت مغفور
۱۳۲۶

(۳) لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

زدنیا رفت خاتونِ سمیع اللہ خاں ہیہات ۔ باوصاف حمیدش کی زنی یا حور عین باشد

قلم با صد الم بنوشت تاریخ وفاتش را ۔ کہ او را دا یا منزل بفردوس برین باشد

مولنا قطب عالم

حضرت شیخ عبد العزیز صاحب کے کئی فرزند تھے۔ سب سے زیادہ متقی۔ پرہیزگار۔ عالم۔ فاضل قطب عالم صاحب تھے جن کا مزار اسی مسجد کے پیچھے ہونا کہا جاتا ہے جو حضرت شکر بار کی مسجد مشہور ہے۔ مگر کوئی کتبہ نہیں اس لیئے معلوم نہیں ہو سکتا کہ آپ کی قبر کون سی ہے۔ قطب عالم صاحب کے بھی کئی صاحب زادے تھے۔ سب سے زیادہ مقدس مولنا شیخ رفیع الدین محمد تھے جو ظاہری اور باطنی دونوں علوم میں کمال رکھتے تھے۔ آپ ہی کی صاحب زادی حضرت شیخ وجیہ الدین جد امجد مولنا شاہ ولی اللہ صاحب سے منسوب تھیں۔ ان کا مزار بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ ممکن ہے کہ شیخ عبد العزیز صاحب کے ہر دو جانب جو دو قبریں ہیں شاید ان میں سے ایک ان کی ہو۔ الغیب عند اللہ۔

مولوی مملوک العلی نانوتوی

شیخ عبد العزیز صاحب شکر بار کے پائین میں آپ کی قبر کچی ہے۔ جب تک کوئی نہ بتائے مل نہیں سکتی۔ ناقدر دانی زمانہ ملاحظہ ہو کہ آپ کے ہزاروں شاگرد صاحب ثروت و اقتدار تھے مگر استاد کو کسی نے بھی نہ پوچھا اور اتنا بھی نہ کیا کہ ایک ہاتھ بھر کا پتھر کا ٹکڑا لگا دیتے کہ اس خاک کے ڈھیر پر سے گزرنے والے فاتحہ تو پڑھ لیتے۔ آپ کا اصلی وطن نانوتہ ضلع سہارنپور ہے۔ مگر جب سے دلی میں مدرس ہوئے آب و دانہ کی کشش نے جانے نہ دیا۔ آپ مولنا رشید الدین خاں رح کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تمام ہندوستان آپ کے فیض سے مملو ہے۔ آپ کے صاحب زادے مولنا محمد یعقوب صاحب بھی باپ کی طرح فخر ہندوستان تھے مدتوں مدرسۂ دیوبند کے مدرس رہے

حضرت مولنا شاہ ولی اللہ صاحب کی درگاہ

یہ وہ مکرم و محترم آستانہ ہے جس کے انوار سے آج سارا ہندوستان منور ہے۔ یہ وہ خاندان ہے کہ جس سے زیادہ آج تک کسی نے اسلام کی خدمت نہیں کی۔ آپ کی درگاہ کا احاطہ پختہ ہے

جس کے اندر ایک مسجد ہے۔ مسجد کے جنوب میں چبوترے پر سنگین جالی دار کٹہرے کے اندر حضرت مولٰنا شاہ عبد الرحیم صاحب۔ حضرت مولٰنا شاہ ولی اللہ صاحب۔ حضرت مولٰنا شاہ رفیع الدین صاحب۔ حضرت مولٰنا شاہ عبد القادر صاحب حضرت مولٰنا شاہ عبد الغنی صاحب والد ماجد حضرت مولٰنا شاہ اسمٰعیل صاحب شہید کے علاوہ دوسرے اہل و عیال کی قبریں ہیں۔ یہ سب حضرات حضرت امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضؓ کی اولاد ہیں۔ سب سے پہلے حضرت مفتی شمس الدین صاحب فاروقی عرب سے تشریف لائے اور رہتک میں مقیم ہوئے۔ شاہ جہاں کے عہد میں مفتی صاحب کی اولاد میں سے مولٰنا شیخ وجیہ الدین دہلی تشریف لائے اور اسی جگہ مدۃ العمر رہے جہاں کہ اب آسودہ ہیں اُس وقت یہ مقام شہر کی آبادی کے اندر تھا چنانچہ اب تک بھی جا بجا مکانوں اور مسجدوں کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔

مولٰنا شاہ عبد الرحیم صاحب
سنہ ۱۰۵۴–۱۱۳۱ھ

مولٰنا وجیہ الدین کی شہادت کے بعد اُن کے صاحبزادے مولٰنا شاہ عبد الرحیم صاحب نے سلسلہ درس و تدریس کا جاری رکھا اور مدرسۂ رحیمیہ قایم کیا۔ تمام دن قرآن مجید اور حدیث شریف کا درس دیتے تھے اور رات کو طالبان خدا کی توجہ دہی اور مراتب سلوک طے کرانے میں مشغول رہتے تھے۔ ظاہری اور باطنی دونوں علموں کی تعلیم دیتے دور دور کے طلبا حتیٰ کہ عرب و عجم سے بھی آکر مستفیض ہوتے۔ نسبت اس قدر قوی تھی کہ ہزاروں آدمیوں پر یکساں اثر پڑتا تھا۔ اخلاص اور قرب کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت سرور کائنات علیہ التحیات کی مجلس میں شامل ہوتے۔ جلوت میں خلوت رہتی تھی۔ آپ شاہ جہاں کے عہد میں ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے علمی تبحر۔ تقویٰ وغیرہ کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔ بڑے بڑے بزرگان دین اور علمائے مستند سے آپنے اکتساب علم کیا۔ تصوف مولٰنا خواجہ خورد ابن حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب سے حاصل کیا اور پھر کئی اور بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں ۱۲ صفر روز چہار شنبہ ۱۱۳۱ھ کو (۷۷) برس کی عمر میں آپ کا وصال ہوا اور اسی جگہ اپنے ذکر و شغل کے حجرے میں مدفون ہوئے۔

مولٰنا شاہ ولی اللہ صاحب
سنہ ۱۱۱۵–۱۱۷۶ھ

آپ کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند ارجمند مولٰنا

شاہ ولی اللہ صاحب خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ شاہ صاحب ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے جب آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوا تو سن شریف سولہ سال کا تھا۔ درسی کتابیں اپنے باپ سے ہی پڑھیں۔ درس و تدریس کا آبائی سلسلہ بدستور قائم رکھا۔ طبیعت میں اجتہادی قوت ازل سے ودیعت کی گئی تھی۔ نئے نئے نکات نکالے زمانے میں شہرت حاصل کی مسلم الثبوت استاد مانے گئے۔ حتی کہ موافق اور مخالف سب آپ کے اقوال سے سند پکڑنے لگے ۱۱۴۳ھ میں مکہ معظمہ تشریف لے گئے بڑے بڑے نامی علماء اور مشائخین سے صحبت رہی احادیث کی سندیں حاصل کیں ۱۱۴۵ھ میں پھر دلی واپس آئے اور اپنے قدیم مکان میں رہ کر مدرسۂ رحیمیہ کو رونق دی تفسیر و حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد اس زمانے میں آپ نے علم حدیث کو فروغ بخشا اطراف و اکناف ہندوستان میں آپ کی حدیث دانی کا شہرہ ہوا گروہ کے گروہ طلبا ء آنے لگے پرانی دلی دار الحدیث بن گئی۔ روشن اختر محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا اس نے مولانا کو بلا کر شہر میں ایک عالی شان مکان دے کر آپ کو اندرون شہر رکھا۔ قدیم جگہ غیر آباد ہو گئی ۱۱۵۰ھ میں سب سے پہلے ضرورت وقتی کو محسوس کر کے آپ نے کلام اللہ کا ترجمہ نہایت فصیح و سلیس فارسی میں کیا وہ ترجمہ اس قدر نفیس ہے کہ جنھوں نے پڑھا ہے ان کے دل سے پوچھنا چاہیئے کہ ہونٹ چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ آپ کی تصانیف بکثرت ہیں جن میں سے ایک بڑی معرکۃ الآرا اور بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ آپ نے تفسیر عزیزی لکھنی شروع کی تھی مگر افسوس کہ ناتمام رہی اگر پوری ہو جاتی تو ایک ایسی لاجواب تفسیر ہوتی کہ باید و شاید۔ ۱۱۷۶ھ میں (۶۲) برس کی عمر میں سفر آخرت اختیار کیا اور اپنے والد ماجد کے پہلو میں آسودہ ہوئے۔ یہ مصرعہ سال وفات کا ہے ع او بود امام اعظم دیں تفصیلی حال ان بزرگوار کا دیکھنا ہو تو کتاب حیات ولی ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا شاہ عبد العزیز صاحب

۱۱۵۹-۱۲۳۹ھ

ولادت آپ کی ۱۱۵۹ھ کی ہے۔ آپ کے اوصاف اور کمال اور تبحر علمی اور تقوی و تقدس کا حال بھلا میں کیا لکھ سکتا ہوں کہاں سے وہ قلم لاؤں اور کدھر سے وہ زبان جو آپ کے اوصاف کا ایک شمہ بیان کر سکوں لیکن بمصداق ملا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔ مختصراً عرض کرتا ہوں کہ آپ جملہ علوم متداولہ میں ید طولی رکھتے تھے

خصوصاً غوامض حدیث نبوی اور تفسیر کلام الٰہی و املائے احکام شریعت غرا میں ہمیشہ مستغرق و منہمک رہتے تھے۔ سوائے اس کے جلائے آئینۂ باطن و صیقل عرفان بالیقان اس درجہ کمال کو پہنچی تھی کہ ہزارہا طالبین راہ حق اس سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ علم اس خاندان میں بطناً بعد بطن و نسلاً بعد نسل متوارث تھا۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں تمام درسی کتابیں علوم عقلی و نقلی و کمالات باطنی اپنے والد ماجد اور مولانا شاہ محمد عاشق اور مولانا خواجہ امین اللہ سے پڑھیں اور حدیث کی سند اپنے والد سے حاصل کی اور آپ ہی خلیفہ مقرر ہوئے کہ سب بھائیوں میں کہ تین آپ سے چھوٹے تھے بڑے تھے۔ دلی میں کیا بلکہ ہندوستان بھر میں اس جامعیت کا کوئی عالم نہ تھا۔ آپ کے ملکہ کا یہ حال تھا کہ اکثر لمبی لمبی عبارتیں کتب معتبرہ کی اپنے حافظے پر سے لکھوا دیتے تھے اور جب وہ کتابیں دستیاب ہو جاتی تھیں اور ان سے ملا کر دیکھا جاتا تھا تو سر مو فرق نہ نکلتا تھا۔ باوجودیکہ آپ کا سن شریف قریب اسی کے پہنچ گیا اور کثرت امراض سے طاقت کچھ باقی نہ رہی تھی اور غذا برائے نام رہ گئی تھی لیکن برکات فیض باطنی اور حدت قوائے روحانی جب مستعد ہوتے تھے تو ایک دریائے ذخار موج زن ہوتا تھا اور فرط افادات سے لوگوں پر حالت استغراق کی طاری ہوتی تھی۔ شیعہ لوگوں نے بہت کچھ شورش مچا رکھی تھی تو آپ نے ایک ادنیٰ توجہ سے تحفۂ اثنا عشریہ جیسی ضخیم اور مستند اور مسکت کتاب لکھ دی۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ تصنیف کے وقت عبارت بول بول کر اس طرح لکھواتے تھے کہ گویا از بر یاد ہے اور اصحاب شیعہ کی بڑی بڑی کتابوں کے ایسے ایسے حوالے دیتے تھے کہ گویا سب مستحضر تھیں۔ اس پر متانت عبارت اور لطائف و ظرائف جیسے ہیں ناظرین پر ہویدا ہیں۔ ہفتے میں دو مرتبہ مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی جس میں اس کثرت سے سامعین جمع ہوتے تھے کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی تھی۔ طریقۂ رشد و ہدایت کا یادم جاری تھا۔ سبحان اللہ کیا نفس قدسی تھا۔ زبان عربی کی نظم و نثر پر قدرت کامل تھی نہایت فصیح و بلیغ عبارت قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ نمونہ اس کا بخوف طوالت نہیں دیا۔ آپ کی وفات ۷ رشوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ بطلوع آفتاب کے وقت ہوئی اور اپنے والد کے پہلو میں دفن ہیں۔

قطعات تاریخ وفات

حجت اللہ ناطق و گویا	شاہ عبدالعزیز فخر زمن

روز یکشنبہ و ہفتم شوال
در میان بہشت ساخت وطن

مہر نصف النہار در عرفان
مثل بدر منیر در ہمہ فن

از سر لطف و علم تاریخش
"رضی اللہ عنہ" گفت حسن
۱۲۳۹ھ

قطعۂ دیگر از مومن خاں

انتخاب نسخۂ دیں مولوی عبد العزیز
بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل

جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے
آگیا تھا کیا کہیں مُردوں کے ایماں میں خلل

ہی ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا
کیا کیا یہ ظلم تو نے بے کسوں پر اے اجل

جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا
لوٹتا تھا خاک پر ہر قدسیِ گردوں محل

کیا کس دنا کس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن
ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و متبذل

مجلس صد آفرینِ تعزیت میں میں بھی تھا
جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آکر بے بدل

دست بے دادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

مولٰنا شاہ رفیع الدین صاحب ۱۲۳۳ھ شاہ ولی اللہ صاحب کے دوسرے صاحب زادے تھے۔ آپ نے بھی سند حدیث شریف کی اپنے والد ماجد سے ہی حاصل کی اور علم اور تقویٰ میں قدم بقدم اپنے باپ اور بھائی کے تھے۔ چوں کہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب بوجہ کبرسنی و کثرت امراض و ضعف مزاج کے زیادہ تر متحمل دماغی محنت تعلیم و تدریس کے نہ ہو سکتے تھے اس وجہ سے یہ کام زیادہ تر شاہ رفیع الدین صاحب ہی کے ذمے تھا۔ آپ کے اوصاف لکھنا بے سود ہی کس باپ کے بیٹے اور کس کے بھائی تھے۔ علاوہ علم و تفضل اور باکمال ہونے کے صاحب باطن اور بڑے متبحر تھے خلاصہ یہ کہ الغرض ملک تھے صورت بشر میں۔ نظم و نثر آپ کی بہت ہی جن سے نظر انداز کرنا پڑا۔ آپ نے ۱۲۰۵ھ میں کلام مجید کا تحت اللفظ اردو ترجمہ کیا جو آج تک مقبول انام ہی۔ اس کے علاوہ اور بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں۔ آخر عمر تک آپ دین کی خدمت میں منہمک رہے اور ستر برس کی عمر میں ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا اور اپنے والد کے پائینتی دفن ہوئے۔

مولٰنا شاہ عبد القادر صاحب ۱۱۶۷ھ - ۱۲۳۰ھ شاہ ولی اللہ صاحب کے تیسرے صاحب زادے تھے عالم۔ فاضل۔ متقی۔ پرہیز گار۔ مستغنی المزاج۔ متوکل۔

دُنیا سے نفرت۔ گوشہ نشینی کے عادی یوں تو دُنیا کو اقامت گاہ چند روزہ اور سرائے فانی سب کہتے ہیں اور جانتے بھی ہیں مگر عمل اور طرز ماند و بود بالکل اس کے خلاف ہے۔ صرف یہی لوگ ایسے نفوس قدسی تھے جو درحقیقت دنیا میں بالکل ایک مسافرانہ حالت سے رہتے تھے کُن فِی الدُّنیَا کَاَنَّکَ غَرِیبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ[1] تحصیل علم سے فراغت پاکر اکبرآبادی مسجد کے حجرے میں ساری عمر بسر کردی رات دن ذکر الہٰی میں مشغول رہتے اہل دنیا کی طرف مطلق التفات نہ فرماتے اس لیئے تصنیف و تالیف کی طرف بھی چنداں توجہ نہ ہوئی قرآن شریف کا بامحاورہ۔ ترجمۂ اردو اور موضح القرآن دو نایاب چیزیں آپ کی یادگار ہیں جن پر سے بلا مبالغہ ہزار کتابیں نثار ہیں۔ ظاہر میں سیدھا سادا ترجمہ ہے مگر حقیقت میں بڑی بلیغ نظر ہی جواہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں اس کا لطف وہی جانتے ہیں جو ادب اور علم تفسیر اور حدیث سے واقف ہیں۔ آپ کا ترجمہ کثرت سے رائج ہے اور بہت مقبول ہے فیض باطن کا یہ حال تھا کہ اس زمانے میں ایسا مکاشف صحیح اور کوئی نہ تھا۔ بارہا ثقات کی زبان سے سنا کہ جو زبان سے نکل گیا بلاکم وکاست وہی ظہور میں آیا باوجود اس کے بسبب کثرت اخلاق کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ فرماتے اور کسی کو نہ کہتے کہ ادھر بیٹھ یا اُدھر لیکن من جانب اللہ لوگوں کے دلوں میں آپ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ رؤسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے بسبب ادب کے دور دور خاموش بیٹھتے اور بدون آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات سے زیادہ منہ سے نہ نکلتی۔ کرامات آپ کی بے شمار ہیں۔ آپ ۱۱۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۰ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے جدامجد مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کے پائین میں مدفون ہوئے۔

مولوی مخصوص اللہ صاحب مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کے فرزند رشید ہیں علم و فضل میں گوئے سبقت اقران و امثال سے لے گئے۔ ایک مدت دراز تک تدریس و تعلیم میں مصروف رہے۔ علوم دینی کے مشاغل میں شبانہ روز مصروف رہتے تھے۔ پچیس برس تک مولانا شاہ عبدالعزیز کی مدت میں رفد وعظ قرأت کلام الٰہی و حدیث رسالت پناہی کرتے تھے۔ آخر میں گوشہ نشین ہوگئے اور اولیائے کرام کی

[1] دنیا میں مسافرانہ طور پر گزران کردیا اس طرح رہو جیسے کہ کوئی راہ رو رہتا ہے۔ ۱۲

زندگی بسر کرنے لگے اور بجز عبادت الٰہی اور تقوے کے اور کچھ کام نہ رہا اور سچ پوچھئے اس سے بڑھ کر اور ہی بھی کون سا کام۔

مولانا شاہ عبد الغنی صاحب
سنہ ۱۲۲۷ھ

آپ شاہ ولی اللہ صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ یہ بھی باوجود متاہل ہونے کے دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ وضع۔ لباس۔ خلق سب میں اپنے والد بزرگوار سے ملتے جلتے تھے۔ حدیث اور تفسیر اپنے دونوں بڑے بھائیوں مولانا شاہ عبد العزیز صاحب اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب سے حاصل کی۔(۵۷) برس کی عمر میں سنہ ۱۲۲۷ھ میں وفات پائی اور مولانا شاہ عبد القادر صاحب کے پاس مدفون ہوئے۔ اب بہت خوبصورت احاطہ سنگین جالی دار بنانے اور جابجا کتبے لگا دینے سے عجیب رونق ہوگئی ہی اور یہ معلوم ہوتا ہی کہ ہر وقت اور ہر ساعت ایک دسیع احاطہ تو درگاہ کا ہی دوسرا اندر یہ کٹہرا ہی۔ ایک چھوٹی سی مسجد اکہرے دالان اور تین در کی ہی جس کی چھت لداؤ کی صندوق نما ہی اور داہنی طرف ایک لداؤ کا حجرہ مسجد سے ملا ہوا ہی عجب نہیں کہ یہی مقام ان حضرات کے تخلیئے اور عبادت کا ہو۔ نقشۂ ذیل سے ہو بہو اس چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے کی جس میں کیسے کیسے جید علماء اور بزرگان دین آسودہ ہیں ظاہر ہو جائے گی۔

اس احاطے کے قبروں میں کے کتبے

یہ کتبے علاوہ اُس بڑے کتبے کے ہیں جو جنوب رویہ دیوار میں لگا ہوا ہے جس کو ہم نے نقشے کے اندر لکھ دیا ہے۔ یہ سارے کتبے جدید العہد ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جب درگاہ کی درستی ہوئی ہے جب یہ سب کتبے لگائے گئے ہیں:۔ شمالی دیوار کی طرف۔

(۱) ہوالرحیم۔ حضرت مولنا شاہ عبدالرحیم صاحب والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ بتاریخ ۱۲ر صفر ۱۱۳۱ھ یوم چہارشنبہ بعمر ۷۷ سال وصال یافت۔

(۲) ہوالولی۔ حضرت مولنا شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ در ۱۱۷۶ھ ہجری بعمر باسٹھ ۶۲ سال رحلت فرمود۔

(۳) ہوالعزیز۔ حضرت مولنا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ بتاریخ ۷ر شوال ۱۲۳۹ھ روز یکشنبہ وقت طلوع آفتاب رحلت نمود بعمر ہشتاد سال۔

جنوبی دیوار کی طرف (۱) یہ کتبہ نقشے میں آگیا ہے۔

(۲) مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ در ۱۲۳۳ھ ہجری رحلت نمود۔

(۳) مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ در ۱۲۳۰ھ ہجری رحلت نمود۔

(۴) مولانا شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ در ۱۲۲۷ھ ہجری انتقال نمود

(۵) زوجہ میر محمد سید حسین کا کتبہ نقشے میں دیکھو)

(۱) اور دوسرے خاص خاص کتبے اس کٹہرے کے باہر گرد درگاہ کے حصّہ اندر کے

ہوالباقی

(۱) برد وحشتِ محمد سراج دین حیدر	لحد زوجۂ سید ابوالحسن۔ افسوس
بروز شنبہ و چہار از مہ رجب سیلاب	طلوعِ ناز نہاں شدۂ کفن افسوس

۱۲۹۲ھ

ہوالاحد

(۲) كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ

مرقد بنت مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانوی خلیفہ مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی

غفر لہا

۱۳۱۶ھ

یا اللہ

لا الٰہ الا اللہ طاق محمد الرسول اللہ

(۳) کُلُّ من علیھا فانٍ ویبقیٰ وَجْہُ ربک ذوالجلال والاکرام

تاریخ وفات عفت آب جنابہ والدہ ماجدہ حاجی شیخ عبدالکریم صاحب سوداگر چرم معروف قدیم دارالسلطنت کلکتہ وشہر دہلی ساکن کلاں مسجد تعلقہ شاہ ترکمان دروانہ صوبۂ دہلی

والدہ مرحومہ جبکہ شیخ عبدالکریم دارفانی سے گئی دارالبقا عصمت پناہ

تھی وہ معصومہ ومغفورہ زبس عالیجناب اس کے اوصاف حمیدہ کا بیاں ہو کیا بھلا

عابدہ اور پارسا اور باحیا ذاتی سخی دلمیں ہردم رحم اور خلق وکرم تھا اور وفا

جمعہ کا دن بارہویں تاریخ ڈھلتا تھا زوال ماہ ربیع الاول مبارک کو ہوا وصل الٰہ

فکر تھا تاریخ کا بیجد جو ہاتف نے سعید

دی ندا کہ آج ارم میں اسکو داخل کردیا

۱۳۲۲ھ

اور کچھ قبریں یہ ہیں :- (۴) عنایت الرحمن خاں ڈپٹی کمشنر انعام سال وفات ۲۲ ربیع الآخر ۱۳۱۷ھ یوم پنجشنبہ عمر (۵۹) سال عمر (۵) حضرت مولانا محمد حسین صاحب فقیر - ۲۲ رمضان یوم شنبہ ۱۳۲۴ھ عمر ۸۱ سال - (۶) سید محسن علی عرف حاجی میر کلن ۱۳۰۹ھ (۷) کلمہ طیبہ - ۱۰ - ذوالحجہ ۱۳۱۰ - سردار مرزا - (۸) الغفور - حافظ سید محمد صاحب مرحوم امام مسجد جامع دہلی - ۳ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ یوم جمعہ بعمر ۷۳ سال وفات یافت -

اور بہت سی قبریں بے کتبے کے ہیں جن میں اہل وعیال حضرت واخوند برہان صاحب شاگرد شاہ عبدالقادر صاحب منشی اتمو جان صاحب ودیگر معتقدین ومتوسلین خاندان وقاضی محمد زبیر صاحب چشتی نظامی اور کٹہرے کے غربی جانب احاطے کے باہر مومن خاں دہلی کے مشہور شاعر کی قبر ہے اور اسی طرح شہر خموشاں کا سلسلہ جہاں تک نظر جاتی ہے چلا گیا ہے

بھتیجے والی مسجد شاہ ولی اللہ صاحب کی درگاہ کے جنوب میں کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک ویران مسجد کھیتوں کے بیچ میں بہت خستہ حالت میں کھڑی ہے - یہ مسجد تین گنبدوں اور تین دروں کی لداؤ کی ہے مسجد کی کرسی

بہت اونچی ہو صحن کے پائین میں دروازہ ہو جس کے اندر سات سیڑھیاں ہیں جو بالکل شکستہ ہیں۔ تینوں دروں کے روکار پر باایں ہمہ خستہ حالی کر جا بجا سے پلاستر جھڑ گیا ہو چھلیں گر گئی ہیں کچھ کچھ کام رنگ کا باقی ہو جس میں معلوم ہوتا ہو کہ باہر وار سارا رنگ آمیزی کا کام تھا اور جب باہر اس قدر تکلف تھا تو اندر تو اس سے بھی زیادہ ہوگا۔ علاوہ مسجد کے شمال اور جنوب میں بغلی دالان بھی تھے جو گر گئے مگر آثار اب بھی موجود ہیں۔ یہ مسجد ضرور آبادی سے گھری ہوئی تھی کیوں کہ اس کے اطراف دور دور تک عمارتوں کی علامتیں زمین کی حیثیت سے معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ باوجود قلبہ وانی کے بھی اینٹیں اور روڑے جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ اب یہ مسجد ویرانے میں اکیلی کھڑی لوگ اس مسجد کا صحیح نام بھی نہیں تلا سکتے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ گھگھتے کی مسجد کہلاتی ہو جس کے پیچھے قبرستان ہی۔

سندری ماتا کا مندر اس مسجد کے سامنے سندری ماتا کا مندر ہو جو گرو گوبند سنگھ کی بی بی تھیں۔ اوّل ماتا جیتو اور ساؤ دیوان کی حویلی مشہور تھی بعد اس میں ماتا سندری کا سماد بننے سے یہی نام مشہور ہوگیا۔

دو اور ویران مسجدیں اس مندر کے پاس ہی ایک اور ا جاڑ مسجد تین گنبدوں اور تین دروں کی لداؤ کی ہو۔ اس مسجد کے مغرب جانب اور ایک مسجد تھی جو ساری ہو تنے بوسنے میں برباد ہو کر اب صرف ایک باکھا اور اس پر ایک برجی باقی رہ گئی ہو جواب گری کی گری۔ مندر کے پاس والی مسجد میں کوڑے کرکٹ کا انبار ہو اور لوگوں نے کھانا پکا پکا کر مسجد کو غارت کردیا اور بہت بے رونق ہوگئی ہو۔ اس مسجد کے اطراف ایک وسیع احاطہ تھا جس کے نشانات اب بھی نمایاں ہیں چنانچہ شمال رخ کی اونچی دیوار احاطے کی اب بھی موجود ہو جو ۴۵ گز لمبی تھی جس میں سے گرتے گرتے اب بھی ۳۰ گز کی دیوار کھڑی ہو جو ۱۰-۱۲ اونچی اور دو فیٹ آثار کی بڑے بڑے بن گھڑے پتھروں کی بنی ہوئی ہی۔

تیسرا باب۔ شہر کے دلی دروازے سے درگاہ حضرت نظام الدین اولیا ومقبرہ ہمایوں و دیگر عمارات گرد و پیش کا بیان

پرانی دلی کا کابلی دروازہ یا لال دروازہ شاہجہان آباد کے دلی دروازے کے باہر تھوڑی دور

پرانی دلّی کا کابلی دروازہ ہی جسے لال دروازہ بھی کہتے ہیں۔ پرانی دلّی کی نشانیوں میں سے یہ بھی ایک نشانی ہی۔ یہ دروازہ عظمت اور شان میں بہت معقول ہی تمام سنگ خارا سے بنا ہی لیکن روکار سنگ سرخ کا ہی۔ اس دروازے پر دالان اور حجرے اور نشیمن بہت خوب صورت خوب صورت بنے ہوے ہیں۔ اب اس میں جیل خانے کے سپاہی رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ کسی تاریخ کی کتاب سے تحقیق نہیں ہوا کہ یہ دروازہ کس بادشاہ کے عہد میں بنا لیکن ایسا خیال کیا جاتا ہی کہ ہمایوں کے عہد میں پرانے قلعے کے ساتھ بنا ہوگا اور ایسا ہی لوگوں میں مشہور بھی ہی۔ اس مقام پر بجز اس دروازے کے اور کچھ نشانی پرانی دلّی کی باقی نہیں اور اسی دروازے کے پاس جیل خانہ ہی۔

فرید خاں کی کارواں سرای زمانۂ حال کا جیل خانہ ۱۰۱۷ھ

لال دروازے سے تھوڑی دور جنوب میں یہ جیل خانہ ہی جو حقیقت میں سرا تھی۔ پرانی دلّی کے ساتھ یہ سرا بھی ویران ہوگئی یہاں تک کہ عالم گیر ثانی اور شاہ عالم ہی کے وقت میں بالکل ویران ہوگئی تھی۔ انگریزوں کو جیل کے لیئے اس سے بہتر اور موزوں عمارت نہ ملی اس سرا کی شکشت وریخت کرکے جیل کے لایق کر لیا۔ اس سرا کا دروازہ بہت بلند اور عالی شان ہی اور اس پر ایسے معقول مکان بنے ہوے ہیں کہ جیل کا داروغہ بھی اس میں بفراغت رہتا ہی۔ اسی کے پاس گورنمنٹ نے ایک نیا جیل اور اسپتال بھی بنا لی ہی۔ اسی کے میدان میں پھانسی بھی دی جاتی ہی۔ یہ سرا درحقیقت فرید خاں کی کارواں سرائے تھی۔ فرید خاں شاہ جہاں کے عہد میں گجرات کے صوبہ دار تھے اور فرید آباد بھی انھیں کا بسایا ہوا ہی جو ایک خاصہ چھوٹا سا قصبہ دلّی سے بارہ میل ہی اور تلپت کی قدیم بستی کی جگہ بنا تھا۔ سلیم گڈھ کے قلعے کو بھی انھوں ہی نے درست کیا اور بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ سلیم گڈھ کا پل بھی انھیں کا بنوایا ہوا ہی۔ فرید خاں سرائے شاہ جی میں مدفون ہیں جو بیگم پور کی مسجد سے مشرق کی طرف کوئی چار سو گز کے فاصلے پر ہی۔

شہر فیروز آباد۔ اور قلعہ یعنی فیروز شاہ کا کوٹلہ اور محلات ۷۵۵ھ ۱۳۵۴ء

عیشِ دنیا سے ہوگیا دل سرد
دیکھ کر رنگِ عالم فانی

نقشہ کوٹلہ فیروزشاہ
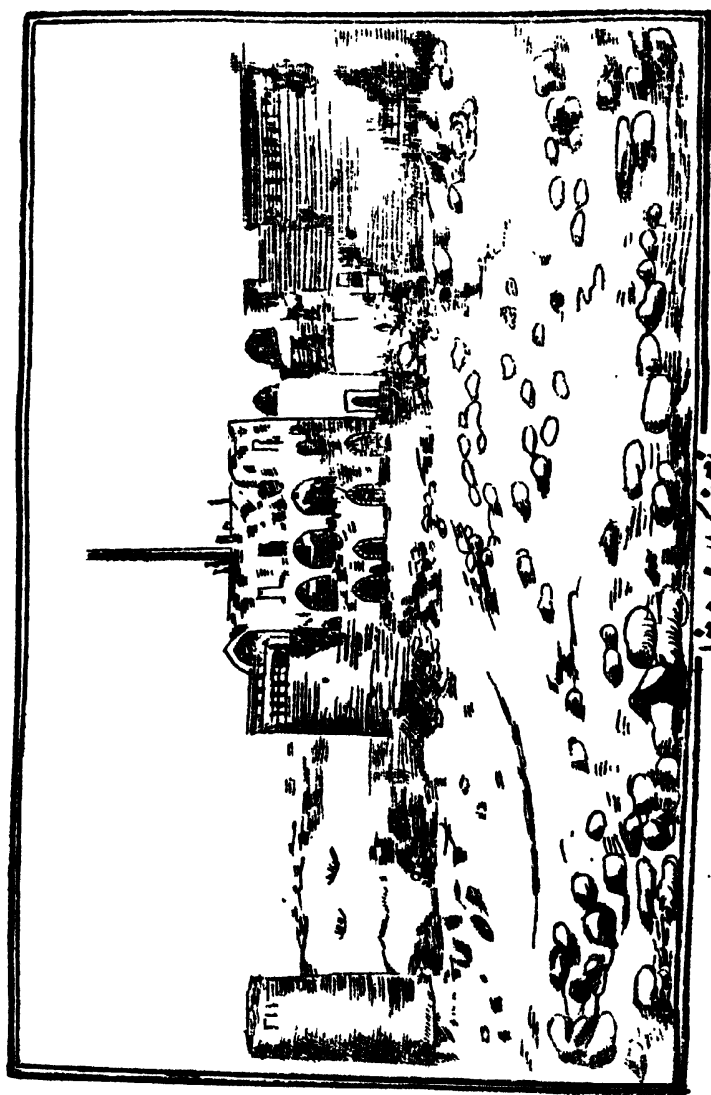
کچھ نہیں خبر طلسم خواب و خیال گوشۂ قصر و بزم سلطانی
ہے سراسر فریب و وہم و گماں تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
بے حقیقت ہے مثل موج سراب جام جمشید و راحِ ریحانی

اس شہر کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ فیروز شاہ تغلق شاہ کا بنایا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر سنہ ۷۵۵ھ ۱۳۵۴ء میں ہوئی۔ شہر کی تعمیر میں دہلی کے پرانے شہروں کا مال مسالا کثرت سے لگایا گیا ہے یعنی ایک طرف اُجاڑا اور دوسری طرف بسایا۔ سیری اور جہاں پناہ دونوں مل کر ہی دلّی کہلاتے تھے۔ یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ فیروز آباد کے نئے شہر بنانے میں زیادہ تر مال مسالا کس پرانے شہر کا لیا گیا۔ شمس سراج لکھتے ہیں کہ "پرانے شہر دہلی کی سات فسیلیں اگلے وقتوں کے بادشاہوں کی بنائی ہوئی تھیں جو امتداد زمانے سے بہت خستہ حالت میں تھیں اُسی کی بے شمار اینٹ پتھر یہاں کام آئے۔ تاجروں کے باربرداری کے جانوروں کو حکم تھا کہ ایک ایک بوجھ اینٹوں کا دلّی سے لاکر فیروز آباد میں ڈال دیا کریں چنانچہ مدتوں یہی طریقہ جاری رہا۔ بادشاہ نے لب دریائے جمن موضع گاوی پور میں ایک جگہ منتخب کرکے دوبارہ لکھنوتی جانے سے پہلے فیروز آباد کی بنا ڈالدی تھی اور تعمیر شروع ہوگئی تھی۔ یہ مقام رائے پتھورا کی دلّی سے پانچ کوس تھا بسم اللہ بادشاہی کے محل سے ہوئی اُس کی دیکھا دیکھی سب امرا و ارکین سلطنت نے بھی اپنے اپنے مکانات جو جس کی شان اور مرتبے کے شایاں تھے بنوائے۔ فیروز آباد کو اتنا بڑا شہر بنانا مرکوز خاطر تھا کہ اس کے اندر بارہ مقامات گھیر لیئے گئے تھے۔ قصبۂ اندرپت۔ سرائے شیخ ملک یار پتہاں۔ سرائے شیخ ابوبکر طوسی۔ گاوی پور۔ کھیت واڑہ جاہر امتؒ۔ اندھوئی۔ سرائے ملک۔ اراضی متعلق بہ مقبرۂ رضیہ سلطانہ۔ موضع بھارسی مہروالا۔ سلطان پور۔ اس شہر میں اس کثرت سے عمارات بنائی گئی تھیں کہ قصبۂ اندرپت سے لے کر کوشک شکار تک جو کہ پانچ کوس کا فاصلہ ہے ساری زمین مکانوں سے پٹی پڑی تھی۔ اس شہر میں آٹھ مسجدیں معمولی تھیں اور ایک خاص۔ ان معمولی مسجدوں میں بھی دس دس ہزار آدمیوں کی گنجایش تھی۔ اب تو اس شہر کے صحیح حدود بھی معلوم کرنا مشکل ہے کیوں کہ گری پڑی عمارتوں کا بھی نشان باقی نہ رہا۔ لیکن دوسرے شہروں کی طرح اندازی پر سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ شہر بھی غالباً نصف مثمن پہلو شکل کا تھا جس کے قاعدے۔ اور دریائے

چمن تھا شمس سراج نے شہر کی وسعت کا حال یوں لکھا ہی کہ "یہ شہر موجودہ دلی یعنی شاہجہاں آباد سے دو چند تھا" یا یوں سمجھو کہ اندرپت سے کوشک شکار تک پانچ کوس اور دریا سے حوض خاص تک جس میں موجودہ دلی کے محلہ جات بلبلی خانہ - ترکمان دروازہ - بھوجلا پہاڑی بھی شامل تھے - اس شہر کی شان وشوکت عظمت اور وسعت کا کچھ اندازہ اُن عالی شان اور سربفلک عمارتوں اور محلات پر سے کیا جاسکتا ہی جو خود بادشاہ اور امرا ے دولت نے بنائے تھے - اس شہر میں نو مسجدیں - تین محل کلاں - شکار گاہ اور متعدد بڑی بڑی عمارتیں تھیں - فیروز شاہ نے صرف دلی اور فیروز آباد میں ہی ایک سو بیس سرائیں بنوائی تھیں اس سے یہ قیاس کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ان سراؤں میں کچھ نہیں تو آدھی تو ضرور فیروز آباد کی نئی دار السلطنت میں ہی ہوں گی - فیروز شاہ کی سلطنت کا زمانہ قریب قریب ۴۰ سال کے رہا اور وہ کچھ ایسے امن چین اور فارغ البالی اور خوش حالی رعایا برایا کا زمانہ تھا کہ آج تک یادگار رہی - اگرچہ شہر دلی اور فیروز آباد میں پانچ کوس کا بُعد تھا مگر آے دن یہاں سے وہاں تک سواریوں اور راہ روؤں کا ایک تانتا لگا رہتا تھا - سڑک کی یہ حالت تھی کہ گویا کوئی میلا لگا ہوا ہی یا آدمیوں کی رو بہ رہی ہی - جدہر دیکھو آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے آدمیوں کا ایک ٹڈی دل تھا یا زمین پر چیونٹیاں پٹی پڑی تھیں - اتنے بڑے جم غفیر خلایق کی آمد و رفت حمل و نقل کے لیئے کرایہ کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں گاڑیاں - بہلیاں - رتھ - پالکیاں - کہار - اونٹ - گھوڑے - ٹٹو - غرض ہر قسم کی سواری ہمہ وقت صبح سویرے سے لے کر رات گئے تک بکثرت ملتی تھیں - ہزارہا مزدور بھی رہتے تھے جن کی گزران اسی بوجھ ڈھونے سامان پونہچانے اور لانے پر تھی عمارات کا یہ حال تھا کہ اگرچہ دونوں مقامات کے مابین پانچ کوس کا فصل تھا مگر چپہ بھر زمین بھی کہیں خالی نہ نظر آتی تھی - جنرل کننگھم کو دونوں شہروں کے درمیان آبادی ہی آبادی ہونے میں شک ہی لیکن جن لوگوں کو ہندوستان کے شہروں کی وسیع آبادیوں کا تجربہ ہی اور اُنھوں نے دیکھا ہی کہ یہاں کی بستیاں کیسی گنجان اور لٹھ بسی ہوتی ہیں تو اُن کے لیئے شمس سراج کا بیان کچھ محل استعجاب نہیں ہی - جنرل صاحب لکھتے ہیں کہ "اگر ہم فیروز آباد کو ایسی گھنی آبادی نہ بھی سمجھیں تو بھی شاہجہاں آباد سے فیروز آباد کسی طرح کم نہ تھا کیوں کہ رقبے میں بھی فیروز آباد شاہجہاں آباد سے دوچند تھا - اس لیئے آبادی کا اندازہ ڈیڑھ لاکھ لگایا جاسکتا ہی" فیروز آباد کے محلات کے

متعلق شمس سراج نے لکھا ہی کہ "ایک محل "محل صحن گلین" کہلاتا تھا جسے "محل دکیھ" یعنی انگوری محل بھی کہتے تھے جس میں امراو ارکین سلطنت خوانین اور ملک اور علمار وفضلا بار یاب ہوتے تھے۔ دوسرے محل کا نام "محل چھجۂ چوبین" تھا جو بادشاہ کے حوالی موالی اور اور مصاحبین کی باریابی کی جگہ تھی۔ تیسرا محل "بار عام" یا "صحن میانگی" یعنی درمیانی۔ بطور دربار عام کے تھا۔" اب ان محلوں کا نام ہی نام رہ گیا ہی اور خواب وخیال ہی ہی۔ بھلا اب ہم ان محلوں کو کہاں ڈھونڈیں اور جب ان کا پتہ صفحۂ دنیا پر باقی نہیں تو ان کا حال کیا خاک لکھ سکتے ہیں۔ اب تو ان کے کھنڈر بھی ڈھونڈے نہیں ملتے۔ شیر شاہ نے جن زمانے میں دور کے مقامات کو تحس نحس کر کے شیر گڈھ بسایا تھا تب تک جمنا کے کنارے پر فیروز آباد دہی سب سے بڑا شہر تھا۔ جب تیمور نے دلی پر حملہ کیا تو اس کا کیمپ شاہی فیروز آباد کے صدر دروازے کے ہی سامنے تھا اور اسی دروازے کے سامنے ابراہیم لودھی نے وہ بڑا بھاری برنجی بیل جو وہ گوالیار کی فتح کے بعد لایا تھا نصب کیا تھا۔ شمس سراج نے جن جن محلوں کے نام گنوائے ہیں ان میں سوائے کوشک فیروز شاہ جو زیادہ تر "فیروز شاہ کے کوٹلے" کے نام سے مشہور ہی اور کسی کا پتہ نہیں ملتا اور فیروز شاہ کے کوٹلے کے صحیح صحیح حدود بھی اب قایم کرنے کا کوئی موقع باقی نہیں ہی۔ یہ قلعہ پیراللوپیپڈن Parallelopipedon یعنی اس شکل کا تھا جس کے ہر کونے پر ایک گول برج تھا اور ہر ضلعے کے وسط میں ایک ایک دروازہ اور دو دو برج جھانکی دار تھیں۔ اس کوٹلے کی فصیل جہاں کہیں بچ بچا رہی ہی وہ ساٹھ فٹ بلند ہی۔ قلعے کے بیچ میں جامع مسجد فیروز آباد اور وہ کوٹھڑیاں جن پر فیروز شاہ نے اسوکا کا ستون نصب کیا ہی صحیح سنہ ۱۸۵۰ء تک فیروز آباد کی عمارات ذیل کا پتہ ملتا ہی:۔ (۱) کوٹلہ یا کوشک فیروز شاہ۔ (۲) محل مذکور کے جنوب میں بہت سے کھنڈر۔ (۳ و ۴ و ۵) تین گری پڑی عمارتیں جن میں دو مقبرے اور ایک محل کا بچا کھچا کچھ حصہ۔ (۶) کوشک انور مہندیاں (۷) ایک چھوٹی سی مسجد (۸) چونے کے بھٹی کی مسجد (۹) ایک اور عمارت جس کی نسبت یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فیروز آباد کے حدود میں تھی۔ جنرل کننگھم لکھتے ہیں کہ "فیروز آباد کا محل جو اس نام کے شہر کا قلعہ بھی تھا اس کے گرد بڑی مضبوط سنگ بست فصیل اور
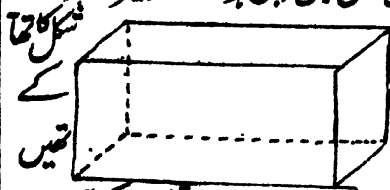
گاؤدم برج سے تھے چنانچہ اسی فصیل کا ایک دروازہ مشہور اب بھی موجود ہے جو لال دروازے اور فیروز شاہ کی لاٹ کے درمیان ہے۔ یہ دروازہ ایک عمدہ نمونہ مستحکم عمارت کا ہے مگر ذرا بھدا ضرور ہے۔ کوٹلے کی غرائبات میں سے تین بڑی بھاری اور لمبی لمبی سرنگیں ہیں جو اتنی چوڑی اور اونچی ہیں کہ بیگمات مع سواریوں کے ان میں سے بآسانی گزر جاتی تھیں۔ ایک سرنگ تو قلعے میں سے دریا کے کنارے تک ہے جو پانچ جریب لمبی ہے۔ دوسری دو کوس لمبی کوشک شکار تک چلی گئی ہے تیسری پانچ کوس لمبی رای پتھورا کے قلعے کی طرف ہے۔ علاوہ اس کے ہندوراؤ کے باڑے سے جو پہاڑی پر ہے چند ہی گز کے فاصلے سے شمال کی طرف ایک عمیق گڑھا نظر آتا ہے جس کے شمال میں دو پست دروازے ہیں جو دونوں تہ خانے کے اندر جانے کا رستہ ہیں۔ ان دروازوں سے کوئی ڈیڑھ سو فیٹ پرے بجانب شمال ایک ٹوٹا ہوا منار بھی بنا ہوا ہے۔ یہ سرنگیں چوں کہ بہت پرانی ہیں اور ان کے اندر کی ہوا کثیف ہے آج تک کسی نے ان میں جانے کی جرأت نہیں کی اور اسی سبب سے ان کی اصلی ماہیت بھی دریافت نہ ہو سکی۔ فیروز شاہ کے کوٹلے میں اور تو اور مگر دو نادر چیزیں قابل دید ہیں۔ ایک تو فیروز آباد کی جامع مسجد اور دوسرے اسوکا کا ستون جو عموماً فیروز شاہ کی لاٹ کہلاتا ہے۔ یہ بے نظیر مسجد فیروز شاہ کی بنوائی ہوئی ہے جو ۷۵۵ھ ۱۳۵۴ء میں بنی تھی۔ امیر تیمور نے[1] اسی مسجد میں خطبہ پڑھا تھا امیر کو یہ مسجد کچھ ایسی پسند آئی کہ اسی نمونے کی ایک مسجد اپنی دارالسلطنت میں بنوانے کی غرض سے اس کا ایک نقشہ بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ مسجد پتھر چونے کی بنی ہوئی ہے جس پر استرکاری ہے۔ مسجد کی عمارت مصری عمارتوں کی طرح گاؤدم ہے۔ اس مسجد کے متعلق محکمۂ آثار قدیمہ کی ایک کمیٹی ۱۸۴۷ء میں بیٹھی تھی جس کی رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ افسوس ہے کہ کمیٹی نے جو نقشے وغیرہ اس مسجد کے بڑی محنت سے بنائے تھے وہ ایام غدر میں سب تلف ہو گئے۔ چوں کہ مسجد کا رخ ٹھیک کعبے کی سمت ہونا چاہیئے اس وجہ سے مسجد پوری طرح چوکون نہیں ہے۔ مسجد کا دروازہ برخلاف دیگر مساجد کے بجائے مشرق کے شمال کی طرف ہے کیوں کہ مشرق کی طرف دریا بہتا ہے۔ مسجد کا صدر دروازہ تو یہی ہے لیکن مسجد میں داخل ہونے کا رستہ باہر دالان سے بھی ہے یعنی چار

[1] یہ واقعہ اواخر ۸۰۱ھ ۱۳۹۸ء کا ہے جب امیر تیمور رہا دلی میں قتل عام اور غارت گری سے فارغ ہو کر میرٹھ اور انبالے کو لوٹنے چلا تو وہ اس مسجد میں فریضۂ نماز ادا کرنے گیا تھا۔

ایسے ہیں جن سے ہم مسجد کی بالائی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ زینے تہ خانے سے لے کر اُدھر اوپر تک چلے گئے ہیں اور تہ خانے میں جانے کا ایک کھلا ہوا دروازہ الگ ہے۔ اسی قسم کے دو زینے شمال رخ کی دیوار میں صدر دروازے کے مشرق اور مغرب میں ستھے اور بطور جواب جنوبی دیوار میں۔ ان کھنڈروں کے دیکھنے سے جو مسجد کے دروازے کے محاذ میں ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسجد کا سلسلہ ایک پل کے ذریعے سے اسوکا کی لاٹ سے جا ملا تھا۔ صدر دروازہ مربع اور گنبد دار ہے جس کے باہر دار تین دروازے اور اندر دار ایک دروازہ ہے۔ ان دروازوں کے اِدھر اُدھر ستون کھڑے کرکے اوپر پٹاؤ ڈال کر جوڑ ان میں کم کر دیا گیا ہے جس سے ایک طرح کی بدنمائی ہو گئی ہے۔ بمقابلے ساری عمارت کے یہی حصہ ابھی اور درست حالت میں باقی ہے۔ اگرچہ یہاں سے بھی دروازے کے عمدہ عمدہ نقش ونگار کے پتھر لوگ نکال کر لے گئے ہیں۔ اندرونی دروازے میں سے جب ہم اصل مسجد کے دالان میں پہنچتے ہیں تو بجز مغربی۔ شمالی۔ اور جنوبی خالی دیواروں کے اور کچھ باقی نہیں رہا۔ دیواروں کے طاقوں سے البتہ اتنا معلوم دیتا ہے کہ کبھی یہاں در۔ محرابیں۔ کھڑکیاں شمال سے لے کر جنوب تک برابر تھیں۔ شمال اور مغرب کی طرف کی دیواریں پوری لمبائی میں چھت تک کھڑی ہیں۔ دریا کے رخ جنوبی دیوار کوئی بیس فیٹ تک گر گئی ہے جس میں اوپر سے نیچے تک پشتوں کے سرے پر کوئی پچیس فیٹ چوڑا خلا ہو گیا ہے البتہ اس کے جواب کی شمالی دیوار پوری موجود ہے جس میں محرابوں کا کچھ کچھ حصہ جن پر چھت پٹی ہوئی تھی باقی ہے اور ایک دو جگہ کچھ کچھ پلاستر بھی رہ گیا ہے جس کے بیچ میں کلمہ موجود ہے۔ مسجد کے صحن میں ایک کنوئیں کا گڑھا پچیس فیٹ گہرا نکلا تھا شمالی اور جنوبی دیواروں کے درمیان دیوار دونوں ستونوں کے نشان بھی باقی ہیں اور ایک جگہ فیل پایوں کا حصہ زیریں بھی نظر آتا ہے۔ شمال ومغرب کے کونے میں جو زینہ ہے وہ ایک بغلی کوٹھڑی میں سے شمال کی طرف پلٹ کر چھت تک چلا گیا ہے اور اس کی بائیں طرف اور چند سیڑھیاں ایک تنگ رستے کی طرف ہیں جو مغربی دیوار کے برابر جنوب ومشرق کے کونے میں چھت تک پہنچ کر ختم ہو گئی ہیں۔ مسجد کی دو منزلہ عمارت کے نیچے بہت سے حجرے شمال سے مغرب کی جانب ہیں اور اسی طرح جنوب میں بھی ہیں جن کے

سامنے محراب دار دروازے ہیں اور یہیں چھت پر چڑھنے کے وہ چاروں زینے ہیں جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ مشرق کے رخ جدھر دریا ہے اُدھر کے اکثر حجرے بالکل صاف ہو گئے اور جو بیچ رہے ہیں وہ بھی کوئی ثابت نہیں گرے پڑے ٹوٹے پھوٹے آدھے آدھے پاؤ پاؤ کھڑے ہیں اس جگہ جنوبی اور شمالی دیوار میں مشرق کے جانب کے زینے کے نیچے چند سیڑھیاں ہیں جو ایک بڑے برآمدے تک چلی گئیں ہیں۔ دریا کے پانی کے چڑھاؤ کے خیال سے ان سیڑھیوں کو اونچی کرسی دی گئی ہے۔ اس قسم کا برآمدہ بس اسی رخ پر ہے اور کسی طرف نہیں ہے۔ اوپر جو ہم نے کنوئیں کا ذکر کیا ہے اُس میں کمیٹی کو شک ہے ممکن ہے کہ وہ کنواں نہ ہو بلکہ ایک گڑھا ہی ہو جس میں وہ ہم کھڑا کیا گیا ہو جو گنبد بناتے وقت بطور ڈاٹ کے بنایا جاتا ہے۔ اتنی رفیع الشان مسجد بے گنبد کے تو ہو نہیں سکتی اور اس کی علامات بھی موجود ہیں یہ گنبد ہشت پہلو تھا جس کے آٹھوں کونوں پر سنگ مرمر کی تختیاں لگی ہوئی تھیں جن میں فتوحات فیروزی کے کارنامے کندہ تھے لیکن کمیٹی کو کوئی کتبہ نہیں ملا ممکن ہے کہ کتبے بھی ان مربع فیل پایوں کی طرح نکال لیے گئے ہوں کہ جن پر گنبد ٹکا ہوا تھا۔ گنبد کے ہونے میں تو اس وجہ سے کوئی شک نہیں کیونکہ آٹھ ستونوں میں سے چھ کے بالائی ٹکڑے اسی کنوئیں کے پاس پڑے ہیں اور اس قسم کے ستون صرف گنبدوں ہی میں لگائے جاتے ہیں۔ جب غربی دیوار کے نیچے کے حصے کی محرابوں کا ملبہ صاف کیا جا رہا تھا تو یہ کھلا کہ اس کے دونوں کونوں میں مغرب کی طرف دو منزلے پر ایک ایک حجرہ بھی تھا جو چھت سے اور چھ فٹ اونچا تھا۔ ان دونوں جانب کے کمروں میں جانے کا ایک ایک زینہ بھی تھا۔ ان کمروں کے تین تین در تھے اور بیچ کے پانچ در مسجد کے مغربی حصے کے لیے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ بعض محرابوں پر بہ اوقات مختلف کچھ کچھ لکھ بھی دیا تھا چنانچہ بعض ایسے لوگوں کے نام بھی دیکھے گئے جو اکبر کے زمانے کے تھے یہ بات اغلب ہے کہ اکبر یا اس کے پوتے جہانگیر کے عہد میں اس مسجد کی از سر نو اور مکمل مرمت کرائی گئی تھی حتیٰ کہ دیواروں پر استرکاری بھی کی گئی تھی ایک ستون پر سفیدی کے نیچے کچھ لکھا ہوا نکلا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سنہ ۱۷۴۲ء تک بانگ صلوٰۃ برابر جاری تھی سنہ ۱۷۶۱ء میں عالمگیر ثانی کو تقدیر یہاں کشاں کشاں

لے گئی کوئی شخص بادشاہ کو مخبری دے کر لے گیا کہ یہاں ایک فقیر صاحب کشف و کرامات
رہتا ہے اور بادشاہ نے بے چارے کو قتل کر دیا۔

اسوکا کی لاٹ یا منارۂ زریں یا کرنڈ کی لاٹ

قیام ۲ ق م - سمت ۱۲۲۰ء ۱۱۶۳ - سنہ ۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء

این ہمہ ہیچ است چوں می بگذرد
بخت و تخت و امر و نہی و گیر و دار

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

فیروز شاہ کے کوٹلے میں ایک دوسری چیز اعجوبۂ روزگار اسوکا مگدھ دیس کے ہندو راجہ کا وہ نادر ستون ہے جس پر اس نے تمامی دنیا کے لیئے اپنے صلح کل فرامین نقش کرائے ہیں - اس عظیم الشان سنگی ستون کو فیروز شاہ نے ۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء میں یہاں لا کر استاد کرایا ہے اور "منارۂ زریں" نام رکھا - یہ ستون ایک ہی بن گھڑے پتھر کا ہے جو ایک گاؤ دم مصری وضع کی عمارت کا نصب کیا گیا ہے - جس کے برج ناتراشیدہ پتھر کے ہیں جو نہایت مضبوط اور غیر معمولی مستحکم پکڑ کے چونے سے جمائے گئے ہیں جن کی محرابیں کمرکی وضع کی ہیں - یہ مکان ایک بہت بلند کرسی دار چبوترے پر بنا ہوا ہے جو دو منزلہ ہے - جس کی پہلی منزل میں متعدد حجرے اور دالان ہیں جس کی چاروں طرف محراب دار در ہیں اور اسی کی چھت پر یہ بھاری ستم کھڑا ہے - اس چھت پر ایک کنارے اور دو فیل پائے بھی کھڑے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس پر بھی کوئی اور منزل رہی ہوگی جس کے یہ ستون رہ گئے ہیں لیکن اگر اور ایک منزل ہوتی تو لاٹ کی بلندی کم ہو جاتی حالانکہ لاٹ یہاں اسی غرض سے کھڑی کی گئی ہے - کہ جس قدر زیادہ بلند ہوگی اتنی ہی خوش نما ہوگی اور دور سے نظر آئے گی - تیسری منزل کے برج اونچائی میں موجودہ عمارت کی سطح کے برابر ہونا خود کھلی دلیل اس بات کی ہے کہ یہ عمارت موجودہ حالت سے زیادہ بلند نہ تھی - ستون کے لیئے چھت کا حصہ توڑ کر ستون ایک چار فیٹ قطر کے حجرے میں اتارا گیا ہے جس پر اس لاٹ کا تمام وزن ہے - محمد امین رازی نے ہفت کلیم میں اکبر کے عہد میں اس لاٹ کے متعلق لکھا ہے کہ سہ منزلہ عمارت پر استاد کیا گیا تھا جو ایک سنگ سرخ کی گاؤ دم لاٹ ہے - مسٹر فرینکلن لکھتے ہیں کہ تین منزلوں میں کچھ تو حوض خانہ تھا

اور کچھ طیور خانہ ۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات فرنیکلن صاحب نے کاہے پر سے لکھی ہے اسوکا مگدھ دیس کا راجہ تھا جو بعد میں دھما اسوکا کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ بندو سرا کا بیٹا اور چندر گپت کا پوتا تھا۔ جو کشمیر سے لے کر قنوج تک تمام ہندوستان کا حکمراں تھا۔ اسوکا ایک راسخ الاعتقاد خاندان میں پیدا ہوا تھا شروع شروع یہ شیو کی پوجا کرتا تھا لیکن بعد میں بدھ مذہب کا پیرو ہو گیا جس کی اشاعت کا وہ بڑا حامی تھا۔ اس نے اپنے تبدیل عقیدے کی یادگاریں اور نیز اس خیال سے کہ اس مذہب کی ترویج اس کی وسیع سلطنت کے ہر گوشے میں ہو جائے۔ چنانچہ اس کے اعلان اور ترویج کا بہترین طریقہ اس نے یہ نکالا کہ اپنے فرامین کی تشہیر بڑے بڑے پتھر کے ستونوں پر کندہ کرا کر ایسے غیر فانی طریقے سے کی کہ کابل سے لے کر اوڑیسے تک اپنے معتقدات کو کندہ کروا دیا جو آج تک بھی جا بجا موجود ہیں۔ ستونوں کے کتبوں میں پالی زبان میں اسوکا کا نام پیا دسی منقوش ہے جو انیٹی اوکس تھیاس (Antiochus Theos) کا ہم عصر تھا اور جس کا زمانہ ۳۲۵ سے ۲۰۰ سال قبل از مسیح قرار پاتا ہے۔ یہ لاٹ ایک ریتیلے پتھر کا بڑا بھاری قتم ۴۲ فٹ لمبا اونچا ہے جس کا اوپر کا ۵ فٹ تو چکنا ہے اور باقی کھردرا ہے۔ جو حصہ اندر دبا ہوا ہے وہ ۴ فٹ ۱ کا ہے۔ اوپر کے حصے کا قطر ۲۵.۳ انچ ہے اور حصۂ زیریں کا قطر ۳۸.۸ انچ ہے۔ گاؤ دم نما فی فٹ ۰.۳۹ انچ ہے ستون کے وزن کا اندازہ ۶۵۷ من کا ہے۔ پتھر کا رنگ زردی مائل ہلکا گلابی ہے جس میں سیاہ چتیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس ستون کی پیمائش میں بھی لوگوں نے غلطیاں کی ہیں۔ میجر برنٹ (Burnt) نے ۱۸۳۴ء میں اسے دیکھ کر ۵ فٹ لمبا بتلایا ہے اور قطر ۳ فٹ۔ فرنیکلن نے لمبان ۵ فٹ۔ وان آرلک (Von Orlick) نے ۴۲ فٹ۔ ولیم فنچ ۲۴ فٹ۔ شمس سراج ۳۲ گز اونچائی اور دور دس فیٹ لکھتے ہیں۔ پتھر کی نوعیت اور کتبے کے متعلق بھی ایسے ہی اختلافات ہیں ڈینش گو ڈی لاایٹ (De laet) اس سنگی جو پہل منار اور کتبے کو بزبان گریک اور سکندر اعظم کا نصب کیا ہوا لکھتا ہے۔ ٹام کاریاٹ بھی اسے سکندر اعظم سے منسوب کرتا ہے اور یہ عجیب بات لکھی ہے کہ ستون کو برنجی بتلاتا ہے۔ پادری ایڈورن ٹیری سنگ مرمر اور سکندر اعظم کا کہتے ہیں۔ بشپ ہیبر ڈھلی ہوئی دھات کا۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں

جب امیر تیمور فیروز آباد میں آیا تو اُس نے اس لاٹ کو کوشک شکار میں دیکھ کر کہا کہ "میں اتنے ملک پھرا مگر میں نے اس کے مقابلے کی کوئی یادگار نہیں دیکھی"
اور اسی طرح کی بے انتہا تعریف کی اور بہت سے لوگوں نے بھی لکھی ہے۔ یہ ستون موضع نہیرے میں تھا جو جمنا کے کنارے خضر آباد کے نزدیک دہلی سے (۱۲۰) میل کے قریب واقع ہے۔ اس کے نقل مکان کے متعلق شمس سراج نے جو روایت لکھی ہے وہ ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔ جب یہ لاٹ موضع نہیرہ سے جس کے مختلف نام سلارا، جوارا۔ طاہرا۔ توبرا۔ ٹپیرا بھی کہے جاتے ہیں۔ لاکر فیروز آباد میں نصب کیا گیا۔ تب شمس سراج کی عمر بارہ برس کی تھی۔ "ٹھٹے کی مہم سے واپس آنے کے بعد فیروزشاہ نواح دہلی کے اکثر مقامات میں پھرا کرتا تھا۔ یہیں اطراف واکناف میں پتھر کے دو ستون تھے ایک موضع توبرا میں تھا جو ضلع سلورا اور خضر آباد کے دامن کوہ میں تھا اور دوسرا قصبۂ میرٹھ کے قریب کہ یہ ستون پانڈوؤں کے زمانے سے وہاں ایستادہ تھے لیکن دہلی کے کسی بادشاہ نے ان کی طرف توجہ نہیں کی آخر کو فیروزشاہ کو خیال آیا اور نہایت کوشش واہتمام سے ان کو اٹھوا لایا۔ ان میں سے ایک کو کوشک میں جامع مسجد کے قریب گڑوا کر "منارۂ زریں" نام رکھا اور دوسرا کوشک شکار میں کھڑا کیا گیا۔ قدیم مورخین نے لکھا ہے کہ یہ دونوں ستون بھیم کے چلنے کے عصا تھے جو بڑا قدآور انسان تھا۔ ہندوؤں کی روایات میں لکھا ہے کہ بھیم روزانہ ہزار آدمیوں کو لقمہ کر جاتا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کر سکتا۔ اُس کے زمانے میں ہندوستان کا یہ تمام حصہ کفاروں (راکششوں) سے بھرا پڑا تھا جو ہمیشہ آپس میں لڑتے بھڑتے اور قتل کرتے رہتے تھے۔ بھیم کے پانچ بھائی تھے اُن میں سب سے زیادہ قوی ہیکل اور طاقت ور یہی تھا۔ یہ اپنے بھائیوں کے مویشی کے ریوڑ چرایا کرتا تھا اور انھیں دو ستونوں کو بطور اپنی لکڑیوں کے استعمال کرتا تھا اور انھیں سے مویشیوں کو جمع کیا کرتا تھا۔ اُس زمانے کے چوپائے بھی ویسے ہی قدوقامت کے تھے جیسے کہ آدمی ہوتے تھے۔ یہ پانچوں کے پانچوں بھائی دہلی ہی کے قرب وجوار میں رہتے تھے کہ بھیم کی وفات کے بعد یہ دونوں لاٹیں اُس کی یادگار

ملہ بعض کتابوں میں اس گاؤں کا نام توپرا لکھا ہے جو جگادری سے (۷) میل جنوب مغرب میں ہے۔ ۱۲

رہ گئیں۔ جب فیروز شاہ کی نظر ان پر پڑی تو اُس نے نہایت احتیاط اور محنت سے
ان کو بطور یادگار فتح دہلی وہاں سے لاکر یہاں نصب کیا۔ خضرآباد دلی سے نوّے
کوس ہے۔ جب بادشاہ کا گزر اِس نواح میں ہوا تو اُس نے ایک ستون موضع تسرا میں
دیکھ کر اُسے دلی لے جانے کا عزم کیا کہ اُسے وہاں کھڑا کرکے آیندہ
آنے والی نسلوں کے لیئے ایک یادگار قایم کرے۔ کس طرح اس کو گرا کر لے
جائیں۔ ان تدابیر پر غور و خوض کرنے کے بعد احکام جاری ہوئے کہ تمام قرب و جوار کے
لوگ جو اندرون اور بیرون دوآب رہتے ہیں حاضر ہوجائیں اور جتنے سوار اور پیدل
ہیں وہ سب بھی آئیں اور ان لوگوں کو حکم دیا گیا تھا کہ اس غرض کی تکمیل کے لیئے
جن اوزاروں کی ضرورت ہو وہ بھی ساتھ لیتے آئیں اور اپنے ساتھ سینبل کی
روئی کے گٹھے بھی لائیں۔ ہزاروں گٹھے روئی کے ستون کے اطراف میں
بچھا دیئے گئے۔ پھر اس کی جڑیں کھودنا شروع کیا گیا۔ تب ستون ان روئی کے
گدیلوں پر جو اطراف بچھائے گئے تھے آن پڑا۔ جب ستون گرگیا تو بنیاد میں
دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک چوکور پتھر پر ٹکا ہوا تھا اُس پتھر کو بھی نکال لیا۔ تب اس
ستون کو سر سے جڑ تک جنگلی گھاس اور غیر قماش شدہ چمڑوں میں خوب لپیٹا گیا تاکہ
رستے میں کوئی حرج مرج نہ ہو۔ تب اس کے لے جانے کے لیئے ایک بہت ہی بڑا
گاڑا یا چھکڑا بنایا گیا جس کے بیالیس پہیئے تھے اور ہر پہیئے میں ایک ایک رسا باندھا گیا
پھر ایک ایک رسے کو ہزاروں آدمی لپٹ گئے اور بڑی مصیبت سے اس لاٹ کو
گاڑے پر چڑھایا۔ اب پھر ہر ایک پہیئے کو موٹے موٹے مضبوط رستے باندھے
گئے اور ہر رستے کو دو دو سو آدمی کھینچتے تھے۔ اس طرح ہزارہا آدمی گاڑے کو
چمٹ گئے اور بہت زور لگا کر اُسے جمنا کے کنارے تک گھسیٹ لائے۔
دریا کے کنارے بادشاہ کی سواری آئی۔ بہت سی بڑی بڑی کشتیاں جمع کی گئیں
بعض اُن میں سے اتنی بڑی تھیں کہ پانچ ہزار من سے سات ہزار من غلہ اُن پر
لاد دیا جاتا تھا اور چھوٹی سی چھوٹی دو ہزار من غلے کے بوجھ کی سہار رکھتی تھیں۔
لاٹ کو بڑی حکمت عملی اور سنبھال سے ان کشتیوں کے بیڑے پر لاد کے
فیروزآباد لے گئے۔ وہاں بڑی احتیاط سے اُتار کر بڑی زحمت اور دانش مندی سے

اسے کوشک تک لے گئے۔ اس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی اور میں میرخاں کا شاگرد تھا۔ لاٹ کے محل میں پہنچ جانے کے بعد اس کے کھڑا کرنے کو جامع مسجد کے متصل ایک عمارت بننی شروع ہوئی جس کی تعمیر کے لیئے بڑے بڑے مشہور اور نامور کاریگر منتخب کیئے گئے۔ یہ عمارت چونے پتھر کی بنائی گئی۔ جس میں بہت سی سیڑھیاں رکھی گئیں۔ جب ایک سیڑھی بن چکتی تھی تو لاٹ اس پر چڑھا دی جاتی اور اسی طرح ایک ایک سیڑھی بنتی جاتی تھی اور لاٹ اوپر چڑھتی چلی جاتی تھی جب اوپر تک پہنچ گئی تو اب اس کے کھڑا کرنے کی فکر ہوئی۔ بڑے بڑے مضبوط موٹے موٹے رستے اور چرخ بنائے گئے جو چھ مقامات پر لگائے گئے تھے۔ رستوں کو لاٹ کے سرے پر باندھ دیا اور رستوں کے دوسرے سرے چرخوں میں جوڑے گئے چرخ خود بہت مضبوطی سے گاڑے اور باندھے گئے تھے کہ اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہ کرسکیں تب چرخوں کے پہیوں کو پھرانا شروع کیا جس سے لاٹ قریب آدھ گز کے اٹھ گئی بڑے بڑے لٹھے اور روئی کے تھیلے نیچے ڈال دیئے گئے کہ پھر نہ گرجاے اس طرح بتدریج لاٹ کو اونچا کرتے رہے اور کئی دن میں جاکر وہ سیدھی کھڑی ہوئی۔ تب اس کے چاروں طرف بڑی بڑی شہتیریں لگاکر ایک قسم کی پنجرہ نما پاڑ باندھی گئی جس کے بیچ میں لاٹ کو لے لیا گیا۔ جب کہیں جاکر وہ تھمی اور سیدھی تیر کی طرح کھڑی رہی اور کسی طرف ذرا بھی جھونک نہ تھا۔ چوکون بنیادی پتھر جس کا اوپر ذکر آیا ہی وہ بھی بنیاد میں نصب کیا گیا۔ جب لاٹ کھڑی ہو گئی تو اس پر دو برجیاں بنائی گئیں اور سب سے اوپر کلس چڑھایا گیا۔ لاٹ کی بلندی (۳۲) گز تھی جس میں سے آٹھ گز تو بنیاد میں گئی اور چوبیس گز اوپر ہی۔ لاٹ کے حصۂ زیریں میں بخط ہندی بہت سی سطور کھدی ہوئی تھیں۔ بہت سے برہمن اور پوجاری پڑھنے کے لیئے بلاے گئے مگر کوئی بھی نہ پڑھ سکا۔ کہا جاتا ہی کہ کسی ایک ہندو نے کچھ مطلب نکالا جو یہ تھا کہ "کوئی شخص اپنی جگہ سے جنبش نہ دے سکے گا تا آں کہ زمان آیندہ میں ایک مسلمان بادشاہ ہوگا جس کا نام سلطان فیروز ہوگا"۔ سنہ ۱۶۱۱ء میں جب ولیم فنچ نے اس لاٹ کو دیکھا تھا تو اس پر ایک ہلال چڑھا ہوا تھا۔ اس کے سنہری کلس ہی کی وجہ سے اس کا نام "منار زرین" پڑا تھا۔ خدا جانے بجلی کے صدمے سے یا توپ کے گولے کے

لگنے سے اوپر کا حصہ تلف ہوگیا۔ مسافروں اور سیاحوں کے نام جا بجا کھدے ہونے
کے سوا جو پہلی صدی عیسوی سے اب تک کے ہیں دو بڑے وقیع کتبے ہیں
ایک تو اسوکا کا جس میں اُس نے اپنا فرمان کھدوایا ہے جو قبل مسیح تیسری صدی میں مشتہر
کیا گیا تھا۔ یہ کتبہ پالی زبان میں ہے جو اس زمانے میں رائج تھی اور دوسرا کتبہ زبان سنسکرت
میں بخط ناگری سمبت ۱۲۲۰ / ۱۱۶۳ء کا ہے۔ اسوکا کے عہد کے کتبے کی نسبت جنرل کننگھم
لکھتے ہیں کہ جتنے کتبے اسوکا کے عہد کے ستونوں پر کھدے ہوئے ہیں اُن سب سے
یہ کتبہ بڑا اور اہم ہے۔ اس کتبے کا خط سارے ہندوستان کے کتبوں سے جو اب تک
دریافت ہوئے ہیں پرانا ہے لیکن کتبہ بہت خوب صورتی اور صفائی سے کھدوا گیا ہے۔ سارے
کتبے میں صرف چند حروف وہ بھی پتھر کے جھڑ جانے سے ضائع ہوگئے ہیں باقی
سب برابر ہے۔ ستون کے ہر چہار طرف الگ الگ جدول کے اندر جدا جدا کتبے ہیں
اور سب سے نیچے ایک بڑا لمبا کتبہ ستون کی چاروں طرف کھدا ہوا ہے۔ البتہ اس کے
حروف باریک اور گہرائی میں ذرا کم ہیں۔ اس میں حروف کے اوپر کے ماترے
بجائے کھڑے ہونے کے ترچھے ہیں اور حروف ج۔ ٹ۔ س۔ اس کتبے
کے دوسرے کتبوں سے جداگانہ شکل کے ہیں۔

مشرقی جانب کے کتبے کا ترجمہ

یوں فرمایا راجہ دیوتم پیا پیا دسی نے۔ میرے اصطباغ کے بارھویں
سال ایک اور فرمانِ مذہبی تمام دنیا کے مفاد کے لیے مشتہر
کیا گیا تھا۔ ہم اس فرمان کو تلف کرکے اور اپنے پہلے عقیدے
کو گناہ خیال کرکے میں اب تمام دنیا کے فائدے کے لیے اس امر کی منادی کرتا ہوں
میں اپنے امرا اپنے اعزہ واقربا۔ اپنے متوسلین کے زمرے میں۔ جو کچھ خوشیاں
بھی مجھے ترک کرنی پڑیں اُس کو تلف کرتا ہوں اور اس امر کا اعلان بھی سارے
مجمع میں کرتا ہوں مع ہذا میں ہر قسم کی دعا سے اُن لوگوں کے لیے بھی جو میرے عقیدے
سے اختلاف رکھتے ہیں دست بدعا ہوں کہ خدا اُن کو توفیق دے کہ وہ میری
واجبی مثال کی تقلید کرکے مجھ سمیت ابدی نجات حاصل کریں۔ بنا براں حالیہ مذہبی
فرمان میرے اصطباغ کے اس ستائیسویں سال میں شائع کیا جاتا ہے۔ یوں فرمایا راجہ
دیوتم پیا پیا دسی نے۔ زمانۂ قدیم کے اٹھارہ راجہ یہی خواہش وتمنا رکھتے تھے کہ بہشت میں

داخل ہو چکے۔ پھر کس طرح۔ انسانوں میں مذہب یا اُس کی ترقی اور شان وشوکت بڑھ سکتی ہے البتہ۔ کم تر درجے کے لوگوں کے تبدیل مذہب سے مذہب (کی رونق) بڑھتی ہے۔
یوں فرمایا راجہ دیونم پیا پیادیسی نے :۔ زمانہ حال اور زمانۂ ماسبق دونوں اسی شوق وامید میں گزر گئے کہ شاہی خاندان کے تبدیل مذہب سے مذہب کس طرح ترویج پا سکتا ہے۔ کم تر درجے کے لوگوں کے تبدیل مذہب سے مذہب بڑھتا ہے تو اعلیٰ درجے کے لوگوں کے تیقن اور تبدیل مذہب سے کیا کچھ نہ بڑھے گا۔ جن لوگوں کے دلوں میں خدا کے نام کا قیام ہے تو (جب کہ) اصل مذہب یہی ہے تو یقیناً وہی نیکی (بھی) بڑھے گی۔
یوں فرمایا راجہ دیونم پیا پیادیسی نے :۔ اسی لیے اسی گھنٹے سے میں نے مباحث مذہبی کے وعظ کا اہتمام کیا ہے۔ میں نے مذہبی مناظرے مقرر کیے ہیں تاکہ بنی نوع انسان اس کو سن کر راہِ راست پہ لائے جائیں اور خدا کی اگنی (نور) کو چمک (دمک) دیں۔

جنوبی جانب

یوں فرمایا راجہ دیونم پیا پیادیسی نے :۔ میرے اصطباغ کے ستائیسویں سال میں (حکم دیتا ہوں کہ) مندرجۂ ذیل جانور نہ مارے جائیں۔ طوطا مینا۔ جنگلی بط۔ قاز۔ بیل کے چھرے کا اُلّو۔ گدھ۔ چمگادڑ۔ امیک۔ پیلیک۔ پہاڑی کوّا۔ عام کوّا۔ ویدویاک۔ خرخرے۔ سنگجاماوا۔ کدھت اسیاک۔ نہاسیسی ملا۔ سندک۔ اوکاپاڑا۔ وہ جانور جن کے جوڑے مل کر رہتے ہیں سفید فاختہ اور گھریلو کبوتر۔ چوپایوں میں ذیل کے مویشی غذا کے کام میں نہ لائے جائیں نہ اُن کو مار پیٹ کی جائے۔ ہر قسم کی بکریاں۔ بھیڑ۔ سور۔ جب کہ گابھن ہوں یا دودھ پلاتے ہوں۔ (تفصیل اُن) چڑیوں کی جو نہ ماری جائیں۔ کسی قسم کے پرند گوشت کی خاطر نہ مارے جائیں اور جو زندہ ہیں انھیں کسی قسم کی ایذا نہ دی جائے۔ جانور جو خود شکار کرتے ہیں پالے نہ جائیں۔ سال کی ہر سہ ماہی میں چودھویں رات کی شام میں۔ اور تین متبرک تاریخوں میں یعنی چودھویں۔ پندرھویں۔ اور قران السعدین کے بعد کا پہلا دن۔ مابین اوپاستھ (صوم) کی رسوم کے۔ نہ ماری ہوئی چیزیں (جیسے زندہ مچھلی) بیچنے کو نہ نکالی جائیں خبردار! ان دنوں میں کسی قسم کا سانپ۔ مچھلیاں کھانے والے (مگرمچھ) حتیٰ کہ کوئی جان دار چیز نہ ماری جائے۔ گو دم پاکش (نصف ماہ) کے آٹھویں دن۔ چودھویں سے پندرھویں تاریخ۔ جن دنوں میں کہ چاند ترِش اور پُنربُوس کے بروج میں ہو ہر چاتماہی

دنوں میں۔ بیلوں سے کام نہ لیا جاوے۔ بکری بھیڑ سور اگرچہ پالتو ہوں تو بھی ان سے کام نہ لیا جاوے۔ ہر چار ماہی کے ترش اور پندرس کے دن ہر چار ماہی کے پشن (نصف روشنی) کے دن گھوڑے کو شقت کے لیئے رکھنا منع ہے۔

مغربی جانب

یوں فرمایا صداؤں کے پیارے راجہ پیا دیسی نے ا۔ میرے اصطباغ کے ستائیسویں سال میں سلنے ذیل کے مذہبی فرمان کی اشاعت کا حکم دیا ہے۔ میرے دھرمی لوگ جو ہزار دں کی تعداد میں ہیں وہ اب درجۂ علم کو پہنچ گئے ہیں۔ دھرمی لوگ ملک میں جہاں کہیں گشت لگائیں گے۔ انجیر کے مقدس درخت اور فرائض ادا کرنے کے لیئے۔ ملک کی خوشی اور فائدے کے لیئے اور اُس کے باشندے نذریں اور بھینٹ چڑھائیں گے اور اپنی فیاضی کے موافق یا اُس کے برعکس وہ فلاح پائیں گے یا بدبختی بھگتیں گے اور وہ اس عقیدے کے آنے کے لیئے شکر گزار ہوں گے۔ کسی گاؤں کو مع وہاں کے باشندوں کے پوجا کے لیئے جو کچھ بھی دیا جاوے یا مقرر کیا جاوے وہی مذہبی لوگ پائیں گے اور میرے لوگوں کو نمونہ پیش کرنے کے لیئے وہ لوگ پابندی کریں گے اور ریاضت کریں گے۔ اور اسی طرح جو کچھ (خیرو) برکت دے دیں اُس کے مطابق میرے دھرمی لوگ پوجا کے لیئے جمع ہوں گے (؟) علاوہ بریں لوگوں کو چاہیئے کہ رات کے وقت میٹر و ملبن کے درخت اور مقدس انجیر کے درخت کے پاس جمع ہوں۔ میرے لوگ میر و ملن درخت کی پرورش (نگہداشت) کریں گے۔ خوشی (لذات نفسانی) سے اسی طرح پرہیز کرنا چاہیئے جیسے کہ نشے سے؟ میرے پیرو گاؤں کی خوشی اور فائدے کے لیئے اس طرح (عمل) کریں گے۔ جس سے وے خوب صورت اور متبرک انجیر کے درخت کے اطراف (آکر) خوشی سے متبرک کام کرتے میں لگے رہیں۔ اسی میں میرے اُن پیرووں کے لیئے جن کے تقرر سے میرا بڑا مقصد ایسی شہرت تھا اور جو حدود مقررہ سے عدول کریں اُن کے لیئے جرمانے اور سزائیں بھی ہیں۔ ارتکاب جرم کی نوعیت کے لحاظ سے سزا کی مقدار مقرر کی گئی ہے لیکن مرتکب جرم کو میں قتل نہ کروں گا۔ جو بدکار قید اور قتل کے مستوجب ہوں گے وہ جلاوطن کیئے جائیں گے۔ جو لوگ شارع عام پر قتل کے مرتکب ہوں

خواہ غریب ہوں یا امیر اُن پر میرے مقرر کردہ تین دنوں میں عذاب نازل کیا جائے گا جو لوگ زندہ مخلوقات کو بے رحمی سے مارنے یا قتل کرنے کے مرتکب ہوں گے (میرے رحم سے) قطع و برید اعضا سے بچ جائیں گے وہ دیہ وندڑ (یعنی خیرات) دیں گے اور اُن کو روزے کا کفارہ بھی دینا پڑے گا۔ اور اس طرح میری خواہش یہ ہے کہ جو میرے مخالف بھی ہوں تو اُن کی بھی حفاظت کی جائے تاکہ وہ پوجا پاٹ کی مدد کریں اور اس کے برعکس وے لوگ جن کی راست بازی ہر اعتبار سے روبہ ترقی ہے وہ خود بخود میری فیاضی سے حصہ پائیں گے۔"

شمالی جانب

"یوں فرمایا راجہ دیونم پیا پیادیسی نے:۔ میرے اصطباغ کے ستائیسویں سال میں سے اس مذہبی فرمان کا تحریری اعلان کیا ہے۔ میں اُن خطاؤں کو تسلیم کرتا ہوں اور اعتراف کرتا ہوں جو میرے دل میں جاگزیں ہیں۔ راست بازی کے شوق میں جس کے مقابلے میں اور سب دوسری باتیں گناہ کی تحقیق اور گناہ پر مطلع ہونے کی پرجوش خواہش ہیں۔ گناہ کے ڈر اور گناہ کی سنگینی سے۔ ان ذرائع سے میری (چشم) بصیرت راست بازی میں مضبوط اور راسخ ہو جائے۔ مذہب کا نظارہ اور مذہب کی محبت خود بخود بڑھتی رہتی ہے اور اور ہمیشہ بڑھتی رہے گی اور میرے لوگ خواہ گرہست ہوں یا سنیاسی سب مخلوق خانی اسی سے (یعنی مذہب سے) جکڑے ہوئے ہیں اور سب ایک ہی رستے کی رہ نمائی کرتے ہیں اور جن لوگوں نے نفسانی خواہشوں پر غلبہ پایا وہی بڑے عقل مند ٹھیرے۔ کیوں کہ یہی سچی دانش مندی ہے۔ مذہب ہی اس کی سنبھال کرتا ہے۔ مذہب ہی سے اس کی نشو و نما ہے۔ مذہب ہی پاکبازانہ افعال سکھاتا ہے۔ مذہب ہی سچی خوشی بخشتا ہے۔" یوں فرمایا دیونم پیا پیادیسی نے:۔ مذہب ہی میں عمدگی ہے بلکہ مذہب تو اچھے کاموں ہی کا نام ہے۔ بہت سے کاموں کا ترک کرنا بھی (مذہب میں داخل ہے)۔ رحم۔ نیک نہادی۔ پاکبازی۔ پارسائی۔ میرے نزدیک اصطباغ کی تقدیس ہے۔ غریبوں اور مصیبت مندوں کی طرف۔ دوپایوں اور چوپایوں کی طرف اور اُن چیزوں کی طرف جو پانی میں چلتی پھرتی ہیں طرح بطرح کے فیاضی کے کام میں نے کیئے ہیں۔ اسی مطلب کے لیئے یہ حالیہ فرمان شایع کیا گیا ہے۔ ہم سب کو

اس پر توجہ کرنی چاہیئے اور یہ آنے والے زمانوں تک باقی رہے۔ اور وہ جو اس کی متابعت میں عمل کرتا ہے وہی ہمیشہ (ہمیشہ) کی خوشی پائے گا یا سگتو میں جا ملے گا۔
یوں فرمایا راجہ دیونم پیا پیادیسی نے:۔ جو کچھ مجھے نیک اور بہتر معلوم دیتا ہے اسے میں نیک اور بہتر سمجھتا ہوں اور اس میں کسی قسم کی برائی کا رجحان نہیں ہوتا۔ کیا میں اسے برا سمجھتا ہوں یا اس کا شمار اسی نیبو (زوجرایم) میں ہے؟۔ (خدا نے انسان کو آنکھیں دو صفتوں میں تمیز کرنے کے لیئے دی ہیں (یعنی صحیح و غلط میں) لیکن جس کی) نظر کی سمائی ہے ویسا ہی وہ دیکھ سکتا ہے۔ ذیل کی نوبے اعتدالیاں کم تر درجے کی ہیں۔ شرارت۔ سنگ دلی۔ غصہ۔ غرور۔ حسد (وغیرہ) اس قسم کے افعال ذمیمہ کا بھول کر بھی کسی حالت میں ذکر نہ کرنا چاہیئے۔ ان کو ممنوع خیال کرنا چاہیئے۔ اس (قانون) کو میرے دل پر کندہ ہونے دو۔ اس پر مجھے (دل و) جان سے فریفتہ ہونے دو۔

لاٹ کے گرد کا کتبہ

علاوہ بریں جیسے جیسے مذہب پھیلتا جاوے گا ویسے ویسے مخالفت بھی بڑھتی جاوے گی۔ اس وجہ سے میں نے وعظ مقرر کیا ہے اور ہر قسم کے قوانین جاری کیئے ہیں جن کے اثر سے راہ سے بھٹکے ہوؤں نے اصلی رستہ پایا۔ سب طرف اس کی منادی کی جاوے۔ اور (سب) اپنے فرائض میں سرگرم ہو جائیں۔ مزید بھی جن کے بڑے جتھے کے جتھے جمع ہو رہے ہیں (لاکھوں جانیں) ان سب کو بھی اسی طرح میرا حکم پونہچے اور اسی طرح تم بھی چاروں طرف اعلان (کرو لاکھوں لوگوں پر) جو مذہب میں شامل ہیں۔ راجہ دیونم پیا پیادیسی نے یوں فرمایا:۔ عالم کی خلایق کے لیئے میں نے بہت عطیات مقرر کیئے ہیں۔ ایسے لوگ مقرر کیئے ہیں جو مذہب کے بڑے دانش مند ہیں اور .... مذہب کے لیئے کیا۔"
"راجہ دیونم پیا پیادیسی نے پھر حسب ذیل ارشاد فرمایا:۔ شوارع عام پر میں نے انجیر کے درخت لگوائے جو انسان اور حیوان کے سائے کے لیئے ہیں۔ میں نے آم کے درخت (بھی) لگوائے اور ہر آدھے کوس پر کنوئیں بھی بنوا دیئے ہیں اور مسافرخانے رات کے لیئے بنوائے اور مختلف مقامات پر انسان و حیوان کے آرام پانے کے لیئے بنوا دیئے ہیں۔ چوں کہ لوگ سڑکوں پر ان مقامات میں آسایش (کی حالت) میں مختلف قسم کی خوشیاں (کرتے) اور آرام پاتے ہیں یہ نئی

بستیاں میرے عہد حکومت میں خوش (و خورم) ہیں۔ اس لیئے اُن کو پورے طور سے ان کی قدر کرنے دو اور اُسی (نیک کرداری کے رستے) کی پیروی کرنے دو۔ میرا مطلب تھا جس کو میں نے پورا کیا" "یوں فرمایا دیونم پیا پیادیسی سنے :۔ اُن پروہتوں کو جو مذہب کے پکے ہیں (یا میرے مسائل کو) ہم غفیرا مرا میں پوہنچنے دو۔ جن کو ایصال ثواب کا موقع ہو اور اُن کو یکساں طور پر ملحدوں میں بھی پوہنچنے دو خواہ وہ سنیاسی ہوں یا گرست اور ان کو مجامع میں بھی پوہنچنے دو۔ میری خاطر سے علاوہ بریں میری خاطر سے ان کو برہمنوں تک بھی پوہنچنے دو اور سب سے زیادہ محتاجوں (مفلسوں) میں بھی اور لوگوں میں جنھوں نے خانہ داری کی زندگی چھوڑ رکھی ہو میری خاطر سے اُن میں بھی پوہنچنے دو۔ اور مختلف ملحدوں میں میری خاطر سے ان کو پوہنچنے دو۔ تم ان مختلف فرقوں میں سخت کوشش کرو کہ سمجھ دار آدمی ۔ وہ آدمی جو مذہب میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں (یا میرے مذہب کے یہ مسائل) ان میں سے ہر ایک میں پوہنچ جائیں اور نیز تمام ملحدوں میں بھی" "یوں فرمایا راجہ دیونم پیا پیادیسی نے :۔ اور ان (پروہنوں) اور دوسرے نہایت زیرک لوگ جو مقدس عہدوں پر ہیں جو میری مخیر مزاج کی رانیوں ایں جاتے ہیں اور تم میری پردہ دار مستورات میں عاقلانہ اور مؤدبانہ طریقے سے نہایت ترغیب دہ کوششیں (اُن کو مذہب میں ملانے) اور دولوں اور بچوں کی آنکھوں پر اثر کریں میری خاطر سے اسی طرح پوہنچنے دو۔ مخیر مزاج کی رانیوں راجکماروں (میں) الغرض (ترویج) مذہبی سرگرمی اور مذہب کی پوری تعلیم کے ۔ اور یہی بھی مذہبی سرگرمی ہو (یعنی) کہ وہ (صفات) رحم و خیرات ۔ راست بازی ۔ تقدس ۔ مہربانی ۔ دیانت داری کو دنیا میں ترقی دیں" "یوں فرمایا راجہ دیونم پیا پیادیسی نے :۔ اور جہاں کہیں میں نے رفاہ عام کے کام کیئے ہیں وہی میرے بعد آنے والے لوگوں کے بطور فرائض کے تجویز کیئے جائیں اور اس طرح) اُن کا اقتدار اور ترقی ظاہر ہوگی ۔ باپ اور ماں کی خدمت گزاری سے پاسبانان روحانی کی خدمت گزاری سے ۔ سن رسیدہ اور معمر لوگوں سے ادب کے طریقے سے پیش آنے سے ۔ اور برہمنوں اور سرامناؤں سے مہربانی اور انکسار سے ۔ یتیم اور مفلس ۔ نوکروں ۔ اور بھاٹ قوم سے" "راجہ دیونم پیا پیادیسی نے پھر یوں فرمایا :۔ انسان میں مذہب دو مختلف طریقوں سے بڑھتا ہے ۔ مذہبی ارکان

پابندی - جور وظلم کے استبداد سے - بدیں غرض کہ مذہبی عہدے اور آزادی خلق اللہ
میں کثرت سے ہو - میں نے قانون کو خود اپنی آنکھ کا تارا بنا رکھا ہو جس کی تصدیق
تمام ان جانوروں سے ہوتی ہو جو قتل سے بچائے گئے اور بہت سے مختلف کاموں سے
جو میری جانب سے کیئے گئے - اور یہ کہ مذہب انسان کی آزادی میں خلق تو ہو -
زندہ موجودات کو مار ڈالنے کی ممانعت کلی سے ترقی پاتا ہی - یا ہر ذی روح جو سانس لیتا ہی
اُس کی قربانی دکی ممانعت سے) - اسی غرض سے یہ سب کچھ کیا گیا ہی کہ وہ میرے
بیٹوں پوتوں پڑپوتوں پر جب تک چاند اور سورج باقی رہیں واجب العمل رہے - اس
لیئے اُن کو ان احکام لی پیروی کرنی چاہیئے اور اُس کی تابعداری کریں اور اُس کی
تعظیم و تکریم کریں - میری سلطنت کے ستائیسویں سال میں میں نے اس فرمان کو
لکھوایا ہی - یوں کہتا ہی (دیونم پیا) :- پتھر اور ستون طیار کیئے جائیں اور یہ مذہبی
احکام اُن پر کندہ کیئے جائیں تاکہ وہ ایسنگ (زمانہ ہائے دراز) تک باقی رہیں"

پانچ چھوٹی سطریں جو الگ ہیں دیونم پیا کے فرمان سے تمام زمانے میں
بڑی سچائی (رہا تا) کا ذکر) اظہار کے
لیئے مقرر کیا گیا ہی - یہ بھی (یعنی) درختان آنبہ
اور دیگر اشیاء (میری) دوسری رانی (ملکہ) کا عطیہ ہیں اور یہ واسطے ..... بیچ بگنی
تیسری راج کماری سردار لڑکی کا ...... دوسری رانی کا یہ کام نگنی قوت سے
(عالم میں) مشتہر ہوئے پہلے چاروں کتبے جدول کے اندر ہیں اور ہر ایک بلحاظ مضمون
کے مکمل ہی - یہی چاروں فرامین لفظاً بلفظ - الہ آباد - مٹیا - رد صیا - اور کوشک
شکار میں جو وقی کی پہاڑی پر ہی منقوش ہیں اس لاٹ کا دوسرا کتبہ ۱۱۶۴ء کا ہی جس میں
سنگم بھاری راجہ وِیِ سالا دیو کی فتوحات کا ذکر ہی - جو رای پتھورا کے حکم سے کھودا گیا
تھا جو راجگان چوہان تنوار کے خاندان میں تھا - اس کتبے کے دو حصے ہیں،
چھوٹا تو اسو کھا کے اینڈکٹ کے اوپر ہی اور بڑا نیچے - کتبۂ بالائی کے حروف بمقابلہ
کتبۂ زیریں کے بڑے ہیں اور لاٹ کے جنوب و مغرب کی طرف منقوش ہیں ذیل
میں پہلے حصے کا ترجمہ ہی دوسرے حصے میں نظم کے دو بند ہیں جو بہت ناقص حالت
میں ہیں اور پڑھے نہیں جاتے - سات مصرعوں میں سے دو ندارد ہیں اللہ آخری

دو مصرعوں کے پانچ لفظ نہیں ہیں۔ کننگھم صاحب کے نزدیک "چاہو مان تِلاکث" کا ترجمہ "سردار چوہان" بہ مقابلۂ کول بروک صاحب کے ترجمے "نہایت عظیم الشان قوم جو برہما کے بازوؤں سے پھوٹی" زیادہ موزوں اور مناسب ہے اور جنرل صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ چوہانوں کی ابتدا کو برہما سے منسوب کرنا غلطی ہے اس بارے میں موک جی کا بیان جو کبھی چوہانوں کا بھاٹ تھا زیادہ قرین قیاس ہے جو ان کا ماخذ "اَنَل کُنڈ" یعنی کوہ آبو کا "آتشی چشمہ" بتلاتا ہے۔ جنرل کننگھم نے مسٹر ایڈورڈ طامس سے اس بارے میں اتفاق کیا ہے کہ وزیر اعظم کا صحیح نام "سری اَسْلِ گلکشن" ہے نہ کہ "سری مَدْ لکشن"۔

کتبہ یہ ہے

سمت ۱۲۲۰ بیساکھ سدی پندرس (۱۵) خوش نصیب وسالا دیو سپر خوش نصیب وِلّا دیو راجہ سکم بھاری۔ (کوہ) بندھیا تک (کوہ) ہما وری تک وقت سیاحت بغرض زیارت مقامات مقدسہ فتوحات حاصل کر کے۔ مغرور راجاؤں سے ستکرہ اور جن کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں (یعنی فروتنوں) کی پاسداری مدنظر رکھ کر) آریاورت کو جیسا کہ اس کے نام کا مفہوم ہے پھر ایک دفعہ ویسا ہی کر کے وحشیوں کا قلع قمع کر کے وسالا دیو حاکم اعلیٰ سکم بھاری اور راجۂ زمین۔ دنیا میں فتح یاب ہوا۔ یہ فاتح خوش نصیب وِگھر اراجہ۔ راجۂ سکم بھاری اس قوم کا سب سے سربرآوردہ جو (برہما) کے بازوؤں سے نکلی تھی اب اپنی اولاد سے یوں خطاب کرتا ہے: ہماری بدولت ہماوت اور وندھیا کا درمیانی ملک ارضی باج گزار بنایا گیا ہے۔ ہمارے دلوں کو بقیہ حصے کے مطیع کرنے کی کوشش سے خالی نہ ہونا چاہیئے۔ دشمنوں کی جوروؤں کی آنکھوں میں آنسو ظاہر ہیں مخالفین کے دانتوں میں گھانس کی پتیاں موجود ہیں۔ تیری شہرت اس کل مقام میں غالب ہے تیرے دشمنوں کے دل امید سے خالی ہیں۔ تیرا رستہ آج جنگلوں میں سے ہے جہاں آدمی گزرنے سے روکا جاتا ہے۔ او وگرہا راجہ دیو تیرے عبور و مرور کی مسرت میں او وگرہا مالک الارض تیرا ٹھکانا جیسا کہ عقل سلیم باور کراتی ہے ان عورتوں کے سینوں میں مقرر کیا جائے جن کی بھنویں خوب صورت ہیں جو تیرے دشمنوں سے بیاہی گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں تو جسمانی ارواح میں سب سے بلند مرتبے کا ہے۔ کیا تو سری کی گود میں نہیں سوتا جسے تو سمندر سے پکڑ کر لایا ہے جسے تو نے بلو دیا ہے۔ سال مبارک بکرما جیت سمت ۱۲۲۰ بروز پنجشنبہ پندرس (۱۵)۔

یہ سری پتی کی موجودگی میں اور اُسی سے لکھا جو بہادالکھیاستھا کا بیٹا گنڈاخاندان
فی الوقت خوش نصیب لکشن پال ایک راج پتر۔ وزیر اعظم ہو ہیبت ناک سیونام
دنیا کا بادشاہ۔ باقی غیر معروف کتبے مختلف زمانوں کے ہیں۔ بعض بہت قدیم زمانے
کے ایسے بھی ہیں جو فیروز شاہ کی لاٹ کو منتقل کرنے کے اول کے ہیں۔ ایک سب سے
پرانا نام "سری بھدرا متراسن" یا "سبھدرا متراہے" یہ اور دو اور کتبے گپتا کے عہد
کے بہت چھوٹے حرفوں میں ہیں مگر اس کے زمانِ مابعد کے کتبے کے ذرا بڑے
حروف ہیں۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے کتبوں میں سے ایک جو سب سے زیادہ صاف
اور واضح ہے وہ "سوریا وشنا سوبرنا کا کنا" ہے۔ دوسرا "ہرا سنگھت سوبرنا کا کنا" ہے۔
جس کے آگے پڑھا نہیں جاتا سوائے ایک لفظ "کمار" کے۔ تیسرا کتبہ "چرا سبانگ"
ہے۔ جس کا دوسرا لفظ ذرا مشتبہ ہے۔ یہی نام دوسری جگہ "چرا سبانا شرا" لکھا ہے حال
کے زمانے کا ایک نام "سد بھیان کرناتھ جوگی" ہے۔ لاٹ کے شمالی رخ پر دو کتبے زمانہ حال
کے ناگری میں ہیں ان دونوں کی تاریخ بدھ تیرہ بدی چیتر اسمت ۱۵۸۱ (۱۵۲۴ء) ہے۔ ان میں
سے جو بڑا کتبہ ہے اس میں "سوری تن ابراہیم" یعنی سلطان ابراہیم لودھی کا نام ہے۔
دگی جو سات مرتبہ اجڑی اور بسی اور کھنڈروں سے پٹی پڑی ہے ان میں بھی فیروز آباد کا
ویرانہ بھیانک ہے۔ کوٹلے پر چڑھ کر دیکھو تو مشرق میں جمنا بہ رہی ہے جس کے قدیم کنارے پر
کسی زمانے میں شہر فیروز آباد آباد تھا۔ مغرب اور شمال اور جنوب میں جہاں تک نظر جاتی ہے
کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں کہیں آدھی دیوار گری کھڑی ہے تو کہیں احاطے کی صرف
دو ہی دیواریں رہ گئیں ہیں۔ سب سے الگ تھلگ ایک لداوی گنبد کا ٹوٹا ہوا باقی ٹکڑا
ہے اور اسی طرح پانچ چھ گری پڑی عمارتوں کا مجموعہ لاٹ کے اطراف بھی ہے۔ آگے چل کر
کوٹلے کے ایک کونے پر برج کے پاس ایک اور سلسلہ کوٹھریوں کا ہے جن میں کچھ
درست ہیں کچھ ٹوٹی پھوٹی اور ایک دوسرا برج بالکل گرا پڑا ہے جس کا ملبا ہی ملبا نظر آتا ہے
عمارات منہدمہ کی بنیادوں کا خالی سلسلہ دور تک چلا گیا ہے جو کئی ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا ہے
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں اس ساری جگہ پر عمارتیں ہی عمارتیں تھیں کھنڈروں
سلسلہ دریا کے کنارے کنارے دور تک چلا گیا ہے جو بہت گنجان آبادی تھی اور جوں جوں دریا سے
دور ہوتے جاتے ہیں گنجانیت کم ہوتی جاتی ہے۔

شیخ محمد کی بائیں اور مہابت خاں کی ریتی

پرانے قلعے سے مہندیوں تک اب کوئی عمارت قابل ذکر باقی نہیں رہی مگر بیچ میں صرف دو عمارتیں مشہور ہیں ایک شیخ محمد کی بائیں[1] (باؤلی) جو اب شاہ صابر بخش صاحب کے جانشینوں کے قبضے میں ہے اور ایک مہابت خاں کی ریتی جہاں کسی زمانے میں مہابت خاں کی حویلی تھی اور اُس کے نیچے جمنا بہتی تھی۔ اس ریتی کا نام مہابت خاں کی ریتی اب تک مشہور ہے۔ مہابت خاں ذات کا راجپوت تھا اور شاہ جہاں بادشاہ کا طرف دار ہوکر اس نے جہانگیر کو قید کرا دیا تھا۔ مہابت خاں بعد میں مسلمان ہوگیا اور آخر میں شیعہ ہوکر مرا اس کی قبر شاہ مرداں میں موجود ہے۔ غدر سے پہلے اور کچھ بعد بھی اس ریتی میں شہزادے اور شہر کے رئیس ہر جمعہ کو پتنگ بازی کیا کرتے تھے۔

نواب مہابت خاں

بروزگار اگر کام خویش برداری + بر آفتاب اگر نام خویش بنگاری
اگر بہ ثروت سامانیاں رسی و کیاں + وگر بچرخ فرازی علم زجباری
چہ سود عاقبش بسپری و بسپاری + دریغ کا خر ازاں بگزری و بگزاری

عہد جہانگیر بادشاہ کے امرائے کبار اور خوانین نامدار سے تھے اصل نام ان کا زمانہ بیگ تھا اور عہد جہانگیری میں کابل کے صوبہ دار تھے عزت و حشمت شان و شوکت فراوانی فوج میں سب امرا سے نمبر بڑھا ہوا تھا۔ نور جہاں بیگم سے ناچاقی۔ بادشاہ کا قید کرنا اور نواب آصف خاں اصفہانی کی گرفتاری اور دوسرے امرا سے مقابلہ یہ سب باتیں جہانگیر نامہ اور اقبال نامۂ جہانگیری میں موجود ہیں۔ یہ واقعہ ۱۰۳۵ھ میں ہوا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد سال دوم جلوس صاحبقرانی مطابق ۱۰۳۸ھ ۱۳ رجب کو دہلی کی صوبہ داری سے سرفراز ہوئے اور ۱۰۴۴ھ میں وفات پائی۔ رخ بمرد تاریخ وفات ہے۔ مخالفین نے خرمرد تاریخ کہی ہے۔ معتمد خاں نے زمانہ آرام یافت ۱۰۴۵ھ سے تاریخ نکالی ہے جس میں ایک عدد بڑھتا ہے۔ مولانا عبدالشکور بزمی نے تاریخ وفات یہ کہی ہے

---

[1] بائیں یا دائیں کو کہتے ہیں باؤلی کا لفظ در اصل باؤلی تھا کیوں بائل اس چشمے کو کہتے ہیں جو فوارے کے مانند زمین کے اندر سے اچھل کر نکلتا ہے۔ بابر نے لکھا ہے کہ "در ہندوستان چاہ کلانے زینہ دار را وائیں می گویند" ۱۲

مفخر ملوک جہاں خان مہابت لقب	آں کہ او یک خلف مادر گیتی نزاد
انچہ بہ تدبیر تیغ کرد باقلیم ہند	ہیچ قوی پنجہ را دست بکوشش نداد
چوں بتقضاے الٰہ تا فلک عمر او	رخت ز دنیا بہ بست روے بجنت نہاد
سال وفاتش خرد دوش بہ رسم دعا	گفت بجاے پدر خان زماں زندہ باد

خان زماں مہابت خاں کے بیٹے کا نام ہو جو مہر اسپ کے نام[1] سے مشہور تھا اسے بھی باپ ہی کا خطاب ملا تھا اور صاحبقران ثانی کے عہد میں کابل کا صوبہ دار ہوا تھا امانی تخلص کرتا تھا ۱۰۴۸ھ میں اس نے بھی وفات پائی۔

شیخ عبد النبی صاحب کی مسجد ۹۸۳ھ ۱۵۷۵ء

مہابت خاں کی ریتی میں دہلی متھرا کی سڑک کے مشرقی رخ پر جیل خانے سے بجانب جنوب تھوڑی دور پر شیخ عبد النبی صاحب نعمانی کی ایک مسجد بہت شکستہ حالت میں ہو جس کی صدر محراب پر ذیل کا کتبہ نہایت خوش خط بہ خط نسخ بہ زبان عربی و فارسی تاریخ شعری مشہور شاعر فیضی کا کہا ہوا تھا جس کو مسجد کی حالت ابتر ہونے سے محکمہ آثار قدیمہ والوں نے لاکر قلعے کے عجائب خانے میں رکھدیا ہو چنانچہ جس جگہ یہ قطعہ نصب تھا اُس کا نشان نمایاں ہو اور وہ قطعہ یہ ہی ہ:—

فی[1] زمانِ الخلیفۃِ الاکبر	اَیَّدَ اللّٰہُ ذَاتَہُ النَّفَاع
قد بنی بقعۃً مُقَدَّسَۃً	مِثْلُھَا لَا یَکُوْنُ فِی الْاَقْطَاع
شیخ[2] الاسلام زائرِ الحرمین	شَیْخُ اَھْلِ الْحَدِیْثِ بِالْاِجْمَاع

[1] ترجمہ اکبر بادشاہ کے عہد میں جس کی کثیر المنفعت ذات کا خدا مددگار رہے۔ ایک ایسی مقدس جگہ کی بنا پڑی کہ جس کی نظیر دوسرے مقامات میں نہیں ہو۔ اس کو شیخ الاسلام حاجی شیخ عبد النبی صاحب نعمانی نے بنایا ہو جو متفقہ طور پر اہل حدیث کے شیخ اور علم کی کان اور ستھری اور نتھری ہوئی چیزوں کا منبع (مخزن) ہیں۔ اس بنا کی تاریخ فیضی نے عقل سے پوچھی تو عقل نے کہا (خیر بقاع) یعنی بہترین مقام۔ [2] صدر الاسلام۔ صدر جہاں اور قاضی القضات سب ایک ہی عہدے کے نام ہیں۔ کل عدالتی عہدہ دار اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ فقرا کا افسر شیخ الاسلام کہلاتا تھا۔ یہ عہدہ ہمارے ملک کے شیخ الشیوخ کے مساوی تھا۔ شیخ الاسلام کی جاگیر بھی ساٹھ ہزار تنکہ سالانہ ہوتی تھی۔ تنکہ و دینار و جیتل کی تحقیق۔ فرشتہ نے علاء الدین خلجی کے (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

عبدُ شیخ النبی نعمانی　　معدن العلم منبع الانتفاع
سال تاریخ این بنا فیضی　　سال العقل قال خیر بقاع

کتبہ ۹۸۳ھ

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) حال میں لکھا ہے کہ "ودراں وقت تنکہ یک تولہ طلا و نقرہ مسکوک رامی گفتند و ہر تنکہ نقرہ را پنجاہ پول مس کہ جیتل می گفتند می دادند اما وزن آں معلوم نیست کہ چہ مقدار بود بعضے برانند کہ یک تولہ مس و بعضے گویند کہ شش پول ایں زماں دو تولہ و ربع کم۔" ہندوستان کے اس وقت کے مورخوں کو جب تنکہ کا رواج تھا اس کی ماہیت اور مالیت معلوم کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی اور پچھلے مورخوں نے جو کوشش کی تو ان کو کچھ پتہ نہ لگا لیکن غیر ملکوں کے سیاحوں کی تحریر سے اور سکوں سے جو دستیاب ہوئے ہیں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب مسلمان اول ہی اول ہندوستان میں آئے تو یہاں زیادہ تر رواج دلّی وال سکّے کا تھا اور وہ جیتل کے برابر ہوتا تھا۔ چنانچہ تاج المآثر کا مصنف اسی لفظ کا استعمال کرتا ہے۔ سراج عفیف یعنی طبقات ناصری کا مصنف الفاظ جیتل اور ٹنکے کا استعمال کرتا ہے۔ سلطان محمود کے سکوں پر جو ۴۱۸ھ کے ہیں عربی میں درہم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور سنسکرت میں ٹنکہ کا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنکہ اصل میں ہندوستان کا لفظ ہے اور ترکی نہیں جیسا بعضوں کا خیال ہے۔ شروع میں تنکۂ نقرہ اور تنکۂ طلائی (۱۷۵) گرین یعنی سو رتی کے ہوتے تھے لیکن سلطان محمد تغلق نے ایک تنکہ نقرئی (۱۴۰) گرین یعنی اسی رتی کا بھی چلایا تھا جسے ابن بطوطہ نے درہمی دینار لکھا ہے اور معمولی تنکۂ نقرہ کو دینار کہتا ہے۔ مسالک الابصار کا مصنف کہتا ہے کہ طلائی ٹنکہ تین مثقال کا ہوتا تھا اور نقرئی تنکہ کی ۸ ہشتگانیاں آتی تھیں اور ایک سلطانی یا دوگانی کے دو جیتل اور ایک جیتل کے چار فلوس۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معمولی تنکہ نقرہ کے (۴۸) جیتل ہوتے تھے اور عدلی کے پچاس اور فرشتہ نے جو لکھا ہے کہ تنکے کے پچاس پول آتے تھے اس کی مراد عدلی تنکہ ہے اور پول سے اس کی مراد جیتل ہے۔ اکبر بادشاہ کے وقت کا جیتل ایک علیحدہ چیز تھی وہ ایک روپیہ کا ہزار واں حصہ ہوتا تھا۔ صاحب طبقات اکبری نے علاوہ تنکۂ سفید و تنکۂ سرخ یعنی تنکہ نقرئی و طلائی کے اور ایک لفظ تنکۂ سیاہ کا استعمال کیا ہے۔ سلطان محمد تغلق کے عطیات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے "واضح باشد کہ مراد ازیں تنکہ نقرہ است کہ پارہ مس ہم داشت و یہ ہشت تنکۂ سیاہ برابر است۔" بعض مورخین کہتے ہیں کہ فرشتے نے اس فقرے کو خبط کر دیا ہے وہ کہتا ہے "چنانچہ نظام الدین احمد بخشی تحقیق کردہ مراد ازیں تنکۂ نقرہ است کہ پارہ مس ہم داشت و یکے ازاں تنکہ ہا را شانزدہ پول مس می دادند" لیکن طبقات اکبری کے موجودہ نسخوں میں خواہ کچھ ہی ہو بادی النظر میں سکۂ سیاہ کا جو مطلب فرشتہ نے

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

اس مسجد کا ایک ہی بڑا مگر چپٹا گنبد ہے اور اندر دار سے دیکھو تو برابر ادھر ادھر بھی ایک ایک گنبد ہے جو چھت پر نہیں ابھرا۔ مسجد تین در کی پتھر چونے کی بڑی مضبوط

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) لیا ہے وہ درست معلوم دیتا ہے کیوں کہ سلطان محمد تغلق کے سکوں میں سے ایک سکہ جس میں چاندی اور تانبا مخلوط ہے (۳۲) رتی کا موجود ہے اور تعجب یہ ہے کہ وہ نہ تو عدلی کا پورا حصہ ہے اور نہ معمولی ٹنکہ کا بلکہ بجائے خود ایک جداگانہ سکہ معلوم دیتا ہے۔ سکوں کی تحقیق کرنے والے حیران ہیں کہ یہ کیا چیز ہے غالباً اصل ٹنکہ کا وزن یہی تھا اور اس صورت میں ٹنکہ ٹانک کے لفظ سے مشتق ہے جو چار ماشے کے برابر ہوتا ہے یہی اس کا وزن ہے اور اس لیئے تنکہ سیاہ اسی سے مراد ہے الغرض ابن بطوطہ کے وقت میں جو ۱۳۳۳ء میں ملک ہند میں آیا تھا تین طرح کے ٹنکے تھے۔ (۱) ٹنکۂ سفید جو خالص چاندی کا سو یا اسی رتی کا ہوتا تھا۔ اسی رتی والے ٹنکے کو عدلی بھی کہتے تھے (۲) ٹنکۂ سرخ جو خالص سونے کا ہوتا تھا اس کا وزن بعض کا سو رتی بعض کا (۱۱۲) رتی بھی ہوتا تھا۔ (۳) ٹنکہ سیاہ (۳۲) رتی کا تھا اور چاندی اور تانبے کا ملواں ہوتا تھا۔ ٹنکۂ سیاہ کا ابن بطوطہ نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ درہم سے اس کی مراد ہشتگانی سے ہے جو حال کے روپئے کی دوانی کے برابر ہوتا تھا اور جس کو مسالک الابصار کا مصنف مصر اور شام کے درہم کے برابر بتلاتا ہے اور ابن بطوطہ بھی درہم کے مساوی کہتا ہے۔ مسٹر ایڈورڈ طامس نے نظام الدین احمد بخشی کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ٹنکۂ سیاہ ہشتگانی چھ جیتل کے مساوی ہوتا تھا اس صورت میں مصنف طبقات اکبری کی مراد اس ٹنکے سے جو سلطان محمد دیتا تھا عدلی ٹنکہ ہوتی ہے۔ لیکن عدلی اور معمولی ٹنکہ میں فقط ایک خمس کا فرق تھا۔ مگر ٹنکہ کوئی معمولی سمجھو یا عدلی عطیات کی عظمت میں کچھ بڑا فرق نہیں پڑتا۔ روپیہ کا رواج شیر شاہ کے وقت سے شروع ہوا ہے اور اسی بادشاہ نے تانبے کے خالص سکے بنائے تھے ورنہ پہلے کل تانبے کے سکوں میں کچھ نہ کچھ چاندی ضرور ہوتی تھی۔ بابر اور سکندر لودھی کے وقت کا ٹنکہ سیاہ نقرئی ٹنکے کا بیسواں حصہ ہوتا تھا یعنی دو بہلولیوں کے برابر۔ بہلولی کا وزن ایک تولہ آٹھ ماشے سات رتی تھا۔ ایک ٹنکہ سفید کے چالیس بہلولی آتے تھے۔ اسی بہلولی کو اکبر کے وقت میں دام کہنے لگے۔ چنانچہ ابوالفضل لکھتا ہے دام سیں تقدیست وزن پنج ٹانک کہ یک تولچہ وہشت ماشہ وہفت سرخ باشد۔ چہلم بخش روپیہ نخست آں راپیسہ گفتے وبہلولی نیز خواندے وامروز بدام اشتہار دارد۔ یک سو ضرب فلاں جاے ودیگر جانب سال ومہ۔ سکہ ہاے محمد بن تغلق شاہ۔ (۱) دینار طلائی۔ ۱۹۸ ¼ گرین۔ دہلی۔ سنہ ۷۲۵،۷۲۶،۷۲۷ھ

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

عمارت ہی۔ اب اندر باہر کا پلاستر سب گر پڑا خالی پتھر ہی پتھر رہ گئے ہیں۔ مسجد کوئی (۵۰ گز) لمبی اور ۱۶ گز چوڑی ہی۔ بیچ کی محراب ۱۱½ گز چوڑی ہی مسجد کے دونوں جانب پہلوؤں میں دو دو حجرے لداؤ کے گنبد دار تھے داہنی طرف مسجد کے شمالی دیوار سے ملے دونوں حجرے گر گئے ان حجروں کے دو دروازے مسجد کے اندر وار نکلے ہوئے ہیں اور اسی طرح کے جوابی دو حجرے محاذ میں جنوب کی جانب بھی تھے وہ گر کر نیست و نابود بھی ہو گئے انھیں میں دو طرفہ زینہ تھا جو اب نہیں رہا اسی سبب سے ہم مسجد کے اوپر نہ چڑھ سکے۔ اندرون مسجد تمام چینی کا کام تھا جس کا کچھ باقی ماندہ حصہ ممبر کے پاس کے پیش طاق۔ گنبد کی چھت اور پاکھوں پر نظر آتا ہی۔ اندر باہر کا پلاستر سب جھڑ جانے سے اب کچھ نہیں رہا۔ چھ سیڑھیوں کا ممبر ہی۔ ممبر کے پاس کے بیچ کی محراب نقش و نگار اور چینی کے کام سے منقش اور بہت آراستہ تھی جس کا کچھ کچھ حصہ اوپر وار رہ گیا ہی۔ بیچ کے بڑے گنبد کے خلا میں اوپر پانچ پانچ طاق چاروں طرف ہیں یعنی سب ملا کر بیس طاق ہوئے۔ سب پر دو طرفہ اللہ اللہ کا طغریٰ ہی۔ فرش پختہ تھا جو اب بالکل نہیں رہا۔ ہر محراب کے پاکھوں پر اندر وار دو طرفہ کلمے کے طغرے تھے جس میں سے اب صرف صدر محراب کے دو طغرے باقی رہ گئے ہیں

(بقیہ نوٹ صفحۂ گزشتہ) عبارت۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا عبدہ و رسولہ۔ حاشیے پر ضرب "ہذا الدنیار بحضرۃ دہلی سنۃ سبع وعشرین وسبعمائۃ"۔ (۲) دینار طلائی۔ وزن ۱۹۸½ گرین دہلی ۷۲۷ھ۔ عبارت۔ ضرب فی زمن العبد الراجی رحمۃ اللہ محمد بن تغلق۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ حاشیے پر۔ ہذا الدینار بحضرۃ الدہلی فی سنۃ سبع وعشرین سبعمائۃ (۳) دینار طلائی نصفی۔ وزن (۹۹) گرین۔ محی سنن خاتم النبیین محمد بن تغلق شاہ۔ (۴) تنکہ پنجاہ کانی۔ پیتل۔ وزن (۱۳۲) گرین جو بجائے چاندی کے سکے کے محمد شاہ بن تغلق نے اپنے حکم سے چلایا تھا۔ دولت آباد ۷۳۱ھ۔ عبارت مہر شد تنکہ پنجاہ کانی در روزگار بندہ امیدوار محمد تغلق۔ من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمن در تخت گاہ دولت آباد سال بر سی یک۔ (۵) تنکہ نصفی تانبہ۔ وزن (۱۰۳) گرین دولت آباد ۷۳۰ھ جو بجائے چاندی کے سکے کے رائج کیا گیا تھا۔ عبارت۔ ضرب ہذا النصفی فی زمن العبد الراجی رحمۃ اللہ محمد تغلق بحضرۃ دولت آباد سنۃ ثلثین سبعمائۃ۔ (۶) سکہ دوکانی۔ وزن۔ (۲۵) گرین۔ عبارت۔ سکہ دوکانی۔ محمد تغلق۔ (۷) سکہ جیتل۔ تانبہ۔ وزن (۴۷) گرین۔ عبارت۔ امان یکانی۔ جیتل۔ ۱۲

باقی جھڑ گئے۔ روکار کا سارا پلاستر جھڑ کر بن گھڑے پتھر سنگ خارا کے نکل آئے ہیں۔ مگر اب بھی داہنی طرف کی چھوٹی محراب کا صرف ایک طغری کلمہ طیبہ کا باقی رہ گیا ہے جو اپنے معدوم شدہ جوڑی داروں کے وجود کی مادی شہادت ہے۔ جو حصّہ عمارت کا باقی ہے سالہا سال کی کائی جم کر کالا اور ہیبت ناک ہو گیا ہے گویا مسجد نے ایک ماتمی لباس پہن لیا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک ڈراؤنی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایک نئی سنوری دلہن کا لباس زیور سب فوج کھسوٹ لیا گیا اور ننگی بچی جنگل بیابان اور ایک لق و دق میدان میں کھڑی ہے۔ ایسی بھیانک صورت کو دیکھ کر ڈر لگتا ہی چاہیے۔ مگر جب اس کے بچے کچھے روپ میں پچھلے بناؤ سنگھار کی جھلک دیکھ کر ہم اپنے خیال کو وسعت دیتے ہیں اور کوئی چار سو برس پہلے کا خیالی نقشہ ذہن میں جمانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمارا خوف و ہراس اور وحشت دلچسپی اور شوقِ دید سے بدل جاتی ہے۔ مسجد کے سامنے ۹۲ چوڑا پختہ صحن ہے۔ اس مسجد کا پختہ احاطہ سو فیٹ مربع کا تھا جس میں طلبا کے لیئے ہر سہ جانب حجرے بنے ہوئے تھے اب وہ احاطہ رہا نہ حجرے۔ ہاں اُن کا نشان ضرور ہے۔ یہ مسجد فیروز شاہ کے کوٹلے کے آگے نظام الدین جاتے ہو بالکل سڑک کے کنارے سیدھے ہاتھ کی طرف ایک بلند ٹیلے پر بنی ہوئی ہے۔

شیخ محمد صاحب چشتی صابری کا گنبد اس مسجد کے سامنے شرقی جنوبی گوشے میں شیخ محمد صاحب کے مزار کا گنبد نظر آتا ہے۔

آپ حضرت شیخ ابراہیم رام پوری قدس سرہ العزیز کے خلیفہ تھے۔ اخلاق بہت وسیع اور نہایت منکسر المزاج تارک الدنیا اور گوشہ نشین تھے۔ صحبت عوام سے بہت گھبراتے تھے اور طبیعت زیادہ تر تنہائی پسند تھی۔ بارہ برس تک خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ شریف اور رستوں کی جاروب کشی کرتے رہے۔ دن رات عبادت و ذکر الٰہی آپ کا مشغلہ تھا۔ کھانا اور سونا برائے نام تھا۔ عالم گیر بادشاہ کا بیٹا محمد معظم آپ کا بڑا معتقد تھا۔ سنا جاتا ہے کہ جس چبوترے پر آپ کا مزار ہے وہ خود آپ نے اور آپ کے مریدین نے بنایا ہے۔ ۲۲ محرم کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ اس جگہ کو شیخ محمد کی باولی کہتے ہیں۔ وجہ اس نام پڑنے کی یہ ہے کہ اس چبوترے کے پاس ایک تالاب تھا جس میں آپ وضو کیا کرتے تھے اسے باؤلی کہتے تھے۔ اسی سبب سے یہ جگہ بھی باؤلی کر کے

مشہور ہو گئی۔

نواب مہابت خاں کی حویلی

عبدالنبی شاہ صاحب کی مسجد کے جنوب رخ پر بیچ میں تھوڑا سا رستہ چھوڑ کر مسجد سے بائیں طرف مہابت خاں کی عظیم الشان حویلی کے کھنڈر پڑے ہیں ان کھنڈروں صدر دروازے اور احاطے کی وسعت ہی سے اس کی اصلی شان شوکت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مہابت خاں کون تھے اوپر ذکر آچکا ہے۔ جیسا مکین ویسا ہی مکان۔ اس کے صدر دروازے کا رخ مسجد کی طرف ہے دروازے کے صرف دو پاکھے کھڑے ہیں باقی گر گیا۔ اور یہیں ایک پختہ کنواں بھی ہے۔ اندر عمارت کے دو بلاک آمنے سامنے بیچ میں وسیع صحن چھوڑ کر گرے پڑے کھڑے ہیں۔ پہلے بلاک کی چھت گر گئی ہے یہ ساری عمارت لداؤ کی تھی۔ جس کے بیچ میں ایک دہری شہ نشین ۲۶×۱۱ فٹ ہے جس کے آگے برآمدہ ہے۔ اور ہر دو جانب ایک ایک کمرہ ۱۱ مربع جس کی چھت کے آدھے آدھے گنبد گر گئے ہیں اور آدھے باقی ہیں۔ بیچ کے ہال کی دیواروں میں بہت سے طاق ہیں اور سامنے اس کے احاطے کی دیوار کے نشان موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قطعہ کے آگے صحن تھا جس میں حوض بھی تھا جو اب ایک گڑھے کی شکل میں رہ گیا ہے۔ یہ بلاک ۷۰×۲۱ فٹ ہے۔ اسی کے سامنے پھر صحن چھوڑ کر جواب کے طور پر دوسرا بلاک کھڑا ہے۔ یہاں اور ایک حوض پختہ ۱۱ مربع اور تین فیٹ گہرا ہے۔ اب دوسرے بلاک کی حالت ملاحظہ ہو جو جنوب میں ہے۔ یہ ۸۰ فٹ لمبا ہے جس کی بیچ کا ہال مشرق کی طرف سے ملے دو حجرے اور اسی کے پاس دہرے تین تین حجرے اور سامنے برآمدہ کھڑے ہیں۔ ایسے ہی تین تین حجرے مشرق کی طرف بھی تھے جو گر گئے۔ شرق رویہ دو باقی ماندہ حجروں میں تہ خانے میں جانے کا رستہ ہے۔ اس بلاک کا سلسلہ سڑک تک چلا گیا ہے یا یوں سمجھیے کہ محل کے احاطے کی مغربی دیوار سڑک کے متوازی ہے اور ادھر اُدھر بھی ایک بڑا دروازہ رہنا پایا جاتا ہے ادھر صحن کی وسعت احاطے کی دیوار تک سو فیٹ کی ہے۔ شمال کی طرف اب بھی احاطے کی دیوار کا ایک حصہ برقرار ہے جس پر سے سارے کمپونڈ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس حویلی کا ٹھیک پتہ یہ ہے کہ دہلی نظام الدین کی بڑی سڑک سے بالکل ملا ہوا بائیں ہاتھ کی طرف اُس مقام پر ہے جہاں سے کہ وہ سڑک پھٹی ہے جو راسے سینما ہوتی ہوئی قطب مینار کو جاتی ہے

چلی گئی ہے۔ پہلے تو یہ محل خود گر گر کھنڈر ہو گیا ہے۔ رہا سہا یوں تلف ہو رہا ہے کہ گرے پڑے پتھر جمع کر کے پھوڑے جا رہے ہیں، اور اُن سے بر اس سڑک کے کنارے جمع کیئے گئے ہیں۔ یہ ساری عمارت نہایت پختہ صرف چونے اور پتھر کی ہے اور چھتیں بھی سب لداؤ کی اندر سے گنبد نما ہیں۔

ببّر کا تکیہ اور مسجد دہلی نظام الدین کی سڑک پر داہنی طرف ایک چھوٹی سی تین در کی مسجد اور کنواں سڑک سے لگا ہوا ہے وہ ببّر کے تکیئے کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے۔

پیاؤ ۱۸۸۲ء پُرانے قلعے سے پہلے سڑک کی بائیں جانب ایک پختہ سہ دری بنی ہوئی ہے جس کے چبوترے پر ایک کوئیاں بھی ہے۔ اس میں پہلے پیاؤ تھی اب خالی پڑی ہے۔ اس کی پیشانی پر ناگری کا کتبہ ہے جس کے نیچے یہ اردو کا کتبہ ہے جو اوپر کے ناگری کے کتبے کا ترجمہ ہے:-

"یہ پیاؤ تعمیر کرائی ہوئی سولی رام و پنا لعل پسران طوطا رام قوم سنار کی ہے مورخہ مئی ۱۸۸۲ء مطابق متی جیٹھ بدی ترودشی سمت ۱۹۳۹ روز دوشنبہ"

شیخ نور الدین ملک یار پراںؒ کا مزار ۶۸۰ھ

ہوائے گلشن دیدار میں گرم پریدن ہوں
قفس سے دم خفا ہوتا ہے مرغ رشتہ بر پا کا
ترے جویا زمانے میں ہیں سب پوچھتے پھرتے
وہ صورت ہے کہاں پنہاں یہ سب کچھ جس کا ہے خاکا

دہلی نظام الدین کی سڑک پر قلعۂ کہنہ سے پہلے سڑک سے تھوڑا ہٹا ہوا داہنی طرف آپ کا مزار ہے اور یہیں سڑک کی بائیں جانب ٹیلے پر حضرت بابا ابو بکر طوسی کا مزار ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے حضرت شیخ نور الدینؒ کے مزار مبارک کی چار دیواری ۵ گز ۱۰ مربع ۵ گز اونچی ہے۔ مزار مبارک ۵ گز ۲ گز ۲ گز ہے۔ جس پر حال میں یہ کتبہ لگا دیا گیا ہے۔ "شیخ نور الدین ملک یار پرّاں قدس اللہ سرہ۔ شیخ بزرگ و باکرامت بود وسلطان المشائخؒ بزیارت روضہ سے آمد و زمان حیات او را نیز دریافتہ بود۔ بتاریخ ۱۸ جمادی الاخری ۶۸۰ھ بعالم قدس خرامید" آپ کے حالات سوانح عمری حضرت نظام الدین اولیاء میں یہ لکھے ہیں (نقل ہے کتاب سیر العارفین سے کہ شیخ نور الدین

ملک یار پرّاں ایک بڑے صاحب عظمت اور باکرامت بزرگ تھے - پیدایش اُن کی لار کی ہی آپ مرید اور خلیفہ شیخ اعز الدین دانیال خلجی کے ہیں اور وہ مرید شیخ علی خضری کے اور وہ مرید ابو اسحاق گازرونی کے تھے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین شیخ صاحب سلطان غیاث الدین بلبن کے وقت میں دہلی پوہنچے اور کنارے دریاے جمن کے (کہ اس زمانے میں دریا اسی مقام کے قریب بہتا تھا اب پرے ہٹ گیا ہی) ہمسایہ میں حضرت شیخ ابابکر طوسی حیدری قدس سرہ کے مقیم ہوے اور یہ ابابکر قلندری تھے زنجیر پوش اور مُہر حیدری موافق رسم حیدریان کے رکھتے تھے اور اُس کی کیفیت یہ ہی کہ شیخ اُس کو بناتے ہیں اور تمام روز اُس کو حلقہ کرکے دونوں سرے اُس کے ایک جالا کر ملاتے اور آگ میں گرم کرکے مہر حیدری اُس پر لگاتے ہیں جس کو مُہر شیخ کہتے ہیں - قلندر صاحب بڑے متقی اور پابند نماز جماعت تھے - حضرت جمال الدین ہانسوی سے نہایت اتحاد تھا - جب کبھی شیخ جمال الدین ہانسی سے خواجہ قطب الدین علیہ الرحمہ کی زیارت کو تشریف لاتے تھے تو آپ ہی کی خانقاہ میں ٹھیرتے تھے نقل ہی کہ جس وقت مولنا حسام الدین اندرپتی خلیفۂ شیخ جمال الدین ہانسوی دہلی ہو کر پیر کی خدمت میں واپس آئے تو شیخ نے پوچھا کہ "آں باز سفید ما چہ گونہ است" یعنی شیخ ابوبکر طوسی کا کیا حال ہی - انھوں نے کہا "قصد حج دارد" - شیخ نے حسام الدین کو یہ کہلا کر واپس بھیجا کہ تمھارے پیچھے میں بھی آتا ہوں اور یہ رباعی مولنا کو لکھ کر دیدی

مرپاے ترا سرم نثار اولی تر | یک سر چہ بود بلکہ ہزار اولی تر
در غار وطن ساز چہ بوبکر از انکہ | بوبکر محمدی بہ غار اولی تر

حضرت ابابکر طوسی کا وصال ۲۲ رجب سنہ کو ہوا آپ اسی ٹیلے پر قریب قلعۂ کہنہ کے رہتے تھے جہاں اب آپ کا مزار ہی - یہاں پہلے بت خانہ تھا آپ نے اسے توڑ کر خانقاہ بنائی - شیخ نورالدین صاحب کو ملک یار پرّاں کہنے کی وجہ یہ ہی کہ جب آپ لار سے دہلی تشریف لاے تو حضرت ابابکر طوسی کے ہمساے میں اسی مقام پر جہاں آپ آسودہ ہیں مقیم ہوئے اُن کو منظور نہ ہوا فرمایا کہ تم اس جوار میں بلا اجازت سلطان وقت کے نہیں رہ سکتے - غیاث الدین بلبن اُس زمانے میں ٹھٹے میں تھا - شیخ نورالدین بقوت باطن اُسی وقت ٹھٹے میں پوہنچے اور بادشاہ سے ملاقات کرکے سب

ماجرا بیان کیا۔ بادشاہ فقرا سے بڑی عقیدت رکھتا تھا فوراً اس جگہ کی معافی اور خرچ لنگر خانقاہ کے لیئے چار گاؤں جاگیر کا فرمان لکھ دیا۔ آپ اسی وقت فرمان شاہی لے اپنی کرامت کے تصرف سے دہلی آئے اور آتے ہی فرمان شاہی حضرت ابا بکر طوسی کو دکھلایا۔ حضرت موصوف متحیر ہوئے اور فرمایا کہ اس درویش کے تابع فرشتے ہوں گے جو یوں پرّاں لے گئے اور پرّاں ہی واپس لائے۔ اُس روز سے آپ کو ملک یار پرّاں کہنے لگے۔ حضرت سلطان المشائخ آپ کی وفات کے بعد دہلی میں تشریف لائے اور دو تین بار دونوں بزرگوں کے مزارات کی زیارت کو تشریف لے گئے۔

حضرت شیخ بابا ابو بکر طوسیؒ کا مزار سنہ ھ

دہلی نظام الدین کی سڑک پر بائیں طرف ایک بلند ٹیلے پر قلعۂ کہنہ سے پہلے ایک سفید سفید عمارت نظر آتی ہے وہ حضرت ابو بکر طوسیؒ کا مزار پُرانوار ہے۔ جس کا احاطہ ۵ گز مربع اور ۵ اونچا ہے۔ مزار مبارک ۶ × ۴ گز پختہ بنا ہوا ہے۔ مزار مقدس پر یہ جدید کتبہ لگا دیا گیا ہے:۔

"شیخ ابو بکر طوسی حیدری قلندر قدس سرہ۔ مشرب قلندریہ داشت۔ میان او و شیخ جمال الدین بغایت مؤدت بود و سلطان المشائخؒ نیز در خانقاہ حاضر شدے و مجلس داشتے۔ ۲۲ رجب سنہ ھ از یں پدرود نمود"۔ یہ خانقاہ لب دریا واقع تھی اور بہت اچھی عمارت تھی جمنا بالکل سے نیچے بہتی تھی گاہ گاہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا بھی خانقاہ میں تشریف لاتے تھے درویشانہ صحبتیں ہوتی تھیں۔ اب خانقاہ باقی نہیں رہی کہتے ہیں کہ پہاڑی کے نیچے تھی اور ایک پختہ دروازہ بھی تھا۔ اب ٹیلے کے نیچے سڑک کے کنارے صرف ایک پختہ سہ دری رہ گئی ہے جس کے اِدھر اُدھر ایک ایک چھوٹا حجرہ ہے۔ وہ بھی کچھ بہت قدیم نہیں معلوم دیتی جو ۲ فٹ × ۱۱ فٹ ہے۔ اسی کی داہنی طرف دو پختہ قبور اور ایک کنواں ہے۔

ایک ہشت پہل برجی

حضرت ابا بکر طوسی کے مزار کے سامنے اور شیخ نور الدین صاحب کے مزار سے ذرا آگے بڑھ کے سڑک کے داہنے جانب ایک سنگ سرخ کی خوش نما ہشت دری برجی باقی بچ رہی ہے جس کا پتھر کا کلس

ٹوٹ گیا ہے۔ اندر کوئی قبر نہیں۔ قرینہ چاہتا ہے کہ ہو نہ ہو کسی باغ یا محل کے احاطے کی چار برجیوں میں کی ایک ہے کیوں کہ اس قسم کی برجیاں احاطوں ہی کے گرد ہوتی ہیں۔ چوں کہ سڑک کے دو طرفہ بہت سے کھنڈر ہیں جن میں سے بہت سے صاف ہو گئے اور جو بچ رہے ہیں وہ صاف ہوتے چلے جاتے ہیں اس سب سے اصل عمارت کا جس کی یہ برجی ہے نشان نہیں مل سکتا۔

کلکاری بھیروں جی کا مندر

قلعۂ کہنہ کی شمالی فصیل کے برابر ایک سڑک چاند ماری کو چلی گئی ہے اُس کی داہنی جانب بالکل فصیل سے ملا ہوا زیر مسجد قلعۂ کہنہ یہ چھوٹا سا مگر قدیم مندر ہے اس میں دو سہ دریاں برابر برابر ہیں ایک میں کلکاری بھیروں جی کی مورتی ہے اور دوسری لوگوں کے واسطے ہے۔ مورتی والی سہ دری کے محاذ میں ایک سہ درہ دالان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مندر بہت قدیم پانڈوؤں کے عہد کا ہے مگر موجودہ عمارت تو ایسی قدیم نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ پرانی عمارت کی درستی زمانۂ حال میں کی گئی ہو۔ مندر کے صحن میں چوکے بچھے ہوئے ہیں اور ایک قدیم کنواں بھی ہے۔ احاطے کی ایک دیوار تو قلعہ کی فصیل ہی ہے باقی تین طرف احاطہ کھینچ لیا ہے مندر آباد حالت میں ہے اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ :-

سید بھورے صاحب کا مزار

اسی مندر کے احاطے سے ملا ہوا مغرب کی طرف سید بھورے صاحب کا چھوٹا سا مزار ہے قبر کا برائے نام نشان رہ گیا ہے۔ چھوٹی سی منڈیر ۱۲ فٹ × ۱۲ فٹ اور ڈھائی فیٹ اونچی کھینچ کر محاط کر دیا ہے اور اس کی نگہداشت کی مسلمانوں کو توفیق نہیں صد آفریں ہے یہاں کے پجاریوں پر کہ تعصب مذہبی کو بالائے طاق رکھ کر اس مزار کی تھوپا تھاپی اور جھاڑو بہارو کرتے رہتے ہیں۔ فصیل کے اس رخ پر ایک کھڑکی بھی ہے اس فصیل کے بالائی حصّے کی مرمت بھی سرکار کی طرف سے کی گئی تھی جس میں کا کچھ حصہ گر گیا

دو دھادھاری کا مندر

اسی لین میں فصیل کے برابر برابر قلعہ کے مشرق کی طرف چلے جاؤ تو اوپر والے مندر سے آدھ آگے بڑھ کر قلعہ کے شرقی و شمالی کونے میں اخیر برج کے نیچے قلعہ کی کھڑکی کے پاس

اس نام کا ایک مندر ہی۔ احاطہ ٹوٹ گیا اب صرف مندر ہی مندر رہ گیا ہی۔
یہاں بھی ایک پرانا اور پختہ کنواں ہی۔

سڑک اور فصیل قلعہ کے بیچ کی عمارات

اس سڑک کی داہنی طرف ایک ہشت درہ برج کھڑا ہی جو کسی محل کا باقی ماندہ جزو معلوم دیتا ہی اس سے اور ذرا آگے ایک پختہ چوپہل برج کھڑا ہی۔

ایک شکستہ گنبد اور ایک ویران احاطہ

پرانے قلعے کے شمال مغربی گوشے میں ایک برج بالکل شکستہ اور منہدمہ حالت میں کھڑا ہی جس کے اندر ایک قبر بھی ہی وہ بھی خستہ قطر اس کا ۲۹ فٹ ہی۔ دروازہ مشرق رویہ ۹×۶ ہی۔ اس برج کے جنوب میں کوئی پانسو قدم پر ۵۰ مربع کا ایک شکستہ احاطہ ہی اس کا دروازہ جنوب رویہ ۹×۷ فٹ ہی اب صرف دروازے کے پاس ایک پندرہ فیٹ کی دیوار رہ گئی ہی۔ اس پر بھی اغلب ہی کہ گنبد تھا اب اس کے اندر کاشت ہوتی ہی یہ چاردیواری بھی اب چلی۔

اندرپت۔ پرانا قلعہ یا دین پناہ

۹۴۰ھ و ۱۵۳۳ء

از بلندیش فرق نتواں کرد
آتش دیدباں ز نور زحل

عوام الناس کی زبان زد ہی کہ یہ قلعہ بہت پرانا ہی بلکہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ایسا پرانا ہی کہ اس کی ابتدا کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ مگر درحقیقت یہ بات نہیں بلکہ کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہی کہ سمت (۴۴۰) بکرماجیت میں انند پال نے پہلے پہل اس جگہ قلعہ بنایا تھا لیکن اس قلعے کا نام ونشاں تک باقی نہیں رہا۔ معلوم نہیں کب ٹوٹا اور کیا ہوا۔ شاید ہمایوں بادشاہ کے عہد تک کچھ نام ونشان باقی ہو۔ سرسید نے اس کا سال بناء عہد نیکپال تنور ۳۰۷ھ تبلایا ہی۔ جنرل کننگھم لکھتے ہیں کہ موقع اندرپت

له مہابھارت میں پانچ پتوں کا ذکر ہی اندرپت تلپت ۔ سونی پت ۔ باگھ پت ۔ پانی پت ۔ یہ سب شہر کسی زمانے میں جمنا کے غربی کنارے پر تھے ۔ اب دریا مشرق کی جانب ہٹ گیا ہی۔ باگھ پت کو اب باغ پت کہتے ہیں جو جمنا کے شرقی کنارے پر ہی۔ تلپت اب متھرا کی سڑک پر دہلی کے قریب ایک پرانے گاؤں کا نام ہی۔ سنا ہی قدیم کی تاریخوں میں اس قصبے کا نام بہت آتا ہی کیونکہ دہلی میں داخل ہونے سے پہلے وہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں پورب سے آتے ہوئے جمنا کو عبور کرکے مسافر ضرور گزرتا تھا۔ ۱۲

کے نام سے اب بھی اندر پرست کے قدیم مقام کا پتہ چلتا ہو جس میں ایک چھوٹا سا قلعہ پرانے قلعے کے نام سے مشہور ہو۔ ہمایوں بادشاہ نے اس کی مرمت کراکے "دین پناہ"

له مہابھوپادھیا پنڈت ہانکے رای نول گوسوامی لکھتے ہیں کہ پرانا قلعہ پانڈوؤں کی قدیم دارالسلطنت اندر پرستھ کی باقیات میں سے ہو۔ ان کی رای میں اس میں کچھ شک نہیں کہ باوجود بہت سے تغیر تبدل کے جو اس زمانۂ دراز میں وقوع پذیر ہوئے ہیں لیکن وہ جگہ جہاں کہ پرانا قلعہ موجود ہو اب بھی باوجود دیکہ یکے بعد دیگرے متعدد سلطنتیں اس پانچ ہزار برس کے زمانۂ دراز میں گزریں اور بہت کچھ انقلاب ہوئے اب بھی اندر پت ہی کے نام سے مشہور ہو۔ یہی نہیں بلکہ کاغذات بندوبست میں بھی اندرپت ہی درج ہو۔ قلعہ میں ایک مسجد ۱۶۸ فٹ لمبی ۴۹ فٹ چوڑی اور ۵۲ فٹ اونچی پنج دری ہو جس کی تین درمیانی محرابیں دوسری محرابوں سے بڑی ہیں اگر ہم اس مسجد کو بغور دیکھیں تو ہم کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہ بھی ابتداءً ہندوؤں کا مندر تھا۔ مسجد کے ٹھیک جنوب میں ایک ہشت پہلو عمارت شیر منڈل کے نام سے مشہور ہو وہ ضرور مندر کے متعلق پانڈوؤں کے زمانے کی قربان گاہ ہو۔ اس امر کے تیقن کی وجوہ حسب ذیل ہیں:۔ (۱) حسب قواعد شاستری وہ عبادت گاہ کے جنوب میں ہو۔ (۲) اگرچہ وہ اس قدر اونچی ہو لیکن پھر بھی اس کی بنیادیں پکی نہیں ورنہ بجائے پختگی۔۔ زمین سے جدا رہتیں اور ایک قربان گاہ کے لیے نامناسب ہوتیں۔ قربان گاہ زیرسا نہیں ہوتا۔ (۳) اگرچہ اس کے چار دروازے ہیں لیکن اب تک بھی پانچ دروازوں کے نشان بالکل نمایاں ہیں جو بداہتہً یدھشٹر۔ بھیمسین۔ ارجن۔ نکل اور سداسیو۔ پانچوں بھائیوں سے منسوب ہیں۔ (۴) اس مقام کے وسط میں صحن نہیں ہو کیونکہ ہَوَن کنڈ میں صحن کی ضرورت نہیں۔ (۵) علاوہ انہیں اس بات کی علامات موجود ہیں کہ اس مکان کا بالائی حصہ دھواں نکلنے کے لیے کھلا رکھا گیا تھا جو بعد میں نئے پتھروں سے بند کر دیا گیا ہو۔ ممکن ہو کہ اس عمارت کا نام پہلے سوریا منڈل رہا ہو کیونکہ پانڈو سورج کی پرستش کرتے تھے چنانچہ مہابھارت میں ایسا ہی لکھا ہو۔ علاوہ اس کے شاستر کی رو سے سورج کا مندر ہشت پہلو ہونا چاہیے۔ ہمارے اس خیال کی مزید تقویت اس بات سے ہوتی ہو کہ سورج کی سواری کی علامت سفید گھوڑا اب بھی قلعے کے دروازے پر موجود ہو۔ کسی عبادت گاہ کے باہر سواری سے پتہ چلتا ہو کہ مندر کس دیوتا کے نام سے معنون ہو۔ شیو کے مندر کے باہر بیل اور سکتی کے مندر کے باہر شیر رہتا ہو۔ اب دو سفید گھوڑے موجود ہیں ممکن ہو کہ وہ پہلے (دو کی جگہ) سات رہے ہوں۔ ان سب امور سے قریب قریب امر یقینی کے ہو کہ قدیم زمانے میں اس مقام کا نام سوریا منڈل تھا۔

(بقیہ نوٹ برصفحۂ آئندہ)

نام رکھا لیکن یہ نام شاید مسلمان ذی علم اصحاب لیتے ہوں تو لیتے ہوں عوام کی زبان پر تو اندرپت یا پرانا قلعہ چڑھا ہوا ہے۔" پرانے قلعے کو لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے وقت کی عمارتیں چھوڑ کر اور باقی جتنی عمارتیں ہیں سب پانڈوؤں کے زمانے کی ہیں زیادتر قرین قیاس

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) شیر شاہ کے زمانے میں اس کا نام شیر منڈل بدل دیا گیا ہوگا جیسا کہ اکثر ہوتا چلا آیا ہے چنانچہ اس کی نظیر دریائے چناب کی موجود ہے کہ اس کا قدیم نام اسکینی تھا جسے سکندر اعظم کے ہمراہیوں نے اکیسنیز کر دیا۔ پنڈت جی نے ناحق اتنی دور تشریف لے جانے کی تکلیف گوارا کی ع یار در خانہ و ما گرد جہاں می گردم۔ بغل میں لڑکا اور شہر میں ڈھنڈورا۔ خود دہلی ہی کی مثال موجود ہے جس نے کئی روپ بدلے ہیں جو دہلی سے شاہجہاں آباد ہوئی اور پھر شاہجہاں آباد سے دہلی اور انگریزوں کے عہد میں کینچلی بدل کر ڈلہی ہو گئی۔ راقم عرض کرتا ہے کہ قطب صاحب کی لاٹ کی نسبت البتہ بحث مباحثہ ایک حد تک باموقع تھا کہ وہ رای پتھورا کے مندر کے وسط میں ہے اور مندروں کو توڑ پھوڑ کر مسجد قوت الاسلام کے بنانے میں کوئی شک نہیں اور مسلمانوں کی عادت میں یہ بات داخل ہے خواہ وہ بری ہو یا اچھی کہ وہ بت خانہ توڑ کر مسجد بنانا اپنے خیال میں کار ثواب سمجھتے ہیں لیکن قلعۂ کہنہ کی مسجد اور شیر منڈل کے متعلق یہ تھیوری کسی او رکی نہیں ہے۔ پنڈت جی کی نظر میں مسجد کا پہلے مندر ہونا ایک بدیہی امر ہے مگر میرے نقطۂ خیال سے بالکل مستبعد ہے جس طرح پنڈت جی صاحب کا دعوی بلا دلیل ہے اسی طرح میرا کہنا بھی محض ایک شخصی رائے ہے اور بس۔ ان کو مسجد کی موجودہ شکل مندر دکھلائی دیتی ہے اور مجھے عین بین بلا شائبۂ شک مسجد تاں یہ بات دوسری ہے کہ کسی زمانے میں اس جگہ کوئی مندر رہا ہو جس کا اب نشان تک باقی نہیں اور مسلمانوں نے اُسے زمین کے برابر کر کے مسجد کھڑی کر لی ہو تو ہمیں خبر نہیں۔ اب رہا شیر منڈل وہ ممکن ہے کہ کسی محل کا ایک باقی ماندہ برج ہو لیکن اس کو اہل ہنود کی قربان گاہ قرار دینے میں پنڈت جی صاحب نے جیسا کچھ زور دیا ہے اس کا فیصلہ خود ناظرین اپنی اپنی جگہ کر لیں۔ میری رائے میں تو صرف چھ ترچھوں سے کان گانٹھے ہیں اور بلحاظ رعایت سورج منڈل یہ شعر بے اختیار زبان پر آتا ہے۔ ؎

جوتے میں ہے لگائی کرن آفتاب کی
جو بات کی قسم بخدا لا جواب کی

کسی عمارت کے محض ہشت پہل ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ سورج کا مندر ہو۔ خود دلی میں بہت سے گنبد ہشت پہل موجود ہیں۔ نہ اس کے دروازے پر شیر گھوڑے کی شکل بنی ہونا اس کی دلیل بین ہے اور پھر اس گھوڑے کی شکل کو شیر منڈل سے کیا تعلق وہ تو قلعے کے صدر دروازے پر ادھر اُدھر دو گھوڑوں کی

(بقیہ نوٹ بر صفحۂ آئندہ)

یہ بات ہے کہ قلعے کی فصیل اور دروازے تو ہمایوں کے بنوائے ہوئے ہیں اور قلعے کے اندر کی عمارات شیر شاہ سور کی جو پٹھانوں کے آخری عہد کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) تصویر بنی ہوئی ہو نہ کہ شیر منڈل پر یا اس کے پاس۔ پھر جب خود دلی میں فیروز شاہ کی بنائی ہوئی ایک قدیم عمارت ۷۵۵ھ کی بنی ہوئی برج منڈل موجود ہو اور جہاں پناہ میں باو منڈل ہو تو کوئی وجہ نہیں ہو کہ شیر منڈل مسلمانوں کا بنا کردہ مقام نہ سمجھا جاوے۔ غیب کا علم سوائے عالم الغیب کے کسی کو نہیں اور وہم کی دارو تو لقمان کے پاس بھی نہیں۔ ممکن تو ہر چیز ہو سکتی ہو یہ بھی ممکن ہو کہ دہلی کی جامع مسجد کبھی مندر رہی ہو لیکن جنرل کننگھم صاحب اور بگلر صاحب جنھوں نے ساری دلی کھونداری اور چپہ چپہ زمین کا چھان مارا اور جو ماہر فن آثار قدیمہ ہیں اور اُن کے اقوال سے سند پکڑی جاتی ہو اُن کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں گزری۔ ہر شخص اپنی راے میں آزاد ہو۔ پنڈت جی صاحب مجھے معاف فرمائیں کہ مجھے اُن کی راے سے مجبوراً اختلاف کرنا پڑا اور یہ اختلاف محض اس وجہ سے نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں کا پارٹ لیتا ہوں۔ حاشا وکلا۔ بات صرف اتنی ہو کہ پنڈت جی صاحب کی راے کی میں نے نقل کر دی اور اپنا ناچیز خیال بھی عرض کر دیا۔ فیصلہ کرنے والے خود پرکھ لیں گے۔ شیر منڈل کے متعلق ایک بات اور بحث طلب ہو کہا جاتا ہو کہ ہمایوں بادشاہ ان سیڑھیوں پر سے گر کر نہیں مرا نہ کوئی مر سکتا ہو بلکہ مکان کے چھجے پر سے اس کا جھونک نکل گیا اور وہ چھت پر سے گر کر مرا میں خاص اسی تحقیق کی غرض سے پھر گیا تھا۔ اس کی دو منزلیں ہیں جن میں اونچی اونچی اٹھارہ اٹھارہ سیڑھیاں ہیں۔ چوں کہ وہ سیڑھیاں سیدھی نہیں بلکہ چکر دار ہیں اس واسطے سرے کی سیڑھی پر سے دُھر نیچے کی سیڑھی تک لڑھک جانے میں کلام ہو۔ میرے خیال میں بے موقع پاؤں پھسل جانے کے بعد دھر نیچے تک لڑھکتے ہوئے چلے آنا یا چند سیڑھیوں کے بعد رُک جانا کسی کی موت کے لیئے بالکل کافی ہو۔ جب موت کا وقت آجاتا ہو تو صرف ایک ٹھوکر میں دم نکل جاتا ہو موت کے لیئے ہاتھی گھوڑے درکار نہیں مثل مشہور ہو جیلے رزق بہانے موت۔ موت کے لیئے ایک ذرا سا بہانہ کافی ہو خصوصاً جب کہ سر میں چوٹ آئی ہو تو مغز کی ذرا سی چوٹ بھی منجر بہ ہلاکت ہو سکتی ہو۔ پس انھیں سیڑھیوں پر سے گر کر مر جانا کچھ بھی بعید القیاس نہیں بلکہ بالکل ممکنات سے ہو۔ ۵

جہاز عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں۔ ۱۲

لیکن اس کے برخلاف صاحب تاریخ خان جہاں لکھتا ہے کہ سلیم شاہ سور نے قلعۂ سلیم گڈھ کی تعمیر کے بعد جو ہمایوں کے قلعے دین پناہ کے محاذ میں تھا صرف آخرالذکر قلعے کی اطراف فصیل کھنچوا دی۔ ہمایوں نامے میں اس قلعے کے متعلق لکھا ہے کہ "اس منصف اور فیاض بادشاہ کا ایک اور کام شہر دین پناہ تھا جو درحقیقت مذہبی آدمیوں کا ملجا اور ماوی تھا۔ شہر کی بنا کے پہلے بادشاہ نے اپنے امرا و ارکان دولت و علما و فضلا سے مشورہ کیا اور ایک ایسا جدید شہر تعمیر کرنے کا عندیہ ظاہر کیا کہ جس میں ذی عقل و فراست لوگوں کا ٹھکانا ہو اور اس کا نام "دین پناہ" رکھا جائے۔ بادشاہ کی اس عمدہ رائے کی سب نے تصویب کی اور موجودہ علما میں سے ایک نے برجستہ کہا" (شاہِ بادشاہ دین پناہ) جس سے تاریخ (۹۴۰) ھ نکلتی ہے۔ اگر یہ شہر بھی اسی سال تعمیر ہو جائے تو کیا خوب ہو" گوالیار سے بادشاہ آگرے چلا گیا اور وہاں سے

اندرپت قلعۂ کہنہ

دلی آیا اور ایک نیک اور مبارک ساعت دیکھ کر دریائے جمنا کے کنارے ایک مرتفع خطۂ زمین پر جو دہلی سے تین کوس ہے پسند کر کے شہر کی بنا کا حکم دیا۔ ماہ محرم الحرام ۹۴۰ھ ۱۵۳۳ء بساعت محمود و اوقات مسعود بادشاہ کی رکاب میں سب امرا و ارکان دولت مقام مقررہ پر گئے۔ پہلے نماز پڑھی پھر بادشاہ نے اپنے دست مبارک سے ایک اینٹ بطور بنیاد کے رکھی پھر سب حاضرین نے بادشاہ کی تقلید کی کسی نے اینٹ اور کسی نے پتھر رکھا اور اسی تاریخ سب سے پہلے محل شاہی کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا اور آخر ماہ شوال تک شہر

دین پناہ کی فصیل - برج - دروازے سب چیزیں قریب قریب مکمل ہوگئیں۔" اس طرح دس مہینے کے اندر ہی اندر اس قدر عمارات بن کر کھڑی ہوگئیں کہ خیال ہوتا ہے کہ اس قطعۂ سرزمین پر کوئی پرانی بستی رہی ہوگی جس کے مال مسالے کی مدد سے اس قدر جلد ایک نیا شہر بن کر کھڑا ہوگیا - دین پناہ کا نقشہ مستطیل ہے تین فرلانگ لمبا اور چار فرلانگ چوڑا - اس کا طول مشرق سے مغرب کو ہے - تین دروازے ہیں - شمال وجنوب کے دروازے مدت سے بند ہیں - ان میں سے شمالی دروازہ "طلاقی دروازہ" کہلاتا ہے وجہ تسمیہ اس کی یہ کہی جاتی ہے کہ ایک دفعہ اس دروازے سے فوج کشی ہوئی اور دروازہ بند کردیا گیا کہ اگر بغیر فتح آکر کھولیں تو اُن پر طلاق ہے مگر پھر بھی فتح نہ ہوئی دروازہ اسی طرح بند رہا مگر یہ معلوم نہیں کہ کس بادشاہ کے زمانے میں تیغہ ہوا - مغربی دروازہ جو صدر دروازہ ہے وہ کھلا ہوا ہے - ان دروازوں کے سوائے تین کھڑکیاں بھی ہیں دو دریا کی طرف جن میں ایک کھلی ہوئی ہے اور تیسری جو قلعے کی مغربی دیوار میں ہے وہ بند ہے - شہر کے چاروں کونوں پر عظیم الشان برج ہیں - مغربی دیوار میں دو برجوں کے درمیان دروازوں کے برج ملاکر سات ہیں شہر پناہ میں دو منزلہ حجرے ہیں جن کی بلندی دروازوں کے برابر نہایت مضبوط اور عریض ہے - دریا کی طرف کی فصیل کا بالائی حصہ منہدم ہوگیا ہے - حصۂ زیریں میں گاؤں والے رہتے اور اپنے مویشی باندھتے ہیں - تمام فصیل سنگ خارا کی بنی ہوئی ہے جس پر بھاری بھاری کنگورے بنے ہوئے ہیں - کسی زمانے میں بہت خوب صورت ہوگی - صدر دروازہ بہت عظیم الشان اور بلند ہے جس کے دونوں جانب کے برج بھی بہت بڑے اور شاندار ہیں - ان برجوں پر ہشت پہلو برجیاں تھیں جن پر چینی کی رنگین اینٹیں لگی ہوئی تھیں - بائیں برج کی برجی گرگئی ہے - دروازے کی محراب سے پانچ چار فیٹ نیچے ایک قطار سنگین توڑوں کی ہے جو نصف مثمن برجیوں کو تھامے ہوئے ہے - اس دروازے کے اوپر کھڑکیاں نہیں ہیں - دروازے کا روکار بھورے اور لال پتھر سے آراستہ ہے - ان برجیوں پر کسی زمانے میں میناکاری کا کام تھا چنانچہ دروازے کے پیچھے بھی اب تک ایک پٹی میناکاری اینٹوں کی موجود ہے - قلعۂ کہنہ کے تین دروازے ہیں جن میں سے صدر دروازہ شمال مغرب میں ہے دوسرا شمال مشرق میں تیسرا جنوب

مغرب میں۔ ان کے علاوہ ایک چھوٹا دروازہ ہے جسے کھڑکی کہا جا سکتا ہے۔ صدر دروازہ جو لب سڑک ہے وہ بڑا عالی شان سہ منزلہ ہے جس پر تین برجیاں اور دو نشیمن ہیں۔ یہ دروازہ تہرا ہے یعنی ایک کے اندر ایک۔ دروازے کے روکار پر داہنی اور بائیں طرف گھوڑے کی تصویر کھدی ہوئی ہے۔ پٹ اب باقی نہیں رہے پہلے ضرور ہوں گے جن کے نشان بھی موجود ہیں۔ دروازے کی بلندی ساٹھ فیٹ۔ چوڑان دس فیٹ اور عمق ساٹھ فیٹ ہے۔ اس کا نقشۂ نظری یہ ہے:۔
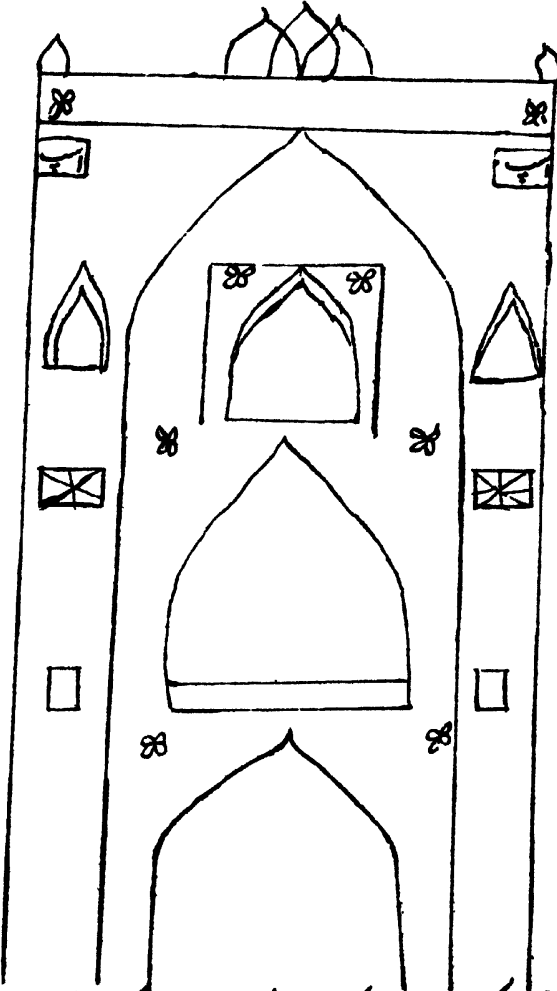
تیسرا دروازہ جنوب کی طرف ہے جو بالکل شمالی دروازے کی طرح کا ہے۔ دریائے جمنا کی

نقشہ مسجد قلعہ کہنہ
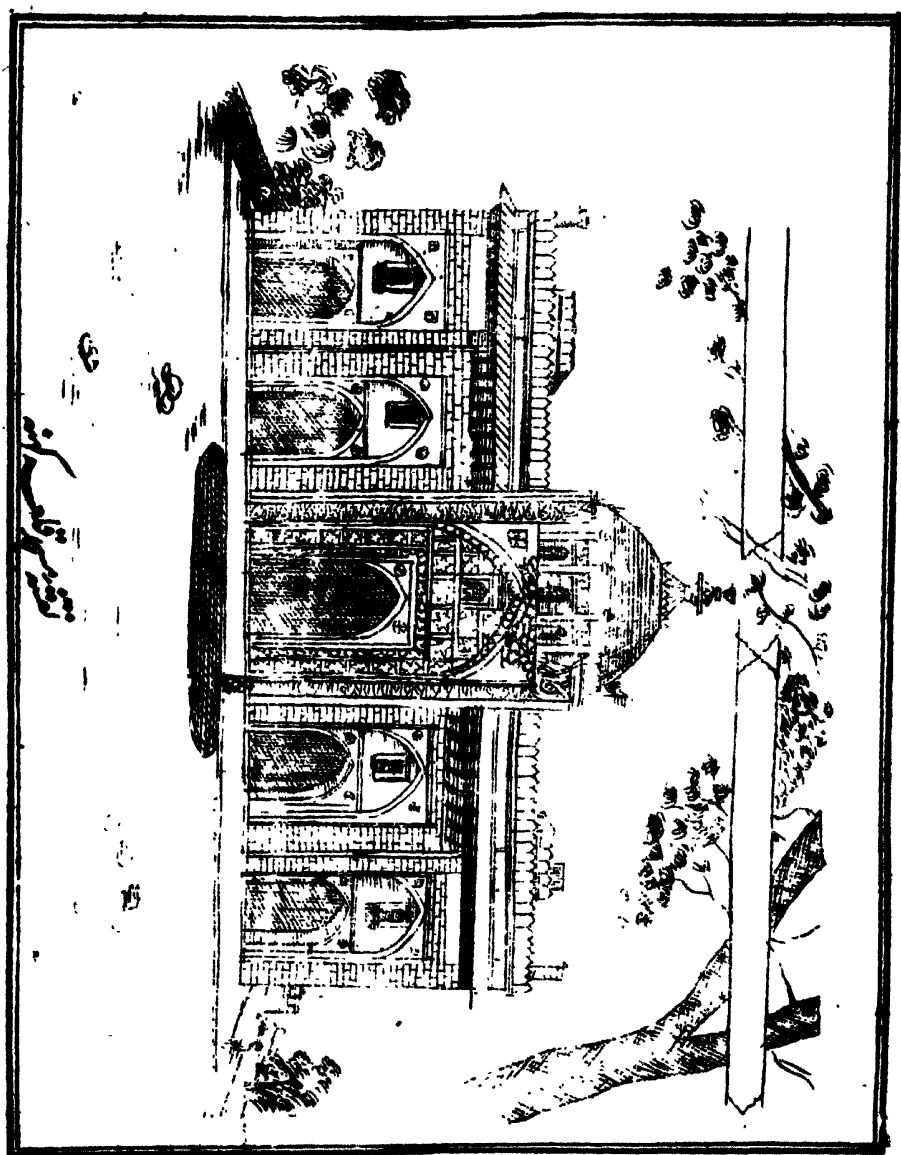
زمانے میں موضع اندرپت یعنی قلعۂ دین پناہ سے کے پاس ہی بہتا تھا چنانچہ مغربی دروازے کے سامنے ایک پل کے گرے پڑے در موجود ہیں لیکن اب دریا یہاں سے بہت دور ہٹ گیا ہے۔ اور دریا کے حالیہ مجرائے آب اور قلعۂ کہنہ کے درمیان جو زمین برآمد ہو گئی ہے اس میں اب زراعت ہوتی ہے۔ دریا کی طرف جو فصیل تھی وہ تو بالکل گر گئی ہے اور دوسری جانب کی فصیلوں کی بھی بہت بری حالت ہے اور قریب الانہدام ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ فصیل کے ہر ہر برج پر برجیاں بنی ہوئی تھیں لیکن اب تو صرف صدر دروازے کی دو طرفہ برجیوں کے سوائے اور کوئی برجی باقی نہیں رہی۔ قلعے کے اندر گاؤں والوں نے رہنے کے مکانات جو زیادہ تر نہایت چھوٹے چھوٹے اور خام تھے بنا لیئے تھے مگر لارڈ کرزن ویسرائے کے زمانے میں لوگوں کو معاوضہ دے کر میدان صاف کر دیا گیا اور گھانس کے تختے لگا کر لال بجری کی سڑکیں نکال کر چمن بنا دیا ہے جو فی الجملہ اس بدنما اور کثیف حیثیت سے بدرجہا بہتر اور خوشنما ہے۔ قلعہ میں فصیل۔ برجوں اور دروازوں کے سوا اب کچھ نہیں رہا۔ وہ جامع جسے "مسجد قلعۂ کہنہ" بھی کہتے ہیں اور ایک برج جو "شیر منڈل" کے نام سے مشہور ہے جسے ڈی لاٹ (De Laet) نے دوسرے لوگوں کی طرح غلطی سے ہمایوں کا محل کہا ہے یہ دو عمارتیں خاص کر دیکھنے کے قابل ہیں۔ ہمایوں کے محل جس کا تفصیلی ذکر ہمایوں نامے میں ہے اب تو اس کا کہیں پتہ بھی نہیں رہا۔ قلعے کی فصیل کے نیچے بجانب غرب مسلمانوں کا قبرستان ہے۔ ایام غدر میں شہر کے اکثر معززین یہاں دفن کیئے گئے تھے۔ یہیں پرانی دلی بھی آباد تھی جو اب بالکل ویران ہے حتی کہ کھنڈر تک بھی باقی نہ رہے دو ایک عمارتوں کے گرے پڑے ڈھیر اور ٹوٹے پھوٹے دروازے البتہ اب بھی باقی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاں یہاں کبھی کوئی بستی بھی تھی۔

مسجد قلعۂ کہنہ
۹۴۸ھ
۱۵۴۱ء

عباس خاں مصنف تاریخ شیر شاہی لکھتے ہیں کہ "دلی قدیم شیر شاہی کے قلعے میں شیر شاہ نے ایک جامع مسجد سنگین بنوائی تھی جس کی آرائش میں سنہرا کام کثرت سے تھا اور نیز دوسری قسم کی قیمتی اشیا بھی جا بجا لگائی گئی تھیں"۔ علیٰ ہذا عبداللہ مصنف تاریخ داؤدی نے بھی لکھا ہے

کہ بادشاہ نے ایک عالیشان مسجد ۱۵۴۱ء ۹۴۸ھ میں بنوائی تھی جو بہت جلد تکمیل کو پہونچی یہ مسجد مستطیل ہی ۱۴۸ فٹ لمبی اور ۴۴ فٹ چوڑی اور ۴۴ فٹ اونچی اور چھت سے گنبد تک سولہا فیٹ کی بلندی اور ہی ۔ اس مسجد کے پانچ در ہیں ۔ بیچ کی محراب دیوار دوز ہی جو چالیس فیٹ اونچی اور پچیس فیٹ چوڑی سنگ مرمر اور سنگ سرخ کے دیوار دوز ستونوں سے بنی ہوئی ہی جس کے اطراف سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی تحریریں ہی جن کے بیچ میں آیات قرآنی بخط نسخ و طغرا نہایت نفاست سے منقوش ہیں محراب کی پیشانی پر عمدہ نقش و نگار ہیں اور دیوار دوز ستونوں پر بھی بہت کچھ نقش و نگار ہیں اور انھیں کے اوپر چھوٹی چھوٹی مینار یں ہیں ۔ درمیانی محراب کے اوپر بیچوں بیچ میں ایک چھوٹا سا نشیمن ہی جس کی چوکھٹ پر بہت عمدہ کام کیا گیا ہی اس محراب کا تمام روکار عمدہ نقش و نگار سے آراستہ و پیراستہ ہی جس میں سنگ سرخ ۔ سنگ زرد اور سنگ موسیٰ قسم قسم اور مختلف رنگ کے پتھروں کی پچیکاری کی گئی ہی کمرہ محراب مسجد کے وسط میں ہی جس میں سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی پٹیاں اور خوبصورت چھوٹے چھوٹے ستون اور مرغولیں اور خوش نما پھول پتیاں اور گلدستے بنے ہوئے ہیں ۔ اس محراب کی دائیں اور بائیں دیوار دوز محرابیں ۳۷ فٹ اونچی اور بیس فیٹ چوڑی ہیں اور درمیانی محراب کے اوپر وسط میں ایک محراب دار کھڑکی ہی ۔ اسی طرح ورلی اور پرلی محرابوں پر بھی بہت ساکام کیا ہوا ہی جو تیس فیٹ اونچی اور بیس فیٹ چوڑی ہیں ۔ ان محرابوں میں کواڑ تھے جو مسجد میں داخل ہونے کے چار رستے تھے مسجد کے اوپر دو چھوٹے چھوٹے منارے ہیں جو بیچ کی محراب کے میناروں کے برابر اونچے ہیں ۔ ادھر ادھر کی محرابوں کے اوپر کی چھت پر کنگورا بنا ہوا ہی اور منڈیر سے چار فٹ نیچے ایک سنگین چھجہ ہی جس کے نیچے توڑے لگے ہوے ہیں ۔ بیچ کی جانب کی دونوں محرابوں کے نیچے بہ نسبت دوسرے توڑوں کے بھاری توڑے لگائے گئے ہیں اور ان پر نقش و نگار بھی ہی بیچ کی محراب کے آگے کوئی چھجہ نہیں ہی ۔ مسجد کی چھت پر کسی زمانے میں تین گنبد تھے جن میں سے دو تو دست برد زمانے کی نذر ہوے اب صرف بیچ کا ایک بڑا گنبد رہ گیا ہی جو ایک پست استوانے پر ایستادہ ہی جس پر ایک چپٹا اور بھاری کلس چڑھا ہوا ہی جس کی نسبت مسٹر ٹگر نے لکھا ہی کہ گنبد کے نیچے ایک بڑا بھاری سرول بوجھ سنبھالنے کو دیا گیا ہی جو ہندوؤں کے بڑے بڑے

مندروں کے گنبدوں کی وضع کا ہی - گنبد سب اندر سے چپٹے ہیں - مسجد کے صحن میں چونے کے بچھے ہوئے ہیں جو جہاں جہاں سے ٹوٹ گئے ہیں وہاں گچ کردی گئی ہی - مسجد کی پچھیت کی دیوار میں سامنے والے پانچ دروں کے جواب میں تین دیوار دوز محرابیں ہیں جن پر نہایت عمدگی سے سنگ مرمر سنگ سرخ اور سنگ موسیٰ کی تحریریں ہیں اور جن میں آیات قرآنی کہیں بخط نسخ اور کہیں بخط کوفی کندہ ہیں ان تینوں محرابوں کے ادھر ادھر نہایت نفیس طاق بنے ہوئے ہیں جو بہت آراستہ ہیں اور ان دو طاقوں کی پیشانی پر یہ دو شعر کندہ ہیں جو آگے لکھے جاتے ہیں - درمیانی محراب کے اوپر ایک چوکون کھڑکی بطور روشن دان کے ہی اور اس کے اوپر گنبد کی چھت میں بھی اسی قسم کی چار کھڑکیاں ہوا کی آمد و رفت کے واسطے ہیں - چھت سے پانچ زنجیریں لٹکی ہوئی ہیں جن میں کبھی کٹورے آویزاں تھے - گنبدوں کی چھت اور کونوں میں جو قینچی کا کام ہی وہ بڑی صناعی اور نہایت عجیب ہی - پاس کے حجروں کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی محرابیں ہیں جن میں سے کوئی آگے کو نکلی ہوئی ہی کوئی پیچھے کو ہٹی ہوئی ان میں سے جو سب سے نیچے کی محراب ہی وہ توڑے کا کام دیتی ہی - مسجد کے شمالی اور جنوبی دیواروں میں چھت پر چڑھنے کے دو زینے ہیں جس میں سولہا سولہا سیڑھیوں کے بعد ایک نصف مثمن برج ملتا ہی جس کے چار ترشے ہوئے ستون مسجد کے پشت کی طرف ہیں - ان ستونوں کے سرے اور توڑے جن پر سنگین شہتیریں لگی ہوئی ہیں سب نقش و نگار سے پُر ہیں - پھر اور پندرہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک لمبا تاریک چھتہ ملتا ہی جو دوسری نصف مثمن برجی کے سرے تک ہی - ان دو برجیوں کے علاوہ اور تین چوکون برجیاں ہیں جن میں سے ایک تو دیوار کے بیچ میں ہی اور ایک ایک دیوار کے ادھر ادھر - ان برجیوں پر اب تک کچھ کچھ میناکاری کا کام باقی ہی - مسجد کی چھت پر دو شکستہ گنبدوں کے نشانات موجود ہیں - درمیانی بڑا گنبد سولہا رخے پست استوانے پر بنایا گیا ہی جس کے اوپر سولہا پانچ فیٹ اونچے منقش ستون ہیں - مسجد کی پچھیت کی دیوار کے وسط میں جو برجی ہی اس کے دونوں طرف دو پتلی پتلی مناریں چھت سے پانچ فٹ بلند ہیں - مسجد کا ممبر اب تو گچ کا ہی مگر قیاس چاہتا ہی کہ پہلے ضرور سنگ مرمر کا ہوگا - مسجد کے متعلق ایک باؤلی بھی تھی جس کی سیڑھیاں تالاب آب تھیں جو

اب بھر دی گئی ہے مسجد کے صحن میں ایک سولہا ضلعوں کا حوض بھی تھا جو اب بالکل خشک ہے۔ مسٹر ٹرملٹ لکھتے ہیں کہ "یہاں کے نقش و نگار کی نفاست کی پوری کیفیت اور لطف بدون اس کے کہ کوئی مصور ویسا ہی نقشہ اتارے قلم سے ادا ہونا ناممکن ہے۔ اس مسجد کی عمارت میں ایک یہ اور جدت ہے کہ محرابوں کے بالائی حصوں میں شمال اور جنوب کے رخوں پر طاق نما چھوٹی چھوٹی آگے کو نکلی ہوئی کھڑکیاں رکھی گئیں ہیں اور ان پر چھوٹی چھوٹی خوش نما برجیاں بنائی گئیں ہیں جو ستونوں پر کھڑی ہیں اور اسی قسم کی آگے کو بڑھی ہوئی کھڑکیاں مسجد کی پچھیت میں بھی ہیں اور اس دیوار کے دونوں سروں پر مدوّر مناریں ہیں جو نیچے سے اوپر تک چلی گئیں ہیں۔ اُس زمانے میں یہی طرز تھا چنانچہ قطب صاحب کی جمالی مسجد۔ مبارک پور کی مسجد اور موضع خیر پور کی ایک بے نام مسجد جو صفدر جنگ کے مقبرے سے کوئی تہائی میل ہوگی سب اسی وضع کی ہیں لیکن یہ مسجد سب پر سبقت لے گئی ہے جو ایک بہترین نمونہ پٹھانوں کے عہد کی فن تعمیر کتبات اور نقش و نگار کا ہے کہ جن کے ہاتھ میں پتھر موم بن جاتا تھا۔ اس مسجد کی اندرونی اور بیرونی تراش اس کی دیواروں کے متعدد پیچ در پیچ زاویوں نے عجیب طرح پر روشنی اور سایہ کی ایسی خوش نما جھلک ڈالتے ہیں کہ نگاہ خیرہ ہو جاتی ہے۔ مسجد کے باہر دار رنگ برنگ کے پتھروں کے جوڑ بڑی خوبی نفاست اور موزونیت سے پیوست کیے گئے ہیں۔ خصوصاً کونوں اور طاقوں کے اندر کا رنگ بے نظیر ہے"۔

مسجد قلعۂ کہنہ کے کتبات

اندرون مسجد بر محراب وسطی۔ (۱) بسم اللہ الرحمن الرحیم سورۂ یسین تا وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ۔ (۲) لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ تا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (۳) بسم اللہ و سورۂ الحمد تا ولا الضالین۔ آمین۔ یا اللہ بیچ میں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کونوں پر۔ سبحان اللہ حسبی اللہ سبحان اللہ حسبی اللہ
اللہ

اللہ نیچے حسبی اللہ حسبی اللہ

داہنی طرف کی پہلی محراب۔ (۱) بسم اللہ۔ سورۂ جمعہ تا وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ

(۲) بسم اللہ - معوذتین - بیچ میں (۳) اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ - لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ - سُبْحَانَ اللّٰہِ
(۴) تا جہاں آباد باشد ایں مقام آباد خلق عالم اندریں ہم خرم و ہم شاد باد
(۵) بسم اللہ - قل ھو اللہ - (۶) لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ - کونوں پر الفتاح الفتاح - داہنی طرف کی دوسری محراب[1] (۱) بسم اللہ - آلم - ذٰلِکَ الْکِتَابُ تا اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ - (۲) سورۂ ارأیت الذی مکمل - (۳) بسم اللہ - قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ .... اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُوْلِجُ النَّھَارَ - (۴) بیچ میں - فِی الَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ - (۵) وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ -

اللہ

یا فتاح

بائیں طرف کی پہلی محراب[1] - (۱) بسم اللہ - سورۂ فتح از ابتدا تا اَلتَّسْلُکُوْا مِنْھَا سُبُلًا فِجَاجًا (۲) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَھُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا تا ختم سورہ کہف - (۳) سورۂ توبہ - لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی تا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ (۴) سورۂ آل عمران شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ تا اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ - (۵) سورۂ انعام - بسم اللہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ تا ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا - (۶) بِرَبِّھِمْ یَعْدِلُوْنَ - ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ تا ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ - (۷) بسم اللہ - آیۃ الکرسی تا وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ - (۸) قُلْ ھُوَ اللّٰہُ - بیچ میں الملک للہ - لا الہ الا اللہ سبحان اللہ اللہ - اللہ - لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ - حسبی اللہ الملک القدوس - الملک للہ - لا الہ الا اللہ سبحان اللہ (۹) الٰہی رحم کن بجا لو کا دیم بخی ت دل جلد یا لی دکا دسیم (اللہ) ھل ار لو رمو دو بےبل دبل کلہ ما دد کا رس وھا بی دکا دیم بائیں طرف کی دوسری محراب[1] - (۱) سورۂ حشر - لَوْ اَنْزَلْنَا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ تا ختم سورہ

---

[1] یہ شعر عربی خط میں گو صاف لکھا ہوا ہے مگر ہر چند غور کیا گیا پڑھا نہیں جاتا لہذا نقل راچہ عقل ناچار صورت نویسی پر اکتفا کرنا پڑا - ۱۲

وَہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۔ (۲) بسم اللہ ۔ الم ترکیف ۔ (۳) بسم اللہ ۔
قل یا ایہا الکافرون ۔ اللہ اللہ

یا فتاح

اللہ

مسجد کا دالان ۷۰-۱۵ × ۷ ۔ ۳ ہی اور چبوترا ۵۲ × ۱۵ ۔ ۲ ہی ۔ درمیانی بیرونی محراب ۵ ۔ ۱۵ اونچی اور ۶-۲ ۔ ۳ چوڑی ہی ۔ جس پر تین فیٹ اونچا کنگورا ہی ادھر ادھر کی محرابیں اونچان میں اس سے کم ہیں ۔ اوپر بھول بھلیاں بنی ہوئی ہیں جس کی پہلی منزل میں تیرہ اور دوسری منزل میں ۳۲ جملہ (۴۵) سیڑھیاں ہیں ۔ **باہر کی محرابوں کے کتبات** ۔ درمیانی محراب پر بسم اللہ سورۂ انا فتحنا تا کان اللہ غفوراً رحیماً ۔ داہنی طرف کی محراب پر ۔ بسم اللہ اور سورہ مزمل تمام وکمال ۔ بائیں طرف کی محراب پر بسم اللہ ۔ سورۂ ملک تا ان الکافرون الا فی غرور ۔ داہنی اور بائیں طرف کی دو چھوٹی چھوٹی محرابیں خالی ہیں ۔ سوائے برجیوں کے اس مسجد کے بلند مینار نہیں ہیں ۔ مسجد کے عقب میں تین نشیمن ہیں ۔ برج ایک ہی ہی مسجد کی دونوں جانب سہ منزلہ برجی دار پاکھے ہیں ۔ **صحن مسجد کا حوض** ۔ اس مسجد کے سامنے ایک ہشت پہل حوض ہی جس کا قطر ۲۶ ۔ ۳ اور عمق ۵ ۔ ۲ ہی ۔ ضرور اس مسجد کے متعلق کوئی بڑا کنواں یا باؤلی ہوگی جس سے یہ حوض بھرا جاتا ہوگا لیکن اب مسجد کے صحن میں کوئی باؤلی نہیں ہی البتہ مسجد کے قریب یعنی مسجد اور شیر منڈل کے بیچ میں اب بھی ایک بہت بڑی قدیم سیڑھیوں کی باؤلی ہی جو اب بے کار پڑی ہی ۔

امیر کابل کا کنواں
۱۳۲۴ھ
۱۹۰۷ء

اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں صاحب نے صحن مسجد میں ایک چھوٹا سا کنواں بنوا دیا تھا اب وہ بھی خشک پڑا ہی ۔ اس کنوئیں پر ایک سنگ مرمر کی تختی پر انگریزی اور فارسی کا کتبہ لگا ہوا ہی :

This well was constructed at the expense of His Majesty Sirajul - Millet wad din The Amir Habibullah Khan of Afghanistan

نقشہ شیر منڈل
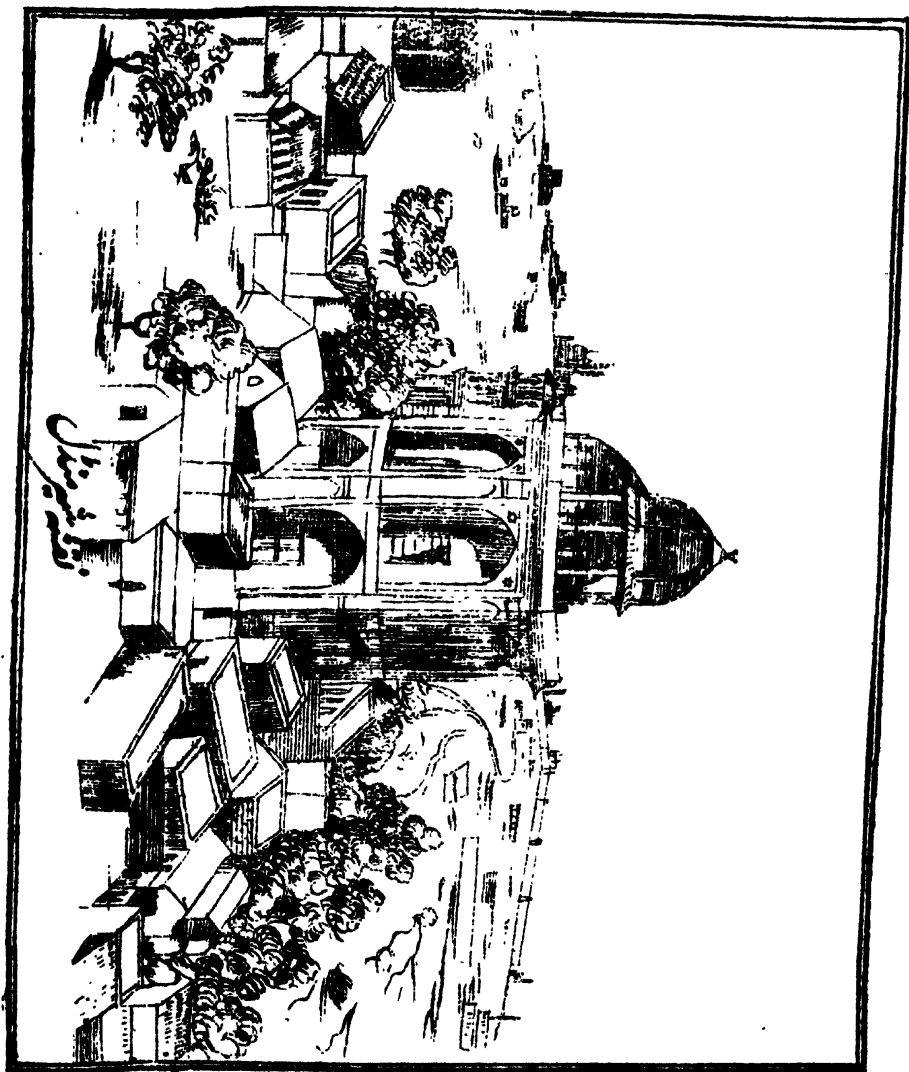
for the benefit of worshippers at this mosque in commemoration of his visit here on the 26th January 1907.

ایں چاہ آب بیادگار تشریف فرمائی اعلیحضرت سراج الملت والدین امیر حبیب اللہ خان امیر افغانستان بانجاب تاریخ یازدہم شہر ذیحجہ ۱۳۲۴ھ ہجری مطابق بست و ششم ماہ جنوری ۱۹۰۷ء عیسوی بمخارج اعلیحضرت موصوف از برائ رفاہیت نماز کنندگان دریں مسجد حفر و تعمیر گردید۔ تاریخ تعمیر بحساب ابجد۔

آبادی چاہ آب بیادگار سراج الملت والدین بدہلی پنجاب۔

۱۳۲۷ھ

شیر منڈل
۹۴۸ھ ۱۵۴۱ء

جب کہ شیر شاہ ہمایوں بادشاہ پر غالب ہوا اور دلی اس کے ہاتھ لگی اُس نے قلعۂ کہنہ میں چند مکان بناے اور مسجد کے قریب ۹۴۸ھ ۱۵۴۱ء میں ایک مکان بطور جہاں نما کے بنا کر شیر منڈل نام رکھا۔ تاریخ داؤدی میں لکھا ہی کہ قلعۂ شیر گڑھ کے اندر شیر شاہ نے ایک چھوٹا سا محل بنوایا تھا جس کا نام "شیر منڈل" تھا مگر وہ بنتے بنتے رہ گیا۔ یہ کچھ بڑی عمارت نہیں ہی نہ ایسے مقام پر بنی ہی جو محل کہی جا سکے نہ یہ قیاس ہوتا ہی کہ وہ کسی عالی شان محل کا کوئی برج ہو یا کسی اور بڑی عمارت کا حصہ ہو۔ یہ روایت بھی بالکل غلط ہی کہ ہمایوں بادشاہ کا محل ہی۔ شیر منڈل ایک ہشت پہل سہ منزلہ عمارت ہی جس کے اطراف پتلی سی غلام گردش ہی اور تیسری منزل پر ایک کھلا ہوا منڈوا ہی جس کا دروازہ مشرق رویہ ہی۔ یہ عمارت ۶۰ ½ اونچی ہی جس کا قطر ۵۲ ہی۔ یہ سارا مکان سنگ سرخ کا ہی جس میں جا بجا سنگ مرمر لگا ہوا ہی۔ اور جس میں داخل ہونے کا دروازہ جنوب رویہ ہی۔ اس کا چبوترہ ۴ ½ اونچا ہی یہ مکان منڈوے کو چھوڑ کر ۴۰ اونچا ہی۔ منڈوا خود ۱۶ اونچا ہی جس کا قطر ۲۰ فٹ ہی۔ منڈوے کے اوپر ایک برجی ہی جس پر سنگ مرمر کی پٹیاں ہیں اور اس برجی کے آٹھ ستون ہیں جن کی بیٹھکوں پر نقش و نگار اور لہریے دار پٹاپٹی کا کام ہی۔ منڈوے کی چو طرف منڈیر ہی جس کے نیچے ایک سنگین چھجہ ہی۔ اس کے

چڑھنے کے دو زینے بالائی منزل کے دیوار میں ہیں۔ بالائی منزل کے چھجے کے نیچے آٹھ دیوار دوز نوک دار کھڑکیاں برج کی آٹھوں سمتوں میں ہیں۔ جن میں لمبوتری محرابیں ہیں ...... اوپر چڑھنے سے دریا اور جنگل کی عجیب و غریب کیفیت معلوم ہوتی اور سیر دکھائی دیتی ہے۔ جنگل کے سبزے کا لہلہانا اور دریا کا پیچ و خم اور موجوں کا لہرانا اور ہوا کا سرسرانا اور چوطرفہ میدان کا شل کٹورے کے دکھائی دینا اور ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈوں کا نظارہ ایسا بھلا معلوم دیتا ہے کہ بیٹھنے کے بعد اٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔ عمارت کے اندر پانچ کمرے چوپڑ کی وضع کے بنے ہوئے ہیں جن میں بیچ کا کمرہ سب میں بڑا ہے اور سب کمروں میں آپس میں رستے ہیں اور دیواروں کے باقی حصے میں چھت تک انواع و اقسام کی پھول چھپوں اور بیلوں کے نقش و نگار ہیں۔ بالائی منزل کے کونوں میں خوب صورت اور پتلی دیوار دوز محرابیں ہیں جن پر سنگ مرمر کا کچھ کام بھی ہے۔ نیچے کی منزل میں بھی اسی قسم کی محرابیں ہیں اور دو منزلوں کے درمیان سنگ مرمر کا ایک پٹکا ہے۔ نیچے کی منزل کی شمالی اور جنوبی دیواروں میں اوپر کی منزل میں جانے کا اٹھارہ اٹھارہ سیڑھیوں کا زینہ ہے۔

ہمایوں بادشاہ کا کوٹھے پر سے گرنا اور وفات ۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء

یہ برج ایک تاریخی واقعے کے سبب سے مختص اور مشہور ہے کیوں کہ ہمایوں بادشاہ کو جو حادثہ پیش آیا جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکا وہ اسی مقام پر پیش آیا۔ جب نسیم نصرت و فیروزی باغ اقبال ہمایوں میں دوبارہ چلی اور اس کی کلید کشور کشائی سے دوبارہ دہلی مفتوح ہوئی اور دوبارہ اپنے قدوم ہمایوں سے اس قلعے کو زیب و زینت بخشی تو وہی شیر منڈل واسطے آہوے جانِ ہمایوں کے شیر بیشۂ اجل ہو گیا۔ مشہور یہ ہے کہ یہ برج ہمایوں بادشاہ کا کتب خانہ تھا۔ سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ ہمایوں ۷ ربیع الاول کو اس منڈل ماہ کنڈل پر اوج گرا ہوا اور بہ تقاضاے شوق اعمالِ ہیئت چھت پر چڑھ کر دوربین سے سیر طلوع مشتری و شرف زہرہ کرتا تھا اور اس وقت اپنے غروب آفتاب حیات اور ہبوط کوکب عمر سے کچھ خبر نہ رکھتا تھا۔ بعد الفراغ نیچے اترنے کا قصد کیا اور درجۂ اوسط میں پہنچا کہ موذن نے بانگ نماز مغرب کا آوازہ بلند کیا۔ ہمایوں بپاس تعظیم اذان سیڑھی پر بیٹھ گیا اور اتفاقاً

لا تخلف المیعاد کہہ کے اُس درجۂ رفیعہ اور مقام محمود سے عصا پر زور دے کے اٹھنا چاہتا تھا کہ وہ متحمل بار سلطنت نہ ہو سکا چوں کہ سیڑھیاں بہت چکنی اور پھسلواں تھیں بادشاہ کے عصا کی شام پھسلی اور بادشاہ اُس بام فلک مقام سے مانند اختر بخت ناکامی رفعت عروج کمال سے حضیض نکبت و وبال میں سر کے بل گرا اور زمین نے جو ایک مدت سے اُس سراپا دولت واقبال کی آرزومند ہم آغوشی تھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بادشاہ کے ہاتھ پاؤں اور جوڑوں میں سخت چوٹ آئی جس سے وہ بالکل بیہوش ہو گیا کئی دن بعد ۱۳ ربیع الاول ۹۶۳ھ کو انتقال کیا۔ حقیقت میں وہ موذن داعی اجل تھا اور لغزش جریب لبیک اجابت ۱۹ جنوری ۱۵۵۶ء ہمایون بادشاہ از بام افتاد تاریخ وفات ہے۔

سکندر کہ بر عالمے حکم داشت — دراں دم کہ می رفت و عالم گذاشت
میسر نبودش کز و عالمے — ستانند و مہلت دہندش دمے

جن لوگوں کو شیر منڈل کی عمارت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ سیڑھیوں سے لڑھکنے کی روایت بالکل غلط ہے کیوں کہ وہ زینہ اس قسم کا نہیں ہے کہ آدمی اوپر سے پھسلے تو وُ ھر نیچے ہی آ کے ٹھکے بلکہ اس میں پیچ و خم ہیں۔ اسی وجہ سے اس بارے میں مورخین کو اختلاف ہے۔ الفنسٹن اور مارشمین لکھتے ہیں کہ وہ کوٹھے کی منڈیر پر سے سر کے بل آن پڑا۔ فرشتہ۔ سیر المتاخرین۔ طبقات اکبری۔ عبدالقادر بدایونی اور مراۃ العالم میں تو سیڑھیوں ہی پر سے گرنا لکھا ہے۔ انتقال کے بعد بادشاہ کا جنازہ دین پناہ سے اٹھایا گیا اور موضع کلوکھڑی میں دفن کیا گیا جہاں بادشاہ کی بیوی حاجی بیگم صاحبہ اور ان کے بیٹے اکبر شاہ نے ایک نہایت شاندار اور عدیم المثال مقبرہ بنوا دیا۔ شیر منڈل کی پہلی اور دوسری منزل دونوں میں اٹھارہ اٹھارہ سیڑھیاں ہیں۔ اوپر کی برجی میں آٹھ در سنگ سرخ کے ابری کی طرح نقش دار ہیں۔ دو دروازے ہیں ایک مشرق کی طرف دوسرا جنوب کی طرف چبوترے کی کرسی ۳ فٹ ۵ انچ ہے۔ چبوترا ہشت پہل ہے جس کا ہر ضلع ۳۰ فٹ ½ ۴ ہے۔ بلندی برج کی چبوترا چھوڑ کر ۶ ... ہے۔

جدید حوض ۱۹۱۹ء

پہلے قلعے کے اندر گنواروں کی آبادی تھی خام مکانات اور جھونپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ سرکار کی طرف سے ان سب کو

دوسری جگہ تبلا کر قلعے کا اندرونی میدان صاف کر دیا گیا اور اب صرف دو عمارتیں رہ گئیں ایک مسجد دوسری شیر منڈل باقی لال بجری کی سڑکیں ڈال کر چو طرف ہری گھانس کے تختے بچھا دیئے ہیں جن کو نلوں کے ذریعے سے پانی پہنچایا جاتا تھا۔ اب شیر منڈل کے پاس ایک پختہ اور وسیع حوض ۱۱۰ - ۱۱۰ مربع فٹ ۱۰ گہرا بنایا گیا ہے جس میں جمنا سے جو قریب ہے بذریعہ پمپنگ انجن کے پانی لایا جاتا ہے اور اسی سے اب آب پاشی ہوتی ہے۔

شیر گڑھ یا دہلی شیر شاہی
سنہ ۴۵ - ۱۵۳۹ء

کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ سُور نے دین پناہ کے قلعے کو مضبوط و مستحکم کر کے شیر گڈھ نام رکھا لیکن حسب بیان صاحب تاریخ خان جہان قلعہ ہمایوں کی فصیلوں کی ترمیم سلیم شاہ پسر شیر شاہ نے (۱۵۴۵-۵۳ء) سلیم گڑھ بنانے کے بعد کی تھی۔ شیر گڑھ شیر شاہ کی بنائی ہوئی دلی کے قلعے کا نام تھا۔ دلی اندرپت کے قدیم میدان میں آباد کی گئی تھی اور دلی شیر شاہی یا شیر شاہ کی دلی کے نام سے مشہور تھی۔ عباس خاں نے تاریخ شیر شاہی میں لکھا ہے کہ "سابق کی دار السلطنت دہلی جمنا سے دور تھی جس کو شیر شاہ نے ڈھا کر جمنا کے کنارے ایک شہر بسایا اور اس شہر میں دو قلعے بنانے کا حکم دیا۔ چھوٹا شہر حاکم شہر کی اقامت کے لیے تھا جس میں ایک جامع مسجد بھی بنائی گئی اور دوسرے قلعے کے گرد وہ فصیل تھی جو سارے شہر کو محاط کیے ہوئے تھی لیکن ابھی وہ فصیل پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ شیر شاہ نے قضا کی"۔ اس سے یہ متحقق ہو گیا کہ اس قلعے کی تکمیل شیر شاہ کے بیٹے نے کی تھی۔ جنرل کننگھم صاحب (Purchas) پرچاس اور (Mariner Finch) میرینر فنچ کی توثیق پر شیر شاہ کی دلی کی حدود حسب ذیل لکھتے ہیں: "شیر شاہ کی دلی کا جنوبی دروازہ کہیں نہ کہیں بارہ پلے اور ہمایوں کے مقبرے کے مابین ہوگا۔ مشرقی جانب کی فصیل کا پتہ جمنا کے اونچے کراڑے سے چلتا ہے جو پہلے فیروز شاہ کے کوٹلے سے سیدھی جنوب رخ ہمایوں کے مقبرے کی طرف بہتی تھی۔ مغربی حدود برساتی نالہ ہے جو شاہجہاں آباد کے اجمیری دروازے سے جنوب رخ اور جمنا کے پرانے پیٹے میں

بہتا ہے۔ اس طرح کُل دَور شہرپناہ کا نو میل سے کچھ قریب ہوتا ہے یعنی حال کے شاہ جہاں آباد سے دو چند۔ (Mr Tremlett) مسٹر ٹریملٹ کو جنرل صاحب کی نشان دادہ جنوبی حد سے اختلاف ہے وہ لکھتے ہیں کہ دو میری اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ پرانے قلعے کے مغربی دروازے کے بالکل سامنے ایک دروازہ موجود ہے جو "لال دروازہ" کہلاتا ہے جو اُسی قسم کا ہے جیسا کہ موجودہ جیل کے سامنے کا لال دروازہ ہے مگر یہ اُس سے ذرا بڑا اور بہتر ہے اور اسی دروازے کو بالعموم شیر شاہ کی دلّی کا جنوبی دروازہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس جنوبی دروازے کی دونوں جانب برج اور تھوڑا سا حصہ فصیل کا بھی باقی ہے ان کے رُخ کو مدنظر رکھتے ہوئے خصوصًا پرانے قلعے کی وہ حالت کہ جیسا وہ اُس زمانے میں تھا یہ امر بعید القیاس معلوم دیتا ہے کہ یہ اور ہمایوں کا مقبرہ ملا کر ایک ہی احاطے میں ہوں۔ اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ اس دروازے اور جمنا کے پرانے پیٹے کے درمیان ہمایوں کے مقبرے کے جنوبی رخ کے بالمقابل بالکل تنگ جگہ ہے۔ نیز یہ کہ دروازے کے مشرق میں جو فصیل ہے وہ شمال کی طرف مڑ گئی ہے نہ کہ جنوب کی طرف۔ اگر میرا خیال صحیح ہے کہ پرانے قلعے کے شمالی دروازے اور سڑک کے مابین جو جابجا عمارتوں کے ٹوٹے ہوئے ڈھنگار پڑے ہوئے ہیں اور وہ شیر شاہ کی دلّی کی فصیل ہی کے ہیں تو میری رائے کو اور تقویت ہو جاتی ہے اور ایسی حالت میں فصیل کا سلسلہ مقبرے سے شمال کی طرف اوپر تک ملتا ہے۔ کار سٹیفن صاحب لکھتے ہیں کہ جنرل صاحب نے جن لوگوں کے حوالے سے رائے قایم کی ہے اُن کی رائیں میری رائے سے بھی منطبق ہو سکتی ہیں۔ فنچ نے جو دو کوس کا فصل لکھا ہے یہ اندازہ اُس کا اپنا لگایا ہوا ہے یا یہ کہ عوام کی زبان زد ایسا ہی رہا ہوا اور گلیوں کے پیچ و خم اور چکر کو محسوب کیا جائے جیسا کہ مقامی حالت کا اقتضا ہے تو دو کوس کا فاصلہ جو مابین دونوں دروازوں کے سرسری طور پر بتلایا گیا ہے کچھ خلاف قیاس نہیں معلوم دیتا کیوں کہ کچھ یہ تو تھا ہی نہیں کہ دونوں دروازوں کے درمیان ناک کی سیدھ سیدھی سڑک ہی ہو........ اگر شہر کی فصیل کا اختتام پرانے قلعے ہی تک سمجھ لیا جائے تو بھی بارہ پلا دہلی سے قریب ہی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس میں شک نہیں ہے کہ مضافات فصیل کے باہر تک پھیلے ہوئے ہو گئے کیوں کہ متھرا کی سڑک اُس زمانے میں شارع عام تھی ان وجوہ پر جاس کا یہ کہنا کہ ہمایوں کا مقبرہ شہر کے اندر تھا ٹھیک (قرین) ہے۔ بہر حال شہر کے جنوبی حد جو جنرل صاحب

مسٹر پہ چاس اس طرف قرار نہیں دیئے جا سکتے جب تک کہ اُس کا بیان اس بارے میں صاف و صریح نہ ہو کہ شمالی دروازہ کہاں تھا اور اس بارے میں پرچاس کا بیان بالکل مبہم ہے اور نیز میری رائے میں یہ بھی ضرور ہے کہ پرانے قلعے کے سامنے والے دروازے اور اُس کی ملحقہ فصیل اور قلعے کے شمال و مغربی کونے پر جو فصیل کا رہا سہا باقی ماندہ ٹکڑا ہے اُس کی بھی کوئی معقول توجیہ کی جائے کہ یہ کیا چیز تھی۔ مسٹر ٹرملیٹ نے دونوں دروازوں کے بیچ میں ایک مسجد کا بھی نشان دیا ہے جو شیر شاہ کی دلی میں تھی۔ یہ مسجد اچھی خاصی حالت میں ہے مگر اب اُس کی وسیع محراب دار چار دیواری میں سے سوائے شمالی اور مشرقی کونے کے ذرا سے حصے کے اور کچھ باقی نہیں ہے۔ مسٹر بگر نے مسٹر ٹریٹ کے نشان دادہ دوسرے دروازے کی نسبت حسب ذیل صراحت کی ہے جو غالباً اُس جنوبی حد کی تعیین سے اتفاق رکھتے ہیں جو جنرل صاحب نے بیان کی ہے۔ پرانے قلعے کے قریب ہمایوں کے مقبرے کی موجودہ سڑک کی داہنی جانب قلعے سے ذرا ہی آگے بڑھ کر

دلی شیر شاہی کا دروازہ اور فصیل

لال دروازے کی طرح کا ایک اجاڑ دروانہ کھڑا ہے جو رنگین اور چمک دار استرکاری اور نقش و نگار سے آراستہ ہے اور سرخ پتھر میں پھول تراش کر اُن میں رنگ بھر دیا ہے۔ دروازے کے کنگوروں پر بھی نقش و نگار ہیں۔ الغرض یہ دروازہ ایک نہایت عمدہ نمونہ صناعی کا ہے۔ دروازے کی دونوں جانب جو عظیم الشان برج تھے اور جن سے اس کی رونق اضعافاً مضاعفہ تھی وہ سب گر گرا گئے اور اس سلسلے میں جو فصیل رہی ہوگی اُس کا بھی اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکال سکتا ہوں کہ یہ دروازہ بھی لال دروازے کی طرح شہر ہی کا دروازہ ہوگا کیوں کہ دونوں ایک ہی طرح کے ہیں۔ اس دروازے میں سے بھی شہر کی کوئی نہ کوئی بڑی سڑک جاتی ہوگی۔ اب بھی ہمایوں کے مقبرے سے ایک سیدھی پرانی سڑک اس دروازے میں سے ہو کر جاتی ہے اور جہاں تک نگاہ دوڑتی ہے وہ سیدھی ہی چلی گئی ہے کہ اس تمام فاصلے پر جہاں تک کہ سڑک کا پتہ لگتا ہے

سڑک کی ہر دو جانب مکانوں کے کھنڈر ہی کھنڈر دکھلائی دیتے ہیں اور مین دروازے کے پاس چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں کا سلسلہ اب بھی موجود ہے جو غالباً سوداگروں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جو دروازے کے دونوں طرف باقاعدہ طور پر بنائی گئیں تھیں اور بہت موزوں معلوم دیتی ہیں۔ اس دروازے اور ہمایوں کے مقبرے کے درمیان سڑک کے بیچوں بیچ ایک کوس کا منارہ کھڑا ہے اور اس مقام پر سڑک کی دونوں طرف آمدورفت کا رستہ کشادہ رکھنے کو سڑک چوڑی کردی گئی ہے۔ شیر گڑھ کی حدود کے متعلق جنرل کننگھم اور مسٹر سٹرلٹ کی جو بحث آن پڑی ہے اس کا قول فیصل صاحب تاریخ داؤدی کے ذیل کے قول سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ "ہیبت خاں نے جب ملتان فتح کر لیا تو ۹۴۷ھ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ آگرے سے دلی آیا اور بدظنی کی وجہ سے علاء الدین کے قلعے کو جو سیری میں تھا مسمار کرڈالا اور دریائے جمنا کے کنارے فیروز آباد اور کلوکھری کے بیچ بیچ موضع اندرپت میں ایک نیا شہر جو پرانے شہر سے دو یا تین کوس تھا بنوایا اور اس قلعے کا نام "شیر گڑھ" رکھا۔ اول تو شیر شاہ کا زمانِ سلطنت ہی بہت مختصر تھا اور پھر اس کو موت نے مہلت نہ دی اس لئے وہ اس کی تکمیل نہ کر سکا"۔ موضع کلوکھری کی حد بارہ پلے سے آگے تک تھی اور میجر فنچ اور ڈی لائٹ نے جو حدود شیر گڑھ کے بتلائے ہیں اور جن سے جنرل صاحب نے اتفاق کیا ہے بالکل صحیح معلوم دیتے ہیں۔ ۱۶۱۱ء میں ڈی لائٹ نے لکھا ہے کہ یہ شہر اجڑ رہا ہے اس کی فصیل گرنی شروع ہو گئی ہے اور بہت سے مکانات زمین دوز ہو گئے اور پٹھانوں کی خوبصورت عمارات ہیں جو شہر کے اندر اور شہر کے باہر ہیں قریب قریب ہیں کے خراب و خستہ حالت میں قریب الانہدام ہیں"۔

خیر المنازل ماہم بیگم کا مدرسہ ۹۶۹ھ ۱۵۶۱ء پرانے قلعے کے غربی دروازے کے عین سامنے دہلی نظام الدین کی سڑک کے بائیں طرف یہ عالیشان اور بہت وسیع عمارت ہے۔ یہی دروازہ شیر شاہی دہلی کا مغربی دروازہ بھی تھا۔

یہ مدرسہ اور مسجد اکبر شاہ کی رضاعی والدہ ماہم انگہ نے جو ادھم خاں کی سگی ماں تھی ۱۵۶۱ء ۹۶۹ھ میں بنوایا تھا۔ مدرسہ تو اب ڈھے ڈھا گیا لیکن اس کے کچھ ادھر ادھر حجرے باقی رہ گئے ہیں۔ مسجد کی

تفصیل مسٹر بگلر نے حسب ذیل لکھی ہے :۔ "یہ مسجد اکبر شاہ کے زمانے کی ہے جو بن گھڑے پتھروں اور چونے کی بنی ہوئی ہے جس کے دروازوں کے بعض حصوں پر گھڑے ہوئے پتھر لگا کر رنگ آمیزی کی گئی ہے جو اب بالکل برباد ہوگئی۔ لیکن جب رہی ہوگی تو نہایت عمدہ ہوگی۔ مسجد کا اندرونی حصہ نقش ونگار اور رنگین استر کاری اور چینی کی اینٹوں سے بافراط آراستہ تھا۔ اگرچہ اب لوگوں نے اسے کھرچ کھرچ کر بالکل ناس کر دیا ہے۔ مسجد کا روکار اور دروازہ بھی اسی قسم کے نقش ونگار اور پھول پتوں سے آراستہ تھا جس میں ہر قسم کا رنگ۔ نیلا۔ زرد۔ گلابی۔ سفید۔ سبز۔ سیاہ اور بھورا موجود تھا اس مسجد میں ایک ہی پست گردنے کا گنبد ہے جس کا کلس ایک خاص وضع کا ہے جو پرانے قلعے کی مسجد کا سا ہے۔ مسجد کی دیواریں سیدھی ہیں لیکن برجیاں گاؤدم ہیں۔ اس مسجد کا چھجہ بھی موٹھ کی مسجد کی طرح بڑا بھاری اور آگے کو نکلا ہوا ہے۔ اس مسجد کی خصوصیات میں سے وہ حجرے تھے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے"

اکبر بادشاہ پر تیر کا وار

اکبر شاہ کے ۸ سنہ جلوس مطابق ۹۷۱ھ ۱۵۶۴ء میں اسی مدرسے کی چھت پر سے بادشاہ کی جان کو صدمہ پہنچانے کا قصد کیا گیا۔ طبقات اکبری میں اس واقعے کی تفصیل یوں لکھی ہے کہ اس واقعے کے چند روز پہلے مرزا شرف الدین حسین دربار شاہی سے بغاوت کر کے ناگور کی طرف چلا گیا تھا جب شاہ ابو المعالی سے سازش ہوئی تو تین سو آدمی جنھیں اپنی جاں نثاری کا بھروسا تھا اس کے ساتھ گئے تھے۔ آپ کتے کا بہانہ کر کے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ ان سب میں شقی اور بدکردار اس کے باپ کا ایک غلام کوکا فولاد حبشی تھا جس نے بادشاہ کی جان لینے کا بیڑا اٹھایا تھا اور ہمیشہ اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا تھا۔ یہ بدمعاش کسی طرح شاہی کیمپ میں داخل ہو گیا اور اپنے کام کے لیے موقع و وقت مناسب کا منتظر رہتا تھا۔ ایک دن بادشاہ سیر و شکار سے پھرتے ہوئے نظام الدین اولیا کی زیارت کو گئے وہاں سے رخصت ہوئے شاہی سواری دہلی شہر کے بازار سے گزر رہی تھی۔ جب سواری اس مدرسے کے پاس پہنچی تو معلوم ہوا کہ شانے میں کچھ لگا۔ دیکھا تو تیر تھا کہ پوست مال تھا گر ہے پار نکل گیا تھا۔ اس ظالم نے تاک کر تیر چلایا تھا لیکن خدا کا فضل شامل حال تھا۔ تیر نے خطا کی اور جسم پر صرف ذرا سی خراش آئی

ابھی تیر نہ نکلا تھا کہ بادشاہ کی رکاب میں جو لوگ تھے فوراً اس سفاک کو پکڑ لائے دیکھا تو فولاد حبشی تھا۔ لوگوں نے چاہا کہ فولاد سنگدل سے پوچھیں کہ یہ حرکت کس کے اشارے سے کی ہی؟ اکبر نے کہا نہ پوچھو۔ غلام روسیاہ خدا جانے کیا کہے اور کن کن جاں نثاروں کی طرف سے شبہے ڈال دے۔ بات نہ کرنے دو اور کام تمام کر دو اتنا کہنے کی دیر تھی کہ تلوار اور خنجروں سے اسی وقت اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور اُسے جہنم رسید کیا۔ دریا دل بادشاہ کے چہرے پر کچھ اضطراب نہ ہوا۔ اسی طرح گھوڑے پر سوار چلا آیا اور قلعۂ دیں پناہ میں داخل ہوا۔ چند روز میں زخم اچھا ہو گیا اور اسی ہفتے میں سنگھاسن پر سوار ہو کر آگرے کو روانہ ہوا۔ ایک عجیب اتفاق قابل ذکر ہی جو خالی از لطف نہیں۔ اکبر کے کتوں میں ایک زرد رنگ کا کتا تھا۔ نہایت خوب صورت اسی واسطے مہوہ اس کا نام رکھا تھا۔ وہ آگرے میں تھا۔ جس دن یہاں تیر لگا۔ اسی دن سے مہوے نے راتب کھانا چھوڑ دیا۔ جب بادشاہ وہاں پہنچے تو میر شکار نے حال عرض کیا۔ اکبر نے اسے حضور میں منگایا آتے ہی پاؤں میں لوٹ گیا اور نہایت خوشی کی حالتیں دکھائیں۔ اپنے سامنے راتب منگا کر دیا جب اُس نے کھایا۔

اس مسجد پر یہ کتبہ ہی:۔

بدوران جلال الدین محمد ❊ کہ باشد اکبر شاہان عادل
چو ماہم بیگم عصمت پناہی ❊ بنا کرد این بنا بہر افاضل
ولی شد ساعی این بقعۂ خیر ❊ شہاب الدین احمد خان باذل
زہے خیریت این منزل خیر ❊ کہ شد تاریخ او خیر المنازل

قایلہ نیاز بخش ❊ باہتمام درویش حسین

سر سید مرحوم نے ماہم بیگم کے مدرسے کا حال بالکل ہی مختصر لکھا ہی حالاں کہ یہ عمارت جہاں تک مسجد کو تعلق ہی برقرار ہی اور اس بے اعتنائی کی مستحق نہ تھی۔ اس کا صدر دروازہ غرق رو یہ سڑک کے کنارے کھڑا آسمان سے سرگوشی کر رہا ہی اور ایسا ہی ایک اور دروازہ اسی [illegible] کا مرتفع اور بلند جس کے روکار پر سنگ سرخ لگا ہوا ہی پیچھے والے شمال مغرب کے کونے میں ہی۔ وہ بھی سڑک پر سے داہنے ہاتھ کی طرف دکھلائی دیتا ہی البتہ اتنا ضرور ہوا ہی کہ اس کے باہر وار جو ڈیوڑھی باسہ دری بطور برآمدے کے تھی گر پڑی ہی اور ایسی بے ڈھب گری ہی کہ اس نے نہ صرف دروازے کی عمارت کو

نقصان پہونچایا بلکہ رستہ بھی روک دیا اس کے دونوں پٹ چوپٹ ہو گئے۔ یہ دروازہ دہلی شیر شاہی کا غرب رویہ دروازہ کہا جاتا ہی یہ دروازہ فصیل شہر میں ہی جس کے دونوں جانب بڑے بڑے عالی شان دمدمہ نا برج تھے جن میں کا ایک پہلی طرف تو دروازے کی محاذ کی عمارت سے کے ساتھ گر پڑا دوسرا سڑک کی طرف کا برقرار و موجود ہی جس کی وجہ سے دروازہ اور شتین اور محفوظ ہو گیا ہی۔ پہلا دروازہ درحقیقت مسجد ہی کا صدر دروازہ ہی۔ مسجد حسب معمول تین درکی ہی اور ایک بڑا گراں ڈیل گنبد بطور اس کی عظمت کے نشان کے کھڑا ہی۔ بیچ کی محراب بہ نسبت بغلی دو محرابوں کے زیادہ بلند ہی۔ لمبان مسجد کی ۱۲ فٹ ۷ اور چوڑان ۹ فٹ ۳ ہی۔ مسجد کی محراب وسطی ہی پر وہ کتبہ ہی جو ہم نے اوپر لکھا ہی یہ محراب اندر کے رخ سے ۱۲ فٹ اور باہر سے ۱۹ فٹ چوڑی اور ۳۳ فٹ اونچی ہی۔ اس کے گرد کوئی سورہ کلام مجید کا گچ میں مرتسم تھا جو جھڑا تو نہیں مگر حروف ایسے مٹے ہیں کہ ایک لفظ بھی نہیں معلوم ہوتا ہاں اتنا پتہ البتہ چلتا ہی کہ یہاں کچھ لکھا ہوا تھا۔ دو طرفہ محراب کے پاکھوں پر طغرے تھے جو جھڑ گئے۔ صرف داہنی اور بائیں طرف کی محرابوں پر کلمۂ طیبہ کے طغرے برقرار ہیں مسجد کے روکار پر تمام چینی کا کام تھا چنانچہ اب بھی کچھ کچھ گلکاری باقی ہی اور محرابوں میں عمودی لاجوردی رنگ کی پٹیاں واضح طور پر نمایاں ہیں جن کا رنگ اب تک بھی چرخ فیروزہ رنگ کو شرماتا ہی مسجد محاط ہی جس کا احاطہ ۱۳۳ فٹ ۴ × ۱۰ فٹ ۱ ہی۔ (۲۵) سیڑھیوں کا دہرا زینہ صدر دروازے کی دونوں بغلیوں میں ہی۔ مسجد کے تین طرف حجروں کی قطاریں تھیں جو غالباً طلبا رکا بورڈنگ تھا صحن مسجد کے شمال جنوب میں دو منزلہ قطار دس دس حجروں کی تھیں جن میں سے اکثر گر گئیں اور چند باقی ہیں وہ بھی خستہ حالت میں ہیں اور یہ حجرے سب لدلوی ہیں۔ اسی کا جواب محاذ میں تھا وہ بھی گر پڑ گیا۔ مشرق کی طرف صدر دروازے کے دائیں بائیں بھی اسی قسم کے حجرے تھے اسی کونے میں ایک کنواں بھی تھا جو دھ گیا اور اس کے سامنے ایک چھوٹے سے حوض کا بھی نشان باقی ہی۔ غرض یہ ایک چوک ہی نہایت نفیس اور خوشنما جس کے غرب میں مسجد ہی مسجد کا ممبر اکھاڑ ڈالا ہاں نشان باقی ہی۔ اندر کا سارا پلاستر اکھڑ گیا بلکہ میں کہوں گا کہ کھرچ ڈالا کیوں کہ ممبر کے پاس کی محراب میں کیا کچھ جڑا ہوا تھا کہ کھودنے کی

علامت موجود ہو اُس کی موجودہ حالت سے بھی پتہ چلتا ہو کہ بہت کچھ نقش ونگار اور ضرورت سے زیادہ آراستہ تھی کیوں کہ مسجدوں میں آرایش کا نچوڑ پیش طاق پر ہی ہوتا ہو۔ جب اس مسجد کے روکار پر ایسا کچھ مینی کا کام اب تک ہو تو پھر پیش طاق کیا پوچھنا۔ یوں تو امتداد زمانہ بڑا برباد کرنے والا ہو لیکن اگر ان عمارتوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتے اور دست درازی نہ کرتے تو بھی سینکڑوں برسوں کی خبر لاتیں۔ گنبد کا پلاستر اوپر کا تو ہو مگر اندر کا بالکل جھڑ گیا۔ ایسے بلند گنبدوں میں اکثر لوگ گولیاں مار مار کے اُس کی گونج کو سن کر خوش ہوتے ہیں مگر اس سے جو عمارت کا ستیاناس ہوتا ہو اُس کا ورد کسے۔ خیر ورنہ یہی خانہ خدا کا خوف تو ضرور تھا ؎

گر دل میں چشم بینا ہو بت خانہ ہو یا کعبہ ہو
ہر گھر میں ہیں اُس کے ہی درشن سبحان اللہ سبحان اللہ

جب گنبد کی یہ گت بنی ہو تو فرش کب رہ سکتا ہو۔ صدر دروازہ ۴۳ فٹ اونچا اندر سے ۱۱ اور باہر سے ۱۲ فٹ چوڑا ہو۔ دروازہ سراپا سنگ سرخ کا بڑا نفیس اور شاندار بنا ہوا ہو اس کی مرغولوں پر بڑا نفیس کام کیا ہوا ہو۔ اس کو اُسی زمانے کے بہت گراں ڈیل چوبی کواڑوں کی جوڑی چڑھی ہوئی تھی جن میں کا ایک پٹ سربسجود ہو کر دروازے ہی میں پڑا ہو دوسرا کھڑے کا کھڑا ہو۔ یہ جوڑی بھی بچھڑ گئی۔ کوئی دن جاتا ہو کہ اس کی لکڑی لوگ چولھے میں جلانے کو لے جائیں گے مگر اس کا توڑنا پھوڑنا بھی کارے دارد کہ لوہے سے جکڑا ہوا ہو اس دروازے کے بیچوں بیچ اندر دار مسجد کی جانب ایک چھوٹا سا بہت خوب صورت نشیمن بنا ہوا ہو جس سے صحن مسجد پیش نظر رہتا ہو جیسا کہ دلی کی جامع مسجد کے شرقی دروازے پر ہو۔ دروازے کے باہر سڑک سے ذرا بچ کر ایک بڑا پرانا گھنا اور سایہ دار نیم کا درخت ہو اور اسی کے نیچے کسی بزرگ کی خام قبر ہو ؎

السلام اے بعد ما آیندگان رفتنی
بر شما خوش باد ناخوش ہائے دنیائے دنی

مسجد کی پچھیت میں اور ایک وسیع احاطہ ہو جو سارے کا سارا کھنڈر ہو۔ اس میں ضرور محلات اور مکانات ستھے چنانچہ پچھواڑے کے دروازے سے

جسے دلّی شیر شاہی کا دروازہ کہتے ہیں اور جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں قلعۂ کہنہ کی طرف دو طرفہ دکانوں کی کوٹھڑیوں کی قطار بنی ہوئی ہو جن میں سے بہت سی گر گئیں اور بہت سی ابھی باقی ہیں۔ ان کے بیچ میں ایک کشادہ سڑک ہو اور دکانوں کا یہ سلسلہ سڑک کی دوسری طرف بھی دور تک چلا گیا ہو کہتے ہیں کہ یہی جوہری بازار تھا۔

دلّی شیر شاہی کے دروازے کے سامنے ایک نامعلوم برج

دلّی شیر شاہی کے غربی دروازے کے سامنے یا یوں سمجھئے کہ ماہم بیگم کے مدرسے سے شمال مغرب کے کونے میں بالکل تھوڑے فصل سے ایک بارہ کھمبا برج اکیلا کھڑا ہو۔ یعنی اُس کے گرد وپیش میں کوئی عمارت اب باقی نہیں ہو اور زیادہ ٹھیک پتہ یہ ہو کہ پرانے قلعے کے غربی دروازے سے ذرا پہلے دلّی سے آتے ہوئے سڑک کی داہنی طرف ہو اور سڑک پر سے اس کا قبہ بخوبی نظر آتا ہو یہ برج نیچے سے ۲۲-۱/۲ مربع ہو مگر اوپر جا کر گنبد ہشت پہل ہو گیا ہو۔ اس کے چاروں طرف تین تین ہیں یعنی سب ملا کو بارہ در ہیں۔ کوئی جداگانہ دروازہ نہیں اس وجہ سے چاروں طرف سے کھلا ہوا ہو۔ بیچ کا در ۷ - ۱/۲ اور ادھر اُدھر کے در ۱۰ - ۱ چوڑے ہیں۔ مقبرے کے ستون عمدہ قسم کے سنگ سرخ کے ہیں۔ دہلیز تک بلندی مقبرے کی ۸-۹ ہو اندر کا فرش سارا اُدھیڑ ڈالا ہو۔ قبر کو معمولی طور سے کھودنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خوب گہرا کھودا ہو اور ایسا معلوم دیتا ہو کہ گویا اس میں کچھ گڑے ہونے کا یقین تھا جو یوں ٹٹول ڈالا ہو۔ قبر کا نام ونشان تک باقی نہیں چھوڑا۔ جو پتھر کھودے ہیں وہ بھی اب تک بکھرے ہوئے پڑے ہیں اور قبروں کی جگہ صرف ایک گڑھا باقی رہ گیا ہو۔ گنبد کے اوپر پورا کوٹ نیلی چینی کا تھا جس کے کچھ کھپرے اب بھی باقی ہیں۔ گنبد کے اندر کا سارا پلاستر جھڑ گیا ہو نرے پتھر نکل آئے ہیں۔ اندر بھی تمام ترصیع کا کام تھا چنانچہ اب تک بھی جا بجا کچھ موجود ہیں۔ گنبد کے اندر چوطرف کچھ آیات قرآنی منقوش تھیں چنانچہ مشرق کی طرف پوری بسم اللہ الرحمن الرحیم باقی ہو اور اس کے پہلے یعنی العزیز الحکیم یعنی عزیز الحکیم بھی ہو جو آخری الفاظ آیۃ الکرسی کے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہو کہ آیۃ الکرسی لکھی ہوئی تھی۔ اس برج کے گرد ایک چبوترہ اور وسیع احاطہ تھا۔ چبوترا گر گیا جس کی بلندی تین فیٹ ہی

اور احاطے کی حدبندی کا صرف موہوم سا نشان جابجا نظر آتا ہے۔ گو مقبرہ چھوٹا ہے مگر خوش قطع ہے اور سنگ سرخ بڑا نفیس اور صاف کیا ہوا لگایا گیا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس دسج میں کس صاحب کی قبر تھی ؎

کہیے یاران عدم کیا گزری
کچھ لب گور سے فرمایئے گا

حضرت ابا بکر طوسی کی درگاہ کے سامنے سڑک کی داہنی طرف جو ایک ہشت پہل برجی کا ذکر ہم اوپر کر آتے ہیں اس سے تھوڑی دور آگے بڑھ کر برج کے

گلال باڑی

ماہم بیگم کے مدرسے کے پاس گلال باڑی کے نام کی ایک عمارت تھی اب بجز چونے کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں اور نہ اس پر کوئی کتبہ ہے

خاص محل

۱۰۵۲ھ
۴۳-۱۶۴۲ء

پرانے قلعے سے جنوب رخ پر کوئی دو سو گز کے فاصلے سے دہلی سے جاتے وقت سڑک کی بائیں جانب قلعہ کے جنوبی دروازے کے محاذ میں سڑک سے ہٹی ہوئی ایک بہت بڑی عالی شان عمارت کھنڈر رہیں کہتے ہیں کہ پرانے قلعے سے جنوب رخ پر کوئی دو سو گز کے فاصلے سے شاہ جہاں کے عہد میں خاص محل بنا تھا یہ اس کا کھنڈر ہے جو تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے سر سید نے جب آثار الصنادید لکھی تو اس وقت میں ہی صرف ایک دروازہ رہ گیا تھا جس پر سنگ سرخ کی ایک تختی ۳ فٹ لمبی اور ڈیڑھ فیٹ چوڑی پر نہایت خوش قلم بخط نستعلیق ایک کتبہ تھا جو اب قلعے کے میوزیم آثار قدیمہ میں لاکر رکھا گیا ہے۔ کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محل زین خاں نے جو اکبر بادشاہ کا کوکا اور فوجی سردار تھا اپنی بیٹی کے لیے ۱۰۵۲ھ ۴۳-۱۶۴۲ء میں بنوایا تھا۔ اب اس محل کا نام نشان تک نہ رہا صرف ایک ٹوٹا پھوٹا دروازہ مغرب کی طرف ہے جس پر یہ کتبہ تھا اگر نہ اتارا جاتا تو وہ بھی ضائع ہوجاتا اور ایک سلسلہ چند محراب دار کوٹھڑیوں کا رہ گیا ہے۔ بقول سر سید زین خاں کی بیٹی کو خاص محل کا خطاب تھا اور اسی نے یہ محل بنوایا ہے اور یہی مسٹے سر ادرین اور دوسرے مورخین کی بھی ہے لیکن ڈاکٹر ووگل (D۲ ۷۵) کہتے ہیں کہ یہ محل کسی کے نام سے موسوم نہیں بلکہ لفظ خاص عام کی ضد میں استعمال کیا گیا ہے۔ کتبے میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے اس شک کی گنجائش ہوسکے بلکہ دونوں باتیں اخذ کی جاسکتی ہیں۔ لیکن مصرعہ "بنا نہاد بہین زمانہ خاص محل صفت

تبلا رہا ہی کہ بانیہ کا خطاب خاص محل تھا اور قطعہ کے مصرعۂ آخری میں جو خاص محل ہی وہ
البتہ محل کا نام ہی۔ اس لیئے سرسید کا خیال زیادہ مرجح اور قابل وثوق ہی۔ اول تو
یہ محل شاہجہاں آباد کے شہر کے باہر بنا تھا اور پھر جو تھوڑا سا حصہ اس کا اب موجود ہی
وہ صرف چند کوٹھڑیاں ہیں ان کے دیکھنے سے تو زیادہ تر ایک کاروان سرائے کی حیثیت
نظر آتی ہی چنانچہ کتبے میں بھی لفظ سرا کا استعمال کیا گیا ہی جس کا اطلاق محل سرا اور اقامتگاہ
مسافران دونوں پر ہوتا ہی اور جب کہ لفظ کرم کا استعمال کیا گیا ہی تو ظن غالب ہی کہ
یہ سرا ہی رہی ہو جیسا کہ مولوی ظفر حسن صاحب نے اپنے ایک ارٹیکل میں اپی گرافیا
اندو ماسلیمیکا میں لکھا ہی۔ سرسید اور مسٹر بیل دونوں نے سہو نظری سے اس محل کی تاریخ
بنا سنہ ۱۰۵۴ھ لکھی ہے غالبًا مصرعۂ آخری میں ب کے اعداد کو شامل کر لیا ہی اور لفظ جواب
کے اعداد کو چھوڑ دیا ہی اور اس سنہ پر نظر نہیں پڑی جو خود کتبے کے مصرعۂ آخر کے
نیچے صاف کندہ ہی یعنی سنہ ۱۰۵۲ھ۔

بدور شاہجہاں صاحب قران ثانی	کہ در جہانست جہاں پرور سپہر جناب
بنا نہاد بہینِ زمانہ خاص محل	دریں زمیں بکرم بنت زینجاں دریاب
ہمیشہ باد بزیرِ سپہر بوقلموں	ہمی ضمیر منیرش پئے صلاح و صواب
اگر ز سالِ بنایش شود سوال ترا	حساب کن بسرائے محل خاص جواب

۱۰۵۲ھ

سرسید نے خاص محل کو گلال باڑی میں تبلایا ہی اور گلال باڑی کو ماہم بیگم کے مدرسے
کے پاس تبلایا ہی جس کا کوئی نشان سوائے مٹی کے ڈھیروں کے باقی نہیں اسی
خاص محل کی نسبت لکھا ہی کہ شاہ جہاں کے وقت میں بنایا تھا اب بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا
اور اس کا کتبہ بھی اب قلعہ کے میوزیم میں ہی۔ مسٹر ظفر حسن اسسٹنٹ سوپرنٹنڈنٹ
محکمۂ آثار قدیمہ دہلی پرانے قلعے کے مغرب میں کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر اس
محل کو بالکل خراب خستہ حالت میں تبلاتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ بجائے محل کے وہ
کاروان سرائے سے زیادہ مشابہ ہی کہ اس میں معمولی طور کی رذرشمانے کی قطاریں
بنی ہوئی ہیں۔ لیکن اب ایسی کوئی عمارت پرانے قلعے کے مغرب میں ماہم بیگم کے
مدرسے کے پاس باقی نہیں ہی۔ ممکن ہی کہ وہ صاف کر دی گئی ہو۔ جس عمارت کا ہم ذکر
کرتے ہیں وہ البتہ کارواں سرائے کی حیثیت کی ہی اور بہت ہی خراب خستہ حالت میں کچھ

گڑھ پر انے قلعے کے جنوب میں ہے نہ کہ مغرب میں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سر سید نے اسی کو خاص محل لکھا ہے اور ممکن ہے کہ مولوی ظفر حسن صاحب نے بھی اسی مقام کا ذکر کیا ہو اور سمت کے تعین میں سہو ہوا ہو کہ بجائے جنوب کے مغرب لکھ[1] دیا ہو۔ ہم کو اس عمارت کا نام اچھن مچھن کی سرا کے بتلایا گیا ہے جو دو بھائی تھے۔ بہر حال اس عالیشان اور وسیع عمارت کی موجودہ حالت یہ ہے کہ پرانے قلعے اور اس عمارت کے بیچ میں اب کوئی اور عمارت باقی نہیں رہی سارا میدان صاف ہے البتہ یہاں سے وہاں تک جا بجا قبروں اور گری پڑی عمارتوں کے ملبے کے نشانات ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا خالی نہ تھا بلکہ عمارتوں سے پٹا ہوا تھا۔ اس مکان کے مشرقی رخ کی دیوار جس میں صدر دروازہ ہے چوستے پتھر کی کھڑی ہے جس میں چھ چھ حجروں کی دوہری قطار ہے یعنی آگے پیچھے ایک حجرے کا رخ اندر وار ہے دوسرے کا باہر دونوں کی پچھیت کی دیوار ملی ہوئی ہے اور یہ حجرے دو منزلہ ہیں یعنی اوپر بھی ایسی ہی دوہری قطار ہے۔ پس ایک ونگ میں اوپر نیچے کے حجرے ملا کر ۲۴ ہوئے اور اسی طرح صدر دروازے کی دوسری طرف حجروں کا سلسلہ ہے۔ اب صدر دروازے کے دونوں طرف چھ چھ حجروں کی قطار باقی ہے اور یہ سلسلہ دور تک دونوں طرف چلا گیا ہے۔ اسی کے محاذ میں بیچ میں کافی جگہ چھوڑ کر محل کی اصلی عمارت کے کھنڈر ہیں جس میں اب تیرہ حجرے موجود ہیں یہ بھی دو منزلہ تھے چنانچہ اب بھی دو حجرے دو منزلہ کھڑے ہیں باقی کی بالائی منزل گر گئی۔ یہ سلسلہ بھی دور تک چلا گیا ہے۔ اس طرح چاروں طرف حجروں کی قطاریں تھیں جو اب باقی نہیں مگر نشان ضرور ہیں حجروں کی پہلی منزل ۱۲ فٹ بلند ہے اور دوسری منزل ۸ فٹ۔ یہ سارے حجرے لداؤ کے ہیں جن کی چھتیں گنبد دار ہیں۔ اس کا صدر دروازہ مشرق کی طرف اب موجود ہے قیاس چاہتا ہے کہ اسی طرح چاروں طرف دروازے ہوں گے۔ صدر دروازے کی نوعیت یہ ہے کہ بیس جوڑا اور ۳ ایمدھ ہے۔ جس کے ادھر ادھر دوہرے حجروں کی قطاروں کا سلسلہ چلا گیا ہے یہ دروازہ ۴ فٹ گہرا ہے۔ دروازے کے دونوں رخوں پر چینی کا کام تھا جس کا بہت تھوڑا حصہ کہیں کہیں نظر آتا ہے چنانچہ دروازے کی محراب کے اندر باہر اوپر وار کو دو طرفہ طغری کلمۂ طیبہ کا ہے۔ دروازہ دہرا الداؤ کا ہے۔ اس پر کتبہ ضرور تھا مگر اب نہیں

[1] بعد میں مولوی ظفر حسن صاحب سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خاص محل یہی ہے اور سمت کے لکھنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ ۱۲

اور جس جگہ تھا وہ جگہ بھی دروازے کی پیشانی پر موجود ہے۔

ڈاک کا انتظام کوس منارے اور سرائیں

سیوستان[1] (سیوان) ملتان تک دس دن کا رستہ ہے اور ملتان سے دار الخلافہ دہلی تک پچاس دن کا۔ جو خبر اخبار نویس بادشاہ کو لکھتے ہیں وہ اُس کے پاس ڈاک کے ذریعے سے پانچ دن میں پہنچ جاتی ہے۔ ڈاک کو اس ملک میں برید کہتے تھے۔ برید عربی میں قاصد اور بارہ میل کے فاصلے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں ڈاک چوکی کو جسے دکن میں ٹپہ کہتے ہیں۔ اسی کو ترکی میں الاغ اور فارسی میں چپار کہتے ہیں۔ ڈاک دو قسم کی ہوتی تھی ایک گھوڑے کی دوسری پیادوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک اولاق کہلاتی تھی۔ ہر چار کوس پر گھوڑا بدلتا تھا یہ گھوڑے بادشاہ کی طرف سے رہتے تھے۔ پیدلوں کی ڈاک کا یہ انتظام تھا کہ ایک میل میں جس کو وہ کروہ[2] کہتے تھے

---

[1] فرشتے نے محمد بن قاسم ثقفی کے ذکر میں لکھا ہے "جمعے از معتبران شہر ہمراہ گرفتہ متوجہ بلدۂ سیوستان کہ دریں عصر بہ سیوان شہرت دارد وارد گردید" سیوان اب کراچی کے ضلع میں ایک تعلقہ ہے۔ کراچی سے (۱۹۰) میل۔ پانچ ہزار کے قریب آبادی ہے۔ شہباز قلندر کی مشہور خانقاہ بھی اسی شہر میں ہے جو سنہ ۵۶۳ء میں بنی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس شہر کا قلعہ سکندر اعظم کا بنایا ہوا ہے۔ شہر کے قریب ایک جھیل منچھر نام کی ہے جس کا پانی برسات میں ۲۰ × ۱۰ میل پھیل جاتا ہے۔ ابو الفضل نے لکھا ہے "نزدیک سیوہان بزرگ کولا بیست دراز دور وزہ راہ اندر منچور گویند بر فراز آب زینہا ساختہ بر سرشے ماہی گیران بسر می برند"۔

[2] کروہ اور کوس ایک ہی بات ہے۔ کوس کی درازی ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف تھی اور اب بھی مختلف ہے۔ شمالی ہندوستان اور پنجاب کا کوس انگریزی سوا میل کا ہوتا تھا گنگا کے کنارے جو ملک واقع تھے اُن کا کوس ۲ ۱/۲ انگریزی میل ہوتا تھا اور بندیل کھنڈ اور دکن میں چار میل کا کوس ہوتا تھا۔ ابن بطوطہ جو دہلی میں سنہ ۱۳۳۴ء میں آیا تھا یعنی محمد بن تغلق کے عہد میں اور اُس کا ہم عصر مارکو پولو فاصلے کی تعداد منزلوں میں لکھتے ہیں لیکن منزل کی کوئی معیار نہیں۔ دولت آباد کا فاصلہ ہی سے کے (رہیل لنخ) جسکو چالیس دن کی فاصلہ لکھا ہے اس شرح سے بیس میل یعنی (۱۵) کوس کی ایک منزل ہوئی جو بہت موزوں ہے۔ لیکن ملتان دہلی سے پانسو میل سے زیادہ نہیں اس کو ابن بطوطہ نے پچاس دن کا رستہ لکھا ہے۔ سیوان سے ملتان تک ۲۰۰۰ میل ہے تقریباً اسی قدر جس قدر دہلی سے ملتان لیکن اُس کو دس دن کا راستہ لکھا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ دریا پر چلنے والی کشتی اس عرصے میں پہنچ جائے بظاہر ان فاصلوں کے لکھنے میں ابن بطوطہ سے سہو ہوا ہے۔

تین چوکیاں ہرکاروں کی ہوتی تھیں جس کو داوہ[۱] کہتے تھے ہر ایک تہائی میل کے فاصلے پر ایک گاؤں آباد ہوتا تھا۔ گاؤں کے باہر ہرکاروں کے لیئے برجیاں بنی ہوئی تھیں اور ہر ایک برجی میں ہرکارے کمر کسے طیار بیٹھے رہتے تھے۔ ہر ایک ہرکارے کے پاس دو گز لمبی ایک چھڑی ہوتی تھی جس کے سرے پر تلمبے گے

[۱] بداؤنی نے اس لفظ کو دھاوہ لکھا ہے اب بھی محاورے میں دھاوہ کرنا اور دھاوے پر چڑھنا بولتے ہیں بداؤنی لکھتا ہے۔" در ۷۴۲ھ سلطان محمد تغلق عظیمت دیو گروہ از دہلی تا آن جا بر سر کوہ دھاوہ یعنی پایگیاں غہوار نشاندہ و در ہر منزلے کوشکے و خانقاہے بنا فرمودہ و شیخے نصب کردہ طعام و شراب و تنبول و سائر مصالح مہمانی مہیا داشتند" فرشتہ سلطان علاء الدین کے حال میں لکھتا ہے " ہر گاہ بادشاہ علاء الدین لشکر بطرفے می فرستاد از دہلی تا آں جا ڈاک چوکی کہ بزبان سلف یام می گفتند می نشاند و در ہر یک کروہ دو پیادہ جلد کہ در ہند پائک می نامند می گزاشت و در ہر قصبہ و شہر کہ بر سمت راہ بود نویسندہ نصب می شد"۔ دوسری جگہ اکبر بادشاہ کے حال میں فرشتہ نے لکھا ہے۔ " در شوارع در ہر پنج کروہ دو اسپ راہوار و چند ہیرہ مقرر بودند آنرا ڈاک چوکی می گفتند۔ تا فرمان ضروری یا عرضداشت امرائے سرحد کہ بہ انجار سد ہیرہ سوار شدہ بجائی دیگر رسانند چنانکہ در شبانروزے پنجاہ کروہ راہ طے می شد وازآگرہ تا احمد آباد خبر بہ پنج روز می رسید و ہر گاہ کسے از حضور بجائے تعین می شد و یا از جائے بدرگاہ می آمد بہ تعجیل اموری شد بہ اسپان ڈاک چوکی سوار می گشت و چہار ہزار ہیرہ کہ بسرعت سیر مشہور بودند نوکر داشت و بسیار بودہ است کہ ہیرہ پیادہ ہشت صد کروہ را در دہ روز طے کردہ"۔ جو دل چسپ حال ابن بطوطہ نے ڈاکیہ کی لکڑی اور گھنگروں کا لکھا ہے وہ اب تک بھی جہاں ریل نہیں ہے اور ہرکارے ڈاک لے کر دوڑتے ہیں ۔ دیکھا جاتا ہے۔ مالک الابصار کے مصنف شہاب الدین دمشقی نے جو ابن بطوطہ کا ہم عصر تھا (۷۴۹-۷۰۷ھ) سراج الدین عمر شبلی کی زبانی جو حال ڈاک کا لکھا ہے وہ بھی اسی کے لگ بھگ ہے جو ابن بطوطہ نے لکھا ہے۔ بلکہ اس میں ایک بات اور زیادہ ہے کہ ہر ایک چوکی پر مسجد اور تالاب اور دکانیں بھی تھیں۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ دولت آباد سے دہلی سے بڑے بڑے شہروں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کا وقت اور کسی غیر معمولی واقعے کے ہونے کا حال اس طرح معلوم ہو جاتا تھا کہ ہر ایک چوکی پر نقارے رکھے ہوئے تھے اور ایک نقارے کی آواز سن کر دوسرا آواز دیتا تھا اور اس طرح سے ذرا سی دیر میں بادشاہ کو خبر پہنچ جاتی تھی۔ ۱۲

گھونگرو بندھے رہتے تھے۔ جب شہر سے ڈاک چلتی تھی تو وہ ایک ہاتھ پر لفافہ رکھ لیتا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں چھڑی اور تمام طاقت خرچ کر کے دوڑ جاتا تھا اس طرح جہاں کہیں خط پونہچانا ہوتا تھا پونہچا دیتے تھے یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک سے بھی جلد جاتی تھی اور کبھی کبھی اس ڈاک کے ذریعے سے خراسان کے میوہ جات بھی بادشاہ کے لیئے تھالیوں میں جاتے تھے اور کبھی کبھی کسی سنگین مجرم کو بھی چارپائی پر اٹھا کے اسی طرح چوکی بہ چوکی ہرکارے پونہچا دیتے تھے۔ چنانچہ گنگا جل جو ہندوؤں کے نزدیک مسلمانوں کے آب زمزم کی طرح متبرک خیال کرتے ہیں ڈاک پر لے جایا کرتے تھے۔ دولت آباد گنگا سے چالیس دن کے فاصلے پر ہے۔ اخبار نویس ہر مسافر کا حال تفصیل وار لکھتے تھے کہ اس کی صورت ایسی ہے لباس ایسا ہے خادم اور ہمراہی اور جانور اس کے ساتھ اس تعداد میں ہیں اس کے حرکات وسکنات اس قسم کے ہیں الغرض کوئی بات باقی نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ کوس منارہ جس کا ذکر ہم لکھ رہے ہیں۔ قلعۂ کہنہ کے مشرقی دروازے کے سامنے سے دکھلائی دیتا ہے جو خاص محل اور عظیم گنج سرائے مغلیہ کے بیچ میں ہے۔ بلکہ عظیم گنج کی سرائے سے بہت پاس شمال کی طرف کوئی دوسو قدم پر ہے۔ کوس منارے کے چار حصے ہیں۔ نیچے کا حصہ ہشت پہل ہے جس کا دور ۲۹ فٹ ۱۱ انچ مربع اور دو فیٹ اونچے پختہ چبوترے پر پتھر اور چونے کا بنا ہوا ہے بیٹھک کا ہشت پہل حصہ ۸ فٹ اونچا گل بندی انداز ۳ فٹ ہوگی اوپر کا سرا گول مٹی پر ختم ہوا ہے۔ اس طرح کے منارے کوس کوس بھر کے فصل تھے اور سرایوں کے پاس ضرور ہوتے تھے جو منزل منزل پر بنی ہوئی تھیں۔ دہلی سے دولت آباد تک تمام رستے پر بید مجنوں اور قسم قسم کے درخت دورویہ لگے ہوئے تھے۔ چلنے والے کو ایسا معلوم دیتا تھا کہ گویا وہ باغ کے درمیان چلا جاتا ہے اور ہر ہر کوس میں تین تین چوکیاں ڈاک کے ہرکاروں کی تھیں اور ہر چوکی پر جس چیز کی مسافر کو

سلہ ملکت سرکار عالی نظام میں چند سال پیشتر تک یہ طریقہ جاری تھا کہ ڈاک نے سنہ ۱۸۶۸ء اوقات کے علاوہ بھی ضروری احکام وغیرہ سپیشل طور سے روانہ کیئے جاتے تھے جو بہت جلد پونہچتے تھے۔ اس کو گھونگرو ڈپٹہ کہتے تھے۔ اس کی فیس چار آنے کوس کے حساب سے لی جاتی تھی جب سے ڈاک خانے میں جدید انتظام ہوا یہ طریقہ موقوف کر دیا گیا۔ ۱۲

ضرورت ہوتی ہو ملتی تھی ایسا معلوم دیتا تھا کہ گویا وہ بازار میں چلا جا رہا ہے اور اس طرح سے یہ سڑک تلنگانہ اور معبر کے ملک تک چلی گئی تھی جو دہلی سے چھ مہینے کا رستہ ہے (معبر کے معنے عربی میں گھاٹ کے ہیں۔ عرب دکن کے مشرقی ساحل کو معبر اور مغربی ساحل کو ملیبار کہتے ہیں) ہر ایک منزل پر بادشاہی محل تھا اور مسافروں کے لیے کچھ ضرورت نہیں تھی کہ وہ اپنے ساتھ زادراہ لیے لیے پھریں۔ اسی قسم کی دو سڑکیں شیر شاہ نے بھی طیار کرائی تھیں۔ بداؤنی لکھتا ہے "از ولایت بنگالہ تا رہتاس غربی کہ چہار ماہہ راہ است واز آگرہ تا منڈو (کہ سی کروہ فاصلہ دارد) در ہر کروہے سرائے ومسجدے وچاہے از خشت پختہ آباد ان ساختہ موذنے وامامے ومسلمانے وہندوئے برائے سقایہ آب نام زد کردہ لنگر طعام برائے فقرا ورہگذرے مہیا داشتند ودو رویہ راہ درختان بزرگ بلند سرکشیدہ (از قسم آنبہ وکھرنی) نشانید تامسافراں درسایۂ آں رفتہ باشند واثر آں تا اکنوں کہ پنجاہ و دو سال ازاں زمان گذشتہ باقیست" فرشتے میں اتنا اور زیادہ ہے "در ہر سرا دو اسپ بام کہ بزبان ہندی ڈاک چوکی گویند نگاہ داشتہ کہ ہر روز خبر نیلاب واقصائے بنگالہ با و می رسید" خلاصۃ التواریخ اور سیرالمتاخرین میں یہ بھی درج ہے کہ "در وقتے کہ شیر شاہ در دولتخانہ مالا مائدہ برائے خود گستر دے آواز نقارہ شدے وچوں در سراہا نقارہ بودند بطرفۃ العین تمامی سراہا از بنگالہ تا رہتاس مردم خبر وا گشتہ نقارہ نواختندے و در ہر سرائے ہماں وقت از طرف بادشاہ بہ مسافران مسلمان پختہ و بہ ہندوان آرد و روغن و دیگر لوازم دادندے ومقرر کردہ بودند کہ از نیلاب تا دہلی دہات افغانان دو رویہ آباد سازند تاسد راہ مغول شوند۔ بداؤنی اور طبقات اکبری اور فرشتے میں درج ہے کہ ہر کوس پر ایسی سرائے اور مسجد تھی لیکن سیرالمتاخرین اور خلاصۃ التواریخ میں لکھا ہے کہ یہ سرائیں دو دو کوس پر تھیں۔ بداؤنی نے لکھا ہے کہ سلیم شاہ نے بیچ میں ایک ایک اور سرا بنوادی تھی یہ بھی بیں ہیں آتا کہ ہر کوس یا نصف پر سرائے کی کیا ضرورت تھی اغلب ہے کہ دو کروہ کی بجائے دہ کروہ ہو۔

بی بی فاطمہ سام کا مزار	تاہم بیگم کے مدرسے سے بجانب جنوب ایک سیدھا کچا رستہ لال بنگلے کی طرف چلا گیا ہے۔ ریل کی

۶۴۳

سڑک کے پاس تار کے کھمبے نمبر ۹۵/۱۸ کے مابین ریلوے لین سے ۱۸۲ قدم داہنی طرف لال بنگلے سے ذرا پہلے درختوں کے جھرمٹ میں ایک چھوٹی سی سفید چار دیواری نظر آتی ہے یہاں بی بی فاطمہ سام کا مزار ہے۔ آپ بڑی صاحب کرامت تھیں۔ شیخ فرید شکر گنج ان کو بہن کہا کرتے تھے۔ سلطان المشائخ ان کے روضے میں ذکر و شغل کیا کرتے تھے۔ عوام ان کو بی بی شام اور صائمہ کہتے ہیں۔ بعض لوگ ان کو حضرت سلطان المشائخ کی پیر بہن بھی بتاتے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ حضرت گنج شکر کی مرید بھی ہوں۔ ۱۸ شعبان کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ آپ کا مزار ۹ فٹ ۳ × ۲۶ فٹ طول و عرض کے احاطے میں ہے جس کی دیوار (۹) اونچی ہے۔ اور چبوترا ۱۱ × ۸ فٹ طول و عرض میں اور چار فیٹ اونچا ہے۔ علاوہ بی بی فاطمہ سام صاحبہ کے آپ کی پائنتی ایک بڑی اور دو چھوٹی چھوٹی قبریں اور ہیں۔ آپ کے مزار پر حال کا لگایا ہوا یہ کتبہ ہے:- حضرت بی بی فاطمہ سام قدس اللہ سرہا از صالحات و قانتات و عابدات زمانہ بود۔ و سلطان المشائخ در روضۂ او بسیار مشغول بودے و در مناقب او غلو فرمودے و در زمان حیات او دریافت بود در سنہ ۶۴۳ھ جاں بجاں آفریں سپرد۔

شیخ ابوالرضا محمد کا مزار ۱۱۰۱ھ آپ اسی کچے رستے سے اور آگے چلیے اور حضرت شیخ ابوالرضا کی زیارت کیجیے۔

آپ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے عم بزرگوار ہیں۔ سنہ ۱۰۴۶ھ میں بعہد اورنگ زیب پیدا ہوئے۔ آپ اپنے بھائی مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب سے سات برس بڑے تھے۔ آپ نے اکتساب علم مولانا حافظ بصیر صاحب سے جو عہد شاہجہانی کے ایک بڑے عالم تھے اور نیز حضرت خواجہ خورد سے جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے تھے کیا۔ آپ کو علم حدیث و تفسیر میں درجۂ کمال حاصل تھا۔ علم و عمل فضل و کمال تحریر و تقریر حلم و کرم توکل و رضا عمدہ نمونہ تھے۔ سنت نبوی کے سختی سے پابند تھے۔ ہزارہا آدمی آپ کے علم و فضل سے مستفید ہوئے۔ اگرچہ آپ کی درگاہ بظاہر کچھ عمدہ نہیں ہے مگر فیض سے مملو ہے۔ مکان کو مکین سے شرف ہے اور شرف المکان بالمکین کا صحیح مصداق یہی جگہ ہے۔ آپ نے ۱۷ محرم سنہ ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کے وصال کی

نقشۂ لال بنگلہ
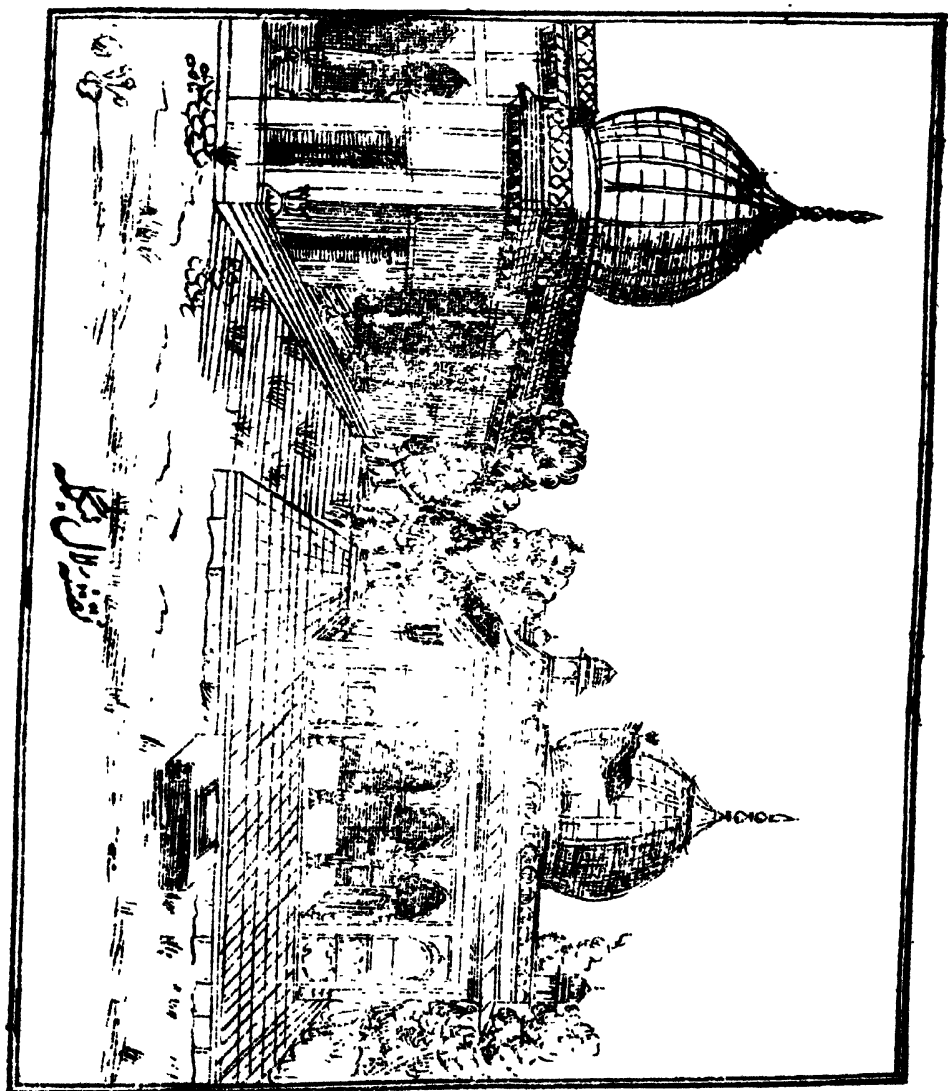
تاریخ آفتاب حقیقت ہی علاوہ آپ کے مزار کے اور اس جگہ آپ کے اہل و عیال اور دیگر بزرگوں کی قبریں بھی ہیں -

لعل بنگلہ
۱۱۹۳ھ
۱۷۷۹ء

یکمن پنبۂ غفلت از گوش ہوش کہ از مردگاں بندت آیا بگوش

پرانے قلعے اور حضرت نظام الدین کی درگاہ کے بیچ میں سید عابد کے مقبرے کے پاس جی آئی پی ریلوے لین کی داہنی طرف بالکل ریل کی سڑک کے کنارے تار کی باڑھ سے ملا ہوا میل ۹۰۲ کے سامنے ایک عمارت لال بنگلے کے نام سے مشہور رہی - تاریخ میں اس کا کچھ ذکر نہیں نہ یہ معلوم ہو سکتا ہی کہ کس نے اور کس غرض سے بنائی - لیکن سرسید علیہ الرحمہ نے آثار الصنادید میں لکھا ہی کہ سرسید نے بہادر شاہ بادشاہ سے سنا تھا کہ ہمایوں بادشاہ کے عہد میں ایران جانے سے پہلے اُن کی کسی حرم کے دفن ہونے کے لیئے یہاں کوئی عمارت بنائی گئی تھی اُس کے بعد حضرت فردوس منزل شاہ عالم بادشاہ کے وقت سے جب کہ لعل کنور اُن کی والدہ کا انتقال ہوا اُن کو اُس قدیم قبر کے پاس اس چھوٹے گنبد میں دفن کیا جب سے یہ مکان لعل بنگلہ مشہور ہو گیا - اس کے بعد اُسی زمانے میں بیگم جان اُن کی چہیتی بیٹی نے جو مرزا مکھو سے منسوب تھیں انتقال کیا اور دوسرے گنبد میں اُن کو دفن کیا اور یہ عمارت بنائی اس حساب سے اس عمارت کو بنے (۱۴۴) برس گزرے - پھر تو خاندان تیموریہ کی بہت سی قبریں یہاں بن گئیں چنانچہ مرزا سلطان پرویز - مرزا دارا بخت ولی عہد بہادر کے بھائی کی - مرزا داؤد - نواب فتح آبادی - مرزا ابلاقی - اور بہادر شاہ کی اور اور ازواج کی قبریں یہیں ہیں - یہ دونوں گنبد سنگ سرخ کے بہت عمدہ بنے ہوئے ہیں - اُن کے صحن میں دو مجر ایک نواب فتح آبادی اور ایک مرزا بلاقی کے بہادر شاہ بادشاہ نے بنوائے ہیں - یہ عمارت ایک وسیع احاطے کے اندر ہی جس کا طول ۱۷۰ - اور عرض ۱۲۴ اور بلندی (۹) ہی لیکن احاطے کا ۹/۱ حصہ گر گیا ہی - اور کچھ ورثا ہی سا رہ گیا ہی - بنگلے کا دروازہ صحن کے شمال و مشرق میں ہی جس کے سامنے ایک گھوگس بنا ہوا ہی - دونوں گنبد صحن کے وسط میں نہیں ہیں بلکہ ایک جو دروازے کے پاس ہی وہ شاہ عالم کی والدہ لعل کنور کا ہی جو سنگ سرخ کے ۲۵ ۱/۲ مربع

ایک فٹ اونچے چبوترے پر واقع ہے۔ یہ گنبد ۳۰ فٹ مربع ہے جس کے چاروں کونوں میں ایک ایک کوٹھڑی چھ چھ فیٹ مربع ہے۔ ان کوٹھڑیوں کے بیچ میں سہ دریاں ہیں جو دو سنگین اور دو دیوار دوز ستونوں پر قایم ہیں۔ عمارت کا درمیانی کمرہ ۱۲ فٹ مربع ہے جس میں تین قبریں ہیں اور ایک قبر مغربی حجرے میں ہے۔ گنبد ۲۰ فٹ بلند ہے جس پر کا گنبد مغلیہ سلاطین کے آخری طرز کا سنگ سرخ کا ہے۔ کلس ملا کر گنبد کی بلندی ۴۵ فٹ ہے۔ اس گنبد سے پچاس فیٹ کے فصل سے دوسرا گنبد ہے جو ۱۵ فٹ مربع ہے اور ساخت میں بالکل پہلے گنبد کی طرح کا ہے۔ یہ مقبرہ شاہ عالم کی بیٹی بیگم جان کا ہے جن کی قبر کا تعویذ تک لوگوں نے نہ چھوڑا۔ اسی کے متصل ایک پختہ اور وسیع احاطے میں اکبر شاہ ثانی کے خاندان کی تین قبریں ہیں۔ یہ احاطہ ریلوے لین کی بائیں طرف ہے۔ جس کمرے میں تین قبریں ہیں اسی کے سامنے بجانب مغرب ایک خالی تعویذ سنگ مرمر کا اکھڑا پڑا ہے خدا جانے کس کا ہے۔ دونوں مقبروں یا کسی قبر کا کوئی کتبہ نہیں ہے۔ ایک قبر جو مغربی برآمدے میں ہے گو وہ سنگ مرمر کی ہے مگر چونکہ وہاں بارش کی بوچھاڑ کی زد ہے بالکل زرد پڑ کر سنگ مرمر کی جلا جاتی رہی ہے ان دونوں مقبروں کی چھت سنگ سرخ کی مصفا سلوں کی ہے۔ چھوٹے بنگلے کے شمال میں گیارہ سیڑھیوں کا زینہ ہے اور بڑے مقبرے کے شمالی اور جنوبی حجروں میں دو طرفہ بارہ بارہ سیڑھیوں کے زینے ہیں۔ احاطے کی مشرقی دیوار بالکل گر گئی ہے اور اسی میں گھوگس تھا۔ دونوں گنبد نہایت خوب صورت اور سنگ سرخ کے ہیں جن پر سنگ مرمر کی سفید عمودی پٹیاں پڑی ہوئی بڑی بھلی معلوم دیتی ہیں اس عمارت میں سنگ سرخ نہایت خوش رنگ اور مصفی لگایا گیا ہے خلاصہ یہ کہ گو عمارت چھوٹی ہے مگر بڑی گٹھی ہوئی اور سڈول ہے اور دیکھنے کے قابل ہے۔

مقبرۂ سید عابد لال بنگلے کے محاذ میں سید عابد کا مقبرہ ہے۔ یہ عمارت ایک بڑے وسیع اور پختہ احاطے کے اندر ہے جو ۲۲۰ فٹ لمبائی

ملہ دلی کی عمارات قدیمہ کو اگر اپنی حالت ہی پر چھوڑ دیا جاتا اور کچھ بھی مرمت نہ کی جاتی تو بھی وہ ایسی مستحکم دیرپا اور پختہ مال مسالے کی سنگین بنی ہوئی تھیں کہ ابھی اور صدیوں تک جنبش نہ کھاتیں مگر خدا جانے لوگوں کو کیا خدا کی سنوار ہے کہ اول تو دیواروں پر (بقیہ نوٹ بر صفحۂ آیندہ)

(بقیہ نوٹ بر صفحۂ آیندہ)

نقشہ مقبرہ سید عابد
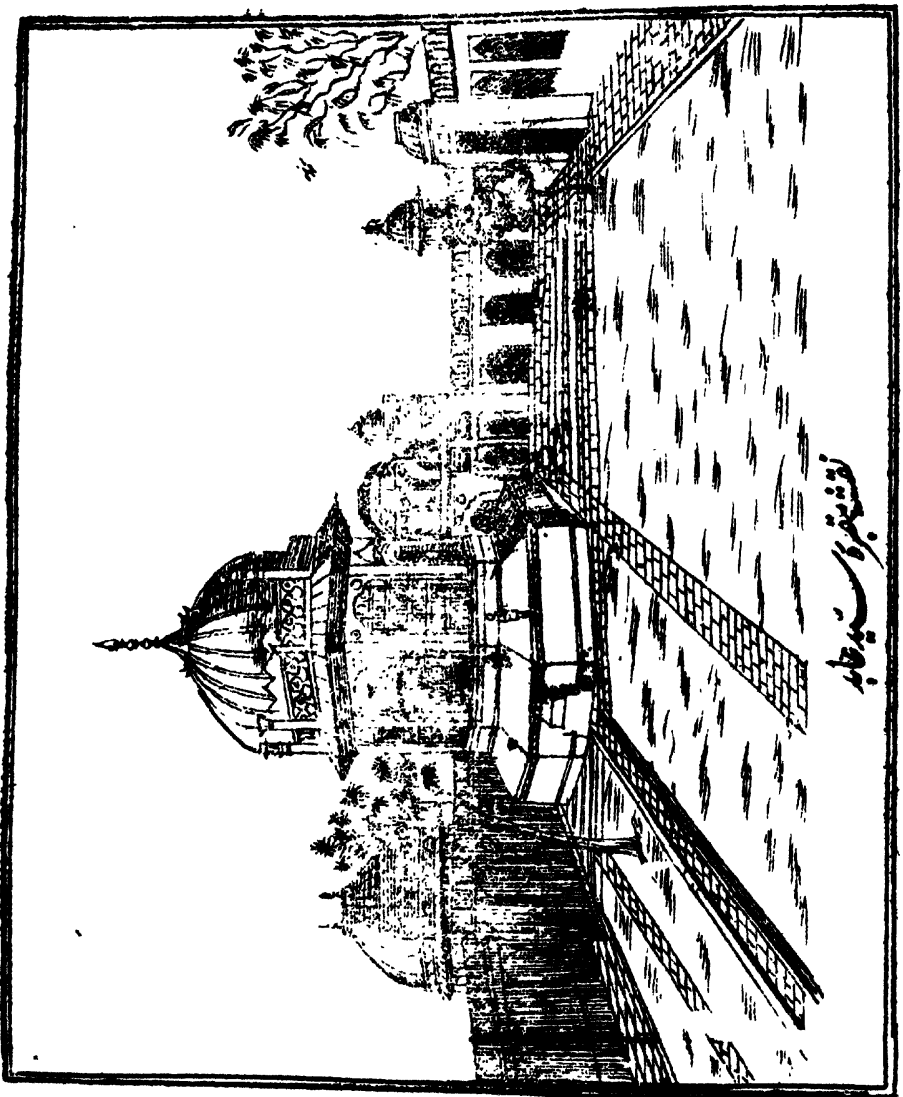
سنہ ثبت چوڑا ہے۔ یہ ساری عمارت چونے اور پتھر کی بہت مستحکم اور خوش نمابنی ہوئی ہے۔ اس میں جا بجا چینی کاری کا کام بھی بنا ہوا ہے۔ سید عابد خاں دوران خاں کے رفیقوں اور مدار المہاموں میں سے تھے جو کسی لڑائی میں شہید ہوئے اُن کا

(بقیہ نوٹ صفحۂ گزشتہ) نام کوئلے سے لکھ کر اس کی چلا بگاڑ دیتے ہیں اور بعض حضرات تو نوک دار کیل یا چاقو سے بہت روانی سے اپنا نام اور پتہ اور تاریخ تشریف آوری بھی کھود جاتے ہیں۔ یہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ جن لوگوں نے ہزار ہا روپیہ خرچ کر کے یہ سر بفلک نادر روزگار عمارتیں کھڑی کر دی ہیں آج ڈھونڈے بھی اُن کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون تھے اور باوجود تلاش و تفحص کے بھی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کن بزرگ سے یہ عمارت منسوب ہے۔ جب ان لوگوں کا نام نہ رہا اور مٹ گیا تو وا ی بر حال ہمارے ہم کس شمار قطار میں ہیں آج مرے کل دوسرا دن ۔ دوسرے کی عمارت پر ایک دفعہ نہیں اگر ہزار دفعہ بھی ہم اپنا نام لکھ دیں تو بھی سوائے مالک الملک کی ذات اقدس کے بقا کسی کو نہیں دنیا کی ساری چیزیں فانی اور تباہ ہونے والی ہیں۔ دلّی میں بیسیوں گنبد ہیں جو ہزار ہا روپیہ کی لاگت کے کھڑے ہیں مگر جس طرح وہ گنبد خاموش ہیں ویسے ہی اُن کے بانیوں کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ زمانۂ قدیم میں چوں کہ اکثر امرا و ذی مرتبت اصحاب گنبدوں میں آسودہ ہوتے تھے لہذا یہ بھی ایک قسم کی تجارت تھی۔ تاجر لوگ عمدہ عمدہ ڈیزائن کے گنبد بنوا رکھتے تھے اور امراء اُن سے خرید لیتے تھے۔ بعض گنبد تو ایسے ہیں کہ گو بن کر طیار ہو گئے مگر فروخت ہونے کی نوبت نہ آئی اور ویسے ہی خالی کے خالی پڑے رہے۔ پس جن گنبدوں کے کتبے محفوظ ہیں اُن سے تو صاحب گنبد کا پتہ چلتا ہے ورنہ نہیں۔ جو گنبد یا محلات گر گئے یا گر رہے ہیں اُن کو گرتے ہوئے بھی سو سو دو دو سو برس عرصہ ہوا۔ دو سو برس کی عمر کا کون شخص مل سکتا ہے جو ان کا صحیح صحیح پتہ دے۔ لہذا لازمی طور پر ہم کو زبانی روایتوں پر خصوصاً اُن لوگوں کے قول پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جو بطناً بعد بطن اور نسلاً بعد نسل مزار کے خدام رہے ہیں۔ ان کے بیانات بھی مختلف ہیں کوئی کسی عمارت کو کسی کی بتلاتا ہے اور کوئی کسی کی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ گنبدوں کی چوکھٹیں چن چن کر نکال لے گئے ہیں اور گنبد جوں کا توں کھڑا ہے۔ چوکھٹیں خاص کر عمدہ پتھر کی ہوتی تھیں اور اُن پر نقش و نگار بھی بڑے اہتمام سے نہایت نفیس بنائے جاتے تھے پس پہلی دست درازی لوگوں نے چوکھٹوں پر کی ہے۔ پھر جہاں کوئی عمارت ذرا کھسکی کہ اس کے پتھر اور اینٹیں اور

(بقیہ نوٹ بر صفحۂ آیندہ)

یہ گنبد ہے بعض لوگ اسے شہید کی درگاہ بھی کہتے ہیں۔ غرض کسی کتاب سے کچھ پتہ نہیں لگا کہ یہ مقبرہ کب بنا اور کس کا بنایا ہوا ہے۔ بہر حال یہ ایک عمارت ہے معقول جس کا دروازہ بہت شان دار ہے اور اس پر ایک خوش نما سہ دری بنی ہوئی ہے گنبد گو چھوٹا سا ہے مگر لطافت اور نزاکت سے خالی نہیں۔ اس کے صحن میں نہریں اور حوض بہت نفیس بنے ہوئے تھے لیکن اب بالکل خراب اور ویران ہو گئے نہریں اور حوض سب ٹوٹ پھوٹ گئے اور سارے احاطے میں جھاڑی ایسی گھنی ہے کہ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ پہلے کیا حالت تھی۔ گنبد بھی بہت بے مرمت ہو گیا اندر اور باہر سے پلاستر جھڑ گیا۔ گنبد میں کوئی قبر تک باقی نہیں بلکہ کم بخت بے دردوں نے سارے تعویذ اور قبروں کے کٹہرے توڑ ڈالے جن کا ڈھیر گنبد میں لگا ہوا ہے شاید موقع پار کرنے کا نہیں ملا۔ اب چینی کا کام باقی نہیں رہا نہ وہ جلا رہی بریں ہم اب بھی یادگار زمانہ گزشتہ ہے۔ اس کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ گنبد اور دروازے پر کی سہ دری سب معلوم ہوتی ہے۔ مقبرے کے اندر کثرت سے چینی کا کام تھا جس کے نشان کچھ کچھ اب بھی نظر آتے ہیں۔ مقبرے کے اندر چاروں طرف سورۃ الملک نہایت خوش خط بخط نسخ منقوش تھی۔ اب بھی اَلعَزِیزُ الغَفُورُ الَّذِی سے لے کر سِیٓئَتْ وُجُوہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَقِیْلَ ھٰذَا الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہٖ تَدَّعُوْنَ تک ہے آگے اڑ گیا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) گھوای گھڑائی سلیں لوگوں نے نکالنی شروع کیں جس چیز کی محافظت نہ ہو اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ لوگ قبروں کو اس واسطے اوبدا کر توڑ دیتے ہیں کہ تعویذ قبر سب سے زیادہ آراستہ اور مکلف ہوتا ہے۔ رنگوں کو کھرچ کھرچ کر دیکھتے ہیں کہ کس طرح رنگا ہے اور کیا مسالا تھا بعض جگہ سیاہی لگا کر نقش و نگار کے چربے لیے ہیں۔ بعض چربوں کی غرض سے ٹکڑے کا ٹکڑا اکھاڑ لے گئے ہیں۔ چھتوں کی نقاشی کو بندوق کی گولیاں مار مار کے غارت کر دیا ہے۔ گنبد میں بندوق چھوڑو تو آواز گونجتی ہے اس آواز پر ٹھٹے لگاتے ہیں جس کے ساتھ چھل کی چھل پلاستر کاری کے کھپرے آن پڑتے ہیں۔ قبروں کو تعویذوں کے سوا خزانہ ملنے کی طمع میں بھی کھود دیتے ہیں عام خیال یہ ہے کہ امراء کی قبروں کے نیچے خزانہ گاڑا جاتا تھا۔ یہ ان کھودنے والوں سے پوچھنا چاہیئے کہ ان کو کچھ ملا یا مفت میں کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے ہوئے۔ ۱۲ من المصنف۔

پڑھا نہیں جاتا ہی گر اس میں بھی کہیں کہیں حروف جھڑ گئے ہیں کیوں کہ چونے کے اُبھرے ہوسے حروف بہ نسبت پتھر میں کھدے ہوؤں کے بہت کم پائدار ہوتے ہیں۔ بہرحال پوری سورت منقوش تھی۔ تھوڑا سا حصہ شروع کا اور تھوڑا سا آخر کا ضائع ہوگیا ہی۔ دروازے کی دونوں جانب چینی کے کام کے طغرے میں کلمۂ طیبہ منقوش ہی اور اسی طرح چاروں دروازوں پر ہی۔ چبوترا گنبد کا پختہ اور ہشت پہل ہی جس کا ایک ضلع ۱۴ گز کا ہی اور تین فیٹ اونچا ہی۔ احاطے میں بہت سی قبریں ہیں چنانچہ اب بھی دو تعویذ سنگ مرمر کے اکھڑے پڑے ہیں ایک پر صرف یا حیّ یا قیّوم کا طغریٰ باقی ہی سادہ دوسرے پر کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ کا طغریٰ ہی اور گرد پوری یٰسین شریف بہ خط نسخ کندہ ہی۔ احاطے کا صدر دروازہ بجانب مغرب ہی جس کے اوپر سہ دری ہونے کے علاوہ اندر پھاٹک کے دونوں جانب بغلی سہ دریاں ہیں اور سامنے بھی دروازے کے دو طرفہ سہ دری اور اسی میں اوپر چڑھنے کا زینہ بھی ہی جس کی اُنیس سیڑھیاں ہیں صدر دروازے کے باہر دو دو در کی صحنچیاں بھی ہیں۔ احاطے کے کونے پر دو برجیاں ہشت دری سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہیں۔

ایک نامعلوم گنبد سید عابد کے مقبرے سے تھوڑی ہی دور جنوب کی طرف ایک چھوٹا سا گنبد کھڑا ہی جس کی چاروں چوکھٹیں لوگ اُکھاڑ لے گئے ہیں نہ فرش باقی ہی نہ قبر۔ اندر کا پلاستر بالکل جھڑ گیا ہی۔ گنبد کا قبہ درست حالت میں ہی۔ خدا معلوم کس کا ہی۔

مُنڈی مسجد ریلوے لین کی داہنی جانب بالکل فنسنگ سے ملی ہوئی ٹیلیگراف پول نمبر ۱۰/۹ کے بیچ میں ایک قدیم مگر شکستہ مسجد ہی چوں کہ اس کے مینار نہیں اور نہ گنبد ہیں بلکہ اوپر سے چھت سپاٹ ہی اسی وجہ سے لوگ مُنڈی مسجد کہنے لگے ہیں۔ اس کے تین در ہیں۔ پتھر چونے کی بنی ہوئی ہی۔ اندر باہر سے پلاستر جھڑ کر خالی پتھر نکل آئے ہیں گو اوپر سے چھت ہموار ہی مگر اندر گنبد بنائے ہیں بیچ کا بڑا اِدھر اُدھر کے چھوٹے۔ صحن مسجد ریلوے لین میں آگیا داہنی طرف کا در قایم ہی۔ بیچ کے در کے گنبد میں سوراخ پڑگیا ہی۔ بائیں

صرف کا گنبد آدھا گر گیا اور اپنے ساتھ دوسرے کوٹے کو بیٹھ گیا۔ ادھر ہی زینہ بھی تھا جس کے اوپر کی تین سیڑھیاں اب صرف باقی رہ گئی ہیں۔ مسجد ۶۲ × ۱۹ ہے۔ درمیانی محراب کی چوڑان ۱۰ اِنچ ہے۔ اندر ممبر یا فرش کچھ باقی نہ رہا۔ اب مویشی باندھے جاتے ہیں اور بہت خراب حالت میں ہے۔

جس طرح انسان کا بچپنا جوانی اور بڑھاپا اور پھر موت ہوتی ہے یہی حال کُل کائنات کا ہے۔ عمارتوں کے اعتبار سے بچپنا یہ ہے کہ عمارت کی بنا پڑی جب بن کر طیار ہوئی گویا جوان ہوئی پھر بڑھاپا آیا ادھر اُدھر سے گرنے لگی۔ مرمت علاج معالجہ تصور فرمائیے آخر کار وہ عمارت گر پڑتی ہے۔ اور یہی اس کی بدبختی چوں کہ ان عمارتوں کا کوئی معالج یعنی خبر گیر نہیں و اغ دوزی ندارد نتیجہ یہ کہ شب غیر طبعی میں گرفتار ہو کر قبل از وقت مسمار ہو کر گر جاتی ہیں۔ ایک اینٹ اپنی جائے سے کھسکی اور چلیں۔ اینٹ پتھر لوگ اس طرح گھسیٹتے ہیں جیسے مردے کا کفن کھسوٹتے ہیں انجام کار ذی روح ہو یا غیر ذی روح جب لیے انقضا

ایک اور بارہ کھمبا ہمایوں کے مقبرے سے جو سڑک صفدر جنگ کے مقبرے کو جاتی ہے۔ جاتے وقت سیدھے ہاتھ کو سیکشن ریلوے نظام الدین کی فنسنگ کے باہر مغرب کی طرف دلی سے جاتے ہوئے ریلوے لین سے سیدھی جانب ٹیلیگراف پول ۹ کے سامنے سنگ خارا کا ایک مقبرہ بنا ہوا ہے جس کے بیچ میں ایک بڑا برج اور چاروں کونوں پر چار برجیاں ہیں جن کی مشرقی طرف کا ایک در اور برجی گر گئی ہے اس چھوٹی سی عمارت کے بارہ ستون ہیں اور اسی وجہ سے بارہ کھمبا مشہور ہے۔ اس عمارت کا نظری نقشہ یہ ہے:—
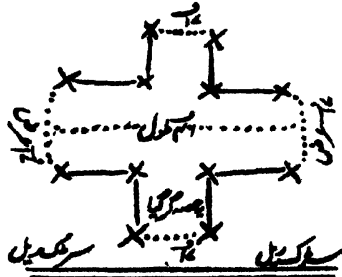
یہ عمارت ۲۶ فٹ مربع ہے درمیانی دالان کا عرض ۱۲ فٹ ۲ انچ ہے ستونوں کی چوڑائی ملاؤ تو ۱۷ فٹ ہو جائے گا۔ بیچ کے دالان میں تین در ہیں اور دونوں طرف ایک ایک برآمدہ ۱۷ فٹ چوکون نکلا ہوا ہے جن میں سے ریل کی طرف کا برآمدہ گر پڑا ہے۔ فرش اب باقی نہیں رہا۔ قبر کا تعویذ محض ایک سنگ خارا کی بھدی سل ۶ فٹ × ۲ فٹ - ۳ انچ لمبی چوڑی اور سطح زمین میں آ گئی ہے۔ اس عمارت کے گرد سنگین اور چوڑا چھجا ہے۔ ستون بڑے بھاری اور چوکون سنگ خارا کے ایک ہی پتھر کی سل کے ہیں جو ۹ فٹ - ۲ انچ اونچی اور ۱ فٹ - ۱۱ انچ مربع ہے۔ سپچے اور اوپر دو دو فیٹ اونچی بیٹھکیں ستون سے الگ ہیں ان میں کوئی نزاکت نہیں۔ گو یہ ساری کی ساری عمارت بہت مضبوط ہے اور اسی وضع قطع کی ہے جیسی کہ حضرت نظام الدین کی درگاہ کا بارہ کھمبا ہے مگر ایک تو اس سے بہت چھوٹی ہے دوسرے یہ کہ سڈول نہیں بھدی ہے۔ اس عمارت کے گرد پختہ چبوترا تھا جو گر گیا اس چبوترے پر کئی قبریں اب بھی موجود ہیں۔ ایک وسیع احاطہ بھی اطراف میں تھا جو بالکل گر گیا مگر کہیں کہیں نشان اب بھی نظر آتا ہے۔ اس عمارت پر کوئی کتبہ نہیں اور نہیں معلوم ہو سکتا کہ یہ بارہ کھمبا کس نے بنوایا تھا۔

ایک ہڑواڑ ٹیلیگراف پول نمبر ۱۰/۹ کے سامنے ریلوے لین کی اسی طرف بارہ کھمبے سے ذرا دور بجانب دہلی ایک ۴۳ فٹ مربع اور پختہ چبوترے پر پانچ شکستہ قبریں ہیں۔ مشرق کی طرف صرف ایک محراب کھڑی ہے جس کے دونوں طرف کلمۂ طیبہ کے طغرے ہیں۔ اس زمانے میں ہڑواڑ کو محفوظ کرنے کا زیادہ تر یہی طریقہ تھا کہ ایک چبوترا بنا کر ایک دیوار سرا سری کھینچ کر چبوترے پر قبریں بنا دیا کرتے تھے مجھے تو یہ کسی کی ہڑواڑ معلوم دیتی ہے۔

ایک نامعلوم گنبد آب ذرا ریلوے لین کی بائیں طرف ملاحظہ فرمائیے۔ ٹیلیگراف پوسٹ نمبر ۱۰/۹-۱۱/۹ کے بیچ میں ایک ۲۵ فٹ مربع گنبد ہے جس کا کلس ٹوٹ گیا ہے۔ اس کے گنبد پر چینی کا کام تھا جس کے کچھ کچھ نشان اب بھی باقی ہیں۔ اندر کا سارا پلاستر جھڑ گیا خالی پتھر رہ گئے۔ قبر کھود ڈالی مگر نشان باقی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر قبر تھی۔ چھ کھٹیں نکال لیں۔ چاروں طرف در کھلے ہیں مگر بہت تنگ اور پست ۵ فٹ - ۶ انچ اونچے ۲ فٹ چوڑے۔ تین طرف محرابوں پر

باہر دار و طرف طغرے ہیں۔ مغرب میں کلمہ۔ مشرق میں صرف پھول۔ شمال میں قتاح جنوب میں الملک للہ۔

ترا چبوترا یہی چبوترا اسی لین میں ۱۵۹ ٹیلیگراف پول کے بیچ میں ۹۹ مربع اور ۸ بلند چبوترے پر صرف ایک قبر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے گنبد تھا چھت منہدم ہو گئی صرف چبوترا رہ گیا۔ اس چبوترے کے نیچے اور ایک چبوترا اوپر والے سے بڑا دو سیڑھیوں کا اور ہے۔

باغ کا دروازہ یہاں سے صرف (۲۷۴) قدم کے فاصلے پر بجانب مغرب ایک عالی شان دروازہ کھڑا ہوا ہے جس کے بیچ میں ایک نشیمن ہے۔ دروازے میں ایک ڈیوڑھی بھی ہے ۲۲×۱۰ ۔ اس کا بھی سارا پلاستر جھڑ گیا اور چوکھٹیں لوگ اکھاڑ لے گئے۔ اسی ڈیوڑھی میں مشرق مغرب میں دو دروازے ہیں اندرونی دروازے کا طول و عرض ۹×۴ ہے اور دروازے کی بیرونی محراب ۱۱-۱۲ چوڑی ہے۔ شمال جنوب کے دروازے بند ہیں۔ باہر وار اس دروازے کے سرخ رنگ کا کام تھا جو کچھ کچھ رہ گیا ہے۔ مغرب رویہ دروازے پر ایک کتبہ بخط نستعلیق کھچ میں تھا اس کے کھپرے کے کھپرے جھڑ پڑے کچھ چیدہ چیدہ لفظ وہ بھی پورے نہیں رہ گئے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی باغ کا دروازہ تھا اور خانجہاں کا نام اب بھی صاف پڑھا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خان جہاں کا باغ تھا۔ اب باغ کی جگہ کمر کمر برابر گھانس کھڑی ہے اور جا بجا کانٹے میں نہ صرف کپڑے الجھتے ہیں بلکہ دل بھی الجھتا ہے۔ یہ مقام کبھی باغ اور سیرگاہ ہوگا اب ویران اور وحشت کدہ ہے کہ دن کو جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ خیر وہ دو سطری ٹوٹا پھوٹا کتبہ یہ ہے۔

.... خانجہاں ... ری سم وصفا شــــــہ لبندش خوش خلق جہ

یا اللہ یا اللہ

جا نو وا سمــــر دا ہو نا کاہ ہے ؛ نم از کم پتا حر خو باں خو باغ ایلو صف از درخانہ

اس کے بعد اٹھوا لنس کا باغ ہے۔

اٹھوا لنس صفدر جنگ کے مقبرے کی سڑک پر سیدھے ہاتھ کی طرف۔

درگاہ حضرت نظام الدین سے جانب شمال ریلوے سٹیشن نظام الدین سے بجانب مشرق ایک پختہ اور وسیع احاطے کے اندر اس نام کا ایک باغ ہے۔ جس کی چار دیواری ہشت پہل ہے اور اسی سبب سے اٹھوانس کہلاتا ہے۔ اس احاطے کے بیچ میں ایک چبوترا ہے جس میں قبریں تھیں وہ سب صاف کر دی گئیں۔ مرزا الٰہی بخش کے داماد مرزا ولایت شاہ نے بعد غدر خریدا تھا۔ ان سے کسی ہندو وکیل صاحب نے لیا اور ان سے بالآخر سرکار نے معاوضہ دے کر لے لیا۔ اب سرکاری ملک ہے اب وہ سامنے دیکھیے ہمایوں صفدر جنگ روڈ دکھلائی دے رہی ہے۔ اسی کے نکڑ پر تار کا کھمبا $\frac{9}{11}$ ہے اور یہ وہی مقام ہے جہاں مذکورہ بالا سڑک ریلوے لین سے تقاطع کرتی ہے۔ ایسا مقام لیول کراسنگ کہلاتا ہے اور یہاں پھاٹک لگا رہتا ہے جو ریل آتے وقت بند کر دیا جاتا ہے باقی اوقات میں آمد و رفت خلایق کے لیے کھلا رہتا ہے۔

دو گمنام گنبد

(۱) اب براہ مہربانی پھر نظام الدین ریلوے سٹیشن کے پاس والے بارہ کھمبے کے نزدیک آ جائیے یعنی ریلوے سڑک کی بائیں جانب کہ اس طرف کی دو عمارتیں بجز آپ کو اور دکھلانی رہ گئی ہیں۔ پہلے اس نقشہ کو ملاحظہ فرمائیے:۔

دہلی — آگرہ — اسٹیشن نظام الدین ریلوے روڈ — بارہ کھمبا — گنبد نمبر (۱) — گنبد نمبر ۲
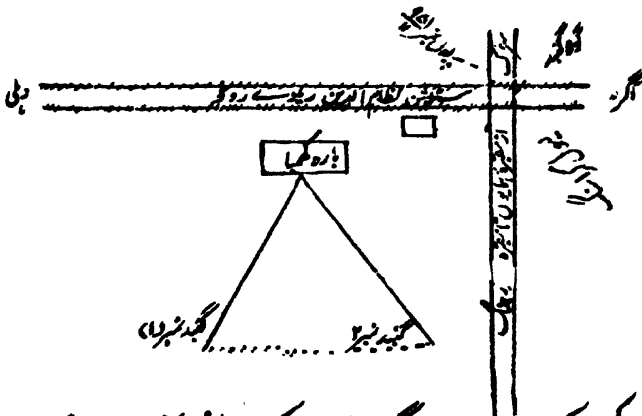
بارہ کھمبے کی عمارت سے گنبد نمبر ۱ و ۲ کی پوزیشن بجنسہ دو اضلاع مثلث متساوی الساقین کے سروں پر ہے۔ گنبد نمبر (۱) سے گذر کر بارہ کھمبے سے کوئی

پانسو قدم پر شمال کی طرف ہے۔ اس گنبد کے چوطرف ۱۱ فٹ چوڑا اینٹوں کا چبوترا ہے جو بالکل ڈھ گیا چار طرف چار دروازے ہیں جن کی چوکھٹیں لوگ اکھاڑ لے گئے۔ مقبرہ اندر سے ۱۲½ فٹ مربع ہے۔ کلس ٹوٹا ہوا ہے۔ گنبد اوپر جاکر ہشت پہل ہوگیا ہے۔ اندر وار سے دروازے چھوٹے ۲ فٹ ۹ انچ اونچے اور ۴ فٹ ۹ چوڑے ہیں لیکن باہر وار ۶ فٹ ۹ چوڑی محرابیں ہیں۔ اندر دو گچ کی قبریں ہیں اور ایک قبر تو زمین کے برابر ہو گئی ہے مگر نشان باقی ہے اس طرح کل تین قبریں ہیں۔ گنبد کے اندر اور چھت میں بہت عمدہ نئی طرز کی نقاشی کا کام سرخ زمین پر سفید بیل بوٹوں کا ہے۔ فرش لوٹ گیا ہے۔ گنبد کے چاروں کونوں پر ایک ایک نہایت خوبصورت اور موزوں چوکور برجی تھی جن کو چار چار پتلے پتلے نازک ستون اور گرد چوڑا چھجا ہے جن میں شمال کی طرف کی دونوں برجیاں گر گئیں اور جنوب کی طرف کی دونوں باقی ہیں۔ گنبد کے باہر پاکھوں پر ابری کا کام گچ میں نئی وضع کا لہریئے دار کیا ہوا ہے جو اور کسی گنبد میں نہیں دیکھا گیا۔ نیچے سے اوپر تک اس طرح کا —

(۲) اوپر والے گنبد کے سامنے کوئی دو ڈھائی سو قدم پر صرف ایک کھیت کے فصل سے یہ دوسرا گنبد کھڑا ہے یہ مقبرہ اندر سے ۱۸ فٹ ۹ انچ مربع ہے۔ چاروں طرف چار چھوٹے چھوٹے دروازے چار چار فیٹ چوڑے اور چھ چھ فیٹ اونچے ہیں جن کی چوکھٹیں لوگ اکھاڑ لے گئے باہر سے بڑی آسج (محراب) ۱۱ فٹ چوڑی ہے اور یہ شکل ہے:-

گرد ایک وسیع اور کشادہ چبوترہ ۲۳ فٹ چوڑا ہے جو ۱۰½ فٹ بلند ہے اور جو تین طرف سے گر گیا ہے صرف مغرب کا رخ باقی ہے۔ اندر سے عمارت بہت خوب صورت ہے دروازوں پر دو طرفہ اندر وار اور باہر وار بھی کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربك ذوالجلال والاکرام کے طغرے گچی میں ہیں جواب اس پائے جاتے ہیں۔ بڑی محرابوں کے دو طرفہ کلمۂ طیبہ کے طغرے ہیں۔ اندر کا فرش ندارد ہے۔ صرف چونے گچی کی تین قبریں باقی ہیں ان کے علاوہ اور کچھ قبریں بھی تھیں جن کے صرف نشان یعنی گڑھے رہ گئے ہیں

کھڑکی
نشین
اندرونی دروازہ
بیرونی
محراب
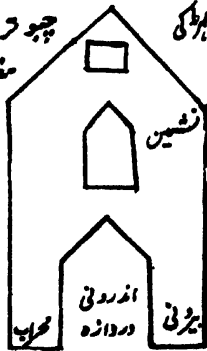
گنبد کی دیواروں اور چھت میں نفیس گلکاری کا کام سرخ زمین پر سفید بیل بوٹوں کا تھا جو اب بھی کچھ کچھ باقی ہے۔ پندرہ سیڑھیوں کا زینہ بھی سلامت ہے گنبد کے دیواروں کی ارتفاع ۳۳ فٹ ہے۔ یہ دونوں گنبد بلحاظ وضع قطع اور ساخت کے ایک ہی طرح کے ہیں صرف فرق اتنا ہے کہ نمبر (۱) کے گنبد کے چاروں کونوں پر برجیاں ہیں جو نمبر ۲ پر نہیں ہیں۔ یہ دونوں گنبد کن کے ہیں کس سے پوچھیں وہ جو اس کے اندر آسودہ ہیں وہ ع کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے۔

سہ دری

گنبد نمبر ۲ کے بالکل قریب ہی ایک سہ دری تھی جو گری ہوئی پڑی ہے جس کا پختہ چبوترا ۲۶ فٹ × ۱۴ فٹ طول و عرض اور ۳ ½ فٹ اونچا ہے۔ شاید کچھ قبریں ہوں مگر وہ کانٹے دار جھاڑی سے ایسا پٹا ہوا ہے کہ جانا ناممکن ہے۔ اب سامنے صفدر جنگ روڈ ہے یہ مقام دوسرے میل کے دوسرے فرلانگ کے پاس ہے آگے سڑک لودھیوں کے مقابر کے سامنے سے گزرتی ہوئی صفدر جنگ کے مقبرے کو چلی گئی ہے اور دوسری جانب درگاہ حضرت نظام الدین پر سے ہمایوں کے مقبرے کو۔

عظیم گنج یا سرائے مغلیہ

آب پھر خاص محل کی طرف پلٹیے۔ پرانے قلعے کے جنوب میں دہلی نظام الدین روڈ کی بائیں طرف اچھن مچھن کی سرائے سے اور آگے بڑھ کے ایک بہت بڑا فصیل نما کنگورے دار پختہ احاطہ جو دکھلائی دیتا ہے وہ عظیم گنج کے نام سے مشہور ہے اور کاغذات سرکاری میں سرائے مغلیہ نام ہے۔ یہ عمارت قلعے نما بہت پختہ اور پرانی ساخت اور طرز کی ہے جس کی فصیل کی بلندی کنگورا چھوڑ کر ۲۴ فٹ اور ۴ ½ فٹ کنگورے کے ملالیں تو ۲۸ ½ فٹ ہوئی۔ دراصل یہ عہد مغلیہ کی بہت بڑی آباد سرائے تھی۔ جب سے قلعۂ کہنہ سے دیہاتی لوگ اٹھا دیئے گئے انھوں نے قریب کے قریب یہاں اپنا بسترا جما لیا۔ ریلوں کے سبب سے اب سرایوں کی ایسی ضرورت نہ رہی جیسی کہ پہلے تھی۔ اب اس کے بعض حجروں میں غریب لوگ مزدور پیشہ مع اپنے بال بچوں کے رہتے ہیں۔ سرائے اتنی بڑی اور اتنی وسیع ہے کہ اس کے چار عالی شان دروازے چاروں سمت میں تھے

جن میں صدر دروازہ پچھاں کی طرف ہے یہی دروازہ شارع عام پر اور درست حالت میں ہے لیکن سرائے بڑی اور رہنے والے معدودے چند اور پرے آن کر جنگل میں کہ چوطرف آبادی کا نام نہیں چور چکار کے ڈر سے عارضی طور پر لوگوں نے جنوب یا جنوب کا دروازہ پورا گر گیا اور شمال کا آدھا گرا ہے اب لے دے کے ایک دروازہ مشرق کا رہ گیا ہے وہ بھی گرا پڑا ہے اب اسی میں سے آمد و رفت ہے چاروں کونوں پر چار نصف دائرے کی شکل کے حجرے ہیں۔ باقی چوطرف وسیع مستحکم اور پختہ چونے اور پتھر کی ساخت کے حجرے ہیں۔ یہ سرائے اندر سے ۳۴۴ مربع ہے بیچ میں ایک مسجد تھی جو بالکل منہدم ہو گئی ایک ٹکڑا دیوار کا کھڑا ہے اور باقی ملبے کا ڈھیر ہے اب یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مسجد تھی ہاں جنھوں نے دیکھا ہے وہ مسجد بتلاتے ہیں اور قبلہ رو دیوار کے دیکھنے سے بھی ایسا ہی معلوم دیتا ہے اور قدیم زمانے کی سراؤں کے بیچ میں مسجد ہوا ہی کرتی تھی۔ چاروں دروازوں کے بغلی میں دونوں طرف اوپر چڑھنے کی سیڑھیاں ہیں۔ گرد (۱۰۰) کوٹھڑیاں ہیں جن میں سے بہت سی گر گئیں بہت سی کھڑی ہیں یہ کوٹھڑیاں ۲۲ فٹ مربع ہیں کوٹھڑیوں کی چھت پر سے کنگورے کی اونچائی ۷ ½ فٹ ہے۔

ایک نامعلوم منہدمہ گنبد عظیم گنج کی سرائے کے شرقی دروازے کے سامنے ہی ایک نامعلوم گنبد ہے۔ جس کا کلس گر گیا ہے۔ بہت خستہ و خراب حالت میں ہے۔ چاروں چوکھٹیں لوگ اکھاڑ لے گئے۔ گنبد بھاری تھا نہ لے جا سکے ورنہ اسے بھی لے جاتے۔ یہ گنبد پتھر چونے کا پختہ بنا ہوا ہے اور چودہ فیٹ مربع۔ چار طرف چار دروازے اندر سے چوکور مگر باہر سے ہشت پہل ہے۔ بھلا جب گنبد کی ایسی تباہ حالت ہے تو قبر کا کیا ٹھکانا

دس قبروں والا منہدمہ گنبد اور آگے بڑھیے تو ایک عجیب ہیبتناک نظارہ پیش نظر ہوتا ہے ایک بہت ... کرسی دار چبوترا ہے جس پر دس قبریں پختہ بنی ہوئی ہیں ایک قبر کے تعویذ پر کلمہ لکھا ہوا ہے۔ باقی سادی ہیں۔ تین طرف تو کوئی دیوار نہیں مگر مغرب کی طرف ایک دیوار کھڑی ہے جس کے اوپر کا حصہ اور چھت گر گئی ہے صرف اجارے تک کی دیوار باقی ہے۔ اس میں تین زہین و یزہ طاق بنے ہوئے ہیں ایک گر گیا دو باقی ہیں

ان کے دونوں طرف کلمۂ طیبہ کا طغری رنگین ہی جس سے معلوم ہو اکہ عمارت کا اندرونی حصہ رنگین کام سے آراستہ تھا۔ یہ کوئی سہ دری معلوم دیتی ہی۔ چبوترے کی وضع قطع اور علامات بتلا رہی ہیں کہ اس چبوترے پر کوئی بڑا گنبد تھا جو گر گیا چنانچہ ادھر اُدھر پتھر بکھرے پڑے ہیں اور کچھ چونے پتھر کے ڈھیم بھی ہیں۔

منہدمہ چوکھنڈی اس چبوترے کے جنوب میں ایک چوکھنڈی ہی جس کی چھت گر گئی صرف پختہ چار دیواری کھڑی ہی قبریں ہوں گی تو وہ سبے میں دب گئیں۔

ایک ٹوٹی پھوٹی پچ دری اسی قلعے کے شمال میں ایک تیغ دری ہی جو سہ ہم امدادی پست گنبد نما دالان نما نیچ میں بڑا گنبد ادھر ادھر دو چھوٹے۔ احاطے کے مشرق وجنوب کے کونے میں ایک پختہ کنواں بھی ہی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا عمارت تھی۔

دلّی سے نظام الدین تک کا بھیانک نظّارہ آہستہ خرام بلکہ مخرام زیر قدمت ہزار جان ست

دلّی سے نظام الدین تک جو سڑک چلی گئی ہی جس کا طول قریب چار میل کے ہی اس کی دونوں جانب دور دور تک چپہ بھر زمین عمارات۔ قبروں گنبدں برجوں۔ مسجدوں۔ مکانوں۔ کنوؤں سے خالی نہیں۔ داہنی طرف کا میدان بی آئی پی ریلوے لین اور رائے سینا (نئی دلی) کی بدولت صاف کر دیا گیا رہا بائیں طرف کا میدان جس میں خاص محل۔ عظیم گنج کی سرائے وغیرہ ہی اس کا بھی یہی حال ہی کہ عرب سرائے اور ہمایوں کے مقبرے تک بلکہ یوں کہو کہ جہاں تک نظر دوڑتی ہی ایک صفاچٹ میدان نظر آتا ہی اور اکا دکا کوئی کھنڈر یا گرا پڑا گنبد باقی رہ گیا ہی تو رہ گیا ہی۔ اس چٹیل میدان میں ہل پھر گیا کھیتی لہلا رہی ہی اس سربفلک عمارات کھڑی تھیں وہاں آج جنگل ہی ہل پھر جانے سے تلے کی زمین اوپر ہو جائے مگر ایک ایک انچ زمین کی بتلا رہی ہی کہ یہ سارا حصہ آباد تھا زیادہ تر زندوں سے اور کم تر مردوں سے چنانچہ اب بھی گو برسوں سے زراعت ہو رہی ہو مگر کھیتوں میں اینٹوں پتھروں کے ٹکڑے روڑے

کرچیاں کتلیں چونے کے ڈلے پٹے پڑے ہیں اور اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں سے گلے مل رہے ہیں - ناظرین اس سرزمین پر قدم سنبھال کر رکھیں -

خدا جانے کیا ہی شاہی قدیم سڑک جو پرانے محلے سے عرب سرائے کو گئی ہے اس کی داہنی جانب ایک ٹوٹی ہوئی چار دیوار کھڑی ہے اس احاطے کا صدر دروازہ بجانب جنوب تھا جس کا نشان موجود ہے یہ عمارت ایک (۳۴) مربع چبوترے پر واقع ہے - مغربی جانب ایک اونچی محراب ایک بڑے در کی شکل کی لداو کی ہے جس میں تین دیوار دوز چھوٹے چھوٹے طاق ہیں - اس محراب کے اندر رنگ آمیزی کا کام ہے اور ہر ہر طاق کے دونوں طرف کلمۂ طیبہ کے طغرے باقی ہیں اور مشرق کی طرف ایک سہ دری ہے - شمال کی طرف بھی ایک سہ دری تھی جس کا نصف حصہ گر گیا اور جنوب کا حصہ بالکل منہدم ہو گیا - قرینے سے یہ کوئی مسجد معلوم ہوتی ہے جو اس قدر گر گئی ہے کہ اب یہ تمیز ہونا بھی مشکل ہے کہ در اصل یہ کیا عمارت تھی -

سندروالے کا محل دہلی عرب سرائے کی شاہی سڑک کے آخری حصے میں عرب سرائے کے پاس کھیتوں کے بیچوں بیچ یہ عمارت کھڑی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ پہلے چوطرف ایک وسیع باغ تھا جس کے بیچ میں یہ محل بنایا گیا تھا اب محل کے صحن میں اور گرد و پیش زراعت ہوتی ہے - خدا جانے اتنی عمارت بھی کیسے بچ رہی - جب اس محل کے چوطرف ہل پھر گیا اور زراعت ہوتی ہے تو مویشی کہاں بندھیں گے لا محالہ اسی محل میں باندھے جاتے ہیں - اس کے کمپونڈ میں کئی پختہ کنوئیں ہیں جن سے پہلے باغ کی آبپاشی اور اب زراعت ہوتی ہے - اس محل کا اب صرف ایک ہال باقی ہے جس کے گرد چوڑی غلام گردش ہے اور چاروں طرف کمرے بنے ہوئے ہیں - ساری چھت لداؤ کی گنبد دار ہے جنوب کی طرف ایک دروازہ تہ خانے کا ہے - یہ محل اب اس قدر

گر گیا ہے کہ اصلی حالت اور نوعیت مکان کی معلوم نہیں ہو سکتی۔ علاوہ اس کے گنواروں نے جا بجا کچی دیواریں اٹھا اٹھا کر اور مسقف اور مجلی اور منقش دیواروں کو گوبر لیپ کر کے پد بخیہ ایسی چڑھا دی ہیں کہ گویا چاند کو ابر غلیظ میں چھپا دیا ہے۔ مثل سنا کرتے تھے کہ رہیں جھونپڑوں میں اور خواب دیکھیں محلوں کا یہاں اس کے برعکس ہے کہ رہیں محلوں میں اور خواب دیکھیں جھونپڑوں کا کیا محل کی تقدیر پھوٹی ہے اور کیسی مٹی پلید ہوئی ہے اور کیسی ان گنواروں کی تقدیر جاگی ہے کہ جن کو جھونپڑا میسر نہ تھی وہ آج محلوں میں براج رہے ہیں۔ یہ محل دو منزلہ تھا اس کا ایک عالی شان دروازہ بھی دہلی عرب سرائے کی قدیم شاہی سڑک پر مشرق رویہ کھڑا ہوا ڈگمگا رہا ہے اور راہ چلتوں کو اپنی عظمت شان کا کرشمہ دکھا کر کچھ نہ ہو تو چلتے چلتے تھامضرور دیتا ہے۔

ایک ویران چوکھنڈی

اسی محل کے پاس ۲۲ مربع پختہ چبوترے پر ایک چوکھنڈی بنی ہوئی ہے جس کے چاروں دروازے لوگ اکھاڑ کر لے گئے۔ بھلا ایسی عمارتوں کا جن کا سرپیر باقی نہیں کیا سُراغ مل سکتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے گنبد بے پتہ ہیں تو یہ بے چاری چوکھنڈی کس شمار قطار میں ہے۔

سُندر والے کا گنبد

دل ای حکیم دریں معبر ہلاک مھند
کہ اعتماد نکروند بر جہاں عقال

سُندر والے کے محل کے مغرب میں ایک گنبد ہے جس کا کلس گر گیا چاروں چوکھٹیں لوگ اکھاڑ لے گئے یہ گنبد ۹۳ مربع ہے اندر اور باہر سارا رنگ کا کام تھا۔ چھت لداؤ کی منقش اور نہایت آراستہ گنبد کی دیواروں میں ایسے نفیس نقش و نگار بنائے ہیں کہ چپہ چپہ بیل بوٹوں اور طرح طرح کے نقش نگار سے ایسا آراستہ ہے کہ دیکھنے کے قابل ہے۔ اس سے چاروں دروازوں پر چار کھڑکیاں ہیں۔ کتبہ بخط نسخ نہایت جلی اور واضح ذوک پلک سے درست ایسا خوش خط ہے کہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کتبہ اس قابل ہے کہ اس کا فوٹو لیا جائے کیوں کہ فی زمانا فن خوش نویسی و خطاطی معدوم ہے۔ یہ کتبہ گچ میں کھودا گیا ہے

اور چاروں طرف ہی کونوں میں وہ نزاکت دکھلائی ہو کہ ہاتھ چومنے کے قابل
ہیں ایسا معلوم دیتا ہو کہ کاغذ پر لکھ کر لگا دیا ہو کونوں میں آدھا لفظ ایک طرف
اور آدھا دوسری طرف مثلاً علیکم تو ایک طرف علیا اور دوسری طرف
کم ایسا جوڑ ملایا ہو کہ گچ پر کھودنا تو درکنار آج کوئی اس کی نقل کاغذ پر بھی
نہیں اتار سکتا۔ شمال کی طرف سے یہ کتبہ شروع ہوا ہو اور سورۂ جمعہ
مع بسم اللہ کے چاروں سمت میں پوری کر دی ہو۔ نقش و نگار کا یہ حال
ہو کہ گچ کی دیوار نہیں معلوم ہوتی موم کی ہو گی۔ یہاں کے پھولوں اور بیلوں
کے چربے شوقین اتار اتار کے لے گئے ہیں چنانچہ سیاہی لگا کر جو
چربے لیئے ہیں وہ سیاہی موجود ہو۔ کتبے میں ایک ندرت عجیب یہ ہو
کہ گچ سفید نہیں ہو بلکہ کچھ ایسا مسالا ملایا ہو کہ ملگجے رنگ کی سنہری رنگ
سے ملتی جلتی ہو گئی ہو اور دور سے ایسا معلوم ہوتا ہو کہ لکھ کر سونے کا پانی
چڑھا دیا ہو مگر درحقیقت وہ گچ کی اصلی چمک ہو۔ جب اس کی چمک کا آج یہ
حال ہو تو خدا جانے جب بنا ہو گا تو کیا کچھ روپ ہو گا۔ اس گنبد پر اوپر جانے کا
زینہ پندرہ سیڑھیوں کا ہو۔ باہر گنبد کے سرخ پٹیاں اور سرخ زمین پر سفید
سفید پھول ایسی بہار دے رہے ہیں کہ گویا پھولوں کا تختہ کھلا ہوا ہو۔ یہاں
بھی ایک کنواں ہو۔ اس گنبد کے چار طرف دروازے ایک ہی طرح کے ہیں
جنوب کی طرف کا صدر دروازہ ہو جس پر دو طرفہ کلمۂ طیبہ کا طغریٰ ہو۔
دو طاق اوپر ہیں دو نیچے ان پر دو طرفہ یا اللہ اور یا فتاح لکھا ہوا ہو محراب
۲۶ فٹ اونچی اور ۱۳ فٹ چوڑی ہو۔ جالیوں پر یا فتاح دو طرفہ لکھا ہو۔ زینہ جنوب کی
دیوار میں ہو۔ چبوترا پہلے پختہ رہا ہو گا اب تو گر گرا گیا۔ گنبد تو اس نفاست کا ہو
کہ اس پر روپیے تو روپیے اگر اشرفیاں بچھا دی جائیں تو بھی [illegible] کے مول ہو
مگر ہائے دنیا کی بے ثباتی اور فنا کہ آج اس کی قبر تک نہیں رہی ہم حیران ہیں
کہ آپ کو کیا بتلائیں کہ کس کا ہو۔ کتبے ہزارہا دہلی میں ہیں مگر اس گنبد جیسا کتبہ
اور نقش و نگار میرے دیکھنے میں تو نہ دہلی میں آئے نہ آگرہ۔ فتح پور سیکری
بیدر۔ گولکنڈہ۔ گلبرگہ اور بیجاپور میں۔ ۵

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

چوں کہ سندر کے محل کے احاطے میں ہی سندر والے کے گنبد کے نام سے مشہور رہی اس میں کچھ شک نہیں کہ اسم بامسمی سندر ہی ہی۔ سندر مرد کا نام بھی ہو سکتا ہی اور عورت کا بھی دونوں صورتوں میں یہ نام ہندوانی ہی۔ ہندوؤں کو ایسے گنبد سے کیا تعلق ہی مسلمان کا ہی خواہ وہ کسی مرد کا ہو یا عورت کا العلم عند اللہ۔

لکڑ والے کا گنبد سندر والے گنبد کے آگے اس نام کا گنبد ہی۔ اس گنبد کا کلس ٹوٹ گیا ہی۔ چبوترا منہدم ہو گیا۔ گنبد کے چو طرف کھمبے ہیں۔ گنبد درست حالت میں ہی مگر چاروں طرف کے دروازے لوگ اکھاڑ لے گئے۔ باہر سے ۳۰ مربع ہی۔ اس کے اندر ایک ٹوٹی پھوٹی قبر کے علاوہ اور پانچ قبروں کے بھی نشان ہیں۔ اندر اس کے اسی نفیس خط میں جو سندر والے گنبد کے کتبے کا ہی گنبج کے اندر نہایت خوش خط اور واضح سورۂ یوسف کا یہ رکوع۔ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ تا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ منقوش ہی۔ پارہ ۱۲۔ سورۂ یوسف رکوع ۱۴ و ۱۵۔ اس گنبد پر کوئی تاریخ نہیں ہی اس سبب سے نہیں معلوم ہو سکتا کہ کب بنا اور کس کا ہی۔ دلی کے وسیع کھنڈروں میں ایسے بہت سے گنبد ہیں جن کا کچھ حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ دروازے کی محراب پر چھ فٹ چوڑی ہی دو طرفہ طغرا سے کلمۂ طیبہ دیوار اور طاقوں پر یا اللہ دو طرفہ لکھا ہوا ہی۔ بیچ کی دو طاق نما محرابوں پر یا فتاح دو طرفہ ہی۔ گنبد کی چھت میں بھی رنگیں گلکاری کا کام بنا ہوا ہی۔ چبوترا اس کا پختہ تھا مگر گر گیا۔

ہشت پہل چوکھنڈی لکڑ والے گنبد سے کوئی (۲۵) قدم پر مشرق کی طرف کھمبٹ کے بیچ میں ایک خوش نما چوکھنڈی بنی ہوئی ہی جس کے چاروں دروازے لوگ اکھاڑ لے گئے۔ کتبہ یا قبر کچھ باقی نہیں۔ چبوترا پختہ چالیس فیٹ مربع اور ۳ فٹ اونچا ہی۔ کچھ خبر نہیں کہ کس کی ہی

نیلی چھتری یا مقبرۂ نوبت خاں
۹۷۳ھ ۱۵۶۵ء

یہ گنبد جو پرانے قلعے اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے بیچ میں واقع ہے۔ عہد اکبری کے ایک امیر نواب نوبت خاں نامی کا ہے۔ جس کو اس نے اپنی عین حیات ۹۷۳ھ ۱۵۶۵ء میں بنوایا تھا اور انتقال کے بعد اسی میں دفن ہوا۔ یہ نیلی چھتری کے نام سے اس سیئے مشہور ہے کہ اس پر کسی زمانے میں چینی کا کام تھا اور برج پر نیلا چھتر تھا جو اب بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس کا احاطہ بہت وسیع کئی بیگہ زمین میں ہے۔ چنانچہ اب تک بھی اس شکستہ احاطے کی دیوار کے نشان کہیں کہیں دکھلائی دیتے ہیں۔ مقبرے کا دروازہ البتہ اب بھی درست حالت میں ہے جو پچیس فیٹ مربع اور کنگورے سمیت چوبیس فیٹ اونچا ہے۔ گنبد کی پیشانی پر سنگ خارا کی تختی پر سنگ موسیٰ کے پچی کیئے حروف میں یہ کتبہ تھا:۔

ببیں خوش منظرے عالی مقامے　　دریں عالم ندیدہ چشم ایام
چو پرسیدم بگفتا یافت اتمام　　پی تاریخ اتمامش "مقبرۂ دار"[1]

دروازے کے پیچھے چھوٹی سی عمارت تین دروں کی ہے۔ اس عمارت کے پچھواڑے ایک ہشت پہلو چھ فٹ اونچا چبوترا ہے جس کا قطر ۹۵ ہے چبوترے کے جنوبی رخ پر آمنے سامنے دو طرفہ چھت پر چڑھنے کے دو زینے ہیں چبوترے کے شمال مشرق اور شمال مغرب کے کونوں میں دو پختہ قبریں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی بڑی چھوٹی قبروں کے نشانات ہیں۔ اس چبوترے کے چاروں کونوں پر کسی زمانے میں برج تھے جو اب گر گئے ہیں۔ اسی چبوترے پر بیچوں بیچ میں نوبت خاں کا مقبرہ ہے جو ایک ہشت پہل عمارت ہے جس کا قطر ۱ ۵ ہے اور کنگورا ملا کر کل بلندی ۴۳ ہے۔ تمام مقبرہ پتھر اور چونے کا ہے جس میں سبز۔ نیلی۔ زرد۔ نارنجی۔ رنگ برنگ کی اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ مقبرے کے اندر جا بجا کلام مجید کی آیتیں منقوش ہیں جن کا کچھ کچھ حصہ اب بھی کہیں کہیں باقی ہے۔ گنبد کے آٹھ در سات فیٹ اونچے اور پانچ فیٹ

[1] اس سے ۱۰۰۰ھ نکلتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سال بنا ۹۷۳ھ ہو اور سال اتمام ۱۰۰۰ھ۔ ۱۲۔

چوڑے ہیں۔ جن کی محرابوں پر طاق بنے ہوئے ہیں۔ گنبد کے اندر بھی سیڑھیاں
ہیں ۳۲ سیڑھیاں چڑھ کر ہم ان طاقوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور بارہ سیڑھیاں
اور چڑھو تو گنبد کی چھت پر جا پہنچو۔ گنبد کی چھت سطح ہی جس کے درمیان
ایک پانچ فیٹ اونچا ہشت پہل چبوترہ ہی جس کا قطر تیس فیٹ ہی اور پھر
اس پر ایک اور چبوترا دو فیٹ اونچا ہی جس کا قطر ۲۳ ہی۔ اس دوسرے
چبوترے پر آٹھ ستون تھے جن کا اب صرف نشان ہی نشان رہ گیا ہی اور
اسی چبوترے پر وہ نیلی چھتری تھی جس کی وجہ سے یہ گنبد نیلی چھتری کے نام
سے مشہور ہوا۔ دلی نظام الدین کی سڑک پر بائیں طرف کی یہ آخری عمارت
سڑک سے ملی ہوئی ہی اور لکڑ والے گنبد کے مغرب میں ہی اور یہیں دلی
سے تیسرا میل ہی۔ نیلی چھتری اور نیلا گنبد ایک ایسا عام لفظ ہی کہ اس نام کی کئی
عمارتیں دلی میں ہیں ایک تو وہ برج ہی جو ہمایوں کے مقبرے کے احاطے
سے ملا ہوا ہی اور نیلا برج کہلاتا ہی دوسرا گنبد جو مقبرۂ نوبت خاں سے آگے
بڑھ کر ہمایوں اور صفدر جنگ کے مقبرے دلی اور متھرا کی سڑک کے چوراہے پر
اچھی حالت میں کھڑا ہی وہ بھی نیلا برج کہلاتا ہی۔ تیسرے نیلی چھتری
نگمبودھ گھاٹ پر موجود ہی۔ غرض جس گنبد کے قبے پر نیلا کام ہوا
اس نام سے شہرت پاگیا۔ جو حالت اس مقبرے کی سرسید
مرحوم نے بیان فرمائی ہی وہ بھی اب باقی نہیں رہی۔ نہ وہ دروازہ رہا نہ کتبہ رہا۔
اس کا صدر دروازہ سڑک کی طرف نہیں ہی بلکہ شرق رویہ ہی جو بہت دن نہیں ہوئے
ڈھا ن پڑا اور اب تک ویسا ہی پڑا ہی اس کے پتھر اور چونے کے ڈھیم کے
ڈھیم دور تک پھیلے پڑے ہیں جو ٹھیکہ داروں کی دست درازی سے روز بروز
معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مال کس کا ہے کون رہا ہی۔ جب بنانے کا
بل بوتا نہیں تو اب سوائے اس کے چارہ کیا ہی کہ گرے پڑے ڈھیروں کو
صاف کیا جائے چنانچہ جب وقت خاکسار دیکھنے گیا اسی کے پتھر جو کس
محنت شوق اور صرفہ سے مثل نگینے کے جوڑے گئے تھے پھوڑے
جا رہے ہیں اور روڑی کے بہت سے بر اس دور نہیں اسی گرے ہوئے

دروازے کی چھاتی پر لگے ہوئے ہیں - اس دروازے کی بلندی ۹ فٹ ۶ انچ اور
چوڑان (؟) ہے - دروازہ لداؤ اور مسقف تھا جس کے اندر کا حجرہ ۲۰ فٹ × ۸ فٹ ۹ انچ
ہے جس کا آدھا دوم (قبہ) گر گیا ہے اور اسی کا چونا پتھر بکھرا پڑا ہے جو کچھ باقی رہ گیا ہے
وہ بھی کوئی دن جاتا ہے کہ صاف ہو جائے گا پتہ بھی نہ لگے گا کہ دروازہ کہیں تھا بھی
یا نہیں - اب مقبرے کی موجودہ حالت بھی ملاحظہ فرمایئے - یہ گنبد ہشت پہل
ہے - اندر باہر چینی کے بے نظیر کام سے آراستہ تھا چنانچہ اب بھی کام کا
بچا کھچا حصہ نمایاں ہے - چھت گر گئی اُس کے نیچے کن کن کی قبریں دب گئی
ہیں کیا معلوم سکتا ہے - اچھا ہے کہ خدا نے پردہ ڈھک دیا - اس کا وسیع اور
پختہ چبوترا ۳۹ فٹ مربع اور چھ فیٹ بلند تھا جو بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا جس پر بہت سی
پختہ قبریں ہیں - گنبد کا قطر اندر سے ۱۹ فٹ ہے - فرش اور چوکھٹیں اوپر نیچے کی
سب نذار و - بیرونی آٹھ دروں کی بلندی ۲۵ فٹ اور چوڑان ۱۱ فٹ ۸ انچ ہے - یہ گنبد
دو منزلہ ہے اوپر بھی آٹھ کھڑکی نما طاق بنے ہوئے ہیں پہلی منزل اجارے تک
کی اونچائی ۱۷ فٹ ۴ انچ ہے اور کل بلندی ۲۷ فٹ ۳ انچ - اٹھارہ سیڑھیوں کا زینہ ہے گنبد
کے اندر چینی کے کام سے کلام مجید کی سورتیں لکھی ہوئی تھیں جو سب جھڑ گئیں
اب بھی جنوب کی طرف سورۂ رحمٰن کے پہلے رکوع کا کچھ حصہ صاف پڑھا
جاتا ہے - چبوترے سے ملی ہوئی سڑک کے رخ پر ۲۸ فٹ × ۱۹ فٹ طول و عرض
اور نو فیٹ بلند ایک چھوٹی سی سہ دری بھی کھڑی ہے -

ہمایوں کا مقبرہ
۹۷۳ھ
۱۵۶۵ء

ہر کہ می خواہد کہ بیند شکلِ فردوسِ بریں
گو بیا ایں قصرِ ایں باغِ ہمایوں را ببیں

۱۱ ربیع الاول ۹۶۳ھ (۲۱ جنوری ۱۵۵۶ء) کو ہمایوں بادشاہ نے کوٹھے پر سے گر کر انتقال کیا اور اُس مقبرے میں جو شہر دہلی سے تقریباً پانچ میل جنوب کی طرف معز الدین کیقباد کے موضع کلوکھری کی حدود میں ہے دفن کیا گیا - بادشاہ کی حرم محترم حمیدہ بانو بیگم ملقب بہ مریم مکانی المعروف بہ نواب حاجی بیگم صاحبہ نے جو اکبر بادشاہ کی والدہ تھیں اپنے شوہر کا ایک بے نظیر مقبرہ تعمیر کرایا جس کی تکمیل ۹۷۳ھ ۱۵۶۵ء میں
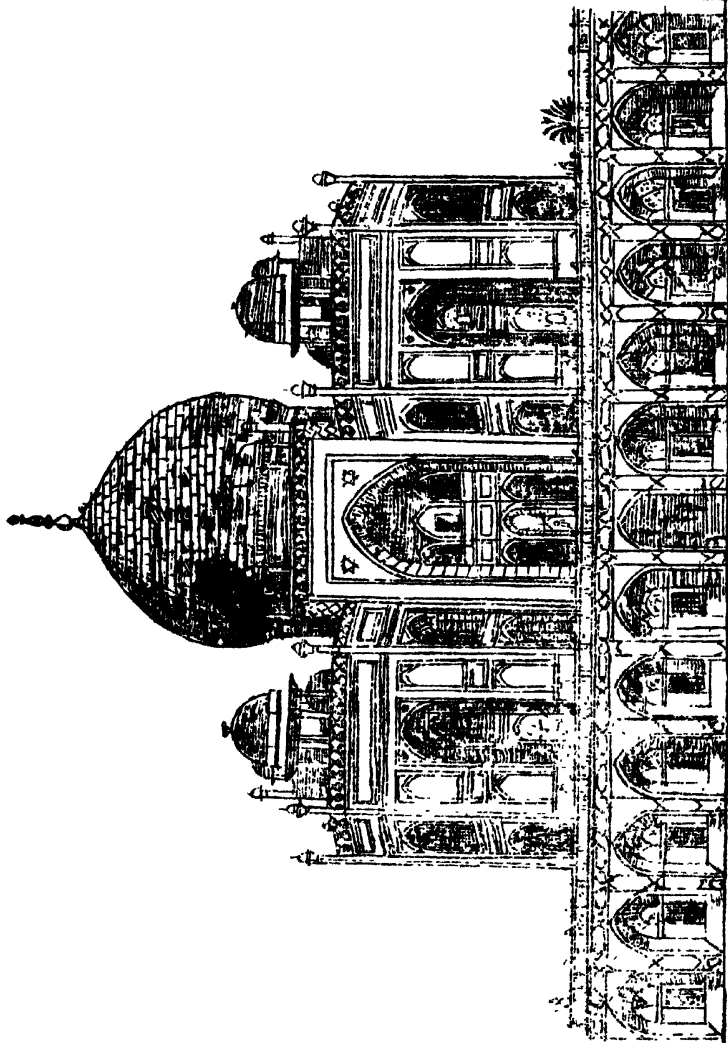
نقشہ مقبرہ ہمایون

ہوئی اور بقول بعض سنہ ۱۴ جلوس اکبری مطابق ۹۷۷ھ ۱۵۶۹ء سولھا برس میں پندرہ لاکھ کے صرفے سے جس کا بڑا حصّہ اکبر کی جیب خاص کا تھا۔ اس بہشت کے ٹکڑے کو بنایا تھا اور فردوس بریں کو زمین پر اُتارا تھا۔ گو یہ مقبرہ ہمایوں کا مقبرہ کہلاتا ہے لیکن یہ دراصل خاندان تیموریہ کی قبرستان ہے ہڈوارڈ ہے۔ اگرچہ اکبر اور اس کے تین جانشین بادشاہ دوسرے مقامات پر آسودہ ہیں مگر پھر بھی کسی مقبرے کو یہ فخر و امتیاز حاصل نہیں ہے کہ خاندان مغلیہ کے اتنے سرکاوردہ ممتاز اور نامور اراکین اُس میں مدفون ہوں جتنے کہ اس میں ہیں اس مقبرے کی عمارت ایسی خوب اور مرغوب ہے کہ روے زمین پر اپنا نظیر نہیں رکھتی سبحان اللہ اس کی رفعت کا بیان نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی لطافت اور ندرت کی شرح کی جا سکتی ہے سلاطین تیموریہ کے مقبروں میں اول یہی بنا ہے رہے اور وہ اس کی نقل ہے گو روضۂ تاج گنج میں افراط سنگ مرمر اور پرچین کاری بہت زیادہ ہے مگر فضا اور دل کشائی اور شوکت اور دل ربائی میں یہ بھی لاجواب ہے۔ تعریف اس کی در و دیوار کی فرد بالغ رس سے افزوں اور توصیف اس کے احاطے کی فراست اہل کیاست سے بیروں۔ جو کوئی اسے ایک دفعہ دیکھ لیتا ہے نقشہ اس کا دل و جان میں رکھتا ہے۔ تماشائی اُس کے نظارے سے سیر نہیں ہوتا۔ صفائی اس کے سنگ سرخ و سفید کی مانند ماہ و خورشید کے درخشاں۔ غنچۂ خاطر افسردگاں اس کے ہبوب نسائم عجیبہ سے مثل گل خنداں سنگ مرمر اور سنگ سرخ کے امتزاج سے یہ عمارت کیا بنائی ہے قدرت خدا دکھلائی ہے گویا آب و آتش کو باہم کیا ہے یا گل و یاسمن کو ایک چمن میں لگایا ہے۔ سنگ مرمر وہ لطیف کہ در شاہوار اس کے آگے بحر خجالت میں ڈوب جاتے۔ اس کی چمک اور صفائی عارض مصفاے مہوشان سیم تن کو شرماے۔ سنگ سرخ وہ نادر کم یاب اور عجوبۂ روزگار کہ گلاب کی پنکھڑیوں پر شرف لے جاے۔ سنگ مرمر کی سفیدی کی شرم سے بیاض صبح شب ظلمانی اور سنگ سرخ کی خجالت سے چہرۂ شفق زعفرانی ہو جاے برج اس کا سرتا پا سنگ مرمر کا گویا قدرت الٰہی کے دریا کا ایک موتی ہے وضع قطع اس برج کی ایسی خوب اور مرغوب ہے کہ آسمان اس کی عظمت و شان کے

مقابلے میں پانی کا ایک بلبلا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا خوش قطع۔ ایسا سڈول ایسا سانچے میں ڈھلا ہوا بُرج شاید کہیں اور ہو تو ہو۔ چوڑان۔ چکلان اونچائی اس مقبرے کی بدرجۂ غایت موزوں و مناسب ہے۔ ایسی مناسبت کسی عمارت میں نہیں پائی جاتی جیسی کہ صناعان بے نظیر نے کوٹ کوٹ کر اس میں بھری ہے۔ باوصف اس عظیم الشان اور وسیع عمارت ہونے کے ایسا نازک اور باموقع سجا سجایا معلوم دیتا ہے جیسا کہ انگوٹھی میں نگینہ۔ صحن اُس کا دل کشا اور مکانات اُس کے دل ربا۔ وضع نہایت خوب اور بغایت مرغوب۔ سُرخ سرخ پتھروں میں سفید سفید دھاریاں ایسا پر لطف منظر ہے کہ گویا دریا موجیں مار رہا ہے۔ گل بوٹے۔ رنگ برنگ کے پتھروں کی پھول پنکھڑیاں جن میں سے ہر ہر اپنے طرز میں جدا اور کاریگری میں ایک سے ایک سوا کچھ عجب تماشا ہے قدرت الٰہی نظر آتا ہے کہ دیکھنے والا محو حیرت ہو جاتا ہے۔ کسی زمانے میں یہاں کے باغ کا چپہ چپہ آراستہ تھا۔ چاروں طرف نہریں جاری تھیں۔ جا بجا حوض بنے ہوئے تھے۔ پانی لہراتا تھا۔ فوارے چھوٹتے تھے سرو کے درخت نہایت موقع موقع سے سرو قد کھڑے تھے۔ طرح طرح کے پھول کھل رہے تھے بلبلیں چہچہاتی تھیں اور اس کی خوبیاں جنت کی یاد دلاتی تھیں۔ قلم میں کیا طاقت ہے جو اس کا نقشہ اُتار سکے یا ایک شمہ اس کی تعریف بیان کر سکے۔ اُس کی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ باوجودیکہ اب وہ بہار نہیں۔ باغ و اشجار و روش و انہار نہیں۔ گلوں کی جگہ خار ہیں اور روشوں کی جگہ جگہ خس و خاشاک۔ مگر پھر بھی دلی کے نواح میں اس سے بہتر اور اس سے زیادہ دل کش کوئی تفریح گاہ نہیں۔ جس کی عمارات موجب نزہت قلوب اہل دلاں اور لطافت مکانات راحت خاطر دانش وراں ہے اب بھی لوگ کثرت سے سیر تماشے کو آتے ہیں اور کسی طرح اس کی سیر سے دل سیر نہیں ہوتا بار بار دیکھتے ہیں مگر پھر بھی جب دیکھو لطف تازہ اور سرور بے اندازہ ملتا ہے۔ ہمایوں کی قبر کے پاس اُن کی زوجہ محترمہ نواب حاجی بیگم صاحبہ کا مزار ہے جو ہمایوں کی بڑی ہمدم اور رفیق اور اُس کے تمام مصائب و آلام کی ہم درد و رفیق اور سفر و حضر کی شریک حال تھیں۔ یہیں شاہجہاں کے نہایت لایق اور بہادر مگر بدنصیب

فرزند اکبر دارا شکوہ کا جسد بے سر دفن ہی۔ جس نے اورنگ زیب سے شکست پائی اور اسی مقبرے کے قریب اُس کا سر کاٹا گیا۔ اگرچہ عمارت مقبرے کی بدستور قایم ہی صرف کہیں کہیں سے جالیاں ٹوٹ ٹاٹ گئی ہیں کہیں فرش جابجا سے اکھڑ اکھڑ ملا گیا ہی لیکن باغ بالکل ویران ہو گیا اور وہ سرو کے درخت جو قد معشوق پر طعنہ مارتے تھے اور وہ گل جو لب زندگی بخش کو جبینوں کی تشنیع کرتے تھے نام کو بھی نہ رہے۔ نہریں ٹوٹ گئیں حوض بند ہو گئے۔ آبشاروں کا نام نہ رہا مگر اب بھی کچھ کچھ نشان پچھلی چہل پہل کو یاد دلانے اور نمک برجراحت چھڑکنے کو موجود ہیں۔ شمال کی طرف چادر گرنے کا مکان اور حوض اور نہروں کے فواروں کا خزانہ بنا ہوا ہی جو اپنی تشنہ دہانی پر آٹھ آٹھ آنسو روتا ہی اور آنسوؤں سے منہ دھوتا ہی۔ یوں تو بہت سے ویسرائے آئے اور چلے چلے گئے مگر لارڈ کرزن نے وہ کر دکھایا جو کسی کے خواب خیال میں بھی نہ تھا۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

اُس نے قالب مردہ میں جان ڈال دی۔ فی الحقیقت وہ اپنے وقت کا مسیحا تھا اُجڑی ہوئی ویران عمارتوں کو جو زمانے کے ظالم ہاتھوں سے فنا ہو رہی تھیں سنبھال لیا۔ اُن کے بانیوں کی دلی دعاؤں کے علاوہ ہندوستان کی مری اور مٹی نشانیوں کو از سر نو تازہ کیا۔ ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ مختصر یہ کہ ہمایوں کا مقبرہ بھی اُسی نیک نہاد ویسرائے کے دردمند دل کی بدولت از سر نو زندہ ہو گیا اس کے قالب مردہ میں تازہ روح پھونک دی اب جدھر دیکھیے سبزہ زار ہی۔ لاویں چل رہی ہیں نہریں دوڑ رہی ہیں جو درخت کٹنے سے بچ رہے تھے اُن کی جان بچ گئی تازہ درخت لگائے جا رہے ہیں ہری ہری دوب کے تختے کے تختے فرش زمردین کی طرح بچھے ہوے پژمردہ دل اور افسردہ خاطر کو فرحت انبساط بے اندازہ دیتے ہیں۔ خس و خاشاک سے میدان پاک صاف ہی نالیوں میں پانی دوڑ رہا ہی۔ حوض لبریز ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ہاں یہ مقام مرقت (ابا بیلوں) اور اُلوؤں کی مِلک نہیں ہی بلکہ اس کا کوئی مالک ہی اور وہ مالک بھی باخبر جس کی بدولت آج یہاں مردنی چھانے کی بجائے آثار زندگی نمود بالیدگی و سرسبزی

رشادابی نمایاں ہیں۔ گو وہ بہار نہ سہی جو کبھی پہلے تھی مگر اس ویرانے کے مقابلے میں تو یہ بھی بسا غنیمت ہے۔ اورنگ زیب کا من چلا مگر نا عاقبت اندیش فرزند محمد اعظم شاہ جو آگرے میں اپنے بھائی سے جنگ کرنے میں مارا گیا۔ اورنگ زیب کا پوتا جہاندار شاہ۔ فرخ سیر جس کو اس کے وزیر اعظم نے زہر دیا تھا۔ شمس الدین ابو البرکات نوجوان عنفوان شباب کے دو گل ہائے نایاب رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ جو باری باری سے صرف تین تین مہینے تک دہلی کے تخت پر رونق افروز رہے اور سب سے آخر عالمگیر ثانی جو اپنے وزیر اعظم عماد الملک کی اشتعالک سے مارا گیا۔ علاوہ ان کے دوسرے شاہزادے اور شاہزادیاں اور بیگمات اور ان کے حوالی موالی جن کے نام نامی اور اسمائے گرامی سے کتب تاریخ منور ہیں سب کے سب اپنے نامدار آقاؤں کے ساتھ ملے جلے میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ اللہ اللہ کیا کیا لوگ تھے کہ جب تک جیئے رفاقت کا دم بھرتے رہے اور جب مر گئے تو بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی مقبرے میں مغلیہ خاندان کے آخری شاہنشاہ ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غفر اللہ نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں قلعہ چھوڑ کر پناہ لی تھی اور یہیں سے ان کو گورنمنٹ برطانیہ نے گرفتار کر کے رنگون کو جلا وطن کیا یہی وہ عبرتناک مقام اور غمناک خطہ ہے جہاں بادشاہ کے نور نظر اور لخت جگر شاہزادگان مرزا مغل۔ مرزا خضر سلطان اور مرزا ابو بکر کے سر کاٹ لیئے گئے۔ جمنا کے کنارے ایک بہت بڑے احاطے کے اندر یہ مقبرہ واقع ہے جس میں داخل ہونے کے دو عظیم الشان سر بفلک گنبد دار دروازے ایک مغرب میں دوسرا جنوب میں ایسے پرشان اور نفیس بنائے ہیں کہ جن سے مقبرے کی عالیشان عمارت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ مغربی دروازے میں بہت اچھے اچھے مختصر مکانات بنے ہوئے ہیں کہ لطافت اور دلکشائی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ دروازے میں ہر مکان میں جانے کا جدا جدا رستہ ہے اور خوبصورت سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جنوبی دروازے میں اگرچہ مکانات نہیں ہیں لیکن دروازے کے گرد دروں کے بننے اور چبوترے کے ہونے سے عجب نمودار شان نکل آئی ہے۔ یہ دروازے بھی گویا بہشت کے دروازے ہیں اور سنگ سرخ رخام کے بنے ہوئے ہیں لیکن سنگ رخام ایسا خوش رنگ دودھیا

دروازہ غربی مقبرہ ہمایون
دروازہ جنوبی مقبرہ ہمایون
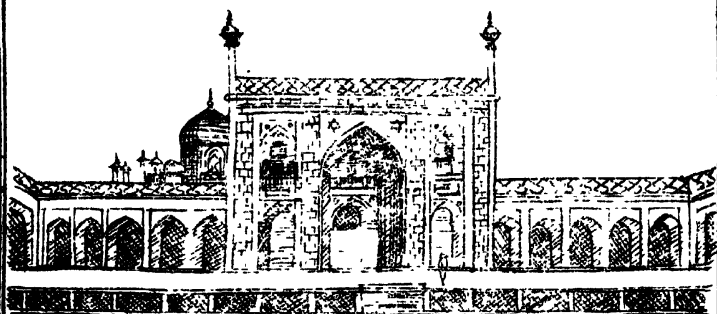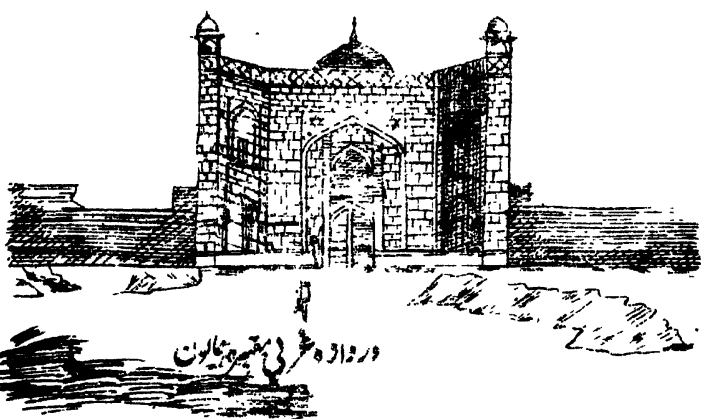
لگایا ہے کہ دور سے بعینہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سنگ سرخ میں سنگ مرمر لگا ہوا ہے فصیل
اس مقبرے کی چونے اور پتھر سے بنی ہوئی ہے۔ اور فصیل کے دیوار پر پانی بہنے کا
برہہ بنا ہوا ہے۔ ان دروازوں کی لطافت اور نزاکت کی شان جاکر قدرت الٰہی کا
تماشہ دیکھیے۔ احاطے کی مشرقی دیوار کے وسط میں پست اور مسطح چھت کا ایک دالان ہے
جس میں آٹھ در اور ایک دروازہ دریا کے رخ پر ہے۔ شمالی طرف کی دیوار کے بیچ میں
سات فیٹ اونچے چبوترے پر ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہوئی ہے جس کے بیچ
میں ایک محراب دار کمرہ ہے جس میں ایک بڑے برج نما کنوئیں سے جو دیوار کے
پیچھے ہی ہے پانی لاکر نہروں میں دوڑایا جاتا تھا جن کے ذریعے سے باغات کی آبپاشی
کی جاتی تھی۔ ۱۸۲۵ء میں بشپ ہیبر (Bishop Heber) نے اس مقبرے کو
دیکھ کر لکھا ہے کہ "اُس وقت تک ایک نہر چالو تھی جس سے رعایا کچھ گیہوں کی کاشت کرتی
تھی"۔ دونوں دروازوں کی دونوں جانب اور شرق رویہ دیوار کے نصف حصے
میں محراب دار حجرے اونچی کرسی دے کر بنائے گئے ہیں لیکن وہ اس قابل
نہیں ہیں اور نہ اتنے کشادہ ہیں کہ کوئی اُن میں مستقلاً رہ سکے۔ دروازے سنگ خارا
کے بنے ہوئے ہیں جن میں سنگ سرخ کے بیل بوٹے اور پٹیاں ہیں اور
جا بجا سنگ مرمر بھی لگایا گیا ہے۔ جنوبی دروازے کو ریسٹ ہوس (دارالاقامہ) بنایا
گیا ہے۔ جو لوگ مقبرے کی سیر کو آتے ہیں وہ اسی میں ٹھیرتے اور آرام پاتے ہیں۔
باغ کے بیچوں بیچ ایک سنگ بست چبوترا پانچ فیٹ اونچا اور سو گز مربع
ہے جس کے کونے تراش کر گول کر دیئے گئے ہیں۔ اس چبوترے کے کنارے
سے ۲۳ پر ایک پٹا ہوا چبوترا بیس فیٹ اونچا اور پچاسی فیٹ مربع ہے اس کے
کونے بھی گول بنائے گئے ہیں۔ اس پٹے ہوئے چبوترے کے چاروں
چھوٹے اضلاع پر ایک ایک محراب دار دروازہ ہے جن میں سے اُن کوٹھڑیوں
میں جانے کا رستہ ہے جن میں کہ قبریں ہیں۔ اسی چبوترے کے چاروں
لمبے اضلاع میں سترہ سترہ در ہیں۔ ذیں در میں جو بیچ میں ہے ایک زینہ ہے جو اس چبوترے پر
جاکر نکلتا ہے۔ پہلے اور دوسرے دونوں چبوتروں پر چوکوں کا فرش ہے۔ اوپر کے
چبوترے کی چاروں طرف سنگ سرخ کی جالیوں کا کٹہرا تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے

غدر میں دریا کی طرف کے کٹہرے کو باغیوں نے توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔ اس چبوترے کے نیچے جو حجرے ہیں ان سب کے دروازے محراب دار ہیں جن میں جا بجا سنگ مرمر کی سلیں اور پٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ اوپر والے شان دار چبوترے کے تہ خانے کے بیچ میں ہمایوں بادشاہ اُن کی بیگم صاحبہ۔ شبیر خوار شاہزادی اور دیگر ممبران خاندان و متوسلان شاہی کی اصل قبریں ہیں اور چبوترے کے اوپر قبروں کے تعویذ بنائے گئے ہیں جن میں سب سے زیادہ ممیز و ممتاز تو ہمایوں بادشاہ اور بیگم صاحبہ کی قبر ہے باقی قبریں بادشاہ کی آل اولاد اور اُن بادشاہوں کی ہیں جو سلسلہ بہ سلسلہ تخت نشین ہوئے یا یہ کہ خاندان شاہی سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور مرشد زادے یا صاحب زادے کہلاتے تھے۔ ان قبروں میں سے بعض گنبد کے اندر ہیں بعض چبوترے پر زیر سما۔ جو قبور گنبد کے نیچے ہیں اُن کے تعویذ بہترین سنگ مرمر کے نہایت شفاف خوب صورت اور نازک اور قابل دید بیل بوٹوں اور نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ قیاس مقتضی ہے کہ دور اکبری کے بعد سے ہمایوں کی قبر کے پاس یعنی گنبد کے اندر اور کوئی شخص دفن نہیں کیا گیا۔ گنبد کا درمیانی کمرہ (۵۴) گز مربع اور سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے جس کی دیواروں میں سنگ مرمر کی سلیں لگی ہوئی ہیں۔ جنرل کننگھم صاحب لکھتے ہیں کہ "مقبرے کی اصلی عمارت کا بیرونی حصہ مربع ہے جس کے چاروں کونے مدور ہیں جو ایک ہشت پہل سطح پر بنا ہوا گیا ہے جس کے چار ضلعے بڑے اور چار چھوٹے ہیں اور ہر چھوٹے ضلع سے ایک برج اُن ہشت پہلو کمروں کا بن گیا ہے جو مقبرے کے کونوں پر ہیں۔ چنانچہ مقبرے کے سطحی نقشے کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقبرے کے چاروں کونوں میں اصل عمارت کے ساتھ چار کمرے اور منتشر او پیئے گئے ہیں۔ دوسری جدت اس مقبرے میں خاص توجہ کے قابل اس کے گنبد کی نئی وضع پتلے گردنے کی ہے اور یہ طرز کچھ ایسا پسندیدہ ہوا کہ پھر تو سلاطین مغلیہ کی تمام عمارتوں میں یہی وضع قطع اختیار کی گئی" مسٹر بگلر اس گنبد کے متعلق لکھتے ہیں کہ "گنبد کی بیرونی ساخت ایک خاص خصوصیت رکھتی ہے مگر کچھ خوش نما نہیں۔ اس کی شکل مخروطی نوکدار ہے جس کا گردنا خود اس کے

ھرسے کم ہے۔ جس سے ایسا معلوم دیتا ہے کہ گویا کسی نے گلا گھونٹ دیا۔" کپتان
ز جر نے لکھا ہے کہ "یہ گنبد سینٹ پال کے مشہور گرجا کے گنبد کا تین چوتھائی
ہے۔" اصلی مقبرہ ایک بلند مربع گنبد ہے جس کے شان دار سنگ مرمر کے قبے پر
ایک چبوترے پر سے سنہری کلس جھمار ہا ہے۔ گنبد کی بلندی (۱۰۳م) ہے چبوترے
کے چاروں کونے اس لیئے مدور کر دیئے گئے ہیں تاکہ چاروں لمبے اور چاروں چھوٹے اضلاع
میں ایک ایک ہشت پہلو کمرے کی گنجایش نکل سکے ان حجروں کی درمیانی
محرابیں پچاس پچاس فیٹ اونچی ہیں۔ فرنیکلن صاحب لکھتے ہیں کہ ان
محرابوں پر چودہ فیٹ اونچی دیوار اس اسطوانے کے تھم کو چھپانے کے لیئے بنائی
گئی ہے جس پر قبے کا سارا بوجھ ہے۔ چار چھوٹے ضلعوں کے رخ پر جو پٹاؤ کرکے
کمرے نکالے ہیں وہاں دہرا سلسلہ محرابوں کا بنا کر چوٹی تک بلند کر دیا ہے۔
یہاں اور تنگ دیوار اٹھا دی جاتی تو ایک قسم کی بدنمائی ہو جاتی اس لیئے ہر کونے
ایک ایک چھوٹی برجی بنا دی گئی ہے۔ عمارت کی شمالی محراب میں سے سنگ مرمر
کے اس اصلی حجرے میں جانے کا رستہ ہے جس کے اندر ہمایوں بادشاہ کی
قبر ہے۔" کونوں کی کمریاں دو منزلہ ہیں۔ ان کمریوں اور بیچ کے حجرے کی
بالائی منزل کے اطراف ایک تنگ گیلری (غلام گردش) ہے اور اسی کی مناسبت
سے نیچے کے حصے میں بھی رستے بنے ہوئے ہیں۔ بیچ کے کمرے
میں اوپر تلے دو سلسلے کھڑکیوں کے ہیں۔ اوپر والی کھڑکیاں نچلی کھڑکیوں
سے کچھ چھوٹی ہیں۔ فرنیکلن صاحب لکھتے ہیں "اس حجرے کی چار
بڑی کھڑکیوں کی بلندی بیس فیٹ ہے اور اسی کے اوپر وار کی کھڑکیاں (۱۶)
فیٹ اونچی ہیں جن کے بیچ میں ایک چوڑا کمرہ نکل آیا ہے۔ کھڑکیوں کی دوسری
قطار میں بھی ایک کمرہ اور ایک چوکون کھڑکی نکالی گئی ہے جس میں سنگ
مرمر کی نفیس جالی لگی ہوئی ہے چھت لداوی بیضوی شکل کی ہے جس کے بیچ میں
سنگ مرمر کے ۲×۶ فٹ ٹکڑے کا قبہ ہے۔ یہاں کا فرش اور دیواریں چھ
چھ فیٹ تک سنگ مرمر کی ہیں۔ دروازوں کی کھڑکیوں میں سنگ مرمر کی
جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ بڑی دیوار اور محرابوں کا عمق چودہ فیٹ کا ہے۔

گنبد کے اندر مختلف قسم کے سنگ مرمر کا فرش ہے۔ گنبد کے اندرونی رخ پر
کسی زمانے میں سنہری اور چینی کے کام کا تھا۔ گنبد کے بیچوں بیچ ایک سنہری
پھندنا لٹک رہا ہے جس کو جاٹوں نے بندوقوں سے مار مار کے اُڑا دیا
چنانچہ اب بھی بعض بعض جگہ گولیوں کی زد کے نشانات دکھلائی دیتے
ہیں۔" ہمایوں کی قبر کا تعویذ سنگ مرمر کے نہایت شفاف چمکدار چھ انچہ اونچے
چبوترے پر ہے۔ چبوترے پر سنگ موسیٰ کی پٹیاں پاس پاس پڑی ہیں۔ اس
تمام کمرے میں سنگ مرمر کا فرش ہے۔ فرنیکلن صاحب لکھتے ہیں کہ "آمنے
سامنے کے کمرے ہشت پہلو اکیس فیٹ قطر کے ہیں جن کی لداؤ کی چھت
چالیس فیٹ بلند ہے۔ بیچ کے چار کمرے ۲۰×۲۰ فٹ ہیں اور بیچ کے آٹھوں
دو منزلہ کمروں میں بھی سنگ مرمر کا فرش ہے جن کا عرض و طول بھی وہی ہے جو اوپر
لکھا گیا ہے۔ نیچے والے جنوب شمال اور جنوب مغرب کے رخ کے کمروں
میں ایک ہی ایک دروازہ ہے لیکن ایک کمرے سے دوسرے میں جانے کا
رستہ موجود ہے۔ بجز بیچ والے بڑے کمرے کے کہ اُس میں
سے سوائے ایک محراب دار دروازے کے اور کوئی رستہ نہیں ہے کونے
کے کمروں کے بالمقابل کے دروازے بیرونی دیواروں میں ہیں۔ کونوں
کے اور اُن کمروں کے جن میں سے گزر کر بیچ کے کمرے میں جاتے
ہیں سنگ مرمر کے فرش ہیں۔ جس میں سنگ سرخ کی پٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔
کونے والے کمروں میں کوٹھے اور غلام گردش اور دو منزلہ کونوں کے
کمروں میں جانے کے زینے ہیں۔ سنگ مرمر کا قبہ پچیس فیٹ اونچے
اسطوانے پر ایستادہ ہے۔ جس میں فری میسنوں کے طبقۂ رایل آرچ کی
طرح کا دوہرا مثلث بنا ہوا ہے اور بیچ میں سنگ موسیٰ کے گلدستے بنے ہوئے
ہیں۔ چھت کے ہر کونے پر ایک پختہ برجی ہے جس کے آٹھ آٹھ ستون ہیں۔
ان برجیوں کے بیچ میں نیچے کے حصے کی محراب کی چوڑان کے بقدر چھوٹے
چھوٹے ہال ہیں جن کے سامنے چار چار ستون چھت کو سہارا لگائے ہوئے
ہیں۔ مشرقی اور مغربی ہالوں کے دونوں طرف ایک ایک چھوٹا کمرہ ہے جن کے

سامنے تنگ برآمدے نہایت خوب صورت اور منقش ستونوں پر ایستادہ ہیں ہر ہال کی چھت پر کنارے سے ذرا علحدہ دو چھوٹی چھوٹی برجیاں چار چار ستونوں پر کھڑی ہوئی ہیں۔ سامنے کے کونوں پر چھ فیٹ اونچی مینار یں ہیں چھت کے آٹھوں کونوں پر بھی آٹھ مناریں ہیں۔ گنبد کی چھت پر کسی زمانے میں ایک بڑا دارالعلم تھا جس کے اساتذہ بڑے بڑے علما سے متبحر اور فاضل اجل اور صاحب اقتدار تھے۔ لیکن وہ زمانہ گیا اور وہ شہرت جو اس دارالعلم کی تھی نسیاً منسیاً ہو گئی اب کوئی دو سو برس ہونے آئے کہ وہ حجرے جو اساتذہ اور طلبا سے بھرے ہوئے تھے خالی پڑے بھائیں بھائیں کر رہے ہیں۔ بلاکمین صاحب لکھتے ہیں کہ "اس مدرسے کے متولی شیخ حسین اور مولنا نورالدین ترخاں تھے"۔ مقبرے کے بالائی حصے میں بھول بھلیاں بھی ہے جس میں آدمی جا کر الجھ جاتا ہے اور اترنے کا رستہ نہیں ملتا۔ چنانچہ ایک دفعہ دلی کے قلعے کے دو تین گورے (سولجر) اس میں جا کر پھنس گئے تھے جو کئی دن سرگرداں رہنے کے بعد بمشکل نکلے۔ یہ بھی سنایا گیا ہے کہ حاجی بیگم صاحبہ نے مکۂ معظمہ سے واپس آنے کے بعد خود اس مقبرے کو اپنی سپردگی میں لیا تھا اور ان کی وفات کے بعد شمال و مغربی گوشے میں جہاں ان کی شیر خوار بچی مدفون تھی خود بھی دفن ہوئیں۔ اصل مقبرے میں صرف تین قبریں ہیں اور جنوب و مغرب کے حجرے میں تین اور شمال و مشرق اور جنوب و مغرب کے حجروں میں دو دو قبریں ہیں ان سب قبروں کے تعویذ سنگ مرمر کے ہیں۔ مقبرے کے مغرب جانب چبوترے پر گیارہ قبریں ہیں جن میں سے پانچ کے تعویذ تو سنگ مرمر کے ہیں اور باقی چونے اور گچ کی ہیں۔ چبوترے کی دوسری جانب صرف ایک ہی قبر ہے جس پر "دُرِّ سنگی بیگم زوجہ عالمگیر ثانی سنہ ۱۱۸۱ھ" کندہ ہے۔ جن قبروں پر کچھ نام نہیں ہے تو ان پر صرف کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ کندہ ہے۔ ہم نے ہر چند کوشش کی کہ دریافت کریں کہ یہ قبریں کن کن کی ہیں لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔ خدام درگاہ حضرت نظام الدین اولیا رح جو بطور گیڈ کے ساتھ رہتے ہیں وہ الٹ پلٹ کچھ نہ کچھ نام بتلا دیتے ہیں

جن کا کچھ بھروسہ نہیں - مقبرے کی شمالی جانب سیڑھیوں کے پاس والی قبر لوگ بالعموم دارا شکوہ کی تبلاتے ہیں اور اسی طرف اسی سلسلے میں معز الدین جہاندار شاہ[1] اور عالمگیر ثانی کی قبریں بھی ہیں - ۵

اگر پردہ برگیری از روی خاک ۔ روی تا بہ ہفتم زمیں در مغاک

ہمہ فرقِ شاہانِ سرکش بود ۔ رخ نو عروسانِ مہوش بود

سراپاے گیتی ہمہ عبرت است ۔ پس و پیش او حیرت و حسرت است

---

[1] ہمایوں کے مقبرے کا بالائی چبوترا جس پر چوکے بچھے ہوئے ہیں ۸ انچ ۱۳۰ × ۱۳۰ ہی جس پر ۱ فٹ ۱۰ انچ اونچی سنگ باسی کی جالیاں بطور کٹہرے کی لگی ہوئی ہیں - نیچے کا چبوترا ۳۲۳ فٹ ۸ انچ لمبا اور ۳۲ فٹ ۹ انچ ہر طرف چوڑا اور ۶ فٹ اونچا ہے - اوپر کے چبوترے سے نیچے کا چبوترا ۲۲ فٹ نیچا ہے جس میں (۲۸) سیڑھیاں ہیں اور دوسرے چبوترے کی (۵) سیڑھیاں ہیں چبوترے میں چاروں طرف ایک ایک دروازہ اور آٹھ آٹھ در ہیں - چاروں طرف کے در ملا کر کل (۴۸) در ہیں اور ہر در میں قبریں ہی قبریں ہیں - ہمایوں کی قبر کا تعویذ بالکل سادہ نہایت چمکدار سنگ مرمر کا ہے - کوئی کتبہ نہیں ہے - قبر کے گرد سنگ مرمر کا چبوترہ ۱۰ فٹ لمبا ۷ فٹ چوڑا اور ۲ فٹ اونچا سنگ مرمر کا ہے - اس پر پچی کاری کا کام ہے - یہ حجرہ جس میں ہمایوں کی قبر ہے ۴۱ فٹ مربع ہے - اس حجرے میں صرف ایک ہی قبر ہمایوں بادشاہ کی ہے - اندرون مقبرہ جنوب کی طرف کے ہشت پہل کمرے میں سنگ مرمر کے تعویذ کی تین قبریں ہیں کہتے ہیں کہ یہ تینوں ہمایوں کی ناکدخدا لڑکیاں تھیں - ان سب قبروں پر کل من علیہا فان اور گرد آیۃ الکرسی منقوش ہے - اسی قسم کی شمال کی طرف کے حجرے میں سنگ مرمر کی دو قبریں ہیں جو عالمگیر ثانی اور ان کی بیوی کی ہیں - عالم گیر ثانی کی قبر کو آگ جلا کر سیاہ کر دیا - زنانی قبر پہ کل من علیہا فان - کلمۂ طیبہ اور آیۃ الکرسی منقوش ہے - چبوترے کے اوپر کل چوبیس اور گرد کے حجروں میں ڈیڑھ سو قبریں ہیں یہ سب خاندان شاہی اور امرا کی قبور ہیں - مغرب رخ کے چبوترے پر اس سلسلے سے قبور ہیں - (۱) سنگ مرمر کی قبر نامعلوم (۲) دارا شکوہ کی قبر سنگ مرمر کی جس کے تعویذ پر کل من علیہا فان اور گرد وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ (پارہ ۴ - سورۂ آل عمران - ۱۷ع - وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ تا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ - پارہ ۲ - سورۂ بقرہ - ۱۹ع - (۳) سنگ مرمر کلمۂ شہادت اور گرد آیۃ الکرسی - تاریخ رشید المرحوم محمد سلطان بن روشن کوکہ - ۹۷۸

(۴ و ۵) سنگ مرمر بلا کتبہ - (۶ و ۷) چونے گچی کی قبریں بلا کتبہ محاذی قبور نمبر ۴ و ۵ - اور یہیں اوپر چار ایک ہی لین میں برابر پانچ قبریں چونے گچی کی ہیں جو ان پانچ راجوں کی کہی جاتی ہیں جو یہ مقبرہ بنانے تھے اور ایک قبر گچ کی مشرق کی طرف بھی ہے -

نقشۂ مقبرہ اندرون احاطہ

سقے یا حجام کا مقبرہ

ہمایوں کے مقبرے سے متعلق ایک وسیع باغ ہے جس کے جنوب مشرق کے کونے میں ایک چھوٹا سا گنبد بنا ہوا ہے جس کا ٹھیک طور پر پتہ نہیں چلتا کہ کس کا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہمایوں کے بھائی شاہ کامران کا ہے کوئی سقے[1] کا مقبرہ بتلاتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں غرض کوئی ٹھکانے کی بات نہیں کہتا۔ البتہ سر سید نے اس کا سال تعمیر سنہ ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۸ء بتلایا ہے لیکن اس کا ماخذ معلوم نہیں ہوتا۔ اس مقبرے کا چبوترا ۸۶ فیٹ مربع اور آٹھ فیٹ اونچا ہے جس پر سنگ سرخ کے چوکے بچھے ہوئے ہیں اور آٹھ سیڑھیاں ہیں۔ مقبرہ چالیس فیٹ مربع اور چبوترا چھوڑ کر ۲۶ فیٹ اونچا ہے چھت پر چڑھنے کا کوئی زینہ نہیں۔ گنبد اندر سے ۲۴ فیٹ مربع ہے جس کی دیواروں کے اندرونی رخ پر سنگ سرخ کی سلیں لگی ہوئی ہیں۔ گنبد میں جانے کا ایک ہی دروازہ چبوترے کی سیڑھیوں کے سامنے جنوب رخ پر ہے۔ گنبد کے چاروں طرف گہری دیوار دوز محرابیں ہیں۔ جنوبی محراب میں آٹھ فیٹ اونچا اور پانچ فیٹ چوڑا دروازہ ہے۔ باقی تینوں طرف محرابوں میں سنگ سرخ کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ بڑی دیوار دوز محراب کے دونوں جانب دو طاق ایک کے اوپر ایک بنے ہوئے ہیں۔ صدر دروازے اور ہر سہ جانب کی محرابوں کے اوپر محراب دار کھڑکیاں ہیں۔ اس مقبرے میں دو قبریں ہیں جن پر آیات قرآنی کندہ ہیں۔ ایک قبر کا تعویذ سات فیٹ لمبا ۲ ½ فیٹ چوڑا اور پندرہ انچ اونچا ہے۔ دوسرا تعویذ چھ فیٹ لمبا ڈھائی فیٹ چوڑا اور کوئی ڈیڑھ فیٹ اونچا ہے

[1] اس گنبد کو میں نے بھی جا کر دیکھا۔ یہاں کے لوگ اسے حجام کا مقبرہ بتلاتے ہیں۔ اندر فرش چوکوں کا ہے جو حال کا بچھایا ہوا معلوم دیتا ہے اور چوبی کواڑ بھی نئے چڑھائے گئے ہیں۔ اس کے اندر جو دو قبریں ہیں داہنی طرف زنانی قبر ہے اور بائیں طرف مردانی۔ دونوں کے تعویذ سنگ مرمر کے ہیں۔ زنانی قبر کے تعویذ پر کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ اور گرداگرد آیۃ الکرسی ہے۔ نام کسی کا ہے نہیں لوگ کہتے ہیں اور قرینہ بھی اسی پر دال ہے کہ میاں بیوی کی قبریں ہیں۔ اندر دار جالیوں کے اوپر دونوں جانب کلمۂ طیبہ اور مغرب کی طرف کی جالی پر یا فتاح دو طرفہ لکھا ہوا ہے۔ ۱۲

گنبد کی چھت کے چاروں کونوں پر چار برجیاں آٹھ آٹھ فیٹ اونچی چار چار ستونوں کی ہیں۔ برجیوں میں پہلے مینا کاری کا کام تھا چنانچہ اب تک اس کا کچھ حصہ جا بجا باقی ہے گنبد کا قبہ سولہ ضلعوں کے اسطوانے پر بنایا گیا ہے جس کے کونوں پر چھوٹی چھوٹی میناریں ہیں۔ گنبد سنگ خارا اور سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے۔ جس پر سنگ مرمر کی دھاریاں پڑی ہوئی ہیں۔

عرب سرا کی مسجد اور مقبرہ

یہ مسجد اور مقبرہ دونوں ایک پختہ احاطے کے اندر ہمایوں کے مقبرے سے بالکل قریب جنوب کی طرف ہیں جس کا ذکر نہ سرسید نے کیا نہ کسی اور نے۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ پتہ چلے کہ ان دونوں عمارتوں کا بانی کون ہے مگر ٹھکانے کی کوئی بات کسی سے معلوم نہ ہوئی۔ گنبد کو کوئی عرب والا گنبد کہتا ہے اور کوئی شیخ گامی کا اور کوئی مسجد کے متعلق حمام بتلاتا ہے مگر وضع قطع حمام کی نہیں ہے اور قبروں کی موجودگی بھی اس قول کو غلط ثابت کرتی ہے۔ مسجد عرب سرا کی مسجد کہلاتی ہے۔ پہلے گنبد کو ملاحظہ فرمائیے جو مسجد سے ملا ہوا جنوب رخ پر ہے۔ یہ گنبد پختہ اور ہشت پہل اور دہرا ہے جس کے اوپنچے اوپنچے چار در کھلے ہوئے ہیں۔ اندر چار قبریں داہنے سے بائیں طرف اس طرح ہیں:۔ (۱) کچی قبر حال کی۔ ۲۔ ۳ سنگ مرمر کی قبریں۔ چوتھی قبر سنگ باسی کی جو بہت پرانی ہونے سے تعویذ پر اور گرد جو آیات منقوش تھیں سب مٹ گئیں۔ نمبر ۲ سنگ مرمر کی قبر پر کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ اور اطراف آیۃ الکرسی ہے۔ نمبر ۳ بالکل سادی ہے۔ گنبد کے اندر اوپر وار آٹھ طاق ہیں۔ فرش باقی نہیں رہا ہے۔ مغرب کی جانب (۲۲) سیڑھیوں کا ایک زینہ ہے۔ مسجد تین در کی ہے۔ ممبر آٹھ سیڑھیوں کا تھا جس میں سے اب صرف نیچے ایک سیڑھی باقی ہے اور سب ٹوٹ کر چونے کا ایک ڈھیر رہ گیا ہے۔ یہ ممبر سنگ سرخ کا تھا جس کے بائیں طرف دو جگہ اللہ کندہ ہے۔ اندر کے پیش طاق پر یا بدوح کا طغریٰ دو طرفہ ہے اور سب سے اوپر دو طرفہ طغرا سے کلمۂ طیبہ ادھر ادھر داہنے بائیں طرف کی محرابوں پر یا فتاح کا طغریٰ ہے۔ اندر کا اور باہر کا پلاستر جا بجا سے گر گیا ہے مسجد کے اندر اور صحن دونوں جگہ کے فرش اکھڑ گئے۔ مسجد کے اندر مویشی کے لئے بھس

بھر اجاتا ہے۔ مسجد کا طول وعرض ۸۸ فٹ × ۴۴ فٹ ہے۔ بیچ کی محراب ۱۳ فٹ چوڑی اور بشمول گنگورا ۴۴ فٹ اونچی ہے۔ باہر چبوترا بیچ کا ۸۸ فٹ مربع ہے۔ چبوترے کی چھ سیڑھیاں ہیں۔ دو طرفہ بغلی زینہ بتیس بتیس سیڑھیوں کا ہے۔ باہر رود کار کی یہ حالت ہے کہ بیچ کے در کی داہنی طرف کی برجی گر گئی بائیں طرف کی باقی ہے پیشانی پر چونے میں کتبہ تھا جس میں سے صرف بسم اللہ پڑھی جاتی ہے باقی مٹ گیا اس کی داہنی طرف نہایت خوش خط کلمۂ طیبہ کا طغریٰ ہے جس کے گرد بہت خوبصورت بیل بنی ہوئی ہے اسی کا جواب بالمقابل دوسری طرف تھا جو جھڑ گیا۔ بیچ وار داہنی طرف کا طغری جھڑ گیا بائیں طرف کلمۂ طیبہ کا طغریٰ موجود ہے۔ صحن مسجد میں ایک پرانا درخت املی کا کھڑا ہے اور متفرق طور پر کئی پرانی قبریں ہیں جن میں سے بہت سی ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔ درمیانی پیش طاق کے ادھر ادھر دو دو مینار جن میں داہنی طرف کی صرف ایک چھوٹی مینار باقی ہے اور تین گر گئیں۔ مسجد کی داہنی طرف مدرسہ یا اسی قسم کی کوئی اچھی خاصی بڑی عمارت تھی جو بالکل گر گئی۔ اس کی ایک مغرب رویہ دیوار رہ گئی ہے جس میں چار در ہیں۔

چماری والا گنبد یہ چماری والا گنبد کہلاتا ہے جو ہمایوں کے مقبرے کے جنوبی دروازے کے سامنے ہے۔ کہتے ہیں کہ جس کا یہ گنبد ہے وہ ہمایوں بادشاہ کا موچی تھا۔ سر سید یا کسی اور صاحب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس گنبد کا قبہ گر کر قبریں دب گئی ہیں۔ اس کے چار دروازے ہیں اور یہ بھی ایک پختہ اور عالی شان عمارت تھی۔ گو یہ گنبد گرا پڑا ہے مگر اب بھی اپنی گزشتہ حالت بتلانے کو کافی ہے اس کی دیواروں پر بھی چینی کا کام تھا جس کے ٹکڑے اب بھی جا بجا باقی ہیں۔ اس کے دروازوں اور کھڑکیوں پر حسبی اللہ اور یا فتاح کے طغرے جا بجا بنے ہوئے ہیں باقی اور کتبے رہے ہوں گے جو جھڑ گئے۔ گنبد کے اندر کی کیا حالت تھی اور کس قسم کے نقش و نگار تھے کتنی اور کس وضع کی قبریں تھیں اب کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کیونکہ اندر گری ہوئی چھت کا ملبہ اٹا ہوا ہے اور گرے ہوئے گنبد کے بڑے بڑے ضخیم پڑے ہوئے ہیں۔ یہ گنبد دو منزلہ تھا اور دروازوں کے بیچ میں چاروں طرف

نشین سے تھے۔ یہ گنبد ہشت پہل عمارت ہی جس کے چار ضلعے بڑے ۲۵ فٹ اور چار چھوٹے۔ ۱۳۔ ۹ فٹ لمبے ہیں۔ گنبد کے اندر آٹھ بڑی عالی شان ایک سے کے اوپر ایک یعنی دُہری دیوار دوز طاق نما محرابیں ہیں۔ چوطرف کتبے لگانے کی سنگ سرخ کی سلیں لگی ہوئی ہیں مگر کتبے لگانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ درکی اونچائی معلوم نہ ہوسکی کہ گنبد بیٹھ جانے سے اوپر جانے کا رستہ ہی نہیں رہا چڑھیں کیسے۔ چوڑان ۱۹ فٹ ہی۔ موجودہ عمارت پر سے آسرج کی بلندی تخمیناً ۴۳ فٹ معلوم ہوتی ہی۔ اس کے گرد پختہ چبوترا تھا وہ گر گیا۔ بعض لوگ اسے دولت خاں کسی امیر کا مقبرہ کہتے ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہی کہ کون اس کا بانی تھا لیکن مقبرہ کی نوعیت سے کسی بڑے امیر کا معلوم ہوتا ہی۔ اس مقبرے کے چبوترے ایک بہت بڑی چونے گچی کی قبر بھی بنی ہوئی ہی۔

نتھو والی کا گنبد

چاری والے گنبد کے مشرق میں کھیت کے اس پار ہمایوں کے مقبرے کے جنوبی دروازے کے سامنے شاہی سڑک کی بائیں جانب یہ گنبد ایک پختہ چبوترے پر جو ۶۰ فٹ مربع اور چار فٹ اونچا ہی واقع ہی۔ اصل گنبد ۱۳ فٹ مربع ہی۔ تین طرف دروازے ہیں مغرب کی طرف بند ہی۔ دروازے ۷ ½ فٹ اونچے اور ۵ ½ فٹ چوڑے ہیں۔ محراب کی بلندی ۱۷ فٹ ہی۔ نہ فرش نہ قبر نہ کتبہ۔ نہ کلس اندر پہلے رنگ کا کام تھا۔ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ گنبد کس کا ہی۔ مقامی لوگ نتھو والی کا گنبد کہتے ہیں اس سے زیادہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔

فاضل خاں کا گنبد

اوپر والے گنبد کے جنوب میں تخمیناً کوئی سَو قدم کے فصل سے ایک اور گنبد (۷۶) مربع ۳ فٹ اونچے پختہ چبوترے پر جو شکستہ حالت میں ہی واقع ہی۔ یہ گنبد ۱۳ فٹ مربع ہی۔ چار دروازے تھے۔ گنبد بیٹھ گیا تین طرف کے دروازے گر گئے اب صرف شمال رُخ کا دروازہ اور اُس پر چوتھائی حصہ گنبد کا کھڑا ہی۔ اور کچھ حصہ مغربی دروازے کا بھی براے نام ہی۔ دروازہ ۸ فٹ ۵ اونچا ۶ فٹ چوڑا ہی۔ محراب کی بلندی ۱۷ فٹ ہی۔ اس گنبد کے اندر بھی رنگ آمیزی کا عمدہ کام تھا جس کا کچھ نشان گنبد کے باقی ماندہ حصے سے معلوم ہوتا ہی۔ لوگ جو نام فاضل خاں کا بتلاتے ہیں واللہ اعلم یہ کون صاحب تھے
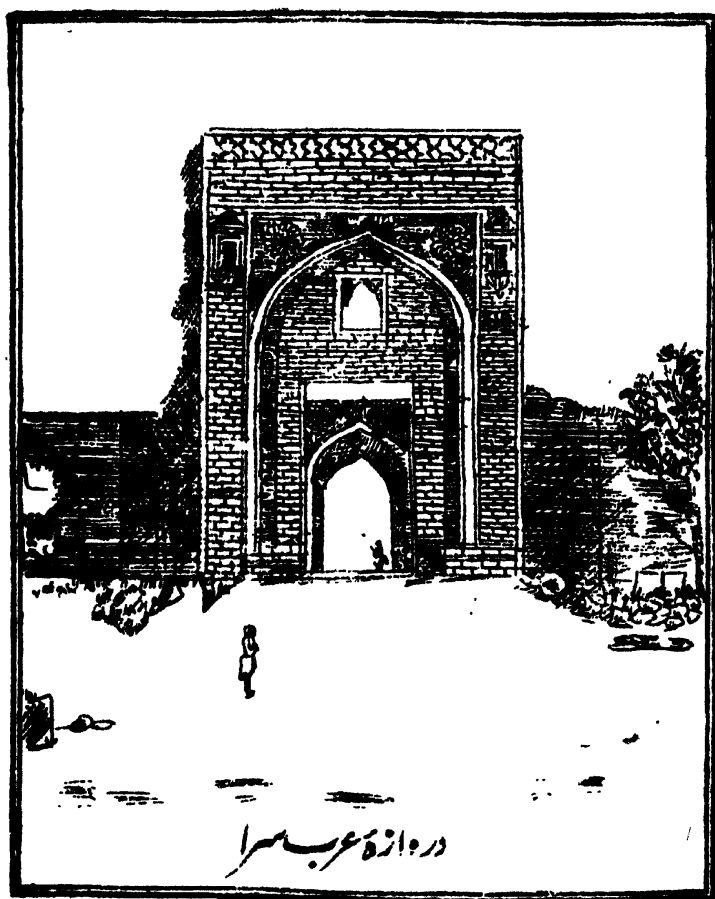
دروازۂ عرب سرا

عرب سرائے
سنہ ۹۶۸ھ
۱۵۶۰ء

ہمایوں کے مقبرے سے بالکل ملی ہوئی عرب سرائے ہے۔ یہ آبادی چار دیواری سے محصور ہے۔ اس سرا کو حاجی بیگم صاحبہ ہمایوں بادشاہ کی بیوی اور اکبر بادشاہ کی والدہ نے ۹۶۸ھ مطابق سنہ ۴ جلوس اکبری میں بنایا تھا۔ اس بیگم نے بہت عالی ہمتی سے عربوں کو حرمین شریفین سے لاکر یہاں آباد کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بیگم صاحب تین سو عرب لائی تھیں جن میں سے سو عرب سادات عالیات سے تھے اور سو مشایخ کبار سے اور سو عوام الناس جو انھیں لوگوں کے خدمت گزار تھے۔ یہ لوگ تو زمانۂ مابعد میں تنگی معاش کی وجہ سے تتر بتر ہوگئے اب خال خال کچھ اُن کے نام لیوا باقی رہ گئے ہیں اور اب تو ہر قوم کے لوگ اس میں بسنے لگے ہیں۔ اس سرا میں کوئی نادر بات سوائے اس کے دروازوں کے نہیں ہے۔ اس سرا کے تین دروازے ہیں دو دروازے تو کچھ ایسے عمدہ نہیں کہ جن کا ذکر کیا جائے لیکن شمالی دروازہ البتہ بڑا عالی شان و قابل ذکر ہے یہ دروازہ چالیس فیٹ اونچا اور ۲۵ فٹ چوڑا اور بیس فٹ عمق میں ہے۔ اس دروازے کی ساخت نہایت خوب صورت اور بے نظیر ہے اس میں مستقیمۃ الزوایا نقش و نگار کے پٹے ہیں جو آڑے ٹیکوں کو تھامے ہوئے ہیں اور آڑے پٹلے کنگوروں کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ انھیں مستقیمۃ الزوایا ٹیکوں کے اندر بلند محراب ہے جس کی ساری پیشانی نقش و نگار سے مزین ہے محراب کے برابر میں دو آگے بڑھی ہوئی سائبان دار کھڑکیاں ہیں جن میں پتھر کے توڑے سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ محراب کی بلندی سے تھوڑی دور نیچے ایک نشیمن ہے جس سے چھ فٹ نیچے دروازے کی محراب شروع ہوتی ہے جو ۱۶ فٹ اونچی اور دس فٹ چوڑی ہے۔

منڈی
سنہ ۱۰۲۱ھ
۱۶۱۲ء

یہ ایک منڈی تھی عرب سرائے کے شرقی دروازے کے پاس اور تمام کھانے پکانے کی چیزیں اس میں بکا کرتی تھیں اور اس منڈی میں ایک بہت نفیس مسجد تھی مگر اب اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ اسی مسجد کا ایک بڑا سیڑھیوں دار کنواں ہے جس کو

بائیں کہتے ہیں۔ یہ کنواں اب تک موجود ہی اور سیڑھیاں بھی بنی ہوئی ہیں اور
کنوئیں میں پانی بھی ہی۔ منڈی کا صرف ایک دروازہ باقی رہ گیا ہی جو بہت نفیس ہی
چینی کاری کے کام کی رنگ برنگ کی اینٹیں اس پر لگی ہوئی ہیں جن کا شوخ
رنگ آج تک بھی نگاہ کو خیرہ کرتا ہی۔ اس منڈی کو بھی مہربان آغا نے
جہانگیر بادشاہ کے عہد میں بنایا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہی کہ منڈی اور بارہ پلہ
ساتھ کے ساتھ بنے ہیں۔ اس دروازے پر سنگ سرخ کی تختی پر یہ کتبہ ہی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ (اللہ) مہربانو قدیمی جہانگیر شاہ

عیسیٰ خاں کی مسجد اور مقبرہ

۹۵۴ھ
۱۵۴۷ء

یہی منزل چند روزہ بھی ہی
کہ دو دن میں ہی منزل عیش طی

عرب سرا کے بستی کے مغربی دروازے
کے پاس اور ہمایوں کے مقبرے کے بالکل قریب عیسیٰ خاں کی مسجد اور مقبرہ ہی جو ایک
بڑی چار دیواری کے اندر ہی جسے عیسیٰ خاں کا کوٹلہ کہتے ہیں۔ عیسیٰ خاں
عہد شیر شاہ سور کا ایک بہت بڑا باقتدار سربرآوردہ امیر تھا جس نے
یہ مسجد اور مقبرہ بنوایا تھا۔ یہ وہی امیر ہی جس نے شیر شاہ کے انتقال کے بعد
جب کہ اس کے بیٹوں میں تخت کے لیئے نزاع برپا ہوئی تھی تو سلیم شاہ کا
بڑا ساتھ دیا تھا اور حصول تخت سلطنت میں سلیم شاہ کی بڑی مدد کی تھی اور اسی
کی سعی اور تدبیر کا نتیجہ تھا جو سلیم شاہ کو کامیابی ہوئی اور اسی کی دلاوری اور استقامت
رائے سے سلیم شاہ نے اپنے بڑے بھائی عادل خاں پر جو ولی عہد تھا فتح
پائی۔ مسجد اور مقبرہ دونوں ۹۵۴ھ ۱۵۴۷ء سلیم شاہ پسر شیر شاہ کے عہد میں
بنے ہیں۔ مسجد۔ یہ مسجد تمام سنگ خارا اور چونے کی بنی ہوئی ہی البتہ محرابوں کے
اور روکار پر سنگ سرخ لگایا گیا ہی۔ مسجد طول میں ۸۸ اور عرض میں ۳۰ فٹ ہی چبوترہ
کے اوپر سے بیچ کی محراب تک بلندی ۲۹ کی ہی اور چھت کے اوپر سے
بیچ کے گنبد کی چوٹی تک ۲۳ کی اونچان ہی جس پر تین فٹ کا کلس سنگ سرخ کا
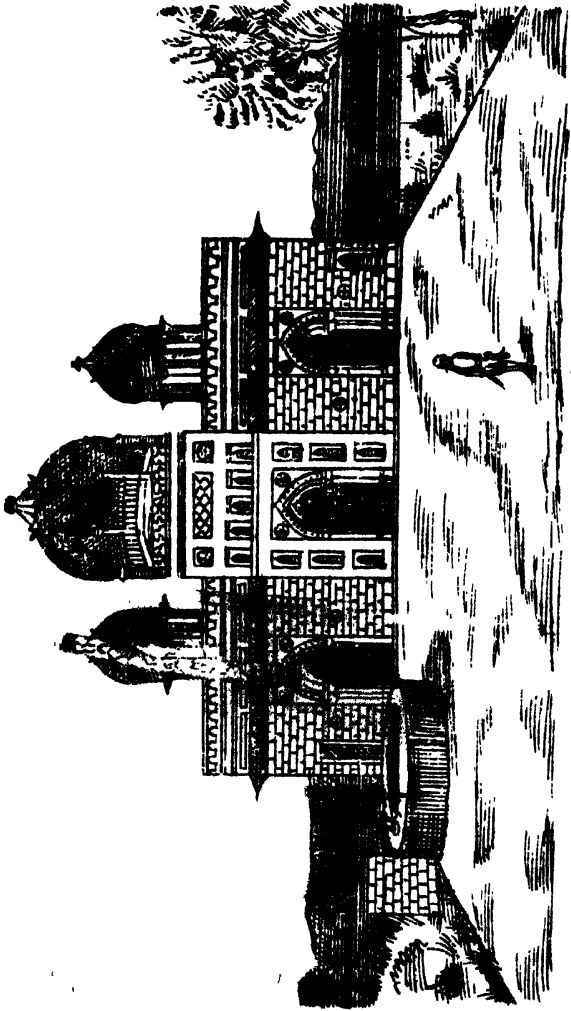
نقشۂ مسجد عیسیٰ خاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
اللہ
مہر بانو قدیمی جہانگیر شاہ
دروازہ سندی
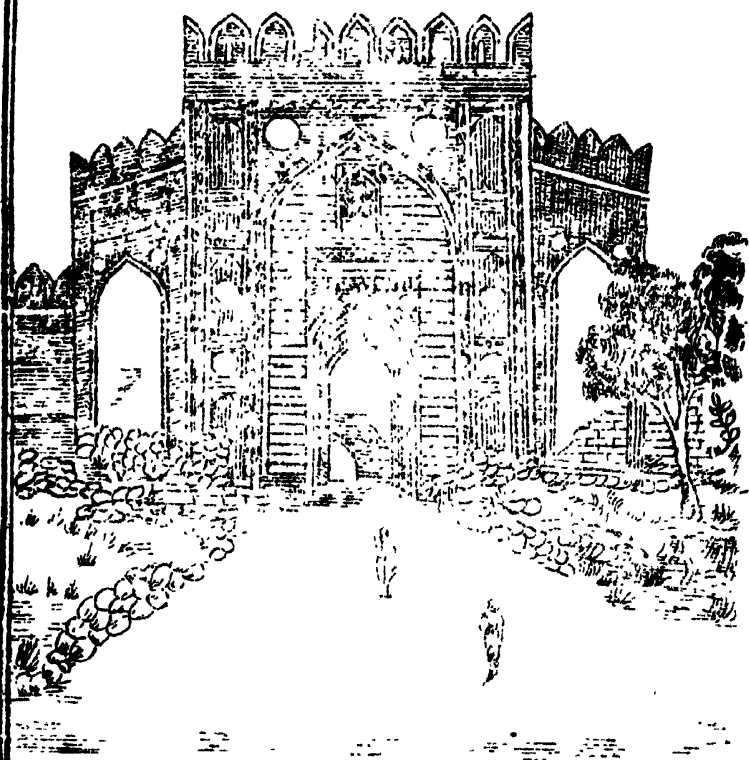
مزید براں ہے۔ اب یہ کلس باقی نہیں رہا)۔ مسجد کے در محراب دار ہیں جن میں پتلے پتلے اونچے اونچے دیوار دوز ستون کھڑے ہیں۔ محرابوں کا روکار ہر طرح کے نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ صدر محراب ۲۶ فٹ ۷ انچ بلند اور ۹ فٹ ۱ انچ چوڑی ہے جس کا روکار سنگ سرخ کا ہے مگر بغلی دروں کا روکار سنگ خارا کا ہے۔ صدر محراب کی پیشانی پر گیارہ دفعہ اللہ اللہ کندہ ہے۔ اور ادھر ادھر پاکھوں پر بھی اللہ اللہ اور دائیں بائیں کی محرابوں پر نو نو دفعہ اللہ اللہ لکھا ہے۔ صدر محراب کے دونوں پاکھوں پر اوپر تلے چار چار طاق سنگ سرخ کے بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کے اندر اب نہ منبر ہے نہ فرش پختہ باقی رہا صرف اکھڑی پکھڑی گچ باقی رہ گئی ہے۔ مینار بھی نہیں ہیں۔ صرف ایک پیش طاق دست برد زمانے سے باقی بچ رہا ہے جس میں سنگ مرمر پر یہ کتبے ہیں:۔ سب سے اوپر محراب پر نو جگہ اللہ اللہ لکھا ہوا ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

حسبی اللہ حسبی اللہ

اللہ بسم اللہ الرحمن الرحیم اللہ

طاق کے اندر دارسے پہلی سطر بسم اللہ۔ شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ تا اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ پارہ ۳۔ سورۂ آل عمران رکوع (۱۰)

اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ۔

دوسری سطر۔ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ تا وَ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ پارہ ۸۔ سورۂ اعراف رکوع (۱۱)۔ تیسری سطر یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ تا کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۔ پیش طاق کے ادھر ادھر دو چھوٹے چھوٹے طاقوں میں سنگ سرخ پر یہ کتبے ہیں:۔

سب سے اوپر اللہ اللہ (۹) دفعہ کلمہ

اللہ اللہ

اس کے گرد شَہِدَ اللّٰہُ الخ جیسا کہ بڑے پیش طاق کی پہلی سطر میں ہے مسجد کے مغرب و جنوب کے کونے میں ایک کنارے کنواں ہے جو بائیں طرف

تیسرے درسے ملا ہوا ہی جس پر کار سٹیفن صاحب نے اعتراض کیا ہی کہ نہیں معلوم ایسا بے موقع کنواں کیوں بنایا ہی جس سے سارا چبوترا مسجد کا خراب ہوگیا۔ کنواں بالکل ایک طرف اور کونے میں ہی جو نہ بدنما ہی نہ اس سے صحن میں کوئی نقصان واقع ہوا ہی بلکہ مسجدوں میں عموماً اسی طرح کنوئیں ہوا کرتے ہیں اور اسی طرف (۲۴) سیڑھیوں کا زینہ بھی ہی۔ مسجد کے سامنے ۸۸ فٹ × ۵۲ ½ کا ایک چبوترا بجری کا زمانۂ حال کا بنا ہوا ہی۔ مسجد کے چبوترے کی نرہ سے مقبرے کا کمپونڈ جو مشرق میں ہی ۸۰ فٹ کے فصل سے ہی۔ روکار مسجد۔ گنبد اور برجیوں پر تمام چینی کا کام تھا جو سب جھڑ جھڑا گیا لیکن روکار کی تینوں محرابوں پر اب بھی لاجوردی۔ زرد۔ سبز رنگ کی اینٹیں جڑی ہوئی ہیں خدا جانے کس قسم کا مسالا اور کس طرح کا رنگ تھا کہ آج بھی اُن کی شوخی نظر کو خیرہ کرتی ہی۔ صدہا برساتیں ان پر گزر گئیں مگر کیا مجال کہ رنگ کہیں سے پھیکا پڑا ہو۔ سنگین چھجہ دونوں محرابوں کے سامنے ہی مگر بیچ کی محراب کے آگے نہیں ہی۔ درمیانی محراب کی دیوار چھت سے تین چار فیٹ بلند ہو کر اس کی دونوں جانب چھوٹی چھوٹی برجیاں پانچ پانچ فیٹ اونچی ہیں چھت کے اطراف کنگورے وار منڈیر ہی۔ چھت کے بیچوں بیچ ایک بڑا بھاری گنبد ہی جو کچھ خوش قطع نہیں ہی اس پر بھی چینی کا کام تھا جو اب بھی جا بجا باقی ہی۔ گنبد کے ادھر اُدھر ایک ایک ہشت پہل برجی ۷ فٹ اونچی ۴ ½ فٹ قطر کی ہی۔ مسجد میں تین در ہیں منبر باقی نہیں رہا اور مینار تو غالباً شروع سے تھے ہی نہیں۔ مسجد کے اندر پہلے چوکوں کا فرش تھا جو اب نہیں رہا اب تو اکھڑی بکھری کچھ رہ گئی ہی۔ اندر وار کی تینوں دیوار دوز محرابیں ۷ فٹ اونچی اور ۳ ½ فٹ چوڑی ہیں جن میں جا بجا سنگ سرخ کی گلکاری ہی۔ اس مسجد کی وضع قطع اُس وقت کے لحاظ سے جب کہ یہ بنی تھی بہت نفیس اور خوب صورت تھی گو اس زمانے میں اس میں کوئی ندرت نہیں پائی جاتی بلکہ بھدّی معلوم دیتی ہی۔ مقبرہ۔ مسجد عیسیٰ خاں کا مقبرہ ہی جو مسجد سے تو کہیں اچھا ہی یہ عمارت سنگ خارا کی بنی ہوئی ہی۔ وضع قطع اس کی بالکل سکندر لودھی وغیرہ بادشاہوں کے زمانے کی سی ہی۔

نقشۂ مقبرۂ عیسیٰ خان
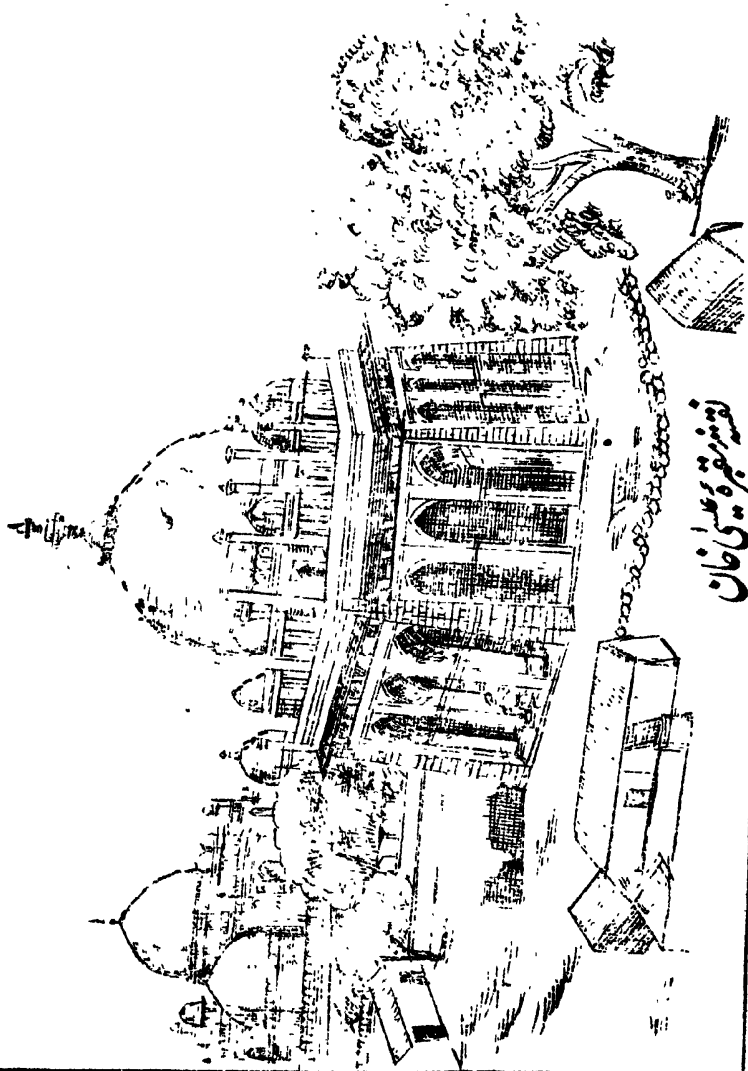
عمارت کے گرد ایک چوڑا اور بھاری توڑے دار چھجہ ہے۔ چھت پر ایک پست منڈیر ہے جس کے ہر ہر کونے پر ایک ایک چھوٹی مینار رہی اور ہر دو میناروں کے بیچ میں ایک ایک برجی سترہ سترہ فیٹ اونچی ہے جس کا قطر دس فیٹ ہے۔ یہ برجیاں سنگ سرخ کی ہیں جن کے آٹھ آٹھ ستون ہیں اور اوپر خوب صورت کلسیاں سنگ مرمر کی چڑھی ہوئی بہت بھلی معلوم دیتی ہیں۔ یہ گنبد سولہا ضلع کے اسطوانے پر ایستادہ ہے۔ یہ مقبرہ ہشت پہلو ہے۔ بیچ میں ایک بہت بڑا گنبد ہے اور گرد نو بڑی بڑی ہشت پہل برجیاں سنگ سرخ کی ہیں گنبد کا کلس اب باقی نہیں رہا۔ ہر ضلع میں تین تین در نوکدار محراب کے ہیں جو کل (۲۴) ہوئے۔ یہ در (۲۰ فٹ) اونچے اور (۸ فٹ) چوڑے ہیں۔ مقبرے کے گرد ۱۲ فٹ چوڑی غلام گردش ہے۔ یہ ساری عمارت سنگ خارا اور چونے کی ہے لیکن اوپر کے ستون جنوب رخ کے سنگ سرخ کے ہیں۔ مقبرے کے چاروں کونوں پر دُہرے در ہیں۔ مقبرے کا اندرونی قطر ۴۳ فٹ ہے۔ مقبرے کے گنبد۔ روکار اور محرابوں سب پر چینی کا لاجوردی رنگ اور رنگ برنگ کی اینٹیں اب بھی باقی ہیں مقبرے کے اندر چھوٹی چھوٹی سنگ خارا کی سپاٹ سلوں کا فرش ہے جو بلحاظ نفاست عمارت کے بدنما ہے ممکن ہے کہ اصلی فرش ہموار مقبرے کے اندر چوکوں کا نہ رہا ہو اور یہ بھتا فرش بعد میں کرا دیا گیا ہو۔ چھ قبریں بائیں طرف سے داہنی طرف اس تفصیل سے ہیں:۔

(۱ و ۲) سنگ مرمر۔ دونوں قبریں ایک ہی وضع کی ہیں جو ۹ فٹ ۹ انچ لمبی۔ ۸ فٹ ۹ انچ چوڑی۔ ۴ فٹ ۔ ۴ انچ اونچی ہیں۔ ان پر کلمۂ طیبہ اور دو طرف اللہ اللہ کندہ ہے۔ اس میں سے ایک قبر جس کا تعویذ سنگ مرمر اور سنگ سرخ کا ملا جلا ہے یعنی اول کی ہے پہلی قطار کی تیسری قبر دوسری قطار کی ۴ - ۵ - ۶ - قبریں سب چونے گچی کی ہیں۔ یہ خبر نہیں کہ کن کی ہیں۔ مقبرے کا ایک ہی دروازہ جنوب رخ ہے اور بھی چھوٹا باقی چھ جالیاں سنگ سرخ کی ہیں جس کی وجہ سے اندر تاریکی رہتی ہے۔ گنبد کے اندر مغرب کی طرف محراب کے اوپر ایک تختی پر آیۃ الکرسی بخط نسخ اور نیچے اس کے یہ کتبہ بخط نستعلیق ہے:۔

"بناکرد این روضہ جنت پناہ در عہد دولت اسلام شاہ بن شیر شاہ خلد اللہ ملکہ وسلطانہ مسند عالی عیسٰیخاں ابن بیارہ اغوان حجاب خاص بتاریخ نہصد وپنجاہ وچہار از ہجرت ۹۵۴ھ۔"

اس کے نیچے طاق میں آیات قرآنی بخط نسخ حسب ذیل ہیں جن کا پڑھنا اونچائی کے سبب سے بہت وقت طلب ہے:۔ طاق کے اندر دو طرفہ اللہ اللہ اندر وار سے سطریں۔ پہلی سطر۔ بسم اللہ الخ۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰۤئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ تا اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ سورۂ آل عمران پارہ (۳) رکوع (۱۰) اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ دوسری سطر بسم اللہ الخ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا تا هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ پارہ (۴) آل عمران رکوع (۱) تیسری سطر۔ بسم اللہ الخ۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ تا بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ پارہ ۳ آل عمران رکوع (۱۱) چوتھی سطر سورۂ جمعہ کامل۔ پارہ (۲۸) پانچویں سطر اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ تا فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ۔ پارہ (۱۰) سورۂ توبہ رکوع (۱۴)

اس مقبرے کا بیرونی کمپونڈ بہت شان دار اور ایسا وسیع ہے کہ وہ قلعہ معلوم دیتا ہے اور اسی وجہ سے کوٹلہ کہلاتا ہے۔ اس کمپونڈ میں چاروں طرف ملاکر (۱۲۸) حجرے نا طاق ہیں۔ جس چبوترے پر گنبد ہے اس کی کرسی ۲ فٹ ۹ انچ ہے۔ گنبد کا اندرونی ضلع ۲۰ فٹ ۔ ۴ انچ لمبا ہے اور ہشت پہل چبوترے کا ضلع ۳۲ فٹ ۴ انچ۔ دروں کی گہران ۴ فٹ ۔ ۸ انچ ہے۔ غلام گردش کے دروں کی چوڑان ۷ فٹ ۹ انچ ہے۔ گنبد کے گرد ایک ہشت پہل کمپونڈ ہے جس کی منڈیر ۳ فٹ ۲ انچ اونچی ہے۔ پھر گرد پھری کا کمپونڈ ہے جو ہر طرف سے ۷ فٹ ۵ انچ چوڑا ہے۔ جس کا ہر ضلع ۸۱ فٹ لمبا ہے۔ مقبرے کا قطر اندر سے ۴۴ فٹ ۳ انچ ہے۔ باہر کے فصیل نما کمپونڈ کی دیوار ۸ فٹ ۔ ۸ انچ اونچی ہے اور کنگورا ملالیں تو اونچان ۱۲ فٹ ۴ انچ ہو جاتی ہے۔ صدر دروازہ بہت عالی شان جنوب کی طرف ہے جو ۲۲ فٹ بلند ۔ ۲۰ فٹ ۔ ۴ انچ چوڑا ہے جس پر گنبد ہے اس کے ادھر ادھر

نقشہ برج نیلہ
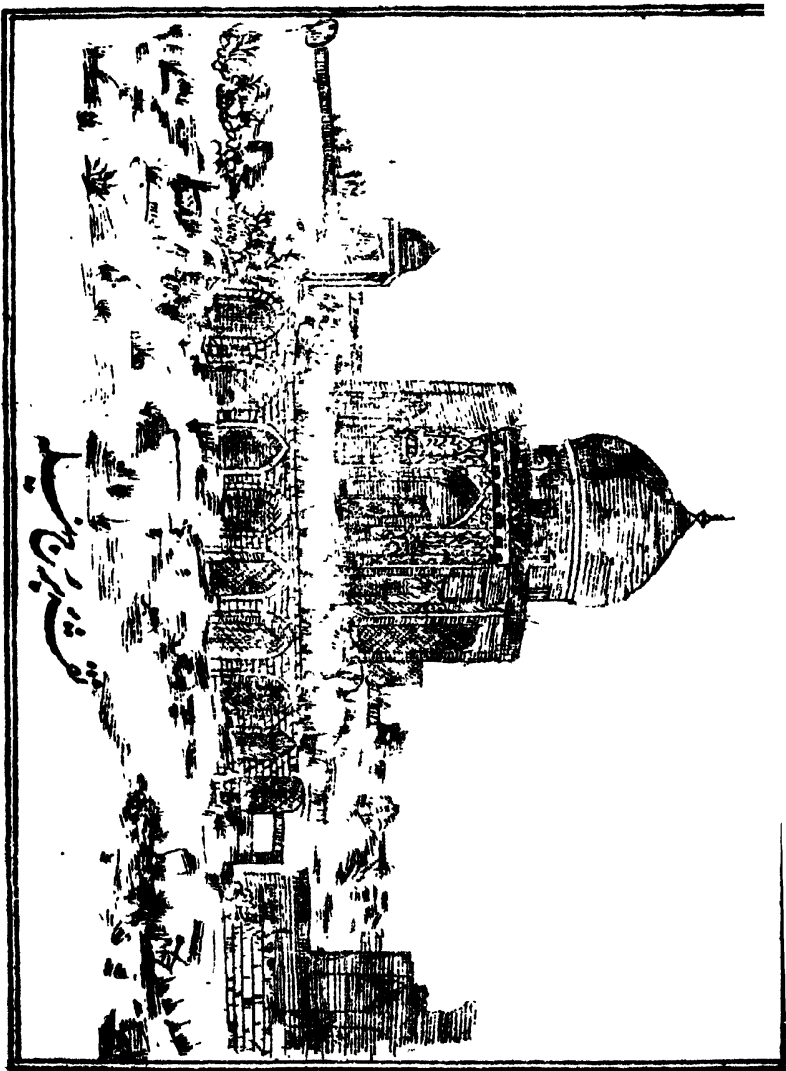
ایک ایک برجی۔ یہ دروازہ دو منزلہ ہی جس پر جانے کے لیئے دو طرفہ زینہ (۲۸) سیڑھیوں کا ہی۔ اس کے دو در داہنی اور بایئں طرف کے گر گئے ہیں صرف بیچ کا در باقی ہی جس پر سہ دری بنی ہوئی ہی۔ مقبرے کے چبوترے پر کئی قبریں ہیں جو زمین کے برابر ہیں صرف سلوں سے اُن کے نشان معلوم دیتے ہیں۔ چونکہ یہ مقبرہ اور مسجد عمارات محفوظۂ سرکار میں ہیں لہذا اچھی حالت میں ہیں اور نگہداشت بھی خوب ہوتی ہی ورنہ پہلے اس مقبرے میں کمین لوگ رہتے تھے جن کے چولھے چکیوں کے سبب سے یہ مقبرہ بہت خراب ہوگیا تھا اس کے کمپونڈ میں چند درخت نیم کے سایہ دار کھڑے ہیں جو مقبرے کے ساتھ کے نہیں ہیں بلکہ زمانۂ مابعد کے ہیں۔ یہ عمارت صحیح و سالم موجود ہی جس کی وضع قطع اور خوبصورتی دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہی۔

نیلا برج یا مقبرۂ میاں فہیم

۱۰۳۴ھ

۱۶۲۴ع

گیتی دریا و تنت کشتی است
عمر تو باد ست تو باز ارگاں

ہمایوں کے مقبرے کی مشرقی دیوار کے باہر ایک ٹوٹا پھوٹا نیلگوں گنبد غم و الم میں کھڑا شان سوگواری دکھا رہا ہی کوئی اس کو حجام کا مقبرہ بتلاتا ہی اور کوئی فہیم کا۔ پہلی بات تو یقیناً غلط ہی اور دوسری بات اگر صحیح ہو تو یہ مقبرہ میاں فہیم کا ہی جو عبدالرحیم خاں خانخاناں کے باوفا مصاحب تھے اور انھوں ہی نے یہ مقبرہ سنہ ۲۰ جلوس جہانگیری میں ۱۰۳۴ھ ۱۶۲۴ع میں قید سے چھوٹے تو بنوایا۔ مہابت خان نے خاناں کو قید کرنے کے پیشتر فہیم خاں کو کچھ دلا دلا لینے کی کوشش کی تھی لیکن فہیم خاں اُس کے دام فریب میں نہ آیا اور

سلہ مجھ کو یہاں کے لوگوں نے منمیار کا گنبد بتلایا ہی جو ہمایوں بادشاہ کی بیگم کے لیئے چوڑیاں بناتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب گنبد کے اندر بالکل سپاٹ ہی۔ قبر بے نشان ندارد۔ فرش بھی بے ڈول اور ناہموار پتھروں کا ہی جو جابجا سے اُکھڑ گئے ہیں اس کے دروازے دو طرفہ مشرق مغرب میں کل من علیہا فان شمال و جنوب میں کلمۂ طیبہ کے طغرے ہیں۔ ۱۲

مہابت خاں سے لڑ کر جان دی اور حق نمک ادا کیا اور خان خاناں نے اپنے جاں نثار مصاحب کی وفاداری کا یہ معاوضہ کیا کہ اس کی نعش آگرے سے لا کر دلی بھجوائی کہ وہاں کی خاک کو آرام گاہ سمجھتا تھا اور اس پر نفیس مقبرہ بنوایا۔ جو "نیلے برج" کے نام سے اس لئے مشہور ہے کہ اس پر نیلے رنگ کی چینی کا کام کیا ہوا ہے اور اس قسم کے کام کو "کارکاشانی" کہتے ہیں۔ غرض اس برج پر طرح بطرح کی رنگ آمیزی کا کام بنا ہوا ہے اور برج کے اندر وار بھی انواع واقسام کی رنگ آمیزی کا کام تھا۔ اب بھی جو کچھ رہ گیا ہے نہایت خوب صورت اور قابل دید ہے۔ یہ وہی میاں فہیم ہیں جس کے نام سے ہندوستان کے زن ومرد کی زبان پر یہ کہاوت مشہور ہے کہ "کمائیں خان خاناں اور لٹائیں میاں فہیم" خان خاناں انھیں میاں کہتے تھے۔ میاں ہی مشہور ہو گئے لوگ انھیں خان خاناں کا غلام سمجھتے ہیں حقیقت میں غلام نہ تھے۔ ایک راجپوت کے بیٹے تھے۔ خدا ترس۔ بامروت۔ جوہر شناس خان خاناں نے اپنے بچوں کی طرح پالا اور بیٹوں کے ساتھ تعلیم وتربیت کیا تھا انہیں ہمت وشجاعت سے دودھ پلوایا تھا اور لیاقت وآداب کے سبق پڑھوایا تھا آقا کی بدولت اس کا نام آسمان شہرت پر ایسا چمکا۔ جیسے چاند کے پہلو میں تارا بیٹے کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ فہیم با وجود اوصاف مذکورہ کے نہایت پرہیزگار نیک نیت۔ نیکوکار تھا۔ مرنے کے دن تک تہجد اور اشراق کی نماز نہیں چھٹی فقیر دوست تھا۔ اور سپاہ کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتا تھا۔ خانخاناں کی سرکار کے کل کاروبار اس کی ذات پر منحصر تھے۔ کھلاتا تھا۔ لٹاتا تھا۔ اپنا دل خوش اور آقا کا نام روشن کرتا تھا۔ وہ مہموں میں تیغ وتیر کی طرح اس کے دم کے ساتھ ہوتا تھا۔ خان خاناں کی ایک عرضی سے جو انھوں نے اکبر بادشاہ کو لکھی ہے معلوم ہوتا ہے کہ سہیل کی لڑائی میں وہ فوج ہراول میں حملہ آور تھا مگر تند مزاج اور بلند نظر بھی حد سے زیادہ تھا۔ جب جاؤ اس کی ڈیوڑھی پر کوڑا ہی چٹخا سنائی دیتا تھا۔ ایک دن داراب اور بکرما جیت شاہجہانی ایک مسند پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کہ فہیم بھی آیا۔ دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور داراب سے

کہا۔ "کاش ایرج کے بدلے تو مرجاتا۔" یہ ڈکوت برہمن اور بیرم خاں کے پوتے کے برابر بیٹھے!! آخر میں خان خاناں کی طبیعت مکدر ہوگئی اسے بیجاپور کی فوجداری بھیج دیا تھا۔ چندروز بعد حساب کتاب مانگا۔ حافظ نصراللہ خاں خان خاناں کے دیوان بااختیار نہایت معزز شخص تھے۔ حساب لینے لگے۔ کسی رقم پر تکرار ہوئی۔ سر دربار حافظ صاحب کے منہ پر طمانچہ مارا۔ اور اٹھ کر چلا گیا۔ آفرین ہے خان خاناں کے حوصلے کو۔ آدھی رات کو آپ گئے اور منا کر لائے۔

جب مہابت خاں نے خان خاناں کو قید کرنا چاہا۔ تو نہیم کی طرف سے خیال تھا کہ من چلا جوان ہے ایسا نہ ہو کہ زیادہ آگ بھڑک اٹھے۔ چاہا کہ منصب اور انعام واکرام کی لالچ دے کر پہلے اسے بلائے نہیم نے نہ مانا۔ اور تیز تیز پیغام سلام بھیجے۔ آخر مہابت خاں نے کہلا بھیجا کہ سپاہی گری کا گھمنڈ کب تک پیش کیا جائے گا۔ جان کھو بیٹھو گے۔ نہیم نے کہا "خان خاناں کا غلام ہے۔ ایسا سستا بھی ہاتھ نہ آئے گا" جب خانخاناں کو مہابت خاں نے بلایا تو نہیم نے اسی وقت کہہ دیا تھا۔ کہ "دغا معلوم ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ذلت اور خواری تک نوبت پہنچے۔ مسلح و مستعد ہو کر حضور کی خدمت میں چلنا چاہیئے۔" خان خاناں نے کچھ خیال نہ کیا۔ مہابت خاں نے انھیں نظر بند کرتے ہی فہیم کے ڈیرے پر آدمی بھیجے اس نے اپنے فرزند فیروز خاں سے کہا کہ "وقت آن لگا ہے۔ تھوڑی دیر انھیں روکو کہ وضو تازہ کر کے سلامتی ایمان کا دوگانہ ادا کروں گا۔" چنانچہ نماز سے فارغ ہو کر آپ بیٹا چالیس جاں نثاروں کے ساتھ تلوار پکڑ کر نکلے۔ اور جان کو آبرو پر قربان کر دیا۔ خیال کرو خان خاناں کو اس کے مرنے کا کیسا رنج ہوا ہوگا۔ اس برج میں اب کوئی قبر نہیں رہی۔ خدا معلوم کہ ٹوٹ پھوٹ گئی یا لوگوں نے تعویذ کے لالچ سے اکھاڑ ڈالی۔ الغرض یہ برج بہت مشہور عمارتوں میں سے ہے اور کسی زمانے میں لاجواب ہوگا۔ گنبد پر تمام نیلا کام ہے۔ گنبد اس کا کچھ زیادہ خوب صورت نہیں ہے مغلوں کے زمانے کی طرز کا پٹلی گردن کا ہے مگر کام جو اس پر بنا ہوا ہے وہ البتہ قابل دید ہے۔ گنبد کا چبوترہ پانچ فیٹ اونچا اور ۷۰ فٹ مربع ہے۔ گنبد ہشت پہل ہے جس کے چار ضلعے لمبے

اور چار چھوٹے ہیں اور قطر ۴۲ ہے۔ چبوترے کے اوپر سے گنبد کی اونچان ستر فیٹ ہے جس پر سنگ سرخ کا چھ فیٹ اونچا کلس ہے۔ گنبد کے چوڑے چار ضلعوں میں چار گہری نوکدار دیوار دو محرابیں ہیں جن میں ایک ایک دروازہ اور دروازوں سے کوئی تین فیٹ اوپر وار کو ایک ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے۔ محرابوں دیواروں اور پیشانی پر انواع واقسام کے نقش ونگار اور بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ گنبد کے اسطوانے کے اوپر سب طرف پست محرابیں ہیں۔ اب اس گنبد میں مویشی باندھے جاتے ہیں جو بڑی عبرت کا مقام ہے۔ اس قابل قدر عمارت کی حالت خستہ وزار دیکھ کر دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ کس شوق سے بنایا ہوگا اور کس طرح ناقدر دانی کے ہاتھوں مسمار ہو رہا ہے۔

مقبرۂ عبدالرحیم خاں خان خاناں[1]

۱۰۳۶ھ
۱۶۲۶ء

میاں فہیم کے مقبرے کے پاس ہی اس سڑک کی داہنی طرف جو ہمایوں کے مقبرے سے بارہ پُلے کو جاتی ہے عبدالرحیم خاں المخاطب بہ خان خاناں۔ اُس بیرم خاں کا بیٹا ہے جو ہمایوں بادشاہ کا مصاحب دوست اور جنرل تھا۔ عبدالرحیم خاں کی ماں جمال خاں میوات کے ایک رئیس کی لڑکی حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی بڑی بہن بادشاہ کے محل میں تھی چھوٹی وزیر کی حرم سرا میں۔ خالو بادشاہ نے خود عبدالرحیم نام رکھا۔ مبارک سولود کی ولادت خاص لاہور میں ہوئی۔ دربار اکبری میں عبدالرحیم خاں کی بڑی وقعت تھی اور مورد مراحم خسروانہ تھا۔ بڑے بڑے عہدوں پر مامور وسرفراز ہوا۔ اسی نے گجرات کے نہایت خطرناک بلوے کو فرو کیا۔ سندھ کا ملک فتح کیا اور تا اختتام زمان سلطنت اکبر ملک دکن کا بھی انتظام کرتا رہا۔ جہانگیر کے زمانے میں بمصداق ہر کمالے را زوالے اس کے نیر اقبال میں زوال آیا۔ جہانگیر کے بیٹے شاہزادہ خورم سے اس کے تعلقات

[1] دیہاتی لوگ خان خاناں کے مشکل لفظ کا صحیح تلفظ نہیں کرسکتے وہ اپنی بولی میں اسے گمنکھنا گنبد کہتے ہیں۔ ۱۲

نقشہ مقبرہ خانخانان
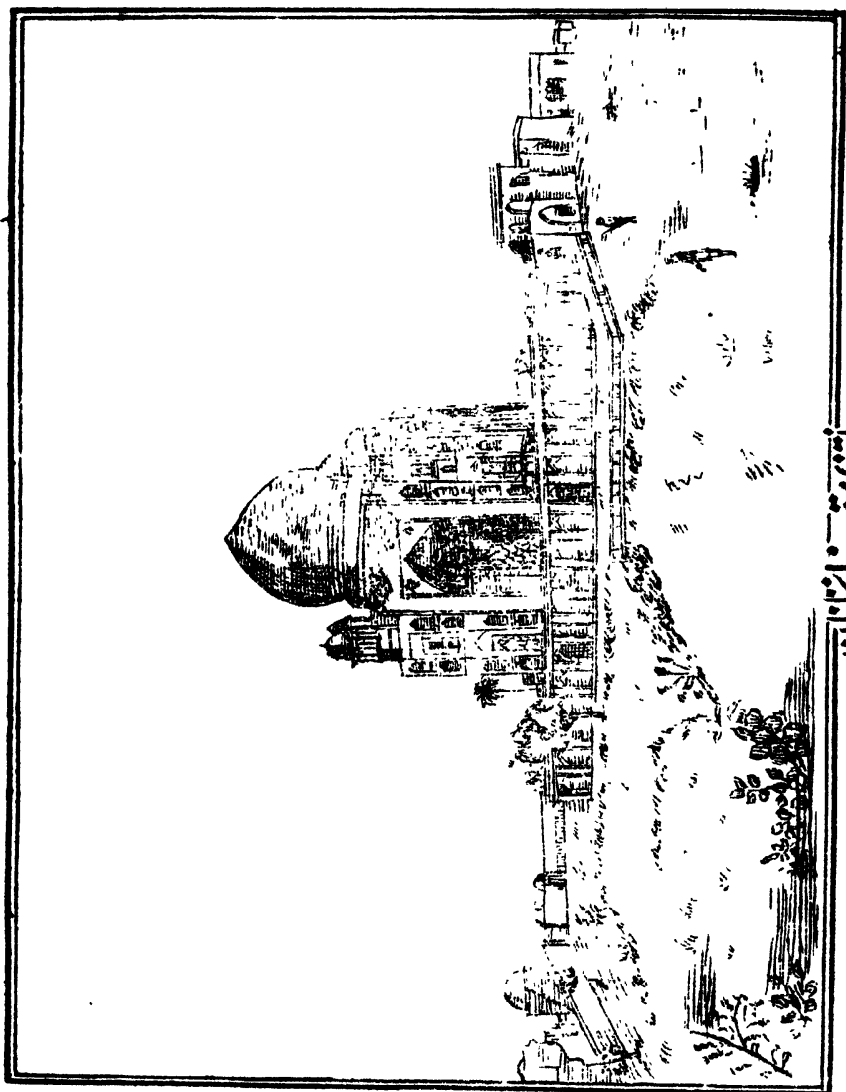
اچھے نہ تھے کچھ بنبھ نہ سکی ۔ کبھی ایک طرف جھک جاتا کبھی دوسری طرف ۔ مہابت خاں نے عبدالرحیم خاں کو قید کیا اور بادشاہ کے حکم سے دہلی اور پھر لاہور بھیج دیا ۔ لاہور میں وہ ایسا بیمار ہوا کہ دہلی میں اخیر وقت آیا اور آتے ہی سنہ ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۶ء میں مرگیا ۔ مسٹر آرسکن (Erskine) لکھتا ہے کہ "عبدالرحیم کے حالات اور واقعات ایسے ہیں کہ اگر لکھے جائیں تو گویا سلطنت مغلیہ کی نصف صدی کی تاریخ ہو ۔ اس کے علم و فضل ۔ دانشمندی ۔ فراست ۔ بہادری اور فیاضی کا بڑا شہرہ تھا" گنبد پختہ پتھر چونے سے بنا ہوا ہے جو چودہ فیٹ بلند اور ۱۴۴ مربع اور چالیس فٹ چوڑے چبوترے پر بنا ہوا ہے ۔ چبوترے کی چاروں طرف سترہ سترہ محرابیں ہیں جن میں سے چودہ تو دیوار دوز ہیں اور باقی میں سے حجروں میں جانے کا رستہ ہے ۔ چبوترے کے جنوب رخ (۱۴) سیڑھیاں ہیں ۔ اور کچھ ٹوٹ گئی ہیں ۔ گنبد ہشت پہل ہے جس کے چار ضلعے لمبے اور چار کوتاہ ہیں قطر ۵۸ ہے ۔ کوتاہ ضلعوں میں ایک کے اوپر ایک دو محرابیں ہیں جو راستے ہیں دو غلام گردشوں کے جو درمیانی حجرے کے اطراف ہیں چھت بھی کوتاہ ضلعوں پر ہے اس پر ایک برج ہے ۔ طویل اضلاع کی طرف بڑی بڑی دیوار دوز دوہری محرابیں ہیں اندر والی چھوٹی محرابوں میں سنگین جالیاں لگی ہوئی ہیں ۔ انھیں میں سے ایک محراب میں سے گنبد میں جانے کا دروازہ ہے ۔ چبوترے پر سے گنبد کی چھت ۳۷ فٹ اونچی ہے اور چھت سے گنبد کی چوٹی ۲۵ اور زیادہ ہے ۔ اب گنبد گاؤں والوں کے قبضے میں ہے اور ملحقہ کھیتوں کے غلّے کا انبار خانہ ہے ۔ آصف الدولہ کی وزارت کے زمانے میں اس کا تمام سنگ مرمر اکھڑوا لیا گیا اور وہ گنبد جو اس قدر اہتمام سے بنایا گیا اور سر سے پا تک آراستہ تھا ننگا بچا کر دیا گیا ۔ گنبد اور دیواروں کے بیش قیمت پتھر تو سب ندارد ہیں اب خالی دیواریں کھڑی ہیں جن پر گھانس اور جھاڑیاں اُگ آئی ہیں جب سارے گنبد کی یہ گت بنی ہے تو قبر کا پتہ کہاں اس کا سنگ مرمر کا تعویذ ندارد ہے اب قبر کا نشان صرف ایک مٹی کا ڈھیر سمجھ لو اور بس ۔ ہم کو اس گنبد کی نہایت بدرونق اور خستہ حالت دیکھ کر سخت ملال ہوا کس اہتمام سے اور کس نفاست سے

بنایا گیا اور کیوں کر پامال ہوا۔ اس کے بیچ میں ایک بڑا گنبد ہی اور چاروں کونوں پر
چار نفیس ہشت پہلو بُرجیاں سنگ سرخ کی ہیں۔ یہ مقبرہ اس سڑک کے کنارے
ہی جو دلی سے ہوڈل۔ پلول۔ فریدآباد کو جاتی ہی۔ ہمایوں کے مقبرے سے
قریب ہی مغرب وجنوب کے کونے میں ہی گنبد پر ضرور سنگ مرمر کی سلیں ہوں گی
وہ اس بے دردی سے نکالی گئی ہیں کہ سارا پلاستر تک اکھڑ گیا وہ تو یہ کہو کہ
کچھ مال مسالا ہی اس بلا کا مستحکم ہی جو گنبد اب بھی کھڑا ہی ورنہ کبھی کا بیٹھ گیا ہوتا۔
جب سے جمنا کا نالہ نکلا ہی اور بھی ٹھیکہ داروں نے ہاتھ صاف کیا اور عمدہ نفیس
پتھر مال مفت دل بے رحم سمجھ کر اکھاڑ لے گئے کہ دیواروں کی چھلیں کی
چھلیں کھود ڈالیں۔ تمام روکار کی پتھر کی سلیں کچھ پہلے نکالی گئیں رہی سہی اب
لوگ لے گئے کیوں کہ کوئی پرسان حال نہیں۔ گاؤں والوں نے جا بجا پکا کر
کالا کر دیا اور اس طرح اس قابل قدر عمارت کی مٹی پلید کی ہی کہ کہا نہیں جا سکتا۔ اس کا
صدر دروازہ سڑک کے جانب ہی۔ یعنی مشرق رویہ ہی۔ بیچ میں بڑی اونچی
محراب ۳۵ بلند اور ۲۸ چوڑی ہی اور داہنے بائیں طرف کی محرابیں بلندی میں
صدر محراب سے کم ۱۲ - ۹ چوڑی ہیں۔ علاوہ سنگ سرخ کے چبوترے
کے جس کا ذکر آیا نیچے ایک سنگ رخام کا چبوترا بھی ہی جو ۳ - ۳ اونچا ہی
پہلے چبوترے پر اب صرف رَبل سٹون (بن گھڑے پتھروں) کا فرش ہی۔
مغرب کی طرف باہر وار محراب میں ایک قبر بھی ہی۔ شمال کی محراب میں بھی اسی طرح
کی ایک قبر تھی جو کسی نے کھود کر پھینک دی۔ یہ گنبد سہ منزلہ ہی۔ پہلی منزل
کی نو سیڑھیاں ہیں۔ دوسری منزل کی سیڑھیاں ٹوٹ گئی ہیں اندازے سے
(۱۵) سیڑھیاں رہی ہوں گی۔ تیسری منزل کی (۱۹) سیڑھیاں ہیں۔ گنبد کے
اندر اب صرف چونے کا ایک ڈھیر ہی اُسے قبر سمجھ لو یار لوگ اس کا تعویذ تو تعویذ
پتھر تک بھی اکھاڑ لے گئے۔ فرش تو رہا ہی نہیں۔ گنبد کے اندر بہت سے
کتبات بخط طغریٰ محرابوں پر تھے مگر سب چونے میں منقش تھے بہت
سے تو پلاستر کے ساتھ جھڑ گئے جو بیچ رہے ہیں وہ اب ایسے بج لیپٹ گئے
ہیں کہ کسی طرح پڑھے نہیں جاتے۔ مغرب کی جانب کی محراب کی دونوں طرف

کلمۂ طیبہ کا طغری عجیب خوش وضع اور خوش خط ہے۔ یہ خط کوفی سے ملتا جلتا ہے مگر نئی روش ہے۔ اسی محراب کے اندر دا جانب شمال وجنوب دو طرفہ قل ہو اللہ کا طغریٰ ہے مشرق میں قل اعوذ اور مغرب میں قل اعوذ برب الفلق۔ جنوبی محراب پر یا مالک یا حافظ کا سیدھا اُلٹا طغریٰ اُدھر سے بھی پڑھ لو اُدھر سے بھی۔ محراب کی دونوں طرف یہی طغری ہے۔ اسی طرف چھوٹی محراب پر کل من علیہا فان تا والاکرام۔ یہی کتبے چاروں طرف ایک کے جواب میں ایک موجود ہیں۔ لیکن اصل کتبہ جس سے معلوم ہو سکے کہ کس کا گنبد ہے اور کب بنا ہے رہا ضرور ہوگا مگر اب نہیں ہے جب ساری سلیں سنگ مرمر کی چن چن کر لے گئے تو یہ ظالموں کے ہاتھ سے کیسے بچ سکتا تھا۔ یہ گنبد ایسا خراب وخستہ ہو گیا ہے کہ مرمت کے قابل بھی نہ رہا۔ ہزاروں روپیہ جب خرچ کیا جائے تو کچھ سنبھل سکتا ہے۔ اب بھی جا بجا سنگ سرخ کی مصفا سلیں ستون پتھر کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ جس کا جی چاہتا ہے اُٹھائے جاتا ہے۔ غالباً اس کی ایسی خستہ حالت ہی کی وجہ سے گورمنٹ نے اسے عمارات محفوظہ میں نہیں لیا۔ بہر حال موجودہ حالت میں بھی اس عالی شان عمارت کو دیکھ کر ہم اپنے ذہن میں اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب کبھی اپنی اصلی حالت میں ہوگا تو کیسا رہا ہوگا۔ چوں کہ عبد الرحیم خاں خانخاناں دور اکبری کا ایک رکن رکین تھا لہٰذا اُس کے دل چسپ حالات ہم ذرا تفصیل سے بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مولٰنا آزاد سے بہتر کون لکھ سکتا ہے لہٰذا اُسی کی نقل علی سبیل الاختصار پیش کی جاتی ہے جس میں اظہار واقعات کے علاوہ زبان کا بھی وہ مزہ ہے کہ سبحان اللہ۔ ۹۶۴ھ؁ میں بیرم خاں کا بڑا پا اقبال کی جوانی میں لہلہا رہا تھا۔ ہیموں کی مہم مار لی تھی۔ اکبر شکار کھیلتے لاہور کو چلے آتے تھے۔ جو نغمۂ بلبل کے سروں میں کسی نے آواز دی کہ بڑا ہے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو۔ فتح کی خوشی میں یہ خوش خبری نیک شگون معلوم ہوئی۔ اس لیئے بادشاہ نے جشن کیا۔ وزیر نے خزانے لٹائے اور اپنے بیگانوں کو انعام واکرام سے مالا مال کر دیا۔ یہ پھول قریب تین سال کے

ناز و نعمت کی ہوائیں اقبال کی شبنم سے شاداب تھا۔ دفعتہً خزاں کی نحوست ایسی بگولا بن کر لپٹی کہ اس کے گلبن کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا اور گھاس پھوس کی طرح مدت تک رواں دواں کرتی رہی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا ٹھکانا بھی کہیں لگے گا یا نہیں۔ ہم کا غذوں کے دیکھنے والے ترس کھاتے ہیں واے بر حال اس کے رشتہ داروں اور ہواخواہ نمک خواروں کے۔ جب اس کی اور اپنی حالت کو یاد کرتے ہوں گے تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہوں گے۔ کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا مگر حق یہ ہے کہ ایسے ہی اونچے سے گرتے ہیں جب اس قدر اونچے پہنچتے ہیں کہ دیکھنے والے تعجب کرتے ہیں۔ یہ تارہ کہاں سے نکل آیا۔ خدا تر نوالہ دے خواہ سوکھا ٹکڑا۔ ماں باپ کا ہاتھ بچوں کے رزق کا چمچہ بلکہ اُن کی قسمت کا پیمانہ ہوتا ہے۔ جب بیرم خاں کے اقبال نے منہ پھیرا اور اکبر رقیبوں کی باتوں میں آکر دہلی آن بیٹھا۔ بیرم خاں آگرے میں رہ گئے۔ یہیں سے نحوست کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔ حال یہ تھا کہ رفیق ساتھ چھوڑ کر دہلی چلے جاتے ہیں۔ عرضیاں جاتی ہیں تو اُلٹے جواب آتے ہیں۔ عرض معروض کے لیئے وکیل پہنچتا ہے تو قید۔ دربار کے طور بے طور۔ خبر آتی ہے تو وحشت ناک بچہ معصوم ان رازوں کو نہ سمجھتا ہوگا مگر اتنا تو ضرور دیکھتا ہوگا کہ باپ کی مجلس میں رونق نہیں۔ وہ امرا اور درباریوں کی بھیڑ بھاڑ کیا ہو گئی۔ باپ کس فکر میں ہے کہ میری طرف نہیں دیکھتا۔ بیرم خاں بے چارہ کیا کرے کبھی بنگالے کا ارادہ کرتا ہے۔ کبھی گجرات کا کہ حج کو چلا جائے اودھر رستہ نہیں پاتا۔ راجپوتانے کا رخ کرتا ہے۔ چند روز ادھر اُدھر پھرتا ہے۔ آخر پنجاب کو آتا ہے۔ کنجا ساتھ اپنے حال کو سنبھالے کہ عیال و اطفال کو۔ آخر حرم سرا اور جواہر خانہ توشہ خانہ وغیرہ بہت سے لوازمات اور اسباب کو بھٹنڈے میں چھوڑا اور آپ پنجاب میں آیا۔ بھٹنڈے کا حاکم اپنا نمک پروردہ۔ خاک سے اُٹھایا ہوا ہاتھوں کا پالا ہوا۔ چھوٹے سے بڑا کر کے حکومت تک پہونچایا ہوا اس نے مال و عیال کو ضبط کر کے روانہ دربار کر دیا۔ دہلی میں آکر سب قید۔ اسباب خزانے میں داخل وہ تین چار برس کا

بچہ روز کی پریشانی اور بے سروسامانی اور گھر والوں کی سرگردانی۔ روز نئے شہر نئے جنگل دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا کہ یہ کیا عالم ہے اور ہم کہاں ہیں۔ میری ہواخوری کی سواریوں اور سب کی دلداریوں میں کیوں فرق آ گیا۔ جو لوگ ہاتھوں کی جگہ آنکھوں پر لیتے تھے وہ کیا ہو گئے۔ اس حالت کی تصویر سے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ باپ دربار سے رخصت ہو کر حج کو چلا۔ گجرات پٹن پر ڈیرے ہیں ابھی سورج جھلکتا ہے شام قریب ہے خیال یہ کہ اب خانخاناں آتا ہے خبر آئی کہ وہ تو مارا گیا۔ اس کے مرتے ہی فوج میں تلاطم مچ گیا۔ پل کی پل میں گھر بار افغانوں نے لوٹ لیا۔ کوئی گھٹڑی لیئے جاتا ہے کوئی صندوقچہ کسی نے مسند گھسیٹ لی کوئی بچھونا لے چلا۔ اس بے کس مردے کے کپڑے تک اتار لیئے۔ لاش بے جان کو کفن کون دے کہ اپنی ہی جان کا ہوش نہیں۔ وہ تین برس کی جان کیا کرتا ہوگا۔ سہم کر رہ جاتا ہوگا ماں کی گود میں دبکتا ہوگا ڈرتا ہوگا انا کے پاس چھپ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بچاریاں کہاں چھپالیں کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی تیری پناہ۔ عجب وقت ہوگا۔ شام غریباں اسی شام کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گزری دن ہوا تو روز محشر۔ محمد امین دیوانہ اور زنبور وغیرہ لشکروں کے لڑنے والے تھے۔ اس وقت کچھ نہ بن آتی تھی۔ پھر بھی ہزار رحمت ہے کہ لٹے قافلے کو سمیٹا اور احمد آباد کو اڑے جاتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں تو پلٹ کر ایک ہاتھ مار جاتے ہیں۔ اس وقت ان پاشکستہ عورتوں کو جن میں سلیمہ سلطان بیگم اور یہ تین برس کا بچہ بھی شامل ہے نکلنا غنیمت ہے۔ لٹیرے اب بھی دست بردار نہیں ہوے پیچھے پیچھے لوٹتے مارتے چلے آتے ہیں۔ معصوم بچہ سہما ہوا ادھر ادھر دیکھتا ہے اور رہ جاتا ہے۔ کون دلاسہ دے اور دے تو ہوتا کیا ہے۔ الٰہی وہ وقت تو دشمن ہی کو نصیب کیجو۔ ان مصیبت زدوں نے لڑتے مرتے احمد آباد میں جا کر دم لیا۔ کئی دن میں گئے ہوے حواس ٹھکانے آئے۔ صلاح ہوئی کہ دربار کے سوا پناہ نہیں ہے۔ پھر چلنا چاہیئے۔ چنانچہ چار مہینے کے بعد ضروری سامان بہم پونہچا کر روانہ ہوئے۔ یہاں بھی خبر پونہچ گئی تھی چغتائی دریا دلی اور اکبری عفو و کرم کے

دریا میں لہر آئی۔ ان کے لیئے فرمان بھیجا۔ خان خاناں کے مرنے کا رنج والم اور اُن کی تباہی کا افسوس تھا۔ ساتھ ہی بڑے دلاسے اور دلداری کے ساتھ لکھا کہ عبد الرحیم کو تسلی دو اور بڑی خبرداری اور ہوشیاری سے لے کر دربار میں حاضر ہو۔ یہ اطمینان کا تعویذ انھیں جالور میں ملا۔ بڑا سہارا ہو گیا ہمت بندھ گئی اور حضور میں پوہنچے۔ اس لٹے قافلے کے واسطے وہ وقت عجب مایوسی اور حیرانی کا عالم ہوگا جب کہ باباز نبور سب تباہی زدوں کو لے کر آگرے میں پوہنچے ہوں گے۔ عورتوں کو محل میں اُتارا ہوگا۔ اس یتیم بچے کو جس کا باپ ایک دن دربار کا مالک تھا۔ بادشاہ کے سامنے لا کر چھوڑ دیا ہوگا اندر شکستہ پا عورتوں کے دل دھکڑ دھکڑ باہر اُس کے قدیمی نمک خوار دعائیں کرتے ہوں گے کہ الٰہی باپ کی خدمتوں کو پیش نظر لائیو۔ چغتائی سلسلے میں ان چند بادشاہوں کا حال خطا بخشی کے معاملے میں قابل تعریف ہے۔ دشمن بھی سامنے آتا تھا تو آنکھ جھک جاتی تھی۔ بلکہ اُس کی جگہ خود شرمندہ ہو جاتے تھے۔ خطا کا ذکر نہ تھا۔ بھلا یہ تو بچہ معصوم تھا وہ بھی بیرم کا بیٹا جس وقت سامنے لائے۔ اکبر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے گود میں اُٹھا لیا۔ اُس کے لیئے وظیفے اور تنخواہیں بیش قرار مقرر کیں اور کہا کہ اس کے سامنے کوئی خان بابا کا ذکر نہ کیا کرو۔ بچہ ہے دل کڑھے گا باباز نبور نے عرض کر کہا حضور یہ باربار پوچھتے ہیں راتوں کو چونک اُٹھتے ہیں کہ کہاں گئے۔ اب تک کیوں نہیں آئے۔ اکبر نے کہا کہہ دیا کرو کہ حج کو گئے ہیں۔ خانہ خدا میں پہنچ گئے بچہ ہے باتوں میں بہلا لیا کرو۔ دیکھو اسے ہر طرح خوش رکھو۔ اسے یہ نہ معلوم ہو کہ خان بابا سر پر نہیں۔ باباز نبور یہ ہمارا بیٹا ہے۔ اسے ہمارے پیش نظر رکھا کرو ۹۶۹ھ میں یہ واجب الرحم بچہ دربار اکبری میں پونہچا تھا۔ اس کے باپ کے جانی دشمن اب ارکان دولت تھے۔ وہ یا اُن کے خوشامدی ہر وقت حضور میں رہتے تھے۔ اکثر ایسے تذکرے کرتے تھے۔ جن سے بیرم خاں کی باتیں اکبر کو یاد آ جائیں۔ اور اُس کی طرف سے کھٹک جائے۔ اکثر ان میں سے کھلم کھلا سمجھاتے تھے لیکن اکبر کی نیک نیتی اور اس لڑکے کا اقبال تھا۔

کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ غیروں کے دل میں اُن باتوں سے رحم پیدا ہوتا تھا۔ اکبر اُسے مرزا خاں کہا کرتا تھا۔ ہونہار لڑکا اکبری سایہ میں پرورش پانے لگا اور بڑا ہو کر ایسا نکلا کہ مورخ اُس کی لیاقت علمی کی گواہی دیتے ہیں۔ بلکہ علمیت سے زیادہ تیزی فکر اور قوت حافظے کی تعریف لکھتے ہیں علوم وفنون کی کیفیت اور انتہائے تحصیل اور حد تحصیل کی شرح کسی نے نہیں کھولی۔ قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ابتدائے عمر کو اور امیرزادوں کی طرح کھیل کود میں برباد نہیں کیا کیونکہ جب وہ بڑا ہوا تو علمار کا قدردان تھا۔ اہل تصنیف اور شعرار کو عزیز رکھتا تھا۔ خود بھی شاعر تھا۔ زبان عربی سے واقف تھا اور بے تکلف بولتا تھا۔ زبان ترکی اور فارسی جو اس کے باپ دادا کی میراث تھی اُسے جانے نہ دیا۔ حاضر جواب۔ لطیفہ گو۔ بذلہ سنج۔ بلبل ہزار داستان تھا۔ سنسکرت میں بھی اچھی لیاقت حاصل کی تھی۔ فن جنگ میں اعلیٰ درجے کی لیاقت رکھتا تھا اس کے باپ کے چند وفادار جاں نثار ساتھ تھے۔ جو محبت کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے اور اپنی قسمتوں کو اس ہونہار باقبال کے ہاتھ بیچے بیٹھے تھے۔ اس اُمید پر کہ اس کے ہاں مینہ برسے گا تو ہمارے گھر میں بھی پرنالے گریں گے۔ حرم سرا میں کچھ شریف زادیاں اور پرستاریں تھیں جو وفاداری کے ساتھ بےکسی اور بےبسی کی چادروں میں لپٹی بیٹھی تھیں۔ حسرت وارمان۔ امید وناامیدی اُن کے خیالوں میں ایک طلسمات بناتی تھی۔ ایک بگاڑتی تھی۔ بادشاہی دربار خدائی عجائب خانہ تھا۔ امیر اور سردار کہ وہاں سے جواہر کی پتلیاں بن کر نکلتے تھے۔ اس کے رفیق دیکھتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ دل میں کہتے تھے کہ ایک دن اس کا باپ جس کو چاہتا تھا اُسے جواہرات اور موتیوں میں چھپا دیتا تھا کاش بیٹا ویسے انعاموں میں ہی شامل ہو جائے اُس میں سب قدرت ہے وہ چاہے تو پھر وہی تماشہ دکھائے۔ دن۔ رات۔ صبح شام۔ آدھی رات آسمان کی طرف ہاتھ تھے خدا کی طرف دھیان تھے۔ دل آمین آمین کہہ رہے تھے۔ مرزا خاں نہایت حسین تھا۔ باہر نکلتا تھا تو رستے کے لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ناواقف خواہ مخواہ

پوچھتے تھے کہ یہ کون خان زادہ ہے ..... اکبر خوب جانتا تھا کہ ماہم خیل والے امرا اور دربار کے کون کون سے سردار ہیں جو اس سے او اس کے باپ سے ذاتی عناد رکھتے ہیں اس واسطے ماہ بانو بیگم خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی بہن سے مرزا خاں کی شادی کردی تاکہ اس کی حمایت نے اپنے بھی دربار میں تاثیر پھیلے۔ ۹۷۳ھ میں اس کے میدان خوش نصیبی میں ایک مبارک شگون کا جلوہ نظر آیا۔ اکبر خان زماں کی مہم پر تھا اس نے عفو تقصیر کے لئے التجا کی اور پنجاب سے خبر پہنچی تھی کہ محمد حکیم مرزا کابل سے فوج لے کر آیا۔ لاہور تک پہنچ گیا ہے۔ اکبر نے خان زماں کی خطا معاف کر کے ملک اس کا برقرار رکھا اور پنجاب کے بندوبست کے لئے چلا۔ مرزا خاں کو خلعت اور منصب عطا کر کے منعم خاں خطاب دیا (حالانکہ منعم خاں زندہ موجود) اور چند امرا صاحب تدبیر اس کے ساتھ آگرے کو رخصت کیا کہ دارالسلطنت کے انتظام اور حفاظت میں سرگرم رہیں۔ خان خاناں کا خطاب بھی خوب ملا باپ اور بیٹے میں کچھ دور کا فرق نہیں۔ اس کے ستارۂ طلوع یا جوہر مردانگی کی چمک تیرھویں صدی میں ہر خاص و عام کو نظر آئی جب کہ ۹۸۰ھ میں خان اعظم مرزا عزیز کوکہ احمد آباد گجرات میں محصور ہوا اور اکبر دو مہینے کی منزلیں سات دن میں طے کر کے گجرات پر جا کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے کہنہ عمل سردار رہ گئے تیرہ برس کے لڑکے کی کیا بساط ہوتی تھی۔ وہ قدم بقدم بادشاہ کے ہم رکاب تھا اس کے دل کا جوش اور بہادری کی امنگ دیکھ کر اکبر نے اسے قلب لشکر میں قایم کیا جو عمدہ سپہ سالاروں کی جگہ ہے۔ اب وہ اس قابل ہوا کہ ہر وقت دربار میں رہنے لگا اور کاروبار حضور کا سرانجام کرنے لگا۔ اکثر کاموں کے لئے بادشاہ کی زبان پر اسی کا نام آنے لگا ۹۸۳ھ میں احمد آباد کی حکومت مرزا خاں کو دی گئی۔ اس وقت اس کی عمر انیس بیس برس کی ہو گی۔ اکبر نے چار امیر تجربہ کار اس کے ساتھ کئے اور سمجھا دیا کہ عنفوان شباب ہے اور اول خدمت ہے جو کام کرنا وزیر خاں کی صلاح سے کرنا۔ میر علاء الدولہ قزوینی کو امینی پر بٹھایا کہ اس کو کہ حساب دانی میں فرد تھا دیوانی سید مظفر بارہا کو بخشی گری فوج پر معزز کیا

خان خاناں کبھی اپنے علاقے میں کبھی دربار میں کبھی متفرق خدمتیں بجا لاتا تھا اور جوہر قابلیت دکھاتا تھا۔ ۹۸۸ھ میں عرض بیگی کی خدمت سپرد کی گئی۔ اسی سنہ میں صوبۂ اجمیر کے علاقے میں فساد ہوا۔ رستم خاں صوبہ دار اجمیر مارا گیا۔ اس میں راجگان کچھوا ہا کی سرشوری بھی شامل تھی کہ راجہ مان سنگھ کے بھائی بند تھے۔ اکبر کو ہر پہلو کا خیال رہتا تھا چنانچہ رنتھنبور خان خاناں کی جاگیر میں دے کر حکم دیا فتنے کو فرو کرے اور مفسدوں کو فساد کی سزا دے۔ ۹۹۰ھ میں جب کہ شاہزادے سلیم یعنی جہانگیر کی عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی اور خان خاناں اٹھائیس برس کا ہوگا۔ اسے شاہزادے کا اتالیق مقرر کیا۔ دیکھنے کے قابل یہ امر ہے کہ ہونہار نوجوان نے اپنے علوم و فنون۔ اوصاف کمالات۔ آداب اخلاق عادات و اطوار۔ متانت و سخاوت سے ایسے ہی عمدہ نقش بادشاہ کے دل پر بٹھائے ہوں گے کہ بڑے بڑے کہن سال کارگزار امیر موجود تھے ان کے ہوتے ولی عہد کی اتالیقی کے لیئے اس پر صاد کیا۔ غرض جب منصب جلیل اسے عطا ہوا تو اس نے بہ ادائے شکرانہ جشن شاہانہ کا سامان کیا اور رونق افروزی کے لیئے بادشاہ کی خدمت میں التجا کی۔ بادشاہ تشریف لے گئے۔ مینہ کو برسنا دریا کو بہاؤ اور بیرم خاں کے بیٹے کو دریا دلی کون سکھائے قلعے سے لے کر اپنے گھر تک سونے چاندی کے پھول لٹائے۔ گھر قریب آیا تو موتی برسائے پا انداز میں مخمل اور زربفت بچھائے۔ گھر میں سوا لاکھ روپے کا چبوترہ بنایا اُس پر بادشاہ کو بٹھا کر نذر دی۔ وہاں سے اُٹھا کے دوسری بارگاہ میں لے گیا چبوترہ لٹوا دیا۔ جواہر اور موتی نثار کیئے۔ امراء نے لوٹے۔ پیشکش میں جواہرات۔ ملبوسات۔ اسلحہ کو کہ خزاین سلطانی میں رکھنے کے قابل تھے۔ عمدہ ہاتھی۔ اصیل گھوڑے کہ بادشاہی خزانوں کی زینت تھے پیش کش گزرانے اور امرائے دربار کو بھی حسب مراتب عجائب غرائب تحفوں سے خوش کیا اور خوش ہوا۔ مرزا خاں کی جوہر لیاقت کا چشمہ جو مدت سے بند پڑا تھا ۹۹۱ھ میں فوارہ ہو کر اُچھلا گجرات میں طرح بطرح کی بدنظمیاں اور بلوے ہو رہے تھے جن کی تفصیل باعث طوالت ہے۔ اکبر بادشاہ تھا اور صاحب

اقبال تھا کچھ پروانہ کی۔ امرائے دربار میں سے سادات بارہ۔ اکثر ایرانی دلاور اور سورما راجپوت۔ راجہ اور ٹھاکر اس مہم کے لیئے نامزد کیے لشکر جرار آراستہ کیا اُس پر نوجوان مرزا خاں کو جس کا اقبال بھی جوانی پر تھا۔ سپہ سالار کیا۔ کار آزمودہ کہنہ عمل سردار فوجیں دے کر ساتھ کیئے۔ قلیچ خاں کو فرمان گیا کہ مالوہ پونہچو اور وہاں سے امرا کو لے کر مہم میں شامل ہو۔ اضلاع دکن میں جو سردار تھے اُنھیں بھی زور شور سے احکام پونہچے کہ جلد میدان جنگ پر حاضر ہوں۔ مرزا خاں اپنے رفقا کو لے مارا مار چلا۔ کوہ و بیابان دریا اور میدان کو لپیٹا سمیٹتا جالور کے رستے پٹن کو چلا جاتا تھا مگر جو خبر پونہچتی تھی پریشان پونہچتی تھی اس لیئے سوچ سمجھ کر قدم اُٹھاتا تھا۔ یہاں سب عید کے چاند کی طرح اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے بعض سردار سروہی تک آگے آئے اور سارے حالات سنائے۔ بڑی بڑی مبارک بادیں ہوئیں وہ فقط دن بھر ٹھیرا اور برق و باد کی طرح اُڑ کر پٹن پر ڈیرے ڈال دیئے۔ امرا اور فوجیں استقبال کر کے لائے۔ شادیانے بجے۔ مظفر گجراتی سلطان محمود کا بیٹا جو گمنامی کے ویرانوں میں بیٹھا تھا باغی اُسے بادشاہ بنانے کی فکر میں تھے اُس نے تیس ہزار فوج جمع کر لی تھی اور خانخاناں کی طرف آٹھ نو ہی ہزار تھی بڑے بڑے معرکے ہوئے گھمسان لڑائیاں رہیں آخر کار نادولت پر وہ نامظفر ہو کر بھاگ گیا۔ مرزا خاں احمد آباد میں آکر ملک و رعیت کے انتظام میں مصروف ہوا۔ دربار میں عرض داشت پڑھی گئی۔ اکبر بہت خوش ہوا۔ فرمان بھیج کر سب کے دل بڑھائے مرزا خاں کو خطاب خان خانی۔ خلعت با اسپ و کمر خنجر مرصع۔ تمن توغ منصب پنج ہزاری کہ انتہائے معراج امرا کی ہے عنایت ہوا۔ اقبال کی کامیابی عہد سے کی ترقی غرض اس وقت مرزا خاں کی عمر کم و بیش بیس برس کی ہوگی کہ وہ دولت خدا نے دی جو باپ کو بھی اخیر عمر میں جا کر نصیب ہوئی تھی۔ ۹۹۲ھ میں مظفر نے تیسری دفعہ سر اُٹھایا مگر پھر شکست کھائی۔ ۹۹۷ھ میں خان اعظم کو احمد آباد گجرات عنایت ہوئی اور خان خاناں مع امرائے فتح یاب بلائے گئے۔ باپ کے مراتب میں سے وکیل مطلق کا منصب برسوں ہوئے کہ نکل گیا تھا ٹوڈرمل کے

مرنے سے ۹۹۸ھ میں پھر قبضے میں آیا۔ احمد آباد گجرات کے عوض جونپور عنایت ہوا۔ ۹۹۹ھ ۱۵۹۱ء میں بادشاہ نے ملتان اور بھکر کو خان خاناں کی جاگیر کیا۔ اور ٹھٹے اور قندہار کی مہم پر بھیجنا قرار پایا اکبر نے دیکھا کہ شہزادگان صفوی جو سلطنت ایران کی طرف سے حاکم ہیں وہ شاہ سے آزردہ ہیں۔ اور آپس میں لڑ رہے ہیں اور رعایا ادھر رجوع ہے۔ بیرم خاں نے مدت تک وہاں حکومت کی ہے خان خاناں ملتان کے رستے فوج لے کر جائیں۔ انھوں نے کچھ تو اس سبب سے کہ وہاں کے معاملات جیسے اب دیکھتے ہو اس وقت اس سے بھی زیادہ پیچیدہ اور خطرناک تھے دوسرے ہندوستانی لوگ برخانی ملکوں کے سفر سے بہت ڈرتے ہیں اور یہاں کی فوج میں زیادہ تر ہندوستانی ہوتے ہیں۔ غرض کچھ اپنی رائے سے کچھ رفیقوں کی صلاح سے عرض کی کہ پہلے ٹھٹے کا ملک میری جاگیر میں کر دیا جائے پھر قندہار پر فوج لے کر جاؤنگا وہ جانتا تھا کہ گجرات کے جنگل میں نقارے بجاتے پھرے یہ اور بات ہے قندہار شہد کا چھتا ہے اور ایران توران ہر ایک کا اس پر دانت ہے دو غنیموں کے منہ سے شکار چھینا اور سامنے بیٹھ کے کھانا کچھ بچوں کا کھیل نہیں۔ انھوں نے پھر کہا کہ قندہار فقط نام کا میٹھا ہے۔ ملک بھوکا ہے۔ حاصل خاک نہیں بلکہ خرچ ہیں کہ جن کا کچھ حساب نہیں اور میرے پاس اس وقت کچھ نہیں میں بھوکا سپاہ بھوکی خالی کیسہ لے کر جاؤں گا تو کروں گا کیا؟ جب ملتان سے بھکر اور ٹھٹے تک تمام ملک سندھ میں اکبری نقارہ بجے گا سمندر کا کنارہ اکبری تصرف میں ہوگا تو قندہار خود بخود ہاتھ آ جائے گا۔ بہر حال۔ قندہار کو روانہ ہوئے رستے میں مرزا جانی حاکم ٹھٹے سے مڈبھیڑ ہوئی مرزا جانی کے ایلچی حاضر ہوئے۔ ملتان سے نکلتے ہی بلوچوں کے سردار نے حاضر ہو کر عہد و پیمان تازہ کیے۔ قلعۂ سیوان کے نیچے سے نکل کر لکّی کو مار لیا اور کنجی سندھ کی ہاتھ آ گئی۔ سپہ سالار نے قلعۂ سیوان کا محاصرہ کر لیا اور فتح کر لیا۔ یہ قلعہ ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ چالیس گز خندق سات گز کی مضبوط فصیل۔ گرد لوہے کی دیوار تھی۔ آٹھ کوس لمبا چھ کوس چوڑا

نیں کشتیں دریا کی وہاں ملتی ہیں۔ رعایا کچھ جزیرے میں اور کچھ کشتیوں میں رہتی تھی۔ مرزا جانی سنتے ہی فوج لے کر آیا۔ بادشاہی فوج بہت تھی جا بجا معرکے کرتے تھے چنانچہ اکثر مقام قبضے میں آئے اور رعایا نے اطاعت کی۔ امرکوٹ کا راجہ اطاعت کر کے مدد کو طیار ہوا۔ ملک ریگستان پانی نایاب جا فوج بادشاہی اس رستے گئی تھی عجب مصیبت میں گرفتار ہوئی نگاہیں خدا کی طرف لگی تھیں کہ اقبال اکبری نے یاوری کی بے موسم بادل آیا اور مینہ برس گیا تالاب بھر گئے۔ خدا نے اپنے بندوں کی جانیں بچا لیں۔ مرزا جانی گھبرا گیا مگر فوج کی بہتات اور لڑائی کے سامان پر خاطر جمع تھی۔ جگہ کی مضبوطی دل کو قوی کرتی تھی۔ برسات کا بھی بھروسہ تھا وہ سمجھا ہوا تھا کہ نہریں نالے دریا سے زیادہ چڑھ جائیں گے بادشاہی لشکر آپ گھبرا کر اٹھ جائے گا نہ جائے گا تو گھر جائے گا۔ ادھر بادشاہی فوج کو غلے کی کمی نے بہت تنگ کیا سپہ سالار نے دربار کو عرض کی۔ اکبر کا خیال دریا کے بہات کی مچھلی تھا۔ امرکوٹ کے رستے ادھر سے بہت کشتیوں میں غلہ اور جنگی سامان توپ تفنگ تلوار اور لاکھ روپیہ نقد فوراً روانہ ہوا۔ مرزا جانی سنجیدہ ان جنگ سے بھاگ کر ہالہ کنڈی سے جانب سیوان سے چالیس کوس دریائے سندھ کے کنارے پر جا کر دم لیا۔ اور قلعہ بنا کر بیٹھ گیا خان خاناں بھی پیچھے پیچھے پہنچا اور محاصرہ کر لیا۔ لڑائی دن رات جاری تھی کہ وبا پھیلی۔ اہل قلعہ تنگ ہو کر زبان حال بزبان صلح کی کہانیاں سنانے لگے۔ باقی بادشاہی لشکر بھی خوراک سے تنگ ہو گیا تھا منظور کیا۔ عہد یہ ہوا کہ سیوستان کا علاقہ قلعۂ سیوان سمیت اور بیس جنگی کشتیاں نذر کرے۔ مرزا ایرج سپہ سالار کے بیٹے کو اپنی بیٹی دے اور برسات بعد حاضر دربار ہو۔ خان خاناں نے جنگی مورچے اٹھائے اور لڑائی کے میدان میں شادی کے شامیانے تن گئے خان خاناں کے دربار میں ملا شکیبی شاعر نے اس لڑائی کی سرگزشت مثنوی میں ادا کی۔ خان خاناں اس شعر پر بہت خوش ہوا اور اسی وقت ہزار اشرفی انعام دی

ہمائے کہ بر عرش کردے خرام　　　گرفتی و آزاد کردی ز دام

مرزا جانی بھی دربار میں موجود تھے انہوں نے بھی ہزار ہی اشرفی دی اور کہا

مرحمت خدا کہ مرا بما گفتی اگر شغال می گفتی زبانت کہ می گرفت ؟ ۱۰۰۳ھ کے جشن نوروزی میں خان خاناں اسے لے کر حاضر ہوئے وہ کورنش اور آداب زمین بوس بجالایا۔ تین ہزاری منصب اور ٹھٹے کا ملک عنایت ہوا اور اس قدر عنایتیں فرمائیں کہ اسے اُمید بھی نہ تھی۔ اکبر کو دریائی قوت بڑھانے کا بڑا خیال تھا۔ چنانچہ اس موقع پر تمام علاقہ اُس کا اُسی کو دے دیا مگر بندرگاہ خالصہ ہو گئے ۱۰۰۴ھ میں خان خاناں کو پھر دکن کا سفر پیش آیا۔ اکبر کو ملک دکن کا خیال اور خان اعظم کی ناکامی کا حال بھولا نہ تھا۔ جو سفارتیں گئی تھیں وہ بھی ناکام رہیں۔ فیضی بھی برہان الملک کے دربار سے کامیاب نہ آیا تھا کہ برہان الملک فرماں روائے احمد نگر مر گیا۔ ملک تو مدت سے تہ و بالا ہو رہا تھا اب معلوم ہوا کہ تیرہ چودہ برس کا لڑکا تخت نشین ہوا اور تختۂ حیات اُس کا بھی کنارۂ عدم پر لگا چاہتا ہے۔ اکبر نے شاہزادۂ مراد کو لشکر عظیم کے ساتھ دکن پر روانہ کیا۔ امرائے عادل شاہ فوج لے کر آئے کہ ملک کا انتظام کریں۔ ابراہیم لشکر لے کر مقابلے کو گیا۔ احمد نگر سے چالیس کوس پر دونو فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ ابراہیم نے گلے پر تیر کھا کر جان دی۔ سبحان اللہ کل بھائی کو اندھا کر کے ہوش کی آنکھوں میں سرمہ دیا تھا۔ آج خود دنیا سے آنکھیں بند کر لیں۔ ملک میں طوائف الملوکی ہو کر عجب ہل چل پڑ گئی میاں منجو نے مراد کو عرضی بھیجی کہ یہ ملک لاوارث ہو گیا۔ مملکت برباد ہو رہی ہے حضور تشریف لائیں تو خانہ زاد خدمت کو حاضر ہیں۔ اکبر کو جب یہ خبر پہنچی تو خان خاناں کو روانگی کا حکم دیا اور شاہزادے کو لکھا کہ تیار ہو مگر خان خاناں کے پہنچنے تک حملے میں تامل کرو اور احمد نگر میں جا پڑو۔ خان خاناں برہان پور کے پاس پہنچا تو راجی علی خاں حاکم خاندیس سے ملاقات ہو گئی اُنھوں نے اسے بھی رفاقت پر آمادہ کیا۔ اتنے میں شاہزادے کا فرمان آیا کہ مہم خراب ہوتی ہے جلد حاضر ہو۔ صادق محمد خاں وغیرہ سرداران ہمراہی شاہزادہ خان خاناں کی آمد سن کر اس خیال سے کہ وہ آگیا تو ہم بالائے طاق اور اس کی روشنی سے شاہزادے کا چراغ بھی مدھم ہو جائے گا۔ اُنھوں نے پھونک دیا کہ اس کے آنے سے حضور کے اختیارات میں فرق آئے گا

اور اب جو فتح ہوگی اُس کے نام ہوگی۔ خان خاناں نے لکھا کہ راجی علی خاں آپ کو حاضر ہوا اور فدوی چلا آیا تو اُس مصلحت میں خلل آجائے گا شہزادے کے دل میں کدورت تو ہوتی ہی جاتی تھی اب بہت بڑھ گئی۔ خان خاناں کو پل پل کی خبر ملتی تھی۔ اپنا لشکر۔ فیل خانہ۔ توپ خانہ وغیرہ وغیرہ اکثر امرا کو پیچھے چھوڑا۔ آپ راجی علی خاں کو ساتھ لے کر دوڑے۔ شہزادہ بیس ہزار لشکر لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔ اُنھوں نے مارا مار احمد نگر سے تیس کوس پہ جا لیا۔ لگانے والوں نے ایسی نہ لگائی تھی جو بجھ بھی سکے پہلے دن تو سلام ہی نصیب نہ ہوا۔ خان خاناں حیران کہ ہزار کارسازیوں سے میں ایسے شخص کو ساتھ لایا جس کی رفاقت فتح و اقبال کی فوج ہے۔ یہ حسن خدمت کا انعام ملا۔ دوسرے دن ملازمت ہوئی تو شہزادہ تیوری چڑھائے منہ بنائے۔ یہ بھی خان خاناں تھے رخصت ہو کر اپنے خیموں میں آئے مگر بہت رنجیدہ اور متفکر۔ اُس وقت سب کی آنکھیں کھلیں اور جس طرح ہوا صفائی ہو گئی۔ مگر اس سے یہ قاعدہ معلوم ہو گیا کہ ایک بالیاقت اور باسامان شخص جو سب کچھ کر سکتا ہے وہ ماتحت ہو کر کچھ نہیں کر سکتا بلکہ کام خراب ہوتا ہے اور وہ خود بھی خراب ہوتا ہے۔ اب ادھر کا حال سنو کہ چاند بی بی برہان الملک کی حقیقی بہن۔ حسین نظام شاہ کی بیٹی۔ علی عادل شاہ کی بی بی علاوہ عظمت خاندانی اور عفت ذاتی کے اپنی عقل و تدبیر اور سخاوت و شجاعت۔ قدردانی۔ کمال پروری کے جواہرات کی جڑاؤ پتلی تھی اس واسطے نادرۃ الزمانی کہلاتی تھی اور وہی ملک کی وارث رہ گئی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ ملک چلا اور خاندان کا نام مٹتا ہے تو چہرے کی نقاب سے ہمت کی کمر باندھ کر کھڑی ہو گئی اور امرا کو بلا کر تسلی اور دلاسے کے ساتھ سمجھایا وہ بھی اکبری لشکر کو دریا کی طرح لہراتا دیکھ کر اپنے اور ملک کے انجام کو سوچے۔ جو عرضیاں شہزادے کو اور اس سے خان خاناں کو بھیجی تھیں اُن پر بہت پچھتائے۔ سب نے مل کر مشورت کی صلاح ٹھیری کہ چاند بی بی قلعۂ احمد نگر میں سلطنت کی وارث بن کر تخت پر بیٹھے ہم حق نمک ادا کریں اور جہاں تک ہو سکے احمد نگر کو بچائیں۔ اس شاہ مزاج بیگم نے لڑائی کا سامان جمع کرنا شروع کیا۔ احمد نگر کو مضبوطی اور مورچہ بندی سے

سید سکندر بنا لیا۔ بہادر شاہ بن ابراہیم شاہ کو برائے نام وارث ملک قرار دے کر
تخت پر بٹھایا۔ ایک سردار کو بیجاپور بھیج کر ابراہیم عادل شاہ سے صلح کر لی۔ جمعیت
دل شکر کو لے کر اپنی جگہ قایم ہو گئی اور اس استقلال و انتظام سے مقابلہ کیا کہ
مردوں کے ہوش اڑ گئے اور خاص و عام میں چاند بی بی سلطان کا نام ہو گیا۔
یہاں یہ انتظام تھا کہ شاہزادۂ مراد فوج جرار کو لیئے شمال احمد نگر سے اس طرح
گرا جیسے پہاڑ سے سیل دریا۔ یہ فوج میدان نمازگاہ میں ٹھیری اور ایک دستۂ فوج کا
چبوترے کے میدان کی طرف بڑھا۔ چاند بی بی نے قلعے سے دکھنی بہادروں کو
نکالا دونوں طرف سے تیر تفنگ چلے قلعے کے مورچوں سے گولے بھی
مارے اس لیئے فوج شاہی آگے نہ بڑھ سکی شام ہو گئی تھی۔ شاہزادہ
اور تمام امیر باغ بہشت میں اتر پڑے۔ دوسرے دن شہر کی حفاظت
اور اہل شہر کی دلداری میں مصروف ہوئے۔ گلی کوچوں میں امان کی منادی کر دی
گئی اور سب کی خاطر جمع ہو گئی۔ دوسرے دن پھر کمیٹی ہوئی اور محاصرے کا انتظام
ہوا اور مورچے تقسیم ہو گئے۔ یہاں تو یہ کچھ ہو رہا تھا ادھر شہباز خاں کمبو کو دلاوری کا
جوش آیا شہزادے اور سپہ سالار کو خبر بھی نہ کی جمعیت کثیر لے کر خوب لوٹ
مچائی۔ دم کے دم میں سارا شہر لٹ کر ستیاناس ہو گیا۔ شہزادے اور خانخاناں کو
جب خبر ہوئی تو اسے بلا کر سخت ملامت کی۔ غارت گروں نے قتل۔ قید قصاص
سے سزائیں پائیں مگر کیا ہو سکتا تھا جو ہونا تھا ہو چکا۔ . . . . بادشاہی لشکر گرد
پڑا تھا۔ مورچے امرا میں تقسیم تھے سب زور مارتے تھے اور کچھ نہ کر سکتے
تھے۔ شہزادے کی سرکار میں فتنہ انگیز کوتہ اندیش جمع ہو گئے تھے میدان
میں دہادانہ مارتے تھے۔ ہاں دربار میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر خوب
تیغ مارتے تھے۔ شہزادے کی تدبیر میں اتنا زور نہ تھا کہ ان کی شرارتوں کو
دبا سکے اور آپ وہ کرے جو کہ مناسب ہو یہ بات غنیم سے لے کر اس کی
رعایا تک سب جان گئے تھے۔ بنجارے رستے میں لٹتے تھے۔ رسد کی
تنگی تھی اندر سے گولے برستے تھے قلعے کی اینٹ نہ ہلتی تھی۔ نفاق و حسد کا
منہ کالا کرتے دھرتے کچھ نہ تھے صرف منہ دیکھنے کے دبکنے رہ جاتے تھے

ہزار طرح کی کوشش اور لاکھ جاں کاہی سے مورچے بڑھا کے تین سرنگیں
برجوں کے نیچے پہنچیں مگر اس بی بی نے اپنی ہمت اور جاسوسوں کی
تلاش سے پتہ لگا کر دو سرنگوں کے سرے نکال لیئے۔ دبا دبے سے
ایک دن پہلے زمین کھود کر باروت کے تھیلے کھینچ لیئے۔ طرہ اس پر یہ کہ پانی
اتنا ڈلوایا کہ آگ کی جگہ پانی اُبلنے لگا۔ قلعے والے تیسری نقب کی فکر میں تھے کہ
اُدھر سے حملہ ہو گیا حکم ہوا کہ فتیلوں کو آگ دکھاؤ۔ واہ واہ صادق محمد خان فتیلوں کی
دیا سلائی اور انھیں کی سرنگ پانی پانی پائی۔ دوسری کو آگ دی وہ بھی فش
تیسری اُڑی کہ یہی سب سے بڑی تھی۔ پچاس گز دیوار گری۔ عجب قیامت
نمودار ہوئی۔ دنیا دھواں دھار ہو گئی۔ الٰہی تیری امان۔ پتھر اور آدمی کبوتروں
کی طرح ہوا میں اُڑے جاتے تھے اور قلابازیاں کھاتے زمین پر آتے تھے
اور کہیں کے کہیں کوسوں پر جا پڑے۔ امرا میں سے کسی نے دھاوا نہ کیا اپنی اپنی
جگہ جی چرا گئے۔ آپس کی پھوٹ سے بڑا وار خالی کھویا۔ آفریں ہے چاندبی بی کی
ہمت مردانہ کو کہ اس شیر دل عورت نے اتنی ہی فرصت کو غنیمت سمجھا۔ برقع سر پر
ڈالا۔ تلوار کمر سے لگائی۔ دوسری تلوار سونت کر ہاتھ میں لیئے بجلی کی طرح بیچ میں
آئی تختے۔ کڑیاں۔ بانس۔ ٹوکرے گارے کے بھرے طیار تھے۔
بڑے بڑے تھیلے اور سارے مصالح لیئے اسی وقت کی منتظر بیٹھی تھی۔ گری
دیوار پر آپ کھڑی ہوئی۔ میٹھی زبان زر کا زور کچھ لالچ کچھ دھمکاوے سے
غرض ایسا کچھ کیا کہ عورت اور مرد آکر سب لپٹ گئے پل کے پل میں فصیل کو
برابر اُٹھا لیا اور اُس پر چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھا دیں۔ جب بادشاہی لشکر ریلا
کر جاتا اُدھر سے گولے جیسے اولے برستے۔ اکبری فوج موج کی طرح
ٹکر کھا کر اُلٹی پھرتی تھی۔ ہزاروں آدمی کام آئے اور کچھ کام نہ ہوا۔ شام کو
ناکام ڈیروں کو پھر آئے۔ جب رات نے اپنی سیاہ چادر تانی شاہزادہ مراد
اور مصاحبوں سمیت نامراد اپنے ڈیروں پر چلے آئے۔ چاندبی بی چمک کر نکلی
بہت سے راج اور معمار جلد کار ہزاروں مزدور بیلدار تیار تھے۔ آپ گھوڑے پر
سوار تھی مشعلیں روشن تھیں۔ چونے گچ کے ساتھ چنائی کر دی۔ روپے

اور ادھر خاں جھولیاں بھر بھر کر دیتی جاتی تھی۔ معمار مزدوروں کا بھی یہ عالم تھا کہ پتھر اور اینٹ بالائے طاق۔ ملبہ۔ لکڑ بلکہ مُردوں کی لاشیں تک جو ہاتھ میں آتا تھا بنیاد میں چنتے جاتے تھے۔ بادشاہی لشکر صبح کو اٹھا اور مورچوں پر نظر ڈالی دیکھیں تو پچاس گز فصیل جس کا تین گز عرض تھا۔ راتوں رات سدِ سکندر۔ اس کے علاوہ وہ جو تدبیریں اس ہمت والی بی بی نے کیں اگر تفصیل لکھوں تو دربار اکبری میں چاندنی کھل جائے۔ اس عرصے میں خان خاناں کو خبر لگی کہ حسین خاں حبشی عادل شاہ کا نایب ستر ہزار فوج جرّار لے کر آتا ہے۔ رسد بند آس پاس میں لکڑی بلکہ گھاس کا تنکا تک نہ رہا۔ لشکر کے جانور بھوکوں مرنے لگے۔ ادھر سے چاند بی بی نے صلح کا پیغام بھیجا کہ برہان الملک کے پوتے کو حضور میں حاضر کرتی ہوں احمد نگر اس کی جاگیر ہو جائے۔ ملک برار کی کنجیاں۔ عمدہ ہاتھی۔ جواہر گراں بہا۔ لطائف و عجائب شاہانہ پیش کرتی ہوں آپ محاصرہ اٹھائیں۔ باخبر اہل کار روز عرض کرتے تھے کہ قلعے میں ذخیرہ نہیں رہا اور غنیم نے ہمت ہار دی کام آسان ہو گیا صلح کی کچھ حاجت نہیں مگر روسیاہ طمع سیاہ کچھ رشوتوں نے پیچ مارا۔ کچھ حاسدوں نے آنکھوں میں خاک ڈالی۔ صلح پر راضی ہو گئے۔ باہر سے عادل شاہی لشکر کے آنے کی بھی خبر لگی تھی کہ چاند بی بی کے مدد کو آ رہا ہے چار و ناچار سب الصلح خیر کا عقد پڑھ کر رخصت ہوئے اور محاصرہ اٹھا لیا۔ شاہزادے نے جب عادل شاہ کی فوج کی آمد سنی وقعت دفعیہ کو چلا۔ چند منزل پر سنا کہ خبر ہوائی تھی۔ یہ ادھر سے برار کو مڑے مگر بے لیاقت سردار محاصرے سے ایسے بے طور اٹھے تھے کہ غنیم پیچھے دباے چلا آتا تھا اور جہاں قابو پایا اسباب و مال لوٹ لیا۔ امرا میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی کوئی روک نہ سکا۔ سپہ سالار آزمودہ کار اور منتظم روزگار تھا۔ چاہتا تو سارے کاروبار باتوں باتوں میں درست کر لیتا مگر شیطانوں نے شہزادے کے کان میں یہ پھونکی تھی کہ خان خاناں یہ چاہتا ہے کہ فتح میرے نام ہو۔ غلام حضور کے جاں نثار ہیں کہ حضور کا نام روشن ہو۔ مور کھ شاہزادہ نہ سمجھا کہ ان نالائقوں سے کچھ نہ ہو سکے گا خان خاناں خاموش۔ جو حکم ہوتا تھا سو کرتا تھا اور ان کی عقل و تدبیر کے تماشے دیکھتا تھا۔ کبھی ہنستا تھا

کبھی جلتا تھا۔ پھر بھی جہاں تک ممکن تھا مہم کو سنبھالے جاتا تھا کہ آقا کا نام نہ بگڑنے
ملک دکن کی کنجی (راجی علی خاں) اُس کی کمر میں تھی وہ عجب جوڑ توڑ کے مضمون
نکالتا تھا۔ خان مذکور کی بیٹی کو شاہزادۂ مراد سے منسوب کر کے اکبر کا سمدھی
بنا دیا۔ اب وہ خواہ مخواہ لشکر میں شامل تھا۔ کئی ہزار فوج اُس کے ساتھ
داماد کو چھوڑ کر خسر کہاں جا سکتا ہے۔ اسی عرصے میں برار پر قبضہ ہو گیا۔
شاہزادے نے شاہ پور (ضلع گلبرگہ مملکت سرکار عالی نظام) اپنا پایہ تخت
بنایا اور اطراف کے ملک پاتھری وغیرہ علاقے کے لیئے سہیل خاں
عادل شاہ کی طرف سے امراے احمد نگر کے جھگڑے چکانے آیا تھا وہ پھرا
جاتا تھا۔ اُس نے جب یہ خبریں سنیں تو بہت برہم ہوا۔ اس کے علاوہ چاند
سلطان نے بھی عادل شاہ کو لکھا اُس پر فرماں روایان دکن نے اتفاق
کر کے لشکر جمع کیئے اور سب متفق ہو کر ساٹھ ہزار جمعیت کے ساتھ فوج شاہی
پر آئے۔ خان خاناں نے یہ حال دیکھ کر شاہزادے اور محمد صادق کو
شاہ پور میں چھوڑا اور شاہ رخ مرزا اور راجی علی خاں کو لے کر بیس ہزار فوج
کے ساتھ بڑھا۔ گوداوری کے کنارے مقام کیا اور یہاں چند روز ٹھیر کر
ملک کا حال معلوم کیا مقام آشتی (ضلع بیڑ علاقہ سرکار نظام) پر فوجوں کی تقسیم کی۔
دریا میں پانی بہت کم تھا پایاب اُتر گیا۔ پاتھری سے بارہ کوس ناندیڑ کے مقام
میدان جنگ قرار پایا ۱۷ جمادی الثانیہ ۱۰۰۵ھ تھی کہ سہیل خاں عادل شاہ کا
سپہ سالار تمام فوجوں کو لے کر میدان میں آیا۔ داہنے پر امراے نظام شاہی۔
بائیں پر قطب شاہی خود قلب میں مقابلے پر آیا چغتائی سپہ سالار بھی بڑی آن بان
سے آیا۔ چاروں طرف پرے جما کر قلعہ باندھا۔ جن میں راجی علی خاں اور راجہ رام
چندر اچھوت دائیں پر تھے۔ خود مرزا شاہ رخ اور مرزا علی بیگ قلب میں۔
سہیل خاں کو بڑا گھمنڈ توپ خانے پر تھا اور فی الحقیقت ہندوستان میں
اوّل توپ خانہ آیا تو دکن میں آیا وہ ملک کئی بندرگاہوں سے ملا ہوا تھا۔ جو سامان
اس کا وہاں تھا اور کہیں نہیں تھا۔ اُس کا آتش خانہ جیسا عمدہ تھا ویسا ہی بہتات
کے ساتھ تھا۔ لڑائی بڑے زور شور سے ہونے لگی۔ دن ڈھل گیا اور

لڑائی بدستور جاری ہے۔ افسوس کہ راجی علی خاں دکن کی کُنجی اسی میدان کی خاک میں کھوئی گئی کہ اُس نے اور راجہ رام چندر نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے ڈٹ کر جان دی اور تیس ہزار دلاور اُن کے ساتھ کھیت رہے۔ اب ڈیڑھ گھڑی سے زیادہ دن نہیں رہا تھا۔ رات جوں توں گزاری۔ خان خاناں کی نگاہیں آسمان کی طرف تھیں کہ دیکھیئے صبح۔ صبح مراد ہوتی ہے یا صبح قتل۔ رات کو بھی لڑائی جاری رہی۔ صبح ہوتے ہی خانخاناں کے سپاہی دریا پر پانی لینے گئے۔ خبر لائے کہ سہیل خاں بارہ ہزار فوج سے جا کھڑا ہے اور ادھر چار ہزار سے زیادہ جمعیت نہ تھی۔ خان خاناں نے کہا اندھیرے کو غنیمت سمجھو اس کے پردے میں بات بن جائے گی۔ تھوڑی فوج ہے دن نے پردہ کھول دیا تو مشکل ہو جائے گی۔ دھندلکے کا وقت تھا۔ صبح ہوا چاہتی تھی اتنے میں سہیل خاں چمکا اور فوج ہوا سے جنگ میں جنبش دی۔ توپیں سیدھی کیں اور ہاتھوں کو سامنے کر کے ریلا دیا۔

ادھر سے بھی اکبری شہسوار نے دھاوے کا حکم دیا۔ فوج دن بھر رات بھر کی بھوکی پیاسی۔ سردار اُن کی عقل حیران۔ دولت خاں ان کا ہرادل تھا گھوڑا مار کر آیا اور کہا کہ اس حالت کے ساتھ فوج کثیر پر جانا جان کا گنوانا ہے۔ مگر میں اس پر بھی حاضر ہوں چھ سو سوار ساتھ ہیں غنیم کی کمر میں گھس جاؤں گا۔ خان خاناں نے کہا "نام دہلی بر باد می دہی؟" دولت خاں نے کہا "اگر حریف را بر داشتیم صد دہلی ایجاد کنیم واگر مُردم کار با خدا است" دولت خاں نے کہا "چنیں انبوہے در پیش است و فتح آسمانی۔ اگر شکست رو دہد۔ جائے نشاں دہید کہ شمارا دریابیم" خان خاناں نے کہا" زیر لاشہا" بڑے زور شور کا حملہ ہوا۔ خان خاناں خود بھی سامنے سے حملہ کر کے پہنچا اور لڑائی دست و گریبان ہو رہی تھی۔ سہیل خان کا لشکر بھی آٹھ پہر کا بھوکا مارا۔ بھوک پیاس کا مارا تھا ایسا بھاگا جس کی ہرگز امید نہ تھی۔ پھر بھی بڑا کشت و خون ہوا۔ سہیل کئی زخم کھا کر گرا۔ قدیمی نمک خوار پروانوں کی طرح آن گرے۔ اٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا اور دونوں بازو پکڑ کر معرکے سے نکال لے گئے۔ تھوڑی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔ خان خانی لشکر میں بے لاگ فتح کے نقارے بجنے لگے۔ بہادروں کی

میدان جنگ کو دیکھا سہمرا اوپڑا تھا۔ ~~ھ

صحن فلک زدیدۂ قربانیاں پُر است ۔ باآں کہ درکمان قضا یک خدنگ بود

لوگوں نے مشہور کیا کہ راجی علی خاں میدان سے بھاگ کر الگ ہو گیا بعضوں نے ہوا اڑائی کہ غنیم سے جا ملا۔ دیکھا تو بڈھا شیر ناموری کے میدان میں سرخ رو پڑا سوتا ہے۔ (۲۵) سردار نامدار اور پانچ سو غلام وفادار کٹے پڑے ہیں۔ اس کی لاش بڑی شان و شوکت سے اٹھا کر لائے اور بدزبانوں کے منہ کالے ہو گئے۔ فتح کے شکرانے میں نقد و جنس ۷۵ لاکھ روپئے کا مال سانچہ سب سپاہ کو بانٹ دیا۔ فقط ضروری اسباب کے دو اونٹ رکھ لیئے کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ بادشاہ اس خوش خبری سے بہت خوش ہوئے خلعت بے بہا اور تحسین و آفرین کا فرمان بھیجا۔ یہ فتح کے نشان اڑاتے شادیانے بجاتے شاہ پور آئے۔ شہزادے کو مجرا کیا تلوار کھول اپنے خیمے میں بیٹھ گئے۔ صادق محمد وغیرہ شاہزادے کے مصاحب و مختار مخالفت کی دیاسلائی سلگاتے جاتے تھے۔ ادھر خان خاناں عرضیاں کر رہا تھا اُدھر شاہزادہ شاہزادے نے باپ کو یہاں تک لکھا کہ حضور ابوالفضل اور سید یوسف خاں مشہدی کو بھیج دیں خان خاناں کو بلالیں۔ خان خاناں بھی اُسی کے لاڈلے تھے اُنھوں نے لکھا کہ حضور شہزادے کو بلالیں خانہ زاد اکیلا فتح کا ذمہ لیتا ہے۔ یہ بات بادشاہ کو ناگوار گزری اگرچہ شاہزادہ خرابِ خواری اور اس کی بدحالیوں کے سبب سے آنے کے قابل نہ تھا مگر حضوری دربار کا ارادہ کیا۔ اس کے مزاج دانوں نے خیر خواہی کی کرکے کہا کہ اس وقت ملک سے حضور کا جانا مناسب نہیں شہزادہ رک گیا۔ ادھر خان خاناں نے کہا کہ جب تک شہزادہ وہاں ہے میں نہ جاؤں گا۔ بادشاہ کو یہ باتیں پسند نہ آئیں اور دل کو ناگوار گزریں۔ غرض ۹۰۶ سنہ ۱۰۰۱ھ میں خان خاناں اپنے علاقے پر گئے وہاں سے دربار میں آئے۔ کئی دن تک عتاب و خطاب میں رہے۔ وہ بھی ہفت پشت کے مزاج داں تھے اور جادو بیان۔ جب عرض معروض کے موقعے پائے۔ شہزادے کی بدصحبتی اور بادہ خواری و بے خبری اور مصاحبوں کی بدذاتیوں کے سب حالات سنائے۔ غبار کدورت کو دھویا چند روز میں

جیسے ستھے ویسے ہی ہو گئے۔ شیخ ابوالفضل اور سید سعف مشہدی دکن کو بھیجے گئے۔ شہزادے کی نوبت حد سے گزر چکی تھی۔ شیخ کے پوہنچتے تک بھی نہ ٹھیر سکا۔ یہ رستے ہی میں تھے کہ وہ ملک عدم کو روانہ ہو گیا۔ یعنی مراد تیس برس کی عمر ۹۹۵ھ / ۱۵۹۹ء میں نامراد ناشاد دنیا سے گیا۔ اکبر کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ دکن میں جوان بیٹا جان سے گیا پھر بھی ملک فتح نہ ہوا! صلاح ٹھیری کہ پہلے اس کام کو کرنا چاہیئے چنانچہ ۱۰۰۸ھ میں شاہزادۂ دانیال کو لشکر عظیم اور سامان وافر کے ساتھ پھر روانہ کیا اور خان خاناں کو اس کے ساتھ کیا۔ مراد کی نامرادی نے نصیحت کر دی تھی اب کی روانگی بندوبست سے ہوئی جاناں بیگم خان خاناں کی بیٹی کے ساتھ شہزادے کی کر دی اور شہزادے کو لے کر دکن میں داخل ہوے۔ شیخ کو روک دیا کہ احمد نگر پر حملہ نہ کرنا ہم آتے ہیں۔ ادھر رستے میں آسیر پر اٹک رہے کہ رستہ صاف کر کے احمد نگر کو لیں گے۔ شیخ ابوالفضل واپس بلا لیئے گئے اور خان خاناں نے احمد نگر پر محاصرہ ڈالا۔ چاند بی بی سامان کی فراہمی امراے لشکر کی دلداری برج وفصیل کی مضبوطی میں بال بھر بھی کمی نہ کرتی تھی۔ پھر بھی کہاں اکبری اقبال اور شاہنشاہی سامان کہاں ایک احمد نگر کا صوبہ اس کے علاوہ قلعے میں سرداروں کی بدنیتی اور نفاق بھی قایم تھا۔ بیگم نے یہ حال اپنے وزیر سے کہا۔ کہ قلعہ بچتا نظر نہیں آتا بہتر کہ ننگ وناموس کو بچائیں اور قلعہ حوالہ کر دیں چیتے خاں نے اور سرداروں کو بیگم کے اس ارادے سے آگاہ کیا اور بہکایا کہ بیگم امراے اکبری سے سازش رکھتی ہے۔ دکھنی سنتے ہی بگڑ کھڑے ہوے اور اُس پاک دامن بی بی کو شہید کیا۔ امراے اکبری نے سرنگیں اڑا کر ڈھا دیا۔ تیس گز دیوار اڑا دی اور برج بابلی سے قلعے میں داخل ہوے۔ چیتے خاں اور ہزاروں دکنی ولاور موت کا شکار ہوے چیتے خاں اور تمام سپاہی قتل کیئے گئے جس لڑکے کو نظام الملک بہادر شاہ بنایا تھا وہ گرفتار ہوا خان خاناں آسے سے کر حاضر ہوے اور مقام برہان پور پر پیش کیا ۴۵ جلوس میں چار مہینے بیس دن کے محاصرے میں قلعہ فتح ہوا۔ بادشاہ نے آسیر فتح کیا اور آگرے کی طرف مراجعت کی۔ ملک شاہزادے کے نام کیا اور

دانیال کی مناسبت سے خاندیس کا نام داندیس رکھا۔ خان خاناں نے پھر پیچ مارا۔ شیخ کی لیاقت اور کاردانی کی بہت تعریفیں لکھوائیں اور انھیں بادشاہ سے مانگ لیا۔ اب صورت حال نہایت نازک۔ شاہزادہ صاحب ملک خان خاناں خسر الدولہ اور سپہ سالار۔ شیخ ان کے ماتحت خوب ٹوک جھوک رہی دوستی رقابت سے بدل گئی۔ اکبر کے لیئے یہ مشکل موقع تھا۔ دونوں جاں نثار۔ دونوں آنکھیں اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ دعوے۔ آفریں ہے اُس بادشاہ کو کہ دونوں دونوں ہاتھوں میں کھلاتا رہا اور اپنا کام لیتا رہا۔ ایک کے ہاتھ سے دوسرے کو گرنے نہ دیا۔ یہ رگڑے جھگڑے اسی طرح سے چلے جاتے تھے۔ سنہ ۱۰۰۹ھ میں خان خاناں کی حسن تدبیر سے تلنگانے کے ملک میں فتوحات کا نشان جا گاڑا۔ شیخ سنہ ۱۰۱۱ھ میں طلب ہوئے اور افسوس کہ راہ سے منزل لقا کو پہنچے خان خاناں نے کئی برس کے عرصے میں دکن کو بہت کچھ تسخیر کر لیا۔ جب بند و بست سے فارغ ہوے تو سنہ ۱۰۱۲ھ میں دربار میں طلب ہوئے۔ اُن کی برہان پور۔ احمد نگر۔ برار کا ملک شہزادے کے نام ہوا اُنھیں اُس کی اتالیقی کا منصب ملا۔ سنہ ۱۰۱۳ھ میں بڑی مصیبت آئی کہ شہزادہ بھی اپنے بھائی کی طرح تینتیس برس چھ مہینے کی عمر میں بادہ خواری سے موت کا شکار ہوا۔ جہانگیری دور ہوا تو خان خاناں دکن میں تھے۔ جہانگیر اپنی توزک میں خود لکھتا ہے کہ خان خاناں بڑی آرزو سے لکھ رہا تھا اور قدمبوسی کی تمنا ظاہر کرتا تھا۔ میں نے اجازت دی بچپن میں میرا اتالیق تھا۔ برہان پور سے آیا اور بے قرار ہو کر میرے قدموں میں گر پڑا میں نے سینے سے لگا لیا اور چہرے پر بوسہ دیا۔ خان خاناں نے بہت نادر اور قیمتی تحالف پیش کیئے۔ پیشگاہ خسروی سے ایک نادر سمند گھوڑا فتوح نامی ہاتھی کہ لڑائی میں لاجواب ہے اور بیس ہاتھی سرفراز ہوے۔ چند روز بعد خلعت کمر شمشیر مرصع۔ فیل خاصہ۔ عطا ہوا۔ علاوہ فوج سابق کے بارہ ہزار سوار اور دس لاکھ کا خزانہ اور وزیر الملک کا خطاب دیا اور پنج ہزاری منصب عنایت کر امراے نامی بیس ہزار سوار کے ساتھ رفاقت میں دیئے۔ دکن کو رخصت ہوے کہ دو برس میں سب ملک سرانجام کر دوں گا۔ وہ دکن کی مہول میں مصروف تھا

سنہ ھ میں جہانگیر نے پرویز شاہزادے کو دو لاکھ کا خزانہ۔ بہت سے جواہر بیش بہا۔ دس ہاتھی تین سو گھوڑے خاصہ کے عنایت فرمائے۔ سید سیف خاں بارہ کو اتالیق کر لشکر ساتھ دیا اور حکم دیا کہ خان خاناں کی مدد کو جاؤ۔ وہاں پھر مراد کا معاملہ ہوا۔ بڑے سپہ سالار بوڑھی عقل۔ نوجوانوں کے دماغوں میں نئی روشنی طبیعتیں موافق نہ آئیں کام بگڑنے شروع ہوئے عین برسات میں لشکر کشی کر دی۔ تکلیف۔ نقصان۔ خرابیاں۔ ندامتیں سب ہی سامنے برسیں۔ انجام یہ ہوا کہ جس خان خاناں نے آج تک شکست کا داغ نہ اٹھایا تھا۔ اُس نے ترسٹھ برس کی عمر میں شکست کھائی۔ فوج برباد۔ اپنے نہایت تباہ بڑھاپے کے بوجھ اور ذلت کی بار برداری کو گھسیٹ کر برہان پور میں پہنچا۔ وہی احمد نگر جسے گوسے مار مار کر فتح کیا تھا۔ قبضے سے نکل گیا۔ تماشہ یہ کہ باپ کو لکھا جو کچھ ہوا۔ خان خاناں کی خودسری۔ خودرائی نفاق سے ہوا۔ یا ہمیں حضور بلا لیں یا انہیں۔ آخر سنہ ۱۰۱۸ھ میں خان خاناں بلائے گئے۔ سنہ ۱۰۲۰ھ میں سرکار قنوج اور کالپی وغیرہ جاگیر عنایت ہوا۔ سال ۱۰۲۱ھ میں معلوم ہوا کہ دکن کی وہی ابتر حالت ہے۔ شہزادے کا لشکر اور امرا سب سرگرداں پھرتے ہیں تو جہانگیر کو پھر پرانا سپہ سالار یاد آیا اور امرائے دربار نے بھی کہا کہ وہاں کی مہمات کو جو خان خاناں سمجھتا ہے وہ کوئی نہیں سمجھتا اُس کو بھیجنا چاہیئے پھر دربار میں حاضر ہوئے شش ہزاری منصب ذات خلعت فاخرہ پھر بھیجے گئے۔ سنہ ۱۰۲۵ھ میں شاہزادۂ خورم کو شاہ جہاں کا خطاب دے کر رخصت کیا۔ سنہ ۱۰۲۶ھ میں خود بھی مالوے میں جاکر چھاؤنی ڈالی شاہ جہاں نے برہان پور میں جاکر مقام کیا اور معاملہ فہم اور صاحب تدبیر افضل خاں کو بھیج کر امرائے اطراف کو موافق کیا۔ شاہزادہ شاہ جہاں کے حسن انتظام سے دکن میں بندوبست قابل اطمینان ہو گیا۔ خاندیس۔ برار۔ احمد نگر کا علاقہ شاہ جہاں کو مرحمت ہوا اُس نے راجپوتانے اور دکن میں فتوحات نمایاں کیں۔ جہانگیر نہایت خوش ہوا۔ غرض کہ شاہ جہاں حضور میں طلب ہوئے۔ دربار میں بڑی عزت واحترام سے لیئے گئے۔ خان خاناں کے بیٹوں نے دکن میں وہ جاں فشانیاں کیں (جن کی تفصیل ہم نے چھوڑ دی) کہ خاندانی سرخروئی شاداب

ہو گئی۔ چنانچہ انہیں دنوں میں شاہنواز کی بیٹی (خان خاناں کی پوتی) سے شاہجہاں کی شادی کر دی۔ خلعت با چارقب زربفت و دو دامن سلک مروارید کمر شمشیر مرصع۔ معہ پردلہ مرصع باکمر خنجر مرصع عنایت فرمایا۔ ۱۰۲۷ھ میں لشکر منصور خاندیس اور برہان پور سے گزر رہا تھا کہ حاضر ہو کر قدمبوسی حاصل کی۔ انواع نوازش خسروانہ اور اقسام عواطف شاہانہ سے سر عزت بلند ہوا۔ علاوہ عطیات بیکراں کے صوبۂ خاندیس و دکن کی سند مرحمت ہوئی۔ منصب ہفت ہزاری ہوا۔ امرا میں یہ رتبہ اب تک کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ خان خاناں کا ستارہ غروب ہوتا ہے جس کا حال بہت طویل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ۔ افسوس جن خان خاناں نے بہار کامرانی کا پھول رہ کر عمر گزاری تھی۔ بڑھاپے میں وہ وقت آیا کہ زمانے کے حادثے اس پر بگولے باندھ کر حملے کرنے لگے۔ ۱۰۲۹ھ میں جوان اور ہونہار بیٹا ایرج مرا تھا۔ دوسرے برس رحمن داد گیا۔ تیسرے برس تو ادبار نے ایک ایسا نحوست کا شبخون مارا کہ اقبال میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور ایسا بھاگا کہ پھر کر نہ دیکھا۔ میرے دوستو! دنیا برا مقام ہے۔ بے مروت زمانہ یہاں انسان کو کبھی ایسے موقعے پر ڈالتا ہے کہ دو ہی پہلو نظر آتے ہیں۔ دونوں میں خطر اور انجام کی خدا کو خبر عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کرے قسمت کے ہاتھ پانسہ ہوتا ہے۔ جس رخ چاہے پلٹ دے۔ سیدھا پڑا تو عقل مند ہیں۔ الٹا پڑا تو بچہ بچہ احمق بناتا ہے اور جو نقصان ندامت مصیبت اور غم و اندوہ اس پر گزرتا ہے وہ تو دل ہی جانتا ہے۔ نورجہاں بیگم اور شاہجہاں کی باہمی نالچاقیوں کو قطع نظر کرکے یہ سنیئے کہ خان خاناں کے نمک خوار قدیم اور ملازم با اعتبار محمد معصوم نے جہانگیر کے پاس مخبری کی کہ امرائے دکن سے اس کی سازش ہے اور ملک عنبر کے خطوط جو اس کے نام سے تھے وہ شیخ عبدالسلام لکھنوی کے پاس ہیں۔ جہانگیر نے مہابت خاں کو حکم دیا اس نے شیخ کو گرفتار کر لیا۔ حال پوچھا تو اس نے بالکل انکار کیا۔ اس غریب کو اتنا مارا کہ مر گیا مگر حرف مطلب نہ ہارا۔ خدا جانے کچھ تھا ہی نہیں یا رازداری کی۔ دونوں طرح سے آفریں۔ بہرصورت خان خاناں اور داراب دونوں دکن سے شاہجہاں کے ساتھ آئے۔ جہانگیر کو بھی کس

ور دسے لکھتا ہے۔ جب خان خاناں جیسے امیر نے کہ میری اتالیق کے منصب عالی سے خصوصیت رکھتا تھا ستر برس کی عمر میں بغاوت اور کافر نعمتی سے منہ کالا کیا تو اوروں سے کیا گلہ۔ گو ایسی ہی زشت بغاوت اور کفران نعمت سے اس کے باپ نے آخر عمر میں میرے پدر بزرگوار سے بھی یہی شیوۂ ناپسندیدہ برتا تھا۔ اس نے باپ کی پیروی کر کے اس عمر میں اپنے تئیں ازل سے ابد تک ملعون و مردود کیا۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود گرچہ با آدمی بزرگ شود

۱۰۳۶ھ میں خان خاناں حضور میں طلب ہوئے۔ مہابت خاں جس کے ہاں وہ نظر بند تھے اس نے بہت کچھ عذر معذرت کے بعد رخصت کیا جہانگیر توزک میں خود لکھتا ہے۔ ندامت کی پیشانی کو دیر تک زمین پر رکھے رہا۔ سر نہ اٹھایا میں نے کہا۔ جو کچھ وقوع میں آیا تقدیر کی باتیں ہیں۔ نہ تمہارے اختیار کی باتیں ہیں نہ ہمارے۔ اس کے سبب سے ملامت اور خجالت دل پہ نہ لاؤ۔ ہم اپنے تئیں تم سے زیادہ شرمندہ پاتے ہیں۔ جو کچھ ظہور میں آیا۔ تقدیر کے اتفاق ہیں۔ ہمارے تمہارے اختیار کی بات نہیں۔ ارکان دولت کو حکم ہوا کہ انھیں سے باکرام اتارو۔ کئی دن کے بعد لاکھ روپیہ انعام دیا۔ چند روز کے بعد صوبۂ قنوج عطا ہوا اور خان خاناں کا خطاب جو اس سے چھین کر مہابت خاں کو ملا تھا پھر انھیں مل گیا انھوں نے شکریہ میں یہ شعر کہہ کر مہر میں کھدوایا:

مرا لطف جہانگیری بتائیدات یزدانی دوبارہ زندگی داد و دوبارہ خان خانی

چند روز میں نور جہاں بیگم کی مہابت خاں سے بگڑی۔ فرمان گیا کہ حاضر ہو اور اپنی جاگیر اور فوج وغیرہ کا حساب کتاب سمجھا دو۔ ۱۶۲۶ء میں بادشاہ لاہور سے گلگشت کشمیر کو چلے جاتے تھے وہ ہندوستان کی طرف سے آیا۔ چھ ہزار تلوار مار راجپوت اُس کے ساتھ تھے۔ لاہور ہوتا ہوا حضور میں چلا۔ مگر تیور بگڑے اور غصے میں بھرا ہوا۔ خان خاناں یہیں موجود تھے۔ مہابت خاں نے اپنی حکمت عملی سے کنار جہلم پہ پہنچ کر بادشاہ کو قید کر لیا اور اسی وقت خان خاناں کو بحفاظت دلی بھجوا دیا۔ دلی سے اُن کا ارادہ اپنی جاگیر کو جانے کا

ہوا مگر پھر بدگمان ہوا اور واپس بلوا لیا کہ لاہور میں بیٹھو۔ دوسرے سال مہابت
نورجہاں کو بھی قید کر لیا۔ بیگم کی دانائی اور حکمت عملی سے آہستہ آہستہ
اس کا طوفان دھیما ہوا۔ آخر یہ کر بھاگا۔ خان خاناں کا دل اس کے زخموں سے
چھلنی ہو رہا تھا۔ بڑی التجا و تمنا سے عرضی بھیجی کہ اس نمک حرام کے استیصال کی
خدمت مجھے مرحمت ہو۔ بیگم نے اس کی جاگیر خان خاناں کی تنخواہ میں مرحمت کی
علاوہ خلعت فاخرہ و انعام و اکرام کے اجمیر کا صوبہ بھی مرحمت کیا۔ بہتر برس کا
بڈھا اس پر یہ قیامت کے صدمے گزر چکے تھے۔ طاقت نے بیوفائی کی
لاہور میں بیمار ہو گئے۔ دہلی میں پہنچ کر ضعف غالب ہوا۔ اواسط ۱۰۳۶ھ
میں دنیا سے انتقال کیا "خاں سپہ سالار کو" تاریخ وفات ہے۔ جہانگیر نے اس
واقعہ کے موقع پر توزک میں نہایت افسوس کے ساتھ خدمتوں کے بعض
کارنامے مختصر اشاروں میں بیان کیے ہیں کہ خان خاناں قابلیت و استعداد
میں یکتائے روزگار تھا۔ زبان عربی ترکی فارسی ہندی جانتا تھا۔ اقسام دانش
عقلی و نقلی یہاں تک کہ ہندی علوم سے بھی بہرہ وافی رکھتا تھا۔ شجاعت اور
شہامت اور سرداری میں نشان بلکہ نشان قدرت الٰہی تھا۔ فارسی اور ہندی
میں خوب شعر کہتا تھا۔ نظام الدین بخشی نے طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ
منصب خان خانانی اور سپہ سالاری کو پہنچا۔ عالی خدمتیں اور عظیم فتحیں کیں۔
فہم و دانش و علم و کمالات اس بزرگ نہاد کے جتنے لکھیں سو میں سے ایک
اور بہت ہی تھوڑے ہیں۔ شفقت عام۔ علماء و فضلاء کی تربیت۔ فقراء کی
محبت اور طبع نظم اس نے میراث پائی ہے فضائل و کمال انسانی میں آج اس کا
نظیر امرائے دربار میں نہیں۔ اکثر باتیں تھیں کہ ان کے خاندان کے لیئے
خاص تھیں مثلاً پرچما کہ اس کی کلغی بادشاہ اور شہزادوں کے سوا کوئی امیر نگا سکتا
تھا۔ ان کو اور ان کے خاندان کو اجازت تھی۔ آشنائی اور آشنا پرستی میں
اعجوبۂ روزگار تھے۔ خوش مزاج۔ خوش اخلاق اور صحبت میں نہایت گرم جوش
اپنے دل ربا اور دل فریب کلام سے یگانہ اور بیگانہ کو غلام بنا لیتے تھے۔ باتوں
باتوں میں کانوں کے رستے دل میں اتر جاتے تھے۔ شیریں کلام۔ لطیفہ گو۔

بذلہ سنج اور نہایت طرّار و فرار تھے۔ بادشاہی یا اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی طرف رجوع کرنے میں اپنے عالی مرتبے کے خیال نہ رکھتے تھے۔ وہ دشمنوں سے بھی بگاڑتے نہ تھے مگر موقع پاتے تو چوکتے بھی نہ تھے۔ ایسا ہاتھ مارتے تھے کہ قلم ہی کر دیتے تھے۔ ان باتوں کے سبب سے لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک زمانہ ساز آدمی تھے۔ اور یہ مقولہ اُن کا حصول تدبیر تھا کہ "با دشمن در لباس دوستی دشمنی نمودہ آید" مآثرالامرا میں لکھا ہے۔ شجاعت۔ سخاوت۔ دانش و تدبیر۔ بند و بست جنگی و ملکی میں افسر تھے۔ مختلف وقتوں میں تیس برس تک دکن میں بسر کی۔ اور اس طرح کی کہ سلاطین و امرائے دکن کو اپنی رسائی کے وسیلے اطاعت و اخلاص کے پھندوں میں پھانسے رکھا۔ جو شاہزادہ یا امیر دربار شاہی سے جاتا۔ یہی کہتا تھا کہ یہ غنیم سے ملے ہوئے ہیں۔ دولت چغتائی کے امرائے عظیم الشان میں سے تھا۔ اس کے نام نامی نے صفحۂ شہرت پر نقش دوام پایا ہے۔ اس کے بعد مآثرالامرا میں یہ شعر بھی لکھا ہے۔ جو کسی حریف یا حریفوں کے کسی خوشامدی نے کہا تھا ؎

یک وجب قد و صد گرہ در دل — تختکے استخوان و صد مشکل

خان خاناں نام کو ہفت ہزاری منصب دار تھا مگر ملکوں میں خود اختیار سلطنت کرتا تھا۔ صدہا ہزاریوں سے اسے معاملے پڑتے تھے۔ اس طرح کام نہ نکالتا تو ملک داری کیوں کر چلتی۔ ایسے نامردوں سے اس طرح جان نہ بچاتا تو کیوں کر بچتا۔ انبوہ در انبوہ منافقوں کو اس پیچ سے نہ مارتا تو خود کیوں کر جیتا۔ ضرور مارا جاتا۔ کاغذوں پر بیٹھ کر لکھنا اور بات ہے اور مہموں کا سر کرنا اور سلطنتوں کا عمل و رآمد کرنا اور بات ہے۔ وہی تھا کہ سب کچھ کر گیا اور نیکی لے گیا اور نام نیک یادگار چھوڑ گیا۔ وقت میں بہتیرے امیر تھے اور آج تک بہتیرے ہوئے کسی کی تاریخ زندگی میں اس کے کارنامے کا پاسنگ تو دکھا دو (اقتباس از دربار اکبری)

ایک بہت بھاری اور قدیم کنواں

ہمایوں کے مقبرے کے احاطے کے باہر بجانب شمال

ایک گنبد دار قدیم کنواں ہے جو مقبرے کے ساتھ کا بنا ہوا ہے جس میں سے پانی فوارے میں چڑھ کر اوپر آتا تھا اور پھر ایک حوض میں جمع ہو کر باغ کی کیاریوں کو سیراب کرتا تھا۔

حضرت سلطان المشائخ کا چلہ

اسی جگہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے چلے کشی کا ایک حجرہ ۹ فٹ × ۸ ہے جس کی ایک طرف سہ درہ دالان ۷ فٹ ۲ انچ × ۹ فٹ ۱/۲ ہے۔ جس کے سامنے برآمدہ ہے۔ یہ مقام متبرک اسی زمانے کی یادگار ہے جب کہ حضرت موصوف مصروف ریاضت تھے۔

ماموں بھانجے کی درگاہ
سنہ ۷۰۰ ھ

ہمایوں کے غربی دروازے کے سامنے ایک نیا باغ لگایا جا رہا ہے۔ اس کے پاس دروازے کے شمال رخ پر ایک پختہ اور وسیع احاطے کے اندر اور ایک چھوٹا احاطہ ۵۵ × ۳۵ فٹ - ۷ فٹ ۱/۲ اونچا ہے اس میں ایک ۱۰ فٹ ۱/۲ × ۹ فٹ ۱/۲ پختہ چبوترے پر جو دو فیٹ اونچا ہے دو مزار ہیں۔ بائیں طرف کے مزار کے سرہانے حال میں یہ کتبہ لگا دیا ہے:۔

حضرت شمس الدین عطاء اللہ قدس سرہ العزیز بتاریخ ۲۷ رجب سنہ ۷۰۰ ھ ازیں جہان پرورد نمود۔ دوسری قبر پہ کوئی کتبہ نہیں ہے جس سے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کس کی قبر ہے مگر عام طور پر یہ ماموں بھانجے کی درگاہ مشہور ہے اس احاطے میں ایک کونے میں ایک اور نامعلوم قبر ہے۔ درگاہ میں بہت پرانے دو نیم کے درخت ہیں اور ایک پرانا درخت پہلو کا ہے جو آپ کے مزار پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ فرش اندرون احاطہ گچ کا پختہ ہے۔ بیرون احاطہ خورد و اندرون احاطۂ کلاں اور بہت سی پختہ اور خام قبریں ہیں۔

بتاشے کا باغ یا بتاشے کا محل
سنہ ۱۰۱۲ ھ

ماموں بھانجے کی درگاہ کے احاطے کی شمالی دیوار کے سامنے بیچ میں ایک کھیت چھوڑ کر اس نام کی گری پڑی ٹوٹی پھوٹی ایک عمارت کھیتوں کے بیچوں بیچ کھڑی ہوئی ہے۔ اس عمارت کا روکار

قریب قریب چاروں طرف سے گر گیا ہی خاص کر مغربی طرف کا رخ بالکل گر پڑا ہی۔ بقیہ تین سمت کا کچھ گرا ہی کچھ کھڑا ہی جس سے اس محل کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہی۔ یہ عمارت بہت نفیس خوش وضع اور خوش قطع پتھر چونے کی ایک پختہ چبوترے پر واقع ہی جو ۲۰فٹ مربع ہی ۲ ½ اونچا اور عمارت کے گرد ۲۲فٹ چوڑا ہی۔ محل کی عمارت کی بلندی ۲۲فٹ ہی۔ چھت لداؤ کی ہی اوپر سے سپاٹ مگر اندر سے گنبد نما ہی جس میں بقدر وسعت شہ نشین اور کمروں کے گنبد بنے ہوے ہیں۔ چاروں طرف پانچ پانچ وسیع اور مرتفع محراب دار در ہیں مکان کا پیش جنوب رویہ ہی اور صرف ادھر ہی صدر دروازہ ہی اور اسی طرف دو دروں میں سے مشرق اور مغرب دائیں بائیں چھت پر جانے کے سولھا سیڑھیوں کے دو زینے ہیں۔ عمارت کے بیچ میں ایک ہال ۲۷فٹ مربع ہی جس کے چاروں طرف تین سیڑھیاں چڑھ کر شہ نشینیں مستطیل ۲۷ × ۱۴ - ½ ہیں جن میں تین تین بڑے دروازے سامنے دار اور ایک ایک چھوٹے داہنے بائیں ہیں جو بغلی کمروں میں نکلتے ہیں۔ شہ نشین کی چھت پر ایک لمبوترا قلم دان نما گنبد ہی اور ادھر ادھر آدھے آدھے گنبد۔ بغلی کمرے ہشت پہل ہیں جن کا قطر ۱۳فٹ ہی اور چاروں طرف چار دروازے اور سات طاق ہیں جن میں چار کھلے تین بند۔ شہ نشین میں سولھا طاق اجارے کے اوپر ہیں جن میں سے پانچ کھلے اور باقی بند ہیں۔ پانچ طاق پچھیت کی دیوار میں ہیں۔ محاذ کی دیوار میں دو دروازے چار طاق ہیں۔ ان شہ نشینوں میں خاص کر بہت نفاست سے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ دیواروں اور چھتوں اور کونوں میں بیل بوٹوں کا باغ کھلایا ہی اور دیواروں میں اجارے تک گیروے رنگ پر سفید چو پڑکے پھول بنائے ہیں۔ کونوں میں سرمئی۔ سرخ۔ زرد۔ ہر قسم کے رنگ کا کام ہی۔ محرابوں کے اندر ایسی نفیس اور قابل دید رنگ آمیزی کا کام کیا ہی کہ حیطۂ بیان سے خارج ہی۔ یہی حال بغلی کمروں کی آراستگی کا ہی۔ استرکاری ایسی کی ہی کہ اب بھی منہ دکھلائی دیتا ہی۔ ہر طاق پر گیروی زمین پر سفید حروف میں طغری کلمۂ طیبہ کا ہی۔ جنوب رویہ سہ دری ہی کہ اسی میں محل کے ہال کا

دروازہ نکلتا ہے اس سہ دری کی پچھیت کی دیوار میں جس میں محل کے ہال کا دروازہ ہے ۲×۱۰ لمبی اور سات انچ چوڑی پٹی گچ کی بنائی ہے جس میں نفیس پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں اور سبزی رنگ دیا ہو جس میں سفید منبت حروف سے یہ کتبہ نہایت خوش خط نستعلیق میں سارے کا سارا ایک لمبی سطر میں لکھا ہوا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نہال خسروی مرزا مظفر　　کہ از نخل مرادی بود فوبر

برفت از عالم فانی بار ماں　　فغان و آہ و دل ہم بود بر سر

چو سال فوت تاریخش بجستم　　خرد گفت آں بہشتی بود پیکر

کاتب الحروف عبدالنبی الحسنی عاقبت بخیر باد

اب تک ہم اسے کسی امیر کا محل سمجھ رہے تھے۔ اس قطعہ کو دیکھ کر ہمارا خیال بدلا چھت پر جاکر دیکھا تو ہمارے خیال کی تصدیق ہوئی یہ مقام گو بتاشے کے محل کے نام سے مشہور ہے مگر دراصل مرزا مظفر کا مقبرہ ہے۔ چھت پر ایک بیس فیٹ مربع۔ ڈھائی فیٹ اونچے پختہ چبوترے پر چونے گچ کی قبر کا ایک تعویذ ۸ لمبا۔ ۲½ چوڑا۔ ۱ اونچا بنا ہوا ہے اور یہ بیچ کے ہال کے اوپر ہے جس سے صاف ظاہر ہو کہ یہ ہال جس کے گرد شہ نشینیں ہیں۔ اور جو شہ نشینوں کی سطح سے بقدر تین سیڑھی کے پست ہے یہ دراصل مقبرہ تھا اور یہیں صاحب مقبرہ کی قبر تھی جس کا اب نام نشان تک نہیں اور یہ ہال بھی تیرہ و تار اور اس کا ایک ہی چھوٹا سا دروازہ ہے۔ پھر خدا معلوم بتاشے کا محل کیوں مشہور ہوا۔ بتاشے کا باغ کہنے کی تو ایک وجہ بھی ہے کہ اس مقبرے کے گرد ایک باغ تھا جو اب نہیں رہا اور باغ کی جگہ کھیت ہی کھیت نظر آتے ہیں تاریخ کے لحاظ سے سنہ ۱۰۱۲ھ سال بنا نکلتا ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا مظفر کون تھے۔ زمانے کے لحاظ سے یہ عہد جہانگیری ہوتا ہے پس یہ اس زمانے کے کوئی بڑے نامی گرامی امیر رہے ہوں گے جن کا مقبرہ ہزار ہا روپیے کی طیاری سے بنا ہے۔ اگر یہ کتبہ نہ ہوتا تو ہم لاکھ سر ٹپک مارتے یہ پتہ بھی نہ چلتا کہ یہ مقبرہ کس کا ہے۔ اس مقبرے کا سطحی اور نظری نقشہ یہ ہے:
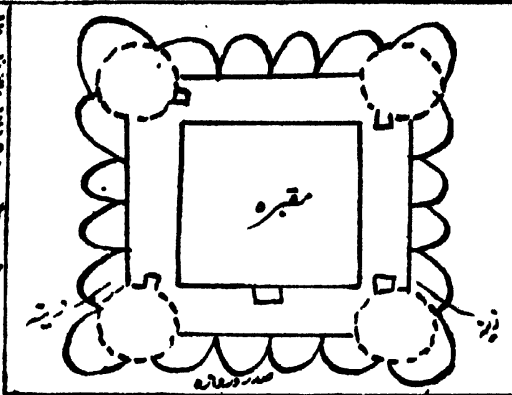
صاحب اکبری میں خواجہ مظفر علی تھا
مظفر خاں کے نام سے کہلاتے تھے
بعد کیل مطلق ہوئے ۹۸۰ھ میں
کہ ٹوڈر مل جیسے کام کو اچھی طرح کر
کی تشخیص میں ... ان کی کارروائی
بھول گئے اہل معرفت میں
سنگ کاشی ہے از خراسانی۔
یاروں نے چل کر اس میں
سنگ ماچھ ہے از مظفر خاں۔

مقبرہ

زینہ

برج

صدر دروازہ

مظفر خاں ایک امیر اکبر کے عہد کا
بیرم خاں کے دیوان تھے سلطنت
بنگالہ کی مہم پر بھیجے گئے تھے
سخت گیر تھے ان کی دیوانی
دیکھ کر ٹوڈرمل کو
ایک شعر مشہور تھا۔
گر ہمہ صد بار سنگ کاشی ہے
اصلاح کی اور کہا۔
گر ہمہ صد بار سنگ ماچھ ہے

اب اس محل کا فرش تو بالکل رہا ہی نہیں۔ ان شہ نشینوں میں جن کے دیکھنے سے آج بھی دل کی کلی کھل جاتی ہے اور آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں کھیت والے اپنے ڈھور ڈنگر باندھتے ہیں جن کا گوبر جا بجا پڑا ہوا ہے اور پیشاب کی عفونت سے ٹھیرنا مشکل ہے۔ کیسا مقام عبرت ہے۔ اب اس عمارت کے گرد زراعت ہوتی ہے پہلے اس محل کے چوطرف باغ تھا۔

دو نامعلوم گنبد

(۱) بتاشے کے محل کے مشرق میں صرف ایک کھیت درمیان میں چھوڑ کر ایک پختہ گنبد ہے جو اندر سے ۱۵ فٹ مربع ہے یہ گنبد ہشت پہلو ہے جس کا ہر ضلع ۸ فٹ ہے۔ آدھا گنبد شمال کی طرف سے گر پڑا ہے۔ تین طرف نفیس جالیاں سنگ سرخ کی لگی ہوئی تھیں چنانچہ اب بھی شمال کے طرف کی جالی سالم ہے اور مغرب کی نصف۔ صدر دروازہ ۱۰ فٹ اونچا ۴ فٹ چوڑا ہے۔ دروازے پر دو طرفہ چینی کے کام کا لکھا ہوا ہے اور اندر باہر چینی کا کام کچھ کچھ بچا کھچا نظر آتا ہے۔ گنبد کے اندر آیات قرآنی نہایت خوش خط جلی اور واضح گچ میں کٹی ہوئی گنبد کے چاروں طرف لکھی ہوئی ہیں جو کئی جگہ سے جھڑ بھی گئی ہیں کھپرے کے کھپرے گر پڑے۔ مغرب و جنوب میں پوری آیۃ الکرسی ہے۔ شمال میں سورۂ مزمل پوری بسم اللہ سمیت جس کے حروف کئی جگہ سے جھڑ گئے ہیں۔ گنبد کے اندر نہ فرش باقی ہے نہ قبر۔ چبوترا ہشت پہل ہے جس کا ہر ضلع ۴ فٹ لمبا ہے اور کرسی چبوترے کی چار فیٹ اونچی ہے۔ اس مقبرے کے مغربی رو کار پر ایک لمبا کتبہ بخط نستعلیق نہایت خوش خط تھا چوں کہ بائیں طرف سے

پھل کی پھل گر پڑی وہ کتبہ بھی گر گیا اب داہنی طرف صرف یہ باقی ہی:-

. . . . سالِ تو دولت ازلی

. . . . مال چیز دیگر افزودہ

روکار اور اوپر کنگورے کی منڈیر پر اب بھی چینی کے کام کی چمک دمک باقی ہی- (۲) اس گنبد سے کوئی دوسو قدم آگے بڑھ کے ایک اور گنبد اسی نوعیت کا ہی جو اندر سے ۱۸ مربع ہی اور باہر سے ۳۳- پختہ چبوترا ۷۰ مربع ہی جس کی کرسی تین فیٹ اونچی ہی- چاروں طرف چار دروازے ہیں جن میں سے صدر دروازہ ۷ آچوڑا ہی- گنبد کے اندر سورۂ یوسف کا یہ رکوع فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ تا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ پارہ ۱۲- سورۂ یوسف رکوع ۱۴ و ۱۵ مثل لکڑ والے گنبد کے اُسی خط میں منقوش ہی جیسا کہ نمبر (۱) کے گنبد میں ہی- قبر اس میں بھی نہیں ہی- نہیں معلوم ہوتا کہ یہ دونوں گنبد کن صاحبوں کے تھے-

درگاہ سیّد محمود بحار

۶۰۷ھ ۱۲۰۶ء

ز عشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی ست

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

یہ درگاہ شہر دہلی سے چار کوس بارہ پُلے کے پاس موضع کیلو کھڑی کے حدود میں واقع ہی- یہ مکان تو کچھ عمدہ بنا ہوا نہیں ہی مگر اس مکان کو مکین سے شرف ہی اور شَرَفُ الْمَكَانِ بِالْمَكِيْنِ یہیں صادق آتا ہی- حضرت سیّد محمود بحار اولیائے کاملین میں سے ہو گزرے ہیں اور سید ناصر الدین سونپتی کی اولاد سے ہیں- آپ علاوہ درویشی کے بہت بڑے عالم باعمل بھی تھے اور اسی واسطے آپ کا لقب "بحار" مشہور ہو گیا- آپ کا لقب "محی العظام" بھی ہی آپ کو "راجہ ہاڑ گوڑ" بھی کہتے ہیں جس کی وجہ تسمیہ یہ ہی کہ ایک بڑھیا عورت کا بیٹا سفر کو گیا تھا اور وہ اُس سے بے انتہا محبت رکھتی تھی اور ہمیشہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی اور اپنے لڑکے کے لیئے دعا منگواتی- اللہ تعالیٰ نے از روے مکاشفہ آپ پر ظاہر فرمایا کہ وہ لڑکا مر گیا اور بجز ہڈیوں کے کچھ باقی نہیں رہا- آپ نے نہایت عجز و انکسار سے بارگاہ باری تعالیٰ

نقشہ بارہ پلہ

درگاہ سید محمود بحار
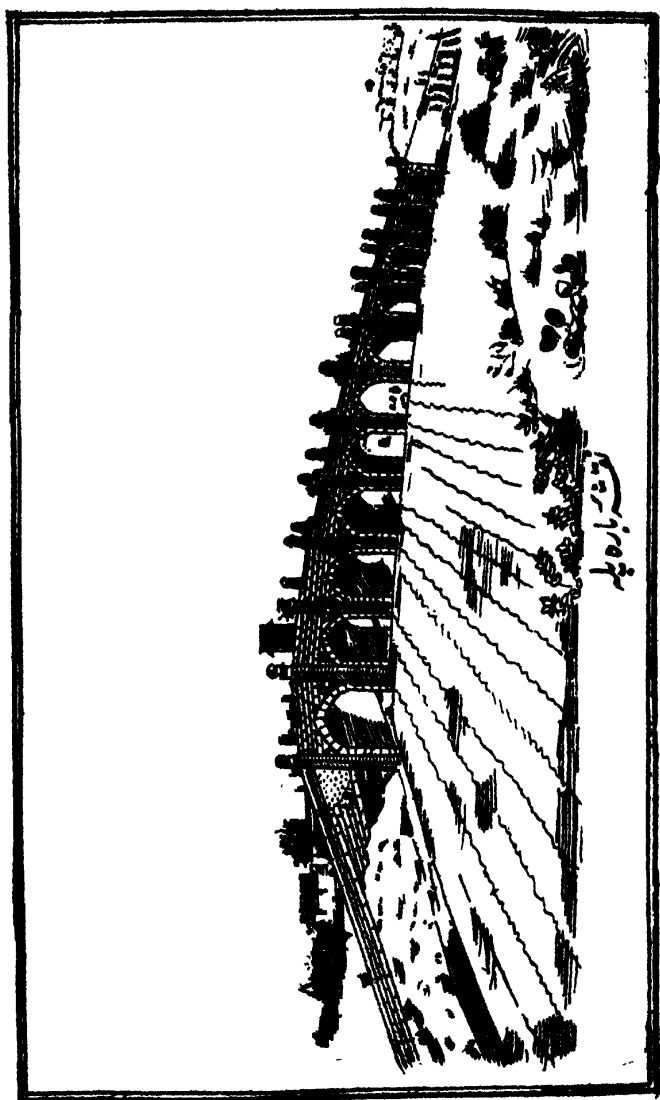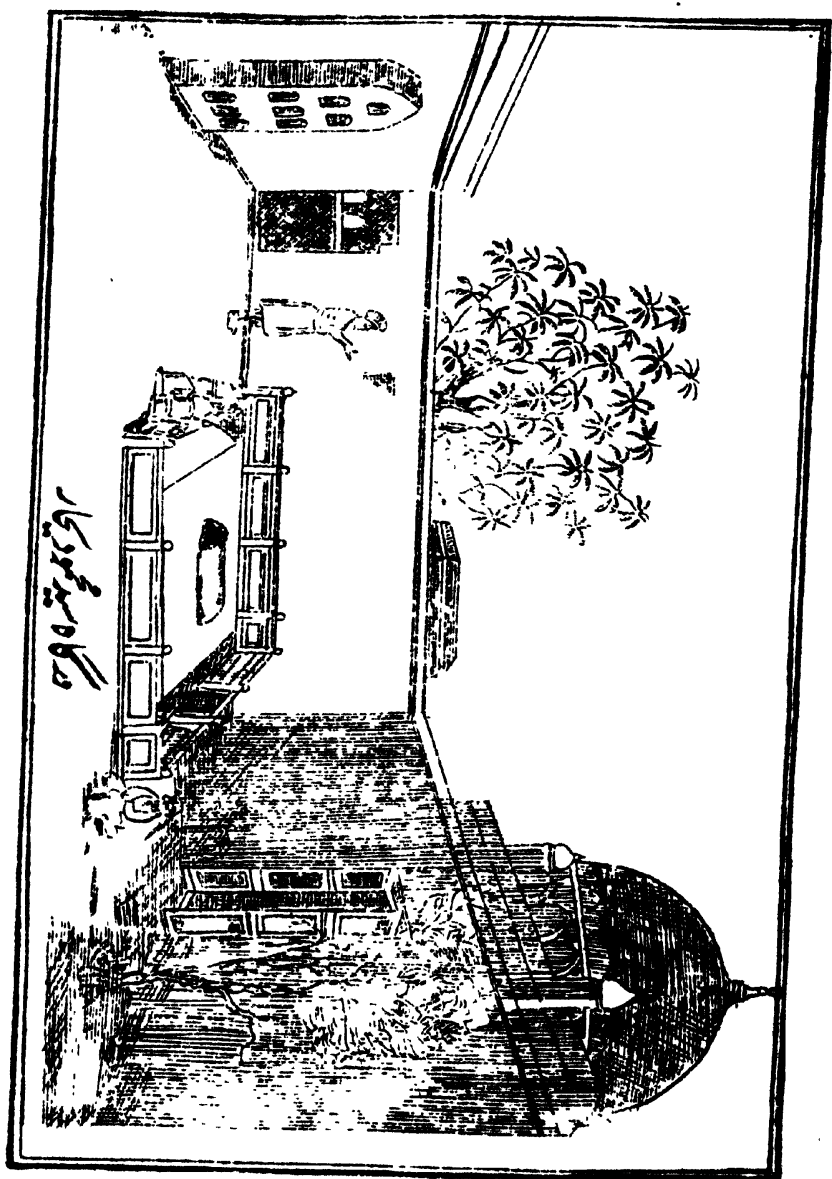
میں دعا کی اور جناب رب العزت نے اپنی قدرت کاملہ سے آپ کی دعا قبول کی اور اس مردے کو زندہ کردیا اور اس مردے کو اس کی ماں سے ملایا اور جلوہ اَوْلِیَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل کا دکھایا۔ ؎
فیض روح القدس ار باز مدد فرماید دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد
جب سے آپ کا لقب محی العظام اور راجہ ہاڑ گوڑ یعنی ہڈیوں کے زندہ کرنے والے اور ہڈیوں کے بادشاہ پڑ گیا۔ آپ کے کمالات ظاہری و باطنی غایت شہرت سے محتاج بیان نہیں۔ آپ کا وصال ۲۷ صفر ۹۱۶ھ کو ہوا اور اِس مقام پر امانت الہی کو سونپا۔ معتقدین خاص نے ایک کچی چار دیواری مزار مبارک کے گرد بنادی ہے۔ اگرچہ مکان عمدہ نہیں مگر فیض سے مملو ہے۔

دنیا پلیست در گزر روز آخرت
در وے مکن مقام کہ پل جائے رفتن است

بارہ پلہ
۱۰۲۱ھ
۱۶۱۲ء

یہ پل ہمایوں کے مقبرے کے جنوبی دروازے کے جنوب مشرقی رخ پر تھوڑے ہی فصل سے واقع ہے جس کو عہد اکبری و جہانگیری کے ایک بڑے نامی گرامی خواجہ سرا مہربان آغا عرف آغامان المخاطب بہ آغائی آغایان نے جہانگیر بادشاہ کی سلطنت کے زمانے میں بنوایا تھا اور انھوں ہی نے عرب سرائے کا شرقی دروازہ بھی بنوایا ہے۔ ان صاحب کو خاندان تیموریہ سے موروثی بندگی تھی۔ جس زمانے میں شاہزادہ جہانگیر کی شادی ہوئی اکبر بادشاہ نے اُن کی خدمات اپنی بیٹی شاہزادہ خانم یعنی جہانگیر کی بہن سے لی تھیں اور جہانگیر کے محل کی خدمات سپرد کردی تھیں اور اس سبب سے جہانگیر بھی ان کی نہایت تعظیم و توقیر کو ملحوظ رکھتا تھا اور یہ بھی ہر دم اور ہر لحظہ جہانگیر کی حضوری میں باریاب رہا کرتے تھے اور سچ مچ جہانگیر کے فدائی اور خیر خواہ مخلص تھے۔ سنہ ۱۴ جلوس جہانگیری میں اُنھوں نے بوجہ کہولت سن خانہ نشینی اختیار کی اور دلی میں رہنے لگے۔ جہانگیر نے بہت خوشی اور خاطر داری سے ان کی پنشن کی درخواست قبول کی اور سید بہوہ حاکم دہلی کو بہت تاکید کی کہ ہمیشہ ان کی خوشی اور

خاطر داری کا پورا خیال رکھیں اور ان کو کسی قسم کا رنج یا تکلیف نہ پہنچے۔ خان خاناں ہونے کے بعد انھوں نے یہ پل سنہ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ع) میں بنوایا۔ جنرل کننگھم اس تاریخ کو اس وجہ سے صحیح نہیں سمجھتے کہ یہ نیہ فنچ نے اسی پل کو سنہ ۱۶۱۱ء میں دیکھا تھا۔ لیکن یہ اس وجہ سے بے محل ہو کہ خود پل پر تاریخ کا کتبہ لگا ہوا ہو۔ ممکن ہو کہ سنہ ۱۰۲۱ھ کی مطابقت سنہ ۱۲-۱۶۱۱ء سے ہو نیز فنچ کا کہنا بھی ٹھیک ہو۔ اغلب ہو کہ اس نے اواخر سنہ ۱۶۱۱ء میں اس پل کو دیکھا ہو گا جو آغاز ہو گا سنہ ۱۰۲۱ھ اور سنہ ۱۶۱۲ء کا۔ یہ بڑا بھاری پل گیارہ دروں کا سنگ بست اور پختہ چونے اور سنگ خارا کا بنا ہوا ہو اور بقول ڈی لائٹ کے جمنا کی ایک شاخ (یعنی نالے) پر بنا ہوا ہو۔ سنہ ۱۶۲۳ء میں مقبرے اور پل کے درمیان ایک کشادہ سڑک تھی جس کے دونوں طرف بڑے بڑے سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے۔ نام تو اس کا بارہ پلہ مشہور ہو مگر در گیارہ ہی ہیں۔ کننگھم کو جو کہ انگریز ہیں ان کو شک پڑ گیا اور یہ وجہ اختراع کی کہ در اصل اس کا نام "بڑا پل" تھا۔ لیکن بگلر صاحب کا لکھنا بالکل قرین قیاس ہو کہ مانا کہ در گیارہ ہوں مگر ستون تو بارہ ہی ہیں اور اسی لحاظ سے صحیح نام بارہ پلہ ہو۔ سیدھی بات چھوڑ کر خواہ مخواہ ایک تیسری وجہ اور گھڑی گئی کہ اہل دیہات نالے کو بار کہتے ہیں اس پر سے یہ نام پڑا۔ میری رائے ناقص میں سیدھی بات وہی ہو کہ بارہ ستون ہونے سے بارہ پلہ مشہور ہو گیا ہو۔ پل کی لمبائی ۳۶۱ فٹ اور چوڑائی ۴۶ فٹ ہو اور انتہائی بلندی ۳۰ فٹ۔ پل کے دونوں سروں پر بڑے بھاری پشتے ہیں۔ دروں کی منڈیر پر دونوں طرف دس دس فیٹ اونچے مینار ہیں۔ شمال رخ کے دوسرے در پر جو سب سے بلند حصہ پل کا ہو اس پر سنگ سرخ کی ۱۲ انچ اونچی ۵ فٹ چوڑی تختی پر ذیل کا کتبہ ہو۔ جس کے اشعار گو لطافت سے خالی اور نہایت بے آب ہیں مگر ان کے معنوں سے آغا صاحب کی اس عقیدت اور اخلاص کا بخوبی پتہ چلتا ہو جو ان کو جہانگیر کے ساتھ تھا۔

اللہ اکبر

از جہانگیر شاہ اکبر شاہ   آنکہ عدلش صباست عالم کل

دوستانرا چو ہد ہد است افسر — دشمنانرا لبان فاختہ غل
ہند را در زمان سلطنتش — عبدہ می نو بسد اسطبل
بوستانیست حضرت دہلی — بوے از گل گرفتہ رنگ از مل
سال ہفتم ز عہد سلطنتش — کہ تنالد ز جور گل بلبل
مخلص خاص مہربان آغا — خادم قصر شاہ و محرم گل
کرد تعمیر این پل از شفقت — کہ شود دستگیرش از سر پل
سال تاریخ از فلک جستم — گشت رویش ز خرمی گل گل
گفت بردار خامہ و بنویس — بستہ از راہ مہربانی پل

اوکھلا گھاٹ اس نام کا گاؤں اور ریلوے سٹیشن دہلی سے چھ میل پر ہے۔ نہر جمن دلی آگرہ کینال اس مقام سے دو میل تک کاٹی گئی ہے۔ اس مقام پر دریاے جمنا کے بیچوں بیچ میں ایک عظیم الشان بند باندھا گیا ہے جس کی وجہ سے موسم گرما میں جمنا کا سارا پانی نہر میں چلا جاتا ہے۔ جہاں اس کا ہیڈ ورک یعنی منبع ہے وہاں ایک چھوٹا سا پارک بنا دیا ہے اور وہاں ایک دو خوش نما بنگلے بھی بنے ہوے ہیں۔ یہ منبع سٹیشن کے مشرق کو دو میل کے فصل سے ہے جو ایک بڑی سیرگاہ ہے اور اکثر لوگ تفریحاً جایا کرتے ہیں۔ دولت خاں لودھی نے ایک ہی سال سلطنت کی تھی کہ خضر خاں نے جو خاندان سادات کا سب سے پہلا بادشاہ تھا اُسے مغلوب کیا خدا جانے کیا سبب تھا کہ خضر خاں اپنے کو تیمور کا باج گزار سمجھتا تھا اور بلا کسی تحریک کے سمرقند کو خراج بھیجا کرتا تھا۔ اس نے سنہ ۱۴۱۸ء میں ایک قلعہ بنایا تھا جس کا نام خضر آباد رکھا لیکن اب اس کا کہیں نشان بھی باقی نہیں رہا مگر اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں اسی اوکھلے کے پاس تھا۔ خضر خاں نے سات برس سلطنت کی اس کے عہد میں کوئی خاص بات قابل تذکرہ واقع نہیں ہوئی۔ خضر خاں نے سنہ ۱۴۲۱ء میں انتقال کیا۔ اس کا مقبرہ اوکھلے میں ہی تھا لیکن جب یہ نہر نکالی گئی وہ تو وہ بھی اس کی رو میں آگیا یعنی اسے گروا دیا گیا۔ اوکھلے کے سٹیشن کے پاس ہی کالکاجی کا مندر ہے جہاں ہر سال بہت سے جاتری جمع ہوتے ہیں

ریلوے لین سے مغرب کی طرف چند میل کے فاصلے پر ایک سپاٹ میدان میں قطب مینار کھڑی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہے جس کے اطراف محلات اور مقابر کے وہ کھنڈر ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہندوستان ساری دنیا میں بھی ایسا دلچسپ مقام نہیں ہے۔

پٹ پڑ گنج سنہ ۱۸۰۳ء

دلی شہر کے جنوب مشرق میں دریاے جمنا کے مشرقی کنارے پر دلی کی اس مشہور لڑائی کا میدان ہے جہاں ۱۱ ستمبر سنہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک اور مرہٹوں سے بڑی بھاری لڑائی ہوئی تھی یہ گاؤں اب بالکل اجاڑ ہے۔ مسٹر فین شا نے اپنی کتاب میں اس جنگ کا حال حسب ذیل لکھا ہے:۔ میدان کارزار کا بہترین نظارہ اس اینٹوں کے پزاوے پر سے ہوتا ہے جو پٹ پڑ گنج کی لبستی کے شمال مغرب میں ہے۔ مرہٹوں کی فوج کوٹلے سے لے کر غازی پور تک جو ایک لمبی اور اونچی پٹی پر بڑی ہوئی تھی جس کی دونوں طرف دلدل تھی جس کے آگے سوار پرلے ہوئے تھے اور سامنے وار توپ خانہ لگا ہوا تھا اور سارے کا سارا پڑاؤ جنگل کی اونچی گھانس میں چھپا ہوا تھا۔ اب حملے کا اگر کچھ موقع تھا تو سامنے ہی کے رخ پر تھا۔ ۱۱ ستمبر کو لارڈ لیک اپنی فوج لے کر علی گڑھ سے چلے اور میدان جنگ سے دو میل جنوب میں جو دلی سے چھ میل ہے گیارھویں تاریخ گیارہ بجے دن کے پہنچے۔ مرہٹوں کی فوج چھ ہزار سوار ملا کر انیس ہزار اور چھوٹی بڑی ستر توپیں تھیں انگریزی لشکر کل ساڑھے چار ہزار تھا اور کچھ سوار اور ہلکی سفری توپیں تھیں۔ غرض یہ کہ اس جنگ میں انگریزوں کے ۱۱۷ آدمی کام آے اور ۲۹۸ زخمی ہوے غنیم کے تین ہزار آدمی مارے گئے اور ساری توپیں ان کی چھین لی گئیں۔ ۱۴ ستمبر کو انگریزی فوج فتح یاب ہو کر جمنا پار ہو کر دہلی میں داخل ہوئی اور ۱۶ کو لارڈ لیک دیوان خاص میں نابینا اور ضعیف بادشاہ شاہ عالم کے حضور میں باریاب ہوے جس جگہ یہ لڑائی ہوئی وہاں ایک ستون اس فتحیابی کی یادگار میں گاڑا گیا ہے جس پر مارکوئس آف ولزلی گورنر جنرل

ہند کے یہ الفاظ بجلسہ کندہ ہیں :-

کتبہ

The Governor General in Council sincerely laments the loss of Major Middleton, 3rd Regiment Native Cavalry; Captain MacGregor, Persian Interpretor; Lieutenant Hill, 2nd Battalion 12th Native Infantry; Cornet Sanguire 27th Dragoons; Quartermaster Richardson 27th Dragoons, and of the brave soldiers who fell in the exemplary execution of deliberate valour and disciplined spirit of the battle of Delhi. The names of those brave men will be commemorated with the glorious events of the day on which they fell, and will be honoured and revered while the fame of that signal victory shall endure.

گورنر جنرل باجلاس کونسل میجر مڈلٹن تیسری رجمنٹ نیٹو کیولری - کپتان میک گریگار مترجم فارسی - لفٹنٹ ہل دوسری پلٹن بارہویں نیٹیو انفنٹری - لفٹنٹ پرسٹن دوسری پلٹن تیرھویں نیٹیو انفنٹری - کارنٹ سینن کوائیر ستائیسویں ڈریگونز - کوارٹر ماسٹر رچرڈسن ستائیسویں ڈریگونز اور اُن بہادر سپاہیوں کی وفات پر مخلصانہ رنج واندوہ کا اظہار فرماتے ہیں جنھوں نے دلی کی لڑائی میں شجاعت اور جوانمردی) اور باقاعدہ ولولے کو قابل تقلید پیرایہ میں انصرام دیا - ان بہادر لوگوں کے نام اُس شاندار دن کے واقعات کی یادگار رہیں گے جس دن کہ وہ کام آئے - اُن کے (ناموں) کی عزت اور توقیر

اس وقت تک قایم رہے گی جب تک کہ اس بے نظیر ربع کا شہرہ باقی ہے۔

قلعۂ کلوکھری۔ کلوکھری کی بستی

قصر معزی یا نیا شہر

۶۸۵ھ ۔ ۱۲۸۶ء

۶۸۹ھ ۔ ۱۲۸۹ء

حصارے چو گردون گردان بلند
کہ رفعت ز برجش بود بہرہ مند
دہد قلعہ ارش بگردون جواب
کند دیدہ بانی او آفتاب
ازاں قلعہ تا گشتہ صورت پذیر
شدہ شیشۂ آسماں دیو گیر

نیا پد سر او بگردون فرو
کہ سرکوب گردوں بود کنج او
شدہ تازہ وصفش دلم بہرہ مند
فلک را نماندہ و ماغ بلند

۶۸۶ھ ۱۲۸۶ء میں موضع کلوکھری میں بلبن کے پوتے سلطان کیقباد نے یہ قلعہ بنوایا تھا جس کا اب نشان تک بھی باقی نہیں ہے مگر جہاں ہمایوں کا مقبرہ ہے وہیں یہ قلعہ بھی تھا۔ طبقات ناصری سے جو بزمان شاہ بلبن لکھی گئی تھی واضح ہے کہ کیقباد نے اپنے عہد میں کلوکھری کو بڑی رونق دی۔ یہاں جمنا کے کنارے عمدہ عمدہ نفیس باغات لگائے اور خود بھی اسی بستی میں رہنے لگا۔ لامحالہ تمام ارکان دولت اور امرا کو بھی یہیں رہنا پڑا اور ان سبھوں نے اپنی اپنی حیثیت اور شان کے موافق متعدد محلات اور مکانات طیار کرائے۔ (از تاریخ فیروز شاہی)۔ کیقباد کے زمانے کے اول سے بھی کلوکھری ایک مشہور مقام اور اقامت گاہ شاہی تھا۔ کتاب مذکورۂ بالا ہی میں لکھا ہے کہ جب ہلاکو خاں مغلوں کے ایلچی کو دربار شاہی میں باریاب کیا گیا تو کوشک سبز سے شہر کلوکھری کے جدید دار السلطنت تک سارے رستے دو طرفہ فوج کھڑی تھی۔ ایلچی کے استقبال کو بلبن کا وزیر بڑی شان و شوکت اور تزک و احتشام سے دلی شہر سے نکلا جس کے جلوس میں پچاس ہزار سوار دو لاکھ پیدل اور دو ہزار جنگی دجمیر فیل ستھے۔ اس وقت طبل و نوبت نقارے کی صدا۔ ڈنکے کی گونج۔ نفیری و شہنائی کی دل کش آواز۔ ہاتھیوں کی زرق برق جھولیں اُن کا چنگھاڑنا اور گھنٹوں کی آواز۔ گھوڑوں کی گلیل ٹاپیں مارنا اور ہنہنانا۔ ہتیاروں کی

جھلاہٹ اور چمک دمک۔ گولوں کی دندناہٹ۔ بانوں کی سنسناہٹ شائیں شائیں۔
غرض یہ کہ ایک عجیب ہنگامہ تھا۔ جس نے مغلوں کے سفیر کے دل پر سلاطین ہند کی عظمت و جبروت کا سکّہ بٹھا دیا اور یہ بات سچ ہو گئی کہ "سلاطین ہند بادشاہی نمی کنند بلکہ خدائی"۔ جب سفیر اس کرّ و فر سے لایا گیا اور دربار میں حاضر ہوا تو شاہزادگان والا تبار اور امرائے ذی وقار۔ راجہ مہاراجہ کا ہجوم دیکھ کر اور بھی دنگ رہ گیا۔ کیقباد کو فالج ہو گیا۔ اس سبب سے امرا نے اُس کے بیٹے کیومرث کو تخت پر بٹھایا مگر امرائے خلجی نے مخالفت کی اور کیومرث کو بہار پور میں پکڑ لے گئے اور کیقباد کا قلعۂ کلوکھری میں لاتیں ہی لاتیں مار کر دم نکال دیا۔ رعایا کی عام رضامندی سے ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء جلال الدین خلجی تخت نشین ہوا۔ دہلی نہ جا کر جلال الدین نے کیقباد کے قلعے کی تکمیل کی اور کلوکھری کو اپنا دار السلطنت قرار دے کر وہیں رہنے لگا۔ چند ہی سال کے عرصے میں "کلوکھری" نئے شہر کے نام سے مشہور ہو گیا اور رائے پتھورا کا قلعہ "پرانی دلّی" کہلانے لگا۔

کوشک لعل تعمیر کردہ جلال الدین خلجی ۶۸۸ھ ۱۲۸۹ء

جلال الدین خلجی کے محل کو سرسید نے کوشک لعل یا نیا شہر لکھا ہے لیکن تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کہ دلّی کو کبھی نیا شہر کہا گیا ہو۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "جلال جلال الدین خلجی نے ایک محل اپنے نام سے بنایا تھا" لیکن کسی اور مورخ نے کہیں اس بات کو نہیں لکھا۔ کوشک لعل کا نشان تو صفحۂ ہستی سے مٹ ہی گیا اب تو صرف نام ہی نام رہ گیا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ "جلال الدین خلجی نے ایک محل بنوایا تھا جس کا نام کوشک سبز تھا جو کوشک لعل سے ملا ہی ہوا تھا"، لیکن کوشک لعل کی نسبت سرسید ہی نے خود لکھا ہے کہ اس میں جلال الدین کے بیٹے کی تخت نشینی ہوئی تھی اور وہ محل رائے پتھورا کے قلعے میں تھا اس لیے یہاں کچھ خلط مبحث ہو گیا ہے۔ بہر حال کوشک لعل کی تعمیر ۶۸۸ھ ۱۲۸۹ء میں ہونا یقینی امر ہے البتہ تعین مقام مبہم ہے۔

خضر آباد اور خضر کی گمٹی

سنہ ۸۱۷ھ — سنہ ۸۲۴ھ
۱۴۱۴ء　۱۴۲۱ء

عالِ دنیا را چو پرسیدم زیک فرزانۂ
گفت یا غولیست یا دیویست یا دیوانۂ
یا شالِ تودۂ برفیست در فصلِ بہار
ہیچ عاقل در چنیں جا کے نسازد خانۂ

خضر خاں خاندان سادات کا پہلا بادشاہ تھا (سنہ ۱۴۱۴-۲۱ء) یہ خاندان اُن تمام سلاطین میں جنھوں نے تخت دہلی پر حکمرانی کی ہے سب سے زیادہ کم زور تھا۔ خضر خاں نے بھی دریاے جمنا کے کنارے کلوکھری سے جنوب مشرق کی طرف ایک میل ہٹ کر موضع اوکھلے کی سرحد میں اپنے نام سے ایک شہر بسایا تھا۔ یہ شہر ہمایوں کے مقبرے سے دو میل ادھر واقع تھا۔ اس شہر کا اب کہیں وجود بھی نہیں رہا اور اسی وجہ سے اب صحیح تعین مقام بھی مشکل ہے اور وہی بات ہوئی کہ ؎

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت　　　رفت منزل بدیگرے پرداخت

اغلب ہے اور نیز سرسید کی رائے بھی یہی ہے کہ خضر خاں کا بسایا ہوا شہر موضع خضر آباد کے قریب تھا۔ خضر آباد جمنا کے کنارے موضع اوکھلے کے قریب شہر دہلی سے آٹھ میل بجانب جنوب ہے۔ سنہ ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں خضر خاں نے انتقال کیا اُس کے بیٹے اور جانشین ابوالفتح مبارک شاہ نے اپنے باپ کا گنبد بنوایا جو عموماً خضر کی گمٹی کے نام سے مشہور ہے۔ گنبد میں جو قبر ہے اسے خضر خاں کی قبر کہنا محض روایت پر مبنی ہے کیوں کہ کوئی کتبہ نہیں مگر جب کہ گنبد خضر خاں کے نام سے مشہور ہے تو قرینۂ غالب یہی ہے کہ قبر بھی اُسی کی ہوگی اور اسی سبب سے سرسید نے بھی اس قبر کو خضر خاں ہی کی لکھا ہے۔ گنبد کے احاطے کا چوتھائی حصہ تو مسمار ہو گیا اب اسی ٹوٹے پھوٹے احاطے کے اندر ایک معمولی سا گنبد کھڑا ہے جس کے چار طرف چار دروازے ہیں اور یہی خضر خاں کا مدفن کہلاتا ہے۔ اس گنبد سے تھوڑی ہی دور اور ایک چھوٹا سا برج ہے خدا جانے وہ کس کا ہے۔

کالکاجی یا کالکا دیوی کا مندر

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چراست
از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است
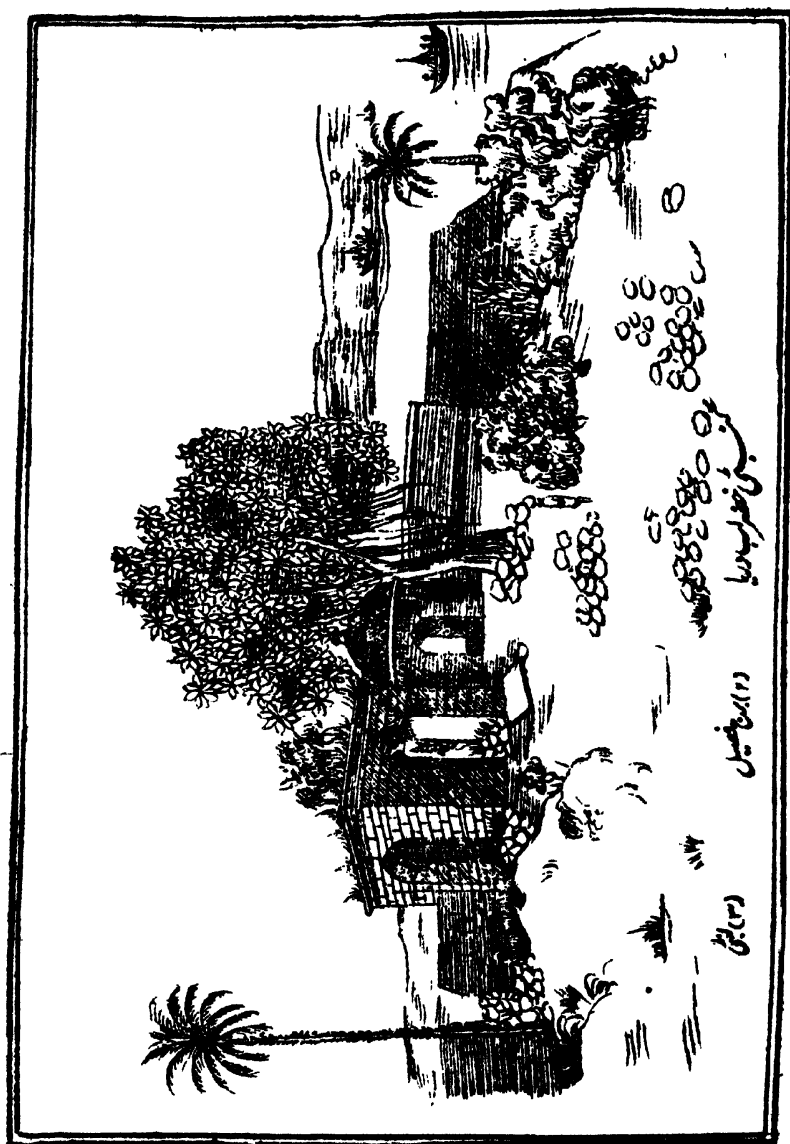
گنبدی خضر لب دریا
(۲) برج فصیل
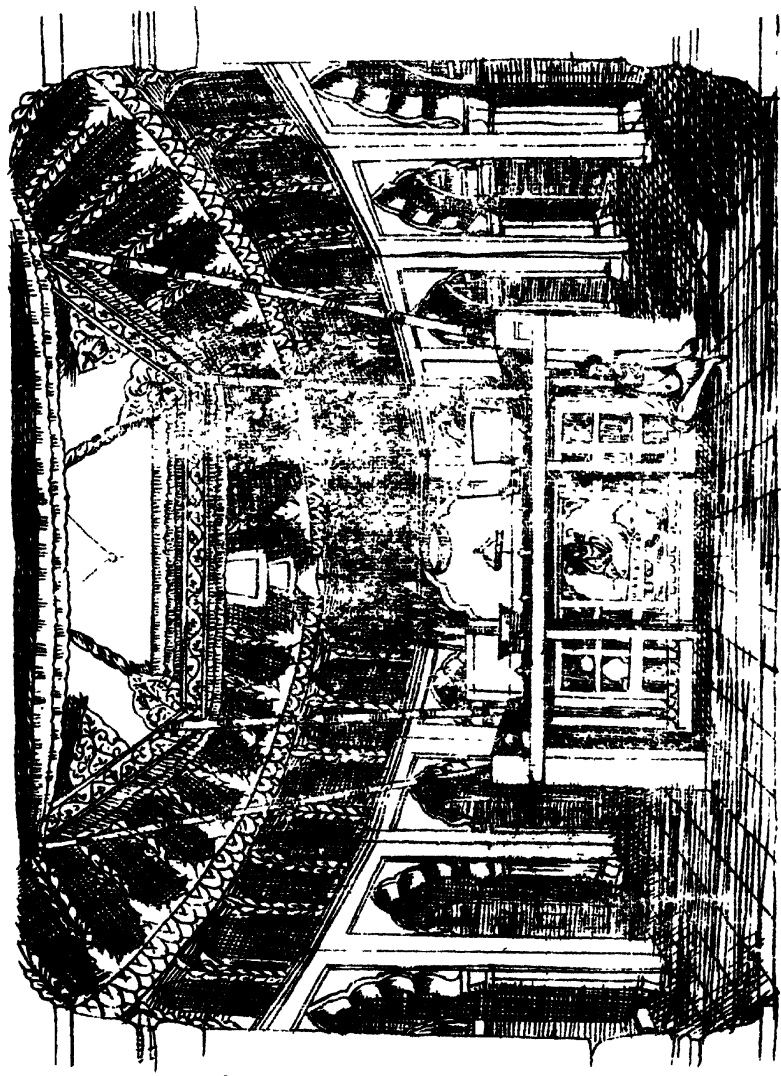
مندر موضع بہار پور کی سرحد میں دلی سے تو میل تغلق آباد کی سڑک پہ ہے۔ اہل ہنود کے مذہب میں کالی دیوی کی پوجا قرنہا قرن سے جاری ہے۔ ہزاروں برس گزرے کہ دو راکشش (دیو یا جن) تھے انھوں نے اُس زمانے کے دیوتاؤں کو بہت ستایا تھا۔ آخر دیوتا ناچار ہو کر برمہا تک فریاد لے گئے۔ برمہا نے کہا مجھ سے تمھاری رچھیا (مداوا) نہیں ہو سکنے کی تم مہامائی یعنی پاربتی کا استت (پوجا) کرو وہ تمھاری سہاتیا (دادرسی) کرے گی۔ جب اُن دیوتاؤں نے مہامائی کی پوجا پاٹ کی تو مہامائی کے منہ سے ایک دیوی پیدا ہوئی جس کا نام کوشکی تھا۔ مہامائی کے حکم سے کوشکی دیوی نے اُن دونوں راکششوں کو قتل کیا۔ اُن کا خون زمین پر گرنا ہی تھا کہ ایک ایک بوند سے ایک ایک راکشش پیدا ہو گیا۔ اس طرح ہزاروں راکشش ہو گئے۔ کوشکی اُن کو مارتے مارتے ہلکان ہو گئی۔ جوں جوں مارتی جاتی تھی ووں ووں ہزاروں پیدا ہوتے جاتے تھے۔ پاربتی کو اپنی لڑکی کی حالت پر بہت ترس آیا۔ اس وقت پاربتی کی بھوؤں سے کالی دیوی پیدا ہوئی جس کا ایک ہونٹ زمین سے لگا ہوا تھا اور دوسرا آسمان میں تھا اور اتنا بڑا منہ پھاڑے بیٹھی رہتی تھی۔ اب ایک سے دو سوے۔ کوشکی جس کو مارتی تھی اُس کا لہو زمین پر گرنے نہ دیتی تھی اور غڑپ کی نگل جاتی تھی۔ اس طرح اُن راکششوں کا شر دنیا سے رفع ہوا۔ اس بات کو پانچ ہزار برس کا عرصہ ہوا کہ کالی دیوی نے اس پہاڑ پر جہاں اب مندر ہے اپنا استھان کیا۔ جب پانڈوؤں کو اس کرامت کی خبر ہوئی تب ہی سے پوجا پاٹ نذر بھینٹ کا سلسلہ جاری ہے۔ بارہ پہر اس مندر میں گھی کا چراغ جلتا رہتا ہے جسے دیبی جی کی جوت کہتے ہیں۔ غرض اب یہ مقام اہل ہنود کی بڑی بھاری اور متبرک پرستش گاہ ہے۔ عام خیال ہے کہ اس دیول کا بڑا حصہ ۱۷۶۴ء میں بنا لیکن مہا کالی کی پوجا تو رائے پتھورا کے زمانے سے چلی آتی ہے۔ مہاراجہ سندھیا نے موضع بہار پور اس مندر کے سبیٹے وقف کر دیا تھا۔ پھر سو روپیے سال نقد ملا کیے اب سب کچھ بند ہے۔ یہاں کے پجاری کچھ کمیٹی سے اور زیادہ تر چڑھاوے اور لوگوں کے دان پن سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ ہر منگل کو

ہفتے وار یہاں میلا لگتا ہی اور ہر مہینے کی اشٹمی کو بہت لوگ جاتے اور پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ چیت اور اسوج کی اشٹمی کو بڑا بھاری میلا ہوتا ہی جس میں شہر کے اور اطراف کے دیہات کے لوگ کثرت سے جمع ہوتے ہیں۔ یہ میلا نچھ ماہی کا کہلاتا ہی۔ اس مقام پر لوگوں کو پانی کی بڑی تکلیف ہی ایک ہی کنواں ہی جس میں گھٹنے گھٹنے پانی رہتا ہی اور بچا نوے ہاتھ رسی جاتی ہی۔ کسی شخص نے دو تالاب بنائے تھے وہ پھوٹے پڑے ہیں اُن میں پانی نہیں ٹھیرتا۔

مورت مندر اس مندر میں کسی کی مورت نہیں ہی ایک گول مول پتھر جیسے مہادیو کا پنڈ دھرا ہی اور اُسی کو کالی کا استھان کہا جاتا ہی جو کثرت استعمال سے کالکاجی مشہور ہو گیا۔ پہلے اس مقام پر کوئی عمارت نہ تھی کالی کا استھان ہونے کے کئی ہزار برس بعد کسی معتقد نے جس کا نام تحقیق نہیں یہاں ایک بارہ در کا لداؤ دالان بنوا دیا تھا اور سمت ۱۸۲۱ میں درگا سنگھ نے سنگ سرخ اور سنگ مرمر کا چھ فٹ اونچا کٹہرا بنوا دیا جس کے بیچوں میں پنڈ رکھا ہوا ہی۔ اس کٹہرے کے بائیں طرف اردو اور ناگری میں یہ دو کتبے لگے ہوئے ہیں:-

سری درگا سنگھ پر سوا رسمت ۱۸۲۱ فصلی

واضح ہو کہ کالی دیبی ہی کا نام درگاجی ہی جو ہمیشہ شیر پر سوار رہتی ہی۔ اس مندر کے پوجاری دو دو وقت پوجا کرتے ہیں اور گیارہ بجے ہر روز دیبی جی کو بھوگ لگاتے ہیں یعنی ہر روز مٹھائی کا ناشتہ رکھا جاتا ہی۔ اسی پنڈ کو جو دیبی جی کی مورت سمجھی جاتی ہی بہت بھاری کپڑے پہنا رکھے ہیں اور دیوی کی مورت پر کمخواب کا پردہ اور غلاف پڑا رہتا ہی اور رات کو آرام کرنے کے لیئے ایک بہت خوب صورت چھوٹی سی پلنگڑی بنا رکھی ہی رات کے وقت اس پلنگڑی کو کسرع کسا تکیہ و کیہ لگا کٹہرے کے اندر دیبی جی کے آگے لگا دیتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ دیبی جی اس پر سکھ فرماتی ہیں۔ جس کی مراد آتی ہی وہ شامیانہ پنکھا چھتر چڑھاتا ہی۔ چنانچہ متعدد چھتر۔ شامیانے اور پنکھے چڑھے ہوئے ہیں۔
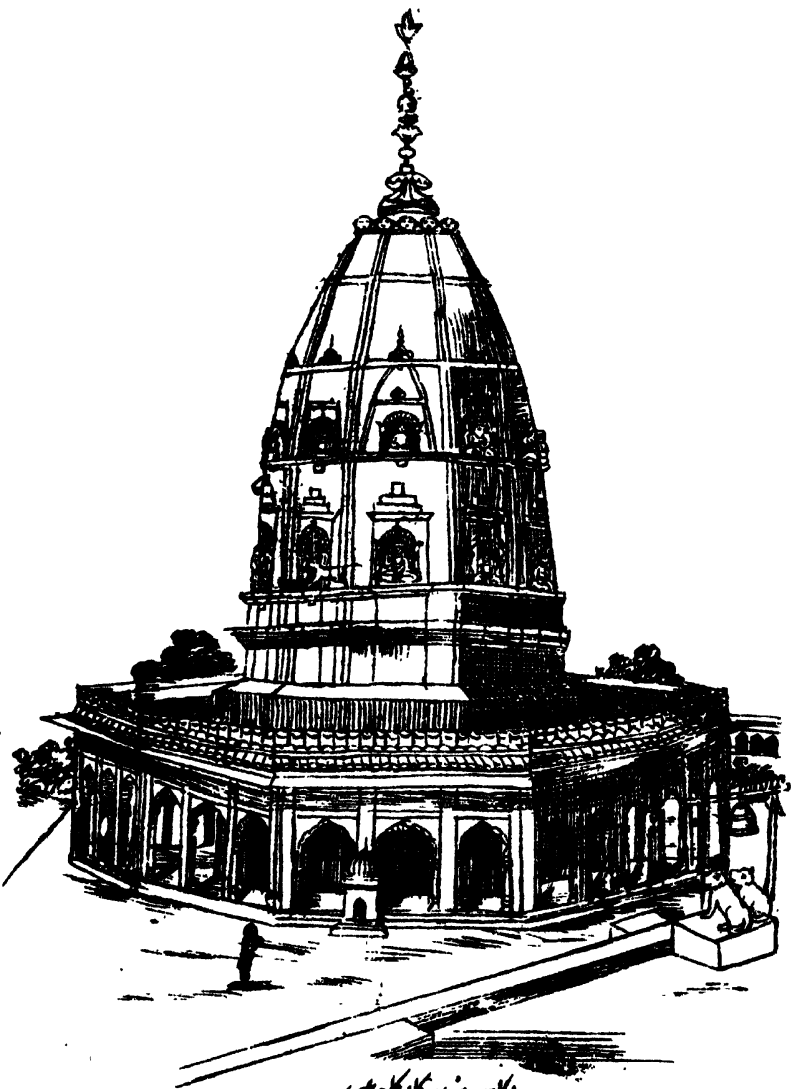
اکاس مندر کالکا دیبی

کاس مندر

اس مندر کی رونق اور شان بڑہانے کو یہاں کے پجاریوں نے چاہا کہ کوئی شخص اس لداؤ پر برج بنوا دے کسی شخص کی ہمت نہ پڑی آخر کار پانڈوں نے یہ تدبیر کی کہ دیبی جی سے حکم لیا جاے جس کے نام کا حکم نکلے وہ مندر کا اکاس جسے گوپرم بھی کہتے ہیں یعنی بلند مخروطی قبہ بنوا دے اس نیت سے شہر کے جتنے ہندو امیر رئیس تھے سب کے نام کی چٹھیاں دیبی جی کے سامنے ڈالی گئیں اتفاق سے مرزا کدار ناتھ کے نام چٹھی نکلی یہ خطابی راجہ تھے مگر در اصل قوم کے بنیئے تھے اور اکبر شاہ ثانی کے عہد میں نظارت کی پیشکاری کا عہدہ رکھتے تھے اور مرزا راجہ کا اُن کو خطاب تھا۔ راجہ صاحب نے جب سنا کہ دیبی جی کا یہ حکم ہی تو فوراً اکاس بنوا دیا۔ یہ اکاس ذوقی کہار کی معرفت بنا ہی اور اس کے گرد غلام گردش سنگین ستونوں کی بھی بنوائی - اندر کے لداؤ میں بارہ دروازے ہیں اور باہر کے ہر ضلع میں تین تین در ہیں۔ راجہ صاحب نے اس تعمیر میں سات آٹھ ہزار روپیئے صرف کیئے پچاس برس کے اندر ہی اندر دلی کے مہاجنوں اور بنیوں نے اس مندر کو بڑی رونق دی ہی اور اس مندر کے آس پاس میلے میں آنے والوں کے اترنے کے لیئے کئی ایک مکان بنوا دیئے ہیں جن سے بہت رونق بڑھ گئی ہی - چوں کہ مذہباً اس بات کا اعتقاد ہی کہ دیبی جی سنگھ یعنی شیر پر سوار ہو کر یہاں تشریف لائی ہیں اس واسطے مندر کے آگے دو مورتیں شیروں کی سنگ سرخ کی بنا کر بٹھا دی ہیں اور اُن کی بھی پوجا ہوتی ہی - ان شیروں کے سروں پر ایک بڑا گھنٹہ لٹکا ہوا ہی جسے پوجا کے وقت بجایا کرتے ہیں اور "دیبی مائی کی جے" کہہ کر پکارتے ہیں۔ انھیں شیروں کے پاس سنگ سرخ کا ایک بڑا ترسول نا ستون کھڑا ہی - یہیں سنگ مرمر میں چھ نوں (قدموں) کا نشان کھدا ہوا ہی۔

نیلا برج یا سیدوں کا مقبرہ یا چورستہ گنبد

بعض لوگ اسے نیلا برج کہتے ہیں۔ یہ مقبرہ چورا ہے کے وسط میں ایک وسیع فننگ کے اندر ہی - جہاں ہمایوں کے

نوٹ - اب پھر حضرت نظام الدین کی درگاہ کے پاس آ جا ئیے - ۱۲

مقبرے اور صفدر جنگ کے مقبرے کو اور دہلی سے متھرا کو سڑک جاتی ہو گو مقبرہ بہت عالی شان اور چینی کے کام کا ہو مگر کچھ ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ کس کا ہو بعض لوگ سیدوں کا کہتے ہیں جن کا زمانہ ۱۴۱۴ء سے ۱۴۴۳ء تک رہا۔ بعض نرا نیلا برج کہتے ہیں اس میں پہلے پولیس کی چوکی تھی اب اسی کے پاس چوکی جداگانہ بن گئی ہو اور مقبرہ خالی کرالیا گیا۔ اس کے گرد ایک وسیع ہشت پہل پختہ چبوترا ہو جس کا ہر ضلع ۴۴ فٹ ۲ انچ لمبا ہو اور چبوترا ۴ فٹ ۴ انچ اونچا۔ اور مقبرے کے گرد ۱۹ فٹ ۲ انچ پھیلا ہوا ہو۔ چار سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہیں۔ گنبد نہایت خوش نما اور سڈول بنا ہوا ہو جس کے اوپر اور چاروں طرف روکار پر اور اندروار کثرت سے چینی کا کام رنگ برنگ کا نیلا۔ سرخ۔ سفید گلکاری کا ہو۔ بہت جھڑ گیا پھر بھی بہت کچھ باقی ہو۔ اندروار سفید پلاستر کر دینے سے پہلا کام باقی نہیں رہا۔ باہر وار بھی جا بجا سے پلاستر جھڑ گیا ہو۔ صدر محراب کے دو طرفہ چینی پر سبز۔ نیلا۔ سفید۔ زرد کام میں کلمہ کا طغریٰ ہو۔ جس کی چوڑان ۱۷ فٹ ۸ انچ۔ اونچان ۲۷ اور مقبرے کی بلندی ۴۳ فٹ ہو۔ اوپر بھی چار طاقچہ نما کھڑکیاں ہیں۔ قبر خام ہو صرف چونا پھیر دیا ہو۔ اور اندر کا فرش بھی کچا ہو۔ زینہ مشرق کی جانب ہو جس میں ۲۴ سیڑھیاں ہیں۔ چبوترے پر متعدد قبریں ہیں اور گرد نیم کے درخت لگے ہوئے ہیں جو قدیم نہیں ہیں۔

ایک چھوٹی سی مسجد

دلی سے جو سڑک آتی ہو جہاں یہ ہمایوں صفدر جنگ روڈ سے ملتی ہو اور چوراہہ ہو جاتا ہو اس کونے پر سیدوں کے مقبرے کے سامنے ایک چھوٹی سی تین گنبدوں اور تین دروں کی پختہ مسجد دہلی کی سڑک سے لگی ہوئی بائیں طرف ہو۔ اس مسجد میں کوئی خاص بات تذکرہ کے قابل نہیں ہو اس کا کوئی خاص نام ہو۔

بارہ کھمبا متصل درگاہ حضرت نظام الدین

حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے قریب ہمایوں کے مقبرے سے جو سڑک صفدر جنگ کے مقبرے کو جاتی ہو جو راستے

نقشہ لال محل
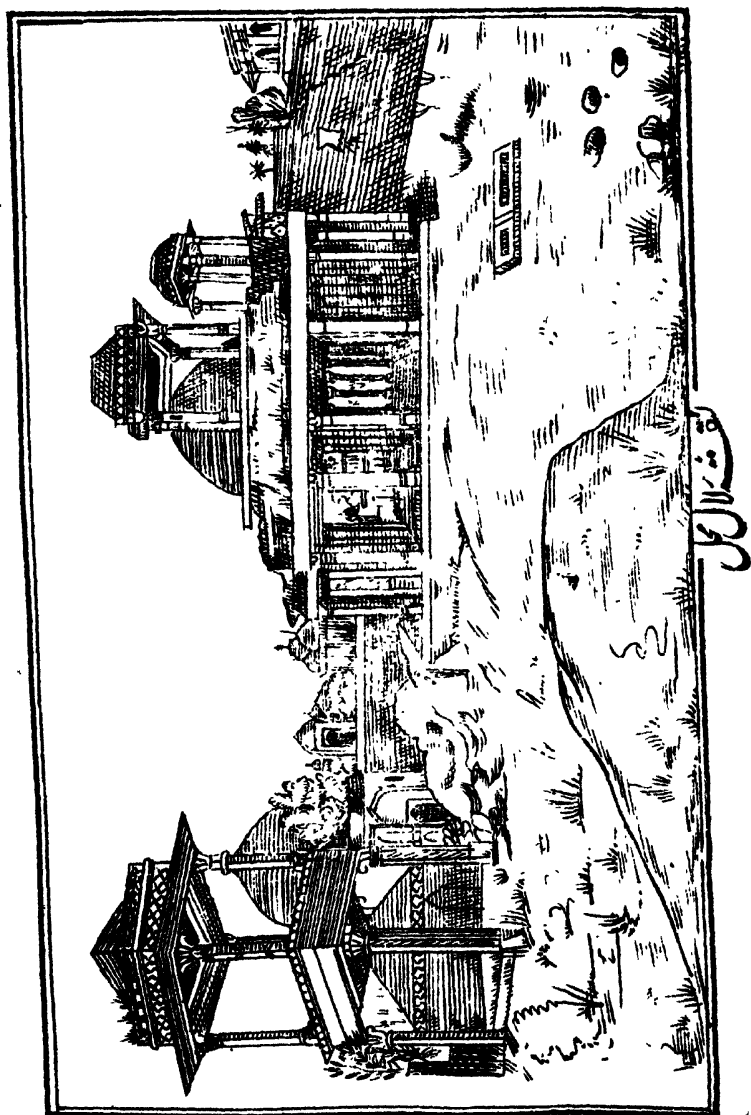
ذرا ہٹ کے یہ ایک پرانی عمارت ہی جس کے بیچ میں ایک بڑا گنبد ہی اور چاروں کونوں پر چار گنبدیاں ہیں۔ یہ عمارت ۴۲ فٹ مربع دو فیٹ کرسی دار چبوترے پر بنی ہوئی ہی۔ جس کے گرد ایک چوڑا توڑے دار چھجہ ہی۔ جس کے ہر چار طرف تین تین بڑی محرابیں ۷ فٹ - ۲ انچ چوڑی ہیں اور ایک ایک محراب دہنے بائیں کونے پر ۵ فٹ - ۵ انچ عریض ہیں۔ غلام گردش ۹ فٹ - ۴ انچ چوڑی ہی غلام گردش چھوڑ کر اندر وار اصلی عمارت میں چاروں طرف تین تین در ہیں اور اسی وجہ سے بارہ کھمبا مشہور ہی یہ حصہ ۳۰ فٹ - ۵ انچ مربع ہی۔ اور اسی پر بڑا گنبد ہی۔ غلام گردش پر ہر چار طرف قلمدان نما لداؤ کی چھت اور کونوں پر ایک ایک گنبدی ہی۔ ستون سب سنگ خارا کے ہیں۔ عمارت پتھر چونے کی ہی۔ گنبد کے اندر چھت پر کسی زمانے میں چینی کا کام تھا جس کے نشان اب بھی باقی ہیں۔ بیچ میں دو قبروں کے نشان ہیں جو زمین کے برابر ہو گئی ہیں۔ فرش پہلے گچ کا تھا اب گچ اڑ کر صرف روڑی رہ گئی ہی۔ سرسید نے آثار الصنادید میں لعل محل کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہی اور لکھا ہی کہ بہت ناقص ہی اور دیکھنے کے قابل نہیں مگر در اصل بلحاظ استحکام بہت درست حالت میں ہی سارا کام پتھر کا ہی کہیں سے ذرا بھی نہیں گرا۔ اس میں ایک عرصے تک مدرسہ تھا اب خالی ہی۔ گورنمنٹ کی طرف سے نگہداشت ہوتی ہی۔ نہیں معلوم ہوتا کہ کس کا مقبرہ تھا۔ دنیاوی نام و نمود پر لوگ مرتے ہیں اور حال یہ ہی کہ جن عمارتوں پر ہزار ہا روپیہ خرچ ہوا اور جو صدہا سال سے زمانے کے فنا کن ہاتھوں کا مقابلہ کر رہی ہیں پھر بھی کوئی نہیں جانتا کہ اس کا بانی کون تھا۔ طرز عمارت بتلا رہا ہی کہ یہ عمارت پٹھانوں کے وقت کی ہی۔ (سنہ ۱۴۵۱-۱۵۲۶ء)۔

فیض اللہ خان بنگش کے مقبرے کے ڈھیم بارہ کھمبے کے پاس ہی فیض اللہ خان بنگش نے اپنا مقبرہ بنوایا جو بالکل ناقص بنا تھا چنانچہ گر پڑا اور سڑک ہمایوں صفدر جنگ کے کنارے درگاہ شریف کے سامنے جو ڈھیم پڑے ہیں وہ اسی کے ہیں۔

لال محل اب اس محل کا صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہی ورنہ سوائے

کھنڈر کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ نظام الدین کی بستی کے پاس کسی زمانے میں یہ محل تھا جہاں اب بہت سے ایسے کھنڈر ہیں کہ جن کے تاریخی حالات صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں ہوتے۔ مسٹر کیمبل کی یہ رائے محض عام رائے پر مبنی ہے کہ "شاہان خلجی نے اس نام کا محل بنوایا تھا اور ظن غالب ہے کہ علاء الدین خلجی کا بنایا ہوا ہے"۔ اب محل کا تو کہیں پتہ نہیں۔ ساٹھ ستر برس کے اول تو کچھ تھا بھی وہ رہا سہا بھی مٹ مٹا گیا۔ شہر میں بہت سی نئی عمارات بننے لگیں۔ سنگ سرخ کی مانگ کثرت سے ہونے لگی۔ مال مفت دل بے رحم۔ بے رحم گاؤں والوں کو غیبی خزانہ ہاتھ آیا۔ ڈسٹری دھڑی کرکے لوٹا اور من مانے پتھر اُکھاڑ اکھاڑ کر لے گئے اور ایک لوٹ مچادی۔ اب جو کچھ ان لٹیروں سے بچ رہا ہے وہ صرف ایک گنبددار حجرہ ہے جس کے چاروں طرف چار چار ستونوں کی برجیاں تھیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑا دو منزلہ دالان محل کے وسیع عمارات کے حصۂ زیرین میں رہ گیا ہے۔ کچھ شکستہ محرابیں جا بجا کھڑی ہیں۔ جن کی تراش خراش پکار رہی ہے کہ علاء الدین کے زمانے کی ہیں۔ دالان کی بالائی منزل تمام تر سنگ سرخ کی ہے اور اسی وجہ سے "لال محل" نام رکھا تھا۔ بالائی منزل بالکل کھلے ہوئے درون کا ایک وسیع ہال ہے جس کی شکل بہت سی چھوٹی چھوٹی برجیوں کی سی ہے جن کی چھتیں سیڑھی دار ڈھلواں ہیں جو گنبد کے اطراف تھیں۔ چوٹی پر پونچ کر مکان کی شکل بیضوی ہوگئی ہے۔ عمارت کا طرز اُس کے نقش و نگار اور گل کاری سب قطب صاحب کے "علائی دروازے" سے ملتی جلتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں عمارتیں قریب قریب ایک ہی زمانے کی بنی ہوئی ہوں گی اور یہی بڑی وجہ ہمارے اس خیال کی ہے کہ ہم اس عمارت کو علاء الدین خلجی سے منسوب کرتے ہیں۔ اکبر یا جہانگیر کے عہد میں اس محل میں کچھ کچھ ترمیمات بھی کی گئی تھیں لیکن اصلیت کا پتہ چلا کہ زمانۂ مابعد میں کیا کیا رد و بدل ہوا ممکن ہے کیونکہ اس عمارت ہی کی وہ حیثیت نہ رہی جو پہلے تھی اور اب تو بالکل ایک تباہ حالت میں ہے۔ یہ محل کوشک لال بھی کہلاتا ہے اور بارہ کھمبے کے پاس ہے۔ پہلے کیسا تھا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ ایک مختصر سی عمارت سرتا پا سنگ سرخ کی باقی رہ گئی ہے جس کے بیچ میں ایک پست اور پھیلا ہوا گنبد ہے اور چاروں طرف دو منزلہ در کے نیچے حجرے اور تہ خانہ ہے۔ تمام ستون سنگ سرخ کے ہیں غریب لوگ سقے وغیرہ رہتے ہیں

جنھوں نے خوب پیٹ بھر کے بگاڑا اور خراب گیا ہے۔ قرینہ دال ہے کہ لال محل کا یہ کوئی بچا کھچا حصہ رہ گیا ہے۔ اس کو اس عالی شان محل کا ایک نمونہ سمجھیے اور اسی پر سے اس کی سابقہ حالت کا مجملی تصور اپنے ذہن میں کر لیجئے۔ لال محل کے دروازے کا حصہ جو اب باقی ہے وہ یہ ہے کہ صرف ایک چوپہل چھتری بُرجی دالان نما مربع شمال رویہ کھڑی ہے۔ چار ستون سنگ خارا کے ہیں چھت میں پتھر کی سلوں کا پٹاؤ کر کے اس کے اوپر سنگ سرخ کی ایک خوش قطع بُرجی بنا دی ہے یہ دروازہ ڈیوڑھی دار تھا۔

ایک نامعلوم گنبد

لال محل سے ملا ہوا ہی ایک چھوٹا سا گنبد (۹۱) مربع کھڑا ہے جس پر رنگ کا کام تھا اب بھی کہیں کہیں اُس کام کی سرخی نظر آتی ہے محراب کے دو طرفہ کلمہ طیبہ کا طغریٰ بھی بنے رہتے ہیں جنھوں نے اندر سے سدا گو بر سے لیپ ڈالا ہے اور اس لپائی کی ایسی تہ پرتہ چڑھ گئی ہیں کہ جیسے چاند ابر میں چھپ جاتا ہے۔ اصلی حیثیت معلوم نہیں ہو سکتی۔ دروازہ صرف ایک ہی مشرق رویہ ہے اسے بھی چُن کر چھوٹا کر دیا ہے۔ اندر پکا پکا کر گنبد کی چھت کو آبنوس کی چھت بنا دیا ہے۔ اندر تین قبریں ہیں جن کا صرف نشان رہ گیا ہے۔ رہنے والوں نے اپنے آرام کے لیئے قبروں کو توڑ پھوڑ کر سطح ہموار کر لی ہے کیوں کہ قبروں کا وجود ان کے آرام و آسائش میں خلل انداز تھا۔

حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز کے حالات

قطب عالم نظام ملت و دیں * کافتاب کمال شد رخ او
در جنید و ز شبلی و معروف * یادگاریست ذات فرخ او

آپ شہر دہلی کے سب سے نامور اور با کرامت اہل اللہ میں سے ہیں جن کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہے اور باوجودیکہ اتنا زمانہ گزرا مگر آج بھی لوگوں کو آپ کی ذات اقدس سے وہی عقیدت ہے جو پہلے تھی۔ آپ کا نام نامی و اسم گرامی محمد بن احمد بن علی البخاری ہے اور سلطان المشائخ۔ نظام الدین اولیا اور محبوب الٰہی کے لقب سے مشہور رہیں۔ دلی والے عموماً سلطان جی ہی کے مختصر پیارے لقب سے پکارتے ہیں۔ آپ کے دادا صاحب کا نام خواجہ علی بخاری اور نانا صاحب کا نام خواجہ عرب ہے۔ یہ دونوں بزرگوار نہایت متقی پرہیزگار صاحب علم و حلم و کرم و اخلاق حسنہ و اوصاف مرضیہ تھے اور علاوہ اس کے دنیاوی ثروت و حشمت سے بھی مالا مال تھے اور یہ دونوں بزرگوار چچا زاد بھائی تھے اور آپس میں غایت درجہ کی محبت تھی چنانچہ اسی قرابت اور محبت کے باعث جو سید علی کے صاحبزادے خواجہ سید احمد حضرت کے والد ماجد

جو مادر زاد ولی تھے) کی نسبت حضرت خواجہ سید عرب (آپ کے نانا) کی صاحبزادی حضرت بی بی زلیخا سے قرار پائی اور نکاح منعقد ہوا۔ آپکا سلسلہ حضرت امیرالمومنین امام حسین بن علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے آپ طرفین سے صحیح النسب سید حسنی تھے۔ وطن اصلی آپ کا شہر بخارا تھا متوطن شہر غزنیں کے تھے۔ اور آپکے آبا و اجداد آخر بسبب مشیت الٰہی حضرت سید علی اور سید عرب بخارا سے ہجرت کرکے مع اپنے اہل و عیال کے ملک ہندوستان کے شہر لاہور میں تشریف لائے اور چندروز بعد وہاں سے بدایوں آئے جو اس زمانے میں نہایت باعظمت اور مرکز علمائے اسلام و صوفیائے کرام تھا اور یہیں کی سکونت اختیار کی حضرت خواجہ سید احمد بڑے عالم متبحر اور فاضل اجل اور نہایت صاحب امانت و دیانت تھے۔ بادشاہ وقت نے آپ کی کرامت اور بزرگی اور علم و دیانت کا شہرہ سنا اور آپ کو شہر بدایوں کی قضائت پیش کی مگر چونکہ امور دنیاوی کی طرف آپ کا میلان خاطر نہ تھا اور خلوت اور گوشہ نشینی پسند طبع تھی آپ نے قضائت کو قبول نہ فرمایا بادشاہ کے تقاضے سے مجبوراً چندروز کے واسطے یہ خدمت قبول کی بعدازاں کنارہ کشی اختیار کی اور بالکل گوشہ نشین ہوکر تلقین و ہدایات عامہ خلائق میں مصروف ہو گئے۔ ۵ ذی حجہ سنہ ۶۴۱ھ میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور بدایوں میں لب تالاب ساغر مدفون ہوئے۔ مزار پاک آپ کا زیارتگاہ خاص و عام و حاجت روائے خلق ہے۔ حضرت سلطان المشائخ کی ولادت ۲۷ صفر المظفر سنہ ۶۳۶ھ ۱۲۳۵ع روز آخری چہارشنبہ وقت صبح صادق ہے۔ آپکا سن شریف پانچ ہی سال کا تھا جب یتیم ہو گئے۔ بادشاہ وقت نے بپاس ادب حضرت کے والد ماجد کے آپ پر مناصب آبائی بحال و برقرار رکھے اور ایک عالم وقت کو آپ کا نائب مقرر کیا۔ سلطان المشائخ اگرچہ اُن دنوں کم سن تھے مگر بحکم مَنْ سَعِدَ سَعِدَ فِي بَطْنِ اُمِّہٖ اُس عہدے سے انکار اور کراہت کرتے تھے جب آپ پڑھنے کے لائق ہوئے آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کو مکتب میں بٹھا دیا آپ نے تھوڑے ہی عرصے میں قرآن شریف حفظ کر لیا بارہ سال کی عمر تھی کہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کے اوصاف سن کر آپ بہت

گرویدہ ہو گئے اور تحصیل علوم میں مصروف و منہمک رہے مگر شیخ کا خیال لگا رہا
مولنٰنا علاء الدین علیہ الرحمہ اصولی بدایوانی سے قدوری تمام کی اس کے بعد
مع اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے بغرض حصول علم دہلی تشریف لائے شمس الملک
سے جو صدر ولایت مانے جاتے تھے اور بہا بزرگ تھے۔ مقامات حریری
جو علم ادب کی ایک نہایت مستند اور بلیغ کتاب ہے پڑھی۔ اور چودہ سال کی عمر
میں علوم عقلی و نقلی کے حصول سے فراغ حاصل کیا۔ آپ بڑے ذہین اور
تیز طبع اور دانش مند تھے کہ علماء نے آپ کو مولنٰنا نظام الدین بحاث محفل
شکن خطاب دیا۔ علم تفاسیر و احادیث و ہیئت و ہندسہ و فقہ و اصول میں دستگاہ
کامل حاصل کی اور علم حدیث مولنٰنا کمال الدین سے جو اس زمانے کے بڑے
محدث تھے حاصل کیا۔ رات دن علم کا ہی مشغلہ رہتا تھا۔ شیخ نجیب الدین
متوکل سے صحبتیں رہتیں اس کے بعد اجودھن تشریف لے گئے شیخ فریدالدین
گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئے قرآن شریف کے چھ پاروں کی تجویدکی
عوارف کے چھ باب سنائے اور سند لی۔ تمہید ابی الشکور سالمی وغیرہ پڑھیں
پھر بیعت سے مشرف ہوئے۔ حضرت کی والدہ ماجدہ نے بھی تھوڑے
عرصے کے بعد ۳۰ رجادی الاولی (سنہ نا معلوم) میں بمقام دہلی انتقال کیا
اور حضرت شیخ نجیب الدین متوکل برادر حقیقی حضرت شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر
رحمۃ اللہ علیہ کے پڑوس میں جس مکان میں کہ رہتی تھیں مدفون ہوئیں اور
یہیں حضرت بی بی نور اور بی بی حور دختران حضرت شیخ شہاب الدین
عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کا مکان تھا یہ دونوں بیبیاں بھی یہیں مدفون ہیں
چنانچہ عام طور پر بی بی نوری کا آستانہ مشہور ہے جو حضرت قطب صاحب کی لاٹھ
سے ایک میل ورے اس سڑک پر واقع ہے جو دہلی سے مہرولی کو جاتی ہے۔
یہ آستانہ موضع آدھ چینی میں واقع ہے جو جاٹوں کی بستی ہے اور مسلمانوں کا نام تک بھی
نہیں ہے بمشکل تمام جاٹوں کے دخل سے ان آستانوں و نیز آستانہ شیخ
نجیب الدین متوکل کو ایک بڑے احاطے میں محصور کر دیا گیا جس میں ایک
قدیم مختصر سے قناتی مسجد اور سباؤلی بھی ہے۔ حضرت کی والدہ ماجدہ کو اپنے خوہری

وفات کا حال عالم رویا سے معلوم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ہر وقت مغموم رہتی تھیں اور اُن کی اطاعت اور ناز برداری کا بڑا اہتمام فرماتی تھیں اور کھانے پینے کی ہر ایک چیز جو حضرت سے کے مرغوب طبع ہوتی آپ کو کھلاتیں پلاتیں۔ حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب آپ کی والدہ ماجدہ کی وفات کا وقت آیا تو چندروز آپ بیمار رہیں۔ کھانا پینا یک لخت چھوڑ دیا۔ اور ہر وقت آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا اُمڈا چلا آتا تھا ہمہ وقت اشکبار رہتی تھیں۔ مرض الموت میں میں چاندرات کو ماہ نو کے سلام کو حاضر ہوا اور حسب عادت قدمبوسی کی تو میری طرف بچشم پرنم متوجہ ہوئیں اور کہا کہ "آج چاندرات ہے؟" میں نے عرض کیا کہ "جی ہاں" کہنے لگیں کہ "اگلے مہینے کی چاندرات کو کس کے پاس آؤ گے اور تمہیں پیار کی نظر سے دیکھنے والا کون رہے گا؟" یہ سنتے ہی میں سمجھ گیا کہ والدہ صاحبہ کی وفات کا زمانہ قریب آگیا۔ میرے دل پر سخت چوٹ لگی اور اس صدمے سے میری حالت متغیر ہو گئی اور زار زار رو رو کے عرض کی کہ "اے مخدومۂ جہاں! مجھ غریب بے چارے کو کس پر چھوڑ چلیں؟" فرمایا کہ "اس کا جواب میں تم کو کل صبح دوں گی اب رات کو تم شیخ نجیب الدین متوکل کے مکان میں جا کر سو رہو۔" چنانچہ اُن کے ارشاد کے موافق میں وہاں جا کر لیٹ رہا مگر نیند کسے آسکتی تھی ساری رات تڑپ تڑپ کر گزاری۔ صبح ہوتے ہی خادمہ بلانے آئی۔ اس نے کہا کہ رات کو والدہ اچھی رہیں۔ میں جا کر پیروں میں گرا اور بے اختیار رو کر عرض کی کہ "میری خوشی تو آپ کی سلامتی میں ہے۔" فرمایا کہ "تم کو یاد ہے کہ تم نے مجھ سے ایک بات کہی تھی اور میں نے کہا تھا کہ تم کو کل جواب دوں گی۔" میں نے عرض کی کہ "جی ہاں۔ یاد کیوں نہیں" فرمایا "اپنا داہنا ہاتھ لاؤ۔ میں نے ہاتھ پھیلا دیا آپ نے داہنے ہاتھ میں میرا ہاتھ پکڑا اور آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا "خداوندا! میں اس غریب بے چارے کو تیرے سپرد کرتی ہوں" اور یہی ایک کلمہ فرما کر جاں بحق تسلیم ہوئیں۔ مجھے اُن کی اس دعا سے ایسی تسکین ہوئی کہ اگر وہ میرے واسطے ایک مکان موتیوں سے بھرا ہوا چھوڑ جاتیں جب بھی یہ اطمینان قلب حاصل نہ ہوتا۔ غرض دہلی میں آپ بعہد سلطان غیاث الدین بلبن بداؤں

سولہا سال کی عمر میں تشریف لاکر شیخ نجیب الدین متوکل کے ہمسایہ میں فروکش ہوے جو حسن اتفاق سے شیخ شیوخ العالم کے بھائی تھے۔ اور تعلیم و تعلم کا شغلہ رہا۔ مولانا شمس الملک و مولانا امین الدین محدث کی صحبتوں سے فیض اٹھایا اور اسی مشغلے میں تین چار سال گزر گئے ایک روز صبح کے وقت آپ جامع مسجد دہلی میں تشریف لے گئے اور موذن نے منارۂ اذان پر چڑھ کر یہ آیۃ پڑھی اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ (کیا مومنوں کے واسطے وہ وقت نہیں آیا ہو کہ ان کے دل ذکر الٰہی کے واسطے جھک جائیں) اس آیۃ کو سنتے ہی آپ کی حالت متغیر ہوگئی اور تمام امور دنیاوی سے دست کش ہوکر ہمہ تن متوجہ الی اللہ ہوگئے۔ ہر طرف سے انوار الٰہی کی تجلیاں آپ پر ہونے لگیں اور بیعت کی خواہش ہونے لگی۔ اس وقت دلی میں شیخ نجیب الدین متوکل سے بڑھ کر کوئی بزرگ نہ تھا آپ نے اُن سے مرید ہونے کی درخواست کی انھوں نے فرمایا کہ اس زمانے میں دو بزرگ معتقد اسے عصر ہیں ایک حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی دوسرے قطب العالم حضرت شیخ فرید الحق والدین مسعود گنج شکر اجودھنی (پاک پٹن شریف) ان دونوں میں سے جس کے چاہو مرید ہو جاؤ۔ آپ کو اس قدر شوق کا غلبہ تھا کہ دوسرے ہی دن بغیر زاد راہ آپ اجودھن کو روانہ ہوے جب آپ قصبۂ سرسہ میں پونہچے تو وہاں دو راستے پھوٹتے ہیں ایک ملتان کو اور دوسرا اجودھن کو آپ تین دن وہاں اس راہ میں مقیم رہے کہ کدھر جاؤں تیسری شب کو آپ کو بشارت ہوئی اور آپ اجودھن کی طرف چلے چنانچہ آپ ۱۵ رجب المرجب ۶۵۵ھ کو اجودھن پونہچے اور بعد نماز ظہر آپ حضرت شیخ شیوخ العالم کے حضور میں حاضر ہوے۔ حضرت نے آپ کی صورت دیکھتے ہی چند قدم استقبال فرمایا اور سلام میں سبقت کی اور السلام علیکم کہہ کر یہ شعر پڑھا:۔

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ   سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

آپ نے حضرت شیخ سے بیس سال کی عمر میں سلسلۂ خاندان چشتیہ میں بیعت کی۔ حضرت نے آپ کے واسطے چارپائی بچھانے کا حکم دیا۔ آپ نے

ترک ادب سے تامل کیا کہ بڑے بڑے حافظان کلام ربانی و عاشقان درگاہ رحمانی تو خاک پر سوئیں تو مجھ کو چار پائی پر کس طرح آرام آسکے گا یہ خبر مولنا بدر الدین اسحاق کو پہنچی تو اُنھوں نے مجھے کہلا بھیجا کہ اپنا کہا کروگے یا شیخ کا فرمودہ بجالاؤگے۔ میں نے کہا کہ میں تو شیخ کا تابع فرمان ہوں اور میں چار پائی کو اُلٹا بچھا کر اس طرح کہ بان زمین سے لگ گئی سو گیا جس سے تعمیل فرمان اور شیخ کا ادب دونوں باتیں حاصل ہوئیں۔ حضرت سلطان المشائخ چاہتے تھے کہ چند دن آپ کی خدمت میں حاضر رہیں مگر آپ کے ہاں عسرت بہت تھی دو دو تین تین دن بلا غذا اسکے صاف گزر جاتے تھے۔ مولنا بدر الدین اسحاق جنگل سے لکڑیاں لاتے اور شیخ جمال الدین ہانسوی کریل کے پھل جن کو ٹینٹی کہتے ہیں اور سرکہ میں اس کا اچار پڑتا ہے لاتے اور مولنا حسام الدین کابلی پانی لاکر باورچی خانے کے برتن دھوتے اور حضرت محبوب الٰہی اُن ٹینٹیوں کو ابال کر کجکول میں نکالتے اور اس طرح کا کھانا ہوتا اس پر بھی بعض اوقات نمک میسر نہ ہوتا۔ خانقاہ کے نزدیک بقال کی ایک دکان تھی حضرت محبوب الٰہی نے ایک دفعہ اُس سے ایک درم کا نمک لے کر کھانے میں ڈال دیا۔ جب حضرت شیخ شیوخ العالم نے لقمہ اُٹھایا تو ہاتھ میں لرزہ پیدا ہوا اور نوالہ جوں کا توں ڈال دیا اور پوچھا کہ نمک کس نے ڈالا ہے اور کہاں سے آیا تھا حضرت محبوب الٰہی فوراً سمجھ گئے کہ قرض کا نمک یہ رنگ لایا ہے میں نے صاف صاف عرض کر دیا فرمایا کہ درویش فاقے سے مرجاتے ہیں مگر لذت نفس کے واسطے قرض نہیں لیتے کیوں کہ قرض اور توکل میں بعد المشرقین ہے دونوں کا ساتھ نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کہ قرض ادا نہ ہو اور گردن پر رہ جاسے پھر وہ پیالے سامنے سے اُٹھوا دیئے اور کہا کہ فقیروں کو دے دو۔ میں وقت ضرورت قرض لے لیا کرتا تھا تب سے توبہ کی کہ کیسی بھی ضرورت ہو قرض نہ لوں گا۔ اس وقت شیخ شیوخ العالم ایک کمبل پر تشریف رکھتے تھے وہ کمبل مجھ کو عنایت فرمایا اور دعا فرمائی کہ انشاء اللہ تم کو قرض لینے کی ضرورت نہ ہوگی پھر جب سلطان المشائخ رخصت ہونے لگے تو آپ نے چند نصیحتیں فرمائیں کہ اپنے دشمنوں کو جس طرح ہوسکے خوش کرنا

اور جب کسی سے قرض لیا ہو اس کے ادا کرنے میں سعی کرنا خداوند تعو آسان کر دیگا
آپ شیخ کی حیات میں تین مرتبہ حاضر خدمت ہوے اور سات مرتبہ بعد وصال
شیخ کے وصال کے وقت آپ وہاں موجود نہ تھے اسی طرح شیخ فریدالدین
گنج شکر بھی اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کے وصال
کے وقت موجود نہ تھے اور وہ اپنے پیر خواجہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمہ
کے وصال کے وقت موجود نہ تھے۔ حضرت محبوب الٰہی نے تمام عمر میں مخصوص
اپنی اوقات کے لیئے کوئی مکان حاصل نہ کیا۔ بدایوں سے آکر پہلے آپ
میاں بازار کی سراے میں جسے نمک کی سراے بھی کہتے تھے فروکش
ہوے اپنی والدہ اور بہن کو یہاں ٹھیرا کر آپ اس کے قریب ہی بارگاہ قواس
میں جو سراے کے سامنے ہی تھی رہنے لگے۔ امیر خسرو کا مکان بھی
اسی محلے میں تھا۔ پھر چند روز کے بعد راوت عرض کے بال بچے چلے جانے
سے وہ مکان خالی ہوا چوں کہ راوت مذکور امیر خسرو کے رشتے کا نانا ہوتا تھا آپ
امیر خسرو کے ذ۔ یعہ سے اس مکان میں جا رہے یہ مکان قلعے کے برج
کے متصل مندہ دروازے اور پل سے ایسا ملا ہوا تھا کہ قلعے کا ایک برج اس
مکان کے اندر آگیا تھا۔ اس مکان کی عمارت نہایت وسیع و بلند تھی۔
سید محمد کرمانی صاحب سیر الاولیا کے جد بزرگوار جب اجودھن سے مع
اہل وعیال کے تشریف لاے تو وہ بھی آپ کے ساتھ اسی مکان میں
رہے۔ اس مکان کی تین منزلیں تھیں۔ نیچے کی منزل میں سید محمد کرمانی کے
اہل وعیال رہتے تھے۔ درمیانی منزل میں حضرت محبوب الٰہی اور اوپر کی
منزل آپ کے احباب کے واسطے تھی اور وہیں کھانا بھی پکتا تھا۔ صاحب
سیر الاولیا کے والد کہتے ہیں کہ ان دنوں سواے میرے کہ میں کم عمر تھا
اور ایک حضرت کے زر خرید غلام بشیر نام کے اور کوئی خادم آپ کے
پاس نہ تھا۔ کھانا پکانے کی خدمت میری والدہ کے سپرد تھی جو حضرت
محبوب الٰہی کے پیر بہن تھیں اور میرے باپ کھانا کھلاتے تھے اور باقی
خدمات جیسے وضو کرانا اور بیت الخلا میں ڈھیلے رکھنا وغیرہ میں انجام دیتا تھا

دو برس کے بعد راوت عرض کے بال بچے واپس آ گئے اس نے سخت تقاضا کر کے مکان خالی کرا لیا حضرت کو اتنی مہلت بھی نہ دی کہ دوسرا مکان مل جاتا آپ کے پاس سوائے کتابوں کے اور کوئی سامان نہ تھا وہ میں نے اپنے سر پر لیں اور چھپر دار کی مسجد میں جو سراج بقال کے گھر کے سامنے تھی لے گیا۔ حضرت نے شب اسی مسجد میں کاٹی اور سید محمد کرمانی کے اہل و عیال مسجد کی دہلیز میں پڑے رہے۔ قدرت خدا کی دیکھیے کہ اسی رات راوت کے مکان کو آگ لگی اور جل جلا کر زمین کے برابر ہو گیا۔ دوسرے دن سعد کاغذی نے جو حضرت شیخ صدر الدین کے مرید تھے یہ ماجرئ سنا اور حضرت کو بڑی عجز و الحاح کے ساتھ اپنے مکان میں لے گئے اور کوٹھے پر ایک وسیع و خوش نما کمرہ بنا ہوا تھا اس میں اتارا اور سید محمد کرمانی کے واسطے دوسرا مکان خالی کروا دیا آپ ایک مہینے اس مکان میں رہے اور پھر یہاں سے اٹھ کر سرائے رکاب دار میں جو پل قیصر کے پاس ہے قیام کیا۔ اس سرا کے کونے میں ایک محفوظ مکان تھا جس میں آپ رہتے تھے اور حضرت کرمانی کے اہل و عیال بھی اسی سرائے کے ایک حجرے میں بسر کرتے تھے۔ پھر ایک مدت کے بعد یہاں سے بھی اٹھ کر محمد میوہ فروش کی دکانوں کے پاس شادی گلابی کے مکان میں جا رہے مگر شمس الدین شربدار کے اقربا نے جو حضرت کے مرید و معتقد تھے آپ کو یہاں نہ رہنے دیا اور بڑے اصرار سے شمس الدین کے مکان میں لے گئے اور اس مکان میں بہ مقابلے دوسرے مکانوں کے آپ کو زیادہ آرام ملا اکثر احباب جو اجودھن سے آتے اسی مکان میں اترتے۔ اسی محلے میں ایک بزرگ صاحب نعمت خواجہ محمد نعلین دوز بھی رہتے تھے ہمیشہ ان کی انگلیاں چمڑے کے رنگ سے رنگین رہتیں ایک دفعہ انھوں نے حضرت کی مع چند احباب کے دعوت کی۔ کھچڑی پکائی تھی اس میں اتفاقاً نمک تیز ہو گیا لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا آپ نے فرمایا "یارو کچھ نہ کہو ان عزیز کے گھر میں قدرے نمک تھا وہی انھوں نے پکا کر تمہارے آگے رکھ دیا" آپ جس جس مکان میں رہے کرمانی صاحب کے اہل و عیال آپ کے ساتھ رہے۔ ابتدائے زمانۂ قیام دہلی میں آپ کا ارادہ

شہر میں رہنے کا مطلق نہ تھا چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ قتلغ خاں کے حوض پر
ایک دن آپ نے ایک درویش صاحب حال کو ذکر و اذکار میں مشغول پایا۔
نزدیک جاکر پوچھا کہ کیا آپ اسی شہر کے رہنے والے ہیں انھوں نے کہا "ہاں"
پھر آپ نے کہا کہ "کیا آپ اپنی خوشی سے یہاں رہتے ہیں؟" انھوں نے کہا
کون ایسا شخص ہے جو اس شہر اور ایسے اژدہام میں خوشی سے سکونت اختیار کرے
پھر ان درویش نے کہا کہ ایک دفعہ میں نے دروازۂ کمال کے باہر حظیرۂ شہیداں
میں جو لب خندق واقع ہے ایک بزرگ صاحب کمال کو دیکھا جنھوں نے فرمایا کہ اگر
تو اپنا ایمان سلامت رکھنا اور خدا کی عبادت چاہتا ہے تو اس شہر سے باہر چلا جا کیونکہ
یہاں فسق و فجور بکثرت ہو گیا ہے" حضرت نے اسی وقت سے شہر سے باہر چلے
جانے کا قصد کیا مگر کچھ نہ کچھ موانع ایسے پیش آتے رہے کہ پچیس برس گزر گئے
اور بہ فحوائے " قَیْدُ الْمَاءِ اَشَدُّ مِنْ قَیْدِ الْحَدِیْدِ" (پانی (آب و دانہ) کی قید لوہے
کی قید سے سخت تر ہوتی ہے) - اُس درویش کا یہ کلام سن کر شہر چھوڑ نے کا ارادہ
مصمم کر لیا کبھی دل کہتا تھا کہ پیٹالی چلا جاؤں کہ ترک (امیر خسرو) بھی وہیں ہیں اور
کبھی ارادہ کرتا تھا کہ بسنالے چلا جاؤں کہ یہ موضع شہر سے کسی قدر نزدیک ہے
الغرض بسنالے گیا اور تین دن وہاں رہا بھی مگر کسی مکان کا بندوبست نہ ہونے
سے مجبور اً واپس آیا اور اسی تردد میں تھا کہ ایک دن حوض رانی کے پاس ایک
باغ میں جا نکلا جس کو جسرتھ کا باغ کہتے ہیں میں نے وہاں وضو کر کے دوگانہ نماز
ادا کیا اور مناجات میں مشغول ہوا کہ "خداوندا میں اپنے اختیار سے کہیں رہنا نہیں
چاہتا جس جگہ میرے دین و دنیا کی خیریت ہو وہیں مجھ کو رکھ" اسی دعا میں مشغول تھا
کہ یکایک آواز غیبی آئی کہ "تیری جگہ غیاث پور ہے"۔ میں نے نہ کبھی غیاث پور کا
نام سنا نہ دیکھا تھا حیران ہوا کہ یہ مقام کس جگہ ہے۔ میں وہاں سے اپنے ایک دوست
نیشاپوری کے مکان پر آیا جو نقیب کہلاتا تھا کہ ان سے غیاث پور کا پتہ
لگاؤں وہ گھر پر نہ تھے دریافت سے معلوم ہوا کہ وہ غیاث پور گئے ہیں ان کے
آنے کے بعد میں اُن کے ساتھ غیاث پور گیا یہ موضع کچھ آباد نہ تھا نہ کوئی
اس کو جانتا تھا۔ بالآخر میں یہیں رہنے لگا یہاں تک کہ سلطان معز الدین کیقباد نے

دریاے جون (جمنا) کے موضع کیلو کھڑی (کیلوگڈھی) میں محل اور شہر و جامع مسجد کی بنیاد ڈالی تو امرا ر و رؤساے شہر کی آمد و رفت اس طرف بہ کثرت ہو گئی اور مخلوقات کی مزاحمت و کثرت حاضری سے میری اوقات میں خلل آنے لگا اس وجہ سے پھر میرا ارادہ یہاں سے چلے جانے کا ہوا اور یہ ارادہ کر لیا کہ وہاں لوگوں کی آمد و رفت کم ہو اسی اثنا میں ایک نوجوان صاحب جمال نحیف و ناتوان جس کے چہرے سے آثار کمال نمایاں تھے واللہ اعلم مردان غیب سے تھا یا کون تھا میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور یہ ابیات پڑھیں ؎

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی ۔۔۔ کہ انگشت نماے عالمے خواہد شد

امروز کہ زلفت دل خلقے بربود ۔۔۔ در گوشہ نشستنت نمی دارد سود

اور پھر کہنے لگا کہ اول تو آدمی مشہور نہ ہو اور جب خدا اسے شہرت دے تو پھر ایسی بات نہ کرے جس سے کل قیامت کے روز خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے واہ یہ کیا قوت اور کیا حوصلہ ہے کہ خلق سے جدا ہو کر گوشۂ خلوت ڈھونڈتے پھریں اور مشغول بحق ہوں یعنی یہ کوئی قوت و حوصلہ نہیں ہے بلکہ قوت اور حوصلہ اس کا نام ہے کہ باوجود خلقت کے ہجوم کے مشغول بحق ہوں ۔ یہ سن کر حضرت نے اپنا ارادہ نقل مکان کا فسخ کیا ۔ آپ کا وہ مکان جو غیاث پور میں دریاے جمنا کے کنارے تھا اب تک اچھی حالت میں موجود ہے جو مقبرۂ ہمایوں کے احاطے کی جنوب و مغربی دیوار سے ملا ہوا ہے ۔ یہ مکان سفال پوش تھا اور آپ کے مریدین و لواحقین بھی وہیں رہتے تھے اب اگرچہ اس کا بہت حصہ منہدم ہو گیا ہے مگر خاص حضرت کے تشریف رکھنے کا مکان اور کتب خانہ اور خلوت کا حجرہ جس میں آپ کا وصال ہوا اور یہیں آپ کو غسل میت بھی دیا گیا قایم ہے جس کی کچھ مرمت بھی کرا دی گئی ہے ۔

خانقاہ کی تعمیر ہر چند بہت سے امرا اور رؤسا نے خانقاہ بنانے کی اجازت چاہی مگر آپ ہمیشہ منع فرما دیتے تھے یہاں تک کہ ایک دن عماد الملک ضیاء الدین وکیل نے جو آپ کے مریدان خاص میں سے تھے خلوت میں عرض کی کہ میری تمنا یہ ہے کہ جناب کے لیئے اس جگہ خانقاہ تعمیر کراؤں حضرت نے اجازت دے دی تب انھوں نے خواجہ اقبال ملازم اور

سید حسن سے جو سید محمد کرمانی کے فرزند کلاں تھے اور بہت پیش پیش تھے سفارش کرائی اور نہایت عاجزی اور منت سے خواستگاری کی تو حضرت نے فرمایا کہ "ای ضیاء الدین اس میں ایک راز ہی جس سبب سے میں اجازت تعمیر خانقاہ کی نہیں دیتا اور وہ یہ ہی کہ جو کوئی اس زمین پر عمارت بنائے گا زندہ نہ رہیگا ضیاء الدین نے یہ سن کر زمین خدمت کو بوسہ دیا اور کہا کہ "مجھ کو بہ مقابلہ حضور کے آرام و آسایش کے اپنی زندگی عزیز نہیں ہی۔ میں اگر زندہ نہ رہا تو کچھ ہرج نہیں ذات بابرکات حضرت کو خداوند عالم دیر گاہ مسلمانوں کے سروں پر سایہ فگن رکھے تا فلاح کونین وسعادت دارین ہم سب کو نصیب ہو۔ تعمیر خانقاہ کی اجازت مجھ کو ضرور ملنی چاہیئے" ناچار آپ نے فرمایا "خیر جب تم اپنی موت خود اختیار کرتے ہو تو تم جانو لیکن یہ ضرور ہی جو کچھ عمارت خانقاہ کے متعلق تم بنانی چاہو وہ سب ایک مہینے میں طیار ہو جائے"۔ ضیاء الدین نے ایسا ہی کیا اور اس عرصے میں آپ موضع کیلوکھری میں جامع مسجد کے قریب رہنے لگے ہر شب جمعہ کو نماز جمعہ کے واسطے آپ تشریف لے جایا کرتے تھے باقی تمام ہفتہ یہیں گزارتے الغرض جب ضیاء الدین کار تعمیر سے فارغ ہوے تو چار سو اشرفی لگاکر مجلس سماع کا سامان مہیا کیا اور اسی روز حضرت مع اپنے دوستوں اور معتقدین کے خانقاہ میں تشریف لاے اور اسی روز ضیاء الدین کو سماع میں ایسا وجد و ذوق حاصل ہوا کہ حضرت کے زانو پر سر رکھکر رحمت حق سے واصل ہوے۔

دم آخر ترے زانو پہ جو اپنا سر ہو خوش نصیبی میں ہمارا نہ کوئی ہمسر ہو

جب آپ غیاث پور میں رہتے تھے تو نفقر فاقے سے از حد تکلیف تھی تین چار فاقوں کے بعد آپ کے ہمراہی شہر میں زنبیل گردانی (گداگری) کرتے تھے اور جو کچھ روٹی ٹکڑے مل جاتے تھے وہ دسترخوان پر لا رکھتے تھے ایک دن ایک فقیر آن نکلا اور خیال کرکے کہ کھانا کھانے کے بعد یہ ٹکڑے تبرک سے بچ رہے ہیں سب سمیٹ سماٹ چلتا ہوا۔ حضرت نے اس کی اس حرکت پر تبسم فرمایا اور کہا کہ "ہنوز ہم کو بھوکا ہی رکھنا منظور ہی" الغرض آپ کے

تمام ہمراہی بہت تنگ حال سے تھے آخر سلطان جلال الدین خلجی کو خبر پونہچی اُس
نے کچھ تحائف آپ کی خدمت میں گزرانے اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر مرضی مبارک
تو خدمت خانقاہ کے لیئے کچھ دیہات نذر کروں تاکہ آپ بہ فراغت عبادت
الٰہی میں معروف و مشغول رہیں آپ نے بادشاہ کی اس درخواست کو قبول نہ فرمایا
خدام نے سن کر تعجب کیا اور عرض کیا کہ حضور ان دیہات کی آمدنی سے باقی بھی
نہ بچیں مگر ہم خدام کی حالت خستہ و تباہ ہی حضرت خاموش رہے اور کہا کہ
بیش ازیں نیست کہ یہ لوگ تنگ ہوکر چلے جائیں گے تو چلے جائیں مجھ کو کچھ
فکر نہیں مگر ہاں خاص خاص احباب سے اس باب میں مشورہ ضرور ہی تاکہ اُن کا
بھی امتحان ہو جاوے کہ قبول دنیا کی بابت کیا راے ہی چنانچہ سید محمد کرمانی اور
دیگر مخلصان سے مشورہ کیا کہ دیہات قبول کرنا چاہیئے یا نہیں سب نے
بالاتفاق نفی میں جواب دیا آپ ان کی سیرچشمی اور استغنار سے بہت خوش ہوے
اور فرمایا کہ عوام کی راے سے مجھے کچھ سروکار نہیں البتہ تم لوگوں کا مجھے
خیال تھا سو الحمد للہ کہ تم لوگ ثابت قدم نکلے اور دین کے کام میں میرے
مددگار ہو اور دوستوں کو ایسا ہی ہونا چاہیئے - آپ جب اجودھن جانے لگے
تو آپ کے کپڑے بہت میلے اور پھٹے ہوے تھے بی بی رانی زوجہ
سید محمد کرمانی نے آپ سے کہا کہ یہ کپڑے مجھے اُتار دو تو میں ان کو دھوکر
پیوند لگا دوں - آپ نے مارے شرم کے کپڑے نہ اُتارے جب اُنھوں
نے بہت اصرار کیا اور سید محمد کرمانی کی لنگی دی کہ اسے باندھ لیجئے تب آپ نے
مجبور ہوکر کپڑے اُتارے - اس نیک بخت بیوی نے کپڑوں کو دھوکر کرتے
میں گریبان کے پاس سید محمد کرمانی کی دستار میں سے کپڑا لے کر پیوند لگایا
اور آپ نے بڑے شکریئے کے ساتھ پہن لیئے اور آخر عمر تک اُن کا
سلوک یاد رکھا اور سید محمد کرمانی پر بے حد عنایت فرماتے رہے - حضرت
خود فرماتے تھے کہ میں شہر دہلی کے دروازے کے پاس رہتا تھا تو نہایت
حیران و پریشان تھا کہ میں بے چارہ کہاں اور معرفت الٰہی کہاں - میں اس
لائق نہیں ہوں کہ اس نعمت سے عزت پاؤں آخر حضرت شیخ رساں کے

روضے میں چلہ کشی کی کہ مقبولان بارگاہ الٰہی میں میرا بھی شمار ہو۔ روضے میں املی کا ایک خشک درخت تھا اس چلے میں وہ ہرا ہو گیا۔ میں نے شیخ کے مزار کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کی کہ یا شیخ ان چالیس دنوں میں درخت کی حالت پلٹ گئی مگر میری حالت میں کچھ بھی فرق نہ ہوا یہ کہہ کر میں نے گھر کی راہ لی راہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ افتاں خیزاں چلے آ رہے ہیں میں نے جانا کہ کوئی مست ہیں میں کترا کر ہٹ گیا وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور جدھر میں تھا اُدھر ہی آئے اور مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ اُن کے بدن سے مجھے عطر و عنبر کی خوشبو آنے لگی اور میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ شیخ رساں ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ "ای صوفی تمھارے سینے سے محبت باری تعالیٰ کی خوش بو آتی ہے" اور یہ کہتے ہی میری نظر سے غایب ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ضرور محبت و معرفت الٰہی مجھ کو حاصل ہو گی کیوں کہ شیخ نے میرے حق میں ایسا ہی فرمایا ہے۔ ایک دفعہ ایک کیمیاگر آپ کی خدمت میں ایسے زمانے میں آیا کہ فقر و فاقے کا اشتداد تھا اُس نے کہا میں صنعت ذہبی یعنی سونا بنانا جانتا ہوں اگر حکم ہو تو بنا دوں تاکہ یہ صعوبت رفع ہو آپ متبسم ہوئے اور فرمایا کہ" ای عزیز مجھے زر سے کام ہے نہ ذہب سے ذہابی الی اللہ یعنی میرا جانا خدا کی طرف ہے اور اس کے سوا باقی ہوس ہے"۔
آپ جب خستہ حالی میں اجودھن گئے تو آپ کے کپڑے بہت فرسودہ تھے آپ کے ایک دوست نے یہ حال دیکھ کر کہا کہ" مولنا! آپ کا کیا حال ہو گیا اگر اتنی مدت آپ دہلی میں تعلیم و تعلم کرتے تو مجتہد زمانہ ہو جاتے اور مال و متاع بے حساب مہیا ہو جاتا۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا اور معذرت کر کے اپنی راہ لی۔ حضرت شیخ الشیوخ نے آپ سے پوچھا کہ" اگر تمھارا کوئی دوست تمھاری یہ حالت دیکھ کر پوچھ بیٹھے تم کیا جواب دو گے" آپ نے فرمایا کہ" جو حضرت کا ارشاد ہو"۔ حضرت شیخ الشیوخ نے فرمایا۔

نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر و برو ترا سعادت باد امرا نگوں ساری

حضرت نے ایک خوان کھانے کا مجھے دیا کہ لو یہ اپنے دوست کے پاس

لے جاؤ۔ وہ سرائے میں اُترے ہوئے تھے میں خوان لے کر پہنچا۔ اُنہوں نے دیکھتے ہی پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ میں نے کہا میرے شیخ نے آپ کے لیے کھانا بھیجا ہے اور جو بات تم نے مجھ سے کہی تھی آپ نے نور باطن سے معلوم کر لی پھر میں نے وہ بیت جو اوپر لکھی گئی پڑھی۔ یہ سنتے ہی وہ شیخ کی خدمت میں سر اخلاص کے بل آئے اور قدمبوسی کر کے بیعت و ارادت سے مشرف ہوئے حضرت شیخ مخدوم نصیر الدین محمود چراغ دہلی قدس سرہٗ سے منقول ہے کہ حضرت محبوب الہٰی صائم الدہر تھے اور نماز جمعہ کے واسطے غیاث پور سے جامع کیلوکھری میں جو سلطان معز الدین کیقباد نے بنائی تھی اور فاصلہ پورے ایک کوس کا تھا پیادہ جایا کرتے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے دن اور لو چل رہی تھی آپ حضرت نور الدین ملک یار پرّاں کے مزار کے قریب سے گزرے تو آپ کو کثرت تمازت آفتاب سے چکر آ گیا۔ کیوں کہ آپ روزے سے بھی تھے بہ مجبوری وہیں ایک دکان پر ٹک گئے اور دل میں خیال آیا کہ اگر کوئی سواری ہوتی تو کیا اچھا ہوتا معاً آپ نے یہ بیت پڑھی۔

ما قدم از سر کنیم در طلب دوستاں راہ بجائے نبرد ہر کہ با قدام رفت

اور اس خطرے سے توبہ کی۔ دوسرے دن حضرت نور الدین ملک یار پرّاں کے ایک مرید نے رات کو اپنے مرشد کو خواب میں دیکھا اور اُن کے ایما کے موافق ایک گھوڑی نذر دینے کو لائے مگر آپ نے نہ لی دوسرے دن پھر وہ تشریف لائے اور کہا کہ "میرے مرشد کا تاکیدی حکم ہے کہ یہ گھوڑی آپ کی نذر کروں" آپ نے فرمایا کہ "تمھارے شیخ کا تم کو حکم ہے اگر میرے شیخ کا مجھ کو حکم ہو تو میں قبول کروں" تیسرے دن پھر وہ گھوڑی لے کر آئے کیوں کہ اُن کے مرشد نے کہا تھا کہ سہ بارہ پھر لے جاؤ وہ ضرور قبول کر لیں گے کہ اُن کے شیخ نے بھی اُن کو اشارہ کر دیا ہے۔ آپ نے اس دفعہ گھوڑی لے لی فرماتے ہیں کہ اُس دن سے میرے اصطبل میں گھوڑیوں کی کمی نہیں رہی اور پھر میں نے وہ گھوڑی اپنے بھانجے خواجہ محمد کو دے دی۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ ابتدائی زمانۂ قیام غیاث پور میں آپ بہت تنگ دست تھے فاقے پر فاقے ہوتے تھے۔ سب سے

پہلے دو شخصوں نے آپ سے خلافت حاصل کی ایک مولنا برہان الدین غریب جن کے نام پر شہر برہان پور آباد ہے اور جن کا مزار مبارک ملک دکن میں بمقام خلد آباد ہے اور دوسرے مولنا کمال الدین یعقوب جن کا مزار ملک گجرات میں شہر پٹن میں حوض شمس لنگ کے نزدیک ہے۔ الغرض یہ دونوں صاحب مجاہدہ وریاضت میں مشغول تھے کہ برابر کڑاکے گزر گئے کچھ نہ ملا۔ حضرت کے پڑوس میں ایک ضعیفہ رہتی تھی جو حضرت سے بہت ارادت رکھتی تھی اور چرخہ کات کر گزر اوقات کرتی اور نان جو بے نمک کھاتی۔ یہ بڑھیا آدھ سیر آٹا جو کا آپ کی خدمت میں لائی آپ نے مولنا کمال الدین سے کہا کہ اس آٹے میں پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا دو شاید کسی مہمان کو پہنچ جائے۔ ہنڈیا چولھے پر کھد بدیکی ہی تھی کہ ایک فقیر کمل پوش آیا اور کہا کہ کچھ ماحضر ہو تو لاؤ آپ وہ پکتی ہوئی ہنڈیا خود اتار کر لائے۔ فقیر نے ویسی ہی گرم گرم کھالی اور ہنڈیا آپ پکڑے کھڑے رہے۔ چلتے وقت فقیر نے ہنڈیا کو پھینک دیا جو ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور کہا کہ "شیخ فرید نے تم کو نعمت باطنی عنایت کی ہے اس لئے میں نے تمہارے فقر ظاہری کی ہانڈی کو توڑ دیا" اور اسی وقت وہ فقیر چل دیا۔ پھر اس کے بعد سے حضرت کی خدمت میں اس قدر فتوحات غیبی اور نذر و نیاز اور شکرانے کی آمد شروع ہوئی کہ حد حساب اور ضبط تقریر سے باہر ہے۔

آپ کا بذل و ایثار

حضرت کے در اقدس پر ہر روز اس قدر فتوحات پہنچتی تھیں کہ جن کا شمار و حساب نہیں لیکن شام تک حضرت سب خرچ کرا دیتے۔ حضرت کا عجب تصرف تھا کہ ہر وقت لینے والوں اور حاجت مندوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ خانقاہ میں لگے رہتے۔ جس روز نقدی آتی اور خرچ نہ ہوتی تو خاطر عاطر کو قرار نہ آتا اور بار بار دریافت فرماتے کہ کچھ باقی تو نہیں رہا؟ آپ ہر جمعہ کو خانقاہ کے تمام حجروں میں جھاڑو دلواتے اور تمام مال و اسباب ہر قسم کا فقراء پر تقسیم کرکے تب جمعے کی نماز کو تشریف لے جاتے۔ اگر کسی بادشاہ کے آنے کی خبر سنتے تو فرماتے "آہ! یہ لوگ کیوں آتے ہیں۔ نہیں چاہتے کہ فقیر آرام سے بیٹھے"۔ جب آپ کسی کو کچھ

مرحمت فرماتے تو یہ نہ کہتے کہ اتنا دو بلکہ خواجہ اقبال کو ارشاد کرتے کہ ان کو کچھ دیدو
اور خواجہ اقبال تھیلی میں ہاتھ ڈال کر ایک مٹھی بھر کے دے دیتے اس میں جو کچھ
بھی آجاے لینے والے کی تقدیر۔ اُس میں روپئے ہوں یا اشرفیاں۔ یہ تو
آپ کی عام داد و دہش کا حال تھا اور جس پر خاص بخشش فرماتے تو اس کو مالا مال
اور فکر دنیا سے مطمئن کر دیتے۔ اعراس کے مواقع پر بلا امتیاز نیک و بد ہر شخص کو
کھانا اور نقدی ملتی۔ بعض کو ایک وقت کا کھانا اور ایک روپیہ نقد اور بعض کو اس سے
دوچند ملتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ عرس میں خواجہ اقبال (آپ کے خادم خاص) مہتمم
لنگر خانہ نے خواجہ اتو کے ہاتھ (جو اُن کے پیش دست تھے) ایک فاحشہ عورت کو
ایک وقت کا کھانا اور ایک روپیہ نقد بھیجا حالانکہ اُس کا معمول دونوں وقت کا کھانا
اور دو روپیہ نقد تھے وہ عورت خواجہ اتو سے لڑنے لگی خواجہ اتو بہ مشکل پیچھا
چھوڑا کر آئے اور خواجہ اقبال سے یہ ماجرا کہہ رہے تھے کہ حضرت بالاخانے پر
تھے اُن کی آواز سن کر فرمانے لگے کہ "اتو کیا کہتے ہیں؟" خواجہ اقبال نے جو بات تھی
بلاکم و کاست گوش گزار کر دی۔ آپ مسکرائے اور فرمایا کہ "اُس عورت کو ایک وقت کا
کھانا اور ایک روپیہ اور بھجوا دو کہ وہ بے چاری غریب ہے۔ تاریخ ہندی میں لکھا ہے
کہ تین ہزار علماء اور فضلاء علاوہ طالب العلموں اور حفاظ کے اور دو سو قوال جو حضرت
کے مریدین اور معتقدین میں سے تھے ہمیشہ آپ اُن کے متکفل تھے
اور دوسرے لوگوں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔ ایک دفعہ حاسدوں نے قطب الدین
کے سامنے آپ کی شکایت کی اور بادشاہ کو بہت بھڑکایا کہ حضرت نظام الدین
اولیاء آپ کو بہت برا بھلا کہتے ہیں اُن کو ایسا نہ چاہیئے کہ فقیر ہو کر سلطان
کی غیبت کریں اور پھر امرائے سلطانی جو اُن کی خدمت میں جاتے ہیں ان تمام
باتوں کو سنتے ہیں آخر یہ لوگ جو کچھ نذر و نیاز دے جاتے ہیں وہ بھی تو در اصل عطیہ
سلطانی ہی ہے۔ الغرض اس قسم کی باتیں کر کے بادشاہ کو آپ کی طرف سے بالکل
برہم کر دیا اور بادشاہ نے حکم دے دیا کہ خبردار آج سے ہمارے لشکر میں سے
کوئی شخص اُن کے پاس نہ جائے نہ ایک جبہ اُن کو نذر دے۔ میں دیکھوں تو کہ پھر یہ
چہل پہل کیسے رہتی ہے اور کہاں سے لنگر جاری رہتا ہے۔ جب آپ نے یہ سنا

تو دستر خوان اور لنگر کو دو چند کر دیا اور ایک تعویذ لکھ کر خواجہ اقبال کو دیا کہ اس کو ایک طاق میں رکھ دو اور جس چیز کی ضرورت ہو بسم اللہ کر کے طاق میں ہاتھ ڈالنا اور نکال لینا۔ جب بادشاہ نے یہ واقعہ سنا نہایت متعجب اور سخت شرمندہ ہوا۔ حضرت کی خانقاہ کے قریب ایک عورت کنوئیں سے پانی بھرتی تھی۔ آپ نے فرمایا "اے مادر مہربان! تم دریا کے کنارے پہ کنوئیں سے پانی کھینچنے کی زحمت کیوں اُٹھاتی ہو۔ دریا میں سے بھر لونا" عورت نے عرض کی کہ میرا خاوند بہت غریب آدمی ہے اور گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں۔ چوں کہ دریا کا پانی بھوک لگاتا ہے اس واسطے ہم کنوئیں کا پانی پیتے ہیں اور اسی پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ عورت کی یہ بات سنتے ہی آپ زار زار رونے لگے اور خواجہ اقبال سے کہا کہ اس عورت کے گھر میں جو کچھ خرچ ہو اس کو پونہچا دیا کرو تاکہ یہ کنوئیں کا پانی نہ پئیں۔ خواجہ اقبال نے اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ایک دفعہ گرمیوں کے دنوں میں غیاث پور میں آگ لگ گئی اور بہت لوگوں کے مکانات جل کر بہت کچھ سامان واسباب کا نقصان ہوا۔ آپ یہ تباہی دیکھ کر بہت روئے۔ جب آگ بجھ گئی تو آپ نے خواجہ اقبال سے کہا کہ جس قدر مکانات جل گئے ہیں ان سب کو جاکر گنو اور ہر گھر میں دو خوان کھانا اور دو مٹکے پانی کے اور دو اشرفیاں پونہچا دو اور ہر ایک کی تسلی اور تشفی کرو چنانچہ اقبال نے اسی وقت اس خدمت کو انجام دیا۔ اس زمانے میں دو آنے میں بہت بڑا چھتیر بنتا تھا اور دو خوان کھانا سارے گھر کو کافی ہوتا۔ ایک روز آپ نے خواجہ اقبال کو آواز دی معلوم ہوا کہ وہ بزازوں کو اسباب دے رہے ہیں آپ فوراً اٹھ کر خواجہ اقبال کے پاس پونہچے اور کہا کہ "اقبال! تم نے تو خوب دکان لگائی" یہ سن کر اقبال بہت شرمندہ ہوئے۔ پھر حضرت نے تمام بقالوں کو ایک ایک کپڑا بانٹ دیا اور جو کچھ رہ گیا وہ فقراء کو دے دیا۔ ایک سوداگر ملتان کو جا رہا تھا راستے میں اس غریب کو لٹیروں نے لوٹ لیا وہ بہت تباہ حال ہو کر ملتان میں حضرت شیخ صدر الدین بن شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی کے پاس گیا اور کہا کہ میں دہلی جانا چاہتا ہوں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر ایک رقعہ سفارشی حضرت محبوب الٰہی کی خدمت

میں لکھ دیں۔ آپ نے لکھ دیا وہ رقعہ وہ سوداگر لے کر دہلی آیا اور آپ کی خدمت میں پیش کردیا آپ نے خواجہ اقبال سے فرمادیا کہ کل صبح سے چاشت کے وقت تک جو کچھ آئے ان کو دے دینا چنانچہ دوسرے دن اس شخص کو چاشت کے وقت تک بارہ ہزار کی معتدبہ رقم ملی اور یہ شخص مالا مال ہوکر اپنے گھر چلا گیا۔

لنگر آپ کا دسترخوان اور لنگر بہت وسیع تھا سینکڑوں بلکہ ہزارہا آدمی روزانہ کھاتے پیتے تھے۔ ایک روز حضرت باباصاحب کے ہاں فاقہ تھا۔ آپ نے حضرت محبوب الٰہی سے فرمایا کہ بابا نظام کچھ چیز پکا کر لاؤ میں کھاؤں گا۔ حضرت اسی وقت بازار گئے اور اپنی دستار ایک دکان میں گرو رکھ کر تھوڑا سا لوبیا لائے اور اسے ابال کر تھوڑا نمک ڈال کر حضرت باباصاحب کی خدمت میں پیش کیا آپ نے اپنے رفقا کے ساتھ تناول فرمایا کہ تم نے لوبیا تو خوب پکایا اور نمک بھی خوب ڈالا خدا کرے کہ منوں نمک روزانہ تمہارے باورچی خانے میں خرچ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت باباصاحب کی دعا قبول فرمائی کہ آپ کا لنگر بہت بڑے پیمانے پر ہمیشہ جاری رہا اور دین و دنیا کی دولت اور حشمت خداوند تعالیٰ نے آپ کو ایسی دی کہ کسی دوسرے ولی کو نصیب نہ ہوئی۔ ایک دفعہ آپ حجرے میں قیلولہ فرمارہے تھے کہ خانقاہ میں کوئی فقیر آیا اس وقت کچھ موجود نہ تھا اسے خالی ہاتھ واپس کردیا اسی وقت آپ نے خواب میں حضرت باباصاحب کو دیکھا فرمارہے ہیں کہ اگر گھر میں کوئی چیز نہ ہو تو نہ سہی مگر جو کوئی آن نکلے تو اس کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنی چاہیئے اگر تمہارے گھر میں کچھ نہ ہو پھر بھی تابہ امکان آنے والوں سے ساتھ حسن خلق سے تو پیش آئیں یہ کہاں کا دستور ہے کہ سائل کو ایسی خستہ دلی کی حالت میں سوکھا ٹرخادیا۔ آپ جب بیدار ہوئے تو پوچھا کہ کیا کوئی درویش آیا تھا؟ جب معلوم ہوا کہ ہاں ایک شخص آیا تھا تو آپ نے خدام کو بہت سرزنش کی اور کہا کہ خبردار آئندہ ایسی حرکت کبھی بھول کر بھی نہ کرنا اور پھر جب کبھی آپ قیلولے سے بیدار ہوتے تو دو باتیں ضرور پوچھتے ایک تو یہ کہ سایہ ڈھل گیا ہے

یا نہیں اور دوسرے یہ کہ کوئی مہمان آیا ہے یا نہیں اور جس قدر مہمان جمع ہوتے بعد نماز ظہر سب کو بلاتے اور نہایت ملاطفت اور شفقت سے آپ اُن سے پیش آتے۔

دنیا اور اہل دنیا سے نفرت اور شاہان وقت کو آپ کی تمنائے زیارت

در حجرۂ فقر بادشاہے — در عالم دل جہاں پناہے
شاہنشہ بے سریر و بے تاج — شاہانش بخاکپا محتاج

باوجود اس قدر فتوحات و نذر و نیاز کے حضرت ہمہ تن یاد مولیٰ میں مصروف رہتے تھے اور دنیا اور اہل دنیا سے بالکل الگ تھلگ تھے۔
جس وقت کچھ زیادہ آجاتا تو آپ بہت روتے اور بار بار فرماتے کہ ارے بھئی تم نے تقسیم بھی کر دیا یا نہیں اور جب تک وہ تقسیم نہ ہو جاتا آپ کو چین نہ پڑتا۔ خداوند تعالیٰ نے آپ کو بڑا مرتبہ اور بڑی شہرت اور بڑی بزرگی دی تھی اکثر امرار و علمار اور سلاطین آپ کے حلقہ بگوش تھے۔

قبلۂ خسروان روئے زمیں — سروراں خاک گشتہ در رہ تو
درگہ تست آسمان دگر — ماہ و خورشید پاسبانش نگر

بعض حاسدین کو آپ کا عروج دین و دنیا از حد ناگوار تھا اور ہر طرح آپ کی ایذادہی میں سرگرم رہتے تھے چنانچہ سلطان علار الدین خلجی کے خدا جانے کیا کیا کان بھرے اور آپ کے وسیع دسترخوان اور آؤ بھگت اور مرجع خلایق ہونے سے اندیشہ تنقیص مراتب شاہی کا پیش کیا۔ کہ یہ تمامی مقربان شاہی امرار و ملازمین رعایا برایا سب آپ کے غلام اور مرید ہو گئے ہیں اور آج اُن کی حالت یہ ہے کہ ؎

متابع اندر تراچوں سپہر خورد و بزرگ — مسخر اند تراچوں زمانہ پیر و جوان

پہلے تو بادشاہ نے سن کر ٹال دیا مگر آخر کار کب تک علی التواتر شکایات پیش ہونے لگیں تو بادشاہ کے دل میں بھی خطرہ گزرا کہ حضرت کا اس قدر عروج امور سلطنت میں ضرور رخنہ اندازی کرے گا۔ لہٰذا اس نے حضرت کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا اور خضر خاں کے ذریعے سے پیش کیا جو بادشاہ کا نہایت پیارا بیٹا اور حضرت کا مرید تھا۔ اور جس میں بڑی بات یہ تھی کہ آپ مجھ کو امور اہم دستگاہ سلطنت

میں صلاح و مشورے سے مستفید فرمائیں جس سے منشار آپ کا عندیہ لینا تھا کہ آیا
واقعی آپ دُنیاوی عروج کے خواہاں ہیں یا نہیں۔ آپ نے خط کو بغور ملاحظہ فرمایا
اور ارباب مجلس سے مخاطب ہو کر ارشاد کیا کہ میں فاتحہ پڑھتا ہوں۔ میں بے چارہ
فقیر مجھ کو سلطنت کے اُمور سے کیا سروکار۔ میں بیرون شہر ایک کونے میں
پڑا ہوا بادشاہ اور جملہ مسلمانوں کی دعاگوئی میں مشغول ہوں اس پر بھی مجھے ستاتے
ہیں اگر بادشاہ کو میری یہ بات ناگوار ہو اور میرا یہاں رہنا پسند نہ کرتا ہو تو مجھ سے
کہہ دے کہ میں یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ (خدا کی زمین
کشادہ ہے) خضر خاں نے یہ جواب بادشاہ کو پہنچایا تب اُس کا خدشہ آپ کے بہ تدریج
امورِ سلطنت میں دخیل ہونے کا جاتا رہا۔ اس کے بعد بادشاہ نادم ہوا اور کلمات
معذرت کے ساتھ اپنے حاضر ہونے کی اجازت چاہی آپ نے فرمایا کہ
آنے کی کیا ضرورت ہے میں غائبانہ دعاگو ہوں اور جو اثر غیبت دعا میں ہوتا ہے وہ
سامنے کی دعا میں نہیں ہوتا لیکن بادشاہ نے نہ مانا اور مُصر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ
"فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں بادشاہ ایک دروازے سے آئیں گے
فقیر دوسرے دروازے سے نکل جائے گا" جب کسی طرح حضرت نے اجازت نہ دی
تو مجبوراً بادشاہ نے بلا اطلاع جانے کا مصمم قصد کیا اور امیر خسرو سے جو حضرت
کے مصحف بردار تھے اس ارادے کا تذکرہ کیا۔ امیر خسرو سخت متفکر ہوئے
کہ اگر حضرت کو خبر نہ کروں تو وہ ناراض ہو جائیں گے اور اگر خبر کروں تو بادشاہ خفا
ہو جائے گا لیکن آپ نے جان پر کھیل کر یہ بات حضرت کے گوش گزار کر دی
کہ کل بادشاہ آپ کی خدمت میں تشریف لانے والے ہیں آپ یہ سنتے ہی کسی تقریب
اجودھن چلے گئے۔ بادشاہ نے یہ سنا اور امیر خسرو سے کہا "واہ خوب! تم نے
میرا راز فاش کر دیا۔ اور تمہاری وجہ سے میں حضرت کی قدم بوسی کی سعادت
سے محروم و بے نصیب رہا" امیر خسرو نے نہایت دلیری اور آزادی سے
عرض کی کہ حضور کی ناراضگی سے صرف جان کا خوف تھا لیکن حضرت شیخ کی ناراضگی
سے ایمان جانے کا قوی اندیشہ ہے۔ بادشاہ ایک مرد سنجیدہ اور دانا تھا اس
برجستہ جواب سے بہت خوش ہوا۔ اور معاف فرما دیا۔ ایک روز سلطان قطب الدین

خلجی خانقاہ کے پاس سے گزرا دیکھا کہ خلقت کا ہجوم ہے پوچھا کہ یہ کیا مقام ہے لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ ہے۔ بادشاہ ان کا مرجع خلائق ہونا اور تزک واحتشام دیکھ کر برآشفتہ ہوا اور حکم دیا کہ ان سے کہہ دو کہ میرے شہر سے چلے جائیں یا کوئی کرامت دکھائیں چنانچہ اسی روز بادشاہ کے پیٹ میں ایسی شدت کا درد اٹھا کہ تڑپنے لگا۔ علاج معالجہ سے کچھ نفع نہ ہوا سمجھا سوء ادبی کا نتیجہ ہے فوراً آپ نے معتمد خاص کو دوڑایا آپ نے فرمایا کہ بندۂ نظام کو کارخانۂ قدرت میں کیا دخل ہے؟ بادشاہ کی حالت قریب بہ ہلاکت پہنچ گئی اس کی ماں گریاں ونالاں خانقاہ میں حاضر ہوئی آپ سے بہت منت وزاری کی آپ نے فرمایا کہ اگر تمہارا بیٹا دلی کی سلطنت میرے نام لکھ دے تو مع گزاشت کے قارورہ لیتی آنا۔ تھوڑی دیر میں بادشاہ کی والدہ گزاشت سلطنت اور قارورہ لے کر در دولت پر حاضر ہوئی اور بہت روئی پیٹی۔ آپ نے بادشاہ کی گزاشت لے کر پیشاب میں ڈال دی اور فرمایا کہ فقیروں کے نزدیک سلطنت کی وقعت اس پیشاب جتنی بھی نہیں ہے۔ اور آپ نے دعا فرمائی بادشاہ اچھا ہو گیا۔ حضرت مخدوم نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے منقول ہے کہ جب حضرت محبوب الٰہی سماع سنتے تو امیر خسرو اور امیر حسن مع دائیں طرف اور خواجہ مبشر آپ کے زرخرید غلام آپ کی بائیں طرف بیٹھتے۔ خواجہ مبشر خود بڑے خوش گلو تھے اور امیر خسرو اور امیر حسن فن موسیقی میں عدیم المثال تھے اور دو سو قوال بھی ملازم تھے۔ جب مجلس شروع ہوتی تو پہلے امیر خسرو غزل شروع کرتے اور جس شعر پر حضرت کو کیف ہوتا تو اسی شعر کی تکرار کرتے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے معتمد خاص قنبر بیگ کو جو حضرت کے مریدان خاص سے تھے کہہ رکھا تھا کہ جس شعر پر آپ کو وجد ہو وہ مجھے بھی سنانا چنانچہ آپ کو حدیقہ حکیم ثنائی کے ان اشعار پر ایک مرتبہ وجد ہوا:۔

پیش منما جمال جاں افروز	در نمودی بر و لپسند لبوز
آں جمال توچیست مستی تو	واں سپند توچیست ہستی تو

قنبر بیگ نے یہ دونوں شعر لکھ کر بارگاہ سلطانی میں گزرانے۔ بادشاہ ان کو

پڑھتا جاتا تھا اور آنکھوں سے ملتا جاتا تھا۔ قنبر بیگ سنے عرض کی کہ خانہ زاد کو تعجب ہے کہ حضور پر نور کو حضرت کی خدمت اقدس میں اتنی تو عقیدت ہے اور پھر آپ کبھی خدمت اقدس میں حاضر نہیں ہوئے۔ بادشاہ سنے کہا۔ اے قنبر بیگ! کیا کہوں۔ ہوں تو میں بادشاہ مگر سرتاپا مکروہات دنیا میں آلودہ کیا منہ لے کر حضرت کے سامنے جاؤں۔ مجھے شرم آتی ہے کہ ایسی ذات پاک کی خدمت میں کیوں کر جاؤں۔ تم میرے دونوں لڑکوں خضر خاں اور شادی خاں کو لے جاؤ اور دونوں کو حضرت کا مرید کرا دو اور دو لاکھ روپیہ نذرانہ اور شکرانہ آپ کے قدموں میں رکھ دینا۔ قنبر خاں سنے ایسا ہی کیا اور دونوں صاحبزادے بیعت وارادت شیخ سے مشرف ہوئے۔ جب خسرو خاں سلطان قطب الدین خلجی اور اس کی اولاد وغیرہ کو قتل کرکے دہلی کے تخت سلطنت پر بیٹھا اور قطب الدین کی بیوی سے شادی بھی کر لی تو اس سنے تمام علماء و مشائخین دہلی کی خدمت میں بہت ہدیئے اور تحفے بھیجے جن کو بہت سے حضرات نے قبول کیا اور بہت سوں سنے رد۔ چنانچہ سید علاء الدین اور شیخ وحید الدین خلیفہ حضرت بابا صاحب اور شیخ عثمان سیاح خلیفہ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح نے قبول نہ کیا اور جن لوگوں سنے قبول کیا تھا ان میں سے اکثروں کو بطور امانت رکھ چھوڑا تھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ خسرو خاں کی سلطنت قایم رہنے والی نہیں۔

خسرو خاں سنے حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں پانچ لاکھ نذر گذرانی تھی آپ سنے لے کر فقراء و مساکین میں تقسیم کردی۔ اس کے چار مہینے کے بعد غازی الملک سنے دیبال پور سے خسرو خاں پر فوج کشی کی اور اس کو قتل کرکے خود دہلی کا بادشاہ بنا اور غیاث الدین تغلق اپنا نام رکھا اور خزانہ کی موجودات لی تو خسرو خاں سنے جس قدر روپیہ درویشوں کو دیا تھا واپس طلب کیا جنھوں سنے امانت رکھا تھا بھیجا دے دیا حضرت محبوب الٰہی سنے جواب دیا کہ وہ بیت المال تھا میں نے مستحقوں کو پونہچا دیا اور میں اس میں سے ایک حبہ بھی اپنے خرچ میں نہیں لایا۔ بادشاہ یہ جواب سن کر خاموش ہوگیا۔ حضرت محبوب الٰہی خود ارشاد فرماتے تھے کہ ہر روز آخر شب میں ایک بیت عالم غیب سے میرے دل میں القا کی جاتی ہے

جس کو بار بار پڑھ کر میں لطف حاصل کیا کرتا ہوں ؎

چنداں بنشینم کہ برآید نفس صبح کاں وقت بدل می رسد از دوست پیامے

آج کی شب یہ دو شعر بھی میرے دل میں آئے اور میں انھیں پڑھتا رہا ؎

ور نمانیم عذر ما بپذیر ای بسا آرزو کہ خاک شدہ

گر بمانیم زندہ بردوزیم دامنے کز فراق چاک شدہ

بعض اوقات حضرت خود بھی فکر شعر فرماتے تھے چنانچہ یہ آپ ہی کا کلام ہے

از تو نتواند بریدن کس بہ آسانی مرا گر نمی داند کسے آخر تو می دانی مرا

آپ کی عظمت شان اور بزرگی

عموماً ظہر کی نماز کے بعد آپ لوگوں سے ملا کرتے تھے لیکن آپ کا رعب داب اور جلال اس درجہ تھا کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کے چہرۂ مبارک پر نگاہ ڈال سکتا کیوں کہ حق تعالیٰ کی تجلی آپ کے چہرے پر ہوتی تھی اور جو کچھ آپ فرماتے لوگ اس کو زمین بوس ہو کر قبول کرتے ؎

خوباں بادہ خوردن من جرعہ خوار ایشاں

ہر جرعہ کہ خوردہ سر بر زمیں نہادہ

آپ رات کے وقت حجرے میں تنہا رہتے اور دروازہ اندر سے بند کر لیتے تھے صبح کو جس کی نظر آپ کے چہرۂ انور پر پڑتی ایسا معلوم دیتا کہ مست و مخمور ہیں تمام رات کی بیداری سے آپ کی آنکھیں سرخ رہتی تھیں۔ چنانچہ امیر خسرو فرماتے ہیں

تو شبانہ می نمائی بہر کہ بودی امشب

کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

مولانا حبیب الدین کوتوال مندہ سے روایت ہے کہ ایک وقت میں آپ کی صحبت میں حاضر تھا کہ مجھ کو عود کی خوشبو آئی مگر وہاں کہیں عود کا پتہ نہ تھا میں نے خیال کیا کہ شاید حجرے میں عود جلتا ہوگا اتنے میں خادم نے کسی ضرورت سے دروازہ کھولا میں نے بغور دیکھا وہاں بھی کہیں عود نہ تھا۔ حضرت نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "مولانا یہ عود کی خوشبو نہیں ہے یہ کسی اور چیز کی خوشبو ہے"۔ حضرت امیر حسن فرماتے ہیں :-

عطار گو بہ بند دکان را کہ من ز دوست　　　بوے کشیدہ ام کہ بمشک و عبیر نیست

اسی طرح حضرت نے ایک کمل قاضی محی الدین کاشانی کو دیا تھا جو برسوں رہا اور بار ہا دھلا مگر اس کی خوشبو نہ گئی۔ آخر حضرت سے عرض کیا آپ نے بچشم پر آب فرمایا قاضی صاحب یہ بوے محبت ہے جس کو محبان باری تعالیٰ کی ذات میں رکھا گیا ہے۔" چنانچہ سعدی فرماتے ہیں ا۔

ایں بوے نہ بوے بوستان ست　　　ایں بوے زکوے دوستان ست

سیر الاولیاء میں مذکور ہے کہ آپ کی ذات مبارک بالکل آپ کے دل کی تابع تھی اور دل روح مطہر کا متابع اور روح مطہر نے اپنے کمال سے قلب کو جذب کیا اور قلب نے قالب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا جس کا نتیجہ ہوا کہ آپ ہمہ تن روح مجسم تھے۔ امیر خسرو کیا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

وجود خواجہ نہ از آب و گل گشتہ مرتب　　　کہ جانِ خضر و مسیحا بہم شدہ است مرکب

کشف و کرامت

مولانا ضیاء الدین سنامی سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ سلطان علاء الدین محمد نے اپنے ملازم قنبر بیگ کے ذریعے سے حضرت کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ اس نے اپنے بھائی الغ خاں کے ساتھ ازنکل کی جانب لشکر روانہ کیا تھا جو جنوب کی طرف ایک ملک ہے۔ مدت ہوئی کہ وہاں سے کچھ خبر نہیں آئی جس کی وجہ سے مجھے سخت تردد ہے آپ دعا فرمائیں کہ یہ مشکل حل ہو۔ آپ نے تھوڑی دیر مراقبہ فرما کر ارشاد فرمایا "خدمت سلطانی میں میری طرف سے دعا و سلام کے بعد کہنا کہ انکو جو مسلمانوں سے غمخواری اور ہمدردی ہے سو میں بھی اسی میں مشغول ہوں ان شاء اللہ کل بوقت چاشت تم کو ازنکل کے فتح ہونے کی خوش خبری پہنچے گی اور تھوڑے ہی دنوں میں تمہارا بھائی بھی مع لشکر کے مع الخیر واپس آجائے گا۔ بادشاہ یہ خبر سن کر بہت خوش ہوا دوسرے ہی دن ناقہ سوار مع عرائض و بشارت فتح خدمت سلطانی میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسی وقت پانسو اشرفیاں نذرانہ بھیجا۔ اس وقت آپ کے پاس خراسان کا ایک درویش اسفند ار بیٹھا ہوا تھا۔ اشرفیوں کو دیکھ کر کہا۔ "یا شیخ الہدایا مشترک"۔ یعنی اس ہدیئے میں میری بھی شرکت ہے شیخ نے جواب دیا

"تنہا خوشتر گ" یعنی تنہائی خوش تر و بہتر ہے۔ درویش یہ جواب سن کر افسردہ ہوا اور اٹھ کر چلنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ ان اشرفیوں کو کیوں چھوڑے چلے میرا مطلب یہ تھا کہ یہ تنہا تمہاری ہی ہیں اور کسی کی ان میں شرکت نہیں ہے اور وہ ساری کی ساری اشرفیاں آپ نے درویش کو دے دیں۔ بوجھ بہت تھا درویش اٹھا نہ سکا تو آپ نے اپنے خادم کو کہا کہ تم ہاتھ لگاؤ اور ان کے ٹھکانے پر پہنچا دو۔ قصبہ سرساوے میں ایک مولوی صاحب کے گھر میں آگ لگ گئی اور تمام مال و املاک مع فرمان الملاک کے جل کر خاکستر ہوگیا۔ وہ بے چارے دہلی آئے اور بہ مشکل تمام نقل فرمان کی حاصل کی اتفاق سے یہ فرمان بھی ان کی بغل سے کہیں نکل پڑا۔ ہر چند تلاش کیا مگر کہیں پتہ نہ چلا آخر کار روتا پیٹتا حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی مصیبت کا حال بیان کیا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا اگر حضرت جناب بابا صاحب کے نام کی نیاز مانو اور کیا اچھا ہو کہ تم بازار سے حلوا بھی لے آؤ اور نیاز دلاؤ مولوی صاحب اسی وقت خانقاہ کے دروازے پر جو حلوائی تھا اس کی دکان پر گئے اور حلوا خریدا۔ حلوائی تول تلا کر کاغذ کو پھاڑ اس میں لپیٹنا چاہتا تھا۔ مولوی صاحب نے دیکھا تو وہ کاغذ حسن اتفاق سے انھیں کا فرمان تھا جھٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور حلوے سمیت خوشی خوشی حضرت کے پاس آئے اور حاضرین مجلس اس کرامت کے اظہار سے زمین بوس ہوئے۔ آپ کے مریدوں میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ مریدی کیا ہے اور پیری کیا۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایک روز پھر وہی مرید حاضر ہوا تو آپ نے اسے کہا کہ تو پچھاں کو چلا جا۔ اس نے کچھ پوچھا پچھایا نہیں اور پچھان کے رخ پر سیدھا ہو لیا اور دہلی سے چلتے چلتے لاہور جا پہنچا۔ وہاں کا حاکم حضرت کا معتقد تھا اس شخص کو آپ کا مرید سن کر سو اشرفیاں اسے دیں کہ حضرت کو میری طرف سے نذر دینا۔ پلٹتے وقت ان کو ایک فاحشہ عورت سے تعلق ہو گیا۔ دام عشق میں ایسے پھنسے کہ سو روپیہ اس کی نذر کیے۔ اس عورت سے ملوث ہونا چاہتے تھے کہ غیب سے ایک ایسا طمانچہ ان کے منہ پر لگا کہ چونک پڑے اور فوراً اپنے کیے پر نادم و شرمسار ہوئے اور توبہ کی۔ زن فاحشہ نے پوچھا کہ کیوں خیر

تمہاری کیا حالت ہے۔ انھوں نے حضرت کا حوالہ دیا وہ عورت آپ کا نام سن کر
اور حالت تصرف دیکھ کر تائب ہو گئی اور اپنا مال و اسباب سب بیچ بانچ کر
ان کے ساتھ ہولی اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئی۔ آپ نے
ان دونوں کا نکاح کر دیا اور وہ سو اشرفیاں بھی انھیں کو دے دیں اور فرمایا کہ
تم نے جو سوال کیا تھا کہ مریدی اور پیری کیا ہے تو آج اس کا جواب سنو۔ مریدی
یہ تھی کہ تم میرے کہے پر چلے گئے مجھسے یہ نہ پوچھا کہ کہاں جاؤں اور کیوں کر
جاؤں اور نہ ذرا سی فکر کی اور پیری یہ تھی کہ میں نے تجھ کو اس کار ناشائستہ
سے باز رکھا اور اس عورت کو تیرے واسطے حلال کر دیا۔ شیخ مبارک گوپاموی
جو آپ کے بڑے معتقد تھے ناقل ہیں کہ جب کبھی وہ گو ... ئو سے سلطان علاء الدین
خلجی کی خدمت میں جاتے تو ایک بیش قیمت خلعت ملتا تھا اب کی دفعہ جو آیا تو خلاف
معمول سابقہ ایک نہایت معمولی خلعت ملا جس سے مجھے بہت رنج ہوا۔ آپ نے
فرمایا :-　　تحفہ شاہ بس عزیز بود　　　　گرچہ دنیار یا پشیز بود
اس بیت کے سنتے ہی میرا دل باغ باغ ہو گیا اور تمام رنج و فکر دور ہو گیا۔
ایک دفعہ حضرت امیر حسن مغموم تھے آپ نے ان کی حالت کو نظر تامل سے
دیکھ کر یہ حکایت فرمائی۔ کہ کسی شہر میں ایک برہمن بہت مالدار تھا کسی خطا پر حاکم
شہر نے اس کا مال و اسباب ضبط کر کے شہر بدر کر دیا۔ اس کے کسی دوست نے
پوچھا۔ پنڈت جی کہو کیا حال ہے؟۔ اس نے کہا بھگوان کی دیا سے راضی خوشی ہوں
دوست نے کہا۔ اچھے کیا خاک ہو تمہارا سارا مال و اسباب تو ضبط ہو گیا اور گھر
سے بے گھر ہو گئے۔ برہمن نے کہا کہ اس میں کچھ ہرج نہیں میرا جنیو تو میرے
پاس ہے۔ اس کے بعد آپ حضرت امیر حسن کی طرف مخاطب ہوئے کہ ان کو بھی
حاکم شہر سے ایذا پونہچی تھی اور مطلب اس حکایت کا یہ تھا کہ اگر سارا جہان بھی جاتا رہے
تو کچھ پروا نہیں خداوند تعالیٰ کی محبت برقرار رہنی چاہیئے۔ ۵
گر خدا داری ز غم آزاد شو　　　　از خیال بیش و کم آزاد شو
آپ کے مریدوں میں سے ایک بہت مالدار سوداگر تھے مگر اولاد نہ تھی۔ آپ کی
دعا سے ان کو لڑکا پیدا ہوا جسے وہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے

بچے کو نہایت شفقت سے اپنی گود میں لیا اور اپنے پیراہن کا ایک ٹکڑا دیا کہ
ان کا کرتہ اسے پہناؤ اور حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی سے مخاطب ہو کر
فرمایا کہ اس بچے کی تعلیم و تلقین تمہارے ذمے ہے اور اس کو تم اپنا خلیفۂ اعظم
بنانا چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور خلافت پیران چشت سے مشرف فرمایا
ان صاحبزادے کا نام شیخ صدر الدین حکیم تھا اور طبیب دہلی مشہور تھے اور ان
بہت سے لوگوں نے فیض پایا۔ آپ کا مزار حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے
روضۂ منورہ کے پاس ہی ہے۔ روایت ہے کہ سلطنت بہمنیہ کا بانی علاء الدین حسن تھا
جو ایک برہمن منجم گانگو نامی کا ملازم تھا اور برہمن شاہزادہ محمد تغلق کا مقرب تھا علاء الدین
بہت غریب آدمی تھا برہمن نے اس کی فلاکت پر ترس کھا کر اسے حوالی دہلی
میں ایک کھیت اور دو بیل دلا دیئے تاکہ وہ اپنا پیٹ پال سکے۔ ہل جوتتے
جوتتے اسے ایک ظرف اشرفیوں سے بھرا ہوا ملا۔ اس نے اسے ویسے ہی
چادر میں لپیٹ لیا اور رات کو برہمن کے پاس لے گیا۔ برہمن نے اس غریب
آدمی کی دیانت اور امانت پر آفریں کہی اور شاہزادہ سے ذکر کیا شاہزادے
نے اپنے باپ غیاث الدین تغلق سے عرض کیا بادشاہ نے قدر دانی فرما کر
امیران صدہ کے زمرے میں اسے داخل کر لیا۔ برہمن نے جو ایک دن علاء الدین کا
زائچہ کھینچا تو کہا کہ تو آگے چل کر بادشاہ ہوگا اس وقت مجھے نہ بھول جانا اسی وجہ سے
علاء الدین نے گانگوئی کا لقب اختیار کیا۔ شاہزادہ محمد تغلق حضرت نظام الدین
اولیاء کا بڑا معتقد تھا اور اکثر جایا کرتا تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنے کشف سے فرمادیا
تھا کہ تو بادشاہ ہوگا۔ ایک دن شاہزادہ حضرت کی دعوت میں گیا تھا۔ جب دسترخوان
بڑھ گیا اور شاہزادہ چلا گیا تو علاء الدین وہاں پہنچا ابھی اس کے آنے کی اطلاع
بھی آپ کو نہیں کی گئی تھی۔ حضرت نے اپنے کشف سے معلوم کیا اور فرمایا
دو سلطانے رفت و سلطانے آمد" اور آپ نے خادم سے کہا کہ "ایک شخص جس
کے چہرے سے آثار شرافت و نجابت ظاہر ہیں دروازے کے باہر کھڑا ہے
بلا لاؤ" خادم نے باہر جا کر دیکھا تو وہاں ایک شخص زردہ حال کھڑا تھا وہ سمجھا کہ یہ کوئی
اور ہوگا آ کر عرض کی کہ جیسا حضور نے فرمایا ایسا تو کوئی شخص باہر نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا

ابھی طرح دیکھو ضرور ہوگا۔ خادم پھر گیا اور کہا کہ ایک جھول سا شخص بیٹھا ہوا ہے آپ نے
فرمایا اُسے ہی بلا لاؤ وہ گو بظاہر حقیر ہے مگر بہ معنی بادشاہ ہے۔ اُس کو دیکھ کر آپ نے
بہت التفات فرمایا اور مستفسر حال رہے۔ دستر خوان تو اُٹھ ہی گیا تھا۔ حضرت نے
صرف ایک نان اپنے افطار کے واسطے حجرے کے طاقچے میں رکھ چھوڑی تھی
اُس کو اپنی اُنگلی کی پور پر رکھ کر علاء الدین کو دی اور فرمایا کہ لو یہ چتر شاہی ہے جو مدت
دراز اور مدت دیر پا کے بعد تجھ کو ایک ملک دکن میں نصیب ہوگا۔ آگے قصہ
طول ہے غایت ما فی الباب یہ کہ آپ کی پیش گوئی من و عن پوری ہوئی اور علاء الدین
بادشاہ ہو گیا۔

آپ کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ

آپ علاوہ صائم الدہر کے کتنی نماز اور کتنی تسبیح
پڑھتے تھے اس کا اندازہ تو مشکل ہے مگر اس میں
ذرا شک نہیں کہ آپ کی تمام عمر عزیز اشغال باطنی
و تزکیۂ نفس میں صرف ہوئی۔ علاوہ اس کے آپ کو حسن خلق اور تالیف قلوب کا
بڑا خیال تھا اور ع دل بدست آور کہ حج اکبر است پر پورا پورا عمل تھا آپ کی زندگی کا
اصول یہ تھا کہ جہاں تک ہوسکے خلق خدا کو آرام و راحت پہنچائی جائے۔ سعدی

می کوش کہ راحتے بجانے برسد
یا دست شکستہ بنانے برسد

یہ بھی آپ فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن تالیف قلوب اور راحت رسانی
خلایق سے بڑھ کر قیمتی کوئی فعل نہ ہوگا۔ آپ اکثر رو بہ قبلہ سجادہ پر ذکر اذکار میں
مشغول بیٹھے رہتے مُتَوَجِّهًا اِلَى اللّٰهِ كَاَنَّهٗ يَنْظُرُ اِلَيْهِ یعنی خدا کی طرف اس محویت سے
متوجہ رہتے تھے کہ گویا خدا کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ مختلف اقسام اور مختلف
خیالات کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے تو ان کے علم و مرتبے کے
موافق بمصداق تکلموا الناس علےٰ قدر عقولھم گفتگو فرماتے اور جو شخص جس فن کا
مذاق رکھتا اُسی میں نہایت لطف و مہربانی سے گفتگو کرتے اور ہر طرح اُس کی
دلجوئی فرماتے کسی قسم کا بھی آدمی ہو جو آپ سے ملتا فوراً آپ اُس کے
دل پر قبضہ کر لیتے اور وہ آپ کی خوبیوں اور حسن اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا۔ اگرچہ

آپ بظاہر لوگوں کی طرف توجہ فرماتے لیکن درحقیقت باطن میں حق تعالیٰ کی جناب میں متوجہ رہتے۔ ؎

اِنّی جَعَلتُکَ فِی الفُؤادِ مُحَدِّثِی
وَ اَبَحتُ جِسمِی مَن اَرَادَ جُلُوسِی
فَالجِسمُ مِنِّی لِلجَلِیسِ مُؤانِسٌ
وَ حَبِیبُ قَلبِی فِی الفُؤادِ اَنِیسِی

یعنی میں نے تجھے دل میں اپنا مخاطب قرار دیا ہے کہ تو مجھ سے باتیں کیے جاتا ہے اور جو شخص میرے ساتھ بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہے اُس کو میرا جسم دوست رکھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا جسم تو ہم نشین کے واسطے انسیت پیدا کرنے والا ہے اور میرے دل کا دوست دل میں میرا انیس ہے۔ ؎

ہرگز وجود حاضر و غایب شنیدہ
من درمیان جمع و دلم جاے دیگر است

آنے جانے والے خود غریب الوطن اور مسافر ہوتے یا شہر والے غرض جو کوئی آپ کے پاس حاضر ہوتا آپ کسی کو کبھی خالی ہاتھ نہ جانے دیتے کچھ نہ کچھ ضرور دیتے کبھی کپڑا کبھی نقدی یا اور کوئی چیز جو آپ کے پاس موجود ہوتی بے تکلف دے دیتے جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا خواہ کوئی سا بھی وقت ہوتا اس کو زحمت انتظار مطلق نہ ہوتی اور فوراً باریاب ہو جاتا۔ ایک روز خواجہ عطاء اللہ کے بھائی جو حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے نواسے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قلم دوات کاغذ لاکر سامنے رکھا کہ فلاں رئیس کے نام سفارشی رقعہ لکھ دیجیے تاکہ وہ میرے ساتھ سلوک کرے۔ آپ نے کہا میری اُس رئیس سے شناسائی نہیں اور بغیر تعارف کے رقعہ کیسے لکھا جا سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ شخص آپ کو سخت سُست اور برا بھلا کہنے لگا کہ تم ہمارے جد کے مرید ہو اور ہمارے خاندان کے صدقے سے یہ نعمت اور دولت تم کو نصیب ہوئی تم کو ایسا کفران نعمت نہ چاہیے کہ میرے واسطے ایک رقعہ بھی نہیں لکھا جاتا یہ کیا شیخی بنا رکھی ہے اپنے تئیں مشہور کر رکھا ہے یہ کہہ کر دوات کو زمین پر دے مارا اور چلنے لگا۔ حضرت نے

اسی وقت اُس کا دامن پکڑ لیا اور فرمایا "کدھر کیوں جاتے ہو صفائی کرتے جاؤ" پھر کچھ روپیے اُن کو دیئے جو وہ لے کر ہنسی خوشی چلتا بنا۔ آندر پت میں جو غیاث پور کے قریب ہی واقع ہے ایک شخص مجور رہتا تھا جو آپ سے خواہ مخواہ کا عناد قلبی رکھتا تھا اور ہمیشہ آپ کی بدگوئی کرتا اور آپ کی ایذاد ہی کے درپے رہتا۔ جب یہ شخص مر گیا تو حضرت اُس کے جنازے پر تشریف لے گئے اور بعد دفن اُس کی قبر پاس دوگانہ پڑھ کر دعا کی کہ "اس شخص نے جو کچھ مجھ کو کہا ہے اور میرے ساتھ کیا ہے میں نے اس کو بخش دیا۔ اب تو میرے سبب سے اس کو عذاب نہ فرمائیو"۔

حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی سے منقول ہے کہ ایک مجلس میں بہت سے صوفیاے کرام جمع تھے ایک صوفی نے کہا کہ حضرت سلطان المشائخ عجب فارغ البال باطن رکھتے ہیں۔ اہل و عیال وغیرہ کا ان کو کچھ غم نہیں۔ دنیا اور دین دونوں حاصل ہیں۔ دنیاوی اقبال ایسا ہے کہ ہزار ہا آدمی پرورش پاتے ہیں۔ غم کبھی ان کے پاس پھٹکتا بھی نہیں۔ آپ کو بھی اس گفتگو کی خبر ہوئی آپ نے شیخ شرف الدین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "جو رنج و غم گھڑی گھڑی مجھ کو پہنچتا ہے شاید ہی کسی اور کو پہنچتا ہو کیونکہ جو شخص میرے پاس آکر اپنا درد دل بیان کرتا ہے تو میرے قلب پر بلا صدمہ ہوتا ہے۔ وہ شخص نہایت سخت دل ہے جس کے دل پر اُس کے بھائی بندوں کے درد کا اثر نہ ہو۔ اور نیز بحکم اَلْمُخْلِصُوْنَ عَلٰی خَطَرٍ عَظِیْمٍ۔ جان لینا چاہیئے کہ ع نزدیکاں رابیش بود حیرانی۔ ایک مرتبہ جماعت خانے میں ایک شخص کو جس کے پاس چھری تھی پکڑ لیا۔ فوراً حضرت تشریف لائے اور فرمایا کہ "دیکھو! خبردار۔ اس کو کچھ ایذا نہ پہنچے"۔ پھر اُسے اپنے سامنے بلوا کر عہد لیا کہ وہ کسی کو ایذا نہ دے گا۔ آپ نے اُسے کچھ خرچ دلوا کر رخصت کیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ "جفا پر تحمل کرنا اور معاف کر دینا بہت بہتر ہے" اور یہ دو بیتیں بھی پڑھیں ۔

ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد	وانکہ مارا خوار دارد ایزد اور ایار باد
ہر کہ او خارے نہد در راہِ ما از دشمنی	ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

پھر فرمایا کہ اگر کوئی تمہارے راستے میں کانٹے رکھے تو کیا تم بھی کانٹے ہی رکھو گے؟ یہ تو عوام کا دستور ہے مگر درویشوں کا یہ قاعدہ نہیں۔ درویش خوش خلق ہوتے

ساتھ بھی خوش خلق ہیں اور بدخلقوں کے ساتھ بھی خوش خلق ہیں۔ پھر اسی فضیلت کے متعلق یہ رباعی پڑھی۔ ؎

گیرم کہ نماز ہاے بسیار کنی | در روزہ دہر سبے شمار کنی
تا دل نہ کنی ز غصہ و کینہ تہی | صد من گل بر سریک خار کنی

پھر حضرت نے حلم و تحمل کی فضیلت میں یہ بیت فرمائی۔ ؎

اگر کوہی بکاہے سے نیر دی | ز ہر بادے چو کاہے گر نہ لرزی

بعض حاضرین نے عرض کی کہ بعض لوگ آپ کو علی الاعلان برا بھلا کہتے ہیں جس کو سن کر ہم تاب نہیں لا سکتے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے ان سب کو معاف کر دیا تم بھی معاف کر دو اور پھر اس قسم کی گفتگو میرے سامنے نہ کرنا۔ دیکھو پیچو ہمیشہ مجھے برا کہا کرتا تھا اور میری برائی کی کوشش کرتا۔ برا کہنا تو آسان ہے مگر برائی چاہنی بہت بد تر ہے۔ جب وہ مر گیا تو میں نے اس کی قبر پر جاکر دعاے مغفرت کی۔ فرمایا جب دو آدمیوں میں عداوت ہو تو ہم کو اپنا باطن پاک رکھنا چاہیئے جب ہمارا باطن عداوت سے پاک ہوگا تو دوسرے کی طرف سے آزار خود بخود کم ہو جائے گا فرمایا کسی کے برا کہنے سے رنج نہ کرنا چاہیئے کیوں کہ صوفی کا مال وقف ہے اور خون اس کا مباح ہے۔ پھر جب یہ بات ہے تو پھر برا کہنے سے کیا رنج کرنا۔ فرمایا کہ ایک دفعہ لوگوں نے مجھ کو نہایت سخت سست اور برا بھلا کہا۔ میں خاموش سنتا رہا۔ جب وہ کہتے کہتے تھک گئے تو کہنے لگے کہ واقعی آپ ہی کا علم ہے۔ فرمایا مخلوق کا مخلوق کے ساتھ معاملہ تین قسم کا ہے۔ ایک تو وہ شخص ہے جس سے نہ کسی کو نفع پہونچتا ہے نہ نقصان، تو یہ شخص مثل جمادات کے ہے اور ایک وہ شخص ہے جس سے لوگوں کو نفع پہونچتا ہے اور نقصان نہیں پہونچتا یہ پہلے سے بہتر ہے اور اس سے بھی بہتر تیسرا شخص جو لوگوں کو نفع پہونچاتا ہے اور جب کوئی اس کے ساتھ برائی کرتا ہے تو وہ بدلہ نہیں لیتا یہ کام صدیقوں کا ہے۔ فرمایا بندے سے جو فعل سرزد ہوتا ہے اچھا یا برا سب کا خالق خدا وند تعالیٰ ہے۔ جو کچھ پہونچتا ہے اسی کی طرف سے پہونچتا ہے پھر کسی سے کیا رنج کرنا۔ اسی کے متعلق یہ حکایت بھی بیان فرمائی کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ راستے میں چلے جاتے تھے کہ ایک جاہل نے پیچھے سے آن کر آپ کے سر پر ایک تھپیڑا مار دیا۔ آپ نے مڑ کر اس کی طرف

دیکھا۔ اس نے کہا میری طرف کیا دیکھتے ہو تمہارا ہی تو قول ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں بات تو یہی ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ خدا نے کس بدبخت کے نام نام زد کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک فقیر نے آکر آپ کو جو نہ کہنا تھا سو کہا۔ آپ بالکل خاموش رہے۔ جب وہ خوب کہہ سن چکا تو آپ نے اُسے کچھ دیا اور وہ رخصت ہوا تب آپ نے فرمایا کہ بہت سے لوگ میرے واسطے تحفے اور ہدیئے لاتے ہیں کوئی شخص ایسا بھی ہونا چاہیئے کہ اُن کا بدلہ ہو جاے۔ ایک دفعہ خواجہ اقبال نے ایک خراس والے کو جس پر کچھ روپیہ باقی تھا پابجولاں کر دیا۔ بسبب خوف و دہشت کے حضرت سے کوئی عرض نہ کر سکا۔ ایک روز وہ کسی نہ کسی طرح خانقاہ کے دروازے پر پہنچا مگر دربانوں نے گھسنے نہ دیا۔ اُس کی زنجیروں کی آواز آپ نے سنی۔ اور کہا کہ کون شخص ہے اُسے اندر بلالو۔ وہ اندر آتے ہی آپ کے قدموں پر گرا اور اپنا حال عرض کیا۔ آپ نے خواجہ اقبال کو بلایا اور کہا کہ یہ کام تم نے نامناسب کیا۔ خدا کا مال۔ خدا کا ملک خدا کے بندے۔ کچھ تم نے کھایا کچھ اور بندوں نے کھایا اور کچھ اس غریب نے کھایا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ تم نے اس کے بیڑیاں ڈال دیں۔ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔ اور فوراً لوہار کو بلا اس کی بیڑیاں کٹوا دیں۔

احوال ہفت شاہاں

آپ حضرت بابا صاحب سے بیعت فرما کر سلطان غیاث الدین بلبن دہلی میں تشریف لاے جو سنہ ۶۶۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا اور جس کا اصلی نام الغ خاں تھا۔ یہ بادشاہ نہایت عادل و منصف مزاج غریب پرور اور فقرا نواز تھا حضرت کا بھی بڑا معتقد اور ہمیشہ نذر و نیاز گزرانا کرتا تھا۔ اُس کے دو بیٹے تھے۔ ایک خان شہید اور دوسرا ناصر الدین محمود۔ خان شہید کو سلطان نے اپنا ولی عہد کر کے ملتان اور پنجاب کا حاکم مقرر کیا تھا اور امیر خسرو بھی انھیں کے ساتھ ملتان گئے تھے۔ جب خان شہید مغلوں کی جنگ میں شہید ہوے تو امیر خسرو کو بھی مغلوں نے گرفتار کر لیا جو کسی تدبیر سے رہائی پاکر دہلی آے

یاث الدین بلبن کو لایق ولی عہد کی شہادت کا ایسا صدمہ ہوا کہ اسی رنج میں تئیس
برس سلطنت کرکے ۶۸۵ھ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد خلاف وصیت
بعض وزرار نے بادشاہ کے پوتے معزالدین کیقباد کو سترہ سال کی عمر میں
تخت نشین کردیا۔ یہ نوجوان اگرچہ حسن صورت رکھتا تھا مگر حسن سیرت سے معرا تھا
عیاشی اور شراب خواری میں سلطنت کو برباد کیا لیکن بایں ہمہ فقرا سے حسن عقیدت
رکھتا تھا اور حضرت سلطان المشائخ کا بے حد گرویدہ تھا۔ اور اسی کے عہد میں
حضرت کی خانقاہ غیاث پور میں تعمیر ہوئی اور اسی نے موضع کیلو کھڑی میں اپنے
رہنے کے واسطے محلات و مکانات بنوائے اور ایک نیا شہر آباد کیا۔ آخر کار
کثرت شراب نوشی سے مفلوج ہو گیا اور سلطان جلال الدین خلجی کیقباد کو قتل کراکے
محل کیلو کھڑی میں تخت نشین ہوا۔ حضرت امیر خسرو نے مثنوی قران السعدین
کیقباد ہی کے نام سے معنون کی۔ سلطان جلال الدین نے از سر نو قصر کیلو کھڑی
کو تعمیر کرایا اور نہایت با وقعت اور بلند حصار سے شہر کی رونق اور حفاظت و بالا
کی یہ بادشاہ ۱۷ رمضان المبارک ۶۹۵ھ میں بمقام کڑہ مانک پور اپنے بھتیجے
اور داماد علاء الدین خلجی کے ہاتھ کشتی میں شہید ہوا۔ اب علاء الدین خلجی تخت
نشین ہوا۔ یہ بادشاہ اگرچہ زیادہ ذی علم نہ تھا مگر بڑا عقل مند اور فہیم تھا اور
عقل ہی کے زور سے اس نے ممالک دور و دراز کو اپنے قبضے میں کر لیا اس
نے بارہا حضرت کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا مگر آپ نے اجازت نہ دی۔ اس
کے دونوں بیٹے خضر خاں اور شادی خاں آپ کے مرید تھے اور خضر خاں ہی نے وہ
عالی شان گنبد تعمیر کرایا تھا جو اب آستانہ شریف کی مسجد کا کام دے رہا ہے الغرض
سلطان علاء الدین خلجی نے بیس سال کی سلطنت کے بعد استسقا میں ۷۱۵ھ میں انتقال
کیا۔ اس کے بعد اس کا فرزند قطب الدین اپنے تینوں بھائیوں خضر خاں شادی خاں
اور شہاب الدین کو قتل کرکے تخت پر بیٹھا اور چوں کہ خضر خاں اور شادی خاں
حضرت محبوب الٰہی کے معتقدین میں سے تھے اس سبب سے اس کو حضرت
سے سخت پرخاش تھی اور اسی ضد پر یہ ضیاء الدین رومی کا مرید بنا اور حضرت
محبوب الٰہی سے طرح طرح پر دشمنی ظاہر کرنی اور ایذا دینی شروع کی۔ ایک روز

شیخ ضیار الدین کے روضے میں حضرت سے اس کا آمنا سامنا ہوا مگر نہ اس نے
حضرت سے ملاقات کی اور نہ آپ کے سلام کا جواب دیا۔ یہ بادشاہ آخر کار
خسرو خاں کے ہاتھ سے قتل ہوا اور یہ واقعہ یوں ہوا کہ جب قطب الدین خلجی نے
نئی جامع مسجد بنوائی تو کل علمار اور فضلار کو نماز جمعہ ادا کرنے کا حکم دیا چنانچہ سب تعمیل حکم کو
حاضر ہوئے مگر حضرت نہ گئے اور جواب دیا کہ جامع کیلو کھڑی قدیم اور ہم سے قریب
اور زیادہ حق دار ہے ہم دوسری مسجد میں نہیں جا سکتے۔ بادشاہ اس جواب سے سخت
ناراض ہوا پھر حکم دیا کہ تمام علمار و مشائخین ماہ نو کے سلام کو حاضر ہوا کریں چنانچہ سب
جاتے اور آپ اپنے بدلے خواجہ اقبال کو بھیج دیتے۔ دشمنوں نے بادشاہ کو بھڑکایا اور بزور آپ کے
بلانے پر آمادہ کیا اور بادشاہ نے بھی برآشفتہ ہو کر حکم دیا کہ اگر شیخ نظام الدین آئندہ ماہ نو کی تہنیت کو
حاضر نہ ہوئے تو میں بزور اُن کو حاضر کراؤں گا۔ مخلصوں نے یہ خبر حضرت کے گوش گزار کی
آپ سن کر خاموش ہو گئے اور سیدھے اپنی والدہ صاحبہ کے مزار پر جا کر عرض کی کہ اگر بادشاہ نے میری بے حرمتی کی
تو غرۂ ماہ آئندہ کو میں آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوں گا کیوں کہ آپ معمولاً پہلی تاریخ
اپنی والدہ صاحبہ کے مزار پر جایا کرتے تھے۔ پھر آپ خانقاہ میں تشریف لے آئے
اور باطمینان تمام سارا مہینا گزار دیا۔ جب چاندرات آئی تو لوگوں نے یاد دلایا۔ آپ نے
فرمایا کہ "میں نہ جاؤں گا" یہ سن کر خدام متفکر ہوئے حضرت نے فرمایا "تم کچھ اندیشہ
نہ کرو میں نے خواب دیکھا ہے کہ ایک بجار نے مجھ پر حملہ کیا میں نے اس کے دونوں
سینگ پکڑ کر اس زور سے دے مارا کہ وہ مر گیا پس مجھ کو یقین ہے کہ میں انشار اللہ بانی
غالب آؤں گا اور وہ میری ایذا دہی کی سزا پائے گا۔ الغرض جب آدھی رات گئی
تو آپ خانقاہ کی چھت پر ٹہلتے جاتے تھے اور یہ بیت پڑھتے جاتے تھے۔

ای روبہک چرا ننشستی بجای خویش باشیر پنجہ کردی و دیدی سزای خویش

اور اسی وقت خسرو خاں نے قطب الدین مبارک خلجی کا سر کاٹ کر ۷۲۰ھ محل
کے نیچے پھینک دیا اور خود ناصر الدین خسرو خاں کے لقب سے بادشاہ بن بیٹھا
اور قطب الدین کی منکوحہ سے شادی بھی کر لی آخر یہ نمک حرام بہت جلد اپنے
کیفر کردار کو پہنچا یعنی سلطان غیاث الدین تغلق کے ہاتھ سے چھ مہینے کے
قتل ہوا اور ۷۲۰ھ میں آخر الذکر تخت پر بیٹھا۔ یہ بادشاہ بھی حضرت کے خلاف

امر خسرو خاں نے جو نذرانہ فقرار کو تقسیم کیا تھا سب نے واپس کر دیا مگر آپ نے چوں کہ تقسیم کر چکے تھے واپس نہ دیا اس سے بادشاہ کے دل میں گرہ پڑ گئی اور لوگوں نے موقع پاکر اور کان بھرے۔ آخر اس نے لکھنوتی سے دلّی میں واپس آتے ہوئے کہا کہ "میں دہلی پونہچ کر اس فقیر کو شہر بدر کروں گا" آپ نے سنا اور فرمایا "ہنوز دلّی دور است" جب بادشاہ دلّی کے قریب پونہچ گیا تو اس کے بیٹے محمد تغلق نے حکم دیا کہ موضع افغان پور میں جو تغلق آباد سے صرف چار میل ہی ایک مختصر وخوش نما محل تیار کیا جائے تاکہ بادشاہ وہاں ایک دن قیام فرمائیں اور دوسرے دن باکوکبۂ شاہی تغلق آباد میں تشریف لاکر تخت شاہی پر جلوس فرمائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بادشاہ اس محل میں ٹھیرا۔ امرار استقبال کو حاضر ہوے۔ خاصے کے بعد جب امرار باہر آے تو یکایک اس مکان کی چھت پر بجلی گری بعض کہتے ہیں کہ شاہزادہ محمد کی سازش سے وہ مکان گرایا گیا بہرحال کچھ بھی سبب ہوا ہو بادشاہ مع چھ سات دیگر ہمراہیاں کے ۷۲۵ھ میں ملک عدم کو روانہ ہوا اور آپ کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ آپ کے کمالات ظاہری و باطنی خوارق عادات بے شمار ہیں۔ چنانچہ اسی طرح جلال الدین فیروز شاہ خلجی کی وفات جو مانک پور میں ۶۹۵ھ میں ہوئی تھی یعنی بادشاہ کو جب کہ وہ کشتی میں سے اترتا تھا ملک علاء الدین نے دغا سے تلوار سے قتل کیا بادشاہ کی موت کا صحیح وقت بھی آپ کو کشف وکرامت سے معلوم ہو گیا تھا۔ اور اسی طرح ۷۰۳ھ مطابق ۱۳۰۳ء میں بعہد علاء الدین خلجی جب مغلوں نے دلّی پر حملہ کیا تو آپ کی ایک ادنی کرامت یہ تھی کہ صرف آپ کی دعا ہی سے آئی ہوائی فوج خود بخود پلٹ گئی۔ سلطان محمد ثالث بن تغلق اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا۔ اوائل زمانۂ سلطنت میں بہت نیک اور عادل تھا اور حضرت کا بڑا احترام کرتا تھا چنانچہ اسی نے سب سے پہلے آپ کے مزار پر قبہ بنوایا مگر افسوس ہی کہ جس سال یہ تخت نشین ہوا ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء اسی سال حضرت کا وصال ہو گیا۔

گویا جگر زمیں کشادند — آں دوست خدا درو نہادند

وفات

جب عمر شریف زیادہ ہوئی اور ضعیفی آگئی تو آپ کی خوراک بالکل تھک گئی کھانا آتا تو آپ ایک یا آدھی روٹی اٹھا لیتے اور ہری ترکاری مثل کریلے

وغیرہ سے نوش فرماتے اور احباب سے کہتے کہ یہ چیز چکھو بڑے مزے کی ہے مغرب کی نماز کے بعد آپ بالا خانے پر چلے جاتے اور وہیں آپ کے پاس آپ کے رفقار بھی چلے جاتے۔ خادم انواع و اقسام کے میوہ جات اور مٹھائیاں پیش کرتے وہ سب اوروں کو کھلا دیتے اور آپ نہ کھاتے۔ عشار کے وقت پھر نیچے اُتر کر باجماعت نماز پڑھتے اور پھر اوپر چلے جاتے۔ خاص خاص لوگ اُس وقت بھی حاضر ہوتے۔ امیر خسرو قصص وحکایات لطائف وظرائف بیان کرتے اور آپ سن کر داد دیتے اور سر ہلاتے چنانچہ امیر خسرو کہتے ہیں ؎

نخوت خسرو مسکین ازیں ہوس شبہا کہ دیدہ برکف پایت نہد بجواب رود

اور خود حضرت تسبیح خوانی میں مصروف رہتے تھے۔ زبان سے سب کی دلجوئی اور خاطرداری فرماتے اور ہر ایک کے حال کی پرسش فرماتے۔ اور دل میں خدا کو یاد کرتے رہتے۔ سبحان اللہ کیسی متبرک صحبت تھی۔ طُوبیٰ بی لِاَعْيُنِ قَوْمٍ اَنْتَ بَيْنَهُمْ لَقَدْ مِنْ نِعْمَةٍ مِنْ وَجْهِكَ الْحَسَنِ یعنی اُس قوم کی آنکھوں کو خوشی اور مبارکی ہو جن میں تو ہے اور وہ تیرے خوب صورت چہرے کے دیدار سے مستفید ہوتے ہیں۔ جب مجلس برخاست ہوتی خواجہ اقبال چند آفتابے پانی بھر کے رکھ دیتے اور حضرت حجرے کا دروازہ بند کرکے یاد حق میں تمام شب مشغول رہتے اور نہ معلوم کہ کیا کیا راز و نیاز ہوتا تھا چنانچہ بارہا یہ بیت ارشاد فرمایا ہے

عشقے کہ از تو دارم ای شمع چگل دل داند و من دانم و من دانم و دل

اور اکثر اوقات یہ قطعہ بھی پڑھا کرتے تھے۔ قطعہ

تنہا منم و شب و چراغے مونس شدہ تا پگاہ روزم
گاہش ز آہ سرد بکشم گاہ از تف سینہ برفروزم

اور یہ بیت بھی زبان پر جاری رہتی تھی۔ ؎

شبہا من و شمع ورگدازیم ایں ست کہ سوز من نہاں ست

جب سحری کا وقت آتا خادم آن کر دستک دیتے حضرت دروازہ کھول دیتے۔ خادم کھانا سامنے رکھ دیتے آپ چند لقمے کھا کر فرماتے کہ باقی بچوں کے ناشتے کے واسطے رکھ دو۔ حضرت کے خادم عبدالرحیم جن کے متعلق یہ خدمت تھی

بیان کرتے ہیں کہ جب میں کھانا لے جاتا تو اکثر آپ نہ کھاتے اور اگر کھاتے بھی تو بہت کم۔ ایک روز میں نے عرض کی کہ حضور اگر کھانا نہ کھائیں گے تو آپ کا کیا حال ہوگا۔ حضرت زار وقطار رونے لگے اور فرمایا کہ ای عبدالرحیم جس وقت میں کھانا چاہتا ہوں یا پانی پیتا ہوں تو مجھ کو غربا کا حال زار یاد آتا ہی کہ بہت سے مساکین درویش مسجدوں کے کونوں اور دکانوں میں بھوکے پیاسے پڑے ہوں گے تو اب تم ہی بتاؤ کہ کس طرح کوئی چیز میرے حلق سے اترے۔ صبح کو جب آپ باہر تشریف لاتے تو آپ کی آنکھیں شب بیداری سے سرخ رہتی تھیں اور عالم خمار کا نظر آتا تھا۔ ؎

شکار چشم تو جانہا بیک بار　　　اسیر زلف تو دلہا بہر تار
خیال زلف تو خواب از سرم برد　　　دو چشم مست تو خون دلم خورد

جمعہ کے دن آپ کا مزاج جادۂ اعتدال سے منحرف ہوا اور نور تجلی سے سینہ مبارک آپ کا روشن ہو گیا۔ نماز میں سجدے کی حالت میں پڑے رہتے پھر اسی عالم محویت میں مکان میں تشریف لائے اور گریہ وزاری زیادہ فرمانے لگے اور جب ہوش آتا فرماتے آج جمعہ کا روز ہی ضرور دوست کا وعدہ دوست کو یاد آتا ہی اور بار بار پوچھتے تھے کہ میں نے نماز پڑھلی یا نہیں۔ خدام عرض کرتے آپ نے نماز پڑھلی ہی آپ فرماتے اور پڑھلوں خبر نہیں کہ پھر بھی نماز پڑھنی نصیب ہوگی یا نہیں۔ غرض جب تک زندہ رہے نماز کو مکرر سہ کرر پڑھتے اور یہ مصرعہ اکثر فرماتے ع۔ می رویم و می رویم و می رویم۔ بعد ازاں آپ نے اپنے سب رفقا خدام اور اعزہ کو جمع کر کے اقبال خادم کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ تم سب گواہ رہنا کہ اگر کسی قسم کی کوئی چیز گھر میں رکھ چھوڑے گا تو قیامت کے روز اس کی جواب وہی اس کے ذمے رہے گی۔ اقبال نے عرض کیا کہ میں کوئی چیز باقی نہ رکھوں گا سب فقرا کو ابھی تقسیم کر دیتا ہوں اور سارا اساماں تقسیم کر کے حضرت کو خبر دی کہ سوائے غلے کے جو لنگر خانے کا روزانہ خرچ ہی سب بانٹ دیا۔ آپ سن کر منغض ہوئے اور کہا کہ اس مردہ ریگ کو کیوں رکھ چھوڑا ہی۔ اقبال نے کہا کہ میں نے سوائے اس غلے کے کچھ نہیں رکھا اور یہ بھی اس خیال سے لگا رکھا ہی کہ مخلوق خدا خود کھائے گی

آپ نے کہا کہ مخلوق خدا کو بلاؤ اور سب کو بلا کر فرمایا کہ اس غلے کو لوٹ لو اور اس جگہ جھاڑ و دے دو۔ تھوڑی دیر میں سارا غلہ لٹ کر جھاڑ و مل گئی۔ بعد سب خدام حاضر ہوے اور عرض کی کہ آپ کے بعد ہمارا کیا حال ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں تم کو اس قدر ملے گا جو تمھاری ضروریات کو کافی ہوگا۔ پھر رفقا و معتقدین کے اصرار سے مولنا شمس الدین نے پوچھا کہ آپ کے حظیرے میں لوگوں نے بڑی بڑی پر تکلف عمارتیں بنوائی ہیں اور سب کی تمنا یہی ہی کہ آپ ہماری عمارت میں آسودہ ہوں پس حضرت کا کیا منشا ہی۔ آپ نے فرمایا مولنا مجھے کسی عمارت میں دفن نہ کرنا۔ مجھے صحرا میں دفن کرنا چنانچہ بعد وفات ایسا ہی کیا گیا۔ بعد میں سلطان محمد تغلق نے آپ کا روضۂ منورہ نہایت تکلف بنوا دیا اور اس کے بعد سے آستانۂ پاک کی خدمت ہر ایک شاہ و امیر نے اپنی سعادت دارین تصور کر کے کچھ نہ کچھ توسیع کی۔ وفات سے چالیس دن پہلے آپ نے کھانا بالکل ترک فرما دیا تھا یہاں تک کہ کھانے کی خوشبو بھی نہ سونگھتے تھے اور ہر وقت آپ کے آنسو جاری رہتے تھے

گر نہ بینی گریۂ زارم ندانی فرق کرد   کاب چشم است ایں کہ پیشت می رود یا آب جو

اسی اثنا میں مبارک تھوڑا شوربا لاے۔ پوچھا کیا ہی۔ اُنھوں نے کہا تھوڑا سا شوربا ہی آپ نوش فرمالیں۔ کہا۔ دریا میں پھینک دو۔ پھر اُنھوں نے کہا کہ آپ نے کئی کئی دن سے غذا ترک فرما دی ہی آپ کا کیا حال ہوگا۔ فرمایا۔ ای سید! جس کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشتاق ہوں اُسے طعام دنیا سے کیا کام۔ حالت مرض میں آپ نے بات چیت بھی بالکل ترک کر دی تھی۔ بوقت وفات آپ نے اپنے کپڑوں کا بقچہ منگایا اور ایک مصلیٰ خاص اور دستار اور پیرہن مولنا برہان الدین غریب کو عطا فرما کر دکن کی طرف رخصت کیا اور ایک دستار اور مصلیٰ اور پیرہن مولنا شمس الدین یحییٰ کو عطا فرمایا۔ اُس دن حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی بھی خدمت میں حاضر تھے مگر اُن کے واسطے کچھ ارشاد نہ کیا جس سے تمام حاضرین حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہی کہ باوجود اس قدر عنایت کے ان کو کچھ نہ دیا۔ آخر وفات سے ایک دن اُن کو طلب فرمایا اور عصا اور مصلیٰ اور تسبیح اور کاسۂ چوبیں اور جو جو تبرکات حضرت بابا صاحب سے پاے تھے سب اُن کو مرحمت

سے کہئے اور ارشاد کیا کہ تم کو دہلی میں رہ کر لوگوں کی جفا و قفا اٹھانی چاہیئے - ابتدائے ماہ ذی حجہ سنہ ۷۲۴ھ میں آپ کی علالت شروع ہوئی اور چار مہینے چند دن بیمار رہ کر شکایت حبس بول سے بالآخر ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ بدھ کے دن طلوع آفتاب کے وقت ۹۰ برس کی عمر میں آپ نے وفات پائی - امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

ربیع دوم و ہجدہ زمہ ورا برفت آں مہ | زمانہ چوں شمار بست داد و پنج ہفصد را

خسرو نے یہ تاریخ کہی ہے:-

انتظام زمان و اہل زمیں | شیخ عالی نسب نظام الدیں
چارشنبہ مجلد نقل نمود | ہجدہم از ربیع ثانی بود
نود و چار سال عمرش بود | کاں زماں شد بہ حضرت معبود
ترحیل آں ستودہ خصال | زد خرد "زبدۂ بہشت" رقم
مرقد او بہ شہر دہلی داں | فیض بخش بطفل و پیر و جواں

جنازۂ مبارک کی نماز شیخ الاسلام حضرت رکن الدین نے پڑھائی جو بہاء الدین ذکریا ملتانی کے نواسے تھے اور بعد نماز کے فرمایا کہ اسی واسطے چار سال سے مجھے دلی میں رکھا تھا کہ یہ شرف مجھے حاصل ہو - جب جنازہ مبارک کو دفن کے واسطے لے چلے تو قوال یہ غزل گا رہے تھے -

سرو سیمینا بصحرا می روی | نیک بد عہدی کہ بے ما می روی
ای تماشاگاہِ عالم روے تو | تو کجا بہر تماشہ می روی

حال اور وجد جنازہ مبارک پر غالب ہوا اور جسم اقدس جنبش میں آیا - مولانا رکن الدین نے فوراً سماع بند کرا دیا اور بعض کتب میں مذکور ہے کہ حضرت شیخ نے جنازے سے ہاتھ باہر نکال کر فرمایا من نمی روم - اسی وقت حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی نے عرض کیا "شیخا شیخا باش دست درکش قدم سید در میان ست" کہ اسی وقت حضرت نے ہاتھ کھینچ لیا - آپ کو نماز ظہر کے وقت غیاث پور میں دفن کیا گیا - ؎

ماہ در ابر احتجاب نمود | عاشقاں را بدیں عذاب نمود
پردہ از زلف بست بر رخ خود | درد و حیرت بدیں خراب نمود

آپ خاندان چشتیہ سے تھے جس خاندان سے حضرت خواجگان معین الدین

حسن سنجری اجمیری چشتی ہیں اور حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی
اوشی چشتی جن کے نام نامی سے سارا قصبہ مہرولی قطب صاحب کہلاتا ہے ان کے
خلیفہ اور خواجہ قطب الدین صاحب کے خلیفہ حضرت شیخ شیوخ العالم فریدالدین
گنج شکر عرف بابا صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں جن کا مزار پاک پٹن میں ہے اور انہیں سے
آپ کو بیعت تھی لیکن جو شہرت آپ کو نصیب ہوئی وہ کم تر کسی کو ملی ہے۔ آپ بڑے
عابد و زاہد۔ متورع۔ متواضع۔ باکمال اور صفات برگزیدہ کا مجموعہ تھے۔ آپ بڑے
ذی علم اور صاحب کمال تھے۔ غرض کہ آپ ہمہ اوست و ہمہ از وست اور مرجع
عام و خاص وقت تھے۔ آپ کے ارشد مریدان میں سید مخدوم شیخ نصیر الدین محمود
جو عموماً چراغ دہلوی کے نام سے مشہور ہیں اور مشہور شاعر امیر خسرو تھے۔
حضرت جب تک زندہ رہے آپ کے دراقدس پر خلایق کا اژدحام لگا رہتا
تھا اور آپ کے وصال کے بعد بھی تا ایں دم آپ کا مزار مبارک مہبط انوار الہی
و منبع فیض نامتناہی قبلہ عالم و عالمیاں اور خاک دراقدس تریاق بیماراں ہے۔ سے

ذاتے کہ در لطافت طبع و کرامتش مثلش نبود و نیز نباشد درین جہاں

دور دور مقامات بلاد و امصار سے لوگ جوق جوق آ کر زیارت سے مشرف ہوتے
اور اپنی جھولیاں مقاصد اور مرادوں سے بھر بھر کے لے جاتے ہیں

آستانہ شریف

خاک درت کہ سرمۂ اہل نظر شد است بہر شفائے ولہا تریاق اعظم است
مسلمان و ہندو و ترسا و گبر زخاک درت جملہ افسر کنند
چو کافور و صندل ازاں خاک پاک بچشم اندر آرند و دایر کنند

حضرت موضع غیاث پور میں جناب نظام الدین ہی کے نام سے مشہور ہے اور
دہلی سے تین میل کے فاصلے پر جی آئی پی ریلوے کا سٹیشن ہے یارانی چبوترے
کے پاس آسودہ ہیں۔ یہ چبوترہ اکثر حضرت کے قدوم میمنت لزوم سے
مشرف ہوتا تھا اور یہیں اکثر آپ تشریف رکھا کرتے تھے اور یہیں اپنے ملنے کے
لوگوں کو وعظ اور پند و نصائح فرماتے تھے۔ یہیں امیر خسرو بھی دفن ہیں اور
یہیں آپ کے زیر سایہ سلاطین دہلی کی قبریں بھی ہیں۔ یہاں ہمہ وقت قرآن خوانی
ہوتی رہتی ہے۔ ایک بہت بلند اور سنگ بست شمالی دروازہ لب سڑک

واقع ہے۔ یہ دروازہ اُس فصیل کے اندر واقع ہے جو تمام بستی کے اطراف ہے اور
اسی دروازے پر نہایت جلی قلم سے سنہری حرفوں میں یہ مصرع مرقوم ہے۔
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا۔ اب اس دروازے کے ہر دو جانب
کے حجروں میں مدرسہ ہے۔ نظام الدین کی بستی میں داخل ہوتے وقت داہنی
طرف چونسٹھ کھمبے کی عمارت ہے اور ذرا آگے بڑھ کر اسی رُخ پر اکبر ثانی کی
ملکہ شاہزادیوں اور دیگر محلات کی قبریں ہیں۔ بائیں جانب ایک چھوٹا سا دروازہ
ہے جہاں جوتیاں اُتاری جاتی ہیں اور اسی دروازے کے کونے میں ایک بہت
پرانا املی کا درخت کوئی پانسو برس کا ہے۔ اس دروازے کے سامنے ساٹھ فٹ
مربع صحن ہے دروازے کی بائیں طرف شربت خانہ ہے یعنی سنگ مرمر کا ایک
بہت بڑا پیالہ ہے جس کو منت مراد والے دودھ یا شربت یا حلوے سے
بھرتے ہیں۔ اور یہیں ایک حجرے میں مدرسہ ہے اور کسی کا ایک مزار بھی ہے اور
داہنی طرف حضرت امیر خسرو کا مزار ہے۔ اس صحن کے شمال میں ایک اور احاطہ
ہے جس میں سنگ مرمر کا فرش ہے اور اسی میں حضرت نظام الدین اولیاء کا مزار
مبارک ہے۔ یہ احاطہ ۱۹ گز طول میں اور ۸ گز عرض میں ہے اور اسی احاطے میں جہاں آرا بیگم محمد شاہ
اور مرزا جہانگیر کی قبریں ہیں اور ایک مسجد بھی ہے جس کا نام "جماعت خانہ" مشہور ہے۔
درگاہ شریف سے اندر داخل ہونے کا ایک چھوٹا سا دروازہ شمالی رُخ پر ہے
جس سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر آپ کے مزار شریف کا قبہ ہے جو تیس فٹ
مربع ہے اور جس کے چاروں طرف پانچ پانچ محرابیں ہیں جن کے سنگ مرمر کے
بیس ستون ہیں اور جو "بست دری" کہلاتی ہے اور جس کے چاروں طرف چھ فٹ
چوڑا برآمدہ ہے۔ حضرت کے مزار کے حجرے کے اطراف سنگ مرمر کی جالیاں
ہیں جن کے گرد سنگ سرخ کا حاشیہ لگا ہوا ہے اور اندر سے حجرۂ شریف
اٹھارہ فٹ مربع ہے۔ اس حجرے اور برآمدے کا سارا فرش سنگ مرمر کا ہے۔
دروں اور کھڑکیوں پر سُرخ بانات کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ آپ کا
گنبد کمر کی شکل کا سنگ مرمر کا ہے جس پر سنگ موسیٰ کی پٹیاں پڑی ہوئی ہیں اور
اوپر سنہری کلس چڑھا ہوا ہے۔ اور حجرے کے چاروں کونوں پر نہایت خوبصورت

چھوٹی چھوٹی سنگ مرمر کی برجیاں ہیں جن کے کلس بھی سنگ مرمر ہی کے ہیں۔ ابر محیط آسمان ہوتا ہے تو حجرے میں ذرا اندھیرا ہو جاتا ہے اور دیواریں اور قبر شریف صاف نہیں معلوم دیتی۔ مزار کے سرہانے کی دیوار میں تین جالیاں سنگ مرمر کی ہیں۔ بیچ والی بڑی ہے اور ادھر ادھر کی اس سے چھوٹی۔ مغرب رویہ دیوار میں ایک طاق ہے جس پر سنہری کام ہے۔ طاق کے دونوں طرف جالیوں میں سے روشنی اور ہوا داخل ہوتی ہے۔ مشرق کی طرف بھی اسی قسم کی تین جالیاں ہیں۔ جنوبی دیوار کے بیچ میں داخلی دروازہ ہے جس کے دونوں جانب سنگ مرمر کی جالیاں ہیں۔ قبر شریف پر ہمیشہ شامیانہ تنا رہتا ہے۔ مورچھل، شتر مرغ کے انڈے اور قمقمے لٹکتے رہتے ہیں۔ قبر شریف کے اطراف ایک سنگ مرمر کا کٹہرا دو فٹ اونچا ہے۔ جو نواب سر خورشید جاہ بہادر مرحوم رئیس اعظم حیدرآباد دکن نے لگایا جس پر یہ عبارت تاریخ کندہ ہے۔ "گزرانیدہ غلامان غلام فدوی محی الدین بہادر شمس الامراء امیر کبیر خورشید جاہ بست ویکم ماہ صفر المظفر ۱۳۰۱ھ ہجری" چھپر کھٹ کے ستون دس فٹ اونچے ہیں اور چھتری دس فٹ لمبی چار فٹ چوڑی ہے جو زریں کپڑے کی ہے۔ قبر کے سرہانے ایک کھلا ہوا قرآن شریف رحل پر رکھا رہتا ہے جس کے پیچھے ایک تختی سنگ مرمر کی ہے جس پر سیپ کے سنہری حرفوں میں آیات قرآنی کندہ ہیں۔ حجرے کے اندرونی ستون سنگ سرخ کے ہیں اور جالیوں کے اندروار بھی سنہری کام ہے۔ ابتدائً مزار شریف ایک جالی دار چار دیواری کے اندر تھا۔ جس پر سلطان محمد بن تغلق نے سب سے پہلے گنبد بنوایا تھا جو اب باقی نہیں رہا۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے حجرے کے اندرونی حصے کی درستی اور آراستگی کے علاوہ گنبد اور جالیوں کی بھی مرمت کرائی اور صندل کے کواڑ چڑھوائے۔ حجرے کے چاروں کونوں پر سونے کے کٹورے آویزاں کیئے اور جماعت خانے کی سربفلک عمارت بھی بنوائی۔ درگاہ کا تمام فرش سنگ مرمر کا محمد شاہ بادشاہ کا بنوایا ہوا ہے چنانچہ محاذی درگاہ شریف فرش کی ایک سل پر سنہ ۱۱۳۹ھ کندہ ہے۔ ۹۶۲ھ میں سید فرید خاں نے سنگ مرمر کی لوح خصب کی جس پر یہ قطعہ کندہ ہے

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

شکر کہ در روضۂ حضرت غوث الانام　　از پی تعمیر شد خانِ فلک احتشام

مہر نسب را شرف اوج فخر را شہاب　　سید عالی نسب میر فلک احترام

بانی او ہاشمی ساعی او ہاشمی　　آنکہ بدوران شاہ ہست سخن را نظام

از پی تاریخ آں چوں متفکر شدم　　کلک خرد زد رقم قبلہ گہِ خاص و عام

روے بدرگاہ او آر فریدوں بصدق　　شاید از لطافِ پیر کار تو گردد نظام

کاتب حسین احمد چشتی

نور الدین جہانگیر بادشاہ کے عہد سلطنت میں نواب فرید خاں المخاطب بہ مرتضیٰ خاں نے جن کا فرید آباد بسایا ہوا ہے سنہ ۱۰۲۱ھ میں مزار مبارک پر سیپ سے پچیکاری کے کام کا بہت نفیس اور نہایت عمدہ و بیش قیمت صندل کی لکڑی کا چھپر کھٹ چڑھایا۔ جس میں سیپ کا ایسا نفیس باریک اور نازک اعلیٰ درجے کا کام کیا ہوا ہے کہ دیکھ کر عقل دنگ ہو جاتی ہے کہ کن ہاتھوں نے اور کس محنت سے بنایا ہوگا جو قدرت الٰہی اور صناعی بے بدل کا ایک نمونہ ہے۔ اس چھپر کھٹ کے اطراف سیپ ہی کی پچیکاری سے یہ اشعار منقوش ہیں

شیخ دہلی نظام راد و فرید　　کار دنیا و دین مہیا کرد

یک فریدش مقامِ فانی داد　　یک فریدش مقام احیا کرد

مرتضیٰ خاں فرازِ مرقد او　　قبۂ چوں سپہر برپا کرد

ابر فیروزی از جہاں برخاست　　دُرِ یکدانہ در صدف جا کرد

بر جہاں کعبۂ مربع او　　چادر از چہار حد وا کرد

عرشۂ مرقد مبارکِ او　　بر زمیں کار عرشِ اعلیٰ کرد

عرش در پائے چار قائمہ اش　　چار تکبیر بے محابا کرد

ہر کہ رخ از مقام او تابید　　پشت بر کعبۂ معلا کرد

ناکہ او در سجود او آورد　　رخ چو آئینہ مصفا کرد

خاک او ب مقامش ار باشی　　میتواں کرد صد مسیحا کرد

سال تاریخ ایں بنا جستم　　قبۂ عقل شیخ القا کرد
۱۰۱۷ھ

قدر بانی او در فیض کشاد　　آنکہ ایں ہفت سقف خضرا کرد

۱۰۶۳ھ ۱۶۵۲ء یعنی شاہ جہاں کے عہد میں ایک امیر خلیل اللہ خاں نامی نے آپ کے مزار کے گرد سنگ سرخ کی غلام گردش بنائی اور اُس کے ہر ہر ضلع میں پانچ پانچ در کے جو سب ملا کر بیس در ہیں اور جنوب کی طرف کے ضلع کے دوسرے اور چوتھے در پر عبارت کندہ ہے۔ دوسرے در پر۔ در عہد اعلی حضرت صاحبقران ثانی احقر العباد خلیل اللہ خاں ابن میرمیران الحسینی نعمت الہی۔ چوتھے در پر۔ فی سنہ ۱۰۶۳ھ کہ حاکم شاہجہان آباد بود ایں ایوان سایہ دروضہ متبرکہ مرتب نمود۔ ۱۱۶۹ھ ۱۷۵۵ء میں عزیز الدین عالم گیر ثانی نے جو آپ کی جناب میں بہت اعتقاد رکھتا تھا چند اشعار آپ کی مدح اور اپنے درد دل میں کہے اور مجرج کے اندر سنگ مرمر پر کندہ کرا کے مغرب کی طرف پائنتی کے رخ پر لگا دیے ہیں

یا عزیز

جو ہے خادم نظام الدین کا دلیس اہی غریب — اُس کے تئیں ہوتا ہی تاج خسروی جگ میں نصیب

خادمی کی تھی عزیز الدین نے باصدق یقیں — تاج شاہی ہند کا مجھ کو دیا ہی عنقریب

مرض دل انگار میرے کا وہ صحت بخش ہی — بے غذا و بے دعا و بے دوا و بے طبیب

بس پریشاں حال ہی اب خلق پر محبوب حق — فضل کر تقصیر وار دں پر تم ہو حق کے طبیب

باہتمام غلام ہوشیار علی خاں محلی ۱۱۶۹ھ

خلیل اللہ خاں کی بنوائی ہوئی غلام گردش ایک عرصے تک بحال خود رہی۔ بعد میں مولوی محمد فخر الدین صاحب عرف مولنا فخر صاحب نے سنگ سُرخ کی غلام گردش کی جگہ سنگ مرمر کی غلام گردش بنوانے کا ارادہ کیا چنانچہ آپ کے پوتے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب نے جو سجادہ نشین تھے سنگ مرمر کے ستون خرید کیے لیکن اُن کی حیات مستعار نے وفا نہ کی اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۸ء میں نواب احمد بخش خاں بہادر والی فیروز پور جھر کہ نے سنگ سُرخ کے ستون لگا کر وہی سنگ مرمر کے ستون لگا دیئے مگر محرابیں اور غلام گردش کی چھت سنگ سرخ کی ہی رہی اُس میں یہ نقص تھا کہ ہمیشہ ٹوٹی لگ کر نقش و نگار جھڑتے جاتے تھے۔ ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۰ء میں فیض اللہ خاں بنگش نے سنگ سُرخ کی چھت کے نیچے تانبے کے پتر کی چھت جڑوادی اور اُس پر اندر باہر تمام سنہری اور لاجوردی کام بنوادیا جو بوسیدہ ہو جانے سے سنہ ۱۳۰۰ھ میں صرف چھت پر دوبارہ گلکاری کی گئی۔ اس

چھت کے بنانے کی تاریخ چھت کے کنارے پر لگی ہوئی ہے لیکن وہاں کا چونا شور لگ کر گر گیا جس سے تاریخ بھی جابجا سے جھڑ گئی ہے اب بمشکل جو پڑھی جاتی ہے وہ یہ ہے :-

بدرگاہ نظام الحق والدین۔ کہ محبوب..........

چو ایں سقف مطلا و منقش بنا کرد خان بنکش خوشتریں است

و سال ایں سقف بنا ایں... کہ آں خا.........

.... گفتا تمامی کار چنیں است

محررہ محمد جان سنہ ۱۰۳۶ھ

درگاہ شریف کا برج پورنے کا اور پست تھا جو غلام گردش کے بننے سے اور بھی دب گیا تھا ۱۲۳۹ھ ۱۸۲۳ء میں اکبر شاہ ثانی نے سنگ مرمر کا برج بنوا ۱ نہایت نفیس سنہری کلس چڑھوا دیا آپ کے مزار کے گنبد مبارک کے کواڑوں کے پٹوں پر چاندی کا پتر منڈھا ہوا ہے جس پر یہ اشعار کندہ ہیں :-

اللہ اکبر

بطفیل سبہ قبولم کن ای آل من و آلہ ہمہ

خسروا دو تو پناہ می جوید ای پناہ من و پناہ ہمہ

کمترین محمد ناصر ۱۹ ربیع الثانی سنہ ۱۳۲۷ھ ہجری

اللہ اکبر

ای ہر ماندگی پناہ ہمہ کرم تست عذر خواہ ہمہ

قطرۂ ز ابر رحمت تو بس آست شستن نامۂ سیاہ ہمہ

غلامان غلام شاہ محمد خاں چشتی نظامی ہوشیار پوری

آپ کے مزار کے پائین میں خواجہ معز الدین اور آپ کے جوار میں خواجہ ضیاء الدین آپ کے مرید مدفون ہیں۔ حضرت کا عرس شریف سترھویں ربیع الثانی کو بڑی دھوم دھام سے آج تک ہوتا ہے۔ ساری دلی امنڈ آتی ہے اور قوالی بھی بڑے زور شور سے ہوتی ہے اور یوں بھی ہر جمعرات کو زائرین کا مجمع ہوتا ہے اور قوالی بھی ہوتی ہے۔

دوسرے مجبر درگاہ شریف کے احاطے کے صحن میں جنوب کی طرف اور تین مجبر ہیں جن کی سنگ مرمر کی چار دیواریاں الگ الگ ہیں۔ درگاہ سے ملا ہوا مزار مرزا جہانگیر کا ہے جو شاہزادے تھے اور اسی کے سامنے محمد شاہ بادشاہ

دہلی کا مزار ہے جس کے پیچھے شاہ جہاں بادشاہ کی چہیتی صاحب زادی جہاں آرا بیگم کا مجر ہے ان سب کے حالات جدا جدا آگے بیان کیئے جاتے ہیں۔

جہاں آرا بیگم کا مجر
۱۰۹۲ھ

جہاں آرا بیگم شاہ جہاں بادشاہ کی بیٹی تھی اور اس کا زمانہ وہ تھا جب کہ سلاطین مغلیہ کا نیر اقبال کمال عروج پہ تھا اور اُس کی وفات اُس زمانے میں ہوئی جب کہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا اور نادر شاہ کے حملے نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ہلا دی تھی۔ مرزا جہانگیر کے زمانے میں تو بادشاہت صرف نام ہی کی رہ گئی تھی وہ در حقیقت نادر شاہ کے تحت میں تھے اور خاتمہ نظر آتا تھا۔ جہاں آرا بیگم کے حالات میں عجیب تناقص ہے۔ مورخین اُس کو تمام اوصاف اور محاسن نسوانی سے متصف کرتے ہیں اور برنیر فرانسیسی سیاح اُس کے برعکس طرح طرح کے اتہام لگاتا ہے جیسی کہ اُس کی عادت ہے کہ جس ہندیا میں کھاتا ہے اُسی میں چھید کرتا ہے۔ اس سیئے ہم بمقابلہ روایات متواترہ کے برنیر کے بیان مجرد کو ساقط الاعتبار خیال کرتے ہیں۔ جب اورنگ زیب نے ۱۲۵۸ھ میں دارا شکوہ کو آگرے سے نو میل کے فاصلے پر بمقام سموگڈھ شکست دے کر اپنے باپ شاہ جہاں کو تخت سے اُتار کر قید کر دیا تو ایک بہن جہاں آرا تو باپ کی طرف ہو گئی اور دوسری روشن آرا بیگم نے فاتح بھائی یعنی اورنگ زیب کا ساتھ دیا۔ باپ کے ساتھ آگرے کے قلعے میں جہاں آرا بھی مقید رہی۔ روشن آرا بھائی کی مشیر و صلاح کار تھی اور ہمیشہ اورنگ زیب کو شاہ جہاں کے حضور میں جانے سے روکتی تھی اور اسی صلاح و مشورے سے دارا شکوہ قتل کیا گیا۔ جہاں آرا بیگم حسن و جمال و عقل و فراست میں مشہور زمانہ تھی اور عورتوں میں جو باتیں اُمنگ کی ہونی چاہئیں وہ سب خدا نے کوٹ کوٹ کر اس میں بھر دی تھیں۔ وہ اورنگ زیب کی ان حرکات سے متنفر تھی اور کبھی کبھی دو بدو بھی اپنی ناراضی کا اظہار کر دیتی تھی چنانچہ اورنگ زیب نے ناراض ہو کر جہاں آرا بیگم کے کچھ معمولات بھی مسدود کر دیئے تھے۔ شاہ جہاں نے ۱۰۷۶ھ میں انتقال کیا۔ باپ کی وفات کے پانچ برس بعد روشن آرا بیگم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جہاں آرا بیگم نے دہلی میں ۲ رمضان المبارک ۱۰۹۲ھ میں انتقال کیا۔ یہ نہیں معلوم ہوا کہ جہاں آرا بیگم آگرے سے دلی خود چلی آئی تھیں یا اورنگ زیب کے حکم سے آنا پڑا لیکن ضرور بھائی بہن کی رنجش کو اس نقل مکان میں دخل تھا۔ چوں کہ جہاں آرا بیگم کو خواجگان چشت سے بڑا اعتقاد تھا اس سیئے بیگم صاحب موصوفہ نے پیرزادگان درگاہ کو ایک رقم

عطیہ دے کر یہ زمین خریدی تھی اور خود تمام حظیرہ سنگ مرمر کا بنوایا۔ قبر سنگ مرمر کی ڈبہ سا ہے۔ تعویذ کے بیچ میں مٹی بھری رہتی ہے جس پر ہریالی اُگی ہوئی ہے۔ قبر ایک سنگ مرمر کی چار دیواری کے اندر ہے جو ۱۴ فٹ × ۱۲ فٹ اور آٹھ فٹ بلند ہے۔ چار دیواری کے اندر داخل ہونے کا ایک ہی دروازہ ہے جس کے کواڑ چوبی ہیں۔ ہر دیوار میں تین تین درے نہایت نفیس سنگ مرمر کی جالی کے ہیں۔ جس دیوار میں دروازہ ہے اس طرف دو ہی درے ہیں تیسرے درے کی جگہ دروازہ ہے۔ دیواروں پر سنگ مرمر کا عمدہ جالی دار کٹہرا تھا جو گر گرا گیا اب صرف ایک طرف کی دیوار پر اس کا کچھ حصہ باقی ہے جس سے اس کی نفاست کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ احاطے کے چاروں کونوں پر چھوٹی چھوٹی برجیاں ہیں جن میں کی دو گر گرا گئیں اب صرف دو باقی ہیں۔ جہاں آرا بیگم کی قبر احاطے کے بیچوں بیچ میں ہے جس کے سراہنے ایک پتلی سی سنگ مرمر کی تختی نہایت خوش نما لوح کی کھڑی ہے جس پر بخط عربی سنگ موسی کی پچیکاری سے ایسا خوش خط یہ کتبہ ہے کہ جس سے آنکھیں روشن ہو جائیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ شعر خود مرحومہ مغفورہ کا ہی ہے؎

هو الحی القیوم

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است
الفقیرۃ الفانیہ جہاں آرا مرید
خواجگان چشت بنت شاہ جہاں
بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ
۱۰۹۲ھ

جہاں آرا بیگم کی قبر کی داہنی طرف مرزا نیلی ملف شاہ عالم بادشاہ کی قبر ہے اور بائیں طرف جمال النسا بیگم دختر اکبر شاہ ثانی کی۔

محمد شاہ بادشاہ کا مجر
۱۱۳۱ھ — ۶۱
۱۷۱۹ء — ۴۸

درگاہ شریف میں جہاں آرا بیگم کے مجر سے مشرق میں **محمد شاہ بادشاہ کا مجر** ہے۔ مغلیہ سلاطین کے زمرے میں سب سے زیادہ مصائب و آلام کا زمانہ اس بدنصیب بادشاہ کا تھا۔ اورنگ زیب کے انتقال کے ساتھ جو زوال شروع ہوا وہ اس کے عہد میں انتہائی

درجے کو پہنچ گیا۔ محمد شاہ ایسے زمانے میں تخت نشین ہوا کہ سارے ملک میں ہر طرف بدنظمی اور بلوہ پھیلا ہوا تھا۔ باج گزار راجاؤں اور امرار نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا جہاں پہلے سے سکون تھا وہاں بھی فتنہ و فساد کی آگ بھڑک گئی اور سب سے بڑھ کر نادر شاہ کا حملہ اور دلی کا قتل عام ہوا۔ اب وہ ڈگمگائی ہوئی بادشاہت رہی سہی بھی کمزور ہو گئی اور یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس وقت ہی سے سلطنت مغلیہ کا قلع و قمع ہو گیا۔ محمد شاہ کو مجبوراً امرار و رؤسار و والیان ملک کی خود سری کو انگیز کرنا پڑا اور سب سے بڑھ کر یہ مصیبت ہوئی کہ باوجود دلی کے قتل عام کے نادر شاہ بادشاہ کو جہاں داری کے بہانے سے جبراً اپنی دارالسلطنت تک لے گیا اور یوں جا کر قتل عام کی بھڑکی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑی اور شہر مزید مصائب اور تباہی و بربادی سے محفوظ رہا۔ محمد شاہ بے چارے کو اس ناخواندہ جہان کی بادل ناخواستہ آؤ بھگت کرنی پڑی۔ تعریفی قصائد سامنے پڑھنے پڑے اور ایک لڑکی بھی اپنی نادر شاہ کے بیٹے کو دے لا کر اپنی جان بچانی پڑی۔ محمد شاہ اس سخت آفت کے بعد آٹھ سال تک زندہ رہا اور جب موت نے اس کا پردہ ڈھنک دیا تو درگاہ حضرت نظام الدین میں آسودہ کیا گیا۔

قطعۂ تاریخ وفات

شہ فلک حشم و روشن اختر آں کہ از و
چو آفتاب جہاں جلگی فروغ گرفت
چو شد بجادۂ فردوس زیں سرائے سپنج
سرود ہاتف غیبی کہ گو "بجنت رفت"
۱۱۶۱ھ

اس کی قبر کا احاطہ مستطیل ہے جو بیس فٹ لمبا اور سولہ فٹ چوڑا ہے۔ چاردیواری آٹھ فٹ سے کچھ اونچی ہے جس کے چاروں کونوں پر سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے منارے ہیں۔ دروازہ اور اُس کے سامنے کے دَرے بھی سنگ مرمر کے ہیں جو نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ دیواروں میں سنگ مرمر کی جالیاں ہیں انھیں کے درمیانی دَرے میں دروازہ ہے جس کے کواڑ بھی سنگ مرمر کے ہیں۔ احاطے کے طول میں سنگ مرمر کے پانچ دَرے ہیں اور عرض میں تین تین۔ جالیاں پانچ فٹ لمبی اور چار فٹ چوڑی ہیں۔ اس احاطے میں چھ قبریں ہیں سب سے بڑی قبر محمد شاہ بادشاہ کی ہے۔ داہنی طرف محل خاص نواب صاحبہ محل کی قبر ہے اور اس کے پائین بن نادر شاہ کی بیوی کی اور داہنی طرف اُس کی معصوم لڑکی کی ہے ایک قبر مرزا جہانگیر محمد شاہ کے پوتے کی اور ایک

مرزا عاشوری کی۔ علاوہ ان قبور کے اور دو شاہزادگان خاندان تیموریہ کی قبریں بھی ہیں جن کے نام تک کسی کو معلوم نہیں۔ یہ غیر مسقف سنگ مرمر کا مجحر محمد شاہ نے اپنی زندگی میں ایک لاکھ روپیہ کو درگاہ والوں سے خرید کر خود طیار کرایا۔

مرزا جہاں گیر و مرزا بابر پسران اکبر شاہ ثانی کا مجحر ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء

متصل مجحر محمد شاہ بادشاہ۔ یہ تیسرا احاطہ بھی محمد شاہ کے مجحر کی بالکل نقل ہے جو اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر تمام تر سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی اصل اصل ہی ہے اور نقل نقل۔ اگرچہ مرزا جہانگیر کے مجحر میں نسبت محمد شاہ کے مجحر کے کام بہت باریک اور نفیس ہے اور جالیاں بھی بہت باریک اور نزاکت سے تراشی گئی ہیں لیکن سنگ مرمر ایسا آبدار اور شفاف۔ بےجوم خوش رنگ و خوش قماش نہیں ملا۔ محمد شاہ کے مجحر پر ایک عجب طرح کی نزاکت۔ ملائمت اور ملاحت ہے اور مرزا جہانگیر کے مجحر پر ایک طرح کا روڑا پا اور روکھا پن برستا ہے بہر حال اپنی جگہ یہ مجحر بھی ایک عجائب روزگار اور قابل دید ہے۔ یہ مجحر مرزا جہانگیر اور مرزا بابر پسران اکبر شاہ ثانی کا ہے۔ مرزا جہانگیر خلف اکبر تھے جو مفسدانہ طبیعت رکھتے تھے چنانچہ ۱۸۰۸ء میں انھوں نے مسٹر سٹین رزیڈنٹ دہلی پر تپنچہ سر کیا تھا جس کی پاداش میں برٹش گورمنٹ نے انھیں نظربند کر کے الہ آباد بھیج دیا اور وہیں ۱۲۳۷ھ ۱۸۲۱ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ وفات کی تاریخیں ہیں۔

(۱) چوں از جہاں برفت جہانگیر میرزا
نور نگاہ اکبر و سالار دوسرا
شد خانہ عز الغمش وار سلطنت
محزون شد از وفات وی آں ظل کبریا
تاریخ فوت او بظہور آمدہ چنیں
از گان شاہ رفت زہے لعل بے بہا

(۲) چوں جہانگیر ابن اکبر بادشاہ
درجہاں باد انش وباداد گشت ۱۲۳۷ھ
از قدوم آں دُر بحر کرم
رونق شہر الہ آباد گشت
آں جناب نہاد خوان فیض را
ہر یک از فکر معاش آزاد گشت
چوں زسی یک سال عمرش شد فزوں
طبع او از زندگی ناشاد گشت
خیمہ زد در منزل جنت سرا
ایں چہ از دور فلک بےداد گشت
عالمے شد درغمش چنداں اسیر
نام شادی از جہاں برباد گشت
ابر آمد در عزا گریہ کناں
بر فلک ہم ماتمے ایجاد گشت

از پئے تاریخ فوت او دلم　　　ہر طرف با نالہ و فریاد گشت
شد عیاں ایں مصرعہ از ترکیب آہ
حیف بے رونق الہ آباد گشت
۱۲۳۶ = ۱۲۳۰ + ۶

(۳) جہانگیر شہزادہ چو از جہاں　　　بشہزادگی دل ببر داشتہ
بسطح منا اشہب عظمے راند　　　بہ گلگشت جنت عناں تافتہ
چو شور قیامت تعاں در غمش　　　بروے زماں آہ برخاستہ
بہ ہاتف بگفتم کہ کلک سعید　　　چہ تاریخ فوتش رقم ساختہ
بدیں گونہ گفتا کہ بے پاسے صید
بملک بقا سلطنت یافتہ
۱۲۳۶ = ۴ - ۱۲۴۰

(۴) از گردش چرخ ایں ستم ایجاد چرا شد - کاں فخر زمانی
افسوس کہ عازم سوے فردوس سرا شد - در عین جوانی
تاریخ وے از کلک قضا منشی تقدیر - بر لوحۂ محفوظ
بنوشت جہانگیر جہاں دار بقا شد - از منزل فانی
۱۲۳۶ = ۲۷۶ + ۹۶۰

نواب ممتاز محل صاحبہ ان کی والدہ تھیں جو مرزا جہانگیر کو بہت چاہتی تھیں۔ اُنھوں نے نواب مختار الدولہ وحید الدین احمد خاں بہادر خلف اکبر و زیر اعظم دستور معظم نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ کو الہ آباد بھیجا اور اُن کی نعش منگوا کر یہاں دفن کی اور بعد میں یہ مقبرہ بھی اُنھوں ہی نے ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۲ء میں بنوایا۔ احاطے کی کرسی ۳ فٹ بلند ہے اور مستطیل شکل کا ۲۰ × ۲۶ فٹ ہے جس میں سنگ مرمر کی چار سیڑھیاں چڑھ کر داخل ہوتے ہیں۔ اس کی چوکھٹ پٹوں سمیت سنگ مرمر کی ہے جن پر نہایت عمدہ پچیکاری کا کام ہے دروازے کے محاذی دوسری طرف اُس کا جوابی دروازہ ہے۔ احاطے کے چاروں کونوں اور دروازوں کی ہر دو جانب سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی مینارین ہیں۔ اس احاطے میں چار قبریں ہیں۔ دیوار سے ملی ہوئی مرزا بابر کی ہے۔ اس کے پاس مرزا جہانگیر کی جس کے تعویذ پر

بہت باریک اور اعلیٰ درجے کا نفیس نقاشی کا کام ہی۔ مگر تختی دار تعویذ سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ تعویذ زنانہ ہی جو کسی وقتی ضرورت کے لحاظ سے مردانی قبر پر لگا دیا گیا اس پر کوئی کتبہ نہیں ہی۔ مگر مرزا بابر کی قبر کا تعویذ بھی خاص اُن کا نہیں ہی وہ بھی کسی کسی دوسرے صاحب کی قبر کا اکھیڑ کر لگا دیا ہی۔ خدا جانے یہ کیا مصلحت تھی کہ قبر کسی کی تعویذ کسی دوسرے کا چنانچہ اس پر کتبہ موجود ہی:۔

آں سید عالی نصیب معدن جود　　واں بحر کرم کز و جہاں مے آسود
فرزند علی میر محمد نامش　　چوں میر محمد از جہاں نقل نمود
تاریخ وفاتش از خرد پرسیدم　　گلزار بہشت جاے یادا فرمود

اس مجرے کے باہر جانب شرق دالان در دالان اور ایک دروازہ کلاں بھی اُنھیں کا تعمیر کرایا ہوا ہی جس میں مرزا بابر کی بیوی کی سنگ مرمر کی قبر ہی جس پر یہ کتبہ ہی:۔

کلمہ

دریغا زوجۂ بابر بہادر　　یکایک زیں جہان بے وفا رفت
بحکم صاحب عالم و سالش　　بقا گفتہ کہ در دار البقا رفت

مکان منشی سعادت علی خاں
سنہ ۱۲۷۱ھ

یہ بھی ایک قدیم مکان بیرون دروازہ مشرقی آستانہ شریف ہی جس پر حال میں ایک نہایت خوش خط اور واضح کتبہ بخط ثلث حسب ذیل لگایا گیا ہی:۔

این مکان مقبرۂ جد مادر مادر خود را سعادت علی وارادت علی
ابناے سید باقر علی مغفور و نبسان شیخ محمد موسیٰ خاں مسرور
در سنہ ۱۲۷۱ھ ہجری نبوی از سر نو بنا ساخت

مجرہ مرزا محمد مقیم
سنہ ۹۶۹ھ

حضرت سلطان اولیاء کی درگاہ شریف کے اندر مشرق کی طرف مرزا محمد مقیم کا مجرہ ہی جس کے دروازے پر یہ دو رخہ کتبہ ہی سامنے دار درگاہ کے رخ پر:۔

آنہا کہ بکوے قرب جا یافتہ اند　　کام دل خود بمدعا یافتہ اند

این مرتبہ والی ز کجا یافتہ اند | از شیخ نظام او بیا یافتہ اند

نیچے دار کوار۔ فرزند مقیم بندہ حی و قدیم | جا کرد درین روضۂ پر فیض و نعیم
امان بود در خشکر اندیشہ و بیم | چوں ساکن فردوس گشت برین مقیم

قائلہ موبدی و کتبہ حسین نقشی | قائلہ میر فریدی نیشاپوری ۹۹۹

قطعہ:۔ از جہاں مرزا مقیم چوں رفت | نہصد و شصت ہفت بد تاریخ
اسی مجھر میں ادر ایک قبر ہے۔ افسوس کہ شد نہال شہر دہلی | ماہی کہ محل طالعش کامل شد
آں تازہ نہال گلشن حسن و جمال | بگذاشت جہاں فانی باکل شد
تاریخ وفات آں گل آمد از غیب | بہ باد ز گلشن مراد آں گل شد

وفات ابوالفضائل بن سید مراد در ۹۶۵ھ

ایضاً:۔ بندہ خواجہ عبداللہ ابن میر حاجی محمد ہمدا نے۔

مکان مرزا بہرام شاہ اسی مجھر کے پاس مرزا بہرام شاہ کا قدیم مکان خراب خستہ حالت میں ہے جس پر یہ کتبہ لگا دیا ہے:۔

ساخت مکان جنت نشان محمد بہرام شاہ ابن شاہ عالم بادشاہ غازی

خانقاہ مرزا بہرام شاہ ۱۲۲۰ھ آنگہ خاں کے مقبرے سے ملی ہوئی یہ خانقاہ مرزا بہرام شاہ عرف مرزا احستو فرزند شاہ عالم بادشاہ کی ہے جو امیر الملک مرزا بلاقی کے نام تھے اس مکان کے دروازے پر یہ تاریخ ہے:۔

شہ بہرام ابن شاہ عالم | مرتب ساخت جائے خوش سراپا
خرد از سال تاریخش چنیں گفت | کہ اقدس خانقاہ روح افزا

۱۲۲۰ھ

یہ خانقاہ محاط ہے جس میں ایک سہ دری ہے اور صحن میں یہ قبریں ہیں:۔

زوجۂ حسین بہرام شہ بر بست رخت | زیں جہان و چشم آں گریاں چو میغ
داغ حسرت بر نہاد او نہا | رفت بی جاں گفت ہاتف اے دریغ

۱۲۲۴ھ

دوسری اس قبر کے سرہانے ۲ فٹ لمبی اور ۱ فٹ چوڑی سنگ مرمر کی لوح بجانب شمال کھڑی ہوئی ہے جس پر یہ کتبہ ہے:۔

کلمہ

از جہاں رفت خواجگی درویش | سوی فردوس رہنما آمد

دل ازیں عالم بے بقا برکند | زانکہ کارِ جہاں فنا آمد
از سرِ اعتقاد و روے نیاز | بر درِ شیخ اولیا آمد
در بہشت بریں نہاد قدم | فارغ از قیدِ ماسوا آمد
سالِ تاریخ او خرد گفت | عمرِ درویش بے بقا آمد

قائلہ و کاتبہ عبد السلام ۹۹۵ھ

پائین قبر میں دوسری لوح سنگ مرمر کی ۸ فٹ لمبی اونچی اور ۲ انچ چوڑی کھڑی ہی جس پر یہ کتبہ ہی:-

ای بی تو گردشِ فلک بے مدا جیف
باشد زمانہ و تو نباشی ہزار جیف

پائین کی لوح کے جوڑ کی ایک تختی سہ دری کے سامنے خالی رکھی ہوئی ہی اس پر بھی یہی شعر کندہ ہی۔ معلوم ہوتا ہی کہ یہ استعمال میں نہیں آئی۔

نواب ضیاء الدولہ کا مزار

قطعۂ تاریخ وفات جو سعد الدین احمد خاں المخاطب نواب ضیاء الدولہ پسر نواب رکن الدولہ امیر کبیر عہد اکبر شاہ[1] کے مزار پر جو اندرون احاطہ ہی کندہ ہی:-

ضیاء الدولہ خطابست و نام سعد الدین (احمد) | اسیر وقت شد از بارگاہ اکبر شاہ
نہم ز ماہ ربیعیہ اولش نامند | بوقت شب ز تماشاے دہر بست نگاہ
ضیاء دولت شاہان ہند رفت ز دہر | بر آمد از دل گیتی شرار شعلۂ آہ
بگفتم از سر جوشِ الم پی تاریخ | کہ باد صدر نشین حریم قرب الہ

۱۲۱۰ھ

سماع خانۂ عالم گیر بادشاہ

اسی کے پاس عالم گیر بادشاہ کا بنایا ہوا دالان در دالان سماع خانہ ہے۔

احاطۂ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

۱۲۸۶ھ

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جہانگیر آباد کے مشہور رئیس اور نامور شاعر تھے جن کا دیوان حال میں اُن کے صاحب زادے نواب محمد اسحاق خاں صاحب نے بڑے اہتمام سے چھپوایا ہی۔ آپ کی قبر پر صرف یہ کتبہ ہی

[1] ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی مراد ہی جن کی وفات ۲۸ جمادی الثانیہ ۱۲۵۳ھ کو ہوئی ہی۔ ۱۲

جُنٰا ھم بما صبروا جنات وحریرا ۱۲۵۶ ہجری"

نواب محمد اسحٰق خاں کی قبر ۱۳۳۷ھ

اسی احاطے میں نواب محمد اسحٰق خاں مرحوم سکریٹری محمڈن کالج علی گڈھ کی قبر ہے۔ جس پر سنگ مرمر کی ایک نہایت بڑی اور شفاف تختی پر بہت خوش خط یہ قطعہ کندہ ہے:۔ کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات جناب نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب رئیس جہانگیر آباد نور اللہ مرقدہ۔

صد حیف و ہزار وا دریغا پنہاں شدہ مہر عالم آرا

ظلمت بہ زمانہ در نظر ہا در آہ و بکا دل و جگر ہا

نواب اسحٰق خان ذوالاحساں ذو القدر و ذو الاقتدار و ذی شاں

دیندار بشکل اہل دنیا دنیا بر ہش طریق عقبیٰ

مصروف بکار قوم ہر دم ذاکر شاغل بقلب پیہم

راس الامرا بجاہ و دولت تاج الفقرا بدل بہ سیرت

سر دفتر صاحبان اقبال سر حلقۂ صوفیان ذوالحال

مدہوش ولائے غوث اعظم مست مئی خواجہ قطب عالم

جانباز شریعت و طریقت فانی فی الذات فی الحقیقت

بگذاشت بجوش دلی جہاں را مردانہ بحق سپرد جاں را

چوں وقت وصال در رسیدہ محبوب الہیش کشیدہ

چوں خدمت خسرو سخن کرد در قرب بہ نزد او وطن کرد

ہر چند بدہا میش قرار است روحش بمدینہ رانہ دار است

اجمیر و نجف مدینہ بغداد کلیر بدعاے اوست دریاد

یا رب بفنائے تو بقا باد چوں اہل فنا بخلد جاں باد

در دل چو اسیر فکر سال است فانی فی الذاتہ وصال است

۱۳۳۷ھ

سلہ حضرت امیر خسرو کی کل تصنیفات کو بڑی تلاش اور جستجو اور خاص اہتمام سے چھپوا رہے تھے جن میں سے چار مثنویاں مع مبسوط اور دلچسپ مقدمات کے علی گڈھ انسٹیٹیوٹ پریس سے شائع بھی ہوچکیں۔ ۱۲

جماعت خانہ یا مسجد درگاہ

سنہ ۷۵۴ھ
۱۳۵۴ء

درگاہ کے احاطے کے سارے کے سارے مغربی رخ پر جماعت خانے کی عمارت ہے جو مسجد کے کام میں لائی جا رہی ہے۔ یہ عمارت غالباً فیروز شاہ تغلق نے سنہ ۷۵۴ھ/۱۳۵۴ء میں بنوائی تھی جو افاغنہ کے عہد کی تعمیرات کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ اسی طرز کی اور بہت سی عمارتیں افاغنہ کے بنائی ہوئی اب بھی دلی میں جا بجا موجود ہیں۔ لیکن اتنا بڑا گنبد اس نواح میں کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ مسجد تمام سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے جو طول و عرض میں ۹۴ فٹ × ۶۴ فٹ اور بلندی میں ۳۶ فٹ ہے اور درمیانی گنبد کی بلندی ملا لو تو بارہ فٹ اونچان اور بڑھ جائے گی۔ دونوں طرف کے بغلی کمرے مسجد کی چھت سے چھ فٹ پست ہیں۔ اس مسجد کے تین درجے ہیں۔ درمیانی درجے کے گنبد کا قطر ۲۵ فٹ ہے اور مشرق سے مغرب تک طول ۴۵ فٹ اور شمال سے جنوب کو بیس فٹ چوڑا ہے۔ یہ برج بزرگ شاہزادہ خضر خاں بن سلطان علاء الدین خلجی نے جو آپ سے بہت عقیدت رکھتا تھا آپ کے روبرو طیار کروایا۔ مسجد کے گنبد پتھر اور چونے کے ہیں اور اندر دار سنگ سرخ لگا ہوا ہے۔ مسجد کے درمیانی حصے میں جانے کا ایک بہت بڑا محراب دار دروازہ ۲۵ فٹ بلند ہے۔ بغلی کمروں کی دو تہائی بلندی تک سنگ سرخ کی جالیاں لگی ہیں جن کے بیچ میں دروازے ہیں۔ مسجد کا صدر دروازہ اپنی وضع میں جداگانہ ہے جس کی طاق نما محراب میں اور دونوں طرف کی محراب دار کھڑکیوں میں جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ جس سے روشنی اور ہوا کا خوب گزر ہوتا ہے۔ صدر دروازے کے پر سورۃ الرحمن کامل خط ثلث میں بہت خوبی سے کندہ ہے۔ جنوبی دریچے کی سیدھی طرف حضرت نظام الدین اولیاء کے وفات کی تاریخ لگی ہوئی ہے:۔

نظام دو گیتی شہ ماہ و طیں — سراج دو عالم شدہ بالیقیں
چو تاریخ نوتش بجستم زغیب — ندا داد ہاتف "شہنشاہ دیں"
۷۲۵ھ

مسجد کے اندر مغربی دیوار میں تین بلند طاق نما محرابیں ہیں۔ درمیانی اور بائیں ہاتھ کی طرف کی محراب سے ملا ہوا منبر ہے۔ محرابوں پر تمام کلام مجید کی آیتیں کندہ ہیں۔ درمیانی گنبد کی چھت میں پتلی زنجیر سے ایک الٹا کٹورا لٹک رہا ہے جسے لوگ سونے

کہتے ہیں۔ سلطان محمد تغلق شاہ نے اپنے زمانِ سلطنت میں دو درجے ادھر اُدھر اور دو دو بُرج اور بنا دیئے جس سے اب مسجد کے پانچ بُرج ہو گئے۔

امام صاحب مسجد خضر خانی حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ العزیز کے سوائے ایک ہمشیرہ صاحبہ کے جن کا اسم شریف بی بی جنت ہے اور کوئی بھائی یا بہن نہ تھے۔ ان ہمشیرہ صاحبہ کے بطن سے ایک صاحب زادے خواجہ سید محمد اور ایک صاحب زادی بی بی رقیہ ہوئیں بی بی رقیہ کی شادی خواجہ سید عبد الصمد صاحب بخاری بدایونی برادر عم زاد حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ کے ساتھ ہوئی اُن کے فرزند ارجمند خواجہ سید ابو بکر مصلی بردار ہوئے اور خواجہ سید محمد صاحب کے فرزند ارجمند خواجہ سید رفیع الدین ہارون تھے۔ سید امین الدین صاحب نظامی رضوی انھیں دو صاحبوں کی اولاد اور فرزندیت کا شرف رکھتے ہیں۔ اس خاندان میں سب سے پہلے خواجہ سید عزیز الملک والدین کو امامت ہوئی۔ جو فرزند ہیں خواجہ سید ابو بکر مصلی بردار کے۔ موجودہ امام صاحب دو بھائی ہیں سید محمد علیم الدین اور سید محمد امین الدین جن کو مناصب قدیمہ آبائی جدی امامت مسجد خضر خانی آستانہ محبوبی و شجرہ خوانی روضۂ نظامی کا افتخار حاصل ہے۔ آپ کا سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت خاتون جنت سے چھتیسویں واسطے پر ہے اور حضرت نظام الدین کی حقیقی ہمشیرہ زادی اور برادر عم زاد یک جدی سے اٹھارواں اور حضرت مصلی بردار سے سولھواں واسطہ ہے۔ ان دونوں صاحبوں کو طرفین سے شرف یک جدی و فخر خواہر زادگی حضرت سلطان المشائخ حاصل ہے۔ یہ دونوں صاحب نہایت بزرگ اور متقی اور پرہیزگار ہیں اور کیوں نہ ہو کہ کس کی آل اولاد ہیں۔ اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں۔

لنگر خانہ درگاہ کے شرقی دروازے کے باہر لنگر خانے کی نہایت پختہ اور قدیم عمارت ہے جس کو خود حضرت محبوب الٰہی نے تعمیر کرایا تھا

درگاہ کی باؤلی سنہ ۷۲۱ھ ۱۳۲۱ء مزار شریف کے احاطے کے باہر شمالی دروازے سے نکل کر ہم ایک دوسرے احاطے میں جا پہنچتے ہیں اور یہیں وہ بہت بڑی باؤلی ہے جو درگاہ شریف کے

نقشہ باولی درگاہ حضرت نظام الدین
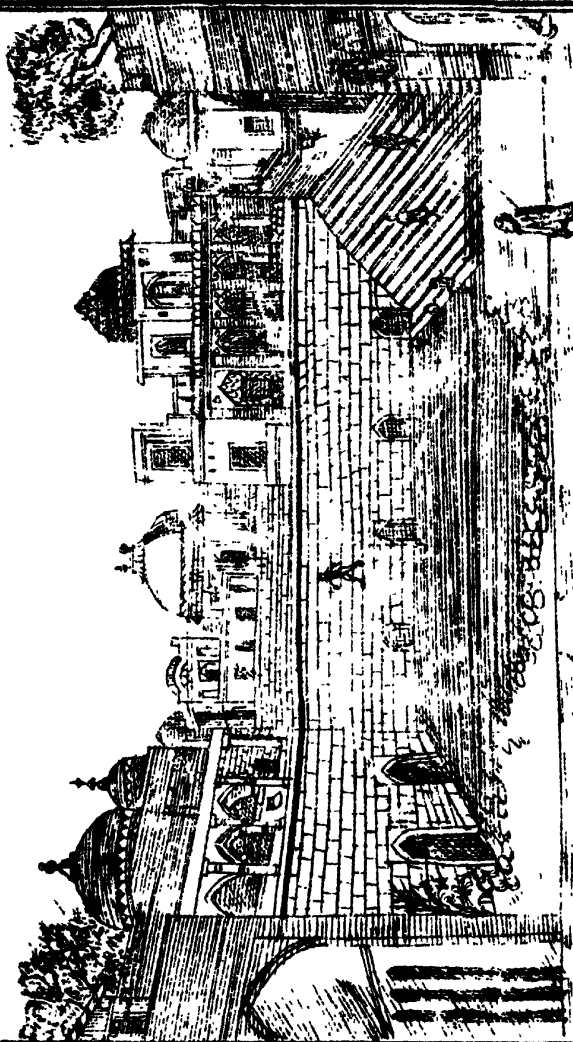
متعلق ہے - اس باؤلی ہی کی تعمیر پر آپ سلطان غیاث الدین تغلق سے ناراض ہو گئے تھے
جس زمانے میں حضرت بغرض آسایش خلق اللہ یہ باؤلی بنوا رہے تھے اسی زمانے میں
بادشاہ بھی قلعہ بنوا رہا تھا - مزدوروں کی قلت تھی - بادشاہ نے مزدوروں کو منع کر دیا
کہ کہیں اور کام کو نہ جائیں - مزدور بے چارے حکم حاکم مرگ مفاجات دن دن میں تو
قلعے کا کام کرتے اور رات کو باؤلی کا کام کرتے - بادشاہ نے جب سنا کہ باؤلی کا
کام بدستور رات کو چل رہا ہے تو طیش میں آ کر تیل بند کر دیا لیکن حضرت کی کرامت سے
پانی تیل کا کام دینے لگا - آپ نے اس کا تذکرہ سید محمود بکار صاحب سے کیا وہ بھی
ایک خام دیوار بنوا رہے تھے یہ سنتے ہی آپ نے دیوار گروا کر زمین کے برابر
کروا دی اور فرمایا کہ "لو ہم نے اس کی سلطنت ہی مٹا دی" - باؤلی کی تعمیر کا کام ۷۲۱ھ ۱۳۲۱ء
میں ختم ہوا اور حضرت نے دعا کی کہ اس کا پانی نفع بخش خلایق ہو چنانچہ اب تک
اس پانی سے لوگ مستفید ہوتے ہیں اور بہت سے خواص اس سے منسوب کیے جاتے
ہیں یہ باؤلی ۱۲۰×۱۸۰ فٹ ہے جس کے چاروں طرف بہت بھاری پختہ دیوار نما بندش
ہے اور شمال کی جانب اترنے کی سیڑھیاں ہیں جو باؤلی کی تہ تک چلی گئی ہیں
سیڑھیاں اس قسم کی ہیں کہ ہر تین چھوٹی سیڑھیوں کے بعد ایک بڑی اور بہت چوڑی
سیڑھی ہے پانی سے عموماً چالیس سیڑھیاں کھلی رہتی ہیں - اور انھیں سیڑھیوں میں سے
ایک سیڑھی پر پتھر کی ایک بہت بڑی چٹان رکھی ہے جس کو "نمازی پتھر" کہتے ہیں اور
یہ خاص نماز پڑھنے ہی کی غرض سے رکھا گیا ہے - باؤلی جب صاف ہوئی تو دیکھا گیا کہ اس
کے اندر چار سوتے ہیں جن کے نیچے چاروں طرف سے سیڑھیاں شروع ہو کر
ایک ہشت پہل سیڑھی پر ختم ہوئی ہیں اور پھر اس کے نیچے سے مدور سیڑھیاں
شروع ہو کر کنوئیں پر ختم ہو گئی ہیں - یہ کنواں آٹھ گز سے آٹھ گز مدور ہے اور تقریباً
اسی قدر گہرا بھی ہے اور باؤلی میں عموماً سولہ سترہ گز پانی رہتا ہے پانی کے اوپر ایک
بہت بڑا طاق ہے اور دو طاق اس سے چھوٹے طاق جنوبی دیوار میں ہیں اور چار چار طاق شرقی اور غربی
دیواروں میں ہیں جن میں بخوبی دو دو آدمی کھڑے ہو کر نہا سکتے ہیں اور ان طاقوں سے
کوئی گز بھر نیچے ایک ڈیڑھ آدھ گز چوڑی چاروں طرف بنی ہوئی ہے جس کے اوپر آدمی
پھر کر باؤلی کے پانی کا بخوبی طواف کر سکتا ہے - یہ باؤلی از سرتا پا سنگ خارا کی عظیم الشان

ڈولیوں سے نہایت مستحکم بنی ہوئی ہی۔ باؤلی کے اطراف مختلف عمارتیں بنی ہیں۔ باؤلی کے جنوب اور مشرق کے رخوں پر تلے اوپر تلے دالان بنے ہوے ہیں جن میں سے درگاہ میں جانے کا رستہ ہی۔ ۱۳۰۷؁ میں محمد معروف پسر وحیدالدین صاحب نے جنوبی دالان بنوایا تھا۔ باؤلی کی کچھ سیڑھیاں اتر کر ایک تنگ رستہ ملتا ہی جو کھلا ہوا ہی کچھ پٹا ہوا جس کو چھتہ کہتے ہیں یہ چھتہ خواجہ معروف نے سلطان فیروز شاہ کے زمانے میں بنوایا تھا ورنہ پہلے مسجد سے باؤلی میں اترنے کا رستہ تھا اور لوگ وضو کے سیئے چلے آتے تھے۔ باؤلی کے جنوبی رخ کی تمامی عمارات فیروز شاہ کے عہد کی بنی ہوئی ہیں جس میں دروے بنے ہوے ہیں اور باؤلی کے اوپر آنے کا رستہ ہی۔ یہاں ایک نہایت بدخط کتبہ بخط عربی یہ ہی:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعہد دولت شاہ معظم	خجستہ خسرو اولاد آدم
مدار دین احمد شاہ فیروز	شہ صاحبقران سلطان اعظم
موفق گشت از حق بندہ معروف	اساس ایں عمارت کرد محکم
جوار روضۂ شیخ المشایخ	نظام الحق والدین قطب عالم
وحیدالدین قریشی والدمن	کہ با اہل ارادت بود ہمدم
بجس اعتقاد و صدق اخلاص	درا سرار ولی اللہ محرم
مرا چوں بردپیش شیخ عالم	بدست خود گرفت و کرد مانم
بلفظ خود مرا معروف خواندہ	دریں عالم چو شیخ عیسوی دم
رجا دارم کز انفاس مبارک	درآں عالم بود معروف پرچم
بخواں تاریخ اتمام عمارت	دریں جا چوں بیائی خیر مقدم
ز ہجرت ہفصد ہشتاد و یک بود	مرتب شد بنا واللہ اعلم

باؤلی پر کی مسجد، برج اور غوطہ زن

اُس باؤلی کی غربی دیوار پر ایک نہایت خوش نما تین در کی مسجد ہی جس کی چھت پر ایک چھوٹا سا برج پٹھانوں کے زمانے کا بطور بالاخانے کے بنا ہوا ہی جس پر

چڑھ کر تیراک غوطہ زن لوگوں سے کچھ پیسے لے کر ساٹھ فیٹ کی بلندی سے کودا کرتے ہیں۔ اتنی بلندی سے کودنا ہر ایک کا کام نہیں ہے وہ لوگ اس کی بہت مشق بہم پونہچاتے ہیں دیکھنے والوں کا سر چکرا جاتا ہے اور دم بخود رہ جاتے ہیں۔

بائی کوکلائی کا راوٹی نما گنبد سنہ ۱۰۸۰ھ

باؤلی کے کنارے بجانب غرب بائی کوکلائی بنت ملایم خان کا ایک راوٹی نما از سر تا پا نہایت نفیس اور شفاف سنگ مرمر کا قابل دید گنبد ہے جس میں بائی کوکلائی کی قبر کا تعویذ نہایت تفصیل سے لاجواب ہے۔ سنگ مرمر کی صفائی ایسی ہو کہ واقعی نگاہ پھسلتی ہے کہتے ہیں کہ ساٹھ ہزار روپیہ کے صرفہ سے یہ چھوٹا سا مقبرہ طیار ہوا تھا جو بلحاظ اس کی لاثانی صنعت و دست کاری کے کچھ غلط اندازہ نہیں معلوم ہوتا۔ واقعی یہ چیز ہی نہایت عجیب و غریب ہے چوکھنڈی کی چھت صندوق نما ہے اور چاروں طرف چار چار در ہیں۔ قبر کے تعویذ کے گرد ننانوے نام باری تعالیٰ ایسے خوش خط کندہ ہیں کہ جس کی تعریف حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ ہر ایک حرف سالم سنگ موسیٰ کا تراش کر اس کو ایسی عمدگی سے پچیکاری کیا ہے اور ایسا ٹھیک جڑا اور پیوست کیا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ تعویذ کے اوپر بسم اللہ شریف اور آیت قل یا عبادی الذین اسرفوا علے انفسہم تا ھو الغفور الرحیم کندہ ہے۔ قبر کے پائین میں یہ قطعہ کندہ ہے:۔

سال تاریخ فوت او جستم | از دل صاف پیر پاک سرشت
آہ سروے کشید و گفت بگو | باد ہمدم بحوریان بہشت
بائی کوکلائی × × × | بنت ملایم خاں سنہ ۱۰۸۰ھ

اسی قبر کے داہنی طرف سطح زمین کے برابر ایک سِل ہلکے پیازی رنگ کے پتھر کی نصب ہے۔ جس پر یہ قطعہ نہایت خوش خط بخط نستعلیق منبت حروف میں کندہ ہے۔ خدا جانے وہ کیسے ہاتھ تھے جو پتھر جیسی سخت چیز پر ایسا لکھتے تھے کہ آج کاغذ پر لکھنا تو درکنار اس کی نقل بھی کوئی نہیں اتار سکتا سچ پوچھیئے تو فی زمانا فن خطاطی رہا ہی نہیں نہ وہ لکھنے والے رہے اور نہ ان کے قدر دان ہی رہے۔

باسمہ سبحانہ

ایں روضۂ خلد آئیں با پنجرۂ موزون | چوں قصر بہشت آمد خوش منزل و ماوائے

تا ہر نظر مردم شد جلوہ گر ایں منزل اہل نظر از ہر سو واند تماشا سے بیٹے
چوں جاے خوشی آمد با اہل خرد گفتم تاریخ بناے او جای و چہ خوش جاییے

چینی کا گنبد باؤلی کے اوپر ایک بہت چھوٹا سا مقبرہ بنا ہوا ہے جس کے اندر تمام چینی کا کام نہایت نفیس اور نازک ہے اس کے نیچے ایک مسجد ہے جو باؤلی کی مسجد کہلاتی ہے۔ معلوم نہیں یہ کس کا گنبد ہے۔ اندرون چاروں طرف بہ خط نستعلیق اشعار لکھے ہوئے تھے جن میں سے مشرق کی طرف کا سارا پلاستر گر گیا۔ شمال کی طرف صرف دو مصرعے رہ گئے ہیں ایک اول کا دوسرا آخر کا۔ بیچ کے تین مصرعے جھڑ گئے صرف ایک لفظ بخندید پڑھا جاتا ہے اور کچھ نہیں۔ ہم بمشکل یہ پڑھ سکتے ہیں۔ ان اشعار سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جواں مرگ مرگیا تھا جس کی وفات حسرت آیات کے غم والم کے اظہار میں یہ اشعار لکھے گئے تھے۔ مشرق سب جھڑ گئے۔ شمال۔ بیا ای کام جاں محرومیم ہیں مصرعہ ۲ و ۳ و ۴ جھڑ گئے

شد دنا دارا وفاداری نہ ایں بود۔

مغرب یہ مصرعہ دوم ہے جس کا مصرعہ اول شمال میں ہے بیابان حسینو . . . . ایں بود
سرا از دل بروں افگندہ رفتی میان خاک و خوں افگندہ رفتی
عجب خارے شکستی در دل من کہ بیروں نا مدالا از گل من
جنوب زدی آتش بجا شاک وجودم ازاں پیچاں رود بر چرخ دودم
بدو دمن سکے نکشادہ دیدہ کہ تو از دیدگاں آتش چکیدہ
ہمی نالید و ہر دم می تپید ہ۔

گو یہ گنبد بہت چھوٹا ہے اور ایک برج کی حیثیت رکھتا ہے لیکن بمصداق ہرچہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر اس کا چپہ چپہ لاجواب نقش و نگار سے بھرا ہوا ہے۔ چھت پر کام اب تک محفوظ ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔ اب اس گنبد کی کس مپرسی کی یہ حالت ہے کہ اس میں میلے کچیلے سقے با فراغت رہتے ہیں۔ اُن کی ہنڈیاں بھنڈو یاں دیوار سے لگی ہوئی جنجی ہوئی ہیں۔ رستی کی الگنیاں باندھ باندھ کر اُن پر ان کی گدڑیاں لٹکی ہوئی ہیں کہ اندر گھستے ہی ایک ایسا بھپکا آتا ہے کہ دماغ چکرا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسی نادر اور تاریخی عمارات کیوں سکونت کے کام میں لائی جاتی ہیں اور کوئی پرساں حال نہیں۔

غیران کی مرمت نہ کرائی جاسکے توکم ازکم ایسے نچلے لوگوں سے خالی کراکے اپنی حالت پران کو چھوڑ دیناہی کافی ہوگا۔ امید کہ محکمۂ آثار قدیمہ کے حکام اس طرف توجہ فرماکر داخل حسنات ہوں گے۔

سیدانیوں کا مقبرہ یہ دراصل **خواجہ فرحت اللہ خاں** رئیس دہلی کا قبرستان ہے۔ اس مقبرے کے اندر صرف دو قبریں ہیں اور باہر بہت سی ہیں۔ (۱) داہنی طرف سنگ سرخ کی ایک قبر ہے جس پر یہ کتبہ ہے:۔

زہرہ آغا بنت امیر تغلق زدنیا رحلت نمود
سنہ نہصد و ہفتاد و یک بود

اس کے گرد حضرت امیر خسروؒ کی وہ غزل کندہ ہے ”ای بدر ماندگی پناہ و ہمہ“ (۲) سنگ مرمر کا تعویذ جس پر بخط نسخ یہ کتبہ ہے:۔

تاریخ وفات مرحومی مغفوری مساۃ فاطمہ بے بے بنت میر یوسف
سنہ نہصد و ہفتاد و پنج کاتبہ حسین نقشے۔

حضرت خواجہ تقی الدین نوح کا مزار درگاہ شریف کے باہر حضرت خواجہ تقی الدین نوحؒ کا مزار ہے جو حضرت نظام الدین اولیاء کی ہمشیرہ حضرت بی بی جنت کے پوتے تھے۔

حضرت سید محمد کرمانی کا مزار یہیں حضرت سید محمد کرمانیؒ کا مزار ایک احاطے کے اندر ہے۔

چبوترہ یارانی کے اور بعض اصحاب ایک احاطے میں ذیل کی تین قبریں ہیں:۔
(۱) مولانا علاء الدین نیلی خلیفۂ حضرت نظام الدین ۷۶۲ھ
(۲) مولانا شمس الدین یحیٰی رح ۷۴۷ھ۔
(۳) مولانا فخر الدین مروزیؒ ۷۳۶ھ۔

درگاہ شریف کے مغرب میں بیرون احاطہ

هو الله العلی

(۱) منشی عالی رتبہ ز دنیا — رفت چو سوے خلد بریں
سال وفاتش احسن گفت — مجمع خوبی شمس الدین
۱۲۶۹

هوالغفار

(۲) شد مغل بیگماں عرب و داخل بخلد
۱۲۷۱

(۳) برلوح سنگ مرمر۔ چوں ستیی بیگم از دنیاے دوں رخت رحلت بست سخت افسوس شد
سال و حالش از سر ۱۲۹۴ ارحق گفت ہاتف داخل فردوس شد

درگاہ شریف کے باہر

(۱) آغا بیگم زوجۂ سید رکن الدین بنت سید حشمت اللہ خاں ابن سید نعمت اللہ خاں ابن سید عزت اللہ خان عرف میر بہکاری ساکن ترکمان دروازہ ابن سید حفیظ اللہ خاں بریلوی ابن محمد حسین بخاری عرف نواب نعمت اللہ خاں شہید نایب صوبہ دار پنجاب سنے بروز شنبہ بتاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ انتقال کیا۔

(۲) هوالباقی

صغری سلطان بیگم از دست اجل در جہاں رفت از جہان بے ثبات
سال پیدایش پدر صغری بگفت ام صغری گفت تاریخ وفات
۱۳۳۲ھ

(۳) بسم اللہ

چو بگذشت از جہاں حافظ سکندر شفاعت کرد قرآں پیش یزداں
بفکر سال رحلت بود طالب بیا حافظ سکندر گفت رضواں
۱۳۳۶

(۴) کل من علیہا فان

اولیں رفت سکندر کہ بحافظ مشہور پس دو مہ پسرش رفت بدنیال آخر
گفت تاریخ دگر طالب محزون از طیب زجہاں حیف جواں رفت محمد ناصر
۱۳۳۰ھ

درگاہ ملک الشعراء حضرت امیر خسرو ۷۲۵ھ

حضرت امیر خسرو کے مختصر حالات ہم یہاں لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں جن صاحبوں کو تفصیلی حالات دیکھنے ہوں وہ انتظار کریں اس مبسوط کتاب کا جو علی گڈھ میں خاص اہتمام سے بہت بڑے پیمانے پر زیر ترتیب ہے چنانچہ اب تک حضرت کی تصنیفات سے چار کتابیں آئینہ سکندری۔ دولرانی خضر خاں۔ مثنوی مجنوں لیلی۔ لآلی عمان موسوم بجواہر خسروی مع بسیط

نقشہ درگاہ حضرت امیر خسرو
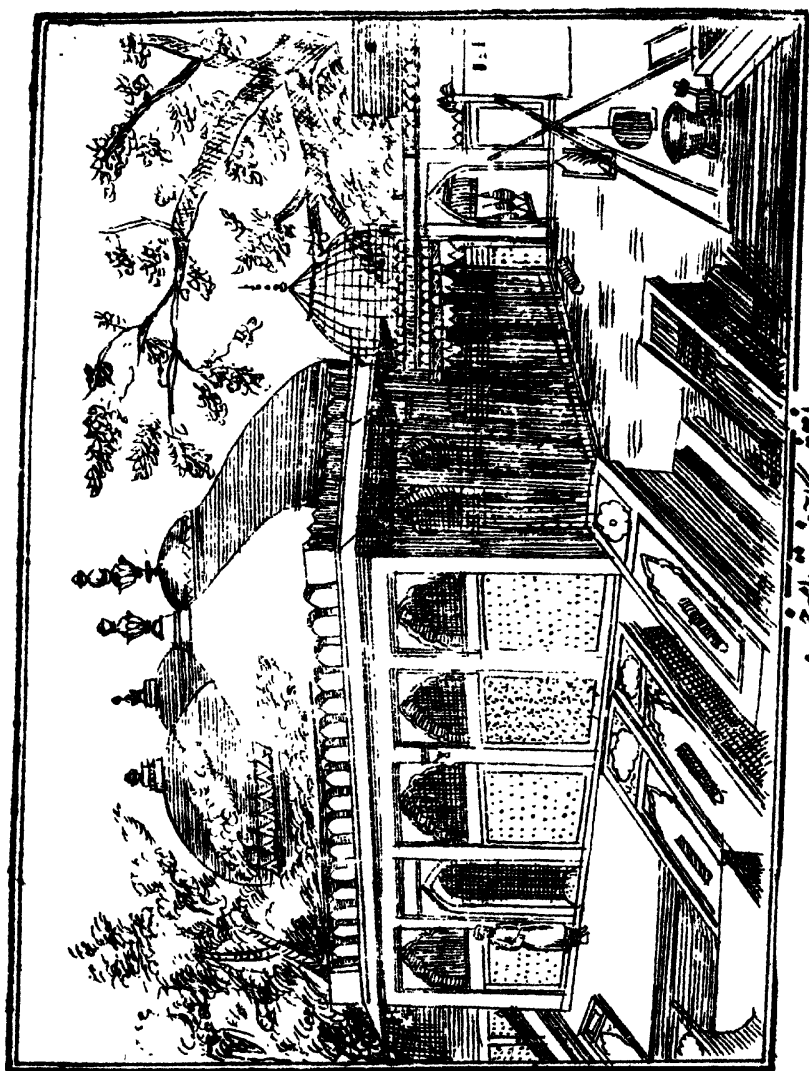
مقدمہ کے نہایت آب تاب سے شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کا نام نامی ابو الحسن یمین الدین تھا خسرو تخلص کرتے تھے آپ کی ولادت گو ہندوستان جنت نشان میں ہوئی مگر آپ ترکی نژاد ہیں آپ کے والد ماجد امیر سیف الدین ترک لاچین محمود۔ سردار قوم ترک ہزارا بلخ ہزارہ کے امیر زادوں میں سے تھے جو چنگیز خاں کے زمانے میں ملک ہندوستان میں آئے۔ اور مومن آباد عرف پٹیالی مضاف بدایوں میں جو گنگا کے کنارے ہے رہتے تھے۔ اسی جگہ میں امیر صاحب پیدا ہوئے اور آپ کے والد ایک کپڑے میں آپ کو لپیٹ کر ایک مجذوب کامل کے پاس لے گئے جو اُن کے پڑوس میں رہتے تھے۔ مجذوب صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا "کہ تم میرے پاس ایسے شخص کو لائے ہو جو خاقانی سے دو قدم آگے ہوگا"۔ امیر صاحب نے دہلی میں پرورش پائی جب آٹھ برس کے ہوئے تو آپ کے والد آپ کو اور آپ کے دونوں بھائیوں عزیز الدین علی شاہ اور حسام الدین کو ساتھ لے کر حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امیر صاحب نے اپنے والد سے پوچھا "کہ آپ مجھے کہاں لیے جاتے ہیں" انھوں نے کہا کہ "میں تم کو حضرت شیخ نظام الدین کا مرید کراؤں گا"۔ امیر صاحب نے کہا کہ مرید ہونے کے واسطے شیخ کا پسند کرنا میرا فعل ہے نہ کہ آپ کا۔ باپ یہ جواب سن کر اندر چلے گئے اور امیر صاحب نے دروازے پر بیٹھے بیٹھے یہ رباعی کہی اور دل میں کہا کہ اگر حضرت شیخ کامل ہیں تو میری اس رباعی کا جواب دیں گے اور مجھے اندر بلوائیں گے۔

رباعی

تو آں شاہی کہ برایوان قصرت
کبوتر گر نشیند باز گردد

غریبے مستمندے بدر آمد
بیاید اندروں یا باز گردد

حضرت محبوب الٰہی کو کشف سے امیر کا حال معلوم ہو گیا۔ اسی وقت خادم سے فرمایا۔ "دیکھو۔ دروازے پر ایک لڑکا بیٹھا ہے تم اس کے پاس جا کر یہ رباعی پڑھ دو"۔

رباعی

بیاید اندروں مرد حقیقت
کہ با ما یک نفس ہم راز گردد

اگر ابلہ بود آں مرد ناداں
ازاں راہے کہ آمد باز گردد

آپ اندر گئے اور تینوں بھائی حضرت کے مرید ہوئے۔ امیر کے والد کی عمر اس وقت

پچاس برس کی تھی۔ ایک سال بعد آپ کفار کے ہاتھوں سے شہید ہوئے جب امیر کی عمر نو سال کی تھی۔ انھوں نے باپ کا ایک نہایت درد انگیز مرثیہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے :۔

سیف از سرم گزشت دل من دو نیم شد ۔ دریاے خوں رواں شد و دریتیم شد

امیر کے نانا عماد الملک اولیاے کرام و اعیان عصر میں سے تھے انھوں ہی نے ان کی پرورش کی اور ایک سو تیرہ سال کی عمر میں قضا کی۔ اگرچہ امیر خسرو کا زیادہ وقت امرا اور بادشاہوں کی صحبت میں گزرا تھا اور انھیں کے ندیم و مصاحب تھے مگر دلی رجحان بزرگان دین۔ علما اور فضلا کی طرف تھا اور ان کے ہم نشین اور ہم صحبت تھے اور تصوف کی چوٹ دل پر لگی ہوئی تھی اور اسی سبب سے سلطان المشائخ کے بڑے مورد عنایت اور یار وفادار اور محرم اسرار تھے۔ حضرت کی ذات بابرکات سے ایسی خالص عقیدت اور پاک اعتقاد تھا کہ دنیا میں اس کی نظیر ملنی ناممکن ہے چنانچہ حضرت یہ شعر آپ کے لیے فرمایا کرتے تھے۔

گر برائے ترک تو کم اترہ تارک نہند ۔ ترک تارک گیرم و ہرگز نگیرم ترکِ ترک

اگرچہ تمام عمر بادشاہوں اور امرا کی خدمت میں رہے اور سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور بڑے عزت و احترام سے بسر کی لیکن اس عالم امارت میں بھی آپ کو اپنے پیر کا زحد پاس ادب تھا اور ہمیشہ ریاضات و مجاہدات میں مشغول رہتے تھے۔ اور طریقہ اہل تصوف آپ کی صورت اور سیرت سے ہویدا تھا دن دربار اور دنیا کے کاروبار میں بسر کرتے اور رات جناب شیخ کی خدمت میں گزارتے ۔

مرا د اہل طریقت لباس ظاہر نیست ۔ کمر بخدمت سلطاں ببند و صوفی باش

غرض جس قدر شفقت و عنایت حضرت محبوب الٰہی کی امیر صاحب کے حال پر تھی کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔ سلطان المشائخ اکثر ان کو "ترک اللہ" کہہ کر پکارتے تھے جیساکہ خسرو کے ان اشعار سے ظاہر ہے :۔

بہ نہ بانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ نیست ۔ دست ترک اللہ بگیر و ہم باللہش سپار

چوں من مسکیں ترا دارم ہمینم بس بود ۔ شیخ من بس مہرباں دفالقم آمرزگار

چوں کہ امیر صاحب حسن لطافت بیان اور فن موسیقی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اس لیے

بعض اوقات حضرت آپ کو ترک اللہ کے سوا مفتاح السماع کہہ کر پکارا کرتے تھے امیر صاحب
شب زندہ دار تہجد گزار تھے اور شب میں سات پارے کلام مجید کی تلاوت کرتے
تھے۔ چالیس برس صائم الدھر رہے۔ شیخ کے ساتھ ہی پاپیادہ حج بھی کیا۔ سفینۃ الاولیاء
میں لکھا ہے کہ آپ کے دل میں ایسا سوز و گداز تھا کہ ہمیشہ پیراہن مقام قلب پر جلا ہوا
رہتا تھا۔ حضرت کی خاص توجہ آپ پر تھی اور مورد عنایات خاص تھے۔ حضرت بارہا فرمایا
کرتے تھے "اے ترک اللہ! میں اپنے وجود سے رنجیدہ ہوتا ہوں لیکن تم سے نہیں"
ایک مرتبہ امیر صاحب سے حضرت خواجہ خضر سے ملاقات ہوگئی امیر صاحب نے
لعاب دہن کی خواہش کی۔ حضرت نے فرمایا یہ دولت سعدی شیرازی کے حصے کی تھی
امیر نے یہ بات حضرت سے عرض کی آپ نے اپنا لعاب دہن دیا۔ تو امیر صاحب نے یہ شعر پڑھا

زلفت زہر دو جانب خوں ریز عاشقاں است — چیزے نمی تواں گفت روئے تو در میان است

یہ اسی کی برکت ہے کہ آپ نے طوطی شکر مقال و طوطی ہند کا لقب پایا اور اپنے زمانے
کے بے نظیر عالم و فاضل اور استاد مانے جاتے تھے۔ سو کتابوں سے اوپر اوپر تو
آپ کی تصانیف ہیں اور کوئی پانچ لاکھ اشعار آپ کی زبان سے نکلے ہیں۔ آپ کا
کلام مقبول انام ہے۔ خالق باری جو بچوں کو پڑھائی جاتی ہے اور جو نصاب خسرو کے
نام سے مشہور ہے آپ ہی کی تصنیف ہے۔ شعر گوئی پر آپ کو ایسی قدرت کاملہ تھی
کہ مثنوی مطلع الانوار جو مثنوی مخزن الاسرار مثنوی شیخ نظامی گنجوی کے جواب میں
لکھی ہے دو ہفتے میں تمام کی۔ آپ بڑے بڑے استادوں پر تعریض کر بیٹھتے تھے
لیکن حضرت ہمیشہ آپ کو منع کیا کرتے تھے کہ کسی پر اعتراض کرنا یا طعن و تشنیع بھی
بات نہیں تم کو نہ چاہیئے۔ امیر صاحب نے جب حضرت نظامی علیہ الرحمہ کے خمسہ کا
جواب لکھا تو حضرت نے آپ کو ڈرایا کہ تم نے بہت برا کیا کہ ایک بزرگ کا جواب لکھا آپ نے کہا کہ میں تو آپ کی
پناہ میں ہوں مجھے کسی کا کیا ڈر۔ اتفاقاً اسی خمسے کی ایک بیت کے جواب میں جب یہ بیت کہی۔

کوکبۂ خسرویم شد بلند — غلغلہ در گور نظامی فگند

تو فوراً ایک شمشیر برہنہ نمودار ہوئی۔ امیر خسرو ڈر گئے اور اسی وقت حضرت
سلطان المشائخ اور شیخ فرید گنج شکر کو یاد کیا۔ وہیں ایک ہاتھ ظاہر ہوا جس نے تلوار کے وار کو
اپنے اوپر جھیل لیا۔ تلوار آستین کاٹتی ہوئی ایک درخت پر جا پڑی۔ خسرو کھبرا اٹھے۔

حضرت کے پاس آئے اور چاہتے تھے کہ یہ ماجرا بیان کریں کہ آپ نے پہلے ہی اپنی کٹی ہوئی آستین دکھا دی۔ خسرو قدموں پر گر پڑے۔ حضرت نے فرمایا۔

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خواست ملکیت ملک سخن از خسرو ماست

این خسرو ما ناصر خسرو نیست زیرا کہ خدا ناصر خسرو ماست

اگرچہ آپ کا زمانہ بیت کر قریب قریب ساڑھے چار سو برس ہوئے مگر آج تک آپ کے ہزاروں اشعار لوگوں کی زبان پر جاری ہوئے ہیں آپ کے کلام میں نظام نے کچھ ایسا خداداد رجوع مقبولیت عام حاصل کیا ہے کہ سیکڑوں کسی کے کلام کو آج تک نہیں ملا۔ اتنا دور زمانہ آپ کی شہرت کو نہ مٹا سکا ایسے ہی لوگ صفحۂ دنیا پر لافانی کہلائے جا سکتے ہیں کہ آج بھی لاکھوں آدمیوں کی زبان پر آپ کا کلام اور ان کے دلوں میں آپ کی عزت و احترام ہے۔ امیر خسرو جان سے اپنے مرشد پر فدا تھے۔ ایک مرتبہ ایک سائل حضرت سلطان المشائخ کے پاس آیا۔ اتفاق سے اس وقت حضرت کے پاس کچھ نہ تھا دوسرے تیسرے دن بھی اتفاق سے کچھ نہ آیا آخر کار آپ نے اپنی جوتیاں اُسے دے دیں وہ خوشی سے کر چلتا ہوا۔ رستے میں امیر خسرو ملے جو کسی مہم سے واپس آرہے تھے۔ آپ چھوٹتے ہی شیخ کی خیریت دریافت کی اور کہا اے یار تجھ میں سے مجھے پیر روشن ضمیر کی بو آتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کوئی تبرک تیرے پاس ہے فقیر نے کہا ہاں نعلین مبارک میرے پاس ہیں۔ امیر نے پانچ لاکھ اشرفیاں دے کر نعلین کو لے لیا اور سر پر رکھ کر شیخ کے روبرو حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے یہ جوتیاں پانچ لاکھ اشرفیاں میں خریدی ہیں؟۔ امیر نے کہا فقیر نے جو مانگا میں نے بے تکلف دے دیا۔ اگر وہ میری جان اور سارا مال بھی مانگتا تو میں بے دریغ دے دیتا۔ ایک مرتبہ آپ نے شیخ سے التماس کیا کہ میں نہیں چاہتا کہ قیامت کے دن مجھے خسرو کے نام سے پکاریں کیونکہ یہ متکبروں کا نام ہے۔ آپ نے فرمایا قیامت میں تمھیں محمد کاسہ لیس کہہ کر پکاریں گے۔ ایک مرتبہ امیر خسرو نے شیخ سے عرض کی کہ میری خواہش ہے کہ دنیا میں آپ کے بعد نہ رہوں اور میری قبر آپ کے پہلو میں ہو۔ جب شیخ کی وفات کا زمانہ قریب آیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ خسرو میرے بعد دنیا میں کم رہے گا جب مرے تو میرے پہلو میں دفن کرنا کہ وہ میرا محرم راز ہے۔

میں سب سے اس کے بہشت میں قدم نہ رکھوں گا۔ اگر یہ جائز ہوتا کہ دو شخص ایک قبر میں
دفن ہوں تو میں وصیت کر جاتا کہ خسرو کو میری قبر میں دفن کرنا تاکہ ہم دونوں ایک جگہ رہیں۔
پہلے آپ سلطان بلبن کے زمانے میں (۶۸۰ھ ـ ۶۸۶ھ) میں شاہزادے کے جو
ملتان کا گورنر تھا مصاحب مقرر ہوئے۔ جب خاندان خلجیہ کا عروج ہوا تو سلطان
جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے (۶۸۹ھ ـ ۶۹۵ھ) آپ کو زمرۂ امرائے دربار میں منسلک کیا
اور آپ کا مرتبہ اور اعتماد سلاطین مابعد کے زمانے میں یوماً فیوماً بڑھتا ہی گیا اور یہی
حال تغلق خاندان کے زمانے میں رہا۔ اگرچہ سلطان غیاث الدین تغلق اور حضرت
نظام الدین اولیاء سے کشیدگی تھی اور وہ خاندان چشتیہ کا مخالف تھا لیکن امیر خسرو کے
ساتھ وہی عزت اور احترام کا تعلق رہا۔ روز بروز جاگیرات و مناصب میں اضافہ ہی
ہوتا رہا۔ جب محمد شاہ تخت دہلی پر بیٹھا تو امیر خسرو کا نیر اقبال اور بھی چمک گیا۔
بادشاہ آپ کا از حد گرویدہ تھا اور آپ کو کتب خانۂ شاہی پر مقرر کیا اور جب بنگالے
کے سفر کو گیا تو آپ کو بھی اپنی مصاحبت میں لے گیا جس وقت حضرت شیخ کا وصال ہوا
امیر خسرو بادشاہ کے ساتھ لکھنوتی میں تھے۔ خبر سنتے ہی اس صدمۂ جانکاہ سے
آپ کی کمر ٹوٹ گئی سارا مال و اسباب راہ خدا میں لٹا دیا اور شاہی ملازمت چھوڑ کر افتاں
و خیزاں دلی پہنچے اور مزار شریف پر پہنچ کر بہت روئے اور ہندی کا یہ دوہا پڑھا

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس　　چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہوں دیس

دہلی میں سب نے آپ کی تسلی تشفی کی خصوصاً حضرت نصیر الدین چراغ دہلی نے لیکن آپ کی بے قراری
بڑھتی ہی گئی اور خبر وفات سنتے ہی سیاہ لباس پہن لیا اور برابر چھ مہینے تک قبر کے
پائیں بیٹھ کر ۲۰ ذی قعدہ ۷۲۵ھ (۱۳۲۴ء) روز جمعہ اور بروایتے ۱۸ شوال سنہ الیہ جمعہ کی
رات چوہتر سال کی عمر میں اس دار المحن سے دار السرور کو کوچ فرمایا۔

قطعۂ تاریخ وفات

خسرو دہلوی بحکم خدا　　بشب جمعہ شد در دار فنا
عمر ہفتاد و پنج سالش بود　　کانزماں شد بدرگہ معبود
ہیجدہم بود از مہ شوال　　کہ گزشتہ ازیں جہان ملال
سال ترحیل افصح الشعراء　　گفت ہاتف "بہشتی اعلیٰ" ۷۲۵ھ

کتاب مخزن الواصلین میں یہ شعر یوں لکھا ہے: سال ترحیل او ز من بشنو ۔ ثانی ہمانا ز خسرو ۷۲۵

انتقال کے بعد حسب وصیت شیخ آپ کو شیخ کے پہلو میں دفن کرنا چاہا کیوں کہ آپ نے اپنی داہنی طرف جگہ بھی چھوڑ رکھی تھی لیکن آداب ولایت کے خلاف سمجھ کر ایک خواجہ سرا مانع ہوا کہ دونوں قبریں برابر برابر ہونے میں زائرین کو مغالطہ ہوگا لہذا آپ ہی کے جوار میں احاطۂ درگاہ شریف کے اندر چند قدم کے فاصلے سے چبوترۂ یارانی پر جہاں حضرت نظام الدین اپنے ارباب حلقے سے بیشتر گفتگو فرمایا کرتے تھے آپ کو آسودہ کیا چوں کہ یہ امر خلاف وصیت حضرت سلطان المشائخ ہوا تھا وہ خواجہ سرا بھی چند روز کے بعد پلنگ پر سویا کا سویا رہ گیا۔

درمیانی دروازہ ۱۰۷۱ھ حضرت سلطان المشائخ اور حضرت امیر خسرو کی درگاہوں کے درمیان جو دروازہ ہے وہ درمیانی دروازہ کہلاتا ہے۔ اس دروازے کو سفیدی کی تہ چڑھا چڑھا کر خراب کر دیا گیا۔ اس کے رُوکار پر کچھ اشعار معلوم دیتے تھے جن کو کھرچوانے اور صاف کرانے سے یہ قطعہ تاریخ نکلا جس پر پہلے کسی کی نظر نہیں پڑی یہ قطعہ عربی خط میں ہے۔

قطعہ

یا عزیز

بدورِ سعد ابو العدل شاہ عالمگیر | بنا ساخت جواہر دُرے برائے ثواب
بہ ہوشیار علی خان مژدہ ہاتف داد | کشادہ باب کرم مفتح الابواب

۱۰۷۱ حسبہٗ [illegible]

حضرت امیر خسرو کی درگاہ کے احاطے کا طول (۱۱۱) اور عرض (۱۵) ہے جس میں سنگ سرخ کا فرش ہے۔ قبہ راؤٹی نما ہے اور گرداگرد گنبد کی جالیوں کا ایک محجر ہے جس کے اندر صرف حضرت امیر خسرو کا مزار ہے ہر ہر جالی پر دو دو مصرعے کندہ ہیں جن میں چونا بھر جانے سے بالکل سفیدی کے اندر چھپ گئے تھے اب بڑی مشکل سے کھرچ کھرچ کر نکالے ہیں جب بھی برابر پڑھے نہیں جاتے بہر حال بہ وقت جو کچھ پڑھا گیا پیش ہے۔ پہلے کسی کو یہ خبر بھی نہ تھی کہ ان جالیوں پر اشعار کندہ ہیں:۔

نظم

شہ ملک سخن خسرو پیر و سالار درویشان | کہ نامش ہست بر لوح جہان چوں نقش دو خارا
چناں در صورت خوبی سخن پرداز شد طبعش | کہ زیبی داد ازاں صورت بخوبی لوح ہستی را
شدہ غواص دریائے تفکر وز محیط فضل | برون آورد دریائے معانی را ازاں دریا

ابسال پنج تریخ و ہفصد از ہجرت حضرت | زدار الملک دنیا کرد رحلت جانب عقبا
بشد ساطے مرغ روحش سدرہ ما وا شد | ندا ے ارجعی چوں در رسید از عالم بالا
گذشتہ بود سی وہشت و نہصد سال ازہجرت | بدوران ہمایوں بادشاہ غازی داتا
شہنشاہی کہ می شاید اگر گو بیاں دائم | دعای دولتش گویند نزد ربی الاعلے
رفیع القدر صاحبد ولتی پاکی کہ در عالم | تہہ دست دنیا شد مثل ارہے مثل بے ہمتا
خدایا تا جہاں باشد بدولت باشد و بادش | خداوند جہاں یار و معین و ناصر الاعدا

قبر اور اُس کا چوبی کٹہرا ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء میں بعہد بابر بادشاہ سید مہدی سے بنوایا اور قبر کے سرہنے کی طرف روضے سے باہر سنگ مرمر کی ایک تختی آٹھ فٹ اونچی اور ایک فٹ چوڑی بنوا کر منبت حروف میں کتبہ لکھوایا :-

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

زمیں را ازیں لوح شد سرفرازی | بدوراں بابر شہنشاہ و غازی
میر خسرو خسرو ملک سخن[1] | آں محیط فضل دریاے کمال
نثر او دلکش تر از ماء معیں | نظم او صافی تر از آب زلال
بلبل بستاں سراے بے قریں | طوطی شکر مقال بے مثال
از پی تاریخ سال فوت او | چوں نہادم سر بزانوے خیال
شد عدیم المثل یک تاریخ او | دیگرے شد طوطی شکر مقال

زحرف وصل جاناں سادہ آمد لوح خاک من | طریق سادہ لوحی بس نشان عشق پاک من
مہدی خواجہ سید با جاہ و جلال | شد بانی ایں اساس بے شبہ و مثال
گفتم سی جمیل مہدی خواجہ | تاریخ بنا ے او چو گردید سوال

حررہ شہاب الدین المعمائی الہروی

قبر جس پر ہمیشہ مغرق غلاف پڑا رہتا ہی آٹھ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی اور ایک فٹ اونچی ہی۔ آپ کی قبر کے پائین میں میرزا عمدۃ اکرام آپ کے بھانجے کی قبر ہی اور "اکرام بیاسود بپاے خسرو" سے تاریخ وفات نکلتی ہی۔ اس احاطے میں اور

[1] یہ قطعہ مولانا غلام علی پدر محمد قاسم فرشتہ کا ہی۔ ۱۲

بہت سے بزرگان وہیں آرام کرتے ہیں جن میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں اور یہ لوگ یاران چبوترہ کہلاتے ہیں :- خواجہ شمس الدین ماہ رو آپ کے بھانجے خواجہ اقبال - خواجہ مبشر خواجہ نورالدین مبارک خواجہ مبارک گوپاموی مولنا ضیاءالدین برنی - خواجہ عزیزالدین - خواجہ قاضی خواجہ سید عمر - خواجہ مولنا قاسم - خواجہ مولنا کمال الدین خواجہ عبدالرحیم عرف خواجہ عبدالرحمن - امیر حاجی پسر امیر خسرو - سید ابراہیم ایرجی - حضرت شیخ بہاءالدین قادری وغیرہ رحمتہ اللہ علیہم اس کے علاوہ اور بھی یہ قبریں ہیں (۱) مولنا غلام فرید خلیفہ حضرت مولنا فخرالدین (۲) خواجہ محب علی بن مولنا محمد سنہ ۸۹ ھ دسنہ صاف نہیں ہے نقطہ کو خواہ سنہ کا نقطہ پڑھو یا سنہ کے اعداد کا سمجھو تو سنہ ۹۰۸ھ پڑھو - (۳) وفات خواجہ عطار اسعد ابن خواجہ میر احمد یزدی شہر ربیع الآخر سنہ نہصد شصت وہفت - (۴) دارالخان بہادر ابن دارالخان مرحوم نبی مختار الحسینی شب جمعہ تاریخ بست وہفتم شہر شوال سنہ ۱۱۲۲ھ برحمت حق پیوست - (۵) نواب لشکر بہادر خاں درروز عاشورہ سنہ نہصد وہشتاد ودو بود کہ شہادت یافت - (۶) وفات مرحومہ سلیمہ سلطان بنت امیر شہاب حاجی در تاریخ پنج شہر محرم الحرام سنہ نہصد وشصت وہشت - (۷) کلمہ طیبہ - وفات شہید مخدوم خاں ولد محمد خاں بتاریخ بست ودویم رمضان سنہ ۱۱۸۶ھ متوطن احمد نگر - (۸) این مزار حاجی وزیر خاں ... نمک فی ۱۷۱۹ (۹) حضرت حاجی لعل محمد رحمتہ اللہ علیہ خلیفہ خاص مولنا فخرالدین دہلوی جن کا وصال ۱۷ رمضان المبارک سنہ ۱۲۴۳ھ کو ہوا - آپ کے مزار پر سنگ مرمر کا حجرہ اور گنبد سنہ ۱۰۱۴ھ میں بعہد نورالدین جہانگیر بادشاہ طاہر محمد عماد الدین حسن نے بنوایا تھا تاریخ بنا مقبرے کے اندر سنگ سرخ کی جالیوں کے اوپر حسب ذیل کندہ ہے:-

ای شربت عاشقی بجامت	وز دوستی مال اہایت
شد سلک فرید از تو منظوم	زانست کہ شد لقب نظامت
جاوید بقاست بندہ خسرو	چوں شد بہزار جاں غلامت
ای خسرو بے نظیر عالم	باروضۂ تو سرانیاز ست
تعمیر نمود طاہراں را	فیض ازلی ہمیشہ باز ست
تاریخ بناش عقل گفتا	باروضہ بگو کہ جائے راز ست

قائل این کلام و بانی این مقام طاہر محمد عماد الدین حسن ابن سلطان علی سبزواری کی سنہ ۱۰۰
غفر ذنوبہ و ستر عیوبہ الکاتب عبدالنبو ن ایوب

مرا نام نیک است و خواجہ عظیم | دو شین و دو دال و و قاف و دو جیم
اگر نام یابی تو زین حرفہا | بدانم کہ ہستی تو مرد فہیم

کاتب مذکورہ نبیرۂ شیخ شکر گنج

کتبہ در طاق

اللہ اللہ

نور الدین محمد

بدور شہنشاہ عالم پناہ ابو المظفر
بادشاہ عادل جہانگیر غازی خلد اللہ
ملکہ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ
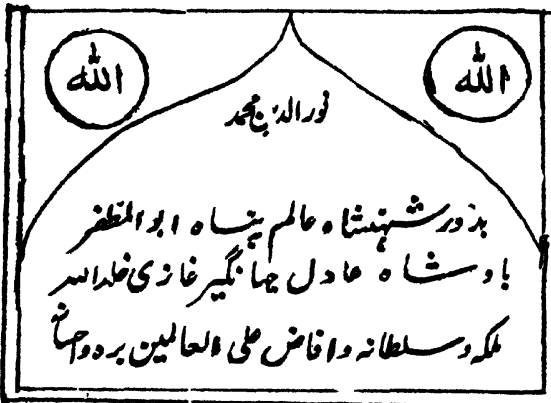
مقبرے کا بیرونی حصہ تیس فٹ لمبا اور بائیس فٹ چوڑا ہے۔ اندرونی حجرہ ۱۵×۱۲ فٹ ہے۔ چاروں طرف سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں صرف بیچ کی کھڑکی کی جگہ شمال کی طرف ایک تختی سنگ مرمر کی لگی ہوئی ہے۔ جنوبی دیوار کے وسط میں دروازہ ہے جو ۵ فٹ بلند اور تین فٹ چوڑا ہے۔ اس میں جو کواڑوں کی جوڑی چڑھی ہوئی ہے اس میں پیتل کے پتر جڑے ہوئے ہیں اور ان پتروں پر ذیل کے اشعار نہایت بدخط ناموزوں اور غلط کھدے ہوئے ہیں جن کو ہم نے بجنسہ نقل کر دیا ہے:-

زہی عز و شرف گر کیجیے مقبول | امیر خسرو کی مقبول یزداں
مراد دل ملے اور دل ہو تنویر | چڑھایا نذر جوڑی میاں خاں

سلہ اس معمے کا حل یہ ہے یعنی ش ش - ل ل - ق ق - ج ج = کے اعداد اور یغ سیب ریب کے اعداد دونوں برابر ہیں جو ۸۶۹ ہوتے ہیں۔

قطع تاریخ

نہ کیوں تاثیر ہوا ور فیض پائے ہیں سرکار نظام الدین کے مختار

مقدم

امیر خسرو کی یاد ہیں ایسے کہ ان کا ور د جنت ہی اظہار

غریب و بندۂ مسکین میاں جاں[۱] محب و خادم الفقرا وفا دار

بسنعت اوسنے باب پہ تنویر کیا سن باراں سو اسی میں نیار

۱۲۸۰ھ

خسرو کی چھت پختہ ہی جس کے دونوں سروں پر پختہ بیان ہیں۔ حضرت امیر خسرو کے مزار کا بڑا اہتمام اب تک ہی اور نذر و نیاز برابر چڑھتی رہتی ہی قمر بن .. مرادوں والے کثرت سے آتے ہیں۔ ۱۷ شوال کو بہت دھوم دھام سے آپ کا عرس ہوتا ہی اور بسنت کی تیسری تاریخ ایک بہت بھاری میلا لگتا ہی جس میں بڑی کثرت سے لوگ جمع ہوتے ہیں جو سترھویں کا میلا یہ پھول والوں کی سیر میلا ہی۔

نواب خاندوراں خاں کی مسجد

حضرت امیر خسرو کی درگاہ کے پاس ہی نواب خاندوراں خاں کی تین در کی نہایت مختصر اور نہایت ہی خوش نما مسجد سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہی جس کی چھت لداؤ کی ہی اور اندر تمام رنگ آمیزی کا بہت نفیس کام ہی۔ غرض یہ کہ گو مسجد چھوٹی سی ہی لیکن با ایں ہمہ بہت کچھ کاریگری کھلائی گئی ہی۔ مختصر سا صحن ہی اور صحن میں ایک زنانی قبر ہی جو خاندوراں خاں کی بہن کی کہلاتی ہی۔ مسجد کے کونے میں ایک کنواں بھی ہی جس میں درگاہ شریف کے پھول ڈالے جاتے ہیں۔

بیرون مسجد شہدا کی قبور

ساری درگاہ کا چپہ چپہ قبروں سے پٹا پڑا ہی ایک انچہ زمین بھی خالی نہیں ہی۔ اس مسجد کے جنوب رخ دروازے کے باہر دروازے سے ملی ہوئی چند بہت پرانی قبریں شہدا کی ہیں جن پر کے کتبے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں :-

(۱) مرحومی مغفوری مرزا جعفر شہید شمسا باد۔

[۱] اسی طرح لکھا ہی۔ ۱۲

(۲) چوں کرو ملا دیں محمد نقل | از دار فنا جانب فردوس شتافت
تاریخ وفاتش ہمہ کس می جستند | عقلم بچناں رفت علاءالدیں یافت

(۳) در سنہ نہصد ہفتاد و پنج مرحومے محمد امین سلطان در چتور شہید شدہ

(۴) نوجواں رفت چو از دہر (۱) | قامت پیر فلک گشت اندوہ ...
وہ کہ شد ماہ رخش در دل تہ خاک نہاں | ماند تا روز جزا حسرت دیدار بما ند
سال تاریخ وفاتش ز خرد می جستم | آہ صد حیف ازاں یوسف ثانی لقا

ان چار قبروں کے سوا اور دو پرانی قبریں بھی سنگ سرخ کی ہیں اور اُن پر کتبے بھی تھے مگر لال پتھر کو لونی جلد لگ جاتی ہے اس وجہ سے بالکل جھڑ گئے صرف کتبہ کا نشان ہی نشان رہ گیا۔

باقیات الصالحات

حضرت امیر خورد نے جو حضرت محبوب الٰہی کے زمانے میں ایک بزرگ تھے سیر الاولیاء کے نام سے ایک تذکرہ لکھا ہے اس میں حضرت محبوب الٰہی کے حالات بھی نہایت معتبر طریقے پر مبالغے سے پاک مورخانہ شان سے لکھے ہیں۔ فی زمانہ درگاہ شریف میں چار خاندان ہیں اور اُنھیں خاندانوں کا عمل دخل درگاہ کے جملہ امور میں ہے۔ (۱) نبیرہ گان۔ (۲) ہارونی (۳) ہندوستانی۔ (۴) قاضی زادے۔

فریق اول حضرت خواجہ سید محمد امام کی اولاد میں ہیں جو حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے نواسے تھے اور حضرت محبوب الٰہی نے اُن کو اپنے پیرزادے کی حیثیت میں بطور فرزند معنوی پرورش کیا تھا اور اپنی زندگی میں ایسے امتیازات اُن کو دیئے تھے جو کسی دوسرے قرابت دار یا خلیفہ کو حاصل نہ تھے مثلاً یہ کہ وہ تمام خلفا اور اقربا سے بالاتر اور حضرت محبوب الٰہی کے برابر بٹھائے جاتے تھے اور حضرت محبوب الٰہی اپنے سامنے لوگوں کو ان کا مرید کراتے تھے اور اپنی موجودگی میں ان کو سماع کا میر مجلس بناتے تھے اور نماز میں امام بھی انھیں کو کرتے تھے۔ آج کل خواجہ سید امام صاحب کی اولاد میں ساٹھ کے قریب آدمی ہیں۔

سید خواجہ حسن نظامی کا ذکر

اور سید خواجہ حسن نظامی بھی انھیں میں کے ایک برگزیدہ بزرگ ہیں جو علاوہ اپنی خاندانی اور نسبی عظمت کے

اپنی ذات سے بھی بڑے نیک نفس اور منکسر المزاج ۔ متواضع ۔ خلیق اور ملنسار ہیں۔ چوں کہ وہ صوم و صلوۃ اور شرع کی سختی سے پابند ہیں اُن کی نو عمری اُن کے تقدس میں حائل نہیں ۔ دہلی میں کم اور باہر کاٹھیاواڑ گجرات بمبئی اور حیدر آباد و سندھ و دکن کی طرف بہت سے لوگ اُن کے معتقد اور مرید ہیں۔ اس طبقے میں وہ ایک غیر معمولی دل و دماغ کے شخص ہیں ۔ دیکھنے میں وہ ایسے کچھ زیادہ ذکی نہیں معلوم ہوتے مگر اُن کے قلم میں ایک خداداد مسمرک پڑ تر ہے جو لوگوں کے دلی جذبات کو اُبھارتی ہے۔ اُن کی تحریر تصنع سے اور عبارت آرائی کی قید سے آزاد ہے۔ ایسا معلوم دیتا ہے کہ قلم کے بدلے زبان صفحۂ کاغذ پر رواں ہے اور زبان بھی پاک صاف اور ستھری آسان اور سلیس اور بامحاورہ دلی کی مستند اردو جس میں شوخی اور ظرافت تہذیب کی چاشنی کے ساتھ ہے وہ ایسی اردو لکھتے ہیں کہ کم استعداد عورتیں اور بچے ۔ ذی استعداد نوجوان اور بڑے بوڑھے تجربہ کار اہل قلم اور صاحب تصنیف اُس سے یکساں مستفید ہوتے اور دلی شوق سے پڑھتے اور ہونٹ چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ انگریزی نہیں جانتے مگر انگریزی الفاظ کثرت سے اُن کی تحریرات میں پائے جاتے ہیں جن کا استعمال وہ بہت خوبی سے باموقع و برمحل کرتے ہیں غرض اُن کی اردو ماڈرن اردو اور سٹینڈرڈ اردو کا ایک بہترین نمونہ ہے جس کی نقل لوگ اُتارنی چاہتے ہیں مگر نہیں اُتار سکتے۔ میری نظر سے آپ کی کوئی مبسوط تصنیف نہیں گزری اول تو آپ اخباروں میں کثرت سے لکھتے ہیں اور ایسے مضامین اخباروں کے ساتھ تلف ہو جاتے ہیں دوم آپ کی تصانیف واللہ اعلم قصداً یا اتفاقاً ہمیشہ مختصر ہوتی ہیں شاید اس خیال سے کہ طول ملل نہ ہو اور پڑھنے والے کا دل اُکتا نہ جائے تحریر مختصر اور مفید آپ کا ماٹو ہے۔ آپ کی تصانیف اس کثرت سے ہیں کہ میں اُن کی فہرست دیتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ کتابوں کا کیٹلاگ نہ ہو جائے تاہم مصداق مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ مشتے نمونہ از خروارے تیمناً و تبرکاً ہم اُن کا ذکر خیر کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتے ۔ جن لوگوں نے یہ کتابیں نہ دیکھی ہوں مگر ایسے بے خبر لوگ بہت کم ہوں گے وہ اب دیکھیں اور اردو لٹریچر کے بہترین ذخیرے سے مستفید ہوں ۔ روزنامچہ سفر مصر و شام و حجاز ۔ کرشن بیتی ۔ سیر دہلی ۔ میلاد نامہ ۔ محرم نامہ ۔ یزید نامہ ۔ انتخاب نئے جید ۔ کم ڈموت ۔ بیتی ہوئی موول غدر دہلی کے افسانے ۔ روزنامچہ خواجہ حسن نظامی ۔ ذکر خسرو ۔ آنالیق خطوط نویسی ۔ بیوی کی تعلیم ۔ مجموعۂ خطوط خواجہ حسن نظامی

منقل نائرہ گیارہویں۔ چٹکیاں گدگدیاں۔ روزنامچہ ہند۔ جگ بیتی۔ بچوں کی کہانیاں۔ قبروں کے غیبی نوشتے۔ رسول کی عیدی۔ توپ خانہ۔ بندوق ہوائی جہاز بم۔ مصر کا اعلان جنگ۔ مکھی کا میدان جنگ۔ جرمن شاہزادے کی لاش۔ فرام مقابلہ مولشلہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ فریق دوم ہارونی حضرت خواجہ رفیع الدین ہارونی کی اولاد میں ہیں جو حضرت محبوب الٰہی کے ہمشیرہ زادے تھے اس خاندان میں اب صرف عورتیں باقی ہیں اور خدا سلامت رکھے حیدرآباد کی ریاست کو تا قیامت دونوں معقول وظیفہ پاتی ہیں۔ مرد کوئی زندہ باقی نہیں رہا۔ فریق سوم ہندوستانی۔ حضرت خواجہ ابوبکر مصلی بردار کی اولاد میں ہیں جو حضرت محبوب الٰہی کے قرابت دار نہایت ممتاز و متبرک بزرگ تھے اور حضور کا مصلیٰ اٹھانے کی خدمت اُن کے سپرد تھی۔ ان کی اولاد میں پچاس کے قریب آدمی اب بھی موجود ہیں۔ فریق چہارم۔ قاضی زادے۔ حضرت قاضی محی الدین کاشانی کی اولاد میں ہیں جو حضرت محبوب الٰہی کے بہت ممتاز اور برگزیدہ خلیفہ تھے اور اُن کی قرابت بھی حضرت محبوب الٰہی کے قرابت داروں سے تھی۔ اب ان چاروں خاندانوں میں آپس کی رشتے داری کے سبب کوئی فرق نہیں اور سب ملے جلے رہتے سہتے ہیں۔ حضرت محبوب الٰہی نے شادی نہیں کی تھی اس لیئے آپ کی اولاد صلبی نہیں ہے بلکہ ہمشیرہ اور اجداد کی نسل آباد ہے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب کے نام کھلا نوٹس

چونکہ مجھے خواجہ صاحب کی خدمت میں نیاز کے ساتھ ایک گونہ دلی عقیدت بھی ہے میں اُن کی خدمت میں بارہا عرض کرچکا ہوں کہ حضرت سلطان المشائخ کی ایک ایسی مکمل سوانح عمری جو زمانہ حال کے طرز پر ہو ضرور لکھیں اور اُن سے بہتر اور کون لکھ سکتا ہے کہ اہل البیت ادریٰ بما فی البیت لیکن ابھی شاید اُس کا وقت نہیں آیا۔ لہٰذا اب مجبور ہو کر میں اُن کو یہ کھلا نوٹس دیتا ہوں۔ گو یہ کام بڑا اہتم بالشان ہے مگر آخر خواجہ صاحب نہ کریں گے تو کون کرے گا؟۔ زندگی کے دن سمٹتے چلے جاتے ہیں۔ موت سر پر کھڑی ہے العجل ثم العجل۔ کار امروز را بفردا مگزار بسم اللہ میدان میں آیئے اور اس اہم فریضے کو ادا کیجئے۔ —ص

بعمارتِ ہیچ اعتماد مکن
کہ پنج روز وگرمی رود باستعجال

شمس الدین محمد اتگہ خاں
خانِ اعظم کا مقبرہ ۹۷۲ ھ ۱۵۶۲ء

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

اگلے زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ بچے کے مزاج اور اخلاق میں دودھ کا اثر ضرور ہوتا ہے اس لیے بادشاہ اور امرا بچوں کے دودھ پلانے کو شریف خاندان کی بی بی تلاش کرتے تھے۔ بادشاہ عالم طفولیت میں جس کی بی بی کا دودھ پیتا تھا وہ اتگہ خاں خطاب پاتا تھا۔ آتا ترکی میں باپ کو کہتے ہیں جو بی بی دودھ پلاتی تھی وہ انگہ کہلاتی تھی۔ ایکہ ترکی میں ماں کو کہتے ہیں۔ جو بچہ ان دونوں میں اس کا دودھ پیتا تھا وہ شہزادے کا کوکا کہلاتا تھا اور بڑا ہو کر کوکلتاش خاں ہو جاتا تھا۔ اس کے اور اس کے رشتے داروں کی بڑی عزت اور خاطر ہوتی تھی۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ اکبر نے سب سے پہلے دودھ توکئی بیگموں کا پیا مگر بھاول انگہ نے پہلے دودھ پلایا وہ جوگا بربار کی بیٹی تھی۔ جب آئی تو بابر نے ہمایوں کے محل میں بھیج دی۔ چنانچہ اس کی خوش روئی نے خوش خوئی رفاقت سے ہمایوں کو بھالیا۔ مریم مکانی آئیں تو سورج کی روشنی نے ستارے کو مدھم کیا اور بادشاہ نے اسے جلال کوکہ کو دے دیا۔ پھر بھی وہ محل میں رہتی تھی۔ اول اس نے دودھ پلایا۔ پھر موقع موقع پر اوروں نے۔ مگر صحیح روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے مادر مکرمہ ہی کے دودھ پینے پر رغبت فرمائی تھی۔ اگلے وقتوں کے لوگ اصلیت اشیار اور تاثیر ادویات سے بالکل بے خبر تھے۔ اس لیئے خواہ مخواہ کے تکلف گلے باندھتے تھے۔ عقل ہوتی تو گدھی کا دودھ پلاتے۔ دانایانِ فرہنگ نے فرمایا ہے کہ اس دودھ سے بہتر بچے کے لیئے کوئی دودھ نہیں۔ خان اعظم ایک سیدھا سادا سید بامروت۔ صاف دل آدمی تھے۔ خاندان کا ذکر کاہے کو کہو کیونکہ وہ آپ ہی اپنے خاندان کے بانی تھے۔ جب ہمایوں نے شیر شاہ سے دوسری شکست کھائی تو تمام لشکر پریشان ہو گیا یہاں تک کہ شکست نصیب بادشاہ کو اس حال میں بیگمات کا ہوش بھی نہ رہا۔ ننگ ناموس

نقشہ مقبرۂ اتکہ خان
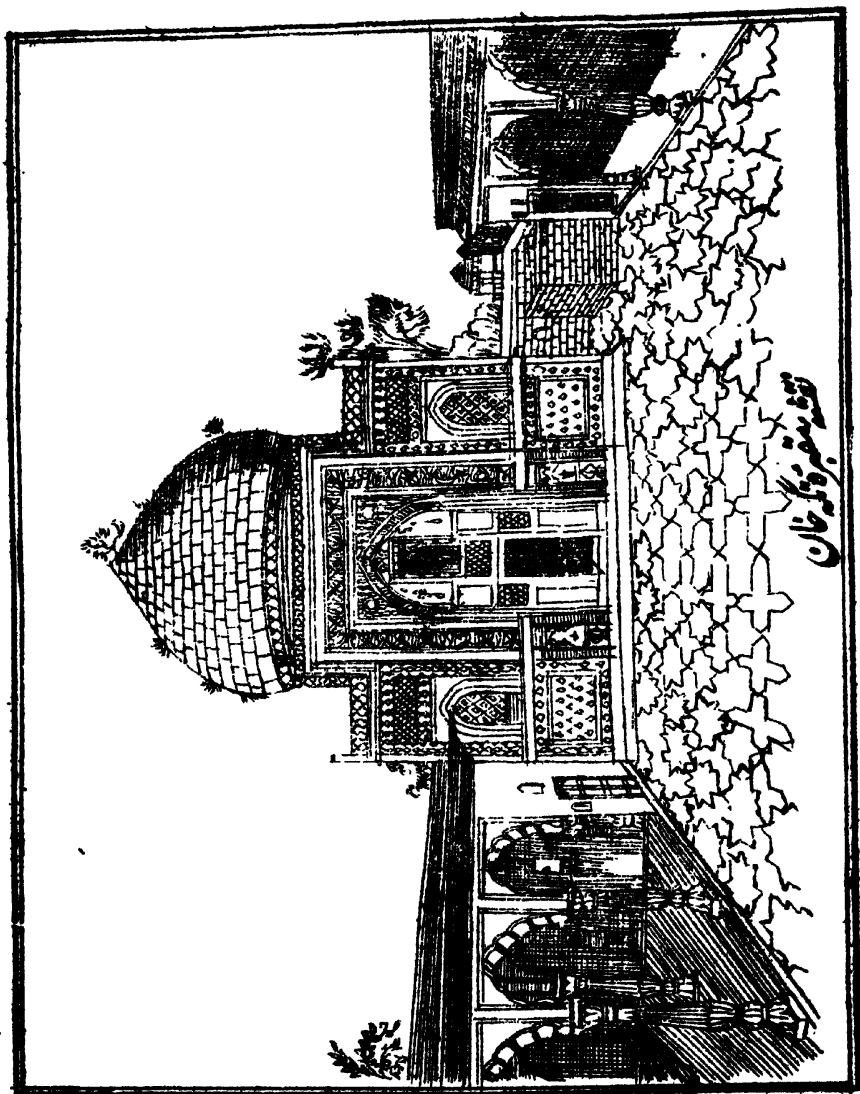
غنیم کے ہاتھ پڑا۔ ہر شخص جان لے کر بھاگا۔ ہمایوں دریا کے کنارے پر آکر حیران کھڑا دیکھتا تھا کہ ایک ہاتھی ہاتھ آگیا۔ اُس پر چڑھا فیل بان سے کہا کہ ہاتھی دریا میں ڈال دے معلوم ہوا کہ اُس کی نیت میں فساد ہے۔ چاہتا ہے کہ غنیم شاہ کے پاس لے جا کر انعام حاصل کرے۔ ایک خواجہ سرا بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اُس نے پیچھے سے تلوار ماری کہ فیل بان کا سر اُڑ گیا اور ہاتھی کو دریا میں ڈال دیا۔ غرض ڈوبتے اُبھرتے پار پہنچے۔ اُتر کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کنارہ بہت بلند ہے خدا کریم کارساز ہے۔ اوپر ایک سپاہی نظر آیا کہ کچھ رسّی اور کچھ دستار کچھ ٹپکہ بٹ کر لٹکا رہا ہے۔ اُسے پکڑ کر اوپر چڑھے اور خدا کا شکر کیا۔ اُس کا نام اور مقام پوچھا۔ عرض کی کہ غزنی کی پیدائش اور مرزا کامران نوکر ہوں۔ بادشاہ نے عنایتوں کا امیدوار کیا۔ اُس وقت تو بدحواسی کا عالم تھا دونوں اپنی اپنی راہ کہیں کے کہیں چلے گئے۔ لاہور پہنچے تو وہ بھی خدمت میں حاضر ہوا ہمایوں نے ملازمان شاہی میں داخل کر کے ہم رکاب لیا۔ اور اُس وقت سے اخیر تک جاں نثاری میں رہا۔ خوش نصیبی سے اُس نے اکبر کی پرورش اور بی بی نے دائگی کی عظمت پائی۔ آخر صورت یہ تھی جو بیرم خاں کی مہم پر بن آئی۔ اس کی بدولت خان اعظم اتکہ خاں ہو گئے۔ لیکن ماہم کی مہتاب میں اُن کا ستارہ نہ چمکا جاں نثاری کا صلہ بھی پورا نہ ملا۔ اُس وقت اُنھوں نے اکبر کو ایک عرضی لکھی ہے جس سے اکثر رمزیں مہم خان خاناں کی کھلتی ہیں اور اُن کی بے اختیاری اور محرومی اور دل شکستگی اور ماہم کی سینہ زوری بھی عیاں ہے۔

ترجمہ عرضداشت کمترین بندگان دولت خواہ شمس الدین اتکہ دعا اور بندگی کے بعد عرض کرتا ہے کہ جب اس دولت خواہ نے دلّی میں آستانہ بوسی کی اور حضور نے عنایت اور التفات بے دریغ مبذول فرما کر بیرم خاں کے علم و نقارہ و طومان وطوغ سے سرفرازی دی اور حکومت و حفاظت سرکار پنجاب وغیرہ کی عنایت فرمائی تو اس دولت خواہ کو بھی واجب ہوا کہ اس عنایت و سرفرازی کے لائق خدمت بجا لاوے تاکہ جب حضور اس فدائی کے حق میں کچھ پرورش فرمائیں تو اور دولت خواہوں کو اس رعایت پر کچھ بولنے کی گنجائش نہ ہو۔ خبر پہنچی کہ فتنہ انگیز حرام خور بیرم خاں کو خطوط اور خبریں بھیج بھیج کر فیروز پور سے آئے۔ حکم ہوا ارکان دولت جمع ہوں اور جو صلاح دولت ہو مصلحت قرار دے کر عرض کریں۔ اُسی مجلس میں بیرم خاں کا وہ خط پڑھا گیا جو

اس نے درویش محمد حاکم بھٹنڈہ کو لکھا تھا اس میں درج تھا کہ میں غلام و بندۂ حضرت کا ہوں مگر یہ چاہتا ہوں کہ اپنا انتقام آں حضرت کے وکلا سے لے لوں۔ سب دولت خواہ اس کے دفع کی تدبیر کے لیئے جو جو خیال میں آتا تھا کہتے تھے۔ چوں کہ وہی دن ہوئے تھے کہ اسباب حشمت خاں مذکور کا دولت خواہ کو عنایت ہوا تھا۔ دل نے کہا کہ کوئی لائق خدمت کروں۔ ارکان دولت کے سامنے کے خورد و کلاں حاضر تھے۔ میں بڑھ کر بولا اور قول دے کر کہا کہ بیرم خاں کی مہم خدا کی عنایت اور حضور کی توجہ سے میرے ذمے جہاں سا منا ہو جاے اگر ہٹوں تو فاحشہ اور لونڈیوں سے کم ہوں۔ ارکان دولت نے کہا کہ بیرم خاں کی مہم بڑی مہم ہے۔ جب تک بندگان حضور متوجہ نہ ہوں کام کا بننا محال ہے۔ جب ارکان دولت نے یہ مصلحت دیکھی میں نہ بولا۔ بزرگوں کی خدمت میں عرض کی کہ فلاں فلاں امرار ملتان و لاہور کو رخصت ہوتے ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ بندہ اُن کی خدمت میں قراولی کے طور پر آگے جاے؟ اور جو حال ہو عرض کرتا رہے بندۂ دولت خواہ کی عرض قبول ہوئی حکم ہوا کہ امرائے عظام کے ساتھ بیرم خاں کی طرف روانہ ہو اور ہزار آدمی کی کمک کا بھی حکم ہوا۔ رخصت ہو کر چار پانچ دن نواح رہتک اور پرگنہ مہم میں ٹھیرا۔ کمک کا نشان بھی نظر نہ آیا۔ امرار کو عرضداشت لکھی تو ہزار آدمی سے پچاس آدمی کی کمک پونہچی۔ اکثر پرانے سپاہی بھی ساتھ تھے۔ سپاہ گری کا معاملہ ہے۔ ہر ایک کو چند در چند اندیشے گزرتے ہیں۔ کیچڑ پانی برسات کا موسم بھی تھا۔ چند روز روانگی میں توقف ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور میں عرض معروض ماہم ہی کی معرفت ہوتی تھی۔ (اور اہل دربار اسے والدہ کہا کرتے تھے) لوگوں نے والدہ کے ذریعے اس کی طرف سے حضور میں ہزاروں باتیں بنائیں اور کہا کہ اتکہ خاں روز دو کوس چلتا ہے ڈر کے مارے آگے نہیں بڑھتا اس سے یہ کام نہیں ہو سکتا اس کی جاگیر و وظیفہ موقوف کرنا چاہیئے۔ والدہ نے اُن کے کہنے پر عمل کیا۔ ملاحظۂ خاطر اور بیس برس کے حق خدمت کا خیال نہ کیا۔ جو کہنے والوں نے کہا اور والدہ نے عرض کیا وہ حضرت پر واضح ہے۔ فرزند عزیز محمد کو لوگوں کی باتوں اور اشاراتوں کی تاب نہ ہوئی۔ دولت خواہ کو لکھا کہ اے دادا! لوگوں کی باتوں نے ہلاک کر ڈالا۔ جو تمہاری قسمت میں ہونا ہے سو ہو گا جس حال میں ہو بیرم خاں کی مہم پر چلے جاؤ۔ دولت خواہ مطلب سمجھ گیا مدد الٰہی پر توکل اور

دولت بادشاہی پر تکیہ کرکے بیرم خاں کی طرف چلا - ایکے بیرم خاں کی مہم حضرت کی بدولت سرانجام کی اور نوکر اور سلطان جو اُس کے ساتھ تھے قتل کیئے اور رشتہ اُس کے قید کرکے درگاہ میں لایا - عیاذاً باللہ - اگر معاملات اُلٹ جاتے تو حضور کو معلوم ہی کہ کیا نوبت پونہچتی - مہم کی حقیقت بیرم خاں سنے خود عرض کی ہی ہوگی - فتح کے بعد جو لوگ دولت خواہوں میں سے معرکے میں موجود نہ تھے - اور ہر ایک کی خدمت حضور کو معلوم ہو - اُنھوں سنے کیسی عنایت اور مرحمت بادشاہی سے سرفرازی پائی ہی اور جو دولت خواہ موجود تھے ایک کو بھی نہیں پوچھا - جان محمد بہسودی قلعۂ جالندھر میں بیٹھا رہا اُس کے لیئے خانی کا خطاب دیا اور بہتیروں سنے خدمتوں سے وہ چند سرفرازیاں پائیں اور وظیفے اور انعام لیئے - جب سب کے بعد اس دولت خواہ اور فرزند یوسف محمد کی نوبت آئی کہ ایسے معرکۂ عظیم میں تلوار ماری تھی تو بڑی مہربانی دہی تھی جو پہلے دن فرمائی تھی یعنی اٹکہ کا نام فرمانِ فتح پر لکھو - عالم پناہا! - دولت خواہ بیگم ماہم سے امیدواری رکھتا ہی غیبت نہیں کرتا خدا قبول کرے - دولت خواہ نے آں حضرت کی دولت خواہی میں جان کو ہتیلی پر رکھ کر بارہ برس کی بیٹی کو ساتھ لے کر بیرم خاں اور اُس کے دس بیس اقرباؤں اور ملازموں اور سلطانوں کے منہ پر تلواریں ماریں اور امراے عظام اپنے اپنے پرگنوں پر بیٹھے تھے مدد کو نہ آئے اور جو ساتھ تھے اُنھوں سنے وہ وہ حرکتیں کیں کہ بیرم خاں نے عرض کیا ہوگا کہ اس غلام پیر کے ساتھ کیا سلوک کیا - بیرم خاں نے جو سپاہی حضور کی ملازمت میں جاسوسی کے لیئے چھوڑے تھے وہ حضور کی بدولت خطاب پاکر دو کروڑ تین کروڑ کا وظیفہ لیں اور یوسف محمد خاں کہ بیرم خاں اور ہیبت خاں اور اُس کے سلطانوں کے مقابل ہو کر تلوار ماریں اُسے آپ خانی کا خطاب دیں - بزرگانِ دربار نے ایک کروڑ کے وظیفے کا پروانہ جاری کیا وہ بھی ذاتی تنخواہ نہیں - بندے کو خان اعظم خطاب دیا - ایک کروڑ انعام مرحمت فرمایا - جس میں سے کل ایک لاکھ فیروزپور پر ملا - عالم پناہ! عمر گزر گئی کہ تمام آدمی دولت خواہ کے بھائیوں اور بیٹوں سمیت امیدواری پر خدمت کر رہے ہیں اب آں حضرت کی بدولت ہر شخص خانی اور سلطانی کے خطاب سے سرفراز ہوگیا - جب علم ونقارہ وطومان وطوغ بیرم خاں کا کمترین کو عنایت فرمایا اور فتح کے بعد جامۂ واقو اور خلعت قاچی

اور اسباب حشمت بھی عنایت کرکے رتبہ بڑھایا۔ اُمیدوار ہوں کہ اُس کا منصب اس کمترین سے متعلق ہو۔ اس عرضی سے انھیں کلی اور مطلق کا منصب ملا اور کاروبار سلطنت سپرد ہوئے۔ اور ماہم اور ماہم والے جو اندر کے مالک بن رہے تھے ان کے اختیارات میں فرق آیا۔ اُن کے حوصلے حد سے بڑھ گئے تھے۔ ادہم خاں بیٹا شہاب خاں جو رنگ نکال کر شہاب الدین احمد خاں ہو گئے وہ بھی اتا والوں کیں ملتی تلوار تھے۔ انھوں نے انھیں اور بھی بھڑکایا۔ ۱۲ رمضان ۹۶۹ھ ۱۵۶۱ء پیر کے دن کو میر اتکہ منعم خاں۔ شہاب خاں وغیرہ چند امرا دیوان عام کے کسی مکان میں بیٹھے مہمات سلطنت میں گفتگو کر رہے تھے۔ میر اتکہ تلاوت قرآن میں مصروف تھے کہ ادہم خاں تقرب بلکہ قرابت کے گھمنڈ میں بھرا رشک و حسد کی آگ میں بھڑکا چند اوباشوں کو ساتھ لیئے آیا۔ سب تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڈھا بزرگ رمضان کا روزہ منہ میں کلام الٰہی زبان پر نیم قد اٹھا اور قرآن کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ وہ رانڈ کا سانڈ بادشاہ کا بھائی بنا ہوا تھا خنجر کھینچ کر بڑھا۔ نوکروں سے کہا کہ یہیں کھڑے دیکھتے ہو؟ ہاں! خوشم اذیک اس کے ملازم نے بڑھ کر ایک خنجر اس کے سینے پر مارا۔ خان اٹھ کر محل شاہی کی طرف بھاگے۔ خدا بردی ناخدا ترس نے پہنچ کر ایک تلوار کا ہاتھ مارا اور دولت خانے کے میدان میں کہن سال جاں نثار کا کام تمام کر دیا۔ دیوان عام میں غل مچ گیا اور خونخوار شمشیر بکف ٹہلتا ہوا بادشاہی حرم سرا کے دروازے پر آیا کہ محل میں داخل ہو۔ دربان کو اتنی عقل آئی اور ہوش نے بھی رفاقت کی کہ دروازے کو قفل لگا دیا۔ اس خونی نے بہت دھمکایا مگر نہ کھولا۔ ماہم اور اس کے بھائی بندوں کا سکہ ایسا بیٹھا تھا کہ ایک کی جرأت نہ ہوئی جو دم مار سکے۔ دیوان میں غل اور محل میں کہرام مچ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا اکبر محل میں آرام کرتا تھا چونک پڑا۔ پوچھا کیا ہوا؟ کسی کو معلوم نہ تھا کیا بتائے۔ بادشاہ نے کوٹھے کی دیوار سے سر نکال کر دیکھا اور پوچھا یہ کیا حالت ہے؟ ایک رفیق چار منصب جاں نثار نے ہاتھ اٹھایا اور جدھر خان اعظم کی نعش پڑی تھی اشارہ کیا اور کچھ کہہ سکا۔ بادشاہ نے دوبارہ پوچھا وہ ڈر کا مارا تھا پھر ہاتھ اٹھا کر رہ گیا۔ بادشاہ گھبرا کر باہر چلے۔ ایک حرم کو ہوش آیا کہ تلوار ہاتھ میں دے دی۔ غنیمت یہ ہوا کہ بادشاہ دوسرے دروازے سے نکل کر آئے۔ اُسے دیکھ کر کہا "او بیہودہ لڑکے میرے اتکہ کو کیوں مار ڈالا؟

اُس نے دوڑ کر بادشاہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیئے اور کہا "تحقیق کیجیے اور غور فرمایئے۔ نادولت خواہ کو سزا دی ہے"۔ اکبر اور ادہم میں دھکا پیل ہونے لگی اور سب کھڑے دیکھ رہے ہیں اندر سے ماہم تیرا رعب داب۔ بادشاہ نے اپنی تلوار پھینک کر اُس کی تلوار پر ہاتھ ڈالا۔ اُس نے خود تلوار کھینچنی چاہی بادشاہ نے ایک مُکا گلے پر مارا اتفاقاً اس زور سے لگا کہ گر پڑا اور کبوتر کی طرح لوٹ گیا۔ آخر اکبر نے جھنجلا کر کہا "چہ تماشہ می کنید؟ بر بندید ایں دیوانہ را" دیکھ رہے ہو باندھ لو اس دیوانے کو اُسی وقت مشکیں کس لی گئیں حکم دیا کہ ابھی دولت خانے کے کوٹھے پر سے پھینک دو۔ ایوان مذکور بارہ گز بلند تھا۔ اُسی وقت ہاتھ پاؤں باندھ کر پھینکا۔ مگر ماہم سے بھی جان نکلی تھی اس طرح بچا کر پھینکا کہ پاؤں کے بل گرا اور بچ گیا۔ دوبارہ حکم دیا کہ پھینکو اور سرنگوں پھینکو دوبارہ کوٹھے پر سے گئے ادہم خاں دھم سے زمین پر آن پڑے اب کے سر کے بل گرے خودسری کی گردن ٹوٹ گئی اور سر پھٹ گیا۔ اس کے ہوا خواہ لاش اُٹھا لے گئے۔ منعم خاں اور شہاب خاں موجود تھے ڈرے اور کھسک کر بھاگ گئے۔ اور یوسف خاں اتکہ کا بیٹا اور تمام اتکہ خیل یہ سنتے ہی مسلح ہوئے اور چڑھ کر ماہم کے سر راہ آن پہنچے کہ ہم آتا دا کا انتقام لیں گے۔ اکبر نے خانِ کلاں یعنی خانِ اعظم کے بڑے بھائی کو بلا کر ادہم کی لاش دکھائی اور فساد سے روک کر کہا کہ قصاص ہم نے لے لیا۔ فساد کیا ضرور ہے دونوں لاشیں دلی کو روانہ کرو۔ تقدیر کا تماشا دیکھو کہ قاتل ستمگار مقتول مظلوم سے ایک دن پہلے زیر خاک پہنچا۔ خانِ اعظم دوسرے دن دفن ہوئے بہ زیادتی یک عدد تاریخ ہوئی "دو خون شد" اور یہ مصرعہ بھی تاریخ وفات ہے ع۔ رفت از ظلم سیر اعظم خاں۔ اور کسی نے یہ تاریخ بھی کہی ہے:۔

خانِ اعظم سپاہِ اعظم خاں + کہ چو او کس دریں زمانہ ندید + بشہادت رسید ماہ صیام + شربتِ موت روزہ دار چشید + کاش سالِ دگر شہید شدے + کہ شدے سال فوت "خانِ شہید"

میر اتکہ شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی متانت بزرگی اور سلامت طبع ان کے اشعار سے ہویدا ہوتی ہے۔ نمونے کے لیئے ایک شعر لکھا جاتا ہے:۔

منہ اے طفلِ اشک از خانۂ چشم قدم بیروں — کہ مردم زادہا از خانہ می آیند کم بیروں

ماہم کچھ بیمار تھیں سنتے ہی دوڑیں کہ جاؤں اور بیٹے کو چھڑا لاؤں۔ اُنھیں یقین تھا کہ یہ سزا ہوگی اور ایسی جلد ہو جائے گی مگر اب کیا ہو سکتا تھا جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ بادشاہ نے

دیکھتے ہی کہا "او ہم آنکہ سارا کشتہ ماہم اور اکشتیم" اور اسے تسلی بھی دی۔ اس کا سینہ حوصلے کا تنور تھا دم نہ مارا مگر رنگ فق ہوگیا اور عرض کی "وے خوب کردید کہ آئینِ انصاف ہمی بود" پھر بھی یقین نہ آتا تھا۔ جب بی بی تحفہ بیگی رستم خاں کی ماں نے سارا حال بیان کیا تو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ اکبر نے بھی خدمتوں کا خیال کر کے تسلی اور دلاسے کے رومال سے آنسو پونچھے۔ اُس کے ہوش بجا نہ تھے خاموش رخصت ہو کر گھر گئی کہ ماتم داری اور سوگواری کی رسمیں ادا کرے۔ بیٹے کا داغ تھا۔ مرض بڑھتا گیا عین چالیسویں کا دن تھا کہ ماں بھی بیٹے کے پاس پہنچ گئی۔ اکبر نے اس کے جنازے کا چند قدم ساتھ دیا اور عزت و احترام سے روانہ کر دیا۔ دونوں کی قبروں پر عالی شان مقبرہ بن گیا جو قطب صاحب کی درگاہ کے پاس موجود ہے اور بھول بھلیاں کہلاتا ہے (از دربار اکبری)

اعظم خاں کا مقبرہ جوار حضرت سلطان المشائخ میں درگاہ شریف سے کوئی بیس گز پر واقع ہے۔ یہ مقبرہ سنہ ۹۷۴ھ مطابق ۱۵۶۶ء میں مرزا عزیز کوکلتاش خاں فرزند دومی اعظم خاں نے بنوایا یہ مقبرہ ۳۰ فٹ مربع اور چھت سے اوپر گنبد کی چوٹی تک ۲۴ فٹ اور زیادہ ہے۔ اس طرح اس کی کل بلندی ۵۴ فٹ ہے۔ چوں کہ گنبد چاروں طرف سے یکساں ہے لہٰذا ایک ہی طرف کی کیفیت بیان کر دینا کافی ہے۔ دیوار کے بیچوں بیچ محراب ہے جو دو فیٹ گہری ۲۳ فٹ اونچی۔ ۱۱ فٹ چوڑی ہے جس میں چار فیٹ اونچا دروازہ لگا ہوا ہے جس پر ایک تختی سنگ مرمر کی لگی ہوئی ہے جو اشتداد زمانے سے زرد پڑ گئی ہے اور اُسی پر یہ کتبہ ہے "تمت ھذہ العمارۃ الشریفۃ فی سنۃ اربع وسبعین وتسعمائۃ باھتمام اُستاد حیدر قلی" ۹۷۴ھ باقی ساری دیوار طرح بطرح کے بیل بوٹوں پھول پتوں اور نقش و نگار سے آراستہ ہے جس میں رنگ برنگ کے نیلے سفید۔ زرد پتھر جڑے ہوئے ہیں محراب کے اوپر سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی پٹیاں بڑی خوب صورتی سے لگائی ہیں جن پر منبت کاری کے گل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ انھیں پٹکوں کے متوازی اور ایک چوڑا پٹکہ سنگ مرمر کا ہے اور ان کے بیچ میں ۱۸ انچ کا فصل ہے جس پر کلام الٰہی کی آیات منقوش ہیں۔ چوڑے پٹکے جو چھت تک دوڑے ہوئے ہیں اُن کی دونوں طرف سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی مناریں ہیں یہ پٹکے کے نیچے سے نہیں ہیں بلکہ پانچ فیٹ اوپر جا کر شروع ہوئے ہیں سطح زمین سے پانچ فیٹ اوپر احاطے تک چاروں طرف اس طرح کارنس نکال دی ہے کہ گویا وہ ایک مضبوط چبوترا ہے جس پر عمارت کا سارا بوجھ ہے اور اس کے اوپر دولے بنائے ہیں

جن میں رنگ برنگ کے پتھر جڑے ہوئے ہیں اور نقش و نگار بھی ہیں۔ اس مقبرے پر مغلیہ طرز کا گنبد ہے جو چھ فیٹ اونچے سنگ مرمر کے گردنے سے نمودار ہوتا ہے اور جس میں سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی پٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک شدید طوفان کی وجہ سے اس کا کلس گر گیا۔ درمیانی محراب کے پاس کے محراب کی بلندی سے دو فیٹ پست ہیں اور چوڑان میں نصف ہیں چھت پر بہت خوب صورت اور نقش و نگار سے آراستہ گنگورا ہے۔ گنبد کے چاروں جانب دیوار دوز محرابیں ہیں جن کے ادھر ادھر دو پتلے اور نازک نہایت نفیس ستون ہیں۔ گنبد کی زمین پر سارا فرش سنگ مرمر کا ہے جس میں سلیٹ کے پتھر کی سیاہ پٹیاں پڑی ہوئی ہیں۔ مقبرے کے سامنے کا فرش چھ گز تک سنگ سرخ کا ہے جس میں سنگ مرمر کی پٹیاں پڑی ہوئی ہیں اور ہشت پہلو کٹاؤ کا کام ہے۔ مقبرے کی موجودہ حالت از بس خستہ ہے ممکن نہیں ہے کہ دیواروں کا اندرونی حصہ بلا استرکاری کے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اب تو سب استرکاری جھڑ گئی ہے اور پتھر نکل آئے ہیں جس مقبرے کے پنشانے تک سنگ مرمر سے ہوں اس کا اندرونی حصہ ایسا ادھورا اور ناقص کیسے رہ سکتا ہے۔ اس گنبد میں تین قبریں سنگ مرمر کی ہیں۔ درمیانی قبر اتکہ خاں کی ہے۔ بائیں طرف اُن کی بی بی جی جی اتکہ کی قبر ہے اور داہنی طرف کی مردانی قبر کا پتہ نہیں چلتا کہ خدا جانے کہ کس کی ہے۔

مقبرے پر کے کتبات یہ مقبرہ ایک احاطے کے اندر ہے جس کے دو اونچے اونچے دروازے لداؤ کے ہیں۔ ایک دری مغرب کی طرف ہے۔ چاروں طرف ایک ایک بلند اور شان دار محراب والے دروازہ ہے۔ ہر ہر دروازے پر بخط نسخ نہایت خوش خط یہ کتبے ہیں:۔

غرب رویہ پیشانی پر۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ۔ دروازے کے گرد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ تا کُلَّمَا اُلْقِیَ فِیْھَا فَوْجٌ سَاَلَھُمْ۔ نیچے دار۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ اِلٰھِیْ جَلَّتْ خَطِیْئَتِیْ لٰکِنْ وَجَدْتُ۔ فَعَفْوُکَ عَنْ ذَنْبِیْ اَجَلُّ وَاَوْسَعُ اَلَمْ یَاْتِکُمْ تا دِیْن۔ کتبہ باقی محمد۔

شمال رویہ۔ پیشانی پر۔ فَرِحِیْنَ بِمَا اٰتٰھُمُ اللّٰہُ تا یَحْزَنُوْن دروازے کے گرد۔

تمالو ابلی تد جاء فاتن بی تا قلیف کان تکیر۔ سینچے وار۔ الٰہی خلاقی فی محزن و مدیلی۔ الیک الذی والاعیاد الیسیر فزع۔ وکتبہ الغریب باقے محمد البخاری۔ مشرق رویہ۔ پیشانی پر۔ ولاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون دروازے کے گرد ادکر وا الی التکبر فی تفہرتا و انما انا نذیر مبین۔ سینچے وار۔ الٰہی تری حالی فقری و فاقتی۔ وانت مناجات الخفیۃ تسمع۔ وکتبہا الغریب باقے محمد البخاری۔ جنوب رویہ۔ پیشانی پر سورہ انا انزلنا تا مطلع الفجر۔ دروازے کے گرد۔ فلما راوہ زلفۃ تا بماء معین ختم سورہ سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین۔ سینچے وار۔ لک الحمد یا ذالجود والمجد والعلی۔ تبارکت تعطی من تشاء وتمنع۔

کتبہ باقے محمد الکاتب ۹۷۶ھ

اس گنبد میں بھی درگاہ شریف کا کوئی مجاور مع اہل و عیال کے رہتا ہے جس کی وجہ سے گنبد اور سہ دری کی حالت بہت خراب ہے۔ محکمۂ آثار قدیمہ نے جب دوسری عمارتیں لوگوں سے خالی کرالی ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ عمارت جو کہیں سے گری پڑی نہیں ہے یوں آنکھوں دیکھتے پامال کرائی جائے۔

بغدادی صاحب علیہ الرحمہ کا مزار تگہ خاں کے مقبرے کے پاس جنوب کی طرف بازار کی مسجد کے حجرے مین آپ کا مزار ہے۔ آپ اولیاء کاملین مین سے تھے۔ بغداد سے دلی تشریف لاکر اس مسجد میں ایسے بیٹھے کہ بس یہیں آپ کا وصال بھی ہوا۔ بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے۔ ہزاروں لوگوں کی حاجتیں آپ کی دعا سے بر آتی تھیں اور کچھ زیادہ حال یا آپ کا زمانہ معلوم نہیں۔

چونسٹھ کھمبا یا مقبرہ مرزا عزیز کوکلتاش ۱۰۳۳ھ ۱۶۲۳ء

عروس ملک کسے در کنار گیرد چست
کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند

خان اعظم کے مقبرے کے پاس ہی کوئی میر گز کے

ـــــــ
لہ یہ کسی عربی مناجات کے اشعار ہیں۔ یہ دونوں مصرعے مقبرے کی پیٹھ کی وجہ سے صاف پڑھے نہیں گئے ۱۲
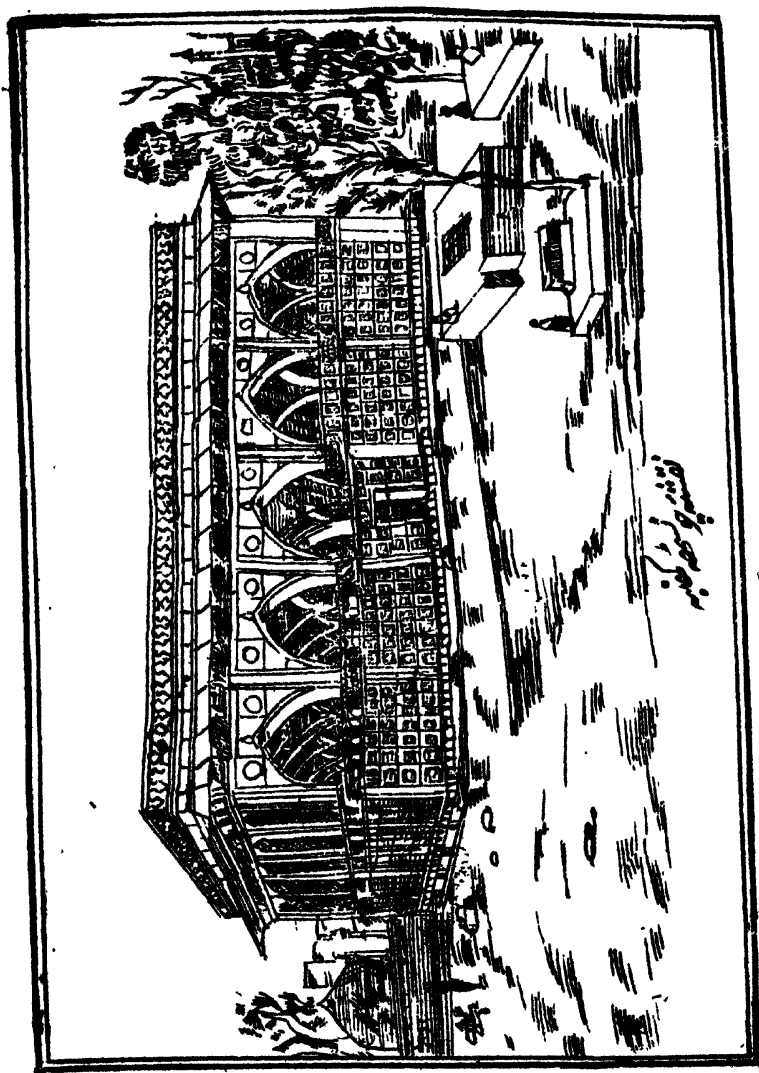
فضل سے مرزا عزیز کوکلتاش کا مزار ہے۔ ان کو بھی باپ کا خطاب خان اعظم ملا تھا۔ یہ اکبر شاہ کا برادر رضاعی تھا اور دربار اکبری کے امرار عظام اور مقربان بارگاہ شاہی و مشیران خاص میں تھا۔ جب اس کے باپ کو ادھم خاں نے مار ڈالا تو مرزا عزیز کی پرورش براہ راست بادشاہ سلامت نے اپنے ذمّے لی۔ اس کے زندگی کے حالات نیرنگی زمانے کی عبرت خیز مثال ہے جو عجیب کشمکش میں گزری عروج زوال دونوں کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ سب سے بڑے صوبے کا گورنر رہا۔ بڑے بڑے خطرناک معرکوں کو فرو کیا لیکن پھر اسی نے قید کی ذلت بھی اٹھائی۔ اکبر کی وفات کے بعد اس نے جہانگیر بادشاہ کے خلاف شاہزادۂ خسرو کا ساتھ دیا اور اگرچہ آگے چل کر یہ رستے پر آگیا تھا اور بادشاہ سے جا ملا اور مراتب اعلیٰ پر پونہچا اور بہت کچھ سرفرازیاں حاصل کیں لیکن یہ کھٹک بادشاہ کے دل سے نہ نکلنی تھی نہ نکلی

شکستہ نشاید دگر بار بست کہ سہل است محل بدخشاں شکست

جہانگیر بادشاہ نے اپنے پوتے کا اتالیق مقرر فرمایا جس کی مشایعت میں یہ گجرات گئے اور وہیں احمد آباد میں ۱۰۳۳ھ ۱۶۲۴ء میں وفات پائی۔ اب ہم مرزا عزیز کے کچھ حالات دربار اکبری سے لکھتے ہیں:۔ "تمام تاریخیں اور تذکرے خان اعظم کی عظمت امیرانہ اور شجاعت رستمانہ اور لیاقت اور قابلیت کی تعریفوں سے مرصع ہیں لیکن اس قسم کے حالات کم ہیں۔ جن سے یہ نگینے اس کی انگوٹھی پر ٹھیک آجائیں ہاں اکبر کے ہم سن تھے ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی عنایتوں اور شفقتوں نے رتبے اور قدر و منزلت بہت بڑھائی تھی بلکہ ان کی سپاہیانہ طبیعت اور بادشاہ کی ناز برداریوں نے لاڈلے بچوں کی طرح ضدی اور بد مزاج کرادیا تھا۔ مرزا عزیز کے والد میر شمس الدین محمد خان خان اعظم اتکہ خاں تھے۔ اکبر ابھی پیدا نہ ہوا تھا جو بادشاہ بیگم نے مرزا عزیز کی ماں سے کہہ دیا تھا کہ میرے ہاں لڑکا ہوگا تو اسے تم دودھ پلانا۔ اکبر پیدا ہوا ان کے ہاں ابھی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس عرصے میں اور بیبیاں اور بعض خواصیں دودھ پلاتی رہیں۔ پھر ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو انھوں نے دودھ پلایا اور زیادہ تر انھیں نے یہ خدمت ادا کی۔ جب ہمایوں ہندوستان سے بالکل مایوس ہوا اور

راہ قندہار سے ایران کو روانہ ہوا تو اکبر کو ان میاں بیوی کے پاس چھوڑ گیا سفر کے
آسرے پر دونوں دکھ بھرتے رہے یہاں تک کہ ہمایوں ایران سے پھر کر آیا۔ کابل کو فتح کیا
اور اکبر کے اقبال کے ساتھ ان کا ستارا بھی نحوست سے نکلا۔ اکبر ان کے سبب سے
ان کے سارے خاندان کی رعایت بدرجۂ غایت کرتا تھا اور عزت مدارج پر جگہ دیتا تھا
یہ بھی ہمیشہ خطرناک موقع پر جاں نثاری کا قدم آگے رکھتے تھے۔ اکبر خان اعظم کی
ماں کو جی جی کہتا تھا اور بڑا ادب بلکہ ماں سے زیادہ خاطر کرتا تھا۔ ۹۶۹ھ میں
خان اعظم شمس الدین محمد خاں اتکہ شہید ہوئے تو اکبر نے مرزا عزیز کی کہ چھوٹے
بیٹے تھے بہت دل داری کی۔ تمام خاندان کو تسلی دی۔ چند روز کے بعد خان اعظم
خطاب دیا مگر ہمیشہ مرزا عزیز اور مرزا کوکہ کہتا تھا۔ ہر وقت مصاحبت میں رہتے تھے
جب ہاتھی پر سوار ہوتے تھے تو اکثر ان ہی کو خواصی میں بٹھاتے تھے ان کی گستاخی
اور بے اعتدالی کو بھائی بیٹوں کا ناز سمجھتے تھے خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے
کہ جب اس پر غصہ آتا ہے تو دیکھتا ہوں کہ میرے اور اُس کے بیچ میں دودھ کا دریا بہ رہا ہے
میں چپ رہ جاتا ہوں۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر مرزا عزیز مجھ پر تلوار بھی کھینچ کر آئے
تو جب تک یہ وار نہ کرے میرا ہاتھ اس پر نہ اُٹھے گا۔ خان اعظم کو بھی اس بات کا بڑا
ناز تھا کہ ہم اکبر بادشاہ کے عزیز بلکہ بھائی ہیں۔ اخبار قربت ان کے اس قدر دور دور
پہنچے تھے کہ ۹۹۵ھ میں جو عبداللہ خاں ازبک کی طرف سے سفارت آئی اُس
میں تحائف سلطنت کے ساتھ ان کے اور منعم خان خانخاناں کے نام علیحدہ تحائف
آئے۔ مرزا عزیز ہمیشہ حضور میں رہتے تھے اس لئے دیبال پور ان کی جاگیر میں
بدستور رہا۔ ۹۸۵ھ میں بادشاہ پاک پٹن سے زیارت کر کے دیبال پور آئے انہوں
نے عرض کی کہ لشکر شاہی مدت سے برابر تکلیف سفر اٹھا رہا ہے چند روز حضور یہاں
آرام فرمائیں۔ بادشاہ نے کئی مقام کیے اور مع شاہزادوں اور امرائے دربار
ان کے گھر گئے۔ خان اعظم نے ضیافتوں اور مہمان داریوں میں بڑی عالی ہمتی دکھائی
رخصت کے دن گراں بہا نذرانے پیشکش گزرانے۔ عربی اور ایرانی گھوڑے
جن پر سونے روپے کے زین۔ کوہ پیکر ہاتھی۔ نقرئی اور طلائی زنجیریں سونڈوں میں
جھلاتے۔ مخمل زر بفت کی جھولیں۔ سونے چاندی کے آنکس۔ موتی جواہرات گرانی

مرصع - کرسیاں پلنگ - سونے چاندی کی چوکیاں - سینکڑوں باسن طلائی اور نقرئی بے
بیش قیمت جواہرات - عجائب اجناس ملک فرنگ - روم خطا وغیرہ کے نفائس تحا
خارج از حد و قیاس حاضر کیے - شہزادوں اور بیگماتوں کو لباس اور زیورہائے گراں
مایہ پیش کیے - تمام ارکان دولت اور اراکین سلطنت - کل ارباب منصب اہل فضل اہل لیاقت
اہل کمال جو ملازم رکاب تھے بلکہ تمام لشکر کو خوانِ انعام سے فیض پہنچاے اور سخاوت
کے دریا میں پانی کی جگہ دودھ کے طوفان اٹھائے - تاریخ اس جشن کی یہ ہے - ع
جہان عزیز اندشہ و شاہزادہ - سنہ ۹۸۰ھ میں صوبہ گجرات فتح کیا جو انھیں جاگیر میں عنایت ہوا
کہ انتظام کرو - لیکن اکبر تو ادھر آیا وہاں محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا نے فولاد خاں دکنی
اور سرشور افغانوں وغیرہ سے موافقت کر کے لشکر فراہم کیا اور مقام پٹن پر آکر ڈیرے
ڈال دیئے - مآثرالامرا میں لکھا کہ حسین مرزا کی جرات و شجاعت کا یہ عالم تھا کہ جنگ
کے معرکوں میں دلاوران زمانے کے حوصلے سے بڑھ کر قدم مارتا تھا - خان اعظم
نے امراے شاہی کو اطراف سے جمع کیا اور لشکر آراستہ ہو کر باہر نکلا - غنیم بھی ادھر سے
اپنی جمعیت سنبھال کر آگے بڑھا اور خوب زور کی لڑائی کے بعد خان اعظم کو فتح ہوئی
اور خان اعظم فتح کا نشان لہراتا گجرات میں داخل ہوا - جب یہ خبر دربار میں پہنچی اکبر کو
بڑی خوشی ہوئی - آفرین کا فرمان بھیج کر انھیں بلا بھیجا - یہ سن کر پھولے نہ سماے اور
اور مارے خوشی کے بے سروپا دربار کی طرف دوڑے - سنہ ۹۸۰ھ میں خان اعظم
بے ڈھب مصیبت کے پھندے میں پڑ گئے تھے اگر اکبر کی تلوار اور ہمت کی پھرتی
مدد کرتی تو خدا جانے کیا ہو جاتا - خان اعظم گجرات میں بیٹھے تھے کبھی شاہانہ
حکومت کے کبھی شاہانہ سخاوت کے مزے لیتے تھے کہ وہی محمد حسین مرزا اختیار الملک
دکنی کے ساتھ مل گیا - دکن کے کئی سردار اور بھی آن ملے اور تمام احمد آباد وغیرہ کے
اطراف پر پھیل گئے انجام یہ ہوا کہ خان اعظم بھاگ کر احمد آباد میں گھس بیٹھے اور
اسی کو غنیمت سمجھا کہ شہر تو ہاتھ میں ہے - غنیم چودہ ہزار لشکر جمع کر کے گجرات پر آیا
اور خان اعظم کو ایسا محاصرے میں دبوچ لیا کہ تڑپ نہ سکے - ایک دن فاضل خاں
فوج لے کر کمانپور دروازے سے نکلے اور لڑنے لگے - غنیم ایسے امنڈ کر آئے
کہ سب کو سمیٹ کر قلعے میں دبوچ دیا - فاضل خاں سخت زخمی ہوا اور غنیمت سمجھو کہ

جان سے گر بھاگا۔ سلطان خواجہ گھوڑے سے گر کر خندق میں جا پڑا۔ فصیل پر سے رسا ڈالا۔ ڈگرا لٹکایا جب نکلے۔ سب کے جی چھوٹ گئے اور کہہ دیا کہ اس غنیم کا مقابلہ ہماری طاقت سے باہر ہے۔ عرضیاں اور خطوط دوڑانے شروع کیے یہی عرائض کی تحریر تھی اور یہی پیام کی تقریر کہ اگر حضور تشریف لائیں تو جانیں بچیں گی ورنہ کام تمام ہے محل میں جی جی آتی تھی اور روتی تھی کہ واری میرے بچے کو جا کرنے لو۔ اکبر چیدہ چیدہ سرداروں اور سپاہیوں کو لے کر سوار ہوا اور اس طرح گیا کہ ستائیس دن کی رستہ ہات دن میں لپیٹ کر ساتویں دن گجرات سے تین کوس پر دم لیا۔ فیضی نے جو سکندر نامے کے جواب میں اکبر نامہ لکھنا چاہا تھا اس میں اس معرکے کا خوب سماں باندھا ہے:

بیک ہفتہ در احمد آباد رفت | تو گوئی کہ بر مرکب باد رفت
یلاں بر شتر ترکش اندر کمر | شتر چوں شتر مرغ در زیر پر

علاء الدولہ نے تذکرے میں لکھا ہے کہ جب اکبر نے گجرات فتح کی تو شاہزادہ سلیم کی وکالت اور نیابت کے ساتھ دو کروڑ ساٹھ لاکھ کا علوفہ کر کے دار الملک احمد آباد سے پایہ تخت گجرات میں ممتاز کیا اس دن ایک تقریب خاص کے سبب سے میں بھی حاضر تھا اور میں مرزا کا ملازم بھی تھا۔ شب برات کی پندرہ تاریخ تھی میں نے اسی وقت تاریخ کہی "گفتا کہ بہ شب برات داوند بدو"۔ دوسرے سال فتوحات بنگالے کے شکرانے میں بادشاہ فتح پور سیکری سے اجمیر گئے۔ دو بڑے بڑے نقارے جو لوٹ میں آئے تھے وہاں نذر چڑھا دیے۔ خان اعظم پہلے سے اشتیاق حضوری میں عرضیاں دوڑا رہے تھے۔ یلغار کر کے احمد آباد سے پہنچے بادشاہ بہت خوش ہوئے اٹھے اور چند قدم بڑھ کر گلے لگایا۔ سنہ ۹۸۲ھ میں مرزا سلیمان کی آمد آمد تھی اور ضیافت کے وہ سامان ہو رہے تھے کہ جس سے جشن جمشید کی شان و شکوہ گرد تھی۔ انھیں حکم پہنچا کہ تم بھی حاضر دربار ہو تا کہ زمرۂ امرا میں پیش ہو۔ خان اعظم ڈاک بٹھا کر فتح پور میں حاضر ہوئے۔ انہی دنوں میں داغ کا آئین جاری ہوا۔ امرا کو یہ قانون ناگوار تھا بادشاہ نے مرزا عزیز کو اپنا سمجھ کر فرمایا کہ پہلے خان اعظم اپنے لشکر کی موجودات دے گا۔ ہٹیلے نواب کی آنکھوں پر ان دنوں جوش جوانی نے پردہ ڈالا تھا۔ ہمیشہ کے لاڈلے تھے، اپنی ہٹ پر آ کر اڑ گئے اور نئے قانون کی

تماچتیں صاف صاف کہنی شروع کیں۔ بادشاہ سے کچھ فہمایش کی اور ارکان دولت
نے تائید میں تقریریں کیں۔ یہ جواب میں کس سے رکتے تھے۔ بادشاہ نے
تنگ آکر کہاکہ ہمارے سامنے نہ آؤ۔ کئی دن کے بعد آگرے بھیج دیا کہ اپنے
باغ میں رہیں اور آمد و رفت کا دروازہ بند۔ یہ کہیں جائیں نہ کوئی ان کے پاس آئے
باغ مذکور کا نام " باغ جہاں آرا " تھا کہ خود ذوق و شوق کی لہروں سے سرسبز کیا تھا
۹۸۳ھ میں بادشاہ کو خود خیال آیا اور تقصیر معاف کرکے پھر صوبہ گجرات پر رخصت
کرنا چاہا۔ یہ تو پورے ضدی تھے نہ مانا۔ بادشاہ نے پھر کہلا بھیجا کہ وہ ملک سلاطین
عالی جاہ کا تخت گاہ ہے اس نعمت اور حضور کی عنایت کا شکرانہ بجالاؤ اور جاؤ۔
انھوں نے کہلا بھیجا کہ میں نے سپاہی گری چھوڑ دی۔ میرا نام اہل دعا کے لشکر میں
رہنے دیجیے۔ قطب الدین خاں ان کے حقیقی چچا کو بھیجا۔ کہن سال بڑے
نے بہت سے نشیب و فراز دکھلاکر سمجھایا۔ ماں نے بھی کہا جھلائی اور خفا بھی
ہوئی مگر یہ کس کی سنتے تھے۔ اور مرزا خاں کی قسمت زور کر رہی تھی اور خان خاناں
بنتا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھیج دیا۔ وہ شکرانے بجالایا اور سجدے کرتا ہوا روانہ ہوا
ان کی خطا تو ہر وقت معاف تھی مگر یہ کہو کہ ۹۸۳ھ میں انھوں نے بھی معافی خطا کو
منظور کیا۔ ۹۸۷ھ میں مرزا کے سر سے بڑی بلا ٹلی۔ بادشاہ خلوت میں تھے۔ نوبت
دولت خانۂ اقبال سے غوغائے عظیم کی آوازیں بلند ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ مرزا کوکہ
زخمی ہوئے۔ حقیقت حال یہ تھی کہ بھوپت چوہان اٹاوے کا راجہ باغی ہو کر ملک
بنگالے میں چلا گیا تھا۔ بنگالہ تسخیر ہو گیا تو وہ پھر اپنے علاقے میں آیا اور رعیتوں کو
پریشانے اور چوروں رہزنوں کو دبانے لگا۔ حکام بادشاہی نے اسے دبایا اور
دربار میں عرض کی حکم ہوا کہ ملک مذکور مرزا کی جاگیر ہے یہ جاکر اس کا بندوبست کریں
وہ بھاگ کر راجہ ٹوڈرمل اور بیربل کے پاس آیا اور جرم بخشی کا رستہ نکالا۔ مرزا کو
یہ حال معلوم ہوا حضور میں عرض کی حکم ہوا کہ شیخ ابراہیم شیخ سلیم چشتی کے خلیفہ اسے
بلائیں اور حال دریافت کریں۔ وہ ظاہر میں بندگی اور دل سے مرزا کی گھات میں تھا۔
راجپوتوں کی جمعیت سے لشکر میں آیا اور شیخ سے کہا کہ مرزا مجھے اپنی پناہ میں
لیں اور جرم بخشی کا ذمہ لے کر حضور میں لے چلیں ورنہ میں اپنی جان کھو دوں گا۔

پہنچ آ سے اور مرزا کو لے کر حضور میں حاضر ہوئے۔ آئین تھا کہ بارگاہ میں بے اجازت
کسی کو ہتیار بند نہ آنے دیتے تھے۔ اس کی کمر میں جمدھر تھا۔ ایک چپڑ داسے
نے جمدھر پر ہاتھ رکھا وہ بدگمان ہوا اور جھٹ جمدھر کھینچ لیا۔ مرزا نے ہاتھ
پکڑ لیا اس نے انھیں زخمی کیا۔ پالکی میں پڑ کر گھر گئے دوسرے دن حضور نے
جا کر آنسو پونچھے اور دم دلاسوں کی مرہم پٹی چڑھائی۔ سنہ ۹۸۸ھ میں پھر نحوست آئی۔
ان کا دیوان کچھ روپیہ کھا گیا انھوں نے اسے طالب اپنے غلام کے سپرد کیا کہ
روپیہ وصول کرے اس نے دیوان جی کو باندھ کر لٹکا دیا چوب کاری شروع کر دی
اور ایسا مارا کہ مار ہی ڈالا۔ دیوان کا باپ روتا پیٹتا حضور میں حاضر ہوا۔ بڈھے کی
حالت دیکھ کر بادشاہ کو بہت رنج ہوا۔ قاضی لشکر کو تحقیقات کا حکم ہوا۔ خان اعظم
نے کہا کہ غلام کو میں نے سزا دے دی میرا مقدمہ حضور قاضی کے ہاتھ میں د
ڈالیں اس میں میری بے عزتی ہے بادشاہ نے یہ عرض منظور نہ کی یہ خفا ہو کر پھر گھر
جا بیٹھے۔ کئی مہینے کے بعد بادشاہ نے خطا معاف کی سنہ ۹۸۸ھ میں بنگالے
میں فساد ہوا۔ مظفر خاں سپہ سالار مارا گیا تو ان کو پنج ہزاری منصب عنایت
اور خان اعظم ان کے باپ کا خطاب بھی دیا اور راجہ ٹوڈرمل کی جگہ بنگالے کا سپہ سالار
کر دیا۔ منعم خاں خان خاناں اور حسین قلی خان جہاں اس ملک میں برسوں تک رہے
مگر انتظام نہ کر سکے ایک طرف تو افغان سر اٹھائے ہوئے تھے دوسری طرف
بادشاہی امرا جو نمک حرام ہو رہے تھے وہ کبھی آپ کبھی افغانوں کے ساتھ مل کر
مار دھاڑ کرتے پھرتے تھے۔ خان اعظم فوجیں بھیج کر ان کا بندوبست کرتے تھے
مگر کچھ بن نہ آتی تھی۔ ایک برس سے زیادہ یہ دو برس تک ادھر رہے اور سلطنت
دق انھیں میں غلطاں پیچاں پڑے رہے۔ امارت بھی خرچ کی روپیہ دے کر غنیم
پر چھایا مگر معاملات پاک و صاف نہ ہوئے۔ سنہ ۹۹۰ھ میں جب بادشاہ کابل کی
مہم فتح کر کے فتح پور میں آئے تو سنہ ۹۹۱ھ کے جشن میں آ کر شامل دربار ہوئے اور صوبے
بغاوت ہو گئی اور بنگالے سے لے کر حاجی پور تک باغیوں نے لے لیا۔
خان اعظم دوبارہ بنگالے کو گئے اور کچھ بندوبست کیا۔ سنہ ۹۹۲ھ میں عرضی کی
کہ مجھے یہاں کی آب و ہوا موافق نہیں چند روز اور رہا تو مر جاؤں گا بادشاہ نے

بلا لیا۔ اکبر کا دل مدت سے دکن کی ہوائیں لہرا رہا تھا۔ ۹۹۳ھ میں دکن سے فتنہ
و فساد کی خبریں آئیں۔ میر مرتضیٰ اور خداوند خاں امرائے دکن برائے احمد نگر پر چڑھ گئے
جو نظام الملک کا پایۂ تخت تھا وہاں سے شکست کھا کر راجہ علی خاں ملک خاندیس کے
پاس آئے کہ اکبر کے پاس جاتے ہیں۔ مرتضیٰ نظام شاہ نے راجہ علی خاں کے پاس
آدمی بھیجے کہ انھیں فہمایش کر کے روکو وہ کسی کے روکے نہ رکے اور لوٹتے
کھسوٹتے آگرے جا پہنچے۔ راجہ علی خاں بڑا دور اندیش تھا خیال ہوا کہ کہیں اکبر کو
یہ بات ناگوار نہ ہو۔ وہ جانتا تھا کہ اکبر ہاتھی کا عاشق تھا ڈیڑھ سو ہاتھی اپنے بیٹے کے ساتھ
بھیج دیئے جو جشن نوروزی میں بہت سے نفائس اور اجناس بطور پیشکش گزرانے
ساتھ ہی تسخیر دکن کے رستے دکھلائے۔ خانخاناں احمد آباد میں پہلے ہی سے موجود
تھے۔ چند امرا کو ادھر روانہ کیا اور خان اعظم کو فرزندی کا خطاب اور سپہ سالار کر کے
حکم دیا کہ برار لیتے ہوئے احمد نگر کو جا مارو انھوں نے ہنڈیا میں جا کر مقام کیا
اور فوج بھیج کر سانول گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ امرا بھی فراہم کیے۔ ماہم بیگم کی
نشانی شہاب الدین خاں بھی موجود تھے اُن کو دیکھتے ہی باپ کا خون آنکھوں
میں اتر آیا۔ خان اعظم اکثر صحبتوں میں اسے ذلیل کرنے لگے۔ شاہ فتح اللہ شیرازی
اصلاح و تدبیر کے لیے بادشاہ نے ساتھ کر دیا تھا یہ اُدھر کے ملک اور لوگوں سے
واقف تھے اور ان کا بڑا اثر تھا۔ یہ آپس کے نفاق کو مٹاتے تھے اور کہتے تھے
کہ یہ موقع آپس کی عداوت کا نہیں ہے مہم خراب ہو جائے گی۔ خان اعظم ان سے
بھی خفا ہو گئے اور باوجودیکہ اُستاد بھی تھے مگر ان سے تمسخر و تضحیک کرنے لگے
جس سے وہ آزردہ ہو گئے۔ شاہ صاحب تدبیر کے ارسطو اور عقل کے افلاطون تھے
بلطائف الحیل ان باتوں کو ٹالتے اور وقت گزارتے رہے۔ شہاب الدین خاں کی یہ
خواری ہوئی کہ وہ خفا ہو کر فوج سمیت اپنے علاقے کو چلے گئے۔ انھوں نے اُن پر
یہ جرم لگایا کہ میں ایک تو بادشاہ کا بھائی دوسرے سپہ سالار میری بلا اجازت جانا یعنی
واسد فوج سے کر اس کے پیچھے دوڑے۔ تولک خاں قوچی کہ شجاعت اور ہمت
میں نظیر نہ رکھتا تھا اور دست راست کی فوج کا سپہ سالار تھا اسے بھی تہمت لگا کر قید
کر لیا۔ دشمن یہ خبر پا کر کہ ان کے آپس میں کشا کشی ہو رہی ہے اور شیر ہو گیا محمد تقی کو سپہ سالار

مقرر کر کے بیس ہزار فوج کے ساتھ بھیج دیا مگر میر فتح اللہ پھر بیچ میں آ گئے اور مصالحت
کرا دی یہی غنیمت ہوئی کہ پرے دورہ گیا۔ راجہ علی خاں حاکم خاندیس دکن کے حصوں کا
سپردار اور سالک شمشیر تھا وہ خان اعظم کی رفاقت کو مستعد ہو گیا تھا یہ حال دیکھ کر اس نے
بھی موقع پایا۔ برار اور احمد نگر کے امرا اور ان کی فوجوں کو لے کر چلا۔ مرزا عزیز نے
یہ سن کر شاہ فتح اللہ کو بھیجا کہ فہمایش کریں۔ وہ دکن کے جنگلوں کا شیر تھا اب کس کی
سنتا تھا۔ شاہ صاحب کی کچھ نہ چلی ناکام پھرے اور آزردہ اور بے زار ہو کر خان خاناں
کے پاس گجرات چلے گئے۔ راجہ علی خاں کی آمد آمد دیکھ کر خان اعظم گھبرا گئے کئی دن
ہنڈیا میں لشکر آمنے سامنے پڑے رہے مقابلے کی طاقت نہ پائی ایک شب چھپاتے
گمنام رستے سے نکل کر برار کا رخ کیا ایلچپور۔ اس کا پایۂ تخت تھا اس کا اور جس شہر کو
پایا لوٹ کھسوٹ کر ستیاناس کر دیا اور دولت بے قیاس سمیٹی۔ تیاراؤ ادھر کا راجہ
ساتھ ہو گیا تھا وہ کڈھب رستوں میں رہنمائی کرتا تھا مرزا صاحب کو اس پہ بھی شبہ ہوا
کہ غنیم سے ملا ہوا ہے اسے بھی تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ ایلچپور پہنچ کر بعض امرا کی
صلاح ہوئی کہ اسی طرح باگیں اٹھائے چلے چلو اور احمد نگر تک دم نہ لو۔ بعضوں نے کہا
یہیں ڈیرے ڈال دو اور جو ملک لیا ہے اس کا انتظام کرو۔ مرزا صاحب کا سرے سے
کسی پر بھروسہ ہی نہ تھا یہاں بھی نہ تھمے اور نہ دربار کا رخ کیا۔ غنیم سوچتا رہ گیا کہ ان
سپہ سالار سپاہ بیٹھے ہوئے ملک کو چھوڑ کر چلا گیا۔ خدا جانے اس میں کیا پیچ
کھیلا ہے۔ یہاں اندر کچھ بھی نہ تھا۔ وہ جریدہ ان کے پیچھے دوڑا۔ اس رستے میں
عجب حالت گزری۔ قدم اٹھائے چلے جاتے تھے۔ بھدے بھدے ہاتھی
اور بھاری بھاری بوجھ رہے جاتے تھے۔ انھیں کوچے کاٹ کاٹ کر ڈالتے
جاتے تھے کہ ہاتھی دشمن کے ہاتھ نہ آئیں۔ دشمن نے راہ میں ہنڈیا کے شہر کو
جو بادشاہی علاقہ تھا ایلچپور کے بدلے لوٹ کر ٹھیکرا کر دیا۔ ایک موقع پر تھم کر لڑائی
ہوئی اس میں بھی جگ ہنسائی ہوئی غرض ہزار رجان کندن سے ندربار کی حد میں
لشکر کو چھوڑا اور آپ احمد آباد کو چلے۔ یہ اس خیال خام میں گئے تھے کہ خان خاناں
میرا بہنوئی ہے اس سے مدد لاؤں گا مگر وہاں بھی ٹٹو نہ چلا اور پھر ندربار جا کر بے ساختگی
مذہب سے لڑائی موقوف کر دربار میں آ دھمکے۔ ۹۹۵ھ میں صلاح ہوئی کہ مدد مہیا

مٹھاس ملاؤ تو وہ بھی مزہ دے گا۔ خان اعظم کی بیٹی سے شاہزادہ مراد کی شادی جس کی
عمر سترہ سال کی تھی مریم مکانی یعنی اکبر کی والدہ کے گھر میں رہی۔ خان اعظم کی عزت
بڑھانی تھی بادشاہ خود برات لے کر گئے اور دھوم دھام سے دلہن بیاہ لائے ۹۹۶ھ
میں لڑکا بھی پیدا ہوا اور مرزا رستم نام رکھا۔ سنہ ۹۹۹ھ میں خان اعظم نے ایک بڑا میدان مارا
جام سرسال اُس ولایت کے اعلیٰ حکمرانوں میں سے تھا اور ہمیشہ فساد کھڑا کیا کرتا تھا
اُس نے مظفر کو پیر مرد بنا کر نکالا۔ سورٹھ کا حاکم دولت خاں جو امین غوری کا
بیٹا تھا اور اپنے کو سلاطین غور کی اولاد کہتا تھا) اور راجہ کنکار کچھ کا حاکم بھی شامل ہوا۔
بیس ہزار کا بلوہ باندھ کر لڑنے کو آئے۔ خان اعظم نے ادھر اُدھر خطوط لکھے کوئی
مدد کو نہ آیا اس ہمت والے نے دل نہ ہارا جس طرح ہو سکا جمعیت اکھٹی کر کے نکلا۔
خان اعظم نے چند سرداروں کو فوج دے کر آگے روانہ کر دیا ان سے کوتہ اندیشی یہ ہوئی
کہ غنیم کے ساتھ صلح کی گفتگوئیں کیں اُن کے دماغ اور بھی چڑھ گئے اور جنگ کے
نقارے بجاتے آگے بڑھے۔ ضدی سپہ سالار کو غصہ آیا باوجودیکہ دس ہزار سے
زیادہ جمعیت نہ تھی اور غنیم کے ساتھ تیس ہزار فوج تھی یہ سامنے ڈٹ گیا کہ یکایک
مینہ برسنا شروع ہوا اور بارش کا تار لگ گیا جس انداز سے لڑائی شروع ہوئی تھی وہ ملتوی
ہو گیا اور طرفین سے ترکانہ حملے ہوتے رہے مشکل یہ ہوئی کہ ادھر رسد بند ہو گئی۔
جب تکلیفیں حد سے گزر گئیں تو خان اعظم نے اُس میدان میں فوج کو لڑانا مناسب
نہ سمجھا چار کوس کوچ کر کے جام کے علاقے میں گھس گیا۔ مظفر نے بھی ادھر ہی کا رخ
کیا۔ دریا بیچ میں تھا اُدھر ڈیرے ڈال دیئے۔ فوجوں میں روز چھینا چھپٹی ہو جاتی تھی
مگر ایک دن میدان ہوا اور میدان بھی وہ ہوا کہ فیصلہ ہی ہو گیا۔ دونوں سپہدار اپنی
اپنی سپاہ لے کر نکلے اور قطعے باندھ کے سامنے ہوئے۔ دشمن کے قدم اکھڑ گئے
مظفر اور جام بے ہوش و بدحواس بھاگے۔ اس کے کئی سو سوار دو ہزار بہادروں کے
ساتھ میدان میں کھیت رہے۔ تھوڑی دیر میں سامنا صاف ہو گیا۔ نقد و جنس سے توپ خانہ
ہاتھی۔ سامان امارت و سامان جاہ و حشمت جس قدر فوج شاہی کے ہاتھ آیا اس کا حساب
نہیں۔ اکبری لشکر کے سو بہادروں نے جانیں عزت پر قربان کیں اور پانسو نے زخموں کے
چہرہ گلرنگ کیا۔ فیضی نے اس فتح کی یہ تاریخ کہی "فتوحات عزیزی" ۹۹۹ھ ۱۰۰۰ھ میں

خبر لگی کہ دولت خاں جو جام کی لڑائی میں تیر کھا کر بھاگا تھا۔ تیر اجل کا نشانہ ہوا۔ خان اعظم لشکر آراستہ کر کے نکلا اور جوناگڑھ کی تسخیر پر کمر باندھی۔ پہلا شگون یہ ہوا کہ جام کے بیٹے چند سرداروں سمیت آن ملے ساتھ ہی کوکہ نبگلور۔ سومنات اور سوٹھا بندر بے جنگ قبضے میں آ گئے۔ قلعۂ جوناگڑھ کی مضبوطی فولاد کے ساتھ شرط باندھ کر کھڑی تھی۔ خان اعظم نے توکل بخدا محاصرہ ڈالا۔ اقبال اکبری کا زور دیکھو اسی دن قلعے کے میگزین میں آگ لگ گئی۔ غنیم نے اگرچہ سخت نقصان اٹھایا مگر حوصلہ ذرا نہ ٹوٹا قلعے والے اور بھی زیادہ گرم ہوئے۔ سو توپ پر فتیلہ پڑتا تھا اور برابر ڈیڑھ من کا گولہ گرتا تھا۔ خان اعظم نے سامنے ایک پہاڑی پر سے گولے برسانے شروع کیے۔ قلعے میں بھونچال اور قلعے والوں میں طلاطم مچ گیا۔ خلاصہ یہ کہ قلعے والے تنگ ہو گئے آخر میاں خاں اور تاج خاں پسران دولت خاں نے کنجیاں حوالے کر دیں۔ اور پچاس سردار صاحب نشان ولشکر آ کر حاضر ہوئے۔ خان اعظم نے ان کو بھاری خلعت بلند منصب اور بڑی بڑی جاگیریں دے کر خوش کیا اور خود بھی بہت خوشی ہو کے جشن کیے۔ ہاں جو باوشاہ کے بھائی ہوتے ہیں ایسا ہی کرتے ہیں اور خوش کیوں نہ ہوں اب تو سومنات قبضے میں آیا محمود غزنوی ہو گئے اور حق بھی یہ ہو کہ بڑا کام کیا۔ اکبری سلطنت کا پاٹ سمندر کے گھاٹ تک پہنچا دیا۔ یہ کچھ تھوڑی خوشی کا مقام نہیں۔ اکبر کو بھی اس بات کی بڑی آرزو تھی کیونکہ اسے دریائی طاقت کے بڑھانے کا دل سے خیال تھا۔ اب خان اعظم سمجھا کہ جب تک منظفر ہاتھ نہ آئے گا یہ فساد فرو نہ ہوگا اس نے کئی سردار نامی فوجیں دے کر روانہ کیے۔ منظفر نے ملک ہار راجہ کے پاس پناہ لی تھی کہ دوارکا مندر وہیں ہے۔ راجہ بھی اس کی مدد پر کمر بستہ ہوا۔ یہ فوجیں اس طرح سر توڑ پہنچیں کہ دوارکا بے جنگ ہاتھ آ گیا۔ راجہ نے منظفر کو مع اہل و عیال ایک جزیرے میں بھیج دیا تھا۔ جب انھوں نے راجہ کو دبایا تو وہ بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ انھوں نے گھوڑا اٹھا کر رستے میں جا لیا وہ پلٹ کر اڑا اور خوب جان توڑ کر لڑا۔ دریا کے کنارے تھے شام تک خوب تلوار چلی مگر قضا سے کون لڑے۔ گلے پر چھوٹا سا تیر کھا کر راجہ کی گلو خلاصی ہوئی مگر منظفر گرتا پڑتا نکل کر کچھ میں پہنچا۔ وہاں کے راجہ نے چھپا رکھا اور مشہور کر دیا کہ دریا میں ڈوب گیا۔ خان اعظم کو جب خبر پہنچی اس نے تازہ دم فوج

اپنے بیٹے عبداللہ کے ساتھ روانہ کی۔ جام یہ خبر سن کر گھبرایا اور رستے ہی میں عبداللہ سے آن ملا اور بنیاد اخلاص کو مستحکم کیا۔ کچھ راجہ نے بھی وکیل بھیجے۔ بہت سا عجز و انکسار کیا اور کہا کہ بیٹے کو حاضر دربار اور مظفر کی تلاش کرتا ہوں۔ یہ روداد خان اعظم کو جوناگڑھ پر پہنچی اس نے لکھا کہ اگر صدق دل سے دولت خواہی بادشاہی اختیار کی ہے تو مظفر کو ہمارے حوالے کر دو۔ راجہ نے کہا کہ موربی کا ضلع قدیم سے میرے علاقے میں تھا وہ مجھے دے دو اور جگہ بتا دیتا ہوں تم جا کر گرفتار کر لو۔ خان اعظم کے سپاہیوں حسب نشان دہی اسے گرفتار کر لیا۔ مظفر نے رستے میں حجامت کے استرے سے خودکشی کر لی۔ سر کٹ کر خان اعظم کے پاس آیا اسے خوشی خوشی دربار میں بھیج دیا کہ فساد کی جڑ کٹ گئی سنہ ۱۰۰۱ھ میں اعظم خاں نے بہت بڑا کام کیا۔ خان اعظم سپاہی زادہ تھا اور خود سپاہی ایسے لوگوں کو مذہب کی پاسداری ہوتی ہے تو سخت تعصب کے ساتھ ہوتی ہے۔ دربار میں تحقیقات مذاہب اور اصلاح اسلام کی تدبیریں جاری تھیں۔ اس اصلاح میں ڈاڑھیوں پر ایسی وبا آئی تھی کہ اکثر امراء بلکہ علماء نے ڈاڑھیاں منڈوا ڈالی تھیں۔ چنانچہ اس کی تاریخ یہ ہے ع۔

بگفتار ریش بر باد دادہ مفسدے چند۔

انھیں دنوں میں وہ بنگالے سے فتح پور آیا ہوا تھا یہاں ہر وقت یہی چرچے رہتے تھے۔ اس کے سامنے کسی مسئلہ میں بحث ہونے لگی۔ ضدی سپاہی کو اس وقت مذہب کی ضد آ گئی۔ اس نے بھی گفتگو شروع کی۔ وہاں علماء اور فضلاء کے خاکے اُڑ جاتے تھے یہ تو کیا حقیقت تھے۔ غرض سپاہی بگڑا۔ بخار تو پہلے ہی سے دل میں بھرے تھے نوبت یہ ہوئی کہ بادشاہ کے سامنے ہی شیخ ابوالفضل اور بیربل کو آگے دھر لیا۔ خیر وہ جلسہ انھیں گرم باتوں میں طے ہو گیا۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے آئین باندھا تھا کہ امرائے سرحدی کو ایک مدت کے بعد موجودات دینے کو حاضر ہونا چاہیئے۔ خان اعظم کے نام فرمان پر فرمان گئے۔ قدیمی لاڈلے تھے نہ آئے۔ اکبر کے احکام۔ ابوالفضل کی انشا پردازی کا ایک جادو نہ چلا۔ خان اعظم کی ڈاڑھی بہت لمبی تھی اور اس کے باب میں تحریریں اور تقریریں ہو چکی تھیں۔ ایک دفعہ یہ بھی لکھا تھا ظاہرا پشم ریش شما گرانی می کند کہ ایں ہمہ تعلل در آمدن دارند۔ جام کی لڑائی پر یہ قرار پایا کہ منت مانی یہ مہم فتح ہو جائے گی تو ڈاڑھی دربار اکبری میں چڑھاؤں گا۔ جب مہم فتح ہوئی تو ادھر سے تقاضے شروع ہوئے۔ اس نے جواب میں ڈاڑھی سے بھی لمبی عرضی لکھی

اور سخت لکھی۔ یہاں سے چھیڑ چھاڑ جاری تھی وہ یہ بھی لکھتا تھا کہ اس نے دنیا چھوڑ دی حج کو چلا جاؤں گا۔ خبر نویس اور بعض امرا کے عرائض سے معلوم ہوا کہ بٹیلے نے مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ بادشاہ نے فرمان لکھے۔ بڑھیا ماں نے برابر خطوط لکھے کہ خبردار خبردار ایسا ارادہ نہ کرنا مگر وہ کب سننے والا تھا جو کرنا تھا وہی کر گزرا۔ ایک عرضداشت روانگی کے وقت لکھی اس میں اور مطالب بھی ہیں اس مطلب کے متعلق جو فقرے ہیں اُن کا ترجمہ یہ ہے:۔
"بدخواہانِ دین و دولت نے آپ کو راہِ راست سے ہٹا کر بد عاقبتی کے رستے میں بدنام کر دیا ہے اور نہیں جانتے کہ کون سے بادشاہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ آیا کلام اللہ جیسا قرآن آپ کے لیئے نازل ہوا ہے یا شق القمر جیسا معجزہ آپ سے ہوا ہے؟ چار یار باصفا جیسے اصحاب آپ کے ہیں؟ کہ آپ اپنے تئیں اس بدنامی سے متہم کرتے ہیں۔ بہ نسبت ان خیرخواہوں کے جو حقیقت میں بدخواہ ہیں عزیز کوکہ فدویت رکھتا ہے اور قصد بیت اللہ کرتا ہے۔ اس ارادے سے کہ وہاں بیٹھ کر آپ کے لیئے راہِ راست پر آنے کی دعا کرے گا۔ اُمید وار ہے کہ اس گنہگار کی دعا قاضی الحاجات کی درگاہ میں قبول ہو کر اثر بخشے گی اور وہ آپ کو راہِ راست پر لائے گا"۔ ان دنوں اسی کی حسن تدبیر اور آب شمشیر سے دریائے شور کے کنارے تک اکبری عمل داری پہنچ گئی تھی اور بندر بندر حلقۂ حکومت میں آ گئے تھے۔ اس نے وہاں کے لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ بندر دیو کو دیکھنے جاتا ہوں فقط چند غم گسار لوگوں سے راز کھولا اور کسی سے ذکر نہ کیا۔ اول بندر پور بندر پہنچا اس میں بڑا اور وسیع سنگین قلعہ تھا یہاں سے بنگلور آیا اور یہاں بھی کہا کہ بندر دیو کو جا رہا ہوں۔ حکام بندر سے اقرار نامے لیئے کہ آپ کے بے اجازت سوداگران ملک غیر کو لنگرگاہ دیو میں نہ آنے دیں گے۔ مطلب اس سے یہ تھا کہ پرتگالی قوم پرسا کو دبائے اور دھمکائے رکھے۔ اس کا رعب داب ایسا پھیل رہا تھا کہ وہ دب گئے اور حسبِ خواہش شرطوں پر اقرار نامے لکھ دیئے۔ مرزا نے کئی جہاز بادشاہی بنوائے تھے اُن میں سے ایک جہاز کا نام الٰہی تھا۔ سومنات کے پاس پہنچ کر جہاز الٰہی پر سوار ہوا۔ چھ بیٹوں اور چھ بیٹیوں اور اہل حرم نوکر چاکر لونڈی غلاموں کو اس میں بٹھایا۔ ملازم بھی سو سے زیادہ ساتھ لیئے۔ نقد و جنس سے جو کچھ ساتھ لے سکا وہ بھی لیا کھانے پینے کا کافی ذخیرہ بھرا اور چلتا ہوا۔ جس وقت وہ خیمے سے نکل کر جہاز کی طرف چلا ایک عالم تھا جس کے مشاہدے سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو اور

دلوں میں یا شوق لہراتے تھے۔ تمام لشکر اور فوجیں آراستہ کھڑی تھیں جب لشکر کے سامنے آ کر کھڑا ہو نقاروں پر چوب پڑی پلٹنوں اور رسالوں نے سلامی دی ترم اور طنبور ساز ترکی عربی ہندی باجے بجنے لگے۔ جو سپاہی ہمیشہ لڑائیوں اور پردیس کے دکھوں سردی گرمی کے دنوں میں اس کے شریک حال اور احسانوں اور انعاموں سے مالامال رہتے تھے غم سے لبریز کھڑے تھے۔ جن لوگوں کو قید کیا تھا چھوڑ دیا اور معذرت کر کے خطا معاف کروائی۔ سب سے دعا کی درخواست کی اور لمبے لمبے ہاتھوں سے سلام کرتا ہوا جا بیٹھا۔ ناخدا سے کہا خدا کے نام پر بادبان کھول دو۔ اس کی تاریخ یہ ہوئی:۔

بجائے راستاں شد خان اعظم ۔۔۔ وے در زعم شاہنشاہ کج رفت

چو پرسیدم ز دل تاریخ سالش ۔۔۔ بگفتا میرزا کوکا بہ حج رفت

ناز بردار بادشاہ کو جب یہ خبر پہنچی تو ناگوار بھی ہوا اور رنج بھی ہوا۔ دل کے خیالات عجیب و غریب فقروں میں زبان سے ٹپکے اور کہا کہ عزیز کو میں ایسا چاہتا ہوں کہ اگر وہ مجھ پر تلوار کھینچ کر آتا تو میں ضبط کرتا۔ وہ زخمی کر لیتا تب ہاتھ ہلاتا۔ افسوس اس کم فرصت نے محبت کی قدر نہ جانی اور سفر کر بیٹھا خدا کرے کامیاب مقصد ہو اور خیر و خوشی سے پھر آئے۔ بڑا خیال یہ ہے کہ اگر رنج دوری میں ماں کا کام تمام ہو گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ جی جی تو بارے غم کے مرنے کی قریب ہو گئی۔ بادشاہ نے بہت دل جوئی اور دل داری کی شمس الدین اس کے بڑے بیٹے کو ہزاری منصب دیا اور شادمان کو پانصدی کر دیا۔ جاگیریں بھی اور ادھر جو ملک خالی پڑا تھا اس کی حکومت مراد کے نام کر کے بند و بست کر دیا۔ مکہ معظمہ میں انھوں نے بہت کچھ داد و دہش کی مگر وہاں آئے دن سخاوت کے دریا بہے کرتے ہیں۔ شریف مکہ اور وہاں کے خدام خاطر میں بھی نہ لائے بلکہ بے دماغی اور تلخ مزاجی ان کی مصاحب وہاں بھی ساتھ تھی اور بچوں کی سی ضدیں ہر وقت موجود تھیں۔ ان رفیقوں کی بدولت شرمائے۔ مکے سے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ غرض اہلِ خدا کے گھر میں گزارہ نہ ہو سکا۔ ظلِ خدا کا گھر پھر غنیمت نظر آیا۔ باوجود اس کے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حجرے خرید کر کے وقف کیے کہ حاجی اور زائر آ کر رہا کریں۔ مدینہ منورہ کے خرچ ہر سالہ کی برآمد بنا کر پچاس برس کا مصارف وہاں کے شرفا کو دیا اور رخصت ہوئے۔ سفر کی عمر کوتاہ یہاں لوگ سمجھے بیٹھے تھے کہ اب پھر کر آ چکے سنہ ۱۰۰۲ھ میں یکایک خبر آئی

کہ خان اعظم آ گئے اور گجرات میں پہنچ گئے۔ بادشاہ پھول کی طرح کھل گئے۔ فرمان کے ساتھ خلعت اور بہت سے گراں بہا گھوڑے روانہ کیے۔ محل میں بڑی خوشیاں ہوئیں۔ گجرات بندر رماول کے رستے چھبیسویں دن لاہور میں آن حاضر ہوئے۔ حضور میں آ کر زمین پر سر رکھ دیا۔ اکبر نے اٹھایا۔ مرزا عزیز مرزا عزیز بکتے اور آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ خوب بھینچ کر گلے لگایا۔ جی جی کو وہیں بلا بھیجا۔ بڑھیا بے چاری سے چلا نہ جاتا تھا بیٹے کی جدائی میں جان بلب ہو رہی تھی۔ تھرتھراتی سامنے آئی۔ خوشی کے مارے زار زار روتی تھی۔ وہ اس بے قراری سے دوڑ کر لپٹی کہ دیکھنے والے بھی رونے لگے۔

پنج ہزاری منصب خان اعظم خطاب پھر عنایت کیا اور کہا کہ گجرات۔ پنجاب۔ بہار جہاں چاہو جاگیر لو۔ انھیں بہار پسند آیا۔ بیٹوں کو بھی منصب اور جاگیریں عطا ہوئیں۔ اب انھیں بھی خوب نصیحت ہو گئی تھی آتے ہی خاص مریدوں کے سلسلے میں داخل ہو گئے۔ حضور میں سجدہ ادا کیا۔ ڈاڑھی درگاہ میں چڑھائی اور جو جو لوازم خوش اعتقادی کے تھے سب بجا لائے۔ پھر تو ہر صحبت اور ہم زبانی میں پیش پیش تھے۔ حاجی پور۔ غازی پور جاگیر مل گیا دین الٰہی کے اصول کی علامی سے تعلیم پانے لگے۔ خاقانی نے کیا خوب کہا ہے۔

درین تعلیم شد عمر و ہنوز ابجد ہمی خوانم   ندانم کی سبق آموز خواہم شد بدیوانش۔

سنہ ۱۰۰۳ھ میں ایسے بڑھے اور چڑھے کہ وکیل مطلق ہو کر سب سے اونچے ہو گئے۔ چند روز بعد مہر اوزک (مہر انگشتری) اور پھر مہر توزک (مہر دربار) بھی انھیں کو سپرد ہو گئی جس کا دو اینچ قطر کا دائرہ تھا۔ حکم ہوا کہ سلطنت کے کل احکام سپرد۔ ہفتے میں دو دن سر دیوان بیٹھا کریں۔ تمام اہل عمل ان کی ہدایت کے موافق کام کیا کریں۔ سنہ ۱۰۰۸ھ میں خود بادشاہ نے قلعہ آسیر کا محاصرہ کیا۔ یہ ساتھ تھے۔ سنہ ۱۰۰۸ھ میں وہیں جی جی کا انتقال ہوا۔ بادشاہ نے بہت غم کیا۔ چند قدم اس کے جنازے کو کندھا دیا اور چار ابرو کی صفائی کی۔ سنہ ۱۰۱۱ھ میں ہفت ہزاری شش ہزار سوار کا منصب عطا ہوا اور خسرو ولیعہد سے ان کی بیٹی منسوب ہوئی۔ سنہ ۱۰۱۴ھ میں نحوست کا ستارہ چادر اوڑھ کر سامنے آیا۔ اکبر بیمار ہوا اور اس کی حالت نے ناامیدی کے آثار دکھائے تو انھوں نے اور مان سنگھ نے بعض رازداروں کی معرفت مافی الضمیر دریافت کیا کہ حکم ہو تو خسرو کی

ولی عہدی کی رسمیں ادا کر دی جائیں۔ وہ حقیقت میں جہانگیر سے محبت نہ رکھتا تھا خشق
رکھتا تھا۔ ان کے ارادے تاڑ گیا اور حکم دیا کہ مان سنگھ اسی وقت بنگالہ اپنی جاگیر کو روانہ
ہو جائے۔ خان اعظم ستے قلعے میں رہ گئے۔ آخر اکبر کا انتقال ہوا جہانگیر تخت نشین ہوا امرائے
حاضر دربار ہو کر مبارکبادی کی نذریں دیں۔ نئے بادشاہ نے کمال عظمت سے خان اعظم
کی عظمت بڑھائی اور کہا کہ جاگیر پر نہ جاؤ میرے پاس ہی رہو۔ آخر خسرو باغی ہوا اور جہانگیر
کے دل پر نقش ہو گیا کہ اس لڑکے کا کیا حوصلہ تھا۔ یہ جرأت اسے خان اعظم کی پشت گرمی
سے ہوئی ہے۔ جب اُس کی مہم سے فارغ ہوا تو یہ عتاب و خطاب میں آئے اور اس میں
کچھ شک نہیں کہ خان اعظم کو خسرو کی بادشاہت کا بڑا ارمان تھا۔ غرض اب یہ نوبت ہوئی
کہ دربار میں جاتے تھے تو کپڑوں کے نیچے کفن پہن کر جاتے تھے کہ دیکھیے زندہ
پھروں یا نہ پھروں۔ بڑا عیب اس میں یہ تھا کہ گفتگو میں سخت بیباک تھا اس کی زبان
اس کے قابو میں نہ تھی جو منہ میں آتا تھا صاف کہہ بیٹھتا تھا موقع بے موقع کچھ نہ دیکھتا
اس نے جہانگیر کو تنگ اور اہل دربار کو دشمن کر دیا تھا۔ مآثر الامراء میں ہے کہ ایک شب امیر الامراء
سے سخت کلامی کی بادشاہ نے اُٹھ کر مشورے کا جلسہ کیا امیر الامراء نے کہا کہ
”کشتن او در توقف نمی خواہد“ مہابت خاں نے کہا ”مرا در کنگاش دخلے نیست سپاہیم
شمشیر سروہی دارم بکمر او می زنم اگر دو حصہ نکند دست مرا ببرند“ خان جہاں نے کہا
حضور میں تو اس کے طالع کو دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ ایک جہان خانہ زاد کی
نظر سے گزرا جہاں دیکھا حضور کا نام روشن نظر آیا اور وہیں خان اعظم کا نام بھی موجود۔
قتل کرنا اس کا کچھ مشکل نہیں مشکل یہ ہے کہ ظاہرا کوئی خطا معلوم نہیں ہوتی۔ اگر اسے حضور نے
مارا تو تمام عالم میں وہی مظلوم مشہور رہوگا۔ جہانگیر اس پر ذرا دھیما ہوا۔ اتنے میں سلیمہ سلطان بیگم
پردے کے پیچھے سے پکار کر بولیں ”حضور محل کی بیگمات اُس کی سفارش کو آئی
ہیں۔ حضور آئیں تو آئیں ورنہ سب باہر نکل پڑیں گی“ بادشاہ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے
محل میں چلے گئے وہاں سب نے مل کر ایسا سمجھایا کہ خطا معاف ہو گئی۔ یہ آگ تو دب گئی
مگر چند ہی روز بعد خواجہ ابو الحسن تربتی نے خاص اُس کے ہاتھ کا لکھا ایک خط
مدت سے لگا رکھا تھا اب پیش کیا۔ اُس کا حال خود جہانگیر نے توزک میں یوں
لکھا ہے۔ عمیر البقین کہتا تھا کہ خسرو اُس کا داماد ہے اور وہ ناخلف میرا دشمن ہے اس کے

سبب سے میری ذات سے خان اعظم کے دل میں ضرور نفاق ہے۔ اب اُس کے
ایک خط سے معلوم ہوا کہ خبث طبعی کو اُس نے کسی وقت بھی جانے نہیں دیا۔
بلکہ میرے والد بزرگوار سے بھی جاری رکھا تھا۔ مجمل یہ ہے کہ ایک موقع پر اُس نے
ایک خط راجہ علی خاں کو لکھا تھا۔ اول سے آخر تک بری اور بد پسندی اور ایسے
مضمون کہ کوئی دشمن کے سیئے بھی نہیں لکھتا اور کسی کی طرف نسبت نہیں رکھتا
چہ جائیکہ حضرت عرش آشیانی جیسے بادشاہ اور صاحب قدردان کے حق میں
وغیرہ وغیرہ۔ یہ تحریر برہان پور راجہ علی خاں کے خزانے سے ہاتھ آئی۔
اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اگر بعض خیالات کا اور اُس کی
ماں کے دودھ کا ملاحظہ نہ ہوتا تو بجا ہوتا کہ اپنے ہاتھ سے اُسے قتل کرتا۔
بہر حال بلایا اور اُس کے ہاتھ میں وہ نوشتہ دے کر کہا کہ سب کے سامنے باواز
بلند پڑھو۔ مجھے گمان تھا کہ اسے دیکھ کر اس کی جان نکل جائے گی۔ انتہائے
بے شرمی اور بے حیائی ہے کہ اس طرح پڑھنے لگا گویا اُس کا لکھا ہی نہیں کسی اور کا
لکھا ہوا پڑھایا ہے وہ پڑھ رہا ہے۔ حاضران مجلس بہشت آئین بندہ ہائے اکبری
وجہانگیری جس نے وہ تحریر دیکھی اور سنی لعنت اور نفرین کرنے لگے۔ اُس
سے پوچھا کہ قطع نظر ان نفاقوں کے جو مجھ سے کیئے اور اپنے اعتقاد ناقص
میں اُن کے لیئے کچھ وجہیں بھی قرار دی تھیں۔ والد بزرگوار نے کہ تجھ کو اور تیرے
خاندان کو خاکِ راہ سے اُٹھا کر اس مرتبۂ اعلیٰ تک پہنچایا کہ اس درجے پر پہنچے
بات کیا ہوئی تھی ؟ کہ دشمنان ومخالفان دولت کو ایسی باتیں لکھیں اور اپنے
تئیں حرام خواروں اور بدنصیبوں میں جگہ دی۔ سچ ہے۔ سرشت اصلی اور پیدائش
طبعی کو کیا کرے۔ جب تیری طبیعت نے آب نفاق سے پرورش پائی ہے تو ان
باتوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو کچھ مجھ سے کیا تھا اُس سے میں درگزرا
اور جو منصب تھا پھر اسی پر سرفراز کیا۔ گمان تھا کہ تیرا نفاق خاص میرے ہی ساتھ
ہوگا اب جو یہ بات معلوم ہوئی کہ اپنے مربی اور خداوند مجازی سے بھی
اس درجہ پر تھا تو تجھے تیرے اعمال اور تیرے مذہب کے حوالے کیا۔ یہ باتیں
سن کر چپ رہ گیا۔ ایسی روسیاہی کے جواب میں کہے کیا ؟ ۔ جاگیر کی موقوفی کا

ظلم کیا اور جو کچھ اس ناشکر سے نے کیا تھا اگرچہ اس میں عفو و درگزر کی گنجائش نہ تھی مگر بعضے
ملاحظوں کی رعایت کر کے درگزر کی"۔ مورخ لکھتے ہیں کہ نظر بند بھی رہے ۱۰۲۵ھ میں
خسرو کے ہاں بیٹا ہوا (خان اعظم کا نواسہ) بادشاہ نے بلند اختر نام رکھا۔ خان اعظم کو گجرات
عنایت ہوا اور حکم ہوا کہ وہ حاضر دربار رہے۔ جہانگیر قلی اُس کا بڑا بیٹا جا کر ملک کا کاروبار
کرے ۱۰۲۸ھ میں اسے داور بخش یعنی خسرو کے بیٹے کا اتالیق کیا۔ اسی سنہ میں امرائے
جلیل القدر دکن پر بھیجے گئے اور مہم بگڑ گئی۔ خان اعظم کو چند امرا اور منصبداروں سمیت
ساتھ فوج دے کر کمک کے لیے بھیجا۔ دس ہزار سوار۔ دو ہزار احدی۔ کل بارہ ہزار۔
تیس لاکھ روپیہ خرچ خزانہ۔ کئی حلقے ہاتھیوں کے ساتھ کیے۔ خلعت فاخرہ کمر شمشیر
مرصع گھوڑا اور فیل خانہ اور پانچ لاکھ روپیہ امداد کے طور عنایت ہوا۔ خان اعظم کا ستارہ
جو ابھی نحوست کے گھر سے نکلا اسی سنہ میں پھر رجعت کھا کر اُلٹا گرا۔ وہ برہان پور میں
بیٹھا امارت کی بہاریں لوٹ رہا تھا معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ اودے پور کی مہم لیا چاہتے ہیں
انھیں بھی جوش آیا اور درخواست کر دی۔ اس جاں نثاری سے جہانگیر بہت خوش ہوا
اور یہ مہم پر روانہ ہوئے۔ مہم شروع ہوئی وہاں سے عرضی کی کہ جب تک نشان اقبال
ادھر کی ہوا میں نہ لہرائے گا کھلنا اس عقدے کا دشوار ہے۔ جہانگیر اُٹھے اور اجمیر تک
جا پہنچے۔ شاہزادہ خورم (شاہ جہاں) کو دو ہزار سوار خوش اسپ امرائے کہنہ عمل
اور بہت سے سامان ضروری دے کر آگے روانہ کیا یہ سب وہاں پہنچے اور
کاروبار جاری ہوا۔ شاہزادے اور خان اعظم کی رائے نے مطابقت نہ کھائی
کام بگڑنے لگے۔ اُدھر شاہزادے کی عرضیاں آئیں۔ غرض بادشاہ کے دل پر
نقش ہو گیا کہ فساد خان اعظم کی طرف سے ہے۔ بڑا خلل خورسان کا وہ رشتہ تھا کہ خسرو کے
خسر تھے اور خسرو خود جرم بغاوت میں معتوب تھا چنانچہ شاہزادہ خورم نے صاف
لکھا کہ خان اعظم اسی رعایت سے مہم کو برباد کیا چاہتا ہے اس کا یہاں رہنا کسی طرح
مناسب نہیں۔ بادشاہ نے فوراً مہابت خاں کو روانہ کیا اور حکم دیا کہ خان اعظم کو اپنے
ساتھ لے کر آؤ۔ وہ گیا اور خان کو عبداللہ اس کے بیٹے سمیت حاضر دربار کیا۔
آصف خاں کے سپرد ہوئے اور قلعہ گوالیار میں قید ہونے گئے اور خسرو کا بھی دربار
میں آنا جانا بند کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد خان اعظم چھوٹ گئے اور ۱۰۳۱ھ میں خسرو نے

دمد تو نیغ سے دکن میں وفات پائی۔ بعض مورخ یہ بھی کہتے ہیں کہ رات کو اچھا بھلا سویا صبح دیکھو تو فرش پر مقتول پڑا تھا۔ سنہ ۱۰۳۲ھ میں داور بخش خسرو کے بیٹے کو صوبہ گجرات عنایت ہوا انھیں بھی ساتھ رخصت کیا۔ سنہ ۱۰۳۳ھ میں بدمزاجی اور خود غرضی نفاق اتفاق کے جھگڑے تمام ہوئے۔ ساری باتیں زندگی کے ساتھ ہیں۔ مرگئے کچھ بھی نہیں۔ احمد آباد گجرات میں خان اعظم نے دنیا سے انتقال کیا۔ جنازے کو دلی میں لائے اور سلطان المشائخ کے ہمسائے میں اتکہ خاں سوتے تھے ان کے پہلو میں بیٹے کو لاکر امان زمین کے سپرد کردیا۔ خان اعظم کی ہمت شجاعت۔ سخاوت۔ لیاقت سے تمام کتب تواریخ اور تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ جہانگیر بادشاہ نے خود توزک میں یہ لکھا ہے کہ "میرے اور میرے والد بزرگوار نے اُس کی ماں کے دودھ کا خیال کرکے اُسے سب امرا سے بڑھادیا تھا اور اسے اور اسکی اولاد کی طرف سے عجیب عجیب باتوں کی برداشت کرتے تھے"۔ علم سیر و فن تاریخ میں اُسے کامل دستگاہ تھی۔ تحریر اور تقریر میں بے نظیر تھا۔ نستعلیق خوب لکھتا تھا۔ ملا باقر کا شاگرد تھا۔ یہ بات بالاتفاق ہے کہ ارباب استعداد اُس کے قطع کو اساتذۂ مشہور کی تحریر سے کم درجہ دیتے تھے۔ مدعانویسی میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا مگر عربیت سے عاری تھا۔ لطیفہ گوئی میں بے مثل تھا۔ شعر بھی اچھا کہتا تھا۔ یہ رباعی اُس کے واردات حال سے ہے:۔

عشق آمد و از جنوں برومندم کرد وارستہ ز صحبت خردمندم کرد
آزاد ز بند دین و دانش گشتم تا سلسلۂ زلف کسے بندم کرد

مآثر الامرا وغیرہ تاریخوں سے صاف صاف ثابت ہے کہ اعظم خاں کی خود پسندی خود رائی بلند نظری بلکہ اوروں کی بد اندیشی حد سے گذری ہوئی تھی اور اکبر کی دل داریوں اور ناز برداری نے ان قباحتوں کو پرورش کیا تھا جس کے حق میں جو چاہتا تھا کہہ بیٹھتا تھا۔ کسی انسان یا مقام یا انجام کا لحاظ نہ کرتا تھا۔ اسی واسطے یہ بات نشان زد تھی کہ اسے اپنی زبان پر اختیار نہیں۔ آخر اقرار نامہ لیا گیا کہ جب تک ہم تم سے بات نہ پوچھیں تم نہ بولو۔ لطیفہ ایک دن جہانگیر نے جہان قلی زین خاں بیٹے سے کہا کہ تمھارا پدر سی قسوری؟ اُس نے کہا "در ہر امر مگر زبان"۔ تحصیل علمی عالمانہ نہ تھی لیکن دستار داری اور مصاحبت میں بے نظیر تھا ہر بات ایک لطیفہ تھی۔ فارسی کے فصیح انشاپرداز اور عمدہ مطلب نگار تھے زبان عربی تحصیل نہ کی تھی مگر کہا کرتے تھے "دو حرفی وارہ عربیم" لطیفہ۔ ان کا قول تھا کہ جب کسی معاملے میں کوئی جھگڑا کہتا ہے

تو میں سمجھتا ہوں ایسا ہی ہوگا اور اُسی بنا پر کارروائی کی صورت سوچنے لگتا ہوں جب وہ کہتا ہے کہ نواب صاحب آپ غلط سمجھیں میں سچ کہتا ہوں۔ تب مجھے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ قسم کھاتا ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ جھوٹا ہے۔ مصاحبت اور علم مجلس میں بے نظیر تھے اور مزے کی باتیں کرتے تھے لطیفہ۔ فرمایا کرتے تھے کہ امیر کے لیے چار بیبیاں چاہئیں۔ مصاحبت اور باتوں چیتوں کے لیے ایرانی۔ خانہ سامانی کے لیے خراسانی۔ سیج کے لیے ہندوستانی۔ چوتھی ترکانی جس سے ہر وقت ملاتے دہاڑتے رہیں کہ اور بیبیاں ڈرتی رہیں۔ انکا مقبرہ چونسٹھ کھمبے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عمارت ۶۹ فٹ مربع اور چونسٹھ کھم کا مقبرہ ہے جس کی بلندی ۲۲ فٹ ہے جسے مرزا صاحب نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا۔ ستون جالیاں فرش چھت سب سنگ مرمر کی ہیں۔ ستونوں کی نشست اس طرح پر ہے کہ مقبرے کے ہر کونے پر چار چار کھم ملے ہوئے ہیں اس کے بعد چار دہرے ستونوں کا سلسلہ ہے۔ باہر چار اٹھائیس ستون ہیں۔ اندر بھی اسی طرح چار چار ملا کر چار قطاریں ستونوں کی ہیں جو باہر کی قطار کے جواب میں ہیں۔ اندرونی ستون بارہ بارہ فیٹ کے فصل سے ہیں۔ چار چار ستونوں کے گروپ پر پچیس چھوٹی چھوٹی برجیاں ہیں جن کے نیچے بہت نفیس محرابیں ہیں ستونوں کے اوپر نیچے کے حصے نہایت نفیس نقش و نگار سے آراستہ ہیں اور تمام بالکل صاف شفاف سنگ مرمر کے ہیں۔ باہر کے ستونوں میں دس فیٹ اونچی جالیاں لگی ہوئی ہیں اور بعض میں اٹھارہ اٹھارہ انچ کے دے لگے ہوئے ہیں۔ جالیوں کے اوپر کی محرابیں کھلی ہوئی ہیں۔ مقبرے کے چار دروازے چاروں طرف درمیانی محراب میں ہیں جن میں لوہے کی سلاخوں کے جنگلے چار دروازے آرکیکیلو انجنیر نے لگا دیئے ہیں جن سے اندر کی حالت سب نظر آتی ہے۔ چھت کے اطراف ایک مشبک کٹہرا ہے اور بچا ہے۔ فرش کے تھوڑے حصے میں سنگ سرخ بھی لگا ہوا ہے۔ جالیاں جا بجا سے شکستہ ہو گئی تھیں اُن میں سفید پتھر لگا کر مرمت کر دی گئی ہے۔ مشرقی دروازے سے جب ہم ہال کے اندر داخل ہوتے ہیں تو ہال میں چار قطاریں ستونوں کی ہونے سے پانچ حصے ہو گئے ہیں۔ پہلا اور دوسرا حصہ خالی ہے۔ تیسرے حصے میں مرزا عزیز کے بھائی اکبر یوسف محمد خاں اور اُن کے

بھتیجے کی قبر ہے۔ چوتھے حصے میں خود مرزا صاحب کی قبر ہے اور اُن کے بائیں ہیں
اُن کے دوسرے بھتیجے کی قبر ہے۔ پانچویں حصے میں مرزا عزیز کی بیوہ بیٹی کی قبر ہے
اور شمالی کونے میں سب سے الگ کٹہرے کے اندر مرزا عزیز کے ایک اور بھتیجے
کی قبر ہے۔ باقی اور قبریں اہالی خاندان کو کلتاش کی ہیں۔ اس طرح چونسٹھ کھمبے میں
سب ملا کر دس قبریں ہیں۔ مرزا صاحب کی قبر پر علاوہ اُن کے نام کے تاریخ وفات
سنہ ۱۰۲۳ھ کندہ ہے جس کا تعویذ قابل دید ہے اُس کی صناعی لاجواب ہے۔ اس کے بیل بوٹے
پھول پتیاں ٹہنیاں کچھ ایسی نزاکت اور عمدگی سے بنائی گئی ہیں کہ قوت بیان
اس سے قاصر ہے۔ اگرچہ یہ قبر مرزا جہانگیر کی قبر کے تعویذ کو باعتبار کاری گری
اور خوبی کے نہیں پہنچتی لیکن چوں کہ یہ مسقف مکان میں محفوظ ہے اور وہ زیر سما۔
اس کے نقش و نگار میں ابھی تک چمک دمک اور آب و تاب زیادہ باقی ہے چونسٹھ کھمبا
باہر سے کچھ ایسا خوب صورت نہیں معلوم ہوتا جیسا نفیس کہ وہ اندر سے ہے۔ اس کے
نفیس سڈول اور مملا نقش و نگار سے آراستہ ستون۔ اُس کی محرابیں۔ اُس کی نہایت
خوب صورت جالیاں جو عمارت کے چاروں طرف لگی ہوئی ہیں کچھ عجیب لطف دیتی
ہیں۔ مقبرہ کا اندرونی حصہ ایسا نازک صاف ستھرا اور خوش نما ہے کہ وہ اپنی آپ ہی
نظیر ہے اور کسی طرح شاہجہاں بادشاہ کی نفیس عمارات اور محلات سے کم نہیں ہے۔
اسی کے زیر سایہ بہادر شاہ آخری بادشاہ دہلی کے محلات اور صاحب زادیوں
کی قبریں ہیں۔

چونسٹھ کھمبے پر کے کتبات

غربی دروازے پر قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا
بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۔ شمالی دروازے پر فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ شرقی دروازے پر وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ جنوبی دروازے پر کوئی
کوئی کتبہ نہیں ہے۔

مکان کی اندرونی حالت

اس عمارت کی چھت لداؤ کی ہے جس کے اندر (۲۵) گنبد ہیں مگر اوپر چھت سپاٹ ہے

اور چونسٹھ ستون ہیں اسی سبب سے چونسٹھ کھمبا مشہور ہے۔ عمارت کے اندر ستونوں کی پانچ قطاریں ہیں۔ پہلی قطار خالی ہے۔ دوسری میں ایک نامعلوم قبر ہے۔ تیسری میں چار قبریں ہیں۔ غربی جانب شروع کی قبر مرزا عزیز کوکلتاش کی بیوی کی ہے اُس سے ملی ہوئی خود مرزا صاحب کی بہت بڑی اور نہایت خوب صورت قبر دوہرے چبوترے پر بنی ہوئی ہے جو سر تا سر سنگ مرمر کی ہے اور تعویذ پر نہایت عمدہ نقش و نگار اور گرد آیۃ الکرسی اور تعویذ کے اوپر بسم اللہ اور ھُوَ الْحَیُّ الَّذِی لَا یَمُوْتُ اور ۱۰۳۳ھ کندہ ہے۔ دو قبریں نامعلوم ہیں۔ چوتھے حصے میں چار قبریں نامعلوم ہیں۔ پانچویں حصے میں دو قبریں ہیں۔ ایک معلوم نہیں کس کی ہے مگر غرب رخ والی زنانی قبر مرزا عزیز کی بہو کی کہی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے ارادہ تھا کہ یہ ساری عمارت درو بست چاندی کی بنائی جائے مگر لوگوں نے کہا کہ چاندی کی عمارت کو کون رہنے دے گا تب سنگ مرمر کی بڑی نفاست سے بنائی گئی۔ گورنمنٹ کی طرف سے بہت کچھ مرمت کی گئی ہے مگر وہ بالکل جعلی کھاتی ہے یعنی بمقابلہ اصل عمارت کے بعض تھوپم تھاپی ہے۔ فرش میں سے کئی سنگ مرمر کے چوکے اکھڑ گئے ہیں۔ یہ مقبرہ ایک بڑے وسیع احاطے کے اندر واقع ہے اب دروازوں میں لوہے کا جنگلا لگا دیا گیا ہے جس کی کنجی ایک حلال خور کے پاس رہتی ہے اور وہی اس کا نگہبان ہے اور صفائی رکھتا ہے۔ مرزا عزیز کوکلتاش کی خبر گیری اب ایک بھنگی کے سپرد ہے۔ اللہ اللہ کیا زمانے کا انقلاب ہے۔

ایک سنگ مرمر کی سل اور کتبہ

اس مقبرے کے ایک کونے میں ایک سنگ مرمر کی سل ۴ - ۲ × ۲ - ۶ رکھی ہوئی ہے جس پر بہت عمدہ نقاشی کا کام ہے۔ خدا جانے کہاں کی ہے۔ اُس کا نقشہ یہ ہے:-

---

[illegible]

ببر مارا بصحرا سے قیامت — کشا بر ما بہر صورت کہ دانی

یہ اشعار نہایت خوش خط نستعلیق ہیں جو پتھر کے گرد لکھے ہوئے ہیں حصہ زیریں ٹوٹ گیا ہے۔ اس تمام متن میں بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں

[illegible]

یہ حصہ ٹوٹ گیا ہے

علاء الدین کی قبر مقبرے کے احاطے کے باہر ایک چبوترے پر ایک قبر ہے جس پر یہ کتبہ ہے:۔

هو الغفور

از دوام غم و رنج علاء الدین است	چوں سوی جناں رفت ز دار دنیا
تحریر بسال انتقالش گردید	آرام گہش با د بہشت زیبا

مرزا اسد اللہ خان غالب کا مزار ۱۸۶۹ء

رشک عرفی و فخر طالب مرد ۱۲۸۵
اسد اللہ خانِ غالب مرد

چونسٹھ کھمبے سے ملا ہوا بجانب شمال ایک احاطے میں اور قبروں کے ساتھ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب عرف مرزا نوشہ کی پختہ قبر ہے۔ آپ چونکہ بڑے پائے کے نامور اور مشہور شاعر تھے لہٰذا آپ کا کچھ مختصر حال آب حیات اور حیات غالب سے لکھا جاتا ہے:۔ آپ اردو میں غالب اور ریختہ میں اسد تخلص کرتے تھے۔ آپ کی ولادت ہشتم ماہ رجب سنہ ۱۲۱۲ھ کو آگرے میں ہوئی آپ کے آباواجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور ان کا سلسلۂ نسب تورابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ مرزا صاحب کے دادا گھر چھوڑ کر نکلے شاہ عالم کا زمانہ تھا دہلی آئے یہاں بھی سلطنت میں کچھ نہ رہا تھا۔ صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے شاہی دربار میں عزت پائی اور خاندان کے نام سے پہاسو کا پرگنہ رسالے کی تنخواہ میں جاگیر ملا۔ شاہ عالم کے بعد طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا اور وہ علاقہ بھی جاتا رہا۔ غالب کے باپ مرزا عبد اللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کے دربار میں پہنچے چند روز بعد حیدر آباد دکن میں جا کر نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس کے بعد ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں یہ صورت بھی بگڑی۔ وہاں سے گھر آئے اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کی عمر (۵) برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے انھوں نے دُرِ یتیم کو دامن میں لے لیا۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں جنرل لیک کا عمل ہوا۔ ان کے چچا چار سو سواروں کے افسر مقرر ہوئے۔ سترہ سو روپیہ مہینا ذات کا اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی ہونک

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی

اور سوانے کے پر گنے نواب آگرے ہیں مین حیات جاگیر مقرر ہوگئے۔ مرزا چچا کے
رسالے میں پرورش پاتے تھے مگر اتفاق ہو کر مرگ ناگہانی سے یہ بھی مر گئے۔ رسالہ
برطرف ہوگیا۔ جاگیر ضبط ہوگئی قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے بہت تدبیریں اور
وسیلے درمیان آئے مگر سب بن بن کر بگڑ گئے۔ جاگیر کے عوض میں
مرزا اور اُن کے خرسگار کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار
روپیے سال مقرر ہوئے اُنھوں نے مرزا صاحب کو صرف ساڑھے سات سو روپیے
سال دیئے اس پر جھگڑا چلا مرزا نواب صاحب کے سلوک سے نالاں ہوکر سنہ ۱۸۳۰ء میں کلکتے گئے
سپریم گورنمنٹ میں دوادوش کی مگر دو برس کے بعد وہاں سے ناکام واپس پھرے اور ایام
جاتی ابھی پورے نہ ہوئے تھے کہ بزرگوں کا سایہ تمام کرکے دلّی میں آئے۔ غرض
یہ کہ احمد بخش کی وفات کے بعد سنہ ۱۸۵۷ء تک وہی ساڑھے سات سو ملتے رہے
مگر فتح دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے سبب پنشن بند رہی۔ آخر جب
مرزا کی ہر طرح سے بریت ہوگئی تو پنشن پھر جاری ہوگئی اور تین برس کی واصلات بھی سرکار
نے عنایت کی پنشن کی مسدودی کے زمانے میں مرزا صاحب کو عسرت اخراجات
نے تنگ پکڑا انھیں رام پور جانا پڑا۔ نواب صاحب سے تعارف سابقہ تھا یعنی سنہ ۱۸۵۵ء
میں شاگرد ہوئے تھے اور ناظم تخلص کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ کچھ بھیجتے بھی رہتے
تھے۔ اُس وقت قلعے کی تنخواہ جاری تھی۔ سرکاری پنشن کھلی ہوئی تھی اُن کی عنایت فتوح غیبی
گنی جاتی تھی۔ جب دلّی کی صورت بگڑی تو زندگی کا مدار اس پر ہوگیا۔ نواب صاحب نے
سنہ ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینا کر دیا اور انھیں بہت تاکید سے بلایا بہت تعظیم و تکریم سے
پیش آئے جب تک رکھا کمال عزت کے ساتھ رکھا بلکہ سو روپئے مہینا ضیافت کا
زیادہ کر دیا۔ مرزا کو دلّی بغیر چین کہاں چند روز کے بعد پھر دلّی چلے آئے۔ چوں کہ پنشن
سرکاری بھی جاری ہوگئی تھی اس لیے چند سال زندگی بسر کی۔ آخر عمر میں بڑھاپے
نے بہت عاجز کر دیا۔ کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا۔ نقش تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے
کسی کو کچھ کہنا سننا ہوتا تھا تو لکھ کر رکھ دیتا تھا وہ دیکھ کر جواب دیتے تھے۔ آخر تہتر برس
چار مہینے کی عمر میں ۲ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ کو انتقال کیا "آہ غالب بمرد" تاریخ وفات ہے۔
مطابق فروری سنہ ۱۸۶۹ء
مرزا صاحب اہل ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اول اول شیخ معظم ہندی اور پھر

ہرمزد نام ایک پارسی ژند و پاژند کا عالم تھا اُس نے اسلام اختیار کیا اور عبدالصمد نام رکھا۔ بہ تقریب سیاحت ہندوستان بھی آنکلا۔ مرزا کا سن چودہ سال کا تھا۔ وہ دو برس تک اُسے اپنے گھر مہمان رکھ کر اکتساب کمال کیا۔ اس روشن ضمیر کے فیضانِ صحبت کا انھیں فخر تھا اور حقیقت میں یہ امر قابلِ فخر تھا بھی۔ فارسی سے انھیں ازلی مناسبت تھی یہ اکتساب کمال اور سونے پر سہاگا ہو۔ (حلیہ)۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں "تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے تمہارے گندمی رنگ پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُس کی ستائش کرتے تھے۔۔۔۔ ہاں مجھ کو رشک آیا۔۔۔ تو اس بات پر کہ (تمہاری) ڈاڑھی خوب گھُٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔۔ بیسرے جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مِسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں (یعنی دلّی میں) ایک وردی ہے عام۔ مُلّا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقہ۔ بھٹیارہ۔ جولاہا۔ کنجڑا منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ میں نے جس دن ڈاڑھی رکھی اُس دن سر منڈایا"۔ مرزا جوانی میں نہایت حسین و خوش رو تھے اور بڑھاپے میں بھی حسانت اور خوب صورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر آخر عمر میں قلّت غذا اور امراضِ دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و نزار ہو گئے تھے کمر بھی جھک گئی تھی لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے اس حالت میں بھی وہ ایک نووار و تورانی معلوم ہوتے تھے۔ لباس اُن کا اکثر اہلِ ولایت کا ہوتا تھا۔ سر پر اگرچہ پاپاخ نہ تھی مگر لمبی ٹوپی جو گوشہ سیاہ پوستین کی ہوتی تھیں۔ ایک لمبی قبا اور اس پر ایک جامہ اور گھتیلی جوتی پہنتے تھے ۱۲۲۵ھ میں نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں مرحوم کی صاحبزادی سے تیرہ سال کی عمر میں مرزا صاحب کی شادی ہوئی تھی گھر لانے کی لاج بہ خیال کر کے بی بی کا پاس خاطر بہت مد نظر رکھتے تھے۔ پھر بھی پاس قید سے کہ شوخیِ طبع تھی جب بہت دق ہوتے تو ہنسی میں ٹال دیتے تھے چنانچہ بعض نقلیں بھی مشہور ہیں۔ ایک عزیز شاگرد سے بے تکلفی تھی اس نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی بی بی کے مرنے کا حال لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ننھے ننھے بچے ہیں اب اور شادی کر

تو کیا کرے پھر بچے کون پالے۔ اس شخص کی ایک بی بی پہلے مرچکی تھی یہ دوسری تھی مرزا صاحب اُسے لکھتے ہیں۔ "امراؤ سنگھ کے حال پر اُس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اُس کو سمجھاؤ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔" مرزا صاحب کے فرزندان روحانی کا تو انبوہ کثیر ہے مگر فرزندان ظاہری سے بے نصیب رہے۔ سات بچے ہوئے مگر برس دن کے پس و پیش میں سب ملک عدم کو چلے گئے۔ ان کی بی بی کے بھانجے الٰہی بخش خاں مرحوم کے نواسے زین العابدین خاں دو ننھے ننھے بچے یادگار چھوڑ کر مر گئے بی بی ان بچوں کو بہت چاہتی تھیں مرزا نے انھیں اپنے بچوں کی طرح پالا۔ بڑھاپے میں انھیں گلے کا ہار کئے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے وہ پالکی میں ساتھ ہوتے تھے اُن کے آرام کے لیئے آپ بے آرام ہوتے تھے۔ افسوس کہ مرزا کے بعد دونوں مر گئے مرزا کثیر الاحباب تھے دوستوں سے دوستی کو ایسا نباہتے تھے کہ اپنا بہت سے زیادہ۔ اُن کی دوست پرستی خوش مزاجی کے ساتھ رفیق ہو کر ہر وقت ایک دائرہ شرفا اور رئیس زادوں کا اُن کے گرد دکھاتی تھی۔ انھیں سے غم غلط ہوتا تھا اور اسی میں اُن کی زندگی تھی۔ لطف یہ ہے کہ دوستوں کے لڑکوں سے بھی وہی باتیں کرتے تھے جو دوستوں سے۔ اُدھر ہونہار نوجوانوں کا مؤدب بیٹھنا۔ ادھر سے بزرگانہ لطیفوں کا پھول برسانا اُدھر سعادت مندوں کا چپ مسکرانا اور بولنا حد ادب سے قدم نہ بڑھانا ادھر پھر شوخی طبع سے باز نہ آنا ایک عجیب کیفیت رکھتا تھا۔ بہرحال انھیں لطافتوں اور ظرافتوں میں زمانے کی مصیبتوں کو ٹالا اور ناگوار کو گوارا کر کے ہنستے کھیلتے چلے گئے۔ مرزا صاحب کا سارا خاندان سنت والجماعت تھا مگر اہل راز اور تصنیفات سے ثابت ہے کہ وہ خود شیعہ تھے اور لطف یہ کہ ظہور اس کا جوش محبت اہل بیت کے اظہار میں تھا نہ تبرا اور تکرار میں۔ چنانچہ اکثر لوگ انھیں تفضیلی کہتے تھے۔ مولانا فخر قدس سرہ العزیز سے بیعت تھے۔ نماز تراویح مسجد جامع میں پڑھتے سنتے تجہیز و تکفین اہل سنت کے طریق پر عمل میں آئی غرض یہ کہ بے ہمہ اور با ہمہ مرنج و مرنجاں تھے۔ اردو میں الفریبا

اٹھارہ سو شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے جو ۱۸۳۹ء میں مرتب ہو کر چھپا۔ اس میں کچھ تمام کچھ نا تمام غزلیں ہیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ غزلوں کے علاوہ تخمیناً پندرہ سو شعر قصیدوں کے (۱۶۲) مثنوی ۳۶ شعر۔ متفرقات قطعوں کے ۱۱۱ شعر۔ رباعیاں ۱۶۔ دو تاریخوں کے چار شعر جس قدر عالم میں مرزا کا کلام بلند ہے اُس سے ہزاروں درجے عالم معنی میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجے کے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب ان شکایتوں کے چرچے زیادہ ہوئے کہ ان کا کلام مغلق اور فارسی کی ترکیبوں سے ادق ہو جاتا ہے تو اُس ملک بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیم سخن کا بھی بادشاہ تھا ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا اور ایک رباعی بھی کہی :—

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا　　　　نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

رباعی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　　　سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشہ کے شیر تھے۔ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوہ خاص تھا۔ چونکہ فارسی کی طرف رغبت زیادہ تھی اور اُس سے انھیں طبعی تعلق تھا اس لیے اکثر الفاظ کی ترکیب ایسی ہوتی کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں۔ لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے ؎

لاکھ مضمون اور اس کی ایک ٹھال　　　　سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

اہل ظرافت اپنی نوک جھوک سے چوکتے نہ تھے چنانچہ ایک دفعہ مشاعرے میں حکیم آغا جان عیش ایک خوش طبع شگفتہ مزاج شخص تھے غزل طرحی میں یہ قطعہ پڑھا

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　　　مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے　　　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اسی واسطے اواخر عمر میں نازک خیالی کے طریقے کو بالکل ترک کر دیا تھا چنانچہ اخیر کی غزلیں صاف صاف ہیں۔ سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کی رائے سے مرزا صاحب

منتخب کر دیا تھا۔ عود ہندی۔ اردوئے معلیٰ۔ لطائف غیبی۔ تیغ تیز۔ ساطع برہان
اردو کی اور دوسری تصانیف ہیں۔ زبان فارسی میں قصائد حمد و نعت۔ غزلوں کا دیوان
پنج آہنگ۔ ۱۸۶۲ء میں قاطع برہان جس میں کچھ تبدیلی کر کے پھر چھپوایا اور
درفش کاویانی نام رکھا۔ نامۂ غالب۔ مہر نیم روز۔ دستنبو۔ سبد چین۔ گل رعنا۔
لطائف غیبی۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہو ایک سرسری نظر میں تہ کو پہنچ جاتے تھے۔
حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعے میں رہتی تھیں۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی
کہ بقول مولانا حالی اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے
تو بجا ہے۔ حسن بیان۔ حاضر جوابی۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں تھے۔
نہایت وسیع الاخلاق اور کثیر الاحباب تھے جو شخص ان سے ملنے جاتا کیسا ہی
مغموم ہوتا خوش ہو کر آتا۔ فراخ حوصلہ ایسے کہ کوئی سائل ان کے در سے
خالی نہ پھرتا۔ غریبوں اور محتاجوں کی حتی الامکان مدد کرتے۔ خودداری مزاج میں
بہت تھی بدون پالکی یا ہوادار کے کبھی باہر نہ نکلے۔ عمائد شہر میں جو لوگ ان کی
ملاقات کو نہ آتے وہ بھی نہ جاتے۔ مرزا کی خودداری کی ایک مثال مشہور ہے کہ
جب دہلی کالج کی پروفیسری کے لیئے بلائے گئے تو صرف اس بات پر بغیر ملے
واپس چلے آئے کہ مسٹر ٹامسن جنہوں نے بلایا تھا ان کے استقبال کو نہیں آئے
گو سات سو روپیئے سالانہ کی پنشن تھی اور سو روپیئے رام پور سے ملتے تھے لیکن
کسی طرح ان کے خرچ کو کافی نہ تھے۔ سیر چشم امیر ابن امیر مخیر ایسے تھے کہ ہاتھ
میں کوڑی نہ تھی۔ کبھی فراغت نہ نصیب نہ ہوئی۔ قرض دار ہی رہے۔ مرزا کا خط
نستعلیق شفیعا آمیز نہایت شیریں اور دل آویز تھا اور باوجود خوش خطی کے نہایت
زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر کے پڑھنے کا انداز حد سے زیادہ دلکش
اور موثر تھا۔ سنہ ۱۲۶۳ھ میں مرزا پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مرزا کو چوسر کا شوق تھا
کبھی بازی بھی بد لیتے تھے۔ کوتوال شہر سے شکر رنجی تھی وہ ٹوہ میں تھا۔ مرزا صاحب
کو چالان کر دیا وہاں سے چھ مہینے کی قید ہو گئی۔ بہت کچھ دوا دوش کی اپیل بھی
کی مگر ایک نہ چلی۔ مرزا صاحب جیسے خوددار غیور طبع کے آدمی کے لیئے قیامت
تھی۔ جیل خانے میں ان کی حالت محض نظر بندی کی تھی ایک علیحدہ کمرے میں رہتے

سے کھانا کپڑا سب گھر سے جاتا تھا۔ دوست احباب کو ملنے ملانے کی اجازت تھی مگر پھر بھی نام قید کا تھا۔ پھر نہیں معلوم کیا گل کھلا کہ چھ مہینے کی جگہ تین مہینے میں چھوٹ گیا۔ چنانچہ خود ایک خط میں لکھتے ہیں "میں ہر کام خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑ نہیں سکتا جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے مصر ہے ایران ہے بغداد ہے یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ آستانۂ رحمۃ للعالمین دل دادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں" مرزا صاحب نے جو ایک ترکیب بند قید خانے میں لکھا تھا اس میں کہتے ہیں:۔

رانده دانا غم رسوائی جاوید بلاست　　　بهر آزار غم از قید فرنگم نبود
جور یا اعدا رود از دل به رهائی لیکن　　　طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود

سنہ ۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بادشاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل مروارید کے دربار عام میں مرحمت فرمایا اور خاندان تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا۔ جو کچھ لکھی گئی تھی کہ غدر پڑ گیا وہ دفتر ہی گاؤ خورد ہو گیا مہر نیم روز اسی کا ایک حصہ ہے۔ نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے کی شادی میں مرزا صاحب نے یہ سہرا لکھ کر حضور میں گزرانا:۔

خوش ہوا بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا　　　باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے　　　ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ　　　مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کے ہی پروئے گئے ہوں گے موتی　　　ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی　　　تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا　　ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے　　رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز　　چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے　　گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک　　کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار　　لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

مقطع کو سن کر بادشاہ کو خیال ہوا کہ یہ تو ملک الشعراء ذوق پر چوٹ ہے۔ چنانچہ ذوق جب گئے تو بادشاہ نے یہ سہرا دیا انھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی پیر و مرشد بادشاہ نے کہا کہ تم بھی ایک سہرا کہدو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا ابھی لکھ دو ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا۔ ذوق نے وہیں بیٹھے بیٹھے یہ سہرا لکھا:۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا　　آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک　　کشتیِ زر میں مہِ نو کے لگا کے سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید　　رخِ پُر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ　　دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم　　گوندھیئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی　　گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار　　تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش　　سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صدکانِ گہر میں چھوڑا　　تیرا بنوایا ہے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار　　اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی　　کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

رونمائی میں تجھے دیکھ کے خورشید و فلک　　کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے　　دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اس کو

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں اسی وقت انھیں ملا۔ شام تک گلی گلی کوچے میں پھیل گیا۔ دوسرے دن اخباروں میں مشتہر ہو گیا۔ مرزا بھی بڑے ادا شناس اور سخن فہم تھے۔ سمجھے کہ تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور بطور معذرت یہ قطعہ حضور میں گزرانا:-

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اب کچھ لطیفے بھی سن کر دل خوش کر لیجیے:-

(۱) اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ مرزا مہدی کو مرزا صاحب نے لکھا: میاں بے رزق جینے کا مجھ کو ڈھب آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزے کھا کھا کر کاٹا۔ خدا رزاق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔

(۲) دلی میں رتھ کو بعضے مونث اور بعضے مذکر بولتے ہیں۔ کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا۔ رتھ مونث ہے یا مذکر؟ آپ نے کہا بھیا! جب عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

(۳) جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے صاحب کے مکان میں رہتے تھے۔ ایک روز کالے صاحب کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے قید سے چھوٹنے کی مبارک باد دی۔ مرزا نے کہا "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے (یعنی مرزا کالے) کی قید میں ہوں۔"

(۴) دلّی میں مشاعرہ تھا۔ مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدر الدین خاں اور مولوی امام بخش صہبائی جلسے میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ مصرع پڑھا۔ ع۔ بوادیے کہ دراں خضر را عصا خفت است۔ مولوی صاحب کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ عصا خفت میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا حضرت! میں ہندی نژاد ہوں میرا عصا پکڑ لیا۔ اس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا۔ ع۔ وسے بجلۂ اول عصائے شیخ بخفت۔ انھوں نے کہا اصل محاورے میں کلام نہیں کلام اس میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں۔

(۵) ایک دفعہ مرزا بہت قرض دار ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش دائر کی۔ جواب دہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے یہ شعر پڑھا:۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں　　رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

(۶)۔ مرزا صاحب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب سے جیل خانے میں ایسے رہنا پڑا جیسے کہ حضرت یوسف کو زندان مصر میں۔ کپڑے میلے ہو گئے جوئیں پڑ گئیں تھیں۔ ایک دن بیٹھے جوئیں چن رہے تھے۔ ایک رئیس وہیں عیادت کو پہنچے۔ پوچھا کیا حال ہے؟۔ آپ نے یہ شعر پڑھا:۔

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں　　کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے اور کپڑے بدلے تو وہاں کا کرتا وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا:۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب　　جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۷) حسین علی خاں کا چھوٹا لڑکا ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ دادا جان مٹھائی منگا دو۔ مرزا نے کہا پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر ادھر ادھر ٹٹولنے لگا۔ آپ نے کہا

درم و دام اپنے پاس کہاں　　چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

(۵) بادشاہ کے ہاں سے چھٹے مہینے تنخواہ ملنے کا دستور تھا، یہاں گھر میں چوہے تو باندیاں کھانے اور انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھنے لگتی تھیں۔ مرزا نے ایک چٹپٹا قصیدہ کہہ سنایا اور ماہ بماہ تنخواہ ملنے لگی۔ گو اس کا شمار لطیفوں میں نہیں ہے مگر اشعار کی برجستگی خود بڑی لطافت ہے۔

ای شہنشاہ آسماں اورنگ — ای جہاں دار آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمی بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرہ ناچیز — روشناس ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کارگزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوق آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر — تا نہ دے باد زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا | ہو گیا ہے شریک ساہو کار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں | شاعر نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان اگر سنیئے | ہے زباں میری تیغ جوہردار
بزم کا التزام گر کیجے | ہے قلم میرا ابر گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد | قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا | آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ | تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام | شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس | ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۹) فضل حق مرزا کے ایک بڑے دوست تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آتا تھا تو خالق باری کا یہ مصرعہ پڑھا کرتے تھے۔ ع۔ آؤ برادر بیٹھے رہے بھائی۔ چنانچہ مرزا کی تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ مصرعہ پڑھا ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دوسرے دالان سے حضرت کی داشتہ بھی اٹھ کر پاس آکر بیٹھ گئی۔ مرزا صاحب نے کہا۔ ہاں صاحب اب وہ دوسرا مصرعہ بھی ارشاد ہو۔ یعنی۔ ع۔ بنشیں ماور بیٹھ ری مائی۔

(۱۰) مرزا کی قاطع برہان کے بہت شخصوں نے جواب لکھے اور بہت زبان درازیاں کیں۔ کسی نے کہا۔ حضرت! آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا۔ فرمایا "بھائی! اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دوگے؟"

(۱۱) بہن بیمار تھیں۔ عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے؟ وہ بولیں کہ مرتی ہوں قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لیئے جاتی ہوں۔ آپ نے کہا۔ بوا! بھلا کیا فکر ہے۔ خدا کے ہاں کیا مفتی صدر الدین خاں بیٹھے ہیں جو ڈگری کرکے پکڑوا بلائیں گے۔

(۱۲) ایک دن مرزا کے کسی شاگرد نے کہا۔ حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت اور بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھیئے تو میں کیسا فصیح ہو گیا۔ مرزا نے کہا

ارے میاں! تین کوس کیوں سرکے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیلپیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

(۱۳) بعض شاگردوں نے مرزا صاحب سے کہا کہ آپ نے حضرت علی کی مدح میں بہت قصیدے اور بڑے بڑے زور کے قصیدے کہے صحابہ میں سے کسی کی تعریف میں کچھ نہ کہا۔ مرزا نے ذرا تامل کر کے کہا "اُن میں کوئی ایسا دکھا دیجئے تو اُس کی تعریف بھی کہدوں۔ مرزا صاحب کی شوخی طبع ہمیشہ انھیں اس رنگ میں شور بور رکھتی تھی۔ جس سے ناواقف لوگ اُنھیں الحاد کی تہمت لگائیں اور چوں کہ یہ رنگ اُن کی شکل وشان پر عجب معلوم ہوتا تھا۔ اس لیئے اُن کے دوست ایسی باتوں کو سن کر چونکتے تھے۔ جوں جوں وہ چونکتے تھے وہ اور بھی زیادہ چھینٹے اُڑاتے تھے۔ اُن کی طبیعت سرور شراب کی عادی تھی لیکن اُسے گناہ سمجھتے تھے اور یہ بھی عہد تھا کہ محرم میں نہ پیتے تھے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ان کے دل میں خشیت اللہ بہت تھی اور اپنے افعال سے شرمسار حد درجے سے تھے چنانچہ یادگار غالب میں لکھا ہے کہ غالب کہتے تھے کہ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں تو میرے دوست عزیز میرا مُنہ کالا کریں، ور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں اور کوّوں کو کھانے کو۔ اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کریں۔ چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں۔ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ لَا اِلٰہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

(۱۴) غدر کے چند روز بعد پنڈت موتی لعل مترجم گورنمنٹ پنجاب کے مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ اُن دنوں پنشن اور دربار دونوں بند تھے۔ مرزا صاحب بسبب دل شکستگی کے شکوہ وشکایت سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ "عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ بھی

نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل کیا؟۔

(۱۵) بھوپال سے ایک شخص دلّی کی سیر کو آئے۔ مرزا صاحب سے بھی ملنے آئے وضع قطع سے وہ نہایت پرہیزگار پارسا معلوم دیتے تھے۔ اُن سے بکمال اخلاق پیش آئے۔ مگر معمولی وقت تھا بیٹھے سرور کر رہے تھے۔ گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا۔ اُن بے چارے کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ بھی شوق ہے۔ انھوں نے شربت کا شیشہ سمجھ کر ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ کوئی شخص پاس سے بولا جناب یہ شراب کا شیشہ ہے بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا میں نے تو شربت کے دھوکے میں اُٹھایا تھا۔ مرزا صاحب نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور کہا "زہے نصیب دھوکے میں نجات ہو گئی"۔

(۱۶) ایک دفعہ رات کو انگنائی میں بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ آپ آسمان کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ جو کام بے صلاح مشورے ہوتا ہے بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے نہیں بنائے جبھی بکھرے ہوئے ہیں۔ نہ کوئی سلسلہ نہ زنجیر۔ نہ بیل نہ بوٹا۔

(۱۷) ایک مولوی صاحب جن کا مذہب سنت والجماعت تھا۔ رمضان کے دنوں میں ملاقات کو آئے۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا۔ حضرت! غضب کرتے ہیں۔ رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا سنّی مسلمان ہوں۔ چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیا کرتا ہوں۔

(۱۸) رمضان کا مہینا تھا آپ نواب حسین مرزا کے ہاں بیٹھے تھے۔ پان منگا کر کھایا۔ ایک صاحب فرشتہ سیرت نہایت متقی اور پرہیزگار اُس وقت حاضر تھے اُنھوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے۔ مسکرا کر بولے "شیطان غالب ہے"۔

(۱۹) جاڑے کا موسم تھا۔ ایک دن نواب مصطفیٰ خاں مرزا کے گھر آئے۔ آپ نے اُن کے آگے شراب کا گلاس بھر کر رکھ دیا۔ وہ اُن کا منہ دیکھنے لگے مرزا صاحب نے کہا پیجیے۔ چوں کہ وہ تائب ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے کہا میں نے توبہ کی۔ آپ متعجب ہو کر بولے۔ ہیں! کیا جاڑے میں بھی؟۔

(۲۰) ایک شخص نے اُن کے سنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہے۔ آپ نے ہنس کر کہا کہ بھلا جو پیئے تو کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دعا نہیں قبول ہوتی۔ مرزا نے کہا بھائی! جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہیئے جس کے لیئے دعا کرے۔

(۲۱) مرزا کے پاس اکثر اشرار گالیاں لکھ کر گمنام خطوط بھیجا کرتے تھے۔ ایک خط میں ماں کی گالی لکھی تھی۔ مسکرا کر کہنے لگے کہ اس الّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرمساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا۔

(۲۲) مروّت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں اصلاح دینے سے بہت گھبراتے تھے بایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں "جہاں تک ہو سکا خدمت احباب بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا رہا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کو بسبب کبر سنی کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنتیں معاف کر دی تھیں۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔"

(۲۳) باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے بسبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں "لاحول ولا قوۃ۔ کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بجان درویش لکھا تھا جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔"

(۲۴) ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔

(۲۵) ایک دن نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے۔ اُن کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب اُن کے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے اُن کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا۔ کہ "آب چشمۂ حیواں درون تاریکیست۔ جب دیوان خانے میں پہنچے تو اس کے دالان میں بسبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا۔ ایں خانہ تمام آفتاب است۔

(۲۶) سنا ہے کہ جب مرزا کرنل براؤن کے روبرو کلاہ پاپاخ اوڑھ کر گئے تو انھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا کہ اول تم مسلمان؟ مرزا نے کہا آدھا۔ کرنل نے کہا اس کا کیا مطلب؟ مرزا نے کہا شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ کرنل ہنسنے لگا۔ کرنل نے پوچھا سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے۔ مرزا نے کہا میں چار کہاروں کا افسر تھا۔ وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میں کیوں کر حاضر ہوتا

(۲۷) جب نواب یوسف علی رئیس رام پور کا انتقال ہوگیا اور مرزا تعزیت کے لیئے رام پور گئے۔ چند روز بعد نواب کلب علی خاں لفٹنٹ گورنر سے ملنے بریلی جا رہے تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے مرزا سے کہا خدا کے سپرد۔ مرزا نے کہا حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ پھر اُلٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔

(۲۸) ایک صحبت میں مرزا میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی تھے اُنھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا میں تو تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔

(۲۹) مولنا امام بخش صہبائی کی رائے پنج رقعہ اور مینا بازار کی نسبت یہ تھی کہ یہ دونوں تحریریں شامل سہ نثر کے ملا ظہوری کی ہیں مگر مرزا اس کے خلاف تھے۔ ایک جلسے میں دونوں صاحب موجود تھے۔ اتفاق سے ذکر چھڑ گیا۔ مرزا نے کہا کہ قطع نظر اس کے کہ سہ نثر اور پنج رقعہ اور مینا بازار اس کی طرز میں بون بعید ہے ظہوری کی شان سے

نہیں ہو کہ وہ نظم کے ساتھ نثر نہ لکھے . . . یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص نظم
ونثر دونوں پر قادر ہو اُس کی نثر میں کہیں نظم نہ پائی جائے۔ مولٰنا صہبائی نے کہا ایسے
اتفاق اکثر ہو جاتے ہیں یہ محض ایک اتفاق کی بات ہے۔ مرزا نے کہا "بے شک مگر
یہ ایسا اتفاق ہوگا کہ ایک شخص ہر ایک لحاظ سے نہایت سنجیدہ شائستہ اور معقول آدمی
ہے مگر اتفاق سے کبھی کبھی کاٹ بھی کھاتا ہے" یہ سن کر سب لوگ ہنس پڑے اور مولٰنا
صہبائی مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ (۳۰) مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے
اُٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اُس کی ایک جانب ایک
کوٹھڑی تنگ و تاریک تھی جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ بہت جُھک کر جانا پڑتا تھا۔ ان
اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس بجے سے چار تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک رمضان
میں مولٰنا آزردہ اسی کوٹھڑی میں ٹھیک دوپہر کے وقت آئے اُس وقت مرزا صاحب
کسی دوست سے چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولٰنا نے رمضان کے مہینے میں
مرزا کو چوسر کھیلتے دیکھ کر کہا "ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان
مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا" مرزا نے کہا "قبلہ حدیث
بالکل صحیح ہے۔ مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھڑی ہے"
(۳۱) ایک روز دوپہر کا کھانا آیا۔ دسترخوان بچھا۔ برتن تو تھے بہت اور کھانا کم
مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا
دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا۔

(۳۲) ایک روز بہادر شاہ مرحوم چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے باغ
حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے درخت لدے ہوئے تھے۔
یہاں کا آم بادشاہ یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آ سکتا تھا۔ مرزا جو ان کہ آموں
کے عاشق تھے بار بار آموں کو غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا اس قدر
غور سے کیا دیکھتے ہو؟" مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے
کہا ہے۔ بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں۔ کیں فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ اس کو دیکھتا ہوں
کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے
اور اُسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

(۴۳) حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے اُن کو آم نہیں بھاتے تھے ایک دن وہ مرزا کے پاس برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ایک گدھے والا گدھے لیئے چلا جا رہا تھا۔ رستے میں آم کے چھلکے پڑے تھے گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیئے۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔

(۴۴) ایک روز مرزا مہدی مجروح مرزا کے پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے۔ مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے۔ اُنھوں نے نہ مانا اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دے دیجیئے گا۔ مرزا نے کہا ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔ جب وہ پیر داب چکے تو اُنھوں نے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا "بھیّا کیسی اجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے۔ میں نے تمہارے پیسے دابے حساب برابر ہوا"

(۴۵) ایک دن سید سردار مرزا مرحوم ملنے آئے۔ تھوڑی دیر ٹھیر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمع دان لے کر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتی دیکھ کر پہن لیں۔ اُنھوں نے کہا قبلہ وکعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ میں اپنی جوتی آپ پہن لیتا۔ مرزا نے کہا میں آپ کو جوتی دکھانے کو شمع دان نہیں لایا۔ بلکہ اس لیئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میری جوتی نہ پہن جائیں۔

(۴۶) ایک بار بہادر شاہ نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی خبر لگی۔ چند رباعیاں لکھ کر بادشاہ کو سنائیں۔ جن میں تشیّع اور رفض سے تحاشی کی تھی اُن میں کی ایک رباعی یہ تھی:۔

جن لوگوں کو ہے مجھسے عداوت گہری	کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی	شیعی کیوں کر ہو ماورا النہری

(۴۷) جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے مارے پیروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا "میاں مٹھو نہ تمہارے جورو نہ بچے تم کس فکر میں سر جھکائے بیٹھے ہو؟

(۴۸) مرزا اپنا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان خود دیکھ کر آئے اُس کا

دیوان خانہ پسند آ گیا اگر محل سرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آکر اس کے دیکھنے کے لئے بی بی
کو بھیجا وہ دیکھ کر آئیں تو اُن سے پسند نا پسند کا حال پوچھا۔ اُنھوں نے کہا اس میں
تو لوگ بلا بتلاتے ہیں۔ مرزا نے کہا کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟"
(۳) سنہ ۱۲۷۷ھ میں اُنھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ لکھی "غالب مُردہ" اس سے
پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر سے مرزا صاحب نے اس
مادے کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا حضرت ان شاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔ مرزا
نے کہا "دیکھو صاحب تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو۔ اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا
تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔"
(۴) ایک مرتبہ شہر میں سخت وبا پھیلی۔ میر مہدی حسین مجروح نے دریافت کیا
کہ حضرت وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے
ہیں۔ "بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو
نہ مار سکے تو تف بریں وبا"
الغرض مرزا کی کوئی بات لطف و ظرافت سے خالی نہ ہوتی اگر کوئی اُن کے تمام
ملفوظات جمع کرے تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی طیار ہو جاتی۔ قبر بالکل سادی سودی
ہے۔ اتنا بڑا نامی گرامی شاعر اور اُس کی قبر جو آج یادگار زمانہ ہوتی اس کس مپرسی کی حالت
میں ہے۔ وائے بر قوم! اس سے معلوم ہوا کہ نفسی نفسی کا معاملہ ہے۔ یہاں قوم دوم
خاک بھی نہیں۔ غالب کے ایک نہیں دو نہیں ہزاروں شاگرد تھے جن میں سے
اب بھی بہت سے زندہ کھاتے پیتے خوش حال ہیں۔ جن کو دعوی غالب سے
تلمذ کا ہے اگر تھوڑا تھوڑا بھی دیتے تو قبر کی یہ حالت نہ ہوتی۔ کچھ دن ہوئے
باسی کرڑھی میں اُبال آیا تھا غلغلہ سنا تھا کہ غالب کی قبر بن رہی ہے۔ چندہ ہو رہا ہے
اور کچھ چندہ ہوا بھی مگر جس طرح مسلمانوں کے اور کام ایندرہ جاتے ہیں یہ دفتر
بھی گاؤ خورد ہو گیا۔ خیر اُن کی کوئی یادگار بنائے یا نہ بنائے اُن کا کلام اور اُن
کی تصانیف ایک ایسی دائمی یادگار ہے کہ ابد الآباد تک رہے گی۔ قبر پر یہ کتبہ
ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ او ہو یہ غالب کی قبر ہے ورنہ کوئی جانتا بھی نہ کہ یہ
دُرِ بے بہا کہاں رُل گیا!۔

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد — اسد اللہ خاں غالب مُرد
کل میں غم و اندوہ میں باخاطرِ محزوں — تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا تو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح — ہاتف نے کہا گنجِ معانی ہے تہِ خاک

خان جہاں تلنگی کا مقبرہ
سنہ ۷۷۲ھ

حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے پاس کوٹ کے اندر موضع غیاث پور کی حدود میں آبادی کے عین بیچوں بیچ خان جہاں ولد خان جہاں تلنگی المخاطب بہ جونا شہ کا عالی شان مقبرہ ہے جو غالباً مسجد کے ساتھ سنہ ۷۷۲ھ میں بنا ہوگا۔ اب بہت خراب اور خستہ حالت میں ہے۔ ضرور اس مقبرے کے گرد احاطہ ہوگا اب تو یہ حال ہے کہ چاروں طرف سے مکانات نے اسے دبا لیا ہے اور گنبد کے اندر کچی دیواریں اٹھا کر ایک گھروندا بنا لیا ہے۔ ہم نے جب اس مقبرے کے دیکھنے کا قصد کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں پردہ دار عورتیں رہتی ہیں اور اندر نہیں جا سکتے مگر ہماری خاطر سے سید محمد علیم الدین صاحب امام مسجد درگاہ شریف نے کسی نہ کسی طرح ہم کو دکھلا دیا۔ یہ مقبرہ غیاث پور کی فصیل سے ملا ہوا ہے جو اب نظام پور کہلاتا ہے۔ خان جہاں کے نام کے ساتھ تلنگی کا لفظ زبان زد ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ وہ ملک تلنگانہ کا رہنے والا ہوگا۔ دہلی کی کالی مسجد اسی کی بنائی ہوئی ہے اور یہاں بھی اس نے ایک مسجد بنوائی ہے۔ اگرچہ لوگوں نے اپنے گھروں کو بڑھاتے بڑھاتے گنبد کو بالکل گھونٹ دیا ہے۔ لیکن گنبد کے اندر ان لوگوں کی مداخلت بے جا کو روکنا اور مقبرے کو ان لوگوں سے خالی کرا کے اس کے اندر کی خام دیواروں کو توڑ کر گنبد کی اصلی عمارت کو صاف کرا دینا حکام متعلقہ کی خاص توجہ کا محتاج ہے۔

کالی مسجد کوٹلہ نظام الدین
سنہ ۷۷۲ھ

دہلی کی کالی مسجد اور بیگم پور کی طرز کی یہ مسجد بھی ہے جو دہلی کی مسجد سے سترہ برس پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ یہ مسجد بھی جونا شہ الملقب بہ خان جہاں فیروز شاہی کی بنوائی ہوئی ہے۔ جو غیاث پور کے کوٹلے میں ہے یہ بستی اب نظام الدین

موسوم ہی۔ مسجد کوٹلے سے مشرق کی طرف ہی۔ یہ مسجد چونے اور پتھر کی بنی ہوئی ہی جس کے صدر دروازے پر بخط نسخ یہ کتبہ ہی:۔

بکرم وفضل حق سبحانہ وتعالیٰ درعہد دولت سلطان السلاطین الزمان الواثق بتائید الرحمان + ابو المظفر فیروز شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ واعلی وشانہ این مسجد بنا کرد بندہ زادہ درگاہ + آسمان جاہ عالمپناہ جونانشہ مقبول الملقب بخانجہاں ابن خانجہان در سال ہفصد وہفتاد دو از ہجرت + پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم خدای بر آن بندہ رحمت کند ہرکہ در این مسجد نماز بگذارد این بندہ را بفاتحہ ودعاء ایمان یاد کند۔

دوسیر پا گنبد یاماشا کا برج

حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے مغرب رویہ دروازے کے سامنے یہ گنبد ہی جس کے آگے ایک پختہ احاطہ کھینچ دیا گیا ہی۔ اس کا گنبد اونچا ہی اور گنبد کے گرد کنگورا اور تین دروازے ہیں۔ مغرب کی طرف دروازہ نہیں ہی۔ اندر کا پلاستر سب جھڑ گیا۔ گنبد کے اندر ایک خام قبر ہی۔ صدر دروازہ مشرق کی طرف ہی جس کی محراب ۱۳ فٹ بلند اور چھ فیٹ چوڑی ہی جس کے دونوں طرف دو کھلے طاق ہیں۔ گنبد کے اندر شمال اور جنوب میں دو طرفہ پچیس پچیس سیڑھیوں کا زینہ ہی۔ گنبد کے مشرقی دروازے کی پیشانی پر دو سطر کا ایک کتبہ بخط نسخ بہت پرانے طرز کا گچ میں منقوش ہی جو کائی لگ جانے اور خط بھی بہت پرانا ہونے سے اچھی طرح پڑھا نہیں جاتا وہ یہ ہی:۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۱)..... قولہ تعالیٰ وما محمد..... قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ..... لا الہ الا ہو الملک القدوس السلام المؤمن المہیمن العزیز الجبار المتکبر سبحٰن اللہ عما یشرکون۔ پارہ ۲۸ سورۂ ممتحنہ رکوع (۶) (۲) قولہ تعالیٰ انما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر پارہ ۱۰۔ سورہ توبہ رکوع (۸) ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون تا افلا تعقلون۔ پارہ (۱) سورۂ بقر رکوع (۵)

اور محراب کے گرد سورۂ کرسی تا وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ - یہ گنبد بہت پرانا پٹھانوں کے وقت کا ہے اور کتبے کا خط بھی بہت پرانا ہے - نہ سنہ تعمیر ملتا ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس کا ہے - احاطے کے اندر کئی قبریں پختہ اور خام اور کچھ درخت سایہ دار بھی ہیں - اس گنبد کا کوئی خاص نام نہیں چوں کہ دُہرا زینہ ہے دو سیڑھیا گنبد کہلاتا ہے اور بعض لوگ ماشا کا برج بھی کہتے ہیں خدا جانے وہ ماشا کون تھے -

ایک شکستہ مسجد

نمبر ۱۱۲/۱۷۲ ہمایوں صفدر جنگ کی سڑک کے بالکل کنارے حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ کے سامنے تین در کی ایک شکستہ مسجد ہے - جس کے اندر تین گنبد ہیں - اوپر چھت سپاٹ ہے - مینار کوئی نہیں ہے - یہ مسجد ۹ × ۳ × ۱۵ ½ فٹ ہے - اس مسجد کی پشت سے ارادت مند خاں کے کٹڑے کو سڑک گئی ہے جو آگے جا کر کچا راستہ روشن چراغ دہلی کی طرف جانے کا ہے -

کٹڑہ ارادت مند خاں

یہ وہی ارادت مند خاں ہیں جن کا محلہ اور مدرسہ شہر دہلی میں مشہور ہے - ان کا اصلی نام ارادت اللہ خاں تھا اور نواب ارادت مند خاں کہلاتے تھے خطاب ان کا شرف الدولہ تھا اور محمد شاہ کے زمانے میں (سنہ ۱۷۱۹-۴۸ء) کے امیر کبیر تھے - یہ وسیع محاط مقام کٹڑہ ارادت مند خاں کے نام سے مشہور ہے جو نظام الدین میں سڑک صفدر جنگ کی بائیں طرف نظر آتا ہے - اس کا فصیل نما احاطہ ۹ × ۲۳ فٹ مربع بہت پختہ بنا ہوا ہے - چاروں طرف لداؤ کی پختہ کوٹھڑیاں ہیں جن میں اب غریب لوگ اہیر اور مالی وغیرہ آباد ہیں - شرق کی طرف اس کا مسقف اور عالی شان دروازہ ہے - کٹڑے کے پچھواڑے ایک بڑا باغ بھی تھا جس میں سے جی آئی پی ریلوے کی لین نکل گئی ہے - اس باغ کے دروازے پر ایک بڑا گنبد بنا ہوا ہے - یہ مقام ریلوے لین کی بائیں طرف تار کے کھمبے نمبر ۹/۵۸ کے پاس ہے جس سے آگے نہر پر تین گرڈر کا آہنی پل بنا ہوا ہے - غدر میں سرکار کی طرف سے یہ کٹڑہ نیلام ہوا تھا جسے مرزا فخر یار جاہ کے والد مرزا الٰہی بخش صاحب نے خرید لیا تھا جو اب گورنمنٹ نے معاوضہ دے کر لے لیا - اب یہ سرکاری عمارت ہے -

ایک چھوٹی سی برجی ارادت مند خاں کے کٹڑے کے سامنے رستے کے کنارے بائیں طرف ایک چھوٹی سی برجی بنی ہوئی ہے۔ جو ایک ۵ فٹ مربع اور ۵ اونچے چبوترے پر ۷ فٹ مربع الداؤ کی ہشت پہلو عمارت ہے۔ اس میں کوئی قبر نہیں ہے مگر نیچے تہ خانہ ہے۔ اغلب ہے کہ اس میں اصل قبر ہوگی رہا اوپر کا تعویذ وہ کوئی اکھاڑ لے گیا ہوگا۔ اس برجی کے اندر باہر رنگین کام تھا چنانچہ باہر اب بھی کچھ کچھ باقی ہے۔

گولا گنبد جہاں سے ہم ارادت مند خاں کے کٹڑے کی طرف مڑے تھے ہمایوں کے مقبرے سے جو سڑک صفدر جنگ کے مقبرے کو جاتی ہے اسی سڑک پر بائیں ہاتھ کی طرف سڑک سے لگا ہوا جی آئی پی آر کی لین سے (جہاں سڑک کا کراسنگ ہے) بائیں ہاتھ کو تار کے کھمبے نمبر ۱۰/۱۴۸ کے محاذی ایک گنبد ۵ فٹ مربع ہے۔ جس کی محراب ۵ فٹ چوڑی ہے۔ اندر دو قبریں گچ کی شکستہ ہیں۔ اور شمال کی طرف ایک ہی دروازہ ہے اس گنبد کا کوئی خاص نام نہیں ہے اس کی شکل کے اعتبار سے گولا گنبد کہلاتا ہے فقط

(حصہ دوم ختم ہوا)

قطعۂ تاریخ از قلم جادو رقم عالی جناب نواب احمد سعید خاں صاحب طالب دہلوی مرحوم مغفور

انساں کی گو وجود ہی گر زورقِ حیات — القاے خیر و شر ہی مگر گوشۂ جہات
خیر العمل ہی کوئی تو کوئی زبوں سرشت — ہر ایک ہی زمانے میں مشہور شش جہات
مصداق اس مقال کے پوچھو اگر تو ہیں — تاریخ اور سیر کی کتابوں میں واقعات
قرطاس کائنات پہ نقشہ کھنچا ہی اور — تاریخ دہلی آج ہی تحتِ قلم دوات
ہیں مولوی بشیر یہ احمد ستودہ نام — اس کے مؤلف اور غنیمت ہے ان کی ذات
مجمل ہی گو بیان۔ یہ صحت کا ہی خیال — دہلی کی سرزمین پہ گزری جو واردات

آئی ندا ظفر کی جو طالب نے فکر کی
یہ چار گوشہ دہلی کے لکھتے ہیں واقعات

۱۳۳۰

[illegible] تاریخ لکھنے کے بعد دنیا سے چل بسے۔ ۲ دہلی کے آخرین بادشاہ ظفر تخلص ۳ یعنی تخت متابوت ۱۲۰

HISTORY

OF

DELHI THE IMPERIAL CITY

A MOST COMPREHENSIVE ACCOUNT OF THE HISTORY AND ARCHÆOLOGY OF DELHI

(WITH NUMEROUS ILLUSTRATIONS)

BY

BASHIR-UD-DIN AHMAD, M.R.A.S.,

FIRST TALUKDAR (COLLECTOR AND DISTRICT MAGISTRATE) RET.

H. E. H. THE NIZAM'S GOVERNMENT,

AUTHOR OF THE HISTORIES OF VIJAYANAGAR AND BIJAPUR, IQBAL DUI

HUSN-E-MUASHRAT, ISLAH-E-MAISHAT, ETC., ETC., AND TRANSLATOR

DR. STALL'S SELF AND SEX SERIES.

VOL. II.

Archæology.

DELHI

1919

1st Edition] [1,000 C

I. M. H. P., Delh.

اعلان

(بموجب کاپی رائٹ ایکٹ ۱۹۱۴ء جملہ حقوق بحق بشیر الدین احمد محفوظ ہیں)

مولوی نذیر احمد صاحب بالقابہ کی تصانیف

قرآن شریف مترجم کلاں ۲۲×۲۹ - دو صفحہ مع فرہنگ الفاظ اردو حاشیہ کاغذ سفید ولایتی کاغذ خانی جلد معمولی

" " ایک صفحہ پر متن دوسرے پر ترجمہ .... حاشیہ شدہ

حمائل مترجم ۲۲×۲۹ ترجمہ بین السطور مع فرہنگ

ادعیۃ القرآن - قرآن شریف کی عام دعائیں مع خواص - دو سورۃ - الحقوق والفرائض - ہر سہ حصص - جس میں اسلام کے تمام مسائل ہیں - اجتہاد - جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا میں اسلام ہی سچا مذہب ہے - حیات النذیر - مولوی نذیر احمد صاحب کی مفصل سوانح عمری مع فوٹو اور دو عکسی خطوط کے - نظم بے نظیر - مولوی صاحب موصوف کی کل نظموں کا مجموعہ - مراۃ العروس - توبۃ النصوح - بنات النعش - محصنات - رویائے صادقہ - ابن الوقت - ایامیٰ - موعظہ حسنہ - مجموعہ خطوط - منتخب الحکایات - چند پند - صرف صغیر فارسی کی گریمر - نصاب خسرو - یعنی خالق باری - رسم الخط - قواعد املا نویسی - مبادی الحکمۃ - منطق کا اردو رسالہ - مالا بد منہ فی الصرف - عربی گریمر - مجموعۂ لکچر - دو جلد جس میں (۲۲) لکچر ہیں - مطالب القرآن - تفسیر کا پہلا حصہ

خاکسار کی تصانیف

واقعات مملکت بیجاپور - تین حصے - ۸۰۰ صفحے (۶۶) فوٹو - دکن کی مکمل تاریخ جس پر ہزار روپیہ انعام ملا - منظورہ ٹکسٹ بک کمیٹی پنجاب - اقبال دلہن - حسن معاشرت - اصلاح معیشت - منظورہ ٹکسٹ بک کمیٹیاں پنجاب و ممالک متحدہ - یہ تینوں کتابیں لڑکیوں اور مستورات کے لئے ازبس مفید ہیں - اصلاح معیشت پر سرکار سے تین سو روپے انعام ملا ہے - حرز طفلان - لڑکوں کے لئے نشاط عمر نوجوانوں کے لئے - عصائے پیری - ادھیڑ عمر کے لوگوں کے لئے بچیوں سے دو دو باتیں - لڑکیوں کے لئے یہ چاروں کتابیں بیش بہا نصائح اور اخلاقی تعلیم کی ہیں - عزم بالجزم - استقامت ارادہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ -

ملنے کا پتہ

بشیر الدین احمد تعلقہ دار پنشنر - کھاری باولی دہلی